قارئین "یوجنا" سے.....

قارئین کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ ان کے محبوب رسالے "یوجنا" اردو کی موجودہ ضخامت (۳۲ صفحات + چار کورز) میں ۲۰ صفحات کا گراں قدر اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اب اس کی ضخامت (۵۲ صفحات + چار کورز) کل ۵۶ صفحات ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی قیمت میں بھی تھوڑا اضافہ کیا گیا ہے۔ اب ایک عام شمارے کی قیمت ۵ روپے ہوگی اور زرِ سالانہ پچاس روپے۔ فی الحال صرف ایک سال ہی کے لیے چندہ قبول کیا جائے گا (دو اور تین سال کے لیے نہیں) قیمتوں پر نظرِ ثانی اور اضافہ اس لیے کیا گیا ہے کہ کاغذ کی قیمت اور طباعت کے اخراجات میں اضافے کے پیشِ نظر ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ قارئین حضرات ہمیشہ کی طرح ہم کو اپنا بھرپور تعاون دیتے ہوئے صفحات میں اس بڑے اضافے کا استقبال کریں گے اور قیمت میں اضافے کو خندہ پیشانی سے قبول کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اب ہم آپ کے لیے زیادہ اور بہتر مواد اور نئے نئے موضوعات پیش کر سکیں گے۔

(ادارہ)

یوجنا

نئی دھلی

چیف ایڈیٹر: ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابد کرہانی

سب ایڈیٹر: ڈاکٹر توحید خان

فون: 677591

تزئین و کتابت: افتخار احمد خاں

سرورق: کے۔ کے ورما

جلد: ۱۵ شمارہ: ۱

اپریل ۱۹۹۵ء (۱۱ چیت تا ۱۰ بیساکھ شک ۱۹۱۷)

زرِ سالانہ: ● ایک سال کے لیے: ۵۰ روپے
(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ڈپٹی ڈائریکٹر پروڈکشن: سُدرشن موہن چہل

مضامین سے متعلق

خط۔کتابت کا پتا:
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"
منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

م۔ک۔ مہتاب

۹۶-۱۹۹۵ء کے مرکزی و ریلوے بجٹ

عوام اور معیشت میں راحت کا احساس

اس برس چھ ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات کے پیش نظر اور غیر اعلانیہ طور پر چناؤ کمیشن کی خواہش کے مطابق ریلوے اور مرکزی سرکار کے آئندہ مالی سال کے لیے بجٹ ماہ فروری کی بجائے بالترتیب ۱۴۔ اور ۱۵ مارچ کو پارلیمنٹ میں پیش کیے گئے۔ دونوں بجٹ پیش کیے جانے کے بعد عوام تجارت اور صنعت کے حلقوں میں کسی قسم کی بے چینی یا اضطراب کا اظہار نہیں کیا گیا بلکہ ایک قسم کی راحت محسوس کی گئی ہے کیوں کہ گزشتہ کچھ برسوں سے یہ معمول بن گیا تھا کہ ریلوے اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر مسافروں کے کرایوں اور مال کے بھاڑے میں اضافہ کرتی آرہی تھی اور وزیر خزانہ کے پاس ترقیات کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے درآمدی و برآمد محصولات اور پیداواری محاصل میں اضافہ کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ اخراجات زندگی میں اضافہ کے باوجود آمدنی ٹیکس بڑھایا جارہا تھا۔ لیکن اس برس دونوں بجٹوں میں ایسا کوئی غیر معمولی اضافہ دیکھنے میں نہیں آیا لہٰذا عوام اور معیشت میں راحت کا احساس ایک قدرتی امر تھا۔ وزیر ریلوے نے درجہ دوم کے کرایوں میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ بیشتر مسافر اسی درجہ میں سفر کرتے ہیں۔ البتہ اعلیٰ درجہ کے آسائش کے سفر کے لیے کرایہ کچھ بڑھا دیا ہے۔ اسی طرح وزیر خزانہ نے کوئی نیا ٹیکس عائد نہیں کیا بلکہ آمدنی ٹیکس کے لیے چھوٹ کی مد ۳۵ ہزار روپے سے بڑھا کر ۴۰ ہزار روپے کر دی ہے اور مصنوعات پر اخراجات کو کم کرنے کے لیے پیداواری محاصل میں بھاری کمی کی ہے اور صنعتوں کے لیے درکار خام مال کی درآمد پر محصول بھی کم کر دیا ہے۔ بے شک انھوں نے ترقیات کے محاذ پر کوئی بڑا قدم نہیں اٹھایا لیکن موجودہ یا رواں اسکیموں کے اخراجات میں بھی کوئی کمی نہیں کی۔ وزیر خزانہ نے گزشتہ برس کی طرح اس برس بھی ۵ ہزار کروڑ روپے کا بجٹ کا خسارہ کھلا چھوڑ دیا ہے جس سے افراطِ زر کی شرح دو عدد پر ٹکے رہنے کا امکان ہے لیکن وزیر خزانہ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے کہ اقتصادی اصلاحات کے نتیجہ کے طور پر مالی وسیلوں میں جو اضافہ ہوگا ان سے افراطِ زر کی شرح ۱۱ فی صد سے کم کر کے ۸ فی صد کی جاسکے گی۔

مرکزی بجٹ

۹۶-۱۹۹۵ء کا مالی بجٹ عوام کے اندیشوں کے برعکس کہا جاسکتا ہے کیوں کہ وزیر خزانہ اور خود وزیر اعظم بارہا کہہ چکے تھے کہ حکومت اقتصادی اصلاحات کے عمل کو جاری رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ اس صورت میں لازم تھا کہ سرکاری دائرہ کار کو محدود کیا جاتا اور مرکز کی طرف سے دی جانے والی اناج کھاد اور برآمدات کے فروغ کے لیے مالی امداد میں کمی کی جاتی۔ تیل اور تیل کی مصنوعات میں سرکاری امداد کا ہاتھ کھینچ لیا جاتا۔ دیہی ترقی اور غریبی دور کرنے کے لیے براہ راست امداد کم کی جاتی۔ ضروری اشیاء کی تقسیم کا نظام صرف کم آمدنی والے لوگوں تک محدود کر دیا جاتا اور غریبی دور کرنے کے پروگراموں کے لیے کم رقوم وقف کی جاتیں۔ لیکن بجٹ میں اناج کھاد تیل کی مصنوعات اور برآمدات پر سرکاری مالی امداد میں کوئی کمی کی گئی ہے نہ دیہی ترقی کے مصارف گھٹائے گئے ہیں اور نہ ہی غریبی دور کرنے کے پروگراموں کی جانب سے توجہ میں کوئی کمی کی گئی ہے۔ سرکاری دائرہ کار سے بھی کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی۔ اس کے برعکس درآمدات پر محصول کی زیادہ سے زیادہ مد ۶۵ فی صد سے کم کر کے ۵۰ فی صد کر دی گئی ہے۔ بہت سی مصنوعات پر پیداواری محصول میں دس سے بیس فی صد کی کمی کی گئی ہے۔

وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے مرکزی مالی بجٹ کو ترقی کے لیے معاون بجٹ قرار دیا ہے اور وزیر خزانہ نے کہا ہے کہ انھوں نے درآمدی محصول اور پیداوار محصول میں کمی کر کے پیداوار کی لاگت کم کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ بھارتی مال کھلے بازار میں غیر ملکی مصنوعات کا مقابلہ کر سکے اور بھارت کی برآمدات کو فروغ حاصل ہو۔ اس سے نہ صرف زرمبادلہ کی آمدنی بڑھے گی بلکہ روزگار کے بھی مزید مواقع حاصل ہو سکیں گے جس کا متناسب اثر افراط زر کی شرح پر پڑے گا۔

وزیر خزانہ نے بجٹ پیش کرتے ہوئے لوک سبھا کو بتایا کہ ۹۶-۱۹۹۵ء میں مرکزی سرکار کی آمدنی کا اندازہ ۱۵۱،۶۷ اکروڑ روپے کا ہے، جب کہ اخراجات کا تخمینہ ۱۵۱،۲۱ اکروڑ روپے کا ہے۔ اس بجٹ میں آمدنی اور اخراجات

۱۸/ ۸/ ۷، پچھم وہار، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۳

یوجنا، نئی دہلی

کے کھاتے میں ۵ ہزار کروڑ روپے کا خسارہ رہے گا جسے پورا کرنے کے لیے وہ کوئی تجویز پیش نہیں کر رہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ اگر ترقی کی موجودہ شرح برقرار رہے تو ملک کی معیشت اتنے خسارے کا بوجھ برداشت کر سکتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ کل املاک پر جن میں آمدنی متوقع املاک وغیرہ شامل ہیں۔ خسارے کا اندازہ ۵،۷۵،۱۳۱ روپے ہوگا جو ملک کی مجموعی پیداوار کی مالیت کے ۵ء۵ فی صد کے برابر ہوگا جو ملکی معیشت کی موجودہ حالت کے مقابلے میں غیر معمولی نہیں کہا جا سکتا۔

پیداواری محاصل میں اضافہ

وزیر خزانہ نے بعض اشیا پر پیداواری ٹیکس میں دس سے بیس فی صد اضافہ تجویز کیا ہے جس سے سرکار کو ۳۲۵ کروڑ روپے کی آمدنی ہوگی۔ ان میں سگریٹ، چیونگ گم، چبانے کا تمباکو، مختلف اقسام کے ریشمی اور مصنوعی دھاگے، مخصوص اقسام کا کچا تمباکو، لکڑی کے اوزار، ربڑ چڑھے دھاگے، ٹائروں میں استعمال ہونے والے دھاگے اور توڑے گئے جہازوں سے نکالا گیا سامان شامل ہے۔ اس کے مقابلے میں عام ضرورت اور صنعتوں میں استعمال ہونے والی بہت سی اشیا کے پیداواری محصول میں کمی کی گئی ہے جس سے سرکار کی آمدنی میں ۳۱۱ کروڑ روپے کی کمی ہوگی۔ مال درآمد کرنے کے محصول میں جو کمی کی گئی ہے اس سے مرکزی سرکار کی آمدنی میں ۱۱۷۹ کروڑ روپے کی کمی ہوگی۔ پیداواری محصول میں اضافے اور کمی میں ریاستی سرکاروں کا حصہ منہا کر کے بجٹ تجاویز کے مطابق مرکزی سرکار کی آمدنی میں کل ۱۵۸۲ کروڑ روپے کی کمی ہوگی۔

وزیر خزانہ نے انکم ٹیکس سے استثنیٰ کی مد میں جو اضافہ کیا ہے اور آمدنی ٹیکس کے نظام میں جو دیگر تبدیلیاں کی ہیں ان سے مرکزی سرکار کی آمدنی میں ۹۰۰ کروڑ روپے کی کمی کا اندازہ ہے۔

وزیر خزانہ نے بعض خوردنی اشیا کو پیداواری ٹیکس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا ہے۔ ان میں ڈبل روٹی، مکھن، پنیر، اچار مربہ، مصالحے، چائے، خوراک کی مصنوعات، ڈیری کی مصنوعات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ عام ضرورت کی اشیا جیسے کہ برتن، مٹی کے تیل سے چلنے والے چولہے، بائیسکل اور بائیسکل کے پرزوں پر بھی کوئی پیداواری ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ خوراک کی کچھ مصنوعات جیسے کہ سوڈا واٹر سے بنی مشروبات، ٹھنڈائی وغیرہ پر پیداواری محصول میں ۵ سے ۲۰ فی صد کی کمی کی گئی ہے۔

درآمدی محصول

درآمدی محصول (کسٹم) کی زیادہ سے زیادہ شرح ۶۵ فی صد سے گھٹا کر ۵۰ فی صد کر دی گئی ہے۔ ان اشیا میں الیکٹرانکس کا سامان، کمپیوٹر، رنگین ٹی وی سیٹ، پولیسٹر دھاگے، جان بچانے کا سامان، مشینیں، بنیادی ضرورت کی مشینیں اور بھاری سامان شامل ہیں۔

ملک میں آنے والے مسافروں کے ذاتی سامان پر کسٹم کی چھوٹ کی زیادہ سے زیادہ حد چار ہزار بڑھا کر ۵ ہزار کر دی گئی ہے۔ زراعت کے کاموں میں مرغیاں پالنے کے لیے درکار سازو سامان، خوراک میں شامل کی جانے والی دوائیوں پر کسٹم محصول میں دس فی صد کی کمی کی گئی ہے۔ اسی طرح سامانِ آرائش، ائرکنڈیشنگ کی مشینوں ویڈیو مقناطیسی ٹیپ، بیٹریوں کے سیل اور آٹو پرزوں پر بھی درآمدی محصول کم کر دیا گیا ہے۔

بے شک آمدنی ٹیکس کی چھوٹ کی مد میں اضافے، ٹیکس کے ڈھانچے میں تبدیلیوں درآمدی محصول اور پیداواری ٹیکس میں کمی سے حکومت کو ۱۵۸۲ کروڑ روپے کا نقصان ہوگا لیکن وزیر خزانہ کو امید ہے کہ ان رعایات میں پیداوار میں جو اضافہ ہوگا اس پر پیداواری محصول سے یہ نقصان کم و بیش پورا ہو جائے گا اور مالیاتی خسارے کی شرح مجموعی قومی آمدنی کے ۵ء۵ فی صد کے برابر رہے گی۔ انھوں نے کہا ہے کہ بھارت ایک عظیم اقتصادی طاقت بن کر ابھر رہا ہے۔ دنیا میں کہیں ایسی مثال نہیں ملتی جہاں بھارت جیسے گوناگوں آبادی والے وسیع ملک میں جمہوری نظام کے اندر رہ کر اتنی بڑی اقتصادی تبدیلی لائی گئی ہو۔

سماج وادی نظام اور غریب طبقوں کی مدد

اقتصادی اصلاحات کے عزم پر قائم رہتے ہوئے وزیر خزانہ نے آئندہ مالی سال کے بجٹ میں ملک کے پسماندہ علاقوں کی ترقی اور غریب و پچھڑے طبقوں کی براہ راست مالی امداد کے مقاصد کو بھی فراموش نہیں کیا۔ انھوں نے ان لوگوں کو بھی خاموش کرنے کی کوشش کی ہے جو اعتراض کر رہے تھے کہ سرکار نے اقتصادی اصلاحات رائج کرنے اور عالمی تجارتی نظام میں شریک ہونے کی دھن میں ملک کی سماج وادی پالیسیوں کو خیرباد کہہ دیا ہے۔

مرکزی بجٹ میں اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کے لیے روزگار کے مواقع میں اضافہ کرنے، دیہی ترقی کے کاموں، دیہات میں روزگار کے وسیلوں میں اضافے اور غریبی دور کرنے کے پروگراموں کو نمایاں ترجیح دی گئی ہے۔ دیہات میں بجلی، پانی، سڑکوں جیسی بنیادی سہولیات، آب پاشی کی سہولیات مہیا کرنے کے کام میں مدد دینے کے لیے ایک ترقیاتی فنڈ قائم کرنے کی تجویز ہے۔ اس فنڈ میں سے درج فہرست ذاتوں اور قبائل سے تعلق رکھنے والے افراد کو روزگار فراہم کرنے والے کام شروع کرنے کے لیے قرضے دیئے جائیں گے۔ چھوٹے صنعتوں کی جاریہ کاری اور ترقی کے لیے بھی ایک فنڈ قائم کیا جائے گا۔ دیہات میں غریبوں اور حاجت مند افراد کو مالی مدد دینے کے لیے بھی ایک فنڈ قائم کرنے کی تجویز ہے اس مقصد کے لیے سماجی امداد کی ایک قومی اسکیم بھی شروع کی جائے گی۔ دیہات میں رہائشی مکانوں کی قلت دور کرنے کے لیے اندرا آواس یوجنا کے تحت ۵ برس میں ۵ لاکھ گھر تعمیر کیے جائیں گے۔

وزیر خزانہ نے کہا ہے کہ قیمتوں میں ٹھہراؤ لانے کے لیے حکومت کے پاس تین کروڑ ٹن اناج کا ذخیرہ ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء سے ہر سال روزگار کے ۶۰ لاکھ نئے مواقع پیدا کیے جا رہے ہیں۔ ملک ہر لحاظ سے خود کفالت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ برآمدات سے اتنی آمدنی ہو رہی ہے کہ اس سے درآمدات کا ۹۰ فی صد خرچ پورا کیا جا رہا ہے۔

بجٹ میں بتایا گیا ہے کہ حکومت غریبی دور کرنے کے پروگراموں کو ترجیح دے رہی ہے۔ دیہی ترقی کے پروگراموں سے دیہات میں غریبی کم کرنے میں مدد ملتی ہے لہٰذا دیہی ترقی کے پروگراموں کے لیے بجٹ میں رقم ۲۱۰۰ کروڑ روپے سے بڑھا کر ۷۰۰۰ کروڑ روپے کر دی گئی ہے۔

اسی طرح تعلیم اور صحت بھی غریبی دور کرنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں جن کا ابتدائی

تعلیم کے اخراجات میں ۴۶ فی صد اور حفظان صحت کے اخراجات میں ۱۹ فی صد کا اضافہ کرنے کی تجویز ہے۔

غریبوں کو براہ راست مالی مدد دینے کے سلسلے میں بیمہ کارپوریشن کی طرف ایک بیمہ اسکیم کا بھی اعلان کیا گیا ہے جس کے تحت ۷۰ روپے سالانہ کے خرچ پر ایسے افراد کا پانچ ہزار روپیہ کا زندگی بیمہ کیا جائے گا۔

دیہات میں بنیادی سہولیات مہیا کرکے کے لیے اپریل ۱۹۹۵ء سے ایک قومی فنڈ قائم کیا جائے گا۔ یہ فنڈ ریاستی سرکاروں کو آب پاشی نقل و حمل، آمد و رفت پانی کے نکاس اور انتظام جیسی سہولیات فراہم کرنے کے لیے قرضے دے گا۔ بجٹ میں شامل کی گئی ایک اور تجویز کے مطابق کمرشیل بینک دیہی و کھادی کی صنعتوں کے کمیشن کو دیہات کے کاریگروں کی قابلِ عمل اسکیموں کی مالی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے ایک ہزار کروڑ روپیہ فراہم کریں گے۔

وزیر خزانہ نے ملک کے شمال مشرقی پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے بھی ایک فنڈ قائم کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ مرکزی سرکار اسکولوں میں بچوں کو دوپہر کا کھانا مہیا کرنے کی اسکیم میں بھی شامل ہونے کے لیے رضامند ہے۔

سب سڈیز

عام خیال کے برعکس بجٹ میں خوراک کھاد اور برآمدات کے فروغ کے لیے دی جانے والی مرکزی راحت میں کوئی کمی نہیں کی گئی بلکہ ان اخراجات میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں اس مالی امداد کا تخمینہ ۱۰۸۲۱ کروڑ روپے ہے جس میں ۲۵ سو کروڑ روپے کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔

مذکورہ بالا تجاویز کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی وزیراعظم کے اس بیان کو درست کہا جا سکتا ہے کہ بجٹ میں ترقی کے عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی گئی بلکہ سماجی بہبود کی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ تجارت اور صنعت کو آگے بڑھنے کے لیے ہر ممکن سہولت مہیا کی گئی ہے۔ وزیر خزانہ نے کہا ہے کہ اگرچہ بجٹ میں ۵ ہزار کروڑ روپے کا خسارہ چھوڑ دیا گیا ہے لیکن آمدنی کے دیگر ذرائع بڑھا کر اس خسارے کو افراطِ زر پر اثر انداز نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ان کا یہ کہنا بہت اہم ہے کہ جب بھارت میں تیار ہونے والے مال پر لاگت کم آئے گی تو ہم زیادہ مال فروخت کر سکیں گے جس سے ملک کو زیادہ آمدنی ہوگی۔

لیکن جو لوگ وزیر خزانہ کے نظریہ سے اتفاق نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ وزیر خزانہ نے پیداوار اور آمدنی میں اضافہ کے قیاس پر خسارے کا اتنا بڑا خلا چھوڑ دیا ہے۔ اسے پُر کرنے کے لیے کوئی سخت قدم نہیں اٹھایا اور درآمدی محصول و پیداواری محصول پر چھوٹ پہ چھوٹ دیتے چلے گئے ہیں۔ وزیر خزانہ کا یہ پانچواں بجٹ تھا۔ اس سے قبل انھوں نے کبھی ایسی فراخ دلی سے کام نہیں لیا۔ ظاہر ہے کہ وزیر خزانہ معیشت کے ہر طبقے کو اگر خوش نہیں کرنا چاہتے تھے تو کم از کم کسی کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ عوام میں یہ تاثر بھی پیدا کرنا چاہتے تھے کہ مہنگائی کا دور ختم ہو رہا ہے اور قیمتوں میں اضافہ رک جائے گا۔ اس حکمت عملی پر غیر ضروری اعتراض بھی نہیں کیا جا سکتا آخر مرکز میں ایک سیاسی جماعت کی سرکار ہے اور ہر سیاسی جماعت کو اپنے مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ اگر اس طرز عمل سے ملکی مفادات مجروح نہ ہوں تو نئی حکمت عملی پر نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی۔

ریلوے بجٹ

وزیر ریلوے شری سی۔ کے۔ جعفر شریف نے ۹۶-۱۹۹۵ء کا جو بجٹ پارلیمنٹ میں پیش کیا ہے اسے بھی ایک نرم بجٹ کہا جا سکتا ہے کیوں کہ ریلوے کے اخراجات اور ترقی کے لیے درکار رقوم حاصل کرنے کی غرض سے صارفین پر ضرورت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا گیا۔ انھوں نے صرف اتنی رقم حاصل کی ہے جس سے اخراجات اور آمدنی کا خسارہ پُر کیا جا سکے۔ آئندہ برس میں ریلوے کے اخراجات کا تخمینہ ۷۵۰۰ کروڑ روپے کا ہے جب کہ آمدنی کا تخمینہ ۶۷۵۰ کروڑ روپے کا ہے۔ اس خسارے کو پُر کرنے کے لیے وزیر ریلوے نے دوسرے درجے میں سفر کرنے والے لوگوں کو کسی بھی طرح زیر بار نہیں کیا بلکہ اعلیٰ درجہ کے پُرآسائش سفر کے کرائے میں کچھ اضافہ کیا ہے یا ریلوے کے ذریعہ لانے لے جانے والے مال کے بھاڑے پر کچھ اضافہ کیا ہے۔ درجہ اول کے پُرآسائش سفر کے کرائے میں اضافے اور مال بھاڑے پر ۷ فی صد اضافے سے انھیں کل ۷۵۰ کروڑ روپیہ کی آمدنی ہوگی جس سے ان کے بجٹ کا گھاٹا پُر ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا ہے کہ ریلوے سہولیات میں اضافہ کرنے نئی لائنیں بچھانے اور ترقی کے دیگر کاموں کے لیے انھیں جو رقم چاہیے وہ اسے قرضوں یا دیگر ذرائع سے حاصل کریں گے صارفین پر کوئی بوجھ نہیں ڈالیں گے۔

اگر بجٹ تجاویز کو غور سے دیکھا جائے تو وزیر ریلوے نے کسی طبقے کو ناراض کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے لیے انھوں نے ۱۹ نئی ریل گاڑیاں چلانے کا بھی اعلان کیا ہے۔ دوسرے درجے کے عام ایکسپریس یا میل گاڑی کے سفر اور درجہ اول کے عام سفر کے کرایہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا بلکہ درجہ اول میں سفر کرنے کے لیے کم از کم ۳۲ روپے کرایہ کی شرط بھی نرم کرکے ۲۰ روپے کر دی ہے۔

ریل کے ذریعہ بھیجے جانے والے مال پر بھاڑہ سات فی صد بڑھا دیا گیا ہے۔ تاجر اور صنعت کار اس پر اعتراض نہیں کرتے کیوں کہ وہ یہ اضافہ اپنے مال کی قیمت میں جوڑ دیتے ہیں۔ لیکن مال بھاڑے میں اضافہ سرکاری ذرائع سے تقسیم کیے جانے والے اناج، چینی اور کیمیاوی کھادوں پر لاگو نہیں ہوگا۔ اس سے آبادی کے غریب طبقوں اور کسانوں کو شکایت نہیں ہوگی۔ وزیر ریلوے نے کہا ہے کہ افراطِ زر کی ۱۱ فی صد شرح سے ریلوے اخراجات میں اضافہ ہوا ہے لیکن وہ ریلوے صارفین پر صرف اتنا ہی بوجھ ڈال رہے ہیں جو ناگزیر ہے۔ انھوں نے صرف خسارہ پورا کرنے کے لیے کم از کم رقم حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزید آمدنی کے لیے ریلوے دیگر ذرائع تلاش کرے گی۔ ●

بقیہ: کمال کا آدمی

اپنے خیالوں میں گم گلی کے آخری سرے پر رک گئی تھی۔ شاید میرے انتظار میں اور میں خود سے پوچھ رہا تھا۔ بڑے دانا بنتے تھے۔ جینے کی یہ ادا کیسی رہی۔؟ قریب ہی سے ایک اور رخا تو تھی بڑی تیزی سے میرے پاس سے گزر گئی۔ شاید اسے بھی "جیوتشی مہاراج" سے ملنا تھا کچھ پوچھنا تھا۔●

نئے بجٹ میں

اقلیتوں کی بہبود کے لیے اقدامات

حکومت نے امسال کے مرکزی بجٹ میں اقلیتوں کی معاشی، تعلیمی و سماجی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے متعدد جامع اور ٹھوس اقدام کیے ہیں۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ مرکز کی جانب سے بجٹ ہٰذا میں اقلیتوں کے تعلق سے مرتب کی گئی تمام اسکیموں پر گزشتہ تین سالوں کی طرح موثر طریقے سے عمل درآمد کیا جائے تو ان کی پسماندگی میں نہ صرف نمایاں طور پر کمی آئے گی بلکہ وہ دوسری قوموں کی برابری کرنے میں کامیاب بھی ہو سکیں گی۔

مرکزی حکومت نے اقلیتوں کو قومی دھارے میں شامل کرنے اور تعمیر ملک میں برابر سے شریک کرنے کے لیے ان کی معاشی ترقی پر خصوصی توجہ دینے کی جانب ایک اہم عملی اقدام کیا ہے۔

۱۹۹۴ء میں یوم آزادی کے موقع پر وزیراعظم پی وی نرسمہا راؤ کے اعلان کے تحت اقلیتوں کے لیے قومی ترقیاتی و مالیاتی کارپوریشن قائم کیا گیا تھا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد اقلیتوں کی معاشی اور ترقیاتی سرگرمیوں کو فروغ دینا ہے۔ وزیر خزانہ نے اپنی بجٹ تقریر میں اعلان کیا کہ اس کارپوریشن کو ہونے والی آمدنی کو ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا جائے گا۔ مرکزی و ریاستی اقلیتی ترقیاتی و مالیاتی کارپوریشنوں کو دیے جانے والے عطیات پر انکم ٹیکس قانون کی دفعہ ۸۰ جی کے تحت رعایت دی جائے گی۔

اقلیتوں کی فلاح کے لیے قائم کیے گئے اس کارپوریشن کا منظور شدہ سرمایہ ۵۰۰ کروڑ روپیہ ہے۔ اس برس حکومت نے اس کارپوریشن کو ۵۰ کروڑ روپیہ کی رقم فراہم کی ہے۔

گزشتہ سال ایک خطیر رقم سے مولانا آزاد ایجوکیشنل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس نے اقلیتوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے اور اعلا تعلیم حاصل کرنے میں کافی معاونت کی۔ اس سوسائٹی کو اور زیادہ کارگر اور موثر بنانے کے لیے سرکار اپنے وعدے کی پابند ہے۔

——— اقلیتی طبقات کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے مئی ۱۹۹۲ء میں قومی اقلیتی کمیشن ایکٹ منظور کیا گیا تھا اور اس طرح سے اقلیتی کمیشن کو ۱۷ مئی ۱۹۹۳ء کو آئینی درجہ ملا اور جسٹس (سبکدوش) محمد سردار علی خاں کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔

آئینی درجہ ملنے کے بعد اس کمیشن کے اختیارات میں اضافہ ہوا ہے اور اس کا وقار بڑھا ہے۔ اب یہ کمیشن سرکاری افسران کو بھی اپنے روبرو طلب کر سکتا ہے۔ اس اختیار کے ملنے سے توقع ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں اپنی ذمہ داریوں سے تساہل برتنے والے سرکاری افسران کی باز پرس ہو سکے گی۔

——— ہندوستان میں لاکھوں کی تعداد میں غریب بنکر ہیں۔ ان کو بہتر حالات کے تحت سہولیات فراہم کر کے ان کی موجودہ پوزیشن کو بہتر بنانا سرکار کی ذمہ داری ہے اس طبقے کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا اور اس صنعت کی تجدید کرنے کے لیے جو سہولیات پہلے سے موجود ہیں اس کے علاوہ امسال کے مرکزی بجٹ میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ اس صنعت میں لگے ہوئے لوگ اب ضلع اور صوبائی کوآپریٹو بینک کے علاوہ کمرشیل بینک سے بھی مناسب شرح پر قرضہ جات ہینڈلوم صنعت فروغ کے لیے حاصل کر سکتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس اقدام سے ان کے معیار زندگی میں بہتری آئے گی۔

——— کھادی اور دیہی صنعتوں کے لیے ایک ہزار کروڑ کی خطیر رقم بجٹ میں مختص کی گئی ہے۔ یہ رقم ریاستی اور مرکزی حکومت کی گارنٹی، بینک ان صنعتوں کو دیں گے۔ اس کے استعمال سے ان صنعتوں میں لگے ہوئے لوگوں کے حالات بہتر ہوں گے اور کافی بڑی تعداد میں بے روزگار نوجوان روزگار حاصل کر پائیں گے۔

——— غریب بچوں کے لیے اسکولوں میں دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ جس سے بہت بڑی تعداد میں کمزور طبقے کے نونہالوں کو معیاری غذا فراہم کی جائے گی۔

۶۵ سال یا اس سے زائد عمر کے غریب افراد کو ۷۵ روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔

——— غریبی کی سطح سے نیچے لوگوں کے ہر کنبے کے ایک فرد کا ۵ ہزار روپے کا بیمہ کیا جائے گا۔ جس کی سالانہ قسط ۷۰ روپے ہوگی اور اسی قسط کی ۲۵ فی صد کی ادائیگی مرکزی سرکار اور ۲۵ فی صد صوبائی سرکار کرے گی۔ اس اسکیم کے نفاذ سے ان لوگوں میں تحفظ کا احساس پیدا ہوگا۔

مختلف النوع مقابلہ جاتی امتحانات میں بیٹھنے والے اقلیتی فرقوں کے کمزور طبقات کے امیدواروں کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن

۲۰ یونیورسٹیوں اور ۳۲ کالجوں کے توسط سے ایک کوچنگ اسکیم چلا رہا ہے۔

اردو مدارس کو جدید تعلیم سے قریب تر کرنے کی نیت سے سرکار نے انہیں کمپیوٹر فراہم کرنے کا انتظام کیا ہے اور جدید تعلیم سے متعلق اساتذہ پر جو اخراجات آئیں گے اسے عطیات کے ذریعہ پورا کیا جائے گا۔

اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیز کرنے اور غریبی دور کرنے کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان سے متعلق منصوبوں پر سختی سے عمل درآمد کرنے کے لیے سرکاری مشینری کو اور زیادہ چاق و چوبند اور بہتر بنانے کے لیے نئے اقدامات کیے جائیں اسی لیے سرکار نے ۶ نئے محکمے قائم کیے ہیں۔ ہر محکمہ وزیر مملکت کے تحت کام کرے گا۔ جس کی کارکردگی کی نگرانی کابینہ سطح کے وزیر کریں گے۔ محکموں کے نام حسب ذیل ہیں۔

شہری ترقی کی وزارت اب شہری امور اور روزگار کی وزارت کہلائے گی۔ اس وزارت کے تحت دو محکمے ہوں گے۔ پہلا شہری ترقی کا اور دوسرا شہری روزگار اور غریبی دور کرنے سے شہری روزگار اور انسداد غریبی کا محکمہ شہروں میں جھگی بستیوں کی بہتری پر خاص توجہ دے گا۔ یہ محکمہ وزیر اعظم کی روزگار یوجنا کی بھی نگرانی کرے گا۔

دیہی ترقی کی وزارت کا نام بدل کر دیہی علاقوں اور روزگار کی وزارت رکھا گیا ہے۔ دیہی روزگار اسکیموں اور دیہات میں بسنے والے افراد کے فلاح و بہبود کی دیگر اسکیموں کی بھی یہی محکمہ نگرانی کرے گا۔

وزارت صحت میں دیسی طبوں اور ہومیوپیتھی کا محکمہ قائم کیا گیا ہے۔ اس اقدام سے یونانی طریقہ علاج کو بالخصوص فروغ حاصل ہوگا اور اس پیشہ سے وابستہ افراد کی حوصلہ افزائی ہو سکے گی۔

غریبی دور کرنے کے پروگراموں سے متعلق

آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے سلسلے میں تفصیلات

(روپے ملین میں)

		مرکز	ریاستیں	مرکز کے زیر انتظام علاقے	میزان
۳/۱	دیہی علاقوں میں غریبی کم کرنا				
۳/۱/۱	کم سے کم ضروریات پروگرام	۰/۰	۷۲۱۵۱/۶۹	۲۱۶۶/۷۹	۷۴۳۱۸/۳۹
۳/۱/۲	سیلف امپلائمنٹ پروگرام	۴۹۵۰۰/۰	۲۸۶۶۴/۶	۱۰/۹	۷۸۱۷۵/۵
۳/۱/۳	وسیع امپلائمنٹ پروگرام	۱۸۴۰۰۰/۰	۵۲۴۴۸/۸	۰/۰	۲۳۶۴۴۸/۸
۳/۱/۴	ایریا ڈیولپمنٹ پروگرام	۰/۰۰	۶۷۵۰۱/۶	۰/۰۰	۶۷۵۰۱/۶
۳/۱/۵	اگررین ریفارمس پروگرام	۲۴۰۰/۰	۸۴۵۵/۴	۱۸/۸	۱۰۸۷۴/۲
۳/۱/۶	عوامی تقسیم کاری (سول سپلائز) ۹۹	۳۰۰/۰	۱۲۳۵/۰	۵۷/۲	۱۵۹۲/۲
۳/۱/۷	امپلائمنٹ ایسورنس اسکیم	۱۲۰۰۰/۰۰	۳۰۰۰/۰۰	۰/۰۰	۱۵۰۰۰/۰۰
۳/۲	شہری علاقوں میں غربت دور کرنا	۱۲۹۲۱/۰	۳۴۶۱۷/۳	۵۲۳۱/۵	۵۲۷۶۹/۸
۴/۰	فروغ انسانی پروگراموں کے ذریعے غریبی دور کرنا				

۴٫۱	آبادی و خاندانی بہبود	۶۵۰۰۰٫۰	-	-	۶۵۰۰۰٫۰
۴٫۲	خواتین اور بچوں کی فلاح	۲۳۷۳۰٫۰	۱۴۶۷۷٫۲	۱۴۴٫۹	۳۸۵۵۲٫۱
۴٫۳	کمزور طبقوں، درج فہرست ذاتوں/قبائلیوں اور پسماندہ ذاتوں وغیرہ کی ترقی	۲۵۴۹۴٫۲	۳۰۵۰۹٫۷	۳۵۰٫۹	۵۶۳۵۴٫۸

ہ صرف ۹۳-۱۹۹۲ء اور ۹۴-۱۹۹۳ء کے لیے مختص کیا گیا منصوبہ

ہ ہ غربا کو معقول قیمتوں پر اناج فراہم کرنے کی غرض سے غیر منصوبہ جاتی اخراجات کے تحت اشیار خوردنی پر مراعات کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس مد کے لیے ۹۵-۱۹۹۴ء کے بجٹ میں ۴۰۰۰۰ ملین روپے مختص کیے گئے ہیں۔

● برائے ۹۵-۱۹۹۴ء بہترین پروگرام کی ضرورت ہے۔

●● اطفال و خواتین کی ترقی کے لیے اس میں ۲۰۰۰۰ ملین روپے شامل ہیں۔

روزگار پیدا کرنے پر خاص توجہ

غریبی دور کرنے کے لیے روزگار کے نئے مواقع پیدا کرنا از حد ضروری ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں اسی مقصد کے پیش نظر روزگار کو یقینی بنانے کی اسکیم شروع کی گئی تھی تاکہ دیہی علاقوں کے غیر تربیت یافتہ افراد کو روزگار مل سکے۔ اس اسکیم پر ۲۶۱ اضلاع میں ۱۷۷۸ منتخب پسماندہ بلاکوں میں عمل در آمد ہو رہا ہے۔ اس اسکیم کو ۱۰۵ مزید پسماندہ بلاکوں میں عمل میں لایا جائے گا۔ اس اسکیم کا وسیع پیمانے پر استقبال ہوا ہے اور اب تک سولاکھ افراد اس اسکیم کے تحت اپنا نام درج کرا چکے ہیں۔ رواں مالی سال میں اس اسکیم کے لیے ۱۲سو کروڑ روپے دئیے گئے ہیں۔ جواہر روزگار یوجنا کے تحت بھی روزگار فراہم کرنے کے سلسلے میں کوششیں جاری ہیں۔ ●

بقیہ: دورِ جدید کے سائنس داں اور ہماری کہکشائیں

قطب شمالی میں یہ عجیب و غریب روشنی ۱۵۶۰ء میں اور قطب جنوبی میں ۱۷۷۳ء میں دیکھی گئی۔ یہ روشنی دراصل بالائی فضا میں سورج سے خارج ہونے والی برقی لہروں کی وجہ سے دیکھنے میں آئی ہے اور عموماً زمین پر انتہائی بلند مقامات پر ان کا نظارہ ممکن ہوتا ہے۔ بعض اوقات اَروار روشنیاں تقریباً ہر صاف تاریک رات میں قطبی علاقوں میں ۲۰ درجہ زاویہ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

سورج کتنا بڑا سیارہ ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ نظام شمسی میں سورج کو چھوڑ کر جتنے بھی سیارے ہیں وہ سورج کے وزن کا صرف ایک فی صد ہیں جب کہ ۹۹ فی صد سمیت یا وزن صرف سورج کے پاس ہے۔ یا یوں سمجھیں کہ ہماری زمین کا جو وزن ہے اس سے تقریباً تین لاکھ ۳۳ ہزار زیادہ وزن سورج کا ہے جب کہ سورج کا قطر ۸ لاکھ ۶۵ ہزار ۴۰ میل بتایا جاتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق سورج کے وسط کا درجۂ حرارت تقریباً ایک کروڑ ۴۵ لاکھ کیلوین (تھرمامیٹر کی پیمائش) ہے۔ جب کہ اس کا درمیانی دباؤ ایک ارب ۷۵ کروڑ ٹن بتایا جاتا ہے۔ سورج ایک سیکنڈ میں ۴۴ لاکھ ٹن ہائیڈروجن گیس جلا کر جو توانائی خارج کرتا ہے وہ تقریباً ۴ کھرب۔ کھرب واٹس بجلی کے توانائی کے مساوی ہے۔ سائنس دانوں نے یہ بھی تخمینہ لگایا ہے کہ سورج جس شرح سے توانائی خارج کر رہا ہے اس شرح سے دس کھرب سال تک سورج سے توانائی کا اخراج ممکن ہے۔ چوں کہ ان سائنس دانوں کے حساب کتاب کے مطابق سورج ۵ کھرب سال بوڑھا ہو چکا ہے اس لیے مزید ۵ کھرب سال تک اس کی تمازت اور روشنی اس طرح برقرار رہنے کا امکان ہے۔ سورج کتنا روشن ہے اس کا اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے تاہم آسانی سے سمجھانے کے لیے یہ مثال کافی ہوگا کہ ایک مربع انچ جگہ پر اگر دو لاکھ ۹۰ ہزار موم بتیاں روشن کی جائیں تو ان دو لاکھ ۹۰ ہزار موم بتیوں سے اس ایک مربع انچ جگہ پر جتنی روشنی پھیل سکتی ہے وہی روشنی سورج کے ایک مربع انچ سطح پر موجود ہے۔

سیارہ عطارد سورج سے اوسطاً ۳۶ لاکھ میل کے فاصلے پر مدار میں گردش کرتا ہے اور سورج کے گرد اس کا ایک چکر ۸۶ یا ۸۷ دنوں میں مکمل ہو جاتا ہے اس طرح گردش کے لحاظ سے یہ تمام سیاروں میں سب سے تیز رفتار ہے یہ سورج کے گرد ایک گھنٹے میں ایک لاکھ ۷ ہزار ۳۰ میل کی رفتار سے چکر کاٹ رہا ہے۔

زمین سے ہم برہنہ آنکھوں سے ۹ میں سے صرف ۵ سیاروں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں ان پانچ میں روشن ترین سیارہ زہرہ ہے۔ یورینس وہ سب سے پہلا سیارہ ہے جسے دوربین کی مدد سے ۱۳ مارچ ۱۷۸۱ء کو سر ولیم ہرشیل نے دریافت کیا تھا۔ اسے بھی بڑی مشکلوں سے آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ پلوٹو سیاروں کی فہرست کا سب سے آخری سیارہ ہے جس کی روشنی سب سے دیر میں زمین تک پہنچتی ہے۔ ●

ڈاکٹر سید شرافت حسین

ہندوستان کے ادائیگی توازن کا میلان؛ مثبت تبدیلی کے آثار

ریزرو بنک آف انڈیا کی حالیہ سالانہ رپورٹ میں ۱۹۹۳-۹۴ء کے دوران ملک کے ادائیگی توازن میں وارد نمایاں مثبت تبدیلی کے سال رواں ۱۹۹۴-۹۵ء میں بھی جاری رہنے کے تسلسل کے ساتھ رواں کھاتہ کے قلیل خسارے کے "فاضل" میں منقلب ہو جانے کی توقع کا اظہار کیا گیا ہے۔ ڈالر کی اصطلاح میں سال گزشتہ کے دوران ملکی برآمدات کی ۲۰ فی صد کے مساوی محکم نمو کے ۱۹۹۴-۹۵ء میں کم ہو کر ۱۵ فی صدی رہ جانے اور جزوی طور پر صنعتی سرد بازاری کے باعث درآمدات کی سست رفتاری کے معکوس ہو کر اس کی نمو در کے ۱۰ فی صد کے بقدر ہونے کی قوی امید ہے۔ لیکن چوں کہ امسال غیر مرئی آمدنی میں معقول ترقی ہونے کی توقع ہے، اس لیے رواں کھاتہ میں موافق توازن کے ظہور پذیر ہونے کا اندازہ ہے۔ دوسری جانب وفور پذیر بیرونی پورٹفولیو اصل کاری و نیز یوروپی اجراء کے سبب سے درآمد ہونے والے سرمایہ کے باعث اصل کے کھاتہ کے تئیں بیرونی کرنسی کے اثاثے میں افزونی کا میلان برقرار رہنا اغلب ہے۔

مذکورہ رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۳-۹۴ء میں بیرونی قرض کے مالیت میں بہت ہی معمولی اضافہ قلم بند ہوا ہے۔ چناں چہ قرض کے کبیر مظاہر۔ قرض و خام قومی پیداوار کے تناسب اور قرض واپسی کی خدمت کی نسبت — میں اصلاح ہوتی نظر آرہی ہے۔ اسی حقیقت کو بیرونی قرض کے بندوبست و نیز استواری کے لیے فاصل آب گردانتے ہوئے ریزرو بنک نے آگاہ کیا ہے کہ واقعتاً بیرونی مقروضیت، رواں کھاتہ کے توازن و نیز درآمد شدہ اصل کے مرکب کا تفاعل ہے۔ لہٰذا برآمدات میں ۱۵ فی صد کی نمو در رواں کھاتہ کے مثبت توازن کے لیے قطعی لازمی ہے۔ محض اس وقت کہ جب مذکورہ خسارے میں کمی وارد ہوتی ہے اور غیر قرض تخلیقی اصل کی درآمد کے ذریعہ سرمایہ فراہمی کی حاجت کی تکمیل کی جاتی ہے، تب ہی خام قومی پیداوار کے تناسب میں بیرونی قرض کے مزید ضبط کا امکان ہوتا ہے۔

سال مذکور کے دوران بھی ملک میں بیرونی اصل کی درآمد میں مستحکم رجحان جاری رہا۔ بالفاظ دیگر ۱۹۹۱-۹۲ء میں محض ۱۵۸ ملین ڈالر کے بقدر اور ۱۹۹۲-۹۳ء کے دوران صرف ۴۳۴ ملین ڈالر کے مساوی کے مقابلہ میں ۱۹۹۳-۹۴ء کے دوران ملک کے اندر بیرونی اصل کی روانی وفور پا کر ۴۱۱۰ ملین ڈالر وارد ہوئی۔ کل بیرونی اصل کاری میں بلاواسطہ اصل کا حصہ بہرحال بہت خفیف، یعنی صرف ۶۲۰ ملین ڈالر تھا حالاں کہ پیوستہ سال کے بالمقابل اس میں صد فی صد کا اضافہ درج ہوا ہے۔ مابقی ۳۴۹۰ ملین ڈالر کی پورٹفولیو اصل کاری میں عالمی امین رسیدات (جی ڈی آر) اور بیرونی ادارہ جاتی اصل کاری علی الترتیب ۱۴۶۰ ملین اور ۱۶۶۵ ملین ڈالر کے مساوی خاصے بڑے حصہ کی شراکت کی ذمہ دار ہیں۔

بیرونی زرمبادلہ کے محفوظ میں مسلسل اضافہ کی برقراری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ریزرو بنک نے تلمیحاً کہا ہے کہ بین الاقوامی زرفنڈ (آئی ایم ایف) کو پیشگی باز خریدی کے طور پر ادائیگی کرنے، ادا بدلی کے مشمولات ختم کر دینے و نیز عوامی زمرہ کے واجبوں کے تئیں وارد واجبات کی تعمیلی کرنے اور بیرونی کرنسی غیر رہائشی امانت کھاتہ (ایف سی این آر اے) کی اسکیموں کے تئیں ادائیگیوں کی تکمیل کرنے کے باوجود یہ وفور قائم رہا ہے۔ مذکورہ صورت حال درونکی بیرونی مبادلہ بازار میں فاضل زرمبادلہ کی دستیابی کی عکاس ہے۔ چناں چہ بیرونی مبادلہ کی وضع میں تبدیل کیفیت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے یہ تشریح کی گئی ہے کہ مارچ ۱۹۹۴ء کے اختتام پر مبادلی اثاثے ۶ر۷ ماہ کی درآمد کے لیے کافی ہیں، جب کہ ۱۹۹۰-۹۱ء میں درآمدی سپر محض ایک ماہ کے لیے مکتفی تھی، جو ۱۹۹۱-۹۲ء و نیز ۱۹۹۲-۹۳ء میں بڑھ کر تین مہینوں سے قدرے زائد مدت کی ضرورت کے مطابق ہو گئی تھی۔

بہر نوع ریزرو بنک نے اپنی رپورٹ میں اس ضمن میں بر محل ہدایت دی ہے کہ درآنحالیکہ بیرونی زرمبادلہ کے محفوظے و نیز درآمدات کا تناسب رفیع نظر آتا ہے، تاہم تجارت اور ادائیگی کے ایک کشادہ نظام کے تحت نسبتاً بلند تر درآمدی سپر رکھنا ہی مصلحت اندیشانہ اقدام ہوگا۔ مزید یہ کہ دیگر ترقی پذیر ممالک کے ساتھ تقابل کرنے پر ہمارے محفوظے محض واجبی دکھائی دیتے ہیں۔ اصولاً کسی معیشت میں محفوظے کی مستحکم وضع اس کے تئیں بین اقوامی اعتماد کی حمایت کرتی ہے اور اس کی اضافہ پذیر بین اقوامیت و نیز کشادگی کی جانب رہنمائی بھی کرتی ہے۔ چناں چہ محفوظے کے ٹھوس نمو اور ادائیگی توازن میں بہتری نے ہندوستان کو رواں کھاتہ کی ادائیگیوں کو مخلصی عطا کرنے، رواں کھاتہ کے تئیں مکمل تبدّل کو رائج کرنے اور اس ضمن میں بین اقوامی زرفنڈ کی دفعہ سات کی حیثیت عرفی کو

ریڈر اینڈ ہیڈ آف دی اکونامکس ڈپارٹمنٹ، جواہر لال نہرو میموریل پوسٹ گریجویٹ کالج۔ بارہ بنکی (یوپی)

۲۰ اگست ۱۹۹۴ء کی تاریخ سے منظور کر لینے کی جانب آمادہ کیا ہے۔

۹۴-۱۹۹۳ء کی بابت فوری تخمینے ہندوستان کے ادائیگی توازن کے رواں و نیز اصل کے کھاتوں میں معرکہ کی اصلاح کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ریزرو بینک نے اپنی گزشتہ رپورٹ میں سال مذکور کے تئیں رواں کھاتہ میں ۴ر۹ بلین ڈالر کے بقدر خسارے کی پیشین گوئی کی تھی، لیکن ساتھ ہی اس امید کا بھی اظہار کیا تھا کہ اگر ملکی برآمدات میں ۲۰ فی صد کی نمو در برقرار رہ پاتی ہے تو یہ خسارہ کم بھی ہو سکتا ہے۔ ایک اعتبار سے اس توقع کی تکمیل ہو گئی ہے۔ اس حقیقت کے شانہ بشانہ بیرونی زرمبادلہ کے محفوظے میں تیز رد وفور نے ۳۱ مارچ ۱۹۹۴ء کو ختم ہوئے سال کے تئیں ملک کے ادائیگی توازن کے مناظرنامہ کو تمثیلی انداز سے تبدیل کر دیا ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء کے ۳۶۰۳ ملین ڈالر کے بالمقابل ۹۴-۱۹۹۳ء میں ملک کے رواں کھاتہ کا خسارہ بہت ہی کم، یعنی صرف ۳۱۵ ملین ڈالر کے بقدر واقع ہوا۔ اس پُراثر تغیر کلی کے لیے دراصل مال وجنس کی تجارت میں منکسر سا خسارہ اور غیر مرئی آمدنی میں معتدل اضافے کی ممد جواب دہ رہی۔ حالاں کہ رپورٹ میں مکمل تفصیلات نہیں دی گئی ہیں، تاہم اس کے متن میں سیاحت سے حاصل آمدنی، نقل وحمل سے وصول شدہ کمائی اور بیمہ رسیدات میں قرین مصلحت معاش کے حصول کا حوالہ ہے۔ علاوہ ازیں شخصی متبادل رسیدات کو بازار میں متعین درمبادلہ کے نظام و نیز بہتر بنکی خدمات سے مہیا ہونے والی ترغیب کے باعث بھی ملک کی غیر مرئی آمدنی میں وفور سے اضافہ ہوا ہے۔ نتیجتاً ۹۳-۱۹۹۲ء کے ۲ر۲ فی صد کے مقابلہ میں ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران ملک کے رواں کھاتہ کا خسارہ خام قومی پیداوار کے تناسب کے اعتبار سے صرف ۱ر۰ فی صد ہی کے حساب سے وارد ہوا۔ لیکن جہاں تک ادائیگی توازن کے اصل کے کھاتہ کا معاملہ ہے، اس میں بڑے ترکیبی تغیرات رونما ہوئے ہیں، بہ معنی ایں کہ ملک میں غیر ملکی امداد کی خالص روانی و نیز تجارتی قرضوں میں تعریف قلم بند ہوئی ہے۔ ملک میں طویل المدتی اصل کی روانی محض ۵ر۲ بلین ڈالر کے مساوی ہوئی۔ لیکن اس تخفیف کی تلافی ۴ بلین ڈالر سے بھی مستزاد وسیع بیرونی اصل کاری کی درآمد سے ہو گئی۔ مجموعاً ملک کے ادائیگی توازن کے رواں کھاتہ میں نمایاں اصلاح اور ۸ر۹ بلین ڈالر کے بقدر خالص اصل کی روانی کے زیر اثر ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۸ر۷ بلین ڈالر کے مساوی فاضل وارد ہوا، جب کہ ۹۳-۱۹۹۲ء کے دوران ۵۶۰ ملین ڈالر کا خسارہ ہوا تھا۔

سال گزشتہ بیرونی قرضے کے معاملہ میں حالات نے بہتری کی جانب رخ بدلا، اس لحاظ سے کہ مذکورہ سال کے دوران اس میں صرف ۶۴۴ ملین ڈالر کے مساوی معمولی سا فروغ ہوا، جب کہ ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۸ بلین ڈالر کے بقدر بلندترین اضافہ ہوا تھا اور اس کے بعد کے دونوں برسوں کے دوران کل قرض میں ہر سال اوسطاً ۳ بلین ڈالر کی افزونی ہوئی تھی۔ مزید برآں پیوستہ سال کے ۴۶ فی صد کے مقابلہ میں ۹۴-۱۹۹۳ء میں مجموعاً رعایتی بیرونی امداد کا حصہ بڑھ کر ۴۸ فی صدی ہو گیا اور قلیل المدتی قرضے ماقبل کے سال کے ۷ فی صد کے بالمقابل کم ہو کر صرف ۴ فی صدی کے بقدر رہ گیا۔ چناں چہ خام قومی پیداوار کے تناسب کے اعتبار سے ملک کا بیرونی قرض ایک سال قبل کے ۴۰ فی صد سے گھٹ کر ۵ر۳۳ فی صدی کے مساوی رہ گیا اور کل قرض و نیز اس کی خدمت کا تناسب بھی ماقبل کے سال میں ۶ر۳۰ فی صد سے خفیف ہو کر ۱ر۲۵ فی صدی تک پہنچ گیا۔ ملک کا کل بیرونی قرض بھی ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۸۹۹۸۶ ملین ڈالر سے بڑھ کر محض ۹۰۶۳۰ ملین ڈالر ہی ہوا۔ بالفاظ دیگر مجموعی اعتبار سے ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران ملک کے اداشدنی بیرونی قرض میں بے حد معمولی اضافہ کا ورود اور قرض کی سطح سے متعلق منظرنامہ میں معنی خیز اصلاح دو ایسی قابل ذکر تبدیلیاں ہیں جن کے تئیں رپورٹ میں صریحی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سال مذکور کے دوران کل امداد کا استعمال فی الواقع ۹۳-۱۹۹۲ء کی ہی سطح پر ۳۵۹۴ ملین ڈالر کے بقدر عیاں ہوا لیکن بے باقی کے بعد ملک میں بیرونی امداد کی خالص روانی بہت قلیل، یعنی صرف ۱۵۴۱ ملین ڈالر ہی رہی۔

مذکورہ رپورٹ میں ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران ملک کے ادائیگی توازن میں وارد مثبت تبدیلیوں کے مناظرنامہ اور اس میلان پر مبنی ۹۵-۱۹۹۴ء کے بارے میں تحلیل کے پس منظر میں سال رواں کے دوران ملک کی بیرونی تجارت و نیز ادائیگی توازن کے ضمن میں واقعاتی ماجرا بہرحال قابل توجہ ہے تاکہ سال گزشتہ کے دوران وارد مثبت و نیز خوش آئند تبدیلیوں کو رواں سال کے اختتامی دور میں اور آئندہ مالی سال میں مزید استحکام و نیز تیز روی فراہم کی جا سکے۔ اجمالاً ملکی درآمدات اکیلے نومبر ۱۹۹۴ء میں ہی ۶ر۳۴ فی صد کی در سے وفور پا گئے، جس کے باعث سال رواں کے دوران ملک کے تجارتی خسارے میں ۹۶ر۱۶۶۱ ملین ڈالر کے بقدر اضافہ ہو گیا۔ محض نومبر ۱۹۹۴ء میں ملکی درآمدات ۳۴ر۲۲۱۳ ملین ڈالر کے مساوی قیمت کے ہوئے اور ملک کا درآمدی بل مجموعاً بڑھ کر ۱۰ر۱۷۶۰۳ ملین ڈالر تک اضافہ کر گیا، یعنی اپریل تا نومبر ۱۹۹۳ء کی مدت کی سطح کے ۱۲ر۱۴۳۲۷ ملین ڈالر کے اوپر ۴۸ر۲۲ فی صدی کا اضافہ۔ یعنی مذکورہ مدت میں ملک کا تجارتی خسارہ ۱۹۹۳ء کی جوابی مدت کے ۵۷ر۵۳۲ ملین ڈالر کے بالمقابل افزوں ہو کر ۹۶ر۱۶۶۱ ملین ڈالر کے بقدر ہو گیا۔ درآنحالیکہ وزارت تجارت کے بقول ملک کے زرمبادلہ کے موجودہ محفوظے کی سطح کے مدنظر یہ تجارتی خسارہ فرمان پذیر حدود کے اندر رہے، تاہم برآمدات کو تقویت دینا اس لیے لازمی ہے تاکہ اضافہ پذیر درآمدات کی حاجت کی تکمیل ہو سکے اور ساتھ ہی ساتھ ملک کا تجارتی خسارہ خوش لگام بھی رہے۔ علیٰ ہذالقیاس اپریل تا نومبر ۱۹۹۴ء کے تعلق سے ملکی درآمدات کے اعداد وشمار کے تجزیہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ درآمدات کا یہ وفور بنیادی طور پر غیر پٹرول اشیاء کی درآمد میں وارد ۴۱ر۳۲ فی صد کی شرح سے اضافہ کی وجہ سے واقع ہوا ہے، کیوں کہ سال رواں کی مدت مذکور میں پٹرول، معدنی تیل و نیز مدہن کی درآمد کی قیمت ۶۵ر۳۶۹۴ ملین ڈالر آنکی گئی ہے، جب کہ سال گزشتہ کی جوابی مدت کے دوران ان کی درآمد کی مالیت ۰۹ر۳۸۴۸ ملین ڈالر تھی، یعنی اس مد میں ۴ فی صدی کی تعریف ہو گئی۔ دوسری جانب مدت مذکور کے دوران ملک میں ۵۵ر۷۴۶ ملین ڈالر کی قیمت کے شکر، ۸۲ر۷۶ ملین ڈالر کے بقدر خوردنی تیل اور ۸۴ر۲۵۸ ملین ڈالر کے مساوی مالیت کے ہوائی جہاز ناگہانی ضرورت کے تحت درآمد کیے گئے۔ بہرحال ان اشیاء کی قیمت مجموعی درآمدی بل کے صرف ۴ فی صد کے ہی مساوی تھی۔

اس کے برعکس تن تنہا نومبر ۱۹۹۴ء کے دوران برآمدات کی نمو میں بھی ۸ر۱۸ فی صدی در سے

شگفتگی آئی اور اسی بنا پر اپریل لغایتہ نومبر ۱۹۹۴ء کے مقابلہ میں امسال کی جوابی مدت میں ملکی برآمدات کی نمو در مستزع ہو کر ۱۵٫۱۸ فی صدی ہو گئی۔ بالفاظ دیگر اکیلے نومبر ۱۹۹۴ء میں ملکی برآمدات ۱۵٫۱۹۹۹ ملین ڈالر کے بقدر عیاں ہوئے اور اپریل لغایتہ نومبر ۱۹۹۴ء کی پوری مدت کے دوران ان کی قیمت ۱۵۴۴۰٫۵ ملین ڈالر تخمینہ کی گئی ہے۔ ملک کے مذکورہ تجارتی اعداد و شمار کے تئیں اپنی تخمین میں وزارت تجارت نے دعوی کیا ہے کہ متعلقہ مدت میں برآمدات کے نمو کی پیہم دہائی در گورنمنٹ کارروائی کے متوقع مثبت اثرات کی مظہر ہے۔ اضافتاً برآمدات کی مذکورہ غیر منقطع نمو در اصل ملکی معیشت کی کشادگی کا انعکاس تصور کی جا رہی ہے مستقبل قریب کے بارے میں تجارتی ماحول کے تئیں وزارت تجارت کا خیال ہے کہ وبائی طاعون کے پھوٹ پڑنے کے بعد چند ممالک کے ذریعہ ہندوستانی اشیار کی درآمد پر جو پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں وہ اب عموماً ہٹا دی گئی ہیں اور اس لیے ہندوستانی برآمدات کے تئیں ماحول نہایت ہی ساز گار ہے۔

بہر نوع حال میں (۱۰ دسمبر ۱۹۹۴ء کو ختم ہوئے ہفتہ کے تھوک قیمتوں کے عارضی اشاریہ پر مبنی) نقطہ بہ نقطہ افراط زر میں اضافہ کی سالانہ ۱۰ فی صدی سے بھی متجاوز کر گئی ہے، جس کے باعث روپیہ کی کم قدری کے مابعد کے مساعد اثرات عموماً زائل ہو چکے ہیں، خصوصاً ہندوستان کے تجارتی شرکا ممالک میں نسبتاً کہیں پست افراط زر کے پس منظر میں۔ چناں چہ ملکی برآمدات کی نمو اور حقیقی شرح مبادلہ کے مابین نسبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے روپیہ کی مبادلی در پر کڑی نگاہ رکھنا عین دقیقہ رس ہوگا۔

در اصل جب سے موجودہ مرکزی گورنمنٹ نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی اور جولائی ۱۹۹۱ء میں "نئی اقتصادی پالیسی" شروع کی، تب ہی سے اقتصادی کشادگی و نیز نرم کاری کے بے صبر جوشیلے حامیٔ ہندوستانی پالیسی سازوں سے "تدریجیت" میں وقت نہ ضائع کر کے میکسیکو سے سبق لیتے ہوئے زیادہ دلیرانہ اور حوصلہ مند طریقۂ علاج اختیار کرنے پر مصر رہے ہیں۔ لیکن آج مالی حباب کے طوفانی انداز سے پھٹ جانے کے بعد جب میکسیکو کا حیرت انگیز نمو نہ ڈگمگا گیا ہے تو ہندوستانی پالیسی سازوں نے یقیناً اطمینان کی سانس لی ہوگی کہ معاشی جوکھوں میں پڑنے کے بجائے وہ وزیر اعظم کے محفوظ "درمیانی راستے" پر جمے رہنے کے تئیں راغب رہے۔ درآنحالیکہ بہت سے لوگوں کے نزدیک "میکسیکو کا نمونہ" ہندوستان کے لیے قابل تقلید تھا، تاہم ملک نے تیز گام سواری کے ہیجان سے پرہیز کر کے قسمت آزمائی کی افتاد سے اپنے آپ کو بچا لیا۔ مجازاً میکسیکو کے موجودہ اقتصادی بحران کا بین سبب یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنی خام قومی پیداوار کے ۸ فی صد کے بقدر رواں کھاتہ کے خسارے کے ساتھ گزارہ کرتا رہا ہے۔ ہندوستان کو بہر حال اپنی خام قومی پیداوار کے محض ایک فی صد کے مساوی ہی رواں کھاتہ کا خسارہ درپیش ہے۔ یہی نہیں اپنے ادائیگی توازن کے بحران کے عروج کے وقت اوائل ۱۹۹۱ء میں بھی ہندوستان کے رواں کھاتہ کا خسارہ اس کی خام قومی پیداوار کے تناسب کے اعتبار سے تقریباً ۳ فی صد ہی رہا تھا۔ گو کہ ہندوستان کی بیرونی تجارت اس کی خام قومی پیداوار میں بہت ہی قلیل حصہ کی مد فراہم کرتی ہے اور ملکی برآمدات بھی کسی خاص اہمیت کے ضامن نہیں ہیں، تاہم یہ عین مصلحت ہے کہ ہندوستان اپنے رواں کھاتہ کے خسارے کو تاکید میں رکھے۔

لیکن سال رواں کے دوران ماہ بہ ماہ ملکی برآمدات کے بالمقابل اس کی درآمدات میں اضافہ کی رفتار نسبتاً تیز تر ہوتی جا رہی ہے اور اس وجہ سے اس کی بیرونی تجارت کا خسارہ متواتر اضافہ پذیر ہے۔ مثلاً سال گزشتہ کی جوابی مدت کے مقابلہ میں موجودہ مالی سال کے اوائلی ۸ مہینوں میں ہندوستان کے برآمدات کی نمو در ۱۵٫۱۸ فی صد اور اس کی درآمدات کی نمو در ۲۲٫۵ فی صدی وارد ہوئی ہے۔ جب کہ اگر اپریل لغایتہ اکتوبر ۱۹۹۴ء سے متعلق اعداد و شمار پر نظر ڈالی جائے تو اس مدت پر مبنی سالانہ نمو در برآمدات کے معاملہ میں ۱۳٫۹۲ فی صد اور درآمدات کے ضمن میں ۱۹٫۸ فی صدی واقع ہوئی تھی۔ اسی طرح اگر اپریل لغایتہ ستمبر ۱۹۹۴ء کے میلان پر غور کیا جائے تو برآمداتی نمو در ۱۲٫۳ فی صد اور درآمدات میں اضافہ کی در ۱۷٫۴ فی صدی عیاں ہوئی تھی۔ لیکن اپریل لغایتہ اگست ۱۹۹۴ء کی بابت تخمینے برآمدات اور درآمد کی سالانہ نمو در بالترتیب ۱۰٫۶ اور ۱۴٫۴ فی صدی ظاہر کرتے ہیں۔ نتیجتاً اپریل تا اگست ۱۹۹۴ء کی مدت میں ہندوستان کا تجارتی خسارہ ۷۹۹ ملین ڈالر ہوا تھا، جب کہ ۱۹۹۳ء کی جوابی مدت میں یہ خسارہ محض ۴۰٫۷ ملین ڈالر ہی کے مساوی تھا۔ لیکن اپریل لغایتہ ستمبر ۱۹۹۴ء میں یہ خسارہ ۱۲۳۰ ملین ڈالر ہو گیا بہ مقابلہ سال گزشتہ کی اسی مدت کے ۵۹۳ ملین ڈالر کے۔ اس کے برعکس اپریل سے اکتوبر ۱۹۹۴ء کے دوران سال گزشتہ کی جوابی مدت کے بالمقابل ملک کا تجارتی خسارہ تقریباً دوگنا ہو کر ۱۳۹۰ ملین ڈالر کے بقدر وارد ہوا اور اپریل تا نومبر ۱۹۹۴ء کے دوران گزشتہ سال کی اسی مدت کے ۵۳۲٫۵ ملین ڈالر کے برعکس ملک کا تجارتی خسارہ بڑھ کر ۱۶۶۱٫۹ ملین ڈالر کے مساوی تک پہنچ گیا ہے۔ چناں چہ یہ ضروری ہے کہ ہندوستان اپنے برآمدات کی نمو در میں تیز روی لانے کی غرض سے تمام ممکنہ اقدام عمل میں لائے خصوصاً ہندوستان کے لیے اپنے روپیہ کی بیش قدری پر سخت تاکید کرنا اور ملک کے اندر قیمتوں کی عام سطح پر کڑی نگرانی رکھنا لازمی ہے۔ روپیہ کی بیش قدری پر تاکید کی غرض سے اس کو اپنے وفور پذیر زر مبادلہ کے محفوظہ کا موزوں و مناسب بندوبست کرنا اور اسی کے شانہ بہ شانہ روپیہ کے مکمل آزادانہ تبدل کے تئیں جبر و ضبط کی پالیسی اختیار کر کے آہستہ روی سے کام کرنا عین مصلحت ہوگا۔ دوسری جانب قیمتوں کی عام سطح پر لگام لگانے کی غرض سے عوامی زمرہ میں پیدا شدہ اشیار و نیز اس کے ذریعہ مہیا کی جانے والی خدمات کی نفاذی قیمتوں اور زراعت و صنعت میں استعمال ہونے والے درآیدے کی قیمتوں اور اجرتوں میں اضافہ کی جبراً ہمت شکنی کرنے سے بھی گریز نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے برخلاف مرکزی گورنمنٹ نے زرعی لاگت و نیز قیمت کے کمیشن (سی اے سی پی) کی سفارش کے مطابق گزشتہ نومبر ۱۹۹۴ء میں خریف کی فصلوں کے لیے سہارا قیمت میں اوسطاً ۹٫۲۵ فی صد اور ربیع کی فصلوں کی سہارا قیمت میں اوسطاً ۲٫۵ سے ۴٫۷ فی صدی و نیز گنے کی قیمتوں میں ۲۵٫۰ فی صدی کا اضافہ کیا۔ نتیجتاً تھوک قیمتوں کے عارضی اشاریہ میں، "ابتدائی اشیار" کے کبیر گروپ کے اشاریہ میں افزونی کے باعث، اضافہ وارد ہوا اور تب ہی سے (۱۹ نومبر ۱۹۹۴ء سے) افراط زر میں

اضافہ کی سالانہ در تدریجاً وفور پذیر ہوگئی اور ۱۸ ہفتوں تک اکائی ہندسوں میں رہنے کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۹۴ء کو اختتام پذیر ہفتہ کے اشاریہ پر منحصر یہ در ۰۲ء۱۰ فی صدی سالانہ ہوگئی۔ حالاں کہ افراط زر میں اضافہ کی در ۱۷ دسمبر ۱۹۹۴ء کو دہائی ہندسوں میں رہ کر بعد کے دو ہفتوں کے اختتام، یعنی ۲۴ اور ۳۱ دسمبر ۱۹۹۴ء کو پھر اکائی کے ہندسوں (یعنی علی الترتیب ۷ء۹، اور ۹۶ء۹ فی صدی) میں وارد ہوئی، تاہم ۷ جنوری ۱۹۹۵ء کو ختم ہوئے ہفتہ میں اپنی دہائی ہندسوں کی روش پر پلٹ کر ۴۷ء۱۰ فی صدی عیاں ہوئی ہے۔ مذکورہ رجحان معیشت کی مثبت صحت کے تئیں خطرے کی گھنٹی ہے۔

میکسیکو کے حالیہ بحران سے ہمارے ملک کے لیے ایک دیگر انتباہ بھی ماخوذ ہے کہ کسی نازک توازن ادائیگی والی معیشت کو اصل کاری کے بدل میں صارفی اشیاء کی درآمد کو تیز روی سے آزادی و نیز کشادگی عنایت کرنے اور اس نہج پر صرفے کی اعانت کرنے سے ہمیشہ گریز کرنا چاہیے۔ علیٰ ہذا القیاس اسی ماخوذہ کی تائید میں ملکی تجارت کو کشادگی اور آزادی عطا کرنے کے تمام اقدامات کے باوجود ہندوستانی گورنمنٹ نے ابھی تک صارفی اشیاء کی درآمد کے لیے اپنے تامینی حصار کو نہ ہٹا کر گویا اپنے تجارتی خسارے کی تاکید کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ باوجود اس کے قابل مشاہدہ یہ ہے کہ موجودہ سال کے اس موقع پر و نیز آئندہ مالی سال کے دوران صارفی اشیاء کی درآمد کو فراغت عطا کرنے کے تئیں گورنمنٹ میں موجود چند ہمنواؤں اور صنعت و نیز صارفین کی لابی کی دلیلوں اور ان کی کوششوں کی مزاحمت کرنے میں وزیر مالیات کس حد تک کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی مزاحمانہ کارروائی کی کامیابی یا اس کے عدم پر ہی ملکی توازن ادائیگی کے رواں کھاتہ کے وفور پذیر خسارے کی تاکید و نیز روپیہ کی قدر کے استحکام کی کامرانی کا انحصار ہے۔

لیکن بہرحال اب بھی میکسیکو کے ساتھ مماثلت موجود ہے۔ ہندوستان کے زر مبادلہ کے محفوظے قلیل المدتی مالیاتی آمد و نیز بیرونی قرض کاری سے ازدیاد ہوئے ہیں نہ کہ بیرونی بلاواسطہ اصل کاری یا برآمدات کی نمو کے ذریعے۔ مزید یہ کہ اب تو موجودہ مالی سال میں پہلی بار ملک کے مبادلی محفوظے دسمبر ۱۹۹۴ء میں ۴۰۰ ملین ڈالر کے بقدر کم ہوگئے ہیں اور ۱۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو سونا اور خصوصی حقوق استخراج (ایس ڈی آر) کے علاوہ ریزرو بینک آف انڈیا کے پاس زر مبادلہ کے محفوظے آخر اکتوبر ۱۹۹۴ء کے ۹۵ء۱۹ بلین ڈالر کے بالمقابل کم ہو کر ۴۲ء۱۹ بلین ڈالر کے مساوی رہ گئے ہیں۔ یوروپی اجراء کی حاصلات کی ہندوستان میں ترسیل کی بابت ترمیم شدہ اصول کار اور تجارت کے مرتفع خسارے کی وجہ سے اب ملکی زر مبادلہ کے محفوظے میں افزونی نسبتاً سست در سے ہونے کی توقع ہے۔ نتیجتاً سال رواں کے اختتام پر ملکی محفوظے کی بابت ماقبل میں کی گئی ۲۵ بلین ڈالر کی تخلیل کو اب صرف ۸ء۲۱ بلین تک کم کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں روپیہ اور ڈالر کی ہم سطحی کو ۳۷ء۳۱ روپے فی ڈالر پر قائم رکھنے کی غرض سے ملکی زر مبادلہ بازار میں ریزرو بینک آف انڈیا ڈالر کی جو گرانبار خریداری کرتا رہا تھا اُس کو ترک کر کے دسمبر ۱۹۹۴ء کے دوران اس نے ڈالر کی کوئی خریداری نہیں کی۔ اس وجہ سے ہندوستانی تیل کارپوریشن کی حاضر ڈالر کے تئیں پرشور حاجت کے باعث ۱۹ دسمبر ۱۹۹۴ء کے تجارتی اجلاس کے دوران ڈالر کے تقابل میں فی الواقع روپیہ کمزور پڑ گیا ہے۔ بہرحال دسمبر ۱۹۹۴ء کے دوران ڈالر کے تقابل میں روپیہ کی اوسط قدر زیادہ تر ۳۷ء۳۱ روپے فی ڈالر کی در پر ہی استوار رہی، جب کہ برطانوی پاؤنڈ کے مقابلہ میں اس کی قدر ۱ء۲ فی صد، جرمن مارک و نیز جاپانی ین کے خلاف ۴ء۲ فی صد کے بقدر بڑھ کر علی الترتیب ۸۶ء۴۸ روپے فی پاؤنڈ، ۹۴ء۱۹ روپے فی مارک اور ۳۲ء۳۱ روپے فی ین ہو گئے۔ اس وجہ سے اغلب ہے کہ برطانیہ، جرمنی اور جاپان کے ساتھ ہندوستان کے توازن ادائیگی کے رواں کھاتہ میں ناموافقت میں شدت وقوع پذیر ہوگی۔

چناں چہ جب تک برآمداتی کمائی اور بیرونی بلاواسطہ اصل کاری کے ذریعہ ملک میں زر مبادلہ کا خاصا وسیع ذخیرہ نہیں ہو جاتا، تجارت و نیز شرح مبادلہ دونوں ہی محاذوں پر ایسی کوئی پالیسی اختیار کرنا کہ جس کی وجہ میکسیکو کی مانند تیز روی سے سرمایہ فراری واقع ہو، بہت ہی خطرناک ثابت ہوگا۔ اس ضمن میں یہ نہایت ہی اہم ہے کہ زر مبادلہ کماؤ بیرونی کرنسی کھاتوں کے کھولنے و نیز ان میں موجود سرمایہ کے استعمال کے معاملہ میں عائد پابندیوں میں فراغی عطا کرنے سے متعلق وزارت مالیات کا منقول فیصلہ درحقیقت "اصل کے کھاتہ" کے تئیں روپیہ کے آزادانہ تبدل کی جانب ایک بیّن قدم کے مترادف ہے۔ بلکہ اسی کے شانہ بہ شانہ زر مبادلہ بازار میں کارپوریٹ اکائیوں کو ریزرو بینک آف انڈیا و نیز وزارت مالیات دونوں سے ہر انفرادی سودے کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد تجارتی بینکوں کے ساتھ ڈالر / روپیہ مبادلہ کے سودے کرنے کی اجازت بھی عنایت کی گئی ہے۔ اس اقدام کے باعث ہندوستانی زر مبادلہ بازار میں تخمین بازی کا عنصر شامل ہو گیا ہے، کیوں کہ اب بینکوں و نیز کارپوریٹ اکائیوں کا ماحصل مبادلی شرح اور ملک کے اندر و نیز باہر سود کی دروں کی حرکت پر منحصر کرے گا۔ چناں چہ جب سے وسط دسمبر ۱۹۹۴ء میں میکسیکو کے معاشی بحران کا ورود ہوا ہے ہندوستانی بازار حصص میں کم و بیش سٹہ فروش بازاری کا رجحان پیدا ہے کیوں کہ بین اقوامی سطح پر سرمایہ کے انتظام کار سراسیمہ ہو کر ہندوستان اور اس جیسے دیگر بازار اصل (جو میکسیکو کے مماثل ہیں) سے اجتناب کر رہے ہیں۔ چناں چہ ہندوستانی بازار اصل میں حصص کی قیمتوں کے حساس اشاریہ میں تب ہی سے مسلسل زوال پذیری کا میلان ہے۔ عالمی امین رسیدات کی قیمتوں میں قرار یافتہ اُتار، امریکی وفاقی محفوظ نظام (ایف آر ایس) کے ذریعہ سود کی شرح میں کیے گئے اضافہ سے متاثر ہو کر بیرونی اصل کاروں کا ایکویٹی کو بانڈس میں تبدیل کرنا اور ملک کی حالیہ سیاسی غیر یقینیت ہی موجودہ صورت حال کے لیے ذمہ دار ہیں۔ بہر نوع اس درمیان کبھی کبھی حصص کی قیمتوں کے حساس اشاریہ میں جو بحالی آجاتی ہے اس کا سبب بازاری عوامل نہ ہو کر ادارہ جاتی دستگیری ہے، جو بہرحال دوامی نہیں ہو سکتی۔

لہٰذا میکسیکو میں "بڑے دھکے" کی کشادگی و نیز نرم کاری کی معالجاتی پالیسی کے لزوم کے طور پر وہاں کے بازار مالیہ و اصل میں جو افراتفری ہے اور بیرونی ادارہ جاتی اصل کاری کی شکل میں "گرم زر" کی جو فراری ہے، اس منظر نامہ میں ہندوستان کے لیے چند اشارے مضمر ہیں: (۱) ہندوستان کو فی الوقت صارفی اشیاء کی درآمد کو فراغت عطا نہیں کرنا چاہیے بلکہ حقیقی اصل کاری کی زائد نمو کے حصول پر ہی ہمہ تن متوجہ رہنا چاہیے۔ (۲) اس کو

باقی صفحہ ۴۶ پر

برآمداتی مالیہ

حکومت نے اقتصادی پالیسی کو آسان بنانے کی جو حکمت عملی اختیار کی ہے، اس کے مطابق، اس نے برآمدات کرنے والے لوگوں کے لیے مالیہ اور قرض کی آسانی سے دستیابی کو یقینی بنانے کے سلسلے میں متعدد اقدامات کیے ہیں، تاکہ برآمداتی کوشش کو مستحکم بنایا جائے اور برآمدات کرنے والے ان لوگوں کی مدد کی جائے جو غیر ملکی زرمبادلہ کی ہماری آمدنی میں تعاون کر رہے ہیں۔

برآمداتی قرض کی مجموعی تقسیم کل برآمدات کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ مارچ ۱۹۹۴ء میں برآمدات کی مالیت ۷۵۴۹ کروڑ روپے (عارضی) رہی تھی اور اسی مدت میں ۵۸۷۴ کروڑ روپے کے قرضے کی تقسیم عمل میں آئی تھی۔

قرضے کی رقم میں اضافہ کرنے کے علاوہ دیگر سہولیات میں بھی توسیع کی گئی ہے۔ ابتدائی مرحلوں میں برآمداتی قرضہ مال بحری جہاز پر لادنے سے قبل اور اس کے بعد دونوں معاملوں میں ۱۳ فی صد سالانہ شرح سود پر دستیاب ہے۔ یکم اپریل ۱۹۹۳ء سے تمام بینکنگ کمپنیوں کو ان کے فراہم کردہ برآمداتی قرضے پر سود کے سلسلے میں ٹیکس عائد کرنے سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے، جس سے برآمدات کرنے والے لوگوں کو براہ راست شرح سود میں ۵ر۲ فی صد سالانہ کا مزید فائدہ ہوگا۔ مال بحری جہاز پر لادنے کے بعد برآمداتی قرضے کی ایک اسکیم یکم جنوری ۱۹۹۲ء سے شروع کی گئی ہے۔

منظوری کے عمل میں تیزی سے لانے اور کام کاج میں نرمی لانے کے لیے بینکوں کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ زیادہ مدت یعنی زیادہ سے زیادہ ۲۷۰ دنوں تک کے لیے مال بحری جہاز پر لادنے سے قبل قرضہ دیں اور جس کے لیے ۱۸۱ دنوں سے ۲۷۰ دنوں تک شرح سود بہت زیادہ نہ ہو۔

مال بحری جہاز پر لادنے سے قبل قرضہ کے چالو کھاتے کی سہولت کے تحت بینکوں کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ ایک مناسب مدت میں فرم کا آرڈر یا قرضہ نامہ پیش کرنے کی شرط کے ساتھ مال بحری جہاز پر لادنے سے متعلق قرضہ دیں۔ بینکوں کو اس بات کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ وہ برآمدات کرنے والے شخص کے ریکارڈ اور ضرورت کے حساب سے کسی بھی شئے کے سلسلے میں چالو کھاتے کی سہولت فراہم کریں۔

بین اقوامی مقابلہ جاتی شرحوں پر برآمداتی قرضہ دستیاب کرانے کے لیے بینکوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ غیر ملکی کرنسی میں مال بحری جہاز پر لادنے سے قبل قرضہ دیں نیز بین اقوامی شرح سود سے وابستہ شرحوں پر غیر ممالک میں برآمداتی بلوں میں دوبارہ کمی کریں۔ یہ سہولت تمام قابل تبدیل کرنسیوں میں دستیاب ہے۔

برآمداتی قرضہ کی منظوری کے طریقے کو آسان بنا دیا گیا ہے۔ نئی اور اضافہ شدہ حد کی منظوری ۴۵ دنوں میں، حد کی تجدید ۳۰ دنوں میں اور عارضی حد کی منظوری ۱۵ دنوں میں ہونی چاہیے۔ قرضے سے متعلق نئی پالیسی کے تحت، برآمداتی قرضے کے شعبے میں ۱۳ فی صد اور ۱۵ فی صد کی موجودہ شرحوں میں ابتدائی مدتوں کے لیے کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ ●

مواصلاتی تربیت کے پروگرام

سرکاری عملے اور تربیت کے محکمے نے ۱۹۹۵-۹۶ء میں سرکاری ملازموں کے لیے آپسی مواصلاتی رابطے بڑھانے کے سلسلے میں ۵ تربیتی پروگرام چلانے کی تجویز رکھی ہے۔

یہ بات سرکاری عملے، عوامی شکایات اور پینشن کے محکمے کی وزیر مملکت شریمتی الوا نے لوک سبھا میں بتائی۔

شریمتی مارگریٹ الوا نے کہا کہ نومبر ۱۹۹۵ء میں مدراس کے انا انسٹی ٹیوٹ آف مینیجمنٹ میں موثر مواصلات اور باہمی ربط و ضبط نیز تعلقات کے موضوع پر تین روزہ تربیتی پروگرام منعقد کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور تربیتی پروگرام دسمبر ۱۹۹۵ء میں بمبئی کے صنعتی انجینئرنگ کے قومی تربیتی ادارے میں انسانی تعلقات کے موضوع پر موثر تال میل قائم کرنے کے سلسلے میں منعقد کیا جائے گا۔

مسز الوا نے کہا کہ دیہی علاقوں میں موثر قسم کے رابطوں، منصوبہ بندی اور ترقی کے موضوع پر بھی ایک پروگرام ہوگا۔ یہ پروگرام ۱۹۹۵ء میں لکھنؤ میں دین دیال اپادھیائے انسٹی ٹیوٹ برائے دیہی ترقی، تربیت و تحقیق میں منعقد کیا جائے گا۔ ان کے علاوہ نومبر ۱۹۹۵ء اور فروری ۱۹۹۶ء میں دو اسی طرح کے پروگرام حیدرآباد میں نظم و نسق سے متعلق ادارے میں منعقد کیے جائیں گے۔ ●

سیین ضامن

انسانی آبادی کا اثر ماحولیات پر

انسانی آبادی میں نامناسب اضافے اور اس اضافہ کی وجہ سے انسانوں کی بڑھتی ہوئی مادّی ضرورتوں کی وجہ سے ہمارا طرز زندگی کافی بدل گیا ہے۔ کرّہ ارض پر انسانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کا بوجھ اور انسانوں کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے فطرت پر جو دباؤ بڑھ رہا ہے وہ مستقبل کے لیے کچھ اچھا نہیں ہے۔ ۱۸۰۰ء کے آس پاس دنیا کی آبادی تقریباً ایک ارب تھی۔ ۱۹۰۰ء تک یہ تقریباً دو ارب ہو گئے۔ بیسویں صدی میں اب تک تین ارب ۷۰ کروڑ کا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس وقت دنیا کی آبادی تقریباً ۵.۱ ارب ۷۰ کروڑ ہے اور اس میں ہر چار روز میں دس لاکھ کی شرح سے اضافہ ہو رہا ہے۔ دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی انسانی سماج کے مستقبل کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ بن چکی ہے۔ آبادی میں حد سے زیادہ اضافے اور اس کے نتیجے میں مادّی ضرورتوں کی مانگوں میں اضافے کی وجہ سے نہ صرف زمین بلکہ ماحولیات پر بھی منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔ ماحولیات کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کے نتیجے میں ہمیں کیا نقصان ہونے والا ہے اس کا اندازہ شاید ہم نہیں لگا پا رہے ہیں۔

ماحولیات کے ماہر مسٹر آر براؤن کے مطابق اگر آبادی میں یوں ہی اضافہ ہوتا رہا تو ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب انسانوں کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے میں جنگلات اور مچھلیاں بالکل ختم ہو جائیں گی۔ سبزہ زار اور قابل کاشت زمین بے کار ہو جائیں گی۔ ترقی پذیر ملکوں میں لکڑیاں کھانا پکانے کے کام میں لائی جا رہی ہیں جس کی وجہ سے جنگلات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ عالمی بینک کے ایک تخمینہ کے مطابق اس وقت جتنے جنگل ہیں ان کا مزید پانچ گنا اُگانے کی ضرورت ہے تاکہ اکیسویں صدی میں کھانا پکانے کے لیے لکڑی کی مانگ کو پورا کیا جا سکے۔

۱۹۹۲ء میں برازیل کے شہر ریو میں زمین کے بارے میں جو چوٹی کانفرنس ہوئی اس میں ماحولیات کے بارے میں چند ایسے حقائق سامنے آئے جو آج بھی باعث تشویش ہیں۔ یہ حقائق کچھ اس طرح ہیں:

زمین کا ۵ر۱.ارب ہیکٹیر رقبہ اب فصل اگانے کے لائق نہیں رہا۔ قیمتی اور زرخیز زمین پر تعمیرات کا کام تیز ہوتا جا رہا ہے۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے درمیان آبادی کے تناسب میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً ۱۹۵۰ء میں یہ تناسب ۲:۱ کا تھا جو ۱۹۸۰ء میں بڑھ کر ۴:۱ ہو گیا اور ۲۰۰۰ء تک یہ تناسب ۵:۱ ہونے کی امید ہے۔ جہاں تک پانی کا تعلق ہے تو اس کی سطح کافی گر چکی ہے۔ ۱۹۵۸ء سے لے کر اب تک بنکاک میں پانی کی سطح ۸۰ فٹ اور ہمارے یہاں تمل ناڈو میں سو فٹ گر چکی ہے۔ ہندوستان میں بے کار اور ناقابل کاشت زمین سب سے زیادہ ہے اور تین فی صد سالانہ کی شرح سے ہمارے جنگلات برباد ہو رہے ہیں۔

ہمارے طرز زندگی نے صرف زمین پر ہی منفی اثرات نہیں ڈالے بلکہ اس سے ماحول بھی بری طرح متاثر ہوا ہے۔ خبر ہے کہ کرّۂ ارض مزید گرم ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس خبر کے بعد ماحولیا کے سائنس داں اور ماہرین اس مسئلہ کے حل کی تلاش میں سرگرم ہو گئے ہیں۔

زمین کا ماحولیاتی نظام کافی پیچیدہ ہے۔ سورج کی شعاعیں اوزون کی سطح (OZON LAYER) سے ہوتی ہوئی زمین تک پہنچتی ہیں۔ اس عمل کے دوران زمین ان شعاعوں کی اچھی خاصی مقدار اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اوپیک گیس (OPAQUE GAS) اور فیکٹریوں سے نکلی آلودگی کی وجہ سے کاربن ڈائی آکسائڈ میں اضافہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے زمین سے واپس نکلی ہوئی سورج کی گرمی زمین کے نچلے ماحول میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ زمین سے واپس نکلی ہوئی سورج کی گرمی کے ماحول کی نچلی سطح پر پھنسے رہ جانے کو سائنسی اصطلاح میں "گرین ہاؤس اِفکٹ" (GREEN HOUSE EFFECT) کہتے ہیں اور حد سے زیادہ گرین ہاؤس افکٹ کی وجہ سے عالمی سطح پر موسم میں تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں سارے ماحولیاتی نظام میں خطرناک پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

ہندوستان میں جو مطالعے ہوئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ کچھ علاقوں میں گرین ہاؤس افکٹ کی وجہ سے چاول کی

ایچ ۲۰۔ ایس۔ ڈی ڈی اے فلیٹس ساکیت، نئی دہلی ۱۷

پیداوار میں تیس فی صد کی کمی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں سمندر سے متعلق علم کے ماہرین کا خیال ہے کہ کرۂ ارض کے مزید گرم ہونے سے سمندر کی سطح میں بھی فرق پڑسکتا ہے جس کی وجہ سے انسانی زندگی خطرے میں پڑسکتی ہے۔

ماحولیاتی نظام میں یہ تمام غیرصحت مند تبدیلیاں خاص طور پر ہمارے بے احتیاط اور ناعاقبت اندیش طرز زندگی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ ہماری مادی کھپت اور ہمارے اخراجات روز بروز بڑھتے جارہے ہیں جس کی وجہ سے وسائل تنگ ہوتے جارہے ہیں۔ جرمنی کے ایک مشہور ماہر اقتصادیات کا کہنا ہے کہ دنیا کو اپنی مادی کھپت میں ۵۰ فی صد کی کٹوتی کرنا ضروری ہے۔ یہ کٹوتی ترقی یافتہ ملکوں کو ۹۰ فی صد کرنا ہوگی کیوں کہ ان کے یہاں کھپت سب سے زیادہ ہے۔ یہ ماہر اقتصادیات ہیں فیڈرک ہٹمٹ بلیک جو جرمنی کے ایک مشہور ادارے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ترقی یافتہ ملکوں کے لوگ تیسری دنیا کے رہنے والوں سے ۱۹گنا زیادہ المونیم، ۱۸گنا زیادہ کیمیکل، ۱۴گنا زیادہ کاغذ اور ۱۳گنا زیادہ لوہا استعمال کرتے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان چیزوں کی کھپت میں کتنا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ۹۰ فی صد کٹوتی کی بات کہی گئی ہے۔

واشنگٹن کے "ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ" کے تجزیہ کار جان ینگ (JOHN YOUNG) کی ایک رپورٹ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کے رہنے والے لوگوں کی مادی کھپت ترقی پذیر ملکوں کے لوگوں کی کھپت سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ اوسطاً ایک امریکی باشندہ اپنی زندگی میں ۵۴۰ ٹن تعمیری ساز و سامان، ۱۸ ٹن کاغذ، ۲۳ ٹن لکڑی، ۱۶ ٹن دھات اور ۳۲ ٹن آرگینک کیمیکل استعمال کرتا ہے۔ ان تحقیقات کے بعد ماحولیات کے ماہرین کو یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑا کہ غیرترقی یافتہ ملکوں کی پسماندگی کی ایک وجہ ترقی یافتہ ملکوں کی بے

ترقی بھی ہے۔

اگر ہم سنجیدگی سے غور کریں تو یہ بات مضحکہ خیز نہیں لگے گی کہ ہم اسی چیز کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں جس پر ہمارا انحصار ہے اور وہ شئے ہے فطرت اور فطرت بھی ہمارے کیے کی ہمیں اچھی سزا دے رہی ہے۔ امریکہ میں صنعتی اداروں اور فیکٹریوں سے نکلنے والی زہریلی گیس کا ۱۷ فی صد حصہ صرف کیمیکل، پلاسٹک، کاغذ اور دھات کی فیکٹریوں سے پیدا ہوتا ہے۔ پاپوانیوگنی، چلی اور امریکہ کے خوبصورت اور دلکش علاقوں میں تمام پہاڑیاں، گھاٹیاں، وادیاں اور ندیاں اس طرح برباد کردی گئی ہیں کہ ان کی شناخت مشکل ہے۔ کناڈا، ملیشیا اور نائجیریا میں جنگلات کٹنے سے ماحولیات کا سارا نظام درہم برہم ہوکر رہ گیا ہے۔

آج ایک طرف وسائل کی کمی ہے تو دوسری جانب آبادی میں زبردست اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ایسی صورت میں آبادی پر کنٹرول کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ جب تک ہم بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو نہیں پالیتے اور اپنا طرز زندگی نہیں بدلتے تب تک فطرت پر بوجھ یوں ہی بڑھتا رہے گا۔ جس کے نتیجے میں نظام فطرت میں توازن بگڑے گا جس کا نقصان بالآخر ہم کو ہی اٹھانا پڑے گا۔ لہٰذا ہمیں آبادی پر کنٹرول کرکے اپنی مادی ضرورتوں پر بھی قابو پانا ہوگا تاکہ فطرت پر پڑنے والا بوجھ ہلکا ہوسکے اور انسان اور فطرت کے درمیان توازن برقرار رہ سکے۔ ●

بقیہ : رفیع احمد قدوائی

خوراک ان کی کامیابی نے انھیں بلند قامت ضرور بنادیا تھا اور ایک بار انھوں نے ازراہ مذاق یہ کہہ بھی دیا تھا کہ ایک بار وہ وزیراعظم بن جائیں تو وہ اتنی اچھی کارگزاری دکھائیں گے کہ لوگ جواہر لال کو بھول جائیں گے۔ لیکن رفیع احمد کی ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ ان کی اپنی کوئی آزادانہ پالیسی نہیں تھی بلکہ انھوں نے ہمیشہ جواہر لال نہرو کی پالیسیوں کو ہی سامنے رکھا۔

رفیع احمد قدوائی سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ ان کے نظریات سماجوادی تھے۔ وہ انتہائی سادہ انسان تھے۔ اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹے لیٹے ہی اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں سے باتیں کرتے رہتے۔ بہت کم ایسے مواقع ہوتے جب کہ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر غیر ملک سے آئے ہوئے کسی مہمان سے بات چیت کرتے۔ جب کوئی سیاست داں صاف گوئی سے کام نہ لے کر جانتے بوجھ کر خاموشی اختیار کرتا تو انھیں غصہ آجاتا۔ لکھنو چھوڑنے کے بعد جب وہ نئی دہلی میں وزیر مواصلات بنے، اس وقت انھوں نے نیشنل ہیرالڈ میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جن میں اترپردیش میں اصلاحات کی ضرورت پر زور دیا۔

آخری دنوں میں ان کی صحت نے جواب دے دیا تھا، ان کے چہرے پر اور پیروں پر ورم آگیا تھا، جواہر لال چاہتے تھے کہ وہ آرام کریں لیکن انھوں نے ہمیشہ خطرات مول لینے کو ہی زندگی سمجھا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سے ہی انھیں بلڈ پریشر رہنے لگا تھا۔ لیکن ان کا دروازہ ہر ایک کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا، دلی میں ہوں یا لکھنؤ میں، آرام اور چین سے انھوں نے بیٹھنا سیکھا ہی نہ تھا۔ تنہائی انھیں پسند ہی نہ تھی، ان سے ملنے کے لیے نہ وزیٹنگ کارڈ درکار تھا نہ پولیس یا چپراسی کی اجازت۔ اگر اتفاق سے وہ کسی وقت تنہا ہوئے تو انھوں نے فون کرکے کسی کو بلالیا۔ وہ صبح سویرے اٹھتے۔ صبح پانچ بجے وہ ایسے لوگوں سے ملاقات کرتے جو ان سے علاحدگی میں بات چیت کرنا چاہتے تھے۔

ہدکنگ ایڈورڈ پر ان کی رہائش گاہ تھی۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو سبھدرا جوشی نے ان کے اعزاز میں ایک عوامی جلسہ کا اہتمام کیا تھا۔ اس جلسے کی بڑے پیمانے پر پبلسٹی کی گئی تھی چناں چہ جب سبھدرا جوشی، رفیع احمد قدوائی کو لینے آئیں تو ان پر دورۂ قلب کا معمولی حملہ تھا، سبھدرا انھیں لے کر جلسہ گاہ پہنچیں۔ بڑی مشکل سے وہ اسٹیج پر چڑھے۔ ابھی مشکل سے ۱۲ منٹ ہی تقریر کرپائے تھے کہ اسٹیج پر نڈھال ہوکر گر پڑے۔ مجمع نے آواز دی کہ آرام کیجیے، آرام کیجیے۔ چناں چہ وہ کار میں واپس لائے گئے البتہ ہمیشہ ہمیشہ کے آرام کے لیے۔ (بشکریہ پی۔آئی۔بی)

●

شکیل جہانگیری

جنگلاتی زندگی کا تحفظ

کرۂ ارض پر آباد انسانوں کی یہ دنیا جس ماحول میں تشکیل کے مراحل سے گزرتی ہے وہ چار اہم عناصر پر مشتمل ہے۔ (۱) ہوا، (۲) پانی، (۳) مٹی اور (۴) زندہ اجسام مثلاً حیوانات و نباتات۔ اول الذکر تین عناصر آپس میں مل کر طبیعاتی ماحول کی تشکیل کرتے ہیں جب کہ آخر الذکر کو حیاتیاتی ماحول کے خانے میں رکھا گیا ہے۔ ہمارے گرد و پیش کی دنیا کو تشکیل دینے والے یہ طبیعاتی اجزا اور حیاتیاتی نظام بلاشبہ زندگی کی مختلف شکلوں کو باقی رکھنے کے لیے یکساں طور پر لازمی ہیں لہٰذا یہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نوع انسانی حیوانات اور نباتات کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

ابتدائے آفرینش سے ہمارا ماحولیاتی نظام انسان کے ہاتھوں بے جا استحصال اور مظالم کا شکار رہا ہے۔ دور حاضر میں انسان کو جب اپنی اس غلطی کا علم ہوا تو ایک احساس ندامت کے ساتھ اس نے اپنے قدرتی سرمائے کے تحفظ اور ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے کی سمت میں سنجیدہ کوششوں کا آغاز کیا۔ ان کوششوں کا خاص محور جنگلات میں پائے جانے والے حیوانات اور نباتات ہیں جن کو عرف عام میں جنگلاتی زندگی یا وائلڈ لائف (WILD LIFE) کہا جاتا ہے۔

حالیہ برسوں میں جنگلاتی زندگی کے تحفظ پر دنیا بھر میں بہت سے سیمینار اور مذاکرات ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ ملکی اور بین اقوامی سطح پر تنظیمیں اور کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں ساتھ ہی تحفظاتی قوانین پاس کیے گئے ہیں اور سالانہ بجٹوں میں اس مقصد کے لیے ایک خاص رقم مختص کی جانے لگی ہے۔

کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ تمام کوششیں کیوں کی جا رہی ہیں؟ بھلا جنگلی جانوروں سے ہمیں کیا فائدہ ہے؟ خاص طور پر یہ سوال دیہات کے باشندے کو پریشان کر سکتا ہے جو کہ جنگلی جانوروں کا کچومر نکالنے کے لیے ہر وقت اپنی کلہاڑی کی دھار اور بھالے کی اَنی کو سان پر چڑھائے رکھتا ہے، کیوں کہ جنگلی جانور اس کی فصلوں کو برباد کرتے ہیں اور جنگلی درندے اس کے مویشیوں کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔

یہ سوال اپنی جگہ درست ہو سکتا ہے۔ انسان ہمیشہ جنگلی جانوروں کو اپنے لیے خطرناک اور نقصان دہ مخلوق تصور کرتا رہا ہے۔ لیکن اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ انسان کے لیے زیادہ خطرناک کون ہے جنگلی جانور یا خود انسان۔ ای۔ پی۔ گی کی تصنیف کردہ کتاب "وائلڈ لائف اِن انڈیا" کے پیش لفظ میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے لکھا تھا:

"تہذیب و شائستگی سے آراستہ ہونے کے باوجود آدمی نہ صرف لگاتار وحشی پن کا مظاہرہ کرتا رہا ہے بلکہ ان جانوروں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا ہے جن کو ہم جنگلی کہتے ہیں۔

فطرت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کو ہر وقت خطرہ لاحق ہے۔ اسی لیے جنگل میں زندگی کو مسلسل نازک مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ طاقتور جانور کمزوروں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں اور کمزور جانور ان سے بچنے کی تدابیر کرتے ہیں اور اکثر اپنی حفاظت کے لیے چند لمحوں میں عارضی طور پر ہیئت تبدیل کر لیتے ہیں۔ لیکن جنگل کا یہ دائمی اور ازلی طور زیادہ تر خوراک کی فراہمی کے لیے برتا جاتا ہے۔ آدمی آدمی کو کھاتا نہیں بلکہ مختلف مقاصد کے لیے اس کی جان لے لیتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ اس کو جسمانی طور پر قتل نہیں کرتا تو اس کی روح کو فنا کر دیتا ہے۔ ہم خیر و شر، تہذیب و بربریت اور رحمانیت و شیطنت کا عجیب و غریب مرکب ہیں۔ ہمارے اقوال و افعال ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ ہماری باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم بہت بڑے آدرش وادی ہیں لیکن ہمارے اعمال اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ ہم امن کا نعرہ لگاتے ہیں لیکن ہمارا رویہ اکثر جارحانہ اور جنگ پسند ہوتا ہے"۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ آخر جنگلاتی زندگی کے تحفظ کو اتنی اہمیت کیوں دی جا رہی ہے؟ اور اس پر زر کثیر کیوں صرف کیا جا رہا ہے، ڈاکٹر محمد اسلم پرویز اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"دنیا میں انسان کا وجود نہ تو خود مختار ہے اور نہ بلا تعلق۔ یہ کل دنیا ایک بہت بڑے نظام کا حصہ ہے جس میں ہر ایک کا دوسرے سے تعلق ہے۔ دنیا میں بھی جاندار اور بے جان چیزیں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ پودوں کی بقا جانوروں سے وابستہ ہے جانوروں کی فلاح و بہبود پیڑ پودوں کی زندگی پر منحصر ہے۔ اگر ہم جانوروں کی مثال لیں تو اس وقت ہمارے ملک میں کئی جانور ناپید ہونے

---

۲۳۷ کاویری۔ جے، این، یو۔ نئی دہلی ۶۷

کے قریب ہیں یا ہو چکے ہیں۔ سفید پہاڑی شیر، چیتا، دلدلی علاقوں کے ہرن، ہندستانی بھیڑ، تکرڈ بھگا، دو سینگوں والا گینڈا اور دوسرے کئی جانور اس زمرے میں آتے ہیں۔ ان جانوروں کی کمی یا ناپیدی سے نظام قدرت میں ایک خلا پیدا ہونے لگتا ہے جس کے دوررس نتائج خطرناک ہوتے ہیں۔ اس کی میں ایک مثال پیش کروں گا۔ فرض کیجیے کہ کسی جنگل میں شیر یا چیتے کم ہونے لگیں یا ختم ہو جائیں تو اس کا ایک اثر یہ ہوگا کہ وہ جانور جن کو شیر شکار کیا کرتا تھا، بڑھنے لگیں گے۔ مثلاً بکریاں، بھیڑیں اور دیگر چھوٹے جانور۔ چونکہ ان کو کوئی مارنے والا نہیں رہا اس لیے ان کی نسلیں دن بہ دن بڑھیں گی۔ یہ تمام جانور پیڑ پودوں کو چرتے ہیں۔ جب ان کی تعداد بڑھنے لگے گی تو پیڑ پودوں پر ان کا دباؤ بڑھ جائے گا۔ زیادہ ہریالی بطور خوراک استعمال ہونے لگے گی جس کی وجہ سے پیڑوں کی تعداد اور گھنا پن کم ہونے لگے گا۔ جب جنگلوں کا گھنا پن کم ہوگا تو بہت سے ایسے جانور جو جنگلوں میں رہتے ہیں، وہ ان جنگلوں سے یا تو نکل کر بھاگیں گے یا پھر مرنے لگیں گے۔ ایسے نکل کر بھاگنے والے جانور اکثر آس پاس کی آبادیوں میں بڑی تباہی مچاتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ قبل اس طرح کے بھاگے ہوئے ہاتھیوں کے جھنڈ نے کافی نقصان پہنچایا تھا۔ تو اس طرح دیکھا جائے تو ایک نسل کم ہونے سے بہت سی نسلیں اور پورا ماحول متاثر ہوتا ہے۔ اور یہ محض قیاس آرائی یا ذہنی اختراع نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے جس کے بارہا تجربات ہو چکے ہیں۔ (جنگلات کا تحفظ: ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، مضمون مشتملہ بہ "سائنس کی باتیں" مطبوعہ ۱۹۸۶ء صفحہ ۸۲-۸۳)

جنگلاتی زندگی کے تحفظ سے مراد وہ انسانی کوششیں ہیں جو جنگلی جانوروں اور پیڑ پودوں کو ناپید ہونے سے بچانے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ ان کوششوں میں ان جنگلی نسلوں کا دانشمندانہ انتظام اور دیکھ بھال شامل ہے جو قدرتی وجوہات سے ناپید ہونے کے قریب ہیں۔ لیکن جنگلاتی زندگی کو سب سے زیادہ خطرہ انسانی حرکات کا نتیجہ ہے۔ گویا انسان نے خود اپنے ہاتھوں جنگلاتی زندگی کے تحفظ کی ضرورت پیدا کی ہے۔

زمین پر انسانی زندگی کے آغاز سے ہی، جنگلی زندگی نوع انسانی کی حرکتوں کے نتیجے میں، مسلسل مصائب کا شکار رہی ہے۔ اثر آفریں ہتھیاروں مثلاً تیر کمان اور بعد میں رائفل اور مشین گن وغیرہ کی ایجاد نے آسانی کے ساتھ انسان کو جانوروں کے شکار پر قادر کر دیا اور اس نے جنگلی نسلوں کی ایک معتد بہ تعداد کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا اور بیشتر نسلوں کی آبادی کو تشویش ناک حد تک کم کر دیا۔ انسانوں نے زراعت و صنعت کو فروغ دینے کی غرض سے جنگلات کا صفایا کیا، انھیں دلدلوں میں تبدیل کیا اور ندیوں پر باندھ تعمیر کیے۔ اس طرح آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ جنگلی جانوروں کے لیے زمین محدود ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ انسان کی پیدا کردہ ماحولیاتی آلودگی نے جنگلی نسلوں کی اچھی خاصی تعداد کو متاثر کیا ہے۔ بہت سی جنگلی نسلیں تو اسی وقت ختم ہو گئی تھیں جب انسان نے اس کرۂ ارض پر زندگی شروع کی تھی۔ البتہ ماضی میں ان کی جگہ دوسری نسلوں کو فروغ حاصل ہوا اور انھوں نے نقصان کی تلافی کر دی تھی اور یوں جنگلاتی زندگی کے مجموعی تنوع میں کمی نہیں آئی۔

ہمارے ملک میں سنہرے رنگ کے خوبصورت بالوں والا لنگور رہا کرتا تھا۔ آج اس نسل کے لنگور کا ایک بھی جوڑا دنیا کے کسی چڑیا گھر میں موجود نہیں ہے۔ ہندوستانی چیتا بھی بہت عرصہ قبل ناپید ہو چکا ہے اور سفید پہاڑی شیر بھی اب اس دنیا میں باقی نہیں ہے۔ اسی طرح کچھ نسلیں اتنی قلیل تعداد میں پائی جاتی ہیں کہ اگر خصوصی توجہ نہ دی گئی تو ان کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی مثلاً ہندوستانی بسٹرڈ (BUSTARD) زنگ جیسے دھبوں والی گجراتی بلی اور دیگر کئی نسلیں۔

لگ بھگ ۱۶۰۰ء میں شمالی امریکہ میں بہت سی قسمیں ناپید ہو گئیں جن میں پیغام رساں کبوتر، کیلی فورنیا کا خاکستری ریچھ، فلوریڈا کا کالا بھیڑیا اور برچ کا پیڑ جو صرف ایک بار ورجینیا میں اُگا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی اور انھوں نے قریب الفنا جنگلاتی زندگی کے تحفظ کے سلسلے میں اقدامات شروع کیے۔ یوں تو ہندوستان کے بعض علاقوں میں قدیم زمانے سے شکار پر پابندی ہے مثلاً مدراس کے نزدیک واقع ویدانتھنگل (VEDANTHANGAL) برڈ سینکچری۔ لیکن انیسویں صدی میں جنگلات کے تحفظ کے بارے میں خاص طور پر غور و خوض کیا گیا۔ پھر بھی اسی سمت میں کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں ہوئی۔ رواں صدی میں جب دنیا کی بہت سی حکومتوں نے جنگلاتی زندگی کے تحفظ کے لیے محافظ قانون پاس کیے اور قومی تفریح گاہیں اور پناہ گاہیں بنائیں تو ہندوستان نے بھی اس طرف خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں ۱۹۲۷ء میں تحفظِ جنگلات قانون بنا کر بہت سے علاقوں کو جنگلی جانوروں کے تحفظ اور ان کی نسلوں کو فروغ دینے کے لیے قومی پارک اور سینکچری کی حیثیت سے مخصوص کیا۔ آزادی کے بعد ان مخصوص علاقوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ آج ہمارے ملک کے کل جنگلاتی علاقے کا ۲۷ء۴ فی صد حصہ قومی پارکوں اور سینکچریوں پر مشتمل ہے جن کی تعداد علی الترتیب ۷۵ اور ۴۲۱ ہے۔ اس قسم کی کوششوں نے بہت سی قریب الفنا جنگلی نسلوں کو ناپید ہونے سے بچا لیا۔ ۱۹۸۹ء میں محکمہ جنگلات کے حاصل کردہ شماریات کے مطابق ہندوستان میں ہاتھیوں کی تعداد ۱۶ سے ۲۰ ہزار کے درمیان، چیتے ۴۳۳۴، لیوپرڈ (LEOPARD) چھ ہزار سات سو، ببر شیروں کی تعداد جو کہ صرف گجرات میں پائے جاتے ہیں، ۲۸۴ ہے۔ گینڈے زیادہ تر آسام میں ہیں ان کی تعداد ایک ہزار چار سو ۷۶ ہے۔ سفید چیتا چالیس سال قبل تقریباً ناپید ہو چکا تھا۔ ریوا (REWA) کے مہاراجہ نے کسی طرح اس کا ایک بچہ حاصل کر لیا تھا اور معمولی چیتے کے میل سے انھوں نے اس کی افزائش نسل کا آغاز کیا تھا جس کا خوش آئند نتیجہ یہ ہے کہ آج دس چڑیا گھروں میں سفید چیتے موجود ہیں جن کی مجموعی تعداد ۳۹ ہے۔ ان میں سے دو دہلی کے چڑیا گھر اور ۲۳ مدھیہ پردیش کے لندن کینن پارک میں ہیں۔

جنگلی جانوروں اور پودوں کے تحفظ کی یہ کوششیں قابلِ ستائش ہیں تاہم جانوروں کی کئی سو اور پودوں کی کئی ہزار نسلیں اب تک فنا کے خطرے سے دوچار ہیں اور جن نسلوں کو ابھی خطرات درپیش نہیں، اندیشہ ہے کہ وہ بھی اس مصیبت کی زد میں آجائیں گی۔

باقی صفحہ ۱۸ پر

بمان باسُو

خلائی تکنالوجی میں ایک اہم سنگ میل

ہندوستان نے خلا میں اپنے مصنوعی سیارے خود چھوڑنے کی راہ میں ایک اہم سنگِ میل گزشتہ سال ۱۵ اکتوبر کو پار کیا جب اس کا مصنوعی سیارے خلا میں پہنچانے والا راکٹ ـــــ پولر سٹیلائٹ لانچ وہیکل (پی ایس ایل وی) ڈی ٹو کامیابی سے داغا گیا۔ اس راکٹ کے ذریعے ۸۰۴ کلوگرام وزن کا ریموٹ سینگ مصنوعی سیارہ آئی آر ایس پی ۲ زمین سے ۸۱۷ کلو میٹر کی اونچائی پر مدار میں پہنچایا گیا۔ اپنی اس کامیابی کے ساتھ ہندوستان ان پانچ ملکوں کے کلب میں شامل ہو گیا ہے جو اپنے مصنوعی سیارے خود خلا میں پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ ملک ہیں امریکہ، جاپان، روس، فرانس اور چین۔ اس کامیابی سے یہ امکان بھی پیدا ہو گیا ہے کہ ہندوستان آگے چل کر مصنوعی سیارے خلا میں چھوڑنے کی خدمات فراہم کرنے والی اربوں ڈالر کی مارکیٹ میں بھی شامل ہو سکتا ہے جس پر اس وقت صرف چند بڑی کمپنیوں ہی کا غلبہ ہے۔ یہ کامیابی اس لیے بھی قابل ذکر ہے کہ یہ صرف ایک ناکامی کے بعد حاصل کی گئی ہے جو ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا دعویٰ کچھ بڑی خلائی طاقتیں بھی نہیں کر سکتیں۔

اپنے مصنوعی سیارے (سٹیلائٹ) خود خلا میں پہنچانے کی صلاحیت کا حصول ہندوستان کے ۳۰ سالہ خلائی پروگرام کا ایک اہم مقصد رہا ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک کو خلائی تکنالوجی کے میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل ہوتی رہی ہیں جس کا بیّن ثبوت ہندوستان میں بنے انسیٹ ۱۔۲ اے اور انسیٹ ۲ بی اور دو آئی آر ایس مصنوعی سیاروں کی کامیاب کارکردگی ہے، تاہم ہندوستان اپنے سیارے خود خلا میں چھوڑنے کی تکنالوجی میں پیچھے تھا۔ اس لیے اسے اپنے تیار کیے ہوئے سیاروں (انسیٹ ۲۔اے، انسیٹ ۲ بی اور آئی آر ایس ۱۔اور آئی آر ایس ۱۔بی) کو خلا میں پہنچانے کے لیے غیر ممالک کی خدمات مستعار لینی پڑتی تھیں۔ ہندوستان کی حالیہ کامیابی اس لحاظ سے بھی کافی اہم ہے کہ اب ہندوستان کو دوسرے ممالک پر انحصار نہیں رکھنا پڑے گا۔ کم از کم اس کے آئی آر ایس زمرے ریموٹ سینگ سٹیلائٹوں کے ضمن میں تو بالکل نہیں۔

پی ایس ایل وی پانچ ایک دیو قامت چار اسٹیجوں والا راکٹ ہے۔ اس کی اونچائی ۴۴ میٹر ہے اور یہ لگ بھگ کلیتًا دیسی تکنالوجی سے تیار کیا گیا ہے۔ چار اسٹیجوں میں سے دو ٹھوس پروپلسن اسٹیج ہیں اور دو سیّال پروپلسن اسٹیج۔ اس میں چھ "اسٹریپ آن" سالڈ پروپیلنٹ بوسٹر بھی لگے ہوئے ہیں۔ پی ایس ایل وی پانچ کی پہلی پرواز گزشتہ ستمبر میں ہوئی تھی۔ شروع میں یہ پرواز نارمل رہی لیکن آدھے راستے میں پہنچ کر اپنے طے شدہ راستے سے بھٹک گئی اور "پے لوڈ" کو مطلوبہ اونچائی تک نہیں پہنچا سکی۔ اس ناکام پرواز کے دوران اس سے ملی ہوئی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ پی ایس ایل وی ڈی ون میں شامل کیے گئے تمام سسٹم ٹھیک طرح سے کام کر رہے تھے اور راکٹ کے ڈیزائن میں کوئی بڑا نقص نہیں تھا۔ اس راکٹ کی ناکامی کی وجوہ کا تجزیہ کرنے کے لیے بنائی گئی کمیٹی نے اس بات کی تصدیق کی کہ اس کے مطلوبہ مدار میں نہ پہنچ پانے کی بڑی وجہ سافٹ ویر کی خرابی تھی۔

جب وجہ کا پتا چل گیا تو اسے دور کرنا کیا مشکل تھا۔ اِسرو (خلائی تحقیق کی ہندوستانی تنظیم) کے سائنس دانوں نے نہ صرف اصلاح شدہ سافٹ ویئر کی بار بار آزمائش کی بلکہ اس میں فیصلہ لینے کی صلاحیت بھی پیدا کر دی تاکہ اگر سٹیلائٹ کو کسی وجہ سے طے شدہ مدار تک نہ پہنچایا جا سکے تو اسے کمتر اونچائی کے مدار پر ضرور پہنچایا جا سکے۔ پی ایس ایل وی کی دوسری پرواز کی ایک نصابی کتاب کی سی درستی اِسرو کے سائنس دانوں کی ایک ناکام تجربے سے بھی فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کا واضح ثبوت ہے۔

اگرچہ اس پرواز کو ابھی تک ایک ترقیاتی پرواز بتایا جا رہا ہے تاہم اس سے مصنوعی سیارے خلا میں چھوڑنے کے لیے لانچنگ سروسز فراہم کرنے والی اربوں ڈالروں کی مارکیٹ میں مستقبل میں ہندوستان کی شمولیت کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ اگرچہ پی ایس ایل وی کو ۱۰۰۰ کلوگرام وزن کے مصنوعی سیارے ۹۰۰ کلومیٹر کی اونچائی والے مداروں میں نصب کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے تاہم اس کا استعمال ۴۰۰ کلوگرام کے مواصلاتی مصنوعی سیاروں کو کمتر بلندیوں پر پہنچانے کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے جس کی مانگ مستقبل میں بڑھنے کی پوری امید ہے خاص کر بڑھتی ہوئی عالمی متحرک ٹیلی فون سروسز کی وجہ سے کیوں کہ ان کے لیے بھی مواصلاتی مصنوعی سیاروں کی خدمات درکار

ہوں گی۔ اسرو کے ذرائع کے مطابق ہندوستان چھوٹے مواصلاتی سٹیلائٹوں کو مدار میں پہنچانے کے لیے اے ایس ایل وی اور پی ایس ایل وی کی خدمات فراہم کر کے ۲۰۰۰ء تک ۶۰ ملین امریکی ڈالروں کی مارکیٹ حاصل کر سکے گا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پی ایس ایل وی سے ۴ سو کلوگرام وزن کے تین مصنوعی سیاروں کو مدار پر پہنچا کر ۴۵ ملین امریکی ڈالر کمائے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ۱۵۰ کلوگرام کے تین چھوٹے مصنوعی سیارے اے ایس ایل وی کے ذریعے مدار پر پہنچا کر ۱۵ ملین ڈالر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

کابینہ کی منظوری

مگر اس اندازے کو حقیقت کی شکل اختیار کرنے سے پہلے پی ایس ایل وی کے اعتبار کو مزید پروازوں کے ذریعے یقینی اور قابلِ قبول بنانا ہوگا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مرکزی کابینہ نے حال ہی میں پی ایس ایل وی پروگرام کی توسیع کی منظوری دے دی ہے۔ اس لیے مزید تین پی ایس ایل وی گاڑیاں بنانے کے لیے راستہ صاف ہو گیا ہے۔ بعد میں تین اور پی ایس ایل وی گاڑیاں تیار کرنے کی گنجائش رکھی جائے گی۔ اس توسیع شدہ پروگرام کے لیے ۲۵۶ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ یہاں پر یہ بتا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ پی ایس ایل وی کی دو پروازوں پر خرچ کی گئی ۴۱۵ کروڑ روپے کی رقم میں سے قریب دو تہائی حصہ ذیلی ڈھانچے کے قیام، آزمائش کی سہولیات کی فراہمی اور سرمایہ جاتی ساز و سامان کی خرید پر خرچ کیا گیا ہے اور لانچ وہیکل کی تیاری پر فی وہیکل صرف ۴۵ کروڑ روپے خرچ ہوئے ہیں۔

پی ایس ایل وی کے لیے ذیلی ڈھانچے میں جو مستقل سہولیات قائم کی گئی ہیں ان میں مہیندر گری (تمل ناڈو) میں لکوڈ اسٹیج ٹیسٹ کی سہولیات، بڑے سالڈ بوسٹر کی تیاری اور آزمائش کی سہولیات، سری ہری کوٹا میں ایک نئے لانچ کمپلیکس کی تعمیر اور ترواننت پورم کے نزدیک ولیامالا میں ایک اور نئے کمپلیکس کی تعمیر شامل ہیں۔ سری ہری کوٹا کے نئے لانچ کمپلیکس میں ایک بہت بڑا متحرک سروس ٹاور بھی بنایا گیا ہے۔

پی ایس ایل وی کی ڈیزائن سازی کے اور نشوونما کی ذمہ داریاں ترواننت پورم کے لکوڈ پروپلشن سسٹم سینٹر اور سری ہری کوٹا کے SHAR سینٹر نے مل کر سنبھال لیں۔ نیوی گیشن سسٹم ترواننت پورم میں اسرو کے اینرشیل سسٹم نے تیار کیا جب کہ اسرو کا ٹیلی میٹری، ٹریکنگ اینڈ کمانڈ نیٹ ورک نے ٹیلی میٹری اور ٹریکنگ کی خدمات فراہم کیں۔ سارے آپریشن میں تال میل برقرار رکھنے کا کام وکرم سارا بھائی اسپیس سینٹر واقع ترواننت پورم نے کیا۔

پی ایس ایل وی پروجیکٹ کا ایک اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں ہندوستانی صنعت نے بھی ایک اہم رول ادا کیا۔ پروجیکٹ کے لیے مختلف قسموں کا ہارڈویئر تیار کرنے میں پبلک اور پرائیویٹ دونوں سیکٹروں کی ڈیڑھ سو سے زائد اکائیوں نے حصہ لیا۔ پبلک سیکٹر کے جن اداروں نے پروجیکٹ کے لیے قابل قدر خدمت انجام دیں ان میں ہندوستان ایرونائکس لمیٹڈ، بھارت الیکٹرانکس اور مشرا دھاتو نگم کے نام قابل ذکر ہیں۔

پی ایس ایل وی ڈی ٹو کی کامیابی کے بعد ہندوستانی خلائی سائنس دانوں کا اگلا نصب العین انسیٹ ٹو کلاس کے مصنوعی سیاروں کے لیے جن کا وزن ۲۶۵ ٹن کے آس پاس ہوتا ہے۔ لانچنگ کی دیسی سہولیات قائم کرنا ہے۔ اس کے لیے زیادہ طاقتور جیو اسٹیشنری سٹیلائٹ لانچ وہیکل (جی ایس ایل وی) تیار کرنے کے لیے تیار کیے گئے (MODULES) سے اخذ کیا گیا ہے۔ بڑا فرق یہ ہے کہ جی ایس ایل وی میں پی ایس ایل وی کے اوپری دو اسٹیجوں کی جگہ ایک واحد کرایوجینک اسٹیج لے گی۔

جی ایس ایل وی کی پہلی آزمائشی پرواز ۱۹۹۸ء میں ہوگی اور پی ایس ایل وی کی کامیابی کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ کامیاب ہوگی۔ ●

بقیہ: جنگلاتی زندگی کا تحفظ

جنگلاتی زندگی سے متعلق ماہرین حیاتیات نے ان جانوروں اور پودوں کو جنھیں ناپید ہو جانے کے امکانات کا سامنا ہے، تین خاص حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۔ مبتلائے خطر ۲۔ اندیشۂ خطر میں مبتلا ۳۔ نادر النسل۔

مبتلائے خطر نسلیں وہ ہیں جن کی بقا سب سے زیادہ خطرے میں ہے۔ انھیں براہ راست انسانی تحفظ کی ضرورت ہے مثلاً ہندوستانی بسٹرڈ اور کیلی فورنیا کا سینڈور پرندہ ۲۰ سال اس نسل کی صرف تین چڑیاں باقی رہ گئی تھیں۔

اندیشۂ خطر میں مبتلا نسلیں یوں تو کثیر تعداد میں پائی جاتی ہیں لیکن پھر بھی انھیں زبردست خطرات کا سامنا ہے۔ یہ خطرات ماحول میں ناموافق تبدیلی کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ آرائشی سامان مہیا کرنے والے، شکار کے شائقین، مچھلی پکڑنے والے حتیٰ کہ جانوروں کو جمع کرنے کے شائقین بھی اس خطرے کا باعث ہو سکتے ہیں۔ خاکستری رنگ کا بھیڑیا ایک ایسی ہی نوع ہے جو اگرچہ بعض مقامات پر وافر تعداد میں پایا جاتا ہے لیکن دنیا بھر میں اس کی تعداد روز بروز گھٹتی جا رہی ہے۔

نادر النسل جانوروں کی نسلیں بہت قلیل تعداد میں باقی رہ گئی ہیں۔ ان کو محفوظ ماحول میں رکھا گیا ہے جہاں ان کی دیکھ بھال ہوتی ہے اور اس طرح ان کی تعداد کو گھٹنے نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن اس طرح یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اگر ہم نے جنگلاتی زندگی کے تحفظ سے ذرا بھی چشم پوشی اختیار کی تو مبتلائے خطر نسلیں صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائیں گی۔ خدا ناخواستہ اگر ایسا ہوا تو نوع انسانی ایک ایسے سرمائے سے ہاتھ دھو بیٹھے گی جن کو دوبارہ حاصل کرنا ناممکن ہوگا۔

ڈاکٹر پورن سکہ

سائنس اور ٹکنالوجی میں خواتین کا حصہ

سائنس، ٹکنالوجی، انجینئرنگ اور علم الادویہ کسی زمانے میں "سخت" مضامین سمجھے جاتے تھے لیکن آج ہندوستان میں خواتین ان شعبوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ اگرچہ بعض حلقوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا پر مرد ذات کا غلبہ ہے لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ خواتین نہ صرف سائنس کے رازہائے سربستہ کو جانتے اور ان پر عبور حاصل کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ انجینئرنگ، ٹکنالوجی اور طب کے شعبوں میں اہم خدمات انجام دے رہی ہیں۔

بایوفزکس، بایوکیمسٹری، بایوٹکنالوجی، مائکرو الیکٹرانکس، کمپیوٹر سائنس اور مینجمنٹ جیسے جدید ترین شعبوں میں سال بہ سال روز افزوں تعداد میں داخل ہو رہی ہیں۔ وہ نہ صرف سائنس کی ترقی میں اہم خدمات انجام دے رہی ہیں بلکہ ملک کی سماجی و اقتصادی ترقی میں بھی معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ اس زمرے کی نامور خواتین میں ڈاکٹر اسیما چٹرجی، ڈاکٹر ارچنا شرما، ڈاکٹر مردولا پھڑکے، ڈاکٹر وندنا شوا، ڈاکٹر میرا شوا، ڈاکٹر ستیہ وتی، ڈاکٹر بھانو کویا، ڈاکٹر کستلا جیرامن، ڈاکٹر اسیمہ آنند، ڈاکٹر اندرا ناتھ، ڈاکٹر راج منال پی، دیوداس، ڈاکٹر یوگنی پاٹھک کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ دوسری سرکردہ خواتین جنھوں نے بیسک سائنس کے بارے میں اہم تحقیق کی ہیں کے نام حسب ذیل ہیں:۔

ٹیسٹ ٹیوب بچوں کی پیدائش کے شعبے میں بمبئی کی ڈاکٹر مسز ہندوجا، پیٹرولیم کی ٹکنالوجی میں ڈاکٹر وملا واصل اور ڈاکٹر اندرا سنگھ، نیورو اینڈوکرینالوجی میں ڈاکٹر پشپا کالرا، بایوفزکس میں ڈاکٹر رجنی گووندجی، علم الانسان میں ڈاکٹر سُدلیش سیٹھ اور پولیمر سائنس میں محترمہ اندرا ورما۔

یہ ایک خوش آئند اور صحت مند حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد ملک کی تمام یونیورسٹیاں اور تکنیکی تعلیم کی درسگاہیں خواتین کو گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ اور ڈاکٹریٹ کی سطح کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم کر رہی ہیں اور خواتین ان کا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ جس کے نتیجے میں تعلیمی اداروں میں ان کی تعداد مسلسل روبہ اضافہ ہے۔ یہ ایک قابل ذکر حقیقت ہے کہ علمی درسگاہوں کے خصوصی نوعیت رکھنے والے پیشہ ورانہ نصابات اب مردوں تک ہی محدود نہیں رہے۔

ماہرین اعداد و شمار کے مطابق دنیا میں سب سے زیادہ سائنسی اور تکنیکی افرادی قوت رکھنے والے ممالک میں ہندوستان تیسرے نمبر پر ہے۔ ہمارے ملک میں ۳۰ لاکھ نفوس پر مشتمل تکنیکی عملہ تحقیق و ترقی کی تنظیموں میں کام کر رہا ہے اور یہ بات ہمارے لیے باعث افتخار ہے کہ اس میں دس فی صد (یا تین لاکھ) خواتین ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ خواتین کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔

سال ۹۳-۱۹۹۲ء میں ملک میں سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبے میں کام کرنے والے ۴۸۰۰۰ افراد میں ۸۲ فی صد خواتین تھیں۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں بھی خواتین کے داخلوں میں نمایاں اضافہ ہوا ہے اور ان کی تعداد ۴۰ ہزار سے بڑھ کر ۱۵ لاکھ ہو گئی ہے۔ ۱۹۸۷ء میں ان اداروں میں کل داخلوں میں خواتین کی تعداد صرف ۰ فی صد تھی مگر وہ بڑھتے بڑھتے ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۳۳ فی صد ہو گئی۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبوں میں داخلہ لینے والی خواتین میں سے ۶ر۱۳ فی صد نے علم الادویہ میں، ۳ر۸ فی صد نے خالص سائنس میں اور ۸ر۴ فی صد نے انجینئرنگ میں داخلہ لیا۔

انجینئرنگ نصابات میں داخل ہونے والی خواتین کی تعداد ۱۹۷۵ء میں صرف ایک فی صد تھی مگر ۱۹۹۰ء میں وہ لگ بھگ دس فی صد ہو گئی ہے۔ ملک کے قومی اداروں میں کام کرنے والے انجینئروں میں سے تقریباً ۲۰ فی صد خواتین ہیں۔ سول سروسز میں ۲۲ فی صد، پبلک سیکٹر کے اداروں میں ۱۴ فی صد، نجی سیکٹر میں ۱۳ فی صد خواتین کام کر رہی ہیں۔ نجی سیکٹر کے چھوٹے اداروں میں دس فی صد اور تحقیق و ترقی کے سرکاری اداروں میں بھی اتنی ہی خواتین خدمات انجام دے رہی ہیں۔ خاتون انجینئروں کی سب سے زیادہ تعداد کیرالا میں اور اس کے بعد تمل ناڈو اور کرناٹک میں ہے اور ان کے بعد ترتیب وار مہاراشٹر، آندھرا پردیش، گجرات، دہلی، مدھیہ پردیش، مغربی بنگال اور اتر پردیش کا نمبر ہے۔ گزشتہ برسوں میں انجینئری کے شعبے میں خواتین کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا ہے اگرچہ یہ اور بات ہے کہ کچھ ریاستوں میں شرح اضافہ زیادہ اور کچھ میں کم ہے۔ برقی انجینئرنگ اور الیکٹرانکس سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے شعبے ہیں ان کے بعد سول انجینئرنگ کا نمبر ہے۔ کمپیوٹر سائنس انجینئرنگ خواتین میں کم مقبول معلوم ہوتی ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ نصابات ۸۰ کی دہائی کے اوائل ہی میں

شروع کیے گیے ہیں۔ مگر حال ہی میں کمپیوٹر سائنس خواتین کی ترجیحی فہرست میں سب سے اوپر آگئی ہے۔ میکنیکل اور کیمیکل انجینئرنگ کا نمبر سول انجینئرنگ کے بعد آتا ہے اور میٹالرجی اور ایرونائیکل انجینئرنگ اور بھی نیچے ہیں۔ "دوسرے زمروں" کے تحت ماحولیاتی انجینئرنگ، آلات سازی، کان کنی ربڑ ٹکنالوجی، زرعی انجینئرنگ وغیرہ شامل ہیں۔

ہندوستان میں ترقی میں خواتین کے رول کو سمجھنے اور سراہنے کے لیے مثبت اقدامات کیے گئے ہیں۔ ملک کے چھٹے پنج سالہ منصوبے میں خواتین کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کی اسکیم کا شامل کیا جانا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ خواتین کو قومی ترقی کا جزو لاینفک سمجھا جارہا ہے۔ یہ اسکیم محکمۂ سائنس اور ٹکنالوجی نئی دہلی کے زیر اہتمام چلائی جارہی ہے۔

بائیو ٹکنالوجی، ادویہ، الیکٹرانکس، کمپیوٹر سائنس، مینجمنٹ وغیرہ میں پیشہ ورانہ تربیت حاصل کرنے کے بعد خواتین نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی سائنسی کوشش کے بڑے دھارے میں شامل ہورہی ہیں۔ پھر بھی اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ہندوستان کی نصف آبادی خواتین پر مشتمل ہے، یہ بات موجب تشویش ہے کہ خواتین کی کل آبادی کے لحاظ سے سائنسی شعبوں میں خواتین کی تعداد اتنی نہیں ہے جتنی کہ ہونی چاہیے۔ ملک کی ترقی میں انھیں برابر کا حصہ دار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ خواتین کی ایک بڑی تعداد میں سائنسی اور تکنیکی صلاحیتیں پیدا کی جائیں۔ اس کے علاوہ اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ تکنیکی مہارت رکھنے والی خواتین کی نمایاں کامیابیوں کی مناسب انداز میں تشہیر کی جائے تاکہ دوسری خواتین میں بھی تکنیکی شعبوں میں داخل ہوکر نام پیدا کرنے کی خواہش پیدا ہو۔

گوشوارہ نمبر ۱

تحقیق و ترقی کے اداروں میں خاتون سائنس داں

(یکم اپریل ۱۹۹۲ء تک کے اعداد و شمار کے مطابق)

نام ادارہ	بنیادی طور پر تحقیق و ترقی کے کاموں میں مصروف عملہ	ضمنی کاموں میں مصروف عملہ	انتظامیہ کاموں میں مصروف عملہ	کل
	(۱)	(۲)	(۳)	(۱+۲+۳)
ادارہ جاتی سیکٹر				
بڑی سائنٹی فک ایجنسیاں	۳۱۰۷	۳۴۰۲	۵۶۰۴	۱۲۱۱۳
مرکزی حکومت کی وزارتیں اور محکمے	۸۹۸	۹۹۰	۲۵۱۴	۴۴۰۲
ریاستی حکومتیں	۱۶۶۵	۱۰۶۲	۳۰۴۵	۵۷۷۲
کل ادارہ جاتی سیکٹر (اے)	۵۶۷۰	۵۴۵۴	۱۱۱۶۳	۲۲۲۸۷
صنعتی سیکٹر				
پبلک سیکٹر بشمول جوائنٹ سیکٹر	۸۲۹	۳۹۳	۳۰۲	۱۵۲۴
نجی سیکٹر	۱۹۹۱	۱۲۴۹	۱۵۴۳	۴۷۸۳
کل صنعتی سیکٹر (بی)	۲۸۲۰	۱۶۴۲	۱۸۴۵	۶۳۰۷
کل (اے + بی)	۸۴۹۰	۷۰۹۶	۱۳۰۰۸	۲۸۵۹۴

گوشوارہ نمبر ۲

اعلا تعلیم کے لیے خواتین کے داخلوں کی تعداد

شعبۂ تعلیم	۱۹۸۶ــــ۸۷		۱۹۹۲ــــ۹۳ء	
	ہزاروں میں	فی صد	ہزاروں میں	فی صد
سائنس	۲۳۱	۶٫۲	۳۱۹	۶٫۶
انجینئرنگ	۱۳	۰٫۳	۱۹	۰٫۴
ادویہ	۳۹	۱٫۰	۵۴	۱٫۱
زراعت	۳	۰٫۱	۴	۰٫۱
ویٹرنری سائنس	۱	۰٫۰۳	۱	۰٫۰۲
دیگر	۸۶۲	۲۳٫۰	۱۱۹۳	۲۴٫۸
کل	۱۱۴۹	۳۰٫۶	۱۵۹۰	۱۳٫۱

ایس۔اے۔حیات

کمپیوٹر

دورِ جدید میں آلۂ شمار یا کمپیوٹر انسانی فلاح وبہبود کے لیے سائنس کا ایک عمدہ تحفہ ہے۔ آج جہاں اس خطۂ ارض پر بڑھتی ہوئی آبادی کا بوجھ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے وہیں انسانی مسائل کا پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہونا عین فطری ہے جن کے حل کے لیے کافی غور وخوض کے بعد منصوبہ بندی درکار ہے۔ موثر منصوبہ بندی کے لیے اعداد وشمار کا سو فی صد صحیح ہونا لازمی ہے۔ اس اہم کام میں کمپیوٹر ہماری مدد کرتا ہے۔

کمپیوٹر ایک الیکٹرونک مشین ہے جو انسان کے ذریعہ چلایا (OPERATE) جاتا ہے۔ اسے استعمال کرنے والے شخص کو ذہین، سمجھ دار اور تجربہ کار ہونا چاہیے۔ معمولی سی غلطی کے سبب نقصان دہ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ اس کی ساخت میں کافی نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں۔ ابتدا میں اس کی بناوٹ بڑی پیچیدہ ہوتی تھی مگر تحقیق کے نتیجہ میں یہ تبدیل ہوتے ہوتے آج سہل ہو چکی ہے۔ آج اس کی چھوٹی شکل بھی دستیاب ہے اور امید ہی نہیں پختہ یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب اسے ہر آدمی بآسانی چلا سکے گا۔

کسی کمپیوٹر میں عام طور پر ۵ حصے ہوتے ہیں۔ یہ سبھی حصے مل کر ایک "نظام آلۂ شمار" (COMPUTER SYSTEM) بناتے ہیں۔ اس کا پہلا حصہ داخلہ یا فراہمی (INPUT DEVICES) کہلاتا ہے۔ اس میں برقی جنبش کے ذریعہ معلومات اور ضروری ہدایتوں کو بھیجا جاتا ہے وہاں سے یہ اصل کمپیوٹر (MAIN COMPUTER) میں چلا جاتا ہے۔ ابتدا میں داخلہ کا ذریعہ پنچ شدہ کارڈ رہا ہے۔ اس کے بعد کاغذ کے لمبے فیتے پنچ کر کے استعمال میں لائے جانے لگے۔ مگر اب مقناطیسی فیتے استعمال ہو رہے ہیں۔ اس کے دس انچ لمبے فیتے پر چار کروڑ خبروں کے ٹکڑے سما سکتے ہیں۔

دوسرا حصہ یادداشت (MEMERY UNIT) کہلاتا ہے۔ اس کے ذمے معلومات اور ضروری ہدایتوں کو یکجا کرنے کا کام ہے۔ یہ دس کھرب معلومات کے ٹکڑے اپنے ٹیپ (TAPE) میں جمع رکھ سکتے ہیں۔ جب کسی کمپیوٹر کا ٹیپ تیزی سے گھوم کر رک جاتا ہے اور پھر تیزی سے گھومنے لگتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ کمپیوٹر معلومات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

تیسرا جزو ہے۔ MICRO PROCESSOR۔

یہ ایک CENTRAL PROCESSING UNIT ہے۔ اس کا کام معلومات کو یادداشت تک پہنچانا ہے۔ یہ معلومات اور متعلقہ ہدایتوں کا تجزیہ (ANALYSIS) کرتا ہے۔ یہ پورے کمپیوٹر سسٹم پر اپنا کنٹرول قائم رکھتا ہے۔ آج تو اس کا سوئچ روشنی کی رفتار سے کھلتا اور بند ہوتا ہے۔ یہ ابتدائی گننے کے طریقہ پر کام کرتا ہے۔ اعشاریہ اور دس تک کے ہندسوں کے بجائے یہ محض ایک اور صفر کی بنیاد پر ہی گنتا ہے جسے اصطلاح سائنس میں BINARY CODES کہتے ہیں۔ کسی کمپیوٹر میں جو معلومات فراہم کیے جاتے ہیں انھیں سب سے پہلے BINARY CODES میں تبدیل کیا جاتا ہے اور تب اسے OPERATE کیا جاتا ہے۔ جوڑ، تفریق (گھٹاؤ) اور تقسیم کا عمل تو دیگر کسی ELETRONIC MACHINE کی طرح ہی اس میں ہوتا ہے مگر ضرب جوڑنے کے طریقہ سے کرتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے ۴۲۵ کو ۱۱۵ سے ضرب کرنا ہے تو اس میں اکائی ۵ ہے لہٰذا ضرب دینے والا ہندسہ بھی ۵ دفعہ آتا ہے اور چونکہ دہائی ایک ہے لہٰذا یہ محض ایک ہی بار آتا ہے اور اس طرح سیکڑا ایک ہے اس لیے یہ بھی ایک ہی دفعہ آتا ہے۔

425
425
425
425
425
425
425

48875

اس طرح جوڑنے پر وہی نتیجہ آتا ہے جو کہ ضرب دینے پر حاصل ہوتا ہے۔ کمپیوٹر کا چوتھا جزو نتیجہ برآمد ہونا (OUTPUT UNIT) کہلاتا ہے۔ یہ (CENTRAL PROCESSING UNIT) یعنی C.R.U سے حاصل شدہ اشارات کو کارآمد شکل میں تبدیل کرتا ہے۔ اسے ہر آدمی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

نظام آلۂ شمار کا پانچواں اور آخری حصہ BACKING STORAGE DEVICE کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اس نظام کا بہت اہم حصہ ہے۔ ان میں معلومات کو بہت دنوں تک جمع کر کے رکھا جا سکتا ہے۔ مطالبہ پر یہ دوبارہ نتائج فراہم

اعزازی سکریٹری، اسٹڈی سینٹر، گیا

کرتا ہے۔

آلہ شمار کی افادیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا بنیادی کام ARITHMETIC CALCULATION یعنی جوڑ، گھٹاؤ، ضرب اور تقسیم ہے۔ اس کے علاوہ یہ منطقی فیصلہ (LOGICAL DECISION) بھی لیتا ہے مثلاً ایک فراہم شدہ بات صحیح ہے یا غلط، دو باتیں یکساں ہیں یا کم و بیش ہیں۔ ان سبھی امور کا جواب "ہاں" یا "نہیں" میں یہ فراہم کرتا ہے۔ ایک کمپیوٹر ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ سے زائد الفاظ پڑھ سکتا ہے۔ اس میں ڈاٹا اور مخصوص ہدایتیں اس وقت تک محفوظ رہتی ہیں تا وقتیکہ انھیں مشین سے باہر الگ نہ کر دیا جائے۔ کسی حساب و کتاب کو انسانی دماغ کو کرنے میں کافی وقت لگتا ہے جب کہ یہ سیکنڈ سے بھی قبل اسے کر ڈالتا ہے۔ اس سے وقت اور محنت دونوں کی بچت ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی محنت کی کافی بچت ہوتی ہے۔ ابتدا میں اس کا مصرف تجارت تک ہی محدود تھا۔ رفتہ رفتہ مختلف دفاتر میں روزمرہ کے کاموں میں اس کا استعمال ہونے لگا۔ ایک کمپیوٹر کم از کم ایک ہزار شخص کا کام تو تنہا کر سکتا ہے۔ انجینئرنگ کے شعبہ میں اس کی مدد سے ہوائی جہاز، آبی جہاز، کار، پُل، عمارت اور دیگر مشینوں کی ڈیزائننگ (DESIGNING) کی جا سکتی ہے۔ اس سے کسی ڈیزائن کے تشفی بخش ہونے کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مواصلات اور ہوائی پرواز (AIRTRAFFIC CONTROL) میں یہ بہت معاون ثابت ہوا ہے۔ اس کے استعمال سے ہوائی جہازوں کے پروازوں کو یقینی طور پر محفوظ بنایا جا چکا ہے۔ ان دنوں ہوائی جہاز اور ریلوے کے ٹکٹوں میں کمپیوٹر کے تعاون سے نشست کو محفوظ (SEATRESERVATION) کرایا جاتا ہے۔ آج دنیا کے بیشتر ممالک میں نظم و ضبط (LAW AND ORDER) کا سلسلہ موجود ہے۔ قانون کی بحالی میں یہ مددگار ہے۔ اس کے ذریعہ حادثات کا ریکارڈ، گاڑی کے مالک، ڈرائیور، گم شدہ گاڑیاں، رپورٹس اور انگلی کے نشانات کے ریکارڈ محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ ان کے تعاون سے کسی ہنگامی صورت حال میں لمحوں میں لائحہ عمل تیار کر کے اس پر عمل کیا جائے تو اس کے مثبت اور حوصلہ بخش نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ تعلیمی مواد کو اس میں محفوظ کر کے درس و تدریس کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ نتائج کو چھاپ کر یا ٹائپ کر کے ہزاروں سطور تک کا جواب اور کسی کاروبار کا حساب و کتاب محض سیکنڈ کے اندر بنا ڈالتا ہے۔ PROCESSING یعنی کمپیوٹر میں عمل شروع کرنے میں کافی سوچ سمجھ کر معلومات کمپیوٹر کو فراہم کی جاتی ہے کیوں کہ اس کے جائزہ اختیار میں آنے کے بعد انھیں OPERATE کرنے میں صرف ایک دو سیکنڈ ہی لگتے ہیں لہٰذا زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس سے چھوٹا ہوا ہو۔ ہر جگہ اس کی کارفرمائیاں موجود ہیں۔ مختلف مقابلہ جاتی (امتحانوں کی کاپیاں کمپیوٹر کی مدد سے قلیل مدت اور کم خرچ میں جانچ لی جاتی ہیں اور انتخابات میں کچھ مقامات پر اس کا استعمال کافی تشفی بخش رہا ہے۔ دفاع کے میدان میں اس کا استعمال نفع بخش ثابت ہوا ہے یہی سبب ہے کہ آج کل آلہ شمار کا استعمال اسکولوں، اسپتالوں، دفتروں، کارخانوں، کھیل کے میدان، میدانِ جنگ، سمندر کی گہرائی اور خلا تک نہایت کامیابی کے ساتھ ہو رہا ہے۔

آج اس کا شعبہ اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ اسے باضابطہ "کمپیوٹر سائنس" کے نصاب سے دنیا میں ہر جگہ روشناس کرایا جا رہا ہے۔ انسان اور کمپیوٹر کا ساتھ اٹوٹ بن کر رہ گیا ہے۔ یہ ایک مشین ہے وہ بھی بہت ہی زیادہ حساس لہٰذا پروگرامر یا کمپیوٹر چلانے والا فرد چاق و چوبند رہتا ہے۔ اس کی معمولی غفلت سے منفی نتائج سامنے آجائیں گے جس سے ہلاکت و تباہی کا خدشہ لاحق ہو جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ کمپیوٹر میں مختلف امور کو بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے تربیت یافتہ لوگوں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

آج کل تو اور بھی زیادہ حساس اور زیادہ ADUANCED آلہ شمار کا استعمال ہو رہا ہے۔ اسے MICRO PROCURE COMPUTER کہتے ہیں۔ اس میں دو قسم کے ٹکڑے ہوتے ہیں ایک اطلاع فراہم کرتے ہیں اور دوسرے اطلاع کو یکجا کرتے ہیں۔ اسے آسانی سے معمولی مہارت رکھنے والا شخص بھی چلا سکتا ہے۔ اب تو لیزر شعلوں (LASER RAYS) نے اسے اور بھی زیادہ فعال اور کارآمد بنا دیا ہے مستقبل میں اس کے ذریعہ مزید عظیم کامیابیوں کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔ ہندوستان بھی اس کے استعمال اور تحقیق میں تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جلد ہی ہمارا ملک سائنس دانوں کے متواتر جدوجہد کے سبب سائنس کے افق پر درخشاں ستارہ بن کر منور ہو گا جس سے ہر عام و خاص کو فیض حاصل ہو گا۔ ●

بقیہ: بلند حوصلگی: مسائل کا حل

دنیا کی طرف بھاگتا ہے اور یہ سلسلہ تب تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ وہ اپنے احساسات، محسوسات اور جذبات کے ساتھ ساتھ اپنی سمجھ بوجھ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو کھو نہیں دیتا۔

اس طرح لوگ جھنجھٹوں، پریشانیوں سے آزاد ہونے کے لیے نشے کا سہارا لیتے ہیں اور اس سہارے چلتے چلتے پاگل پن کی حالت کو پہنچ جاتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی حالات میں ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے فکر اور پریشانیوں سے نجات پانے کے لیے کسی بھی طرح کی نشہ آور چیزیں کسی بھی حالت میں استعمال نہ کرنا چاہیے بلکہ مسائل کا سیدھے طور پر سامنا کرنا چاہیے اور ان سے اپنے عزائم اور حوصلوں سے نمٹنا چاہیے یہی بہترین زندگی جینے کا صحیح راستہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسائل کو اتنے بڑھے چڑھے اور غیر فطری ڈھنگ سے نہیں دیکھنا چاہیے جس کی وجہ سے زندگی بوجھ محسوس ہونے لگے۔

سازگار حالات کی طرح تکلیف دہ حالات کو بھی ضروری مانتے ہوئے ان کا مقابلہ کرنے اور مسائل کے خوشگوار اور عاقلانہ حل تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو ذہن کو سازگار بناتے ہوئے زندگی کے راستے پر آگے بڑھتے رہا جا سکتا ہے اس کے لیے زندگی سے فرار اور کسی غلط راستہ کو اپنانے کی ضرورت قطعی نہیں۔

فردوس عنبریں پٹی

دورِ جدید کے سائنسداں اور ہماری کہکشائیں

اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی یہ کائنات کس قدر وسیع ہے کہ اس کے بارے میں انسانی عقل اور اس کا علم بہت ہی محدود ہے۔ کائنات کی وسعت اعداد و شمار میں ظاہر کرنا ناممکن ہے۔ سورج ہماری زمین سے تقریباً ۳ لاکھ ۳۳ ہزار گنا بڑا ہے اور زمین سے اس کا فاصلہ تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس رفتار سے سورج سے چلنے والی ایک کرن کو زمین تک پہنچنے میں تقریباً ۹ منٹ درکار ہوتے ہیں۔ ہماری زمین سے جو کہکشاں ہمیں نظر آتی ہے کہا یہ جاتا ہے کہ اس کہکشا میں ہمارے سورج سے لاکھوں گنا لاکھوں بڑے ستارے شامل ہیں۔ جن کی روشنی برسوں میں ہم تک پہنچ پاتی ہے۔ قدرت کی صناعی پر ابھی سے حیران نہ ہوں۔ اصل حیرت تو دورِ جدید کے سائنس دانوں کے ان دعوؤں پر ہونی چاہیے کہ ہماری کہکشاں تو محض ایک حقیر ٹکڑا ہے ورنہ اس سے کہیں بڑی دس ارب کہکشائیں کائنات میں اپنے اپنے مخصوص راستوں پر محوِ سفر ہیں۔ ہماری کہکشاں ایک سیکنڈ میں ۳۷۰ میل کی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ نومبر ۱۹۸۹ء میں امریکی ماہرین فلکیات مارگریٹ کیلر اور جون ہمیرا نے خلا میں ایک "عظیم دیوار" دریافت کی تھی۔ یہ عظیم دیوار ۲۸۰ کہکشاؤں کی تھی جو ۸۰ کروڑ نوری سال کے فاصلے پر ہیں۔ (ایک نوری سال ۵۸ کھرب ۷۸ ارب ۴۹ کروڑ ۹۸ لاکھ ۱۴ ہزار میل کے مساوی ہے) اس کے بعد سب سے بڑی کہکشاں جولائی ۱۹۹۰ء میں تین امریکی ماہرین فلکیات نے دریافت کی تھیں۔ یہ کہکشاں ایک ارب ۷ کروڑ نوری سال کی مسافت پر ہے اور اسے (ABELL) ۲۰۲۹ کہکشاں کا نام دیا گیا ہے۔

زمین کی پیدائش کے بارے میں مختلف نظریات پیش کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ہماری زمین کسی بڑے ستارے کے پھٹنے کے نتیجے میں خلا میں بکھرنے والے اس کے ملبے کا ایک حصہ ہے۔ ایسے ستارے جو اپنی عمر مکمل کر لیتے ہیں وہ زندگی پوری ہونے کے بعد ایک دھماکے کے ساتھ خلا میں پھٹ جاتے ہیں۔ ان کے پھٹنے کے بعد جو پھلجھڑی سی چھوٹتی ہے اور گیس اور گرد کی صورت میں ان کا جو ملبہ بکھرتا ہے وہ کبھی کبھار کسی خوش قسمت ماہر فلکیات کی دوربین سے دیکھنے میں آجاتا ہے۔ ان پھٹنے والے ستاروں کو انفجاری ستارہ یا سپرنووا کہتے ہیں یہ ستارے پھٹتے رہتے ہیں لیکن عام طور پر ان کا مشاہدہ نہیں ہو پاتا اس لیے کہ وہ ہماری طاقتور سے طاقتور دوربین کی دسترس سے بھی دور ہوتے ہیں۔ مابعد التاریخ دور میں اب تک جو سب سے روشن "سپرنووا" دیکھا گیا ہے اسے ایس۔ این ۱۰۰۶ کہتے ہیں اسے اپریل ۱۰۰۶ء میں "بٹیا لوپی" کے قریب دیکھا گیا تھا۔ عام طور پر پھٹنے والا ستارہ چند دنوں سے چند ماہ کے اندر معدوم ہو جاتا ہے لیکن یہ روشن ترین سپرنووا تقریباً دو سال تک اپنی پھلجھڑی نما روشنیاں بکھیرتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سپرنووا تین ہزار نوری سال کی مسافت پر پھٹا تھا۔ اس کے بعد ۱۰۵۴ء ۱۶۰۴ء اور ۱۸۸۵ء میں بھی ستاروں کے پھٹنے کے بعد ان کا مشاہدہ کیا گیا تھا۔

سب سے حال میں ۲۳ فروری ۱۹۸۷ء کو ستارے کو پھٹتے ہوئے دیکھا گیا۔ یہ منظر سب سے پہلے ایان شیلٹن نے حادثاتی طور پر دیکھا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ چلی کی رسدگاہ پر موصوف آسمان کے ایک مخصوص حصے پر تحقیق کے سلسلے میں طاقتور کیمروں کی مدد سے روزانہ تصویریں کھینچ رہے تھے۔ ایک رات تصویریں اتارنے کے بعد فلم ڈیولپ کرنے کے بعد انھیں ستاروں کے جھرمٹ میں ایک دھبہ سا نظر آیا۔ پہلی بار تو انھوں نے دھبے کے بارے میں یہ سمجھا کہ یہ فلم میں کسی خراش یا خرابی کی وجہ سے ہے لیکن بعد میں جب انھوں نے دوبارہ دوربین سے مشاہدہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ دھبہ پھٹنے والا ستارہ یا "سپرنووا" ہے۔ یہ سپرنووا زمین سے ایک لاکھ ۷۰ ہزار نوری سال کی مسافت پر تھا۔ مئی ۱۹۸۷ء میں یہ اتنا روشن تھا کہ برہنہ آنکھوں سے بھی اس کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ دو تین ماہ بعد یہ ستارہ معدوم ہو گیا۔

اہل یونان کی بہت ساری دیویاں اور دیوتا تھے ان میں سے ایک دیوی کا نام "آرورا" ہے جسے "فجر کی دیوی" بھی کہتے ہیں۔ علم فلکیات میں آرورا دراصل قطبین میں گاہے گاہے نظر آنے والی وہ پراسرار روشنیاں ہیں جو آسمان سے زمین پر اترتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

باقی صفحہ پر

کلامی محلہ، نزد مسجد، اورنگ آباد، بہار

صحت کی دیکھ بھال اور ابتدائی تعلیم میں تال میل

ہندوستان ALMA ATTA اعلان (۱۹۷۸ء) پر دستخط کر کے خود کو ۲۰۰۰ء تک "سب کے لیے صحت" کا نصب العین حاصل کرنے کا پابند کر چکا ہے۔ یہ کام عوام کی حقیقی ضرورتوں اور ترجیحات کے مطابق صحت کی ابتدائی خدمات فراہم کر کے کیا جائے گا۔ دیہی علاقوں میں ان خدمات کے لیے ذیلی مراکز اور پرائمری ہیلتھ سینٹر وغیرہ قائم کیے جا رہے ہیں اور صحت کی دیکھ بھال کی خدمات کو بڑھایا جا رہا ہے۔ دسمبر ۱۹۹۱ء تک ۱۳۰۰۹۸۷ ذیلی مراکز، ۲۲۰۵۹ پرائمری ہیلتھ سینٹر اور ۵۹۷، کمیونٹی ہیلتھ سینٹر قائم کیے جا چکے تھے۔ آج کل ان کی تعداد میں مزید اضافہ کیا جا رہا ہے۔ ان مراکز صحت پر صحت کی دیکھ بھال کرنے والا عملہ بھی متعین کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان اقدامات کے باوجود دیہی عوام کی زندگی میں خاطر خواہ بہتری نہیں آئی ہے اور چوں کہ صدی کا اختتام قریب آ رہا ہے اس لیے ۲۰۰۰ء تک "سب کے لیے صحت" کے خواب کی تعبیر دور کی بات نظر آتی ہے۔

جہالت اور لاعلمی، پرانی قدریں اور پرانے عقائد، مذہبی و ثقافتی رسم و رواج اور توہمات اور عوامی تحریک کا فقدان وغیرہ صحت اور خاندانی بہبود کے پروگراموں کی کامیاب تکمیل کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ساتویں پنج سالہ منصوبے کے دوران صحت اور خاندانی بہبود کے پروگراموں کی رفتار ترقی کے جائزے کے دوران یہ محسوس کیا گیا کہ یہ پروگرام محض محکمۂ صحت اور خاندانی بہبود کا ہی ایک پروگرام ہے۔ جب کہ ترقی یافتہ اور دیگر ترقی پذیر ممالک کے مطالعاتی جائزوں سے پتا چلتا ہے کہ وہاں صحت کی دیکھ بھال کے پروگراموں کی کامیاب تکمیل کا انحصار شعبۂ صحت اور دیگر متعلقہ شعبوں مثلاً تعلیم، زراعت، دیہی ترقیات، جنگلات، اطلاعات و نشریات وغیرہ کے درمیان موثر تال میل پر ہے۔ ہندوستان میں بھی مختلف شعبوں کے درمیان تعاون کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ سریواستو کمیٹی کی رپورٹ (۱۹۷۵ء) میں سفارش کی گئی تھی کہ "سماج میں صحت کی ابتدائی دیکھ بھال کی خدمات خصوصی تربیت یافتہ کارکنان کے ذریعے فراہم کی جانی چاہئیں۔ اس طرح کی عوام کی ذمہ داری خود عوام ہی پر ہو۔" کمیٹی نے "پرائمری اسکول ٹیچروں، پوسٹ ماسٹروں اور گرام سیوکوں جیسے پیشہ ور اور نیم پیشہ ور افراد کی ایسی ٹیمیں بنانے کی بھی سفارش کی تھی جو جزوقتی بنیاد پر کام کرتے ہوئے صحت اور خاندانی بہبود کے لیے سادہ اور آسان ترغیبی، تدارکی اور معالجاتی خدمات مہیا کر سکیں۔"

قومی صحت سے متعلق حکمت عملی (۱۹۸۲ء) میں بھی اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ "صحت اور اس سے زیادہ قریبی تعلق رکھنے والے شعبوں کے درمیان موثر تال میل کو یقینی بنانا بہت ضروری ہے۔" آٹھویں پنج سالہ منصوبے میں یہ بات دوہرائی گئی کہ "منصوبے کی مدت میں مختلف شعبوں کے درمیان تفاعل کے ساتھ ساتھ سیاسی عزم اور ایک مقبول عوامی تحریک حکمت عملی کی اہم مداخلتوں کی بنیاد ہوگی۔"

صحت اور خاندانی بہبود کے شعبے اور جن دوسرے شعبوں کے درمیان تال میل کی ضرورت ہے ان میں سے ایک تعلیم کا شعبہ ہے۔ آبادی اور ترقی کے بارے میں ماہرین پارلیمان کے ایشیائی فورم کی پہلی کانفرنس میں، جو ۱۷ سے ۲۰ فروری ۱۹۸۴ء تک نئی دہلی میں منعقد ہوئی تھی، شریمتی اندرا گاندھی نے عوام میں خاندانی منصوبہ بندی کی قبولیت کے لیے عوامی رجحان اور طرز عمل کو بدلنے میں تعلیم کی اہمیت کا خاص طور سے ذکر کیا تھا۔

ہندوستان نے اپنی تعلیمی پالیسیوں اور پروگراموں میں آبادی، صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے نظریات اور مسائل کو مناسب جگہ دی ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی (۱۹۸۶ء) میں اس امر پر زور دیا گیا کہ چھوٹے کنبے کے اصول کو قومی نظام تعلیم کا ایک جزو سمجھا جائے۔ چناں چہ صحت اور خاندانی بہبود کے نظریات و مسائل کو قومی نظام تعلیم میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ نظریات اور مسائل نیشنل پاپولیشن ایجوکیشن پروگرام (NPEP) میں بھی شامل کیے گئے ہیں۔ وزارت تعلیم نے یو این ایف پی اے کی مالی اور یونیسکو کی تکنیکی امداد سے ملک میں شروع کیا ہے۔ صحت اور خاندانی بہبود کے بشمول آبادی کی جو تعلیم باقاعدہ اسکولوں اور ٹیچر ٹریننگ نصابات میں شامل کی گئی تھی وہ ساتویں منصوبے کے دوران غیر رسمی تعلیم اور تعلیم بالغان کے اداروں اور یونیورسٹیوں میں بھی شروع کی گئی۔ قومی خواندگی مشن (این ایل ایم) نے بھی اس بات پر زور دیا کہ "چھوٹے کنبے کے اصول کے تسلیم کیے جانے کا انحصار تعلیم ہے۔ خواندگی سے علم میں اضافہ ہوتا ہے جس سے

چھوٹے کنبے کے اصول کو تسلیم کرنے میں مدد ملتی ہے"۔ لہٰذا قومی خواندگی مشن کا ایک مقصد" ۱۵ سے ۳۵ سال تک کے زمرۂ عمر کے ناخواندہ اشخاص میں چھوٹے کنبے کے اصول کی اہمیت کا احساس پیدا کرنا ہے۔"

ہندوستان میں ۹۰-۱۹۸۹ء میں ۵۴۸۱۳۱ پرائمری اسکول تھے جن میں سے ۴۷۱۴۴۱ اسکول دیہی علاقوں میں اور ۷۶۶۹۰ اسکول شہری علاقوں میں تھے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ملک میں پرائمری ٹیچروں کی کل تعداد ۱۶۸۱۹۷۰ تھی۔ ان میں ۱۱۸۹۰۰۴ مرد تھے اور ۴۹۲۹۶۶ عورتیں۔ چوں کہ پرائمری اسکولوں کی بڑی تعداد دیہی علاقوں میں کام کرتی تھی اس لیے صحت کی ابتدائی دیکھ بھال اور ابتدائی (پرائمری) تعلیم کے درمیان ایک بہتر کاروباری رشتہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اگر دیہات میں کام کرنے والے صحتی عملے اور معلمین/انسٹرکٹروں کے درمیان مشترکہ فرائض کی انجام دہی کا رشتہ قائم ہو جائے تو گاؤوں کے معلمین صحت کو بڑھانے والے عملے کی حیثیت سے کام کر سکیں گے اور گاؤں کی سطح پر صحت اور خاندانی بہبود کے پروگراموں پر موثر عمل درآمد کے لیے ایک اضافی رول ادا کر سکیں گے۔

خصوصیات

زیرنظر جائزہ ریاست اڑیسہ کے ذیلی مراکز کی سطح کے گاؤوں کے چند اسکولوں میں لیا گیا تھا۔ اس کا مقصد صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کے بارے میں پرائمری اسکول ٹیچروں کے رویے کا پتا لگانا تھا۔ ۹۱-۱۹۹۰ء میں اس ریاست میں ۵۴۲۶ ذیلی مراکز کام کر رہے تھے اور مزید ۳۴۷۲ ذیلی مراکز قائم کرنے کا منصوبہ تھا۔ ریاست میں آنگن واڑیوں کی کل تعداد ۵۶۷۷، تھی۔ ذیلی مراکز میں ۸۰۷ مرد ایم پی ورکرز اور ۵۷۳۱ خاتون ایم پی ورکرز اور ۷۶۲۱ آنگن واڑی ورکرز کام کر رہے تھے۔ ریاست کے ۳۵۶۱۲ پرائمری اسکولوں میں سے ۳۲۶۰۲ اسکول دیہی علاقوں میں اور صرف ۲۰۱۹ اسکول شہری علاقوں میں تھے۔

صحت اور خاندانی بہبود کے بارے میں جائزے سے معلوم ہوا کہ ۸۰ فی صد بچے گھروں ہی میں پیدا ہوتے تھے اور غیر تربیت یافتہ دائیاں وغیرہ یہ بچے پیدا کرواتی تھیں، صرف ۳۵ فی صد شادی شدہ جوڑے خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے استعمال کر رہے تھے اور نوزائیدہ بچوں کی ۶۸ فی صد اموات پیدا ہونے کے ۲۸ دنوں کے اندر ہوتی تھیں۔ ریاست میں نوزائیدہ بچوں کی اموات کی شرح سب سے زیادہ (۱۲۲) تھی۔

مثبت رویّہ

موجودہ جائزے کا منشا رگاؤں میں صحتی عملے کے ذریعے فراہم کی جانے والی صحت اور خاندانی بہبود کی خدمات کے بارے میں مرد اور خاتون اسکول ٹیچروں کے رویے کا تجزیہ کرنا ہے۔ ایک مثبت رویّہ فکر و عمل کی بنیاد ہوتا ہے۔ ایسا رویّہ گاؤوں میں ان خدمات کی موثر کارکردگی کے لیے ایک نصب العین کا کام دے گا۔ صحت اور خاندانی بہبود کی خدمات کے تئیں اسکول ٹیچروں کے رویے کا تجزیہ جن جزئیات کی بنیاد پر کیا گیا وہ ہیں خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اور چھوٹا کنبہ، حاملہ عورتوں اور بچوں کو بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے لگانا، عورتوں کا مرتبہ اور دیر سے شادی، غذائیت اور ماحول کی صفائی ستھرائی، ذرائع ابلاغ (ٹی وی) کے ذریعے پیغام رسانی، عوام کی شرکت اور خاندانی بہبود کے کاموں کی تربیت۔

مرد اور خاتون اسکول ٹیچروں میں صحت کی دیکھ بھال اور خاندانی منصوبہ بندی کی خدمات کے بلند رجحان پایا گیا۔ مرد اور خاتون اسکول ٹیچروں کے رجحان میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ تمام ممبروں نے خاندانی بہبود کے پروگراموں میں شمولیت کے لیے مثبت رجحان ظاہر کیا اور کہا کہ وہ صحت کی بنیادی دیکھ بھال اور خاندانی منصوبہ بندی کی تربیت کے لیے ایک تجدیدی نصاب مکمل کرنا چاہیں گے۔

پیچیدگیاں اور تجاویز

جائزے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ گاؤں کے پرائمری اسکول ٹیچروں اور صحتی عملے کے درمیان قریبی تعاون اور تال میل سے گاؤں میں صحت کی دیکھ بھال کی خدمات زیادہ جرأت مندانہ بنائی جاسکیں گی اور صحت اور خاندانی بہبود کے پروگراموں پر موثر عمل درآمد سے گاؤں میں سب کے لیے صحت کا نصب العین حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

ریاست، ضلع، بلاک اور گاؤں کی سطح پر درج ذیل اقدامات سے مختلف شعبوں کے درمیان بہتر تال میل اور صحت اور خاندانی بہبود کی خدمات کی فراہمی میں اسکول ٹیچروں کو شامل کرنے میں کافی مدد ملے گی۔

(۱) شعبوں کے درمیان تال میل ڈائرکٹوریٹ آف ہیلتھ سروسز اور ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن کی سطح پر قائم کیا جانا چاہیے (جیسا کہ نقشے میں دکھایا گیا ہے) تاکہ یہ تال میل اور تعاون اوپر سے نیچے خدمات کی فراہمی کی سطح پر پہنچے۔ ریاست اور ضلع کی سطح پر تال میل خاص کر خدمات سے پہلے اور خدمات کے دوران تربیت، تربیتی نصاب کی وضع و ترتیب۔ تربیتی کیلنڈر مع نظام الاوقات کی تیاری اور ڈیپوٹیشن پر اساتذہ کی خدمات حاصل کرنے کے معاملوں میں قائم ہونا چاہیے۔ سب سے نیچے کی سطح پر تال میل صحتی عملے اور اسکول ٹیچروں کے درمیان ہونا چاہیے تاکہ وہ تربیت کی ایسی حکمت عملی زیر عمل لائیں جس سے لوگوں کا رویہ بدل کر انھیں آمادہ کیا جا سکے۔

صحت اور خاندانی بہبود کے نظریات و مسائل کو اساتذہ کے تربیتی پروگراموں میں شامل کر کے انھیں صحت و خاندانی بہبود کی خدمات کے بارے میں زیادہ باخبر اور متحرک بنایا جاسکے گا۔ اس کے بعد انھیں تجدیدی تربیت اور عملی تربیت بھی دی جا سکتی ہے۔ اسکول ٹیچروں کے تجدیدی تربیت کا اہتمام میڈیکل آفیسر ز یا ڈسٹرکٹ یا بلاک ٹریننگ آفیسرز کو کرنا چاہیے۔ مرد ٹیچروں کو ان باتوں کی ٹریننگ دی جانی چاہیے۔ (۱) صحت کی دستیاب سہولیات اور گاؤں کی سطح پر کام کرنے والے صحت عملے کے بارے میں معلومات

اور ان کے فرائض کے متعلق آگاہی۔ (۲) قومی صحت پروگرام (۳) بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے لگانا (۴) تعلیم صحت (۵) ماحول کی صفائی ستھرائی (۶) خاندانی منصوبہ بندی اور (۷) ایڈس۔

اور تعلیم صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کی تعلیم دی جاسکتی ہے۔

(۳) اسکول ٹیچروں کو گاؤں میں صحت اور خاندانی بہبود کے پروگراموں پر موثر عمل درآمد کے لیے مندرجہ ذیل فرائض انجام دینے چاہئیں۔

نقشہ
صحت اور تعلیم کے محکموں کے درمیان تعاون
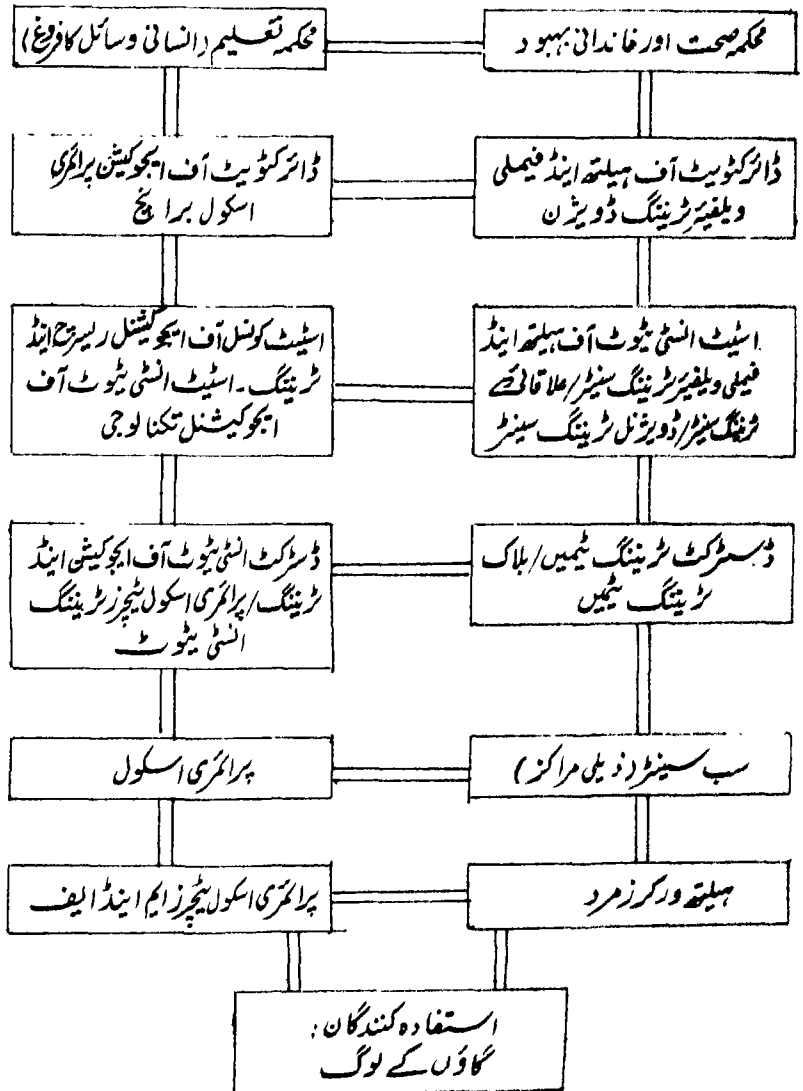
(۲) خاتون ٹیچروں کو گاؤں میں دستیاب صحتی سہولیات، گاؤں میں کام کرنے والے صحتی عملے کی قسموں، زچہ اور بچہ کی دیکھ بھال، غذائیت

(الف) صحتی عملے اور گاؤں کے لوگوں کے درمیان بچولیوں کا کام کرنا چاہیے۔

(ب) گاؤں کے لوگوں کو ترغیب دینی چاہیے

کہ وہ حاملہ عورتوں اور نومولود بچوں کو ہیلتھ سینٹر پر لے جاکر انھیں بیماریوں سے بچاؤ کے لیے ٹیکے لگوائیں۔

(ج) لوگوں کو کنبہ چھوٹا رکھنے کا اصول اختیار کرنے کا مشورہ دینا چاہیے۔

(د) اسکولی بچوں، نوجوانوں اور گاؤں کے لوگوں کی مدد سے تالابوں، گڈھوں اور کنوؤں کو صاف ستھرا رکھنا چاہیے۔

(ہ) صحت کی دیکھ بھال اور گاؤں کی ترقی کے مسائل پر غور کرنے کے لیے طلبا کے والدین کی میٹنگیں بلانی چاہیئں۔

(و) اسکولوں میں صحت اور خاندانی بہبود کے موضوعات پر مضمون نویسی، بحث مباحثوں اور مصوری کے مقابلوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

(ز) اسکول کے بچوں کو ٹیکے لگانے میں صحتی عملے کی مدد کرنا چاہیے۔

(ح) گاؤں کے دوسرے غیر صحتی کارکنان مثلاً آنگن واڑی ورکرز اور ہیلتھ گائڈوں وغیرہ کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

(ط) اسکول میں روزانہ بچوں کی صفائی ستھرائی کی جانچ کرنا چاہیے۔

(ی) کسی وبا کے پھیلنے پر صحتی عملے کی مدد کرنا چاہیے۔

(۴) صحتی عملے اور پرائمری اسکول ٹیچروں کے درمیان بہتر تال میل سے گاؤں میں صحت کی دیکھ بھال کی بہتر خدمات فراہم کی جاسکیں گی۔ ذیلی مراکز پر ضروری سازوسامان اور دواؤں کی دستیابی سے نہ صرف صحتی عملے کی صلاحیت کارکردگی بڑھے گی بلکہ لوگوں میں صحتی خدمات کے بارے میں بھروسہ اور اعتماد پیدا ہوگا۔

(۵) گاؤں میں کام کرنے والا ایک اور کارکن جس کا تعلق صحت سے ہے اور جس کے ساتھ اسکول ٹیچروں کو قریبی رابطہ رکھنا چاہیے آنگن واڑی ورکر ہے۔ آنگن واڑی ورکرز آئی سی ڈی ایس پروگرام کے تحت کھولی گئی آنگن واڑیوں میں کام کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ اسکولی اساتذہ کے قریبی رابطے سے آنگن واڑی کے بچوں کو بہتر غذا میسر آسکے گی اور

باقی صفحہ ۳۰ پر

ڈاکٹر طلعت عثمانی

جان لیوا مرض

ایڈز — خطرات اور تحفظ

ایڈز ایک ایسا مرض ہے جو "وائرس" (VIRUS) کے خاندان سے تعلق رکھنے والے جراثیم کے ذریعہ پھیلتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم ایڈز کے بارے میں مزید معلومات حاصل کریں۔ آئیے ہم یہ دیکھیں کہ وائرس کیا چیز ہے؟ دراصل وائرس ایک قسم کے جراثیم ہیں جو طاقتور خوردبین یعنی الیکٹرون مائکروسکوپ کے ذریعہ ہی دیکھے جاسکتے ہیں سائنس دانوں کے مطابق ان میں جاندار اور بے جان دونوں قسم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ان کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ کسی جاندار کے جسم میں پہنچنے کے بعد یہ "زندہ" کی طرح ہو جاتے ہیں اور ان کی تقسیم اور پھیلاؤ تیزی سے ہوتا ہے جب کہ جسم سے باہر آنے کے بعد یہ بے جان سے ہو جاتے ہیں۔ انفلوائنزا، نزلہ، پولیو، چیچک، پیلا بخار اور خسرہ کچھ ایسی بیماریاں ہیں جو اس وائرس کے ذریعہ پھیلتی ہیں۔

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ ایڈز کیا ہے؟ دراصل ایڈز (AIDS) انگریزی کے ایک لمبے نام کا مخفف ہے جس کو آٹو امیون ڈیفیشینسی سنڈروم (AUTO IMMUNE DEFICIENCY SYNDROME) کہا جاتا ہے۔ یہ مختلف علامات کا ایک مجموعہ ہے جو انسان کے جسم میں اس مرض کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ ایڈز ایک ایسا مرض ہے جو وائرس کے ذریعہ پھیلتا ہے۔ اس وائرس کا نام ہائیو (HIV) یعنی ہائی امیونو ڈیفیشینسی وائرس (HIGH IMMUNO DEFICIENCY VIRUS) ہے۔ قدرت نے ہمارے جسم کے اندر مختلف امراض سے لڑنے کی ایک طاقت رکھی ہے جسے قوت مدافعت (IMMUNITY) کہتے ہیں۔ یہ خون میں موجود خاص قسم کے ذرات یعنی ٹی ڈ سیل پر انحصار کرتی ہے۔ HIV جسم میں داخل ہو کر ان ٹی ڈ سیل کو ختم کرنے لگتا ہے جس سے جسم کی قوت مدافعت ختم ہونے لگتی ہے اور جسم ایڈز کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس مرض کی تشخیص اتفاقی طور پر پہلی مرتبہ ۱۹۸۱ء میں ہوئی جب امریکہ میں لاس اینجلس کے مقام پر کچھ ایسے مریض پائے گئے جو نمونیہ کے شکار تھے اور علاج کے باوجود ان کو شفا نہیں ہو رہی تھی۔ ان مریضوں کی جانچ اور تحقیقات کی گئیں تو ۱۹۸۳ء میں فرانس میں پاسچر انسٹی ٹیوٹ کے سائنس دانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ مریض ہائیو HIV نامی وائرس کا شکار ہیں۔

ایڈز کے پھیلنے کا طریقہ

مختلف امراض مختلف طریقوں سے پھیلتے ہیں۔ بعض امراض سانس کے ذریعہ، بعض کھانے پینے کی چیزوں سے، بعض مریض کو چھونے سے اور کچھ امراض مریض کے قریب جانے سے لگتے ہیں۔ یعنی ایک مریض سے کسی دوسرے شخص میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

ایڈز کے پھیلنے کا طریقہ یہ ہے کہ یہ تب ہی ایک شخص سے دوسرے میں منتقل ہوتا ہے جب ایک جسم کا مادہ دوسرے جسم میں منتقل ہو جائے۔ یہ مادہ دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ایک خون اور دوسرے مادہ تولید۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایڈز کا مرض تب ہی ہوگا جب ایڈز کے مریض کا خون کسی صحت مند آدمی کے جسم میں چلا جائے۔ یا ایڈز کے کسی مریض یا مریضہ کے ساتھ صحت مند آدمی جنسی اختلاط کرے۔

بعض تحقیقات سے اس بات کا بھی انکشاف ہوا ہے کہ اس مرض کا وائرس تھوک یا آنسوؤں میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس بات کو بھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ایسے مریض کا بوسہ لینے یا اس کے قریب آنے سے یہ مرض پھیل سکتا ہے۔

ایڈز کا وائرس کسی شخص کے جسم میں داخل ہونے کے باوجود کافی عرصہ تک خاموش پڑا رہتا ہے یعنی ایڈز کی علامات ظاہر نہیں ہوتیں لیکن آہستہ آہستہ یہ جسم کے اندر اپنا کام کرتا رہتا ہے اور جب اس شخص کی قوتِ مدافعت کمزور ہو جاتی ہے تب یہ وائرس اپنا کام کر جاتا ہے اور ایڈز کی علامات اس شخص میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ خاموشی کا یہ عرصہ چھ ماہ سے لے کر ۱۵ سال تک پایا جاتا ہے۔ یعنی اس تمام عرصہ میں وہ شخص بغیر کسی علامت کے اپنے اندر اس وائرس کو لیے اپنی زندگی کے معمولات انجام دیتا رہتا ہے اور اس عرصہ کے دوران اس شخص نے کسی کو اپنا خون دیا ہے یا کسی کے ساتھ جنسی اختلاط کیا ہے تو اس شخص میں ایڈز کے وائرس پہلے شخص سے منتقل ہو سکتے ہیں اور اگر کسی شخص کی قوت مدافعت

سی ۲۹۱، منٹو روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فی الوقت کمزور ہے یا جب بھی کمزور پڑتی ہے اس میں ایڈز کی علامات پیدا ہو جاتی ہیں۔

بعض لوگوں میں یہ مرض پیدائشی طور پر بھی پایا جاتا ہے۔ پیدائش سے قبل، پیدائش کے دوران یا پیدائش کے فوراً بعد بچہ میں ماں کے ذریعہ منتقل ہو سکتا ہے۔

عام طور پر یہ مرض ساحلی شہروں میں پایا جاتا ہے یا ان شہروں میں جہاں سیاحوں کی آمد و رفت زیادہ ہوتی ہے۔ جہاں طوائفیں رہتی ہیں ان علاقوں میں بھی یہ مرض اکثر پایا جاتا ہے۔

علامات

جسم کے اندر قوتِ مدافعت کمزور ہو جانے کے سبب بھی یہ مرض پیدا ہو سکتا ہے مثلاً انفلوائنزا، نزلہ، زکام، نمونیہ، آنتوں کی خرابی، جسم کی لاغری وغیرہ۔ اہم بات یہ ہے کہ مریض علاج کے باوجود ٹھیک نہیں ہوتا اور مرض بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کافی دن بعد جانچ اور ایڈز کے مخصوص ٹیسٹ کرنے سے ہی مرض کی تشخیص ہوتی ہے۔

تشخیص

اس مرض کی تشخیص دو طرح کے ٹیسٹوں کے ذریعہ کی جا سکتی ہے۔ پہلا ایلیسا (ELISSA) ٹیسٹ جس کا پورا نام اینزائم لنکڈ امیونوسوربنٹ ایسے (ENZYME LINKED IMMUNOSORBANT ASSAY) ٹیسٹ ہے۔ اس ٹیسٹ میں وائرس کے جسم میں داخل ہونے کے بعد جسم میں جو اینٹی باڈیز بنتی ہیں ان کی موجودگی کا پتا لگایا جاتا ہے۔ یہ سستا ٹیسٹ ہے۔ دوسرا ویسٹرن بلوٹ (WESTERN BLOT) ٹیسٹ کہلاتا ہے۔ بہ نسبتاً مہنگا لیکن توثیقی ٹیسٹ ہے۔

علاج

ایڈز مرض کو ختم کرنے کے لیے ابھی تک کوئی دوا دریافت نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن کچھ دوائیں ایسی ضرور ہیں جو مرض کی علامات کو کم کر سکتی ہیں۔ ان کو علامات و شکایت یا مرض کے اعتبار سے استعمال کیا جاتا ہے۔

پرہیز

ہم جانتے ہیں کہ اس مرض کی دو اہم وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ با سبب خون کا تبادلہ ہے۔ یہاں احتیاط اس بات کی رکھنی چاہیے کہ ہر اس چیز سے بچا جائے جس کے ذریعہ ایک انسان کا خون دوسرے انسان کے جسم میں داخل ہونے کا امکان ہو۔ مثلاً کسی کی مسواک یا ٹوتھ برش استعمال نہ کریں کیوں کہ مسوڑھوں سے خون آنا آج ایک عام بات ہے۔ ایسے کسی شخص کی مسواک یا برش میں خون کے ذرات لگے رہ سکتے ہیں اور اگر یہ کوئی دوسرا شخص استعمال کرتا ہے تو اس کے جسم میں یہ خون کے ذرات داخل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح کسی دوسرے کا بلیڈ یا استرا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ بازار میں شیو یا حجامت بنوانے سے پہلے استرا اچھی طرح صاف کرالیں یا اس کا بلیڈ نیا لگوالیں۔۔۔

انجکشن لگواتے وقت خاص طور سے احتیاط رکھنی چاہیے یا تو صرف ایک بار استعمال ہونے والی سیرنج استعمال کریں یا نئی سوئی لگوائیں۔ بہتر ہوگا اپنی سوئی سیرنج خرید کر لے جائیں اور بالفرض پرانی شیشے والی سیرنج سوئی استعمال کرنی ہی پڑے تو اس کو پانی میں اچھی طرح ابال لیں۔

اگر گھر کے کسی فرد کو کسی آپریشن، مرض یا حادثہ کے نتیجے میں خون دینا پڑے تو کوشش کریں کہ گھر ہی کا کوئی فرد خون کا عطیہ دے۔ پیشہ ور لوگوں سے خون ہرگز نہیں لینا چاہیے کیوں کہ یہ لوگ عام طور پر اس مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ بلڈ بینک سے خون لیتے وقت بھی اچھی طرح جانچ کریں کہ اس کو ایڈز کے جراثیم سے پاک کرکے پاس کیا گیا ہے یا نہیں۔

جنسی بے راہ روی سے بچنا چاہیے۔ طوائفوں، ہیجڑوں اور ہم جنسوں میں یہ بیماری کثرت سے پائی جاتی ہے۔ اسی لیے ان سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے اور ان سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے بھی بچنا چاہیے۔

صحت کے اصولوں پر عمل کرنا چاہیے مثلاً صبح سویرے اٹھنا، ورزش یا چہل قدمی کرنا، متوازن مناسب غذا لینا، صاف ستھرا رہنا تاکہ جسم کی قوتِ مدافعت کمزور نہ ہو اور کسی بھی بیماری کا حملہ جسم پر نہ ہو سکے۔ ان سب باتوں پر عمل کرکے کوئی بھی شخص ایڈز جیسے موذی مرض سے بچا رہ سکتا ہے۔ ●

بقیہ: کیا آپ جانتے ہیں؟

ہیں۔ اعلاد جمع خدمت انسیٹ۔ ۲ اے سے حاصل ہو رہی ہیں۔ انسیٹ۔ ٹو بی سیٹلائٹ کے لیے چھوٹا شمال۔ جنوب اسٹیشن کیپنگ (این ایس ایس کے) عمل اگست ۱۹۹۵ء میں انجام دیا گیا۔

☆ انسیٹ۔ ۲ سی۔/۲ ڈی سیٹلائٹ ڈھانچہ حسب معمول کام کر رہا ہے۔ انسیٹ ۲ سی۔ اگست ۱۹۹۵ء میں اور انسیٹ۔ ۲ ڈی۔ ۱۹۹۶ء میں داغے جانے ہیں۔ دو اعلیٰ طاقتی ٹرانسپونڈروں میں سے ایک کو موبائیل سیٹلائٹ سروس ٹرانسپونڈروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ مجموعی آن بورڈ جنریشن انسیٹ ۲ سی/ ٹو ڈی کے لیے ۱۶۰۰ واٹ کی ہے جب کہ انسیٹ۔ ۲ اے/ ۲ بی میں ۱۰۰ واٹ کی ہے۔ سیٹلائٹ کا ڈھانچہ فراہم ہو گیا ہے اور اس کی تشکیل جلد شروع ہوگی۔

☆ خلائی سائنس کے محکمے نے ۳۰ جنوری ۱۹۹۵ء کو واشنگٹن کے ایک بین اقوامی ٹیلی مواصلات سیٹلائٹ آرگنائزیشن (انٹیلاسٹ) کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے۔ اس کے تحت صلاحیت کا ایک حصہ (۳۶ ایم ایچ کے ۱۱ ٹرانسپونڈروں کو) اس آرگنائزیشن کو پٹے پر دیا جائے گا۔ یہ آرگنائزیشن اس کا استعمال اپنے صارفین کے لیے کرے گا۔ اس طویل المدت معاہدے کو حکومت ہند اور انٹیلاسٹ کے بورڈ آف گورنرز نے اپنی منظوری دے دی ہے۔ معاہدے کے شرائط کے تحت ٹرانسپونڈروں کی لاگت دس برسوں میں دس کروڑ امریکی ڈالروں کے بقدر ہوگی۔

ڈاکٹر عرفان علیمی

پلیگ ـــ ایک وبائی مرض

چند ماہ قبل پلیگ (طاعون) اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ ملک کے مختلف اضلاع (سورت، بمبئی، دہلی، کلکتہ اور گجرات وغیرہ) میں پھیلا اور قیامت برپا کر کے رخصت ہو گیا۔ پورے ملک میں خوف و دہشت کا ماحول پیدا ہو گیا، بیرونی ممالک کی پروازیں بند ہو گئیں، مال کی آمدات و برآمدات کا سلسلہ ملتوی ہو گیا، ڈاک و تار کا نظام منقطع ہو گیا، سیاحوں کی آمد پر پابندی لگ گئی، قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ اس طرح کثیر زرمبادلہ کا نقصان ہوا اور ملک کی مالی معیشت بری طرح متاثر ہوئی۔

پلیگ کیا ہے؟

طاعون یا پلیگ ایک متعدی مرض ہے جو ایک مخصوص جرثومہ YERSINIA-PESTIS کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ اس مرض کا اصل سبب چوہے ہوتے ہیں۔ بیماری چوہوں کے ذریعے پھیلتی ہے اور پھیلانے کا کام پسّو انجام دیتے ہیں۔ جب پسّو چوہوں کے جسم سے چمٹ کر اس کا خون چوستے ہیں تو اس مرض کا جرثومہ ان میں منتقل ہو جاتا ہے اور آنتوں میں پرورش پاتا ہے۔ یہ پسّو ایک چوہے سے دوسرے چوہے پر پہنچتے رہتے ہیں اور اس طرح جراثیم دوسرے چوہوں میں بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ چوہوں کی ہلاکت کے بعد یہ پسّو خوراک کی تلاش میں انسانوں کو اپنا شکار بناتے ہیں اور جراثیم کو انسانوں میں داخل کر دیتے ہیں۔

اس مرض کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اس مرض کا حوالہ پرانی کتابوں میں ملتا ہے۔ ۵۴۳ء میں یہ مرض مصر سے شروع ہو کر افریقہ، شام، فلسطین و قسطنطنیہ سے ہوتا ہوا ایشیا، یورپ و لندن تک پھیل گیا تھا۔ ہمارے ملک میں یہ وبا غالباً عہد اکبری میں قرون وسطیٰ سے آئی تھی جہاں اسے بلیک ڈیتھ کا نام دیا گیا تھا اور جہاں کروڑوں افراد ہلاک ہوئے تھے۔ جہانگیر کے عہد میں یہ وبا بڑی تیزی سے پھیلی تھی اور لاکھوں انسانی جانوں کو اپنا شکار بنایا تھا۔

پلیگ کی قسمیں

علامات و عوارضات کے اعتبار سے اس مرض کی درج ذیل قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) گلٹی والا طاعون (BUBONIC PLAGUE)

(۲) نمونیائی طاعون (PNEUMONIC PLAGUE)

(۳) عفونتی طاعون (SEPTICAENIC PLAGUE)

گلٹی والا طاعون

اسے طاعون غدوی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سب سے عام قسم کا پایا جانے والا طاعون ہے۔ اس قسم کے طاعون میں مبتلا ہونے پر مریض سخت بے چینی اور بے قراری محسوس کرتا ہے۔ لرزنے کے ساتھ تیز بخار آتا ہے۔ پیاس کی شدت ہوتی ہے۔ جسم میں پائے جانے والی گلٹیوں میں سوجن آ جاتی ہے اور تیز درد ہوتا ہے۔ خاص طور پر کنج ران کے غدود متورم ہو جاتے ہیں اور بغل کی گلٹیاں بھی سوج جاتی ہیں۔ مرض کی تشخیص ہونے پر جراثیمی اثرات پورے جسم میں پھیل جاتے ہیں۔

عفونتی طاعون

یہ گلٹی والے طاعون سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے لیکن دیکھنے میں بہت کم آتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ گلٹی والا طاعون ہی کبھی کبھی عفونتی طاعون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے طاعون میں مرض کی سمّیت پورے جسم میں پھیل جاتی ہے۔ سب سے پہلے سر کا درد شروع ہوتا ہے۔ بے خوابی کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ مریض پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ قے اور دست کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور مریض بے ہوش بھی ہو جاتا ہے۔ جلد کے نیچے جریان خون ہونے لگتا ہے جس کے سبب جسم پر سیاہ دھبے پڑ جاتے ہیں۔

نمونیائی طاعون

اس قسم کا طاعون سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہوتا ہے۔ اس قسم کے طاعون میں تعدیہ کی تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔ نمونیائی طاعون کہلانے کی وجہ یہ ہے کہ جراثیم پھیپھڑوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور نمونیا جیسی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ اس قسم کے طاعون میں بھی تیز بخار آتا ہے۔ سینے میں درد ہوتا ہے۔ غدود میں سوجن آ جاتی ہے۔ کھانسی آتی ہے اور کبھی کبھی کھانسی کے ساتھ بلغم و خون بھی آنے لگتا ہے۔ جراثیم انسان کے لعاب دہن تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی سبب سے اس قسم کے طاعون میں مبتلا مریض کے بلغم اور چھینک سے صحت مند افراد بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔

بیگم سرائے۔ الٰہ آباد ۲۱۱۰۱۵

احتیاطی تدابیر

احتیاطی تدابیر یہ ہے کہ گنجان آباد علاقوں میں رہائش ترک کرکے کھلے مقامات میں عارضی رہائش اختیار کی جائے، چوہوں کا صفایا کرنے کی تدابیر کی جائیں، گھر کی صفائی کا خاص خیال رکھا جائے، کہیں غلاظت اور پانی کے جماؤ نہ ہونے دیا جائے، کھانے پینے کی اشیاء کو ڈھک کر رکھا جائے، کیڑے مار دواؤں کا چھڑکاؤ کیا جائے تاکہ پسو کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ اگر طاعون کی وبا پھوٹ پڑے اور چوہے مرنے لگیں تو انھیں براہ راست ہاتھ سے نہ پکڑیں۔ چوہوں کی ہلاکت کی اطلاع فوراً محکمہ صحت کو دیں۔ جب یہ یقین ہو جائے کہ چوہوں کا خاتمہ ہو گیا ہے تو گھر میں موجود چوہوں، بلوں، سوراخوں اور درازوں کو بند کر دیں۔ یہ خیال رکھیں کہ کہیں باہر سے چوہے گھر میں داخل نہ ہوں۔ رومال یا کسی کپڑے سے ناک اور منہ ڈھک کر گھر سے باہر نکلیں۔ طاعون زدہ علاقوں سے آنے پر کپڑوں کو کم از کم ۲۰ منٹ تک گرم پانی میں ابالیں۔ اگر گھر کا کوئی فرد اس مرض میں مبتلا ہو جائے تو اسے ہاسپٹل پہنچا دیں۔ اگر گھر میں ہی (اس مرض سے متاثرہ) مریض کو رکھنا مجبوری ہو تو اس سے چند فٹ کا فاصلہ ضرور رکھیں تاکہ اس کے چھینک اور تھوک سے گھر کے دوسرے صحت مند افراد محفوظ رہ سکیں کیوں کہ اس کے جراثیم رطوبت میں زندہ رہتے ہیں۔ فرش پر سونے سے پرہیز کریں کیوں کہ پسو ۲ سے ۳ فٹ کی اونچائی تک اڑ سکتے ہیں۔ اس لیے وبا پھیل جانے کی صورت میں ٹخنوں تک کے موزے اور دستانوں کا استعمال کریں۔

طاعون کا ٹیکہ

طاعون کا ٹیکہ لگانا بھی اچھی احتیاطی تدابیر ہے تاہم اسے مکمل طور پر مانع مرض نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ ماہرین کے مطابق ٹیکے کے اثرات محدود ہوتے ہیں۔ ٹیکے کا استعمال صرف مرض سے بچاؤ کے لیے کرنا تو مناسب اور مفید ہے لیکن اس سے وبا کا خاتمہ ممکن نہیں ـــــ عالمی ادارہ صحت کے مطابق اسے پلیگ کے کنٹرول کے لیے نہیں استعمال کرنا چاہیے۔ یہ اس وقت کارآمد ثابت ہوتا ہے جب وبا پھیلنے کے ایک ہفتے پہلے لگایا جائے اور اسے اس حال میں دو بار لگنا چاہیے۔

علاج

مرض میں مبتلا ہونے کی صورت میں طب جدید کے مطابق ضد حیوی ادویات (ANTI BIOTICS) مثلاً ٹیٹرا سائکلین، اسٹریپٹو مائی سین، کینامائی سین وسلفومائڈس کا استعمال موثر و مفید ثابت ہوتا ہے۔ حالیہ وبائی صورت میں ڈوکسی سائکلین بھی موثر ثابت ہوئی ہے۔

یونانی طریقہ علاج

وبا پھوٹ پڑنے کی صورت میں حفظ ماتقدم کے طور پر متاثرہ علاقوں کے صحت مند افراد کو درج ذیل نسخہ استعمال کرنا چاہیے۔

نسخہ :۔ مرمکی، حدوار شیریں، طباشیر کبود، زہر مہرہ خطائی، درونج عقربی اور کافور خالص سب کو ہم وزن لے کر سفوف بنا کر عرق گلاب میں گھس کر چنے کے برابر گولیاں بنالیں اور ۲-۲ گولی صبح وشام عرق گلاب یا عرق بید مشک استعمال کرنے سے مرض سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔

طاعون کی تازہ صورت حال

عالمی ادارہ صحت کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق طاعون دنیا میں آج بھی موجود ہے اور افریقہ، ایشیا کے علاوہ جنوبی اور شمالی امریکہ کے لوگ اس کا شکار ہو رہے ہیں۔ تازہ اطلاعات کے مطابق سال گزشتہ (۱۹۹۴ء) میں زائرے میں یہ وبائی صورت میں پھوٹ پڑا تھا۔ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۹۲ء کے عرصے میں ۱۴۸۵۶ افراد اس مرض میں مبتلا ہوئے تھے جن میں سے ۱۴۵۱ افراد کی موت واقع ہو گئی تھی۔ یہ تعداد دنیا کے ۲۱ ممالک کی ہے۔

ہندوستان میں طاعون سے مرنے والوں کی تعداد

سال	اموات
۱۹۴۸ء	۲۳۱۹۱
۱۹۵۰ء	۱۸۸۱۳
۱۹۵۲ء	۳۸۹۴
۱۹۵۴ء	۲۰۵
۱۹۵۶ء	۱۹۵
۱۹۵۸ء	۲۰۶
۱۹۶۰ء	۱۰۸
۱۹۶۲ء	۳۰۰
۱۹۶۴ء	۱۵
۱۹۶۶ء	۸
۱۹۶۸ء	صفر
۱۹۹۰ء	صفر

بقیہ: صحت کی دیکھ بھال اور ابتدائی تعلیم میں تال میل

اسکول کی سطح سے پہلے کی ابتدائی تعلیم بھی بہتر ہوگی۔

ان کارکنان اور اساتذہ کو بوقت ضرورت ہیلتھ گائڈوں کی مدد بھی کرنا چاہیے۔ نہ صرف یہ بلکہ انھیں گاؤں میں صحت اور خاندانی بہبود کے پروگرام کے لیے کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کی بھی مدد کرنی چاہیے۔

(۶) اسکول ٹیچروں کو گاؤں پنچایت کے اراکین کے تعاون سے گاؤں میں قیام پذیر خاتون ہیلتھ ورکر کی حفاظت اور سلامتی کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ اگر ہیلتھ ورکر گاؤں کے ذیلی مرکز کے کوارٹر میں رہے تو اس کے اور اسکول ٹیچروں کے درمیان بہتر رابطہ قائم ہو سکتا ہے اس سے خاتون ہیلتھ ورکر کو بھی گاؤں والوں کو بروقت صحتی خدمات بہم پہنچانے میں مدد ملے گی۔ مرد اور خاتون ہیلتھ ورکر کو وقتاً فوقتاً "ابتدائی ملازمت ٹریننگ" بھی دی جانی چاہیے۔

مختلف شعبوں کے درمیان قریبی تعاون اور تال میل سے صحت اور خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام پر موثر عمل درآمد میں بہت مدد ملے گی اور دیہی عوام کی زندگی کو بہتر بنایا جا سکے گا۔ یہ مثال غلط نہ ہوگی کہ صحت اور خاندانی بہبود کا پروگرام ایک ایسا کھیل ہے جو شعبۂ صحت کی کپتانی میں کھیلا جاتا ہے اور صحت سے تعلق رکھنے والے شعبوں کا عملہ اس میں کھلاڑیوں کی حیثیت سے حصہ لیتا ہے۔ اس کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ سب کھلاڑی پوری جانفشانی اور باہمی تال میل سے اپنا کردار ادا کرتے ہیں یا نہیں۔ ●

محمد آصف

ونوبا بھاوے ــــ ایک آفاقی انسان

آچاریہ ونوبا بھاوے کو عرف عام میں ونوبا جی یا ونوبا کے نام سے پکارتے ہیں۔ ان کی شہرت کا راز بھودان تحریک کی کامیابی میں مضمر تھا۔ گاندھی جی ونوبا جی کی روحانیت کے معترف تھے اور ان کے خیالات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ونوبا جی کی بڑائی اور عظمت کو سمجھنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ گاندھی جی، ونوبا جی کو اس وقت سے مانتے تھے جب کہ وہ ابھی بیس سال سے بھی کم عمر کے تھے۔ ونوبا جی نے ۱۹۱۶ء میں گاندھی جی کے آشرم میں شمولیت کی۔ اس موقع پر گاندھی جی نے ونوبا کے والد محترم کو لکھا: ”آپ کا بیٹا ونوبا میرے ساتھ ہے۔ اس نے اتنی کم سنی میں اعلا روحانی اقدار حاصل کر لی ہیں اور اس قدر ریاضت کی ہے، جس کے حاصل کرنے میں مجھے برسہا برس کی صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہے“ اس کے ایک سال بعد سی، ایف اینڈریوز سابرمتی آشرم میں آئے تو گاندھی جی نے ونوبا جی کے بارے میں یہ خیالات ظاہر کیے: ”ونوبا اس آشرم کے چند موتیوں میں سے ایک ہے ان کی آمد دیگر لوگوں سے مختلف ہے، دوسرے لوگ آشرم میں آشیرواد حاصل کرنے کے لیے آئے ہیں لیکن ونوبا کے آشیرواد کی خود آشرم کو ضرورت ہے۔

جواہر لال نہرو نے ونوبا جی سے پہلی بار جب سیوگرام کے تعمیری کاموں میں مصروف کارکنوں کی کانفرنس میں ملاقات کی تو ان سے رہنمائی حاصل کرنا چاہی، یہ کانفرنس مارچ ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کے سانحہ قتل کے بعد بلائی گئی تھی۔ جواہر لال نہرو نے ایک بار کہا تھا: ”جب کبھی مجھے کوئی دشواری پیش آتی ہے، یا میں کسی مسئلے میں الجھ جاتا ہوں، تو مجھے گاندھی جی یاد آنے لگتے ہیں۔ لیکن چونکہ باپو اب اس دنیا میں نہیں ہیں تو مجھے یکایک ونوبا کا خیال آتا ہے جن کو میں گاندھیائی افکار و روایات کا بہترین شارح مانتا ہوں۔ جے پرکاش نرائن نے ونوبا جی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا: ”تاریخ میں راستہ دکھانے والے مفکرین اور انقلابی شخصیتوں کے ظہور میں آنے کے بعد ان کے فلسفۂ حیات کی تفسیر بتانے والے لوگ پیدا ہوا کرتے ہیں جو ان کے افکار و فلسفہ کو ترتیب و تشکیل دیا کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے جیسا کہ گاندھی جی جنھوں نے ونوبا جی کے فلسفہ کی تشریح کی۔ کہا جاتا ہے کہ گاندھی جی عزت و احترام کے جذبہ سے ونوبا جی کے چرن چھوتے تھے۔

ونوبا جی ہندوستان کے منظر نامے پر ۱۹۴۰ء میں ابھرے۔ بھودان تحریک کے خالق کی حیثیت سے انھوں نے عالمی شہرت پائی۔ ۱۹۵۰ء اور اس کے بعد کے عرصے میں ان کے نام کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کے درشن کے لیے باہر ملکوں کے لوگ آیا کرتے تھے۔ انگریزی اخبارات میں ان کا چرچا رہا کرتا تھا۔ اپنے خیالات کی اپج اور نئے افکار کی وجہ سے اپنے اور پرائے سبھی ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہیلیم ٹینی سن نے ان کو ایک شمع یا موم بتی سے تشبیہ دی۔ یہ موم بتی ان کے بقول پڑوس کی ایک موم بتی سے روشن ہوئی اور پھر مسلسل اپنی روشنی دیتی رہی۔ ایک برطانوی مفکر ڈونالڈ گروم نے لکھا کہ ”ونوبا جب بیٹھے ہوتے ہیں تو وہ کمزوری اور نقاہت کی تصویر ہوتے ہیں لیکن جب تقریر کرنے لگتے ہیں تو ان میں قوت، طاقت، مزاح، دوسروں کے لیے جذبۂ خیر سگالی سبھی کچھ ہوتا ہے، اس کمزور جسم میں بلا کی روحانی طاقت ہوتی ہے جس سے وہ تخلیقی کاموں کی طرف مائل ہوتے ہیں اور جس سے دوسرے تحریک عمل حاصل کرتے ہیں۔ بھودان تحریک گاندھی جی کے دور سے ہی پُرامن خاموش زبردست انقلاب تھی لوئی فشر نے بھودان تحریک کو مشرقی دنیا کا عظیم ترین تخلیقی عمل بتایا تھا۔ بڑی بات یہ کہ اس سے نہ صرف ہندوستان کے مفکر متاثر ہوئے بلکہ باہر ملکوں والے بھی اس نادر خیال پر حیران تھے۔ بہت سے غیر ملکی تو ان کے ساتھ پدیاترا پر نکل پڑے۔ انھوں نے آشرم میں رہ کر زندگی کے وہ تجربات بھی حاصل کیے جو وہاں کے رہنے والوں کو ہوا کرتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی لوگ ہیں جو ہندوستان تو نہیں آئے لیکن اپنی جگہ رہتے ہوئے بھی ونوبا جی کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مثال کے طور پر فرانس کے ایک اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر ایم پی پیرٹ (M.P. PERRET) انھوں نے ونوبا جی پر ایک نظم لکھ ڈالی اور اسے ہندوستان کے سفارت خانے میں بھیج دی۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔ اس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔

گزشتہ شام، انھوں نے ایک خاموش مجمع میں تقریر کی۔ اس جگہ گاؤں والے تھے۔ ان کا موضوع بھی گاؤں تھا۔ انھوں نے گاؤں والوں سے کہا کہ انھیں نہ صرف کچھ ضروری بلکہ سب کا سب سامان، ان لوگوں کو دینا ہے جن کے پاس سوائے

کوارٹر شری ظہیر الدین خاں، نزد ریلوے لائن غازی آباد، یوپی

امید کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس طرح ذہن کی تقسیم کے عمل سے انھوں نے زبردست ہندوستانی امیدوں کو نئی زندگی بخشی۔ ہر شخص کو یہ محسوس ہوا کہ گاندھی جی ایک بار پھر اس دھرتی پر چل رہے ہیں اور غریب و بے نوا عوام کو دیکھ کر، جو ان کے دل میں بسے تھے، وہ مسکرا رہے ہیں۔ رات نے دوبارہ گھیر لیا ہے، کل سویرے چڑیاں چہچہائیں گی اور خوشبو دار صبح میں ان کی آواز سنی جائے گی اور ونوبا جی سڑکوں پر اسی طرح چلتے پھرتے نظر آئیں گے جیسا کہ ایک دریا جس کی چال ہمیشہ بنی رہتی ہیں اور جس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔

بین اقوامی اعزاز کے طور پر ونوبا جی کو ۱۹۵۸ء میں مَگ سے سے (MAG SAYSAY) ایوارڈ عطا کیا گیا اس وقت ہندوستان میں امریکی سفیر ایلس ورتھ بُنکر نے کہا تھا کہ ونوبا جی کا کمزور جسم اور ان کی عظیم اتما قدیم ہندوستانی روایات کی روح تھی۔ اس سے قبل اسی سفیر نے یہ بھی کہا تھا کہ اگرچہ بھودان کے تحریک اور سرودے ہندوستان کے دیہات کی دھول بھری سڑکوں پر پہنچی تھی تاہم اچاریہ کے فلسفۂ حیات کے مضمرات بین اقوامی منظر نامے میں عظیم سیاسی مفاہیم کے حامل ہیں۔ برٹرنڈ رسل نے ونوبا جی کو ۱۹۶۲ء میں لندن میں نیو کلیر مخالف مارچ میں شرکت کی دعوت دیتے ہوئے لکھا کہ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا وجود انسانی معاملات میں ضمیر کے کردار کی علامات واضح کرنے کے لیے اس دنیا میں آیا ہے۔"

ونوبا جی بلاشبہ ایک نیشنلسٹ تھے لیکن ان کی دیش بھگتی، گاندھی جی کی طرح سے ہی، اعلا ترین اقدار کی حامل تھی۔ ایک طرح سے وہ آفاقی انسان تھے اور پوری دنیا کے شہری تھے۔ انھوں نے بڑی عقیدت و احترام سے سبھی مذاہب کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ انسانوں کے درمیان کسی قسم کے فرق کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی سوچ فرقہ، ذات، محدود قومی وابستگی وغیرہ سے بالاتر تھی، ان کے خیال میں سبھی مذہبی کتابیں یکساں اخلاقی درس دیتی ہیں۔ انھوں نے زندگی کے فلسفہ کو یوں بیان کیا ہے۔

"ہمارا تعلق پوری دنیا سے ہے، ہم کسی ایک ملک کے شہری ہونے پر فخر نہیں کرتے، ہم کسی ایک مذہب کے پیرو کار ہونے پر ضد نہیں کرتے، نہ ہی ہم خود کو کسی ایک فرقے، ذات سے باندھتے ہیں۔ دنیا کے بہترین خیالات کے باغیچے کی سیر ہی ہمارے مطالعے کی محنت ہے۔ ہماری برابر کوشش یہی ہے کہ ہم ان بہترین خیالات کو ہضم کریں۔ ان تضادات کے درمیان ہم آہنگی ہی ہمارا کامیاب عقیدہ ہے۔"

اگر نوعِ انسانی کو نیوکلیر جنگ یا معاشی عدم توازن کے بحران سے بچانا ہے تو ونوبا جی کی تعلیمات سے استفادہ کرنا ہوگا۔ انھوں نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کے بدلے ہوئے حالات کو سامنے رکھا اور ہندوستان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ وسنت نارگورکار نے ونوبا جی کے بارے میں ۱۹۶۲ء میں لکھا تھا، وہ آج بھی صحیح ہے: ونوبا جی ہمارے درمیان میں ہیں لیکن ان کا تعلق آنے والی نسلوں سے ہے، اس طرح وہ مستقبل کے انسان ہیں۔ اس طرح وہ مستقبل دور نہیں جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے اور ہر لمحہ اور ہر آن مستقبل کے تقاضوں کو بدلتا جا رہا ہے۔ ●

بقیہ: نئی حقیقت نگاری: منٹو کی دین

بولیاں سناتا تھا۔ استاد کا دامن سرکتا جاتا تھا۔ وہ اتنا متاثر ہوئے انھوں نے کرسی سے اٹھ کر منٹو کو گلے لگا لیا۔

میرے یار نوں مندا نہ بولیے
تے میری بھانویں گت پٹ لئیے
مینوں اج دی رات نہ چھیڑیے
مہندی والے ہاتھ جوڑ دے
لب جان گے یار گواچے
تے بیڑی پالے پتّاں لوڑے

منٹو کی بے وقت موت نے جہاں اردو افسانے سے کئی منگو کوچوان اور کئی سوگندھیاں چھین لیں وہاں ان دیہاتی بولیوں سے ان کے بول چھین لیے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ منٹو اپنے ایام میں ایک نیا ادب تعمیر کر رہا تھا۔ ایسا ادب جس میں پرندوں کی اڑان، بنجاروں کا سنگیت، درویش کا رقص، مدہوشی کا عالم اور زندگی کا نغمہ ہوتا ہے۔ وہ اردو ادب کا سب سے بے باک اور بانکا ادیب تھا۔ منٹو نے رومانیت کی روایت کو رد کیا اور ایک نئے ادب کی بنیاد ڈالی جو جذبات سے تہی ہے۔ اور حقیقت پر مبنی ہے۔ منٹو پر جن ادیبوں نے گہرے اثرات چھوڑے ان میں چیخوف، بالزاک اور فلابیر نمایاں ہیں۔ کئی افسانوں مثلاً 'بو'، 'کھول دو'، 'نیا قانون' میں تو وہ ان ادیبوں کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ منٹو کی سماجی حقیقت نگاری میں جو تیکھا پن ہے، جو طنز ہے وہ ان میں نہیں ہے جن سے وہ متاثر ہوا ہے۔ منٹو نے طوائفوں پر بے تحاشہ لکھا اور وہاں بھی ایسی حقیقت نگاری سے کام لیا جس کی مثال نہ پہلے تھی اور نہ بعد میں۔ وہ زندہ حقیقتوں سے بچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تو صرف حقیقت بیانی کی ہے۔

منٹو اردو ادب کا سیاہ حاشیہ نہیں بلکہ افسانہ اردو کے صحرا میں ایک نخلستان نظر آتا ہے۔ وہ اردو ادب کا ایسا گنجا فرشتہ تھا جس نے بڑے سے بڑے فرشتے کو بے نقاب کیا۔ افسانوں کی جھوٹی دنیا کا سچا آدمی۔ آج منٹو کو اس دنیا سے رخصت ہوئے ۴۰ سال ہو گئے ہیں لیکن دنیا آج بھی اسے یاد کرتی ہے۔

اپنی چھوٹی سی کہانی "بیگو" میں منٹو ہم سے اس طرح رخصت لیتا ہے۔

"جب اس کو غسل دینے لگے تو اسپتال کے ایک نوکر نے مجھے بلایا اور کہا۔ ڈاکٹر صاحب اس کی مٹھی میں کچھ ہے۔ میں نے اس کی بند مٹھی کو کھول کر دیکھا۔ لوہے کے دو کلپ تھے۔ اس کی بیگو کی یادگار۔ ان کو نکالنا نہیں۔ یہ اس کے ساتھ ہی دفن ہوں گے۔ میں نے غسل دینے والوں سے کہا۔ اور دل میں غم کی ایک عجیب و غریب کیفیت لیے دفتر چلا گیا۔"

منٹو کے افسانوں میں بیگو کے کلپ تھے۔ بیگو کی معصومیت تھی۔ اس کی مسکراہٹ تھی۔ منٹو کے نقادوں نے انھیں منٹو کے ساتھ دفن کر دیا۔ سعادت حسن کو صرف منٹو جانتا تھا۔ اور منٹو کو سعادت حسن۔ دونوں ایک دوسرے کے کردار کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس نے تہذیب کو تاریخی اور تاریخ کو تہذیبی پس منظر میں دیکھا ہے۔ ●

رفیع احمد قدوائی

رفیع احمد قدوائی ہماری تحریک آزادی کی زندہ جاوید شخصیت کا نام ہے، ان کی عظمت کا راز نوع انسانی سے محبت میں مضمر ہے، وہ اپنے نظریات سیرت اور سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے تاریخ ہند کی ایک لازوال شخصیت بن چکے ہیں۔ ان کا اسم گرامی ملکی اور عالمی حیثیت کے متعدد اہم تاریخی واقعات سے جڑا ہوا ہے۔

ابتدائی زندگی

رفیع احمد قدوائی کی پیدائش اتر پردیش کے ضلع بارہ بنکی کے ایک گاؤں میں جس کا نام مسولی ہے، ۱۸ فروری ۱۸۹۴ء کو ہوئی۔ آپ کے والد محترم کا اسم گرامی امتیاز علی تھا، ان کے بعد لگاتار تین بھائی اور ہوئے، ان کے نام تھے شفیق احمد، ممتاز احمد اور حفیظ احمد۔ امتیاز علی کو عرف عام میں لالہ میاں کہا جاتا تھا۔ اس طرح وہ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی علامت تھے۔ ان کے خاندان میں فرقہ وارانہ بوچھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ آپ کی والدہ محترمہ اگرچہ پاس کے ایک گاؤں سے تعلق رکھتی تھیں لیکن انتہائی سادہ زندگی گزارنے کی عادی تھیں۔ رفیع احمد ابھی آٹھ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کی والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کے والد امتیاز علی نے دوسری شادی کر لی، ان کے بطن سے دو بیٹے ہوئے یعنی علی کامل اور حسین کامل۔ رفیع احمد اپنے سگے بھائیوں کے ہمراہ اپنے چچا ولایت علی کی سرپرستی میں آگئے۔ ولایت علی بارہ بنکی کی عدالت میں وکالت کر رہے تھے۔ ولایت علی کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ اس طرح ولایت علی اور ان کی بیوی کو نو بچوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی۔ ولایت علی کی ایک بیٹی انیسہ بیگم تھیں جنھیں عرف عام میں آپا جی کے نام سے پکارتے تھے۔ ان کی شادی رفیع احمد کے چھوٹے بھائی شفیق احمد سے ہوئی۔ اس زمانے کی مشہور شخصیتیں مثلاً مولانا محمد علی مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور راجہ غلام حسین جب کبھی بارہ بنکی جاتے تو ولایت علی کے ہی مہمان ہوا کرتے تھے۔

ولایت علی زود نویس اور صاحب قلم انسان تھے۔ وہ بیوق کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ ان کے اکثر و بیشتر خاکے مولانا محمد علی کے اخبار (ہفتہ وار) کامریڈ میں شائع ہوئے، اس کے علاوہ راجہ غلام حسین کے اخبار نیو ایرا انیز اردو ویکلی ہمدرد میں بھی ان کے خاکے شائع ہوئے۔ رفیع احمد نے بہت عرصے تک ان اخبارات کا فائل محفوظ رکھا لیکن ایک دفعہ گھر کی تلاشی کے دوران پولیس یہ سب فائل لے گئی جو پھر کبھی واپس نہ ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم سے قبل کی سیاست

پہلی جنگ عظیم سے قبل مسلم قیادت میں ایک زبردست موڑ آیا۔ محمد علی نے کامریڈ اخبار نکالا اور دو سال بعد ۱۹۱۲ء میں ابوالکلام آزاد نے "الہلال" نکالا۔ ان دونوں اخبارات نے مسلمانوں میں جذبہ حب الوطنی بیدار کیا اور طلبا کو برطانوی سامراجیت کے خلاف سینہ سپر ہونے کے لیے کہا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ، گزشتہ کئی دہائیوں سے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے تعلیم اور ثقافت کا مرکز بن چکا تھا۔ لیکن محمد علی نے جو کہ اس ادارے کے ایک طالب علم تھے، اس کالج کے طلبا میں دیش بھگتی کی ایک نئی روح پھونکی۔ گاندھی جی ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کے ساتھ علی گڑھ آئے اور انھوں نے تحریک عدم تعاون میں حصہ لینے کے لیے طلبا سے اپیل کی۔ ان کی اپیل کارگر ثابت ہوئی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے یونیورسٹی لکچررشپ چھوڑ دی۔ ان کے ساتھ اور بہت سے طلبا بھی ہو گئے۔ اس کے بعد گاندھی جی، حکیم اجمل خاں نے دلی میں جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی تاکہ جو طلبا تحریک عدم تعاون میں شرکت کر رہے ہیں وہ یہاں اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ محمد علی اس کے پہلے پرنسپل بنے اس ادارے کے تعلیم یافتہ بہت سے نیشنلسٹ مسلمان جامعہ ملیہ نئی دہلی کے ہی فیض یافتہ ہیں۔ رفیع احمد نے بھی علی گڑھ کالج کا بائیکاٹ کیا تھا لیکن وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی آنے کے بجائے گھر چلے گئے تھے۔

رفیع احمد ۱۹۱۳ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی سے ۱۹ سال کی عمر میں میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایم اے او کالج چلے گئے تھے۔

رفیع احمد ابتدا سے ہی موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے سوراج پارٹی میں شمولیت کی اور ۱۹۲۳ء کے عام انتخابات میں الیکشن مہم میں گھوم پھر کر کام کیا۔ ۱۹۲۶ء میں رفیع احمد سوراج پارٹی کے ٹکٹ پر لکھنو۔ فیض آباد ڈویژن سے کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے۔ وہ سوراج پارٹی کے چیف وہپ بنے۔ رفیع احمد کی جواہر لال نہرو کے ساتھ رفاقت انتہائی پائدار ثابت ہوئی۔ ایک طرح سے جواہر لال دماغ تھے تو رفیع احمد ان کا ہاتھ

دونوں نے الہ آباد، پرتاب گڑھ، رائے بریلی، سلطانپور اور فتح پور میں کسانوں کو جگانے کا کام کیا۔ ان دونوں میں اکثر و بیشتر اختلافات بھی رونما ہوئے لیکن ان کی بنیاد اخلاص تھی۔ رفیع احمد جواہر لال کی انتظامی صلاحیت کے معترف تھے۔

مخالفوں کے ساتھ حسن سلوک

رفیع احمد قدوائی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ دوستوں کے مقابلے مخالفوں کے ساتھ زیادہ حسن سلوک کا معاملہ کرتے۔ اس بات پر اکثر دوست ان سے ناراض بھی ہو جاتے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد کے عرصے میں الگورائے شاستری کو اتر پردیش کانگریس کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔ شاستری کا گروپ رفیع احمد کا مخالف تھا۔ کچھ سال پہلے مئو ناتھ بھنجن میں صوبائی کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا تھا جس میں الگورائے شاستری کے ذمے بہت سی رقومات واجب الادا تھیں۔ اس موقع پر الگورائے شاستری کے دوستوں نے بھی ان کی مدد نہ کی اور قرض کی بازادائیگی کا مطالبہ بڑھتا گیا۔ اس موقع پر رفیع احمد کے نام الگورائے شاستری کا ایک نوٹس بھی آیا کہ چوں کہ رفیع احمد نے ڈسپلن شکنی کی ہے اس لیے ان کے خلاف کارروائی کیوں نہ کی جائے۔ مگر بالآخر الگورائے رفیع احمد قدوائی کے پاس آئے اور قرض کی واپسی کے لیے ان سے کچھ رقم مانگی۔ رفیع احمد نے ۱۵ ہزار روپے کا چیک ان کے نام کاٹ دیا اور پھر کبھی یہ رقم واپس نہیں مانگی۔ رفیع احمد قدوائی کے متعدد واقعات ایسے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کے کام آئے مگر اس انداز سے کہ دوسروں کو احساس تک نہ ہو کہ انھوں نے ان کے ساتھ کوئی بھلائی کی ہے۔ وہ بے لوث انسان تھے، انھیں روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ ان کا مقولہ تھا کہ امیروں سے لو اور غریبوں کو دو۔ یہ کام وہ سمجھا بجھا کر ہی انجام دیتے اور اس میں زور زبردستی کا کوئی شائبہ تک نہ ہوتا۔

انسان دوستی

رفیع احمد قدوائی جن دنوں اتر پردیش کے وزیر داخلہ تھے، اس زمانے میں ایک مصیبت زدہ برہمن لڑکا جسے اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا، کونسل چیمبر کے باہر رفیع احمد کی گاڑی کے سامنے کھڑا ہو گیا، یہ لڑکا ۱۹۴۲ء میں "بھارت چھوڑو" تحریک میں بجلی کے تار کاٹنے کی وجہ سے جیل جا چکا تھا۔ لیکن اب اسے سب نے بھلا دیا تھا۔ وہ پولیس میں کانسٹیبل کی آسامی پر بھرتی ہونے کی درخواست ہاتھ میں لیے ہوئے گیا تھا۔ رفیع احمد نے اس کی درخواست لی اور اسے سب انسپکٹر کی جگہ دلا دی۔

کامیاب وزیر خوراک

جب رفیع احمد قدوائی کو خوراک وزراعت کا قلمدان وزارت سونپا گیا۔ ان کے قریبی ساتھیوں نے سمجھا کہ یہ رفیع احمد کی دشمنی میں ان کو ناکام بنانے کے لیے دیا گیا ہے۔ رفیع احمد نے اس چیلنج کو قبول کیا۔ رفیع احمد نے اس مشکل گتھی کو کیسے سلجھایا، اس کو سمجھنے کے لیے ہندوستان کی اس وقت کی پوزیشن کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ برطانوی دور حکومت میں سمندر کے راستے ہندوستان کی جو تجارت ہوتی تھی، اس وقت ہندوستان سے ۲۵ لاکھ ٹن سے بھی زیادہ غلہ باہر ملکوں کو جاتا تھا۔ یہ ۱۹۳۷ء کا وہ دور تھا جب برما بھی ہندوستان کا ایک حصہ تھا۔ برما کے آزاد ہو جانے کے بعد بھی آسام میں وہاں سے چاول آتا رہا۔ یہیں سے چاول اس علاقے میں بھی جاتا تھا جو بعد میں مشرقی پاکستان اور اس کے بعد بنگلہ دیش بنا۔ لیکن جب برما پر جاپان کا قبضہ ہو گیا تو ہندوستان کے لیے خوراک کی صورت حال مشکل ہو گئی۔ بنگال میں آبادی گھنی ہے، اس لیے بنگال کو اکثر قحط سالی کا سامنا کرنا پڑا۔ چاول کی قیمت بھی بڑھتی چلی گئی۔ وہاں کی آبادی کلکتہ کی طرف آنے لگی۔ ان لوگوں کے خالی پیٹوں کو کھانا اور ان کے خالی ہاتھوں کو کام کی ضرورت تھی۔

تقسیم وطن سے ہندوستان کی خوراک کی صورت حال اور بگڑتی چلی گئی تھی۔ ہندوستان کو غیر منقسم ہندوستان کے زیر کاشت رقبے کا تقریباً ۸۴ فی صد حصہ ملا لیکن آب پاشی والا رقبہ جو ہندوستان کے حصے میں آیا وہ کل آب پاشی والے رقبے کا صرف ۶۹ فی صد تھا۔ خوراک کی پیداوار کے لیے مشہور علاقے یعنی سندھ، پنجاب، سلہٹ جو تقریباً ۸ لاکھ ٹن غلہ فراہم کرتے تھے، ہندوستان کے پاس سے جاتے رہے، اس سے ہندوستان میں خوراک کی کمی ہو گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر خوراک کی قلت کا سامنا کرنا پڑا جس نے کنٹرول کے نظام کو جنم دیا، غلہ کی چور بازاری کی بدعت عام ہو گئی۔ اس صورت حال پر رفیع احمد قدوائی نے کس طرح قابو پایا؟

رفیع احمد قدوائی ایک عملی انسان تھے، انھوں نے مشرقی اتر پردیش میں کسانوں کے درمیان کام کیا تھا۔ وہ بیوپاریوں اور کسانوں کی نفسیات سے واقف تھے۔ خوراک وزراعت کا عہدہ سنبھالتے ہی انھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان کی جگہ کھیتوں میں ہے، پارلیمنٹ میں نہیں۔ انھوں نے ملک کا دورہ کیا اور ریاستی وزیروں سے تبادلہ خیال کیا۔ افسروں، بیوپاریوں، کسانوں اور عوام سے تبادلہ خیال کیا۔ وہ بھیس بدل کر عام آدمی کی طرح ادھر ادھر گھومتے۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ لوگوں کے ذہنوں پر قلت کا خوف زیادہ غالب ہے جسے توڑنا ضروری ہے تاکہ وہ ذخیرہ اندوزی کے مرض سے بچیں۔ ان کے پاس صرف ۶ لاکھ ٹن کا معمولی سا ذخیرہ موجود تھا۔ ۱۹۵۲ء کے پہلے چار ماہ میں ہندوستان نے نو لاکھ ٹن اناج باہر سے منگایا لیکن پھر بھی ریاستوں کی غلہ کی مانگ پوری نہ ہو سکی۔ رفیع احمد نے یہ محسوس کر لیا کہ اگر وہ اس محاذ پر ناکام ہو گئے تو جواہر لال بھی انھیں نہیں بچا پائیں گے۔ رفیع احمد زندگی کے اتار چڑھاؤ کو سمجھتے تھے اور اکثر موقعوں پر حیران کن فیصلے لیا کرتے۔ چناں چہ ان کے پاس اگر کوئی ریاستی وزیر خوراک، اناج کی سپلائی کی مانگ لے کر آتا تو وہ اس کی تکمیل کے لیے فوراً رضامندی ظاہر کر دیتے، اس طرح ریاستوں کی طرف سے طلب کردہ اناج کی مانگ ذخیرے میں موجود اناج سے کہیں زیادہ ہو گئی لیکن اس مانگ کا زیادہ تر حصہ خوف کی وجہ سے تھا اور مستقبل کی ضرورتوں سے متعلق تھا۔ چناں چہ جب انھوں نے دو چار ریاستوں کو ان کی مانگ کے مطابق دیا تو ریاستوں نے کہا کہ ان کے پاس تو اس قدر غلہ رکھنے کی گنجائش ہی نہیں پھر وہ جو اناج اٹھا رہی ہیں، اس کی قیمت بھی انھیں نقد ادا کرنی پڑ رہی ہے چناں چہ ریاستوں نے خود ہی غیر استعمال شدہ غلہ لوٹانا شروع کر دیا۔ اس طرح رفیع احمد قدوائی نے قلت کی نفسیات سے انھیں چھٹکارا دلایا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

رفیع احمد قدوائی کے کچھ ناقدین کا کہنا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بلند قامت بننا چاہتے تھے اور وہ جواہر لال نہرو کی جگہ لینا چاہتے تھے۔ بحیثیت وزیر

باقی صفحہ [illegible] پر

ثروت جہاں

کھیل کیوں ضروری ہیں؟

ایک زمانہ تھا کہ ہم نے گھروں میں اپنے بڑوں سے سنا تھا

پڑھو گے لکھو گے بنو گے نواب
کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب

آج اقدار زمانہ بدل چکی ہیں، آج ہم کنوئیں سے پانی نکالنے کی بجائے نل کے نیچے بیٹھ کر نہاتے ہیں، چراغ کی لو میں پڑھنے کی بجائے ٹیوب لائٹ میں پڑھتے ہیں، کسی زمانے میں بس کے سفر کے دوران بس کنڈکٹر ہمارے پاس آتا تھا اور کہتا تھا کہ "جناب ٹکٹ لے لیجیے" اب ہم بس کنڈکٹر کے حضور میں درخواست کرتے ہیں کہ "جناب ٹکٹ دے دیجیے" اس طرح زمانہ یکسر بدل گیا ہے اور یہ تبدیلی بدستور جاری ہے۔ اب قدم قدم پر کھیلوں کی ضرورت ہے، یوں تو سیاست بھی ایک کھیل بن چکی ہے۔ بساط سیاست پر بازی کا جیتنا اور ہارنا روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔ مذہب بھی ایک کھیل بن کر رہ گیا ہے، اس کے ذریعے سے بھی ہار اور جیت کے معیار طے کیے جاتے ہیں، مہاتما گاندھی کے اس دیش میں ان کے اقوال کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے، وہ کہتے تھے کہ دماغی ورزش کے ساتھ ساتھ جسمانی ورزش بھی ضروری ہے، چناں چہ صحت مند جسم میں صحت مند دماغ کی پرورش کے لیے بھی کھیل ہمارے لیے ضروری ہیں، کھیل انسان کی فطری ضرورت بھی ہیں، روزمرہ کی زندگی کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہر سنجیدہ سے سنجیدہ انسان کھیل کا فطری جذبہ رکھتا ہے، کبھی کسی بردبار سے بردبار انسان کو بیٹھے ہوئے دیکھیے تو اندازہ ہوگا کہ اکثر و بیشتر وہ یا تو انگلیاں چٹخانے لگتے ہیں یا پیپر ویٹ اچھالنے لگتے ہیں، اکثر اپنے ہاتھ کے قلم سے خالی لمحات میں نقش و نگار بنانے لگتے ہیں، اس طرح کی غیر دانستہ حرکتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ انسان میں کھیل سے فطری لگاؤ ہے، دماغ اور ذہن کا ذائقہ بدلنے کے لیے بھی کھیل ضروری ہیں۔

انسانی معاملات اور سیاست حاضرہ میں کھیلوں کو بڑا دخل ہے۔ اب کرکٹ، ہاکی اور جسمانی کرتبوں کی نمائشیں عالمی سطح پر ہوتی ہیں، جن کو ہم ٹورنامنٹ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جنوب ایشیائی کھیلوں کی فیڈریشن کے تحت کھیل منعقد کرائے جاتے ہیں جن کا مقصد جنوب ایشیائی ملکوں کی تقریباً ایک بلین آبادی کے درمیان آپسی تال میل بڑھانا ہے۔ بلاشبہ اس طرح کی کوششوں سے مختلف ملکوں کے درمیان جذبہ رفاقت اور دوستی کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے۔

والدین کا بہترین عطیہ اولاد کی بہترین تعلیم و تربیت ہے۔ ہر بچہ اپنے ساتھ بے شمار مسرتیں لاتا ہے اور نئی نئی امیدوں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ بچہ صانع حقیقی کا شاہکار اور انمول تحفہ ہے۔ بچہ کی اگر تربیت نہ ہو تو بچہ ناکارہ اور نکمّا رہ جاتا ہے، اس کی پیدائشی قوتیں اور صلاحیتیں جامد ہو جاتی ہیں، صحیح تربیت ہونے سے ان کی صلاحیتیں ابھرتی ہیں اور اس طرح وہ انفرادی اور خاندانی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا اہل ہوتا ہے، تمدن کی ترقی میں ان کی صلاحیتوں سے مدد ملتی ہے۔

انسان کی شخصیت بڑی پیچیدہ ہے، اس کے متعدد پہلو ہیں مثلاً ذہنی، جسمانی، عملی اور اخلاقی۔ یہ شخصیت تنگ دائرے میں نہیں پنپ سکتی، اس کے لیے وسیع دائرہ درکار ہے اسی لیے کھیلوں کی اہمیت ہے، اس سے مقابلے کی اسپرٹ تیز ہوتی ہے جو آج کی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ کھیلوں کے فروغ کے لیے جو کلب قائم ہوتے ہیں، جو ٹیمیں بنتی ہیں، ان کے ذریعے سے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے کی عادت پڑتی ہے، جس سے جمہوری مزاج کے اس ملک میں بہترین شہری بننے میں مدد ملتی ہے۔ اب فٹبال، والی بال، کرکٹ، ہاکی، رسہ کشی، تیراکی وغیرہ میں سبھی لڑکے لڑکیاں حصہ لیتے ہیں، کھیلوں میں کارکردگی بڑھانے کے لیے ان سب کھیلوں کی باقاعدہ تربیت کے لیے اسکول قائم ہیں۔

کھیل وہ مشغلہ ہے جس میں غیر ارادی طور پر دلچسپی بڑھتی ہے۔ بچوں کو کھیلوں سے حقیقی مسرت ہوتی ہے، ان کا غم غلط ہوتا ہے، دماغی تھکاوٹ دور ہوتی ہے، جذبات کی تسکین ہوتی ہے، قوت مدافعت بڑھتی ہے۔ کھیلوں میں مختلف طرح کی صورت حال سے کھلاڑیوں کو واسطہ پڑتا ہے، ان سے نمٹنے کے لیے انھیں سوچنے، سمجھنے اور بروقت فیصلہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ عالمی سطح پر گھومنے پھرنے کا موقع ملتا ہے، تجربات اور قوت مشاہدہ نیز قوت فیصلہ میں اضافہ ہوتا ہے، ضابطہ کی پابندی کا مزاج بنتا ہے۔ کھیلوں کے ذریعے استقلال، پامردی، ضبط نفس، خود اعتمادی، وفاداری، اطاعت شعاری جیسے اہم اوصاف پروان چڑھتے ہیں۔

کھیلوں کا فروغ جسمانی صحت کا بہترین

اپر کھبٹہ جات، غازی آباد۔ یوپی

ذریعہ ہے، جسمانی صحت سے کیا مراد ہے؟ مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ اگر کوئی شخص ہر طرح کی بیماری سے محفوظ ہے تو وہ شخص صحت مند کہلائے گا اور کسی قسم کی تھکاوٹ کے بغیر وہ اپنا کام معمول کے مطابق انجام دے سکے گا، مہاتما گاندھی کے نزدیک ایسا شخص دن میں دس تا بارہ میل بآسانی چل سکتا ہے اور تھکن محسوس کیے بغیر عام نوعیت کے کام انجام دے سکتا ہے۔ البتہ جو لوگ اپنی میز پر بیٹھ کر ۶ تا ۸ گھنٹے کام کرتے ہیں، درمیان میں کچھ دیر کے لیے لنچ کرتے ہیں، گھر آکر کھانا کھا کر سو جاتے ہیں، وہ اکثر بیمار رہتے ہیں، اسی لیے کچھ لوگ جو دن میں فرصت نہیں پاتے، وہ رات کو بیڈ منٹن وغیرہ فلڈ لائٹ میں کھیلتے ہیں۔ جوں جوں کام کی سختی بڑھتی ہے، عام انسان کی قلب کی رفتار ۷۰ فی منٹ سے بڑھ کر ۲۰۰ فی منٹ ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں جسمانی کسرتوں کے بہت سے پروگرام انسانی صحت کو ٹھیک رکھنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں یہ بہت سے پروگرام انسان کو متحرک اور لچکیلا بنانے کے لیے ہیں، بہت سے پروگرام قوت برداشت کو مضبوط بنانے کے لیے ہیں۔ اس بات کی احتیاط ضروری ہے کہ کوئی پروگرام ضرورت سے زیادہ نہیں اپنانا چاہیے۔ اگر آپ کو کبھی عارضۂ قلب ہوا ہے یا آپ ہائی بلڈ پریشر کے مریض رہے ہیں، یا آپ کو امراض سینہ میں یعنی کھانسی، دمہ وغیرہ یا جوڑوں میں درد وغیرہ ہے تو طبی معائنے کے بعد ہی کھیل کود کے پروگراموں سے دلچسپی لینی چاہیے۔ یوگا، یوگ آسن اور یوگ کی بہت سی کسرتیں مثلاً سوریہ پرنام ایسی ہیں جن سے انسان کا دماغ چاق و چوبند رہتا ہے۔ زندگی پر مختلف طرح کے دباؤ پڑتے رہتے ہیں۔ چناں چہ کھیل کود کے ذریعے دماغی تناؤ کو کم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ عام طور پر یہ محسوس کیا گیا ہے کہ ہاکی، فٹ بال، ٹینس اور بہت سے دوسرے کھیلوں اور اسپورٹس میں ہمارے کھلاڑی ہنرمندی، چابکدستی، صلاحیت وغیرہ میں کسی سے کم نہیں، البتہ ان کی جسمانی صحت کا معیار وہ نہیں جو اور کھلاڑیوں کا ہوتا ہے، اسی لیے صحت کا معیار کھیلوں کے فروغ کا ہی ایک حصہ ہے۔ ہمارے ملک میں کھیلوں کے فروغ اور کھلاڑیوں کی ہمت افزائی کے لیے ہر سال ارجن ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔ یہ ایوارڈز تیر اندازی، اتھلیٹکس، بلیرڈ، باکسنگ، کرکٹ، فٹ بال، جمناسٹک، ہاکی، ٹیبل ٹینس، والی بال، ویٹ لفٹنگ، کشتی وغیرہ کے لیے دیے جاتے ہیں۔ یہ کھلاڑیوں کی اعلا کارکردگی کا اعتراف ہوتا ہے، یہی نہیں کھلاڑیوں کی بہترین کارکردگی کے لیے ذمہ دار کوچوں کی ہمت افزائی کے لیے درون اچاریہ ایوارڈز بھی دیے جاتے ہیں، ارجن ایوارڈ کے تحت ہر کھلاڑی کو ۲۰ ہزار روپے اور کانسہ کی تختی دی جاتی ہے۔ اس تختی پر مہابھارت کے سورما، ارجن کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ کرکٹ کی بہترین کارگزاری کے لیے دادا بھائی نوروجی ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ اس کے تحت چاندی کی تختی اور دس ہزار روپے نقد دیے جاتے ہیں۔ یوں تو ہر کھیل اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے اور ہندوستان نے سبھی کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے مگر یہاں کی روایات سے جڑا ہوا ایک کھیل شطرنج ہے، اس کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ یہ خالص ہندوستان کی پیداوار ہے۔ قدیم زمانے میں اسے چترانگ کہا جاتا تھا۔ چتر کے معنی چار کے ہیں اور انگ کے معنی حصے کے ہیں یعنی چار حصے۔ یہ چار حصے فوج سے تعلق رکھتے تھے یعنی ہاتھی جسے شطرنج کی زبان میں رخ کے نام سے پکارتے ہیں، گھوڑے، رتھ اور پیادہ۔ اب رتھ کے بجائے بشپ کو لے لیا گیا ہے۔ شطرنج اب ایک بین اقوامی کھیل بن چکا ہے۔ ہر دو سال بعد اس کے لیے اولمپک کھیلوں کا مقابلہ کرایا جاتا ہے۔ میر سلطان خاں نے ۱۹۰۵ء میں اس کھیل میں بین اقوامی شہرت پائی، وہ نواب سر عمر حیات خاں کے ملازم تھے جنھوں نے میر صاحب کو شطرنج کھیلنا سکھایا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں ان کو آل انڈیا چیمپئن شپ ملی۔ اس میں ان کو نو پوائنٹس میں سے ۸٫۵ پوائنٹ ملے تھے۔ آزادی کے بعد مینل ناڈو کے ارون کو ۱۹۶۱ء میں اس کھیل میں بین اقوامی ماسٹر کا خطاب ملا۔ ۱۹۷۸ء میں روی کمار کو بھی اسی خطاب سے نوازا گیا۔ اور اب وشوانا تھن آنند نے اس کامیابیوں سے ہندوستان کا نام اور بھی روشن کیا ہے۔

یوجنا، نئی دہلی

کیا آپ جانتے ہیں؟

☆ انسیٹ۔ ۱۔ ڈی ۱۲ جون ۱۹۹۰ء کو داغا گیا تھا اور ۱۷ جولائی ۱۹۹۰ء سے استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ ڈیٹ ریلے ٹرانسپونڈرز کے علاوہ تمام طرح کے پے لوڈ ٹھیک طرح سے کام کر رہے ہیں۔

☆ انسیٹ۔ ۲ اے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۹۰ء کو داغا گیا تھا اور ۶ اگست ۱۹۹۲ء کو استعمال کے لیے مستعد قرار دیا گیا۔ اے آر اے بی ایس اے ٹی۔ اسی کے ذریعہ انجام دیا جانے والا ٹیلی مواصلاتی ٹریفک کو اگست ۱۹۹۲ء کے دوسرے ہفتے میں انسیٹ۔ ۲ اے۔ میں منتقل کر دیا گیا۔ انسیٹ۔ ۱۲۔ کو کامیابی سے داغنے کے ساتھ اعداد جمع کرنے کی خدمت دوبارہ بحال ہو گئی ہے۔ جنوری ۱۹۹۵ء میں گیارہواں شمال جنوب اسٹیشن کیپنگ عمل کامیابی سے مکمل ہو گیا۔

☆ انسیٹ۔ ۲ بی۔ ۲۳ جولائی ۱۹۹۳ء کو فرینچ گوئیانہ سے ایرین ۴۴ ایل لانچر کے ذریعہ کورو سے داغا گیا اور ۱۰ اگست ۱۹۹۳ء سے قابل استعمال قرار دیا گیا۔ تمام پے لوڈ کامیابی سے مصروف عمل ہیں۔

☆ دوردرشن ۱۵ اگست ۱۹۹۴ء سے انسیٹ ٹو۔ بی سے ۱۲ ٹی وی چینل نشر کر رہا ہے۔ اس کے تحت ایس بینڈ میں ۲ چینل سی بینڈ میں ۸ چینل، ایکسٹینشن۔ سی۔ بینڈ میں دو چینل شامل ہیں۔ ان کے علاوہ نیشنل ٹی وی سروس اور اپ ریجنل سروس بھی انسیٹ۔ ۱۔ ڈی ایس۔ بینڈ کی مدد سے فراہم کی جا رہی ہے۔ انسیٹ ٹو اے۔ کی مدد سے ایکسٹینشن سی بینڈ میں مدھیہ پردیش اور راجستھان ٹی وی علاقائی خدمت اور شمال مشرقی سروس (ایس بینڈ) فراہم کرائی جا رہی ہے۔

☆ وی ایچ آر آر تھا ویرانسیٹ۔ ۲ بی کی مدد سے بھارتی محکمۂ موسمیات کو حاصل ہو رہی

باقی صفحہ ۲۸ پر

ڈاکٹر حسن امام

ہندوستان کے عہد آزادی تک اردو افسانے کا ارتقا

اردو افسانہ کا آغاز منشی پریم چند اور سید سجاد حیدر یلدرم کے ہاتھوں ہوا۔ جس طرح یورپ میں ایڈگرایلن، ارونگ اور ہاتھورن جیسے ادیبوں نے افسانہ کو ہاتھ لگاتے ہی اسے بام عروج پر پہنچا دیا اسی طرح اردو کو بھی سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند جیسے غیر معمولی فنکار ہاتھ آگئے جن کی ریاضت اور فنی سوجھ بوجھ نے پہلے ہی دن اردو افسانہ کو حسین اور نوجوان بناکر پیش کر دیا۔ بیسویں صدی عیسوی سے ہندوستان میں حقیقت اور رومانیت کا امتزاج لے کر آئی تھی۔ انیسویں صدی کے ادبی نشاط ثانیہ نے ذہن اور جذبے دونوں کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ سجاد حیدر یلدرم نے اسے "خیالستان" میں پیش کیا اور منشی پریم چند نے "سوز وطن" اور "پریم پچیسی" میں۔ دونوں کے موضوعات اسی معاشرتی اور سیاسی زندگی سے لیے گئے ہیں جو ان کے گرد وپیش بکھری پڑی تھی — یلدرم عورت کے خیالی پیکر سے آسودگی چاہتے ہیں اور پریم چند وطن کی رومانی محبت کے گرد کہانی کا جال بنتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یلدرم اور ان سے متاثر ہوکر لکھنے والے حقیقی زندگی پر ایک خیالی اور جذباتی غلاف چڑھاکر واقعات کی تصویر کشی کرتے تھے اور پریم چند اور ان کے ہمنوا مثالیت پسند ہوتے ہوئے حقائق کی ٹھوس زمین پر چلتے تھے۔ یلدرم کے ساتھ لکھنے والوں میں نیاز فتحپوری، ل۔ احمد اور مجنوں گورکھپوری کے نام شامل ہیں اور پریم چند کے قریب ساتھ لکھنے والوں میں سدرشن، علی عباس حسینی، اعظم کریوی اور حامد اللہ افسر دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں طرز تحریر کے اس فرق کو ظاہر کرنے کا مقصد یہ نمایاں کرنا ہے کہ زندگی کے خام مواد سے مختلف قسم کے افسانے تخلیق کرنے کی تکنیک اردو میں تھوڑے ہی دنوں کے اندر وجود میں آگئی تھی۔ جیساکہ ہم نے کہا ہے کہ سجاد حیدر یلدرم مرد اور عورت کی رومانی محبت اور قرب کے فطری حق کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، نیاز فتحپوری زندگی کے حزن و طرب کو افسانہ میں شعر بناکر آسودگی حاصل کرتے ہیں تو سلطان حیدر جوش میں اصلاح کا جذبہ شدید ہے اس لیے وہ طنز کے ذریعہ اپنے مقصد تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مگر ان افسانہ نویسوں نے افسانہ کے فن میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا اور نہ ترقی کی اور نہ افسانہ کے موضوعات میں کسی عظمت اور وقار کا اضافہ کیا۔ مگر ایسی بات پریم چند کے بارے میں نہیں کہی جائے گی۔

پریم چند کے خیالات کا دائرہ ذاتی نہیں سماجی ہے، انفرادی نہیں قومی ہے اور خیالی نہیں حقیقی ہے۔ پریم چند حقیقی واقعات کا احاطہ کرتے تھے اور زندگی کے اعلا تقاضوں کو نصب العین بناکر افسانہ کی حدیں متعین کرتے تھے۔ ان کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" میں داستانی فضا ہے، شاعرانہ زبان ہے اور رومانی انداز نظر ہوتے ہوئے اس میں آزادی کا اعلا نصب العین بھی ہے۔ پریم چند نے اپنی کہانیوں میں عام زندگی کے اکثر پہلوؤں کو سمیٹ لیا ہے، مثلاً ان کے افسانے "بڑے گھر کی بیٹی"، "بوڑھی کاکی"، "پوس کی رات"، "کا نشہ"، "مماں کا دل"، "سوتیلی ماں"، "جلوس"، "شطرنج کی بازی"، "حج اکبر"، "عیدگاہ"، "نمک کا داروغہ" اور "ادیب کی عزت" — اور جب پریم چند نے اپنے آخری دنوں میں افسانہ کفن کی تخلیق کی تو ان کے یہاں فکر و فن، مواد اور ہیئت کا ایسا حسین امتزاج ہو چکا تھا جس کی وجہ سے پریم چند فن کے عروج کی آخری منزل کو چھو رہے تھے۔

پریم چند کی طرح عام زندگی کو افسانے کا موضوع اعظم کریوی، اور علی عباس حسینی نے بھی بنایا۔ یہ دونوں افسانہ نگار ہندوستان کے دیہاتوں سے واقف تھے۔ اعظم کریوی کا دائرہ عمل محدود اور رومانی تھا۔ اور علی عباس حسینی انسان دوستی، اصلاح، اخلاقی نصب العین اور شرافت نفس کو عزیز رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے افسانوں میں بھی یہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ علی عباس حسینی کا فن مقصدی ہونے کے باوجود کہانی کو کہانی بنانے کا فن ہے۔ وہ پلاٹ میں محنت کرتے تھے اور کہانی میں خوبصورت زبان استعمال کرتے تھے۔ علی عباس حسینی ترقی پسند نظریے سے متاثر ہوئے۔ ان کے افسانوں کے کردار کے انتخاب میں کوئی اخلاقی نصب العین ضرور رہا ہے۔

۱۹۳۰ء کے بعد سے روسی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کے ترجمے بڑی تیزی سے اردو رسالوں میں شائع ہونے لگے اور بہترین افسانوں کے نمونے اردو افسانہ نگاروں کے سامنے آگئے۔ اسی زمانے میں اردو میں کچھ ایسے افسانے لکھے گئے جو "انگارے" نام کے مجموعہ میں شائع ہوئے۔ ان افسانوں میں رومانی انقلاب پسندی، سماجی تنقید، طنز اور استہزا سبھی کے حامل افسانے شامل تھے۔ ان افسانوں میں نہ تو خیال کی پختگی ہی اور نہ فن کی پختگی، لیکن یہ افسانے وقت کی انقلابی آواز

انچارج عربی، فارسی و اردو، پٹنہ یونیورسٹی لائبریری پٹنہ

سے ہم آہنگ تھے۔ انھوں نے تاریخی تقاضا کو پورا کیا اور ترقی پسند دور کے لیے زمین ہموار کی۔

ایک جانب مغربی افسانوں کے اعلا نمونے تھے۔ دوسری جانب "انگارے" کی کہانیاں، تیسری جانب پریم چند کا فنی ادراک جو کفن افسانہ میں ظاہر ہو چکا تھا اور چوتھی جانب ہندوستان کی آزادی کے لیے بے قرار فضا تھی جو آزادی اور انقلاب کے نعروں سے گونج رہی تھی اور ان سب نے ملا کر ایک نئی تحریک کو جنم دے دیا، جس کو ترقی پسند تحریک کہتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا سب سے گہرا اثر اردو شاعری اور مختصر افسانہ پڑا اور افسانے پر شاعری سے زیادہ اثر پڑا۔ اس لیے کہ شاعری کی روایت قدیم اسلوبوں اور موضوعات سے آزاد نہیں ہو سکی تھی اور وہ ایک طویل تاریخ سے بندھی ہوئی تھی۔ لیکن افسانہ اس کے مقابلہ میں نیا تھا اور اس کے پاس زندگی سے الجھنے اور اسے سلجھانے کی ایک روایت موجود تھی۔ اس لیے ۱۹۳۶ء کے بعد سے اردو افسانہ غیر معمولی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔ اسی زمانے میں تقریباً دس سال تک اردو افسانے نے موضوع کے اعتبار سے زندگی کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کر لیا۔ سماجی انتشار، قومی اتحاد، سیاسی بے چارگی، طبقاتی استحصال، امن کی خواہش، غریبی اور افلاس، متوسط طبقہ کے اخلاقی کردار کا کھوکھلا پن، محبت پر پابندی، بیکاری، جنسی گھٹن، ایثار اور قربانی، خاندانی زندگی کی ابتری اور ایسے ہی سیکڑوں موضوعات سیکڑوں شکلوں میں افسانہ بنے۔

جن افسانہ نگاروں نے فن کی لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ ان موضوعات کو اپنایا ان میں چند نام یہ ہیں: کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، احمد علی، رشید جہاں، حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، اختر اورینوی، اختر رائے پوری، اختر انصاری، دیوندر ستیارتھی، کوثر چاند پوری، پریم ناتھ پردیسی، سہیل عظیم آبادی، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی، عزیز احمد، ابراہیم جلیس، شوکت صدیقی، حسن عسکری، مہندر ناتھ، ہنس راج رہبر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، رضیہ سجاد ظہیر، مسیح الحسن، بلونت سنگھ، غلام عباس، انتظار حسین، شکیلہ اختر اور ڈاکٹر محمد محسن۔ اس فہرست میں اور نام بڑھائے جا سکتے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل ان افسانہ نگاروں میں سے کئی شہرت کے بام عروج پر پہنچ چکے تھے اور فن کے اس کارواں کو لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے کہ جب ان کی اصل شہرت کا وقت آیا تو ملک تقسیم ہونے کی وجہ سے ان کا رشتہ ہندوستان سے منقطع ہو گیا مثلاً: غلام عباس، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، انتظار حسین، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، عزیز احمد، ابراہیم جلیس، شوکت صدیقی وغیرہ۔

اس مختصر سی مدت میں اردو افسانہ موضوع کی وسعت اور تکنیک کے تنوع کے اعتبار سے اردو ادب کی سب سے زیادہ مقبول اور اہم صنف بن گیا۔ پھر آزادی آئی اور اپنے ساتھ نئے مسائل لائی۔ آزادی کے بعد خوشی، امنگ، تعمیر اور ترقی کی خواہش اور خود اعتمادی، بلند نگاہی اور حوصلہ مندی کے جذبات پیدا ہونے چاہیے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا اور فرقہ وارانہ فسادات، قتل و غارت گری، بے وطنی اور غریب الدیاری، مہاجر اور شرنارتھی یہ موضوعات افسانہ نگاروں کی نگاہوں کے سامنے آئے اور ان کی روح کو جھنجھوڑ دیا اور کرشن چندر، علی عباس حسینی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، مسیح الحسن، اختر اورینوی ہر ایک نے ان مسائل پر غیر معمولی کہانیاں لکھیں۔ اس طرح اردو افسانہ نگاری ایک وسیع تر دائرے میں ترقی کرتی رہی، لکھنے والے بڑھتے رہے اور نئے تجربوں کے لیے راہیں کھلتی رہیں جس طرح پریم چند اور علی عباس حسینی نے یوپی کے دیہات اور عوام کی مصوری کی تھی، احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ نے پنجاب کے گاؤں پیش کیے تھے۔ سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی اور شکیلہ اختر نے بہار کی زندگی کے نقش ابھارے تھے۔ بعض نئے لکھنے والوں نے کشمیر کی زندگی کے خاکے پیش کیے تھے۔ اس کی ابتدا پریم ناتھ پردیسی اور کرشن چندر کر چکے تھے لیکن پریم ناتھ در، حامدی کشمیری، موہن یاورا، نور شاہ، ٹھاکر پونچھی وغیرہ نے اس کے مسائل کو نئے حالات کی روشنی میں دیکھا۔

گزشتہ ۳۰ سال میں جن افسانہ نگاروں نے اردو ادب پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں ان میں قرۃ العین حیدر بہت مشہور ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ رام لال، جیلانی بانو، ستیش بترا، بشیشر پردیپ، اقبال مجید، عابد سہیل، امرتا پریتم، واجدہ تبسم، آمنہ ابوالحسن، اقبال متین، رتن سنگھ، ظفر پیامی اچھے افسانہ نگاروں کے کارواں میں ترقی کی طرف رواں دواں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے فن سے پرخلوص لگاؤ رکھتا ہے اور زندگی کو غور سے دیکھتا ہے۔

ہم نے ہندوستان کی آزادی کے عہد تک صرف اردو افسانہ کے ارتقا کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ اس مختصر مضمون میں لیا ہے۔ آزادی کے بعد بھی اردو افسانہ کی ترقی رکی ہوئی نہیں ہے۔ قریب ۵۰ سال آزادی کے گزرے ہیں۔ افسانہ نگاروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ نت نئے تجربے اردو افسانہ میں ہو رہے ہیں اور آنے والے دور کے لیے اردو افسانہ کا باب کھلا ہے اور اردو ادب کے لیے آنے والا نیا دور شاندار ہے۔ ●

قلم کار حضرات سے

گزارش ہے کہ

(۱) مضامین/ دیگر تصانیف جو یوجنا کو ارسال کریں انھیں کہیں اور چھپنے کے لیے قطعاً نہ بھیجیں۔

(۲) ہر مضمون کے آخر میں طبع زاد/ غیر مطبوعہ لکھ کر اپنا دستخط، نام اور پتا ضرور درج کریں۔

(۳) مضمون کی اصل ہمیں ارسال کریں فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۴) مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کریں۔

(۵) مضامین میں جو اقوال (QUOTATICNS) استعمال کیے گئے ہیں، ان کے سورس کا حوالہ دینا لازمی ہے۔

(۶) مضامین میں انگریزی الفاظ کا استعمال بدرجۂ مجبوری ہی کریں۔ (ادارہ)

کے۔کے۔کھلر

نئی حقیقت نگاری، منٹو کی دین

سعادت حسن منٹو نے اپنی ۲۱ سالہ ادبی زندگی میں ایک نئی حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالی جس کا تصور اردو ادب اور تنقید میں اس سے پہلے نہ تھا۔ زندگی کو جتنا قریب سے منٹو نے دیکھا شاید کسی اور ادیب نے نہ دیکھا ہوگا۔ اسے زندگی کے فکر اور فلسفے سے اتنی دلچسپی نہیں ہے جتنی خود زندگی سے۔ وہ زندگی کے ہر طور طریقے کو سمجھتا تھا۔ اس کے ہر نشیب و فراز سے گزرا تھا۔ زندگی کی ہر تلخی، ہر تجربہ، ہر پہلو اس کے لیے پرکشش تھا اور بقول ابوسعید قریشی، منٹو اپنے خاص انداز میں ایک حقیقت سے دوسری حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔

منٹو کو جھوٹ، فریب عریاں کاری سے سخت نفرت تھی۔ زندگی سے جو کچھ اس نے پایا وہی اپنے افسانوں کی شکل میں اسے لوٹا دیا۔ "گنجے فرشتے" میں منٹو لکھتا ہے۔

"میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں کوئی شیمپو نہیں۔ کوئی گھونگر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ میں بناؤ سنگھار کرنا نہیں جانتا۔ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہ ہو سکی۔ اس کے منھ سے گالیوں کے بجائے میں پھول نہیں جھڑا سکا۔ میراجی کی ذلالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی۔ اور نہ ہی میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا کہ وہ برخود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے۔ اس کتاب میں جو بھی فرشتہ آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے۔"

اگر وہ آج زندہ ہوتا تو یقیناً اردو افسانے کی حالت زار دیکھ کر اسے افسوس ہوتا۔ پچھلے کئی سالوں میں نہ کوئی "ہتک" لکھی گئی اور نہ "لوبہ ٹیک سنگھ" نہ "گنجے فرشتے" اور نہ "سیاہ حاشیے"۔ "مصری کی ڈلی" میں منٹو لکھتا ہے۔ "زندگی کیا ہے۔؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اونی جراب ہے۔ جس کے دھاگے کا ایک سرا ہمارے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ ہم اس جراب کو ادھیڑتے رہتے ہیں۔ جب ادھیڑتے ادھیڑتے دھاگے کا دوسرا سرا ہمارے ہاتھ میں آجائے گا تو یہ طلسم جسے زندگی کہا جاتا ہے۔ لوٹ جائے گا۔" منٹو کے فن کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ اس طلسم کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔ منٹو کی موت کو آج ۴۰ سال ہو گئے ہیں لیکن منٹو کا فن زندہ ہے۔ ایک الزام جو منٹو پر اکثر لگایا جاتا رہا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے افسانے ناقابلِ برداشت ہیں۔ اس سلسلے میں منٹو لکھتا ہے۔

"زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے واقف نہیں تو میرے افسانے پڑھیے۔ اور اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ میری تحریر میں کوئی نقص نہیں ہے جس نقص کو میرے نام منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ دراصل موجودہ نظام کا ایک نقص ہے۔ میں ہنگامہ پسند نہیں، میں لوگوں کے خیالات میں ہیجان پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن تہذیب و تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی۔ میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ اس لیے کہ یہ کام میرا نہیں درزیوں کا ہے۔"

منٹو پنجاب کے ایک دیہات سمرالہ ضلع لدھیانہ میں ۱۱ مئی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن امرتسر میں گزرا۔ جلیان والا باغ کا المیہ وہ زندگی بھر نہیں بھول سکا۔ بھگت سنگھ جسے ۱۹۳۱ء میں پھانسی دی گئی اس کا ہیرو تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں بھگت سنگھ کا مجسمہ لگا رکھا تھا۔ نسلاً منٹو کشمیری تھا لیکن پنجاب کی بولیوں اور پنجاب کے ماحول سے وہ گھل مل گیا تھا۔ اس کی آخری ادبی خواہش پنجاب کی بولیوں کو جمع کر کے چھپوانا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ "ان بولیوں کے سامنے باقی سب شاعری فراڈ ہے۔"

یہ منٹو کی حقیقت نگاری ہی تھی جس نے اسے پنجابی بولیوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ وہ ان دیہاتی بولیوں پر مرتا تھا۔ یہ وہ دیہات ہیں جہاں رومان، تہذیب و تمدن کے بوجھ سے بالکل آزاد ہے۔ جہاں جذبات بچوں کی مانند کھیلتے ہیں۔ ان بولیوں میں وہ شاعری ہے جو وزن کی قید اور لفظی بندشوں سے مبرا ہے۔ ان بولیوں نے تہذیب کو برقرار رکھا ہے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے منٹو نے دیال سنگھ کالج لاہور میں پنجابی کے سب سے بڑے شاعر استاد دامن کی صدارت میں ان بولیوں پہ ایک طویل لکچر دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جوں جوں منٹو

باقی صـ۳۳ پر

سی۔۸/۳۳۸، وسنت کنج، نئی دہلی۔۷۰

اوم پرکاش

کمال کا آدمی

اُن تنگ گلیوں سے گزر کر جب ہم اس جیوتشی کے گھر پہنچے تو وہاں پہلے ہی سے لوگوں کو قطار میں بیٹھا دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہم کسی ڈاکٹر کے گھر آگئے ہوں۔ میں نے اس جیوتشی کے بارے میں سنا تھا کہ بڑے کمال کا آدمی ہے۔ لوگوں کی تکلیفوں کو، دکھوں کو دور کرتا ہے۔ صحیح بات بتاتا ہے، اور کئی طریقے اپنانے کو کہتا ہے، جس میں انگوٹھی میں کون سا قیمتی پتھر جڑوانا ہے وغیرہ بھی شامل ہے۔ مجھے اُس سے ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا، کیوں کہ مجھے ایسے لوگوں پر کوئی تیقن نہیں، لیکن بیوی کی بات نہیں ٹال سکا، جسے اس پر پورا اعتماد تھا۔ اب تجسس ضرور تھا کہ اسے دیکھوں تو وہ کرتا کیا ہے، کہتا کیا ہے؟ اتنے سارے لوگوں کو وہاں بیٹھا دیکھ کر، جن میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی، میں گھبرا سا گیا، کیوں کہ یہاں تو کافی وقت لگنا تھا۔ میری بیوی نے شاید میری گھبراہٹ کو جان لیا تھا اس لیے کہہ رہی تھی "گھبراؤ نہیں، یہاں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ آؤ، یہاں بیٹھ جاؤ۔" میں نے حکم کی تعمیل کی اور سب سے آخر میں بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ میری بیوی بھی بیٹھ گئی۔

وہ ایک برامدہ تھا جسے کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ کچھ تصویریں ٹنگی تھیں اور کچھ عجیب وغریب اشتہار سے، جن پر لکیریں کھنچی ہوئی تھیں ٹیڑھی میڑھی سی۔ ہلکا نیلا رنگ دیواروں پر چڑھا تھا اور صفائی کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا تھا۔ میں اس قطار میں ابھی سب سے آخر میں بیٹھا تھا اور میں نے دیکھا کہ جو شخص دروازے کے ساتھ بالکل لگا بیٹھا تھا، وہ بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے کہیں جانے کی بڑی جلدی تھی۔

اس کی بغل میں ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی جو نہایت ہی بجھی بجھی سی اور سوچ میں غرق تھی۔ اس سے پہلے کہ میں قطار میں بیٹھے دوسرے افراد کا جائزہ لیتا میری بیوی نے کچھ قریب آکر میرے کان میں کچھ بُدبُدایا۔ میں کچھ نہیں سمجھا، اس کے قریب ہو کر پوچھا "کیا ہے"۔

وہ میرے کچھ اور قریب ہو کر بولی۔ "وہ جو دروازے سے دوسرے نمبر پر خاتون بیٹھی ہے نا اس کا ابھی کچھ ہفتے پہلے جوان بیٹا چل بسا ہے"۔

"کیسے،" میں نے پھر سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

"حادثے میں۔ ایک ٹرک کے نیچے آگیا تھا" اس نے کہا۔

"تو پھر وہ اب یہاں کیا کرنے آئی ہے" میں نے کچھ جاننے کی غرض سے پوچھ لیا۔

"بس دل کو تسلی دینے"۔ ایک خاص انداز سے اس نے یہ بات کہی۔

"کیسی تسلی"۔ میں نے مزید کریدا۔

"اب خاموش"۔ اس نے جیسے مجھ سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

میں خاموش ہو گیا، قطار میں کچھ ہلچل ہوئی۔ میں بھی کچھ اور آگے ہوا۔ اب وہ خاتون بالکل دروازے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اسی طرح گم سم، دنیا جہان کو بھلائے ہوئے۔

"اب کیا جاننا چاہتی ہے وہ" میں نے خود سے پوچھا، "کیا چاہیے اسے؟ کیا ابھی بھی وہ اس سچ کو نہیں جان پائی کہ جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا۔ اس میں کوئی کیا مدد کر سکتا ہے"۔

قطار میں پھر حرکت ہوئی اور ہم پھر آگے ہوئے اور اس طرح ہم اس دروازے کے قریب ہوتے ہو گئے جس کے اندر کوئی ایسا شخص بیٹھا تھا، جو سب کی بگڑی بنا رہا تھا، اب وہ خاتون اندر گئی تھی جس کے بارے میں ابھی مجھے میری بیوی نے بتایا تھا۔ ہم دروازے سے کچھ زیادہ دور تھے ابھی، میں نے بہت کوشش کی کہ اندر ہو رہی بات چیت سن سکوں، لیکن کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔ شاید بات چیت بہت ہی ہلکے ہلکے ہو رہی تھی۔ سب کچھ پُراسرار سا لگا، لوگوں کے بیٹھنے تک سے باہر نکل کر مسکراتے ہوئے یا خاموشی گزر جانے تک سب کچھ۔ میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، وہ شاید مجھ میں مچل رہے خیالات کو سمجھ گئی تھی، کچھ نہیں بولی، بس آنکھوں آنکھوں میں سمجھا دیا کہ اور زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

میں نے گھڑی دیکھی، پورا ایک گھنٹہ گزر گیا تھا اس خاتون کو اندر گئے تو اب لگ بھگ دس منٹ ہو چکے تھے، اب اور زیادہ یوں بیٹھے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر بھاگ جانا چاہتا تھا، لیکن ایسا کر نہ سکا، ہاں اکیلا آیا ہوتا تو ضرور بھاگ گیا ہوتا۔ اچانک وہ خاتون پردے کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا لگا، اور آنکھیں سوجی ہوئی۔ گردن جھکائے وہ میرے سامنے سے دوپٹہ سنبھالتی

اسسٹنٹ ایڈیٹر، سینک سماچار، ایل۔ا، بلاک، چرچ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ہوئی نکل گئی۔ میں اسے روک کر پوچھنا چاہتا تھا کہ اب کیا معلوم ہوا، کیا تسلی ہو گئی ؟ پر ایسا نہ کر سکا، کیوں کہ میں اپنی بیوی کی نظروں میں قید تھا، اپنے ہی دل میں اٹھے طوفان میں ڈوب گیا، یہ کتنا بڑا دھوکا ہے خود سے جھوٹی تسلیوں میں جیتے رہنا۔ سچ سے منھ موڑنا — کیسا سکھ ہے یہ — ؟

"چلئے چلئے — ہماری باری آگئی ہے"

میں چونک پڑا۔ میری بیوی مجھے ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہو گیا اور اپنی بیوی کے پیچھے پیچھے کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ کچھ دیر خود کو سنبھالنے میں لگی اور پھر اس نیم روشن کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں سب کچھ عجیب سا تھا، جیسے روشنی کا انتظام۔ تیز روشنی کا بلب کالی شیڈ سے ڈھکا بالکل میز پر آکر ٹھہر سا گیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی میز تھی، جس پر لال کپڑا بچھا ہوا تھا، میز کے بیچ میں ایک سادہ سفید کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر ایک قلم رکھا تھا۔ اس بڑی میز کے پیچھے جیوتشی جی بیٹھے تھے، جس کا چہرہ اک مٹیالے روشنی میں صاف صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کچھ بلب اس طرح سیٹ کیے گئے تھے کہ ہمارا چہرہ جیوتشی جی کو صاف صاف دکھائی دیتا۔ میری سوچ کی دراڑیں گہرا گئیں۔ "یہ کہاں آگیا ہوں میں، یہ سب کیا ہے، مجھے کیا چاہیے"۔

میرے قریب ہی بیٹھی میری بیوی نے جیوتشی جی کو کچھ دیتے ہوئے کہا۔ "صبح آٹھ بج کر آٹھ منٹ"۔

میں نے حیران نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھا وہ خاموش بس اس نیم اندھیرے میں کچھ تلاش رہی تھی۔ میں بھی سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک سایہ سا سامنے تھا جس میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ کمرے میں گہرا سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ایک پراسرار خاموشی، جسے کچھ ہی دیر میں جیوتشی کی آواز نے توڑ دیا وہ پوچھ رہے تھے۔ "کیا کام کرتے ہو"

"نوکری سرکاری نوکری"۔ میں نے کہا۔

"کوئی مشکل"۔ وہ پھر بولا۔

"کیسی مشکل"۔ میں نے سوال پلٹ دیا۔

"یہی نوکری پیشے کی، صحت کی، گھریلو کوئی پریشانی — وغیرہ وغیرہ" اس نے رک رک کر ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

یہ کیسا سوال تھا۔ مشکل۔ کیسی مشکل، مشکلیں کس کو نہیں ہیں، گھریلو پریشانیوں سے کون آزاد ہے، صحت کس کی بس ایک دم ٹھیک ہی رہتی ہے۔ "بس اوپر والے کی مہربانی ہے" میں نے ہلکے انداز میں بات اچھال دی۔ وہ پھر خاموش ہو گیا۔ جیسے کچھ سوچ رہا ہو، بیوی نے میرے قریب آکر کہا "ٹھیک طرح سے جواب دیجیے نا"۔

جیوتشی کی آواز پھر ابھری۔ اب وہ میری بیوی سے مخاطب تھا۔

"تم نے ان کی پیدائش کا جو وقت دیا ہے وہ تو ٹھیک ہے، لیکن —"

وہ پھر خاموش ہو گیا اور سامنے پڑے سفید کاغذ پر کچھ لکیریں کھینچنے لگا۔ آڑی ترچھی سی لکیریں۔ جنھیں میں صاف صاف دیکھ سکتا تھا۔ اس نے کچھ اس کاغذ پر لکھا بھی، میں یہ سب خاموشی سے دیکھتا رہا۔ اک تماشہ تھا۔ میں ہنسنا چاہتا تھا، خود پر، اپنی بیوی پر اور اس جیوتشی پر بھی، جس کا یہ روزگار تھا یا شغل مجھے معلوم نہیں۔ لیکن کمرے کی پُراسرار خاموشی اور اندھیرے اُجالے میں لپٹے درو دیوار مجھے چپ رہنے کو کہہ رہے تھے۔ اس نے کاغذ اٹھا لیا اور میز کے نیچے کہیں رکھتے ہوئے میری بیوی سے بولا۔ "آپ مجھ سے کل پھر ملیے گا، کوئی طریقہ بتاؤں گا، سب ٹھیک ہو جائے گا" کیا ٹھیک ہو جائے گا میں نے پوچھنا چاہا، لیکن وہاں کی خاموشی کا کچھ ایسا اثر ہو گیا تھا کہ اپنی ہتھیلیوں کو دیکھنے لگا، دوسری طرف میری بیوی نے اپنے بٹوے سے کچھ پیسے نکالے اور اسے دیتے ہوئے بولی "آپ کا کرم ہے، بس اچھی طرح سے دیکھیے گا۔ ان کی صحت کچھ کچھ خراب رہتی ہے اور غصہ بھی زیادہ آتا ہے اور وہ مہاراج جو بچوں کے بارے میں پوچھا تھا اس کے بارے میں بھی کچھ بتا دینا"۔

میں بیوی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کتنی معصوم تھی وہ۔ اسے اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ میں اس کی بغل میں بیٹھا ہوں اور وہ جو کہہ رہی ہے سچ نہیں ہے۔ غصہ تو مجھے واقعی اب آرہا تھا اور اس کے آنے کی اتنی بڑی وجہ بھی تھی۔ لیکن بس خاموش رہا اور سنتا رہا، خود کو کوستا بھی رہا کہ یہاں آیا ہی کیوں تھا۔ میں بس اپنی بیوی کو ہی دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ ہی دیر بعد ہاتھ جوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے بھی اٹھ جانے کو کہا۔ میری حالت عجیب تھی۔ بالکل اس اسکولی بچے کی طرح جسے کسی شرارت کے جرم میں ہیڈ ماسٹر کے سامنے پیش کر دیا ہو۔ میں اٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ شاید اس جیوتشی کا چہرہ کچھ اور صاف نظر آئے۔ لیکن ناکام رہا۔ اسی گہری مٹیالی روشنی میں وہ شخص گم ہی رہا۔

کمرے سے باہر نکلتے ہی تازہ ہوا کے جھونکے نے کچھ راحت بخشی۔ میں نے دیکھا قطار میں کچھ اور لوگ شامل ہو گئے تھے۔ سیڑھیوں پر ایک چھوٹا لڑکا ایک عمر رسیدہ خاتون کو سہارا دے کر اوپر لا رہا تھا۔ اچانک اس بوڑھی عورت کا کچھ توازن بگڑ گیا اور وہ سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئی۔ وہ اس چھوٹے لڑکے سے نہیں اٹھ پا رہی تھی۔ میں نے آگے ہو کر اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "یہاں کس لیے آئی ہو موسی"۔ اس سے تو کوئی جواب نہیں بن پڑا کیوں کہ وہ کھانسنے لگ پڑی تھی۔ اس چھوٹے لڑکے نے مجھے بتایا کہ وہ اس کی دادی ہے اور یہاں مہاراج سے ملنے آئی ہے، کیوں کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ میرا دل چاہا کہ اپنے سر کے بال نوچ لوں۔ اس بڑھیا سے کہوں کہ کسی ڈاکٹر کے پاس جائیے، لیکن کچھ نہ کہہ سکا، بس خاموشی سے اسے قطار کے آخر میں بیٹھا دیکھتا رہا۔ اس کا پوتا اس کے قریب ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"چلیے بھی"۔ میری بیوی مجھ سے کہہ رہی تھی۔

"اب کہاں چلنا ہے"۔ میں نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ میرے طنز کو سمجھ گئی اور سیڑھیاں اترنے لگی چپ چاپ۔ میں بھی، اب خیالوں میں گم آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ خود ہی سے جیسے خفا تھا کہ یہاں آیا کیوں، یوں کے

باقی صفحہ پر

غزل

کرشن موھن

تال سے باہر نہیں، تال ہی میں ہے سروج
اور کہاں پائے گا، من کی خوشی من میں کھوج

لاگ، ریا، چھل کپٹ، پاس نہ آ، دور رہے
ایسے جگت میں رہیں، نیر میں جیسے سروج

حسن کی رکھ آبرو، ہو نہ سبک جستجو
زندگی کا رُخ نکھار، عاشقی کا بھید کھوج

وقت بھلا کس کا میت، مکر فریب اس کی ریت
راجا ہو کوئی کہ رنک، گنگو ہو کوئی کہ کھوج

آس بھی ہے پاس بھی، جیسے گدا اگر کوئی
مانگنے کے ساتھ ساتھ دیتا ہو گالی گلوچ

۱۵۸۔ پشپا بجلی۔ دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲
یوجنا، نئی دہلی

غزل

شفیع اللہ خاں رازؔ

تو اگر میرے ساتھ ہو جائے
رشکِ جنت حیات ہو جائے

وقت، اک بے وفا حسینہ ہے
جانے کب کس کے ساتھ ہو جائے

آدمی، آدمی نظر آئے
ختم گر ذات پات ہو جائے

پیار امرت کا ایسا پیالہ ہے
زیست قند و نبات ہو جائے

حسن کردار میں وہ برکت ہے
آدمی کی نجات ہو جائے

لوگ کیوں جستجو میں رہتے ہیں
ختم یہ کائنات ہو جائے

رازؔ فرصت میں گر وہ مل جائیں
ان سے کچھ دیر بات ہو جائے

کٹرہ پُر دل خان، اردو روڈ، اٹاوہ، یوپی ۲۰۶۰۰۱

غزل

بدر نظیری

جو اس نے کھینچ لیں میرے نفس کی زنجیریں
میں لکھ سکا بھی نہ شہرِ غزل کی تفسیریں

وہ اپنے چہرے کا نقش و نگار بھی دیکھے
اُتارتا ہے جو کاغذ پہ سب کی تصویریں

بھٹک رہی ہے اندھیرے میں آج کی تہذیب
کہ تیرگی سی اُگلتی ہیں اس کی تنویریں

برستے شعلوں کی تہذیب میں وہ یاد آئیں
گزشتہ دور کی رنگین و سادہ تصویریں

جو سرد و گرم ہواؤں سے بچ کے چلتے تھے
گری پڑی ملیں سڑکوں پہ ان کی تصویریں

دعا کو ہاتھ اٹھے بدرؔ تو اٹھے ہی رہیں
کبھی تو لوٹیں گی گم گشتہ اس کی تاثیریں

اے۔۲۰، ایس، آر، ایم فلیٹ، غفار منزل جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

غزلیں

کیفی سنبھلی

جو ایک پل میں ہی سو بار ٹوٹتا ہوں میں
بڑا غرور تھا مجھ کو کہ آئینہ ہوں میں

کچھ ایسا چہرے پہ چہرہ چڑھا چکا ہوں میں
ذرا جو آئینہ دیکھوں تو کانپتا ہوں میں

بچا تو مجھے حسنِ سلوک دریا سے
بنا کے پیاس کو زادِ سفر چلا ہوں میں

بلندیوں کے مجھے خواب پھر نہ دکھلاؤ
کہ فرشِ خاک پہ گر کر ابھی اٹھا ہوں میں

صداقتوں کا تری اعتراف کیسے کروں؟
خود اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتا ہوں میں

مجھے بجھانے کی اب تک جو سازشیں نہ ہوئیں
تو آج تک کوئی نا معتبر دیا ہوں میں

کوئی تو مجھ کو زمیں پر اتار لے کیفیؔ
کہ بے سبب ہی خلاؤں میں اڑ رہا ہوں میں

نوریوں سرائے سنبھل (مراد آباد)

نسیم شاہجہانپوری

حریمِ حسن الیقین و گماں سے باہر تھا
یہ تب کی بات ہے جب راہ تھی نہ رہبر تھا

خوشا وہ خواب کہ وہ مجھ سے ہم کلام رہے
میں سو رہا تھا مگر جاگتا مقدر تھا

اٹھا ہے بت شکنی کے لیے جو دستِ خلیلؑ
تو پاش پاش ہر اک شاہکار آزر تھا

اثر ہوا نہ زمانے کی سنگ باری کا
جو تم نے پھینکا تھا مجھ پر وہ پھول پتھر تھا

سفرِ حیات کا اک سلسلہ تھا خوابوں کا
کھلی جب آنکھ تو ہر سمت شورِ محشر تھا

ہوں آج باعثِ تزئینِ گلستاں بھی نسیمؔ
فضا بدلنے کا سہرا ابھی کل مرے سر تھا

تارین جلال نگر، شاہجہاں پور۔ یوپی

ظفر اقبال ظفرؔ

بند آنکھوں کو کریں روز یہ سپنا دیکھیں
چاند قربت کا ہو روشن تو اُجالا دیکھیں

موم کے لوگ کڑی دھوپ میں آ بیٹھے ہیں
آؤ اب ان کے پگھلنے کا تماشا دیکھیں

پیاس ہم اپنی بجھانے تو چلے آئے ہیں
جو ہے اک منظرِ بے آب وہ دریا دیکھیں

جی بہت اُوب چکا شہر کے ہنگاموں سے
آؤ اب چل کے ذرا وسعتِ صحرا دیکھیں

یہ مرے دل میں ابھرتی ہے عجب سی خواہش
آئینہ توڑ دیں اور کثرتِ جلوا دیکھیں

شہرِ آشوب میں ملنے سے رہی جائے سکوں
آؤ چل کر کسی درویش کی کٹیا دیکھیں

اب مرے دل میں ظفرؔ آخری خواہش ہے یہی
اپنی آنکھوں سے کبھی وادیٔ بطحا دیکھیں

۱۷۰، رخیلدار۔ فتح پور، (۲۱۲۶۰۱)

بچت

رضا امروہوی

بچت کرو کہ ضروری ہے زندگی کے لیے
چراغ چاہیے ہر گھر میں روشنی کے لیے

جو کام بگڑے ہوئے ہوں سنوارتی ہے بچت
اُداس، اُداس سے چہرے نکھارتی ہے بچت
غموں کے بوجھ سروں سے اتارتی ہے بچت

بچت کرو کہ ضروری ہے زندگی کے لیے
چراغ چاہیے ہر گھر میں روشنی کے لیے

بچت سے فائدے ہیں کوئی بھی نہیں نقصان
یہ ایسا کام ہے کر سکتا ہے ہر اک انسان
جو فائدے نہ اٹھائے بچت سے ہے نادان

بچت کرو کہ ضروری ہے زندگی کے لیے
چراغ چاہیے ہر گھر میں روشنی کے لیے

بچت کرو کہ نئے وقت کا تقاضا ہے
نئے سماج کی تعمیر کا اشارہ ہے
بچت ہی یارو برے وقت کا سہارا ہے

بچت کرو کہ ضروری ہے زندگی کے لیے
چراغ چاہیے ہر گھر میں روشنی کے لیے

پی اینڈ ٹی بلاک نمبر ۲ - B/1 کالی باڑی مارگ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۱

امن کے دیپ جلاؤ

بیدل سرحدی

مانگ میں دھرتی کی آکاش کے تارے بھر دیں
اک نئی صبح کے آنے کے اشارے بھر دیں
اور مٹی کے چراغوں میں شرارے بھر دیں
سرد سینوں کو ذرا ہوشِ یقیں سے گرماؤ
امن کے دیپ جلاؤ ساتھیو دیپ جلاؤ

روئے گیتی کو ذرا اور نکھاریں آؤ
آؤ مستقبل روشن کو پکاریں آؤ
موت کے گھاٹ اندھیروں کو اُتاریں آؤ
جگمگاتے ہوئے پُرنور دیوؤں ہاتھ بٹاؤ
امن کے دیپ جلاؤ ساتھیو دیپ جلاؤ

پھر مسیحائے زماں عیسیٰؑ دوراں بن جاؤ
اور تکبر کے سب آتش کدے گلزار بناؤ
آگ اک ایسی ہر اک سینۂ سوزاں میں لگاؤ
امن کے دیپ جلاؤ ساتھیو دیپ جلاؤ

نگہبان شعبۂ اشاعت، سنت نرنکاری منڈل، دہلی - ۹

تبصرے

نام کتاب	لمحہ لمحہ اضطراب
مولف	انور قریشی
صفحات	۹۶
قیمت	۲۵ روپے
ملنے کا پتا	انور قریشی، بڑے خاں حضرت خواجہ دانا روڈ سورت ۳۹۵۰۰۱
مبصر	عادل صدیقی

شعر عصری دردمندی، انسانی رشتوں کی پیچیدگی اور زندگی کی قدروں کی شکست و ریخت کا اظہار ہے۔ شعری ترسیل کا وسیلہ کائناتی و آفاقی صداقتوں کو بے نقاب کرتا ہے اور داخلی حقیقتوں کا مشاہدہ بھی کراتا ہے۔ غزل کا جدید لہجہ اب محض گل و بلبل تک ہی محدود نہیں بلکہ تمام تہذیبی، ادبی، سیاسی، عمرانی اور معاشرتی حقیقتوں کو ایمائی طرز اسلوب کے راستے غزل میں سمیٹ لیا جاتا ہے، انھیں مقدس رعایتوں، بامعنی تجزیوں اور زندگی بخش عمل کو جناب انور قریشی صاحب نے 'لمحہ لمحہ اضطراب' میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کا تعلق گجرات کے مشہور شہر سورت سے ہے، یہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس کا آغاز انھوں نے حمد کے اس شعر سے کیا ہے :

تو ہے ادھر، تو ہے اُدھر، اول بھی تو، آخر بھی تو
تو ہر جگہ ہے جلوہ گر اول بھی تو، آخر بھی تو

ان کے اشعار ان کے فطری کرب اور عصری حیثیت کے آئینہ دار ہیں، کہتے ہیں :

پھٹے زمین کہ گر جائے آسماں ہم پر
جو بات کرنی ہے ہم صاف صاف کرتے ہیں

زمانہ جانتا ہے باوجود کوشش پیہم
ذرا سا بھی نہ دھبہ لگ سکا یوسف کے دامن پر

انسان آج جس طرح کی کشمکش سے دوچار ہے اور تنازع للبقا کی دوڑ میں جس طرح سرگرداں ہے، شاعر نے ان کیفیات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ زندگی کے اس شعری سفر میں کسی کسی وقت شاعر کو یاس و قنوطیت کے جذبات پر بھی قابو پانا پڑتا ہے، لیکن وہ نہ تو مایوس ہیں اور نہ خوفزدہ بلکہ انسان کو زندگی کی دائمی حقیقتوں سے آگاہ کرانا چاہتے ہیں۔

فکر جہاں ہو یا کہ رہوں محو روزگار
رہتا نہیں میں چاہنے والوں سے بے خبر

ہم ہیں وفا، خلوص و محبت سے آشنا
وہ اور ہیں جو کرتے ہیں زردار کی تلاش

"لمحہ لمحہ اضطراب" کے اشعار سے شاعر کی اضطرابی کیفیات کا بخوبی اظہار ہوتا ہے ؎

ارمان اگر دل سے نکلنے کے لیے ہیں
روکا ہے انھیں کس نے، نکل کیوں نہیں جاتے

مختصر یہ کہ لمحہ لمحہ اضطراب فکر و وجدان کی کیفیتوں کو ہم آہنگ کر رہا ہے۔ شاعر کا خلوص اور بے باکی ہی اس شعری مجموعے کی جان ہے۔ ●

نام کتاب	اردو شارٹ ہینڈ گائڈ
مولف	نجم الاسلام
صفحات	۲۷۲
قیمت	۶۰ روپے
مبصر	سیدہ رفیعہ زیدی

"اردو شارٹ ہینڈ گائڈ" میں سب سے پہلے عرض مولف، پیش لفظ اور مختلف اشخاص کی آرا شامل کی گئی ہیں۔ اس کے بعد شارٹ ہینڈ کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ بعد ازاں طلبا کے لیے ضروری ہدایات ترتیب دی گئی ہیں۔ اس کے بعد" خاکہ اردو علامات" کے تحت اردو شارٹ ہینڈ میں استعمال ہونے والی علامات کو سمجھایا گیا ہے۔ ان علامات کو پیش کرتے وقت موٹا جلی اور خفی میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا ہے مثلاً صفحہ ۲۵ پر درج ذیل علامات کو موٹا کر دیا گیا ہے۔

و س ی ک خ ے غ ے

اس میں "و ی خ" کی علامات کو ہلکا ہونا چاہیے جب کہ "غ" کی علامات کو موٹا ہونا چاہیے تھا۔ مگر یہاں تمام علامات کو (جلی) موٹا کر دیا گیا ہے۔ یہ تو کتاب کے ابتدائی صفحہ کی مثال ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ پوری کتاب میں کہیں بھی ان علامات کے باریک یا موٹا ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے جب کہ شارٹ ہینڈ کا تمام نظام باریک اور موٹی علامات ہی پر قائم ہے۔

یوں تو مولف نے صفحہ ۲۸ پر" حرکات کے مقامات" اور" ماقبل و مابعد" کو نقشہ کے ذریعہ سمجھایا ہے جب کہ صفحہ ۳۱ پر علامات ملانے کا طریقہ سمجھایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ "حرکات کے مقامات" والے سبق سے پہلے آنا چاہیے تھا۔

مولف نے یوں تو "طلبا کے لیے ہدایات" میں شارٹ ہینڈ لائن دار کاغذ پر لکھنے کی تلقین کی ہے مگر خود کتاب میں جو علامات اور دیگر اصول پیش کیے ہیں انھیں سمجھانے کے لیے کہیں لائن دار کاغذ کا استعمال نہیں کیا ہے۔

اسی طرح ترنیمات / رموز کی تعریف بیان کرتے ہوئے صفحہ ۳۹ پر جو مثالیں پیش کی ہیں ان کے لکھنے کا اصول صفحہ ۴۸ پر بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح علامات سمجھانے سے پہلے مثال پیش کردی گئی ہے جو طریقہ تدریس کے منافی ہے مثلاً

بالکل ؟ سرکار زبردست

علاوہ ازیں تمام رموز کو ایک ہی کالم میں پیش کردیا گیا ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر مولف انھیں تینے کالموں ہی میں پیش کرکے سمجھاتے یعنی مقام اول، مقام دوم اور مقام سوم۔

کتاب کے صفحہ ۴۸ پر "ر۔ ڑ" کا ہک اور صفحہ ۵۰ پر "ل" کا ہک لکھنے کا اصول بیان کیا گیا ہے۔ بعدازاں صفحہ ۵۵ تا ۶۳ پر چھوٹے اور بڑے دائرے لکھنے کے اصول سمجھائے گئے ہیں۔ یہاں بھی مولف نے تدریس کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ خود مولف نے صفحہ ۴۸ پر "ر۔ ڑ" کے ہک کا سبق ترتیب دیا ہے اور اس سبق کو شروع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اب تک ہم نے چھوٹے و بڑے دائرے کا استعمال پڑھا ہے اب ہم ہک کا استعمال کیسے کریں اور کس طرح نہ کریں اس پر مباحثہ کریں گے۔"

لہٰذا دائروں کو استعمال کرنے والے اسباق کو ہک دار علامات کے استعمال کے اصول سے پہلے ترتیب دینا چاہیے تھا۔

شارٹ ہینڈ میں کچھ علامات دائروں اور ہکوں سے ظاہر کی جاتی ہیں لیکن کتاب میں یہ دائرے اور ہک صحیح طریقہ سے پیش نہیں کیے جاسکے مثلاً

ص ۵۵ شک فش

ص ۵۶ دستک

ص ۶۹ ہستی ساتھ سچ مر پیش

ص ۱۳۷ دست کش

یہ تمام علامات غلط طریقہ سے پیش کی گئی ہیں صحیح علامات حسب ذیل ہوں گی۔

شک فش دستک ہستی ساتھ پیش دست کش

"اصول اتصال" کے سبق میں مجموعہ نویسی کے اصول کو سمجھاتے وقت جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان کی شارٹ ہینڈ بھی غلط طریقہ سے پیش کی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں مولف نے دفتری اصطلاحات اور مرسومات کو لغت کے اصول کے تحت ترتیب دیا ہے مگر ان کی علامات لکھتے وقت لائن کا استعمال نہیں کیا گیا ہے جس سے انھیں ترتیب دینے کا مقصد ہی فوت ہوگیا ہے۔

کتاب کے صفحہ ۲۱۳ پر اردو شارٹ ہینڈ کو دائیں سے بائیں لکھا ہے جو سراسر غلط ہے چوں کہ مولف نے طریقہ پٹمین کو استعمال کیا ہے اور اس طریقہ کے تحت کسی صورت میں شارٹ ہینڈ کو دائیں سے بائیں نہیں لکھا جاسکتا۔

کتاب کی پرنٹ لائن پر یہ جملہ درج ہے۔ "اردو شارٹ ہینڈ ریسرچ بورڈ، نئی دہلی سے منظور شدہ"۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اس قسم کے بورڈ کا ہندوستان بھر میں کہیں وجود نہیں ہے تو پھر منظور شدہ ہونے کا سوال ہی کہاں رہ جاتا ہے۔

بہرحال بعض کمیوں اور خامیوں (جن کا ذکر کیا گیا) کے باوصف "اردو شارٹ ہینڈ گائڈ" کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو میں اس موضوع پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں اور کم مواد دستیاب ہے۔ اس لحاظ سے اردو شارٹ ہینڈ سیکھنے کے طالب اس کتاب سے خاطر خواہ استفادہ کرسکتے ہیں۔ ●

بقیہ: مثبت تبدیلی کے آثار

اپنے توازن ادائیگی کے رواں کھاتہ کے خسارے کو واجبی حدود کے اندر رکھنا چاہیے، جو کہ اپنی خام قومی پیداوار کے ایک فی صدی سے زیادہ نہ ہو جیسا کہ اس وقت ہے۔ میکسیکو میں یہ ۸ فی صدی ہے۔ (۳) ہندوستان کے بیرونی زرمبادلہ کے محفوظے کو حال کے مانند قلیل المدتی سرمایہ کی درآمد و نیز بیرونی قرض سے ذخیرہ نہ کرکے، برآمدات کی بلند دراور بلاواسطہ بیرونی اصل کاری کی اساس پر ماخوذ ہونا چاہیے۔ (۴) منصوبہ بندی کمیشن کی واگزاشت کردہ قومی نمونہ جائزے کی حالیہ ۳۸ ویں گردش کے اعداد وشمار سے عیاں ہوا ہے کہ ملک کے اقتصادی اصلاحات کے عمل کے اوائلی دو سال کے دوران ہندوستان میں مفلسوں کی تعداد میں فی الحقیقت اضافہ ہوگیا ہے، بایں معنیٰ کہ خط افلاس سے پست گزارا کرنے والوں کی تعداد ۹۰-۱۹۸۹ء میں ۳۴ فی صد سے افزوں ہوکر ۱۹۹۲ء میں ۴۰ فی صد ہوگئی ہے۔

درآنحالیکہ یہ حقیقت امر ہے کہ جہاں بھی ساختیاتی مطابقت میں اصلاح کا عمل شروع کیا جاتا ہے، ابتدا میں غربا ہی اس کا بار برداشت کرتے ہیں اور نسبتاً زیادہ مصیبت اٹھاتے ہیں، تاہم ایک جمہوری سیاسی نظام میں فلاحی ریاست کے اصول و نیز سماجی تحفظ کی پالیسی کو موقوف نہیں کیا جاسکتا ہے۔ چناں چہ آج کے اس "عالمیانے کی اقتصاد" کہ ہندوستان جس کا ایک بڑا حامی ہے، کے دور میں ظہور میں آنے والے ترقی پذیر بازاروں کے لیے معاشی کشادگی کے نو کلاسیکی یک مشتی پالیسی کا چاہے زیادہ دلیرانہ طریقۂ علاج ہو یا درمیانی راستے والا، اس کو عوام الناس کے معیار زندگی میں نوعیتی بہتری لانے کے مفروضے کو لازماً توجہ دینا پڑے گی۔ لیکن بہرحال اس مقصد کی تکمیل کی غرض سے وضع کیے گئے منصوبہ و نیز پروگراموں کو "معاشی احکار" کے مطابق ہونا چاہیے اور خصوصی حلقوں و نیز طبقوں کے لیے نشانہ بند طرز کا ہی ہونا چاہیے۔ مزید یہ کہ ان پروگراموں پر عمل درآمد میں سختی اور ایمانداری کی بھی پابندی ضروری ہے تاکہ ان کے فوائد ان ہی افراد و نیز حلقوں تک پہنچ سکیں کہ جن کے لیے ان کو وقف کیا گیا ہے (۵) ہندوستان کو اپنی خام پیداوار کے تناسب کے اعتبار سے اپنے دفور پذیر مالیاتی خسارے کو، جو گزشتہ سال (۹۴-۱۹۹۳ء میں) ۷ر۳ فی صد کے مساوی تھا، لازمی طور پر ضبط کرنا ہوگا۔ چناں چہ ہمیں مسرفانہ مصارف، غیر منصوبہ بند و نیز نا ترقیاتی اخراجات پر جبر کرنا چاہیے۔ اگر ہم یہ سب کرپائے، محض تب ہی ہم مناسب طور پر افراط زر میں اضافہ کی سالانہ در کو ۵-۶ فی صد کے مدارج میں پابند کرپائیں گے۔ (۶) افراط زر میں اضافہ کی در کو ہی پابند رکھنے کی غرض سے ملک میں زررسد کی نمو در ۱۰ فی صدی سالانہ سے مستزاد نہیں ہونا چاہیے، جب کہ اس وقت وہ ۱۵-۱۹ فی صدی کے بہت اونچے مراتب میں ہے۔ (۷) مالی زمرہ کی اصلاح، قومی تجدید فنڈ (این آر ایف) کے عمل درآمد کے تئیں سرگرمی پیدا کرنا اور بیرونی و نیز داخلی قرض کا مناسب و موزوں بندوبست، بھی ملک کی موجودہ اقتصادی اصلاحات کی پالیسی کے "درمیانی راستے" کے تئیں وقت کی پکار ہیں، جن کی تعمیل میں ہی عوام الناس کی فلاح مضمر ہے۔ لیکن اقتصادی اصلاحات بہرحال ناقابل منسوخی ہیں۔ ●

سید جعفر محمود

دہلی ـــ سوال و جواب کے آئینے میں

دہلی کی چہار دیواری کے اندر ایک عظیم تاریخ مدفون ہے۔ ایسا طویل اور شاندار ماضی دنیا کے چند ایک ہی شہر کے قسمت میں آیا ہے۔ اس کی ابتدا کے متعلق جانکاری قدیم تواریخ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کا کہنا ہے کہ تین ہزار سال قبل بھی دہلی کے اطراف واکناف میں انسانی آبادی کے ثبوت ملے ہیں۔ آج جہاں ہندوستان کی راجدھانی واقع ہے یہاں بہت ساری بستیاں اجڑتی اور بستی رہی ہیں۔ یہاں پر پائی جانے والی ۱۳۰۰ سو سے زائد تاریخی یادگاریں مختلف روایتوں، تہذیبوں اور طرزِ زندگی کی جھلکیاں پیش کرتی ہیں۔ دلی ایک ایسے آئینے کے مصداق ہے جس میں مکمل ہندوستان کی تصویر جھلکتی ہے۔

دہلی کی قدامت جاننے کے لیے اس افسانوی شہر کی جانب مڑ کر دیکھنا ہوگا جسے 'اندر پرستھا' کہتے ہیں۔ 'اندر پرستھا' جو دراصل پانڈوؤں کی راجدھانی تھی، کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سولہویں صدی کے پرانے قلعہ کے نزدیک واقع تھی۔ اس اساطیری ابتدا سے لے کر اب تک اس شہر نے مختلف ادوارِ حکومت کو دیکھا ہے۔ بعد کے زمانے نے تومار راجپوتوں کو اراولی پہاڑیوں پر جو جنوبی دہلی میں واقع ہے قدم جماتے دیکھا۔ پھر چوہان خاندان کا زمانہ آیا، جنھوں نے ان سے اس شہر کو چھین لیا۔

دہلی پر قطب الدین ایبک کے قبضے کے بعد نئے دور کی شروعات ہوئی، جسے دہلی سلطنت کا دور کہتے ہیں۔ مغلوں کے شاندار دور کے شروع ہونے سے قبل دہلی پر پانچ خاندانوں (غلام خاندان، خلجی خاندان، تغلق خاندان، سیّد خاندان اور لودی خاندان) نے حکومت کی تھی۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے دہلی کے بارے میں مزید معلومات سوال و جواب کی شکل میں پیش ہیں۔

سوالات

۱۔ دہلی کی ابتدائی تاریخ کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ ؎

پہلے دلّی تومار، پیچھے چوہان
اور پیچھے مغل پٹھان

"پہلے دہلی پر تومار نے قبضہ کیا، پھر چوہان نے اور اس کے بعد مغل اور پٹھان نے۔" ان میں سے ہر ایک خاندان کے اول اور آخر بادشاہوں کے نام بتائیں؟

۲۔ لال کوٹ کس نے بنوایا تھا؟

۳۔ پانڈو راجکماروں نے دھرت راشٹر سے پانچ گاؤں طلب کیے تھے ان میں سے چار یہ تھے۔ تیلا پرستھا (تیلاپت)، سونا پرستھا (سونی پت)، وردکا پرستھا (باغپت) اور پانی پرستھا (پانی پت)

● پانچواں گاؤں کون سا تھا؟

۴۔ "علی مردان نہر" بنیادی طور پر کس نے تعمیر کروائی تھی؟

۵۔ دہلی کا آخری ہندو راجا کون تھا؟

۶۔ کون سے کتبے سے پتا چلتا ہے کہ توماروں نے ہریانہ پر حکومت کی تھی جس کی راجدھانی دلّیکا تھی۔؟

۷۔ توماروں نے جو ایک راجپوت قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، دہلی کو کب قائم کیا تھا؟

۸۔ "میں نے شہر دلّی کے مکینوں کو تین دن کے اندر شہر خالی کر دینے کا حکم جاری کیا۔ گھر گھر کی تلاشی میں مجھے ایک اندھا اور ایک لنگڑا آدمی ملا۔ لنگڑے کو قتل کروا دیا اور میرے حکم کے مطابق اندھے کو دولت آباد تک زمین پر گھسیٹا گیا صرف اس کے پاؤں نئی راجدھانی تک ـــ

بی جی۔۲ بی، ڈی ڈی اے فلیٹس، منیرکا، نئی دہلی ۶۷

پہنچ پائے۔" • کون ہوں میں ؟

۹۔ "علاؤالدین خلجی ۱۲۹۶ء میں تخت نشین ہونے کے بعد قطب مینار کے علاقے میں واقع اپنے رہائشی محل میں منتقل ہوگیا۔" • اس محل کا نام کیا تھا ؟

۱۰۔ "میرے دورِ حکومت میں دہلی نے اپنی بلندی کو چھو لیا تھا، دہلی کی تاریخ میں جدید باب کھل گئے تھے، میں نے خلافت کی بندشوں سے خود کو آزاد کرلیا اور خود سے ہی خلیفہ کا لقب اختیار کرلیا، دہلی اب میرا دارالخلافہ بنی۔" • کون ہوں میں ؟

۱۱۔ "میں ایک خلجی ہوں، میں نے غیر ترک قبیلے کی رہنمائی کی اور نابالغ بادشاہ شمس الدین کو اغوا کرلیا، میں نے اس کی گردن اڑوادی اور ۱۲۹۰ء میں دہلی کے تخت پر براجمان ہوگیا۔ مگر میرے تخت نشین ہونے پر عوام میں اس قدر ناراضگی پھیل گئی کہ لمبے عرصہ تک میں دہلی کے اندر قدم نہ رکھ سکا اور کیقباد کے ادھورے بنے ہوئے محل میں جو کیلو کھیڑی (کیلوکاری) میں واقع ہے، رہنے لگا۔" • کون ہوں میں ؟

۱۲۔ "میں نے شراب نوشی پر پابندی لگوادی، تمام نشے بازوں، جواری، تاڑی اور بھنگ بیچنے والوں کو دہلی سے نکال باہر کیا، قحبہ خانوں پر تالے ڈلوادیئے، تمام پیشہ ور عورتوں کو متعینہ مدت کے اندر شادی کرنے کا حکم جاری کردیا۔" • کون ہوں میں ؟

۱۳۔ "مہابھارت کے زمانے میں دہلی پانڈوؤں کی راجدھانی تھی، اس وقت اِسے کیا کہتے تھے"؟

۱۴۔ "تغلق آباد کو غیاث الدین تغلق نے بسایا تھا، یہ تیسری دہلی پورب کی جانب چند میل دور چٹانی پہاڑیوں کے درمیان واقع تھی۔" • اسے کیوں غیر آباد چھوڑ دیا گیا ؟

۱۵۔ ہندوستان کا پہلا پٹھان بادشاہ کون تھا ؟

۱۶۔ "تاریخی دستاویزات کے مطابق ترک اور پٹھان خاندانوں کے دورِ حکومت میں پرانی دہلی میں ۵ شہر بسائے گئے تھے۔" وہ کون کون سے تھے ؟

۱۷۔ "محل انگور" • کس نے تعمیر کروایا تھا ؟

۱۸۔ "حوضِ شمسی" • کس نے بنوایا تھا ؟

۱۹۔ "۶۰۰ سو سال قبل اپنے فرزند فتح خان کی موت کے باعث فیروز شاہ تغلق کا ذہنی سکون درہم برہم ہوگیا تھا۔ اس صدمہ سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے شکار بازی کی جانب اپنی توجہ مرکوز کرلی۔ اس نے اس کھیل کے لیے ایک علاقہ کو منتخب کیا اور اسے محصور کروادیا۔ اس کے سرحدوں پر عمارتیں کھڑی کروادی۔" • اسے کیا کہتے ہیں ؟

۲۰۔ "دہلی سلطنت کا مسلم بادشاہ اوّل ہی غلام خاندان کا بانی بھی تھا۔" • وہ کون تھا ؟

۲۱۔ "یہ باور کیا جاتا ہے کہ دہلی شہر کا نام آٹھویں صدی کے قنوج کے ایک راجا کے نام پر پڑا تھا۔" • وہ کون تھا ؟

۲۲۔ سرحد پر لڑتے ہوئے منگولوں کے ہاتھ اپنے فرزند کی موت کی خبر سن کر یہ دہلی کا سلطان صدمہ سے مر گیا، پہلے یہ غلام تھا جسے التمش نے خریدا تھا، یہ بادشاہ رضیہ بیگم کے تحت "امیر شکار" بھی تھا۔" • یہ سلطان کون تھا ؟

۲۳۔ ۱۹۰۱ء میں دہلی کی آبادی کیا تھی ؟

جوابات

۱۔ اننگ پال دوئم دہلی کا پہلا تومار راجا تھا، وشالہ دیوا بھگرا یاراج چوہان پہلا چوہان راجا، بہلول خاں لودی پہلا پٹھان بادشاہ اور ظہیرالدین محمد بابر پہلا مغل بادشاہ تھا۔

۲۔ تومار راجپوت اننگ پال نے ۱۰۶۰ء میں اس کو بنوایا تھا۔

۳۔ اندرا پرستھا (اندراپت)

۴۔ تیرہویں صدی میں جلال الدین خلجی نے اس کو تعمیر کروایا تھا۔ فیروز شاہ تغلق نے ان باغوں کے لیے جسے اس نے دہلی میں تعمیر کروائے تھے ان کی آب پاشی کے لیے اس میں اضافہ اور اس کی مرمت کروائی تھی۔

۵۔ پرتھوی راج۔

۶۔ رتھہاری راجا مہندر پال اول کے پیہووا کتبہ میں۔

۷۔ ۷۳۶ء میں ـــــ سردن کتبہ (۱۳۲۸ء) سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

۸۔ محمد بن تغلق۔

۹۔ کشک لعل

۱۰۔ علاءالدین خلجی۔

۱۱۔ جلال الدین فیروز۔

۱۲۔ علاءالدین خلجی۔

۱۳۔ اندرپرستھا ـــ یوگنی پورا اور کھنڈوا پرستھا کے نام سے بھی موسوم تھا۔ یہ جمنا ندی کے کنارے موجودہ فیروز شاہ کوٹلہ اور ہمایوں کے مقبرہ کے درمیان واقع تھا۔

۱۴۔ پرانی روایت کے مطابق قلع اور شہر کی تباہی کا سبب نظام الدین اولیارحؒ کی بددعا تھی۔ غیاث الدین کی حرکتوں سے نالاں ہوکر انھوں نے یہ بددعا دی تھی کہ یہ تمام محلات میں یا تو گوجر بسیں گے یا یہ اجاڑ ہوجائیں گے۔" یا بسے گوجر یا رہے اُجڑ"۔ ویسے اصل سبب یقیناً پانی کی خرابی اور غیر صحت بخش ماحول کا ہونا ہوگا جس کے باعث یہ مستقل غیر آباد رہے۔

۱۵۔ بہلول خاں لودی۔

۱۶۔ مہرولی، سیری، تغلق آباد، جہاں پناہ اور فیروز آباد۔

۱۷۔ فیروز شاہ تغلق نے ۱۳۵۴ء میں اسے فیروز آباد میں بنوایا تھا۔

۱۸۔ التمش نے ۱۲۲۹-۳۰ء میں بنوایا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ پیغمبرؐ سفید گھوڑے پر سوار آئے ہیں اور اس جگہ کی نشاندہی کر رہے ہیں جہاں حوض بنانا چاہیے۔ دوسرے ہی دن التمش نے نعل نما ایک جھرنے کو دیکھا پانی بہہ رہا تھا۔ بعد میں یہی "شمسی تالاب" کے نام سے مشہور ہوا اور شاہی خاندان کے لوگوں کے لیے سیر و تفریح کا مقام بن گیا۔

۱۹۔ کشک شکار۔

۲۰۔ قطب الدین ایبک۔

۲۱۔ راجا دلو۔

۲۲۔ غیاث الدین بلبن۔

۲۳۔ ۲۰۰,۰۰۰ تھی۔

محمد جبار نئی دہلی

یاسمین صدیقی

بلند حوصلگی، مسائل کا حل

زندگی میں اکثر اتار چڑھاؤ آتے ہی رہتے ہیں کبھی آرام اور سکھ چین کی زندگی رہتی ہے تو کبھی پریشان کن اور دکھوں سے بھری، یہی اتار چڑھاؤ زندگی کو خوشگوار بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔ رات کے اندھیرے سے دن کا اجالا اپنی روشنی پھیلاتا ہے۔ پت جھڑ کے موسم سے بہار کے موسم کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح دکھ اور پریشانیوں کے بغیر سکھ اور خوشی کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہ جاتی میٹھا کھاتے کھاتے جب طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے تو منھ کا مزہ بدلنے کے لیے نمکین کھانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی لیے سکھ، آرام و آسائش اور خوشی سے بھری زندگی گزارتے گزارتے اس کی یکسانیت کو توڑنے کے لیے پریشانی اور دشواریوں کا بھی زندگی کے راہ میں درپیش آنا ضروری ہے۔

عزم و استقلال سے بھرا انسان یہی سوچ کر دکھ اور پریشانیوں کو بھی اسی طرح ہنسی خوشی جھیلتا ہے جس طرح وہ آرام و آسائش سے لطف اندوز ہوتا ہے البتہ کمزور، پست ہمت والے لوگ دکھوں اور پریشانیوں سے اس طرح گھبرا جاتے ہیں جیسے ان کے سامنے آگ میں کودنے جیسا مقام آگیا ہو۔ ایسے حالات میں ان کے پاس حقیقت سے آنکھیں چرا لینے اور سچائی سے کنارہ کشی کا ہی خیال دل میں پیدا ہوتا ہے اور ان حالات میں بجائے حوصلہ سے کام لینے کے ان سے راہ فرار حاصل کرنے کی تدبیریں سوچتا ہے۔

یہ مکمل طور پر واضح ہے کہ محسوسات، احساسِ غم اور خیالات کا مرکز انسان کا دماغ ہے۔ سکھ، دکھ، غم اور خوشی، آرام و آسائش وغیرہ کا احساس دماغ کو ہی ہوتا ہے اور دماغ ہی ان حالات میں جوڑ توڑ کرکے کسی نقطہ پر پہنچتا ہے اور اسی انداز سے لوگ کام کو انجام دیتے ہیں مشکلوں سے نہ گھبرانے اور پریشانیوں سے جدوجہد کرنے کی اسی صلاحیت کا نام حوصلہ ہے۔ حوصلہ مند لوگ مصیبت اور پریشانیوں میں صحیح راستہ نکالنے اور موجودہ مسائل سے نمٹنے میں ذرا بھی پریشانی محسوس نہیں کرتے جب کہ پست ہمت لوگ ان حالات میں بجائے مقابلہ کرنے کے اس سے بھاگنے کے خیال میں رہتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ مسائل معاشی یا مادی ہی ہوں مسئلوں کی شکل کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ انسان کی زندگی میں نجی، خاندانی، سماجی اور کاروباری یعنی کسی طرح کے مسائل سر ابھار سکتے ہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ انھیں سلجھانے کے لیے حوصلہ اور سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے کچھ لوگ بلاوجہ اس سے بھاگنے کی بات سوچتے ہیں۔ گھر میں اگر آگ لگ گئی ہو تو اس میں کہیں بھاگ کر نکلا بھی جا سکتا ہے۔ البتہ اگر مسئلہ زندگی کے ایسے شعبے میں پیدا ہو گیا ہو جہاں سے نہ بھاگتے بنتا ہو اور کمزور ہونے کی وجہ سے نہ اس کا مقابلہ کرنے بنتا ہو تو ایسے حالات میں انسان اس سے آنکھ موندنے اس کی طرف سے دھیان ہٹا لینے اور کسی طرح ان کے بوجھ کو پھینک دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی کا نام زندگی سے فرار ہے، زندگی سے فرار کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں ہے کہ زندگی کا ہی خاتمہ کر دیا جائے۔ ہم اکثر یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ مسئلوں سے گھبرا کر اپنی زندگی برباد کر لیتے ہیں۔ جیسے شتر مرغ اپنی پریشانیوں کو سامنے محسوس کر کے اپنے منھ کو ریت میں چھپا لیتا ہے اس طرح پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے کچھ لوگ نشیلی چیزوں کا استعمال کرنے میں ہی راہ فرار محسوس کرتے ہیں اور اس طرح وہ شراب، چرس، افیم، گانجا (ڈرگز) کے عادی بن جاتے ہیں جو خود میں نئی نئی پریشانیاں پیدا کرنے لگتی ہیں اور وہ لوگ اپنے آپ کو تباہی کے غار میں ڈھکیل لیتے ہیں۔

ویسے آج کل منشیات کا استعمال فیشن کی شکل میں روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے کوئی مسئلہ اور پریشانی نہ ہوتے ہوئے بھی لوگ پارٹی، کلبوں اور دوسری محفلوں میں اپنے یار دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ان نشیلی اشیا کے ذریعہ اپنی صحت اور ذہنی سکون کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ نشیلی اشیا کی گود میں جانے سے صحت تو بگڑتی ہی ہے ساتھ ہی ذہنی سکون بھی غارت ہو جاتا ہے۔ زندگی کے مسائل سے بھاگ کر آدمی ان سے آزاد نہیں ہو جاتا اور نہ ہی کوئی ان کا حل ڈھونڈ پاتا ہے۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جب تک نشیلی اشیا کا اثر رہتا ہے اس وقت وہ تصورات کی دنیا میں کھو جاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ اسے موجودہ پریشانیوں سے ہونے والی فکر، گھبراہٹ اور پریشانیوں سے اتنے وقت کے لیے نجات حاصل ہو گئی۔ لیکن درحقیقت ایسا ہوتا نہیں ہے بلکہ اتنے وقفہ کے لیے دماغی توازن کا مرکز صحیح ڈھنگ سے کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور مدہوشی کے عالم میں جا پہنچتا ہے اور جب نشہ کا اثر ختم ہو جاتا ہے تو مسائل پھر اس کے سامنے جوں کے توں کھڑے ملتے ہیں۔ ان سے گھبرا کر پھر انسان اسی

باقی صفحہ ۲۲ پر

نیم چوک، اردو بازار۔ دربھنگہ

بڑھتے قدم...

(ترقیاتی خبرنامہ)

موسم گرما کی خصوصی ریل گاڑیاں

ریلوے کے محکمے نے موسم گرما کے دوران تعطیلات کی بھیڑ بھاڑ کو کم کرنے کے لیے تقریباً ایک ہزار خصوصی ریل گاڑیاں چلانے کا منصوبہ وضع کیا ہے۔ یہ خصوصی ریل گاڑیاں ملک بھر کے ۲۶ روٹس پر چلیں گی۔ ان خصوصی ریل گاڑیوں کے لیے بکنگ کا کام مارچ ۱۹۹۵ء میں جلدی ہی شروع ہو رہا ہے۔

موسم گرما کے دوران چلنے والی خصوصی ریلوے گاڑیوں میں کرلا۔ وارانسی۔ پٹنہ کی روزانہ کی خصوصی ریل گاڑی مدراس۔ کوئیلان لائن پر چھ دنوں میں ایک دن چلنے والی ریل گاڑی اور کرلا۔ گورکھپور لائن کی ایک ہفتے میں ۵ دن چلنے والی ریل گاڑی بھی شامل ہے۔

اس کے علاوہ باندرہ ٹرمنس، جے پور سیکشن، بمبئی سینٹرل، احمد آباد سیکشن، دلی۔ جموں توی سیکشن منگلور۔ تری وینڈرم سیکشن اور مدراس الگور مدورائی سیکشن پر ہفتے میں ۳ دن چلنے والی خصوصی ریل گاڑیاں چلیں گی۔ اس کے علاوہ بمبئی سینٹرل اور گاندھی دھام، بمبئی وی ٹی اور پونہ اور ہاوڑہ۔ دلی اور جموں توی، تروپتی اور وشاکھا پٹنم ہاوڑہ۔ بمبئی وی ٹی اور ہاوڑہ۔ مدراس کے درمیان ہفتے میں دو دن چلنے والی خصوصی ریل گاڑیاں چلائی جائیں گی۔ بمبئی وی ٹی۔ تری وینڈرم، بمبئی سینٹرل۔ حضرت نظام الدین، بمبئی سینٹرل۔ باپا۔ احمد آباد۔ وارانسی، ہاوڑہ۔ کالکا، ہاوڑہ دہرہ دون، سیالدہ۔ نیو علی پور دوار، مدراس۔ کنوتر، بنگلور سٹی۔ کوئلن سکندر آباد۔ مدراس، سکندر آباد، راجکوٹ اور بروتی۔ دلی۔ جموں توی روٹس پر ہفتے میں چلنے والی ۲ خصوصی ریل گاڑیاں لگائی جائیں گی۔

مذکورہ موسم گرما کی خصوصی ریل گاڑیاں گرمی کے دوران کی متوقع بھیڑ بھاڑ کو کم کرنے کے لیے چلائی جائیں گی۔ ●

۱۹۹۴-۹۵ء میں ۴۵۰ سے زائد ریل گاڑیوں کی رفتار بڑھائی گئی

ریلوے کے محکمے نے ۱۹۹۴-۹۵ء میں اب تک ۴۵۰ سے زائد ریل گاڑیوں کی رفتار میں اوسط ۴۵. اور ۴۰ منٹ کا اضافہ کیا ہے۔ ان ریل گاڑیوں میں ۱۵۰ میل اور ایکسپریس ریل گاڑیاں اور تین سو سے زائد مسافر ریل گاڑیاں شامل ہیں۔

۱۹۹۳-۹۴ء کے دوران بڑی ریل لائن کی ۲۰۱ ریل گاڑیوں اور چھوٹی لائن کی ۱۶۶ ریل گاڑیوں کی رفتار میں بالترتیب ۱۲/۴۸ منٹ اور ۲۷/۳۵ منٹوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

ریلوے کے تحت تیز رفتار ریل گاڑیوں کا عہد مارچ ۱۹۶۹ء میں شروع ہوا تھا جب نئی دلی۔ ہاوڑہ، راجدھانی ایکسپریس سپر فاسٹ ریل گاڑی کی شروعات ہوئی تھی۔ اس کی رفتار اس وقت ۱۳۰ کلو میٹر فی گھنٹہ تھی تب سے اب تک رفتار بڑھانے کا عمل جاری و ساری رہا ہے۔ ●

غذائیت کے بارے میں تعلیم کی ضرورت

کم غذائیت اور غذائیت کی کمی کے مسئلے پر قابو پانے کے بارے میں ایک حالیہ ورکشاپ میں اسکولوں اور کالجوں میں غذائیت کے بارے میں تعلیم کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ یہ کام تعلیمی مواد کو فروغ دے کر نیز آیوڈین، لوہے کے ذرات اور وٹامن اے کی کمی والے علاقوں میں شروع کیا جانا چاہیے۔ میٹنگ میں صحت اور خاندانی بہبود، تعلیم، سماجی بہبود اور دیہی ترقی کے محکموں میں چھوٹے ورکنگ گروپ قائم کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے تاکہ موجودہ اقدامات کا جائزہ لیا جائے اور غذائیت کے واضح مقاصد شامل کیے جائیں۔

مشرقی اور شمال مشرقی علاقے کے لیے ورکشاپ گوہاٹی میں منعقد ہوا تھا، جسے انسانی وسائل کے ترقی و فروغ کی وزارت میں خواتین اور بچوں کو ترقی و بہبود کے محکمے نے اسپانسر کیا تھا۔ ●

جہاز رانی کی صنعت کی جدید کاری

آٹھویں منصوبے کے دوران حکومت کے ذریعہ جہازوں کی مرمت کے لیے نئی سہولیات مہیا کرنے کی کوئی تجویز نہیں ہے۔ لیکن بحری جہازوں کی مرمت کی سہولیات کو بہتر اور جدید ترین بنانے کے لیے متعدد اسکیمیں تجویز کی گئی ہیں۔ جن میں یہ اسکیمیں شامل ہیں:

(i) چند سہولیات میں اضافہ نیز پرانے ساز و سامان کی تبدیلی اور جدید کاری۔

(ii) بحری جہازوں کی تیزی سے مرمت کی سہولیت میں اضافہ۔

(iii) موجودہ گودیوں کی جدید کاری۔ ●

واکیہ: مشین کی مدد سے ترجمہ

نیشنل سینٹر سافٹ ویر ٹکنالوجی بمبئی کے

تحت علم پر مبنی کمپیوٹر نظام (کے بی سی ایس) گروپ نے واکیہ نام کا ترجمہ نظام وضع کیا ہے۔ مشین کی مدد سے ہونے والے ترجمے کے لیے یہ پروٹوٹائپ نظام ہے۔

یہ نظام خودکار عنوان نشاندہی، جملوں کو آسان بنانے، علم البیان کے مطابق جملے کی تطبیق وغیرہ سمیت مختلف تکنیکات کا استعمال کرتا ہے۔ اس پروٹوٹائپ نظام کی صلاحیت میں اضافے کے لیے برابر کام جاری ہے۔ ●

پسماندہ طبقوں سے متعلق قومی مالی اور ترقیاتی کارپوریشن کے ذریعے قرضے کی حد میں اضافہ

پسماندہ طبقوں سے متعلق قومی مالی اور ترقیاتی کارپوریشن نے پسماندہ طبقوں کے اراکین کے لیے قرضوں کی منظوری کو آسان بنا دیا ہے اور کچھ نئی اسکیمیں بھی شروع کی ہیں۔ پریس کو یہ اطلاع دیتے ہوئے منیجنگ ڈائریکٹر شری ایس۔ ایم کنور نے کہا کہ بورڈ آف ڈائریکٹرس نے ۲۳ فروری کو اپنی میٹنگ میں فیصلہ کیا ہے کہ قرضے کی حد فی شخص ۸۵۰۰۰ روپے سے بڑھا کر ۵۰۰۰۰۰ روپے کر دی جائے۔ یہ قدم اس لیے اٹھایا گیا ہے تاکہ قرضے لینے والے افراد ڈیزل سے چلنے والی ٹیکسیاں اور ہلکی کاروباری گاڑیاں خرید سکیں نیز وہ چھوٹے پیمانے کی صنعتیں لگا سکیں۔

مذکورہ کارپوریشن ۱۹۹۲ء میں قائم کی گئی تھی۔ ●

ریلوے کے ذریعے مال کی نقل و حمل میں اضافہ

ریلوے نے موجودہ مالی سال میں جنوری ۱۹۹۵ء کو ختم ہونے والے دس مہینوں کے دوران مالیہ کمانے والے ۷۱۷ر۲۷ لاکھ ٹن مال کی نقل و حمل کی ہے، جب کہ گزشتہ سال کی اسی مدت میں اس نے مذکورہ ۶ر۲۹۰۳ لاکھ ٹن مال کی نقل و حمل کی تھی۔ نقل و حمل گزشتہ سال کے مقابلے میں ۱ر۶۸ لاکھ ٹن یا ۵ر۳۵ر۲ فی صد زیادہ ہے۔

مذکورہ مدت کے دوران مالیہ کمانے والے جس مال کی نقل و حمل کی گئی ہے اس میں کوئلہ، خام مال، لوہے کے ڈلے، تیار فولاد، خام لوہا، سیمنٹ، اناج، کیمیاوی کھادیں، پیٹرولیم، تیل وغیرہ شامل ہے۔ ●

کپڑے کی برآمدات میں ریکارڈ اضافہ

اپریل ۱۹۹۴ء سے جنوری ۱۹۹۵ء کے دوران بھارت سے دست کاریوں، پٹ سن اور ناریل کے ریشے سمیت کپڑے کی برآمدات کی مالیت میں ڈالر کے لحاظ سے ۷ر۲۸ فی صد کا ریکارڈ اضافہ ہوا ہے۔ یہ مالیت بڑھ کر ۵ر۸۰۷۳۸ لاکھ امریکی ڈالر (یا ۸۔ ارب ڈالر) ہو گئی ہے، جب کہ ۹۴-۱۹۹۳ء کی اسی مدت میں یہ مالیت ۰ر۶۲۷۵۴ لاکھ ڈالر (یا ۲ر۶ ارب ڈالر) تھی۔ اس طرح ۹۵-۱۹۹۴ء کے لیے مقرر کردہ نشانے کا ۷ر۸۹ فی صد حصہ موجودہ مالی سال کے ۱۰ مہینوں میں یعنی اپریل ۱۹۹۴ء سے جنوری ۱۹۹۵ء تک حاصل کر لیا گیا ہے۔ کپڑے کی صنعت کے مرکزی وزیر شری جی وینکٹ سوامی نے کہا ہے کہ ۹۔ ارب ڈالر کا نشانہ نہ صرف حاصل کر لیا جائے گا بلکہ پہلے دس مہینوں میں حاصل کردہ کامیابی کے پیش نظر نشانے سے تجاوز کیا جائے گا۔ ●

بمبئی میں خواتین کے لیے خصوصی ریل گاڑیاں مقبول

مغربی ریلوے نے خواتین کے لیے خصوصی ریل گاڑیاں چلانے کا سلسلہ جاری رکھنے کے بارے میں جو سروے کیے ہیں ان سے پتا چلا ہے کہ یہ خصوصی ریل گاڑیاں کافی مقبول ہو رہی ہیں۔ ●

شیروں کے تحفظ کے بارے میں بھارت چین معاہدہ

بھارت اور چین نے شیروں کی نسل کے تحفظ کے سلسلے میں تعاون کرنے اور ان کی آبادی کو ختم کرنے کے رجحان کی روک تھام کرنے کے سلسلے میں مشترکہ کوششیں کرنے کی غرض سے ایک معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔

ماحولیات اور جنگلات کے وزیر شری کمل ناتھ نے حکومت ہند کی جانب سے اور چین میں ماحولیات، سائنس اور ٹکنالوجی کے وزیر مسٹر سونگ جیان نے حکومت چین کی جانب سے بیجنگ کے گریٹ ہال آف دی پیوپل میں مذکورہ معاہدے پر دستخط کیے۔ ●

برآمدات میں ۲ر۱۷ فی صد اضافہ

اپریل سے جنوری ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران بھارت کی برآمدات کی مالیت کا تخمینہ ۱ر۲۰۸۷۱۰ لاکھ امریکی ڈالر لگایا گیا ہے جب کہ اپریل سے جنوری ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران یہ مالیت ۹ر۱۷۷۹۸۷ لاکھ امریکی ڈالر تھی۔ اس طرح برآمدات کی مالیت میں ۲۶ر۱۷ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ موجودہ سال میں برآمدات میں اپریل تا اگست ۱۹۹۴ء سے مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

اپریل سے جنوری ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران درآمدات کی مالیت کا تخمینہ ۲ر۲۲۷۰۸۴ لاکھ امریکی ڈالر لگایا گیا ہے جب کہ ۹۴-۱۹۹۳ء کی اس مدت میں یہ مالیت ۷ر۱۰۵۸۰۴ لاکھ امریکی ڈالر تھی۔ اس طرح درآمدات کی مالیت میں ۵۵ر۲۳ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ ●

غیر سرکاری شعبے میں بجلی کی ۱۳۷ پروجیکٹ تجاویز

بجلی کے مرکزی وزیر شری این کے پی سالوے نے کہا ہے کہ حکومت کے پاس ۵۹۸۶۶ میگاواٹ بجلی کی صلاحیت کے سلسلے میں ۱۳۷ پروجیکٹ تجاویز ہیں جو ۲۲۰۳۱۲ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری پر مشتمل ہیں۔ وزیر موصوف یہاں اپنی وزارت سے وابستہ پارلیمانی مشاورتی کمیٹی کی میٹنگ میں تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ آئندہ دو مہینوں میں ان میں سے کچھ تجاویز کو حقیقت میں بدل دیا جائے گا۔ غیر سرکاری شعبے میں بجلی تیار کرنے کی نئی پالیسی کے تحت بجلی کے پہلے پلانٹ ۱۹۹۷ء سے چالو کر دیے جائیں گے اور بجلی کی صورت حال میں مزید بہتری آئے گی۔

ملک میں بجلی کی کمی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے شری سالوے نے کہا کہ یہ کمی غیر سرکاری شعبے کے ذریعے پوری کرنی ہو گی۔

قدرتی وسائل کے تحفظ کے لیے طویل مدتی منصوبہ بندی پر زور

بنجر زمینوں میں پودکاری کے بارے میں ایک دو روزہ قومی سمپوزیم کا یہاں افتتاح کرتے ہوئے لوک سبھا کے اسپیکر شری شوراج پاٹل نے دنیا بھر کے سائنس دانوں اور حکومتوں پر زور دیا ہے کہ وہ قدرتی وسائل کے تحفظ اور استعمال کے سلسلے میں طویل مدتی منصوبہ بندی کریں۔ شری پاٹل

نے بنجر زمینوں میں اگائے جاسکنے والے پودے تیار کرنے کے لیے ٹشو کلچر، نسلیاتی انجینئرنگ اور حیاتیاتی تکنالوجی کے دیگر پہلوؤں کے سلسلے میں بنیادی ڈھانچے کی سہولیات مہیا کرنے پر بھی زور دیا۔ انھوں نے الیکٹرونک ذرائع ابلاغ سے اپیل کی کہ وہ اس اہم معاملے کے بارے میں بیداری پیدا کریں۔ ●

دہشت گردی کی روک تھام کے لیے علاقائی تعاون

دہشت گردی کی روک تھام کے سلسلے میں اطلاعات کے تبادلے کے لیے سارک (علاقائی تعاون کے لیے جنوب ایشیائی انجمن) کے علاقائی لائزن افسروں کا سالانہ کنونیشن آج یہاں شروع ہوا، جس میں بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، سری لنکا اور مالدیپ شرکت کررہے ہیں۔ کنونیشن میں دہشت گردوں کی سرگرمیوں کی روک تھام کرنے کے سلسلہ میں مذکورہ ممالک کے درمیان تعاون کے بارے میں تبادلۂ خیالات کیا جارہا ہے۔ اس میں دہشت گردی کی روک تھام کرنے کے لیے قانون وضع کرنے اور عملے کو ترتیب دینے کے سلسلے میں ہونے والی پیش رفت کا بھی جائزہ لیا جارہا ہے۔

مذکورہ دوروزہ کنونیشن کا افتتاح امور داخلہ کی وزارت میں اسپیشل سکریٹری شری اروند ورما نے کیا۔ یہ کنونیشن اس سلسلے میں تیسرا سالانہ کنونیشن ہے۔ ●

اپر دریائے جمنا بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ

آبی وسائل کی وزارت، حکومت ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ حکومت ہند کی قرار داد کے ذریعے اپر دریائے جمنا بورڈ قائم کیا جائے جو پانی کی تقسیم کے لیے خاص ریاستوں کے دستخط کردہ معاہدے نیز خاص ریاستوں کی منظور کردہ حد تک اپر دریائے جمنا بورڈ قائم کرنے کے سلسلے میں معاہدے پر مبنی ہوگا۔ اس امر کا اعلان آج یہاں آبی وسائل اور پارلیمانی امور کے مرکزی وزیر شری ودیا چرن شکلا نے کیا۔ وزارت نے بورڈ کی تشکیل کے سلسلے میں قرارداد ۱۱ مارچ ۱۹۹۵ء کو جاری کردی ہے۔

مذکورہ بورڈ قائم کرنے کے سلسلے میں فیصلے سے قبل شری شکلا نے مستفید ہونے والی ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی متعدد بین ریاستی میٹنگیں طلب کی تھیں تاکہ مذکورہ بورڈ قائم کرنے کے سلسلے میں معاہدے کے مسودے پر تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ ●

کمپیوٹر کے ذریعے ریلوے ریزرویشن

ریلوے نے ان اسٹیشنوں پر کمپیوٹر کے ذریعے مسافروں کے لیے ریزرویشن کا نظام فراہم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے، جہاں روزانہ ۳ سو یا اس سے زیادہ ریزرویشن کا کام ہوتا ہے۔ نتیجتاً ریلوے میں روزانہ ۵ لاکھ ریزرویشن میں سے ۹۲ فی صد ریزرویشن کا کام کمپیوٹر سے انجام دیا جائے گا۔

کمپیوٹر کے ذریعہ مسافروں کے لیے ریزرویشن کا نظام حال ہی میں پال گھاٹ، ٹاٹا نگر، رانچی، اجمیر، اندور، راجکوٹ، گوالیار اور شولاپور میں شروع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جبلپور، روڑکیلا، نیو جلپائی گوڑی، دہرہ دون، جالندھر، رائے پور، ہبلی اور کوئیلون میں یہ نظام فراہم کرنے کے سلسلے میں کام چل رہا ہے۔

گزشتہ تین برسوں کے دوران یہ نظام ۴۶ شہروں میں فراہم کیا گیا ہے، جن کو ملاکر شہروں کی کل تعداد ۶۰ ہوگئی ہے۔ اب ریلوے ریزرویشن کا ۸۰ فی صد کام کمپیوٹر کے ذریعہ انجام دیا جارہا ہے۔ ●

ویکیوم بریک والی ریل گاڑیوں کو ایر بریک گاڑیوں کی شکل

ریلوے کے محکمے نے ۴ ویکیوم (VACEUME) بریک والی مسافر ریل گاڑیوں کو دسمبر ۱۹۹۴ء تک یعنی رواں مالی برس کے پہلے ۹ ماہ کے دوران ایر بریک والی ریلوے گاڑیوں کی شکل دی ہے۔ یہ قدم وزارت ریلوے کی وزارت کے ذریعہ اپریل ۱۹۹۴ء سے ویکیوم بریک والی مسافر ریل گاڑیوں کو ایر بریک والی ریل گاڑیوں میں تبدیل کرنے کے فیصلے کے بموجب اٹھایا گیا ہے۔ ایر بریک والی مسافر ریل گاڑیاں مسافروں کو تیز رفتار، آرام دہ اور محفوظ سفر کی سہولت فراہم کراتی ہیں۔

یکم اپریل ۱۹۹۴ء سے نافذالعمل ایک پالیسی فیصلے کے مطابق ریلوے پیداواری اکائیوں میں تیار کردہ اور سرکاری و نجی دائرہ کار کی اکائیوں سے حاصل کردہ رولنگ اسٹاک میں ایر بریک لگائے جاتے ہیں تاکہ ملک میں جھٹکوں سے پاک، آرام دہ، تیز رفتار اور محفوظ ریلوے خدمات فراہم کرائی جاسکیں۔ ●

طوفان کا پتا لگانے کے لیے نئے راڈار

بھارت کے محکمۂ موسمیات نے مشاہداتی نیٹ ورک کی حالت میں بہتری لانے کے لیے طوفان کا پتا لگانے والے راڈاروں اور ہواؤں کا پتا لگانے والے راڈار نصب کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ کچھ ساحلی اسٹیشنوں پر روایتی سمندری طوفان کا پتا بتانے والے راڈاروں کی جگہ نئے ڈوپلر موسمیاتی راڈار بھی لگانے کا منصوبہ ہے۔ یہ راڈار ۱۹۹۶ء کے اواخر تک چالو ہوجائیں گے۔ ان راڈاروں کی تخمینہ لاگت ۶۶٫۸۰ کروڑ روپے کے قریب ہے۔ ●

بجلی پروجیکٹوں کے لیے وقت اور لاگت کا اضافہ

منصوبہ بندی اور پروگراموں پر عمل درآمد کے وزیر مملکت شری گری دھر گومانگو نے راجیہ سبھا میں ایک اطلاع میں بتایا کہ پروگراموں پر عمل درآمد کے محکمے کے ذریعہ بجلی کے شعبے کے ضمن میں کی گئی حالیہ نظرثانی سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بجلی پروجیکٹوں کے ضمن میں وقت اور لاگت معینہ حدود سے تجاوز کرگئی ہے۔

یکم جنوری ۱۹۹۵ء کو ۲۰ کروڑ روپے اور اس سے زیادہ کی لاگت والے ۴۰ بجلی پروجیکٹ جن کی نگرانی محکمے کے ذریعہ کی گئی ہے، کی لاگت ۱۱٫۸۸۸۹ کروڑ روپے سے تجاوز کرکے ۳۸۸۴٫۷۷ کروڑ روپے ہوگئی ہے۔

وقت اور لاگت کم کرنے کے تدارک کے اقدامات میں کڑی نگرانی، پروجیکٹ حکام کے ساتھ نظرثانی میٹنگیں وغیرہ شامل ہیں۔ ●

یوجنا
نئی دہلی

چیف ایڈیٹر : ڈی. کے. بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

سب ایڈیٹر : ڈاکٹر توحید خان

فون : 677591

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : کلدیپ سنگھ

جلد : ۱۵ شمارہ : ۲
مئی ۱۹۹۵ء (۱۱ ربیساکھ تا ۱۰ جیسٹھ شک ۱۹۱۷)

زرِ سالانہ : ایک سال کے لیے : ۵۰ روپے
(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)
زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں :
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ڈپٹی ڈائریکٹر/پروڈکشن : سدرشن موہن چہل

مضامین سے متعلق
خط وکتابت کا پتا :
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۵، آر. کے. پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"
منصوبہ بندی ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہے۔

ترتیب

سید اطہر رضا بلگرامی

صحت: علم اقتصادیات کے دائرہ میں

اقتصادیات میں صحت کو ایک سنجیدہ اور مکمل موضوع کی حیثیت سے حال ہی میں متعارف کرایا گیا ہے۔ عالمی بینک اور اقوام متحدہ نے اس طرف خصوصی توجہ دی ہے اور افریقہ، تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک کو اس موضوع کا تحقیقاتی میدان منتخب کیا ہے۔ یوں، بشری قوت، انسانی وسائل کی ترقی و توسیع، انسانی محنت وکاوش، انسانی سرمایہ کا فروغ جیسے موضوعات اقتصادیات کے تحقیقی میدان رہے ہیں جہاں ترقی یافتہ اور تیسری دنیا کے ترقی پذیر دونوں ممالک نے بہت کچھ کام کیا ہے اور آج بھی سرگرم عمل ہیں لیکن صحت کو خصوصی طور پر اقتصادیات کا مکمل اور وسیع موضوع بنا کر پیش کرنا حالیہ کارنامہ ہے جو نہ صرف معاشیات کے نشر و فکر میں قابل قدر اضافہ ہے بلکہ ایک نیا تجربہ بھی ہے۔

صحت کو علم اقتصادیات کا خصوصی موضوع بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور تمام ترقی یافتہ ممالک و بین اقوامی ادارے اس طرف کیوں رجوع ہوئے؟ کیوں سنجیدگی سے ترجیحاتی سطح پر غور و فکر ہونے لگا؟ اس کا پس منظر کافی وسیع ہے اور کئی مدارج میں تقسیم ہے جس کو یہاں مختصراً بیان کرکے صحت کو علم اقتصادیات کے میدان میں متعارف کرانا مقصود ہے۔

صحت اور اقتصادیات کا پس منظر

اقتصادی نظام کی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز انسان ہے۔ انسان کا عمل، اس کی محنت و کاوش، اس کی جستجو و تلاش اشیا و خدمات کو وجود میں لانے کا وسیلہ بنتی ہیں اور پھر ان کو تصرف میں لانے والا بھی یہی انسان ہے۔ یعنی انسان مجسّم طلب بھی ہے اور طلب کی تسکین کا ذریعہ بھی۔ وہ اپنی پسندگی و ناپسندگی کے اظہار کے ذریعہ ترجیحات متعین کرتا ہے اور اس طرح پیداوار میں مسلسل تبدیلیوں و تغیرات کا سبب بنتا ہے۔ وہ مسلسل تحقیقات و جستجو کے ذریعہ پیداوار میں ندرت لاتا ہے، افادیت بڑھاتا ہے، یعنی طلب کو وسیع کرتے رہنے کا آلہ بنتا ہے۔ پھر تبادلہ، تقسیم، تجارت، سرمایہ کاری جیسی تمام سرگرمیوں میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔

ایک اقتصادی نظام جس کا مرکز انسان ہو اسی وقت بہتر و منظم طور پر چل سکتا ہے جب انسانی صلاحیتوں کا بھرپور فروغ ہو اور استعمال ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ جسمانی و ذہنی طور پر صحت مند ہو۔ "تندرستی ہزار نعمت ہے" کو آج کی دنیا جس سنجیدگی سے سمجھ رہی ہے شاید اس سے قبل محض بزرگوں کے قول تک محدود کیے ہوئے تھی۔ آج کی دنیا اس نتیجہ پر پہنچ چکی ہے کہ تیسری دنیا کے عوام کی بہتر صحت مستحکم اور وسیع بازاروں کی ضمانت ہے اس لیے جب تک ترقیاتی پروگراموں میں حفظانِ صحت کی اسکیموں پر زور نہیں دیا جائے گا، ترقیاتی منصوبے کامیاب نہیں ہوں گے۔ اس موضوع پر ترقیاتی ممالک کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا سبب بھی خالص اقتصادی و تجارتی ہے۔ ان ممالک کے سامنے تیسری دنیا بہت وسیع منڈی ہے جہاں وہ مال کھپا سکتے ہیں۔ اگر اس دنیا کے عوام کی صحت قابلِ اعتبار نہ رہی تو وہ نہ تو اچھے صارفین ثابت ہو سکتے ہیں اور نہ اچھے انسانی سرمایہ و محنت کش۔ اس لیے اپنے مال کی مسلسل کھپت کے لیے ان منڈیوں اور بازاروں کو وسیع ہوتے رہنا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ صحت مند عوام زیادہ محنت، زیادہ دولت کمائیں، زیادہ صلاحیتوں کو بڑھائیں اور پھر زیادہ قوت خرید بڑھا کر بہتر صارفین ثابت ہوتے رہیں۔

دراصل تیسری دنیا میں تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی، پھیلتے اور گنجان بنتے شہر، جھگی جھونپڑی اور گندی بستیوں کے پھیلاؤ اور ماحولیاتی آلودگیوں نے انسانی صحت کے لیے شدید خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ پھر صنعتی و تجارتی زندگی کی تھکا دینے والی بھاگ دوڑ نے ذہنی سکون کو چھین کر انتشار دیا ہے، بے چینی اور بوجھ کو بڑھایا ہے جس کے نتیجہ میں ہر پل بڑھنے والا تناؤ متعدد ذہنی، قلبی اور اعصابی بیماریوں کا موجب بنا ہے۔ آج کا انسان کل سے زیادہ جسمانی و ذہنی محنت کرنے کے باوجود سکون

پروفیسر اور ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف اکنامکس
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

وآسودگی سے دور بوجھ لیے جی رہا ہے اور پھر اچھی غذا، صاف ستھرے پانی، صاف ستھری ہوا اور آلودگیوں سے پاک ماحول اور فضا کی ناپیدی نے اس بوجھ کو بیماریوں کی آماجگاہ میں بدل دیا۔ آج کا انسان کل سے زیادہ بیماریوں کا شکار رہتا ہے۔ عمر کا ایک بڑا اور قیمتی حصہ جو پیداوار بڑھانے اور روزگار کی ترقی پر صرف ہونا چاہیے، صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور فروغ دینے پر خرچ ہونا چاہیے، بیماریوں کے علاج، چھٹیوں، بیکاری اور بے روزگاری پر ضائع ہو جاتا ہے۔ اس طرح گویا انسان خسارے کی زندگی گزارتا ہے جو مسلسل بڑھتا رہتا ہے۔ کنبہ کے کسی ایک فرد کی بیماری صرف اسی کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ پورا کنبہ متاثر ہوتا ہے، اس کی کل پیداوار، کل آمدنی متاثر ہوتی ہے اور نتیجتاً پورا کنبہ غربت و افلاس کے کبھی نہ ٹوٹنے والے دائرہ میں پھنس جاتا ہے۔ گویا ایک قیمتی سرمایہ تباہ و برباد ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اشیا و خدمات کی مجموعی طلب میں تیزی سے گراوٹ آتی ہے اور نتیجتاً بازاریں سمٹنا اور تنگ ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ سرمایہ لگانے کی حوصلہ شکنی صنعتوں کو سکوڑتی اور محدود کرتی جاتی ہے، فی کس پیداوار، آمدنی روزگار اور قوت خرید سب کچھ تیزی کے ساتھ انحطاط پذیر ہوتے ہیں۔

یہ خطرہ افریقہ اور تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں بڑھتا جا رہا ہے جس سے ترقی یافتہ ملکوں کو بھی چونکنا پڑا ہے۔ اگر اس طرف فوری اور موثر قدم نہ اٹھائے گئے تو ترقیاتی سرگرمیوں پر صرف ہونے والے کروڑوں اور عربوں روپیہ کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نظر نہ آئے گا۔ ترقی یافتہ ممالک نے اور بین اقوامی اداروں نے اس پہلو کی طرف سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا اور مختلف عملی پروگراموں کے ساتھ ساتھ صحت و تندرستی کی معاشیات کی مکمل چھان بین کرکے اس کو اقتصادیات کا ایک اہم جزو بنا دیا۔ گو کہ اس موضوع کی عمر دس پندرہ سال سے زیادہ کی نہیں ہے، پھر بھی ترقی یافتہ ممالک نے، ترقی پذیر ممالک کے مقابلہ کہیں زیادہ تندہی سے کام کیا ہے۔ ۱۹۹۳ء کی عالمی بینک رپورٹ کا منتخب موضوع بھی یہی رہا جو اپنے طور کی منفرد تحقیقاتی رپورٹ ہے۔ اس طرح ترقیاتی پروگراموں پر عوام کی صحت کے کیا اثرات ہوتے ہیں، اس سوال نے صحت کو معاشیات کا باقاعدہ موضوع بنا دیا۔ اس موضوع کے چند ابتدائی گوشوں کا جائزہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

صحت کی تعریف

تندرستی یا صحت کے کیا معنی ہیں؟ کیا کبھی بیمار نہ پڑنے کا نام صحت ہے؟ یا بیمار پڑنے پر جلد صحت یاب ہو جانے کو صحت کہتے ہیں؟ یعنی بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت کے مضبوط ہونے کا دوسرا نام صحت ہے۔ یا اعضاء جوارح کا طبعی عمر تک بحُسن و خوبی کام انجام دیتے رہنے کا نام صحت ہے۔ صحت کی یہ تمام تعریفیں نامکمل اور جزوی ہیں کیونکہ یہ محض مادی و جسمانی دائرہ تک محدود ہیں۔ ذہنی و سماجی شعور و بالیدگی کو دائرہ سے خارج رکھا گیا ہے۔ صحت مند جسم صحت مند دماغ کا آئینہ ضرور ہوتا ہے لیکن بیمار و قنوطی ذہن رکھ کر کوئی اپنے جسم کو صحت مند کبھی بھی نہیں رکھ سکتا۔

اقوام متحدہ نے صحت کی تعریف میں جسمانی، ذہنی اور سماجی تینوں عوامل کو شامل کرکے ایک جامع تعریف کی ہے۔ اس کے خیال میں ان تینوں میں مکمل یگانیت اور توازن صحیح صحت کی عکاسی کرتے ہیں۔ انسان کی نشو و نما میں اگر جسمانی و ذہنی توازن برقرار نہ رہے تو اس کا سماجی توازن بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر ذہنی نشو و نما جسمانی نشو و نما کے مقابلہ سست ہے تو وہ ذہنی طور پر غیر صحت مند ہے اور اس کے برعکس اگر ذہنی نشو و نما کے مقابلہ جسمانی نشو و نما سست ہوا تو بہ اعتبار جسم و اعضا و جوارح وہ غیر صحت مند ہے۔ صحیح صحت کا پیمانہ جسمانی و ذہنی نشو و نما میں کامل توازن برقرار رکھنا ہے۔ اس توازن کی کسوٹی یہ ہے کہ جب جسم و ذہن کا طبعی توازن کسی داخلی یا خارجی عناصر کی وجہ سے غیر توازنی کیفیت میں مبتلا ہو کر بیماری کا شکار ہو تو اس کا طبعی نظام فطری توازن کی طرف پلٹا لے جائے۔ یہی اصل صحت ہے۔ اب عدم توازن سے توازن کی طرف پلٹنے کی مدت بچپن سے نوجوانی اور جوانی تک بہت تیز ہوتی ہے جس میں قدرتی طبعی نظام کی قوت اہم رول ادا کرتی ہے۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ یہ نظام کمزور پڑ جاتا ہے اور اب خارجی عناصر (دوا، علاج، جراحی اور مختلف نوعیتوں کی کسرتیں وغیرہ) کا سہارا لے کر قدرتی توازن کی طرف پلٹنے کی کوشش ہوتی ہے جس کی مدت یقیناً زیادہ ہوتی ہے اور عمر کے آخر حصوں میں اس توازن کو پالینا اور برقرار رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

اس طرح بچپن سے جوانی تک جسمانی و ذہنی توازن کو برقرار رکھنے میں خارجی عناصر کا رول کم اور طبعی نظام کا رول بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے عمر کے اس حصہ میں انسان جو کھاتا ہے جزو بدن بنتا ہے اور تمام تر جسمانی و ذہنی صلاحیتیں اپنے عروج پر ہوتی ہیں۔ اگر بچپن سے غذائیت سے بھرپور اور منظم غذا کا پروگرام بنا لیا جائے اور تمام احتیاطی تدابیر مثلاً ٹیکے وغیرہ حسب قاعدہ لگوا لیے جائیں تو قوتِ مدافعت کا ایسا خزانہ جمع ہو سکتا ہے جو ڈھلتی عمر تک توازن کو برقرار رکھنے میں کام آسکتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ابتدائی عمر کا انوسٹمنٹ اور احتیاط ڈھلتی عمر کے غیر افادہ اخراجات کے بوجھ کو بڑی حد تک کم کر دینے کا باعث بنتا ہے۔ آج افریقہ اور تیسری دنیا کے تمام ممالک میں حفظانِ صحت کے تمام پلان اور اس سے متعلق تمام احتیاطی تدابیر ایک انقلابی مہم کا روپ دھارنے کر چکی ہیں جس کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ موجودہ نسل کو طبعی قوتِ مدافعت کے خزانے سے بھر دے تاکہ وہ لمبی عمر تک ملک کا گراں قدر سرمایہ بنے رہیں۔

صحت اور معاشی ترقی

صحت اور معاشی ترقی کا سیدھا اور گہرا تعلق ہے جس کی طرف پچھلے صفحات میں کچھ اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ۱۹۹۳ء کی "عالمی ترقیاتی رپورٹ" (WORLD DEVELOPMENT REPORT) جو عالمی بینک کی طرف سے شائع ہوئی "صحت کی اقتصادیات" (ECONOMICS OF HELTH) پر مرکوز ہے۔ اس رپورٹ میں صحت اور معاشی ترقی و خوشحالی کے تعلق کو مندرجہ ذیل طور پر واضح کیا گیا ہے۔

۱۔ عوام کی اچھی و بہتر صحت، غیر صحت مند اور بیمار افراد کے ذریعہ ڈالے گئے بوجھ کو کم کرتی ہے۔

۲۔ معاشی ترقی میں صحت چار طرح سے معاون ثابت ہوتی ہے اوّل، بیمار محنت کشوں کی بدولت پیداوار میں ہونے والے نقصان کو کم کرتی ہے۔

دوم وہ ان قدرتی وسائل کو استعمال میں لانے کے قابل بنا دیتی ہے جو بیماری کی بدولت پہنچ کے باہر تھے۔

سوم وہ تعلیم گاہوں میں بچوں کی تعداد بڑھانے کا باعث بنتی ہے اور تعلیم جاری رکھنے کے قابل بناتی ہے۔

چہارم وہ ان وسائل کو ترقیاتی پروگراموں کی طرف موڑتی ہے جو بیماری کے علاج پر لگا دیے جاتے تھے۔

۳۔ ایک صحت مند شخص زیادہ پیدا کرتا ہے اور بہتر روزگار کو تلاش کر سکتا ہے۔

۴۔ صحت پر خرچ اچھا انوسٹمنٹ ہے کیوں کہ بیماری کے دوران ضائع ہونے والے قیمتی اور پیداآور وقت کی بچت ہوتی ہے، پیداوار کی صلاحیتوں کا فروغ ہوتا ہے اور بہتر روزگار کے مواقع وسیع ہوتے ہیں۔

۵۔ صحت پر کیا گیا انوسٹمنٹ دوسرے وسائل جیسے زمین کی پیداواری صلاحیتوں کو فروغ دیتا ہے۔ مثلاً ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۷ء کے دوران سری لنکا میں ملیریا ختم کرنے کے کامیاب پروگرام نے وہاں کی قومی آمدنی کو ۱۹۷۷ء میں ۹ فی صد بڑھا دیا۔ وہ علاقہ جو ملیریا زدہ تھے وہ دوبارہ بسنے کے نقطۂ نظر سے پرکشش بن گئے، علاقہ چھوڑ کر جانے والے واپس آ گئے اور پیداوار میں اضافہ ہوا۔

۶۔ صحت پر کیے جانے والے خرچ سے بیماریوں کے حملے کم ہوتے ہیں اور اس طرح دوا علاج کے اخراجات کی بچت ہوتی ہے۔ پولیو کا ٹیکہ اس کی ایک مثال ہے۔

۷۔ صحت پر ہونے والے مصارف غربت دور کرنے میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ بیماری کے مضر اثرات سب سے زیادہ غریب طبقہ پر پڑتے ہیں کیوں کہ ان کی قلیل جمع پونجی کا بڑا حصہ آدھے ادھورے علاج کی نذر ہو جاتا ہے۔ ان کے لیے اپنی چھوٹی بچت کو چھوئے بغیر صحت یاب ہو جانا ممکن نہیں۔ غریب نوجوانی میں ہی مر جاتا ہے اور معذور ہو جانے پر زیادہ جھیلتا ہے کیوں کہ مناسب علاج نہ کر سکنے کی مجبوری صحت یابی کی رفتار کو سست رکھتی ہے۔ سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ ہے کہ اگر کنبہ کا واحد روزی کمانے والا بیمار پڑے تو دوسرے تمام افراد کو زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے، اپنے صرف (CONSUMPTION) سے منھ موڑنا پڑتا ہے یہاں تک کہ فاقہ کی بھی نوبت آ جاتی ہے۔

رپورٹ میں یہ کہہ کر اختتام کیا گیا کہ صحت پر کیے جانے والے مصارف بار آور انوسٹمنٹ ہے کیوں کہ یہ آمدنی، بالخصوص غریب طبقہ کی بڑھاتا ہے اور صحت کی خرابی سے انسان جو مصائب جھیلتا ہے ان کو کم کرتا ہے۔ اس لیے کم آمدنی والے غریب طبقہ کی ترقیاتی اسکیموں یا صحت کے متعلق تمام پروگراموں کو ترجیحی نشانوں پر رکھنا ان کی فلاح کو فروغ دینے کا سب سے موثر طریقہ ہے۔

صحت کی اقتصادیات

صحت کو اگر ایک صنعت کا درجہ دیا جائے تو پھر اس صنعت کی پیداوار ہوگی، اس کی طلب ہوگی۔ پیداوار کا عمل PRODUCTION FUNCTION ہوگا۔ مصارف و اخراجات یعنی لاگتیں ہوں گی، اس کا بازار ہوگا جہاں بازاری سرگرمیوں کے تحت اس کی قدر و قیمت کا تعین ہوگا اور نفع و نقصان ہوگا۔ ایک صنعت کی جو معاشی سرگرمیاں ہیں ان سب کا اطلاق اس صنعت پر ہو سکتا ہے اس حصہ میں انھیں پہلوؤں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

اقتصادیات کے دیگر شعبوں کی طرح صحت کے سیکٹر میں بھی کمیاب وسایل کے ایسے مناسب استعمال کی بات کی جاتی ہے جہاں زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یعنی انتخاب کا مسئلہ بنیادی ہے۔ وسائل کی تنگی و کمیابی اور ضرورت مندوں کی زیادتی وسائل کے بہتر انتخاب کا مسئلہ پیدا کرتے ہیں اور پھر اس انتخاب کے متعلق تمام اصولوں کو مرتب کرتے ہیں۔ صحت کے سیکٹر میں بھی یہی مسئلہ بنیادی ہے۔ صحت کے طالب مختلف بیماریوں میں مبتلا تمام عوام ہیں جس میں نوزائیدہ بچے، کم سن بچے، نوجوان، جوان، بوڑھے سبھی شامل ہیں۔ بیماریوں کے اقسام، ان کی مدت، ان کے امکانی مضر اثرات صحت کی طلب کی شدت، سمت اور سطح کا تعین کرتے ہیں۔ کسی ہنگامی صورتِ حال میں مثلاً حادثہ، دل کا دورہ، جلنے، چوٹ لگنے وغیرہ میں طلب کی شدت اپنی انتہا پر ہوتی ہے۔ خطرہ سے باہر ہو جانے پر یہ طلب درمیانی سطح پر آ جاتی ہے اور صحت یاب ہو جانے پر چند ہفتہ یا چند ماہ احتیاطی تدابیر کے دور میں یہ طلب پست سطح پر ہوتی ہے۔

اس طلب کی تسکین اسپتالوں، پرائمری ہیلتھ کے مراکز، ڈاکٹروں، سرجنوں، نرسوں، دوا فروشوں، دوائیاں اور اسپتالوں میں استعمال ہونے والی مشینوں و دیگر ساز و سامان تیار کرنے والی کمپنیوں وغیرہ سے ہوتی ہے۔ یہ رسد کا حصہ ہے جو طلب کے مقابلہ پر ہے۔

اب طلب و رسد کے توازن سے صحت کی سطح یا صحت کی قدر و قیمت کا تعین ہو جاتا ہے۔ جن ممالک میں اس توازن کو برقرار رکھنے میں کامیابی حاصل ہو گئی ہے وہاں صحت کا معیار بلند پایا جاتا ہے اور جہاں عدم توازن کی کیفیت ہے وہاں صحت کا معیار پست ہے۔ اگر طلب کے مقابلہ میں رسد کم ہے تو صحت برقرار رکھنے

کی قیمت بہت زیادہ ہوگی اور جہاں طلب کے مقابلہ میں رسد زیادہ ہے وہاں صحت کی قیمت کم ہوگی۔

طلب کے بموجب رسد کی سطح کو قائم رکھنے کی ذمہ داری پبلک سیکٹر یعنی حکومت کی ہے اور نجی سیکٹر کی بھی۔ پبلک سیکٹر کے اسپتال، اس کے ڈاکٹر، نرسیں، سرجن، میڈیکل ریسرچ کے ادارے، دوائیاں تیار کرنے والی کمپنیاں اور فرمس، انتہائی پیچیدہ اور حساس آلات و مشین تیار کرنے والی فرمس پبلک سیکٹر میں بھی ہیں اور نجی سیکٹر میں بھی۔ پبلک سیکٹر کی لاگتیں یا مصارف نجی سیکٹر کے مقابلہ کم ہوتی ہیں کیوں کہ پبلک سیکٹر فلاحی رجحان رکھتا ہے اور نجی سیکٹر منافع کا۔ اس لیے زیادہ تر غریب و درمیانی طبقہ کی طلب پبلک سیکٹر سے پوری ہوتی ہے اور دولت مند و امرا کی طلب کی تسکین پرائیویٹ سیکٹر کے ذریعہ ہوتی ہے۔

اسپتالوں، نرسنگ ہومس، پرائمری ہیلتھ مراکز یا نجی پریکٹس میں مریضوں کی آمد انپٹ (INPUT) ہے اور صحت یاب ہوکر نکلنے والے آؤٹ پٹ (OUTPUT) ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ انپٹ اور آؤٹ پٹ کا تناسب کیا ہے اور یہی تناسب طے کر دیتا ہے کہ اس صنعت کی مجموعی پیداوار کیسی ہے۔ یہ تناسب پبلک و نجی سیکٹر میں اور پبلک و نجی سیکٹر کے مختلف اسپتالوں میں، نرسنگ ہومس اور پرائیویٹ پریکٹس میں الگ الگ پایا جاتا ہے۔ کچھ مقام پر یہ تناسب بہت بلند ہوتا ہے اور کہیں مقام پر بہت پست اور اسی سے پیداوار کی کوالٹی کا اندازہ لگا لیا جاتا ہے۔ اب اگر کہیں انپٹ (INPUT) کے مقابلہ آؤٹ پٹ (OUTPUT) نیچی ہے تو کچھ عرصہ بعد اس یونٹ کی طلب بھی کم ہو جائے گی اور انپٹ بھی کم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر آؤٹ پٹ کا تناسب بلند رہتا ہے تو اس یونٹ کی طلب بھی بلند رہتی ہے اور انپٹ کی سطح بھی بلند رہتی ہے۔

مریض کی مکمل دیکھ بھال اور دوا علاج جس سے کم سے کم وقت میں وہ صحت یاب ہوکر اپنے کام پر واپس جائے اصل پیداوار ہے۔ اس طرح اگر کسی اسپتال کا پیداواری عمل (PRODUCTION FUNCTION) سمجھنا ہو تو پھر اس اسپتال میں مرض کی تشخیص کی کیا سہولتیں ہیں، مریض کی دیکھ بھال کا کیا اور کیسا انتظام ہے، ہنگامی یا نازک صورت حال کو سنبھالنے کے کیا اور کیسے انتظام ہیں، ماہر ڈاکٹر، سرجن، نرسوں اور تکنیکی عملہ کی تعداد اور ان کا معیار کیسا ہے، مریضوں کے بیڈس کی دستیابی کیسی ہے اور دیگر سہولتیں جو انتظامیہ سے تعلق رکھتی ہیں کیسی ہیں، ان تمام عوامل کو دیکھنا ہوگا آؤٹ پٹ کا تناسب اسی وقت بلند ہو سکتا ہے جب ان تمام عوامل کا معیار بلند ہوگا اور ان میں مکمل اتحاد و نظم وضبط ہو۔

پیداوار کی قیمت طلب اور رسد کے توازن سے طے ہوتی ہے۔ جن یونٹ میں ان عوامل کے درمیان بہتر اتحاد پایا جاتا ہے وہاں آؤٹ پٹ کا تناسب بلند رہتا ہے، یعنی طلب زیادہ رہتی ہے اور اسی لیے رو بہ صحت ہونے کی قیمت بھی زیادہ ادا کرنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ وقتی اور قلیل مدتی ہے کیوں کہ اس اونچی قیمت کو وقت کی اس بچت کے مقابلہ پر رکھ کر دیکھیے جو جلد صحت یاب ہونے کی وجہ سے بچا ہے اور جس کو آمدنی میں بدلا جا سکتا ہے۔ اس طرح وقتی اونچی قیمت ہونے والے لمبے نقصان کو بچاتی ہے۔ دوسری صورت میں علاج سستا بھی ہو سکتا ہے اور نتیجہ میں مرض کی مدت زیادہ ہو سکتی ہے یا تھوڑے عرصہ بعد دوبارہ حملہ کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں بار بار بیمار پڑ کر اخراجات بڑھتے ہیں کام پر واپس جانے کا عرصہ لمبا اور آمدنی کے مواقع کم ہونے لگتے ہیں۔ اس لیے صحت کے سلسلے میں قیمت کی بلندی زیادہ فائدہ بخش ہے بشرطیکہ قیمت کی بلندی کے ساتھ ساتھ جلد سے جلد رو بہ صحت ہونے کی ضمانت ہو۔

تیسری دنیا کے تمام ممالک معاشی ترقی کے استحکام کے لیے دیگر اقتصادی عناصر کے ہمراہ صحت کو بھی ایک اہم عنصر تسلیم کرتے ہیں۔ بنیادی مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی بیمار پڑتا ہے تو کم سے کم مدت میں صحت یاب ہو جائے تاکہ اس کا اور اس کے خاندان کا کم سے کم نقصان ہو۔ دوسرا ابتدا سے ہی ایسی تدبیریں اور ایسی اسکیمیں بنائی جائیں کہ جان لیوا یا اپاہج کر دینے والی بیماریوں سے انسانوں کو محفوظ رکھا جا سکے اور اس طرح ملک کا قیمتی بشری سرمایہ ضائع نہ ہونے پائے۔ بیماریوں پر برباد ہونے والا وقت قیمتی ہے اس سے نہ صرف اشخاص کی غیر حاضری پیداوار کو کم کرتی ہے بلکہ کنبہ کے دیگر افراد کی پیداواری صلاحیتیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ اس لیے صحت پر ہونے والا انوسٹمنٹ دراصل بشری صلاحیتوں کے تحفظ اور اس کے فروغ کا انوسٹمنٹ ہے جس کو ہر ممکن طور پر بڑھانا چاہیے۔ ●

بقیہ: بہبودیٔ مزدور کے امکانات: نئے اقتصادی تناظر میں

تغیرات مزدوروں سے متعلق بنیادی مسائل کے حل کی طمانیت فراہم نہیں کرتے کیوں کہ رجحانات کے تصادم، تضادات اور مفادات کی پیچیدگیاں موجودہ نظام میں زیریں لہر کے طور پر موجود ہیں۔ نیا اقتصادی منظر نامہ، نئی اقتصادی تعبیر کا متقاضی ہے۔ نئے ماحول میں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم ان معیاروں کو فروغ دیں جو ایک مہذب اور فلاحی معاشرے کے لیے ضروری ہیں۔ بالخصوص غیر منظم محنت کشوں کو درپیش چیلنجوں کے تئیں مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ مثبت معاشی فضا، معقول اجرت، کام کے بہتر مواقع، پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے کے جذبے کی حوصلہ افزائی، محفوظ ماحول، پنشن اور پراویڈنٹ کے فوائد، وقار محنت، طبی سہولیات، بچوں کی تعلیم اور خوشگوار مستقبل کے حصول کی طمانیت وہ بنیادی مقاصد ہیں جو ہر دور میں اور ہر ماحول میں یکساں اہمیت کے حامل رہیں گے۔ ہمہ وقت حرکت و اضطراب کہ اس جستجو میں بہبودیٔ مزدور کے امکانات پوشیدہ ہیں۔ ●

ڈی کے پانڈے اور ایم سلیم

درختوں کے ذریعے

فضائی آلودگی کی روک تھام

ہوا میں مختلف قسم کی گیسیں اور بخارات موجود ہوتے ہیں مثلاً ریگستانوں کا گرد و غبار، مٹی کے ذرات، ایش (ASH) آتش فشانوں اور جلتے ہوئے جنگلات سے نکلنے والی گیسیں اور سمندری بخارات وغیرہ اور ہر جاندار اس ہوا میں سانس لیتا ہے۔

لیکن ان اجزا میں سے ہر جزو ہوا کو آلودہ نہیں کرتا۔ ہوا کی آلودگی سے مراد ہوا میں ایسے اجزا کی موجودگی ہے جو تمام جانداروں کو نقصان پہنچاتی ہے۔

انسان نے گزشتہ دو صدیوں میں فضا کے اجزائے ترکیبی میں کافی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ جو اب تشویشناک صورت اختیار کر گئی ہے ہم لاکھوں ٹن کوئلہ اور دوسرا ایندھن جلا کر اور اس کی بوئیں سونگھ چکے ہیں۔ اس عمل سے مضر اور بیکار مادے فضا میں داخل ہو چکے ہیں۔ ترقی پذیر آٹوموبائل انڈسٹری فضا میں آلودگی کی ایک اور وجہ ہے۔

انسان کی معاشی سرگرمیوں میں سے بیشتر سرگرمیاں ایسی ہیں جن سے ماحول میں تبدیلی آتی ہے۔ قدرتی ماحول میں تبدیلی اور اس تبدیلی کی شدت کا انحصار اس بات پر ہے کہ توانائی پیدا کرنے کے لیے کن ذرائع اور کن طریقوں کا استعمال کیا جاتا ہے، کون سا خام مال استعمال کیا جاتا ہے، کون سی صنعت لگائی جا رہی ہے، کہاں لگائی جا رہی ہے اور اس میں کس قسم کی پیداوار ہو رہی ہے اور کس پیمانے پر ہو رہی ہے۔ آج ماحولیات کو فضائی آلودگی کا جو خطرہ درپیش ہے وہ خاص کر اسٹیل، پیٹرو کیمیکلز اور شراب کشید کرنے کی بھٹیوں وغیرہ بھاری صنعتوں کی وجہ سے ہے۔

انسان کی صنعتی اور دیگر سرگرمیاں ہی اس خطرناک صورت حال کے لیے ذمہ دار ہیں۔ جو زمین کھود کر نکالے ہوئے ایندھن کے جلنے سے، ریفریجریشن سے نکلنے والی کلورو فلورو کاربن سے، آگ بجھانے کے لیے کی جانے والی کارروائی سے پیدا ہونے والی گیس سے، نامیاتی مادے کے بگاڑ سے پیدا ہونے والی میتھین سے اور زراعت میں کیمیاوی کھاد کے استعمال سے پیدا ہونے والے نائٹرس آکسائڈ سے پیدا ہوئی ہے۔ مسئلہ جنگلات کے ختم کیے جانے سے اور زیادہ شدت اختیار کر جاتا ہے۔ لکڑی کے جلنے سے فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ اور گرین ہاؤس کی دیگر گیسوں کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ یہ گیسیں زمین سے نکلنے والی گرمی کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں اور پھر اسے نیچے کی طرف چھوڑتی ہیں جس سے نچلی فضا گرم ہو جاتی ہے۔ اس طرح دنیا کا گرمی کا توازن بگڑ گیا ہے جس کے سبب زمین کی سطح بھی گرم ہو رہی ہے۔

دنیا میں گرمی کے پیدا ہونے میں کاربن ڈائی آکسائڈ کا حصہ اندازاً پچاس فی صد ہے۔ باقی پچاس فی صد کے لیے دوسری گیسیں (مثلاً میتھین، کلوفلورو کاربن، نائٹرس آکسائڈ وغیرہ) ذمہ دار ہیں۔ موخر الذکر گیسیں کاربن ڈائی آکسائڈ سے ایک ہزار تا دس ہزار گنا زیادہ اثردار ہوتا ہے اسی لیے یہ گیسیں اپنے اجتماع کی موجودہ حد پر بھی بہت خطرناک ہیں۔

مختلف قسموں کا کچرا اکثر پودوں کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ آلودگی پیدا کرنے والے کچھ کلاسیکی عناصر یہ ہیں زمین کھود کر نکالے ہوئے ایندھن سے نکلنے والی سلفر ڈائی آکسائڈ بھاری دھاتوں کے باریک ترین ذرات المونیم اور فاسفیٹ میں کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والا فلورائڈ، آٹوموبائلز سے نکلنے والا ہائیڈرو کاربن اور مونو کسائڈ وغیرہ۔ ان سب میں بہت سی صنعتوں میں کوئلہ جلانے سے نکلنے والی سلفر ڈائی آکسائڈ سبزے اور سبزیوں کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ ہے۔

آلودگی کا پتا لگانے والے پودے

فضائی آلودگی کا پتا لگانے اور اس کے اثرات پر نگاہ رکھنے میں پودے بہت کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ ان اثرات میں سے کسی ایک اثر کی شدت کا پتا لگانے کے لیے اس کی مقدار بھی ناپی جا سکتی ہے۔ ہوا کو آلودہ کرنے والے عناصر کے حیاتیاتی اثرات کی مانیٹرنگ کے لیے پودوں کو بطور اشاریہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ مقامی، علاقائی اور قومی پیمانے پر استعمال کیا جا چکا ہے۔ کچھ قسم کے پودوں کا ذکر، جنھیں آلودگی ظاہر کرنے والے اشاریوں کے طور پر کیا جا سکتا ہے، گوشوارہ نمبر ا میں کیا گیا ہے۔

درخت ہوا کو آلودہ کرنے والے عناصر کے اثر کو جذب کر لیتے ہیں۔ درختوں کے پتے اور پتوں پر کافی گرد جمع ہو جاتی ہے۔ اندازہ

لگایا گیا ہے کہ پتے پتیوں کی ایک مربع میٹر سطح پر
اوسطاً ۴۴ر۱ تا ۳۵ر۵ گرام گرد جمع ہوتی ہے
تاہم ہر زمرے کے درخت پر جمع ہونے والی گرد
کی مقدار دوسرے زمرے کے درختوں سے مختلف
ہوتی ہے جیسا کہ گوشوارہ ۲ میں دکھایا گیا ہے۔
آج میٹروپالیٹن شہروں اور صنعتی علاقوں
میں پورے سال آلودگی کے عمل پر نگاہ رکھنے کی
ضرورت ہے تبھی ہوا کو آلودہ کرنے والے ہر عنصر
کے لیے ماحولیاتی کوالٹی اسٹینڈرڈ مؤثر کیے
جا سکیں گے اور یہ طے کیا جا سکے گا کہ اسے اس
کے ذریعۂ اخراج پر کس طرح اور کس حد تک
کم کیا جا سکتا ہے۔ پیڑ پودے اس ضمن میں ہمیں صحیح
اطلاعات فراہم کر سکتے ہیں اور لیبارٹریوں میں
ان کا مزید مطالعہ کر کے آلودگی کے مضر اثرات
کو کم کرنے کے طریقے دریافت کیے جا سکتے ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۱

درختوں کی اہم اقسام جو آلودگی کا پتا دینے میں اشاریوں کا کام دے سکتی ہیں

نمبر شمار	درختوں کی قسم	ہوا کو پراگندہ کرنے والا عنصر	علامات / اثرات
۱۔	ہلدو	سلفر ڈائی آکسائڈ	انٹرو ینل کلوروسس نیوروسس
۲۔	کچنال		
۳۔	بانس		
۴۔	جونیپرس		
۵۔	مورپنکھی		
۶۔	پوپلر (سرو)		
۷۔	اوک		
۸۔	املی		
۹۔	چیڑ		
۱۰۔	آم		
۱۔	املتاس	ہائیڈروجن فلورائڈ	پتی کی نوک اور کنارے سے نیوروسس
۲۔	شیشم		
۳۔	وائٹ اسپراؤس		
۴۔	جونیپرس (صنوبر)		
۵۔	آڑو (OLIA CUSPIDATA)		
۶۔	آڑو (PRUNUS PERSICA)		
۷۔	ہمالیائی چیری		
۸۔	ولو		
۹۔	اُلم		
۱۔	چیڑ	اوزون	پتوں کی سطح پر لال اور بھورے دھبے۔ پتوں کا مڑنا، نیوروسس
۲۔	سیاہ اخروٹ		
۳۔	اوک (شاہ بلوط)		
۴۔	اسپراؤس		
۵۔	جونیپرس		
۱۔	نیم	گرد اور دھواں	پتیاں زرد ہو جاتی ہیں کلوروسس، فوٹو سینتھیسس ریٹ کم ہو جاتا ہے۔
۲۔	(ERTHRINA INDICA)	دھواں	
۳۔	آم		

گوشوارہ نمبر۲

درخت کا نام	گرام / فی مربع میٹر پتیوں پر
ٹیک (ساگون)	۵٫۳۵
سال	۴٫۵۰
بہیڑہ	۴٫۴۹
آم	۴٫۰۵
کچنار	۳٫۹۰
پلا	۳٫۰۵
نیم	۲٫۹۲
املتاس	۲٫۲۴
املی	۲٫۰۸

بقیہ: چاند اور سورج گرہن

آجاتے ہیں تو سورج گرہن لگتا ہے۔

نئے چاند کے وقت اگر چاند PLANE OF ECLIPTIC پر ہے تو TOTAL یا ANNULAR SOLAR ECLIPSE اور زمین کے درمیان رہ کر اپنا عکس زمین پر ڈالتا ہے۔ یہ SHADOW ZONE AMBRA کی طرح تکون یا CONICAL SHAPE کا ہوتا ہے اور زمین کی طرف اس کا رخ ہوتا ہے۔ سورج اور چاند کا فاصلہ ان کے ELIPTICAL NAZTURE OF THE TWO ORBITS کی وجہ سے کم زیادہ ہوتا رہتا ہے، چاند کے کون (CONE) کے عکس کا آخری حصہ زمین کو چھو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی چھو سکتا۔ اگر یہ زمین کی سطح کے کسی بھی حصے کو چھوتا ہے تو مکمل سورج گرہن کو وہاں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر APPEX OF THE SHADOW CONE زمین کو نہیں چھوتا ہے تو سورج کا ANNULAR ECLIPSE اس جگہ کے APPEX کے بالکل نیچے دیکھا جا سکتا ہے۔ ANNULAR ECLIPSE میں سورج کے DISC کا مرکزی حصہ بالکل تاریک دکھائی دیتا ہے اور اس کے چاروں طرف روشنی کا ایک ہالہ بن جاتا ہے۔ سورج کے TOTAL ECLIPSE یا ANNULAR ECLIPSE کے لیے ضروری ہے کہ سورج، چاند اور زمین کے مراکز PLANE OF THE ECLIPTIC پر ایک سیدھ میں ہوں۔ اگر چاند ECLIPTIC کے نزدیک ہوگا تو PARTIAL SOLAR ECLIPSE ہو جائے گا۔ اگر یہ PLANE OF THE ECLIPTIC کے اوپر یا نیچے ہوگا تو سورج گرہن نہیں لگے گا۔ یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ سارے ANNULAR ECLIPSE اور TOTAL، PARTIAL ECLIPSE سے شروع ہوتے ہیں اور اسی پر ختم بھی ہوتے ہیں۔

۳۰ جون ۱۹۷۳ء میں مکمل سورج گرہن ہوا تھا جو کہ PARTIAL SOLAR ECLIPSE کی شکل میں جنوبی ہندوستان میں دوپہر کے بعد دیکھا گیا۔ یہ گرہن لمبے وقفے کا تھا جس کا شمار ۲۹ مئی ۱۹۱۹ء کے سورج گرہن کے لمبے وقفے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ جنوبی امریکہ کے شمال مشرقی حصے میں، افریقہ، یورپ کے جنوب مغربی حصے میں، برطانیہ کے جنوبی حصے میں، اسپین، فرانس، اٹلی، یوگوسلاویہ اور بلگیریہ میں، ایشیا کے جنوب مغربی حصے یعنی سعودی عرب، عراق، جنوب مغربی ترکی اور ایران، جنوبی ہندوستان اور سری لنکا میں دیکھا گیا تھا۔

ساری دنیا کو اگر ہم ایک ساتھ لے کر دیکھیں تو سورج گرہن کا وقفہ ۵ گھنٹے اور ۱۴ منٹ کا زیادہ سے زیادہ رہا ہے۔ لیکن کسی ایک جگہ پر زیادہ سے زیادہ ۳ گھنٹے تک کا ہی وقفہ ملتا ہے۔ شمال مغربی افریقہ کے حصے میں زیادہ سے زیادہ سورج گرہن کا وقفہ ۳ گھنٹے کا رہا ہے۔ وقفہ کے لحاظ سے ۱۴۳۴ برسوں میں یہ وقفہ سب سے زیادہ رہا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ۲۱۵۰ء تک اتنے لمبے وقفے کا سورج گرہن نہیں لگے گا۔ ●

یوجنا، نئی دہلی

بقیہ: تبصرہ

کتاب کا آغاز روایتی انداز میں حمد "اللہ بہت بڑا ہے" سے ہوتا ہے۔ دوسری نظم وطنیت کے جذبات پر مشتمل "بھارت پیارا" ہے۔ کتاب میں مختلف موضوعات پر مشتمل کم و بیش ۷۰ نظمیں ہیں، جن میں بچوں کے لیے کھیل کود، تعلیم و تربیت، نصیحت، سیر و تفریح وغیرہ کا سامان وافر مقدار میں فراہم کیا گیا ہے۔ کتاب میں شامل تقریباً تمام موضوعات ایسے ہیں جن سے بچوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ زبان نہایت آسان ہے۔ البتہ کہیں کہیں مقامی لہجے کا اثر ضرور کھٹکتا ہے۔

کتاب شروع سے آخر تک رنگین ہے۔ جگہ جگہ نظموں سے متعلق کارٹون بھی دیے گئے ہیں۔ چھپائی میں سلیقہ کم اور رنگوں کا استعمال زیادہ کیا گیا ہے۔ کتابت بھی اچھی نہیں ہے۔ سرورق خوبصورت کارٹونوں سے مزین ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب بچوں کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے۔ ●

شاہ توفیق احمد راہی

پیڑ پودے اور ہماری زندگی

قاعدہ، اصول اور ضابطہ یہ ہے کہ جس چیز کی قدر آپ کریں گے وہ آپ کی اہمیت کو سمجھے گی یہاں تذکرہ چیز کا نہیں بلکہ اس کی اہمیت کا ہے۔ اگر توجہ سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ آپ کے جسم میں کس عضو، کس حصہ کی کیا اور کتنی قیمت ہے اور اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ ضروریاتِ زندگی میں کس چیز کی اور کیسی اہمیت ہے اس کا کچھ اندازہ ہمارے ملک میں ہونے والی خشک سالی سے ہوگیا ہوگا، کل تک جو درخت ہمارے دوست تھے اور ہم سے راضی بہ رضا بھی، آج وہ ہم سے ناراض ہی نہیں بلکہ مخالف بھی ہیں اس کی وجہ ان کی اپنی نہیں بلکہ ہماری تساہلی اور ناعاقبت اندیشی ہے میں تو یہاں تک کہوں گا کہ قدرت کی طرف سے اک سزا ہے جو قدر ناشناسی کی بنا پر ہمیں دی جا رہی ہے، درخت جو انسانی ضرورت کے پیش نظر کلیدی حیثیت کے حامل ہیں اس کا اندازہ صدیوں سے انسان کے فیضیاب ہونے والے رشتہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ بغیر درخت کے انسان پل بھر بھی زندہ نہیں رہ سکتا، اس لیے کہ حیات انسانی میں ہوا کا بہ شکل آکسیجن ایک بڑا اور اہم کردار ہے۔ قاسم ازل نے انسانوں کو جو جو اور جس جس قدر لباسِ فاخرہ عطا فرمائے ہیں ان میں درختوں کا بھی ایک بڑا حصہ ہے۔ پراچین پرمپرا یہ ہے کہ انھیں پیڑ پودوں کی چھال اور پتے تک انسان کے ممد و معاون رہے ہیں اور یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ کسی بھی ذی روح کے عالم وجود میں آنے سے پہلے قدرت اس کی غذا مہیا کر دیتی ہے۔ چناں چہ بچے کی پیدائش سے پہلے ماں کی چھاتی میں دودھ کا آجانا اس کی بین دلیل کے لیے کافی ہے۔ چناں چہ انسان کے وجود میں آنے سے قدرت کاملہ نے حسب ضرورت تمامی پیڑ پودوں کو جنم دے دیا یہ کتنا بڑا احسان ہے حضرت انسان پر کہ پہلے ضرورت کی چیز مہیا کرنا اور پھر وجود میں لانا۔

درخت جو انسان کو ہوا کے ساتھ ساتھ سائے بھی مہیا کرتے ہیں جدید سائنٹفک نظریہ کے مطابق اپنی ان دونوں قیمتی چیزوں کے لیے بسا اوقات اور بعض مقامات پر انتہائی مفید ثابت ہوئے ہیں اس طرح کے درخت آج بھی اتر پردیش کے شمالی (پہاڑی) علاقے بالخصوص بھوالی میں موجود ہیں جو تپ دق کے مریضوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں سمجھے جاتے۔

درختوں نے اگر ایک جانب ہوا اور سائے کے بیش بہا عطیہ سے حضرت انسان کو سرفراز کرکے زندگی کی منازل طے کرنے پر گامزن کیا تو دوسری طرف محرابوں اور قوسوں کی مختلف اشکال کے مختلف نقش و نگار سے بھرپور قوسِ قزح ایسے رنگوں کے پھولوں سے اس کی خوشیوں کو نہ صرف چار چاند لگائے بلکہ ان کی خوشبوؤں سے مست اور بے خود بھی کیا۔ اب یہ ایک علاحدہ بات ہے کہ مئے کا نشہ تو آج بھی جان بناں ہے مگر ساقی کی تصویر دھندلا گئی۔

اگر آپ انصاف کے نقطۂ نظر سے فیصلہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ درختوں نے انسان کو کیا کچھ عطا نہیں کیا؟ انار اور امرود کی شکل میں اگر پھل دیئے تو اخروٹ اور بادام کی شکل میں خشک میوے، شیشم کے درختوں نے اگر لکڑی عنایت کی تو سنکونا جیسے درختوں نے دوائیں بھی، ناریل کے درختوں نے اگر ریشوں کی شکل میں کرم فرمایا ہے تو بانس کے پیڑوں نے تنکے اور کاغذ کا تحفہ بھی، امیوبا کے درختوں نے اگر ربر کی نوازش کی ہے تو سائیکس کے پیڑوں نے ساگو دانہ کی سوغات بھی اور پھر سرسبزیوں اور شادابیوں کا حسن دلآویز بھی۔

اگلے زمانے میں پیڑوں کی بھرمار تھی اور اس کے گواہ تاریخ اور جغرافیہ کے وہ پرانے صفحات ہیں جن میں زیادتی کی یہ وجہ بیان کی گئی ہے کہ اس دور کا چلن ہی یہ تھا کہ گھر کے اندر اور باہر پیڑ لگائے جائیں، چناں چہ بلند و بالا محلوں چھوٹے موٹے مکانوں تک کے اطراف میں درخت لگائے جاتے تھے اور بڑے لوگوں کی اس تقلید میں چھوٹے لوگوں نے بھی اپنے کھپریل پوش گھروں اور خس پوش جھونپڑیوں کے چہار جانب پیڑ لگانے شروع کر دیے جس کے نتیجے میں پیڑ لگانا ایک رسم سی ہوگئی اور یہ رسم آج ناپید ہے جب کہ اس زمانے سے زیادہ آج کے دور میں اس کی ضرورت ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "تاریخ خود کو دہرایا کرتی ہے۔"

درخت چاہے چھوٹا ہو یا بڑا ہمارے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے گھروں اور کارخانوں سے نکلنے والا دھواں مکانوں اور فیکٹریوں سے اڑنے والا گرد و غبار اور ملوں و گاڑیوں سے خارج ہونے والی گیس فضا کو کثیف اور زہر آلود کرتی

پوسٹ بکس نمبر ۲۳۔ بریلی سٹی ۲۴۳۰۰۳ یوپی

ہیں، اور کثافت و آلودگی انسانی صحت کے لیے مضر رساں ہے، نیز پیڑ پلودوں سے خارج ہونے والی آکسیجن گیس فضا کی اس کثافت کے مہلک اثرات کو کم کر دیتی ہے اور بعض پیڑ پلودے ان خطرناک گیسز کو اپنے اندر جذب کر کے مخلوق کو ان کے انتہائی مہلک اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں چناں چہ درختوں کا اگر وجود نہ ہو تو مخلوق کی زندگی جسمانی طور پر اس قدر کشمکش کا شکار ہو جائے کہ ازالہ ہی ممکن نہ ہو۔ درختوں کا وجود زمین پر آبی نظام قائم رکھنے کا بھی موجب ہے کیوں کہ ہر پیڑ پودا اپنی جڑوں کے وسیلے سے زمین کی گہرائیوں سے پانی کھینچ کر بہ شکل بخارات فضا میں تحلیل کرتا ہے چناں چہ درخت کا جس قدر بھی طول و عرض ہوگا اسی قدر رقبہ اور گہرائی میں اس کی جڑیں پھیلی ہوئی ہوں گی اور پھر اسی نوعیت سے اتنی ہی مقدار میں زمین سے پانی کھینچ کر اپنے اندر جذب کریں گی اور پھر بوقت تحلیل اسی ممکنہ حساب سے اس پانی کو فضا میں بخارات کی شکل میں خارج کریں گی اور جیسے پیڑ ہوں گے اسی حساب سے سردی گرمی بہار اور برسات بھی ہوگی۔

جن علاقوں میں پیڑ پودوں کی بہتات ہوتی ہے۔ وہاں کی برسات بھی انتہائی مفید ہوتی ہے کیوں کہ پیڑوں کے بھرمار کے سبب زمین جلد اور زیادہ پانی جذب کرتی ہے جس کی وجہ سے زمین پر پانی سست رفتاری سے بہتا ہے اور یہی سبب ہے کہ بہ نسبت اس مقام کے جہاں پیڑ نہ ہوں جنگلوں اور باغات کی زمین پر بہت کم پانی بہتا نظر آئے گا اور زمین کی تشنگی چھائی بہ بہت زیادہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانی کے بہنے کے عمل میں کوئی رکاوٹ آڑے نہیں آتی۔ مزید یہ کہ بارش کے قطروں کے وزن سے زمین کی مٹی کٹ کٹ کر پانی کے ساتھ بہہ جاتی ہے۔ جو نہایت ہی نقصان دہ عمل ہے۔ دیگر بات یہ ہے کہ اس طریقۂ کار سے جب زمین زیادہ پانی جذب نہیں کر پاتی تو زمین کے اندر موجود خزانے میں کمی واقع ہوتی ہے۔ جس سے سطح آب گر جاتی ہے چناں چہ بریلی ضلع کی سطح آب کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کہ جب زمین زیادہ پانی جذب نہیں کر پاتی تو زیادہ تر پانی نالوں اور دریاؤں کی نذر ہو جاتا ہے جو اپنی بساط سے زیادہ پانی اپنے کناروں سے بہا دیتے ہیں اور جس کی وجہ سے سیلاب زیادہ آنے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ نیز اور زیادہ نقصانات ہو جانے کے امکانات ہوتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس پانی سے وہ سطحی مٹی کٹ کر برباد ہو جاتی ہے جس کی ہمیں زیادہ ضرورت ہے کیوں کہ وہ انتہائی زرخیز ہوتی ہے، اس لیے کہ جدید سائنسی نظریہ کے مطابق اس سطحی مٹی کی تعمیر میں تقریباً ۸۰ سال کا طویل عرصہ لگ جاتا ہے اور مزید یہ کہ سطحی مٹی کٹ کر جب دریاؤں میں داخل ہوتی ہے تو نہ صرف اس کے پانی کو بد رنگ کر دیتی ہے بلکہ نیچے بیٹھ جاتی ہے جس سے دریا کی سطح اونچی ہو جاتی ہے اور سطح جیسے جیسے بلند ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے پانی کی بساط اور برداشت کم ہوتی جاتی ہے، جس سے ایک طرف سیلاب آنے کا خطرہ اور دوسری جانب پل بنانے یا باندھ باندھنے کی ضرورت بڑھتی چلی جاتی ہے اور جب ضرورت کی خاطر باندھ باندھ دیے جاتے ہیں تو یہی مٹی نہ صرف باندھ کی تہہ میں بیٹھ کر اس کی سطح کو بلند کر دیتی ہے بلکہ باندھ کی تہہ میں جم جم کر باندھ کی گہرائی کو بھی کم کرتی چلی جاتی ہے۔ جس سے باندھ کی عمر گھٹتی ہے مزید یہ کہ پانی کم جمع ہونے کی غرض سے نہ صرف یہ کہ بجلی کم بنتی ہے بلکہ آب پاشی کے مواقع بھی کم سے کم تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور اس طرح ۸۰ سالہ عمر کی اس زرخیز مٹی کے آہستہ آہستہ اپنے اختتام کو پہنچتے ہی علاقے کے علاقے بنجر ہو جاتے ہیں، قحط پڑ جاتے ہیں، خشک سالی آ جاتی ہے۔

جہاں تک درختوں سے مزید فوائد کا سوال ہے ان سے ہمیں بیش قیمتی جڑی بوٹیوں کے ساتھ ساتھ کوئلہ اور جلانے کی لکڑی بھی فراہم ہوتی ہے اور یہی لکڑی فرنیچر کی شکل میں ہمارے ڈرائنگ روم اور دفتروں کی زینت بنتی ہے۔ الغرض ابتدا تا انتہا درخت انسان کے ساتھی اور ہمدرد ہی نہیں بلکہ مونس اور غم خوار بھی ہیں۔ یہاں تک کہ عمر کے آخری حصہ میں یہی درخت کام آتے ہیں چناں چہ ضعیفی کی اس عمر اور بڑھاپے کی اس شکل میں جب کمر کمان کی طرح جھک جاتی ہے تو عصا کی شکل میں یہی درخت ساتھی ہوتا ہے اور موت کے لبیک کہنے پر تختوں کی شکل میں قبرستان اور آگ کی صورت میں شمشان میں یہی درخت کام آیا کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیتے جی اگر کوئی قدر کرتا ہے تو درخت اور مرنے کے بعد کوئی کام آتا ہے تو درخت۔ ●

یا جھنا، نئی دہلی

بقیہ: ایک نئی انگریزی اردو ڈکشنری

AVIAN : (A)(L.AVIS + AN)

BLANCARD : (N)(F.BLANC + ARD)

BYSSOLITE : (A)(GR.BYSSOS + LITE)

CALLING : (N)(F.CALL + ING)

CALLIPIC : (A)(GR.KALLIPPOS + IC)

اس لغت میں الفاظ کی قواعدی نوعیت بھی ظاہر کی گئی ہے اور ان کی ادبی حیثیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ انگریزی لفظ کے مترادفات دینے میں معنی کے زیادہ سے زیادہ SHADES پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور حسب ضرورت مترادفات کی تشریحات بھی کی گئی ہیں تاکہ قاری کو مفہوم تک رسائی میں دشواری نہ ہو۔ لغت میں انگریزی زبان کے الفاظ یا اصطلاحات کا اردو متبادل لفظ یا محاورہ دینے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے، لیکن جہاں ضرورت پیش آتی ہے وہاں انگریزی لفظ کے معنی تفصیل سے دیے گئے ہیں۔ تاکہ سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

اس لغت کی ترتیب میں اب تک موجود تمام انگریزی اردو لغات سے استفادے کے ساتھ ساتھ تمام علوم و فنون پر نئی نئی کتابوں، اخبارات و رسائل سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جہاں الفاظ و اصطلاحات عصری تقاضوں کے تحت جنم لیتے ہیں اور جن پر نظر رکھنا ایک اچھے لغت نویس کے لیے لازمی ہوتا ہے۔ تبھی "اپ ٹو ڈیٹ" لغت کی تدوین ممکن ہو سکتی ہے۔ کلیم صاحب نے اس نکتے کو مد نظر رکھا ہے اسی لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لغت اب تک موجود تمام لغات میں مستند اور بہتر شمار کی جائے گی۔

ایک کمی جو اس لغت کے مطالعہ کے وقت شدت سے محسوس ہوئی وہ اس لغت میں مرتب لغت پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کے مقدمے کا نہ ہونا ہے جس سے اس لغت کی بہت سی خوبیوں اور طریق ترتیب پر بھرپور روشنی نہیں پڑتی۔ ڈائرکٹر صاحبہ کا پیش لفظ اس سلسلے میں تھوڑی سی رہنمائی تو کرتا ہے لیکن جس تفصیلی مقدمے کی یہ لغت متقاضی تھی اس کا بدل نہیں پیش کرتا۔

بہرحال اتنی خوبصورت لغت شائع کرنے کے لیے بورڈ کا عملہ عمومی طور پر اور ڈائرکٹر صاحبہ خصوصی طور پر مبارکباد کی مستحق ہیں۔ جنھوں نے کافی عرق ریزی اور جاں سوزی کے بعد اتنا عمدہ پروڈکشن دیا ہے۔ ●

فروغ صبا جامی

ایٹمی توانائی: امیدیں اور خدشات

ایٹمی توانائی کی بنیاد زمین کی اوپری سطح میں موجود کچھ بھاری عناصر مثلاً یورنیم ہوتے ہیں ان میں آسوٹوپ ہوتے ہیں جن میں پھٹنے یا جلنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جب کسی ایک ایٹم کا مرکز پھٹتا ہے تو وہ ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے جن کا وزن حقیقی جسم سے کسی قدر کم ہوتا ہے۔ کمیت میں کمی توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ٹکڑوں میں تقسیم ہونے والا ایٹم نیوٹرون بھی خارج کرتا ہے اور بھاری ذرات بھی۔ ایٹم دوسرے تقسیم ہونے کے قابل ایٹم سے ٹکراتے ہیں اور انھیں توڑ کر تقسیم کر دیتے ہیں اور یوں ردعمل کا سلسلہ قائم کرتے ہیں۔

ری ایکٹر ایک قابل ذکر ایجاد کا نام ہے جو اس وسیع عمل کو تیز کرتا ہے جس کے نتیجے میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ ایک بڑے ری ایکٹر میں ایک ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو ۶ لاکھ آبادی کے شہر کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ری ایکٹر کے کام شروع کرتے ہی اندرونی حصہ کو چاراطراف پانی میں ڈبو دیا جاتا ہے۔ ہزاروں ٹن پانی شدید دباؤ کے تحت گردش کرتا ہے تاکہ حرارت کو دور کیا جا سکے اور ری ایکٹر کے درجۂ حرارت کو حدود میں رکھا جا سکے، پانی نیوٹرون کے بہاؤ کو سست اور معتدل رکھتا ہے اور یوں ردعمل کے تسلسل کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔

توانائی کے لیے پریشان دنیا میں ۴۴ ممالک ایسے ہیں جہاں جوہری توانائی کا استعمال ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۸ء کے وسط تک ۲۲ ممالک میں ۲۲۰ ری ایکٹروں کو کام کرنے کا اجازت نامہ مل چکا تھا جن میں دس کروڑ کلو واٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے لیکن ترقی یافتہ اقوام میں جوہری توانائی کی بڑھتی ہوئی مخالفت نے ترقی کی رفتار میں کمی کر دی ہے جب کہ اس کے برخلاف ترقی پذیر ممالک کے اقوام میں ری ایکٹروں کے حصول کی کوششیں خصوصی اہمیت کے ساتھ جاری ہیں۔ ترقی یافتہ قوتیں اپنی آمرانہ سوچ یہ کہہ کر مسلط کر رہی ہیں کہ ری پروسیسنگ پلانٹ پلاٹینم پیدا کرتے ہیں جو جوہری بم کی تیاری میں استعمال ہو سکتا ہے اس سے پلاٹینم کے چرائے جانے اور نتیجتاً جوہری ہتھیاروں کے پھیلاؤ کا خطرہ پیدا ہوتا ہے۔

ایٹمی پلانٹ اور ری ایکٹروں کے بارے میں ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا وہ بم کی مانند پھٹ سکتے ہیں اس کا جواب سائنس دانوں نے یہ دیا ہے کہ تجارتی ری ایکٹر میں استعمال ہونے والے یورینیم ۲۳۵ میں ایٹمی دھماکے کی صلاحیت نہیں ہوتی لیکن کچھ حالات کے تحت ایٹمی پلانٹ میں بھاپ کا دھماکہ ہو سکتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں ایٹمی صلاحیت کے حصول کی کوششوں کو مغربی ترقی یافتہ ممالک اس بنیاد پر شک کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ ایٹمی پلانٹ میں ایٹمی ہتھیار بنانے کی بھی صلاحیت ہونے کی صورت میں فوجی بنیادوں پر طاقت کا توازن بھی بدل سکتا ہے اور سیاسی بنیادوں پر تبدیلیاں بھی متوقع ہو سکتی ہیں۔

اس سوال پر کہ کیا ایٹمی پلانٹ سے ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری ممکن ہے۔ سائنس والے بتاتے ہیں کہ تمام ری ایکٹر پلاٹینیم کو خصوصی حیثیت سے پیدا کرتے ہیں۔ ری پروسیسنگ پلانٹ کے ذریعے اس پلاٹینیم کو ایندھن کے لیے علیحدہ بھی کیا جا سکتا ہے اور صاف بھی اور یہی پلاٹینیم ہتھیاروں کے لیے موزوں مادہ ہے۔

ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری اور پلاٹینیم کو علاحدہ کرنے کے ذکر میں ری پروسیسنگ پلانٹ اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ ری پروسیسنگ کے عمل کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ جب استعمال شدہ ایندھن ری ایکٹر سے لیا جاتا ہے تو اس میں غیر استعمال شدہ یورینیم اور پلاٹینیم ۲۳۹ جیسے اہم مادے موجود رہ گئے ہیں جو کہ جلنے کے عمل کے دوران نیوٹرون کی شدید گولہ باری کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

ایٹمی توانائی اور تابکاری کے سلسلے میں ایک زیادہ انتباہی مسئلہ جو ناقدین اٹھاتے ہیں وہ تابکار ایٹمی فضلے کا ہے کہ اس کا کیا کیا جائے؟ اس کو دو سطحوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول کم درجے کا تابکار فضلہ۔ اس میں تابکاری بہت کم ہے دوسرے میں اعلا پیمانے پر تابکاری ہوتی ہے اور زیادہ مشکلات بھی کیوں کہ اس میں شامل الفا ذرات پلوٹینیم خارج کرتے ہیں۔

کلالی محلہ، نزد مسجد۔ اورنگ آباد۔ ۸۲۴۱۰۱

فضلہ کے مسئلے کے لیے صرف ایٹمی توانائی کو مورد الزام نہیں قرار دیا جاسکتا کیوں کہ اس کی ابتدا برسوں قبل اس وقت ہوئی جب امریکہ نے ایٹم بموں کی تیاری اور آبدوزوں میں ایٹمی ری ایکٹروں کی تنصیب کے لیے پلوٹینیم کی تیاری شروع کی تھی مختلف اقوام نے ایٹمی فضلے کے انتظام کے مختلف طریقوں کو آزمانے کی کوشش کی ہے۔ برطانیہ میں اس مقصد کے لیے پائپ لائن کو استعمال کیا گیا جو آئرش سمندر میں خارج تھی۔ امریکہ کے ایٹمی توانائی کمیشن نے ۱۹۴۶ء سے ۱۹۷۰ء تک کے عرصہ کے دوران کم درجے کے ایٹمی فضلے کے ہزاروں ٹن کے کنستر میری لینڈ اور ڈیلا اور ساحل سے ۱۲ میل دور اٹلانٹک سمندر میں اور سان فرانسیکو سے ۳۵ میل دور مغرب میں ذخیرہ کیے۔ روس درمیانی درجے کے مائع ایٹمی فضلے کو دو ہزار میٹر گہرائی میں مٹی کی سطح کے نیچے پمپ سے لے جاتے جا رہے ہیں۔ مغربی جرمنی میں ہینوور میں دنیا کی اولیں نمک کی کان فضلہ محفوظ رکھنے کی جگہ بنائی گئی تھی اس کے علاوہ زیادہ خطرناک فضلہ کا انتظام کرنے میں زیادہ احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۷۲ء سے "ایسے" کے مقام پر جمع کیا جا رہا ہے۔ چند سائنس دانوں کا خیال ہے کہ خطرناک اور طویل عرصہ تک برقرار رہنے والے تابکار فضلے کو بہتر ہوگا کہ ٹھوس شکل میں تبدیل کیا جائے اور پھر اسے حفاظتی کنستروں میں رکھ کر محفوظ جغرافیائی حالات میں سیکڑوں ہزاروں فٹ گہرائی میں دفن کردیا جائے اس سلسلہ میں سائنس دان گریفائٹ نمکین سطحوں اور پتھروں کی مخصوص سطح کا جائزہ لے رہے ہیں۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ پائدار ہے اور کون تابکاری کو ماحول میں پھیلنے سے روکنے میں سب سے بہتر ہوگا۔

فرانس میں مائع تابکار فضلہ جو استعمال شدہ ایندھن کی ری پروسیسنگ کے بعد بچ رہتا ہے اسے بخارات میں تبدیل کردیا جاتا ہے اور ریزیڈیو کو بہت زیادہ حرارت پر پندرہ سو پاؤنڈ کے انتہائی سخت شیشے کے ٹکڑوں میں تبدیل کردیا جاتا ہے۔ فرانسیسی حکام کہتے ہیں کہ انھیں دھات کے تپے ہوئے ڈرم میں بند کرکے صدیوں کے لیے بحفاظت دفن کردیا جائے گا۔ اس طریقہ کا اختلاف اپنی جگہ لیکن طویل مدت تک اسے ذخیرہ کرنا بہرحال لازم ہوگا جس کا انحصار آسوٹوپ کی آدھی زندگی پر ہوگا یہ تمام معاملات میں فضلے کو ایسی جگہوں پر ذخیرہ کرنے کی ضرورت ہوگی جہاں زمین کا پانی ان تک بہ آسانی نہ پہنچ سکے اور جہاں زلزلے اور دوسری سرگرمیوں کا امکان نہ ہو اس کے ساتھ ہی اس سے انسانی زندگی کو بھی محفوظ رکھنا ہے۔ ایٹمی فضلہ کو محتاط اور محفوظ طریقے سے ٹھکانے لگانے کے مسئلے پر ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اواخر تک تقریباً ۳ کروڑ ڈالر تحقیق پر خرچ ہوچکے تھے لیکن اس کے باوجود حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ فضلے کو ٹھکانے لگانے کی سہولتیں کب میسر ہوں گی۔

ایٹمی قوت سے بجلی پیدا کرنے کی ابتدا ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی جب امریکہ نے پہلی مرتبہ یہ تجربہ کیا اس کی صلاحیت چار بجلی کے بلبوں تک محدود تھی۔ امریکی ریاست اڈاہو میں قائم کیا جانے والا پہلا تجرباتی بجلی پیدا کرنے والا ری ایکٹر قومی تاریخی سنگ میل کی حیثیت سے محفوظ کیا جاچکا ہے۔ ●

یوجنا، نئی دہلی

بقیہ: بچوں میں جنسی بے راہ روی: ایک خطرناک رجحان

باخبر بنائیں۔

جنس کے تعلق سے گفتگو ڈھکے چھپے انداز میں نہیں، کھل کر ہونی چاہیے۔ جنس کے مختلف پہلوؤں پر بات چیت کرتے وقت شرم، حیا اور جھجک کو بالائے طاق رکھنا فضول اور بے مقصد نہیں ہوگا۔

محض اخلاقیات کے درس سے طلبا ر قابو میں آنے والے نہیں، کیوں کہ جنسی ترغیب دینے والی اشتہاراتی مہمات اور تفریحی پروگراموں کے سامنے وہ بے بس ہیں۔ ایسی حالت میں بہتر یہی ہے کہ انھیں محفوظ جنسی میل جول کے بارے میں تربیت دی جائے۔ ●

بقیہ: نیم: اہمیت اور فوائد

سال میں دس لاکھ ٹن بتولی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت صرف اس کا پانچواں حصہ ہی اکٹھا کیا جاتا ہے۔ نبولیاں اکٹھا کرنے کی ٹکنالوجی بہتر ہوجانے کے سبب نیم کا تقریباً ۵۰ ٹن سفوف تیار کیا جاسکتا ہے جو کسانوں کی آمدنی بڑھانے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

ماہرین کے مطابق بھارت کے غریب کسانوں کی آمدنی بڑھانے کا ایک اور طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ نیم کا عرق نکالا جائے اور فصل کو کیڑوں سے بچانے کے لیے اسے فصل پر چھڑکا جائے۔ ملک کی کئی لیباریٹریوں میں یہ عرق تیار کرنے میں حوصلہ افزا پیش رفت ہوئی ہے۔

نیم کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اب نیم کے بارے میں ہر سال ایک کانفرنس ہونے لگی ہے۔ پچھلی کانفرنس ۱۹۹۳ء میں بنگلور میں ہوئی تھی۔ ہمارے آیورویدا میں نیم کے دوائی اثرات کے بارے میں کافی تفصیل موجود ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ نیم سے بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے اور مانع حمل مادے تیار کیے جاسکتے ہیں۔

یہ بات کافی اہم ہے کہ نیم کے تیل میں مانع حمل خوبیاں پائی گئی ہیں۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف امیونالوجی نئی دہلی کے سائنس داں اب نیم سے بنائے گئے ایک مانع حمل مرکب کی جانچ کر رہے ہیں۔ نیم کی اس خاصیت میں ساری دنیا کے سائنس دانوں کی دلچسپی ہے۔ جیسے جیسے سائنسداں اپنی لیباریٹریوں میں نیم پر تجربات کرتے جائیں گے ویسے ویسے عدم توجہی کے شکار اس درخت کی خصوصیات منظر عام پر آتی جائیں گی اور اس کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ ہوگا۔ پھر اس کا استعمال ہندوستانی گاؤوں میں صرف جراثیم کش مسواک یا داتون بنانے تک ہی محدود نہیں رہے گا۔ نیم کھیتوں میں کیڑے مکوڑوں سے بچاؤ کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے اس سے وہ آلودگی پیدا نہیں ہوگی جو کیڑے مار کیمیاوی دواؤں کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کس قدر دوربیں اور دانشمند تھے ہمارے آبا و اجداد نیم کے درخت لگانے پر زور دیتے تھے۔ ●

دانش اقبال

بہبودیٔ مزدور کے امکانات
نئے اقتصادی تناظر میں

عصر حاضر میں جدید تکنالوجی اور بڑھتی آبادی کے سیل بے کراں نے موج در موج اقتصادی تغیرات کو ناگزیر بنا دیا ہے۔ سرد جنگ کی کشاکش سے مضمحل دنیا نے نظریاتی ترجیحات کی سپر پھینک کر تکنالوجی اور مسابقتی اختراعات کی پے در پے فتوحات کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ تجارت و زندگی جو بسا اوقات معیشت کے اکھاڑے میں باہم برسر پیکار نظر آتے تھے کچھ اس طرح سے شیر و شکر ہوئے کہ اب کوئی جداگانہ شناخت محال ہو چکی ہے۔ لیکن اس حقیقت کے اظہار کے لیے نہ کسی مثال کی ضرورت ہے اور نہ ہی کوئی منطقی استدلال درکار ہے کہ سرد جنگ کے بعد کا اقتصادی منظر نامہ ابھی اپنی تکمیل کے ابتدائی مراحل میں ہے۔

زماں گزیدہ سیاسی و اقتصادی عقائد کے انہدام سے اٹھنے والے گرد و غبار نے ہماری توجہ انفرادی نارسائیوں کی بھول بھلیوں سے ہٹا کر وسیع تر اقتصادی مفادات کی منزل کی جانب مرکوز کر دی ہے۔

اقتصادی ترقی و فلاح کی یہ جستجو ابتدا ہی سے بہت دلکش و خوش کن نظر آتی ہے لیکن یہ سفر آسان ہرگز نہیں ہے کیوں کہ جب تک قافلے میں موجود ہر شہ زور و ناتواں خوش حالی کی منزل تک ثابت و سالم نہ پہنچے تب تک ہمارا عزم سفر صحیح معنوں میں شرمندۂ جستجو نہیں ہوگا۔ اقتصادی نظام کی تجدید نو کے لیے انسانی وسائل کلیدی اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ ساری کی ساری تگ و دو کا محور و مقصد بھی یہی محنت کش ہیں اور اس جد و جہد کا وسیلہ بھی انھیں کو بننا ہے۔ زیر نظر سطور میں ہم عالمی یوم محنت کے موقع پر محنت کش طبقہ کو درپیش مسائل کے ساتھ ساتھ متوقع مراحل اور ترجیحات و مقاصد کا احتساب کریں گے۔

صنعتی انقلاب سے لے کر جدید تکنالوجی اور آزاد معیشت کے موجودہ دور تک محنت کشوں کی زندگی نارسائیوں اور محرومیوں کی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے۔ وہی مسائل جو صنعتی انقلاب کے وقت مزدوروں کو درپیش تھے آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ہر جگہ موجود ہیں۔ حالاں کہ موجودہ عالمی تناظر میں ان کی نوعیت اور شدت کسی قدر بدل گئی ہے۔ ہر دور میں محنت کشوں کی آرزو یہی رہی ہے کہ انھیں خود اپنی زندگی پر کسی قدر اختیار ضرور حاصل ہونا چاہیے۔ حالاں کہ عصری تناظر میں روایتی اصطلاحات بڑی حد تک فرسودہ سمجھی جانے لگی ہیں لیکن حالات میں اس قدر تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے کہ ہم مزدوروں کے بنیادی مسائل سے چشم پوشی کرنے میں حق بجانب تصور کیے جائیں۔ اس بات کا اندیشہ اب بھی موجود ہے کہ نوآبادیاتی باقیات و تعصبات کی میراث، نو اقتصادیات استحصال کی شکل اختیار نہ کر لے۔ حالاں کہ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ قدیم نظام میں بہت سی تبدیلیاں آئیں اور خاص طور سے مغربی ممالک میں اب یہ آزاد صنعتی جمہوریت کے سانچے میں ڈھل چکا ہے لیکن آزاد عالمی معیشت کا نومولود نظام ابھی طاقتور ممالک کی خود غرضانہ پالیسیوں سے آزاد نہیں ہے۔ آزاد عالمی نظام میں معاشی مفادات کا توازن اس حد تک حساس ہے کہ دور افتادہ مضرات معمولی سے معمولی تبدیلیوں کی راہ میں حائل محسوس ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک اور تیسری دنیا کے مابین معیار زندگی کے تفاوت کی شدید ترین قہرسامانیاں محنت کش طبقات کی زندگی ہی میں ملتی ہیں۔ حوصلہ شکن مسابقتی کشمکش سے نبرد آزما تیسری دنیا کے بیشتر ممالک نئے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں اور محنت کش طبقات امید و بیم کی ایسی کیفیت سے دوچار ہیں جہاں ان کی فلاح و بہبود وسیع تر قومی مفادات سے مشروط طور پر جڑی ہوئی ہے۔

قومی تناظر میں فی الوقت بین اقوامی حکمت عملی کی مجبوریوں سے قطع نظر اس بات کا ادراک لازمی ہے کہ محنت کش طبقہ کی بہبود کے لیے ایسی پالیسیاں وضع کرنا ضروری ہے جو ایک طرف تو قوم کی معاشی صحت کو تقویت بخشتی ہوں اور دوسری جانب مزدور سماج کی عصری ضرورتوں سے بھی ہم آہنگ ہوں۔ اس ضمن میں تحریک محنت کے ماضی و حال کا

اے-۲/۲۳۴، گلی نمبر ۲، ذاکر نگر اوکھلا، نئی دہلی ۲۵

جائزہ نئی راہوں کے تعین میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔

ہمارے ملک میں تحریک محنت نے تحریک آزادی کے دوش بدوش اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں دونوں تحریکیں باہم مربوط تھیں اور ان کے مقاصد بھی مشترک تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ دونوں تحریکیں متوازی نہیں تھیں بلکہ ایک دوسرے پر انحصار اس حد تک تھا کہ ان کو الگ الگ شناخت کرنا ممکن نہیں۔ ملک کی آزادی کے ساتھ حالاں کہ مشترکہ حریف تو سامنے سے ہٹ گیا لیکن غربت و افلاس اور ناداری و نارسائی کے خلاف جدوجہد کو تو جاری رکھنا تھا۔ چناں چہ آزاد ہندوستان کے منصوبہ سازوں نے ابتدا ہی سے اپنی توجہ اس بات کی جانب رکھی کہ ملکی پیداوار بڑھانے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ مزدوروں کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ انھیں ہر قسم کی جائز سہولیات دے کر ان کے معیار زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ ریاستی اور مرکزی حکومتوں نے اپنی اپنی سطح پر ہر مزدوروں کو خوش اور مطمئن رکھنے کے لیے بہت سے اقدامات کیے۔ خاص زور اس بات پر دیا گیا کہ صنعتی امن قائم رہے یعنی ہڑتالیں وغیرہ نہ ہوں۔ تصادم کے بجائے تصفیہ کا راستہ اپنایا جائے۔ روزگار کے ذرائع میں تنوع پیدا ہو اور محنت کش طبقہ کو بنیادی سہولیات فراہم کی جائیں تاکہ کارکردگی کو مہمیز دی جا سکے۔ دوسری جانب انھیں مناسب قانونی تحفظات کی طمانیت بھی حاصل ہو۔ ساتھ ہی ساتھ اس طرح کی بھی کوششیں کی گئیں کہ مزدور تحریک ایک سنجیدہ اور ذمہ دار تحریک بن سکے اور اپنے اس رویہ کو تج دے جو نوآبادیاتی سامراج کے خلاف ہی موزوں تھا۔ اس دور کی مزدور تحریک کا غالب حصہ برسر حکومت قائدین سے نظریاتی اختلاف رکھتا تھا۔ اس سے پہلے کہ مزدور تحریک نئے ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہو پاتی، نظریات و توقعات کی خلیج اور جز وقتی سیاسی مفادات نے تحریک کو کئی حصوں میں منقسم کر دیا۔ شروع کے دو پنجسالہ منصوبوں کے ساتھ ہی یہ محسوس کیا جانے لگا کہ ہندوستان کا مطمح نظر مکمل اشتراکی نظام نہیں بلکہ ایک ایسا جمہوری معاشی نظام ہے جہاں انفرادی اور اجتماعی ذرائع صنعت و حرفت دوش بدوش موجود رہیں گے۔ پہلے منصوبے کے دوران ہی یہ بھی سوچا گیا کہ اگر مزدوروں کے لیے روٹی کپڑے اور مکان کے ساتھ ساتھ علاج و معالجہ جیسی سہولیات کو یقینی بنایا جائے اور ان کے اندر سماجی تحفظ کا احساس پیدا کیا جائے تو ان میں تعمیری ولولہ پیدا ہوگا اور وہ اپنی قومی ذمہ داریوں کو پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھا سکیں گے۔ بعد کے منصوبوں میں بھی اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا کہ مزدوروں کے ساتھ منصفانہ سلوک ہو اور ان کی حالت سدھاری جائے تاکہ ہم محنت کش طبقہ کو ترقی و خوش حالی کی منزل تک پہنچا سکیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزدوروں اور مالکان کے تعلقات میں بھی بہتری آئی۔ صنعتی سمجھوتے کی قرارداد منظور ہونے کے بعد انڈین لیبر کانفرنس اور اسٹینڈنگ لیبر کمیٹی کے علاوہ دیگر صنعتی اور مشاورتی کمیٹیاں وجود میں آئیں۔ صنعتی تنازعوں سے نمٹنے کے لیے مختلف سطحوں پر ورکس کمیٹیاں قائم کی گئیں اور مقامی اور ریاستی سطح کی کمیٹیوں کے علاوہ ایک کل ہند تنظیم بھی بنائی گئی۔ نتیجہ خیز مذاکرات ممکن نہ ہونے پر ثالثی کے لیے تین سطحی عدالتوں کا نظام بنایا گیا جس میں لیبر کورٹ، انڈسٹریل ٹریبونل اور نیشنل ٹریبونل شامل تھے۔ اس کے علاوہ مزدوروں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مرکزی بورڈ کی تشکیل کی گئی جس کے تحت علاقائی مراکز کھولے گئے۔ آج کل ۱۶۴ ایسے مراکز مزدوروں کی تربیت کا کام کر رہے ہیں۔ مختلف علاقائی زبانوں میں دیہی مزدوروں کے لیے پائلٹ پروجیکٹ چلائے جا رہے ہیں۔ ان تربیتی پروگراموں کا مقصد یہ ہے کہ صنعتوں کے لیے ماہر کاریگر تیار کیے جائیں۔ روایتی کاریگر اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کر سکیں اور نئی تکنالوجی کا استعمال سیکھ سکیں پیشہ ورانہ حرفوں کی ٹریننگ کا بھی بنیادی مقصد یہی ہے کہ عصری تکنیک کی جانکاری مزدوروں کو دی جا سکے اور معیار میں یکسانیت پیدا کی جائے۔

خط غربت اور اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کی مناسبت سے اقل ترین اجرت کے تعین کا نظام وضع کیا گیا جس کے تحت مزدوروں کے لیے کم سے کم اجرت طے کی جاتی ہے۔ ایسا خاص طور سے ان زمروں میں کیا گیا جہاں مزدور غیر منظم تھے یا پھر اتنے منظم نہیں تھے کہ اپنے مطالبات منظور کرا سکیں۔ خاص طور سے زرعی مزدوروں کے لیے یہ طریقہ کار انتہائی کارآمد ثابت ہوا۔ یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ مختلف صنعتوں سے منسلک مزدوروں کی اقل ترین اجرت کے تعین میں بہت زیادہ فرق نہ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سوتی ملوں، شکر ملوں، سیمنٹ اور دیگر صنعتوں کے لیے اجرت بورڈوں کا قیام عمل میں آیا۔ اجرتوں کے تعین کے علاوہ ممکنہ خطرات کا سامنا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ بیماری یا زخمی ہو جانے کی صورت میں کام کے لیے لائق نہ رہنے یا بیکار ہو جانے کے خوف کے ازالہ کے لیے قانونی تحفظات کو بروئے کار لایا جائے تاکہ مزدوروں میں اعتماد و اطمینان پیدا ہو اور پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی کر سکیں۔ ان تحفظات میں موت کی صورت میں معاوضہ، دوران زچگی خاتون مزدوروں کو ضروری سہولیات کے ساتھ ساتھ ایمپلائیز اسٹیٹ انشورنس ایکٹ شامل ہے۔ ایسا ان سبھی کارخانوں کے لیے کیا گیا جہاں بیس یا زائد مزدور برسر کار ہوں۔ ابھی کچھ دنوں قبل ہی وزیر محنت نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ چھوٹے کارخانوں میں ایمپلائیز پراویڈنٹ فنڈ اور پنشن فوائد بھی فراہم کیے جائیں گے۔ اس اسکیم میں مالک، مزدور اور حکومت مشترکہ تعاون دیں گے۔ بین اقوامی تنظیم محنت کے تعاون سے حادثات سے تحفظ

کے لیے ایک پروجیکٹ چلایا جارہا ہے جس کے تحت ایک اعلا سطحی سفارشی کمیٹی خطرناک سمجھی جانے والی صنعتی اکائیوں کی رہنمائی کرتی ہے۔ قومی سطح پر نیشنل سیفٹی کاؤنسل حفاظتی تدابیر کی ترویج واشاعت کے لیے کام کررہی ہے۔ ہرسال تحفظ کے شعور کو بیدار کرنے کے لیے ۴ مارچ کو قومی یوم تحفظ منایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ڈوک ورکسرس ایکٹ، فیکٹری ایکٹ، انڈین مائنز ایکٹ اور پلانٹیشن ایکٹ جیسے قوانین کی رو سے مزدوروں کو فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں مختلف قسم کی سہولیات کی فراہمی کا تیقن دیا گیا ہے۔ ایسے کئی قوانین کا بھی نفاذ عمل میں لایا گیا ہے جن کے تحت صنعتی، کان کنی اور باغوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی فلاح وبہبود کی اسکیموں پر خرچ کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ یہ قوانین اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ مالکان اپنے مزدوروں کی حفاظت، صحت اور بھلائی کے لیے ضروری اقدامات کریں۔ اسی طرح سے اوقات کار، چھٹی، تنخواہ کے ساتھ تعطیل اور کوئی خاص کام کرنے کی صورت میں یا کیمیائی آلودگی کی وجہ سے پیدا شدہ بیماریوں کی صورت میں معاوضہ وغیرہ کی شرائط کی ترتیب وتدوین بھی کی گئی ہے۔ وقتاً فوقتاً اس بات کی بھی جانچ کی جاتی رہتی ہے کہ ان باتوں پر کس حد تک عمل ہورہا ہے۔

کئی ایسے فنڈ بھی قائم کیے گئے ہیں جن سے مزدوروں کی طبی اور تعلیمی ضرورتوں کے لیے امداد فراہم کی جاتی ہے۔ رہائشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایسی کئی اسکیمیں بنائی گئی ہیں جن کے تحت مکان کی تعمیر کے لیے نصف خرچ امداد اور نصف قرض کے طور پر دیا جاتا ہے۔ امدادِ باہمی سوسائیٹوں کو بھی گراں قدر امداد دی جاتی ہے۔ مالکان کی سوسائیٹوں کے مقابلے میں دوگنی امداد مزدور سوسائیٹوں کو دی جاتی ہے۔

۱۹۷۶ء میں مساویانہ اجرت کا قانون بنایا گیا تاکہ خواتین مزدوروں کے ساتھ امتیازی سلوک کا خاتمہ کیا جاسکے۔ اس قانون کے مطابق مساوی نوعیت کے کاموں کی مساویانہ اجرت بلا لحاظِ جنس دی جانا ضروری ہے۔ اجرت کے علاوہ دیگر سہولیات کی فراہمی بھی بلا کسی امتیاز کے ہونی ضروری قرار دی گئی ہے۔ اس ضمن میں شکایات کے ازالہ کے لیے دہلی، مدراس اور احمد آباد میں کام کررہی نیم سرکاری اور رضاکار تنظیمیں خاتون مزدوروں کی مدد کرتی ہیں۔

اپنے کام کے تئیں ذوق وشوق رکھنے والے مزدوروں کی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت کی جانب سے "محنت انعامات" بانٹے جاتے ہیں۔ جن کو وزیراعظم کے محنت انعامات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سرکاری شعبے کے زمرے میں کام کرنے والے مزدوروں کو قابل قدر خدمات کے عوض "شرم رتن"، "شرم بھوشن"، "شرم ویر" اور "شرم دیوی" جیسے انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کان کنی سے متعلق انتظامی عملے کو "تحفظ کان کنی" انعامات دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح کے انعامات دیگر صنعتوں سے وابستہ افراد کو بھی مثالی ہمت وجرأت کے اعتراف کے طور پر قومی تحفظ انعامات دیے جاتے ہیں۔ گزشتہ دنوں "شرم ویر" انعام کا نام بدل کر "وشوکرما انعام" کردیا گیا ہے۔ یہ انعام ان کارکنوں کو دیا جاتا ہے جو پیداواری صلاحیت کے اضافے میں قابل قدر خدمات انجام دیتے ہیں۔

حالیہ دنوں میں بیرونی روزگار کا رجحان ہندوستان میں تیزی کے ساتھ بڑھا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت بیرونی ممالک میں تقریباً آٹھ تا دس لاکھ ہندوستانی افراد کام کررہے ہیں۔ ان لوگوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے اور ان کی فلاح وبہبود کو یقینی بنانے کے لیے نقل وطن ایکٹ ۱۹۸۳ء وجود میں آیا۔ اس قانون کے تحت یہ ضروری قرار دیا گیا کہ بیرونی مالکان خواہ وہ سرکاری ادارے ہوں یا نجی تنظیمیں، باقاعدہ تسلیم شدہ ایجنٹوں کے ذریعے ہی ہندوستانی افراد کی بھرتی کریں۔ اس سلسلے میں پروٹیکٹر جنرل آف ایمگریشن اور ہندوستانی سفارت خانوں کے ذمہ داران اجازت نامہ دینے کے مجاز ہیں۔

بندھوا مزدوری کے سدِباب کے لیے بانڈیڈ لیبر سسٹم (ابولیشن) ایکٹ ۱۹۷۶ء کے ذریعے اس بات کو یقینی بنایا گیا کہ اس خرابی کا خاتمہ، قرضوں سے نجات، بازآبادکاری اور دیگر ضروری طریقوں سے کیا جاسکے۔ بندھوا مزدوری کا چلن بطور خاص جن صوبوں میں تھا ان میں آندھرا پردیش، بہار، گجرات، ہریانہ، کرناٹک، کیرالا، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، اڑیسہ، راجستھان، تمل ناڈو اور اترپردیش شامل ہیں۔ اس قانون کے تحت بندھوا مزدوروں کی رہائی کے لیے صوبائی حکومتوں کو براہ راست ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ مرکزی حکومت ریاستی سرکاروں کو مالی امداد بھی فراہم کرتی ہے تاکہ رہا شدہ مزدوروں کی بازآبادکاری، تعلیم وتربیت اور مالی اعانت مناسب انداز سے ہوسکے۔

اندرون ملک ان مسائل سے قطع نظر قومی اور بین اقوامی سطح پر آج کل جو مسئلہ سب سے زیادہ موضوع بحث ہے اور جس پر ہم سب کی فوری توجہ درکار ہے وہ بچہ مزدوری کا افسوسناک چلن ہے۔ روٹی کی تلاش اور پیٹ کے جہنم کو بھرنے کے لیے ہزاروں ننھے منّے بچوں کی زندگی جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ ہوٹلوں، دوکانوں، ورک شاپوں، کارخانوں اور بعض اوقات امیر افراد کے گھروں میں کام کرنے والے دو وقت کی روٹی کی تلاش میں ہر قسم کا استحصال وظلم برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ غریب اور نادار خاندانوں سے تعلق رکھنے والے یہ بچے کام کے دوران کمر توڑ مشقت جھیلتے جھیلتے بچپن کی ساری معصومیتوں سے محروم ہوکر وقت سے بہت پہلے بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ صنعتی ماحول کی کثافت وآلودگی ان کی صحت کو تباہ کردیتی ہے لیکن پیٹ کی خاطر انھیں بندھوا مزدوروں سے بدتر زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ قالین،

تا ہے، ریڈی میڈ کپڑے، پیتل کے برتنوں، پالش، پاؤڈر، کانچ، بجلی کے آلات، الیکٹرانکس گوداموں، آٹو ورکشاپ اور پٹرول پمپوں وغیرہ جیسی کثافت سے بھری جگہوں پر ایک تخمینے کے مطابق تقریباً ۵۵ ہزار بچے کام کرتے ہیں۔ ان جگہوں پر ان سے ۱۲ تا ۱۶ گھنٹے کام لیا جاتا ہے۔ دور دراز جگہوں سے آئے بچے یا دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے بچے تو اکثر اوقات ۲۴ گھنٹے کے ملازم بن جاتے ہیں۔ بعض کارخانوں میں ان بچوں کا سونا جاگنا اور کھانا پینا سبھی کچھ کارخانوں کی چار دیواری میں محصور رہتا ہے۔

خاص طور سے ماچس، آتش بازی، کانچ اور کیمیکلز کے کارخانوں میں کام کرنے والے ان بچوں کی حالت بہت دگرگوں ہے۔ ان کارخانوں میں عام طور سے حفاظتی تدابیر اور احتیاطی اقدامات کی طرف بہت کم دھیان دیا جاتا ہے جس کے سبب بیشتر بچے جان لیوا بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مناسب علاج ومعالجہ کی سہولیات کے فقدان کے نتیجے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ فٹ ویر صنعت میں کام کر رہے چھوٹے بچوں سے سلوشن اور اڈھیسیو جیسی اشیاء چمڑے پر لگوائی جاتی ہیں۔ زیادہ تر کارخانوں میں کام سکھانے کے بہانے ان بچوں سے مفت کام لیا جاتا ہے۔ دو روپے یومیہ سے لے کر دس روپے یومیہ پانے والے یہ بچے کام سیکھنے کے لالچ میں اس منظم استحصال کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

کمزور وپسماندہ طبقات سے تعلق رکھنے والے غریب والدین جو اپنے بچوں کی تعلیم کے کفیل نہیں ہو سکتے یہ سوچ کر اپنے بچوں کو ان کارخانوں میں بھیجتے ہیں کہ اس طرح سے ان کے بچے اپنی اور اپنے والدین کی کفالت کے متحمل ہو سکیں گے۔ جلد یا بدیر زیادہ سے زیادہ اجرت کی لالچ میں وہ بچوں کو ایسے کام کے لیے بھیجنے لگتے ہیں جو اور زیادہ مضرت رساں ہوتے ہیں۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اس رجحان میں کسی طرح کی کمی نظر نہیں آتی۔ اس رجحان کی بنیادی وجہ کمزور طبقات میں پایا جانے والا یہ خیال ہے کہ ان کے جتنے زیادہ بچے ہوں گے اتنی زیادہ ان کے ذریعے سے آمدنی حاصل ہوگی۔ تعلیم سے عدم دلچسپی ان طبقات میں اس قدر پائی جاتی ہے کہ بچوں کی تعلیم کو غیر ضروری عیاشی اور تضیع اوقات تصور کیا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ افراد کی بے روزگاری بھی ان کے اس عمل کو تقویت بخشتی ہے۔ چناں چہ وہ چاہتے ہیں کہ فضول تعلیم میں وقت نہ برباد کر کے جلد از جلد ان کے بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں۔ جو تھوڑے بہت بچے اسکولوں کا رخ کرتے ہیں وہ بھی نچلی سطح کے اسکولوں کی پست حالی کے باعث تعلیم میں خاطر خواہ دلچسپی نہیں پیدا کر پاتے ہیں اور سلسلۂ تعلیم کو بیچ میں ہی منقطع کر کے کسی کارخانے کا رخ کرتے ہیں۔ حالاں کہ اس سلسلے میں قومی سطح پر اعداد و شمار بہت سرسری نوعیت کے ہیں لیکن ایک اندازے کے مطابق تقریباً نصف تعداد تعلیم منقطع کر دیتی ہے۔ خاص طور سے وہ بچے جو پڑھنے میں کمزور ہوں یا جو ایک آدھ مرتبہ کسی کلاس میں فیل ہو جائیں وہ ایسے کارخانوں کا ایندھن بن جاتے ہیں۔ تعلیم منقطع ہونے کے عوامل جو بھی ہوں لیکن مجموعی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ بچہ اسکول نہ جا کر کسی ایسے کارخانے کا رخ کرتا ہے جہاں اسے روزی روٹی کا راستہ نظر آئے۔

ہماری حکومت بچوں کے اس قبیح استحصال کے تئیں اپنی ذمہ داری سے غافل نہیں رہی ہے۔ حکومت نے اس لعنت کے انسداد کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں۔ قانونی تحفظات بھی اس سلسلے میں موجود ہیں تاکہ بچہ مزدوروں کے انسانیت سوز استحصال کو روکا جا سکے۔ علاوہ ازیں چائلڈ لیبر (پروہیبشن اینڈ ریگولیشن) ایکٹ ۱۹۸۶ء کے ذریعہ خطرناک صنعتوں میں بچوں سے کام کرانے کو ممنوع اور کچھ دوسرے پیشوں میں ان کی شمولیت پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں بچہ مزدوری پر قومی پالیسی وضع کی گئی جس میں قانونی انتظامات کے ساتھ ساتھ ان بچوں کی بھلائی کے لیے ایک عمومی ترقیاتی پروگرام اور ان مخصوص علاقوں میں جہاں بچہ مزدوری کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے، پروجیکٹ پر مبنی عملی منصوبوں پر کام شروع کیا گیا ہے۔ ایسے نو علاقوں میں قومی بچہ مزدوری پروجیکٹ شروع کیے جا چکے ہیں۔ کل ملا کر اب تک اس طرح کے ۶۰ سے زائد پروجیکٹ شروع کیے گئے ہیں۔ اس لعنت کی روک تھام کے عملی منصوبوں پر کام کرنے والی رضاکار تنظیموں کو مالی امداد بھی فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عالمی تنظیم محنت کے تعاون سے دو پروجیکٹ آئیپیک IPEC

INTERNATIONAL PROGRAMME ON THE ELIMINATION OF CHILD LABOUR)

اور کلاسپ (CHILD LABOUR ACTION AND SUPPORT PROGRAMME)

بھی چلائے جا رہے ہیں۔ پانچ سال قبل نیشنل لیبر انسٹی ٹیوٹ میں یونیسیف UNICEF کی مدد سے بچہ مزدوری سے متعلق ایک خصوصی سیل کا بھی قیام عمل میں آیا ہے۔ اس مسئلے سے نبرد آزما بین اقوامی، قومی، ریاستی اور رضاکارانہ اداروں کی مشترکہ کوشش یہی ہے کہ تحقیق کے ذریعے کارفرما عوامل کی نشاندہی کی جائے اور خاص طور سے ان مخصوص حالات کا پتا لگایا جائے جن سے یہ بچے مختلف جگہوں پر دوچار ہیں۔ اب تک حاصل ہوئی پیش رفت کے دیکھئے اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ ہم جلد ہی اس مسئلے پر مکمل طور پر قابو پا لیں گے۔

پچھلے چار سالوں کے دوران اقتصادی اصلاحات کے نتیجے میں انقلاب آفریں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ اقتصادی پالیسی میں نرم روی کے مثبت اثرات ہماری معیشت پر مرتب ہوئے ہیں۔ برآمدات اور غیر ملکی کرنسی ذخائر میں خاطر خواہ اضافے کے ساتھ ساتھ ہمارے ملک میں بیرونی سرمایہ کاری کی منظوری میں زبردست اضافہ ہوا ہے جس کے لازمی نتیجے کے طور پر کلیدی شعبوں میں تیز رفتار ترقی کے امکانات روشن ہوئے ہیں۔ نئی صنعتی پالیسی بھی اس سلسلے میں ایک اہم قدم ہے۔ اس بات کے لیے انتھک کوششیں کی جا رہی ہیں کہ ہندوستانی صنعت کو عالمی صنعت معیار کے مقابل لایا جائے۔ چناں چہ سرمایہ کاری کے غیر ضروری ضابطوں کے خاتمے اور تکنیکی ترقی کی مدد سے اس سمت اہم پیش رفت ہوئی ہے۔ ان سبھی اقدامات کے نتیجے میں قومی پیداوار بڑھے گی جس کے براہ راست فوائد مزدور طبقے کو حاصل ہوں گے۔

یوجنا، نئی دہلی

۱۹۹۱ء کی نئی صنعتی پالیسی میں سرکاری شعبے کے لیے جو اہم فیصلے کیے گئے تھے ان میں ایک یہ تھا کہ سرکاری شعبہ میں حصص میں کمی لائی جائے تاکہ عام لوگ ان میں دلچسپی لے سکیں اور خاص طور سے ان اداروں کی ملکیت میں مزدوروں کی شمولیت ہو سکے۔ اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ مزدوروں کی انتظامیہ میں شرکت کے بعد ملکیت میں شمولیت ایک اہم اقدام ہے جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے۔

اگر ہم ملک کی موجودہ صنعتی صورت پر غور کریں تو یہ بات سامنے آئے گی۔ مجموعی اعتبار سے بہتر صنعتی ماحول پیدا ہوا ہے۔ ہڑتالوں اور لاک آؤٹ وغیرہ میں کمی آئی ہے اور صنعتی امن کی وجہ سے کام کے دنوں کا نقصان کم سے کم ہو رہا ہے۔ اجرتوں کی ادائیگی اور سماجی تحفظ کے نظام میں باضابطگی آئی ہے۔ غیر منظم شعبے جیسے کہ زرعی مزدوروں اور گھریلو ملازمین میں اپنے حقوق کے تئیں تعمیری شعور پیدا ہوا ہے۔ خاتون اور بچہ مزدوروں کی حالت کو قانونی اور فلاحی کارروائی سے بہتر بنانے اور ترقی کے عمل میں ان کی شمولیت کے لیے مسلسل کوششیں کی جا رہی ہیں۔

مزدوروں کے معیار میں بہتری لانے کے لیے بین اقوامی تنظیم محنت کی سفارشات پر عمل درآمد اور بین اقوامی تنظیم محنت کے تمام غیر توثیق شدہ ضابطوں پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ کئی مخصوص اداروں کی جانب سے مزدوروں کے لیے تربیتی اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں اور تقریباً سبھی جگہ ترغیباتی وظائف کی رقم میں حالیہ دنوں میں اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ فلاحی اقدامات کے اس تسلسل میں بدلتے معاشی ماحول کے ساتھ اور تیزی آنے کی توقع ہے۔ ٹریڈ یونین تحریک کے وہ گوشے جو معاشی اصلاحات اور نرم روی کی پالیسی کے تئیں ابتدا میں شاکی تھے، اب آہستہ آہستہ نئے حقائق کو تسلیم کر کے اپنے اندر مطابقت پیدا کر رہے ہیں۔ حکومت کی فلاحی کوششوں اور نرم روی کی پالیسی میں ان کا اعتماد قابل لحاظ حد تک بڑھا ہے۔ یہاں تک کہ روایتی طور پر نظریاتی حریف جماعتیں بیرونی سرمایہ کاری اور کثیر ملکی کمپنیوں کو خوش آمدید کہہ رہی ہیں۔

خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں یہ عمل سوشلسٹ ممالک کے برعکس بغیر کسی تصادم اور افراط و تفریط کے ہو رہا ہے۔ مزدور حلقوں میں اس بات کے لیے بھی اطمینان پایا جاتا ہے کہ اروگوئے مذاکرات اور عالمی تنظیم تجارت کی سطح پر ہماری حکومت نے مزدور طبقہ کے مفادات سے پہلو تہی نہیں برتی اور ہمیشہ مزدوروں کی فلاح و بہبود کے تعلق سے تعمیری رویہ اپنایا ہے۔

عالمی تنظیم تجارت نے بہت سے ایسے ضابطے وضع کیے ہیں جن کی صحیح صحیح توجیہہ آنے والے وقت کے حقائق کی روشنی ہی میں ممکن ہو سکے گی۔ ان میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بین اقوامی معیارِ محنت کو فروغ دینے کے لیے مناسب ترین طریقۂ کار کیا ہو سکتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کا ماننا ہے کہ ہمارے لیے رہنمایانہ خطوط کی پابندی ضروری ہے اور ان رہنمایانہ خطوط میں آلودگی اور سبسڈی وغیرہ سے متعلق شرائط کے علاوہ اور کسی شرط کو شامل نہیں کیا جانا چاہیے۔ لیکن دوسری جانب بیشتر ترقی یافتہ ممالک اور ان کے ہمنواؤں کا زور اس بات پر ہے کہ غور اس بات پر کیا جانا چاہیے کہ کس قسم کے وسائلِ محنت پیداوار کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ ان ممالک کی کوشش ہے کہ صرف وہی ممالک مساویانہ تجارتی روابط کے اہل قرار دیے جائیں جہاں قوانین محنت، شرح اجرت اور مزدوروں کو فراہم کیے جانے والے دوسرے فوائد عین ترقی یافتہ ممالک کی مانند ہوں۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ معیار محنت کے حامی ترقی یافتہ ممالک مزدوروں کے استحصال کے لیے اپنی تشویش میں حق بجانب ہیں۔ لیکن اس دلیل کو معاشی سبقت کا حربہ بھی تصور کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کوشش کے نتیجے میں اگر ترقی پذیر ممالک کو مساویانہ مواقع نہ حاصل ہوئے تو ان کا معیار محنت اور گر سکتا ہے۔

خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں بچہ مزدوری کے خلاف تعمیری رویہ پایا جاتا ہے اور قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں بھی خاطر خواہ پیش رفت ہوئی ہے۔ چناں چہ دیگر ترقی پذیر ممالک کے ساتھ ساتھ ہماری حکومت کا بھی ماننا ہے کہ ہمارے یہاں مزدوروں سے متعلق اعلا معیارات اسی انداز میں رواج پا سکتے ہیں کہ جب ہم مغربی ممالک کے مساوی ترقی حاصل کریں اور اسی مقصد کے حصول کے لیے پہلی شرط یہی ہے کہ ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان تجارتی روابط بلا روک ٹوک جاری رہیں اور یہ سوچ حقیقت پر مبنی بھی ہے کہ معیارِ محنت کو کسی ایک سطح پر جامد نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ ہمہ پہلو اقتصادی ترقی معیارِ زندگی اور بہتر کام کے ماحول کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ہندوستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک یہ ضرور چاہیں گے کہ ہمارے یہاں نہ صرف مزدوروں سے متعلق ضابطے بلکہ مزدوروں کا مجموعی معیار زندگی ترقی یافتہ ممالک کے مساوی ہو جائے، لیکن ایسا تب ہی ممکن ہوگا جب ہماری معیشت روز افزوں ترقی کرے۔ صرف اسی صورت میں مزدوروں کے کام کے ماحول میں بہتری آ سکے گی۔ خاص طور سے اس سلسلے میں ہندوستان جیسے ملک سے بہتر امید کی جا سکتی ہے جہاں صنعت کاری، مزدور تحریک اور جمہوری اداروں کی کارکردگی کی باقاعدہ روایت موجود ہے۔ فعال جمہوری اداروں کی موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ مزدوروں سے متعلق معیاروں کو خود غرضانہ تجارتی مفادات یا اونچے طبقے کی ساہوکارانہ ہوس کی تسکین کے باعث کم نہیں رکھا گیا ہے بلکہ ایسا صرف اور صرف معاشی مجبوریوں کے باعث ہے۔ ہمارے ملک کے حالات ان ممالک سے یکسر مختلف ہیں جہاں جمہوری ادارے فعال و متحرک نہیں ہیں اور جہاں مزدوروں کا معیار زندگی منفی پالیسیوں کی وجہ سے پست ہے۔

نئے معاشی نظام کے تناظر میں مذکورہ بالا حقائق اور اقدامات و مسائل کی روشنی میں ہم بہبودئ مزدور کی سمت و رفتار کا اندازہ کر سکتے ہیں اور بہ آسانی اس نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں کہ عالمی معاشی نظام کے موجودہ

باقی صفحہ پر

عبدالسلام صدیقی

ہندوستانی آئین کے معمار ڈاکٹر امبیڈکر

بیسویں صدی ہندوستان کی بیداریِ نو کے لیے مشہور ہے۔ اس دوران ملک میں ایک نئی بیداری اور سماجی شعور پیدا کرنے میں جن شخصیتوں نے اپنا سب کچھ قربان کیا ان میں "امبیڈکر جی" کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ان کی زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت تھی۔ انھوں نے تقریر و تحریر اور اپنے کردار و عمل سے دبے کچلے اور ستم زدہ طبقوں میں ایک روح پھونکی، ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی، ساتھ ہی ساتھ ان کے اندر اپنے حقوق کے لیے لڑنے کا عزم پیدا کیا۔

"بھارت رتن" سے سرفراز ڈاکٹر امبیڈکر متنوع صفات کی حامل شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے قومی یک جہتی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کے لیے زندگی وقف کر دی۔ سماجی ترقی اور بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لیے وہ ہمیشہ جدوجہد کرتے رہے اور مخالفت کے باوجود مساوات و سوشلزم کے اپنے نصب العین سے کبھی نہیں ہٹے۔ انھوں نے ملک میں آزادی، اتحاد اور رواداری کا ماحول قائم کرنے میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ انھوں نے تاریخ، اقتصادیات، سیاسیات اور قانون جیسے مضامین میں اعلا تعلیم حاصل کی۔ نیز برطانیہ و امریکہ کی مشہور ترین یونیورسٹیوں سے اعلا ڈگریاں بھی حاصل کیں۔

۱۹۲۷ء میں جب سب سے پہلے ڈاکٹر امبیڈکر نے استحصال زدہ اور انسانی حقوق سے محروم سماج کی بہبود کے لیے آواز اٹھانا شروع کی تو ان کی حمایت کرنے کی بجائے انتہا پسند اور فرقہ پرست عناصر نے ان کی تذلیل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہندوستان کا یہ بہادر سپوت سماج کی فلاح و بہبود کے اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹا، بلکہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور سماج میں برابری لانے کے لیے اپنی پوری طاقت لگا دی۔ انھوں نے اپنے قول و عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ برتری کسی مخصوص ذات میں پیدا ہونے پر منحصر نہیں اور نہ ہی اس پر کسی مخصوص مذہب کی اجارہ داری ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کے موجودہ آئین کو وجود میں لانے کے لیے ان کے رول کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ آئین تیار کرنے والی ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے انھوں نے ۲۹ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۵ نومبر ۱۹۴۹ء تک جس محنت اور لگن سے آئین کا مسودہ تیار کیا اس کے لیے ان کی بہت تعریف کی گئی۔

"بی۔ آر۔ امبیڈکر" کی آئین سازی پر ان کے ذہن و زندگی اور امنگوں نے بلاشبہ اپنی گرفت رکھی تھی۔ ۱۹۵۰ء کا آئین ان کی ذاتی جیت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ زندگی کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ افراد کی ضرورتوں اور حوصلوں میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ سماجی حالات بھی بدلتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اپنے مکمل اور مربوط آئین کو بھی ایک بے جان تحریری مجموعہ بنانے سے اجتناب کیا۔ آئین کے آرٹیکل ۳۶۸ کے تحت آئین میں ترمیم کا اختیار پارلیمنٹ کے حوالے کر دیا۔ آرٹیکل ۳۶۸ کے تحت پارلیمنٹ کا یہ اختیار لامحدود نہیں تھا بلکہ راہبر اصولوں کی بالادستی برقرار رکھنے کی خاطر آئینی ترمیم کے جائزے لینے کے حق و اختیار بہرحال عدلیہ کو دیئے گئے تھے۔

"امبیڈکر جی" مہاتما بدھ، سنت کبیر، جیوتبا پھولے کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ اسی وجہ سے وہ ایسے سماج کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں مساوات، آزادی اور بھائی چارے کی حکمرانی ہو۔ وہ دلت، پامال اور استحصال زدہ طبقے کا حوصلہ برابر بڑھانے کی کوشش کرتے رہے۔ نیز برتری اور کمتری کے جذبے سے سماج کو نجات دلانا چاہتے تھے۔ ہندوستان کے اتحاد، آزادی اور سالمیت پر بہت زور دیتے تھے۔

"امبیڈکر" ایک منصف مزاج انسان تھے انھوں نے ہمیشہ ناانصافی، ظلم و ستم اور استحصال کے خلاف جدوجہد کی۔ وہ ہر مسئلے کا حل آئین کی روشنی میں تلاش کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ: "اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ملک میں طوائف الملوکی پھیل جائے گی۔" ان کا یقین تھا کہ برطانیہ میں غیر تحریر شدہ روایات کی وجہ سے پارلیمنٹ کی بالادستی کوئی خرابی نہیں پیدا کر سکی۔ لیکن ہندوستان میں یہ روایات موجود نہیں تھیں، ان کو پروان چڑھانے کا فرض بھی تحریری آئین پر عائد ہوتا ہے اس لیے انھوں نے پارلیمنٹ کی جگہ آئین کی بالادستی کا اصول

E ۳۴۲ برہمپترا ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۶۷

یوجنا، نئی دہلی

اختیار کیا اور عدلیہ کو قانون سازی کی تشریح و تعبیر کا حق دے دیا۔ ہندوستانی آئین میں عاملہ، عدلیہ اور قانون ساز اداروں کے درمیان اندرونی تناسب قائم کرکے آئین کے بنیادی ڈھانچے اور راہبر اصولوں کو ترمیم و تنسیخ سے ماورا قرار دے دیا جس پر اب بھی عمل ہو رہا ہے۔

"ڈاکٹر امبیڈکر" نے آزاد ہندوستان کو بنیادی حقوق، جمہوری اور ضمیر کی آزادی کے ان تصورات کا تحفہ دیا جن پر آج ملک کی جمہوریت کی ساری عمارت کھڑی ہے۔ اس عمارت کی مضبوطی اور دلکشی کے حقیقی معمار" امبیڈکر جی " اس لیے ہیں کیوں کہ مسودہ کمیٹی نے آئین کا جو مسودہ مرتب کیا تھا اس کا شاید ایک ایک حرف ان کے ذہن میں ڈھل کر ان کے قلم سے نکلا تھا۔ انھوں نے گاؤں کی جگہ فرد کو بنیادی اکائی قرار دینے پر زور دیا اور اس مشن میں پورے طور سے کامیاب بھی ہوئے۔ اس طرح ہندوستان واقعی بیسویں صدی کی روشن خیالی کو قبول کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اس وقت ساری دنیا میں فرد کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء ہی میں ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو ایک فرد کی حیثیت سے وہ سب کچھ دے دیا تھا جو بیسویں صدی کی آخری دہائی میں دنیا کے عوام ہر جگہ حاصل کر رہے ہیں۔ یہ شخصی آزادی کے زبردست حامی تھے اس سلسلے میں ان کا یہ نظریہ بڑی اہمیت کا حامل ہے:

"سماج میں رہنے کی وجہ سے انسان کی شخصیت معدوم نہیں ہو سکتی۔ اس کی ایک آزادانہ زندگی ہے اور آزادانہ وجود، اس کا وجود ہی شخصی ترقی کے لیے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ قومیں شخصی آزادی کو سلب نہیں کرتیں۔"

انھوں نے آزادی اور اخوت پر ہمیشہ زور دیا جو جمہوریت کی بقا کے لیے لازمی ہے۔ درج فہرست اقوام و قبائل اور پسماندہ ذاتوں کے افراد کو خود مختاری اور خود اعتمادی کی بنیاد پر اوپر اٹھنے کے لیے ہمیشہ متوجہ کیا۔ ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ حقوق و مسائل سے محروم افراد کو ترقی کرنے کا موقع ملے اور ملک خوش حال بنے۔

ڈاکٹر امبیڈکر ہمیشہ مذہب، ذات اور علاقہ پرستی سے بلند ہو کر قومی یک جہتی کو مستحکم کرنے پر زور دیتے رہے۔ ان کا یقین تھا کہ مذہب انسانیت کو اختیار کیے بغیر نہ تو یک جہتی قائم رہ سکتی ہے اور نہ ہی جمہوریت زندہ رہ سکتی ہے۔ جمہوریت کی آواز ہی سب کچھ ہے۔ سماج میں جب افراد کو تحریر و تقریر اور اپنے رسم و رواج نیز مذہبی امور کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے تو اس سے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ میل ملاپ کو تقویت ملتی ہے۔ قومی یک جہتی پر زور دیتے ہوئے ایک بار انھوں نے کہا تھا:

"اکثریتی طبقے کا یہ عظیم کام ہوگا کہ وہ ہندوستان میں رہنے والے سبھی طبقوں کو اتحاد کی لڑی میں پرونے کی کوشش کریں، اگر مستقل اتحاد قائم کرنا ہے تو یہ بھائی چارے کے جذبات پر منحصر ہونا چاہیے یعنی ایسے جذبے ہونے چاہیے جن کی مدد سے روحانی اتحاد قائم کرنے میں مدد ملے۔" (ڈاکٹر امبیڈکر)

قومی یک جہتی کے ساتھ انھوں نے قومیت پر بھی زور دیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ بغیر قومیت کے جذبے کے قوم پرستی نہیں پیدا ہو سکتی۔ ان دونوں کے لیے وہ سماجی اصلاح کو بے حد ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ: "سماجی اصلاح کے بغیر حقیقی قومیت ممکن نہیں۔" اس کے ساتھ انھوں نے ذات پات' چھوا چھوت اور اونچ نیچ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ: "ذاتیں ہندو سماج کی اقتصادی اور سماجی تنظیم میں حائل ہوتی ہیں اس لیے انھیں توڑ دینا چاہیے۔"

آزادی کے بعد سماج میں رونما ہونے والی خرابیوں کو دیکھ کر وہ بہت فکرمند ہوئے اور انھوں نے واضح طور پر کہا:

"مجھے پڑھے لکھے لوگوں نے برباد کر دیا ہے۔ ان لوگوں سے امید تھی کہ پڑھ لکھ کر اعلا تعلیم حاصل کرکے سماج کی خدمت کریں گے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ غلام، کلرکوں، افسروں اور سیاست دانوں کی ایک بھیڑ اکٹھی ہو گئی ہے جو سماجی خدمت کے بجائے اپنا پیٹ پالنے میں لگی ہے۔" (ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر)

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر جنھوں نے ہندوستان کا آئین بنایا اور ملک کے اتحاد، آزادی کو دائمی بنانے پر زور دیتے رہے، یہ چاہتے تھے کہ جیسے بھی ممکن ہو ہندوستان میں مثالی سماج کے قیام کو یقینی بنایا جائے۔ آج جب کہ ہم بیسویں صدی کی آخری دہائی میں سانس لے رہے ہیں۔ شعر و ادب، سیاسی و سماجی فلسفوں اور انسانی ذہن میں فرد کی اہمیت اور تقدیس کو مرکزی درجہ حاصل ہوتے جا رہا ہے۔

فرد کی اہمیت، عزت و وقار کے لیے ان کی فکرمندی نے ہندوستانی آئین کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ ان کی اپنی زندگی کے تجربے اور احساسات کا نتیجہ تھی۔ ان کے شعور میں انسانیت اور انسان دوستی کی جو روشنی جلوہ گر تھی وہ ہر ظلمت پسندی سے لڑ کر برابر فتح حاصل کرتی رہی، لیکن ہندوستان کے آئین سازی ان کی سب سے بڑی کامیابی تھی جس کی وجہ سے امبیڈکر ہندوستان کے ماضی سے نکل کر مستقبل کا ایک اٹوٹ حصہ بن گئے۔ ایسے مستقبل کا حصہ جس کی تعمیر خود انھوں نے شروع کی تھی جو آج بھی ایک فرد کو امید اور اعتماد کے سہارے فراہم کرتا ہے، حوصلہ عطا کرتا ہے اور یہ یقین دلاتا ہے کہ فرد ہی سب سے بالا ہے اور جو ہے وہ بھی فرد کے لیے اس کے ذریعے اور فرد کے مفاد میں ہے۔ کیوں کہ فرد ہی انسانی زندگی کی اکائی ہے۔

آج کے بدلے ہوئے دور میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر کے بنائے ہوئے راستے پر گامزن ہوں اور ہندوستان کو خوش حال، متحد اور طاقتور بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں یہی ان کو ہمارا سچا اور صحیح خراجِ عقیدت ہوگا۔ ●

منزل ایک راہی دو:
نہرو اور آزاد

تحریک آزادی کی شمع کو منزل مقصود پر پہنچانے والوں میں جہاں دیگر رہنماؤں کے نام ہیں، وہاں دو نام جو خاص طور پر قابل ذکر ہیں وہ ہیں آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد۔ دونوں ایک گاڑی کے دو پہیوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ جو اپنا الگ الگ وجود رکھنے کے باوجود ایک ہی سمت میں رواں دواں رہتے ہیں اور یہ گاڑی ہے تحریک آزادی کی۔

اس گاڑی کو جہاں دوسرے رہنما بھی آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ دونوں برابر کی رفتار سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔ گو دونوں کی عمروں میں صرف ایک سال کا فرق ہے۔ لیکن دونوں کی تحریک شمولیت میں تقریباً ایک دہائی کا فرق ہے۔ لیکن جب حالات نے ایک دوسرے کے قریب پہنچایا، تو پھر مرتے دم تک الگ نہیں ہوئے۔

نہرو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے، جب کہ مولانا آزاد ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ ایک کا تعلق روشن خیال پنڈت گھرانے سے تھا، تو دوسرے کا مشرقی و اسلامی اقدار سے وابستہ تہذیب سے۔ ۱۹۰۵ء میں جب نہرو ۱۵ برس کی عمر میں لندن کے اسکول ہیرو میں داخلہ کے لیے گئے تو اس وقت آزاد لکھنؤ میں الندوہ کے ایڈیٹر تھے۔ ۱۹۱۲ء میں جب نہرو بیرسٹری کر کے لوٹے، تو آزاد نے اپنا مشہور زمانہ اخبار الہلال جاری کیا۔ اس وقت آزاد کی عمر ۲۴ سال تھی تو نہرو ۲۳ سالہ نوجوان تھے۔

۱۹۱۶ء میں جب نہرو نے پہلی بار گاندھی جی سے ملاقات کی تو اس وقت مولانا رانچی میں نظر بند کیے گئے تھے۔ لیکن بُعدِ زمانہ آہستہ آہستہ ختم ہوتا چلا گیا اور نہرو اپنے تیز قدموں سے چل کر مولانا کے قریب پہنچ گئے۔

۱۹۲۰ء تحریک آزادی کا وہ دور تھا جب دونوں رہنماؤں نے عملی جدو جہد میں حصہ لیا اور دونوں تحریک کے اہم رہنماؤں کے طور پر ابھرے۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا آزاد پہلی بار کانگریس کے صدر بنائے گئے اور لگاتار سات سال تک اس کے صدر رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پنڈت نہرو جو مولانا آزاد کے قریب آئے تھے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں انھیں پہلی مرتبہ آزاد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ نہرو کو کانگریس کمیٹی میں دوبارہ شامل کرنے میں مولانا نے ذاتی دلچسپی لی تھی۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"ایک نمایاں شخص جنھیں ڈاکٹر راجندر پرشاد کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا تھا، جواہر لال نہرو تھے۔ میں جواہر لال کو کمیٹی کو واپس بلا لایا۔"

یہ معاملہ کانگریس ورکنگ کمیٹی تک محدود نہ رہا، بلکہ جب سات سال کی لگاتار صدارت سے اوب کر مولانا اس عہدہ سے الگ ہونے لگے تو انھوں نے نہرو کو صدر بنانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ اس بارے میں خود مولانا لکھتے ہیں:

"مجھے اس بات کی فکر تھی کہ میرے بعد جو صدر ہو وہ میرے نقطۂ نظر سے متفق ہو اور اسی پالیسی پر عمل کرے جسے میں نے اختیار کیا تھا۔ اس کی موافقت اور مخالفت میں تمام دلیلوں کو جانچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ جواہر لال کو صدر ہونا چاہیے۔"

(ہماری آزادی)

مولانا کی مندرجہ بالا سطور سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں کے نقطۂ نظر میں کس قدر یکسانیت تھی اور ساتھ ہی عملی اقدار بھی مشترک تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد نے نہرو کو اپنا جانشین چنا۔

۱۹۲۳ء کی یہ پہلی رفاقت آزاد کے انتقال (۱۹۵۸ء) تک قائم رہی۔ اس ۳۵ سال کے عرصے میں کتنے ہی موڑ آئے اور ان سالوں میں بار بار اختلاف رائے بھی ہوا لیکن دونوں نے فیصلہ کن مراحل پر ایک دوسرے کی تائید کی۔ یہ اختلافات نہ ذاتی تھے نہ اصولیاتی البتہ ان کو ہم نظریاتی اختلافات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جو عموماً دونوں طبیعتوں کی سوچ کا اختلاف تھا۔ بہت سی باتوں کو آزاد اور نہرو اپنے اپنے طور پر سوچتے تھے، لیکن دونوں کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ تھا، قومی آزادی۔

دونوں شخصیتوں میں جو کچھ تھوڑا بہت نظریاتی اختلاف کبھی ہوا وہ دونوں کے مخصوص پس منظر اور مزاج کے سبب تھا ـ ـ ـ

ایک کا تعلق یوروپی و آزاد خیال ماحول سے تھا۔ تو دوسرے کا ماحول خاندانی روایات اور مشرقی تہذیب کا نمونہ تھا۔ ایک پر مغربی فکر غالب تھی تو دوسرے پر مشرقیت حاوی تھی۔ لیکن دونوں کا جذبہ ایک ہی تھا اور وہ تھا جذبۂ آزادی۔ مولانا آزاد نہایت سنجیدہ و متین جب کہ نہرو

مکان نمبر ... گلی ... بلیماران، دہلی

بڑمزاج، مولانا خلوت پسند تو نہرو جلوت کے دلدادہ۔ نہرو کے یہاں دعوتیں و ضیافتیں ہوتیں اور قہقہوں کی بارش رہتی۔ جب کہ مولانا آزاد سے ملاقاتی آتے، ملاقات کرتے اور مختصر وقت میں اپنی بات کرکے چلے جاتے۔ دونوں کی اس طبیعت کا فرق ایک واقعہ سے واضح ہوجاتا ہے۔

ظ انصاری اپنی کتاب "ابوالکلام آزاد کا ذہنی سفر" میں ایک واقعہ لکھتے ہیں۔

۱۹۵۶ء عید رمضان کا چاند ہوا۔ تو میں اتفاقاً کرنل بشیر حسین زیدی کے بنگلے ہیلی روڈ پر موجود تھا۔ چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی..... پرائم منسٹر ہاؤس کا فون تھا۔ قدسیہ بیگم زیدی نے شوہر کو آواز دی۔ پنڈت جی ہیں۔ جلدی آئیے۔

اُدھر سے، زیدی، تم نے مجھے بتایا نہیں کل عید ہے؟ عید کے موقع پر کچھ دوستوں کو بلایا جاتا ہے، اب تم یوں کرو کہ کل دوپہر عید کا لنچ بیگم صاحبہ کے ساتھ یہیں کھاؤ۔ بچے یہاں ہوں گے تو ساتھ لانا۔

اِدھر۔ جی ضرور، ضرور

اور پھر باہم تبصرہ "ایک پنڈت جی ہیں کہ عید کی دعوت پر اصرار اور ایک ہمارے مولانا آزاد کہ بسم اللہ کے گنبد میں بند رہتے ہیں۔ بھولے سے بھی کسی کو دعوت نہیں دینے والے۔"

دونوں حضرات نے ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح جانچا اور پرکھا۔ یہ دونوں کے نہایت پرخلوص تعلقات کا نتیجہ ہی تھا کہ دونوں نے برملا ایک دوسرے کے بارے میں کھلے الفاظ میں رائے زنی کی اور کسی نے اس کا برا نہیں مانا۔ نہرو نے اپنی سوانح موسوم بہ ڈسکوری آف انڈیا میں اور اپنی دیگر تحریروں میں مولانا آزاد اور ان کی شخصیت کے بارے میں جابجا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح مولانا آزاد نے بھی اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم کے علاوہ اپنے خطوط میں پنڈت نہرو کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مولانا آزاد نہرو کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جواہر لال نہرو کی طبیعت بھی انتہائی جذباتی واقع ہوئی ہے۔ اس لیے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات سے کام کرتے رہتے تھے۔ (غبار خاطر)

ایک دوسری جگہ نہرو کے بارے میں مولانا آزاد نے اس طرح اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، جس سے قلبی لگاؤ بھی ظاہر ہوتا ہے اور رشتوں کا سچاپن بھی جھلکتا ہے۔

"جواہر لال میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی قومی زندگی کو ترقی دینے میں کسی سے کم حصہ نہیں لیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے محنت کی ہے اور تکلیفیں اٹھائی ہیں اور آزادی کے بعد وہ ہمارے قومی اتحاد اور ترقی کی علامت بن گئے ہیں۔ پھر بھی مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ یہی نہیں، بسا اوقات وہ معاملوں کے خالص نظری پہلو سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ واقعی صورت حال کا صحیح اندازہ نہیں کرپاتے۔" (انڈیا ونس فریڈم)

مولانا آزاد نے ان سطور میں جس طرح کا انداز اختیار کیا ہے وہ ایک سچا دوست ہی دوسرے کے لیے کرسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح نہرو بھی آزاد کی شخصیت اور عام طور پر ان کے جذبات سے عاری رہنے والے مزاج کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں۔

"ان کی ذات غیر معمولی علمیت اور حیرت افزا ذہانت کی حامل تھی جس پر کبھی جذبات یا تعصب کا غلبہ نہیں ہونے پاتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ ان کی شخصیت ایک ایسا آئینہ تھی جس میں ہندوستان کی گوناگوں تہذیب کا عکس پایا جاتا ہے۔"

"وہ انتہائی مغلوب العقل ہیں۔ انتہائی مہذب ہیں جن کو جذبات بہا کر نہیں لے جاسکتے۔"

(Selected Works) XII, 29

"ایک سخت بیرونی غلاف ان اندرونی کیفیات کو چھپا لیتا ہے۔" یہی وہ بیرونی غلاف تھا جو پنڈت نہرو جیسے قریبی دوست سے بھی ایک پردہ بنائے رکھا تھا۔ اسی سبب نہرو نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"میں ذرا سا تکلف محسوس کرتا ہوں۔ مولانا سے بحث کرنے میں میں اپنا مخصوص انداز بحث آزادانہ اور بے تکلف طور پر ان کے ساتھ استعمال نہیں کرسکتا کہ کہیں ان کو برا نہ لگ جائے۔ بعض رسمی قیود ہیں جن کو بہرحال برتنا پڑتا ہے۔"

(Selected works Vol.XII,P 297

مندرجہ بالا آرا سے ایک بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ایک دوسرے سے انتہائی تعلق ہونے کے باوجود دونوں جذبات کے معاملے میں ایک دوسرے کی ضد تھے اور اس بات کا علم دونوں ہی کو تھا۔

ایک دوسرے کے علم، وسیع النظری اور وسیع المشربی کے بارے میں دونوں حضرات نے بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ نہرو مولانا آزاد کے بارے میں ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں۔

"تاریخ اقوام ماضیہ آپ کا درق بصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے اور پھر یہ وسیع علم آپ کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود ہے۔ آپ کا ذہن مدلل اور سلجھا ہوا ہے۔"

نہرو باوجود اختلاف رائے ہونے کے مولانا کی رائے کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔ اس کا اندازہ ہم درج ذیل اقتباس سے بخوبی کرسکتے ہیں۔

"قطع نظر اس کے کہ ہم نے آپ کی رائے سے اختلاف کیا۔ بالاتفاق ہم ہمیشہ یہ ملحوظ خاطر رکھتے رہے کہ آپ کی رائے بہت زیادہ وقیع ہوتی ہے۔"

مولانا آزاد بھی نہرو کی قابلیت و صلاحیت کے قائل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے نہرو کو پہلے کانگریس ورکنگ کمیٹی میں شامل کیا اور پھر اپنے بعد کانگریس کی صدارت کے لیے ان کا نام تجویز کیا اور اس کے لیے گاندھی جی کو بھی ہموار کرلیا۔

قلعہ احمد نگر میں دونوں کی اسیری نے بھی ان کے آپسی تعلقات کو مزید استوار کیا۔ اور دونوں نے ایک دوسرے کو مزید اچھی طرح جانا اور پہچانا۔ ایام اسیری میں دونوں حضرات نے جو خطوط باہر کی دنیا کو لکھے۔ وہ ان کے آپسی ذاتی تعلقات اور آپسی محبت و رکھ رکھاؤ کے آئینہ دار ہیں۔ مولانا آزاد چینی چائے کے رسیا ہی نہیں بلکہ عاشق تھے۔ اس بات سے نہرو اچھی طرح واقف تھے۔ جب کسی سبب سے چینی چائے ملنے میں دقت ہوئی تو ایک سچے دوست کی طرح نہرو بے چین ہوگئے اور انھوں نے اپنی بہن کرشنا کو لکھا۔

"مولانا کی ایک خدمت بھی شاید تم انجام دے سکو! چینی چائے WHITE JASMINE

سکے وہ صرف وہ شائق ہیں۔ چار بجے صبح کے لگ بھگ، اتنا کبھی کبھی دوسرے وقتوں میں بھی وہ اسے تنہا ہی پیتے ہیں۔ اس کا جو ذخیرہ ان کے ساتھ تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ یہاں یہ چائے ملتی نہیں بمبئی میں مل سکے تو اس کا ایک ڈبہ مہربانی کر کے بھیج دو۔

"وہائٹ جیسمن نہ مل سکے تو اس سے قریب تر ہی جو چائے مل سکے تو بھیج دینا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خاصی قیمتی بھی ہوگی۔"

نہرو کی چائے کی عادت کے بارے میں مولانا کی رائے تھی کہ

"جواہر لال نہرو بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں۔ خواص یورپ کے ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی۔"

نہرو کی ذوقِ باغبانی کے سلسلے میں مولانا جیل سے تحریر کرتے ہیں۔

"ہم سب یہاں آئے تو صحن بالکل چٹیل میدان تھا۔۔۔ خیال ہوا کہ باغبانی کا مشغلہ کیوں نہ ہو۔ جواہر لال۔۔۔ فوراً کمر بستہ ہو گئے اور اس خرابے میں رنگ و بو کی تعمیر کا سروسامان شروع ہو گیا۔"

"جواہر لال صبح و شام پھاوڑا اور کدال ہاتھ میں لیے کوہ کندن و کاہ برآوردن میں لگے رہتے۔"

انھیں اسیری کے ایام میں آزاد کی پابندیٔ وقت کے مزاج کا گلہ نہرو اس طرح دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔

"مولانا ہیبت ناک حد تک وقت کی پابندی کرتے ہیں کہ ہم سب لحظہ بہ لحظہ چوکنا رہتے ہیں کہ کسی وقت چند سیکنڈ کی بھی دیر نہ ہو جائے۔ بہت سے لوگوں کو جن کی عادتیں اور جن کے مذاق ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں ایک جگہ لا کر بند کر دینا عجیب سی مگر دلچسپ بات ہے۔"

قید و بند کی صعوبتوں کے بعد آزادی کے قرب کا زمانہ آیا۔ یہ دور اس تحریک کا انتہائی نازک ترین دور سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ آزادی کی اساس تقسیم وطن پر رکھ دی گئی تھی۔ مولانا آزاد کسی بھی قیمت پر ملک کی تقسیم پر راضی نہ تھے، جب کہ جواہر لال نہرو آئندہ کے حالات کا اندازہ لگا کر اس ناگزیر تاریخی عمل کے لیے بادلِ ناخواستہ

تیار ہو گئے تھے۔ تقسیم وطن جیسے اہم مسئلے پر قطعاً جداگانہ رائے بھی ان دو دوستوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکی۔ ملک تقسیم ہوا لیکن دونوں حضرات کے دل تقسیم نہ ہوئے۔

بہرحال یہ دونوں دوست گاندھی جی کے ساتھ مل کر ایک مثلث بناتے ہوئے ملک کو آزادی کی دہلیز تک لے آئے۔ نہرو ملک کے پہلے وزیر اعظم چنے گئے۔ اس چناؤ میں بھی پس پردہ مولانا آزاد ہی کا ہاتھ تھا اور جس طرح آزاد نہرو کو ورکنگ کمیٹی میں لائے تھے۔ نہرو ان کو اپنی کابینہ میں لے آئے۔ گو نہرو کی حیثیت وزیر اعظم کی تھی اور مولانا آزاد صرف ایک وزیر تھے۔ لیکن نہرو ان کی رایوں کا ہمیشہ احترام کرتے رہے اور ان کی دوستی اپنی جگہ برقرار رہی۔

نہرو جب بھی دہلی میں ہوتے۔ روزانہ شام کو مولانا آزاد سے ملنے ضرور جاتے۔

مولانا آزاد کے انتقال پر نہرو نے جن خیالات کا اظہار کیا۔ وہ ان سے لگاؤ اور وابستگی اور آپسی تعلقات کا آئینہ دار بھی ہیں۔

"ممتاز افراد کے انتقال پر یہ کہنا بڑی رسمی سی بات ہو کر رہ گئی ہے کہ اب اس کی جگہ پُر نہ ہو سکے گی۔ مگر جہاں تک مولانا ابوالکلام کے انتقال کا تعلق ہے یہ بات سو فیصدی صحیح ہے۔ یہی نہیں کہ میں نے مولانا کے علم و فضل سے استفادہ کیا ہے بلکہ بسا اوقات حضرت مولانا کے علم و مطالعہ کے سامنے مجھے اپنا علم دریا کے سامنے پانی کا قطرہ دکھائی دیا ہے۔"

"ہم جب بعض چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں تو یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہمیشہ رہیں گی۔ اس طرح اپنے ساتھیوں کے بارے میں ہمیں کچھ ایسا ہی گمان ہو جاتا ہے۔ لیکن جب کوئی ایسا شخص اچانک اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی زندگی اور اس کی موت ہمارے لیے کیا معنی رکھتی ہے۔"

فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا کے انتقال نے دونوں حضرات کی اس رفاقت و دوستی کو ختم کر دیا۔ لیکن ان کی یاد جواہر لال نہرو کے دل میں ہمیشہ رہی اور بعد کی تحریروں اور تقاریر میں وہ اس کا ذکر کرتے رہے اور اس طرح دونوں حضرات

نے مل کر تحریک آزادی کی گاڑی کو کھینچا اور آخر کار کامیابی سے ہمکنار کیا۔

●

قلم کار حضرات سے

گزارش ہے کہ

(۱) مضامین / دیگر تصانیف جو یوجنا کو ارسال کریں انھیں کہیں اور چھپنے کے لیے قطعاً نہ بھیجیں۔

(۲) ہر مضمون کے آخر میں طبع زاد / غیر مطبوعہ لکھ کر اپنا دستخط، نام اور پتا ضرور درج کریں۔

(۳) مضمون کی اصل ہی ارسال کریں فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۴) مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کریں۔

(۵) مضامین میں جو اقوال۔۔۔ (QUOTATIONS) استعمال کیے گئے ہوں، ان کے سورس کا حوالہ دینا لازمی ہے۔

(۶) مضامین میں انگریزی الفاظ کا استعمال بدرجہ مجبوری ہی کریں۔

(۷) جواب طلب امور کے لیے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں۔

(ادارہ)

مہتاب بانو

قومی یکجہتی کے علم بردار ــ ڈاکٹر ذاکر حسین

کچھ شخصیتیں اتنی عظیم ہوتی ہیں کہ انھیں ان کی اعلا صفات، علمی قیادت اور عملی صلاحیتوں کو تاریخ انسانیت کبھی فراموش نہیں کر پاتی۔ ہندوستان میں بھی ایسی شخصیتیں دریائے سندھ کی تہذیب اور ویدک دور سے لے کر عہد حاضر تک پیدا ہوتی رہی ہیں۔ مجاہد آزادی، ماہر تعلیمات و اقتصادیات اور عالم باعمل ڈاکٹر ذاکر حسین ہمارے وطن عزیز ہندوستان کے ایک ایسے ہی سپوت تھے جنھیں رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور قومی یک جہتی و اتحاد کا ایک روشن آفتاب تھے جس کی شعاعوں نے تقسیم ہند کے المناک اور خونریز دور میں بھی کروڑوں ہندوستانیوں کے دل و دماغ کو اخوت و محبت اور رواداری سے منور رکھا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے چراغوں میں آج بھی اس آفتاب کا لہو بقعہ نور بنا ہوا ہے۔

آبا و اجداد

ڈاکٹر ذاکر حسین کے آبا و اجداد پٹھان تھے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے دور یعنی ۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء میں پٹھان افغانستان سے ہندوستان آئے تھے اور پھر ہمیشہ کے لیے ہندوستان کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ خیبر اور کوہاٹ کے دلیر اور جانباز پٹھان موجودہ فرخ آباد شہر کے علاقے میں آباد ہوئے۔ ایک بہادر پٹھان محمد احمد خاں کی شجاعت اور دلیری سے خوش ہو کر فرخ سیر نے اُسے نواب کے خطاب سے نوازا اور جاگیر کے ساتھ ساتھ منصب چار ہزاری سے بھی سرفراز کیا۔ اسی محمد احمد خاں نے فرخ سیر کے نام پر فرخ آباد شہر آباد کیا اور اپنے بڑے فرزند ارجمند قائم خاں کے نام پر ایک قصبے کو قائم گنج کا نام دیا۔ اس چھوٹے سے قصبے قائم گنج میں بڑے بڑے عالم، فاضل اور شجاع پیدا ہوئے اور آزاد ہندوستان کے تیسرے صدر جمہوریہ مرحوم ذاکر حسین کا تعلق بھی اسی قصبے قائم گنج سے تھا۔

مرحوم ذاکر حسین کے آبا و اجداد کا تعلق نورکاکا کے قبیلے سے ہے اور وہ آفون یعنی مذہبی پیشوا تھے۔ اسی قبیلے میں دو مشہور بھائی ہوئے جن کے نام حسن اور حسین تھے۔ حسین کو مدہ آفون یعنی بڑا استاد سمجھا جاتا تھا۔ وہ بچوں کو درس و تدریس دیتے تھے۔ حسین ایک صوفی منش انسان تھے۔ مقامی پٹھان ان کے معتقد تھے اور بہت سے پٹھانوں نے تو ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی۔ اتر پردیش کے قصبہ قائم گنج میں آج بھی حسین کا مزار موجود ہے اور لوگ وہاں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے اکثر جاتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے خاندان کا تعلق انھیں مدہ آفون حسین سے براہ راست ہے اور اسی مناسبت سے مرحوم ذاکر حسین کے اہل خاندان کے ناموں کے ساتھ حسین لکھا جاتا ہے۔ مدہ آفون حسین کے فرزند احمد حسین خاں تھے اور ان کے بیٹے محمد حسین خاں تھے۔ محمد حسین کے بیٹے غلام حسین خاں مرحوم ذاکر حسین خاں کے دادا تھے اور عادات و صفات کے لحاظ سے ایک درویش تھے عموماً فقیروں فقرو کی صحبت میں رہا کرتے تھے۔ غلام حسین خاں کے دو بیٹے ہوئے عطا حسین خاں اور فدا حسین خاں۔ عطا حسین خاں کے کوئی اولاد نہیں ہوئی لیکن فدا حسین خاں کے سات لڑکے ہوئے جن کے نام بالترتیب اس طرح تھے مظفر حسین، عابد حسین، ذاکر حسین، زاہد حسین، یوسف حسین، جعفر حسین اور محمود حسین۔ ذاکر حسین کے بڑے بھائی مظفر حسین صرف ۳۰ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ مظفر حسین خاں سے چھوٹے دو بھائی عابد حسین خاں اور زاہد حسین خاں کا دِق کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہو گیا۔ جعفر حسین کی بھی کم عمری ہی میں وفات ہو گئی۔ یوسف حسین خاں عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے بعد میں وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر بھی رہے اور "روح اقبال" "اردو غزل" "فرانسیسی ادب" جیسی اہم کتابیں تحریر کیں۔ سب سے چھوٹے بھائی محمود حسین خاں نے جرمنی سے تاریخ میں تحقیق کی اور پاکستان بننے کے بعد وہ ہجرت کر کے ہندوستان کو خیرآباد کہہ گئے۔ بعد میں وہ کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر اور وائس چانسلر مقرر کیے گئے اور کچھ مدت کے لیے انھیں پاکستان کا وزیر تعلیم بھی بنایا گیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بڑے بھائی ۱۸۹۳ء میں قائم گنج میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے لحاظ سے ذاکر صاحب کا نمبر تیسرا تھا اور وہ ۸ فروری ۱۸۹۷ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔

بچپن اور ابتدائی تعلیم

ذاکر حسین کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔ والد کے انتقال سے پہلے حیدرآباد میں وہ اپنے گھر پر ہی انگریز ٹیچر سے پڑھا کرتے تھے۔ والد کی وفات

۴۷/۱۱۔E حوض رانی مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

کے بعد وہ قائم گنج آگئے اور اٹاوہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ یہاں انھیں مشہور استاد اور اس اسکول کے صدر مدرس سید الطاف حسین مرحوم کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ الطاف حسین کی نیک سیرت، اعلا کردار اور شرافت و نفاست کے اثرات ذاکر حسین پر کافی حد تک پڑے تھے اور انھوں نے الطاف حسین مرحوم سے جو کچھ بھی سیکھا اور پڑھا اس پر وہ زندگی بھر عمل کرتے رہے اور ذاکر حسین مرحوم کی کامیابیوں اور حصولیابیوں میں بلاشبہ الطاف حسین کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ذاکر صاحب نے بھی سید الطاف حسین کو تاعمر یاد رکھا۔ اسی اسکول کے ایک دوسرے ٹیچر سید شرف الدین نے جو ایک وطن پرست اور نیشنلسٹ مسلمان تھے، بھی ذاکر حسین کو کافی متاثر کیا۔ ان کی بدولت ذاکر صاحب کو تحریر و تقریر اور علمی و ادبی مباحث میں حصہ لینے کا شوق پیدا ہوا اور وہ قومی، ملی اور بین اقوامی مسائل میں خاصی گہری دلچسپی لینے لگے۔ اسی دور میں ترکی میں جنگی حالات پیدا ہو گئے تو ذاکر حسین نے اپنے اسکول کے ساتھیوں کے اشتراک سے چندہ جمع کرنے اور ترکی کی مدد کرنے کے لیے پرجوش تقاریر کیں۔ یہ ذاکر حسین مرحوم کی تقاریر کا ہی نتیجہ تھا کہ اٹاوہ کے بہت سے مسلمانوں نے گوشت کھانا ترک کر دیا اور اس طرح بچائے گئے سرمائے کو ترکی کے امدادی فنڈ میں دینے لگے۔ ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں طاعون پھیلا اور ذاکر صاحب کے دیگر رشتے داروں کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ بھی اس موذی مرض میں مبتلا ہو کر وفات پا گئیں۔ ذاکر حسین کی والدہ ایک مذہبی مشرقی خاتون تھیں اور اپنی اولاد میں انھوں نے اچھے اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ والد کے بعد والدہ کے انتقال نے ذاکر حسین کی دنیا ہی گویا تاریک کر دی تھی۔ ان حالات میں انھوں نے مشہور صوفی پیر حسن شاہ کے ہاتھوں پر بیعت کی اور ان سے علم و روحانیت کی روشنی حاصل کرنے کے لیے وہ پیر صاحب کی خدمت میں رہنے لگے۔ صوفی حسن شاہ کی سیرت و علم دوستی اور خدا پرستی کا بھی ذاکر حسین پر کافی اثر پڑا۔

اعلا تعلیم

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے انٹرینس کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۱۳ء میں ذاکر حسین سرسید کے قائم کردہ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخل ہو گئے یہاں ان کے دو بڑے بھائی عابد حسین اور زاہد حسین پہلے ہی سے زیر تعلیم تھے۔ ۱۹۱۵ء میں ذاکر صاحب کے بڑے بھائی نے قائم گنج ہی میں شاہجہاں بیگم سے ان کی شادی کر دی تھی۔ ایم۔ اے۔ او کالج سے ذاکر حسین نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان سائنسی مضامین کے ساتھ پاس کیا اور پھر لکھنؤ چلے گئے تاکہ وہاں کے میڈیکل کالج میں طب کی تعلیم حاصل کر سکیں لیکن بیمار ہو جانے کی وجہ سے ان کی طبیب بننے کی خواہش پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ بعد میں بیماری سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ دوبارہ ایم۔ اے۔ او کالج میں داخل ہو گئے اور سائنس کی بجائے آرٹس میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۸ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اقتصادیات میں ایم۔ اے کیا اور وکالت کے کورس میں داخلہ لیا۔ ذاکر حسین مرحوم کی یادداشت بہت تیز تھی جس کتاب یا مضمون کو ایک بار پڑھ لیتے تھے وہ ذہن میں بیٹھ جاتی تھی۔ اس لیے وہ امتحان کے لیے بہت زیادہ محنت نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی ہمیشہ امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوتے تھے۔ ذاکر صاحب کے ساتھیوں مثلاً پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں ذاکر حسین کی مذکورہ خصوصیت کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ علی گڑھ میں اعلا تعلیم حاصل کرتے ہوئے ہی ذاکر حسین نے تقریر و تحریر، بحث و مباحثہ، سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کو سمجھنے اور زندگی کے سرد و گرم حالات سے کامیابی کے ساتھ دوچار ہونے کا ہنر سیکھا تھا۔ علی گڑھ کے طلبا کی یونین میں تقریریں کرتے کرتے ہی وہ ایک سحر آفریں مقرر بنے۔ طالب علم کے طور پر بھی ذاکر حسین صاحب نے طلبا، کالج اور ملک و قوم کی ترقی کے لیے متعدد تعمیری اور اصلاحی امور انجام دیے۔ وہ ڈیبیٹنگ سوسائٹی، اسٹوڈینٹ یونین اور کالج میگزین کے کاموں میں بھی انتہائی دلچسپی لیتے تھے۔ اسی دور میں انھوں نے افلاطون کی کتاب "ری پبلک" کا اردو میں ترجمہ "ریاست" کے نام سے نہایت شستہ اور آسان زبان میں کیا تھا۔ اس ترجمے کی تعریف متعدد علما نے کی تھی مثال کے طور پر اقبال سہیل نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ "افلاطون کو اردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔" ذاکر حسین کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی اور ایک انگریز عالم ریمز باتھم نے ذاکر حسین کے انداز تقریر کی کافی ستائش کی تھی۔ ایم۔ اے کے آخری سال میں ہی ذاکر حسین کو اقتصادیات کا جونیر لیکچرر مقرر کر دیا گیا تھا۔ بعد ازاں ذاکر صاحب نے جرمنی سے اقتصادیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

سیاسی سرگرمیاں

ایم۔ اے۔ او کالج سے ہی ذاکر حسین صاحب نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس دور میں تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات شروع ہو چکی تھیں۔ اس کالج کے طلبا دو گروپوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گروپ برطانوی حکومت کا حامی تھا اور دوسرا گروپ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور حکیم اجمل خاں جیسے قوم پرست اور انگریزی سامراج مخالف رہنماؤں کی حمایت کرتا تھا۔ ذاکر حسین خاں آخر الذکر گروپ میں شامل تھے۔ اس زمانے میں مہاتما گاندھی بھی ایم۔ اے۔ او۔ کالج آئے تھے اور طلبا سے کہا تھا کہ وہ ملک کی آزادی کے لیے میدان میں آ جائیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ان کے بہت سے رفقا نے قوم پرست رہنماؤں کی آواز پر لبیک کہا اور انھوں نے علی گڑھ کالج کو چھوڑ دیا اور ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے کی تعمیر میں مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، عبدالمجید خواجہ اور ذاکر حسین نے اہم رول ادا کیا۔ مولانا محمد علی جامعہ ملیہ کے پہلے شیخ الجامعہ مقرر کیے گئے اور ذاکر صاحب نے ان کے معاون و مددگار کے طور پر خدمات انجام دیں۔ جامعہ کی تعلیمی اور قومی خدمات کرنے کے دوران ذاکر حسین، حکیم اجمل خاں اور مہاتما گاندھی جیسی عظیم شخصیتوں کے قریب آئے اور ان حضرات کے کردار و افکار سے بے حد متاثر ہوئے۔ ذاکر حسین مہاتما گاندھی سے بے حد عقیدت و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے وہ گاندھی جی کو ملک و قوم کے لیے ایک ایسی شمع سمجھتے تھے جس کی روشنی ہندوستان کے لیے نہایت ضروری بلکہ لازمی تھی۔ ایک مرتبہ ذاکر صاحب نے کہا تھا کہ "میں نے اپنی عوامی زندگی کا آغاز گاندھی جی کے قدموں میں بیٹھ کر کیا تھا اور

وہی میرے پیرو مرشد تھے۔"

ذاکر حسین خاں مہاتما گاندھی کے علاوہ حکیم اجمل خاں سے بھی بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے ایک بار کہا تھا "گاندھی جی کی حق بینی، حق شناسی، حق کوشی اور ہمہ گیر انسانیت کی آنچ نے اگر مجھے سونے کو کندن بنا دیا تو حکیم اجمل خاں کے خلق و مروت صبر و حلم نے اس پر جلا کر دی۔"

بطور ماہر تعلیم

اگر چہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے اقتصادیات میں پی ایچ ڈی کی تھی لیکن وہ ایک عظیم ماہر تعلیم بھی تھے۔ انھوں نے دور حاضر کی دو ہندوستانی یونیورسٹیوں یعنی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی نئی دہلی کو آگے بڑھانے، تعلیمی ماحول کو بہتر بنانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی آزادی کے بعد حالت خراب ہو گئی تھی، اس کی ڈگریوں کی اہمیت بھی بہت زیادہ نہیں تھی لیکن ذاکر حسین خاں کے وائس چانسلر بننے کے بعد اس یونیورسٹی کی ساکھ بحال ہوئی اور یونیورسٹی کا سالانہ بجٹ ۱۵ لاکھ سے بڑھ کر ۵۰ لاکھ روپے ہو گیا تھا۔ اسی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی نئی دہلی کی آج جو ترقی یافتہ شکل نظر آتی ہے وہ بہت حد تک ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی علمی اور عملی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے۔ ذاکر حسین مرحوم نے مختلف قومی اور بین اقوامی پلیٹ فارموں پر ہندوستانی ماہرین تعلیمات کی قیادت کی۔ ۱۹۴۵ء میں لندن میں یونیسکو (UNESCO) کے قیام کے پہلے اجلاس میں ذاکر حسین ہندوستانی وفد میں شامل تھے۔ ۱۹۵۶ء میں یونیسکو کے ہندوستان میں منعقدہ اجلاس میں ہندوستانی وفد کی عملاً سربراہی ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہی کی تھی۔ وہ عرصہ دراز تک یونیسکو کے ایگزیکیٹیو بورڈ کے رکن بھی رہے۔ ذاکر صاحب انٹرنیشنل اسٹوڈینٹس سروس کی ہندوستانی کمیٹی کے صدر بھی رہے۔ وہ ورلڈ یونیورسٹی سروس کی صدارت پر بھی ذاکر حسین رونق افروز ہوئے۔ حکومت ہند نے انھیں سینٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کا صدر اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا رکن بھی مقرر کیا۔ گاندھی جی نے بنیادی تعلیم کا جو تصور پیش کیا تھا اُسے عملی جامہ پہنانے اور سارے ہندوستان میں اسے رائج کرنے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات کو تاریخ فراموش نہیں کر سکے گی۔

آفتاب قومی یک جہتی

مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین نے قومی یک جہتی و اتحاد کو فروغ دینے کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ دور طالب علمی سے ہی وہ ایک سچے مسلمان اور پکے ہندوستانی رہے۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج میں کچھ طلبا انگریز سامراج اور علاحدگی پسند مسلم رہنماؤں کے ہمدرد تھے اور کچھ طلبا جن میں ذاکر حسین مرحوم پیش پیش تھے، گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں اور جواہر لال نہرو کے خیالات سے اتفاق کرتے تھے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق کے خلاف تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وجود قوم پرست مسلمانوں کی کاوشوں اور مہاتما گاندھی کی عملی کوششوں کا نتیجہ ہے اور ذاکر حسین مرحوم نے جامعہ کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہندوستان کے مختلف فرقوں، ذاتوں، طبقوں اور علاقوں کے لوگوں میں اخوت و محبت کے بیج بونے کی حتی الامکان کوشش کی۔ حالاں کہ جالندھر میں ٹرین روک کر کچھ فرقہ پرست جنونیوں نے ذاکر صاحب کو قتل کرنے کی کوشش کی لیکن صبر و استقامت کی مورتی اس عظیم رہنما نے کبھی اس واقعہ کی شکایت نہیں کی۔ انھوں نے اکثر کہا کہ "انفرادی اور سماجی طور پر سادہ و پاک زندگی بسر کرنا، پسماندہ اور کمزور افراد کے ساتھ حقیقی اور پُر خلوص ہمدردی کا اظہار کرنا اور ہندوستان کے مختلف طبقوں میں اتحاد و وحدت پیدا کرنا میرے آدرش رہے ہیں۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین کی یہ کوشش عمر بھر رہی کہ ہندوستانی مسلمان اپنے مذہبی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے ہندوستان کی قومی تہذیب کے رنگ میں ڈھل جائیں۔ ذاکر صاحب جمہوریت اور سیکولرزم کے علم بردار تھے اور اسی لیے ۱۳ مئی ۱۹۶۷ء کو انھیں ہندوستانی قوم نے صدر جمہوریہ ہند کے معزز ترین عہدے پر متمکن کیا۔ کرسی صدارت سنبھالنے کے بعد ذاکر حسین نے جو یادگار تقریر کی تھی اس کے چند الفاظ کا تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔ انھوں نے کہا تھا "سارا ہندوستان میرا گھر ہے اور اس کے باشندے میرا کنبہ، عوام کے کچھ عرصے کے لیے مجھے اس کنبے کا سربراہ منتخب کیا ہے۔ میں سچی لگن سے اس گھر کو مستحکم اور خوبصورت بنانے کی کوشش کروں گا۔ تاکہ یہ گھر ان عظیم لوگوں کی شایان شان ہو سکے جو انصاف خوش حالی اور شائستگی کی بنیادوں پر زندگی سنوارنے میں لگے ہیں۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی عملی زندگی سے اپنے مذکورہ خیالات کی سچائی کو ثابت کر دیا۔ وہ استاد رہے یا صدر جمہوریہ ہر دور میں انھوں نے سیکولرزم اور جمہوریت کو مضبوط کرنے اور قومی اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینے کی دل و جان سے کوشش کی۔ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی جیتی جاگتی مثال اردو زبان ہے اور ذاکر صاحب نے اپنے دور صدارت میں اس زبان کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی صد سالہ تقریبات منوا کر ساری دنیا کو غالب سے متعارف کرایا۔ وہ خود ایک اچھے ادیب اور کہانی کار تھے۔ ان کی ادبی تخلیقات میں بھی اخوت و محبت، اعلا انسانی اقدار اور جذبات نمایاں ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی تحریر، تقریر اور عمل سے ہندوستان میں قومی یک جہتی و اتحاد کو فروغ دینے کی حتی الامکان کوشش کی۔ مگر ۳ مئی ۱۹۶۹ء کو سیکولر اور جمہوری آدرشوں کی روشنی پر لانے والا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا۔ لیکن وطن پرستی، قومی اتحاد و محبت جو شعاعیں اس آفتاب سے پھوٹی تھیں وہ آج بھی شفق بن کر ہندوستان کو منور کر رہی ہیں اور علامہ اقبال کی زبان میں کہہ رہی ہیں

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" ●

بقیہ کور ۳: صفائی ستھرائی — ایک طرز زندگی

لاکھ لوگ اس سے استفادہ کریں گے۔ ۹۶-۱۹۹۵ء اور ۹۷-۱۹۹۶ء کے دوران مزید لوگوں کو فائدہ پہنچے گا کیوں کہ مرکزی اور ریاستی شعبوں میں مالی امداد کی رقم بڑھائی جا رہی ہے۔ ●

ڈاکٹر اقبال محی الدین

چاند اور سورج گرہن

آج کل آپ نے اخباروں میں، ریڈیو اور ٹی۔وی کی خبروں میں سنا ہوگا کہ سورج گرہن لگنے والا ہے کبھی چاند گرہن کے بارے میں بھی خبریں آتی رہتی ہیں کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں چاند گرہن دکھائی دے گا۔ اتنا کچھ سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں لکھا جاتا ہے کیا کبھی آپ نے غور کیا کہ یہ چاند اور سورج گرہن کیا ہوتا ہے؟ آئیے ہم آپ کو اس کے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہیں۔

چاند و سورج کے گرہن کا عمل اس طرح ہوتا ہے کہ جب چاند، زمین اور سورج کے درمیانی خط کے عین درمیان آجاتا ہے تو گرہن لگتا ہے۔ اگر ایسا بدر کو ہو تو زمین کا سایہ چاند پر پڑتا ہے تب چاند گرہن یا LUNAR ECLIPSE اور اگر اماوس ہو تو چاند کا سایہ زمین پر پڑتا ہے تب ہمیں سورج پورا یا ادھورا کٹا ہوا نظر آتا ہے۔ اسے سورج گرہن یا SOLAR ECLIPSE کہتے ہیں۔ مگر گرہن صرف بدر یا اماوس کو ہی نہیں ہوتے البتہ اس کے گرہن کو پورا یا ادھورا یا کچھ حصے کا (PARTIAL) بھی ہو سکتا ہے ایسا زمین اور چاند کے مرکزوں کے درمیان '۹-°۵ کا جھکاؤ ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ہم نے بات سورج، چاند، زمین اور بدر یا پورنیما و اماوس اور زمین و چاند کے مرکزوں کے درمیان کے جھکاؤ کی تو کر دی مگر اب بھی بات بہت واضح نہیں ہو سکی کہ آخر یہ زمین یا چاند اپنی پوزیشن مختلف اوقات میں بدلتے ہوئے کس طرح سورج کے سیدھ میں آجاتے ہیں جس سے گرہن والی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور کیسے زمین، چاند اور سورج گرہن کے ذمہ دار ہیں؟

اس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے نظامِ شمسی یا سورج اور اس کے خاندان کے بارے میں پھر زمین کے بارے میں اور پھر چاند کے بارے میں تفصیل سے جاننا بہت ضروری ہے۔

سورج

سورج گرم جگمگاتی گیسوں کا بہت بڑا کرہ ہے جو ہماری زمین سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے۔ ہماری زمین کی تمام روشنی، حرارت اور زندگی کا منبع سورج ہی تو ہے۔ یہ ہم سے تقریباً ۱۵ کروڑ کلومیٹر دور ہے۔ اس کی روشنی زمین تک پہنچنے میں ½۸ منٹ لگتے ہیں جب کہ روشنی کی رفتار ۳ لاکھ کلومیٹر فی سکنڈ ہے۔

سورج اور اس کے ۹ سیارے نظامِ شمسی یا سورج کے خاندان میں شامل ہیں جن کے نام ہیں ــ مرکری، مارس، وینس، زمین، جوپیٹر، سیٹرن، یورینس، نیپچون اور پلوٹو۔ یہ سیارے سورج کے چاروں طرف چکر لگاتے رہتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے محور پر بھی گھومتے رہتے ہیں۔ مرکری اور وینس سیاروں کے علاوہ دوسرے سات سیاروں کے اپنے چاند ہیں جو ان کے چاروں طرف چکر لگاتے رہتے ہیں۔ زمین کا بھی ایک چاند ہے جو اپنے محور پر گھومنے کے ساتھ ساتھ زمین کے گرد بھی گردش کرتا رہتا ہے۔ مارس کے دو چاند ہیں۔ جوپیٹر کے ۱۶ چاند ہیں۔ سیٹرن کے ۱۷ چاند ہیں۔ یورینس کے ۱۵ چاند ہیں ــ نیپچون کے دو چاند ہیں اور پلوٹو کا ایک چاند ہے۔ ہر سیارے کے چاند اپنے محور پر گھومنے کے ساتھ ساتھ اس کے چاروں طرف چکر بھی لگاتے رہتے ہیں جن کے اپنے محور پر گردش کرنے اور سورج کے گرد چکر لگانے کے اوقات الگ الگ ہیں۔ (دیکھئے نقشہ اگلے صفحہ پر)

زمین

زمین سورج سے تقریباً ۱۵ کروڑ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس کا قطر ۱۲۷۵۶ کلومیٹر ہے۔ یہ ایک گیند کی مانند گول ہے جس کی دو طرح کی حرکات ہیں۔ پہلی ROTATION اور دوسری REVOLUTION زمین کی پہلی حرکت میں وہ روزانہ اپنے محور پر گھومتی رہتی ہے جس کی رفتار ۱۶۰۰ کلومیٹر فی منٹ ہے۔ گھومتے رہنے سے جو حصہ اس کا سورج کے سامنے رہتا ہے وہاں دن یا اجالا ہوتا ہے اور جو حصہ اندھیرے میں ہوتا ہے وہاں رات رہتی ہے۔ زمین کی دوسری حرکت یا گردش کا نام ہے REVOLUTION۔ یعنی اپنے متعینہ مدارِ ارضی پر وہ سورج کے چاروں طرف چکر لگاتی رہتی ہے۔ پورے ایک چکر کو ایک سال کہتے ہیں۔ زمین ۳۶۵/۲۵ دنوں میں سورج کے گرد ایک چکر لگاتی ہے۔ ہر سال میں ایک چوتھائی دن کا اضافہ ہوتا ہے جو چار سال کے بعد پورا ایک دن بن جاتا ہے۔ اسی لیے ہر چار سال کے بعد فروری کے مہینے میں ایک دن کا اضافہ کر کے اس سال کو

۵۴۔ پی، ڈی۔ڈی۔اے فلیٹ، قطب انکلیو۔
نزد قطب ہوٹل نئی دہلی ۱۱۰۰۱۶

نقشہ

سورج اور اس کا کنبہ (نظامِ شمسی)

LEAP YEA بنا دیا جاتا ہے۔ اسی لیے
LEAP YEA ۳۶۶ دن کا ہو جاتا ہے۔
زمین کی دوسری حرکت یعنی REVOLUTION
کے بھی اثرات ہوتے ہیں۔ دن کی لمبائی میں کمی و
بیشی، موسم کے تغیرات، مدو جزر اور گرہن جیسے اثرات
رونما ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زمین کی
دونوں حرکتوں سے تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں
اور وہ اپنے متعین راستے پر گردش کرتی ہوئی اور
اپنے محور پر گھومتی ہوئی سورج کے گرد چکر لگاتی
رہتی ہے۔ (دیکھیے نقشہ)

چاند

اب کچھ باتیں چاند کے بارے میں سمجھ
ہو جائیں۔ چاند ہماری زمین کا ثانوی سیارہ ہے
جو ہم سے ۳ لاکھ ۹۰ ہزار کلو میٹر کی دوری پر ہے۔
اس کا قطر ۳۴۰۰ کلو میٹر ہے۔ چاند، زمین کے
چاروں طرف اسی طرح گھومتا ہے جس طرح زمین
سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے۔ چاند کا رقبہ
زمین کے رقبہ سے ایک چوتھائی ہے۔ چاند کی روشنی
کو زمین تک پہنچنے میں ایک سکنڈ + چوتھائی سکنڈ
کا وقت درکار ہے۔ چاند زمین کے چاروں طرف
۲۹ دن میں ایک چکر لگاتا ہے۔ اپنے محور پر بھی
اس کو گھومنے میں اتنا ہی وقت درکار ہے، اسی لیے
ہمارے سامنے چاند کا ایک ہی حصہ ہمیشہ رہتا ہے
اور دوسرا حصہ سامنے نہیں آنے پاتا۔ چاند پر نہ تو ہوا
ہے اور نہ ہی پانی۔ دن میں یہ بہت گرم ہو جاتا ہے
اور رات میں بے حد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔
اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زمین، سورج اور
چاند کے آپسی رشتہ کی وجہ سے کافی تغیرات رونما
ہوتے ہیں اور یہی تینوں مل کر گرہن کے ذمہ دار بھی
ہیں۔ (دیکھیے نقشہ) پہلے ہم تفصیل سے چاند گرہن
کے بارے میں بات کریں گے۔ اس کے بعد سورج
گرہن کے بارے میں بتائیں گے۔
جب چاند کا یا سورج کا کچھ حصہ سایۂ ارض
وماہ سے ڈھک جاتا ہے تو اسے چاند یا سورج
گرہن یا LUNAR ECLIPSE کہتے ہیں اور
جب سورج پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو اسے
SOLAR ECLIPSE کہتے ہیں۔

چاند گرہن

چاند گرہن یا LUNAR ECLIPSE اس
وقت ہوتا ہے جب زمین گھومتے گھومتے اپنے
مدارِ ارضی پر آگے بڑھتے ہوئے ایسی پوزیشن میں
آجاتی ہے جب چاند اور سورج دونوں کے درمیان
پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح زمین کا سایہ چاند پر پڑنے
لگتا ہے۔ یہ عکس ارضی چاند کو تھوڑا یا پورا ڈھک
لیتا ہے۔ یہ پورنیما یا پورے چاند کے وقت ہوتا
ہے کیوں کہ اس دن زمین، چاند اور سورج کے
ٹھیک درمیان میں آجاتی ہے۔ اس طرح زمین
سورج کی روشنی کو چاند پر پڑنے نہیں دیتی اور
چاند بالکل اندھیرے میں ہو جاتا ہے۔ لیکن جیسے
ہی چاند اپنے مدار پر گردش کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا
ہے یہ گرہنی کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور سورج کی
روشنی براہ راست چاند پر دوبارہ پڑنے لگتی ہے۔
اس طرح چاند گرہن ختم ہو جاتا ہے۔
یہاں ایک اہم بات بتانا بھی ضروری
ہے اور وہ ہے بات UMBRA اور PENUMBRA
کی۔ جب سورج کی کرنوں کو زمین روک لیتی ہے
اور اپنا سایہ چاند پر ڈالتی ہے تو زمین کا عکسی زون
بالکل اندھیرے میں ہو جاتا ہے جس کو
UMBRA کہتے ہیں۔ UMBRA کے چاروں طرف
ایک ہلکی روشنی کا زون اور بن جاتا ہے جس کو
PENUMBRA کہتے ہیں۔ یہ ہلکی روشنی سورج سے ہی
حاصل ہوتی ہے۔ چاند گرہن اس وقت ہوتا ہے
جب چاند UMBRA ZONE سے گزرتا ہے اور
یہ پورنیما یا پورے چاند کے وقت ہی ممکن ہوتا ہے
کیوں کہ اس وقت زمین ٹھیک چاند اور سورج
کے درمیان گردش کرتے کرتے ایک سیدھ میں
آجاتی ہے۔
یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ چاند گرہن ہر پورنیما
کے وقت ہی عمل میں آئے کیوں کہ چاند کا مدار
۵ء۹ مدارِ ارضی پر جھکا ہوا ہے جس کو
PLANE OF THE ECLIPTIC کہتے ہیں۔
پورنیما کے وقت اگر چاند اپنے مدار سے اوپر
یا نیچے رہا تو وہ UMBRA کے زون میں نہیں آئے
گا اور نہ ہی عکس ارضی کے دائرہ اثر میں آئے گا۔
اس طرح پورنیما کے وقت بھی ضروری نہیں کہ
چاند گرہن ہو جائے۔ چاند گرہن ہونے کے لیے ضروری
ہے کہ چاند کی پوزیشن پورنیما کے وقت
PLANE OF THE ECLIPTIC کے بہت
نزدیک ہونی چاہیے۔
ماہِ مکمل کے وقت اگر چاند PLANE OF
THE ECLIPTIC کے اندر ہو تو پورا چاند
تاریکی میں آجائے گا۔ اس کو TOTAL LUNAR
ECLIPSE کہتے ہیں۔ اگر یہ ECLIPTIC کے
نزدیک ہی رہا تو وہ کم تاریکی میں رہے گا۔ ایسی حالت
کو PARTIAL LUNAR ECLIPSE کہتے ہیں۔
اگر یہ PLANE OF THE ECLIPTIC سے
دور اوپر یا نیچے رہا تو چاند گرہن بالکل نہیں ہوگا۔

سورج گرہن

اب ہم سورج یا SOLAR ECLIPSE
کی بات کرتے ہیں۔ سورج گرہن اس وقت ہوتا ہے
جب چاند کا سایہ سورج کے کچھ حصے کو اندھیرے
میں کر دیتا ہے جس سے سورج کا وہ حصہ تاریک
نظر آتا ہے۔ یہ کیفیت نئے چاند کے وقت ہوتی
ہے۔ اس وقت چاند، زمین اور سورج کے درمیان
ایک سیدھ میں آجاتا ہے جس سے یہ کیفیت پیدا
ہوتی ہے۔
ہر نئے چاند کے اوقات پر سورج گرہن کا
لگنا ضروری بھی نہیں ہے کیوں کہ چاند کا مدار ۵ء۹
PLANE OF THE ECLIPTIC پر جھکا
ہوا ہے۔ سورج گرہن اسی وقت ممکن ہے جب تینوں
یعنی سورج، چاند اور زمین اس PLANE پر ایک
ساتھ ایک سیدھ میں ہوں۔
ہم نے پہلے آپ کو یہ بتایا تھا کہ کس
طرح زمین اپنے محور پر بھی گھومتی ہے اور اپنے
متعین مدار پر سفر کرتی ہوئی سورج کے چاروں
طرف چکر بھی لگاتی ہے۔ اسی طرح چاند بھی اپنے
محور پر گھومتا ہے اور زمین کے چاروں طرف بھی
اپنے متعین مدار پر چکر لگاتا رہتا ہے۔ جب بھی سفر
طے کرتے کرتے چاند، زمین اور سورج ایک سیدھ
میں آجاتے ہیں تو ان کی پوزیشن کے لحاظ سے گرہن
لگتے ہیں۔ سورج گرہن لگنے کی وجہ بھی یہی ہوتی
ہے کہ اپنے مدار پر گردش کرتے کرتے جب چاند،
باقی صـ۳ پر

ڈاکٹر ایس۔ سریندر اور کے۔ مولاشا

ہندوستان میں بچے گود لینے کا رواج

ایک جائزہ

بچوں کی فلاح و بہبود کو دنیا بھر میں سماج کی ایک بڑی ضرورت سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں بھی پارلیمنٹ نے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک قومی پالیسی منظور کر رکھی ہے جس میں بچوں کے لیے ایک ۵ نکاتی پروگرام تجویز کیا گیا ہے اور یتیم اور لاوارث بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کے پروگراموں کو ترجیح دینے کو کہا گیا ہے۔ پالیسی قرارداد میں بچوں کو عدم توجہی اور ظلم و استحصال سے تحفظ عطا کیا گیا ہے۔

صنعت کاری کے سبب ہماری خاندانی زندگی پر کئی قسم کے دباؤ پڑے جن کی وجہ سے مشترکہ خاندان کا نظام ٹوٹ گیا اور بچوں کے تئیں لاپروائی بڑھ گئی۔ ان کے علاوہ بے سہارا بچوں کا مسئلہ بھی ہے جنھیں ایک فلاحی ریاست میں دستیاب سماجی فائدوں سے بہرہ ور ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ بچوں سے متعلق پالیسی اور پروگراموں کا جائزہ لینے کے لیے منصوبہ بندی کمیشن کے قائم کردہ ورکنگ گروپ کا اندازہ ہے کہ ملک میں صفر سے لے کر چودہ برس تک کی عمر کے تقریباً ۱۵ فی صد بچے بے سہارا ہیں۔ اس اندازے کے مطابق تقریباً ۱۵ ملین بچوں کو گھروں کی ضرورت ہے۔ ان بچوں کو سماج میں دوسروں کے ہاتھوں استحصال سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے لیے ادارہ جاتی یا غیر ادارہ جاتی دیکھ بھال کا انتظام کیا جائے جب کہ ادارہ جاتی سہولیات کے تحت یتیم خانے، چلڈرنس ہوم وغیرہ آتے ہیں غیر ادارہ جاتی متبادلات سے بے سہارا بچوں کے مفاد کی بہتر خدمت ہو سکے گی کیوں کہ ان کی بدولت انھیں ایک کنبہ اور کنبے کا ماحول میسّر آ سکے گا۔ اس لیے بے سہارا بچوں کا گود لیا جانا بلاشبہ سب سے اچھا غیر ادارہ جاتی متبادل ہے۔ اس سے ایک بے سہارا بچے کو ایک گھر، ایک کنبہ اور سیکیورٹی ملتی ہے جس کی اسے بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ گود لینے سے بے اولاد میاں بیوی اور بچے تینوں کی جذباتی ضرورت بڑی حد تک پوری ہو جاتی ہے اس سے گود لیے گئے بچے کی مستقبل کی ترقی کی بنیاد پڑتی ہے اور اس کا ایک محفوظ اور پیار بھرے ماحول میں جوان ہونا یقینی بن جاتا ہے۔

بچہ گود لینے کے لیے قانونی کارروائی کرنا پڑتی ہے جس کے بعد بچے کے خواہش مند میاں بیوی قانونی طور پر گود لیے ہوئے بچے کے والدین بن جاتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایک بے سہارا بچے کے لیے گود دیے جانے کی کارروائی ایک نئے گھر اور ایک نئے ماحول میں اس کا نیا جنم ہوتا ہے۔ اس سے ایک بچے کو جسے قدرت نے ماں باپ اور گھر سے محروم کر دیا ہو، نئے ماں باپ اور نیا گھر مل جاتا ہے۔

بچہ گود لینے کا مقصد ترقی یافتہ ملکوں میں ترقی پذیر ملکوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں بچہ گود لینے والے والدین کو دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو غیر رضاکارانہ طور پر بے اولاد ہیں (بچہ گود لینے والے والدین میں اکثریت ایسے ہی والدین کی ہے) اور دوسرے جن کے دو یا دو سے زیادہ بچے پہلے ہی سے ہیں۔ ان میں بچہ گود لینے کی خواہش نہایت مشکل حالات میں رہنے والے بچوں یا جنگ کی وجہ سے یتیم ہو جانے والے بچوں کی حالت زار کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔

اس کے برعکس ترقی پذیر ملکوں میں وہی والدین بچہ (خاص کر لڑکا) گود لینا چاہتے ہیں جن کے اپنا کوئی بچہ نہیں ہوتا یا جن کے لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوتی ہیں، کوئی لڑکا نہیں ہوتا۔ ترقی پذیر ملکوں میں بے اولاد والدین اس لیے بھی لڑکا گود لینا چاہتے ہیں کہ وہ ان کے بڑھاپے میں ان کا سہارا بنے، ان کا اور ان کے خاندان کا نام چلائے، خاندان کی جائداد کی دیکھ بھال کرے اور ان کے مرنے پر ان کی آخری رسوم ادا کرے۔

ہندوستان میں مشترکہ خاندانوں میں بچے گود لینے کا رواج پرانے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ اس وقت اپنے ہی خاندان کا کوئی بچہ یا اپنی ذات برادری کا بچہ گود لینے کا رواج تھا۔ اپنے خاندان یا برادری سے باہر کے بے سہارا بچوں کو گود لینے کا رواج حال ہی میں شروع ہوا ہے۔

ہندوستان میں بچہ گود لینے کا کوئی ایسا قانون نہیں ہے جو سبھی فرقوں پر یکساں طور پر لاگو ہو۔ ہندو ایڈاپشن اینڈ مینٹی نینس ایکٹ ۱۹۵۶ء کا اطلاق صرف ہندوؤں ہی پر ہوتا ہے۔ اس قانون کے تحت بچہ گود لینے کی کارروائی ایک سول عدالت میں کی جاتی ہے اور وہ ناقابل تنسیخ ہوتی ہے۔ غیر ہندو بچوں پر گارجین شپ اینڈ وارڈز ایکٹ ۱۸۹۰ء کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس قانون کے تحت بچہ گود لینے

کا کوئی حکم جاری نہیں کیا جاتا تاہم ہائی کورٹ خواہش مند والدین کو کسی بچے کو اپنی سرپرستی میں لینے کا حکم جاری کر سکتی ہے۔ اس طرح سرپرستی میں لیے گئے بچے کو سرپرست والدین کا "سرنیم" (خاندانی نام)، استعمال کرنے یا وراثت میں ان کی جائداد پانے کا حق نہیں ہوتا۔

گود لینے کی کارروائی

سب سے پہلے بچہ لینے کے خواہش مند میاں بیوی کو مجاز عدالت میں درخواست دینی چاہیے۔ درخواست منظور کیے جانے پر عدالت انھیں ایک حکم کے ذریعے اپنی پسند کا بچہ گود لینے کی اجازت دے گی۔ اس کے بعد وہ میاں بیوی بچہ گود لینے کی دستاویز پر دستخط کر کے ۱۹۰۸ء کے رجسٹریشن ایکٹ کے تحت اس کی رجسٹری کرائیں گے۔ اس کے ساتھ بچہ گود لینے کی کارروائی پوری ہو جائے گی۔ اس کے بعد بچہ گود لینے والے والدین اپنے گود لیے ہوئے بچے کے متعلق تمام ذمہ داریاں اور حقوق حاصل کر سکیں گے اور بچے کو بھی ان کا نام استعمال کرنے اور وراثت میں ان کی جائداد پانے کا حق مل جائے گا۔ لیکن یہ قانون صرف ہندوؤں کے لیے ہی ہے اور اس کے دائرے میں سکھ، بودھ اور جین بھی آتے ہیں۔

غیر ہندوؤں کے لیے گارجین شپ اینڈ وارڈ ایکٹ ۱۸۹۰ء ہی ابھی تک نافذ ہے۔ اس کے تحت کوئی بھی میاں بیوی کسی بچے کو اپنی سرپرستی میں لینے کی درخواست دے سکتے ہیں۔ اس قانون کے تحت انھیں بچے کے ضمن میں کچھ قانونی حیثیت تو حاصل ہو ہی جاتی ہے خواہ وہ کتنی ہی ناکافی کیوں نہ ہو۔

ہندوستانی شہریوں اور دوسرے ملکوں کے شہریوں دونوں ہی کو کسی ہندوستانی بچے کو گود لینے کا اختیار ہے۔ سپریم کورٹ نے اپنے ۱۹۸۱ء کے فیصلے اور اس کے بعد ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء کے دو فیصلوں میں بچہ گود لینے کا طریق کار طے کر دیا ہے۔

عام طور پر بے اولاد والدین اسپتالوں اور نرسنگ ہومز میں جاتے ہیں اور وہاں کے میڈیکل اور دوسرے عملے کی مدد سے نوزائیدہ ان چاہے بچے لے آتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو یتیم خانوں اور آشرموں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پر یتیم بچے والدین کا پیار پانے کو ترس رہے ہیں۔ لیکن ملک میں بچوں کی فلاح و بہبود کا کام کرنے والی تنظیمیں بچہ گود لینے میں ضرورت مند لوگوں کی مدد کر سکتی ہیں۔ ان تنظیموں کے بارے میں ریاستی محکمہ فلاح و بہبود یا ڈائرکٹوریٹ آف سوشل ویلفیئر سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہے۔

انڈین کونسل آف سوشل ویلفیئر ہندوستانی بچوں کو گود لینے میں غیر ملکیوں کی مدد کر سکتی ہے۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ بچہ گود لینے والے والدین کے ملک ہی میں بچے کو گود لینے کی قانونی کارروائی پوری کی جائے۔ یہ کونسل اس بات کا بھی پتا لگاتی ہے کہ جو لوگ بچہ گود لینا چاہتے ہیں وہ قابل قبول ہیں یا نہیں۔ عدالت سے یتیم بچوں کو کسی کی سرپرستی میں دینے کی سفارش بھی یہی کونسل کرتی ہے۔

انڈین ایسوسی ایشن آف پروموشن آف ایڈاپشن نامی رضاکار تنظیم بھی جو ۱۹۷۰ء میں قائم کی گئی تھی بے سہارا بچوں کے گود لیے جانے کے معاملے میں سرگرم خدمات انجام دے رہی ہے۔ بمبئی کے میٹرو پالیٹن علاقے میں ۱۹۸۳ء سے ایک رضاکار تال میل ایجنسی (V C A) بھی کام کر رہی ہے۔ یہ ایجنسی بچوں کی فلاح و بہبود کی تیرہ تنظیموں کے ساتھ جو اس کی رکن ہیں، بچے گود لیے جانے کے معاملے میں تال میل پیدا کرتی ہے۔ اس کا مقصد گھر کے محتاج بچوں اور بچوں کے محتاج والدین کے درمیان جلد از جلد مکمل رابطہ قائم کروانا ہے تاکہ محتاج بچوں کو جلد از جلد نئے والدین کا پیار مل سکے۔

اس لیے جو والدین بچہ گود لینا چاہتے ہوں وہ ان رضاکار تنظیموں کی مدد سے اپنی خواہش کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

چوں کہ بچوں کے گود لیے جانے کے بارے میں پورے ملک کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں اس لیے اس مضمون میں صرف بمبئی کے میٹرو پولیٹن علاقے کے بارے میں انڈین کونسل آف سوشل ویلفیئر کے فراہم کردہ اعداد و شمار ہی پیش کیے جا رہے ہیں۔ بمبئی کے علاقے میں ۱۹۸۷ء میں صرف ۳۱ بچے گود لیے گئے جب کہ ۱۹۸۸ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۲۱۶ اور ۱۹۹۰ء میں ۲۷۹ ہو گئی۔ (دیکھیے گوشوارہ نمبر ۱)

ایک خاص بات

ہندوستان میں لڑکیوں کی بہ نسبت لڑکے زیادہ گود لیے جاتے ہیں۔ اگرچہ اب لڑکیاں بھی گود لی جانے لگی ہیں مگر ان کی تعداد ابھی لڑکوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس کی وجوہات سماجی، معاشی اور نفسیاتی ہیں۔ لیکن غیر ہندوؤں میں صورت حال مختلف ہے۔ غیر ہندوؤں میں لڑکیاں زیادہ گود لی جا رہی ہیں لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ہندو والدین جن میں سکھ، جین اور بودھ بھی شامل ہیں، غیر ہندوؤں کی بہ نسبت زیادہ بچے گود لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ غیر ہندوؤں کے لیے بچہ گود لینے کا کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ ان کے لیے صرف بچے کو اپنی سرپرستی میں لینے کا قانون ہے جس کے تحت بچے اور سرپرست کے درمیان کوئی مستقل قانونی رشتہ قائم نہیں ہو پاتا اور ایسے بچے کو سرپرست کی جائداد وراثت میں پانے کا بھی حق نہیں ملتا۔

گوشوارہ نمبر ۱

بچوں کے سرپرستی میں لیے جانے کے بارے میں رپورٹ

برائے ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۰ء

سال	غیر ہندو (سرپرستی میں لیے گئے بچے)	ہندو (گود لیے گئے بچے)	کل تعداد
۱۹۸۶ء			
لڑکے	۱۲	—	۱۲
لڑکیاں	۱۹	—	۱۹
۱۹۸۷ء			
لڑکے	۱۰	۷۴	۸۴
لڑکیاں	۲۵	۴۷	۷۲
۱۹۸۸ء			
لڑکے	۱۱	۱۰۰	۱۱۱
لڑکیاں	۲۰	۸۵	۱۰۵
۱۹۸۹ء			
لڑکے	۲۱	۱۵۷	۱۷۸
لڑکیاں	۲۴	۹۴	۱۸۸
۱۹۹۰ء			
لڑکے	۱۳	۱۵۰	۱۶۳
لڑکیاں	۱۸	۹۸	۱۱۶

بذریعہ انڈین کونسل آف سوشل ویلفیئر کے ریکارڈس

گوشوارہ نمبر ۲

بچوں کے گود لیے جانے کی رپورٹ

برائے ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۰ء

سال	ملک کے اندر گود لیے گئے بچے	ملک سے باہر گود لیے گئے ہندوستانی بچے
۱۹۸۶ء		
لڑکے	۱۲	۱۴۰
لڑکیاں	۱۹	۲۷۸
۱۹۸۷ء		
لڑکے	۸۴	۱۴۱

لڑکیاں	۷۲	۲۳۹
۱۹۸۸ء		
لڑکے	۱۱۱	۱۳۷
لڑکیاں	۱۰۵	۳۳۰
۱۹۸۹ء		
لڑکے	۱۲۸	۷۶
لڑکیاں	۱۱۸	۲۰۸۳
۱۹۹۰ء		
لڑکے	۱۶۳	۶۱
لڑکیاں	۱۱۶	۲۷۲
کل تعداد (۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۰ء)	۹۷۸	۲۰۵۷

ذریعہ انڈین کونسل آف سوشل ویلفیئر کے ریکارڈس

مذکورہ بالا اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۰ء تک کی مدت میں مجموعی طور پر ۳۰۳۵ ہندوستانی بچے کو گود لیے گئے اس میں سے ۶۸ فی صدی بچے دوسرے ملکوں سے لوگوں نے گود لیے۔

اگرچہ مدت زیر تبصرہ میں ملک کے اندر گود لیے جانے والے بچوں کی تعداد میں اضافے کا رجحان دکھائی دیا، غیر ملکیوں کے ذریعے گود لیے گئے بچوں کی تعداد رو بہ زوال پائی گئی۔ ملک کے اندر زیادہ تر لڑکے گود لیے گئے جب کہ غیر ملکیوں میں لڑکیاں گود لینے کا رجحان پایا گیا۔ اگرچہ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں تاہم محققین نے عام طور پر درج ذیل وجوہات کی نشاندہی کی ہے:

(۱) ہندوستانی لڑکی محبت و شفقت کی علامت ہے۔

(۲) وہ برسوں کنبے کے ساتھ رہتی ہے۔

(۳) اسے غیر ملکی ماحول میں رچنے بسنے میں مقابلتاً کم دقت پیش آتی ہے۔

تاہم بعض مصنفین کا یہ کہنا ہے کہ غیر ملکی لوگ خود بچے کا انتخاب نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے لیے یہ کام ہندوستانی ایجنسی کرتی ہے۔ ان حالات میں ان مصنفین کو اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہے کہ غیر ملکیوں کے ذریعے گود لیے جانے والے بچوں میں زیادہ تر لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان کے بقول اس کی وجوہات یہ ہو سکتی ہیں کہ

(الف) کوئی بھی شخص جس نے کبھی یتیم خانہ یا اناتھ آشرم دیکھا ہے جانتا ہے کہ وہاں بچوں کی اکثریت لڑکیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

(ب) بچہ گود لینے کے خواہش مند ہندوستانیوں کو ترجیح دی جاتی ہے اور وہ زیادہ تر لڑکا ہی پسند کرتے ہیں۔

(ج) کوئی بچہ کسی غیر ملک میں گود دیے جانے کے لیے تبھی جا سکتا ہے جب تین ہندوستانی والدین اسے گود لینے سے انکار کر چکے ہوں۔

(د) یہی وجہ ہے کہ غیر ملکیوں کو گود دینے کے لیے دستیاب بچوں میں لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

سماجی محققین کے دلوں میں اکثر یہ سوال اٹھتا ہے کہ بچوں کے نقطہ نگاہ سے کیا چیز بہتر ہے ملک کے اندر ہندوستانی والدین کے ذریعے گود لیا جانا یا ملک سے باہر غیر ملکیوں کے ذریعے گود لیا جانا۔ عام طور پر یہی محسوس کیا جاتا ہے کہ گود لیا ہوا بچہ ایک مانوس ماحول اور جانے پہچانے سماجی و ثقافتی حالات میں زیادہ آسانی سے رچ بس جاتا ہے لیکن اگر اسے کسی دوسرے ملک میں بھیجا جاتا ہے تو اسے خود کو وہاں کے سماجی و ثقافتی حالات کے مطابق ڈھالنے میں مشکل پیش آ سکتی ہے اور نفسیاتی طور پر اس کے ذہن پر دباؤ پڑ سکتا ہے

خلاصہ

(۱) مناسب تعلیم اور پرچار کے ذریعے عوام میں بے سہارا بچوں کو گود لینے کی ضرورت کا احساس پیدا کیا جانا چاہیے۔ چوں کہ ملک کی آبادی پہلے ہی سے کافی زیادہ ہے اس لیے حکومت کو "ایک بچہ گود لیجیے" کو مقبول بنانا چاہیے۔ اس سے کثرت آبادی اور بے سہارا بچوں کے دونوں ہی مسئلے بیک وقت حل کیے جا سکیں گے۔

(۲) حکومت کو اس بات پر زیادہ توجہ دینی چاہیے کہ ہندوستانی بچے جہاں تک ہو سکے ہندوستانی والدین کے ذریعے ہی گود لیے جائیں۔ اس کام میں رضاکار تنظیموں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے اور انھیں اور حکومت دونوں کو یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اور

(۳) بچے گود لینے کے لیے سبھی ہندوستانی شہریوں کے لیے ایک مشترک قانون بنایا جانا چاہیے۔

عظیم اقبال

بچوں میں جنسی بے راہ روی؛
ایک خطرناک رجحان

اگر گرد و پیش کے حالات سے آپ آشنا ہیں تو جنسی استحصال اور جنسی بے راہ روی کے سانحات کی خبروں سے آپ یقیناً واقف ہوں گے۔ ان واقعات پر مغربی ملکوں کی اجارہ داری ختم ہو چکی ہے اور اب مشرقی ممالک بھی ایسے حادثات کی انگنت مثالوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس تعلق سے ہندوستان کوئی استثنائی حیثیت نہیں رکھتا۔

اس سلسلے میں یہ انکشاف دلچسپی سے خالی نہیں کہ میدانِ جنس کی صحرانوردی کے لیے اب صرف بالغ مرد اور عورت ہی صف آرا نہیں، بلکہ کم سن بچے بھی ان کے دوش بدوش ہیں۔ اب ان کم سنوں کے لیے جنس کسی شجرِ ممنوعہ کی حیثیت قطعی نہیں رہتی۔ جنس ایک نعمت نہیں، اس کے آفت بننے میں بھلا دیر ہی کتنی لگتی ہے!

بچوں کو لگ جانے والی جنسی بیماریوں (SEXUALLY TRASMITTED DISEASES) کے بڑھتے ہوئے واقعات تشویشناک ہیں۔ دہلی کے ایک اسپتال کے ایک جائزے کے مطابق ایسی بیماریوں S.T.D. میں مبتلا ۳۶۲ مریضوں میں سے ۵۸ ایسے مریض تھے، جن کی عمر ۱۴ سال سے کم تھی۔ بچوں میں اکثریت ۷ سال سے کم عمر بچیوں کی تھی۔ چوں کہ ۷ سال سے کم عمر جنسی سرگرمی کا دور نہیں ہوتا، اس لیے ایسا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ سارے مریض جنسی استحصال کا شکار ہوئے ہوں گے۔ اکثر معاملات میں مجرم وہ لوگ ہوتے ہیں جو قریبی رشتہ دار ہیں یا جو ان بچوں تک آسانی سے رسائی رکھتے ہیں۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ان کی یا تو شناخت نہیں ہو پاتی یا جو سرزنش سے بچ جاتے ہیں۔ نتیجتاً بہت کم ملزم سزا پاتے ہیں۔

ایسے عتاب کو اکثر حالات میں خاموشی سے برداشت کر لیا جاتا ہے۔ کچھ معاملات میں یہ بھی احساس نہیں ہوتا کہ ان کے ساتھ کچھ زیادتی ہوئی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ استحصال معاشرہ کے کم تر درجہ کے افراد تک محدود نہیں۔ آل انڈیا میڈیکل سائنسز کے ڈرماٹولوجی ڈپارٹمنٹ نے ایسے معاملات درج کیے ہیں جن میں مالدار خاندانوں کے بچے چھوت کی جنسی بیماریوں میں مبتلا پائے گئے ہیں۔

اس کے پیش نظر والدین کو اس خطرے سے، جو ان کے بچوں کو لاحق ہے، خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ بچوں کو اس کی تربیت دینی چاہیے کہ اگر کوئی ان کے ساتھ ناروا سلوک کرے تو اس کی خبر وہ اپنے والدین کو دیں۔

گھر کی حدود میں بچوں کی صحبت میں قرابت داروں کی حرکات و سکنات پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ بچوں کے باہری لوگوں سے میل جول کو بھی بے روک چھوڑ دینا دانشمندی نہیں ہے۔ مزید بچوں کے تنہا باہر جانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ بچوں کو بھروسے میں لینے اور انھیں کچھ چھپانے سے منع کرنے کی ترغیب بھی واجب ہے۔

ایک اور حالیہ جائزہ بھی تشویشناک ہے کہ اسکولی بچے پُرخطر جنسی حرکات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ زیادہ تر بچوں نے اعتراف کیا کہ اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے انھوں نے پیشہ ور افراد کی خدمات حاصل کیں۔ اس طور سے طلبا S.T.D. کے ساتھ ساتھ ایڈس (AIDS) سے دوچار ہونے کا خطرہ بھی مول لے رہے ہیں۔ چوں کہ پیشہ ور افراد ایڈس کے جراثیم کے حامل ہوتے ہیں۔ اس لیے امکانی خطرے کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ جائزے سے یہ بھی منکشف ہوا کہ اکثر طلبا غیر محفوظ جنسی اختلاط کے خطرات سے ناواقف ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے نظرانداز کرنے کی نہیں اس سے بہ طور نمٹنے کی ضرورت ہے۔

ملک میں فی الوقت HIV POSITIVE مریضوں کی تعداد دس لاکھ ہے اور ہر سال اس کے دوگنے ہونے کا امکان بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ آنے والے وقتوں میں ایڈس سے ہونے والی اموات بہت زیادہ ہوں گی۔

اسکول کے منتظمین اپنی اس ذمہ داری سے منہ نہیں موڑ سکتے کہ وہ بے روک ٹوک جنسی اختلاط کے خطرات سے اپنے طلبا کو

باقی صفحہ پر

گنج ٹے بیتیا ۸۴۵۴۳۸۔ بہار

محمد شہاب الدین (ریسرچ اسکالر پٹنہ یونیورسٹی)

آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح

طنز و مزاح ادب کا اہم ترین پیرایۂ بیان ہے جس کے اعلیٰ نمونے کسی بھی ادب میں اسی وقت دستیاب ہو سکتے ہیں جب زبان ترقی کی منازل طے کر چکی ہو۔ اردو زبان بھی جس رفتار سے ترقی کی منازل طے کرتی رہی طنز و مزاح بھی اسی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ اگرچہ اردو ادب میں طنز و مزاح کے عناصر داستانی عہد سے ہی ملنے شروع ہو جاتے ہیں مگر ان کی حیثیت آٹے میں نمک کے مصداق تھی اور اس عہد میں طنز و مزاح کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں فن کی بلندی و عظمت بہت زیادہ نمایاں نہیں ہے مگر ۱۸۵۷ء کے بعد طنز و مزاح کی سمت میں اردو ادب نے جو ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ دراصل طنز و مزاح کے بہترین پیرایے اسی وقت وجود میں آتے ہیں جب زندگی میں انتشار، ناہمواری، کشمکش اور کرب و اضطراب ہو۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ غدر کے بعد غیر ملکی تسلط نے ہماری زندگی کو نئی تبدیلیوں سے دوچار کیا۔ نئی اور قدیم تہذیب کی کشمکش، اقتصادی بدحالی، پست ہمتی اور احساس شکست خوردگی نے ادیبوں کے نہ صرف لب و لہجے میں تبدیلی پیدا کی بلکہ ادب کو حقیقت سے قریب تر کر دیا۔ اب ادب میں داستانی عہد کی پُر اسرار فضا کی گنجائش نہ رہی چناں چہ ادب میں زندگی کے تلخ و ترش حقائق کو پیش کیا جانے لگا اور ادب کو افادی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا۔ چناں چہ وہ ادیب جو اپنے اندر حسِ مزاح رکھتے تھے انھوں نے بھی مزاح کا استعمال افادی نقطۂ نظر سے کیا۔ اب ان کے مزاح میں مسرت و انبساط کی محض حصولیابی نہ تھی بلکہ طنز و مزاح کے پردے میں کمزوریوں اور کمیوں کی نشاندہی تھی۔ چناں چہ غالب کے بعد "اودھ پنچ" کے ذریعے طنز و مزاح کا ایک بڑا کارواں تیار ہوا جس نے زندگی کی ناہمواریوں اور کجرویوں کو ہدف طنز بنایا۔ لیکن ان کے یہاں اظہار بیان میں اتنی جذباتیت آگئی کہ اسی شدید جذباتیت نے فن کو مجروح کیا۔ کیوں کہ ادب بذات خود فنون لطیفہ سے تعلق رکھتا ہے جہاں تندی و تلخی کا گزر ناممکن ہے پھر طنز و مزاح جو فن شیشہ گری کے مترادف ہے اس میں تو قدم قدم پر فن کے مجروح ہونے کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔ طنز و مزاح کا بہترین پیرایۂ بیان اور انداز بیان کا خوبصورت طریقہ تو یہ ہے کہ دونوں باہم شیر و شکر ہو جائیں۔ لیکن اسی عہد میں لطیف طنزیہ و مزاحیہ اسلوب کم نظر آتا ہے۔ تاہم ان تمام باتوں کے باوجود "اودھ پنچ" نے طنز و مزاح کے جو رنگا رنگ اسالیب دیتے ہیں اس کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔

"اودھ پنچ" کے بعد عبوری کے مزاح نگاروں نے اس سمت میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور انھوں نے اپنے اسالیب میں طنز و مزاح کے فن کو برتنے میں خاص اہتمام کیا۔ ان کا لب و لہجہ ایک خاص رکھ رکھاؤ رکھتا ہے اور انداز بیان میں اگر تلخی ہے بھی تو زبان و بیان کی شگفتگی اور مزاح کی شیرینی اسے بہت حد تک کم کر دیتی ہے۔ اس عہد میں چند ایسے بھی نمونے سامنے آئے جو خالص مزاح کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس عہد کے مزاح نگاروں کے زبان و بیان کے مخصوص استعمال سے بھی طنزیہ و مزاحیہ پیرایۂ بیان کو حسن بخشتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے مغربی ادبیات سے استفادہ کی مستحسن کوشش بھی کی۔

اس کے بعد رشید احمد صدیقی کے عہد میں اردو طنز و مزاح مزید وسعتوں سے ہمکنار ہوا۔ اس عہد میں طنز و مزاح کے اعلیٰ پیرایے سامنے آئے اور ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ طنز و مزاح کی تاریخ میں اس عہد کو طنز و مزاح کا عہد زریں کہہ سکتے ہیں۔ ہم ادب کے تمام اصناف میں آزادی کے بعد ایک نمایاں تبدیلی کا احساس کرتے ہیں۔ طنز و مزاح میں بھی اس تبدیلی کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اردو کے نثری اور شعری اسلوب میں طنز و مزاح کے جو پیرایے آزادی کے بعد سامنے آئے ان میں طنز کی نشتریت زیادہ ہے۔ مزاح کا عنصر نسبتاً کم ہے۔ دراصل خالص مزاح کے نشو و نما اور ارتقا کے لیے سکون و عافیت کی ایک ایسی فضا درکار ہے جس میں لوگ ماحول سے بدظن نہ ہوں بلکہ زندگی کی مضحک کیفیات سے اور افراد کی مخصوص ناہمواریوں سے محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ لیکن تقسیم ہند نے اس صلاحیت کو کاری ضرب لگایا۔ اس لیے آزادی کے بعد طنز و مزاح کے جو پیرایے سامنے آئے اس میں نشتریت اور طنز کی تلخی زیادہ نمایاں ہے۔

آزادی کے بعد طنز و مزاح کی روایت کی تشکیل میں جن لوگوں کے نام اردو نثر میں بہت

نعمان چمبر، بیکنا پہاڑی چوک پوسٹ مہندرو، پٹنہ۔۶

اہم ہیں ان میں کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، خواجہ احمد عباس، ابراہیم جلیس، فرقت کاکوروی، وجاہت علی سندیلوی، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، خواجہ عبدالغفور اور مشتاق احمد یوسفی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ گرچہ اس ضمن میں اور بھی کئی نام لیے جا سکتے ہیں مگر اختصار کی غرض سے ہم نے محض ان مشہور ادیبوں کو شامل کیا ہے جن کی تحریروں نے طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور اپنے اسلوب کی رنگا رنگی سے انفرادیت قائم کی۔

کنہیا لال کپور نے آزادی سے قبل لکھنا شروع کیا اور طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی مگر ان کے فن کے عروج کا زمانہ آزادی کے بعد ہے۔ انھوں نے نثر و نظم دونوں میں طنز و مزاح کا استعمال کیا ہے مگر نثری اسالیب زیادہ اہم ہیں۔ ان کا دائرہ بہت وسیع ہے انھوں نے ژرف نگاہی سے مسائل کو دیکھا اور ہمدردی سے ان پر اصلاح کی غرض سے طنز کے تیر چلائے۔ ان کے یہاں طنز میں مزاح کی آمیزش اس خوبی سے ملتی ہے کہ نہ تو نشتریت غالب آتی ہے اور نہ جذباتیت حاوی ہوتی ہے۔ زبان و بیان بہت مشکل اور پیچیدہ نہیں بلکہ عام فہم انداز میں پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ پیروڈی میں انھیں کمال حاصل ہے اس کے ذریعے بھی وہ نکتہ رسی کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ زندگی اور سماج کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کو اپنا ہدف بناتے ہیں "کامریڈ شیخ چلی" "فلسفۂ قناعت" "انکم ٹیکس والے" اور "کپور اللغات" ان کے شاہکار نمونے ہیں۔

فکر تونسوی کے یہاں سماجی طنز کا تیور سب سے نمایاں ہے۔ جتنا گہرا سیاسی اور سماجی شعور فکر کی تحریروں میں ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔ سیاسی، سماجی، معاشی استحصال اور ناہمواریوں پر ان کی بہت گہری نظر ہے۔ طنز و مزاح میں انھوں نے غریبوں، کسانوں، مزدوروں اور بے سہارا عوام کے دکھ درد کی ترجمانی کی ہے اس اعتبار سے ان کی ذات منفرد ہے۔ "چھٹا دریا" "ساتواں شاستر" "تیر نیم کش" "چوپٹ راجے" "بھر گورنی" "خد و خال" "بدنام کتاب" "چوپٹ راجا" وغیرہ میں فکر تونسوی نے زندگی کی ناہمواریوں اور تضادات پر شدید طنز کیا ہے۔ لیکن اس طنز میں برجستگی اور مزاح کی خوشگواری سے بشاشت قائم رہتی ہے اور فکر بیدار ہوتی ہے۔

خواجہ احمد عباس گرچہ کالم نگار ہیں لیکن انھوں نے اس کالم نگاری کے ذریعے بہت ہی کامیاب طنزیہ شاہکار دیتے ہیں۔ وہ "بلٹز" بمبئی میں آزاد قلم کے نام سے "آخری صفحہ" لکھتے تھے۔ ان کی سوشلسٹ نظر قومی اور بین اقوامی معاملات پر بہت گہری ہے۔ ان کا قلم بہت ہی بے باک ہے۔ "سیاہ سورج اور سفید سائے" "خواب تھا یا افسانہ" "دلی جو ایک شہر تھا" وغیرہ ان کے مشہور کالم ہیں۔

ابراہیم جلیس کا انداز بیان نکھرا ہوا اور شگفتہ ہے۔ انھوں نے "چور بازار" "دو ملک ایک کہانی" "آزاد غلام" "چالیس کروڑ بھکاری" میں جو طنز پیش کیا ہے اس میں برصغیر کی ناہمواریوں کے دکھوں کو شوخی میں ڈھال دیا ہے۔ کہیں کہیں لہجہ جذباتی اور طنز آمیز ہے۔ ان کا خاص جوہر بے باکی اور حق گوئی ہے۔

یوسف ناظم الفاظ کی نشست و برخواست، جملوں کے الٹ پھیر سے شوخی و ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ ان کے یہاں سماجی، تہذیبی، سیاسی اور دفتری نظام کی ناہمواریوں پر طنز سے مزاح ابھرتا ہے۔ "کیف و کم" "فٹ نوٹ" "سائے اور ہمسائے" "آسمان سے کھجور میں" اور "سہرا" ان کی انشاپردازی کے شاہکار ہیں۔

فرقت کاکوروی کا انداز قدیمی ہے وہ سرشار کے اسلوب کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی زبان میں لکھنویت کی پوری جھلک موجود ہے۔ ان کی تحریروں کے محرکات زیادہ تر ہنگامی حالات ہوتے ہیں ــــ وجاہت علی سندیلوی نے انشائیوں کے ذریعے طنز و مزاح کے پیرائے میں تازگی و شگفتگی کے ساتھ سماجی معنویت کو جگہ دی ہے۔

طنز و مزاح میں ایمائی اور تمثیلی پیرایۂ بیان میں احمد جمال پاشا نمائندہ اسلوب کے مالک ہیں۔ ان کے فکر و فن کا دائرہ بہت وسیع ہے انھوں نے طنز و مزاح میں اظہار اور تکنیک کے کچھ کامیاب تجربے بھی کیے ہیں۔ "ادب میں مارشل لا" "رستم میدان امتحان میں" "ایک چائے کی پیالی" "چند حسینوں کے خطوط" ان کی بہترین تخلیقات ہیں۔

نئے مزاح نگاروں میں مجتبیٰ حسین کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ ان کا فن تفکر و تفنن سے تعلق رکھتا ہے اور بقول محمد حسن "مجتبیٰ حسین زندگی اور الفاظ کے پیچھے بنتی بگڑتی لطافتوں سے پیکر تراشی کا ہنر رکھتے ہیں اور طنز سے نہیں خوش دلی سے لطف سخن پیدا کرتے ہیں۔" وہ نہ خود ہنستے ہیں اور نہ ہنسانے کی تحریک دیتے ہیں بلکہ فضا بندی ہی قاری کو ہنسنے پر مجبور کرتی ہے وہ سماج کی محرومیوں اور تلخیوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے یہاں عصر کے بصیرت میں سماجی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے ساتھ تجربات و مشاہدات میں وسعت اور گہرائی ہے۔

موجودہ عہد کے اہم اور ممتاز مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی ہیں۔ ان کے فن نے موجودہ عہد میں طنز و مزاح کو تفنن و تفکر اور مسرت و بصیرت عطا کیا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں میں توانائی و تازگی، ادبیت اور نکتہ سنجی، ظرافت اور طنز کی حسین آمیزش نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے فن کو تخلیقی حسن کے ساتھ عصری بصیرت اور عصری مذاق و فکر سے آشنا کیا ہے۔

عصر حاضر میں اردو نثر میں طنز و مزاح کے اس اجمالی جائزے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ طنز و مزاح نے فکر و فن اور زبان و اسلوب کے اعتبار سے کافی ترقی کی ہے۔ گرچہ طنز و مزاح نگاروں کی کمی کا احساس شدت سے ہوتا ہے لیکن یہ احساس بہت حد تک ان چند مزاح نگاروں کی وقیع تخلیقات کم کر دیتی ہیں۔

خواجہ محمد اکرام الدین

عظیم بیگ چغتائی کا اُسلوب

عظیم بیگ چغتائی اردو طنز و مزاح میں نمایاں اور منفرد اسلوب کے حامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں شوخی و شگفتگی، خوش مذاقی اور شیریں بیانی ہر جگہ موجود ہے وہ معمولی سے مضمون کو بھی اپنے اسلوب کی طرفگی سے قابل قدر بنا دیتے ہیں۔ آسان اور عام فہم زبان میں مزاح پیدا کرنے کا انھیں خوب سلیقہ آتا ہے۔ ان کے اسلوب کی تشکیل میں خود ان کی پُر بہار شخصیت اور گھریلو ماحول کا خاص دخل ہے۔ عظیم بیگ چغتائی کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے تھا۔ ان کی طبیعت میں شوخی و شرارت کے عناصر زیادہ تھے۔ گھر کے ماحول اور تعلیم و تربیت نے ان کی شخصیت کو مزید نکھارا۔ گھر کا ماحول تھا جہاں بھائی بہنوں میں ادبی مباحثہ اور مذاکرہ آئے دن ہوا کرتی تھیں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دارالاقامہ کی خاصی روش، سنجیدہ مذاق، خوش گپیاں، فقرہ تراشی اور جملہ بازی میں یہ جم کر حصہ لیتے تھے۔ ایک تو ان کی پُر بہار شخصیت اوپر سے اس طرح کے ماحول نے ان کی شخصیت کو اور بھی زیادہ باغ و بہار بنا دیا۔ ان کی گفتگو کا انداز بڑا نرالا تھا۔ شوخی و شگفتگی اور دلچسپی ایسی تھی کہ لوگ گھنٹوں ان کی باتیں سنتے اور مسرور ہوا کرتے اور یہ بات کرتے تھکتے بھی نہ تھے۔ ان کی تحریروں میں مذکورہ تمام باتیں بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے مشہور افسانے "انگوٹھی کی مصیبت" سے ہوتا ہے جو رسالہ "نیرنگ خیال" میں شائع ہوا۔ اس افسانے کی زبان اور طرز ایسا دلنواز تھا کہ چھپتے ہی عظیم بیگ کا نام شہرت کی بلندی کو جا پہنچا۔ حالاں کہ انھوں نے اسکول کی تعلیم کے دوران ہی "قصر صحرا" لکھا اور انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس کا دوسرا حصہ لکھا۔ مگر ادبی شناخت "انگوٹھی کی مصیبت" سے ہی ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے متواتر کئی افسانے لکھے اور مقبول ہوتے گئے۔

ان کی ادبی زندگی کل گیارہ برس کی تھی اس قلیل عرصے میں انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں ان کی تصنیفات کی تعداد تقریباً ۳۲ ہیں۔ جن میں زیادہ تر افسانے اور ناول ہیں اور دیگر موضوعات پر مضامین بھی ہیں اور سب کے سب ظرافت سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے ناولوں میں "شریر بیوی"، "فل بوٹ"، "چمکی"، "کولتار"، "ویمپائر"، "خانم" بہت مشہور ہوئے۔ "روح ظرافت"، "روح لطافت"، "انگوٹھی کی مصیبت"، "چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز" ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں اور مزاحیہ مضامین میں "ملفوظات ٹامی" اور "مضامین چغتائی" بہت ہی اہم ہیں۔

ان کی بیشتر تخلیقات کی فضا محبت، شرارت اور کھلنڈرے پن کے گرد گھومتی ہے۔ "کولتار"، "شریر بیوی"، "چمکی" اسی قبیل کی تصنیف ہیں جن میں شرارتیں ہی شرارتیں بھری پڑی ہیں۔ ان کی یہ شوخی غیر بالیدہ ذہن کو محظوظ کر سکتی ہے مگر سنجیدہ ذہن کے لیے یقینی طور پر بار گزرتا ہے۔ پھر ان کی تحریروں میں تکرار اس قدر ہوتی ہے کہ بعض دفعہ ان کے مزاح میں پستی کا شائبہ ہونے لگتا ہے اسی لیے کلیم الدین احمد اسے "انڈر گریجویٹ" ذہنیت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اسے اگر طالب علمانہ کارنامہ سمجھائے تو لائق تحسین ہے۔" یہ خیال بہت حد تک درست ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ زبان و بیان کی قدرت اور انداز کی دلکشی نے ان کی خامیوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ کیوں کہ عظیم بیگ چغتائی کچھ اس انداز سے لکھتے ہیں کہ ہر ہر لفظ اور فقرے سے مزاح کا بھرپور لطف ملتا ہے اور انھوں نے اردو ادب کو جس قدر افسانے، ناول اور مزاحیہ مضامین دیا ہے وہ ایک سے بڑھ کر ایک ہیں جو طنز و مزاح کے بیش قیمت سرمائے ہیں۔ ان کی تمام تخلیقات اپنے اندر ہنسنے ہنسانے کا بھرپور سامان لیے ہوئے ہیں کیوں کہ وہ لکھتے ہی اس انداز سے ہیں جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو یا واقعہ سنا رہا ہو۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں ایک کے بعد دوسرا واقعہ اس خوبصورتی اور برجستگی سے بیان ہوتے ہیں کہ اس سے شگفتگی اور ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوٹتی نظر آتی ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی کا محبوب موضوع

٭۱۳۰ سابرمتی ہوسٹل، جے۔ این۔ یو، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

"عشق و محبت" ہے اور "جوانی کی شرارتیں" جہاں وہ جوانی کی دلچسپ شرارتوں اور خوش فعلیوں کو بیان کرتے ہیں وہاں ان کے قلم میں اور زیادہ روانی آجاتی ہے اور لب و لہجے سے شیرینیت ٹپکنے لگتی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کو زعفران زار بنانے کے لیے عملی مذاق کا حربہ بھی استعمال کیا ہے اور کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ "چینی کی انگوٹھی اور لوٹے کا راز" سے عملی مذاق کا ایک نمونہ دیکھیں :

> "زور سے سیٹی بجی گاڑی چھوٹنے کی اور اس نامعقول سیٹی کو سن کر ہم دونوں گویا ایک دم جاگ اٹھے اور بھاگے ہم دونوں، مگر شذوی بھائی مع چائے کی پیالی کے، جس کا کنڈا ان کی انگلی میں پھنس گیا تھا۔ ادھر ہوٹل والے نے دیکھا کہ مسافر چائے کی پیالی پار کیے جاتا ہے کہ لپکا کر لینا۔ اب ایک وقت میں شذوی بھائی کے ذمہ دو کام تھے ایک تو چائے کی پیالی سے نجات حاصل کرنا جس کا کنڈا ان انگلی میں پھنسا ہوا تھا دوسرے سر پر پیر رکھ کر بھاگنا کہ کہیں گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ نتیجہ میں خود معلوم کر سکتے ہیں کہ سوائے اس کے اور کیا ممکن تھا کہ کسی عجیب و غریب طریقے سے انگلی میں چائے کی پیالی کا صرف کنڈا ہی کنڈا رہ جائے۔"

اس طویل افسانے میں اس ایک واقعہ نے جان ڈال دی ہے۔ واقعہ کی شوخی اور تحریر کی شگفتگی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کی سادہ اور صاف ستھری عبارت قاری کو بار بار قہقہہ لگانے پر مجبور کرتی ہے۔ اس اقتباس میں گفتگو کا سا انداز ہے اور بیچ بیچ میں برجستہ محاورے بھی آتے ہیں مثلاً پار کرنا، لپکا کر لینا، سر پر پیر رکھ کر بھاگنا وغیرہ۔

عظیم بیگ چغتائی کے اسلوب کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مکالموں سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ایسی تحریریں جن میں مکالماتی انداز ہے اکثر چھوٹے چھوٹے جملے ہوتے ہیں اور زبان عام فہم اور سادہ و سلیس ہوتی ہے۔

واقعات کی ناہمواری اور کرداروں کی بدحواسی سے بھی مزاح پیدا کرنے میں عظیم بیگ یکتا نظر آتے ہیں۔

"خانم" میں شوخ و چنچل بیوی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے شوہر کن کن مضحکہ خیز حالات کا شکار ہوتا ہے اسے اس ناول کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور وہ کس طرح ہمیشہ بیوی کے رعب و دبدبہ سے بدحواس رہتا ہے اس کا انداز ملاحظہ فرمائیں :

> "یہ میرا ملازم تھا۔ میں نے آواز دے کر بلایا۔ کیوں کیسے آئے ہو؟"
> "کچھ نہیں صاحب .... دیکھنے بھیجا تھا۔"
> "اور کچھ کہا تھا۔"
> "جی نہیں ــــ بس یہی کہا تھا دیکھ کے چلے آنا جلدی سے۔"
> "تو دیکھو" میں نے کہا۔ "کیا کہو گے جا کے؟ یہ کہنا کہ خاں صاحب کے یہاں نہیں تھے ــــ یوسف صاحب کے یہاں تھے۔ مگر نہیں۔ تم سے تو یہی کہا کہ خاں صاحب کے ہاں دیکھ لینا تو بس یہی کہہ دینا کہ نہیں تھے۔ دیکھو" "لاحول ولاقوۃ" خانصاحب نے بگڑ کر کہا۔ ارے میاں تم آدمی ہو کہ ہنج شاخہ۔ بیوی نہ ہوئی نعوذ باللہ وہ ہو گئی۔"

ان تمام اقتباسات سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ دراصل ان کے انداز بیان کی جدت و ندرت نے ہی ان کی تحقیقات کو قابل قدر بنایا اور چوں کہ وہ شوخ طبع واقع ہوتے ہیں اس لیے تحریر میں شوخی و شرارت کا رنگ نمایاں ہو گیا ہے۔ اس شوخی نے معمولی سے معمولی واقعات میں ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور طبیعت پر گرانی محسوس نہیں ہوتی بلکہ ہر بار لطف و انبساط ہی ملتا ہے۔

عظیم بیگ چغتائی کو ظرافت میں ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ افسانے ہوں یا ناول یا مضامین ہر جگہ ظرافت ہے اور میں خلوص و ہمدردی کے عناصر ہر جگہ موجود ہیں۔ کیوں کہ وہ اصلاحی مقاصد کے تحت ان شرارتوں اور مضحکہ خیز کرداروں کو پیش کر کے ناہمواری کو دور کرنا چاہتے تھے لیکن کہیں بھی ناصحانہ اور خطیبانہ انداز نہیں بلکہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے بھی اسے شوخی و شگفتگی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو انھیں مزاح نگاروں میں فن اور اسلوب ہر اعتبار سے انفرادیت اور اہمیت حاصل ہے۔ ان کی تحریروں کا پس منظر اپنی تہذیب و معاشرت ہے اور مزاح کے پس پردہ پنہاں جذبات اصلاح و ہمدردی سے مشتق ہیں اور زبان و بیان کی سادگی و برجستگی ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے ان کی سادہ تحریروں میں بھی بلا کی رنگینی و دلکشی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عظیم بیگ چغتائی ایک مخصوص اسلوب بیان کے مالک ہیں۔ وہ سادہ و سلیس عام فہم اور بے حد دلچسپ زبان لکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں عجیب و غریب ترکیبوں، محاوروں اور استعارات سے مزین ہیں۔ مزاحیہ رنگ میں نسائی زبان خوب لکھتے ہیں۔ ان کے بعض جملوں میں ایسی ترکیبیں بھی موجود ہیں جن سے مزاح تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے مگر اعلا ادبی وقار نہیں آپاتا کیوں کہ عموماً ان کی تحریروں میں تعزیکی باتیں ہیں۔ تاہم اردو کے مزاحیہ اسلوب میں انھیں ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ ●

بقیہ کور ۴ : بنیادی تعلیم کا نیا پروگرام

قومی حکومتوں کو عوام کی مدد سے ہی چلانا ہوتا ہے۔

پچھلے ماہ ایک امدادی ادارے کے ذریعہ پروگرام کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس نے انتظامی ڈھانچے اور استعدادی فروغ کے لیے اقدامات پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اس پروگرام میں شامل ہر ریاست میں امدادی سوسائٹیوں کا رجسٹریشن کیا گیا ہے جو تفرقات دور کرنے کے لیے ایک قابل عمل میکنزم فراہم کریں گی۔ اس نے اس بات پر بھی مسرت کا اظہار کیا کہ پروجیکٹ کے تحت تمام اسکولوں کے لیے اسکولوں کے نقشے، مقامات کی فہرست، تعمیراتی ڈرائنگ، پانچ سالہ عملی پروگرام اور بجٹ پر کام مکمل کر لیا گیا ہے۔ ●

کوثر مظہری (ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ

ادب، تہذیب اور سماج

کوئی بھی ادب سماج سے الگ ہو کر تخلیق نہیں ہوتا۔ ادب اور معاشرے میں ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ DE BONALD نے اٹھارہویں صدی میں کہا تھا: LITERATURE IS THE EXPRESSION OF SOCIETY اس کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ادب سے معاشرے اور ثقافت کو ایک سمت و رفتار ملتی ہے۔ تعقل، فنی اوصاف، ذوق و شوق، اقدار و معیار، حقائق سے متعلق مفروضے، تجربی عقائد، زبان اور بولی اور اسلوب فن وغیرہ ایسے اہم عناصر ہیں جو ادب کی تخلیق میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ سماج کے NORMS محض عارضی تحریکات سے نہیں بنتے بگڑتے۔ سید عبدالباری نے اپنی تصنیف "لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر" میں لکھتے ہیں:

"عہد وسطیٰ کا ادب ہو یا شاہی دور کی تخلیقات، رومانی عہد کے شہ پارے ہوں یا عہد جدید کی کاوشیں، ہمیں ہر جگہ معاشرہ کی مروجہ اقدار کی واضح جھلک ادب میں ملتی ہے۔"

ادیب یا شاعر جو کچھ بھی سوچتا ہے اور اپنے دائرہ فکر میں جو محل بھی تیار کرتا ہے اس میں معاشرہ کے تہذیبی و معاشرتی عناصر کی کارفرمائی لازمی طور پر ہوتی ہے۔ مثلاً جس دور میں لکھنؤ کی فضا پر تعیش اور جنسی رجحان غالب تھا، فکر کا معیار اس درجہ پست ہو گیا تھا کہ ابتذال اور سوقیانہ پن شاعروں اور ادیبوں کا طرۂ امتیاز بن گئے۔ اسی بنیاد پر اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہر دور کا ادب اپنے دور کے سماج کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ فرد، سماج اور شعر و ادب کے رشتے کو ڈاکٹر سید عبدالباری نے اس طرح پیش کیا ہے۔
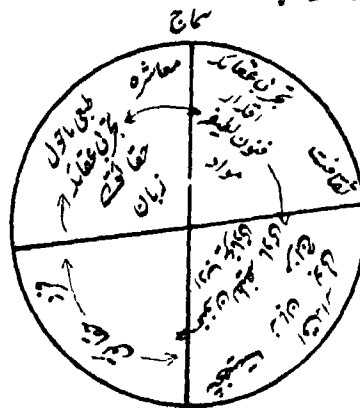
اس دائرے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معاشرے میں تہذیبی سفر فرد سے شروع ہوتا ہے۔ انسان پہلے طبعی ماحول اور تجربات سے گزرتا ہے جو اس کے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سماج کی زبان اور بولی سیکھتا ہے اور حقیقتوں سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ اس عمل میں اس کے دل و دماغ پر اقدار کی چھاپ پڑتی ہے۔ اب اس کا ذہن فنون لطیفہ کی طرف مائل ہوتا ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ فنون لطیفہ کی ترقی یافتہ شاخ "ادب" کو اپنا کر تخلیقی سفر شروع کرتا ہے۔ اس تخلیقی سفر کے لیے اسے اپنے گرد و پیش سے مواد حاصل ہو جاتے ہیں۔ حقیقتوں سے فرار حاصل کر کے کسی سچے ادب پارہ کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ علامہ اقبال بقول

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا؟

کسی ادب پارے کے مطالعہ سے کسی عہد کی ذہنی و عقلی رفتار سفر کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اس میں معاشرے کی قدریں موجزن ہوتی ہیں۔ اگر ہم اشوگھوش کے مشہور رزمیہ "بدھ چرت" کا مطالعہ کریں تو گوتم بدھ کی زندگی اور اس عہد کی تہذیبی و معاشرتی قدریں بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ اسی طرح "سوترالنکار" میں برہمنوں اور جینیوں کے مذہبی فلسفہ کی تردید کے ساتھ ساتھ اس میں مختلف رسم خط، صنعتی فنون اور اس عہد کی مصوری کی طرف بھی واضح اشارے ملتے ہیں۔ اسی طرح کالی داس کی دو کاویہ طرز کی تصانیف کمار سمبھو اور رگھو ونش اہمیت کے حامل ہیں۔ "کمار سمبھو" میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیو اور ہمالہ کی بیٹی پاروتی کا بیاہ کس طرح ہوا۔ "رگھو ونش" میں رام چندر جی کے خاندان کی تاریخ بیان کی گئی ہے بساتھ ہی اس عہد کے تمام تر تہذیبی و ثقافتی عناصر جگہ جگہ ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔ ویدوں اور پرانوں کے قصے اور اس وقت کے طرز معاشرت کا عکس بھی ملتا ہے۔ کالی داس کی اہم تصنیف "میگھ دوت" (۱۱۲ رباعیات ہیں)

۹/۳۴۳ ۔ ذاکر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کے مطالعہ سے اس عہد کے دیوی دیوتاؤں کی عظمت وعقیدت اور غلام اور آقا کے مابین جذبۂ اطاعت وعدالت کی تصویر ملتی ہے۔ اسی طرح عہد قدیم کے شاعر راجہ بھرتری ہری کی تخلیقات کے مطالعہ سے شیو پوجا اور اس دور (۷ویں صدی عیسوی) کے تہذیبی، معاشرتی اور مذہبی پہلوؤں پر خاص روشنی پڑتی ہے۔ داستانوں اور قدیم ادب پاروں سیر و تفریح کا شوق، تہواروں کی کثرت، طوائفوں کو گھر میں رکھنا، رقص و سرور کی محفلیں منعقد کرنا، عورتوں اور مردوں کا یکساں طور پر بن ٹھن کر زیورات اور ہاروں سے سج سجا کر گھر سے باہر نکلنا، غرض یہ کہ اس عہد کی روایتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ ذہن کمار جیرت اور کتھا سرت ساگر کا مطالعہ کریں تو اس عہد کی تہذیبی زندگی کے ساتھ ساتھ مصوری، سنگ تراشی، نقاشی اور فنون لطیفہ کی دوسری شاخوں سے بھی آگاہی ہوتی ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ فرد، سماج اور ادب میں رشتہ ہے جو ناگزیر طور پر کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ بقول مجنوں گورکھپوری:

"ادیب کوئی جوگی یا راہب نہیں ہوتا اور ادب ترک یا تپسیا کی پیداوار نہیں ہے۔ ادیب بھی اسی طرح ایک مخصوص ہیئت اجتماعی، ایک خاص نظام تمدن کا پروردہ ہوتا ہے جس طرح کہ دوسرا فرد اور ادب بھی براہ راست ہماری معاشی اور سماجی زندگی سے اس طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے حرکات وسکنات۔"

(ادب اور زندگی۔ ص ۴۸)

رچرڈ ہوگرٹ کا قول بھی نقل کرنا یہاں بیجا نہ ہوگا۔ پروفیسر محمد حسن نے اسے اپنی کتاب ادبی سماجیات میں نقل کیا ہے۔

WITHOUT THE FULL LITERARY WITNESS THE STUDENT OF SOCIETY WILL BE BLIND TO THE FULLNESS OF THE SOCIETY

یعنی یہ کہ سماج کا طالب علم (فرد) علم سماج کی تکمیل کے لیے ادبی گواہ (ادبی پارے) کا کسی قدر محتاج ضرور ہے۔ کسی بھی عہد کے سماج کو سمجھنے کے لیے اگر اس عہد کے ادب پاروں کا سہارا لیا جائے تو کافی مدد مل سکتی ہے۔ ہومر کے رزم نامے ایلیڈ اور اوڈیسی میں جس طرح رزمیاتی تہذیب جھلکتی ہے اسی طرح کی چیز مہابھارت اور رامائن (بالمیکی) میں بھی ملتی ہے۔ اس کے بعد FEUDAL AGE آیا جس کا اثر ہندوستان میں تقریباً ۱۸۵۷ء تک باقی رہا۔ اس جاگیردارانہ نظام کی جھلکیاں دانتے کی ڈیوائن کامیڈی، چاسر کی حکایات کینٹربری (CANTER BURY TALES) فردوسی کی تصنیف شاہنامہ، جائسی کی پدماوت وغیرہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں مشترکہ تہذیب کو فروغ حاصل ہوا۔ داراشکوہ جو ہندو فلسفہ اور تصوف کا معتقد تھا، نے اپنشدوں، بھگوت گیتا اور یوگ وششٹ کا ترجمہ کرایا۔ اس نے خود بھی ہندو اور اسلامی تصوف کا تقابلی مطالعہ کر کے "مجمع البحرین" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ اس عہد میں ہندو مسلم دونوں کے طرز معاشرت، وضع و لباس، خورد و نوش کے طریقے تقریباً ایک سے تھے۔ جب انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر ہوا تو مغربی تہذیب نے مشرقی تہذیب کو متاثر کرنے لگی۔ ظاہر ہے اس عہد کے ادب میں نئی تہذیبی زندگی نظر آنے لگی۔

کسی عہد کی تہذیب ادب کو کس درجہ متاثر کرتی ہے اس کا اندازہ لکھنؤ کی زوال آمادہ معاشرت سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہزار افتاد کے باوجود لکھنؤ کے عشرت کدے جلوہ ریزیاں اور طوائف نوازی عام رہی۔ یہ حسن پرستی اور طوائف پروری اس تہذیب کا حصہ بن گئی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

"چوں کہ لکھنؤ میں حسن و جنس سے دلچسپی لینا اہم جزو معاشرت ہو گیا تھا اس لیے نفس پروری کے سارے سامان معاشرہ کو عزیز تھے۔ چناں چہ عورت کی ذات سب سے قریب ہو گئی تھی۔ اس کی ذات سے مختلف جذبات آسودہ ہوتے تھے۔ وہ پُرفن تھی اور فنکار بھی۔ اس سے جسم و روح دونوں کی تشنگی دور ہو سکتی تھی۔ اس لیے لوگوں کی دلچسپیاں سمٹ کر ایک ذات سے وابستہ ہو گئی تھیں۔"

لکھنؤ کے شعرا کی نظر بھی خارجی حسن اور لوازمات حسن پر ٹکی رہی۔ آتش کا یہ شعر دیکھیں ؎

رہا کرتا ہے نظم شعر کا سودا مرے سر میں
عروس فکر ان روزوں لدی رہتی ہے زیور میں

اس عہد میں ہی دہلی کے شعرا اپنے شعروں میں انتشار اور غم و الم کو پیش کر رہے تھے جب کہ لکھنوی شعرا شاہان اودھ کے عام تعیش پسندی اور تہذیبی لباط کو موضوع شعر بنائے ہوئے تھے۔ محبوب اور طوائفوں کے زیورات، سج دھج اور چال ڈھال کو اپنے فن کا حصہ بنایا۔ جرأت کو ملاحظہ کریں ؎

انکھڑیاں جادو ہیں پلکیں برچھیاں، بھالا نگاہ
بانکی چتون ہائے تیری دل کو کیا کیا بھائے ہے
رہتے ہیں یاقوت سے بن پان کھائے سرخ ہونٹ
اور چمک دانتوں کی موتی کی لڑی دکھلائے ہے

شاعری کے علاوہ مرزا ہادی رسوا کے ناول "امراؤ جان ادا" اور سرشار کے فسانۂ آزاد کو دیکھ لیں جو اسی تہذیب و ثقافت کا ثمرہ ہیں۔ تو کیا یہ بات واضح طور پر سامنے نہیں آئی کہ ادب سماج کا آئینہ ہے؟ آخر دہلوی شعرا بانشاط ایسا ادب پارہ کیوں خلق نہیں کر پا رہے تھے جیسا لکھنؤ والے کر رہے تھے؟ ظاہر ہے دہلی پر افتاد پڑی تھی۔ خستہ حالی، معاشی، تعلیمی اور فکری بحران نے شاعروں اور ادیبوں کو بہت حد تک مایوس کر دیا تھا۔ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا کار اسی انتشار کا صحیح علاج تلاش کر رہے تھے۔ اس تحریک نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو متاثر کیا۔ اردو شعر و ادب میں بھی نیا موڑ آیا۔ دیانند سرسوتی کی تنظیم (۱۸۷۵ء) آریہ سماج ہو یا کلکتہ میں قائم کردہ رام کرشن مشن (۱۸۹۷ء) ہو، سب کا مشن یہی تھا کہ انسانی مفلوج شعور کو تقویت بخشی جائے۔ معاشرے میں جو اخلاقی، اقتصادی اور مذہبی بحران ہے اس کی اصلاح کی جائے۔ ہندو اور مسلم دونوں فرقوں کے رہنماؤں نے اس کے لیے کوششیں کیں۔ شری وویکانند نے رام کرشن مشن کو اور بھی فروغ دیا۔ ۱۸۹۳ء میں جب وہ شکاگو عالمی مذاہب کے اجتماع میں گئے تو انھوں نے عالم گیر اخوت پر تقریر کی۔ ادھر سرسید، حالی، آزاد، اکبر، شبلی وغیرہ نے اپنے افکار کو سماجی اور ادبی زندگی کی تعمیر میں خرچ کیا۔ لہٰذا جب ادب کے مطالعہ کی

باقی صفحہ ۵۴ پر

ہے راہِ ترقی پہ وطن۔۔۔

راجندر بہادر موج

امید کے سورج کی کرن دیکھ رہا ہوں
بنتا ہوا سونے کا گگن دیکھ رہا ہوں

پھولوں میں نیا رنگ ہے پتوں پہ نیا روپ
بھرپور بہاروں پہ چمن دیکھ رہا ہوں

جس نور سے مٹ جائے گی نفرت کی سیاہی
اس نور کو پھر جلوہ فگن دیکھ رہا ہوں

موجوں میں نیا عزم ہے لہروں میں جوانی
پیغام بہ لب گنگ و جمن دیکھ رہا ہوں

ہونے کو ہے اب ختم ستم کاریِ اغیار
بدلا ہوا اب رنگ چمن دیکھ رہا ہوں

مٹنے کو ہیں اب ظلم کے ظالم کے فسانے
کچھ ایسے ہی دنیا کے چلن دیکھ رہا ہوں

ہر خار کی صورت سے نمودار ہے ہمت
ہر شاخ کے سینے میں چبھن دیکھ رہا ہوں

طوفان کا منہ پھیر دیں اب حوصلہ یہ ہے
پُرجوش ہیں اب اہلِ وطن دیکھ رہا ہوں

تیار ہیں رکشا کے لیے اپنے سپاہی
شمشیر بہ کف سرو سمن دیکھ رہا ہوں

ہے جذبۂ ایثار ہر اک پیر و جواں میں
ہے راہ ترقی پہ وطن دیکھ رہا ہوں

اے موج یہ پھیلا ہوا طوفانِ ترقی
ہر فن کے یہاں ماہرِ فن دیکھ رہا ہوں

موج مارگ فتح گڑھ۔ یو پی

غزل

معصوم انصاری

یہ زمیں پانی میں ہے اور آسماں پانی میں ہے
چشمِ تر سے دیکھیے سارا جہاں پانی میں ہے

فکر رہتی ہے نہنگوں کی طرف سے ہر گھڑی
نیند کیا آئے اسے جس کا مکاں پانی میں ہے

کیفیتِ دل کی بیاں کرتے ہیں پلکوں کے چراغ
فرطِ غم کی اک سلگتی داستاں پانی میں ہے

غالباً دیکھا نہیں ہے تم نے موسم قحط کا
ہم سے پوچھو زندگی کا سکھ نہاں پانی میں ہے

رات، دریا کا کنارہ، سر پہ تاروں کی برات
نور آسا کارواں در کارواں پانی میں ہے

دھند سی چھائی ہوئی معصوم سطحِ آب پر
سرد رُت میں کس کی آہوں کا دھواں پانی میں ہے

۳۴۸/۲۶ سید بلڈنگ تیسری منزل بالا کمپاؤنڈ بھیونڈی

غزلیں

منصور سبزواری

شرط اپنا اطلبی ہے تو نہ ہاری جائے
عمر زخموں کے سفر میں ہی گزاری جائے

بچپن کو جوڑتا ہوا اب جال کٹ گیا
ماں مرگئی تو جیسے مرا نال کٹ گیا

اب کسی گھر سے تحفظ نہیں ملنے والا
اپنے ہی جسم میں ہر رات گزاری جائے

پشمینہ پہنے گھومتا ہے سردیوں میں شہر
بھیڑیں تو برف پوش ہوئیں مال کٹ گیا

ختم ہوتا تھا کبھی پہلے پرندوں کا وجود
اب کے اس کھیل میں لگتا ہے شکاری جائے

کس نے سکھا دیے تجھے آداب ہجر کے
مجھ سے ملے بغیر ترا سال کٹ گیا

دیر تک ٹھیک نہیں ساتھ عدو کو رکھنا
لے کے گھر سے کوئی سانپوں کی پٹاری جائے

کوئی چھپا ہوا تھا پس سطح آب ابھی
اک دائرہ بہ شکلِ خد و خال کٹ گیا

حرف مصلوب پہ دلوا انا ٹھہری ہے
سچ کی گردن نہ کہیں مفت میں ماری جائے

جو اپنے قاتلوں کو بھی دیتا تھا خوں بہا
وہ بھوکا پیاسا شخص مع آل کٹ گیا

پوسٹ نوح، ضلع گوڑگانو، ہریانہ، ۱۲۲۱۰۷

ڈاکٹر نریش

درمیاں ان کے فاصلہ رکھنا
ذہن و دل کو جدا جدا رکھنا

دشمنوں سے بھی رابطہ رکھنا
سامنے اپنے آئینہ رکھنا

کیا خبر کب دعا اثر آئے
اک دریچہ کوئی کھلا رکھنا

اے غم یار دل کے زخموں سے
میرا آنگن ہرا بھرا رکھنا

عشق کرنے کا شوق ہے تو نریش
جاں دینے کا حوصلہ رکھنا

پروفیسر و صدر شعبۂ جدید ادب، پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ

غزلیں

مدہوش بلگرامی

ان کی ہو جائے گی جب مجھ پہ نظر شام ڈھلے
اشک بن جائیں گے آنکھوں میں گہر شام ڈھلے

درد کا ہوتا ہے جب دل پہ اثر شام ڈھلے
رنگ لاتا ہے مرا دیدۂ تر شام ڈھلے

میں یہ سمجھا کہ مجھے مل گئی میری منزل
جب نظر آنے لگی گردِ سفر شام ڈھلے

کتنی نظریں لگی ہوتی ہیں مرے ہاتھوں پر
جب میں آتا ہوں کبھی لوٹ کے گھر شام ڈھلے

جب سے تپتے ہوئے سورج کا بدن سرد ہوا
تیرگی پھیلی ہے تا حدِ نظر شام ڈھلے

راہبر بن گئے ماضی کے سنہرے سپنے
جب ہوا راہِ محبت سے گزر شام ڈھلے

۲۲۳، بہرا سوداگر مشرق، ہردوئی۔ ۲۴۱۰۰۱

معین فیاضی

نام اُجالے کا لے لے کر رات کرے ہیں طاری لوگ
ظرف کے کتنے ہلکے نکلے پتھر جیسے بھاری لوگ

اُن لوگوں کا چہرا چومو اُن لوگوں کی قدر کرو
صبح کو لانے کی خاطر جو کرتے ہیں تیاری لوگ

نیچے چلنے پھرنے والے کچھ تو بلندی پر آئیں
ہر اک کو یہ فکر ہے اب تو بن جائیں عماری لوگ

میں ہر دشواری پر اب تو قابو پانے والا ہوں
لاکھ کریں رستوں میں پیدا میرے لیے دشواری لوگ

جس کو دیکھو معینؔ یہاں اک خوابِ گراں میں غلطاں ہے
بھول گئے ہیں جیسے اب تو مفہومِ بیداری لوگ

انچارج اردو تعلیمی کلاسس، گلشن صفی اردو گھر مغلپورہ حیدرآباد

شہناز چاندنی

یوں تو قدم قدم پہ شناسا ملے گا دوست
قسمت میں یہ کہاں ہے کہ تم سا ملے گا دوست

کترا کے آپ ہم سے کسی سمت جائیے
رستہ ہمارے دل سے وہیں جا ملے گا دوست

تو ہے اگر کتاب تو پڑھ لیں گے ہم تجھے
لیکن مطالعے کا صلہ کیا ملے گا دوست

دنیا غرض پرستوں سے آگے کی چیز ہے
دنیا میں کوئی کیسے کسی کا ملے گا دوست

شہنازؔ جس کو پاس محبت ذرا بھی ہے
میلے میں زندگی کے وہ تنہا ملے گا دوست

ڈھولی کھال سہارنپور، یوپی۔ ۲۴۷۰۰۱

تبصرے

نام کتاب	:	حرف وصدا
مصنف	:	محمد فاروق خاں فرآز سلطانپوری
صفحات	:	۲۰۸
قیمت	:	۱۰۰ روپے
ملنے کے پتے	:	۱۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔۶ ۲۔ مرکزی مکتبہ اسلامی ۱۳۵۳ چتلی قبر دہلی۔۶ ۳۔ نصرت بکڈپو حیدری مارکیٹ امین آباد لکھنؤ۔۱۸
مبصر	:	طاہر اسلم

متعدد نثری کتب مصنف و مؤلف محمد فاروق خاں فرآز سلطانپوری کے اردو زبان میں پہلے مجموعۂ کلام کا نام "حرف وصدا" ہے۔ اس سے قبل ہندی زبان میں ان کی کتاب "چیتیج کے پار" ہندی زبان کے قارئین سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔

"حرف وصدا" فرآز کا پہلا مجموعۂ کلام ہی مگر اس کے عمیق مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ فرآز کو کبھی الہامی و وجدانی کیفیت کے عالم میں اور کبھی جذبۂ عشق و عقیدت کے ایمان افروز تقاضوں پر اپنی زندگی کے تلخ و شیریں محسوسات و تجربات کو بے حد سلیقے سے نظم کرنے کا فن، قدرتِ ایزد نے بہت پہلے سے ودیعت کیا ہوا ہے۔

فرآز زبان و بیان پر بخوبی قدرت، فنِ شعر پر مکمل گرفت اور کئی زبانوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ وہ اگرچہ روایات کے پابند نظر آتے ہیں مگر دورِ حاضر کی جدید کاریوں سے انحراف بھی نہیں کرتے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ان کا کلام قدیم وجدید طرزِ بیان سے آراستہ ہے۔

"حرف صدا" فہرست کے مطابق چھ عنوانات پر مشتمل ہے جو اس طرح ہیں۔۔۔
۱۔ نعت ۔۲۔ کشمکشِ حیات ۔۳۔ بارگاہِ رسالتؐ میں ۔۴۔ عام غزلیں۔ ۵۔ قرآنیات ۶۔ نظمیات۔

"کشمکش حیات" اور "عام غزلیں" ان عنوانات کے تحت ۹۵ غزلیں ہیں جن میں خاص اور عام کا فیصلہ قاری پر ہی چھوڑ دیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

"قرآنیات" میں سورۃ الفاتحہ، سورۃ الانفطار، سورۃ التین، سورۃ القدر، سورۃ القارعہ، سورۃ العصر، سورۃ الماعون، سورۃ النجم اور سورۃ الاخلاص کا منظوم ترجمہ ہے جو فرآز کی دینی بصیرت کا بیّن ثبوت ہے۔

"نظمیات" اس عنوان والے حصے میں ۲۰ نظمیں، ۵ گیت (جن میں چار ہندی کے ہیں) ۲ سہرے اور متفرقات کی صورت میں ۲ قطعات اور چار اشعار درج ہیں سہروں، قطعات اور اشعار سے قطع نظر نظموں میں "ہر آدمی بے ضمیر کیوں ہے" "حنا" اور "ایک عورت کا خطاب اپنے شوہر سے" قاری کو فوری طور پر متاثر کرتی ہیں۔

"حرف صدا" کا ٹائیٹل جاذب نظر، کاغذ دبیز و شفاف اور کتابت وطباعت بہت ہی نفیس ہے۔ ان تمام خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کتاب کی قیمت کو زیادہ نہیں کہا جاسکتا۔ ●

نام کتاب	:	ننھی منی باتیں حصہ دوم
شاعر	:	حیدر بیابانی
صفحات	:	۱۶
قیمت	:	۲۶ روپے
سالِ اشاعت	:	۱۹۹۲ء
ملنے کا پتہ	:	حیدر بیابانی "بسیرا" اچل پور شہر ۴۴۴۸۰۶۔ امراوتی، مہاراشٹر
مبصر	:	عادل اسیر دہلوی

زیر نظر کتاب ننھی منی باتیں حصہ دوم حیدر بیابانی کا بچوں کے لیے دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۸۴ء میں وہ ننھی منی باتیں حصہ اول مہاراشٹر اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کر چکے ہیں۔

ننھی منی باتیں حصہ دوم میں انھوں نے حصہ اول سے منتخب کچھ اچھی نظمیں بھی شامل کردی ہیں، جس کی وجہ سے کتاب کی ضخامت اور افادیت دونوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ننھی منی باتیں حصہ دوم فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

باقی صفحہ پر

جمیل اختر

ایک نئی انگریزی اردو ڈکشنری

میں آج آپ کو ایک ایسی انگریزی اردو ڈکشنری سے متعارف کرانے جارہا ہوں جو ابھی ابھی ترقی اردو بورڈ کے ذریعے شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہے۔ اس لغت کو پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم نے مرتب کیا ہے۔ یہ لغت مولوی عبدالحق کی انگریزی اردو ڈکشنری کے تقریباً ۶۰ سال بعد سامنے آئی ہے۔

یوں تو دنیا کی کسی بھی زبان میں لغت کی ترتیب و تدوین کا کام بے حد پیچیدہ اور کٹھن کام رہا ہے اور جہاں ذولسانی لغت کی تدوین کا معاملہ ہو تو یہ دشواری اور بڑھ جاتی ہے۔ جب تک دونوں زبانوں پر عبور حاصل نہ ہو یہ کام ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے دونوں زبانوں کے مزاج، اس کے آغاز و ارتقار اور ماخذ، صرف و نحو، روزمرہ اور محاورے، اس کے صوتیاتی نظام و لسانی ہم آہنگی اور اصطلاحات پر قدرت حاصل کرنا ضروری ہے۔ جب تک دونوں زبانوں کے خارجی و داخلی، ظاہری و معنوی تمام پہلوؤں سے آگاہی حاصل نہ ہوگی معنی و مطلب کی وہ تمام نزاکتیں جو الفاظ کے ظاہری پردوں میں پوشیدہ ہیں، مفہوم و مدعا کی وہ تمام باریکیاں جو ظاہری علامات یا سمبلز کی تہہ میں چھپی ہوئی ہیں ان تک رسائی ممکن نہ ہو سکے گی۔ اس لیے دونوں زبانوں کی روح اور مزاج اور اس کے جسمانی خدوخال کی مکمل اور مفصل معلومات ضروری ہے۔ ایک کامیاب لغت نویس کے لیے زبان کا یہ وسیع علم نہ صرف ضروری بلکہ لازمی ہے۔ اس کا کام محض مرتب کا نہیں ہوتا بلکہ وہ بہ یک وقت ایک ماہر لسانیات، ایک ناقد اور محقق کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ متروک اور مروّج الفاظ کی نشاندہی اور نئے الفاظ کی شمولیت کے ساتھ ساتھ اسے جدید علوم کی روشنی میں لغت کو سائنٹفک بنانا بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اس وادیٔ پُرخار میں ایک ذولسانی لغت نویس کو بڑی احتیاط سے قدم رکھنا اور بہت سنبھل کر چلنا ہوتا ہے۔

ان دشواریوں کے باوجود ذولسانی لغت کی تدوین کے مشکل ترین کام کو بہت سے لوگوں نے کیا۔ اردو میں ذولسانی لغت کی تدوین کا یہ سلسلہ عہد قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ہندوستان کی تمام جدید زبانوں کی طرح اردو کی ذولسانی لغات بھی یورپین اور خصوصاً انگریز عالموں نے لکھیں۔ ان مغربی عالموں نے اس سلسلے میں بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور لغات کا جو وسیع و وقیع سرمایہ چھوڑا ہے اس نے بعد کے لغت نویسوں کے لیے بھی مشعل راہ کا کام دیا ہے۔ انھیں مغربی عالموں کی لغات آج بھی رہبر و رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔

انگریزی۔ اردو لغت کے ابتدائی نقش اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں ہمیں جارج ہیڈلے کے یہاں نظر آتے ہیں۔ بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق۔

"اس نے اردو کی صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی جس میں انگریزی ہندوستانی لغت بھی شامل ہے"۔ پھر ذولسانی لغات کے اس سلسلے کو جسے فرگوسن، جان جیشوا کیٹلر، ڈنکن فوربس، پلیٹس، شیکسپیئر، جے بی گلکرائسٹ، ڈاکٹر فیلن، ہنری ہیرلس، لفٹننٹ روبک، ہیزل گرود، ریورنڈ کریون، ڈبلو ایل تھابرن، جی رینکنگ، ہنری گرانٹ نے جاری رکھا اور ہندوستانیوں میں دوسابھائی سہراب جی، متھرا پرساد، سداسکھ لال، مولوی عبدالودود، درگاپرساد نے بھی اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی لغات لکھی گئیں، لیکن مقبولیت عام گلکرائسٹ فیلن اور پلیٹس کی لغات کو ہی حاصل ہو سکی۔ پلیٹس کی لغت آج بھی معتبر لغات میں ایک ہے اور سب سے اچھی لغات شمار کی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا عالموں کی کاوشوں کے بعد اس جہت میں مدتوں تک ایک سناٹا رہا اور اس بیچ دونوں زبانوں میں نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا رہا۔ علوم و فنون کی نئی شاخوں میں اضافے کے ساتھ نئی اصطلاحیں وجود میں آئیں، دنیا کی روزافزوں ترقی اور سائنس و تکنالوجی کی ایجادات نے زبان کے دامن کو بے حد وسیع کر دیا اور موجود لغات جدید کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کرنے کی اہل نہیں رہی۔ تنگی و تشنگی کا شدید احساس ہونے لگا اور ایک ایسی انگریزی اردو لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی جو جدید عہد کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اس جہت میں جم کر کام کرنے کی ضرورت تھی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں مولوی عبدالحق نے اس ضرورت کو سب سے پہلے محسوس کیا اور کئی سالوں کی محنت و کاوش کے بعد ۱۹۳۷ء میں انجمن ترقی اردو ہند سے انگریزی۔ اردو اور اردو۔ انگریزی لغت کی تدوین کا کام مکمل کیا اور انجمن ہی سے اسے شائع

ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

بھی کرایا۔ ۸۱۰ صفحات کی یہ لغت اب تک موجود تمام لغت میں سب سے اچھی مانی جاتی ہے اور خود مولوی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ "ایسی جامع لغت ہماری زبان میں تو کیا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں۔" اور مولوی صاحب کا یہ دعویٰ کوئی غلط بھی نہیں بلکہ مبنی برحقیقت ہے۔ مولوی صاحب نے بڑی محنت و کاوش کے بعد ایک ایسی لغت اردو کے قارئین کو دی جو موجود تمام لغات میں اپنے ترتیب و تدوین اور جدید کاری کے لحاظ سے بہتر تھی اور بدلتے عہد کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کرنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ اس لیے اسے نہ صرف قبولیت عام حاصل ہوئی بلکہ آج بھی سب سے زیادہ جامع اور مستند لغت اسی کو مانا جاتا ہے۔ اس لغت کو شائع ہوئے کوئی ساٹھ سال ہو چکے ہیں لیکن اب بھی انگریزی سے اردو میں ترجمے کے لیے تمام دنیا میں یہی لغت استعمال کی جاتی ہے۔ اس مدت میں اس میں دو بار نظر ثانی بھی کی گئی ہے۔ ایک ۱۹۶۸ء میں اور دوسری ۱۹۸۱ء میں اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن تبدیلیٔ زمانہ کے تحت جس طرح کی نظر ثانی کی ضرورت تھی وہ ان دونوں نظر ثانی میں ممکن نہیں ہو سکی اور اس بیچ علوم و فنون کی دنیا میں جو انقلاب آیا اور خود انگریزی اور اردو الفاظ کے ذخیرے میں جو اضافہ ہوا۔ یہ لغت اس اضافے سے محروم رہی جس کی وجہ سے جدید عہد کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کرنے کی اہل نہیں رہی اور ایک نئی لغت کی ضرورت لوگوں کو شدت سے محسوس ہونے لگی، جو سائنسی ایجادات و انکشافات کے اس عہد کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

عصر حاضر میں علوم و فنون کی نت نئی شاخوں کے ذریعے جو نئی نئی سائنسی اور علمی اصطلاحیں وضع ہوئیں، عمرانی علوم میں جو نئے نئے الفاظ وضع ہو کر مستعمل ہوئے، پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا نے ذرائع ابلاغ کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا جس کے لیے نئی نئی اصطلاحیں بنائی گئیں۔ اس سے زبان کے سرمایۂ الفاظ میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس نے ہر دو زبانوں کی علمی، فنی اور سائنسی حیثیت کو اور بلند کر دیا۔ دوسرے تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ ہر پل ہم انکشافات و ایجادات اور ترقی کی جانب گامزن ہیں۔ ایسے حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ مولوی عبدالحق کی انگریزی اردو لغت پر نئے سرے سے کام ہوتا اور اسے جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جاتا لیکن کسی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ ہو سکا اور ایک نئی لغت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔

مبارک باد کے مستحق ہیں ترقی اردو بورڈ کے اراکین جنھوں نے اس کمی کو شدت سے محسوس کیا اور ایک جامع لغت کا منصوبہ بنایا اور اس پر عمل پیرا ہوئے۔ اس کی ادارت کی اہم ذمہ داری کلیم الدین احمد کو سونپی گئی اور انھوں نے اس کٹھن اور عظیم کام کو کرنے کی ذمہ داری بہ خوشی گوارا کر لی۔ تقریباً ۲۵ برس کی جانفشاں محنت و کاوش کے بعد لغت کا مکمل مسودہ تیار ہوا، جس کی ایک جلد آج زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آگئی ہے۔

چھ جلدوں پر مشتمل لغت کی پہلی جلد جو انگریزی کے تین حروف تہجی A + B + C پر مشتمل ہے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس کی ضخامت ۱۲۱۷ صفحات کی ہے۔ مکمل چھ جلدوں میں ڈھائی لاکھ الفاظ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتابت و طباعت عمدہ اور جلد کا معیار بھی اعلا ہے۔ ظاہری طور پر بے حد حسین ہے اور دنیا کی کسی بھی زبان کی لغت سے اس کا ظاہری معیار کم نہیں ہے۔

اب ذرا اس کے اندرون میں جھانک کر دیکھیے تو یقیناً آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ جیسی لغت کی ضرورت ایک عرصے سے اردو قاری محسوس کر رہے تھے۔ یہ لغت ان کی ضروریات کے عین مطابق ہے۔ تنگیٔ داماں اور تشنگیٔ الفاظ کی شکایت اب بہت حد تک رفع ہو جائے گی اور قاری اپنے خزینۂ علم کی وسعت بے بہا کو سیراب کر سکیں گے۔ اس لغت کا نام "جامع انگریزی۔ اردو ڈکشنری" ہے۔

تمام جدید اور عصری علوم و فنون کی اصطلاحیں، نئے الفاظ و محاورات کو اس لغت میں جگہ دے کر اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ بہت سے ایسے انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کو اس لغت میں شامل کیا گیا ہے جن کا اندراج اس لغت کی تیاری کے زمانے کی دوسری لغات میں موجود نہیں تھا۔ یوں تو اس لغت کی مکمل جلدوں میں ۸۴ علوم و فنون کی اصطلاحوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ لیکن جلد اول میں فلسفہ، نفسیات، طبیعات، لسانیات، شماریات، سماجیات، سیاسیات، حیاتیات، نباتیات، حیوانیات، ادبیات، تعلیمات، معدنیات، تعمیرات، زراعت، فنون لطیفہ، تاریخ، طب، کیمیا، تجارت و معاشیات، انتظامیہ، قانون، ذرائع ابلاغ، جنگ، موسیقی، فوج، جہاز رانی، علم نجوم، حشریات، عدلیہ وغیرہ کی اصطلاحات اور تقریباً ۴۸ ہزار انگریزی الفاظ و محاورات اور روزمرہ کے معنی و مفہوم کا اندراج کیا گیا ہے۔

اس لغت کی ترتیب نہایت سائنٹفک ہے۔ اس میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ ذیلی اندراجات کی ترتیب بھی حروف تہجی کے مطابق کی گئی ہے۔ لغت نویس نے قدیم اور جدید علوم کے الفاظ کا احاطہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ لغوی معنی کے ساتھ ساتھ اس کے اصطلاحی پہلوؤں کو بھی کمال خوبی سے سمیٹ لیا ہے۔ ہر لفظ کے لغوی معنی پہلے دیے گئے ہیں پھر اس لفظ کے اصطلاحی معنی دیے گئے ہیں۔ اگر ایک لفظ مختلف علوم میں مختلف اصطلاحی مفہوم کا حامل ہے تو اس کی اصطلاحیں بھی حروف تہجی کی ترتیب سے نمبروار دی گئی ہیں۔ لفظ کے معنی ترجیحی ترتیب سے (۱) (۲) (۳) نمبروں سے ظاہر کیے گئے ہیں۔ انھیں نمبروں کے ساتھ سیمی کولن (؛) موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نمبر کے مطابق لفظ کے معنی پورے ہو گئے۔ انگریزی الفاظ کی قواعدی صورت، اسم، فعل، متعلق فعل، صفت، حرف ربط وغیرہ کو انگریزی لفظ کے اندراج کے فوراً بعد قوسین میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ قواعد کے مشتقات کی فہرست الگ سے دی گئی ہے۔

اصطلاحات کے علوم کو ہر اصطلاح کے سامنے بریکٹ میں دیا گیا ہے۔ جیسے۔

(انتظامیہ) مشتہر شدہ

ADVERTISED TENDER : (N)

(تجارت و معاشیات) اشتہار کھاتا

ADVERTISEMENT ACCOUNT : (N)

(تاریخ و سیاسیات) حسب ہدایت

UNDER ADVICE :

(فلسفہ و نفسیات) مشاورتی کونسل

ADVISORY COUNCIL : (N)

(لسانیات) تبادل

ALTERNATE : (N)

(طبیعات) زاویہ متبادلہ

ALTERNATE ANGLE : (N)

(معدنیات) ایک معدنی شئے جس میں پھٹکری اور المینیم ہائیڈریٹ پایا جاتا ہے۔ (کیمیا) (ٹلونائٹ۔

ALUNITE : (N) (FR ALUM)

(طب) خون کی کمی، کم خونی، خون میں سرخ ذرات کی کمی، رنگ کا زرد ہونا یا زرد پڑ جانا۔

ANAEMIA : (N) (GR ANAI MIA)

(ریاضیات) ثابت شدہ سہل تر مسئلوں میں حل کر کے کسی مسئلہ کا اثبات۔

ANCIENT ANALYSIS :

(شماریات) تجزیہ نقشہ خوشہ

BUNCH MAPANALYSIS :

(سماجیات) باہمی کردار

RECIPROCAL BEHAVIOUR :

ذرا اس طریقہ، ترتیب کو بہ نظر غائر ملاحظہ فرمائیے۔ سائنس و ٹکنالوجی کی برق رفتاری کے اس دور میں کتنی سہل انگاری فراہم کی گئی ہے۔ عصری تقاضوں سے کس قدر ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم کی وضاحت اتنی عمدگی سے کی گئی ہے کہ کسی طرح کے کنفیوژن کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہ لغت مترجموں، مصنفوں، سائنس دانوں، زبان دانوں، پیشہ ورانہ ماہروں، اخبار نویسوں، شعبۂ انتظامیہ کے کارکنوں، صحافیوں اور تمام علوم و فنون کے ماہر افراد کے لیے لفظ و معنی کا ایک ایسا خزینۂ بے بہا ہے۔ لغت کی یہ جدید اور سائنٹفک ترتیب مترجموں کو تلاش و جستجو کی زحمت سے نجات دلائے گی اور کم وقت میں زیادہ مواد کا ترجمہ بہ حسن و خوبی ہو سکے گا۔

اس لغت کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اصطلاحات بہ کثرت موجود ہیں جو اس سے قبل کی لغات میں نہیں ہیں۔ ان اصطلاحات کے اندراجات کا طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے واحد لفظ کے لغوی معنی دیے گئے ہیں۔ واحد لفظ کے مرکبات، سابقوں، لاحقوں کے جوڑ سے حاصل ہونے والے الفاظ و اصطلاحات اسی واحد لفظ کے ذیلی اندراجات ہیں۔ جیسے ایک واحد لفظ ہے:

(۱) سب، پورا، کل۔ (۲) انتہائی، سرتاپا، ہمہ تن۔ (۳) (جمع کے ساتھ) سب کے سب، جملہ، کلے تعداد؛ (۴) ہر قسم کے، ہر طرح کے، ہر ایک۔

ALL : (A)(TENT.)

کل، مکمل، پورے طور سے، کل ملاکر، بالکل۔

ALL : (ADV)

(۱) سب آدمی، سب کے سب، دنیا بھر۔ ۲ (OF کے ساتھ) کل، جملہ، سب کا سب، تمام و کمال، سارے کا سارا، سمو چا۔ (۳) سب کچھ (۴) سب کچھ، جو کچھ تھا، ساری پونجی، سارا اثاثہ، جمع جتھا۔

ALL : (N)

اس کے دس ذیلی، معنوی و اصطلاحی اندراجات ہیں جنھیں حروف تہجی کی ترتیب سے دیا گیا ہے۔ مثلاً۔

باقی سب، باقی کل، بھی، علاوہ، مزید برآں، نیز۔

AND ALL :

بقیہ سب

AND ALL THAT :

مطلق، بالکل ہی، کسی طرح سے بھی۔

AT ALL

تاہم، باوجود، باوجود اس کے کہ۔

FOR ALL :

سب ملاکر، کل، کلہم۔

IN ALL :

سبھوں میں۔

OF ALL :

اس کے بعد ALL کے دوسرے مرکزی اندراجات ہیں جو صفحہ ۱۳۱ سے ۱۳۳ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

ALL ALL : برابر، ایک سا، ایک ہی سا۔

ALL ALONG : ہمیشہ۔

ALL ALONG OF : بوجہ، بدولت۔

کلیتاً، سبھوں کو، یہ ہمہ جزو کل، مجموعی طور پر، مجموعاً، سب کا سب۔

ALL AND SOME :

واحد لفظ کے بعد بالکل اسی نمونہ پر جتنے الفاظ کی جمع بنتی ہے تو جمع لفظ کے اندراجات لکھے گئے ہیں اور پھر اصطلاحات بھی حروف تہجی کی ترتیب سے دیے گئے ہیں۔ علمی اصطلاحات کو عام معنی کے برعکس قوسین میں دیا گیا ہے۔ جہاں ایک ہی لفظ الگ الگ علوم میں کئی مفہوم میں مستعمل ہے تو اس کا اندراج "و" عطف کی مدد سے کیا گیا ہے۔ ص ۱۱۸۸ پر ایک عام لفظ ہے CULTURE۔ اس کی قواعدی صورت اسم اور فعل کے تحت اس کے الگ الگ علوم کے اصطلاحی معنی درج ہیں اور یہ ایک لفظ تین صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔

(۱) تہذیب، تمدن، ثقافت، تربیت، ترقی، (ذہنی)۔ (۲) زراعت، فلاحت، کاشت، پرورش، پیداواری۔ (۳) جراثیم پرورده۔

CULTURE : (N)(L.CULTURE)

پرورش کرنا، (مچھلیاں وغیرہ) پالنا، (دواسازی کے لیے) جراثیم پالنا۔

CULTURE : (V)

CULTURE اسم اور فعل کے تحت تمام ذیلی اور مرکزی اندراجات بہ تفصیل دیے گئے ہیں۔ اس طرح کے اور بہت سے الفاظ مثلاً BURIAL BURNING، BUSH، BURST، CHARGE، CHARACTER، AGE، AID، ALL وغیرہ ہیں۔ جن کے معنی کی تفصیلی اندراجات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ الفاظ کے لسانی مآخذ کی بھی نشاندہی قوسین میں [ ] میں کر دی گئی ہے۔ CULTURE کے سامنے اس کا مآخذ ملاحظہ فرمائیں۔ ان مآخذ کے مخففات الگ سے دیے گئے ہیں اور جس کا مآخذ دستیاب نہیں ہو سکا ہے اس کے سامنے ORIGIN UNKNOWN لکھ دیا گیا ہے۔ جیسے

(بازاری) سوزاک

CLAP : (N)(ORIGIN UNKNOWN)

کیچڑ یا کسی دوسری چپکنے والی چیز کا دھبا یا داغ، کیچڑ

CLART : (N)(ORIGIN UNKNOWN)

انگریزی کے بہت سے ایسے الفاظ جن کی ایک سے زیادہ املا کا چلن رہا ہے۔ اس کی نشاندہی بھی اس لغت میں کر دی گئی ہے اور اس لفظ کے سامنے اس کی دونوں املا لکھ دی گئی ہے۔ جدید املا امریکن انگلش کے نام سے جانی جاتی ہے۔ چند مثالیں دیکھئے۔

ABY ABYE-ACHE AKE-ACHEILARY

ACHILARY

BATTEL BATELL BELLOOT BELOTE

BLENNO BLENN

CATAWAMPUSLY CATAWAMPOUSLY

CATHODIC/ KATHODIC

دو لفظوں کے مرکب الفاظ کی نشاندہی بھی لغت میں اس لفظ کے سامنے کر دی گئی ہے۔

ACADIALITE : (N)(ACADIET LITE)

باقی صفحہ ۱ پر

نیم: اہمیت اور فوائد

اگر آپ سڑک پر چلتے چلتے تھک جائیں اور کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر کچھ دیر ستانا چاہیں تو آپ کس درخت کے نیچے بیٹھنا چاہیں گے؟

"نیم کے" قدرتی طور پر آپ کا جواب یہی ہوگا۔ اس لیے کہ پرانے وقتوں سے قریب قریب ہر ہندوستانی جانتا ہے کہ نیم کیڑوں کو دور بھگاتا ہے۔

لیکن آج نیم صرف ایک درخت نہیں رہا ہے اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے سائنس دانوں نے اس کے حیرت انگیز خواص دریافت کیے ہیں اور کمپنیاں ان کے بارے میں تجربے کر رہی ہیں۔ گزشتہ سال جب سے ایک امریکی کمپنی نے نیم سے تیار کی گئی دو مصنوعات پیٹنٹ کروائی ہیں تب سے بھارت میں جیسے خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھی ہیں۔ دراصل کچھ پاستوں میں تو ایک سیاسی مہم چل رہی ہے کہ نیم کا مقدر گیٹ معاہدہ کی وجہ سے دوسری فصلوں کے بیجوں کے آنے کا منتظر ہے گو یہ سچ نہیں ہے۔

آخر نیم میں جسے علم نباتات میں AZARICHACHTA INDICA کہتے ہیں ایسی خاص بات کیا ہے؟ نیم کا درخت سب سے پہلے میانمار میں اگا تھا اور صدیوں پہلے اسے وہاں سے ہندوستان لایا گیا تھا۔ یہ درخت افریقہ سے لے کر جنوبی مشرقی ایشیا ملیشیا اور آسٹریلیا تک تمام گرم ملکوں میں اگتا ہے۔ لیکن اس کا جتنا گہرا مطالعہ ہندوستان میں کیا گیا ہے اتنا شاید کہیں نہیں کیا گیا ہے ہندوستان کے لوک ادب میں نیم کی حیرت انگیز خاصیتوں کا ذکر ملتا ہے۔

۱۹۶۸ء میں یہ بات اخبارات کی سرخیوں میں چھپی کہ دو انگریز سائنس دانوں نے نیم کے مغز سے AZADIRACHTIN--A نام کا ایک مرکب تیار کیا ہے جو تقریباً ۲۰۰ کیڑوں کی افزائش کو روک سکتا ہے۔ بعد میں یہ محسوس کیا گیا کہ اس مرکب سے ایسی دوا تیار کی جا سکتی ہے جس سے ماحول کو نقصان پہنچائے بغیر کیڑے مکوڑوں اور جراثیم پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ تب سے ترقی یافتہ ممالک کی کئی سرکردہ لیباریٹریوں میں اس مرکب پر تحقیقی تجربات کیے جا رہے ہیں۔ ان کی اہمیت اس لیے اور بڑھ گئی ہے کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ لیباریٹریوں میں تیار شدہ کیمیاوی کیڑے مار دواؤں کے اثرات نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ جانوروں کے لیے بھی نقصان دہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے کیڑے مار کیمیاوی دواؤں کے خلاف ایک مہم چل پڑی اور ہر شخص یہ چاہنے لگا کہ کوئی ایسا قدرتی مرکب نکلے جو ان کیمیاوی دواؤں کے بجائے استعمال کیا جا سکے۔ سب کی نگاہ نیم ہی پر پڑی اور جلد ہی AZADIRACHTIN — A کی ۱۲ اقسام تیار کر لی گئیں۔

ایک سرکردہ جرمن ماہر کا کہنا ہے کہ یہ مرکب کیڑے مکوڑوں کے کم اجتماع پر قابو پانے کے لیے بہترین ہے۔ جرمن سائنس دانوں کی ٹیم نے عملی مظاہرہ کر کے دکھایا کہ یہ مرکب اس چھوٹے سے کیڑے کو مارنے میں کتنا پر اثر ہے جس کی وجہ سے جنوبی امریکہ میں CHAGAS نامی بیماری پھیلی تھی۔ اس بیماری سے بچاؤ کے لیے نیم کے اس مرکب سے تیار کیے گئے ٹیکے لگائے گئے۔ اب سائنس داں نیم کے مرکب سے ملیریا سے بچاؤ کا ٹیکہ تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہندوستان کے کاشتکار محفوظ طور پر غلہ ذخیرہ کرنے کے لیے ہمیشہ سے نیم کی خشک پتیاں استعمال کرتے آئے ہیں۔ اب سائنس داں اس طریقے کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک کامیاب پروڈکٹ تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور شاید وہ امریکن کمپنی جدید طریقوں کا استعمال کرتے ہوئے یہی کچھ کرنا چاہتی ہے۔ یہ بات اس لیے اور اہم ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں کیمیاوی دواؤں کے اثرات سے پاک خوراک کی بڑی مانگ ہے۔ اس لیے خوراک کو محفوظ رکھنے کے لیے کیڑے مار دواؤں کی جانچ کا معیار سخت بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے جو کسان اپنا فاضل غلہ غیر ممالک کو برآمد کرنا چاہتے ہیں انھیں احتیاط برتنی ہوگی کہ ان کا غلہ کیمیاوی ادویہ کے مضر اثرات سے پاک ہو۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ انھیں رفتہ رفتہ کیڑے مار کیمیاوی دوائیں کے بجائے قدرتی کیڑے مار مرکبات استعمال کرنے ہوں گے۔

چوں کہ نیم کے مرکبات بہت پُر اثر ہوتے ہیں اور حیاتیات پر ان کا عمل تیز ہوتا ہے اس لیے ان کی محض تھوڑی سی مقدار ہی کا استعمال کافی ہوگا۔ اس سے اخراجات میں بھی کفایت ہوگی۔ ہمارے ملک میں نیم کے درخت بہ افراط پائے جاتے ہیں اندازہ لگایا گیا ہے ہمارے یہاں ایک

باقی صفحہ ۱۲ پر

مناظر حسین

پیاز اور اس کے فوائد

پیاز ایک مشہور عام، ہردلعزیز اور کم قیمت میں حاصل ہونے والا قدرت کا بہترین عطیہ ہے یہ وہ سبزی ہے جس کے بغیر کسی سالن کو پکانا ممکن نہیں اور نہ ہی کوئی سالن اس کے بغیر ذائقہ دار بنتا ہے۔ اسے ہانڈی میں مصالحہ کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا اچار بھی سرکہ میں ملا کر بنایا جاتا ہے۔ چٹنی بھی تیار کی جاتی ہے اور اس کا استعمال بطور سلاد بھی کیا جاتا ہے۔ یہ دنیا کے ہر ملک میں بہ آسانی دستیاب ہو جاتا ہے۔

پیاز کی تاریخ بے حد دلچسپ ہے گیارہویں صدی میں کروسیڈ کے دوران سیلوٹ قسم کا پیاز سیریا سے فرانس پہنچا۔ فرانس میں یہ کافی مقبول ہوا۔ آج پیاز وہاں کی غذا کا اہم حصہ بن چکا ہے۔ پیاز کا فرانسیسی شوربا بطور خاص مشہور ہے اور آج یہ کئی ممالک کا پسندیدہ مشروب ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آج سے تقریباً ۵ ہزار سال قبل وسط ایشیا میں پیاز کا پتا چلا۔ اس وقت یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ پیاز میں عجیب و غریب طبی صفات موجود ہیں۔

مغربی آیورویدسائنس کے جنم داتا ہیپو کریٹس کے مطابق پیاز آنکھوں کی روشنی کو حیرت ناک طور پر بڑھاتا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں شائع شدہ ایک کتاب (THE GREAT HERBAL) میں تحریر ہے کہ پیاز کے عرق سے گنجے پن کو مکمل طور پر ختم کیا جا سکتا ہے۔ دورے پڑنے بند ہو سکتے ہیں اور پاگل کتے کا کاٹا ہوا مریض صحت یاب ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ پیاز زکام کو دور کرتا ہے اور چہرے کے حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ گٹھیا کو دور بھگاتا ہے اور ہائی بلڈ پریشر کو نارمل کرتا ہے علاوہ ازیں نظام ہضم کو درست کرتا ہے۔

لیکن لوگوں کو (THE GREAT HERBAL) نامی کتاب میں تحریر شدہ پیاز کی ان خوبیوں پر یقین نہ آیا اور عرصہ تک اسے ایک مذاق سمجھا جاتا رہا۔ لیکن آج سے تین دہائی پیشتر ہوئی مختلف سائنسی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کتاب میں پیاز کے جو صفات بیان کیے گئے ہیں اس سے بھی کہیں زیادہ خوبیاں اس میں موجود ہیں۔ دراصل اثنا برطانیہ میں کیے گئے چند تجربات سے یہ بات سامنے آئی کہ اسپتال کے مریضوں میں پیاز نہ کھانے والے مریضوں کے مقابلے خوب پیاز کھانے والے مریضوں کے خون میں زیادہ تھکے نہیں بنے۔ امریکہ کے سائنس دانوں نے کچھ عرصہ قبل پیاز سے فروسٹا گلاڈن اے، نامی کیمیائی مادہ الگ کیا ہے جو ذہنی انتشار کو کم کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔

ہمارے ملک میں پرانے زمانے میں پیاز اسپین، اٹلی، آسٹریلیا، پرتگال اور امریکہ سے درآمد کیا جاتا تھا۔ لیکن آج ہندوستان اس معاملے میں نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ چند ممالک کو پیاز برآمد بھی کرتا ہے جس سے بھارت کو ایک اچھا زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

پیاز کے مختلف اقسام دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ بھارت میں بطور خاص پیاز کی تین قسموں کی کاشت ہوتی ہے — لال، پیلا اور سفید پیاز، لال پیاز ملک کی کئی ریاستوں میں پیدا ہوتا ہے یہ کافی دنوں تک خراب نہیں ہوتا۔ پیلا پیاز اکثر راجستھان میں اگایا جاتا ہے اور سفید پیاز مہاراشٹر، کرناٹک اور تمل ناڈو میں زیادہ ہوتا ہے۔ ملک کے بڑے حصے میں اس کی کاشت ہوتی ہے۔ کسانوں کے لیے یہ ایک منافع بخش فصل ہے۔

سائنس دانوں کا قول ہے کہ پیاز سے ایک "ایم" نامی شعاع خارج ہوتی ہے جو الٹراوائلٹ شعاعوں کی طرح ہی ہوتی ہے۔ اس سے صحت اور قوت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پیاز میں نشاستہ، پروٹین، نمکیات، فاسفورس، وٹامن اے، بی، سی اور ای بھی کافی مقدار میں ملتا ہے۔ اس میں لوہا اور وٹامن ج بھی موجود ہے۔ اس کا مزاج گرم اور خشک ہے۔

دل کے مریضوں کے لیے اس کا استعمال بے حد مفید ہے۔ ایسے مریضوں کو روزانہ علی الصبح پیاز کے عرق کا استعمال دو چمچہ شہد کے ساتھ کرنا چاہیے۔

علم طب یونانی کے قدیم حکماء پیاز کے فوائد سے بخوبی آگاہ تھے اور متعدد امراض کے سدباب کے لیے اس کا استعمال کرتے تھے۔ روم کے مشہور زمانہ حکیم پلائنی نے پیاز کے ۲۷ فائدے تحریر کیے ہیں جو زندہ رہنے کے لیے سنگ میل ہیں۔ اس سے پیاز کی اہمیت میں کافی اضافہ ہو گیا ہے۔ برصغیر کی مشہور مغنیہ ملکہ ترنم نور جہاں نے

موضع ڈبو، ڈاکخانہ بارا، ایا چاکند، ضلع گیا (بہار)

اپنے ایک انٹرویو میں اپنی پسندیدہ سبزی پیاز بتائی ہے۔ اس کے علاوہ بھی دنیا کی مشہور شخصیات نے اپنی آواز کو دلکش اور سریلی بنانے، رنگ گورا کرنے اور ذہن کو تیز کرنے کے لیے پیاز کو ذریعہ بنایا انھوں نے ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑنے کے لیے بھی پیاز کی مدد لی۔

جزائر غرب الہند میں آج بھی یہ رواج ہے کہ مریضوں کا کمرہ چھوت سے پاک کرنے اور جراثیم کو ختم کرنے کے لیے وہاں ہر روز پیاز چھیل کر پھیلا دیا جاتا ہے۔

آئرلینڈ کے لوگ پیاز کا استعمال کھانسی، نزلہ اور زکام کے لیے بطور دوا کرتے ہیں۔ اب آخر میں پیاز کے چند گھریلو نسخے تحریر کر رہا ہوں جو اکثر مجرب ہیں۔

● دست یا پائخانہ کے مرض میں کچے پیاز کو پیس کر ناف پر اچھی طرح لیپ کریں۔ بیحد مفید ہے۔

● ادرک اور پیاز کا عرق ہم وزن لے کر پلا دینے سے قے رک جاتی ہے۔

● اگر بچھو یا بھڑ کاٹ لے تو پیاز کچل کر اس کا عرق اس مقام پر مالش کر دیں درد دور ہو جائے گا اور زہر اثر نہ کر سکے گا۔

● یہ بات طے شدہ ہے کہ اگر ہاتھ میں سفید پیاز کی ایک گانٹھ ہو تو لو نہیں لگ سکتی۔

● پیاز کے ٹکڑے کو ڈوری سے باندھ کر بلب کے چاروں طرف لٹکا دیں مچھر بھاگ جائیں گے۔

● اگر بلغمیت اور سردی کے سبب حیض بند ہو گیا ہو تو پیاز کو گھی میں خوب سرخ کر لیں اور روئی کو چیڑ کر اس میں محلول کر دیں اور کھائیں۔ تین چار دفعہ کے استعمال سے ہی حیض جاری ہو جائے گا۔

● پیاز کو پیس کر اس کا لیپ بالوں پر کر دینے سے سیاہ بال اگنے شروع ہو جاتے ہیں۔

● نصف چھٹانک پیاز کا پانی صبح سویرے پلاتے رہنے سے گردہ اور مثانہ کی پتھری ریزہ ریزہ ہو کر خارج ہو جاتی ہے۔ یہ پانی نہار منہ پلانا شرط ہے۔

● سفید پیاز حسب ضرورت لیں اور انھیں کاٹ کر خشک کریں پھر انھیں خوب کوٹ کر اس کا سفوف بنالیں اور احتیاط سے کسی شیشی میں رکھ لیں۔ اگر دست زیادہ ہو رہا ہو تو مریض کو آدھ پاؤ دہی میں چھ ماشہ اس سفوف کو ملا کر کھلا دیں۔ اگر فائدہ نہ ہو تو ایک گھنٹہ کے بعد دوسری خوراک دیں۔ اس سے پیچش بھی ختم ہو جائے گی۔ غذا میں چاول اور دہی کے علاوہ اور کچھ کھانے کو نہ دیں۔

● بھنا ہوا پیاز پھوڑوں پر باندھ دینے سے درد اور سوجن ختم ہو جاتی ہے اور پھوڑے پھٹ جاتے ہیں۔

● پیاز کو آگ میں بھون لیں اور اس کا عرق ایک چمچہ کی مقدار میں نکال کر گرم گرم پلائیں پیٹ درد کو شفا حاصل ہوگی۔

● پیاز کو خوب گھوٹ لیں اور اسے گلے پر لیپ کر دیں۔ اس سے خناق، گلے کا درد اور ورم میں افاقہ ہوگا۔

● پیاز کا اچار کھانے سے ریاح سے نجات مل جاتی ہے۔

● دہی اور پیاز کا عرق ملا کر پینے سے خونی پیچش دور ہو جاتی ہے۔

● اگر سر میں جوئیں ہوں تو پیاز کا عرق تیل کی طرح بالوں میں لگائیں جوئیں مر جائیں گی۔

● پیاز کاٹ کر سونگھ لیں۔ درد سر ختم ہو جائے گا آزمودہ اور مجرب ہے۔

پیاز کو سرکہ میں ملا کر استعمال کریں، زیادہ مفید ہے۔ زیادہ پیاز کے استعمال سے گلا خراب ہوتا ہے۔ رات کے کھانے میں بطور سلاد کچا پیاز استعمال نہ کریں۔ ●

بقیہ کور ۲: جنگلات کے فروغ کے لیے نئی کوششیں

تحقیق کی جائے گی۔ جنگلات کے سماجی پہلوؤں کو نظر میں رکھتے ہوئے تحفظ اور انتظام سے متعلق سرگرمیوں میں مقامی لوگوں کو بھی شامل کیا جائے گا۔

بقیہ: ادب، تہذیب اور سماج

بات آتی ہے تو سماج اور سماجی زندگی خود بخود سامنے آجاتی ہے۔ تہذیبی اور معاشرتی زندگی ادب کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ کوئی ادب خلا میں تو خلق نہیں ہوتا بلکہ ادب کے لیے آغوش مادر سماج ہی ہے۔ جس طرح کا سماج ہوگا، ادب بھی اسی کے مطابق خلق ہوگا۔ یہاں یہ بات بھی عرض کرنا ضروری ہے کہ صرف ادیب ہی سماج سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ ادب بھی سماج کو متاثر کرتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی ادب SOCIAL CONTROL کا ایک اہم جزو بن جاتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادب، سماج اور فرد تینوں کا ایک دوسرے سے اہم رشتہ ہے۔ بلکہ تینوں ایک دوسرے کے لیے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ●

این ٹی سی کی جدید کاری کے منصوبے کو منظوری

حکومت نے نیشنل ٹیکسٹائل کارپوریشن (این ٹی سی) کی ملوں کے احیا اور جدید کاری کی تجویز کو منظوری دے دی ہے۔ ان ملوں کی تعداد ۹ ہے اور اس سلسلے میں ۲۰۰۵،۲ کروڑ روپے کے اخراجات آئیں گے۔ کپڑے کی صنعت کے مرکزی وزیر شری جی جی وینکٹ سوامی نے ایک نیوز کانفرنس میں اس بات کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ مرکزی کابینہ نے این ٹی سی کی جدید کاری کے منصوبے کو منظوری دے دی تھی۔ اس کو ایک تاریخی فیصلہ قرار دیتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا کہ یہ پروگرام قومی مفاد میں نیز کارکن طبقے کے مفاد میں ہے۔

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

اقتصادی اصلاحات کے سلسلے میں نئے اقدامات

اقتصادی اصلاحات کے عمل کو وسیع کرنے کے لیے متعدد نئے اقدامات کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اقتصادی استحکام کے سلسلے میں نیز بھارتی نظام میں بین اقوامی اعتماد بحال کرنے کے سلسلے میں کافی پیش رفت کی گئی ہے۔ یہ بات وزارت خزانہ کی سالانہ رپورٹ برائے ۹۵-۱۹۹۴ء میں بتائی گئی ہے۔

مذکورہ سال کے دوران مجموعی اندرون ملک پیداوار میں تقریباً ۵ر۳ فی صد کا اضافہ ہونے کی توقع ہے۔ ادائیگیوں کے توازن کی صورت حال میں قابل دید بہتری کی وجہ سے غیر ملکی مالیہ پر انحصار تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ صنعتی ماحول میں بہتری آئی ہے اور بیرونی غیر ملکی سرمایہ کاری میں اضافہ ہوا ہے۔ غیر ملکی زر مبادلہ کی اطمینان بخش صورت حال اور اناج کے ذخائر کی اعلا سطح کی وجہ سے اقتصادی استحکام برقرار رکھنے کے لیے حکومت کی صلاحیت میں اضافہ ہوا ہے۔

صنعتی شعبے میں حکومت نے لائسنس دینے کی محدود پالیسیاں ختم کر دی ہیں۔ سالانہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بنیادی ڈھانچے کی سات اہم صنعتوں یعنی بجلی، کوئلہ، فولاد، خام تیل، ریفائنری پروڈکٹس، سیمنٹ اور کیمیاوی کھادوں کی صنعتوں نے اپریل تا دسمبر ۱۹۹۴ء میں ۸ر۷ فی صد کی شرح اضافہ حاصل کی ہے، جب کہ ۱۹۹۳ء کی اسی مدت میں یہ شرح اضافہ ۹ر۳ فی صد تھی۔

افراط زر کو کم کرنے کے لیے بھی حکومت نے متعدد اقدامات کیے ہیں، جن میں مالی خسارے کو محدود رکھنا، اوپن جنرل لائسنس کے تحت چینی، کپاس اور پامولین تیل کی درآمدات کی اجازت دینا، فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے ذریعے چاول اور گیہوں کی کھلے بازار میں فروخت کر کے اناج کی منڈی میں سرگرم مداخلت کرنا بھی شامل ہیں۔

سرمایہ جاتی منڈی میں اصلاحات کے عمل کو نیشنل اسٹاک ایکسچینج آف انڈیا قائم کر کے آگے بڑھایا گیا ہے۔ ●

پنچایتی راج اداروں کے منتخبہ نمائندوں کی تربیت کا پروگرام

حکومت نے پنچایتی راج اداروں کے نئے منتخبہ نمائندوں کی تربیت کے لیے ایک زبردست پروگرام شروع کیا ہے۔ دیہی علاقوں اور روزگار کی وزارت نے پنچایتی راج اداروں کے کارکنان کی تربیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے دو ٹاسک فورسیں قائم کی ہیں۔ دور سے دی جانے والی تعلیم اور خواندگی کے بعد کی مہم کے لیے ماڈیول تیار کرنے والی ٹاسک فورس پنچایتی راج اداروں کے لیے منتخبہ نمائندوں میں اطلاعات کی تشہیر کے لیے ماڈیول تیار کرنے کے سلسلے میں اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے ساتھ اشتراک عمل میں کام کر رہی ہے۔ ان ماڈیولز میں تحریری مواد کے ساتھ ساتھ سماعی اور بصری پروگرام بھی شامل ہیں۔ امید ہے کہ یہ پروگرام ٹی وی چینلوں کے علاوہ اس نئے مصنوعی سیارے "گرام سیٹ" کے ذریعے بھی استعمال کیے جائیں گے، جو دیہی مواصلات کے لیے ۹۸-۱۹۹۷ء میں چھوڑا جائے گا۔

پنچایتی راج کو مستحکم بنانے کے سلسلے میں قائم کی گئی ٹاسک فورس نے ایک تربیتی ماڈیول کو قطعی شکل دی ہے اور پنچایت سے متعلق وزرا کی قومی کمیٹی نے اسے منظوری بھی دے دی ہے۔ اب اسے عمل درآمد کے لیے ریاستوں کو بھیج دیا گیا ہے۔

مرکز نے تربیت دینے والے لوگوں کے جامع تربیت کے پروگرام کے لیے تین قومی اداروں کی نشاندہی کی ہے، جن میں سے ایک ادارہ حیدرآباد میں، دوسرا مسوری میں اور تیسرا نئی دہلی میں واقع ہے۔ ان اداروں میں تربیت حاصل کرنے والے مذکورہ افراد کو پنچایتی راج اداروں کے کارکنان کو تربیت دینے کی غرض سے ریاستوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔

دیہی علاقوں اور روزگار کی وزارت لوکل باڈیز کے منتخبہ نمائندوں کو تربیت دینے اور ان میں ترقیاتی پروگراموں کے بارے میں بیداری پیدا کرنے کے سلسلے میں ریاستوں کو محدود مالی امداد بھی فراہم کرتی رہی ہے۔ سماج کے کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے منتخبہ گروپوں اور عورتوں میں بیداری پیدا کرنے کے پروگرام چلانے کے لیے غیر سرکاری تنظیموں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

مدھیہ پردیش، کرناٹک، اڑیسہ، ہریانہ، مغربی بنگال، آسام، تریپورہ، پنجاب اور راجستھان میں پنچایت کے نمائندوں کے لیے تربیتی پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔ ملک بھر میں

انتخابات ہو جانے کے بعد منتخبہ نمائندوں کی مجموعی تعداد ۲۵ لاکھ تک پہنچ جانے کی توقع ہے۔ ●

سپر فاسٹ ٹرینوں میں ٹیلیفون سروس

ریلوے نے سپر فاسٹ میل اور ایکسپریس ٹرینوں میں ٹیلیفون کی خدمات فراہم کرنے کے لیے ایک تجرباتی پروجیکٹ شروع کیا ہے۔ سٹیلائٹ کے ذریعے ٹیلی فون کی خدمات فراہم کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

تجرباتی پروجیکٹ کو چلانے کے لیے وزارتِ مواصلات نے اِنمارسیٹ (یعنی انٹرنیشنل میری ٹائم سٹیلائٹ آرگنائزیشن) کے ساتھ مفاہمت کے ایک میمورنڈم پر دستخط کیے ہیں۔ یہ تجرباتی پروجیکٹ بھارتی ریلوے ودیش سنچار نگم لمیٹڈ اور انمارسیٹ مل کر چلائیں گی۔

چلتی ہوئی ریل گاڑیوں میں مواصلات کے لیے اس کی موزونیت کا پتا لگانے کے لیے خصوصی سٹیلائٹ ٹرمینلوں کے ساتھ ٹیلیفون سروس کی آزمائش کی جائے گی۔ یہ آزمائشیں انمارسیٹ کی طرف سے ٹرمینلوں کے دستیاب ہوتے ہی شروع کرنے کی تجویز ہے۔

شروع میں ٹیلی فون سروس کی آزمائشیں نئی دہلی سے بمبئی سینٹرل جانے والی راجدھانی ایکسپریس اور "پیلیس آن وہیلز" ٹرینوں پر کی جائیں گی۔ ●

سڑکوں کی تعمیر میں عالمی بینک کی امداد

اس وقت آٹھ مختلف ریاستوں میں عالمی بینک کی امداد سے مختلف پروجیکٹ چلائے جا رہے ہیں جن ریاستوں میں یہ پروجیکٹ چلائے جا رہے ہیں ان کے نام ہیں:۔ ہریانہ، پنجاب، مغربی بنگال، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، راجستھان، اڑیسہ، تمل ناڈو۔ ہریانہ کے پروجیکٹوں کے لیے ۳ ارب ۲ کروڑ ۷۴ لاکھ روپے، پنجاب کے لیے ۴ ارب ۳ کروڑ ۸۲ لاکھ روپے، مغربی بنگال کے لیے ۸۸ کروڑ ۲۷ لاکھ روپے، مدھیہ پردیش کے لیے ۳۷ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے، مہاراشٹر کے لیے ایک ارب ۷۷ کروڑ ۳۷ لاکھ روپے، راجستھان کے لیے ۱۱ کروڑ ۹۴ لاکھ روپے، اڑیسہ کے لیے ۲ ارب ۱۸ کروڑ ۱۴ لاکھ روپے اور تمل ناڈو کے لیے ۲۸ کروڑ ۱۹ لاکھ روپے دیے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ بہار، مہاراشٹر، راجستھان، اترپردیش میں عالمی بینک کی مدد سے سڑکوں کی تعمیر و ترقی کے پروجیکٹ زیرِ عمل ہیں، ان کے لیے بحیثیت مجموعی ۵ ارب ۱۹ کروڑ ۶۱ لاکھ روپے کے اخراجات کا اندازہ ہے۔ ●

دواسازی میں تحقیق کی حوصلہ افزائی

مرکز نے دواسازی کے شعبے میں تحقیق و ترقی کے لیے مالی مراعات کو آخری شکل دے لی ہے اور ان کا جلد ہی اعلان کیا جائے گا۔

صحت کی دیکھ بھال کے قومی پروگرام کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے کیمیاوی کھادوں اور کیمیکلز کے مرکزی وزیر شری رام لکھن یادو نے کہا کہ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے اور ہندوستان میں دواسازی کی صنعت کو اس سلسلے میں سرمایہ کاری پر آمادہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہندوستان میں تحقیق و تجربے سے جو نئی دوائیں سامنے آئیں ان کا وافر انداز میں تحفظ کیا جائے، انھوں نے کہا کہ دواسازی کی صنعت سے وابستہ ذمہ داروں کو آگے آنا چاہیے اور دواؤں کی تحقیق کے سلسلے میں ٹھوس تجاویز سامنے لانی چاہئیں۔

شری یادو نے کہا کہ سرکار نے بہت سے کنٹرول ہٹا لیے ہیں اس لیے اس صنعت کے ذمہ داروں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ عوام کی صحت کے معیار کو قائم رکھنے میں سرکار کا ہاتھ بٹائیں۔ انھوں نے اس بات پر یقین ظاہر کیا کہ صارفین کو مناسب قیمتوں پر دوائیں دستیاب ہوتی رہیں گی۔ ●

تجارتی فصلوں کے روشن امکانات

ہندوستانی کسانوں کے لیے تجارتی فصلیں کافی کشش رکھتی ہیں۔ اس سال امید ہے کہ کسان ان کی پیداوار سے کافی نفع کمائیں گے۔ گنے کی فصل ۱۹۹۴-۹۵ء میں پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ اس کی پیداوار ۲۵ کروڑ ٹن تک پہنچ جانے کی توقع ہے جو پچھلے سال سے دو کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن زیادہ ہے۔

۱۹۹۴-۹۵ء میں تلہنوں کی پیداوار ۲ کروڑ ۲۳ لاکھ ۵۰ ہزار ٹن تک پہنچ جانے کی توقع ہے جو پچھلے سال کے مقابلے ۸ لاکھ ٹن زیادہ ہے حالاں کہ سویابین کی پیداوار میں دس لاکھ ٹن کی کمی آئی ہے۔

روئی کی کاشت کی بہتر پیداواری صلاحیت سے اس سال پیداوار بڑھی۔ امید ہے کہ ایک کروڑ ۱۶ لاکھ ۲۰ ہزار گانٹھوں کے بقدر روئی حاصل ہو سکے گی، جب کہ ۱۹۹۳-۹۴ء میں ایک کروڑ ۷ لاکھ دس ہزار گانٹھیں مل سکی تھیں۔ پٹ سن کی پیداوار میں اس سال ۳ لاکھ ۲۰ ہزار ٹن اضافے کی توقع ہے۔ ●

اسکولی بچوں کے لیے دوپہر کا کھانا کمیٹی کی تشکیل

انسانی وسائل کے فروغ کے وزیر شری مادھوراؤ سندھیا نے اسکولی بچوں کے لیے دوپہر کے کھانے کے واسطے ایک کمیٹی تشکیل دی ہے، یہ کمیٹی مرحلہ وار طریقے سے اسکولی بچوں کو تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنائے گی۔ مرکزی سکریٹری برائے محکمہ تعلیم شری ایس وی گری، اس کمیٹی کے چیئرمین ہوں گے۔

خیال رہے کہ ۱۹۹۵-۹۶ء کے مرکزی بجٹ میں وزیرِ خزانہ نے کہا تھا کہ اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جائے گی، اس کمیٹی کا کام یہ ہے کہ یہ ان بچوں کی نشاندہی کرے جو اس اسکیم کے تحت فائدہ اٹھانے کے مجاز ہیں، اسے دیگر صنعتی اور ترقیاتی پروگراموں کے ساتھ مربوط انداز میں چلایا جائے گا۔ اس سلسلے میں کمیٹی ریاستوں کا دورہ کرے گی۔ ●

پارلیمینٹ میں مستقل اسٹوڈیو کی سہولتیں

دوردرشن نے لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں مستقل نوعیت کی اسٹوڈیو سہولتیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان میں بڑے بڑے کیمرے نصب کیے جائیں گے۔ وزارت اطلاعات و نشریات کے

سال رواں کے بجٹ میں اس مقصد کے لیے ۲۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ اس پروجیکٹ پر کل ۳۴ کروڑ روپے کے اخراجات کا اندازہ ہے۔ سردست پارلیمنٹ کی کارروائی چلتی پھرتی آؤٹ ڈور گاڑیوں کے ذریعے دکھائی جاتی ہے۔

اتر پردیش میں مئو کے مقام پر پروگرام کی تیاری کا ایک سینٹر قائم کیا جانا ہے۔ اس کے علاوہ اودے پور، الہ آباد، وجے واڑہ، ناگپور، ترنچور، گوالیار، رانچی، راجکوٹ، چنڈی گڑھ، گنگٹوک، وشاکھاپٹنم، شانتی نکیتن، پٹیالہ، متھرا، سیلم، جونا گڑھ اور اندور میں بھی ایسے ہی مراکز قائم کیے جائیں گے۔ بجٹ میں ٹی وی اسٹوڈیو کے قیام کے لیے رقومات میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اسٹوڈیو، عمارات، سامان کی خریداری اور تنصیب وغیرہ کے لیے ۲۷ کروڑ ۹۳ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ گزشتہ سال اسٹوڈیو کے جملہ مصارف ۲۷ کروڑ ۸۳ لاکھ روپے ہوئے۔ ●

ریلوے نے تیز رفتار ریل ڈبہ تیار کیا

ریلوے نے نئے ڈیزائن کا ایک ایسا ریل ڈبہ تیار کیا ہے جو ۱۶۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکے گا۔ اس میں ایسے جدید آلات نصب کیے گئے ہیں جن سے اس کی رفتار تیز ہو اور اس کی حفاظت یقینی ہو۔ اس سلسلے کا پہلا ڈبہ تجربہ کے مرحلوں سے گزر رہا ہے اور اس نے حوصلہ افزا نتائج دیے ہیں۔ یہ تیز رفتار ڈبہ ٹرنک راستوں پر شروع کیا جائے گا۔ چار بڑے شہروں کو ملانے والے ریل راستوں پر اسے دسمبر ۱۹۹۵ء سے شروع کیا جائے گا۔

جن سیکشنوں پر بجلی سے ریل گاڑیاں نہیں چلتیں، ان کے لیے ایسی ریل گاڑیاں تیار کی گئی ہیں جن کے دونوں سروں پر انجن ہیں تاکہ شہروں کے درمیان تیز رفتار گاڑیاں شروع کی جا سکیں۔

ریلوے کے محکمے نے ایسے ریل ڈبے تیار کیے ہیں جن سے فضا میں آلودگی نہ پھیلے، ٹائلٹ نظام کو بھی اس طرح ڈھالا گیا ہے جس سے فضا اور ماحول کو آلودہ ہونے سے بچایا جا سکے۔

حال ہی میں دو ٹیر والا ائرکنڈیشنڈ کوچ شروع کیا گیا ہے جو کیبن نما ہے اور جس کے دروازے پھسلنے والے ہیں، اس سے سفر کو آرام دہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ●

تعلیم کے سلسلے میں بھارت کے اقدامات کی تعریف

یونیسکو نے تعلیم، بالخصوص ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں بھارت کے اقدامات کی توصیف و ستائش کی ہے۔ یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر فیڈریکو مایر نے انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے وزیر شری مادھوراؤ سندھیا کے ساتھ یہاں ملاقات کے دوران یہ بات بتائی۔

شری سندھیا نے مسٹر مایر کو ان کوششوں کے بارے میں بتایا، جو ملک میں سب کو تعلیم کے سلسلے میں کی گئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ خواندگی کی مہموں میں تعلیم حاصل کرنے والی عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ پنچایتی راج اداروں میں خواتین کے لیے ایک تہائی ریزرویشن مہیا کرانے سے متعلق حالیہ آئینی ترمیمات اور اس کے بعد مختلف ریاستوں میں پنچایتی انتخابات نے خاتون رہنماؤں کی ایک نئی نسل تیار کی ہے جو سماجی ترقی کے لیے کام کر رہی ہے۔ شری سندھیا نے مسٹر مایر کو یہ بھی بتایا کہ قومی یک جہتی، رواداری، تعلیم اور خواتین کی مساوات کو فروغ دینے کے لیے مہاتما گاندھی کی ۱۲۵ ویں سالگرہ منانے کے سلسلے میں متعدد سرگرمیاں منعقد کی جا رہی ہیں۔ ●

ریلوے میں کھانے پینے کی خدمات کی نجی کاری

موجودہ پالیسی کے مطابق، ریل گاڑیوں میں پینٹری کاروں سمیت صرف نئے کیٹرنگ یونٹوں کے ٹھیکے ان مشہور اور پیشہ ور کیٹررں کو دیے جا رہے ہیں، جن کا انتخاب پریس نوٹیفکیشن کے ذریعے طلب کردہ درخواستوں کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

جنگلی جانوروں کی اشیا کی ضبطگی

دہلی میں جنگلی جانوروں سے متعلق حکام نے گزشتہ تین برسوں کے دوران بڑی تعداد میں جنگلی جانوروں کی اشیا پکڑی ہیں اور اسمگلنگ کرنے والے لوگوں کے خلاف متعلقہ قوانین اور قوائد کے تحت کارروائی کی گئی ہے۔ پکڑی گئی اشیا میں شیروں کی ۲۸۷ کلوگرام ہڈیاں، موروں کی دم کے ۴۸۴۴۲ کلوگرام پر، سانپوں کی ۸۲۴۸ کھالیں، ریگستانی لومڑیوں کی ۷۹۶ کھالیں، جنگلی پرندوں کے ۱۴۶۳ کلوگرام پر، چیتوں کی ۶۲ کھالیں اور شیروں کی ۵ کھالیں بھی شامل ہیں۔

ماحولیات اور جنگلات کے وزیر مملکت شری کمل ناتھ نے راجیہ سبھا میں یہ بات بتائی۔ ●

قارئین "یوجنا" سے ۔ ۔ ۔ ۔

قارئین کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ ان کے محبوب رسالے "یوجنا" اردو کی موجودہ ضخامت (۳۲ صفحات + چار کورز) میں ۲۰ صفحات کا گراں قدر اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اب اس کی ضخامت (۵۲ صفحات + چار کورز) کل ۵۶ صفحات ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی قیمت میں بھی تھوڑا اضافہ کیا گیا ہے۔ اب ایک عام شمارے کی قیمت ۵ روپے ہوگی اور زر سالانہ پچاس روپے۔ فی الحال صرف ایک سال ہی کے لیے چندہ قبول کیا جائے گا (دو اور تین سال کے لیے نہیں)۔ قیمتوں پر نظر ثانی اور اضافہ اس لیے کیا گیا ہے کہ کاغذ کی قیمت اور طباعت کے اخراجات میں اضافے کے پیش نظر ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ ہمیں امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ قارئین حضرات ہمیشہ کی طرح ہم کو اپنا بھرپور تعاون دیتے ہوئے صفحات میں اس بڑے اضافے کا استقبال کریں گے اور قیمت میں اضافے کو خندہ پیشانی سے قبول کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اب ہم آپ کے لیے زیادہ اور بہتر مواد اور نئے نئے موضوعات پیش کر سکیں گے۔ (ادارہ)

نئی دھلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی. کے بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

سب ایڈیٹر : ڈاکٹر توحید خان

فون : 677591

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : کلدیپ سنگھ

جلد : ۱۵ شمارہ : ۳

جون ۱۹۹۵ء (۱۱ جیشٹھ تا ۹ اساڑھ شک ۱۹۱۷)

زر سالانہ : ایک سال کے لیے : ۵۰ روپے (طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت) ایک شمارہ ۵ روپے

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں :

بزنس منیجر : پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۱

ڈپٹی ڈائریکٹر پروڈکشن : شدرشن موہن چہل

مضامین سے متعلق

خط کتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۵، آر.کے. پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بندی سے ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

ڈاکٹر بی. بھٹاچاریہ

ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور بھارت

عالمی تجارت کی تنظیم (ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن) کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی تجارت کے بارے میں چل رہی اروگوے بات چیت بالآخر کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔ یہ نئی تنظیم جس نے پہلی جنوری ۱۹۹۵ء سے گیٹ (GATT) کی جگہ لے لی، اروگوے بات چیت کے دوران ہوئے معاہدوں کو نافذ کرنے کے ساتھ ان مسئلوں اور معاملوں کو بھی حل کرنے کی کوشش کرے گی جو اُروگوے میں ہوئی میٹنگ کے دوران حل نہیں کیے جا سکے۔

کسی بھی معیار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ گیٹ کے معرض وجود میں آنے کے بعد سے اُروگوئے کانفرنس سب سے زیادہ موثر اور اہم کانفرنس تھی جس کے دوران کثیر رخی تجارت پر نہ صرف سیر حاصل اور کافی تفصیلی تبادلہ خیال کیا گیا بلکہ متعدد معاہدوں پر بھی دستخط کیے گئے۔ اس کانفرنس کے دوران نہ صرف ان کوششوں پر تبادلہ خیال کیا گیا جن کا مقصد تجارتی اشیاء کے میدان میں تجارت کو نرم رَو بنانا تھا بلکہ سروسیز (SERVICES) میں تجارت کے بارے میں بھی بحث کی گئی۔ اس کے علاوہ تجارت سے متعلق سرمایہ کاری کے اقدامات اور دانشوروں کی املاک کے حقوق (INTELLECTUALS PROPERTY RIGHTS) پر بھی بات چیت ہوئی۔

شروع میں یہ تخمینہ لگایا گیا تھا کہ سامانوں کی بازار میں رسائی کے بارے میں اُروگوئے بات چیت کے نتیجے میں آمدنی کی شکل میں ۲۳۵ بلین امریکی ڈالر سالانہ کا فائدہ ہوگا اور ۲۰۰۲ء تک سالانہ ۷۵۵ بلین امریکی ڈالر کا تجارتی فائدہ ہوگا۔ یہ فائدے زرعی اور صنعتی مصنوعات کی ایک بڑی تعداد پر محصول میں کمی کرنے یا اسے ختم کرنے سے پیدا ہوں گے۔ اس سلسلے میں جو اہم فیصلے کیے گئے وہ حسب ذیل ہیں۔

— محصول میں اضافہ کے ذریعہ بازار میں سامانوں کی رسائی میں کافی اضافہ — (ترقی یافتہ ملکوں میں صنعتی مصنوعات پر ۷۸ فی صد سے ۹۹ فی صد اور ترقی پذیر ممالک میں ۲۲ فی صد سے بڑھا کر ۷۲ فی صد)

— محصول لگانے اور اس کی پابندی کی وجہ سے زرعی پیداوار کے لیے سو فی صد تحفظ۔

— ترقی یافتہ ممالک کی صنعتی مصنوعات پر محصول کی سطح میں کل ۳۸ فی صد کی کمی یعنی ۶٫۳ فی صد سے گھٹ کر ۳٫۹ فی صد۔

— ان درآمدہ صنعتی مصنوعات کی قیمت میں ۲۰ سے ۴۳ فی صد کا اضافہ جن پر ترقی یافتہ ممالک میں کوئی چنگی نہیں لگتی۔ اسی کے ساتھ ساتھ درآمدات کے تناسب میں ۷ سے ۵ فی صد کی کمی۔

— محصول میں اضافے کے رجحان کو کم کرنے میں کامیابی جس کی وجہ سے ان ترقی پذیر ممالک کو فائدہ ہوگا جو پروسس کیے گئے بنیادی سامان زیادہ برآمد کرنا چاہتے ہیں۔

— ان متعدد مصنوعات کے محصول میں اوسط سے بھی زیادہ کمی جنھیں ترقی پذیر ممالک برآمد کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

بعد میں ان تخمینوں پر نظر ثانی کی گئی جس سے اندازہ لگا کہ فائدے کچھ زیادہ ہوں گے۔ اب تخمینہ لگایا گیا ہے کہ بازار کی رسائی سے دنیا کو آمدنی کے طور پر جو حاصل ہوگا وہ کم سے کم ۵ سو بلین امریکی ڈالر ہوگا۔ اس سے قبل جو تخمینہ لگایا گیا تھا اس سے اتنی آمدنی ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی کیوں کہ اس میں سب ڈیز اور محصول کے کوٹے میں کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والے متعدد فائدوں کو نظر انداز کیا گیا تھا۔

سروسز میں تجارت کی شمولیت اُروگوئے کانفرنس کی اہم باتوں میں سے ایک تھی۔ ۱۹۹۳ء میں سروسز میں تجارت ۱۰۳۰ بلین امریکی ڈالر مالیت کی پہنچ چکی تھی لیکن یہ محسوس کیا گیا کہ اگر بین سرحدی سروسز تجارت پر سے پابندی ہٹالی جائے تو سروسز کی تجارت میں کافی فروغ ہوگا۔ تاہم سروسز کے شعبے میں اُروگوئے کانفرنس بہت عمدہ نتائج حاصل نہ کر سکی۔ اور صرف بازار کھولنے کے بارے میں سمجھوتے کے خاکے پر ہی اتفاق ہو سکا۔ MOST-FAVOURED-NATION کی بنیاد پر ایسی چھوٹ کے ذریعہ بازار کی رسائی کو عملی بنایا جائے گا اور غیر ملکی سروس فراہم کرنے والوں کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جائے گا جیسا کہ مقامی لوگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

معاہدے کے خاکے کی جس طرح تشکیل ہوئی ہے اس کی وجہ سے معاہدے کو متضاد طریقے سے سمجھا اور پیش کیا جا رہا ہے لہٰذا عالمی تجارت کی تنظیم کا ایک خاص کام یہ بھی ہے کہ وہ معاہدے کے خاکے کو زیادہ صاف اور غیر مبہم بنائے۔

اُروگوئے کانفرنس میں عالمی تجارت کے جس نئے نظام کا تصور سامنے آیا ہے اس کے نفاذ میں عالمی تجارت کی تنظیم کا کردار بڑا مشکل اور اہم ہوگا۔ اس تنظیم کی تشکیل کے بعد تمام ملکوں کو جو امیدیں اس سے وابستہ ہیں ان کی تشریح مراکش میں شاہ حسن دوم نے ۱۵ اپریل کو اختتامی اجلاس میں ان الفاظ میں کی :

"آج عالمی تجارت کی تنظیم کو جنم دے کر ہم بین اقوامی معیشت اور تجارتی تعلقات میں قانون کی بالادستی کو بطور تبرک پیش کر رہے ہیں۔ اس طرح ہم یک رخی پن کا لالچ اور جنگل کے قانون پر عالمی قوانین اور ڈسپلن کی بالادستی قائم کر رہے ہیں۔ یقین و اعتماد کے اس مجموعی اظہار سے دراصل نوآبادیاتی معاہدوں کے دور کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اب ہم ایک دوسرے پر انحصار کر کے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اس بات سے لاتعلق رہ کر کہ ہماری معیشتیں کیسی ہیں، آج سے ہم سبھی لوگ یکساں حقوق کے مالک ہوں گے اور تمام ذمہ داریوں کے یکساں پابند۔ ہمارے مقاصد یکساں ہیں، ہمارے سامنے چیلنج بھی یکساں ہیں۔ ہم سبھی کو بے روزگاری کے مسئلے کو حل کرنے کا چیلنج ہے، سماجی افواج کے مسئلہ کو دور کرنے کا چیلنج ہے نیز یہ کہ ماحولیاتی و دیگر مسائل کو حل کرنے کے لیے راستے تلاش کرنے کا بھی چیلنج ہے۔ اس لیے ہمیں ان چیلنجوں کا مقابلہ بخوبی کرنا ہوگا۔"

ایسا اندازہ لگایا گیا ہے کہ عالمی تجارت کی تنظیم تین بین اقوامی تنظیموں کی مثلث تشکیل کرے گی۔ یہ تین بین اقوامی تنظیمیں ہیں۔ بین اقوامی مالی فنڈ، عالمی بینک اور خود عالمی تجارت کی تنظیم۔ ایک طرح سے عالمی تجارت کی تنظیم جنگ کے بعد بین اقوامی تجارت کی تنظیم کا جو بنیادی خیال پیدا ہوا تھا اس کی معراج ہے۔ لیکن بین اقوامی تجارت کی تنظیم کا خیال امریکہ اور گیٹ کی مخالفت کی وجہ سے عمل میں نہیں لایا جا سکا تھا۔ گیٹ کو ایک درمیانی اور عارضی قدم کے طور پر سمجھا گیا تھا جو ۳۱ دسمبر ۱۹۹۴ء تک جاری رہا۔

تعاون کے امکانات اور عالمی تجارت پر نظر رکھنے کے نظام دونوں لحاظ سے گیٹ اور عالمی تجارت کی تنظیم میں کافی فرق ہے۔ آمدنی کے معیار کو اونچا کرنا، مکمل روزگار کو یقینی بنانا اور تجارت کی توسیع کرنا گیٹ کے مقاصد میں سے تھے۔ عالمی تجارت کی تنظیم نے اپنی تمہید میں ان مقاصد کو دہراتے ہوئے انھیں سروسز کے شعبے میں بھی حاصل کرنے کی بات کی ہے۔ اس کے علاوہ ماحول کے تحفظ کے لیے اس نے "پائیدار ترقی" کے تصور کو بھی متعارف کرایا۔ ترقی پذیر ملکوں کے لیے بین اقوامی تجارت میں زیادہ ترقی کو یقینی بنانے کے لیے اس نے خصوصی اقدام پر بھی زور دیا ہے۔

ڈھانچہ اور فیصلے کرنے کا طریقہ

عالمی تجارت کی تنظیم گیٹ کے فیصلہ لینے یا فیصلہ کرنے کے عمل کی تاسی کرے گی۔ تمام فیصلے اتفاق رائے کے اصول پر مبنی ہوں گے اور اگر کسی ممبر کی جانب سے کسی بھی مسئلہ پر کوئی رسمی اعتراض سامنے نہ آیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ اور اگر کسی مسئلے پر اتفاق رائے سے فیصلہ نہ ہوا تو اس پر ووٹنگ کرائی جا سکتی ہے۔ ووٹنگ میں ایک ملک کو صرف ایک ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہوگا اور جتنے بھی ووٹ پڑیں گے اس میں سے زیادہ ووٹ جس بات کے حق میں ہوں گے فیصلہ اسی کے مطابق کیا جائے گا۔ لیکن ووٹوں کی "اکثریت" تبھی مانی جائے گی جب تین چوتھائی ممبر کسی بات کے حق میں ووٹ ڈالیں گے۔

جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے عالمی تجارت کی تنظیم کو گیٹ کے مقابلے میں کہیں زیادہ اختیارات دیے گئے ہیں۔ جھگڑوں کو حل کرنے کے لیے جو نئے قوانین و ضوابط بنائے گئے ہیں وہ بڑی تجارتی طاقتوں کے ساتھ چھوٹے ترقی پذیر ملکوں کے تجارتی جھگڑوں میں آخرالذکر ملکوں کے لیے مددگار ثابت ہوں گے۔ اُروگوئے کانفرنس کے تمام معاہدوں کے لیے اس نئے نظام میں ایک مربوط طریقۂ کار موجود ہے۔ تجارتی جھگڑے بنیادی طور پر آپسی صلاح و مشورہ کے ذریعہ ہی حل کیے جاتے ہیں۔ ہاں اگر صلاح و مشورہ کے ذریعہ کوئی جھگڑا نہ طے کیا جا سکے گا تو ایسی صورت میں جھگڑے طے کرانے والی ایک کمیٹی یہ کام اپنے ذمہ لے گی۔ اس نئے نظام میں وہ حکومت جس کے خلاف شکایت کی گئی ہے جھگڑے طے کرانے والی کمیٹی کے قیام میں کوئی خلل نہیں پیدا کر سکے گی۔ اگر کوئی ملک اس کمیٹی کی سفارشات کو معینہ مدت میں لاگو نہیں کرتا تو شکایت کرنے والا مناسب معاوضہ کا دعویٰ کر سکتا ہے اور اگر یہ معاوضہ نہ دیا گیا تو شکایت کرنے والے کو معاوضہ نہ دینے والے ملک پر پابندی عائد کرنے کی درخواست کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

عالمی تجارت کی تنظیم کا ڈھانچہ آگے صفحہ پر دکھایا جا رہا ہے، جس میں دیکھا جا سکتا ہے کہ نئے نظام میں تجارتی بات چیت کے لیے ادارہ جاتی انتظامات کیے گئے ہیں جو گیٹ کے نظام میں موجود نہیں تھے۔

تصحیح

قارئین ہمارے اپریل ۹۵ء کے شمارے میں شائع شدہ چند مضامین سے متعلق درج ذیل تصحیحات نوٹ فرمالیں:

(۱) جان لیوا مرض: ایڈز از ڈاکٹر طلعت عثمانی صفحہ ۲۷، دوسرا پیراگراف: لفظ [illegible] کی جگہ Acquired پڑھا جائے۔

(۲) رفیع احمد قدوائی از جناب عادل صدیقی صفحہ ۳۳، دوسرا پیراگراف: ۱۸ فروری ۱۹۹۴ء کی جگہ ۱۸ فروری ۱۸۹۴ء پڑھا جائے۔

(۳) نئی حقیقت نگاری: منٹو کی دین صفحہ ۲۹، پہلی سطر: "مساوات" کی جگہ "سعادت" پڑھا جائے۔

ادارہ ان غلطیوں کے لیے معذرت خواہ ہے۔

ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کا ڈھانچہ

وزارتی کانفرنس
(ہر دو سال بعد)

جنرل کونسل

جھگڑوں کا نبٹارہ

تجارتی پالیسی پر نظر ثانی

تجارت و ترقی کی کمیٹی

ادائیگی کے توازن کے بارے میں کمیٹی

بجٹ کے بارے میں کمیٹی

کونسل برائے سروسز

سامانوں کے لیے کونسل

ٹرپس کونسل

□ □ □   □ □ □   □ □ □

□ وہ کمیٹیاں جو مختلف انتظامات کو نافذ کرنے کے لیے قائم کی گئیں۔

درپیش مسائل
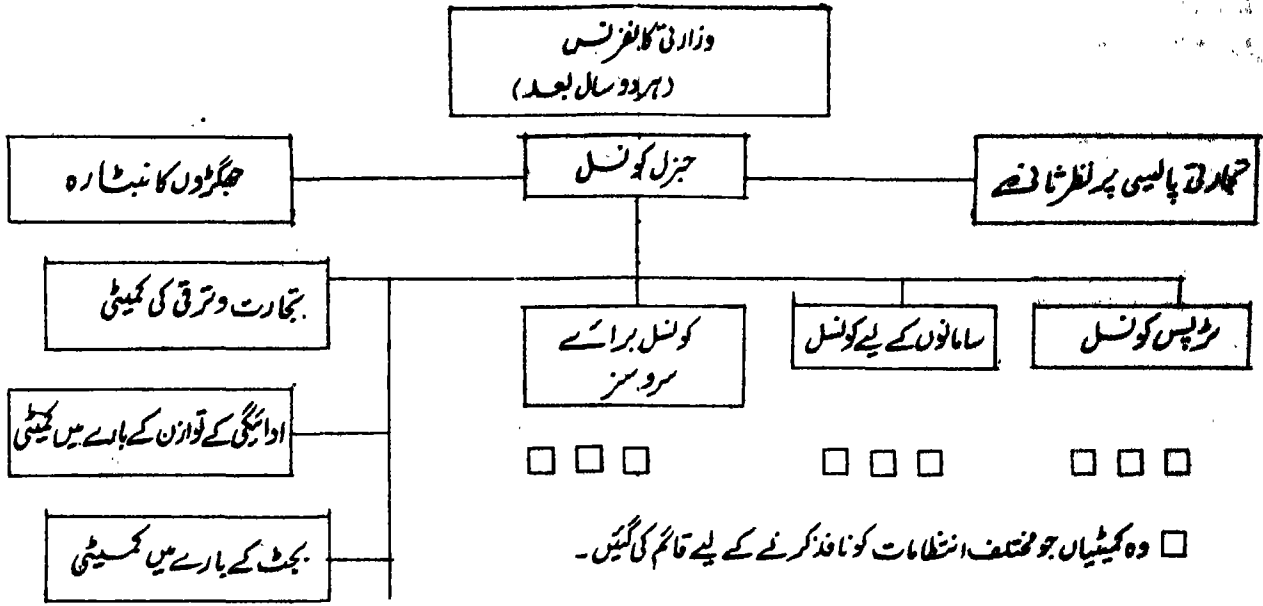
ان سب باتوں کے باوجود عالمی تجارت کی تنظیم کے بارے میں ہر بات عمدہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس تنظیم کے کاموں کے پروگرام کے بارے میں تشویش پائی جاتی ہے جس میں دوسری باتوں کے علاوہ نام نہاد سماجی دفعہ اور پائیدار ترقی کے شامل ہونے کی امید ہے۔

سماجی دفعہ کا معاملہ درحقیقت ترقی پذیر ملکوں میں محنت کے معیار سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں۔ اخلاقی طور پر دیکھا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ محنت کشوں کو زیادہ معاوضہ ملنا چاہیے اور عام تجارتی اداروں میں بچہ مزدوری کو استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ تاہم یہ توضیح پیش کرنا کہ ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ملکوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے کیوں کہ اول الذکر کو تحفظ ملنا چاہیے عجیب و غریب منطق ہے۔

ماضی قریب میں امریکہ، فرانس حتیٰ کہ یوروپین یونین نے سماجی دفعات کے حق میں آوازیں اٹھائی تھیں اور امریکہ تو اس مسئلہ کو نافٹا (NAFTA) معاہدے میں شامل کرانے میں کامیاب بھی ہو گیا ہے۔ عالمی تجارت کی تنظیم میں سماجی دفعہ کی شمولیت کے لیے یوروپین پارلیمنٹ نے ایک قرارداد بھی منظور کی تھی۔

تاریخی اعتبار سے یہ پہلا موقع نہیں ہے جب محنت کے معیار اور تجارت کے مسئلے کو گیٹ میں اٹھایا گیا ہے۔ کچھ سال قبل اُروگوئے دور کی بات چیت کے شروع میں گیٹ کونسل نے ورکروں کے حقوق پر تبادلہ خیال کیا تھا۔

پائیدار ترقی کا مسئلہ اور اس کا تصور بالکل نیا ہے۔ پائیدار ترقی کا مطلب تجارت اور ماحول دونوں کو مدنظر رکھ کر اور دونوں کا خیال رکھ کر ترقی کی جانب گامزن ہونا ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماحول سے متعلق چند مسئلے ایسے ہیں جو تجارت سے متعلق ہیں پھر بھی زیادہ تر ایسے ہیں جن کا تجارت سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح اگرچہ ان میں سے کچھ بین اقوامی نوعیت کے ہیں تو دیگر صرف گھریلو ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر اسی پہلو کی نگرانی کے لیے اقوام متحدہ کی خصوصی ایجنسی، یو۔این۔ای۔پی، پہلے ہی موجود ہے، اس میدان میں عالمی تجارت کی تنظیم کا کردار مشکوک معلوم دیتا ہے۔

زیادہ تر ترقی پذیر ممالک عالمی تجارت کی تنظیم کے کام کے پروگرام میں ان مسئلوں کی شمولیت سے خوش نہیں ہیں۔ خاص طور پر بھارت نے کہا ہے کہ اگرچہ وہ بین اقوامی سطح پر مانے گئے محنت کے معیار کا پابند ہے تاہم اس مسئلہ کو تجارت سے جوڑنے میں اسے کوئی منطق سمجھ میں نہیں آتی۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ یہ نئی تجارتی تنظیم نو آبادیاتی نظام کا ایک آلۂ کار نہیں بنتی، بھارت سمیت تمام ترقی پذیر ملکوں کو ہوشیار رہنا ہوگا۔

ڈاکٹر سی۔ ایس۔ پرساد

چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں سرمایہ کاری

کچھ نئے اقدامات

وسائل کی کمی اور کام کرنے والوں کی بہتات سے عبارت معیشت کو بہتر بنانے کے عمل میں چھوٹی صنعتوں کا رول قابلِ قدر ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے۔ ملک کی مجموعی صنعتی ترقی کے نقشے میں چھوٹی صنعتیں نمایاں اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کی وجہیں دو ہیں: ایک یہ کہ چھوٹی صنعتوں سے منسلک کارخانے تھوڑی سی سرمایہ کاری کے باوصف بڑے پیمانے پر روزگار فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؛ دوم یہ کہ: ہمہ پہلو ترقی میں بھی چھوٹی صنعتوں کا بڑا عمل دخل ہے۔

منصوبہ بند ترقی کی حکمت عملی کے آغاز ہی سے چھوٹی صنعتوں سے متعلق شعبہ حیرت انگیز رفتار سے ترقی پذیر رہا ہے۔ مارچ ۱۹۹۴ء کے اخیر تک ملک میں چھوٹی صنعتوں کے ۲۳ لاکھ ۸۴ ہزار کارخانے قائم ہوئے اور قیمتوں کی موجودہ شرح کے حساب سے ان کارخانوں سے ۲ کھرب، ۶۴۔ ارب، ۸۰ کروڑ روپے کی مالیت کا مال تیار ہوا۔ اس میں سے ۲۴ کھرب ۱۴۔ ارب اور ۹۰ کروڑ روپے کی مالیت کا مال بیرونی ممالک کو برآمد ہو کر فروخت ہوا۔ نیز ایک کروڑ ۳۹ لاکھ اور ۳۸ ہزار آدمیوں کو روزگار بھی فراہم ہوا۔ یہ شعبہ فی الوقت پیداواری شعبے میں ۴۰ فی صدی اور کل برآمدات میں ۳۴٫۵ فی صدی حصہ ادا کر رہا ہے۔

تمام قسم کی صنعتی سرگرمیوں کے لیے میعادی قرضہ جات اور کاروباری اصل زر دو اہم اور بنیادی ضرورتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرضہ جات کی بروقت اور ضرورت کی حد تک فراہمی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر تجارت ہو چھوٹے پیمانے پر چلنے والے کارخانے ہوں، سب کے لیے سرمایہ کاری سب سے اہم جزو ہے۔

جولائی ۱۹۹۱ء میں اقتصادی اصلاحات کے نفاذ کا عمل شروع ہوا تب سے چھوٹی صنعتوں کے شعبے کو بھرپور امداد اور سہارا دینے کی حکومت کی فراخدلانہ پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اسی لیے قومیائے گئے بینکوں میں قرضہ فراہم کرنے سے متعلق پروگرام میں چھوٹی صنعتوں کے شعبہ میں سرمایہ کاری بدستور ترجیحی طور پر توجہ کی حامل ہے۔

کمرشیل کو آپریٹو اور علاقائی دیہاتی بینک چھوٹی صنعتوں کے کسی بھی کارخانے کے کاروباری اصل زر کا ۸۰ فی صد حصہ فراہم کرتے ہیں۔ میعادی قرضہ جات کی فراہمی اسٹیٹ فائنانشل کارپوریشن (SFC) اسٹیٹ اسمال انڈسٹریز ڈیولپمنٹ کارپوریشن نیشنل اسمال انڈسٹریز کارپوریشن اور نبارڈ (NARARD) کی ذمہ داری ہے۔ اسمال انڈسٹریز ڈیولپمنٹ بینک آف انڈیا (SIDRI) باز سرمایہ کاری کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے۔ یہ بینک ۱۹۹۰ء میں قیام پذیر ہوا۔ "سنگل ونڈو" اسکیم اور "نیشنل اکوٹی فنڈ" کے تحت طویل مدتی قرضے فراہم کرنے کی ذمہ داری ایس ایف سی پر عائد ہے۔ بڑے صنعتی کارخانوں کے برعکس جو بازار اصل سے بھی سرمایہ حاصل کرتے ہیں، چھوٹی صنعتوں کے کارخانوں کے قیام اور پھیلاؤ کے لیے صرف ایس ایف سی اور بینک قرضے بہم کرتے ہیں۔ ایس آئی ڈی بی آئی (SIDRI) بھی براہ راست سرمایہ کاری کرتا ہے مگر یہ کارخانوں کی جدید سے جدید تر بنانے، صنعتی شعبے میں اپنا زور بازو آزمانے والوں اور عورتوں کی بہبود سے متعلق پروگراموں کے لیے مخصوص ہے۔

پچھلی دو دہائیوں میں چھوٹے صنعتی کارخانوں کے لیے ادارہ جاتی سرمایہ کاری کی فراہمی ایک تناسب رفتار سے جاری رہی ہے۔ یہ سلسلہ بالخصوص ۱۹۶۹ء سے جاری ہے۔ اسی سال ملک کے کئی بڑے بینک قومیائے گئے۔ دسمبر ۱۹۶۹ء میں شیڈولڈ بینکوں سے فراہم کیے گئے قرضہ جات کی سطح ۳۔ ارب ۷۴ کروڑ روپے تھی لیکن مارچ ۱۹۹۴ء میں یہ بڑھ کر ۲۱ کھرب ۵۶۔ ارب اور دس کروڑ روپے ہو گئی۔ اس مدت میں چھوٹی صنعتوں کے کارخانوں میں قرضہ جات کی سطح ۶٫۹ فی صد سے بڑھ کر ۱۵٫۳ فی صدی ہو گئی۔ گوشوارہ نمبر ا حالیہ برسوں میں ان کارخانوں میں قرضہ جات کی فراہمی کا منظر پیش کرتا ہے۔

پولیس فورس کی جدید کاری

ریاستی پولیس فورس کی جدید کاری کی اسکیم کے تحت مرکز ریاستوں کو ٹریننگ اور مواصلاتی سامان کی فراہمی نیز فورنیسک سائنس سے متعلق لیبارٹریوں کے لیے مساویانہ بنیادوں پر مالی امداد دے رہا ہے تاکہ پولیس کو جدید سہولتوں سے آراستہ کیا جا سکے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء، ۹۴-۱۹۹۳ء، ۹۵-۱۹۹۴ء میں اس اسکیم کے تحت ہر سال ۳۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ ●

گوشوارہ نمبر ۱

چھوٹی صنعتوں میں کل قرضہ جات کا حصہ

بقایا جات از مارچ ۱۹۹۱ء تا مارچ ۱۹۹۴ء

	مارچ ۱۹۹۱ء	مارچ ۱۹۹۲ء	مارچ ۱۹۹۳ء	مارچ ۱۹۹۴ء
خالص قرضہ جات	۱۰۵۶۳۲ کروڑ روپے	۱۱۲۱۶۰ کروڑ روپے	۱۳۲۷۸۲ کروڑ روپے	۱۴۰۹۱۴ کروڑ روپے
چھوٹی صنعتوں کے کارخانوں کو فراہم شدہ قرضے	۱۶۷۸۳ کروڑ روپے	۱۷۳۹۸ کروڑ روپے	۱۹۳۸۸ کروڑ روپے	۲۱۵۶۱ کروڑ روپے
چھوٹی صنعتوں کے شعبے کے کھاتوں کی تعداد	۳۱٫۰۴ لاکھ	۲۹٫۲۳ لاکھ	۳۰٫۴۰ لاکھ	۳۰٫۱۹ لاکھ

پچھلے چار برسوں میں بینکوں سے فراہم شدہ قرضہ جات کا اوسطاً ۱۵٫۳۰ فی صد حصہ چھوٹی صنعتوں کے شعبے کو فراہم ہوا ہے۔ اسی طرح اسٹیٹ فینانشل کارپوریشنوں نے قرضہ جات کی سطح ۸۵-۱۹۸۴ء میں ۳۰۷ کروڑ روپے سے ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۱۳۰۸ کروڑ روپے تک بڑھا دی۔ اسمال انڈسٹریز ڈویلپمنٹ بینک آف انڈیا نے بازسرمایہ کاری اور راست سرمایہ کاری، دونوں کے حوالے سے اپنی سرگرمیوں کو وسیع تر کرنے میں اپنے آغاز ہی سے کامیابیاں حاصل کیں۔ گوشوارہ نمبر ۲ اس ادارے کی کارکردگی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۲

اسمال انڈسٹریز ڈویلپمنٹ بینک آف انڈیا کی سالانہ کارکردگی

	۹۱-۱۹۹۰ء	۹۲-۱۹۹۱ء	۹۳-۱۹۹۲ء	۹۴-۱۹۹۳ء
راست سرمایہ کاری	۹۸ کروڑ روپے	۱۹۲ کروڑ روپے	۵۱۵ کروڑ روپے	۱۱۳۴ کروڑ روپے
بالواسطہ اور بازسرمایہ کاری	۲۱۵۵ کروڑ روپے	۲۳۹۶ کروڑ روپے	۲۲۷۳ کروڑ روپے	۲۱۹۷ کروڑ روپے
کل	۲۲۵۳ کروڑ روپے	۲۵۸۸ کروڑ روپے	۲۷۸۸ کروڑ روپے	۳۳۳۱ کروڑ روپے

چھوٹی صنعتوں سے متعلق شعبہ میں مالی امداد کی کمی کی شکایت وقتاً فوقتاً کی جاتی رہی ہے۔ ضرورت سے کم اور تاخیر سے قرضوں کی فراہمی کا ذکر خصوصی طور پر کیا جاتا ہے۔ کمرشل بینکوں کو کاروباری اصل زر مہیا کرنے کے لیے جتنا سرمایہ فراہم ہوا وہ چھوٹی صنعتوں کی ضروریات سے بہت کم تھا۔ بہرحال حکومت ان مسائل سے باخبر ہے۔ چھوٹی صنعتوں کے کارخانہ داروں کی شکایت ہے کہ انھیں کاروباری اصل زر حاصل کرنے میں مندرجہ ذیل مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

(۱) معیادی قرضہ حاصل کرنے کے بعد بھی کاروباری اصل زر کی فراہمی میں صبرآزما تاخیر ہوتی ہے۔

(۲) کاروباری اصل زر کا تخمینہ لگانے کا عمل جبوری قسم کا اور غیر معروضی ہے۔ اس لیے اس مد کے تحت دی جانے والی رقم ضروریات سے کم ہوتی ہے۔

(۳) اکثر کاروباری اصل زر میں اضافہ یا کمی کا مسئلہ پیداوار میں اضافہ یا کمی کی بنیاد پر طے نہیں کیا جاتا۔

(۴) کسی منصوبہ میں قیمتوں میں اضافے کے تناسب سے مزید قرضے کی فراہمی میں بینک لیت و لعل سے کام لیتے ہیں۔

حالیہ اقتصادی اصلاحات کے ایک حصے کے طور پر چھوٹے، کمزور اور دیہات میں قائم کارخانوں کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرکے انھیں ترقی پذیری کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے کئی نئے اقدامات کا اعلان ہوا۔ یہ ۶ اگست ۱۹۹۱ء کی بات ہے۔ یہ تسلیم کیا گیا کہ قلیل المدتی یا طویل المدتی قرضہ جات کے حصول میں مختلف قسم کی دقتیں چھوٹی صنعتوں کا ایک مستقل مسئلہ ہے۔ اس کے پیش نظر، کچھ مخصوص کارخانوں کو چھوڑ کر، توجہ اب اعانتی / معمولی قرضہ جات کے بجائے ضرورت کے مطابق اور ایک منضبط طریقۂ کار کے تحت قرضوں کے فراہمی کے عمل کو یقینی بنانے پر مرکوز ہوگئی ہے۔ اس حکمت عملی کے نفاذ سے اس شعبے میں کارکردگی نفع بخش ثابت ہوگی۔

نائک کمیٹی

چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں مالی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔ اس سوال پر غور کرنے کے لیے ریزرو بینک آف انڈیا نے دسمبر ۱۹۹۱ء میں اپنے ڈپٹی گورنر، شری پی۔ آر نائک کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی۔ کمیٹی کو خصوصی طور سے اداروں سے فراہم ہونے والے سرمائے اور اس سے متعلق دوسرے امور کی جانچ کا کام بھی سونپا گیا۔ اس کمیٹی نے ستمبر ۱۹۹۲ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔

کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں کاروباری اصل زر اصل پیداوار کی مالیت کے ۸٫۱ فی صد کے برابر فراہم ہوا تھا۔ دیہی صنعتوں کے علاوہ دوسری چھوٹی اور معمولی صنعتوں کو کاروباری اصل پیداوار کی مالیت کے محض ۲٫۷ فی صد کی حد تک ملا۔ اسی شعبے میں البتہ نسبتاً بڑے کارخانوں کو پیداوار کی مالیت کا ۱۸٫۸ فی صد کاروباری اصل زر کے طور پر بہم ہوا۔ جو ۲۰ فی صد کی ضرورت سے تھوڑا سا کم تھا۔ کمیٹی نے اس سطح کو غیر مناسب نہیں سمجھا۔ کمیٹی

نے کئی سفارشات کیں جن میں کچھ منظور بھی کی گئیں۔ کچھ اہم سفارشات جنھیں منظور کیا گیا ہے اور جن کی بنیاد پر ہدایات بھی جاری ہوئی ہیں، یوں ہیں:۔

۱۔ چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں سرمایہ کاری کے باب میں بینکوں کو ترتیب (۱) دیہی صنعتوں، بہت چھوٹی صنعتوں اور اس شعبے کے دوسرے کارخانوں کے لیے ترجیحی طور پر سرمایہ فراہم کرنا چاہیے۔

۲۔ پیش ازاں دیہی صنعتوں، بہت چھوٹی صنعتوں اور چھوٹی صنعتوں کے دوسرے کارخانوں کو جو قائم ہو چکے ہیں یا قائم ہونے والے ہیں، کاروباری اصل زر سالانہ پیداوار یا سالانہ متوقع پیداوار کی مالیت کے ۲۰ فی صد حصہ تک فراہم ہونا چاہیے اگر ان کا کل کاروباری اصل فنڈ ایک کروڑ روپے تک کا ہے۔

۳۔ بینکو کو چاہیے کہ وہ آٹھویں پانچسالہ منصوبے کے دوران چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں واجب ضروریات کو پورا کرنے کے لیے سرمایہ کاری کی مہم کو تیز تر کرنا چاہیے۔

۴۔ ہر بینک میں موثر طریقے سے شکایات کا ازالہ کرنے سے متعلق ایک شعبہ کا قیام عمل میں لایا جانا چاہیے تاکہ چھوٹے صنعت کار آسانی کے ساتھ اس شعبے سے رابطہ قائم کر کے اپنی مشکل دور کروا سکیں۔

۵۔ قرضوں کی فراہمی کے لیے درخواستوں کو نبٹارے کے لیے جو طریقۂ کار اور وقت مقرر ہوا ہے اس کی سختی سے پابندی کی جانی چاہیے۔

۶۔ بینکوں کو SIDRI کے "سنگل ونڈو اسکیم" پر عمل پیرا ہو کر چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں قرضوں کی فراہمی کے معاملات پر غور اور فیصلہ کرنا چاہیے۔

۷۔ بینکوں کے اسٹاف کو چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں سرمایہ کاری کی سمت میں صحیح رجحان، سلیقہ شعاری اور مناسب نقطۂ نظر حاصل کرنے کے لیے تربیت دی جانی چاہیے۔

۸۔ قرضوں کی فراہمی کے لیے لازمی طور پر کھاتے کھولنے کو ایک شرط لابدی قرار دینے سے احتراز ضروری ہے۔

۹۔ اسٹیٹ فائنانشل کارپوریشنوں کو ۸۵ ضلعوں میں سے ۴۰ ضلعوں میں ایک سب سے بڑے مالی ادارے کے طور پر کام کرنا چاہیے اگر ان اضلاع میں چھوٹی صنعتوں کے رجسٹرڈ کارخانوں کی تعداد ۲ ہزار سے زیادہ ہے۔ اس صورت میں نئے کارخانوں کے لیے معیاری قرضے اور کاروباری اصل زر دونوں فراہم کرنا اسی کارپوریشن کی ذمہ داری ہونی چاہیے۔ باقی ۴۵ ضلعوں میں کمرشل بینکوں کو سب سے بڑے مالی ادارے کے طور پر سرمایہ دستیاب کرنے کی ذمہ داری قبولنی چاہیے۔ دونوں اداروں میں البتہ "سنگل ونڈو اسکیم" پر عمل لازمی اور قدر مشترک ہونی چاہیے۔ بعد ازاں اس امر کے پیش نظر کہ فائنانشل کارپوریشنوں کی مالی حالت بے حد کمزور ہے، یہ مناسب سمجھا گیا کہ ۴۰ ضلعوں میں سرمایہ کاری کی ذمہ داری ان کے لیے نامناسب بوجھ ہوگی۔ اس لیے یہ تعداد گھٹا کر ۲۳ کر دی گئی اور یہ ۲۳ اضلاع ۸ فائنانشل کارپوریشنوں کو تفویض ہوئے باقی ۱۷ اضلاع دوبارہ کمرشل بینکوں کے دائرہ کار میں لائے گئے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا ہے کہ جن علاقوں میں چھوٹی صنعتوں کے کارخانوں کی بہتات ہے کمرشل بینک وہاں خاص طور سے شاخیں قائم کریں گے تاکہ ان کارخانوں کی مالی ضروریات کو موثر پیرایہ میں پورا کیا جا سکے۔

۱۰۔ کھاتوں کے حوالے سے جن کارخانوں کے قرضوں کی حد دس لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔ ان کے متعلق اعداد و شمار کو کمپیوٹر کے ذریعہ محفوظ کرنے کے لیے بینکوں سے مناسب اقدام کرنے کو کہا گیا ہے۔

۱۱۔ ریزرو بینک آف انڈیا نے بینکوں کو ہدایت دی ہے کہ چھوٹی صنعتوں کے کارخانوں کی سرمایہ کاری کی درخواستوں کو مسترد کرنے یا قرضوں کی حد کو کم کرنے کے بارے میں افسرانِ بالا کی اجازت کے بغیر درخواست دہندہ کو اس کی اطلاع نہ دی جائے۔

ہدایات کا جاری ہونا ہی سرمایہ کی فراہمی کو یقینی نہیں بنا سکتا۔ ان کی کامیابی کسی تجارتی منصوبے کے منافع بخش ہونے کی شرط کا پابند ہے۔ یہ ضروری ہے کہ کارخانے لگانے والے اپنے منصوبے کی ضروریات اور اجزائے ترکیبی سے کما حقہٗ واقف ہوں اور انھیں ریزرو بینک آف انڈیا سے جاری شدہ ہدایات اور قرضے کے حصول سے متعلق دوسری لوازمات کا بھی بھرپور علم ہو۔ لہٰذا بنیادی کام موجود اور آنے والے کارخانہ داروں کو ریزرو بینک کی ہدایات سے متعلق ان کو بھرپور جانکاری بہم کرنے کا ہے۔ دوسرا بڑا کام ہے ان لوگوں کو مختلف مالی اداروں تک پہنچنے اور نفع بخش پروجیکٹ تجاویز تیار کرنے میں مدد دینا۔

یہ شکایت عام ہے کہ چھوٹی صنعتوں کے کارخانوں کے کاروباری اصل کی ضروریات کو پورا کرنے میں بینکوں کا رویہ کچھ حوصلہ افزا نہیں۔ اس انجماد کی صورت کو دور کرنے کے لیے کچھ ٹھوس اقدامات کی ضرورت ہے۔ اس معاملہ میں ریاستی حکومتیں SIDRI اور ایس ایس آئی ایسوسی ایشنز (SMALL SCALE INDUSTRIES ASSOCIATIONS) کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہے۔

دوسرا مسئلہ چھوٹے صنعتی کارخانوں کا کارکردگی کے لحاظ سے بڑے کارخانوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھلا دی جاتی ہے کہ چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں ضرورت کے مطابق انتظامی وسائل کی کمی بھی ہے اور یہ شعبہ درجہ بندی کے سبب اقتصادی فوائد حاصل کرنے سے بھی عاجز ہے۔ یہ مسئلہ زیادہ تر اس شعبے میں بہت چھوٹے کارخانوں کو پریشان کر رہا ہے اور ان کارخانوں کی تعداد ۹۵٪ ہے۔

حالیہ اقدامات

اقتصادی اصلاحات کے بعد کی سرمایہ کاری

گئی پالیسی کا ایک واضح نشان قرضوں کی درجہ داری میں تخفیف ہے۔ اب قرضوں کے صرف تین درجے ہیں: ۲۵ ہزار روپے تک، ۲۵ ہزار سے دو لاکھ روپے تک اور دو لاکھ روپے سے زائد۔ دوسرا اہم پہلو شرح سود میں خاطر خواہ تخفیف سے عبارت ہے۔ ۱۹۹۳ء میں کئی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ پہلے ۵،سو روپے تک کے قرضے پر ۵ر۱۱ فی صد سالانہ اور ۵۰۰۰ روپے سے ۲۵۰۰۰ روپے تک کے قرضے پر ۵ر۱۳ فی صد سالانہ کی شرح سے بینک سود وصول کرتے تھے۔ اب ۲۵ ہزار روپے تک کے قرضے پر یکساں شرح سے سود لیا جاتا ہے اور یہ صرف ۱۲ فی صد سالانہ ہے۔ اپریل ۱۹۹۳ء میں ۲۵ ہزار روپے سے زائد اور ۲ لاکھ روپے کے قرضے پر ۵ر۱۶ فی صد سالانہ کی شرح سے سود لگتا تھا۔ جون ۱۹۹۳ء میں اسے گھٹا کر ۱۶ فی صدی کر دیا گیا اور ستمبر ۱۹۹۳ء میں مزید گھٹا کر صرف ۱۵ فی صدی کی سطح پر لایا گیا۔ اسی عرصے میں ۲ لاکھ روپے سے زائد کے قرضے کا "FLOOR" شرح سود دو مراحل میں گھٹا دیا گیا یعنی اپریل ۱۹۹۳ء میں ۱۷ فی صدی سے ۱۵ فی صدی تک۔ ان اقدامات کے تسلسل کے طور پر سال ۹۵-۱۹۹۴ء کے بجٹ میں مالی اداروں سے فراہم کیے جانے والے میعادی قرضوں کی شرح سود ۱۴ فی صدی سالانہ کر دی گئی۔ اسی طرح کمرشل بینکوں کے تین سالہ میعادی قرضوں پر سود کی شرح ۱۵ فی صدی کے مقابلہ میں ۱۴ فی صد مقرر کی گئی۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء سے ۶ مہینے تک نافذ العمل رہنے والی قرضوں کی فراہمی سے متعلق پالیسی کے مطابق میعادی قرضوں اور کاروباری اصل زر دونوں پر شرح سود کم کی گئی ہے یعنی ۲۵ ہزار روپے سے ۲ لاکھ روپے تک صرف ۵ر۱۳ فی صدی سالانہ۔ ۲ لاکھ روپے سے زیادہ پر شرح سود کا معاملہ آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔

اکتوبر ۱۹۹۳ء کی "کریڈٹ پالیسی" کے تحت دیہی، بہت چھوٹی اور چھوٹی صنعتوں کے دوسرے کارخانوں کے لیے کاروباری اصل زر کو ان کارخانوں کی کم سے کم سالانہ پیداوار کی مالیت کے ۲۰ فی صدی کی حد پر مقرر کرنے کے آسان طریقہ کو اسی شعبے کے دوسرے کارخانوں پر بھی لاگو کیا گیا۔ یہ وہ خانے ہیں جن کے کاروباری اصل کی ضرورت ایک کروڑ روپے تک کی ہوگی۔ پہلے اس کی حد صرف ۵۰ لاکھ روپے تھی۔ اس سے چھوٹی صنعتوں سے منسلک بڑے کارخانوں کے قیام میں سرمایہ کی فراہمی کا مسئلہ آسان ہو گیا ہے۔ "ترجیحی شعبوں کی فہرست" کا از سر نو جائزہ لیا گیا۔ اس کے نتیجے میں دوسری باتوں کے علاوہ چھوٹے درجے کے کارخانوں کے شعبے میں پلانٹ، مشینری اور متعلقہ ضروری ساز و سامان کے لیے ۶۰ لاکھ روپے تک اور برآمد کے لیے مال تیار کرنے والے ایسے ہی کارخانوں کے لیے ۷۵ لاکھ روپے تک سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے۔ پہلے اس کی حد صرف ۳۵ لاکھ روپے تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس پورے شعبے کو ترجیح کا حامل شعبہ قرار دیا گیا ہے اور اب قابل قدر حد تک سرمایہ کا حصول بھی یقینی دکھائی دیتا ہے۔ ان چھوٹے درجے کے کارخانوں سے بھی چھوٹے کارخانوں کے لیے ۵ لاکھ روپے کی حد تک قرضے کی فراہمی بھی ان اقدامات کا ایک حصہ ہے۔ مزید بہت ہی چھوٹے کارخانوں، کھادی، دیہی اور گھریلو صنعتوں اور ان سے وابستہ کاریگروں کے لیے چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں کی جانے والی کل سرمایہ کاری کا ۴۰ فی صد حصہ مختص رہے گا۔ ترجیح کے حامل شعبوں کے لوازمات کی پابندی نئے منظور شدہ ترجیح کے حامل شعبوں میں قائم ہونے والے بینکوں پر بھی لازمی ہوگی۔ جیسا کہ پہلے ہی بتایا گیا ہے، نائک کمیٹی کی سفارشات پر مبنی جاری شدہ ہدایات میں بینکوں اور ایس ایف سی کو سرمایہ کاری کے بنیادی اداروں کے طور پر کام کرنا چاہیے۔ یہ ہدایات نومبر ۱۹۹۳ء میں جاری ہوئیں۔ ان کے مطابق ۸۵ اضلاع میں جن میں ۲۰۰۰ سے زائد چھوٹی صنعتوں کے کارخانے قائم ہوئے ہوں۔ بینک اور ایس ایف سی سرمایہ کاری کریں گے۔ ان میں ۶۲ اضلاع پبلک سیکٹر بینکوں اور ۲۳ اضلاع ایس ایف سی کو تفویض ہوئے ہیں۔ بینکوں کو ۸۵ شناخت شدہ اضلاع میں خصوصی شاخیں قائم کرنے کے لیے بھی کہا گیا ہے تاکہ قرضے کی فراہمی کی سہولیات چھوٹے کارخانوں کو آسانی سے مہیا ہو جائیں۔

SIDBI نے "سنگل ونڈو" اسکیم میں بڑے پیمانے پر ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ مقصد چھوٹی صنعتوں کے کارخانوں کی قرضے کی ضروریات پوری کرنا ہے۔ کسی منصوبے پر لاگت کی حد ۳۰ لاکھ روپے سے بڑھا کر ۵۰ لاکھ روپے کر دی گئی ہے۔ مزید برآں میعادی قرضے اور کاروباری اصل زر کے تحت دیے جانے والے سرمائے کی الگ الگ حدوں کو بھی برخواست کیا گیا ہے۔ ان ترامیم کے سبب اس شعبے میں بڑے بڑے منصوبہ کار بھی نافذ کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے کارخانوں اور قرضہ فراہم کرنے کے بنیادی اداروں کو قرضے کے لیے منظور شدہ منصوبوں پر آزادانہ طور پر عمل درآمد کرنے کا اہل بھی بنایا گیا ہے۔ SIDBI مربوط انداز سے مختلف سہولیات کے فروغ میں بھی اعانت کرتا ہے۔

خواتین کے لیے اسکیم

ایس آئی ڈی بی آئی (اسمال انڈسٹریز ڈویلپمنٹ بینک آف انڈیا) کی سرگرمیوں میں دیہاتی غریب عورتوں کو صنعتی میدان میں آگے بڑھنے سے متعلق سرگرمی پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ہر چند کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ سرمایہ کاری کے باب میں اس ادارے میں مردوں اور عورتوں میں کوئی تخصیص روا نہیں رکھی جاتی پھر بھی مخصوص طریقے سے خواتین کے لیے مندرجہ ذیل خاص اسکیمیں تیار کی گئی ہیں:

(الف) بازسرمایہ کاری کی اسکیم

(۱) خواتین کارخانہ داروں کے لیے بازسرمایہ کاری کی اسکیم: اس اسکیم کے دو مقاصد ہیں: خواتین کارخانہ داروں کو ایسی تربیت اور توسیعی خدمات میسر کرنا، جو ان کی ہنرمندی اور سماجی رتبے کے ہم پلہ ہوں اور رہنمائی امداد فراہم کرکے انھیں چھوٹے درجے کے کارخانوں کے شعبے میں اپنے کارخانے قائم کرنے کے اہل بنانا۔ اس اسکیم کے تحت قرضہ فراہم کرنے کے بنیادی اداروں (ریاستی سطح کے مالی ادارے اور بینک) کو بازسرمایہ کاری کے لیے اس حد تک مالی امداد

دی جاتی ہے، جس حد تک وہ خواتین کو چھوٹے درجے کے کارخانوں کے شعبے میں صنعتی کارخانے قائم کرنے کے لیے قرضے فراہم کرتے ہیں۔ چھوٹے درجے کے کارخانوں کے شعبے میں گھریلو صنعتیں، دیہی اور بہت چھوٹی صنعتوں کے کارخانے قائم کرنے کے لیے خواتین کو اس اسکیم کے تحت قرضے فراہم ہوں گے۔ اس اسکیم کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ "فہرست الف" میں درج پس ماندہ اضلاع یا صوبوں میں اگر خواتین کارخانے لگائیں تو انھیں کل لاگت کا صرف ۵ر۱۲ فی صد اپنے حصے کے طور پر ادا کرنا ہوگا۔ دوسرے صوبوں میں یہ حد ۱۵ فی صد ہے۔ مزید انھیں کوئی متوازی ضمانت بھی فراہم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) مہیلا اُدیام ندھی: یہ اسکیم اسٹیٹ فائنانشل کارپوریشن مشترکہ طور پر یا اس کارپوریشن اور اسٹیٹ انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے تحت نافذ العمل ہے۔ اس کے تحت خواتین کو چھوٹے کارخانوں کے شعبے میں صنعتی کارخانے قائم کرنے کے لیے ایک مناسب رقم "ایکوئی ٹی" کے طور پر فراہم کی جاتی ہے۔ اس میں ایسی توسیعی خدمات کے لیے بھی مالی اعانت مہیا ہے جو اس شعبے کے قواعد و ضوابط کے مطابق ہوں۔ شرط صرف یہ ہے کہ کل لاگت ۱۰ لاکھ روپے سے زیادہ نہ ہو۔ کسی منصوبہ کار کے کل لاگت سے "ایکوئی ٹی" کی رقم مہیا کرکے بنیادی کاروباری اصل زر کے لیے جس رقم کی ضرورت باقی رہتی ہے وہ نرم قرضے کے طور پر فراہم کی جاتی ہے۔ اس میں البتہ چھوٹی صنعتوں کو بڑھاوا دینے والی خواتین کی ذاتی سرمایہ کاری کی سطح کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور کل رقم ۱۵ فی صد سے زیادہ نہیں دی جاتی۔ چھوٹی صنعتوں کو بڑھاوا دینے والی ان خواتین کی ذاتی سرمایہ کاری کی حد کم سے کم منصوبے کی کل لاگت کے ۱۰ فی صد کے برابر مقرر ہے۔ اس اسکیم کے تحت خواتین کو میعادی قرضے حاصل کرنے کی سہولت بھی حاصل ہے اور یہ قرضے وہ اسٹیٹ فائنانشل کارپوریشن یا اسٹیٹ انڈسٹریل کارپوریشن سے لے سکتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے ان دو کارپوریشنوں کو SIDBI سے سرمایہ فراہم کیا جاتا ہے۔

(ب) ترقی سے متعلق اسکیمیں

(۱) مہیلا وکاس ندھی: کے تحت SIDBI نے ایک خاص فنڈ مختص کیا ہے۔ خواتین میں، بالخصوص دیہاتی غریب خواتین میں، روزگار کے وسائل پیدا کرنے کے لیے کام کرنے والی منظم رضاکار انجمنیں اس فنڈ سے مالی اعانت حاصل کر سکتی ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے ضمن میں یہ انجمنیں خواتین کو پیشہ ورانہ تربیت دیں گی، ایسے مرکز قائم کریں گی جہاں مال بھی تیار ہو اور تربیت بھی دی جا سکے، تیار شدہ مال کو بازار میں فروخت کرنے کے وسائل کو بڑھاوا دینے کی ذمہ داری اٹھائیں گی، کارخانے چلانے کے لیے ترقی یافتہ ساز و سامان مہیا کریں گی اور پیداوار کے ساتھ ساتھ ماہرانہ صلاحیتوں کو بھی فروغ دینے کا بندوبست کریں گی۔

(۲) خواتین کو صنعتی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے ترغیب دئے جانے سے متعلق پروگرام: اس پروگرام کو روبہ عمل کرنے کے لیے کام کرنے والی انجمنوں کو مالی اعانت دستیاب کی جاتی ہے۔ ان انجمنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بارے میں خواتین کی ابتدائی رہنمائی سے متعلق خدمات بہم کریں۔

(۳) کارخانہ لگانے والی خواتین کی انجمنوں کی مالی امداد: SIDBI ان انجمنوں کو سیمینار، نمائش اور خریدنے اور بیچنے والوں کے اجتماعات منعقد کرنے کے لیے مالی اعانت دیتا ہے۔

"پی ایم آر وے اسکیم": پرائم منسٹر کی روزگار یوجنا ایک ایسی یوجنا ہے، جس کے تحت شہری یا دیہاتی کے فرق سے قطع نظر چھوٹے کارخانے لگائے جا سکتے ہیں۔ یہ یوجنا ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ء سے نافذ ہے۔ اس کا مقصد تعلیم یافتہ بے روزگاروں کو اپنا روزگار آپ پیدا کرنے کے لیے ہر قسم کے وسائل بہم کرنا ہے۔ اس اسکیم کے تحت کمزور طبقوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی ترجیحی بنیادوں پر فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ ٹرائب کے لیے ۵ر۲۲ فی صد اور دوسرے پسماندہ طبقوں کے لیے ۲۷ فی صد سرمایہ، جو اس یوجنا کے تحت مہیا ہوتا ہے، مختص رکھا گیا ہے۔ ایک لاکھ روپے تک کے منصوبوں پر اس اسکیم کے ذریعہ سے سرمایہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر دو یا دو سے زیادہ اشخاص مشترکہ طور پر کوئی روزگار مہیا کرنے والا کام ہاتھ میں لینا چاہیں اور ایک لاکھ روپے یا اس سے کچھ کم سرمایہ انفرادی اور ذاتی طور پر اس کام میں لگائیں تو مالی امداد کی حد ایک لاکھ روپے سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ پروجیکٹ قائم کرنے کا خواہش مند کوئی بھی شخص پروجیکٹ کی کل لاگت کا ۹۵ فی صد حصہ بینکوں سے مخلوط قرضے کے طور پر حاصل کر سکتا ہے۔ ذاتی طور پر اسے محض ۵ فی صد کی معمولی رقم فراہم کرنی ہے۔ اس قرضے کے لیے اسے کوئی متوازی ضمانت پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ مرکزی حکومت زیادہ سے زیادہ ۷۵۰۰ روپے تک یا پروجیکٹ کے کل لاگت کا ۱۵ فی صد حصہ اعانت کے طور پر ادا کرتی ہے۔ یہ شرح فی کس ہے۔ قرضے کی واپسی کی مدت تین سے سات سال تک ہے۔ اس اسکیم کی ایک لازمی شرط اپنا روزگار آپ پیدا کرنے والوں کا چار ہفتے کا تربیتی کورس مکمل کرنا ہے۔ یہ قرضہ منظور ہونے کے بعد پوری کی جانے والی واحد شرط ہے۔ اس دوران تربیت حاصل کرنے والوں کو ۳ سو روپے کا مشاہرہ بھی ملے گا۔

موجودہ دور پیداواریت میں اضافہ، پیداوار کو بہتر بنانا اور زیادہ صلاحیت حاصل کرکے تجارتی معاملے میں پورا اترنے کے تقاضوں کو پورا کرنے کا دور ہے۔ یہ وقت ہے قرضوں کی فراہمی سے منسلک معیشت کی اس طرح سے ترتیب نو کرنا، کہ جن مقاصد کا ذکر ہو چکا ہے، ان کا حصول یقینی ہو جائے۔ چھوٹی صنعتوں کے شعبے میں ماہرانہ صلاحیتوں کا فروغ، جدید فکر و عمل، فروخت کے ساتھ ہی ساتھ تیزی کے ساتھ قرضوں کی واپسی، جانکاری کے وسائل تک آسانی کے ساتھ رسائی، بہت زیادہ اہمیت کی ضروریات ہیں۔ ان کو پورا کرنے کے لیے مختلف سہولیات کو ترقی پذیر کرنا اور وسیع تر کرنا ناگزیر ہے۔ عوامی خدمات، بلوں میں چھوٹے قرضوں کا بیمہ، مختلف قسم کے چھوٹے کارخانوں کے لیے قرضے کی ضروریات کی سطح مقرر کرنے والے اداروں کا قیام، ماہرانہ صلاحیتوں کے فروغ اور کسی خطرے کی پیش بندی کے اقدامات کرنے کے لیے حوصلہ مند کاروباری کمپنیوں کا اشتراک۔ ان سا سے مقاصد کے لیے مختلف اسکیموں کا نفاذ بھی ایک اہم تقاضہ ہے جزید سرمایہ کاری کی نئی اسکیموں اور موجودہ اسکیموں کو استحکام بخشنے پر زیادہ توجہ کرنا بے حد اہم ہے۔ چھوٹی صنعتوں کے فروغ کے لیے یہ اقدامات ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ●

بھارت میں بجلی کی صورتحال

آٹھویں پنج سالہ منصوبے کی دستاویز میں بجلی، نقل و حمل، مواصلات، آبپاشی وغیرہ جیسی سہولتوں کے نشانوں کو پورا کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ یہ زور اس توجیح کے ساتھ دیا گیا ہے کہ ایسی سہولتوں کے پیدا کرنے سے صنعت، ایگرو پروسسنگ اور سروسز وغیرہ جیسے شعبوں میں اقتصادی سرگرمیوں کے راستے کھل جاتے ہیں۔ اس مضمون میں بجلی کے شعبے کے چند اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ملک میں بجلی سپلائی کرنے والے اداروں کی بجلی پیدا کرنے کی موجودہ مجموعی صلاحیت مارچ ۱۹۹۳ء کے اختتام پر ۷۲۶۱۲ میگاواٹ تھی۔ اس میں سے ۲۷ فی صد ہائڈل اور ۷۳ فی صد تھرمل تھی (بشمول تقریباً تین فی صد نیوکلیائی)۔ نیچے دیے گئے گوشوارہ نمبر ۱ میں اس بات کو دکھایا گیا ہے کہ کون کون سے ادارے کتنی بجلی پیدا کرتے ہیں۔ پیداوار کی کل صلاحیت کا ۶۳٫۱ فی صد حصہ ریاستی بجلی بورڈ پیدا کرتے ہیں جب کہ ۲ر۰ فی صد بجلی کے محکمے، ۲۸٫۳ فی صد مرکزی سیکٹر، ۴٫۱ فی صد نجی شعبے اور باقی کے ۴٫۳ فی صد دوسری ایجنسیاں پیدا کرتی ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۱

ملکیت	ہائڈل	تھرمل	کل
۱۔ ریاستی بجلی بورڈ	۱۹۳۴۹٫۶ (۷۸٫۵٪)	۳۰۴۶۲٫۹ (۵۷٫۴٪)	۴۵۸۱۲٫۵ (۶۳٫۱٪)
۲۔ بجلی کے محکمے	۷۰٫۶ (۰٫۴٪)	۸۷٫۵ (۰٫۲٪)	۱۵۸٫۱ (۰٫۲٪)
۳۔ مرکزی	۱۱۵۹٫۰ (۶٫۰٪)	۱۹۴۲۶٫۰ (۳۶٫۶٪)	۲۰۵۸۵٫۰ (۲۸٫۰۳٪)
۴۔ پرائیویٹ	۲۷۶٫۰ (۱٫۴٪)	۲۶۹۷٫۰ (۵٫۱٪)	۲۹۷۳٫۰ (۴٫۱٪)
۵۔ دیگر	۲۷۱۲٫۱ (۱۳٫۷٪)	۳۷۱٫۴ (۰٫۷٪)	۳۰۸۳٫۵ (۴٫۳٪)
کل	۱۹۵۶۷٫۳ (۱۰۰٫۰)	۵۳۰۴۴٫۸ (۱۰۰٫۰)	۷۲۶۱۲٫۱ (۱۰۰٫۰)

بجلی کے شعبے میں پیداوار کی صلاحیت ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۲۷۷۷ میگاواٹ، ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۳۰۲۹ میگاواٹ اور ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۳۵۳۷ میگاواٹ بڑھی۔ ملکی سطح پر ہائڈل، تھرمل اور نیوکلائی شعبے میں پیداواری صلاحیت میں جو اضافہ ہوا اسے گوشوارہ نمبر ۲ میں دکھایا گیا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۲

بجلی کی صلاحیت میں اضافہ

سال	تھرمل	ہائڈل	نیوکلائی	کل
۱۹۹۰-۹۱ء	۲۳۳۱٫۰	۴۴۵٫۵	۰٫۰	۲۷۷۶٫۵
۱۹۹۱-۹۲ء	۲۵۹۱٫۴	۴۳۷٫۲	۲۲۰٫۰	۳۰۲۸٫۶
۱۹۹۲-۹۳ء	۳۱۶۴٫۳	۳۷۳٫۰	۲۲۰٫۰	۳۵۳۷٫۳

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ۱۹۹۲-۹۳ء میں بجلی کی پیداواری صلاحیت میں جو اضافہ ہوا اس میں ۱۱ فی صد حصہ ہائڈل کا اور باقی ماندہ تھرمل یونٹوں کا۔ مجموعی صلاحیت میں یہ اضافہ مرکزی اور ریاستی سیکٹروں دونوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۹۲-۹۳ء میں کل اضافے کا ۶۰ فی صد سے بھی زیادہ مرکزی سیکٹر میں تھا اور باقی ماندہ ریاستی سیکٹر میں۔

کسی بھی ریاست، علاقے یا ملک کی اقتصادی سرگرمیوں کی سطح اور خوبی کو پرکھنے کے لیے یہ دیکھا جانا ضروری ہے کہ اس علاقے میں بجلی کی فی کس کھپت کتنی ہے۔ بھارت میں ۱۹۹۲-۹۳ء کے دوران بجلی کی فی کس کھپت گجرات، مہاراشٹر، ہریانہ، پنجاب، تمل ناڈو، کرناٹک وغیرہ جیسے ترقی یافتہ ریاستوں میں زیادہ اور بہار، اڑیسہ، مغربی بنگال، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، کیرل اور شمال مشرقی علاقہ کی سات ریاستوں جیسی کم ترقی یافتہ ریاستوں میں کم تھی۔ گوشوارہ نمبر ۳ میں مختلف ریاستوں میں بجلی کی فی کس کھپت کی صورت حال کیا تھی، دکھایا گیا ہے:

گوشوارہ نمبر ۳

بجلی کی فی کس کھپت

ریاستیں	۱۹۸۵-۸۶ء	۱۹۹۱-۹۲ء
ترقی یافتہ ریاستیں		
۱۔ ہریانہ	۲۴۷	۴۵۵
۲۔ پنجاب	۴۲۳	۶۱۶
۳۔ گجرات	۲۹۹	۵۰۴
۴۔ مہاراشٹر	۳۱۳	۴۳۴
۵۔ تمل ناڈو	۲۱۳	۳۳۵
۶۔ کرناٹک	۱۸۷	۲۹۶
کم ترقی یافتہ ریاستیں		
۷۔ بہار	۹۵	۱۰۸
۸۔ اڑیسہ	۱۳۰	۲۹۵
۹۔ مغربی بنگال	۱۳۵	۱۵۱
۱۰۔ مدھیہ پردیش	۱۶۸	۲۶۷
۱۱۔ راجستھان	۱۴۰	۲۳۱
۱۲۔ اتر پردیش	۱۱۸	۱۷۴
۱۳۔ آندھرا پردیش	۱۸۳	۱۹۱
۱۴۔ کیرل	۱۴۰	۱۹۶
۱۵۔ آسام	۵۳	۹۰
۱۶۔ منی پور	۵۲	۱۰۷
۱۷۔ میگھالیہ	۷۶	۱۲۵
۱۸۔ ناگالینڈ	۶۸	۷۸
۱۹۔ تریپورہ	۲۸	۵۳
۲۰۔ اروناچل پردیش	۳۲	۵۸
۲۱۔ میزورم	۲۸	۶۹
کل ہند	۱۷۸	۲۶۸

دیہی علاقوں میں ہر گھر میں بجلی کی فراہمی اور مختلف ریاستوں میں صنعت کاری کے عمل کو تیز کرنے پر مزید زور دینے سے نسبتاً کم ترقی والی ریاستوں میں بجلی کی فی کس کھپت بڑھنے کی امید ہے۔ کسی بھی ریاست یا علاقے کی جو مجموعی آبادی ہے اس کے کتنے لوگ بجلی استعمال کرتے ہیں اور کتنے نہیں اگر اس بات پر ہم غور کریں تو ان دونوں کے درمیان ہمیں کافی فرق نظر آئے گا اور اسی فرق سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تمام دیہی علاقوں میں لوگوں کے گھروں میں بجلی اب بھی پوری طرح نہیں پہنچی ہے۔ تازہ ترین برآمد پالیسی میں ایگرو پروسسنگ اکائیوں کی مصنوعات کی برآمدات پر زیادہ زور دیا گیا ہے جس کے نتیجے میں ایگرو پروسسنگ اکائیوں کے قیام کی ضرورت بڑھے گی اور جب مزید اکائیاں قائم ہوں گی تو لازمی ہے کہ اور زیادہ بجلی کی ضرورت پیش آئے گی۔ امید ہے کہ مرکزی اور ریاستی سیکٹروں میں زیر تعمیر بجلی کے پروجیکٹوں کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی بجلی کی اس اضافی ضرورت کو پورا کر لیا جائے گا۔

مزید فنڈ کی ضرورت

مرکزی اور ریاستی سیکٹروں کے بجلی پروجیکٹوں کی جلد تکمیل کے لیے آٹھویں منصوبے کے باقی ماندہ سالوں کے دوران ان پروجیکٹوں کو کافی فنڈ سمیت مجموعی امداد کی فراہمی کو یقینی بنانا ضروری ہے۔ ان پروجیکٹوں کی تکمیل کے بعد اضافی بجلی پیدا ہوگی جس کی وجہ سے ان علاقوں/ریاستوں کو جہاں یہ پروجیکٹ ہیں اس اضافی پیداوار کے استعمال کے لیے منصوبے بنانے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اور بجلی کی اضافی پیداوار کے موثر استعمال کے لیے ان منصوبوں میں علاقے کی اقتصادی سرگرمیوں نیز گھریلو ضرورتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مختلف ریاستوں میں زیر تعمیر بجلی پروجیکٹوں کی تکمیل اور متعلقہ ریاستوں میں بجلی کی ترسیل کی بڑی اسکیموں کا نفاذ ایک ساتھ ہونا ضروری ہے۔ بجلی کی ترسیل مناسب اسکیموں کی کمی کی وجہ سے وہ قیمتی بجلی جس کے پیدا کرنے میں قوم کو بھاری خرچ اٹھانا پڑتا ہے، بغیر استعمال کے رہے گی۔ لہٰذا بجلی پروجیکٹوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بجلی ترسیل کی اسکیموں کا نفاذ بہت ضروری ہے۔ خبروں کے مطابق اتر پردیش میں انپرا "بی" پروجیکٹ مکمل ہونے والا ہے جس سے بجلی دستیاب ہو جائے گی لیکن اس پروجیکٹ سے پیدا ہونے والی بجلی کا استعمال فوری طور پر نہ ہو سکے گا کیوں کہ اس علاقے میں بجلی کی ترسیل کی اسکیم کی کمی ہے۔ لہٰذا ایسے

مسائل کا حل تلاش کرنا نہایت ضروری ہے۔

ریاستی بجلی بورڈوں کے ضمن میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ بجلی کی ایک یونٹ پیدا کرنے میں جو لاگت آتی ہے اس کے اور اس ایک یونٹ پر جو محصول حاصل ہوتا ہے کے درمیان کافی فرق ہے۔ اس فرق کو گوشوارہ نمبر ۴ میں دکھایا گیا۔ اس گوشوارہ سے پتا چلے گا کہ اگرچہ ریاستی بجلی بورڈوں کے ذریعہ فروخت کی گئی بجلی سے اوسط یونٹ پر جو محصول حاصل ہوا اس میں کافی اضافہ ہوا ہے تاہم اس اوسط یونٹ بجلی کے سپلائی پر جو لاگت آئی ہے اس میں کافی تیزی سے اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ سے محصول اور لاگت کے درمیان کافی فرق پیدا ہو گیا ہے۔ ملک کے ۱۷ بجلی بورڈوں نے جو بجلی سپلائی کی اس کی لاگت کا ۷۵٫۹۲ فی صد ۹۱-۱۹۹۰ء میں، ۷۶٫۴۱ فی صد ۹۲-۱۹۹۱ء میں، ۷۹٫۱۸ فی صد ۹۳-۱۹۹۲ء میں اور ۸۰٫۹۱ فی صد ۹۴-۱۹۹۳ء میں اوسط محصول کی شکل میں حاصل ہوگا۔

میں ان سبسڈیز کی سطح کو دکھایا گیا ہے۔ یہ سبسڈیز ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۵۶۵۱ کروڑ روپے تھی جو ۹۲-۱۹۹۱ء میں بڑھ کر ۷۱۰۰ کروڑ روپے، ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۸۹۰۶ کروڑ روپے اور ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۱۰۳۵۸ کروڑ روپے ہو گئیں۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں اس کے ۱۲۰۱۴ کروڑ روپے تک بڑھنے کی امید ہے۔

بجلی بورڈ مذکرہ بالا دو سیکٹروں کو فراہم کرے گا۔ کچھ ریاستی حکومتیں زرعی اور گھریلو شعبوں کو کم قیمت کی بجلی فراہم کرنے کے عوض میں اس سود کو معاف کر دیتی ہیں جو انھیں ملنے ہوتے ہیں۔ ریاستی بجلی بورڈ کل سبسڈی کا ایک حصہ تجارتی اور صنعتی یونٹوں پر محصول کے کراس سبسڈائزیشن (CROSS-SUBSIDISATION) کے ذریعے حاصل کر لیتے ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۳

زرعی اور گھریلو شعبوں کے لیے سبسڈیز

(۹۱-۱۹۹۰ء سے ۹۵-۱۹۹۴ء تک)

(روپے کروڑ میں)

سال	زراعت کے لیے سبسڈی	گھریلو سبسڈی	کل رقم
۹۱-۱۹۹۰	۴۵۸۶	۱۰۶۵	۵۶۵۱
۹۲-۱۹۹۱	۵۸۵۹	۱۲۳۵	۷۰۹۴
۹۳-۱۹۹۲	۷۳۶۳	۱۵۴۳	۸۹۰۵
۹۴-۱۹۹۳ (آر۔ای)	۸۳۴۹	۲۰۰۹	۱۰۳۵۸
۹۵-۱۹۹۴ (تخمینہ لگایا گیا)	۹۵۱۴	۲۵۰۰	۱۲۰۱۴

گوشوارہ نمبر ۴

ریاستی بجلی بورڈوں کے ذریعہ محصول کی شکل میں حاصل کی گئی لاگت

(پیسہ فی یونٹ)

سال	اوسط لاگت	اوسط محصول	محصول کی شکل میں لاگت کا کتنا حصہ حاصل ہوا
۹۱-۱۹۹۰	۱۰۷٫۳۸	۸۱٫۵۲	۷۵٫۹۳
۹۲-۱۹۹۱	۱۱۵٫۳۵	۸۸٫۱۴	۷۶٫۴۱
۹۳-۱۹۹۲	۱۳۲٫۷۶	۱۰۵٫۵۲	۷۹٫۴۸
۹۴-۱۹۹۳	۱۴۹٫۱۹	۱۲۰٫۷۱	۸۰٫۹۱

مختلف وجوہات کی بنا پر ریاستی بجلی بورڈوں کو تجارتی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ وجوہات کچھ یوں ہیں (۱) بجلی پیدا کرنے کی لاگت اور محصول کی شرح میں فرق (۲) ترسیل و تقسیم کے نقصانات (۳) پی۔ ایل۔ ایف کی نیچی سطح۔

خبر ہے کہ بھارت سرکار غیر ملکی کمپنیوں کو بجلی کے شعبے میں سرمایہ کاری کرنے پر ۱۶ فی صد واپسی کی شرح کی گارنٹی دینے پر رضامند ہو گئی ہے اگر ایسا ہوا تو اس سے بجلی کے شعبے میں تجارتی خسارے مزید بڑھیں گے۔

تجارتی نفع و نقصان

ریاستی بجلی بورڈوں کو تجارتی خسارہ (بغیر سبسڈی) ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۳۰۸۳ کروڑ روپے تھا جو ۹۲-۱۹۹۱ء میں بڑھ کر ۴۰۲۱ کروڑ روپے، ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۴۷۸۶ کروڑ اور ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۴۹۹۲ کروڑ روپے ہو گیا۔ ان خساروں کا تعلق ان سبسڈیز سے ہے جو زرعی شعبے اور گھریلو سیکٹر کو فراہم کی جاتی ہیں۔ گوشوارہ نمبر ۵

ریاستی بجلی بورڈ زرعی اور گھریلو سیکٹروں کو کم دام میں جو بجلی فروخت کرتے ہیں انھیں زیادہ تر سرکاروں سے اس کا معاوضہ نہیں ملتا۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں صرف سات ریاستی حکومتوں نے ریاستی بجلی بورڈوں کو ۲۰۵۰ کروڑ روپے کی امداد دینے کی تجویز رکھی ہے جو اس مجموعی سبسڈی کا صرف ۱۷ فی صد ہی ہے جو ریاستی

خسارے کی وجوہات

اب ذرا پی۔ ایل۔ ایف (پلانٹ لوڈ فیکٹر) پر غور کریں۔ مختلف ریاستوں بجلی کے شعبے کے مصارف کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ بجلی پیدا کرنے کے پروجیکٹوں کے منصوبہ جاتی مصارف ان مصارف سے کہیں زیادہ ہیں۔

جدید کاری کے پروگرام اور ترسیل و تقسیم پروجیکٹوں کے لیے طے کیے گئے ہیں۔ مختلف ریاستوں میں بجلی کے شعبے میں جدید کاری اور ٹرانسمیشن اسکیموں کو مناسب مالی امداد فراہم کرنے سے پی۔ ایل۔ ایف (پلان لوڈ فیکٹر) میں بہتری آئے گی اور اس طرح بجلی زیادہ مقدار میں دستیاب ہوگی۔ ایک تخمینہ کے مطابق، پی۔ ایل۔ ایف میں ایک فی صد بہتری سے تقریباً ۵۳۰ میگا واٹ اضافی بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔ اس طرح پی۔ ایل۔ ایف میں بہتری پیدا کرنے سے بجلی کے شعبے میں جو سرمایہ کاری کی گئی ہے اس کا منافع اچھا ہوگا۔ ۹۱-۱۹۹۰ء میں کل ہند سطح پر تھرمل پلانٹ کے لیے پی۔ ایل۔ ایف کی سطح ۵۳٫۹۰ فی صد تھی جو ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۵۷٫۱۰ فی صد ہو گئی۔ ہر علاقے کے پی۔ ایل۔ ایف کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جنوبی علاقہ کے پاس سب سے زیادہ پی۔ ایل۔ ایف ہے جو ۶۲٫۶۰ فی صد ہے۔ اس کے بعد شمالی (۶۲٫۰۰ فی صد) مغربی (۵۹٫۷۰ فی صد) مشرقی (۳۹٫۶۰ فی صد) اور شمال مشرقی (۲۴٫۳۰ فی صد) علاقوں کا نمبر آتا ہے۔

بجلی کی ترسیل و تقسیم میں جو خسارے ہوتے ہیں اس کی وجہ سے ریاستی بجلی بورڈوں کے داخلی وسائل پر زبردست منفی اثرات پڑتے ہیں۔ تمام ریاستوں کو جو خسارے ہوئے ہیں اس کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ۹۴-۱۹۹۳ء میں جموں و کشمیر کو اس سلسلے میں سب سے زیادہ خسارہ اٹھانا پڑا تھا جو ۴۴٫۷۶ فی صد تھا۔ اس سال یعنی ۹۴-۱۹۹۳ء میں (۱۹) ریاستی بجلی بورڈوں کا اوسط خسارہ ۲۰٫۳۷ فی صد تھا۔ وہ ریاستیں جنھیں ان (۱۹) ریاستی بجلی بورڈوں کے اوسط خسارہ سے کم خسارہ اٹھانا پڑا، یہ ہیں: آندھرا پردیش (۱۸٫۵۰٪)، ہماچل پردیش (۱۹٫۳۷٪)، کرناٹک (۱۸٫۵۰٪)، کیرل (۲۰٪) مدھیہ پردیش (۲۰٪)، مہاراشٹر (۱۵٫۳۰٪) میگھالیہ (۱۲٪) اور تمل ناڈو (۱۷٫۵۰٪)۔ ریاستی بجلی بورڈوں کو اپنے خسارے کم کرنے کے لیے فوری اور ضروری اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے انھیں سب سے پہلے بجلی کی چوری کو قابو میں لانا ہوگا اور یہ کام سخت اقدامات کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ تقسیم کے نظام میں موجود مختلف خامیوں کو بھی دور کرنا ہوگا۔ تقسیم و ترسیل (TRANSMISSION AND DISTRIBUTION) کے خساروں کو کم کرنا ایک ایسی سرگرمی ہے جسے کم سے کم سرمایہ کاری کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے فائدے بہت ہیں کیوں کہ اس میں اضافی لاگت کچھ نہیں آتی جیسا کہ بجلی پیدا کرنے میں ہوتا ہے۔ قومی سطح پر تقسیم و ترسیل کے خسارے میں ایک فی صد کی کمی سے تقریباً ۲۹۰۹ ملین یونٹوں کی بچت کی جا سکتی ہے اور اس سے ریاستی بجلی بورڈوں کو ۹۴-۱۹۹۳ء کی محصول کی شرح کے حساب سے ۲۳۰ کروڑ روپے کا اضافی مالیہ حاصل ہو سکتا ہے۔

بجلی (سپلائی) کے قانون مجریہ ۱۹۴۸ء کی دفعہ ۵۹ کے مطابق ریاستی بجلی بورڈوں کو سود وغیرہ کی رقم نکال دینے کے بعد سروس میں اپنے کل جمع اثاثوں پر کم سے کم تین فی صد کی شرح سے منافع کمانا چاہیے۔ یہ دفعہ ۱۹۸۵ء سے لاگو ہوئی تھی۔ تاہم اضافی پیداوار کی توقعات درکنار، زیادہ تر ریاستی بجلی بورڈ خسارے ہی میں جا رہے ہیں۔

بجلی کے وزیروں نے حال ہی میں یہ یہ سفارشات پیش کی تھیں کہ زراعت کے شعبے کے لیے بجلی محصول ۵۰ پیسے فی یونٹ سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر یہ سفارشات نافذ بھی کی جائیں تو منصوبہ بندی کمیشن کے پاور ڈویژن نے یہ تخمینہ لگایا ہے کہ ریاستی بجلی بورڈوں نے جو رقم لگائی ہے اس پر منافع نہیں ہوگا۔ یہ بھی تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اگر رقم جو لگائی گئی ہے اور اس پر منافع کی شرح برابر برابر ہو تو ۹۴-۱۹۹۳ء میں مختلف ریاستی بجلی بورڈ ۴۹۸۰ کروڑ روپے کے وسائل یکجا کرنے کے لائق ہو جائیں گے۔ اگر زراعت کے شعبے کے لیے محصول کی شرح پچاس پیسے فی یونٹ کر دی جائے تو ریاستی بجلی بورڈوں کو ۱۹۲۴ کروڑ روپے کی اضافی رقم حاصل ہو سکتی ہے۔ اتنے وسائل کو یکجا کرنا دو باتوں پر منحصر ہوگا۔ اول یہ کہ مختلف صارفین کے لیے محصول کی شرح کو معتدل بنانے کی صلاحیت ان میں کتنی ہے دوم یہ کہ ریاستی بجلی بورڈوں کی کام کرنے کی طریقۂ کار میں بہتری پیدا کرنے کی صلاحیت ان میں کتنی ہے۔ کام کرنے کی صلاحیت میں بہتری کئی باتوں کے ذریعہ پیدا کی جا سکتی ہے۔ اول یہ کہ توانائی کے تحفظ کے اقدامات کیے جا سکتے ہیں جس کی وجہ سے فی یونٹ ایندھن کی لاگت میں کمی واقع ہوگی۔ دوسرے یہ کہ دفتری اور او اینڈ ایم اخراجات میں کمی کی جا سکتی ہے، تیسرے یہ کہ بجلی کے شعبے میں ایجادات کی سطح پر سخت کنٹرول ہونا چاہیے اور چوتھے یہ کہ مینجمنٹ کے جدید ترین طریقوں کو اپنانا چاہیے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے کام کرنے کی صلاحیت میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

محصول کو معتدل بنا کر اور کام کرنے کی اپنی صلاحیت میں بہتری پیدا کر کے ریاستی بجلی بورڈ اگر کافی وسائل پیدا کرنے کے لائق بن جائیں تو وہ جدید کاری کی اسکیموں اور نظام کو بہتر بنانے کے پروگراموں جیسے شعبوں میں سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔ جس سے بالآخر ان کی اقتصادی حالت بہتر ہوگی۔ ایک رپورٹ کے مطابق قومی ترقی کونسل کی مقرر کردہ بجلی کے بارے میں ایک کمیٹی نے حال ہی میں اپنی رپورٹ پیش کی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کمیٹی نے دوسری باتوں کے علاوہ اس بات کی بھی سفارش کی ہے کہ کم آمدنی والے گروپوں کو چھوڑ کر، گھریلو سیکٹر کو کم دام میں بجلی کی فروخت بند کر دینا چاہیے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کمیٹی نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ تمام ریاستوں کو زرعی صارفین پر کم سے کم ۵۰ پیسے فی یونٹ کا محصول لگانا چاہیے۔ اگر ان سفارشات کو نافذ کیا گیا تو بجلی کے شعبے کی کام کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہونے کی امید ہے۔

تسنیم فاطمہ

ماحولیات۔ ہندوستانی پس منظر میں

ہندوستان کی آبادی بڑھتے بڑھتے ۹۰ کروڑ نفوس تک جا پہنچی ہے، یہ لوگ مختلف نسلی گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں، مختلف زبانیں بولتے ہیں، مختلف مذاہب کو مانتے ہیں اور ہندوستان کے وسیع و عریض رقبے پر آباد ہیں جہاں مختلف طرح کی آب و ہوا ہے، ہندوستان ۲۵ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام چھ علاقوں پر مشتمل ہے، ہندوستان میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مقامی بولیوں کی تعداد تو ۱۶۵۲ سے بھی زیادہ ہے، ہندوستان میں چھ بڑے مذاہب ہیں یعنی ہندو مذہب، اسلام، عیسائی، سکھ، بودھ اور جین دھرم۔ ہندوستان میں مختلف الخیال لوگ مختلف طرح کی رسوم مناتے ہیں۔ یہاں کا چپہ چپہ اوراقِ مصور کی طرح گوناگونی اور بوقلمونی کا مظہر ہے۔ ان کے طرز بود و باش بھی جداجدا ہیں اور وہ قدرت سے ہم آہنگ ہیں، خاص کر یہاں کی قبائلی آبادی جو کہ ہندوستان کی مجموعی آبادی کی ۸ فی صد ہے اپنے رسم و رواج کے اعتبار سے ہے جو تنوع لیے ہوتے ہے۔

آج پوری دنیا ماحولیات کے مسائل اور بڑھتی ہوئی آلودگی سے پریشان ہے، ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ دنیا میں ۷۰ فی صد آبادی غریب ترین آبادی کی فہرست میں آتی ہے اور ہندوستان میں بھی غریبی ہے۔ قدرتی وسائل پر دباؤ بڑھنے سے تکلیف دہ نتائج سامنے آرہے ہیں۔ ہر ملک کے سامنے مسئلہ یہی ہے کہ ماحول کے اس بگڑتے ہوئے توازن کو کیسے روکا جائے۔

ہندوستان کی سرزمین وسائل کے اعتبار سے متنوع بھی ہے اور مالامال بھی مگر اس کے باوجود یہاں کے بسنے والے غریب ہیں۔ اس میں سورج کی مسلسل باقی رہنے والی گرمی اور اسی طرح کے دیگر قدرتی وسائل نیز افرادی قوت کے سبب اس کا شمار دنیا کے ان ملکوں میں ہوتا ہے جو امیر بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو یہاں کے عوام بے حد غریب تھے، اکثریت ان کی بھی جو بھوک کے شکار تھے، ناخواندگی کی دلدل میں پھنسے تھے، بیماریوں سے چور چور تھے۔ ملک میں آبرسانی کی سہولتیں تقریباً ناپید تھیں، بجلی کی تیاری بہت معمولی تھی، مواصلاتی نظام اور صنعتی ڈھانچہ تو بے حد کمزور اور نہیں کے برابر تھا، مردوں میں صرف ۲۵ فی صد اور عورتوں میں ۷ فی صد لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کے شہری سیاسی آزادی سے اس وقت تک لطف اندوز نہیں ہو سکتے، جب تک وہ غریبی کی دلدل سے باہر نہیں آجاتے، مسز اندرا گاندھی نے ملک میں ترقیاتی عمل کو ایک ایسی مہم سے تعبیر کیا تھا جس کی مثال نوعِ انسانی کی تاریخ میں کم ہی ملے گی، یعنی کہ دنیا کی آبادی کے ۱۶ فی صد حصے کی، جو کہ بھارت میں بستا ہے، بنیادی ضرورت کو پورا کرنا اور پھر اس تیزی کے ساتھ کہ ایک دو نسلوں کے اندر اندر ہی اس مقصد کو پالینا، تاریخ انسانی کا نادر الوجود واقعہ ہے۔

غریبی اور ماحولیاتی مسائل کا چولی دامن کا ساتھ ہے، دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہیں یہ ایک بڑا مسئلہ ہے اور سب سے بڑا چیلنج بھی، ہندوستان کی اکثریت براہ راست ملک کے قدرتی وسائل پر انحصار رکھتی ہے اور انھیں سے خوراک، ایندھن، مکان اور چارہ وغیرہ جیسی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

ہندوستان میں فی کس اوسط آمدنی میں اضافہ ہو رہا ہے مگر پھر بھی تقریباً ۴۰ فی صد آبادی غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ ماحولیاتی مسائل کے سبب غریبی کے مسائل بڑھے ہیں، عوام کی زندگی کا مدار انھیں وسائل پر ہے جو اس کے ارد گرد ہیں، اس طرح غریبی کے چیلنج اور ماحولیاتی توازن کے خراب ہونے کے مسائل ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

آبادی اور ماحول

مسز اندرا گاندھی نے ۱۹۷۲ء میں اسٹاک ہام میں انسانی ماحولیات کے موضوع پر اقوام متحدہ کی طرف سے بلائی گئی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم ماحول میں مزید ابتری لانا نہیں چاہتے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم ایک منٹ کے لیے بھی اس حقیقت کو فراموش کرنا نہیں چاہتے کہ ہمارے عوام کی بڑی تعداد غریبی کی دلدل میں پھنسی ہے۔ آج کے دور میں غریبی اور اضافۂ آبادی کے باہمی ربط کو سمجھنا پہلے کے مقابلے آسان ہے۔ حکومت ہند دنیا کی ان چند سرکاروں میں سے ایک ہے جہاں خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو سرکار کے زیر اہتمام چلنے والے پروگراموں میں شامل کیا گیا ہے اس پروگرام کی وجہ سے فی ہزار شرح پیدائش جو ۱۹۶۱ء میں ۴۱ تھی، گھٹ کر ۱۹۸۶ء میں ۳۲.۴

معرفت ڈاکٹر سردار حسن، محلہ ہرناتھ پورہ۔ سہارنپور، یوپی

ماہنامہ نئی دہلی

رہ گئی، لیکن بہتر صحتی خدمات کی وجہ سے فی ہزار شرح اموات جو ۱۹۵۱ء میں ۲۲٫۸ تھی، گھٹ کر ۱۹۸۸ء میں ۱۰٫۹ رہ گئی۔ اگرچہ ہم نے اضافۂ آبادی کی شرح کو ۲ فی صد گھٹانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے لیکن پھر بھی ایک اندازے کے مطابق اس صدی کے آخر تک ہندوستان کی آبادی ایک ارب تک پہنچ جائے گی۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اضافۂ آبادی غریبی کا لازمی نتیجہ ہے۔ غریب کنبہ میں ہر بچہ کمانے میں مدد دیتا ہے، مگر پوری دنیا کو اس سے کم ہی سروکار ہے کہ اس کی غریبی دور کرے۔ کنبہ اس حالت میں محدود ہوگا جب کہ اس کے بنیادی اسباب پر توجہ دی جائے گی ورنہ تو جبراً اور زبردستی کا کوئی بھی عمل اس کو کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ ہندوستان کے پالیسی سازوں نے یہ محسوس کیا کہ صحتی خدمات کو عام کرکے آبادی میں اضافے کو روکا جاسکتا ہے اس کے لیے تعلیم اور خواندگی کو عام کرنے پر بھی زور دیا جارہا ہے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں ملک میں خواندگی کی سطح جو آزادی کے وقت صرف ۱۶ فی صد تھی، بڑھ کر ۵۶ فی صد تک پہنچ چکی ہے۔

ماحول کا تحفظ اور قدرتی وسائل کو مستقبل کے خیال سے مفید تر بنانے کا عمل ہندوستان کے ثقافتی ورثے کا جزو لازم ہے۔ اسٹاک ہام کانفرنس سے لے کر ۱۹۹۲ء میں منعقدہ ریوڈی جنیرو کانفرنس کے درمیانی عرصے میں ہندوستان میں ایسے قوانین بنائے گئے جن سے ماحول کے تحفظ میں مدد ملتی۔

زمین کا بے جا استعمال

ہندوستان میں کل خشکی کے رقبہ یعنی ۳۲ کروڑ ۹۰ لاکھ ہیکٹیئر اراضی میں سے، ۷ کروڑ ۵۰ لاکھ ہیکٹیئر اراضی گندی بستیوں کی شکل میں بدل چکی ہے۔ ملک میں ۱۴ کروڑ ۳۰ لاکھ ہیکٹیئر اراضی پر کاشت ہوتی ہے۔ اندازہ ہے کہ اس میں سے ۸ کروڑ ہیکٹیئر اراضی پر مٹی کی ساخت کے معیار میں مختلف تناسب سے کمی آچکی ہے۔ ۱۸ کروڑ ۶۰ لاکھ ہیکٹیئر اراضی وہ ہے جس پر کاشت نہیں ہوتی اس میں سے ۴ کروڑ ہیکٹیئر اراضی مکمل طور پر غیر پیداواری ہے۔ ساڑھے سات کروڑ ہیکٹیئر اراضی جنگلات سے پُر ہے۔ اس میں سے بھی ۴ کروڑ ہیکٹیئر اراضی اپنی صلاحیت نمو کھوتی جارہی ہے۔ ہندوستان میں ۱۹۸۲ء میں مویشیوں کی تعداد ۴۱ کروڑ ۶۰ لاکھ تھی۔ اس صدی کے اختتام تک یہ تعداد بڑھ کر ۴۹ کروڑ ۴۰ لاکھ تک پہنچ جائے گی، ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ہیکٹیئر اراضی پر مستقل چراگاہیں ہیں۔ آج کے دور میں اراضی، پانی اور جنگلات وغیرہ کے تحفظ کے پروگراموں کو زبردست اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ کام مقامی لوگوں کے تعاون سے انجام دیا جارہا ہے۔

ماحولیات کا تحفظ کافی عرصے سے ہندوستانی فکر اور سماجی ترقی کے عمل کا جزو لاینفک بن چکا ہے۔ جنگلات کے فروغ کے لیے سرکار نے ایک پالیسی بنالی ہے۔ قومی وسائل کے تحفظ کے لیے جو حکمت عملی اپنائی گئی ہے اس میں ماحولیات کو آلودگی سے بچانے پر خاص زور دیا گیا ہے، ۱۹۷۲ء میں جنگلی جانوروں کے تحفظ کا قانون بنایا گیا، ۱۹۸۰ء میں جنگلات کے تحفظ کا قانون بنا، ۱۹۸۶ء میں ماحولیات کے تحفظ کا قانون بنا، متعلقہ قوانین کو موثر ترین بنانے کے لیے ان میں وقتاً فوقتاً ترامیم بھی کی جاتی رہیں۔

اس صدی کے آخر تک سب کے لیے صحت کا نعرہ دیا گیا ہے۔ اس کے تحت پینے کے صاف پانی اور صحت وصفائی کی سہولتوں کو فراہم کرنے پر زور ہے۔ قدرتی وسائل کو مسلسل کارآمد اور مفید بنائے رکھنے کے لیے پروگرام ترجیحی بنیادوں پر شروع کیے گئے، صنعتی آلودگی کی روک تھام کے لیے خصوصی کوششیں جاری ہیں۔

عملی اقدامات

جنگل بانی کے قومی عملی پلان میں ملک میں جنگل بانی کے فروغ کو متاثر کرنے والے اہم مسائل کا جائزہ لینے کا کام شامل ہے۔ جنگل بانی کو مرکزی سطح سے اور ریاستی سطح سے فروغ دینے کے لیے طویل المدتی، وسط مدتی اور مختصر مدتی ترقیاتی پروگرام وضع کیے گیے۔ اس کے تحت شجرکاری کے پروگرام پر خاص توجہ دی جاتی ہے جس سے مختلف طرح کے چرند اور پرند مستقل بنیادوں پر زندہ رہ سکیں اور ان کی نسلیں معدوم نہ ہونے پائیں، اس سلسلے میں خوراک و زراعت کی عالمی تنظیم سے تکنیکی امداد حاصل کی گئی اور ان کی مدد سے جنگل بانی کے ایسے پروگرام شروع کیے گئے جو ہندوستان کی آب و ہوا اور حیاتیاتی تنوع سے میل کھاتے ہوں۔ اس طرح کا ایک اور پروگرام بے کار پڑی زمینوں کا فروغ ہے۔ اس کے لیے ۱۹۸۵ء سے شجرکاری کے پروگرام کو تیز کردیا گیا اور اس کام میں عوام کی شرکت کو ضروری سمجھا گیا اور سائنس و تکنالوجی کی جدید دریافتوں سے مدد لی گئی۔

اگست ۱۹۹۲ء میں حکومت ہند کی وزارت ماحولیات و جنگلات میں جنگل بانی، شجرکاری اور معیشت حیوانات کے فروغ کے لیے قومی سطح کے ایک بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اس بورڈ کے ذمے جو مختلف کام لگائے گئے ہیں، ان میں شجرکاری کو بڑھاوا دینا، معیشت حیوانات کے توازن کو برقرار رکھنا اور معاشی ترقی کے لیے معاون دیگر بہت سے کاموں کی بجاآوری ہے۔ مئی ۱۹۸۵ء میں بے کار پڑی زمینوں کے فروغ اور ان کی ترقی کے قومی پروگرام کو شروع کیا گیا تاکہ اراضی کی گرتی ہوئی حالت سے پیدا شدہ معاشی بحران پر قابو پایا جاسکے، ایندھن کی کمی سے اور چارہ کی قلت سے بہت سے سماجی اور اقتصادی مسائل ابھرے ہیں۔ جنگل بانی اور معاشی ترقی کے مسائل سے متعلق بورڈ نے ایسے صراحت شدہ پروگرام وضع کیے جن سے ریاستی سرکاروں اور غیر سرکاری تنظیموں کی مدد کی جاسکے اور اس بورڈ کی مدد سے وہ ماحول میں سدھار لانے میں کامیاب ہوسکیں۔ اس سلسلے میں علاقے کی اپنی ضروریات کے پیش نظر ایندھن کی لکڑی اور چارہ کی فراہمی کے پروجیکٹ شروع کیے گئے۔ یہ ان اضلاع میں شروع کیے گئے جہاں ان دونوں چیزوں کی کمی تھی، جنگلات سے متعلق چھوٹی موٹی پیداوار مثلاً ادویاتی پودوں کے اُگانے کی اسکیم کے تحت ریاستی سرکاروں کی مدد کی جاتی ہے جس سے عمارتی لکڑی کے علاوہ دوسری طرح کی جنگلاتی پیداوار کو بڑھاوا ملے۔ اس کے لیے غیر سرکاری تنظیموں کی مدد کی جاتی ہے۔ قبائلی آبادی اس طرح کی اسکیموں سے خاص طور پر فائدہ اٹھا رہی ہے۔ بے کار پڑی زمینوں کے نقشوں کی تیاری، وہاں کے لیے جنگلاتی پیداوار میں معاون بیجوں کی تیاری اور ہوائی جہازوں سے بیج بکھیرنے کے کام شروع کیے گئے ہیں۔

آج ملک میں حیاتی تنوع کو زبردست خطرہ ہے، ایک تو زمین کا بے جا استعمال، دوسرے

جنگلات کے کٹ جانے سے ایسے حالات کا رونما ہونا کہ وہاں جنگلی جانور آباد نہ رہ سکیں، اس خطرے کو اور سنگین بنا رہا ہے، ہندوستان میں جنگلی جانوروں کی نسلوں کے تحفظ کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے ہیں۔ ملک میں شکار پر پابندی ہے

قومی پارک اور جنگلی جانوروں کی حفاظت گاہیں

آج ہندوستان میں ۷۵ قومی پارک، ۴۲۱ جانوروں کی پناہ گاہیں، شیروں کے تحفظ کے ۱۲ پروجیکٹ زیر عمل ہیں۔ ملک میں خشکی کا متعدد رقبہ ہے، اس کے تقریباً ۳ر۴ فی صدر قبے پر آٹھ بائیو اسفیر ریزرو چل رہے ہیں اور یہ وہ زمینی رقبے ہیں جو ماحول کے تحفظ سے متعلق مختلف پروجیکٹوں کے لیے محفوظ ہیں۔

نیشنل پارکوں اور جنگلی جانوروں کی حفاظت گاہوں میں ملک کے جانوروں کی دنیا کے بہت سے نادر الوجود حیوانات کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ کشمیر میں ڈاچی گام نیشنل پارک میں ہنگول یا کشمیری بارہ سنگھے کو محفوظ کیا گیا ہے۔ مشکی ہرن بھی اسی پارک میں محفوظ ہیں۔ ہمالیہ کے دامن میں کاربٹ نیشنل پارک ہے۔ اس کا نام شکار کی دنیا کے مشہور نشانہ باز جم کاربٹ کے نام پر ہے، اس کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں پڑی۔ یہ ملک کا قدیم ترین نیشنل پارک ہے۔ اس میں شیروں، ہاتھیوں، چیتوں، تیندوؤں اور بارہ سنگھے کی بہت سی اقسام کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اسی پٹی میں دودھوا نیشنل پارک ہے جو دلدلی بارہ سنگھا، شیر اور چیتل وغیرہ کی پناہ گاہ ہے۔ مدھیہ پردیش میں کنہا نیشنل پارک ہے۔ یہ بھی شیروں اور دلدلی ہرنوں کی پناہ گاہ کے طور پر مشہور ہے۔ کرناٹک میں باندی پور کے نام سے نیشنل پارک ہے۔ اس کے ایک جانب تمل ناڈو کی مدوملائی جنگلی جانوروں کی پناہ گاہ ہے، شمال میں ناگرہول پارک ہے اور کیرالا کے مغرب میں وائی ناد جنگلی جانوروں کی پناہ گاہ ہے۔ اس طرح یہ جنوبی ہندوستان کا علاقہ ایک ہزار مربع کلومیٹر سے بھی زیادہ رقبہ جنگلی جانوروں کی حفاظت کے فرائض انجام دینے میں مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ ان پناہ گاہوں میں جنگلی سور، چیتل، چیتے، چتی دار بارہ سنگھے، جنگلی بلاؤ اور مختلف طرح کی بلیاں موجود ہیں۔ کیرالا میں پیریار جنگلی جانوروں کی پناہ گاہ میں ہاتھی، شیر اور دیگر بہت سے جانور محفوظ ہیں۔

راجستھان میں بھرت پور کے مقام پر کیولادیو گھانا نیشنل پارک آبی جانوروں کی مشہور پناہ گاہ ہے، اس میں ۷ سو مختلف طرح کی چڑیاں اور پرندے محفوظ ہیں۔ یہ وہ پرندے ہیں جو نقل مکانی کیا کرتے ہیں ہر سال اکتوبر سے دسمبر تک مقامی آبی پرندے، لق لق، ڈبکیہ نامی دریائی چڑیا یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں، دسمبر میں سائبریا کے سارس اسی پناہ گاہ میں مہمان ہوتے ہیں۔ اب دنیا میں ان کی نسل کو معدومی کا زبردست سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ گجرات میں گیر نسل کے شیروں کی پناہ گاہ ہے۔ یہ نہ صرف ہندوستان کے شیروں کے لیے جنت ہے بلکہ پورے ایشیا کے شیروں کی پناہ گاہ ہے۔ یہاں سانبھر، چتی دار بارہ سنگھے، ہرن کی قسم مرگ اور لکڑ بھگا وغیرہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دریائے برہم پتر پر قاضی رنگا نیشنل پارک ہے۔ اس میں جنگلی بھینسے اور گینڈے وغیرہ محفوظ کیے گئے ہیں۔ اروناچل پردیش میں نام دھپہ جنگلی جانوروں کی پناہ گاہ ہے۔ یہاں بھی جنگلی بھینسے اور دیگر بہت سے جانور پائے جاتے ہیں، مغربی بنگال میں سندر بن نیشنل پارک ۲۵۸۵ مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔

اس طرح ہندوستان میں ماحولیات کو محفوظ کرنے اور ان کے تعلق سے جنگلی جانوروں، پرندوں کو حفاظت سے رکھنے کے پروگرام کافی آگے بڑھ چکے ہیں، ہندوستان کی ان کوششوں کو کسی بھی حالت میں ترقی یافتہ ملک کی کوششوں سے کمتر نہیں کہا جا سکتا۔ ●

بقیہ: نوکری کی تلاش میں . . . .

بھیج دوں؟" ہم نے پوچھا "کتنے دن میں بھجوا سکیں گے؟" کہنے لگے "ایک ہفتے کے اندر" ہم نے کہا "ایک ہفتے میں تو پاسپورٹ بھی نہیں بن سکتا!" وہ قدرے جھنجھلا کر بولے "کہا نا کہ آپ بس جگہ پسند کیجیے باقی ساری فکریں مجھ پر چھوڑ دیجیے!" ہم نے اپنا فیصلہ سنانے کے لیے ایک دن کی مہلت مانگی۔ دوسرے دن پہنچے تو دیکھا پولیس والے انھیں حضرت کو دولھا بنانے لیے جا رہے ہیں اور جعلی پاسپورٹوں، ڈگریوں اور سندوں کی برات پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔

ایک صاحب اور ملے۔ پہلے تو انھوں نے پیسے کی ضرورت، پیسے کی نایابی اور پیسے کے بغیر حاصل ہونے والی ذلت و خواری پر خاصی مدلل و مفصل تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ پیسے کو صرف ایک چیز کھینچتی ہے اور وہ ہے خود پیسہ۔ ہم نے اپنے سابقہ تجربوں اور نوکری دلانے والوں کے حشر کے بارے میں انھیں بتایا تو وہ سرد آہ بھر کر بولے "ہاں صاحب، دنیا میں بے ایمانوں کی کمی نہیں!" پھر کہنے لگے "میں تو آپ کو وہ نوکری دلاؤں گا جس کے لیے لازمی لیاقت آپ رکھتے ہوں۔ ایک جگہ ہے بھی ــ بڑے آرام کی۔ تنخواہ بھی فور فیگرس میں ہے" ہم نے جلدی سے کہا "تو ہمیں دلا دیجیے نا!" وہ بولے "ٹھیک ہے، آپ آج ۵۰ ہزار کا انتظام کر لیجیے، کل تقرر نامہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔" ہم نے کہا "مرزا سودا تو نہیں بتا سکے، آپ ہی بتا دیجیے کہ "نوکری ملتی ہے ڈھیریوں یا تول؟" وہ بولے "ڈھیریوں بھی اور تل کر بھی۔ بس زر خرچنے کی دیری ہے" ہم نے کہا "جب ہم اس جگہ کے لیے وافر لیاقت رکھتے ہیں تو زر خرچنے کی کیا ضرورت؟" وہ چیں بر جبیں ہوتے ہوئے بولے "تو آپ کے خیال میں اس جگہ کے لیے جو ایک ہزار پانچ سو چالیس درخواستیں آئی ہیں وہ سب کی سب نالائقوں کی ہیں؟" ہم نے کہا "کہہ نہیں سکتے۔" انھوں نے کہا "جناب ان میں سے ۷۵ فی صدی امیدوار آپ سے زیادہ لائق اور تجربہ کار ہیں" ہم نے کہا "مگر یہ سودا ہمیں منظور نہیں" وہ بولے "پھر تو آپ تشریف لے جانے سے قبل میاں نظیر کا یہ بند نوٹ کر لیجیے اور جب اس کا مطلب سمجھ میں آ جائے تو نوکری کی تلاش میں نکلیے:

زر کے دیے سے پیر اور استاد نرم ہو
زر کے سبب سے دشمن بیداد نرم ہو
جو شوخ سنگ دل ہے پری زاد نرم ہو
زر وہ ہے جس کو دیکھ کے فولاد نرم ہو
جو ہے سو ہو رہا ہے سدا مبتلائے زر
ہر اک یہی پکارے ہے، دن رات ہائے زر

اس سب کے باوجود ہم نے ہمت نہیں ہاری اور آج کریم بھائی سرسوں والا کی مہربانی سے ہم ان کی آئل مل میں کیشیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور آپ کی دعا سے مع اہل و عیال ساتھ خیریت کے ہیں۔ ●

نشاط اسلم

بھارت میں شیروں کا تحفظ

آزادی سے قبل ہندوستان میں شیروں کے تحفظ کا عوامی احساس نہیں تھا۔ ملک میں متعدد رجواڑے تھے اور شیروں کا شکار ان کا خاص ذریعۂ تفریح تھا۔ شیروں کی کھالیں، جبڑے اور پنجے وغیرہ رئیسوں اور راجاؤں کے عشرت کدوں کی زینت ہوا کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ شیروں کو مارنا مایۂ افتخار سمجھا جاتا تھا۔

بھارت میں پہلی بار ۱۹۷۲ء میں شیروں کی اعداد شماری ہوئی تو معلوم ہوا کہ بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں شیروں کی تعداد ۴۰ ہزار تھی جو گھٹتے گھٹتے صرف ۱۸۲۷ رہ گئی۔ یہ انکشاف کافی تشویشناک تھا۔ لہٰذا حکومت نے ۱۹۷۳ء میں "پروجیکٹ ٹائیگر" شروع کیا اور اس کے تحت شیروں کی پناہ گاہیں (TIGER RESERVES) بنائی گئیں۔ بعد ازاں ۱۹۸۰ء میں THE WILD LIFE CONSERVATION ACT پاس کیا گیا جس کے تحت شیروں کے تحفظ کے لیے اقدامات منضبط کیے گئے۔

ابتدا میں ۹ پناہ گاہیں تشکیل دی گئیں۔ ان کی تعداد اب بڑھ کر ۲۳ ہو گئی ہے۔ یہ ۲۳ پناہ گاہیں جنگلات کے تقریباً ۲۸۰۱۷ اسکوائر کلو میٹر کا احاطہ کرتی ہیں۔ ۱۲۶۳۴ اسکوائر کلو میٹر کا رقبہ مرکزی علاقہ ہے اور ۱۵۳۸۳ اسکوائر کلو میٹر کا علاقہ بفرزون میں آتا ہے۔ ان پناہ گاہوں میں رن تھمبور، سندربن، نندن کانن، کتھا، کلی پال اور بکسا وغیرہ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

رن تھمبور

راجستھان کے خشک اور بنجر علاقے میں رن تھمبور نخلستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ کوہ اراولی اور وندھیاچل کے درمیان واقع رن تھمبور اپنی تاریخی اہمیت کے لیے پہلے سے ہی مشہور رہا ہے۔ یہ جے پور سے ۱۴۴ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور سیاحوں میں کافی مقبول ہے۔ اس میں ایک تاریخی قلعہ بھی ہے جو سیاحوں کی مزید دلچسپی کا باعث ہے۔ پناہ گاہ میں واقع کاچیڑا میدان اور پدم تالاب شیروں کو دیکھنے کے اہم مقامات ہیں۔ تاریخی ریکارڈ بتاتے ہیں کہ رن تھمبور کے علاقے میں ۱۹ویں صدی میں شیر کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے۔ لیکن وہ راجاؤں اور دیگر شکاریوں کے بے رحم شوق کے شکار ہوئے۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۴ء کے قلیل عرصے میں صرف ادے پور کے مہاراجہ نے تقریباً ایک ہزار شیر ہلاک کر ڈالے تھے۔ یہاں کے خاردار جنگلات کے درمیان جگہ جگہ تالاب ہیں جو خشک موسم میں نباتات کی بالیدگی کے ضامن ہیں۔ یہ نباتات سانبھر، چیتل، نیل گائے اور ہرن وغیرہ کے لیے چارہ فراہم کرتے ہیں، پھر یہ سبزی خور جانور شیر اور چیتوں کی غذا کے کام آتے ہیں۔ رن تھمبور کے ٹائیگر ریزرو میں وحشی ریچھ، اژدھے اور گھڑیال بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کی جھیلوں میں انواع و اقسام کے پرندے بسیرا کرتے ہیں مثلاً فاختہ، تیتر، مور، طوطے، بٹیر اور مرغابیاں وغیرہ۔ ۱۹۹۱ء کی شیر شماری کے مطابق یہاں شیروں کی تعداد ۴۵ تھی مگر حالیہ جائزے بتاتے ہیں کہ ناجائز طور پر گھس آنے والے شکاریوں نے کچھ شیروں کو اپنے لالچ کا شکار بنایا ہے جس کی وجہ سے ان کی تعداد میں کافی کمی آگئی ہے۔ اس افسوسناک صورت حال سے نپٹنے کے لیے محکمۂ جنگلات، شعبۂ پروجیکٹ ٹائیگر اور ریاستی حکومت نے ماہرین کی مدد سے مجرموں کے خلاف سخت قدم اٹھائے ہیں لیکن تشویشناک حالات ابھی تک ختم نہیں ہوئے۔

نندن کانن

اڑیسہ میں بھوبنیشور سے تقریباً ۲۰ کلو میٹر کی دوری پر "نندن کانن زولوجیکل پارک" واقع ہے جو دو شیروں کے نام پر ہے۔ یہ دو شیر اپنی حرکات و سکنات کے باعث یہاں بہت مقبول تھے۔ نندن کانن کا LION SAFARI اور WHITE TIGHER SAFARI اپنی طرز میں بے مثال ہے۔ یہاں جانور قیدی نہیں ہیں بلکہ آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں۔ سیاح جالی دار گاڑیوں سے ان کا نظارہ کرتے ہیں۔ یہ پارک پستہ قد درختوں اور لمبی لمبی گھاس سے بھرا ہوا ہے جس کے باعث گھومتے پھرتے اور لیٹے ہوئے شیروں کو دیکھنے میں کوئی دشواری

اے۔۸۸، پنڈارا روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

نہیں ہوتی۔ یہاں کا LION SAFARI ہندوستان کا سب سے بڑا سفاری ہے۔ اس کا رقبہ ٹائیگر سفاری سے زیادہ ہے۔ اس میں لگ بھگ ۳۰ ایشیائی شیر اور دس گیارہ افریقی ببر شیر ہیں۔ شیروں کی نسل بڑھانے کے مقصد سے اس میں ایک نرسری بھی بنائی گئی ہے۔ سفید شیروں کا یہ دنیا میں سب سے بڑا پارک ہے۔ یہ تقریباً ۱۲ ہیکٹیر زمین کے رقبے پر بنایا گیا ہے۔ یہاں سفید شیروں کی تعداد ۳۷ ہے جن میں سے زیادہ تر "ریوا" سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ مختلف النسل بھی ہیں۔ سب سے پہلا سفید شیر ۱۹۵۱ء میں مدھیہ پردیش کے ضلع "ریوا" کے جنگلات میں مہاراجہ ریوا نے پکڑا تھا اور اس کا نام موہن رکھا تھا۔ نندن کانن کے سفید شیر سفاری سے کئی عدد سفید شیر اندرون ملک اور بیرون ملک کے چڑیا گھروں کو عطیے کے طور پر دیے گئے ہیں۔ ان میں دہلی کا چڑیا گھر بھی شامل ہے۔ یہ سفید شیر اپنی جسامت، نیلی آنکھوں، گلابی ناک، برف کی مانند سفید رنگ اور اس پر دلکش سلیٹی اور ہلکی سیاہ دھاریوں کی وجہ سے عام شیروں سے کہیں زیادہ عظیم الشان اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہ سفاری ایک وادی میں بنائی گئی ہے۔ اس میں ایک مصنوعی جھیل بھی پانی کو محفوظ رکھنے کے مقصد سے تیاری کی گئی ہے۔ ایک واچ ٹاور بھی ہے تاکہ سیاح شیروں کا اچھی طرح مشاہدہ کر سکیں۔ نندن کانن زولوجیکل پارک میں ان شیروں کے علاوہ کھلے پنجروں میں تقریباً ۴۰ مختلف اقسام کے چیتے گلدار اور تیندوے وغیرہ بھی ہیں۔ مگر مچھوں کی افزائش نسل اور نشوونما کے لیے ایک بڑا مرکز بھی قائم کیا گیا ہے۔

سندر بن

سندر بن کے جنگلات خلیج بنگال کے دہانے اور دریائے گنگا کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں فطرت کا بے پناہ حسن نباتات اور حیوانات کے روپ میں بکھرا پڑا ہے مگر جنگلات کے بری طرح کٹنے کے باعث یہاں کی خوبصورتی کو گھن لگنا شروع ہو گیا ہے۔ سندر بن کے جنگلوں کا نصف حصہ پروجیکٹ ٹائیگر کے تحت محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ تقریباً ۲۵۸۵ اسکوائر کلو میٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ شیروں کی سب سے کثیر تعداد سندر بن کی پناہ گاہ میں ہے۔ یہاں ۱۹۸۹ء کی اعداد شماری کے مطابق شیروں کی تعداد ۲۶۹ ہے۔ دوسرے نمبر پر کنہا ٹائیگرز ازرو ہے جہاں ۹۹ شیر ہیں۔

سندر بن کے مشرقی اور مغربی کناروں پر درختوں کو برباد کر کے تیزی سے مکانات بن رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مچھلی پالنے کے لیے تالابوں کی تعداد بھی کثرت سے بڑھتی چلی جا رہی ہے لہٰذا بنگال کے شاہی شیروں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ خوراک کا اٹھ کھڑا ہوا ہے کیوں کہ جنگلوں کے معدوم ہونے سے دیگر جانوروں کی تعداد ناقابل یقین حد تک گھٹ گئی ہے۔ پہلے یہاں ہرن، گینڈے اور جنگلی بھینسے وغیرہ پائے جاتے تھے جو اب تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ سندر بن کے شیر آدم خوری کے لیے کافی بدنام ہیں، شاید اس کا ایک بڑا سبب خوراک کی کمی ہے۔ ہر سال اوسطاً وہ لگ بھگ دو سو آدمیوں کو اپنا نوالہ بنا لیتے ہیں۔ مارے جانے والوں میں زیادہ تر مچھیرے اور شہد نکالنے والے ہوتے ہیں۔ سندر بن کے جزیروں میں صرف ۵۴ جزیرے قابل رہائش ہیں۔ باقی جزائر آدم خور شیروں، زہریلے سانپوں اور جنگلی شہد کی مکھیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان جزیروں میں شہد جمع کرنے والے لوگ جنگل کی خاص دیوی "بن بی بی" کی پوجا کرتے ہیں تاکہ وہ شیروں کے حملوں سے محفوظ رہ سکیں۔

بکسا

بکسا ٹائیگر ازرو، جلپائی گوڑی کے علی پور دوار سب ڈویژن میں واقع ہے۔ یہ بھارت کا پندرھواں اور مغربی بنگال کا دوسرا ٹائیگر ریزرو ہے۔ اس پناہ گاہ کی سرحدیں شمال کی جانب بھوٹان اور مشرق کی طرف آسام سے ملتی ہیں۔ یہاں کا کل رقبہ ۷۵۹.۲۶ اسکوائر کلو میٹر ہے جس میں ۳۳۰.۱۰ اسکوائر کلو میٹر کا علاقہ مرکزی اور بقیہ بفر زون میں آتا ہے۔ شیروں کے علاوہ یہاں تیندوا، ہاتھی، جنگلی بھینسے، جنگلی بلی، ہرن، چتکبرے ہرن، سانبھر اور اژدھے کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ رنگ برنگے خوش الحان پرندوں کی بھی تقریباً تین سو اقسام یہاں ملتی ہیں۔ شیروں کی تعداد یہاں ۳۷ ہے۔ شیروں کی اعداد شماری کے لیے یہاں جو PLASTER CAST METHOD اپنایا گیا ہے اسے بین اقوامی سطح پر بہترین تسلیم کیا گیا ہے۔

بکسا کی پناہ گاہ کے پروجیکٹ اسٹاف کے پاس رائفلوں اور جیپ وغیرہ کا کافی اچھا انتظام ہے۔ پورے علاقے میں ایمرجینسی کے لیے وائرلیس لگائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یونٹ آف فارسیٹ پروٹکٹیڈ فورس (THE UNITS OF FOREST PROTECTED FORCE) کو بھی تعینات کیا گیا ہے۔ پانی کے لیے جنگل کے بھبر ٹریک BHABBAR TRACK میں چھ عدد جل کنڈ بنائے گئے ہیں۔ لیکن یہ گرمیوں میں خشک ہو جاتے ہیں۔ یہاں سبزی خور جانوروں کے چارے کے لیے عمدہ قسم کی گھاس بھی اگائی جاتی ہے۔ پناہ گاہ کی مزید حفاظت کے لیے تین واچ ٹاور بھی ہیں جہاں سے فارسیٹ گارڈ ۲۴ گھنٹے شکاریوں اور درخت کاٹنے والوں پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔

سملی پال

شیروں کی یہ پناہ گاہ اڑلیسہ کے شمال مشرقی سیکٹر میں بنائی گئی ہے۔ ابتدا میں یہ جگہ مہاراجہ میور بھنج کی شکار گاہ تھی۔ جنگل کے ۸۴۵ اسکوائر کلو میٹر کے رقبے پر بنا یہ ریزرو بے حد فرحت بخش اور سرور انگیز مقام ہے۔ یہ سال، کدم اور چمپا کے گھنے پیڑوں اور لمبی لمبی گھاس سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں قدرتی چشموں اور جھرنوں کی بہتات ہے۔ ان میں خاص طور سے بیرہ پانی (BEREHE PANI) اور جورنڈہ (JORNDA) کے آبشار کافی مشہور ہیں۔ بیرہ پانی، ۱۳۰۸ فٹ گہرا آبشار ہے۔ یہ مقامی زبان میں "پانی کی رسی" کے نام سے مشہور ہے۔

سملی پال ۹۶ شیروں اور تقریباً ۵۰۹

ہاتھیوں کی جائے پناہ ہے۔ ان کے علاوہ یہاں سیاہ تیندوا، چوسنگھا، ارنا بھینس، چیتل، لنگور، سانبھر، لکڑبگھا، گیدڑ اور جنگلی کتے بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر مچھوں کی نشو و نما کے لیے بھی یہاں ایک پروجیکٹ ہے۔ پرندوں میں مور، پہاڑی مینا اور جنگلی مرغی قابل ذکر ہیں۔

سملی پال کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ۲۷۵۰ اسکوائر کلومیٹر پر پھیلا یہ گھنا اور سرسبز و شاداب جنگل پورے ملک میں وہ واحد اچھوتا جنگل ہے جو انسانوں کی تخریبی کارروائی سے ابھی تک محفوظ ہے۔ سیاحوں کے قیام و طعام اور گھومنے کے لیے ریاستی حکومت نے جیپ، بسوں، سرائے اور لاج وغیرہ کا اچھا انتظام کیا ہے۔

کنہا

شیروں کی یہ مشہور جائے پناہ مدھیہ پردیش کے گھنے جنگل کے ۱۹۴۰ اسکوائر کلومیٹر پر بنی ہوئی ہے۔ یہاں بانس سال اور مختلف اقسام کے لمبے اور گھنے درخت ہیں۔ یہاں کی اونچی نیچی ڈھلانیں ہمیشہ سبز گھاس سے ڈھکی رہتی ہیں۔ یہاں تقریباً ۹۹ عدد شاندار شیروں کے علاوہ چیتل، سانبھر، بارہ سنگھا اور ارنا بھینسے بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

کنہا میں گرچہ نیشنل پارک ۱۹۵۵ء میں ہی بنایا گیا تھا لیکن یہ ایک چھوٹے سے علاقے تک ہی محدود تھا، علاوہ ازیں جنگل کو ہمیشہ شکاریوں چرنے والے مویشیوں، لکڑی چرانے والوں اور آگ سے کافی نقصان پہنچتا رہتا تھا۔ لیکن ٹائیگر ریزرو بننے کے بعد اسے مرکزی اور سرحدی علاقے میں تقسیم کر دیا گیا اور نگرانی مقرر کی گئی جس کے باعث یہاں کے پیڑ پودے اور جانور ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہوئے۔ یہاں کی ہری بھری چراگاہوں میں سیکڑوں بارہ سنگھے، چیتل اور سانبھر وغیرہ ایک ساتھ چرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شیر بھی دن میں بہ آسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس قدر احتیاط اور تحفظ کے باوجود بھارت کے اس شاندار قومی جانور کو شکاریوں سے ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ گزشتہ سال رن تھمبور اور مدھیہ پردیش کے ٹائیگر ریزرو میں ۵۵ شیروں کو ناجائز طریقے سے مار ڈالا گیا۔ کرناٹک کے ضلع کڈگو میں واقع ناگرہول نیشنل پارک میں ان کی تعداد افسوسناک حد تک گھٹ کر صرف ڈیڑھ فی صد رہ گئی ہے۔ بھارت میں پوری دنیا کے شیروں کی ۵۵ فی صد آبادی رہتی ہے۔ ۱۹۸۹ء میں شیر شماری کے مطابق یہاں ان کی تعداد ۴ ہزار تین سو ۳۴ تھی اور ۱۹۹۴ء کی اعداد و شمار سے یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ اب یہ تعداد کم ہو کر صرف تین ہزار سات سو چار رہ گئی ہے یعنی پچھلے چھ سالوں سے ان کی آبادی بتدریج گھٹتی جا رہی ہے۔ یہ صورت حال کافی تشویشناک ہے۔ اس کے اسباب کئی ہیں جن میں تربیت یافتہ اسٹاف، نئے ہتھیاروں، گاڑیوں اور دیگر جدید آلات کی کمی، ریاستی حکومتوں کی بدانتظامی اور مرکز سے ملنے والی مالی امداد میں تاخیر بھی ہے۔ سندر بن، دھروا اور کنہا وغیرہ جیسی اہم پناہ گاہوں میں نگراں عملے کی سخت کمی ہے۔ شکاریوں اور لکڑی کے اسمگلروں کا مقابلہ کرنے کے لیے نئے ہتھیار پوری طرح فراہم نہیں کیے جاتے۔ اس کے علاوہ پناہ گاہوں کے مرکزی علاقے CORE AREAS اور بفرزون BUFFER ZONE کا انتظام بھی الگ الگ ہے۔ فیلڈ ڈائرکٹر کے زیر نگرانی مرکزی علاقہ ہوتا ہے اور بفرزون کی حفاظت کی ذمہ داری TERRITORIAL DIVISIONAL FOREST OFFICERS کی ہوتی ہے۔ ان دونوں میں صحیح تال میل نہ ہونے کی وجہ سے جنگل اور پناہ گاہ دونوں کو انتہائی نقصان پہنچتا رہتا ہے۔ گزشتہ سال ایک TIGERCRISIS CELL تشکیل دیا گیا ہے تاکہ شیروں کی غیر طبعی اموات کے اسباب کی پوری تحقیقات کی جا سکے۔ محکمۂ ماحولیات و جنگلات اور شعبہ پروجیکٹ ٹائیگر سے امید کی جاتی ہے کہ وہ شیروں کے مکمل تحفظ کے لیے نئے اور زیادہ محتاط طریقوں کو ترویج دیں گے۔

قلم کار حضرات سے

گزارش ہے کہ

(۱) مضامین/ دیگر تصانیف جو یوجنا کو ارسال کریں انھیں کہیں اور چھپنے کے لیے قطعاً نہ بھیجیں۔

(۲) ہر مضمون کے آخر میں طبع زاد/ غیر مطبوعہ لکھ کر اپنا دستخط، نام اور پتا ضرور درج کریں۔

(۳) مضمون کی اصل ہمیں ارسال کریں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۴) مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کریں۔

(۵) مضامین میں جو اقوال (QUOTATIONS) استعمال کئے گئے ہوں، ان کے سورس کا حوالہ دینا لازمی ہے۔

(۶) مضامین میں انگریزی الفاظ کا استعمال بدرجۂ مجبوری ہی کریں۔

(۷) جواب طلب امور کے لیے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں۔

(ادارہ)

حسین ضامن

غیر رسمی تعلیمی پروگرام

قدیم ہندوستان میں "گوروکل" کا ایک ایسا نظام موجود تھا جس کے تحت استاد اپنے شاگرد کو ہر بات کی تعلیم دیتا تھا۔ اس سلسلے میں اکلویہ کی داستان کافی مشہور ہے۔ جدوجہد آزادی کے زمانے میں بھی یہ بات شدت سے محسوس کی گئی تھی کہ ناخواندگی غلامی کی اہم وجہ ہے۔ لہٰذا اس زمانے میں بھی جدوجہد آزادی کے رہنماؤں خصوصاً گاندھی جی نے خواندگی پر کافی زور دیا تھا۔ لیکن آج ملک میں درس و تدریس کی جو حالت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پبلک اسکول کے نام پر ملک میں ہزاروں اسکول دوکانوں کی طرح کھل گئے ہیں جہاں تعلیم کی سودے بازی ہو رہی ہے۔

ان حالات میں جہاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے والدین کو کثیر رقم ادا کرنی پڑتی ہو، ہر بچے کے لیے تعلیم حاصل کرنا بڑا مشکل ہے ہندوستان ایک ترقی پذیر ملک ہے جہاں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو غریب ہیں اور جو پبلک اسکولوں میں اپنے بچوں کو نہیں پڑھا سکتے۔ لہٰذا ایسے لوگ سرکاری اسکولوں میں اپنے بچوں کو بھیجتے ہیں مگر سرکاری اسکولوں میں بھی سبھی بچے نہیں جا پاتے۔ ایک جائزہ کے مطابق ہمارے ملک کے کل بچوں کا صرف ۵۰ فی صد حصہ ہی اسکول جا پاتا ہے اور باقی خواندگی سے بالکل دور ہیں۔ ۱۴ سے ۱۶ برس کے درمیان کے بچے دنیا میں سب سے زیادہ ہندوستان میں ہیں جنھوں نے آج تک اسکول کا منھ نہیں دیکھا ہے۔ ان سو بچوں میں سے، جو درجۂ اول میں داخلہ لیتے ہیں، صرف ۳۵ بچے ہی درجہ پانچ تک تعلیم مکمل کر پاتے ہیں باقی اس سے قبل ہی اسکول چھوڑ جاتے ہیں۔

ان سب باتوں کے پیش نظر ۱۹۷۸ء میں غیر رسمی تعلیم کا پروگرام (NON-FORMAL EDUCATION PROG) تجرباتی بنیادوں پر شروع کیا گیا تھا جس کا مقصد ملک بھر میں ۹ سے ۱۴ برس کی عمر کے تقریباً ۸۰ لاکھ ایسے بچوں کو تعلیم فراہم کرنا تھا جنھوں نے کہیں کسی اسکول میں رسمی تعلیم حاصل نہ کی ہو۔ شروع میں یہ پروگرام آندھرا پردیش، آسام، بہار، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان، یو پی اور مغربی بنگال میں شروع کیا گیا کیوں کہ ان ریاستوں کو تعلیمی اعتبار سے پچھڑا ہوا سمجھا گیا۔ چھٹے پنج سالہ منصوبے (۸۵-۱۹۸۰ء) کے دوران یہ پروگرام تقریباً تمام ریاستوں میں شروع کر دیا گیا تاکہ اس کے ذریعہ ناخواندگی دور کرنے کے قومی مقصد کو پورا کیا جا سکے۔

غیر رسمی تعلیم کا مقصد سیکھنے والوں کی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ اس میں کافی لچک ہے۔ رسمی تعلیم جیسی سخت گیری اس میں نہیں۔ اس پروگرام کے تحت تعلیم حاصل کرنے سے پڑھنے والوں کی روزمرہ کی زندگی کو کافی فائدہ پہنچتا ہے۔ تعلیم دینے کا طریقہ بھی رسمی تعلیم کے طریقے سے بالکل الگ ہے۔ اس تعلیم کے لیے کسی مخصوص طریقۂ کار پر کاربند نہیں رہا جاتا اور بدلتے ہوئے حالات اور ضروریات کے تحت تعلیم دینے کے طریقے میں سب کی سہولت کو ذہن میں رکھ کر اس میں تبدیلی کی جا سکتی ہے، جب کہ رسمی طریقۂ تعلیم میں شاید ایسا ممکن نہیں۔ وہاں تو پہلے سے طے شدہ ایک نظام الاوقات ہوتا ہے۔ بچوں کا وقت پر اسکول پہنچنا، وقت پر اسکول سے واپس ہونا یہ سب باتیں رسمی تعلیمی نظام میں ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف مضامین کے بارے میں پہلے سے طے شدہ وقت پر ہی علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ہر مضمون کے لیے الگ الگ پیریڈ (PERIOD) ہوں گے اور صرف اسی پیریڈ میں وہ مضمون پڑھا جا سکتا ہے جس کے لیے وہ پیریڈ پہلے سے طے کیا گیا ہے۔ اساتذہ کے لیے حاضری اور غیر حاضری کے ریکارڈ رکھنا ضروری ہے۔ پھر امتحان کا ایک مخصوص طریقہ یہ سب رسمی تعلیم کے نظام کے اہم عناصر ہیں۔ لیکن غیر رسمی تعلیم کے نظام کا مقصد ایک ایسا تعلیمی ماحول پیدا کرنا ہے جس میں والدین اور بچے از خود شرکت کرنے کے خواہش مند ہوں۔ والدین اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کے لیے تعلیمی مراکز پر خود سے آئیں اور بچے بھی بخوشی تعلیم حاصل کریں۔

این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی (NCERT) اور این۔ آئی۔ ای۔ پی۔ اے (NIEPA) دو اہم مرکزی ایجنسیاں ہیں جو درس و تدریس کے نصاب تیار کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ایجنسیاں ان لوگوں کو تربیت بھی فراہم کرتی ہیں جو غیر رسمی تعلیم کے پروگرام میں شریک ہیں ریاستی سطح پر ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی (SCERT) اور ڈائرکٹوریٹ آف ایجوکیشن میں غیر رسمی تعلیم پروگرام کا محکمہ، وہ

بلاک اے ۳۰۔ ایس، ڈی، ڈی، اے فلیٹ، ساکیت، نئی دہلی ۱۷

اہم ایجنسیاں ہیں جو غیر رسمی تعلیم کے پروگرام کی ذمہ دار ہیں۔ ریاستی سطح پر جوائنٹ ڈائرکٹر، ضلعی سطح پر اسسٹنٹ ڈائرکٹر، بلاک کی سطح پر پروجیکٹ افسر اور ہر ۲۰ مراکز کے لیے ایک سپروائزر غیر رسمی تعلیم کے پروگرام کے نفاذ کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس پروگرام کے تحت ملک بھر میں دو لاکھ ۷۰ ہزار مراکز قائم کیے گئے ہیں جو ریاستی حکومتوں کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے دس فی صد مراکز رضاکار تنظیمیں چلا رہی ہیں۔ ان تمام مراکز میں تقریباً ۷۰ لاکھ افراد کے نام درج ہیں اور ۹۱-۱۹۹۰ء کے دوران اس پروگرام پر تقریباً ۴۴ کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا۔ اس پروگرام کے نظم و نسق کے لیے بلاک ایک اہم اکائی ہے جو تعلیم کی منصوبہ بندی کے علاوہ اساتذہ، سپروائزروں اور پروجیکٹ افسروں کی تربیت کا اہتمام بھی کرتی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود یہ بات قابل ذکر ہے کہ غیر رسمی تعلیم کے پروگرام پر عمل درآمد بنیادی طور پر صحیح ڈھنگ سے نہیں ہو رہا ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو اس پروگرام کے تحت قائم کیے گئے تعلیمی مراکز پر بہت کم ہی بھیج رہے ہیں جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس پروگرام پر لوگوں کا بھروسہ زیادہ نہیں ہے یا پھر یہ کہ اس کی جانب ان کی دلچسپی بہت کم ہے۔ ایسا ہونا فطری بھی ہے کیوں کہ جب اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے والے لوگ ہی سنجیدگی اور ایمانداری سے اس میں ملوث نہیں ہیں تو وہ لوگ اس سے کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں یا اس میں دلچسپی لے سکتے ہیں جن کے لیے یہ پروگرام تیار کیا گیا ہے۔ ریاستی، ضلعی اور بلاک کی سطح پر اس پروگرام سے متعلق جتنے بھی اہل کار اور افسران ہیں وہ شاید سنجیدگی سے کام نہیں کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ان اہل کاروں اور افسروں کو بھی نہیں معلوم کہ دراصل انھیں کرنا کیا ہے یا یہ کہ ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ طالب علموں کی خاص ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مشکل سے ہی کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے۔ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ طالب علموں کی خاص ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مشکل سے ہی کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے۔ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ طالب علموں کو وہی سب مضامین یہاں بھی پڑھائے جاتے ہیں جو رسمی تعلیم کے اسکولوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ نیز یہ کہ پڑھانے کا طریقہ بھی بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ عام اسکولوں میں۔ اگر کوئی فرق ہے تو صرف اوقات کا۔ رسمی تعلیم والے اسکول دن میں چلتے ہیں جب کہ غیر رسمی تعلیم کے مراکز میں شام کے وقت تعلیم دی جاتی ہے۔

دوسری باعث تشویش بات یہ ہے کہ ان مرکزوں پر انسٹرکٹرز بھی زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ عام طور پر انھیں لوگوں کو بحیثیت انسٹرکٹر رکھا جانا چاہیے جو مقامی ہوں اور کم سے کم ہائی اسکول پاس ہوں لیکن اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ بعض مراکز پر ایسے لوگ بھی انسٹرکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں جو ہائی اسکول بھی پاس نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ جو انسٹرکٹر ہائی اسکول یا اس سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں ان کی تربیت بھی صحیح ڈھنگ سے نہیں ہوتی ہے۔ اب ظاہر ہے ایسے انسٹرکٹر یا اساتذہ طالب علموں کو کیسی تعلیم دیں گے۔

غیر رسمی تعلیم پروگرام کے لیے اقتصادی وسائل کی بھی کافی کمی ہے۔ انسٹرکٹروں کو آنریریم (HONOURARIUM) کی شکل میں ایک سو پچاس روپیہ ماہانہ دیا جاتا ہے۔ لیکن اس پروگرام کے لیے اقتصادی وسائل کی اتنی کمی ہے کہ یہ رقم ادا کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کئی مہینوں تک انسٹرکٹروں کو ان کا آنریریم نہیں ملتا اور بغیر پیسے کے یہ لوگ کام کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایسی صورت حال ہوگی تو انسٹرکٹر سنجیدگی اور لگن سے کیسے کام کر سکتے ہیں اور جب انسٹرکٹر ہی سنجیدگی اور تندہی سے کام نہ کریں گے تو تعلیمی مراکز کا کیا حال ہوگا اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان سب باتوں کا بالآخر منفی اثر پروگرام کے مقاصد پر پڑتا ہے۔

ایک طرف یہ سب کوتاہیاں ہیں تو دوسری جانب کرپشن بھی اس پروگرام میں در آیا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کاغذات پر تو مراکز کھل گئے ہیں مگر دراصل کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک مرکز چلانے کے لیے وہاں کم از کم پچیس طالب علموں کا مندرج ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اہل کار کاغذوں پر مراکز کھول کر وہاں ہر مرکز میں ۲۵ بچوں کے فرضی نام درج کر دیتے ہیں تاکہ تعلیمی مرکز کے لیے سرکار کی طرف سے ملنے والا اساثا آثار ہے اور وہ اسے فروخت کرتے رہیں۔ یہ بات تو عام ہے کہ پروجیکٹ افسران گاؤں اور تعلیمی مرکزوں کا دورہ کیے بغیر ہی الاؤنسز کا دعویٰ کرتے ہیں۔ فرضی بل بنائے جاتے ہیں اور سرکار سے ٹی۔ اے وغیرہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اس پروگرام کو وہ جزوقتی کام سمجھ کر کرتے ہیں اور زیادہ تر وقت وہ اپنے ذاتی کاموں میں صرف کرتے ہیں۔

ایک اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ غیر رسمی تعلیمی پروگرام میں سماج کی شراکت بالکل نہیں ہے اور اس سلسلے میں جو کوششیں کی جارہی ہیں وہ ناکافی ہیں۔ جن علاقوں میں تعلیمی مراکز قائم کیے گئے ہیں وہاں کے کسی بھی مقامی آدمی کی نمائندگی پروگرام کی مشاورتی کمیٹی میں نہیں ہے۔ مشاورتی کمیٹی میں مقامی لوگوں کی نمائندگی نہایت ضروری ہے کیوں کہ یہ لوگ علاقے کے مسائل اور حالات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جس سے مرکز کو صحیح ڈھنگ سے چلانے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

غیر رسمی تعلیمی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے انسٹرکٹروں کو مناسب اور صحیح تربیت دیا جانا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ انھیں ملنے والے آنیریریم میں بھی اضافہ ہونا چاہیے تاکہ وہ لوگ بچوں کو پڑھانے اور اپنی ذمہ داری نبھانے میں زیادہ دلچسپی لیں۔ ساتھ ہی ساتھ کرپشن اور بدانتظامی کو دور کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ عام طور پر دیہی علاقوں کے غریب بچے تو دس برس کی عمر میں مزدوری کرنا شروع کر دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے والدین کا سہارا بن سکیں۔ علاوہ ازیں والدین رات کے وقت اپنی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے تعلیمی مراکز پر نہیں بھیجتے۔ انھیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کی بیٹیوں کے ساتھ ناروا سلوک نہ برتا جائے۔ لہٰذا لڑکیوں کو تعلیم کی جانب راغب کرنے کے لیے مزید کوششیں کی جانی چاہیے نیز والدین کے ذہنوں سے اپنی بیٹیوں کے بارے میں ڈر نکالنے کے

باقی صفحہ ۲۳ پر

"... اس قصے کا ماحصل یہ ہے کہ سرگرمی اور خلوص دل سے اپنے عقائد مذہبی کی پیروی کرنا ہی فانی مسرتوں اور سعادتوں کی بنیاد ہے۔
... مصنف نے اپنے اس عہد کو بڑی خوبی سے نباہا ہے۔ اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہ آنے پائے جو مذہبی تعصبات پر مبنی ہو۔۔۔
... بعض ایسے واقعات مثلاً فہیدہ کے ساتھ چھوٹی لڑکی کا مکالمہ نہایت فطری اور پُر اثر ہے[1]۔"

اس عبارت میں قصہ میں پلاٹ سازی، مکالمہ نگاری اور زبان کے سلسلے میں گفتگو ملتی ہے۔ یہاں اس جملے سے "مکالمے میں اور نصائح میں بہت طول ہے اور کہیں کہیں بے محل بھی ہے۔ (یا)... چھوٹی لڑکی کا مکالمہ نہایت فطری اور پر اثر ہے" اندازہ ہوتا ہے کہ اب اردو فکشن کی تنقید تحسین یا تقریظ سے نکل رہی ہے۔ لیکن اتنا خیال رہے کہ یہ تبصرہ اور اس میں پائی جانے والی تنقید کی بو باس بھی دراصل مغربی اہل قلم اور فکر و نظر کی دین ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو میں تنقید کے رجحانات مغرب سے ہی آئے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے اب شاد عظیم آبادی کی "صورت الخیال" (موسوم بہ ولایتی کی آپ بیتی) کا وہ دیباچہ سامنے آتا ہے، جس میں مصنف قصہ نگاری میں نئی روش کی تلاش کرتا ہے کہ:

"... اس نئی طرز کی داستان میں نہ کسی طلسم کے باندھنے اور توڑنے کا حال ہے، نہ جنوں اور دیو پری کا ڈھکوسلہ ہے۔ نہ کسی ایسے انوکھے ملک و انوکھے خلقت کا بیان ہے کہ اس کا پتا نہ زمین میں ملے نہ آسمان پر حتی الوسع اس خیالی قصہ میں فطرتی حالات پر بہت کچھ توجہ کی گئی ہے۔ اپنی ہی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد اور اپنے ہی دل کی گرمی بھی نہیں..."[2]

یہ خیالات ۱۸۷۶ء کے ہیں جس میں قصہ کا مقصد اصلاح معاشرہ بتایا گیا ہے اور یہ بھی کہ اس کے افراد کا تعلق دیو پری یا جنوں کی انوکھی دنیا سے نہیں ہے۔ یہاں واضح طور پر قدیم قصوں پر تنقید اور نئی کہانی کی تلاش کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی ناول کے بارے میں پرنسپل مدرسہ عالیہ نے اپنے تاثرات ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن، بنگال کو بتاریخ ۲۱ فروری ۱۸۸۱ء میں ان الفاظ میں لکھے تھے:

"مجھے اس بات کے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ جس قدر ناولیں ہندوستانی زبان میں پڑھی ہیں، ان میں یہ ناول سب سے بہتر ہے۔ ہر شخص جس کا بیان اس قصے میں یکے بعد دیگرے ہے، یعنی آقا بی بی، نوکر، انگریز، یا ہم گویا زندہ ہے۔ اپنی خاص وضع کی ہندوستانی زبان میں باتیں کرتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ ناول مراۃ العروس اور بنات النعش سے باعتبار ادب و انشا کے کہیں بڑھی ہوئی ہے[3]۔"

یہاں کردار نگاری کا ذکر ہے اور نذیر احمد کے ناولوں سے تقابلی مطالعہ بھی۔ یہ ناول تبصرہ نگار کے نزدیک ادب و انشا کے لحاظ سے مراۃ العروس اور بنات النعش سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

رتن ناتھ سرشار بھی اردو فکشن کا ایک اہم نام ہے۔ اس کی کئی تصانیف ہیں۔ ان کی تصانیف کے سلسلے میں اس نے جو گفتگو کی ہے۔ آئیے ان میں تنقیدی نقوش تلاش کرتے ہیں۔

جام سرشار پہلی بار فسانۂ جدید کے عنوان سے اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں اردو کے نول کشور پریس نے پنڈت سادھو پرشاد ڈپٹی کلکٹر و اکسٹرا اسسٹنٹ ممالک مغربی و شمالی اودھ) سے، جو اپنے زمانے کے نمایاں اہل علم تھے، اس ناول کو مرتب کروایا اور اس ناول پر انھوں نے ایک تقریظ بھی لکھی، جس میں جام سرشار کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے اس کے کئی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ناول میں کرداروں کے استعمال کی طرف نقادانِ فن نگاہ رکھنے لگے تھے۔ ملاحظہ ہو یہ تقریظ:

"میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ناول اپنے طرز میں بہت عمدہ اور بے مثال ہے۔ اور بالکل انگریزی ناولوں کے طرز پر لکھا گیا ہے۔۔۔
... بڑی خوبی میرے علم و یقین میں اس ناول میں یہ ہے کہ افراط و تفریط دونوں سے مبرا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے بالکل نیچرہی نیچر ہے۔ پنڈت رتن ناتھ صاحب کے ناولوں میں یہ واقعی بڑی عمدگی ہے کہ اردو زبان میں نہ انگریزی طرز قصص کا عمل درآمد کیا ہے نہ کہیں جن اور بھوت پریت کے جھوٹے قصے ہیں، نہ کہیں ضعیف الاعتقادی کا بیان ہے نہ کہیں اس قدر مبالغہ کیا ہے جو نیچر کے خلاف ہو اور اس پر طرہ یہ کہ بیان میں اس قدر خوش اسلوبی ہے کہ پڑھنے والے کا جی چاہتا ہے کہ پڑھتا ہی جائے۔ اگر شراب کا بیان ہے تو شرابی کی تصویر کھینچ دی ہے اور اگر محلاتی زبان ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاص محل خانہ کا مرقع پیش نظر ہے۔۔۔
گو بادی النظر میں بعض ناظرین یہ خیال کریں کہ ظہور اور نواب صاحب کی اشارہ بازی اور چھیڑ بازی ذرا کسی قدر بڑھ گئی ہے، مگر اربابِ نکتہ رس خوب جانتے ہیں کہ ناولسٹ ہر حال میں واقعات صحیحہ کی پوری پوری تصویر کھینچ دے گا۔ باقی رہا بوسہ بازی کا ذکر یہ انگریزی ناولوں میں جائز ہے۔
... اس ناول کا ماحصل یہ ہے کہ اکثار بادہ نوشی کے مضار بے شمار لوگوں پر ظاہر کیے جائیں اور اس میں اصلاً شک نہیں کہ ہر بیان میں مصنف نے شراب خوری کی توہین کی ہے اور صاف

---

[1] بحوالہ التوبۃ النصوح۔ دوسرا ایڈیشن مطبوعہ نول کشور، کانپور، ۱۸۸۲ء ص ۲۶۸، ۲۶۳۔ [2] صورت الخیال۔ شاد عظیم آبادی [3] بحوالہ شاد کی نثر نگاری۔ ڈاکٹر وہاب اشرفی۔ ص ۸۵

صاف ظاہر کردیا ہے کہ بادہ نوشی کی۔ کثرت انسان کے ساتھ وہ کرتی ہے جو مرگ جان اور کفر ایمان کے ساتھ کرتا ہے۔ ۔ ۔

اس ناول کی زبان قابل تعریف ہے اور اس کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف زبان پر قادر ہے[1]"

اس عبارت میں فکشن کی تنقید ایک نئے پن کے ساتھ سامنے آتی ہے جس میں انگریزی طرز پر ناول کا لکھا جانا، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور بالخصوص کردار نگاری پر بڑی اچھی تنقیدی رائے ہے۔ جہاں بھوت اور پریت سے انحراف کا بھی ذکر ہے اور قصہ کو فطری بنانے کا بھی۔ زبان کی تعریف بھی ہے اور سرشار کی ناول نگاری کا امتیازی وصف بھی بتایا گیا ہے۔ گویا تقریظ لکھنے والا تنقیدی ذہن رکھتا ہے، نیز وہ اردو ناول نگاری کے اصول وضوابط کے ساتھ مغربی ناول نگاری کے مزاج سے واقفیت رکھتا ہے۔ ورنہ اس قدر تقابلی مطالعہ ممکن نہیں ہو سکتا۔

شرر جو "دلگداز" کے مدیر تھے اور اردو میں تاریخی ناول کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ اپنے رسالے "دلگداز" میں ناول کا سلسلہ پیش کرتے تھے۔ اور گاہے گاہے اپنے ناولوں کے جواز میں تبصرہ یا مختصر مضمون بھی شائع کرتے تھے۔ ان میں تنقید کی کچھ روشنی مل جاتی ہے۔ "ملک العزیز ورجنا" کے دیباچے میں وہ جو کچھ لکھتے ہیں اسے اردو میں تاریخی ناول کی تفہیم و تنقید کی بنیادی اینٹ کا نام دیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ یہ ناول پہلی بار ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا تھا:

> "۔ ۔ ۔ یہ ناول تاریخی ہے۔ اردو میں اس وقت جتنے "اوریجنل" (طبعی) ناول لکھے گئے ہیں ان میں کسی تاریخی واقعے کی مطابقت کی کوشش نہیں کی گئی۔ ۔ ۔ اس ناول میں بہت زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے کہ تاریخ کسی طرح ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ ۔ ۔ یہ دعویٰ نہیں کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے سچ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ جو یہ ناول دیکھے گا وہ تاریخ کے ایک خاص قصے سے بخوبی واقف ہو جائے گا[2]"

ڈاکٹر شریف احمد نے لکھا ہے کہ:

- "یہ سطور دو نکات متعین کرتی ہیں ایک یہ کہ یہ ناول اردو کا پہلا تاریخی ناول ہے۔ دوسرے شرر تاریخی ناول کو کیا سمجھتے ہیں[3]"
- "دل گداز کے ساتھ اس سال جو ناول شروع کیا گیا تھا وہ بھی اب پورا ہو گیا جس کا نام "شاہزادہ حسن اور انجلینا" ہے۔ ہمارے خیال میں جس طرح ناول "ملک العزیز اور جنا" کو عموماً لوگوں نے پسند کیا تھا اسی طرح اس کو بھی عام پبلک سے مقبولیت کی سند ملی۔ اس ناول کے ذریعہ سے زیادہ اس امر پر زور دینا مقصود تھا کہ شیعوں اور سنیوں کے باہمی تعلقات کا نمونہ دکھایا جائے اور اس کی خرابیاں ظاہر کر کے موقع دے دیا جائے کہ ہر شخص اس ناول کے ملاحظہ کے بعد اپنے باہمی تعلقات کو عمدہ اور شائستہ بنائے[4]"

"موقع دے دیا جائے" میں دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فنکار "فن پارہ میں مسئلہ کا حل پیش نہیں کرتا اور نہ مسائل کا حل پیش کرنا کسی فنکار کا مقصد ہوتا ہے۔ بلکہ وہ تو حالات، کیفیات اور جذبات کی تصویر کشی تخیل کی آمیزش سے کر دیتا ہے۔ قاری کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ ان کی روشنی میں اچھے یا برے نتائج یا فیصلے پر پہنچے۔

ایک اور مضمون "ہمارا جدید ناول" میں (دل گداز، جنوری ۱۸۸۹ء) انھوں نے حسن یا لوں کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ مسلمانوں کے اوصاف اور کمال کو اگر ناول میں لکھیں تو ہمارے ناولوں کا شمار دنیا کے کل مصنفوں کے ناولوں سے بڑھ جائے۔

۲۔ ان کے نزدیک ناول میں اپنی قوم کے گزشتہ حالات اور اگلی نیک نامیوں کو ظاہر کر کے آج کل کے بجھے ہوئے دلوں میں ایک تازہ جوش پیدا کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ یعنی ناول کا موضوع ان کے نزدیک نہایت محدود ہو جاتا ہے۔

اسی زمانہ کا ایک اور ناول "اصلاح النساء" ہے۔ کہا جاتا ہے یہ بہار کی پہلی خاتون ناول نویس رشیدۃ النساء کی فکر کا نتیجہ ہے۔ وہ دیباچے میں لکھتی ہیں:

> "۔ ۔ ۔ ہم کو بھی خیال ہوا کہ ایک کتاب ایسی لکھیں، جس میں ان رسموں کا بیان ہو، جن کے باعث سے صدہا گھر تباہ ہو گئے اور جو باعث فضول خرچ اور فساد کے ہیں، مگر مجھے یہ خیال بھی ہوا کہ ان باتوں کو نصیحت کے طور پر لکھنا میری حیثیت پر زیبا نہیں ہے، بلکہ ان باتوں کو قصے کے پیرایہ میں لکھنا ہر طرح سے مناسب ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے ان ہی رسموں اور جھگڑوں کو جو روز انہ ہر شریف خاندان میں ہوتے ہیں، فرضی نام رکھ کر لکھنا شروع کیا[5]"

یہاں قصہ کے فن پر کوئی گفتگو تو نہیں ملتی لیکن نصیحت بھری باتوں کو "قصے کے پیرایہ میں لکھنے" کی کوشش میں ہی مصنفہ کے تنقیدی شعور کا پتا چلتا ہے۔

اب نذیر احمد، شرر، سرشار کے بعد مرزا محمد ہادی رسوا کی تحریریں سامنے آتی ہیں۔ افشائے راز (۱۸۹۶ء) ان کا پہلا ناولچہ ہے۔ اس ناول میں یوں تو فن قصہ اور اس کے اجزائے ترکیبی کی طرف رسوا نے زیادہ توجہ نہ دی مگر اردو انشا پردازی کی ترویج و اشاعت کا ذکر ہے اور اپنے نظریۂ فن کی وضاحت کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا نظریہ ادب برائے زندگی (مولوی کریم الدین کے بعد غالباً اردو میں پہلی بار) بھی واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔

---

[1] جام سرشار۔ مرتبہ بدر عالم۔ مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۶۱ء ص ۵۳۷۔ ۵۳۶۔ [2] ملک العزیز ورجنا۔ مرتبہ ممتاز منگلوری، لاہور ۱۹۶۳ء ص ۶۴
[3] عبدالحلیم شرر: شخصیت وفن۔ ڈاکٹر شریف احمد ص ۱۲۳۔ [4] دلگداز، نمبر ۱۱، جلد نمبر ۳، دسمبر ۱۸۸۹ء ص ۵۔ [5] اصلاح النساء۔ از رشیدۃ النساء، ۱۸۹۴ء ص ۳

مرزا رسوا نے نذیر، سرشار، شرر وغیرہ کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے اور ان کے کامیاب و ناکامیاب تجربے بھی ان کی نظر میں ہیں۔ رسوا نے پہلی بار فن کے تقاضوں کو محسوس کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ فطرت انسانی کے مطالعہ و مشاہدہ کے بغیر ناول کا تصور ہی ممکن نہیں۔ وہ ناول کا قصہ اور اس کے کردار اپنے ماحول میں ہی تلاش کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اسی لیے تاریخی ناول انھیں اپیل نہیں کرتے۔ وہ سماجی تصویر کشی کو بھی ناول کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ انھیں فن اس قدر عزیز ہے کہ ان کا ناول بجائے عوام الناس کے اہل فن میں قدر کی نظر سے دیکھا جائے۔

رسوا کی بڑی خوبی اور نئی بات جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کہی، یہ بات نہ دتاسی کے خطبات میں آئی ہے نہ کریم الدین کے نظریات میں۔ یعنی کرداروں کی ظاہری ہی نہیں باطنی کیفیت کی تصویر کشی۔ یہیں سے گویا نفسیات اردو ناول کی تنقید میں داخل ہوئی۔ امراؤ جان ادا میں اس کا عملی ثبوت ملتا ہے۔

نذیر احمد نے اردو ناول کی بنیاد ڈالی اور اسے زندگی کے حقائق سے وابستہ کیا، سرشار نے بتایا کہ یہ زندگی کا آئینہ ہے، جس میں اس کی تمام وسعتیں اور رعنائیاں منعکس ہیں۔ اس زندگی میں ایسے کرداروں کی آب و تاب ہے جو دل نشیں، انوکھے اور ناقابلِ فراموش ہیں۔ شرر نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ ناول میں قصہ گوئی کے کچھ حدود ہیں۔ واقعات کو لڑی میں پرونے کے کچھ اصول، کچھ سلیقے ہیں جن کے بغیر کسی قصہ کو ناول نہیں کہا جا سکتا۔ رسوا نے ان تینوں کی فنی روایات کا احترام کیا اور اردو میں پہلی بار ایک مکمل معیاری ناول "امراؤ جان ادا" کی صورت میں پیش کیا، جس میں وہ خوبیاں بھی موجود تھیں، جو بکھری بکھری سی نذیر، سرشار اور شرر کے ناولوں میں ملتی تھیں اور وہ بھی جو ان میں موجود نہ تھیں۔

اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹ویں صدی عیسوی کے اختتام تک اردو میں فکشن کی تنقید روزافزوں مائل بہ ارتقا ہے۔ اس صدی کے آخر میں "ناول نویسی" پر سب سے پہلا ایک طویل مضمون ملتا ہے جس میں ناول کی مقبولیت کے اسباب، اردو ناول کا تجزیہ، ناولوں کی فنی خصوصیات، ناولوں کے موضوعات وغیرہ پر تفصیلی بحث ہے اور مضمون نگار نے جگہ جگہ انگریزی ادب کے حوالے سے اپنی بات واضح انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ ان بیش قیمت خیالات کا اظہار سید سجاد حیدر نے کیا اور یہ مضمون "معارف" علی گڑھ، جلد ا، شمارہ نمبر ۴، اکتوبر ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل پوری صدی میں اس نوعیت کا کوئی مضمون نہیں ملتا۔ ذیل میں اس کے چند اقتباسات پیش کرنا مناسب ہوگا تاکہ مضمون کی افادیت کا اندازہ ہو۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "پھر کیا عبث ہے کہ افسانہ نگاری روزافزوں ترقی پر ہے؟ اس کی ایک بہت معقول وجہ بتائی گئی ہے یعنی یہ کہ انسان کسی نہ کسی حد تک یونان کے فلاسفر ایرس ٹپس یا ایپی کیورس کا پیرو ہے جن کا یہ قول ہے کہ اصلی مقصد زندگی کا خوشی ہے اور شوقیہ کتابوں کے پڑھنے والے بھی عموماً اس زمرہ میں شامل ہیں۔ وہ جب کسی کتاب کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو اکثر کی غرض یہ ہوتی ہے کہ انھیں لطف حاصل ہو۔ ایسے نفوس قدسیہ شاید لاکھ میں چار بھی نہیں ہوتے جو علم کو محض علم کے لیے حاصل کرتے ہوں اور جو ایسے ہیں وہ بھی خوشی کے بندے ہیں ۔۔۔ اور چوں کہ علوم میں لطف حاصل کرنے کے لیے محنت اور کاوش کی ضرورت ہے۔ اس سے بچنے کے لیے وہ لوگ جو کتابوں سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں، قصوں کی طرف جھک پڑتے ہیں۔ یہ قدرتی حالت ہماری خواہش لطف کی ہے ...... یہ خواہش (لطف کے حصول کی خواہش) لوگوں میں منجملہ اور ذریعوں کے عموماً قصوں کے ذریعہ سے بھی پوری ہوتی ہے اور اس لیے یہ کوشش ہونی چاہیے کہ اس کا استعمال اچھا ہو؎"

یہاں قصہ کو لطف و انبساط حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بتایا گیا ہے اور یہ بھی کہ اس کا استعمال اچھا ہو۔ یعنی ناول یا قصہ چوں کہ سماج اور اس کے افراد پر اثر کرتا ہے اس لیے اخلاقی یا توں سے قصہ کو خالی نہیں ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں وہ سر والٹر اسکاٹ اور ڈکنس کے ناولوں کا حوالہ دیتے ہیں کہ ان کے ناولوں نے "ملک کی پبلک پر بہت کچھ اثر ڈالا ہے؎"

وہ ناولوں کے اثرات پر گفتگو کرتے ہوئے ناول کی حقیقت پسندی اور داستان کی طلسماتی دنیا پر یوں تنقید کرتے ہیں:

> "مگر اس میں اثر ڈالنے کے لیے ہر ناول نویس کو قدم قدم پر ایک بہت بڑی بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یعنی یہ کہ کوئی مافوق العادت واقعہ قصہ میں نہ بیان ہو جائے۔ ایک زمانہ میں قصہ کی خوبی ہی یہ سمجھی جاتی تھی کہ چن چن کے ایسی باتیں لکھی جائیں جو ناممکن الوقوع ہوں اور پڑھنے والے ان کو آسانی سے قبول کر لیتے تھے ۔۔۔ ہندوستان میں تو ایسے لوگ اب تک موجود ہیں جو داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا، فسانۂ عجائب اور گل بکاؤلی کے افسانوں کو سچے واقعات سمجھتے ہیں ۔۔۔ لیکن موجودہ زمانہ کا قصہ پڑھنے والا ایک عجیب الخلقت شخص ہے؎"

اس کے بعد اردو میں اچھے ناول نگاروں کی کمیابی کا ذکر کرتے ہیں اور نذیر احمد، شرر اور سرشار کا ادبی اور فنی مرتبہ تلاش کرتے ہوئے قصہ کے مختلف معیار اور اقسام کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

> "قصہ کی سب سے اعلا قسم وہ مانی گئی ہے جس میں مصنف انسانی فطرت

؎، ؎، ؎ ناول نویسی۔ سید سجاد حیدر۔ معارف، اکتوبر ۱۸۹۸ء ص ۹۹۔۹۸، ۱۰۰، ۱۰۰

پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالتا ہے جو اس کے اختیار سے باہر معلوم ہوتا ہے اور جسے لوگ حیرت زدہ ہو کر الہام کا خطاب دینے میں بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ انسانی فطرت کا ایسا مطالعہ کرنے والا صدیوں میں ایک آدھ ہی پیدا ہوتا ہے۔۔

دوسری قسم کے قصے وہ ہوتے ہیں جن کے ذریعہ سے کوئی خاص اخلاقی سبق یا تعلیم دینی مقصود ہوتی ہے۔ اس قسم میں کم و بیش کل ناول آسکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہر قصہ میں مصنف کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور دکھانا چاہتا ہے۔۔۔۔ اس میں وہ ناول شامل کرنے چاہئیں۔ جو بالقصد کسی خاص غرض کے لیے لکھے گئے ہوں۔

تیسری قسم تاریخی قصوں کی ہے۔۔ اس میں مصنف کسی خاص تاریخی واقع کو لے کر کچھ کمی و بیشی کے ساتھ فسانہ کے پیرایہ میں بیان کرتا ہے۔ پھر سراغ رسانی اور اسرار کے قصے ہیں۔ ان کی تعداد ہر جگہ بہت زیادہ ہوتی ہے اور نوجوانوں اور عام آدمیوں کو یہ بہت پسند آتے ہیں[1]۔"

یہ تقسیم دراصل انیسویں صدی کے آخر زمانہ تک کے ناول کے پیش نظر ہے۔ حالات اب دوسرے ہیں۔ اس لیے ناول کی تعریف کے ساتھ اس کے اقسام میں بھی تبدیلی اور اضافہ ہوا ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ اس عہد میں جب کہ فکشن کی تنقید تو کیا خود اردو تنقید کے بال و پر بھی نہ آئے تھے۔ سجاد حیدر نے ناول نویسی کے متعلق سوچا اور اس کی خامیوں کو سامنے رکھا۔ لیکن ان کے خیالات سے کلی اتفاق ممکن نہیں ہے۔ مثلاً ناول کی تقسیم بندی میں انھوں نے ان ناولوں کو اعلا درجہ میں رکھا ہے جس میں مصنف انسانی فطرت پر ایک فلسفیانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ یہاں اور بھی تقسیم بتائی گئی ہے لیکن عشقیہ ناول کا کہیں ذکر تک نہیں ہے۔

ممکن ہے انھوں نے عشق کو فطرتِ انسانی کا جزو اعظم تسلیم کرتے ہوئے ظاہراً عشق کا نام نہیں لیا۔

اس لیے کہ جب ہم خود سجاد حیدر کی ناول نویسی پر غور کرتے ہیں تو ان کے سب سے مشہور قصے "خارستان وگلستان" میں عورت کی نمود لطیف اور اس کی صنفی کشش کا کھلا کھلا اعتراف ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی دوسرے قصوں میں ان کے یہاں عشق کا ہی رجحان زیادہ ملتا ہے۔ ممکن ہے ناول نویسی کے یہ اصول و ضوابط انھوں نے مشرقی ناولوں سے اخذ کر کے مغربی مفکرین اور ناقدین کے مضامین پڑھ کر اخذ کیے ہوں جس کے نتیجے میں یہ تضاد رہ گیا ہے۔

ناول کی اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ہمارے ناولوں میں پلاٹ کی بہت بڑی کمی ہوتی ہے۔ ناول کے لیے عشق اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لیے جان۔ عشق کے بعد جنگ کا نمبر ہے۔۔۔ انگریزی ہی پر کیا موقوف ہے خود اردو کے قصوں میں عشق داخل کیا جاتا ہے لیکن ایک بہت بڑا فرق انگریزی اور اردو کے قصوں میں یہ ہے کہ ان میں جب عشق کا سلسلہ چلتا ہے تو بالکل نیچرل معلوم ہوتا ہے اور اردو میں از سرتاپا بے جوڑ۔

اس اقتباس کا بھی مقصد واضح ہے کہ ناول کی کہانی عموماً عشق پر مبنی ہوتی ہے۔ ہمارے ناول نویس اس سے آگے بڑھ کر دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ہاں نذیر احمد کو اس سلسلے میں وہ مجتہد سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے قصوں سے عشقیہ عنصر نکال دیا، جو ہندوستانی سماج کے مطابق بھی تھا۔

پلاٹ کے بعد انھوں نے کردار نگاری پر گفتگو کی ہے جو خاصی اہم ہے۔ وہ ناول کے خاص عنصر اور نئی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ بات جو فیلڈنگ کے پیش نظر تھی جس کے تحت اس نے ناول کو COMIC EPIC IN PROSE کہا تھا، وہ یہی تھی کہ ناول میں ایسے انسانوں کو ہیرو بنایا جائے جن کا تعلق عوام کی زندگی سے ہو، ایسے عوام جو غریب ہیں، جن کی کوئی سماجی حیثیت نہیں ہے لیکن جو زندگی کی جنگ میں شریک ہے اور اپنی سماجی حیثیت تسلیم کرانے میں کوشاں ہے ۔۔ حتیٰ کہ غریب عوام میں سے بھی ایسے افراد کو ہیرو بنایا جائے جن کی عزت اس نچلے طبقے میں بھی نہیں ہے، مثلاً کوئی حرامی اولاد یا کوئی طوائف ۔۔ فیلڈنگ کے ٹام جونس کا ہیرو ایک ایسی ہی ناجائز اولاد ہے، لیکن جو زندگی کی کش مکش میں، اپنی کھوئی عزت کو بحال کرنے میں، سماج کو اس بات کے سمجھانے اور سمجھنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس کی پیدائش میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ تو وہ دو کمزور اور بزدل انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ غلطی اور گناہ ان کے لیے ہے۔ مجھے تو جینے کا اتنا ہی حق ہے جتنا دوسرے بچوں کو اور اس سلسلے میں وہ جس قدر سماج سے لڑتا ہے اور جس طرح حالات کے ساتھ نبرد آزما ہوتا ہے، دراصل یہ اس کی "نئی ہیروئی" شناخت ہے۔

ناول میں "ہیرو کی تبدیلی" اور سماج کے نچلے یا متوسط طبقے کے افراد کو ہیرو بنانے کا یہ خیال اس وقت جنم لیتا ہے جب معاشرے میں یہ احساس عام ہو جاتا ہے کہ سرمایہ داروں یا بادشاہوں یا امیروں کی شاہانہ زندگی کا دار و مدار مزدور اور محنت کش طبقے پر ہے۔ بظاہر تو ان کی آمدنی یا ان کے گھر کا خرچ ان کا مالک اٹھاتا ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے کہ وہ خود ان کی محنت کے باعث عیش کرتے ہیں اور جب یہ ساری حقیقتیں سامنے آتی ہیں تو مزدور طبقہ جہاں سماج میں اپنی اہمیت تسلیم کراتا ہے وہیں ادب میں بھی ہیرو کی جگہ لیتا ہے کہ قصہ کا اصلی ہیرو مجھے بناؤ۔۔ اور پھر قصہ کا ہیرو اور اس کا ماحول سب کچھ بدلتا ہے۔

سجاد حیدر کا اشارہ بھی کردار کی تبدیلی ہی کی طرف ہے۔ اسی لیے وہ ناول نگاری کے لیے تجربے، معلومات اور مشاہدے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ ان کی یہ باتیں اور تمام خیالات جو ناول نگاری سے متعلق ہیں، وہ اکثر انگریزی تنقید سے اخذ کردہ ہیں۔ ہاں انھوں نے اسے اردو میں عام کرنے کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے ان کا یہ مضمون بھی اردو میں افسانوی ادب کی تنقید کے ارتقا میں اہم مقام رکھتا ہے۔

اب ہماری نظر ایک بار پھر مرزا رسوا کی

---

[1] ناول نویسی۔ سجاد حیدر یلدرم۔ ص ۱۰۲۔۱۰۱

طرف جاتا ہے، جنھوں نے اپنے ایک اور ناول "ذاتِ شریف" میں تاریخ نویسی اور ناول نویسی کے فرق اور فنی پر گفتگو کی ہے اور اپنی ناول نگاری کی وضاحت بھی کی ہے وہ کتاب کے آخر میں "ذاتِ شریف" کے لیے جو جواز پیش کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب کو زندگی اور تاریخ کا آئینہ قرار دیتے ہیں، جس میں واقعات صحیح ہوتے ہیں، ممکن ہے تاریخ میں الٹ پھیر ہو۔ لکھتے ہیں:

"یہ افسانہ اور اس کے علاوہ اور ناول ہم نے تحریر کیے ہیں ان میں کسی میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے جس سے دل و دماغ پر کوئی شدید اثر مثل ہول یا خوف یا رقت وغیرہ کے طاری ہو سکے۔ کیوں کہ اصل منشا ہمارا اس افسانہ نویسی سے نقلِ معاشرت کے واقعات کی فراہمی ہے۔ ہمارے ناول نہ بڑے ٹریجڈی ہیں، نہ کمیڈی، نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوئے، نہ ان میں سے کسی نے خودکشی کی، نہ ہجر ہوا نہ وصال۔ ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیے۔ امید ہے کہ یہ تاریخ بکار آمد ثابت ہوگی۔"[1]

اس جائزے سے یہ بات تو سامنے آتی ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک اردو میں افسانوی ادب کی تنقید کن مراحل سے اور کیوں کر گزری، پھر اس میں کیوں کر ارتقا ہوا۔

●

گزشتہ اوراق میں مختلف تصانیف اور تذکروں سے، دیباچوں، خطبوں، تقریظوں اور اشتہاروں سے فکشن کی تنقید کے ملتے جلتے، آدھے ادھورے نقوش کو تاریخی ترتیب اور ارتقا کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جس سے اردو میں "افسانوی ادب کی تنقید" کے آغاز اور اس کے ارتقا کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ جب ہم ان کا تجزیہ کرتے ہیں، تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

۱۔ اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط سے ۱۸ویں صدی عیسوی کے اختتام تک اردو میں فکشن کی تنقید کے سلسلے میں تقریباً خاموشی ہے۔ اس لیے کہ اس مدت میں جو تصانیف ملتی ہیں۔ ان کے مصنفین اردو زبان کے متعلق ہی بات کرتے ہیں کہ "ان سے پہلے ہرگز کسی فصیح نے اس فصاحت سے بات نہیں کی ہے۔" ان کی نگاہ قصہ، کہانی یا داستان کے فن یا اس کی خامی و خوبی پر نہیں ہوتی۔ دراصل یہ اس عہد کا مزاج ہی تھا۔ زبان اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ خصوصاً نثر لکھنے کا رواج بہت عام نہ تھا۔ چناں چہ نثر کی تشکیل کے اس زمانے میں کم و بیش ہر مصنف کا یہ دعویٰ فطری ہے کہ وہ اس طرح کی نثر ایجاد کر رہا ہے۔ اس لیے یہ پورا عہد فکشن کی تنقید کے سلسلے میں تہی دامن نظر آتا ہے، جس پر زیادہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

۲۔ انیسویں صدی عیسوی کا آغاز، البتہ نئی تبدیلیوں اور نئے انقلابات کے ساتھ ہوتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، قدیم دہلی کالج کا قیام اور سرسید تحریک نے عوام اور ادب دونوں کو متاثر کیا۔ اس لیے زندگی کے ساتھ انسان کے خیالات، زمانے کے رجحانات اور ادب کے مزاج میں بھی تغیرات و وسعت پیدا ہوئی۔

اردو میں تصنیف و تالیف و ترجمے کے کام میں ترقی ہوئی۔ خصوصی طور پر داستان گوئی اور قصہ نویسی نے کافی فروغ پایا۔ مگر اس عہد کے وسط تک فکشن کی تنقید کے ہلکے پھلکے اشارے کے علاوہ کوئی ٹھوس چیز سامنے نہیں آتی۔ بلکہ پورے عہد کے افسانوی ادب کے تنقیدی سرمائے کے تجزیے کے بعد یہ کہنا ہرگز نامناسب نہ ہوگا کہ اس پورے عہد میں تنقید کی جو نوعیت ہے اس کی بنیاد تاثرات پر مبنی ہے اور یہ تاثراتی تنقید فی زمانہ بھی اردو میں سب سے زیادہ رائج ہے۔ البتہ بعض مغربی دانشوروں نے جن کا تعلق اس زبان سے تھا، انھوں نے کسی کتاب پر تقریظ، تبصرہ یا تمہید میں کچھ باتیں کی ہیں، جن میں فکشن کی تنقید مل جاتی ہے۔ ان میں جان گلکرسٹ، ڈنکن فاربس، ڈاکٹر چارلس ریو اور گارساں دتاسی کے نام اہم ہیں۔ بلکہ گارساں دتاسی نے تو غالباً پہلی بار صنف داستان کی تعریف کی ہے یا تمثیل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

ان ابتدائی کوششوں اور ہلکے اشاروں نے ہی فکشن کی تنقید کے لیے راہیں ہموار کیں، اس کے بعد انیسویں صدی عیسوی کی ساتویں دہائی کے آغاز میں مولوی کریم الدین کی خط تقدیر کے مقدمے پر نظر ٹھہرتی ہے، جس کی روشنی میں مولوی کریم الدین، اردو میں افسانوی ادب کا پہلا باضابطہ نقاد بن کر ہمارے سامنے آتا ہے، جس نے داستان اور قصہ گوئی کی پرانی روش پر تنقید کی اور اس سے انحراف کیا اور اردو میں پہلی بار ادب برائے زندگی کا رجحان دیا۔ اس کے علاوہ وہ قصہ خوانی کو بڑی اہم چیز سمجھتا ہے اس کے نزدیک یہ انسان کو مسرت اور انبساط کے ساتھ بصیرت اور بصارت بھی بخشتا ہے۔ مولوی کریم الدین سے قبل اردو کے کسی ادیب یا دانشور نے افسانوی ادب سے متعلق اتنے واضح سوالات نہیں اٹھائے۔ اس لیے مولوی کریم الدین افسانوی ادب کی تنقید کے بابا آدم کہے جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد دوسری اہم تنقید بوستانِ خیال (جلد دوم، مرتبہ خواجہ بدرالدین خاں امان دہلوی) کے دیباچے میں ملتی ہے، جہاں داستان کے فن کے لیے ۵ اجزا کو ضروری بتایا گیا ہے۔

۳۔ اس عہد میں (۱۸۰۱ء — ۱۹۰۰ء) افسانوی ادب کے متعلق دو نوعیت کے متعلق خیالات ملتے ہیں۔ ایک طبقہ جس میں غالب سرفہرست ہیں ادب برائے ادب یا تفننِ طبع یا حسن کی حمایت کرتا ہے اور دوسرا وہ طبقہ جس کی تعداد کافی ہے، ادب برائے اصلاح اور ادب برائے زندگی کے تصور کو صحیح تسلیم کرتا ہے۔ ان میں بعض مغربی دانشوروں کے ساتھ نذیر احمد بھی شامل ہیں — نذیر احمد کے تمام قصے پند و موعظت پر مبنی اور ادب برائے اصلاح کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اسی لیے انھیں حکومتِ وقت ہر سال ان کی کتابوں پر انعامات سے بھی نوازتی ہے۔ دراصل یہ اس عہد کا تقاضا تھا جسے نذیر احمد اور ان کے قبیلے کے دوسرے اہلِ قلم پورا کر رہے تھے۔

۴۔ اسی زمانے میں سرشار بھی ناولوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ بلکہ اردو میں لفظ ناول کو رائج کرنے اور عوام میں مقبول بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اس سلسلے میں دلگداز کے صفحات نے بھی ان کی بڑی مدد کی تھی۔ لیکن ۱۹۰۰ء تک انھوں نے جو کچھ لکھا اپنے ناول یعنی ایک خاص قسم کے تاریخی ناول

[1] ذاتِ شریف۔ مرزا رسوا ص ۲۰۲

کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھا۔ وہ یہی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے اوصاف اور کمال کو اگر ناول میں لکھیں تو اردو ناول کا شمار دنیا کے کل مصنفوں کے ناولوں سے بڑھ جائے گا۔ ان کے مطابق ناول کا موضوع بہت محدود ہو جاتا ہے۔ لیکن ۱۹۰۰ء کے بعد انھوں نے باضابطہ اردو ناول پر مضامین لکھے، جن کا ذکر اگلے باب میں ہی ممکن اور مناسب ہوگا۔ ڈاکٹر شریف احمد نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے :

> "انھوں نے (شررؔ) لفظ ناول کو
> اردو میں سب سے پہلے اور سب سے
> زیادہ مستعمل اور مروج کیا ہے[1]..."

شررؔ واقعتاً پہلے شخص ہیں، جنھوں نے تشنہ ہی سہی، لیکن ایک خاص صنف ناول پر اپنے رسالہ "دلگداز" میں "ہمارا جدید ناول" کے تحت اپنے خیالات اور تصورات عوام کے سامنے رکھے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ہم ان کے خیالات سے اتفاق نہ کریں، لیکن ان کی اس کارگزاری اور خدمت سے انکار ممکن نہیں۔

نذیر احمد اور سرشار نے ناول کی تخلیق تو کی، لیکن اس کے خط و خال، اس کی ہیئت و ساخت کے متعلق اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ مضامین شررؔ نے لکھے۔

۵۔ اسی زمانہ کے اختتام پر مرزا رسواؔ کا تحریر کردہ وہ دیباچہ سامنے آتا ہے جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہونے والے ان کے پہلے ناول "افشائے راز" میں شامل تھا۔ یہ مولوی کریم الدین کے دیباچہ کے بعد دوسری اہم تنقید ہے جس میں "ادب برائے زندگی" کا تصور ملتا ہے، اور جس کی وضاحت بھی کی گئی ہے وہ جملہ یہ ہے :

> "یہ ناول ان لوگوں کے لیے لکھا
> گیا ہے جن کو فطرتِ انسان کی مختلف حیثیتوں
> پر نظر کرنے کا شوق ہے۔"

فطرتِ انسانی کا مطالعہ کرنے کا شوق شاید سب سے پہلے مرزا رسواؔ کے یہاں ہی نظر آتا ہے، جو امراؤ جان اداؔ کی شکل میں ہمارے سامنے زیادہ واضح ہو کر آتا ہے۔

۶۔ اس لحاظ سے فکشن کی تنقید کے بنیادی معماروں میں مولوی کریم الدین، خواجہ بدرالدین خاں امانؔ دہلوی، مرزا غالبؔ، نذیرؔ احمد، شررؔ، رسواؔ اور سید سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کے اسماء ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان اہلِ قلم نے اردو افسانوی ادب کے متعلق سوچا اور مضامین یا تقریظ یا دیباچہ کی صورت میں کچھ وضاحت کی۔

۷۔ اس صدی میں اردو میں افسانوی ادب کی تنقید، تاثرات، تحسین، تنقیص، تعریف، تقریظ سے نکل کر کسی حد تک پرکھ، جانچ اور معیار کی منزل میں داخل ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ بھی اس صدی کی آخری دہائی میں۔

اس طرح تحقیق کے بعد کچھ اور باتیں سامنے آتی ہیں کہ :

الف : لفظ تمثیل کا استعمال پہلی بار ملاؔ وجہی نے کیا۔

ب : تمثیل کی تعریف غالباً پہلی بار گارساں دتاسی نے پیش کی۔

ج : لفظ "داستان" کو شاید تحسینؔ نے سب سے پہلے استعمال کیا۔

د : اردو میں تقابلی تنقید کا رجحان سرورؔ کے فسانۂ عجائب کے حوالے سے آیا۔

ہ : اردو فکشن کی تنقید کا بابا آدم مولوی کریم الدین ہے جس نے ادب برائے زندگی کا تصور دیا۔

و : اردو میں لفظ ناول کو سب سے پہلے شادؔ عظیم آبادی اور سب سے زیادہ شررؔ نے استعمال کیا۔

۱۷ویں صدی عیسوی سے ۱۹ویں صدی عیسوی کے وسط تک اردو میں افسانوی ادب کی تنقید کا کوئی واضح رجحان نہیں ملتا۔ لیکن انیسویں صدی کی آخری پانچ دہائیوں میں افسانوی ادب کی تنقید میں نئے اور واضح تصورات ملتے ہیں اور یہ تصورات اچانک نہیں بلکہ بتدریج سامنے آتے ہیں۔ اس لحاظ سے افسانوی ادب کی تنقید کا یہ ارتقا اپنے آپ میں تدریجی نظر آتا ہے جس نے بیسویں صدی عیسوی میں اردو تنقید کے مختلف دبستان کو جنم دیا۔ ●

[1] عبدالحلیم شررؔ: شخصیت اور فن۔ از ڈاکٹر شریف احمد ص ۴۱۔ گوہر پبلی کیشنز، ۵۲۷۶ کوچہ رحمان، دہلی ۶، ۱۹۸۹ء

بقیہ: غیر رسمی تعلیمی پروگرام

لیے خصوصی اقدامات کرنے ہوں گے اور انھیں یہ یقین دلانا ہوگا کہ تعلیمی مراکز میں ان کی بیٹیاں بے خوف و خطر تعلیم حاصل کر سکتی ہیں تبھی تعلیمی مراکز میں لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اگر سماج کی شراکت کو اس پروگرام میں یقینی بنایا جائے تو متذکرہ بالا مسائل کا حل شاید بہت مشکل نہیں ہوگا۔ ●

ریاستی بجلی بورڈوں کی تشکیل نو کے لیے عالمی بینک کی امداد

عالمی بینک کی مدد سے ریاستی بجلی بورڈوں کی از سر نو تشکیل کی جائے گی۔ عالمی بینک نے ریاستی بجلی بورڈوں کے جائزے کی تجویز پیش کی ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو از سر نو تشکیل دے سکیں۔ متعدد ریاستی بجلی بورڈوں مثلاً ہریانہ، اتر پردیش، اڑیسہ، بہار، راجستھان اور آندھرا پردیش نے اس تجویز کے سلسلے میں مثبت رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ ہریانہ، اتر پردیش، بہار، راجستھان اور اڑیسہ کے بجلی بورڈ باہر کے کنسلٹینٹس کے ذریعے جائزے کے سلسلے میں پروجیکٹ کی تیاری کی ابتدائی سہولت کے تحت قرضوں کے لیے عالمی بینک کے ساتھ معاہدوں پر دستخط کر چکے ہیں۔ عالمی بینک کے اندازہ کے مطابق تشکیل نو کے عمل سے ملک میں بجلی کی پیداوار، ترسیل اور تقسیم کے کارپوریٹائزیشن کو فروغ ملے گا۔ ہریانہ اور اڑیسہ کے لیے کنسلٹینٹس کی رپورٹیں دستیاب کرا دی گئی ہیں۔

نثار احمد صدیقی

ایڈز

عام طور پر جنگیں جلد فتح حاصل کرنے کے دلاسے پر شروع کی جاتی ہیں اور ان کے ساتھ نہ صرف باجے گاجے اور شور و شغب کے ہنگامے بھی برپا کیے جاتے ہیں بلکہ کسی طور پیچھے نہ ہٹنے کا یقین بھی دلایا جاتا ہے۔ اسی طرح "ایڈز" کے مرض کے خلاف مہم شروع کرتے وقت بھی ایسے ہی وعدے کیے گئے۔ ۱۹۸۰ء کے وسط میں تحقیق کرنے والوں نے اعلان کیا کہ انھوں نے "ایڈز" کا مرض پیدا کرنے والے وائرس کا سراغ لگا لیا ہے اور دو برس کے اندر اندر اسے جڑ سے اکھاڑ دینے والا ویکسین تیار کر لیں گے، جس سے بیسویں صدی کے سب سے زیادہ تباہ کن مرض کو سائنس، تکنالوجی اور تحقیق کے آگے سرنگوں ہونا پڑے گا۔ مگر ان اعلانات سے کوئی فتح حاصل نہ ہو سکی۔ دو سال قبل ایمسٹرڈیم میں گیارہ ہزار سائنس دانوں اور دیگر طبی ماہرین ایک کانفرنس میں جمع ہوئے۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی اور غم کے آثار ہویدہ تھے کیوں کہ ۱۲ برس کی ناکامیوں اور آزردگیوں نے انھیں دل شکستہ کر دیا تھا۔ تحقیق پر کئی ارب ڈالر خرچ ہوئے اور اس موذی مرض سے بچاؤ کے کئی طریقے بیان کیے گئے۔ مگر آج بھی سائنس داں اس پر فتح حاصل کرتے دکھائی نہیں دیتے۔

ایڈز کے خلاف اب تک کوئی ویکسین، کوئی شافی دوا اور کوئی واضح اور حتمی علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ اس کے متعلق معلومات کی فراہمی نے اس خوفناک مرض کو ترقی پذیر ملکوں میں بڑھنے اور پھیلنے سے روکا ہے۔ مگر یہ غریب ممالک میں تیزی کے ساتھ پھیلتا جا رہا ہے۔ بین اقوامی ادارہ صحت نے بیان جاری کیا ہے کہ ۲۰۰۰ء تک دنیا بھر میں تین کروڑ اشخاص ایڈز کے مرض میں مبتلا ہو جائیں گے جب کہ بہت سے ماہرین کہتے ہیں کہ یہ تعداد بڑھ کر گیارہ کروڑ ہو جائے گی۔

تحقیق کنندگان کی پیہم جد و جہد کے باوجود مرض کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا نہیں جا سکا اور ابھی تک سائنس داں اسے دور کرنے کے لیے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے چلے جاتے ہیں۔ جوں جوں ریسرچ کرنے والے مرض کے متعلق زیادہ معلومات حاصل کرتے ہیں توں توں نئے نئے مسائل اور سوالات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس مرض کا اصل سبب HIV وائرس کو ٹھہرایا گیا، جو خوردبین کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر نئے نئے گل کھلاتا ہے۔ ادویات اور ویکسینوں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ HIV وائرس کیسے انسانی جسم کے اندر موجود مدافعت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اب تو سائنس دان بھی شک کرنے لگے ہیں کہ کہیں پس آئینہ کوئی اور محرک تو نہیں؟

ایمسٹرڈیم کانفرنس میں اس وقت حیرانی و پریشانی نے زور پکڑا جب سائنس دانوں نے ایڈز جیسے امراض میں مبتلا ایسے لوگوں کو پیش کیا جن میں HIV وائرس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس خوفناک انکشاف نے ایک اور ہی مسئلہ کھڑا کر دیا کہ دنیا میں نئی قسم کا ایڈز وائرس نمودار ہونے لگا ہے۔ اس پر ایڈز وائرس کے دریافت کنندہ ڈاکٹر لوک مونٹیگنر نے بیان دیا کہ ایسے مرض بھی اسی وائرس کا شاخسانہ ہوں گے کانفرنس ہال میں کوئی بھی اچھی خبر سننے میں نہیں آئی۔ مگر کانفرنس ہال کے باہر لوگوں کا ہجوم کسی معجزہ کے لیے چیخ و پکار کرتا سنائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر جوناس سالک نے تجویز پیش کی کہ شافی ویکسین تلاش کرنے والوں نے غلط راستہ اختیار کر رکھا ہے۔ ایکٹرلیس الزبیتھ ٹیلر امریکہ . . . . . . پر بہت گرجی برسی کہ اسے تحقیق کے لیے بہت کچھ کرنا چاہیے۔ اس پر امریکی مندوب نے کہا کہ ہم ایسی بلا سے ٹکر لے رہے ہیں جو تیزی سے پھیلتی چلی جا رہی ہے اور ہم جنگ ہارتے چلے جا رہے ہیں۔

جب ایمسٹرڈیم کانفرنس میں نئی قسم کے ایڈز پر بحث چھڑی تو مندوبین حیران و پریشان ہونے لگے۔ کئی نامور ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کے مشاہدے میں ایسے مریض بھی آئے جو ایڈز جیسی علامت رکھتے ہیں مگر ان کے خون میں HIV وائرس دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اس پر بحث چھڑی کہ کیا کسی اور جرثومے نے رسی تڑوالی ہے۔ یا انسانی جسم کے مدافعتی نظام میں گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔ اگر کوئی نیا وائرس نمودار ہو گیا تو لوگوں کو گھبرانا یا انتقال خون سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ ایسے مریض خال خال دیکھنے کو ملتے ہیں اس لیے کانفرنس کو اصل مسئلہ کی طرف توجہ دینی چاہیے کیوں کہ HIV بڑا خوفناک اور ہیبت ناک دشمن ثابت ہوا ہے۔ ویسے بھی ابھی تک تحقیق کنندگان اس

کلامی محلہ، اورنگ آباد۔ ۴۳۱۰۰۱ ۸۲

لودھی جناہ، نئی دہلی

وائرس کے باؤلے پن کا راز پا نہیں سکے اور یہ وائرس انسانی خون کے خلیوں کو بدستور کھاتا چلا جا رہا ہے۔ مگر اس مقام پر ان کو فکر انسانی جواب دینے لگی ہے کہ سالہا سال تک HIV انسانی خلیوں میں چھپ چھپ کر کیوں بیٹھا رہتا ہے پھر یکایک نمودار ہو کر ایڈز کا مرض لاحق کر دیتا ہے، اس مرض کے زور کے کیا اسباب ہیں؟ جب کہ یہ انسانی خلیوں ہی میں پرورش پاتا ہے اور وہیں اس کی افزائش نسل بھی ہوتی ہے۔ اس مقام پر ہماری سوچ جواب دینے لگتی ہے اور یہ خیال آتا ہے کہ سالہا سال تک HIV انسانی خلیوں کے ساتھ چپٹے رہنے میں کیوں خوشی محسوس کرتا ہے اور پھر یکایک ایڈز کا مرض کیوں نمودار ہو جاتا ہے۔ اگر HIV عام سا وائرس ہوتا تو وہ ادویات سے آسانی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا مگر یہ تو بڑا ہی پیچیدہ وائرس ثابت ہوا ہے جو چھپ بھی سکتا ہے اور پھر یکایک نمودار بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے پھٹتے ہوئے بم کی طرح چاروں طرف پھیلنا شروع کر دیا ہے۔ غریبوں کی بستیوں کو اجاڑتا چلا جا رہا ہے خیال ہے کہ اس صدی کے آخر تک ۹۰ فی صد غریب ممالک میں کثرت سے پھیل جائے گا اور اس کا زیادہ شکار عورتیں ہوں گی جن کی شرح اب بھی ۳۹ فی صد تک جا پہنچی ہے اس کے پیدا ہونے والے بچوں پر بہت برے اثرات مرتب ہوں گے۔

اب تک دریافت کردہ ادویات میں سے AZT سب سے زیادہ پراثر سمجھی جاتی تھی۔ مگر وہ بھی مکمل طور پر اس مرض کا علاج نہیں کر سکی۔ آج سے سات آٹھ سال قبل اسے امریکہ میں استعمال میں لایا گیا اس کے اثر سے مریض چند سال مزید زندہ رہ سکتا تھا مگر کچھ عرصہ بعد دوا اثر کرنا چھوڑ دیتی ہے اس کا اثر اب ۱۸ ماہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس کے بعد DDC نام کی دوا مارکیٹ میں پیش کی گئی مگر وہ بھی سو فی صد کامیاب نہیں ہو سکی۔ ان ناکامیوں کے باوجود تحقیق کنندگان درجن بھر ویکسینوں پر تجربات کرتے چلے جا رہے ہیں۔ نتائج پرکھنے کے بعد انھیں مریضوں پر استعمال کر کے دیکھا گیا کہ کیا وہ انسانی جسم کے نظام مدافعت کو مضبوط بنا سکیں گی؟ مگر کوئی مریض اس موذی مرض سے زندہ و سلامت بچ نہ سکا، جس کی وجہ سے صحیح اندازہ لگایا ہی نہ جا سکا۔ اگر تجربات کامیاب رہے تو شاید ایسا ویکسین وجود میں لایا جا سکے جس کے استعمال سے تندرست شخص کو یہ مرض لاحق بھی نہ ہو۔ ایک اور بات نے بھی سائنس دانوں کو حیران و پریشان کیے رکھا کہ یہ مرض ہم جنسی سے کیوں ہوتا ہے؟ یا منشیات کے ٹیکے لگوانے والے اس کی گرفت میں کیوں آتے ہیں؟ دراصل طوائفوں کو یہ مرض لاحق ہو جایا کرتا تھا جس سے دوسرے بھی اس میں مبتلا ہونے لگے۔ منشیات کے عادی جب استعمال شدہ سوئی سے ٹیکہ لگاتے تو وہ بھی اس مرض میں گرفتار ہو جاتے۔

اب امریکہ میں ایک اور ہی بات دیکھنے میں آئی ہے۔ سان فرانسسکو کے ہسپتالوں میں ایڈز کی مریض عورتیں زیادہ تعداد میں آنے لگیں دوسرے ایڈز کے مریضوں میں تپ دق کا زور ہونے لگا جن پر عام دوائیں اثر نہیں کرتیں۔ اس لیے وہ بے چاری عورتیں دوہرے امراض میں گرفتار ہونے لگیں۔ ٹی۔ بی کا بیکٹریا ہوا کے ذریعہ بھی پھیلتا ہے اس لیے تندرست انسان بھی اس کی زد میں آ سکتے ہیں البتہ مضبوط مدافعتی نظام والے اس سے محفوظ رہتے ہیں۔

ایڈز کے دنیا بھر میں تیزی سے پھیلتے چلے جانے پر حکومتوں کو خبردار ہونا چاہیے۔ ویسے بھارت کی حکومت اس پر بہت زیادہ توجہ دے رہی ہے۔ لیکن ہمیں اپنے آس پاس کے غریب ممالک پر بھی دھیان دینا ضروری ہے تاکہ ہمارا دیش اس موذی مرض سے دور ہی رہے۔ بین اقوامی ادارہ نے ایڈز کے متعلق اپنے سالانہ بجٹ میں اضافہ کے بجائے کمی کر دی ہے۔ اگر پڑوسی ممالک اور عالمی ادارہ کی یہی صورت حال رہی تو ۲۰۰۰ء تک ایڈز سب سے بڑی وبا بن کر ابھرے گا جس کے سامنے ۱۹۱۸ء والی انفلوائزا کی وبا ہیچ نظر آئے گی اس نے اب تک دو کروڑ انسانوں کو تہہ تیغ کر ڈالا ہے۔

دیہات میں بجلی پہنچانے کا پروگرام

مرکز جلد ہی ایک سروے کے ذریعے دیہی علاقوں میں بجلی کی ضروریات کا اندازہ کرے گا۔ اس سے قبل سنٹرل الیکٹریسٹی اتھارٹی نے قومی سطح پر بجلی کی ضروریات کا اندازہ لگایا تھا اور مارچ ۱۹۹۱ء میں چودھویں رپورٹ شائع کی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۶۳۴۸۵ ایم کے ڈبلیو ایچ بجلی پمپ سیٹوں اور ٹیوب ویلوں کے لیے درکار تھی اور ۲۰۷۵ ایم کے ڈبلیو ایچ بجلی لفٹ آب پاشی کے لیے درکار تھی۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں دیہات میں بجلی پہنچانے کے پروگرام کے لیے کل ۹۔ ارب ۹۶ کروڑ ۹۶ لاکھ روپے دیے گئے جن میں سے پبلک سیکٹر کے تحت دیہات میں بجلی پہنچانے والی کارپوریشن کے لیے ۶۔ ارب ۴۵ کروڑ ۸۵ لاکھ روپے مختص کیے گئے۔ باقی رقم ریاستی حکومتوں کو دی گئی۔ ملک میں ابھی ۸۴۷۵۰ دیہات میں بجلی پہنچانی باقی ہے۔

آٹھویں پنج سالہ منصوبے میں ۵۰ ہزار دیہات کو بجلی پہنچانی ہے۔ ان میں سے دس ہزار گاؤں دور دراز فاصلوں پر ہیں، جنھیں توانائی کے غیر روایتی ذرائع سے فائدہ پہنچایا جائے گا۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۴۲۴۰ دیہات میں بجلی پہنچانے کا نشانہ رکھا گیا تھا جب کہ ۳۶۶۹ دیہات میں بجلی پہنچائی گئی تھی۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۳۲۱۰ دیہات میں بجلی پہنچانی تھی جب کہ ۳۳۵۲ دیہات میں بجلی پہنچائی گئی۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۲۸۹۷ دیہات میں بجلی پہنچانی تھی جب کہ ۲۹۲۴ دیہات میں بجلی پہنچائی گئی۔

کلیم اللہ

ایک مہلک رسم: جہیز

انسانی ضرورتوں میں جنسی خواہش انسان کی ایک اہم ضرورت ہے اور ایک عمر کے بعد اس فطری خواہش کی تکمیل ناگزیر ہو جاتی ہے۔ شادی کی رسم کا جنم اسی جنسی خواہش کے سبب ہوا۔ ایسے جنسی تعلقات اور اس کے نتائج میں پیدا شدہ اولاد کو جائز قرار دیا جاتا ہے۔ اس رسم کا دنیا کے بیشتر مذاہب میں ذکر ملتا ہے جو زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک قائم ہے۔

دنیا کے قدیم مذہب ہندو دھرم کے مطابق انسانی زندگی کے دھرم، ارتھ، کام اور موکچھ چار مقاصد ہیں۔ تعلیم میں کامل ہونے کے بعد انسان عورت سے شادی کر کے "کام" (جنسی خواہش) کی تکمیل کرتا ہے۔ شادی کی تمام رسومات سپت پدی (SAPT PADI) (سات پھیرے) کے بعد مکمل ہوتی ہیں۔ اس اٹوٹ رشتے کو زندگی کی سنگلاخ راہوں کے کسی بھی موڑ پر توڑا نہیں جا سکتا ـــــ مطابق اس مذہب کے انسان جنسی ضروریات کی تکمیل کرنے کے ساتھ ساتھ اولاد کو جنم دے کر پتر رن (पितृ ऋण) سے بری ہوتا ہے۔ عورت کے بغیر انسانی زندگی کا تصور ادھورا ہے اسی لیے ہندو مذہب میں بیوی کو اردھانگنی سے منسوب کیا جاتا ہے، جس کی شرکت کے بغیر مذہب کی متعدد رسومات ادا ہی نہیں کی جا سکتی ہیں۔

اسلامی قوانین میں بھی شادی کو ایک اہم فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ پیارے رسولؐ نے اپنے اتباعیوں کو تجرد (CELIBACY) کی اجازت نہیں دی ہے۔ اسلام کے مطابق بیوی جو اولاد کو جنم دیتی ہے، سماج کی پاسبانی کا بیڑا اٹھاتی ہے، کا مرتبہ بہت ہی عظیم اور بلند ہے۔ مزید یہ کہا گیا ہے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ اس سے مذہب اسلام میں عورت کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

باوجود ان تمام مفادات و اہمیت کے عورت کا استحصال زمانۂ قدیم سے پدرانہ سوسائٹی (PATRIARCHIAL SOCIETY) کا شیوہ رہا ہے۔ اسے ہمیشہ جنسی تلذذ کی شے تصور کیا گیا۔ اگر زمانۂ قدیم میں کنیزوں کے طور پر ان کا جنسی استحصال کیا گیا تو دور جدید میں بھی اسی جنسی استحصال کے لیے ہر گلی اور کوچے میں طوائفوں کی بستیاں آباد کر دی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں "امتیازی سلوک" جہیز اور اس کے نتائج میں خودکشی اور نذر آتش کرنا وغیرہ جدید سماج میں عورتوں کے سنگین مسائل ہیں۔

جہیز رسم کا وجود بھی شادی کی پاک و صاف رسم کے ساتھ ہی ہوا تھا۔ ابتدا میں اس کی نوعیت مختلف تھی۔ اس وقت شادی کے موقع پر دی گئی اشیاء و رقوم کو تحفہ کے طور پر قبول کیا جاتا تھا۔ مذہب اسلام میں شادی سے متعلق مہر کی روایت ہے جو بیویوں کی حفاظت کی ضمانت کے طور پر شوہر کو ادا کرنی ہوتی ہے۔ اس عمل کے پس پردہ صرف ایک ہی مقصد پوشیدہ تھا وہ یہ کہ شادی کے بعد میاں اور بیوی ایک نیا گھر بساتے ہیں یا بسانے کے ابتدائی مراحل میں داخل ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں بہت سی پریشانیاں پیدا ہوتی ہیں۔ انھیں دشواریوں و پریشانیوں کو کم کرنے کی خاطر یہ سہولت فراہم کی گئی تھی اس کے باعث نہ تو لڑکی کے والدین پر کوئی بوجھ ہوتا تھا اور نہ ہی لڑکی کا تولد کسر شان سمجھا جاتا تھا۔

مگر زمانے نے رخ بدلا۔ آسمان نے تیور دکھائے اور اس رسم نے نیا رنگ روپ اختیار کیا۔ جس کے نتیجے میں متناسب سماجی ڈھانچہ لڑکھڑایا۔ یکسانیت و مساوات پر مبنی ازدواجی زندگی کے سماجی رشتے میں دراڑیں پڑیں اور تو اور شادی جس کے ذریعہ دو دلوں کو جوڑا جاتا ہے، دو روحوں کا ملن کروایا جاتا ہے اور ایک دوسرے کا غم غلط کرنے کی قسمیں کھلائی جاتی ہیں، کا حسین خواب اس کے باعث شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

جہیز کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے اس لیے اس کی متعدد تعریفیں و تشریحات کی گئیں ہیں۔ "برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا" کے مطابق وہ ساز و سامان جو ایک بیوی شادی کے موقع پر اپنے شوہر کے گھر لاتی ہے، جہیز ہے۔

(DOWRY: THE PROPERTY THAT WIFE BRINGS TO HER HUSBAND ON MARRIAGE)

فیروز اللغات میں بھی مفاہیم میں یکسانیت ہوتے ہوئے الفاظ کی رد و بدل کے ساتھ اس کا ذکر اس طرح سے کیا گیا ہے۔

جہیز "وہ سامان جو بیٹی کی شادی میں ماں باپ کی طرف سے دیا جائے" تاہم تاریخی و سماجی عوامل کے تحت الفاظ کے معنی و مطالب بدل جاتے ہیں اس لیے موجودہ زمانہ کے تناظر میں اگر یہ کہا جائے کہ شادی کے عین وقت یا اس سے قبل یا بعد

۲۳۲۔ ستلج ہوسٹل۔ جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی، ۶۷

یوجنا، نئی دہلی

دونوں فریقین میں سے کسی ایک کے ذریعہ شادی کے عوض میں زبردستی وصول کی گئی رقوم واشیاء یا اس کا مطالبہ ہی جہیز ہے تو غلط نہ ہوگا۔

چوں کہ اس رسم کے باعث ملک میں سماجی بدعنوانیاں پیدا ہو رہی تھیں اسی لیے حکومت ہند نے اس رسم کے انسداد کے لیے ۱۹۶۱ء میں جہیز امتناع قانون (DOWRY PROHIBITION ACT) وضع کیا جس میں اس کی تعریف وتشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

جہیز کا مطلب کسی قسم کی جائداد یا قیمتی اشیاء جو سیکورٹی کے طور پر شادی کے کسی فریق یا فریقین میں سے کسی کے والدین یا کسی دوسرے شخص کے ذریعہ براہ راست یا بالواسطہ طور سے شادی کے موقع پر یا اس سے قبل یا بعد کبھی بھی دینا یا دینے کا وعدہ کرنا ہوتا ہے۔

(THE DOWRY MEANS ANY PROPERTY OR VALUABLE SECURITY GIVEN OR AGREED TOBE GIVEN DIRECTLY OR INDIRECTLY BY ONE PARTY TO THE MARRIAGE TO THE OTHER PARTY TO MARRIAGE OR BY PARENTS OF EITHER PARTY TO THE MARRIAGE OR BYANY PERSON TO EITHER PARTY TO THE MARRIAGE OR TO ANY OTHER PERSON AT OR BEFORE OR ANY TIME AFTER THE MARRIAGE.)

اس قانون کے تحت جہیز میں ملوث افراد پر زیادہ سے زیادہ چھ ماہ مدت کی قید یا ۵ ہزار روپیہ تک کا جرمانہ یا دونوں عائد ہوتے ہیں۔ لیکن جب اس قانون کے ذریعہ کوئی نمایاں اصلاح نہ ہوئی تو حکومت ہند نے اس جانب سخت اقدام اٹھاتے اور ۱۹۸۶ء میں اس سے متعلق ایک ترمیمی قانون وضع کیا، جس کے ذریعہ جہیز کی تعریف وتشریح کے دائرے کو وسیع کیا گیا۔ اس کے تحت جہیز لینے و دینے والے ملزمان پر کم از کم ۵ برس کی قید اور ۱۵ ہزار روپیہ کا جرمانہ یا جہیز کی کل رقم ادا کرنے کی دفعہ عائد ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جہیز کے متقاضی پر کم از کم ۶ ماہ کی قید بھی ہو سکتی ہے۔

تاہم جن تاریخی، سماجی، اقتصادی و مذہبی عوامل میں اس کا وجود ہوا تھا وہ صورت حال اب بھی موجود ہے اسی لیے حکومت ہند کی طرف سے سخت سے سخت قوانین کے باوجود اس ایذا رساں رسم کو ختم نہیں کیا جا سکا۔

اس مہلک رسم کی وجہ سے سماج کی بے شمار نئی نویلی دلہنوں کو اپنے شوہر کے گھر جہنم کی زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ اپنی ایثار و قربانی کے باوجود بھی وہ سسرال والوں کا دل نہیں جیت پاتی۔ گھر ہوتے ہوئے بھی پرایوں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اسے جسمانی ونفسیاتی طور سے پریشان کیا جاتا ہے اور حد تو یہ ہے کہ جہیز کی کمی کی پاداش میں وقتاً فوقتاً انھیں نذر آتش کر دیا جاتا ہے۔ انسانیت سوز یہ بے رحمی آج بھی ہمارے سماج کی ایک حقیقت ہے۔ یہ برائی صرف سماج کے امیر یا متوسط طبقے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ سماج کا نچلا طبقہ بھی اپنے اونچے طبقے کی نقل میں اپنی بہنوں ولڑکیوں کے جہیز کے لیے قرض کی زنجیروں میں جکڑ جاتا ہے اور ہمیشہ ہمیش مقروض رہتے ہوتے بے بضاعت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ موت ہی اسے اس رذالت کی زندگی سے نجات دلواتی ہے۔

جہیز کے نتائج میں عورتوں کی اموات میں دن بہ دن اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ ثبوت کے لیے مندرجہ ذیل گوشوارے پیش ہیں۔

گوشوارے

سنہ	جہیز سے متعلق اموات
۱۹۹۰ء	۴۸۳۶
۱۹۹۱ء	۵۱۵۷
۱۹۹۲ء	۴۹۶۲
۱۹۹۳ء	۸۰۹
۱۹۹۴ء	۱۳۲۶

گوشوارہ (ریاستوں میں تناسب)

	ریاستوں میں جہیز سے متعلق اموات	۱۹۹۰ء	۱۹۹۱ء	۱۹۹۲ء
۱.	آندھرا پردیش	۳۴۴	۴۱۱	۴۲۴
۲.	اروناچل پردیش	۰	۰	۱
۳.	آسام	۳۴	۱۴	۱۱
۴.	بہار	۲۴۳	۲۶۳	۱۷۰
۵.	گوا	-	۰	۱
۶.	گجرات	۱۳۵	۱۰۳	۱۲۳
۷.	ہریانہ	۱۲۶	۱۴۴	۲۰۹
۸.	ہماچل پردیش	۲۱	۳۰	۱۸
۹.	جموں وکشمیر	۸	۹	۳۰
۱۰.	کرناٹک	۲۱۶	۲۲۷	۲۰۹
۱۱.	کیرالا	۱۱	۱۳	۱۸
۱۲.	مدھیہ پردیش	۳۹۷	۴۲۳	۳۵۳
۱۳.	مہاراشٹر	۸۵۸	۸۲۸	۷۲۷
۱۴.	منی پور	۱	۰	۰
۱۵.	میگھالیہ	۰	۰	۲
۱۶	میزورم	۰	۰	۰
۱۷	اڑیسہ	۶۴	۶۳	۱۰۲

۱۸.	پنجاب	۱۰۳	۹۹	۱۰۱
۱۹.	راجستھان	۱۶۶	۱۵۲	۲۵۰
۲۰.	سکم	۰	۰	۰
۲۱	تامل ناڈو	۸۶	۹۷	۷۵
۲۲.	ناگالینڈ	۰	۰	۰
۲۳.	تری پورہ	۵	۷	۳
۲۴.	اترپردیش	۱۵۱۶	۱۵۹۷	۱۷۸۳
۲۵.	مغربی بنگال	۶۲۰	۵۳۸	۱۷۴
..	یونین ٹیریٹریز			
۲۶.	جزائر انڈمان و نیکو بار	۰	۰	۰
۲۷.	چنڈی گڑھ	۰	۲	۱
۲۸.	وادرونگر حویلی	۰	۰	۰
۲۹.	دمن اور دیو	۰	۰	۰
۳۰.	دہلی	۱۰۲	۱۳۳	۱۲۱
۳۱	لکش دویپ	۰	۰	۰
۳۲	پانڈیچری	۰	۴	۲

حوالہ: کرائم ان انڈیا۔ ۱۹۹۲ء

اگران چارٹوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ یوپی، مہاراشٹر، آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش اور بہار میں جہیز کے معاملے میں ہلاک شدگان کا تناسب دوسری ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ دہلی جو یونین ٹیریٹریز کے تحت ہے اس بابت سرفہرست ہے۔

تاریخ اس بات کی نظیر ہے کہ کسی بھی سماجی برائی کو صرف قوانین کے ذریعہ ختم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جہیز جیسی لعنت آمیز برائی کو سماج سے مٹانے کے لیے ہمہ جہت کوشش کی اشد ضرورت ہے بغیر اس کے اس کو کالعدم کرنا ناممکن ہے۔ اس جہت میں چند آرا پیش ہیں جو اس مسئلے کو حل کرنے میں مدد و معاون ہوسکتی ہیں۔

(۱) سب سے پہلے اس برائی کے اس پس منظر کو تلاش کرنا ہوگا جس میں اس کا جنم ہوا اور جن سماجی عوامل کے تحت پرورش و پرداخت پاکر اس مقام

باقی ص۵۹ پر

حاجی شمس الدین

ہماری شخصیت اور اندازِ فکر

ہر انسان کی شخصیت اس کی نشو ونما اور ماحول کے مطابق بنتی اور بگڑتی ہے۔ اگر انسان کی پرورش اچھے ماحول میں ہوئی ہے تو لازماً اس کا اثر اس کی شخصیت پر پڑے گا اور اس کی شخصیت کے مطابق ہی اس کا اندازِ فکر بھی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شخصیت اور اندازِ فکر میں چولی دامن کا رشتہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے' اس کے مطابق ہی اس کا اندازِ فکر ہوگا اور پھر اس کا طرزِ عمل بھی ویسا ہی ہوگا۔

زندگی کیا ہے؟ اس سلسلہ میں لوگوں کے اپنے اپنے خیالات ہیں۔ کوئی اسے پانی کا بلبلہ کہتا ہے تو کوئی ایک رنگین خواب، کوئی اسے پھولوں کی سیج سمجھتا ہے تو کوئی کانٹوں کا بچھونا۔ خیر زندگی جو بھی ہو، سوال یہ ہے کہ اسے کیسے جیا جائے؟ یوں تو زندگی سبھی جیتے ہیں۔ ایک وہ بھی جیتا ہے جس کے پاس افراطِ دولت ہوتی ہے لیکن جو کروٹیں بدل بدل کر راتیں گزار دیتا ہے اور ایک پل بھی چین کی نیند نہیں سو پاتا۔ اور ایک وہ جیتا ہے جس کے پاس کوئی دھن دولت نہیں۔ جو دن بھر کڑی محنت کر کے روزی کماتا ہے اور شام کو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سوکھی روٹیاں چبا کر چین اور بے فکری کی نیند سو جاتا ہے۔ ایک وہ بھی جیتا ہے جو ذرا سی مصیبت آنے پر گھبرا جاتا ہے۔ ضرورت کی تمام چیزیں پاس ہونے پر بھی اسے اطمینان نہیں ہوتا۔ جو اس کے پاس نہیں ہے اس کے لیے اپنی قسمت کو کوستا ہے اور رو رو کر اپنی زندگی گزار دیتا ہے اور ایک وہ بھی جیتا ہے جو مشکلات میں بھی سدا مسکراتا ہی رہتا ہے اور مصیبتوں کے طوفان آنے پر ان کا بہادری سے مقابلہ کرتا ہے۔ جو کچھ اس کے پاس ہے، اسی میں سکون اور چین کی سانس لیتا ہے۔ جو نہیں ہے اس کے لیے روتا نہیں۔ یہ ہیں ہماری شخصیت اور اندازِ فکر کی چند تصویریں۔

حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ تمام انسان ایک جیسی زندگی نہیں پاتے۔ کوئی عیش وآرام میں پیدا ہوتا ہے تو کوئی غریبی میں۔ کسی کی زندگی سدا بہاروں میں گزرتی ہے تو کسی پر سدا خزاں ہی چھائی رہتی ہے۔ کوئی کچھ نہ کر کے بھی سب کچھ پا جاتا ہے تو کسی کے لاکھ کوششیں کرنے پر بھی اسے سوکھی روٹیاں تک نصیب نہیں ہوتیں۔ یہ فرق تو زمانہ سے چلا آ رہا ہے اور چلتا رہے گا کیوں کہ ہماری زندگی ہماری شخصیت اور اندازِ فکر کے مطابق ہی ہوگی۔ سوال یہ نہیں ہے کہ سب کی زندگی ایک جیسی ہو بلکہ یہ کہ جو جس حالت میں ہے اسی میں اپنی زندگی کو ایسے سانچے میں ڈھالے کہ اس کی زندگی خوشحالی میں گزرے اور وہ جس مقصد سے اس دنیا میں آیا ہے اسے پورا کر سکے۔ اس میں کامیابی ہماری شخصیت اور اندازِ فکر پر ہی منحصر ہوگی اور اس کے لیے ہر شخص کو جینے کے سلیقہ سے واقف ہونا ضروری ہوگا۔

جینے کا سلیقہ تو بڑے بزرگ اور تجربہ کار ہی بتا سکتے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں کچھ زیادہ کہنے کا حقدار تو نہیں پھر بھی میں نے اپنی زندگی میں جو کچھ پڑھا۔ سنا۔ دیکھا اور سمجھا ہے، اس بنا پر اپنے اندازِ فکر کے مطابق کچھ کہنا چاہوں گا۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ زندگی بڑی قیمتی ہے۔ یہ خدا کی امانت ہے جو ہمیں دی گئی ہے اور اسے بگاڑنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ ہماری زندگی کا کوئی مقصد ہے جسے پورا کرنا ہمارا فرضِ اولین ہے۔ خدا نے ہمیں اپنے ڈھنگ سے بنایا ہے اور اسی لیے وہ جو کچھ ہمارے ساتھ کرتا ہے وہی ہمیں دنیا میں دوسروں کے لیے کرنا چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب کے ساتھ سچائی اور ایمانداری سے پیش آنا چاہیے۔ سب کو یکساں نظر سے دیکھنا اور دوسروں کے دکھ درد کو کم کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہم صرف اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے جئیں۔ اسی میں ہم صحیح سکون اور اطمینان کا احساس کر سکتے ہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ زندگی پانی کا ایک بلبلہ ہے جو ایک لمحہ میں برباد ہو جائے گا یا زندگی ایک سنہری خواب ہے جو دیکھنے میں دلکش لگتا ہے لیکن حقیقت میں ایک کڑوا گھونٹ ہے۔ ایسے لوگ اتنی قیمتی اور خوب صورت زندگی کو بلاوجہ مایوسی میں گنوا دیتے ہیں۔ جب وہ یہ جانتے ہیں کہ زندگی بہت مختصر ہے اور کوئی یقین نہیں وہ کب ختم ہو جائے تب تو ان کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیں۔ اس قیمتی زندگی کا جلد سے جلد صحیح استعمال کریں۔ رونے سے زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ ہنسنے سے اس میں لطف آ جاتا ہے۔ رونے والے کے پاس کوئی نہیں جاتا۔ ہنسنے والے کے بہت سے ساتھی بن جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہماری شخصیت اور اندازِ فکر کا ہی نتیجہ ہے۔ تو پھر ہم

۱۵۰/۲- بیج ناتھ پورہ، رائے پور- ۴۹۲۰۰۱

رونے کی بجائے ہنس کر ہی زندگی کیوں نہ گزاریں۔ یہ تو ہماری شخصیت اور اندازِ فکر پر منحصر ہے کہ ہم اپنی زندگی کس طرح گزاریں۔ ہم چاہیں تو اسے اچھی طرح گزار سکتے ہیں یا اسے رو رو کر گنوا سکتے ہیں۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

کچھ لوگ زندگی کی مشکلات کو بڑھا چڑھا کر بتاتے ہیں اور اسی غم میں سدا مایوس رہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں کچھ تو کل آنے والے مصائب کے بارے میں سوچ سوچ کر آج کی خوشی بھی ختم کر دیتے ہیں۔ یہ بھی ہماری شخصیت اور اندازِ فکر کی ایک پرچھائیں ہے۔ ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ رات کی سیاہی سے ہی دن کی روشنی کی قدر ہوتی ہے۔ گرمی کی تپتی دھوپ سے ہی درخت کے سائے کا احساس ہوتا ہے مشکلات کے بعد ہی آسانیوں کی قیمت معلوم ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو اس شاعر سے ہمت اور سبق لینا چاہیے جو کہتا ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

واقعی اگر زندگی کا راستہ سیدھا سیدھا ہو۔ اس میں کوئی اتار چڑھاؤ نہ ہو تو زندگی کا مزہ ہی کیا؟ جس نے کبھی شکست نہ کھائی ہو اس کے لیے فتح کا مطلب ہی کیا۔ جس نے کبھی بھوک کی جوالا نہ سہی ہو اس کے لیے لذیذ کھانوں کا مزا ہی کیا۔ سدا سونے کے پالنے میں جھولنے والا انسان، اس آرام سے بھی تنگ ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی بدمزہ ہو جاتی ہے۔ کانٹوں میں کھلنے والے گلوں کی زندگی میں جو مزہ ہے وہ آسانیوں میں رہنے والے کیا سمجھیں؟ اور پھر حقیقت تو یہ ہے کہ مصیبتیں، تکالیف اور غم ہی تو ہمیں زندگی کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیتے ہیں۔ بھوک سہہ کر ہی ہم دوسروں کی بھوک سمجھ سکتے ہیں۔ تکالیف سہہ کر ہی ہم دوسروں کے مصائب کا احساس کر سکتے ہیں اور ان کی مدد کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ حقیقت میں یہ غم اور مصیبتیں ہی ہیں جو ہمیں زندگی کا صحیح سبق پڑھاتی ہیں اور اسی لیے ہمیں انھیں ہمیشہ خوش آمدید کہنا چاہیے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

اے غمِ زندگی سلام تجھے
مجھ کو جینا سکھا دیا تو نے

یہ تمام باتیں بھی ہماری شخصیت اور اندازِ فکر کے ہی نتائج ہیں۔ ہم چاہیں تو کئی طریقوں سے اپنی زندگی کو خوشحال بنا سکتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم کچھ اچھے دوست بنا لیں۔ ایسے دوست جو وقت پر ہمارے کام آ سکیں۔ جن سے ہم اپنا دکھ سکھ کہہ سکیں یا ضرورت پڑنے پر ان سے صلاح مشورہ کر سکیں تو ہماری زندگی اچھی طرح گزر سکتی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے دیکھا کہ شاذ و نادر ہی ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں جنھیں اچھے دوست یا ساتھی مل جائیں ورنہ زیادہ تر لوگ اس میں بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ کبھی کبھی دوست اچھے نہ ہونے سے بھی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ اس لیے دوستوں کا انتخاب کرتے وقت ہمیں بڑی احتیاط برتنی چاہیے۔ دوست ہر عمر اور ہر زمانہ کے ہوتے ہیں۔ یہ بہت ہی عقلمند اور تجربہ کار ہوتے ہیں۔ ہر مشکل یہ آسان کرتے ہیں۔ ہر شک و شبہہ کا حل یہ پیش کرتے ہیں۔ یہ کبھی پریشان نہیں کرتے یہ دوست ہیں اچھی کتابیں۔ میں نے اپنی زندگی میں سچی خوشی اور حقیقی سکون ان ہی کی صحبت میں حاصل کیا ہے۔ اس لیے ہر انسان کو بہترین کتابوں کی شکل ہی میں عمدہ دوست بنا کر رکھنا چاہیے۔

اسی طرح ہر انسان کو اپنی پسند کے کسی نہ کسی کام میں دلچسپی رکھنا چاہیے۔ اسی میں وہ اپنی زندگی کی کٹھنائیوں اور غموں کو بھول کر کچھ وقت تو خوشی اور بے فکری میں گزار لیتا ہے۔

ہماری شخصیت اور اندازِ فکر کا نتیجہ اچھا اخلاق اور خوش مزاجی بھی ہو سکتا ہے جو زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ کوئی ہمارے ساتھ کیسا بھی سلوک کرے اور ہم سے کتنی ہی بری طرح پیش آئے لیکن ہم اپنے خلوص اور اخلاق کو اس کے ساتھ بھی نہ بدلیں اور اس کے ساتھ بھی خوش مزاج رہیں تو ایک دن وہ برا آدمی بھی بدل جائے گا۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے۔ ؎

خوش مزاجی سا زمانہ میں کوئی جادو نہیں
ہنس کے ملنا رام کر لیتا ہے ہر انسان کو

سچ پوچھا جائے تو یہ دنیا ایک آئینہ ہے۔ اس کی طرف ہم جس طرح دیکھیں گے۔ ہمارا عکس اس میں ویسا ہی دکھائی دے گا۔ اگر ہم اس کی طرف غصہ اور نفرت سے دیکھیں گے تو بدلے میں ہمیں غصہ اور نفرت ہی دیکھنے کو ملے گا اور اگر ہم اس کی طرف خلوص و محبت سے دیکھیں گے تو بدلے میں ہمیں بھی خلوص و محبت ہی ملے گا۔ اسی لیے اس دنیا میں سب کے ساتھ خلوص و محبت اور بھائی چارہ کا سلوک ہی ہماری شخصیت کا اندازِ فکر ہونا چاہیے جو دنیا میں واقعی کامیابی کا راز ہے۔ ●

اقلیتوں کے لیے بہتر کوچنگ

انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے وزیر شری مادھو راؤ سندھیا نے ایک کمیٹی تشکیل دی ہے جو مقابلہ جاتی امتحانات کے سلسلے میں اقلیتوں کے لیے کوچنگ کلاسوں کے بارے میں یو جی سی اسکیم کو مستحکم بنانے پر غور کرے گی۔ یہ قدم ان تفصیلی تبادلۂ خیالات کے بعد اٹھایا گیا ہے جو شری سندھیا نے اس سلسلے میں ملک بھر کے سرکردہ اقلیتی ماہرینِ تعلیم اور دانشوروں کے ساتھ کیے تھے۔ کمیٹی کے اراکین میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر بشیر الدین، مشہور ماہرِ تعلیم سید حامد، گورکھپور یونیورسٹی کے ڈاکٹر عزیز احمد، بمبئی یونیورسٹی کے پروفیسر نواز مودی، پٹنہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر ایم او صدیقی اور کالی کٹ یونیورسٹی وائس چانسلر پروفیسر اے اینے پی عمر کٹی شامل ہیں۔ یہ کمیٹی کوچنگ کلاسوں کو بہتر بنانے کے لیے کیے جانے والے اقدامات کے بارے میں اپنی سفارشات جلد ہی پیش کر دے گی۔

مذکورہ میٹنگ میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا تھا کہ دیگر ریاستوں کے ساتھ ساتھ اتر پردیش، بہار اور مدھیہ پردیش کے پسماندہ علاقوں میں خاتون اساتذہ کی نگرانی میں اقلیتی خواتین کے لیے خصوصی کوچنگ کلاسوں کا اہتمام کیا جائے گا۔ ●

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

اردو فکشن کی تنقید۔ آغاز و ارتقا

اردو میں افسانوی ادب کی اصطلاح انگریزی لفظ FICTION کے مترادف ہے۔ بلکہ کثرت استعمال سے لفظ FICTION جوں کا توں اردو میں رائج ہو چکا ہے۔ لفظ فکشن یا افسانوی ادب اپنے آپ میں کافی وسعت رکھتا ہے۔ اسی لیے مختلف مکاتبِ فکر کے نزدیک اس کے مفہوم میں کہیں کم کہیں زیادہ فرق ہے۔

فکشن ـــــ ایسی ہر تحریر جس میں کسی واقعہ، کہانی یا افسانے کو بیان کیا جائے، فکشن کے زمرے میں آئے گی۔ اسی لیے اس کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں حکایت بھی شامل ہے اور تمثیل بھی۔ داستان، ناول اور افسانہ (طویل یا مختصر) بھی، ناولٹ بھی اور ڈرامے بھی۔ یہاں تک کہ منظوم داستانیں بھی اور ایسی مثنویاں بھی جن میں قصہ پن کا عنصر ملتا ہے۔

جب کلیم الدین احمد نے "اردو تنقید پر ایک نظر" ڈالی تو تنقید کا جو سرمایہ سامنے آیا، وہ تقریباً سارے کا سارا "اردو شاعری" سے متعلق تھا اور آج بھی نثر سے زیادہ شاعری کی تنقید لکھی جا رہی ہے ـــــ اس لحاظ سے یہ کام اور بھی زیادہ نیا اور دشوار ہے۔ ظاہر ہے، جب اردو نثر کی تنقید ہی عنقا ہونے کی حد تک کم ہے تو اس کے "جزو" یعنی نثری افسانوی ادب کی تنقید کی تلاش اور تحقیق مزید مشکل کام ہے۔

اردو شاعری کی تنقید تو مشاعرے میں سامنے کی داد و اصلاح، اردو تذکرے سے لے کر حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" تک میں مل جاتی ہے۔ لیکن اردو نثر کی تنقید کے سلسلے میں خاموشی نظر آتی ہے۔

کچھ تلاش اور جستجو کے بعد یحییٰ کی "سیر المصنفین"، پروفیسر حامد حسن قادری کی "داستانِ تاریخ اردو" اور سید محمد کی "ارباب نثر اردو" میں اردو نثر پاروں پر تنقیدی اشارے سے مل جاتے ہیں۔ یہ یہ اردو نثر نگاروں کے تذکرے یا اردو نثر کے ارتقا کی تاریخ ہیں۔ افسانوی ادب کی تنقید کے نقوش ان میں بھی نہیں ملتے۔ آخر اردو میں افسانوی ادب کی تنقید کب سے شروع ہوئی؟ کس نے آغاز کیا؟ اس کا ارتقا کیوں کر ہوا؟ دورِ قدیم او متوسط میں یہ کن منازل و مراحل سے گزری اور اس کا معیار کیا تھا؟ حال یا جدید ادب میں اس کی صورتِ حال کیا ہے۔ اس مقالے میں انھیں سوالوں کے جوابات ڈھونڈنے کی سعی کی گئی ہے۔

اردو فکشن کی تنقید کی تلاش سے قبل یہ عقدہ حل کرنا زیادہ ضروری ہے کہ اردو فکشن کی ابتدا کب سے ہوئی؟ اس لیے کہ جب سے اردو فکشن کا آغاز ہوا ہوگا، اس کی تنقید کا نقطۂ آغاز بھی اسی کے آس پاس ہوگا کہ تنقید، تخلیق کے بطن سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

قصہ گوئی کوئی نیا فن نہیں۔ قصے تہذیبی قدروں کے ساتھ ساتھ چلتے اور پنپتے ہیں۔ ان کا ارتقا بھی تہذیبِ انسانی کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ چناں چہ فن قصہ گوئی اتنا ہی قدیم ہے، جتنی خود انسانی تہذیب۔

اردو زبان کا قدیم سرمایۂ داستان دوسری زبان سے ترجمے پر مشتمل ہے۔ بہ نظرِ غائر ان قصوں کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ اردو میں رانی کیتکی اور کنور اودے بھان از سید انشاء اللہ خاں (۱۸۰۳ء)، فسانۂ عجائب از مرزا رجب علی بیگ سرور (۱۸۲۴ء)، سروش سخن از فخر الدین حسین سخن (۱۸۶۰ء) اور طلسم حیرت از جعفر علی شیون کاکوروی (۱۸۷۲ء) ہی ایسی داستانیں ہیں جنھیں طبع زاد کہا جا سکتا ہے، ورنہ اردو کی دوسری تمام کہانیوں کا ماخذ سنسکرت، عربی اور فارسی کے قصے ہیں۔

اردو زبان و ادب کی ابتدا اور ارتقا میں سرزمین دکن اور اہلِ دکن کا بڑا ہاتھ رہا ہے ـــ چناں چہ نثری قصوں کی ابتدا کا سراغ بھی یہیں ملتا ہے۔ ملا وجہی کی "سب رس" (۱۶۳۵ء) دکن کی ہی نہیں، اردو کی اولین قدیم نثری کہانی ہے۔ دکنی زبان کے نثری افسانے کی جتنی کتابیں اب تک دریافت ہوئی ہیں، ان میں سب رس قدیم ترین ہے۔ یہ ایک تمثیلی قصہ ہے۔ اس میں حسن اور عشق کی کشمکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

افسانوی ادب میں تمثیلی قصوں کی بھی شمولیت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں سب رس کا دیباچہ جسے خود ملا وجہی نے لکھا ہے قابل توجہ ہے۔ ۱۶۳۵ء کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:

"اس کتاب کا ناؤں سب رس
سب کو پڑھنے آوے ہوس، بول بول
کوں چڑھے اُمس... کیا عورت کیا مرد،
جس میں کچھ عشق کا درد، اس کتاب کوں
سینے پرتی ہلاسی نا، اس کتاب بغیر کوئی
وقت اپنا کھلاسی نا"

یا ● ..." جیتے چترساراں، جیتے فہم داراں،

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

جیتے گن کاراں ہوئے سن آج لگن کوئی
اس جہاں میں، ہندوستان میں، ہندی
زبان سوں، اس لطافت اس چھنداں
سوں نظم ہور نثر ملاکر گلاکر یوں نئیں
بولیاں۔"

ملا وجہی قصّہ کے تمثیلی اسلوب پر زور دیتا ہے اور قصہ میں زبان کی سلاست اور فصاحت کی گفتگو کرتا ہے۔

سب رس کے بعد ۱۷۷۵ء کی تصنیف "نوطرز مرصع" ملتی ہے۔

تحسین نے بھی قصّہ لکھنے کا مقصد یہی بتایا ہے جو کوئی صحیح زبان لکھنا اور بولنا چاہے وہ اس کا مطالعہ کرے۔

عجائب القصص جو ۹۳-۱۷۹۲ء کی تصنیف ہے اور ایک بادشاہ کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

سترہویں صدی عیسوی (۱۷۰۰-۱۶۰۱ء) سے اٹھارہویں صدی عیسوی (۱۸۰۰-۱۷۰۱ء) تک کی اس مدت میں یوں تو ان کے علاوہ اور بھی نثری تصانیف ملتی ہیں لیکن مذکورہ بالا تصانیف میں شامل "دیباچوں میں" کچھ تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔ ان میں داستان یا قصہ سے متعلق کوئی بات نہیں۔ اگر کچھ ہے تو زبان یا اسلوب یا طرز تحریر کے سلسلے میں یہ دعویٰ کہ "ہرگز کوئی فصیح اس فصاحت سوں بات نئیں کیا" یا "آگے اسلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہیں ہوا۔"

دراصل یہ عہد ہی اردو نثر کی ابتدا اور ارتقا کا ہے۔ اس لیے ہر شخص اسی قسم کے دعوے کرتا نظر آتا ہے۔ اس عہد میں قصہ گوئی یا داستان گوئی کا کوئی خاص تصور اسی لیے نہیں پنپنے پاتا کہ اہل قلم کا سارا زور زبان پر ہوتا تھا۔ ایسا اس لیے بھی ہوا ہوگا کہ زبان میں طاقت آتی ہے تب ہی طبع زاد تخلیق وجود میں آتی ہے اور پھر تنقید۔ اس لیے زبان پر توجہ دینا قدرتی امر ہے۔ اس صدی میں شاعری کی زبان اور اس کے سانچے تو معتبر ہو جاتے ہیں لیکن نثر ابھی گھٹنوں چل رہی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اٹھارہویں صدی کے اسی نثری سرمائے نے انیسویں صدی کے نثری ادب کے لیے راہیں ہموار کیں۔ چناں چہ اس صورتِ حال میں جب کہ اردو نثر ہی کم کم لکھی جا رہی ہے۔ ایسے میں فکشن اور اس کی تنقید یا کسی تنقیدی اشارے سے اس صدی کا دامن خالی ہونا خلافِ توقع نہیں۔

انیسویں صدی کا آغاز اردو زبان و ادب کے لیے بہت سی امیدیں لایا۔ پچھلی صدی سلطنت مغلیہ کے زوال، انگریزوں کی آمد ہندوستان اور ان کے اقتدار کی صدی تھی۔ تغیر اور انقلاب کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستانی زبان کی تفہیم کی خاطر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج جیسا ادارہ قائم کیا، جس کا مقصد انگریزوں کو ہندوستانی زبان کی تعلیم دینا تھا۔ لیکن لاشعوری طور پر اردو نثر کو بھی اس سے فائدہ ہو گیا اور اردو نثر جو فارسی اور عربی کے زیر اثر گھٹی گھٹی سانس لے رہی تھی، آزاد فضا میں پرواز چڑھنے لگی۔

گل کرسٹ کو اپنے طالب علموں کے لیے سادہ اور سلیس نثر و زبان کی ضرورت تھی، جن کے ذریعہ وہ جلد از جلد یہ زبان سیکھ سکتے تھے۔ اس اقتباس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک اردو نثر میں سادہ اور سلیس کوئی تصنیف نہیں ملتی، یا اگر ملتی بھی ہے تو اس سے گل کرسٹ کی واقفیت نہیں۔ ورنہ وہ اس طرح کی بات نہ لکھتا۔ یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ آج اردو تحقیقات نے فورٹ ولیم کالج سے قبل کی لکھی گئی کئی سادہ اور عام فہم نثری تصانیف کو دریافت کر لیا ہے۔ مثلاً عجائب القصص، قصہ مہر افروز و دلبر، نو آئین ہندی، رستم علی کا قصہ و احوال روہیلہ۔ ان کی زبان بھی بول چال سے قریب ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ داستانیں مختلف مقامات پر ایک مدت تک گمنام پڑی رہیں۔ کیا عجب ہے کہ آنے والے دنوں میں اور کون سی نئی دریافت سامنے آئے۔ کسی موضوع پر لکھنے والا ایک شخص اس وقت کی معلومات کے پیشِ نظر ہی کوئی نتیجہ نکالتا ہے۔ اس لحاظ سے گل کرسٹ کی اس عبارت پر زیادہ تنقید یا اعتراض کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔

بہرحال، گل کرسٹ نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے فورٹ ولیم کالج میں کئی مقتدر اور محترم منشیوں اور ادیبوں کو معتبر کیا۔ ان کے ذریعہ مختلف کتابوں کا سادہ اور آسان زبان میں ترجمہ کرایا، یا انھیں خود ایسی داستان لکھنے کی دعوت دی۔ چناں چہ اسی کوشش میں اردو نثر کی تراش خراش عمل میں آئی۔

انیسویں صدی کے بالکل آغاز ہی میں فورٹ ولیم کالج قائم ہو گیا تھا۔ یہ دور اردو نثر کی ترقی و ترویج کے لیے خاصا اہم تسلیم کیا جاتا ہے۔ چوں کہ اس عہد میں عموماً داستان تصنیف یا تالیف کی گئی تھی، اس لیے آئیے ہم ان میں "فکشن کی تنقید" کی تلاش کریں۔

۱۸۰۱ء میں خلیل علی خاں اشک کی "داستانِ امیر حمزہ" پر نظر پڑتی ہے۔

اس کے بعد اردو کی مقبول داستان "باغ و بہار" پر نگاہ ٹھہرتی ہے جو فورٹ ولیم کالج کی سب سے مشہور تصنیف ہے اور خود میر امن کے مطابق ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوئی تھی (حقیقت یہ ہے کہ اس کے کچھ حصّے ۱۸۰۱ء میں چھپ چکے تھے) اس کا دیباچہ ملاحظہ ہو:

"جان گل کرسٹ صاحب نے۔۔۔
لطف سے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی
گفتگو میں جو اردو کے لوگ: ہندو،
مسلمان، عورت، مرد لڑکے بالے، خاص
و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ
کرو، موافق حضور کے۔ میں نے بھی اسی
محاورے سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی
باتیں کرتا ہے۔"[1]

اس عبارت میں فکشن یا داستان کے سلسلے میں اہم تنقیدی اشارہ ملتا ہے۔ میر امن کے کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ قصہ کی تعمیر میں مکالمہ نگاری سے کام لینا چاہتا ہے اور DIALOGUE کے ذریعہ ڈرامائیت، لحاظ مراتب کے ساتھ ساتھ بول چال کی زبان میں قصّہ کو آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکالمہ کی یہ کیفیت پوری "باغ و بہار" میں نظر آتی ہے اور اسی مکالمہ سے میر امن نے قصہ میں ڈرامائیت پیدا کی ہے۔ لحاظ مراتب کا اندازہ بھی بول چال کی زبان کے ذریعہ ہو جاتا ہے۔ باغ و بہار اپنی مقبولیت

---

[1] بحوالہ باغ و بہار، مرتب سلیم اختر، ص ۱۰۶

کے باعث بار بار چھپتی رہی۔ تقریباً ہر اہم نقاد نے اسے اپنے طور پر مرتب کیا ہے اور مقدمہ لکھا۔ اس کی وجہ اس کا قصہ نہیں، بلکہ اس کی نثر ہے۔ میر امّن کی سادہ نگارش کے خلاف اہم ترین صدائے احتجاج لکھنؤ کے مرزا رجب علی بیگ سرور نے بلند کی۔ جب سرور نے فسانۂ عجائب لکھی تو اس کا سب سے بڑا محرک یہی جذبہ تھا کہ یہ سادہ نگارش اپنے اندر ان شعری معائب یا محاسن کو نہیں رکھتی جو اس عہد کی نثر کا نمایاں وصف ہے۔

۱۸۰۴ء میں شائع شدہ باغ و بہار میں شامل گل کرسٹ کی یہ تحریر فکشن کی تنقید کے سلسلے میں اہمیت رکھتی ہے۔

> "عطا حسین خان نے نوطرز مرصع کے عنوان سے اس کا ترجمہ تو کیا لیکن عربی اور فارسی محاورات کی کثرت اور پُرتکلف اسلوب کی بنا پر یہ اس زبان کے نمونہ کی حیثیت سے پسند نہ کیا جاسکا۔ یہ قباحت دور کرنے کے لیے محولا بالا ترجمہ سے میر امّن دلی والے نے جو کہ کالج سے وابستہ مقامی فضلا میں سے ہے اس کو قلم بند کیا ہے اور ہندوستانی طالب علم پر فوراً ہی یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس نے کس خوش اسلوبی سے ریختہ کے محاورہ کی برقراری کے ساتھ ساتھ اسلوب کی سادگی اور زبان کی صفائی بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا جس سے زبان پر اس کی قدرت عیاں ہو جاتی ہے۔
>
> کتاب میں مشرقی آداب اور روایات کی دل خوش کن تفاصیل ملتی ہیں اور پھر کوثر و تسنیم میں گھلی زبان اسے ایک حد تک اصل تصنیف ہی بنا دیتی ہے (بحوالہ باغ و بہار، مرتبہ سلیم اختر ص ۶۸۔۶۷) اس عبارت سے یہ باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ نوطرز مرصع کو عربی اور فارسی آمیز زبان اور پُرتکلف زبان نے نامقبول بنادیا، یعنی قصہ گوئی کے لیے آسان اور سادہ اسلوب ضروری ہے۔

۲۔ باغ و بہار کی کامیابی کا راز اس کا سادہ اسلوب ہے۔

۳۔ کہانی میں اپنے عہد کی تصویر ضرور ہونی چاہیے، کیوں کہ باغ و بہار میں مشرقی آداب و روایات کی خوبو ملتی ہے۔

فکشن کی تنقید کے سلسلے میں یہ باتیں بڑی اہم معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی اب قصہ گو یا قصہ کے مبصر زبان کے چٹخارے اور اسلوب کی سادگی سے نکل کر قصہ میں مشرقی آداب و روایات کی "دل خوش کن تفاصیل" پر بھی توجہ کرتے ہیں قصہ اب زندگی کی تصویر کشی کا کام بھی کر سکتا ہے اور اہلِ نظر کے نزدیک یہی اس کا خاص وصف بھی تصور کیا جا رہا ہے۔

رجب علی بیگ سرور کی تصنیف "فسانۂ عجائب" ۱۸۲۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ سرور نے اپنی داستان کے تحفظ میں جو باتیں کی ہیں ان سے داستانی ادب کا کوئی وصف نمایاں نہیں ہوتا، ہاں میر امّن کی باغ و بہار کی زبان اور اسلوب پر فقرے ضرور چُست کیے ہیں، جیسے ایک عمری چشمک کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا
"دلی کے روڑے ہیں محاورے کے ہاتھ منھ توڑے ہیں[۱]"

لیکن اسی چشمک نے کم از کم یک طرفہ ہی سہی "تقابلی تنقید" کا رجحان تو بخشا۔

۱۸۵۴ء میں سرور دلی آئے تھے جہاں ان کی ملاقات مرزا غالب سے ہوئی اس کا حال "تذکرہ غوثیہ" میں لکھا ہے۔ غالب ایک فنکار تھا، وہ فکشن کا نقاد نہیں تھا، لیکن بعض مقامات پر افسانوی ادب کے متعلق اپنے ایسے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے کہ اس کے تنقیدی شعور کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یہ گفتگو ملاحظہ ہو:

سرور: مرزا صاحب! اردو زبان کس کتاب کی عمدہ ہے؟
غالب: چار درویش کی۔
سرور: اور فسانۂ عجائب کیسی ہے؟
غالب: اجی لاحول و لاقوۃ! اس میں لطف زبان کہاں؟ ایک تُک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے[۲]"

یہاں صرف دو الفاظ "لطف زبان" میں غالب نے "باغ و بہار کی سب سے بڑی خوبی کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ لیکن فکشن کی تنقید میں یہ محض اشارہ نہیں بلکہ "تقابلی مطالعہ اور تنقید" کی کوشش ہے۔ حالاں کہ یہاں صرف "لطف زبان" کے متعلق اظہارِ خیال کیا گیا ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ اس عہد میں تنقید کا یہی رجحان ملتا ہے۔ مثلاً فسانۂ عجائب کے آخر میں فدا علی عیش کی تقریظ شامل ہے۔ اس میں بھی زبان کی تحسین ملتی ہے۔

"طبقات الشعرائے ہند" اس لحاظ سے اہم تذکرہ ہے کہ اس میں بعض نثر نگاروں کے احوال بھی ملتے ہیں اور کہیں کہیں ان کی نثری کاوش پر کوئی ایک آدھ جملے بھی۔ یہ ایف۔ فلن اور مولوی کریم الدین کی مشترکہ تالیف ہے جو ۱۸۴۷ء، ۱۸۴۸ء اور اس سے قبل کی ہے۔

گارساں دتاسی جو مغربی دانشور اور مشرقی ادب و تہذیب کا دلدادہ تھا۔ اردو زبان سے اس کو خاص دلچسپی تھی۔ وہ ہر سال اپنے طالب علموں کو مشرقی ادب و تہذیب اور زبان کے ارتقا پر لیکچر دیا کرتا تھا۔ یہ خطبے اس لیے اہم ہیں کہ ان میں بھی فکشن کی تنقید مل جاتی ہے۔

گارساں دتاسی نے اپنے ایک خطبہ میں گل بکاؤلی، ہیر رانجھا، گل و صنوبر، باغ و بہار، نوطرز مرصع، بتیال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، طوطا کہانی، قصہ بلند اختر از میر خاں، فسانۂ عجائب جیسی ہندوستانی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے قصہ پر تنقیدی گفتگو کی ہے۔

> "(ان قصوں میں) عام طور پر پہلے ہیرو اور ہیروئن کا جسمانی اور اخلاقی حال تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کم و بیش عجیب و غریب یا پیچیدہ واقعات کا ذکر ہوتا ہے جو ان کو پیش آتے ہیں اور جو ہمیشہ ان کی ملاقات کے مانع اور حارج ہوتے ہیں۔ آخر میں ان کی محبت اور

---

[۱] فسانۂ عجائب۔ رجب علی بیگ سرور۔ ص ۱۶ [۲] تذکرہ غوثیہ۔ شاہ گل حسن قادری۔ ص ۱۰۱

وفاداری کا صلہ ملتا ہے بعض اوقات مگر شاذ و نادر انجام المناک بھی ہوتا ہے[1]۔"

اردو داستانوں میں جس نوعیت کے قصے بیان کیے جاتے ہیں، ان میں کرداروں کو جس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے، ان کی پہلی نظر میں محبت اور پھر طلسماتی اشیا کے ذریعے ان کی ملاقات اور جدائی اور آخر کار وصل ــــــ یہی کچھ داستانوں کی کہانیوں اور کرداروں کا مزاج رہا ہے۔ ان پر یہ کتنی اجمالی تنقیدی رائے ہے۔ ایک دوسری جگہ "صنف داستان" کے ضمن میں کہتا ہے کہ :

"۔۔۔ مسلمانوں کے ادب میں تصنیف کی ایک اور خاص قسم ہوتی ہے جو ہمارے قصے کے مماثل نہیں بلکہ قصوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے، یعنی ایک ہی قصے میں بہت سے قصے ملے ہوتے ہیں۔ یہ ایک عجیب قسم کی تصنیف ہوتی ہے اور اس میں اخلاقی اور بعض اوقات حکیمانہ اور مذہبی شان پائی جاتی ہے۔ مثلاً کشف الاسرار (از مقدسی)، منطق الطیر، اخوان الصفا وغیرہ جو بہت مشہور ہیں۔ اس میں جانور باری باری سے اپنے صفات بیان کرتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ خداوند تعالیٰ اکثر ہمیں جانوروں میں ایسی صفات کے نمونے دکھاتا ہے جو انسان کے لیے قابلِ تقلید ہوتی ہیں[2]۔"

یہاں دتاسی ایک عجیب قسم کی تصنیف ہی کہہ پاتا ہے۔ تعجب ہے کہ اس نے اس صنف کا کوئی نام نہ دیا۔ کیا اس وقت تک وہ ALLEGORY یا تمثیل سے واقف نہ تھا؟ یا اس کا اشارہ داستان کی طرف ہے؟ یہ سوالات سر اٹھاتے ہیں، لیکن ان سے قطع نظر اس عبارت سے فکشن کی تنقید کے ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی خطبہ میں آگے کہتا ہے :

"۔۔۔ مثال کے طور پر صرف "الف لیلیٰ" کا نام لیتا ہوں۔ یہ دنیا کی نہایت دلچسپ کتابوں میں سے ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ اس سے ہمیں مسلمانوں کے رسم و رواج کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ کتاب محض تفننِ طبع کے لیے ہے لیکن کم از کم GULLIVERS TRAVELS سے یقیناً کہیں زیادہ قابلِ وقعت ہے[3]۔"

یہاں بھی اردو کی کہانیوں کا موازنہ، قصہ اور قصہ میں ماحول اور معاشرت کی حقیقی پیش کش کے اعتبار سے دوسری زبانوں کے قصوں سے کیا جا رہا ہے۔

کبھی کبھی معاصرین کی چشمک یا ادبی تنازعے بھی تنقیدی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مثلاً سروش سخن (۱۸۶۰ء) جو دراصل فسانۂ عجائب کے جواب میں لکھی گئی۔ اس کے دیباچے میں سخن نے سرور کی زبان پر اعتراض کیا ہے۔ چوں کہ فسانۂ عجائب میں سرور نے میر امن کی باغ و بہار کے حوالے سے ان کی زبان پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ اس کے نتیجے میں انھیں (سرور کو) دلی والوں نے اپنا نشانہ بنایا اور حد تو یہ ہے کہ فسانۂ عجائب (۱۸۲۴ء) کا جواب کم و بیش ۳۶ سال بعد "سروش سخن" کے دیباچے میں دیا گیا، لیکن اس تنازع میں اردو فکشن کی تنقید کا بھلا ہوتا گیا اور آہستہ آہستہ تنقیدی شعور میں پختگی آتی گئی اس کی روشن مثال "خط تقدیر" کے دیباچہ کی صورت میں مل جاتی ہے۔

"خط تقدیر" کی اشاعت پہلی بار ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ یہ ناول ہے یا نہیں، اس ضمن میں بحث کرنا میرا مقصد نہیں۔ لیکن اس کے دیباچہ میں مولوی کریم الدین نے قصہ نگاری سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس عہد میں اپنی نوعیت کے بڑے اہم "تنقیدی شعور" کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ روایتی قصہ نگاری سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے اور شاید پہلی بار کسی قصہ نگار کے یہاں یہ خواہش سر اٹھاتی نظر آتی ہے کہ "کہانی ایسے طور پر ہو کہ جو شخص پڑھے یا سنے اس کو خیال ہو کہ قصہ میرے ہی حسبِ حال لکھا گیا ہے۔" یہ دیباچہ جو "پیشانی خط تقدیر" کے عنوان سے لکھا گیا ہے اور کچھ طویل ہے۔ اس طویل دیباچہ کو نقل کرنا ممکن نہیں۔ ہاں اس سے جو اہم نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں، وہ یہ ہیں :

۱۔ قصہ ایسے پیرائے میں ہو جس کا اثر طبع انسان پر ہو۔
۲۔ جو شخص پڑھے یا سنے اسے اپنے حسبِ حال معلوم ہو۔ یعنی واقعتاً کہانی زمین پر رہنے والے انسانوں کی ہو۔ یہاں آپ بیتی کی طرف اشارہ ہے اور کہانی میں نفسیاتی پہلو پر زور ہے۔
۳۔ زبان آسان ہو۔
۴۔ ایشیائی قصوں کی پرانی روش اور طور کو چھوڑ کر نئے طریقے سے کہانی لکھنا۔

اس کے بعد کریم الدین نے قدیم انداز قصہ گوئی پر تنقید کی ہے کہ جب سے قصہ نویسی کا شوق ہوا ہے تمام مصنفوں نے بادشاہوں تاجروں یا فقیروں کی کہانیاں لکھی اور ان میں عشق و حسن کے معاملات کو داخل کر دیا۔ کسی نے اس روش سے انحراف کی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ ان مصنفین کو یہ خوف رہا ہوگا کہ جب تک عشقیہ مضامین اور بادشاہوں کا ذکر نہ ہوگا میری کہانی مقبول نہ ہوگی۔

۵۔ وہ قصہ خوانی کو بڑی اہم چیز سمجھتا ہے اس کے نزدیک یہ انسان کو مسرت و انبساط کے ساتھ بصیرت و بصارت بھی بخشتا ہے۔

مولوی کریم الدین کی یہ تحریر اردو افسانوی ادب کی تنقید میں بڑی بنیادی بحث اٹھاتی ہے۔ یہاں قصہ کے پیرائے پر بھی گفتگو ہے کہ اسے اس انداز کا ہونا چاہیے کہ انسان کی فطرت اس سے متاثر ہو اور متاثر کرنے کی قوت "زبان" میں بھی پوشیدہ ہے۔ اور قصہ کی "دلچسپی" میں بھی۔ نیز ایسے واقعات و حالات میں بھی جن کا تعلق انسان کی اپنی زندگی یا سامنے کی زندگی سے

---

[1] خطبات گارساں دتاسی۔ مرتبہ عبدالحق۔ ص ۱۵۵۔ ۱۵۴۔ ۱۵۹۔ [2] خطبات گارساں دتاسی۔ مرتبہ عبدالحق۔ ص ۱۶۱۔ ۴؍ دسمبر ۱۸۵۴ء
[3] خطبات گارساں دتاسی۔ مرتبہ عبدالحق۔ ص ۱۹۱۔ ۴؍ دسمبر ۱۸۵۴ء

ہوتا ہے۔ ورنہ دوسری دنیا کے واقعات سے طبع انسان پر کیا اثر ہوگا؛ چناں چہ آگے اس بات کا ذکر آیا ہے کہ جو سنے یا پڑھے اسے اپنے حسب حال معلوم ہو۔ یہاں حسبِ حال کا لفظ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس کا مطلب آپ بیتی بھی ہو سکتا ہے اور نفسیاتی پہلو پر زور بھی۔ ایک قصہ ہر انسان کے حسب حال اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ اس نوعیت کا ہو کہ ہر انسان کی زندگی میں اس کا وقوع ہونا ممکن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پرانے قصہ نگاروں کو کہتا ہے کہ "انھیں یہ خوف رہا ہوگا کہ جب تک عشقیہ مضامین اور بادشاہوں کا ذکر نہ ہوگا، قصہ دلچسپ اور مقبول نہ ہوگا" اور اسی خوف کے تحت وہ اپنی کہانیوں میں عشقیہ مضامین کے ساتھ بادشاہوں کا کردار اور شاہی واقعات کا بیان کرتے تھے۔ ان کے برعکس مولوی کریم الدین یہ سمجھتا ہے کہ ہم حقیقی زندگی کی پیش کش کے ذریعے بھی قصہ کو دلچسپ بنا سکتے ہیں۔ نیز عوام کی زندگی کو اس سماج کو جو شاہی سماج سے قطعی الگ ہے اس کے دکھ درد کو اس کی آپ بیتی کو بھی قصہ کی بنیاد بنا سکتے ہیں جو مقبول بھی ہوگا کہ اس میں سننے والے کو ایسا محسوس ہوگا کہ کہانی اس کے حسب حال ہے۔ اس سے قبل اتنے واضح انداز میں کسی نے فکشن کی تنقید نہ کی تھی۔ دیکھا جائے تو تنقیدی اعتبار سے کریم الدین کے یہ خیالات خاصے انقلابی اور تغیر آفریں نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں اس نوع کی فکر اور پرانی کہانیوں پر ایسی تنقیدی رائے کہ اس میں محض طبقہ اولیٰ کے کردار اور شاہی معاشرت کے شب و روز کو ہی بنیاد بنایا جاتا ہے، بڑی بیش قیمت ہے۔ اس اعتبار سے کریم الدین کا تنقیدی رویہ پختہ نظر آتا ہے جس نے آنے والے دور کے فکشن اور تنقید دونوں کو متاثر کیا۔

اب خطبہ گارساں دتاسی کا یہ اقتباس دیکھیے جو فکشن کی تنقید میں ایک زنجیر کی حیثیت رکھتا ہے:

"... اس کتاب کا نام "منتخبات اردو" ہے۔ یہ انتخاب کریم الدین نے کیا ہے ... اس میں الف لیلیٰ میں سے سندباد جہازی کا دلچسپ قصہ بھی لیا گیا ہے۔ اگرچہ الف لیلیٰ کے سب نسخوں میں یہ قصہ موجود نہیں ہے۔ تحفۂ اخوان الصفا کے بعض حصے بھی طبع ہوئے ہیں۔ یہ کتاب تمثیلانہ رنگ میں لکھی گئی ہے۔[1]"

یہاں اس نے "ایک عجیب قسم کی تصنیف" کے لیے تمثیلانہ رنگ کا لفظ استعمال کر لیا ہے۔ یہ فکشن کی تنقید کے ساتھ گارساں دتاسی کے تنقیدی شعور کے ارتقا کا بھی پتا دیتا ہے۔ یعنی ۱۸۵۴ء سے ۱۸۶۳ء تک آتے آتے اس نے اس عجیب قسم کی تصنیف کو "تمثیلانہ" کہنا شروع کر دیا:

"داستانی ادب" کی حد درجہ مقبول و معروف داستان "بوستانِ خیال" (جلد دوم) ہے جس کا اردو ترجمہ خواجہ بدرالدین امان خاں دہلوی نے کیا۔

"واسطے افسانہ کے چند مراتب لازم ہیں، ورنہ مضمون بے سرو پا سے جس کی مبتدا و مخبر کا پتہ نہ لگے سامعین قصہ یا ناظرین کتاب ضرور بے لطف ہوں گے اور ان کو کچھ مزہ نہیں آنے کا اول مطلب مطول و خوشنما جس کی بندش میں توارد مضمون اور تکرار بیان واقع نہ ہو اور مدت دراز تک اختتام کے سامعین مشتاق رہیں۔ دوم بجز ملمعائے خوش ترکیب اور مطلب دلچسپ کوئی عبارت سامعہ خراش و ہزل مثل تعریف باغ و کوہستان با مکان و آرائش مکان درج نہ کیا جاوے اور بیشتر اہل تصانیف قصص اسی مضمون سے افسانہ کو طول دیتے ہیں۔ سوم لطافت زبان اور فصاحت بیان۔ چہارم عبارت سریع الفہم جو واسطے فن کے تواریخ گزشتہ کا لطف آوے اور نقل و اصل میں ہرگز فرق نہ ہو سکے، یعنی صاحبان تصانیف قصص کو اس امر کا لحاظ پر ضرور ہے کہ تمہید خیالی کو اپنے بدلائل و براہین واقعہ اصلی کے طرز سے بیان کریں۔ والا رموز حمزہ کی مانند وہی مضمون بے ہودہ گوش زدہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص صحرا سے باغ میں پہنچا، یا چشمہ سے کوہستان میں نکل آیا، یا زمین پر سے آسمان پر جست کی یا فلاں پہلوان نے فلاں پہلوان کو قتل و زخمی کیا۔ بس یہ بیان مزخرف تا کجا سنا جاوے۔ وہ بھی ہر بار۔ سبحان اللہ مصنف نے بوستانِ خیال کے فقط تمہید عاشق شاہزادہ معز الدین کے جو اصل الاصول اس افسانۂ عالی کا ہے[2]"

یہ طویل دیباچہ ہمیں کئی اہم نکات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ:

۱۔ قصہ کے بیان میں تکرار اور توارد نہ ہو، بلکہ ایک تجسس اور تحیر خیزی کی کیفیت ہو جس کے سحر میں سامع گرفتار رہے اور اختتام قصہ کا بے چینی سے منتظر بھی رہے کہ آگے کیا ہوگا؟ — یہ قصہ کا آج بھی لازمی عنصر ہے۔ بیان اور دلچسپی، اس کے بغیر آج کا افسانہ بھی افسانہ کے فن کو نہیں چھوتا۔

۲۔ دیباچہ نویس کا یہ بھی خیال ہے کہ قصہ میں کوئی عبارت غیر متعلقہ یا ایسی نہ آئے جس کا تعلق قصہ سے نہ ہو، ورنہ قصہ میں غیر دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔

۳۔ اس کی یہ بات بڑی اہم ہے کہ "قصہ میں تواریخ گزشتہ کا لطف آوے اور نقل و اصل میں ہرگز فرق نہ ہو سکے"۔ یہاں بھی قصہ کو تاریخ کے مماثل سمجھ کر یہ بات لکھی گئی ہے کہ قصہ فرضی نہ ہو بلکہ ایسا ہو کہ جو ہماری زندگی میں بیت چکا ہو، تاریخ کا حصہ بن چکا ہو۔ قصہ کو تاریخ جیسا دلچسپ بنانے کی یہ کوشش اس سے قبل بھی کی گئی ہے۔

اس عبارت میں تنقید کی بہتر شکل سامنے آتی ہے، جو فکشن کی تنقید میں عموماً اور فن داستان کے سلسلے میں خصوصاً ایک اچھی اور

---

[1] خطبات گارساں دتاسی مرتبہ عبدالحق: ۷ دسمبر ۱۸۶۳ء [2] بوستانِ خیال، حدائق الانظار (جلد دوم) مترجم خواجہ بدرالدین امان خاں دہلوی، ص ۴ مطبع اکمل المطابع واقع دہلی (۱۸۶۸ء)

بنیادی تنقیدی کوشش ہے۔ اس سے پیشتر فن داستان پر ایسی تنقیدی گفتگو نہیں ملتی۔

بوستانِ خیال کے اس نسخے پر مرزا غالب نے ایک "تقریظ" لکھی تھی۔ اس میں غالب نے اپنے طور پر نہایت مختصر الفاظ میں فنِ داستان کی تعریف اور تنقید کی ہے۔ ۱۸۶۹ء کی یہ تحریر ملاحظہ ہو:۔

"موعظت و پند نہیں، ترہات ندیمانہ ہے۔ سیر و اخبار نہیں جھوٹا افسانہ ہے۔ داستان طرازی منجملۂ فنون سخن ہے سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے[1]"

غالب کے یہ خیالات داستان طرازی کی حد تک تو صحیح ہو سکتے ہیں مگر قصہ گوئی کے اعتبار سے بہتر نہیں۔ کیوں کہ جب ان سے قبل کے ادیبوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ قصہ، تاریخ سے دلچسپ ہو، ہر انسان کے حسب حال ہو، تو پھر غالب کا اسے صرف "دل بہلانے کے لیے اچھا فن"، کہنا زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ایسی صورت میں خصوصًا جب کہ خود بوستانِ خیال کا مترجم ہی اصول وضوابط طے کر رہا ہے اور اسے دل بہلانے کی چیز نہیں سمجھ رہا ہے۔ ان باتوں سے قطعِ نظر فکشن کی تنقید کی ارتقائی صورت کے پیشِ نظر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ فکشن کی تنقید ابتدا سے غالب تک آتے آتے زبان اور اسلوب کے چٹخارے سے آگے بڑھ کر قصہ میں کردار، تواریخ سے اس کی مماثلت اور مشابہت اور ماحول اور معاشرت کی پیش کش کے ساتھ دلچسپی تک آگئی ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جس میں غالب کے ساتھ سر سید احمد خاں، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی اور نذیر احمد کی ادبی اور سماجی کارگزاریاں نظر آتی ہیں۔ یہی وہ عہد ہے جب نذیر احمد کی اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے ہاتھوں اردو میں ناول نگاری کا وجود عمل میں آیا اور بالکل پہلے پہل نذیر احمد نے اردو قصہ کو طوطا مینا کی گفتگو، طلسماتی دنیا کے تحیر خیز واقعات اور مافوق الفطرت عناصر سے پاک کیا۔ اپنے زمانے کے مزاج اور ماحول کے تقاضے کے پیش نظر ایسی کہانیاں لکھیں جن میں ہمارے درمیان کے انسان، ہماری اپنی دنیا کے کردار، ہماری طرح کے مسائل سے دوچار نظر آتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی کہانیوں میں پند و موعظت کا زور ملتا ہے۔ لیکن یہ اس عہد کے حسب حال ہے۔ ان کا پہلا ناول مراۃ العروس ہے جو ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ حالاں کہ اس کے دیباچہ میں قصہ کے فن پر کوئی گفتگو نہیں ملتی، لیکن قصہ لکھنے کی ضرورت اور اس کی نوعیت پر اظہارِ خیال ضرور ملتا ہے۔ چوں کہ نذیر احمد نے انگریزی ناول پڑھ رکھا تھا اور وکٹوریہ عہد میں اخلاقیات پر زور دیا جاتا تھا۔ جیسے THE FAMILY INSTRUCTOR وغیرہ جس میں اخلاقی اور اصلاحی باتیں ملتی ہیں۔ چناں چہ نذیر احمد نے بھی اپنے ناولوں میں ان اجزا سے کام لیا ہے۔ یہی وصف انھیں اپنے عہد میں حقیقت پسند اور ان کے ناولوں کو حقیقت نگاری کا مظہر بناتا ہے۔ اسی بنا پر ان کے دیباچوں میں بھی ناول میں واقعہ نگاری کے عناصر پر زور دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ہماری نظر مغرب کے ایک محب اردو اور معلم زبان و ادب پر پڑتی ہے، جو پیرس میں اپنے طالب علموں کو ہندوستانی زبان و ادب میں ہونے والے سال بہ سال ارتقا پر لیکچر دیا کرتا تھا۔ یہ مستشرق گارساں دتاسی تھا۔ اس کے خطبات بھی تنقیدی نقوش رکھتے ہیں۔ ان خطبات کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے۔ گارساں دتاسی کے خطبات سے جو تنقیدی نکتے نکلتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ دتاسی کے نزدیک کہانی کا مقصد نصیحت اور اصلاح ہے۔ یہ اپنے بیان کی وجہ سے یاد بھی رہ جاتی ہے۔ دوسرے زبان، کہانی کے لیے عام فہم ہونی چاہیے۔ چناں چہ وہ جہاں جہاں قصہ یا کہانی کا ذکر کرتا ہے ان دو باتوں پر بہت زور دیتا ہے۔

انھیں باتوں کی طرف نذیر احمد نے توبۃ النصوح (۱۸۷۳ء) کے دیباچہ میں بھی اشارہ کیا ہے۔ توبۃ النصوح کے مصنف کو انعام کا مستحق قرار دیتے ہوئے سر ولیم میور نے اس کتاب پر اپنے جن خیالات کا اظہار ۱۷ جنوری ۱۸۷۴ء کے سرکاری مراسلے میں کیا تھا۔ اس میں بھی فکشن کی تنقید ملتی ہے۔ یہ مراسلہ ملاحظہ ہو:

"بہ مقابلہ مراۃ العروس کم تر درجے کی ہے۔ یعنی بہ اعتبار بندش اور حالات کے اس میں وہ بے ساختگی نہیں جو مراۃ العروس میں ہے اور چند اشخاص کا ایک مرتبہ کیا گیا ہے مگر پھر ان پر نظر نہیں رکھی گئی — مکالمے میں اور نصائح میں بہت طول ہے اور کہیں کہیں بے محل بھی ہے مگر ساتھ ہی اس کے یہ بات بھی ہے کہ کتاب کا مقصد اور زبان دونوں بہ غایت پسندیدہ اور قابل تعریف ہیں۔ فی الواقعہ، بیان کی قوت، اسلوب کا پاکیزہ و سادہ حسن، محاورات کی بے مثال برجستگی اور دلی کی عام بول چال کے مطابق فارسی و عربی الفاظ کی موزوں آمیزش، اس کتاب کے اعلا اوصاف ہیں۔ ضرب الامثال اور اشعار کے بہ کثرت و برمحل استعمال اور روزمرہ کے بے تکلف گفتگو کے فقروں نے اس کتاب کی افادیت میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے۔ . .

اس کتاب کا سب سے نمایاں پہلو، اس کا مذہبی رنگ ہے۔ کتاب کے دیباچے میں مصنف نے کھلے طور پر اعتراف کیا ہے کہ مذہب کے حوالے کے بغیر، حسن معاشرت کی تعلیم اور خانگی زندگی میں نیکی اور اخلاق کی تلقین، اس کے بس کی بات نہیں . . .

باقی صفحہ ۲۲ پر

---

[1] بوستانِ خیال۔ تقریظ مرزا غالب ص ۲۵۷

اظہر مسعود

نوکری کی تلاش میں....

اٹھارہ برس کی مسلسل محنت کے بعد آخر ہم نے ایم۔ اے کر ہی لیا۔ اب ہم آزاد تھے۔ نہ کتابوں سے جوجھنا، نہ استادوں کا خوف، نہ امتحان کا ہوّا، نہ نتیجے کا انتظار۔ انتظار تھا تو بس اس کا کہ کوئی اچھی سی نوکری مل جائے۔

جب نتیجہ نکلے ایک سال ہونے کو آیا اور قرض خواہوں کے سوا کسی نے ہماری بیکاری پر توجہ نہ کی تو تشویش لاحق ہوئی۔ مانا کہ ہم نے کہیں درخواست نہیں گزاری تھی مگر اتنا تو نوکری دینے والے بھی جانتے ہیں کہ ایم۔ اے کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اب کوئی اچھی سی نوکری دینا ان کا اخلاقی فرض تھا۔ اور پھر ہمارا نتیجہ کوئی ڈھکا چھپا تو تھا نہیں۔ ہم نے اول درجے میں ایم۔ اے پاس کیا تھا۔ یہ خبر اردو کے "کثیر الاشاعت" مقامی روزنامے "پردۂ صنم" کی شاہ سرخی بنتی مگر بھلا ہو ایڈیٹر کا جنھیں ہماری شہرت پھوٹی آنکھ نہ بھائی۔

سوچا حکام بالا کو خط لکھ کر یاد دلا دیں کہ ہم ایم۔ اے کر چکے ہیں اور ابھی تک ہمارے تقرر سے کسی خالی اسامی کو رونق نہیں بخشی گئی ہے۔ لیکن جذبۂ ہمدردی نے قلم روک لیا کہ اس غفلت پر سکون ہی کا چہرہ سا کھنچ جائے گا۔ مذکورۃ الصدر جذبہ کچھ اتنا شدید تھا کہ اس کا اثر زائل ہوتے ہوتے ایک برس اور بیت گیا۔ خیال آیا ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ ہمارا تقرر کہیں نہ ہوا ہو۔ یقیناً ڈاک کی گڑبڑ ہے۔ ایک شکایت نامہ محکمۂ ڈاک کو لکھ بھیجا۔ وہاں سے استفسار کیا گیا "کیا کوئی تقرر نامہ آنے والا تھا؟" ہم نے جواب دیا "ایک نہیں، بہت سے!" دریافت ہوا "کہاں سے؟" ہم نے جواب دیا "پورے ملک سے بلکہ گمان غالب ہے کہ بیرونی ممالک سے بھی" پوچھا گیا "آپ نے کون سا تیر مارا ہے؟" ہم نے بھی پلٹ کر پوچھ لیا "آپ کو نہیں معلوم؟" جواب آیا "نہیں" ہم نے لکھا "وائے بر عقلِ شما!" فرمائش ہوئی "ترجمہ کر کے بھیجیے" ترجمہ بھیجا تو خط کے بجائے تار آیا "SAME TO YOU"

جی تو چاہا کہ اس ساری کارروائی کی ایک فائل بنا کر اوپر بھیج دیں۔ پھر سوچا ہمارے ذرا سے غصے کی بدولت کوئی نان شبینہ کو محتاج ہو جائے گا۔ چناں چہ ہمارے اخلاق نے، جو طالب علمی کا، طویل دور گزارنے کے باوجود محفوظ تھا، ہمیں کسی کارروائی سے باز رکھا۔

اس طرح کے اور بھی کئی واقعات ہوئے اور ہم نے اپنے نفع نقصان کی پروا نہ کرتے ہوئے ہر دفعہ کمال صبر کا مظاہرہ کیا۔ لیکن نادان نوکری دینے والوں نے معاملے کی نزاکت کا چنداں خیال نہیں کیا اور اپنی روش بلکہ کج روی پر قائم رہے۔

بہرحال نوکری کرنا تھی تو ارباب حل و عقد کو یاد دلانا بھی ضروری تھا۔ چناں چہ ہم نے "پردۂ صنم" کے ایڈیٹر کو ایک خبر بنا کر دی کہ "ہم ایم۔ اے کا معرکہ تو سر کر ہی چکے ہیں اب سوچتے ہیں کہ نوکری دو کری بھی کر ہی ڈالی جائے" ایڈیٹر نے کہا "۲۵ روپے ہوں تو اخبار کے لیے ادھار دیجیے" ہم سمجھے سگریٹ کے لیے مانگ رہے ہیں جس کا دھواں اردو اخبار نکالنے اور روشنائی نہ ہو تو بسا اوقات چھاپنے کے بھی کام آتا ہے۔ پھر بھی احتیاطاً پوچھ لیا "بھائی، ۲۵ روپے میں کیا ہوگا؟ یہ رقم تو کثیر الاشاعت اخبار کے لیے اونٹ کے منہ کو زیرہ بھی ثابت نہیں ہوگی!" وہ ماچس کی ڈبیا پر سگریٹ کو ٹھونکتے ہوئے بولے "اس ہفتے کا کاغذ تو آ ہی جائے گا"

جب ایم۔ اے کیے ہوئے آٹھ برس ہو گئے اور کسی معقول ملازمت کے لیے ہماری گانٹھ میں بس ایک سال رہ گیا تو یہ سوچ کر اٹھے کہ چلو میاں:

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

ایک دفتر پہنچے۔ وہاں افسر اعلا سے ملنا چاہا تو چپراسی نے بڑے بابو کے پاس پہنچا دیا۔ ہمارے منہ سے بہ دقت اتنا نکلا کہ "ہم نے ایم۔ اے کر لیا ہے" جواب ملا "بہت بہت مبارک ہو، مٹھائی کب کھلا رہے ہیں؟" ہمیں بڑے بابو کی یہ گستاخانہ بے تکلفی پھوٹی آنکھ نہیں بھائی اور ہم نہ صرف بغیر کچھ کہے سنے بلکہ پیر بھی پٹکتے ہوئے وہاں سے چلے آئے۔

ایک اور دفتر کا حال سنیے۔ بڑے بابو کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہم نے ایم۔ اے فارسی میں کیا ہے تو انھوں نے تیل بیچنے کا مخلصانہ مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ یہ یقین بھی دلایا کہ سیر اوپر ایک پاؤ

ادبستان دین دیال روڈ۔ لکھنؤ، ۲۲۶۰۰۳

کھلی مفت ملے گی تو وہ سرسوں کا تیل ہمیشہ ہمیں سے خریدا کریں گے۔

اسی طرح اور بہت سے دفتروں کے چکر لگائے۔ ہر جگہ پذیرائی کا کم و بیش یہی رنگ رہا۔ نوکری جو کبھی سڑک پر پڑے ٹھیکرے سے زیادہ بے وقعت معلوم ہوتی تھی اس کی امید گھٹتی اور مایوسی بڑھتی جا رہی تھی کہ اچانک ایک پوسٹر پر نظر پڑی "آپ نوکری کے لیے پریشان ہیں تو ہم سے ملیں ملنے میں کوئی حرج نہیں" معلوم ہوا کہ ہم نوکری کے لیے قرار واقعی پریشان ہی نہیں حیران بھی تھے۔

اشتہار دینے والے حضرت زرد پتلون، سبز کوٹ، سرخ قمیص اور گلابی ٹائی میں خود بھی کسی رنگ برنگے اشتہار سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ دانتوں میں کم و بیش ان کی ہی جسامت کا سگار بھی پھنسا ہوا تھا۔ میز پر سنہری ڈائل والا سرخ رنگ کا ایک ٹیلی فون رکھا ہوا تھا اور ٹیلی فون کے قریب ہی رکھا ہوا تھا ایک ٹو ان ون جس کا طول میز کے عرض سے بھی زیادہ تھا۔ اس میں ٹیپ رکارڈ بھی تھا، ریڈیو اور رکارڈ پلیئر بھی۔ یہ تینوں چیزیں بہ یک وقت و با آواز بلند اپنی صحت و سلامتی کا اعلان کر رہی تھیں۔ پشت کی طرف دیوار پر ڈیڑھ گز لمبا اور ایک گز چوڑا کسی ہوائی کمپنی کا کلنڈر ٹنگا ہوا تھا جس میں عمر خیام اپنے امریکی نژاد محبوب کو رباعی اور دوہے کا فرق سمجھانے میں مصروف تھا۔

ہم نے جیسے ہی اندر آنے کی اجازت چاہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ ہمیں سر سے اندر آنے کا اشارہ کر کے ٹیلی فون میں چیخے "جی۔ آپ کا پورا نام کیا ہے؟" پھر سامنے کھلی ہوئی ڈائری میں دیکھ کر بولے "تو آپ کویت والے جاب کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ وہ کام تو بس بنا ہی سمجھیے۔ آج ایک بجے گیلارڈ آ جائیں وہیں لنچ پر تفصیلات طے کر لی جائیں گی۔ او۔ کے!" اتنا کہہ کر بڑی بے نیازی سے رسیور کریڈل میں اور سگار کی راکھ ایش ٹرے میں ڈالتے ہوئے ہماری طرف متوجہ ہوئے "کہیے جناب، کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اور اس سے پہلے کہ جناب بر سر مطلب آتے، ٹیلی فون پھر بج اٹھا۔ "جی بول رہا ہوں،" وہ ٹیلی فون میں گنگنائے "جی ہاں، منتری جی سے بات ہو گئی ہے — کام بنا ہی سمجھیے — اور ہاں۔ رات کو آٹھ بجے کستوری میں ڈنر پر ملاقات کیجیے، پوری بات وہیں بتا دوں گا،" وہ ٹیلی فون رکھ کر ہماری طرف متوجہ بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ گھنٹی تیسری مرتبہ بجی۔ آخر جب دسویں مرتبہ ظالم سماج کی طرح ٹیلی فون کی گھنٹی ہم دونوں کے بیچ دیوار بنی تو ہمارے صبر کا پیمانہ خاصا وسیع ہونے کے باوجود چھلک اٹھا۔ ہم اٹھنے ہی کو تھے کہ انھوں نے جلدی سے فون کاٹ دیا اور ہم سے سوال کیا "آپ کس طرح کی نوکری چاہتے ہیں؟" ہم نے جواب دیا کہ "یوں تو ہم یونیورسٹی کی ملازمت کو ترجیح دیا کرتے ہیں مگر وقت گزاری کے لیے کلرکی ولرکی بھی چل سکتی ہے"

ہماری بات سن کر انھوں نے کہا "یونیورسٹی میں ایک جگہ ہے تو۔ لیاقت بھی مطلب بھر کی ہے — بس ذرا کمی ہے تو تجربے کی!" ہم نے قائل کیا "تجربہ کوئی لے کر تو پیدا نہیں ہوتا۔ نوکری کرے گا تبھی تو ہوگا!" وہ بولے "بیشک! پھر دم توڑتے ہوئے سگار کو دو چار کش لے کر زندہ کیا اور کہا "تھوڑا بہت خرچ تو کرنا ہی پڑے گا!" ہم نے پوچھا "اندازاً کتنا؟" انھوں نے انگشت شہادت سے ہوا میں کچھ حساب لگا کر بتایا "ایک ہزار نو سو ستائیس روپے پچانوے پیسے۔" ہم نے دل ہی دل میں ان کی بلائیں لیں کیوں کہ ہمیں ایک دوسرے صاحب نے یونیورسٹی کی ملازمت کے لیے کچھ اور ہی بتایا تھا۔ پھر بھی ہم نے خاندانی بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قدرے بے نیازی سے سوال کیا "یہ رقم کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی؟" کہنے لگے "بوہنی کا وقت ہے، چلیے پچانوے پیسے کم دے دیجیے گا!" ہم نے سوچا اس بندۂ خدا پر اس وقت نیکی سوار ہے، زیادہ مول تول کرنے سے بھڑک نہ جائے اس لیے فوراً ہی اپنی رضامندی دے دی۔ انھوں نے کاغذ اور قلم ہمارے سامنے رکھتے ہوئے کہا "تو لکھیے درخواست — میں بولتا ہوں!"

ہم نے قلم سنبھالا اور انھوں نے بولنا شروع کیا "محترمی — مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی یونیورسٹی کے شعبۂ ..... میں ایک ..." یہاں تک بول کر انھوں نے بجھا ہوا سگار سلگایا پھر ایک طویل کش لے کر کھانسی کے سہارے دھواں چھوڑتے ہوئے پوچھا "کیا لکھا؟" ہم نے کہا "شعبۂ .... میں ایک ...." وہ بولے "ہاں تو آگے لکھیے — ایک چپراسی کی عارضی اسامی خالی ہے ...." ہمارے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا اور ہم نے اپنی خاندانی بردباری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ٹو ان ون سے بھی اونچی آواز میں بگڑ کر کہا "آپ نے ہماری نہیں اس عظیم الشان ڈگری کی توہین کی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ہم نے اپنی زندگی کے ۱۸ قیمتی سال برباد — مطلب یہ کہ صرف کیے تھے" انھوں نے کہا "اجی سنیے تو" ہم پیر پٹک کر بولے "کچھ نہیں سننا۔ باتیں تو کویت اور منتری جی کی کر رہے تھے۔ اب آپ شاید یہ کہیں گے کہ کویت میں جھاڑو لگانے کی اسامی ہے اور منتری جی سے کسی کوٹھی کی ٹٹیاں چھڑکنے پر رکھوانے کی بات ہو رہی تھی!!" پہلے تو وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائے پھر بولے "جی، آپ بالکل ٹھیک سمجھے!"

کچھ نوکری دلانے والے تو اپنی زنبیل میں ایسے ایسے کرشمے رکھتے ہیں جنھیں دیکھ کر خواجہ خضر بھی دنگ رہ جائیں۔ نوکری حاصل کرنے کی مہم کے دوران ہماری ملاقات ایک ایسے معجز نما سے بھی ہوئی۔

انھوں نے خالی اسامیوں کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے رکھ دی۔ یہ سب ایسی تھیں جن کے لیے سائنس، کامرس، انجنیئرنگ کمپیوٹر وغیرہ کی اعلا قابلیت اور وسیع تجربہ لازمی تھا۔ تنخواہیں بھی "ہوشربا" تھیں مگر ہمارے لائق کوئی بھی نہیں تھی یا یوں کہیے کہ ہم کسی کے لائق نہیں تھے۔ ہماری مایوسی کو بھانپتے ہوئے انھوں نے کہا "آپ گھبرائیں نہیں، ان میں سے جو جگہ آپ کو پسند ہو بلا تامل و تکلف بتائیں" ہم نے کہا "مانا کہ کشش ثقل کی تھیوری نیوٹن کے بجائے عمر خیام کی دریافت تھی لیکن کوئی رباعیات خیام پڑھ کر سائنس داں تو بن نہیں سکتا!" انھوں نے کہا "یہ سب ہمارے اوپر چھوڑ دیجیے" پھر ایک آنکھ دبا کر بولے "کہیے تو پریوں کے دیس

باقی صفحہ ۱۶ پر

غــــــــــزلیں

یعقوب عامر

یہ تو نہیں کہ میری وفا میں اثر نہ تھا
لیکن مزاج یار ہی کچھ معتبر نہ تھا

خود میری انگلیوں کو تردد نے ڈس لیا
خط جس کو لکھ رہا تھا مجھے اس کا ڈر نہ تھا

نیند آسکی نہ کل مجھے کوشش کے باوجود
جیسے یہ اور گھر تھا کوئی میرا گھر نہ تھا

سب لوگ مبتلا تھے زمانے کے کرب میں
اس بھیڑ میں مگر کوئی آشفتہ سر نہ تھا

منزل پہ آکے سارے تصور بکھر گئے
اچھا ہوا کہ ساتھ کوئی ہم سفر نہ تھا

لوگ آئے اور بہار کا مژدہ سنا گئے
لیکن ہمارے نام کا کوئی شجر نہ تھا

کیا گلہ کرتا گئی مری بے رنگی حیات
اتنا تو میری ذات سے وہ بے خبر نہ تھا

عامر جب اس کے ساتھ میسر تھیں قربتیں
رسوا تھا ان دنوں بھی مگر اس قدر نہ تھا

۱۵۰۔ غالب اپارٹمنٹس، پروانہ روڈ، پیتم پورہ، دہلی ۳۴
یوجینا، نئی دہلی

تحسین منور

غم مجھے میری جان، چھوٹا سا
ہے مرا کل جہان، چھوٹا سا

پھر خدا بن کے آگیا کوئی
یا خدا امتحان، چھوٹا سا

نیند آئی تو خواب پورا ہوا
بن گیا اک مکان، چھوٹا سا

ظلم کا تیر جب گلے پہ لگا
ہنس دیا، بے زبان، چھوٹا سا

میری قسمت میں اس نے لکھا ہے
بس یہی آسمان، چھوٹا سا

ایک نقطے میں نور سمٹا ہوا
وسعتوں کا نشان، چھوٹا سا

۱۶۵۔ حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۷

عامر قدوائی

اب بھی زندہ ہے سرابوں کے سہارے کوئی
اس کو خوابوں کی بلندی سے اتارے کوئی

بھولے بھٹکے ترا خط آئے تو یہ لگتا ہے
جیسے یادوں کے سمندر سے پکارے کوئی

اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو توبہ
جیسے دریا میں چراغوں کو اُتارے کوئی

کچھ ہمیں کو نہیں فرصت کہ اُدھر دیکھ سکیں
یوں تو کرتا ہے ہمیں روز اشارے کوئی

بیش قیمت ہیں یہ آنسو انھیں ضائع نہ کرو
ایسے مٹی میں ملاتا ہے ستارے کوئی

چاہے دنیا میں کہیں بھی ہوں چلے آئیں گے
دل کی وادی سے تو اک بار پکارے کوئی

اک طرف ڈوب رہی ہے مری کشتی عامر
اور کھڑا دیکھ رہا ہے وہ کنارے کوئی

سکریٹری، پی۔ سی۔ ایف۔ لٹریری کلب، ۳۲۔ اسٹیشن روڈ لکھنوا

گنگا

غمگین قریشی

ہمیشہ سے ہزاروں پاپیوں کے پاپ دھوتی ہے
مگر اے گنگا میّا تو نہ تھکتی ہے نہ سوتی ہے
ترا پاکیزہ آنچل ڈھانپ لیتا ہے گناہوں کو
تری آغوش ملتی ہے فقیروں بادشاہوں کو
عقیدت مند تری معرفت کے گیت گاتے ہیں
کہیں بھی ہوں تری خاطر ہری کے دوار آتے ہیں
ترے ساحل پہ لاکھوں بھکت جب اشنان کرتے ہیں
یہ منظر خوبصورت ہی تجھے ذی شان کرتے ہیں
ترے شاداب دامن میں شوالوں کا رچاؤ ہے
پہاڑوں سے اتر کر یہ ترا پہلا پڑاؤ ہے
ترا آغاز ہوتا ہے ہمالہ کی فضاؤں سے
تو اے گنگا نکل کر آئی شنکر کی جٹاؤں سے
الگ سب سے تری موجوں کا اندازِ روانی ہے
تری ہر بوند امرت ہے مقدس تیرا پانی ہے
جہاں والے بڑائی کو تیری تسلیم کرتے ہیں
تبرک کی طرح پانی ترا تقسیم کرتے ہیں
ہزاروں لوگ "ہر" کی پیڑی پہ تجھ میں نہاتے ہیں
ہزاروں لوگ تجھ میں پھول اپنوں کے بہاتے ہیں
یہی دیکھا ہے رہتی ہے سدا کوشش زمانے کی
قریب المرگ انسانوں کو گنگا جل پلانے کی
ترے دھاروں سے ملتا ہے پیام کیف سامانی
وفا کا درس دیتا ہے ترا بہتا ہوا پانی
بہت مشہور ہے دنیا میں آسودہ روی تیری
کہیں رہتے ہوں لیکن قدر کرتے ہیں سبھی تیری
یقیناً کشورِ ہندوستاں کی شان ہے گنگا
ہمارے واسطے اللہ کا احسان ہے گنگا

ڈھولی کھال، سہارنپور (یوپی)

غزل

سدھیر کمار پرواز

ہم سے مت پوچھو کہ ہم جیون میں کیا کرتے رہے
جس نے کی ہم سے جفا، اس سے وفا کرتے رہے

ہم کو یہ معلوم ہے کہ بے وفا ہیں وہ مگر
پھر بھی ان کی چاہ میں خود کو فنا کرتے رہے

بھولنا بہتر ہے ان کو ورنہ ہم مٹ جائیں گے
بے وفائی کا اگر ان سے گلہ کرتے رہے

تم نے کب انسانیت کی شاعری میں بات کی
صرف حسن و عشق کا تم تذکرہ کرتے رہے

بعد مرنے کے انھیں عزت ملی سنسار میں
جو مٹا کر خود کو اوروں کا بھلا کرتے رہے

کیا ملا پرواز کو تم سے لگا کر دل صنم
غم زدہ کو اور بھی تم غم زدہ کرتے رہے

جالو نگر سہارنپور (اتر پردیش)

بقیہ کور ۳ : طوفانی ہوائیں

(د) کمزور طوفان کا سب سے باہر والا علاقہ جہاں ہلکی ہوائیں چلتی ہیں۔

"ہر کمالے را زوالے" کے مصداق جوں ہی طوفان باد و باراں بری علاقوں میں داخل ہو جاتا ہے، اس کے منتشر ہونے کا عمل بھی شروع ہو جاتا ہے۔ زمین کے جغرافیائی محل وقوع کے عوامل سے مسلسل حرکت اضافی اور نمی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے، اس طوفان کی توانائی تیزی کے ساتھ کم ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ چنگھاڑتی ہوئی ہوائیں کمزور ہو جاتی ہیں اور مرکزی علاقہ میں ماحول کا دباؤ تیز تر ہو جاتا ہے۔ بارش البتہ موسلا دھار ہی ہوتی ہے۔

طوفانی ہواؤں کے علاقے

جیسا کہ ان کے نام ہی سے ظاہر ہے، گرم علاقوں کے ہوائی طوفان، سطح سمندر کے قریب نسبتاً گرم علاقوں سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ خطِ استوا سے کچھ ہی ڈگری دور سے آغازِ سفر کرتے ہیں اور دونوں نیم کروں میں قطبین کی سمت میں چلنے لگتے ہیں۔ ہوائی طوفان عام طور سے مون سون سے پہلے یا مون سون کے بعد کے موسم میں عرض بلد کے ۵ ڈگری شمال اور ۱۵ ڈگری شمال کے درمیان بحرِ ہند، خصوصاً خلیج بنگال اور بحیرۂ عرب میں پیدا ہوتے ہیں۔ دورانِ سفر وہ نمی کی کافی سے زیادہ مقدار خود میں جذب کر لیتے ہیں۔ خلیج بنگال کے ہوائی طوفان مغرب یا شمال۔ مغرب کا رخ اختیار کرتے ہیں اور ہندوستان کے مشرقی ساحلوں کو زد میں لاتے ہیں۔ جو طوفان شمال۔ مشرقی سمت میں چلتے ہیں وہ بنگلہ دیش اور میانمار کے ساحلوں پر وار کرتے ہیں۔ دنیا بھر میں خلیج بنگال شدید قسم کے ہوائی طوفانوں کے جنم داتا کے طور پر مشہور رہے۔

طوفانِ باد و باراں کے دوران ساحلی علاقوں میں سمندر کا پانی زمینی خطوں میں بھر کر سیلاب لاتا ہے اور تباہی مچا دیتا ہے۔ جانوروں کی ایک خاصی تعداد اس سیلاب کی نذر ہو جاتی ہے جھونپڑیاں اور مکان منہدم ہو جاتے ہیں اور قابلِ کاشت زمین میں سمندری ریت اور مٹی سما جاتی ہے۔ تجزیاتی طور پر یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ کسی بھی آفاتِ سماوی سے زیادہ سمندر کی یا یہ حد سے زیادہ سیلاب نفس موجیں انسانی جان و مال کے اتلاف کا سبب ہیں۔ برصغیر کے مشرقی ساحلوں کے ساتھ لگنے والے تامل ناڈو، آندھرا پردیش، اڑیسہ، مغربی بنگال اور بنگلہ دیش کے علاقے ان طوفانوں کے غیظ و غضب کی زد پر رہتے ہیں۔

۱۹۶۴ء میں اس طوفان نے خلیج بنگال میں کنٹائی کے مقام پر حد ساحل سے تجاوز کیا اور ساحل سے تقریباً زاویۂ قائمہ کی سمت میں چلنا شروع کیا۔ خلیج بنگال کے شمال۔ مغرب میں پانی کا بہت بڑا ذخیرہ ہو گیا تھا۔ طوفان کی لہریں ۱۲ میٹر اونچی تھیں۔ ۵۰ ہزار آدمی ڈوب کر مر گئے اور بعد ازاں مزید ۳ ہزار آدمی سیلاب کے باعث پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہو کر لقمۂ اجل بن گئے۔

نومبر ۱۹۷۰ء کے بنگلہ دیش کے طوفان کا سبب مدراس کے مشرق میں تقریباً ۸ سو کلو میٹر دور علاقے میں ہوا کا دباؤ کم ہوتا تھا۔ ۱۰ نومبر تک دباؤ کی اس کمی نے ایک شدید طوفان کی شکل اختیار کی۔ شمال مشرقی رخ میں چل کر یہ طوفان ۱۲ نومبر کو کلکتہ کے مغرب میں ۳ سو کلو میٹر دور علاقے میں پہنچ گیا۔ اچانک ہی اس کا رخ مشرق کی طرف ہو گیا اور یہ ۱۳ نومبر کی صبح کے اوقات میں چٹاگانگ کے علاقے کو پھلانگتا ہوا بنگلہ دیش میں داخل ہو گیا۔ ہندوستان کے ساحلی علاقوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ مشکل سے اس طوفان کی ضرب سے محفوظ رہے۔

ہر چند کہ ہوائی طوفانوں کو فطرت کے ایسے ایجنٹ کے طور پر پہچانا گیا ہے جو خطرناک اور بے رحم قاتل ہے، پھر بھی اس نبٹنے کے لیے بھرپور اور کامیاب اقدامات کرنا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ تاہم اب بروقت اطلاع سے کافی حد تک انسانی جان و مال کے تلف ہونے کے مسئلہ پر قابو پایا گیا ہے۔ موسمیات کے مزاج کا تشخیص کرنے والے آلات کی مدد سے اب یہ ممکن ہو سکا ہے کہ طوفانی ہواؤں کی پیدائش کے امکانات، ان کے سمتِ سفر اور ان کی شدت کے متعلق قبل از وقت جانکاری حاصل ہو۔ یہ قابلِ قدر اور قابلِ پذیرائی ہے۔ ہندوستان میں موسمیات سے متعلق محکمے نے کلکتہ، وشاکاپٹنم، مدراس، پورٹ بلیر اور بمبئی میں ان طوفانوں سے متعلق خطرے کی اطلاع دینے والے مراکز میں طاقتور راڈار نصب کیے جائیں۔ حالیہ ایام میں مزید سائنسی نوعیت کے اقدام بھی کیے گئے ہیں۔ اب الیکٹرانک کمپیوٹر کے ذریعہ طوفانی ہواؤں کی نقل و حمل کا پتا لگایا جانا ممکن ہوا ہے۔ جب کوئی طوفان راڈار کے ۴ سو کلو میٹر کے دائرے میں نظر آتا ہے، پھر اس پر نظر رکھ کر مناسب وقت پر لوگوں کو اس آمد سے خبردار کیا جا سکتا ہے۔ آج کل خطرے کی اطلاع ۱۵ سے ۲۵ گھنٹے قبل دینے کی سہولت موجود ہے۔

تامل ناڈو، آندھرا پردیش، اڑیسہ اور مغربی بنگال میں راڈار نصب کرنے اور ان کے جال کو مزید وسیع کرنے کے خصوصی انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ طاقتور راڈاروں کی مدد سے طوفانی ہواؤں کی آمد پر نظر رکھی جا سکتی ہے اور خطرے کی اطلاع وقت پر دے کر ان سے ہونے والے نقصان کو سرے سے ٹالا جا سکتا ہے یا کم کیا جا سکتا ہے۔ ●

بقیہ : گاؤں میرے خواب لے کا

طرزِ فکر کو ترجیح دی ہے۔

کچھ بھی کہا جائے صنعتی پھیلاؤ اور بڑے پیمانے پر پیداوار کچھ بہت پرانی باتیں نہیں۔ ہمیں علم نہیں کہ ان سے ہماری خوشیوں میں کیا اور کتنا اضافہ ہوا مگر اتنا تو واضح ہے کہ یہ اپنے جلو میں حالیہ عالمی جنگیں لے آئیں۔ ابھی دوسری جنگ عظیم جاری ہے یہ کب اختتام پذیر ہوگی کچھ خبر نہیں مگر ابھی سے تیسری عالمی جنگ کی باتیں سننے میں آ رہی ہیں۔ ہمارا ملک کبھی اتنا ناآسودہ اور مبتلائے مصیبت نہیں تھا جتنا کہ یہ فی الوقت ہے۔ شہری لوگ ممکن ہے اچھا منافع کماتے ہوں اور انھیں مناسب اجرت ملتی ہو۔ لیکن یہ سب دیہاتوں کا خون چوسنے کے عمل سے ممکن ہوا ہے۔ ہمیں لاکھوں کروڑوں نہیں چاہئیں۔ گاؤں خود کفیل ہوں اور خود انحصاری کی منزل سر کریں، ہمیں اتنا ہی چاہیے لیکن خیال رہے کہ خود کفالت سے متعلق میرا نظریہ محدود نہیں۔ خود کفالت کے میرے نظریے میں خود غرضی اور تحکم کی کوئی گنجائش نہیں۔" ●

ڈاکٹر نجیب اختر

ہندوستانی جمالیات۔ ایک تعارف

ہندوستانی تہذیب اور اس کی قدروں میں ہندوستانی جمالیات کے جو نقوش پنہاں ہیں اور ہندوستانی تہذیب اور فنون لطیفہ نے کس طرح مختلف نسلوں اور قوموں کے تجربوں کو ہم آہنگ اور اپنے اندر جذب کر کے اعلا جمالیاتی اقدار کا امین بنا دیا ہے، جس میں صدیوں کی دروں بینی اور اعلا ژرف نگاہی شامل ہے۔ ہندوستانی تہذیب کے سرچشموں ہی سے ہندوستانی جمالیات کا معیار و اعتبار قائم ہوا ہے۔ ہندوستان کے فنون ہمیں ہزاروں برسوں کے جمالیاتی تجربوں کے تیئیں بیدار کرتے ہیں۔ یہاں کے فنکاروں کا جمالیاتی شعور بیدار اور متحرک رہا ہے جس کی وجہ سے فنون کی جمالیاتی سطح بلند رہی ہے اور اس وجہ سے اعلا جمالیاتی صورتوں کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔

تخلیقی آرٹ کا رشتہ اپنی تہذیب سے بہت گہرا ہے۔ قدیم فن تعمیر، فن مجسمہ سازی، فن مصوری اور فن موسیقی وغیرہ کس طرح جمالیاتی جہتوں سے آشنا کرتی ہیں۔ مذہبی اور متصوفانہ تجربے، مندروں کی بنیادیں اور دیوی دیوتاؤں کے جلوے، زندگی کے جلال و جمال کو نمایاں کرتے ہیں۔ ہندوستانی معاشرے میں جسم، زمین اور جنگل اور پرندوں، جانوروں اور پھولوں کی ہمیشہ اہمیت رہی ہے۔ انہی کے ذریعہ کائنات اور روحانی اقدار کو پہچاننے اور ایک جمالیاتی وحدت کو سمجھنے کا شعور پیدا ہوا ہے۔

جمالیاتی جہتوں سے ادب اور فنون لطیفہ کے مطالعے کو آگے بڑھانے اور وقار و اعتبار بخشنے والوں میں سب سے اہم اور نمایاں ناموں میں ایک نام پروفیسر شکیل الرحمٰن کا ہے۔ "جمالیات" نسبتاً ایک مشکل ترین نظریہ تنقید ہے، جس کی طرف چند ایک لوگوں نے ہی توجہ کی ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے ادب پاروں اور فنون لطیفہ کی تفہیم اور پرکھ خاص جمالیاتی نقطۂ نظر سے کی ہے اور ان کی شناخت اردو کی ادبی تنقید میں ان کے خاص جمالیاتی نقطۂ نظر کی وجہ سے ہی بنی ہے۔

"ہندوستانی جمالیات" ان کی تازہ تصنیف ہے اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی جمالیات کا مطالعہ انھوں نے اسی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ پہلی جلد نو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے "ہندوستانی تہذیب کا نظام جمال"۔ ہندوستانی تہذیب انسان کی اعلاترین قدروں کا سرچشمہ ہے۔ اس نے مختلف قوموں اور نسلوں کے جمالیاتی تصورات کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ ہندوستانی تفکر میں متضاد خیالات اور تصورات کی کمی نہیں ہے۔ لیکن یہ افکار و خیالات کسی نہ کسی سطح پر ایک ہی سچائی کی جانب بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بقول مصنف جمالیات کی تاریخ میں یہ واحد نظام جمال ہے کہ جس نے اعلا اور افضل ترین تجربوں کو قبول کرتے ہوئے کسی تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی جمالیات کا دائرہ بہت ہی وسیع، تہہ دار اور حد درجہ معنی خیز بن گیا ہے۔

● "یوگ" نے ہندوستانی فکر و نظر اور نظام جمال کو متاثر کیا ہے۔ "یوگ" دراصل فرد اور کائنات کی وحدت کا نام ہے جس کے لغوی معنی ملنے، ہم آہنگ ہونے اور جذب ہونے کے ہیں۔ رقص ہو یا موسیقی، فن تعمیر ہو یا فن مجسمہ سازی یوگ بنیادی جوہر ہے۔ یوگ فنون لطیفہ کی روح ہے اور جلال و جمال کا بنیادی سرچشمہ۔

● "ہندوستانی جمالیات" کا گہرا باطنی رشتہ قدیم نسلی اور قبائلی زندگی کے عقائد اور توہمات، سماجی اور مذہبی تصورات اور تمدنی انداز فکر سے قائم ہے۔ تہذیبیں بنیادی طور پر سماجی ثقافتی مرکبات ہیں، جو مختلف عہد اور علاقوں میں ظہور پذیر ہو کر اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ ہندوستانی نظام جمال اور عوامی احساسات و جذبات کے گہرے رشتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کلچر کی مختلف اکائیوں کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کیوں کہ یہی اکائیاں وحدت کا شعور عطا کرتی ہیں اور ثقافتی تخلیقی محنت کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ اس کے بغیر نظام جمال کا مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ کلچر صرف مادی نہیں ہوتا یہ انسان کے ماحول کو خوبصورت اور دلکش بنانے کا نام ہے۔ تخلیقی محنت اور ہر شے میں حسن کی آرزو کہ جن کی وجہ سے ایلورا، اجنتا، ایہولے اور کھجوراہو اور بھرت نایتم، کچی پڑی اور کتھا کلی کی تخلیق ہوئی ہے۔

دوسرے باب میں "ہندوستانی فنون لطیفہ اور عوامی حسیات" کے موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ابتدا میں بنیادی امتیازی پیکر "ناگ" پر گفتگو کی گئی ہے۔ "ناگ" کو مذہب اور عوامی عقائد میں خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور ہندوستانی تہذیب میں "سانپ" یا ناگ

سینٹر آف انڈین لینگویجز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی

ایک متحرک معنی خیز پیکر رہا ہے، جس کی وجہ سے فنون میں بھی یہ حسی پیکر مختلف قصوں اور کہانیوں میں علامتی معنویت لیے ہوئے موجود ہے۔ اس نے فنون پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ ناگ پوجا میں صرف احساس اور عمل نہیں بلکہ ذات کا اظہار بھی ہے۔ اس نے تمدنی قدروں اور سماجی اور اخلاقی رویوں کی تشکیل کی ہے۔ اس کی عبادت کی تاریخ ماضی کی تاریکیوں میں پوشیدہ ہے۔ بدھ ازم میں بھی یہ پیکر موجود ہے۔

اسی باب میں پھول اور پودوں کی اہمیت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ یہ داخلی تہذیب کے اشارے ہیں۔ عوام نے ان کے ذریعے اپنے احساس جمال کو ظاہر کیا ہے۔

ہندوستانی سماج میں لکیروں، خاکوں اور رنگوں کو کیا حیثیت حاصل رہی ہے؟ عوامی جذبات و احساسات سے ان کا کیا رشتہ رہا ہے؟ ہندوستانی تہذیب میں صورت یا فارم کی کیا اہمیت رہی ہے اور ساتھ ہی ینتروں اور منتروں کے رشتوں، مذہبی اور فلسفیانہ سطحوں کے ساتھ جمالیات پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔

تیسرا باب "کلا" بنیادی جمالیاتی تصور ہے۔ تخلیقی آرٹ کی اہمیت اور تخلیق کے پیچیدہ عمل کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "کلا" کو ہندوستانی جمالیات میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ جمالیات کے عالموں نے کلا سے تخلیقی آرٹ کی مختلف توضیحیں کی ہیں۔ کلا کی جمالیاتی قدروں اور کیفیتوں کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں جمالیاتی نقالی کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ نقالی کا تصور ہندوستانی جمالیات میں یونانی تصور سے کس قدر مختلف ہے۔ اور تجربوں کی سطح کتنی بلند اور ارفع ہے اور فنی تخلیق کو کتنا برتر اور افضل تصور کیا گیا ہے ـــــ

پانچویں اور چھٹے باب میں وحدت جلال و جمال، آہنگ اور آہنگ کی وحدت کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ کائنات کے باطن میں جو پُراسرار آہنگ ہیں ان کا تخلیقی اظہار آہنگ کی وحدت سے ہوتا ہے جو فنون کی روح ہے۔ اس کے مطالعے کے بغیر ہندوستانی جمالیات کی روح تک نہیں پہنچا جا سکتا ـــــ ساتویں باب میں وبھو (VIBHAVA) اور (RASA) کو جلال و جمال کے تصورات کے پیش نظر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

آٹھویں باب کا تعلق "آنند" سے ہے۔ ہندوستانی فنون لطیفہ میں اعلا سطح پر مسرت اور لذت حاصل کرنے کی آرزو نے آنند کو جنم دیا ہے۔ اعلا اور افضل جمالیاتی تجربہ وہی ہے جس سے "آنند" حاصل ہو۔

نویں باب میں اظہار کے حسن پر گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ تجربہ اور اظہار کی وحدت ہی فن ہے۔ النکاروں کی وضاحت کی گئی ہے۔ تشبیہوں اور استعاروں کو تمام فنون میں اظہار کے حسن کے بنیادی اقدار سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"ہندوستانی جمالیات" کی دوسری جلد میں درج ذیل ابواب اور عنوان کے تحت اظہار خیال کیا گیا ہے۔

"رقص اور کائناتی آہنگ" میں رقص کو ہندوستانی جمالیات کا سب سے بڑا سرچشمہ بتایا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہندوستانی جمالیات کے تمام فکری سرچشمے اس سرچشمے سے پھوٹے ہیں۔ جسم اور روح اور تمام عناصر و اشیا کے پُراسرار وحدت کا شعور سب سے پہلے اس عظیم تر رقص سے حاصل ہوتا ہے۔ شیو کا رقص یوگ کا نقطۂ عروج ہے۔" ص ۱۰ جلد دوم۔

"ہندوستانی تہذیب نے جسم کے آہنگ کو ہمیشہ اہم تصور کیا ہے۔ روح کا آہنگ جسم کا آہنگ بن گیا ہے۔ روح اور جسم کی وحدت نے کائنات کے آہنگ سے پراسرار باطنی رشتہ قائم کیا ہے۔ کائنات اور فطرت کے آہنگ کو چھوتے ہی روح اور جسم میں مترنم حرکت پیدا ہو گئی اور یہی حرکت شیو یا نٹراج کے پیکر میں مجسم ہو گئی۔" ص ۱ جلد دوم

گویا ہندوستانی جمالیات میں رقص کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور شیو کے رقص کو یوگ کا نقطۂ عروج تسلیم کیا گیا ہے۔ اس باب میں رقص کی جمالیات کے امتیازی پہلو پیش کیے گئے ہیں اور اس کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے بھرت ناٹیم، سیو شیلڈ ناٹیم، برہم میلہ، کچی پیڑی، کوراونجی، کتھاکلی، موہنی آٹیم، کتھک اور منی پوری کے خصوصیات اور ان کی جمالیاتی جہتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں "موسیقی ـــــ تخلیقی فن کے باطن کا آہنگ" میں موسیقی کو فنون لطیفہ اور تخلیقی آرٹ کے باطن کا آہنگ بتایا گیا ہے۔ یعنی تخلیق کے اندرون میں موسیقیت پنہاں ہے۔ فنون لطیفہ اور آرٹ کے تخلیقی مراحل موسیقی کے بغیر تکمیل کے مراحل طے نہیں کر سکتے۔ اس طرح موسیقی کی حیثیت روح کی ہو جاتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"رقص، مصوری، مجسمہ سازی اور فن تعمیر سب کے باطن میں اس کا آہنگ ہوتا ہے۔ رقص کو موسیقی سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا، مصوری کے خاکوں اور لکیروں اور کینوس کے زاویوں میں موسیقی کی لہریں ہوتی ہیں، مجسموں کے نقوش اور فن تعمیر اور نقاشی کے اندر اس کی لہریں دوڑتی ہیں، چونکہ اس کا رشتہ انسان کے بنیادی جذبوں سے ہے۔ اس لیے کسی بھی تخلیق کا تصور موسیقی کے آہنگ کے بغیر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ موسیقی کی لہریں "نروس سسٹم" سے بیدار اور متحرک ہوتی ہیں۔ فطرت کی آوازوں سے نظام اعصابی میں تحرک پیدا ہوتا ہے اور موسیقی جنم لیتی ہے۔" ص ۷۰ جلد دوم۔

رقص، مصوری، مجسمہ سازی اور فن تعمیر سب میں موسیقی کا بنیادی آہنگ موجود ہے۔ چوں کہ اس کا رشتہ انسان کے بنیادی جذبوں سے ہے اور جذبے اپنے اندر ایک خوشنما ترنم رکھتے ہیں جو تخلیقی مرحلے میں اس کے رگ و پے میں جاری و ساری رہتا ہے۔ اس لیے ہندوستانی جمالیات میں اس کا مقام بھی بہت بلند ہے۔ ہندوستانی موسیقاروں نے فطری ارتعاشات کو سمجھتے ہوئے جو نفیس اور نازک مدارج قائم کیے ہیں وہ قابل توجہ ہیں۔

تیسرے باب "فن تعمیر ـــــ شیو شکتی کے تحرک کا آہنگ" میں فن تعمیر کی جمالیات کو اجاگر کیا گیا ہے اور شیو شکتی کے تحرک کے آہنگ کو پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاریخی جائزہ لیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ فن تعمیر اور فن مجسمہ سازی میں مختلف قوموں، نسلوں اور قبیلوں کا خون جگر اور

ان کا فکر و شعور شامل ہے۔ دائرہ مربع اور مثلث وغیرہ کی جمالیاتی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ریاضیاتی اور ہندسی سچائیوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح فن تعمیر کا دلچسپ اور معنی خیز مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

آخری باب فن مجسمہ سازی اور فن مصوری سے متعلق ہے اور ان فنون کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مجسمہ سازی کی روایت بہت قدیم اور اس کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ یہ مجسمے جہاں آفاقی احساسات اور ماورائی سطحوں کا شعور بخشتے ہیں وہاں سماجی اقدار اور تجربات کا احساس و شعور بھی عطا کرتے ہیں ـــــ مصوری کی تاریخ بھی بے حد قدیم ہے، مصوری مجسمہ سازی کی بنیاد رہی ہے لیکن ابتدائی نمونے محفوظ نہیں ہیں اس لیے قدیم غاروں کے نقش و نگار سے قدیم ہندوستانی مصوری کی قدروں کو سمجھا جاسکتا ہے۔ "ہم آہنگی" اور "حرکت" کو ہندوستانی مصوری کی بنیادی خصوصیت بتایا گیا ہے۔ ہندوستانی مجسمہ سازی اور مصوری میں مختلف نسلوں کے جو تجربے ملتے ہیں، تخلیقی پیکروں کے علاوہ مصوری کی امتیازی خصوصیات اور اس فن کی جمالیاتی جہتوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ عظیم ماں، عورت اور درخت، اودھ نار الیشور، عورت، متھن، شیو، شیولنگ، نٹ راج، وشنو، گنیش، ہمالہ، کیلاش، گنگا، بدھ، بودھسو اور چند دوسرے پیکروں کی تخلیق اور ان کی جمالیاتی جہتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اس طرح ڈاکٹر شکیل الرحمٰن نے ہندوستانی جمالیات میں بنیادی فکری عناصر اور تہذیبی رویے کی نشاندہی کی ہے کہ کس طرح مختلف قوموں اور نسلوں کے فکر و شعور نے ہندوستانی جمالیات کی تشکیل میں حصہ لیا ہے اور کن کن عناصر سے مل کر ہندوستانی جمالیات کا خمیر تیار ہوا ہے اور فنون لطیفہ میں ہندوستانی جمالیات کے جو نقوش پنہاں ہیں اس کو ایک وسیع تر پس منظر کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہمارے خیال میں اردو میں اپنی نوعیت کی یہ اولین کوشش ہے۔ ہمارے یہاں عام طور پر میر و غالب اور اقبال و شاد سے بات آگے نہیں بڑھتی ہے۔ ہم دوسرے موضوعات پر غور و فکر کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس طرح روایتی موضوعات سے ہٹ کر ایک بہت وسیع تر موضوع پر اظہار خیال کرنا اور بھرپور مطالعے کے بعد موضوع کو اپنی گرفت میں لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جبکہ اردو میں کوئی مواد اس موضوع سے متعلق موجود نہیں ہے اور جو مواد دوسری زبانوں میں ہیں، ہندوستان کے مختلف حصوں، کتب خانوں اور عجائب گھروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ جاکر بنیادی مواد کی فراہمی کا کام بڑے حوصلہ اور دل جگر کا کام ہے۔ یہی نہیں بلکہ انگلستان کی لائبریریوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمٰن کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انھوں نے جمالیاتی تصور تنقید کا شعر و ادب اور فنون لطیفہ پر عملی اطلاق کر کے دکھلایا ہے۔ امید ہے کہ اردو دنیا میں اس کتاب کا استقبال کیا جائے گا۔ ●

ممبر پارلیمنٹ کی علاقائی ترقیاتی اسکیم کے لیے ۹۰ کروڑ روپے

پروگراموں پر عمل درآمد سے متعلق محکمے نے ۹۶-۱۹۹۵ء کے لیے ممبر پارلیمنٹ کی علاقائی ترقیاتی اسکیم کے تحت ۹۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی ہے۔ پہلی قسط جون۔ جولائی سے جاری کی جاتی ہے۔

منصوبہ بندی اور پروگراموں پر عمل درآمد کے وزیر مملکت شری گریدھر گومانگو نے اپنی وزارت سے وابستہ پارلیمانی مشاورتی کمیٹی کی میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے یہ اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء تک دستیاب اطلاعات کے مطابق پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے منتخبہ اور نامزد اراکین سمیت لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے تمام انتخابی حلقوں کے لیے ۷۱۱ کروڑ روپے کی رقم جاری کی جاچکی ہے۔ شری گومانگو نے کہا کہ ان کے محکمے نے نکنیٹ (این آئی سی انٹرنیٹ) کے ذریعے اس اسکیم پر عمل درآمد کے کام کی پیش رفت کی نگرانی کرنے کے سلسلے میں کارروائی شروع کر دی ہے۔ ●

بقیہ : جہیز

تک پہنچی۔ وہ عوامل چاہے مذہبی ہوں یا تاریخی، سماجی ہوں یا اقتصادی کو بدلنے کی حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے۔ تمام مذاہب میں مساوات کی تبلیغ کے باوجود آج بھی سماج میں مردوں کو مذہبی طور سے عورتوں پر فوقیت حاصل ہے۔ سماج میں ان کا مقام مردوں کے مقابلے میں کمتر ہے۔ یہیں سے تضاد جنس میں تفریق کرنے کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔ اس کے رفع کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے جس کی وجہ سے ان کے شعور میں بالیدگی آئے گی۔ وہ اپنے حقوق سے آگاہ ہوں گی اور اس کے دفاع کے لیے مناسب اقدام اٹھائیں گی۔ مردوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی انا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مساوات انسانی کی تعلیم کو عملی جامہ پہنائیں۔

(۲) حکومت کو چاہیے کہ وہ عورتوں کو اقتصادی طور سے خود مختار بنائے تاکہ وہ اپنے پیروں پر خود کھڑی ہو سکیں۔ حالیہ وقتوں میں حکومت اس سمت جو اقدام اٹھا رہی ہے اس سے جہیز جیسی لعنت و ملامت آمیز برائی کو ختم کرنے میں مدد ملے گی۔

(۳) مساوات نسواں کی تنظیموں کے ذریعہ اس کے خلاف جو تحریکیں چلائی جارہی ہیں اسے وہ اور زیادہ فعال و متحرک بنائیں۔ انسانی حقوق سے وابستہ تنظیموں کو بھی اس جانب پیش رفت کرنی چاہیے اور اس کے خلاف ایک پرزور محاذ تیار کرنا چاہیے جو جدید تعلیم سے مزین نوجوان طبقے کے بیدار ذہنوں میں طوفان برپا کردے جس کے باعث ان کے دلوں میں جہیز لینے دینے کے خلاف نفرت پیدا ہوجائے کیونکہ آج کے نوجوان طبقے پر ہی کل کے مستقبل ہند کا انحصار ہے۔

(۴) اس رسم کو ختم کرنے کی جانب حکومت ہند نے جتنے بھی قوانین وضع کیے ہیں اسے من وعن عملی جامہ پہنائے۔ اس کے لیے مرکزی و ریاستی حکومتوں کو اس سے منسلک عملے کو چاق و چوبند بنانا ہوگا تاکہ شکایت ملنے پر اس کے خلاف فوراً اقدام اٹھائیں۔

آخر میں ذرائع ابلاغ و ترسیل کے ذریعہ اس کے خلاف ایک زبردست مہم چھیڑنی چاہیے کیونکہ جدید دور میں نئی تکنالوجی کے باعث کسی مسئلے پر رائے عامہ تیار کرنا بہت ہی آسان ہے بشرطیکہ حکومت اور ان سے جڑے سارے اراکین اس مسئلے پر نیک نیتی سے کام لیں اور بس ایک ہی نعرہ دیں کہ شادی سادی ہو۔

اگر ان مذکورہ باتوں پر عمل کیا گیا تو عنقریب ہی جہیز جیسی مہلک رسم سے سماج کو نجات مل سکتی ہے۔ ●

بڑھتے قدم ۔۔۔

(ترقیاتی خبر نامہ)

۹۵-۱۹۹۴ء میں بایوٹکنالوجی کی پیش رفت

۹۵-۱۹۹۴ء میں بنگلور میں واقع انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس نے مولی کیولر بایولوجی اور امیونولوجی کے شعبوں میں اہم پیش رفت دکھائی ہے اس سے متعدد امراض پر قابو پانے میں مدد ملے گی جیسا کہ جاپانی انسیفلائیٹس، روٹا وائرس، ملیریا کے جراثیم وغیرہ۔ یہ بات محکمہ بایوٹکنالوجی کی سالانہ رپورٹ برائے ۹۵-۱۹۹۴ء میں بتائی گئی ہے۔

حیدرآباد میں سیلولر اور مولی کیولر بایولوجی کے مرکز میں نمک کی شناخت کرنے والا ایک آلہ تیار کیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے متعدد قسم کے جین پر کامیاب تجربے ہوئے ہیں۔ اس ویکٹر کے لیے ۸ پیٹنٹوں کے استعمالات کی فہرست مرتب کی گئی ہے۔ متعدد قسم کے جین دریافت کیے گئے ہیں۔

پودوں کے متعلق مولی کیولر حیاتیاتی سائنس نے چاول کے لیے فنگر پرنٹ ٹکنالوجی دریافت کی ہے۔ اس کا استعمال بیجوں کے تصدیق نامے کی صورت میں ہوگا۔

جودھپور کی جے نارائن ویاس یونیورسٹی میں سائنس داں ایسے درختوں کے بارے میں دریافت کرنے میں مصروف ہیں، جو بے آب و گیاہ زمینی خطوں پر اگائے جاسکیں۔

کیسری دال کی پیداوار بڑھانے میں معاون ۵ کلونز دریافت کیے گئے ہیں، کلاپنور، رائے پور، پونا اور دلی میں ان کے تجربے ہو رہے ہیں۔ اب تک اس عمل سے چار فصلیں اگائی جاچکی ہیں۔

نجی سیکٹر کی تقریباً ۱۵ صنعتیں آئل پام کی کاشت اور درجہ بندی میں مصروف ہیں۔ اس سلسلے میں تحقیقی نتائج سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔

پونا کے ادارے میں ٹشو کلچر پر رہنمایانہ پلانٹ کے تیار کردہ ڈھائی لاکھ پودے ۱۲ جنگلاتی محکموں کو دے دیے گئے ہیں۔ آندھرا پردیش، گجرات، کرناٹک، مہاراشٹر اور تمل ناڈو کی زراعتی یونیورسٹی کو بھی ٹشو کلچر کے ذریعے تیار کردہ پودے دیے گئے ہیں۔

دلی کے مرکز پر ۴ لاکھ ۴۲ ہزار پودے تیار کیے گئے اور ہریانہ، اتر پردیش، راجستھان، بہار اور مدھیہ پردیش میں ۴۸۰۷ ہیکٹیر اراضی پر ۲ لاکھ ۴۶ ہزار پودے لگائے گئے۔

الگائی بایو فرٹیلائزر کے نئے ٹکنالوجی پیکج تیار کیے گئے۔ ان کو کسانوں میں بانٹا گیا۔

حیاتیاتی جراثیم پر کنٹرول کرنے کے پروجیکٹ نے کافی ترقی کی ہے۔

اس سال کسانوں کے لیے زراعتی وسائل کے نظم و نسق سے متعلق پروجیکٹ پر عمل درآمد کیا گیا۔ نئی دہلی میں ٹیکہ کے قومی ادارے نے عورتوں کے لیے ایسا ویکسین تیار کرنے کی کوشش کی جس سے حمل روکا جاسکے۔ ●

کلین ٹکنالوجیوں کو فروغ دینے کا پروگرام

مرکزی حکومت کلین ٹکنالوجی کو فروغ دینے کا ایک ملک گیر نظام قائم کر رہی ہے تاکہ آلودگی پھیلانے والے صنعتی شعبے میں کلین ٹکنالوجیوں کی منتقلی کے کام میں سہولت بہم پہنچائی جائے۔ اس نظام میں موثر مظاہروں کے ذریعے بڑے پیمانے پر اپنائے جانے اور حاصل کرنے کے لیے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک دستیاب کلین ٹکنالوجیوں کا جائزہ لینے اور انھیں ترجیح دینے کا کام شامل ہے۔

عالمی بینک نے بڑے اور چھوٹے ساز و سامان کی حصولی کے لیے ۲۔ ارب ڈالر کی خصوصی مالی امداد فراہم کی ہے۔ ایک کروڑ ڈالر کی رقم، جو مظاہرہ جاتی پروجیکٹوں کے لیے مخصوص کی گئی ہے اور جس کا استعمال نہیں کیا گیا ہے، اس پروگرام کے لیے دی جارہی ہے۔ ●

رطوبت معلوم کرنے کا میٹر

کلکتہ میں واقع شیشے اور سیرامک کے مرکزی تحقیقی ادارے نے پسے ہوئے مال میں رطوبت کا جز و فوری اور صحیح طور سے معلوم کرنے کے لیے ایک قابلِ نقل و حمل میٹر تیار کیا ہے۔ اس میٹر کا ڈیزائن بھی اسی ادارے نے بنایا ہے۔ یہ میٹر لکڑی، سیمنٹ، کنکریٹ، پکی چینی، مٹی اور دیگر سیرامک اشیاء کی سطح پر رطوبت معلوم کرنے کے لیے بھی استعمال

کیا جاسکتا ہے۔

رطوبت ماحول کا ایک اہم حصہ ہوتی ہے نیز مال تیار کرنے اور اس کا ذخیرہ کرنے کے سلسلے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ رطوبت کا جزو معلوم ہونا سیرامک کی تیاری، سیمنٹ کی صنعت، خوراک کی ڈبہ بندی، پلائی ووڈ کی تیاری اور الیکٹرونکس کی صنعت کے لیے خاص دلچسپی کا حامل ہے۔ ●

ریلوے کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے اقدامات

ریلوے نے اپنی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ایک سات نکاتی منصوبۂ عمل شروع کیا ہے۔ اس منصوبے میں تکنالوجی کو بہتر اور جدید بنانے، ایندھن کی کھپت اور سازوسامان کے اخراجات میں کمی لاکر اخراجات میں کمی لانے، اثاثوں یعنی رولنگ اسٹاک اور ریل راستوں کو بحال کرنے، زیادہ ہارس پاور والے اور ایندھن کی بچت کرنے والے ریل انجن شروع کرنے، ویکیوم بریک والے پرانے مال ڈبوں کی جگہ رفتہ رفتہ زیادہ صلاحیت اور جدید ایئر بریک والے مال ڈبے شروع کرنے، کوئلے کی نقل و حمل کے لیے بی او بی آر قسم کے از خود ڈسچارج مال ڈبے شروع کرنے اور سگنل کے نظام کو بہتر بنانے کا کام شامل ہے۔ ●

ریل گاڑیوں میں طبی سہولیات

لمبی دوری کی سپر فاسٹ ریل گاڑیوں، راجدھانی اور شتابدی ایکسپریس ریل گاڑیوں سمیت تمام مسافر ریل گاڑیوں میں فرسٹ ایڈ بکس فراہم کیے گئے ہیں، جو گارڈ کے کیبن میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ریلوے صحتی یونٹوں اور اسپتالوں والے اسٹیشنوں پر پیغام ملنے پر ریلوے ڈاکٹر بیمار مسافروں کو دیکھتے ہیں۔ شدید طور سے بیمار مریضوں کو اسٹیشن عملے کے ذریعے اگلے اسٹیشن پر ریل گاڑی کے رکنے پر قریب ترین اسپتال لے جایا جاتا ہے۔ ●

ریلوے کلاک روم سروس کی نجی کاری کرے گا

ریلوے کی وزارت نے علاقائی ریلوں کو ہدایات جاری کی ہیں کہ اہم اسٹیشنوں پر خرچ میں کفایت لانے کے لیے کلاک روم کو چلانے اور دیکھ بھال کے بہت سے کام نجی سیکٹر کو دے دیں۔ اس سے مسافروں کو زیادہ آسائش ملے گی۔

ابتدا میں جنوب سینٹرل ریلوے نے سکندرآباد اور حیدرآباد کے اسٹیشنوں پر کلاک روم کی سروسز نجی سیکٹر کو سونپ دی ہیں۔ سکندرآباد اسٹیشن کے سلسلے میں ۳ لاکھ ۸۷ ہزار روپے سالانہ اور حیدرآباد اسٹیشن کے سلسلے میں ایک لاکھ ۸۱ ہزار روپے سالانہ لائسنس فیس کے طور پر لیے جائیں گے۔ شروع میں یہ ٹھیکہ تین سال کے لیے ہے۔ سکندرآباد اسٹیشن پر اس اقدام سے سالانہ ایک لاکھ دس ہزار روپے اور حیدرآباد اسٹیشن پر سالانہ ایک لاکھ ۷۴ ہزار روپے کی بچت ہوگی۔

ریلوے اب خود اپنے وسائل پیدا کرنے پر زور دے رہی ہے۔ لہٰذا علاقائی ریلوے کفایت لانے اور آمدنی بڑھانے کے لیے بہت سے اقدامات کر رہی ہیں۔ ●

نئی دہلی۔ جے پور شتابدی ایکسپریس کی اجمیر تک توسیع

اجمیر اور دہلی کو شتابدی ریل سروس سے جوڑ دیا گیا ہے۔ موجودہ جے پور۔ دہلی شتابدی ریل گاڑی کی اجمیر تک توسیع کردی گئی ہے، جسے اجمیر میں ریلوے کے وزیر شری سی کے جعفر شریف نے جھنڈی دکھا کر روانہ کیا۔ اجمیر اور دہلی کے درمیان تیز رفتار شتابدی سروس سے پشکر اور درگاہ شریف حضرت خواجہ غریب نواز کے زائرین کی ضروریات پوری ہوں گی۔

یہ شتابدی ریل گاڑی نئی دہلی سے صبح ۶ بج کر ۵ منٹ پر روانہ ہوگی نیز صبح گیارہ بجے جے پور اور دوپہر ڈیڑھ بجے اجمیر پہنچے گی۔ واپسی میں یہ ریل گاڑی شام تین بجکر ۱۰ منٹ پر اجمیر سے روانہ ہوگی نیز شام ۵ بجکر ۲۰ منٹ پر جے پور اور رات ۱۰ بجکر ۵ منٹ پر نئی دہلی پہنچے گی۔ یہ ریل گاڑی اتوار کو چھوڑ کر ہفتے میں چھ دن چلے گی۔ ●

مسلمانوں میں تعلیم

بہبود کے وزیر شری سیتارام کیسری نے کہا ہے کہ مسلمانوں کی اقتصادی اور سماجی پسماندگی کی بنیادی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ شری کیسری ممبئی میں مسلمانوں کی تعلیم ۲۱ویں صدی کے چیلنج کے موضوع پر ایک کانفرنس کا افتتاح کر رہے تھے۔ اس کانفرنس کا اہتمام قومی تنظیم نے کیا تھا۔

شری کیسری نے کہا کہ مسلمانوں میں خواندگی کی شرح مقابلتاً بہت کم ہے اور کچھ اضلاع میں تو یہ صرف ۴ فی صد ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم دینے اور ان کی پیشہ ورانہ تربیت کی فوری ضرورت پر زور دیا تاکہ وہ ملک کی ترقی کے کام میں ایک قابلِ قدر ساجھے دار بن سکیں۔ بہبود کی وزارت نے مولانا آزاد تعلیمی فاؤنڈیشن قائم کر کے مسلمانوں میں اور خاص طور سے خواتین میں تعلیم کو فروغ دینے کے سلسلے میں متعدد اقدامات کیے ہیں۔ اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والے امیدوار کو کل ہند مقابلہ جاتی سروسز کے سلسلے میں تیار کرانے کی غرض سے "امتحان سے قبل کی کوچنگ" کے نام سے ایک نئی اسکیم بھی شروع کی گئی ہے۔ وزیر موصوف نے مزید کہا کہ ۲۱ویں صدی میں مسلمانوں کی ہمہ جہت ترقی اور خوشحالی کے لیے تعلیم ہی واحد کلید ہے۔ ●

آئی سی ڈی ایس کی توسیع

بچوں کی ترقی سے متعلق مربوط خدمات (آئی سی ڈی ایس) کی ملک بھر میں تیزی سے توسیع ہوئی ہے۔ اس پروگرام کے تحت چھ سال سے کم عمر کے بچوں، حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کے لیے مزید غذائیت، بیماریوں سے محفوظ رکھنے اور صحتی جانچ جیسی خدمات فراہم کی جارہی ہیں۔ خواتین اور بچوں کی ترقی سے متعلق محکمے کی سالانہ رپورٹ ۹۵-۱۹۹۴ء کے مطابق ملک میں تقریباً ۳۰۰۰ آئی سی ڈی ایس پروجیکٹ ہیں۔ ان خدمات سے ۲ء۱۵ کروڑ بچے اور مائیں مستفید ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ اس اسکیم کے تحت تین سال سے ۶ سال تک کی عمر کے ایک کروڑ سے زیادہ بچے اسکول سے قبل کی تعلیم

حاصل کر رہے ہیں۔

آئی سی ڈی ایس کے تحت ایک اہم قدم وہ اسکیم رہی ہے، جس میں گیارہ سال سے ۱۸ سال تک کی عمر کی ان لڑکیوں پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے، جنھوں نے اسکول تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا ہے۔ اس اسکیم میں ان لڑکیوں کی غذائی، صحتی، تعلیمی، تفریحی اور ترقیاتی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس وقت اس اسکیم سے ۵۰۷ بلاکوں کی ۱۵۱۳۶ لاکھ مذکورہ لڑکیوں کو مستفید کیا جا رہا ہے۔ ●

بلیک بورڈ اسکیم کی توسیع (اتر پردیش میں)

آپریشن بلیک بورڈ کی اسکیم پرائمری اسکولوں میں سہولیات کو بہتر بنانے کی غرض سے شروع کی گئی تھی۔ اعلیٰ پرائمری اسکولوں کو مستفید کرنے اور تیسرے استاد کی خدمات فراہم کرنے کی غرض سے اس اسکیم کی توسیع کر دی گئی ہے۔ آپریشن بلیک بورڈ کی اس توسیع شدہ اسکیم کے تحت ۱۴۵۲۵ تیسرے اساتذہ کی خدمات فراہم کی جا چکی اور ۳۳۵،۷ اعلیٰ پرائمری اسکولوں کو مستفید کیا جا چکا ہے۔ یہ توسیع شدہ اسکیم آٹھویں منصوبے کے دوران دیہی علاقوں تک ہی محدود ہے۔ لڑکیوں کے اسکولوں کو اولین ترجیح نیز درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے علاقوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

آپریشن بلیک بورڈ کی اسکیم ۸۸-۱۹۸۷ء میں شروع کی گئی تھی تاکہ کلاس روم تعمیر کر کے، اساتذہ کی منظوری دے کر نیز بلیک بورڈ، نقشے، چارٹ اور لائبریریوں سمیت درس و تدریس کا دیگر سازوسامان فراہم کر کے پرائمری اسکولوں کو سہولیات فراہم کی جائیں۔ اس اسکیم کے تحت اب تک ۵۲۲۵۴۷ اسکولوں کو مستفید کیا جا چکا ہے۔ ۱۴۸۴۸ اساتذہ کی منظوری دی جا چکی ہے اور ۲۶۳۶۱۶ کلاس روم تعمیر کیے جا چکے ہیں۔ ●

یونیورسٹیوں اور لائبریریوں کے درمیان رابطے کی تجویز

انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے وزیر شری مادھو راؤ سندھیا نے ملک کی یونیورسٹیوں کا رابطہ دنیا بھر کی لائبریریوں کے ساتھ جوڑنے کی تجویز پیش کی ہے۔ اس سے تمام دو سو یونیورسٹیوں کم اخراجات پر بہترین لائبریریوں تک رسائی حاصل ہو سکے گی۔ ●

راشٹریہ مہیلا کوش سے ۶۲۰۰۰ خواتین مستفید

راشٹریہ مہیلا کوش خود روزگار کے لیے غریب خواتین کو قرضہ فراہم کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ اس کوش نے اچھی شروعات کی ہے۔ اس نے ڈیڑھ سال میں اب تک ۶۲ ہزار سے زیادہ خواتین کے لیے ۵۹ر۹ کروڑ روپے کے قرضے کی منظوری دی ہے۔ یہ کوش آئندہ چھ برسوں کے دوران تقریباً ۲ لاکھ خواتین کے لیے تقریباً ۱۰۰ کروڑ روپے کا قرضہ فراہم کرنے کی توقع کرتا ہے۔

راشٹریہ مہیلا کوش ۳۱ کروڑ روپے کے سرمایہ سے ۱۹۹۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ اسکیم غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعے چلائی جاتی ہے۔ اب تک ملک بھر میں ایسی ۵۳ تنظیموں نے اس اسکیم پر عمل درآمد کیا ہے۔ ●

پسماندہ علاقوں میں صنعت کاری کا فروغ

پسماندہ علاقوں میں صنعت کاری کے عمل کو فروغ دینے کے لیے حکومتِ ہند متعدد رعایات دے رہی ہے اور بہت سی اسکیمیں چلا رہی ہے، جن میں ٹیکس سے چھوٹ کی اسکیم اور ترقیاتی مراکز کی اسکیمیں بھی شامل ہیں۔ ریاستی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ منڈی پر مبنی معیشت میں سرمایہ کاری حاصل کرنے کے لیے صنعتی ماحول کو بہتر بنائیں۔ ●

ہلکا پھلکا جدید ہیلی کوپٹر

حکومت نے ہلکے پھلکے جدید ہیلی کوپٹر کے ڈیزائن اور تیاری کے لیے جون ۱۹۸۴ء میں ۷،۶ کروڑ، ۸۰ لاکھ روپے منظور کیے تھے۔ ابتدائی پروگرام کے مطابق یہ پروجیکٹ ۱۹۹۱ء میں مکمل ہونا تھا لیکن چونکہ یہ ملک میں پہلی بار تیار کیا جا رہا تھا اس لیے اسے مختلف دشواریوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے یہ مقررہ مدت میں پورا نہ کیا جا سکا۔ ۱۹۹۳ء میں حکومت نے اس کی نظر ثانی شدہ لاگت یعنی ۳۔ ارب ۹۰ کروڑ ۶۸ لاکھ روپے کی منظوری دی۔ اس کی لاگت میں اضافہ کی وجہ شرح تبادلہ میں تبدیلی اور محصول قیمتوں وغیرہ میں اضافہ تھا۔ اس کی تیاری شروع کرنے کے لیے کوئی تاریخ متعین نہیں ہوتی ہے، البتہ اس سلسلے میں پیش رفت اچھی ہے۔ یہ کثیر المقاصد ہیلی کوپٹر ہوگا۔ ●

ڈاکخانوں میں شمسی توانائی کا استعمال

ڈاک کا محکمہ دیہات کے ان ڈاکخانوں میں غیر روایتی توانائی کا استعمال کرے گا جہاں بجلی دستیاب نہیں ہے یا اس کی دستیابی غیر یقینی ہے۔ گاؤوں میں واقع ۵۰ سے سو کے درمیان چھوٹے ڈاک خانوں میں شمسی توانائی سے بجلی حاصل کی جائے گی۔

اس نظام کے تحت ۹ واٹ کے دو فلورو سینٹ لیمپ اور ۳۰ واٹ کا پنکھا استعمال کیا جائے گا جو روزانہ چار گھنٹے چل سکے۔ اس نظام پر ہر ڈاک خانے میں ۴۲ ہزار روپیہ کی لاگت آئے گی جس میں بھاڑے پر ہونے والا خرچ اور رکھ رکھاؤ کا خرچ شامل نہیں ہوگا۔ اس پروجیکٹ پر خرچ ہونے والی رقم کا نصف حصہ ڈاک کا محکمہ اور نصف غیر روایتی توانائی کا محکمہ برداشت کرے گا۔

سینٹرل الیکٹرانکس لمیٹیڈ صاحب آباد اس سلسلے میں سازوسامان نصب کرنے کا کام انجام دے گا۔

ابتدا میں یہ پروجیکٹ ہریانہ، ہماچل پردیش، پنجاب، راجستھان اور اتر پردیش کے دیہی علاقوں میں ۵۸ چھوٹے ڈاک خانوں میں شروع کیا جائے گا۔ اس طرح کا نظام ہماچل پردیش کے منڈی ضلع کے کوٹلی ڈاک خانے میں شروع ہو چکا ہے۔ اس پروجیکٹ کا خاص مقصد یہ ہے کہ دیہی عوام غیر روایتی توانائی کے استعمال کو دیکھ سکیں اور اس کا اثر قبول کریں۔

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

سب ایڈیٹر : ڈاکٹر توحید خان

فون : 677591

تزئین و کتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : تنویر فاطمہ نقوی

جلد : ۱۵ شمارہ : ۴

جولائی ۱۹۹۵ء (۱۰ اساڑھ تا ۹ شراون شک ۱۹۱۷)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زرسالانہ : ایک سال کے لیے : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت

زرسالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں :

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۱۰۰۰۱

انچارج پروڈکشن : کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق

خط کتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطہ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

ڈاکٹر منجولا چکرورتی

خواتین کو مردوں کے ہم پایہ بنانے کا عمل

انسانی سماج اور سماجی رویے ابتدائے آفرینش سے ہی اُلٹتے بدلتے رہے ہیں۔ معاشرے کے فرائض اور اس کی ساخت نیز معاشرے کی ذمہ داریاں اور اس کا رول حسب ضرورت عصری تقاضوں کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ ابتدائی دور میں سماج میں مساوات کا جو تصور تھا، وہ رفتہ رفتہ بدلتا گیا اور اس کی جگہ ایک طبقاتی اور سرمایہ داری نظام نے لے لی جس کی وجہ سے مردوں اور عورتوں میں نابرابری کے تصور نے جنم لیا اور پیشہ نیز دولت کی بنیاد پر طبقات بنے۔ یہ عدم مساوات عورتوں اور مردوں کے ضمن میں خاص طور پر دیکھنے کو ملی۔

سماج میں کھیتی باڑی پر مبنی نظام معیشت رائج ہوا اور خانہ بدوشی کی جگہ بستیاں بنا کر رہنے لگے۔ نہ صرف کنبہ میں بلکہ بحیثیت مجموعی پورے سماج میں تقسیم کار نے جگہ لے لی۔ زراعت پیشہ سماج میں بدلتے پیداواری رشتے کچھ اس طرح قائم ہوئے کہ عورتوں کے اصل رول کو بچوں کی پیدائش سے جوڑ دیا گیا۔ ان کے لئے اصل کام بچے جننا اور ان کی پرورش کرنا قرار پایا۔ عورت کو چہار دیواری میں محصور کر دیا گیا حالانکہ اُن کی بغیر مزدوری محنت، زراعت میں مختلف طرح سے جلوہ گر تھی، چنانچہ زراعت سے متعلق وہ بہت سے کام جو گھر میں انجام پاتے تھے اور بہت سے دیگر متعلقہ کام وہ تھے جن کو عورتیں ہی انجام دیتی تھیں۔ البتہ اس عمل میں عورتیں منڈی اور وسائل کی دسترس سے محروم رہیں۔ زر پر مبنی معیشت نے اکثر صورتوں میں عورتوں کو اراضی اور املاک کے حقوق سے بھی محروم کر دیا اس صورت حال نے عورتوں کے تئیں مالکانہ حقوق کو ان کے شوہروں اور بیٹوں کے حوالے کر دیا۔

آج انسانی تہذیب نے زندگی کے سبھی شعبوں میں تکنیکی اور ترقیاتی انقلاب برپا کیا ہے۔ ایک زمانے میں ہمارا نظام معیشت صرف زراعت پر مبنی تھا لیکن اب نہ صرف صنعتی ترقیاتی پروگرام بھی اس کے احاطہ کار میں ہیں بلکہ سبھی تجارتی، مواصلاتی اور ترقیاتی سرگرمیاں بھی اسی نظام کے دائرۂ کار میں آتی ہیں۔

بدقسمتی سے سماجی تبدیلی خاص کر سماج میں عورتوں کے مرتبے کے تعلق سے اسقدر نہ ہو سکی جیسا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں ترقی دیکھنے کو ملی۔ اس حقیقت کی تردید مشکل ہے کہ پوری دنیا میں کم ہی عورتیں ایسی ملیں گی جنھوں نے مردوں کے مقابلے زیادہ یا ان کے برابر مرتبہ پایا ہو۔ عورتوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو ترقی کی ہے اس کا اعتراف بڑے پیمانے پر کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ تر عورتیں غریب ناخواندہ، پردہ نشین اور اقتدار سے محروم ہیں اور بہت کم عورتیں زندگی میں ترقی کر سکی ہیں۔

اکثر سیکس اور جنڈر انگریزی کے ان لفظوں کو بالعموم تذکیر و تانیث کے مفہوم میں برابر سمجھا گیا ہے حالانکہ سیکس کا بنیادی مفہوم اس فرق کو ظاہر کرتا ہے جو ایک ہی جنس کے ارکان میں حیاتیاتی اور جسمانی اعتبار سے پایا جاتا ہے جب کہ جنڈر کا تعلق افراد کے سماجی طور پر تعمیر کردہ تصورات سے ہے جو متوقع رویوں پر مبنی ہوتے ہیں اور جن کو سماج مخصوص رول سونپتا ہے۔ کنبہ میں رشتوں کے نازک نظام میں جنس (مرد یا عورت) کا رول متعین کیا جاتا ہے اور ہر سماج میں سماجیاتی طریقوں سے اس نظام کو تقویت دی جاتی رہی ہے۔ سماج میں بچوں کو ان کے سرپرست یہی طریقے سکھاتے ہیں اور پھر اسباب پر نظر رکھتے ہیں کہ ان پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں اس طریق کار میں مردوں اور عورتوں کے رول کو الگ الگ رکھا گیا ہے اور پھر انہیں متعینہ طریقوں پر کاربند رہنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ سب کام ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ ہر معاشرے کے سماجی اور ثقافتی طریقوں میں یہ عمل ایک دوسرے سے اس قدر گندھا ہوا ہوا ہے کہ ان لوگوں کے دل میں اس کے متعلق خیال ہی نہیں آتا اور ان کے نتائج پر ان کی نظر ہی نہیں جاتی۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے کھلونے بھی الگ الگ طرز کے بنائے جاتے ہیں۔ سماج کو یکساں طرز پر ڈھالنے کے عمل میں بھی اس طرح کے فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

لڑکیوں کو کھیلنے کے لئے گڑیاں دی جاتی ہیں اور لڑکوں کو میکانکی اور انجینئری طرز کے کھلونے دے کر ان کا دل بہلایا جاتا ہے، کپڑوں کے پہننے میں بھی لڑکوں اور لڑکیوں میں فرق ہے۔ ان کے رویوں میں بھی فرق ہے اور ان کے کردار بھی مختلف ہیں تعلیم کے غیر رسمی نظام کے علاوہ رسمی نظام تعلیم کے تحت لڑکیوں کو نرم و نازک، خوش خلق، نرم رو، غیر عملی اور تابعدار سمجھا جاتا ہے۔ اور نظام تعلیم کے تحت انہیں صفات کو سامنے رکھ کر ان کو تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ عمل گھسی پٹی نوعیت کے بن چکے ہیں اور دنیا کے زیادہ تر سماج میں ایسا ہی کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ دنیا کے بیشتر سماج میں لڑکیاں خوبصورت انداز میں سجا سنوار کر رکھی جاتی ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تصور ہوتا ہے کہ وہ ہر ماحول میں خود کو کھپا سکیں گی اور مرد کی بالادستی کو قبول کرتے ہوئے اس کی عقل و تمیز اور سوجھ بوجھ اور قوت فیصلہ کے سامنے خود کو صفر کر دیں گی۔

زیادہ تر معاشرے ایسے ہیں کہ جہاں لڑکی کو گھر میں ایک عارضی ممبر کے رُوپ میں دیکھا جاتا ہے اور جب شادی کے بعد وہ اپنے گھر میں جاتی ہیں تو وہاں

ان کو اولاد پیدا کرنے کی مشین سمجھ لیا جاتا ہے۔ گھریلو ذمہ داریوں میں ان کو پیداوار بڑھانے کے عمل میں کم ہی مصروف دکھا جاتا ہے۔ مشرقی طرز حیات میں عورتوں کا رول بحیثیت ماں اور بحیثیت بیوی ایک نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ عورتوں کی تابعداری اور خود سپردگی کا صلہ ان کو یہ ملتا ہے کہ عورتیں خود کو مردوں کی حفاظت میں عمر بھر زندگی بسر کرتی ہیں۔ کہیں وہ باپ کی نگرانی میں، کہیں شوہر کی نگرانی میں اور کہیں بیٹوں کی معاونت سے زندگی گزارتی ہیں۔

مردوں اور عورتوں کے درمیان امتیاز کا مسئلہ ایک عالمی مسئلہ ہے۔ البتہ کہیں یہ کسی شکل میں ہے اور کہیں زیادہ اور کہیں کم، غرضیکہ مختلف ثقافتوں میں اس کی مختلف شکل ہے۔ کچھ ترقی یافتہ ممالک ایسے ہیں جنہوں نے حالیہ ماضی میں عورتوں کو حق رائے دہندگی دیا ہے۔ برطانیہ میں ہندوستان کے مقابلے کم ہی عورتیں انتظامی عہدوں پر فائز ہیں۔ اگرچہ برطانیہ میں ۸۰ فیصد عورتیں روزی روٹی کمانے والی ہیں لیکن زیادہ تر وہ ہیں جن کی اجرتیں بہت قلیل ہیں۔ کم ہنر عورتیں جز وقتی کام کرتی ہیں یا پھر دفتروں میں ہیں۔ امریکہ اور جاپان کی صورت حال بھی بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں عورتوں کی نابرابری کی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے جب کہ ترقی پذیر ملکوں میں سماجی اور مذہبی رسومات کے نام پر عورتوں کا جسمانی استحصال کیا جاتا ہے۔ سوڈان اور صومالیہ کی عورتوں کے جھگڑے، تھائی لینڈ میں عورتوں کی سودے بازی، ہندوستان میں دیوداسی اور جوگن کا رواج اس بات کی مثالیں ہیں کہ عورتوں کا کس کس طرح استحصال ہو رہا ہے۔

مارچ ۱۹۹۵ء میں سماجی ترقی کے لئے عالمی چوٹی کانفرنس سے متعلق ابتدائی کمیٹی کے اقوام متحدہ کے مسودہ میں بیان کیا گیا ہے کہ "مردوں کے مقابلے کہیں زیادہ عورتیں انتہائی غربت اور افلاس میں زندگی گزار رہی ہیں اور عورتوں نیز ان کے بچوں پر اس طرح کے عدم توازن کے مضر اثرات نمایاں ہیں۔ غریبی، سماجی اختلاط، بدنظمی، ماحولیاتی گندگی اور جنگی اثرات سے عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

ہندوستان کی صورت حال

حصول آزادی سے قبل ہندوستان کے سماج میں مردوں کی مسلمہ بالادستی تھی۔ اس عرصہ میں سوورن ذاتوں اور بالائی طبقہ کی عورتیں گھر کی چہار دیواری میں محصور تھیں۔ البتہ کسان عورتیں اپنے کنبہ کی آمدنی بڑھانے کے لئے کام کیا کرتی تھیں۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی، جو انھوں نے انگریزوں کے خلاف کی۔ برطانیہ کے خلاف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی میں عورتیں بھی شریک رہیں اور انھوں نے بھی ترقی کے لئے جدوجہد کی۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۹۲ء تک ہندوستان میں منصوبہ سازی کا جو عمل رہا اور جو پالیسیاں اور پروگرام مرتب کئے گئے ان سے عورتوں کے سماجی مرتبے کو اوپر اٹھانے میں بڑی مدد ملی۔ عورتوں کی اوسط عمر بڑھی، بچوں کی شرح اموات میں کمی آئی۔ ان کو روزگار ملا۔ اور ترقیاتی پروگراموں میں ان کی عملی شرکت بڑھی۔ یہ ترقیاں معمولی نہیں کہی جاسکتیں۔

البتہ کچھ سماجی، اقتصادی اور ثقافتی عناصر کے باعث ہندوستانی عورتوں کو خاطر خواہ انداز میں فائدے نہیں پہنچ سکے۔ چنانچہ آج ہندوستان میں عورتوں کا مرتبہ مجموعی طور پر مردوں سے کم ہے۔ ۱۹۹۱ء میں قومی سطح پر ایک ہزار مرد تھے تو ۹۲۹ عورتیں تھیں۔ اس تناسب میں کمی کا سلسلہ ۱۹۰۱ء سے جاری ہے جب کہ ایک ہزار مردوں کے مقابلے ۹۷۲ عورتیں ہوتی تھیں۔ ہر دس سال کے بعد مردم شماری سے پتہ چلا کہ اس میں برابر کمی کا رجحان رہا۔ البتہ ۱۹۸۱ء میں کی گئی مردم شماری میں یہ قدرے بڑھا اور ایک ہزار مردوں کے مقابلے عورتوں کی تعداد ۹۳۴ رہی، اگرچہ اس وقت مردوں اور عورتوں کے اوسط عمر میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن پھر بھی زیادہ تر حاملہ عورتوں کی اموات ابتدائی عمر میں ہی ہوجاتی ہے۔ قومی دستاویز کی روشنی میں چار سال تک کی لڑکیاں مقابلتاً زیادہ مرتی ہیں۔ اس دستاویز میں عورتوں کی صحت اور خوراک کے کمتر معیار کی بھی شکایت کی گئی ہے۔ مردوں کی شرح خواندگی ۶۳٫۸۶ فیصد اور عورتوں کی شرح خواندگی ۳۹٫۴۲ فی صد ہے۔ اسکول جانے والی لڑکیوں کی تعداد لڑکوں کے مقابلے کم ہے۔ پرائمری سطح کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران لڑکوں کے مقابلے لڑکیاں زیادہ تر اپنی تعلیم درمیان میں ہی چھوڑ دیتی ہیں۔ ۱۹۹۱ء میں صرف ۲۳٫۲۷ فی صد لڑکیاں ثانوی اسکولوں میں تعلیم پا رہی تھیں۔ ۱۹۸۹ء میں منظم روزگار کے شعبہ میں عورتوں کا تناسب ۱۳٫۷ فی صد تھا اور وہ بھی زیادہ تر معاشرتی میں تھیں اور غیر ہنر مند عملے یا اتفاقیہ صورت میں ملازمتیں کر رہی تھیں۔ سینئر انتظامی شعبے میں عورتوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ۹۰ فیصد سے زیادہ عورتیں غیر منظم شعبوں میں کام کر رہی ہیں یا انہوں نے خود روزگار شروع کئے ہوئے ہیں جہاں تنخواہ کم ہے۔ اور غیر ہنرمند سیکٹر میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ آٹھویں منصوبے کی دستاویز میں مذکور ہے کہ ۱۹۸۸ء میں گزیٹیڈ خواتین کا تناسب سرکاری ملازمتوں میں ۴٫۹ فی صد تھا۔ ۱۹۸۷ء میں آئی اے ایس۔۔ خواتین افسروں کا تناسب ۷٫۴ فیصد تھا۔ غیر ملکی ملازمتوں (فارن سروس) میں ہندوستانی خواتین کا تناسب ۹٫۹ فیصد تھا۔ اور ہندوستانی اکونومک سروس میں ۱۲٫۹ فیصد تھا۔ اسی طرح ارکان پارلیمنٹ میں ان کا تناسب بہت معمولی ہے۔ ریاستی ودھان سبھاؤں میں بھی یہی صورت حال ہے۔ یہی نہیں، عورتوں کے خلاف تشدد کی وارداتوں کی بڑی شکایت ہے۔ چنانچہ عصمت دری، کمسن بچوں کی عصمت دری، جہیز سے متعلق ظلم و ستم اور قتل کی وارداتوں کی رپورٹوں سے بھی خواتین پر ہونے والے ظلم و ستم کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

پالیسیاں اور پروگرام

آزاد ہندوستان کے آئین میں عورتوں کو مساویانہ حقوق اور مواقع کی ضمانت دی گئی ہے اور ان کے سماجی مرتبہ کو اوپر اٹھانے کے لئے خصوصی دفعات کو سوچ سمجھ کر شامل کیا گیا ہے۔ ہندوستانی سماج میں طبقہ داری نظام ہے۔ یہاں کا سماجی، ثقافتی اور اقتصادی ڈھانچہ متنوع ہے اور پیچیدہ بھی، اور یہاں کی اقدار نوع بہ نوع ہیں۔ ان حالات میں ایسی یکساں پالیسیوں اور پروگراموں کو لاگو نہیں کیا جاسکتا جن کا اطلاق ملک کے سبھی خطوں پر کیا جاسکے۔

البتہ منصوبہ ترقی کے تحت خواتین کو ترقی کے اصل دھارے میں شامل کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں، اگرچہ پہلے چند پنجسالہ منصوبوں کی کارگزاری اس ضمن میں حوصلہ افزا رہی اور اس سلسلے کی وہ رضاکارانہ کوششیں قابل تعریف ہیں جو عورتوں اور بچوں کی بہبود کے لئے کی گئیں، اس سلسلے میں مہیلا منڈل قائم کئے گئے، سماجی تحفظ کے لئے قانون بنائے گئے اور کچھ قوانین میں ترمیم کی گئی۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ پانچواں منصوبہ اس موقعہ پر آیا جب کہ خواتین کی بہبود کے بین الاقوامی سال کی تقاریب منائی گئیں اس موقعہ پر ہندوستان میں عورتوں کے سماجی بہتری لانے سے متعلق اقدامات

پر نگانی ایک رپورٹ پیش کی گئی جس میں عورتوں کی اقتصادی بہتری، روزگار اور اس کے تربیتی پروگراموں کو شروع کرنے کی بات کہی گئی ہے اور انہیں موضوعات کو عورتوں کی سماجی اور اقتصادی ترقی کا اصل موضوع بنایا گیا۔ چھٹے منصوبے میں صحت، تعلیم اور روزگار وغیرہ کو شامل کیا گیا اور ان کو بھی خواتین کی ترقی کے لئے ضروری سمجھا گیا۔ البتہ ان تمام منصوبوں کے سلسلے میں اصل انداز نظر یہی تھا کہ عورتوں کو سماجی خدمات کا فائدہ ملے اور ترقیاتی عمل میں ان کی شرکت سے زیادہ ان کو فائدہ ملنے کے پہلو پر زیادہ زور دیا گیا۔

چھٹے منصوبے میں بچپن کی شادی کی روک تھام کا قانون، جہیز کا ایکٹ، مساویانہ اجرتوں کا ایکٹ، اور اس طرح کے بہت سے ایسے قانون بنائے گئے جن سے جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہ برتا جا سکے۔

عورتوں کی حالت کو مختلف شعبوں میں بہتر بنانے کے خیال سے مختلف وزارتوں اور محکموں میں بہت سے خصوصی پروگرام شروع کئے گئے تاکہ عورتوں کو ترقی کے اصل دھارے سے جوڑا جا سکے۔ ساتویں منصوبے میں عورتوں اور بچوں کی ترقی کے لئے الگ سے ایک محکمہ کھولا گیا تاکہ عورتوں کی ترقی سے جڑے ہوئے مسائل پر بنیادی نقطہ نظر پیش کیا جا سکے، اس مرحلے میں کچھ اہم کام کئے گئے مثلاً کرمنل لا، (جرائم کی روک تھام سے متعلق قانون) میں ترمیم، منشیات کی روک تھام سے متعلق قانون، جہیز ۱۹۸۶ء میں عورتوں کی غیر شائستہ جنسی نمائندگی، ستی کی روک تھام کے قانون سے متعلق اختیارات کی منتقلی، جنس کی رو سے تحقیق و تفتیش کے بعد رپورٹ وغیرہ دینا ہو، وغیرہ۔ اسی دوران ۱۹۸۸ء اور ۲۰۰۰ء کے درمیانی عرصے کو سامنے رکھ کر عورتوں کی ترقی کے ایک امکانی منصوبے کو تشکیل دیا گیا۔ از خود روزگار کرنے والی عورتیں اور غیر رسمی شعبوں میں کام کرنے والی عورتوں سے متعلق قومی کمیشن نے شرم شکتی کے عنوان سے اسی عرصے میں اپنی رپورٹ دی۔ ۱۹۷۰ء میں خواتین قیدیوں سے متعلق ماہرین پر مشتمل قومی کمیشن نے رپورٹ دی۔ ۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۰ء کے درمیانی عرصے کو سامنے رکھ کر بچیوں کے لئے قومی سطح پر ایک عملی پلان مرتب کیا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں تعلیم کی قومی پالیسی مرتب کی گئی اس میں بھی عورتوں کی تعلیم کے بہت سے اہم مسائل کو چھیڑا گیا۔

اس کے بعد دو سالانہ منصوبوں اور پھر آٹھویں منصوبے (۱۹۹۲ - ۱۹۹۷) میں قومی ترقیاتی کوششوں کو سامنے رکھ کر عورتوں کی بہبود کے لئے مزید کام کئے گئے۔ آٹھویں منصوبے میں حکمت عملی یہ ہے کہ مختلف سیکٹروں میں ترقیاتی فائدے ایسے ہوں جہاں عورتوں کے فائدوں کو نظر انداز نہ کیا گیا ہو بلکہ عورتوں کے ترقیاتی منصوبوں سے بحیثیت مجموعی ترقی کے مجموعی پروگراموں کو تقویت پہنچے۔ صحت، تعلیم، روزگار وغیرہ کے شعبوں میں ان سماجی، ثقافتی اور انتظامی دشواریوں کو دور کرنا ضروری سمجھا گیا جن سے عورتوں کی ترقی کی امکانی صلاحیت کے حصول میں رکاوٹ پڑتی ہے اور جن کی وجہ سے عورتیں ترقیاتی عمل میں مساویانہ کردار ادا نہیں کر پاتیں اس سلسلے میں عوامی ذرائع ابلاغ اور لوک پروگراموں کی اہمیت واضح کی گئی۔ عورتوں اور مردوں میں مساویانہ کردار کے حصول کے لئے سرکاری کوششوں کے ساتھ ساتھ رضاکارانہ کوششوں کو بھی اہمیت دی گئی۔ عورتوں کے خلاف ظلم و ستم روکنے اور عورتوں کی بہبود کے بارے شعور کو جگانے کے لئے رضاکارانہ کوششوں کی اہمیت بھی واضح کی گئی۔ چناں چہ ۱۹۹۲ء میں عورتوں کی بہبود سے متعلق قومی کمیشن قائم کیا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں ہی آئین میں ترمیم کے لئے ۷۲ واں اور ۷۳ واں بل پیش کیا گیا جس کی رو سے پنچایتوں میں عورتوں کی ۳۰ فی صد نشستوں کی تخصیص کی گئی۔ ۱۹۹۳ء میں عورتوں کے لئے قومی حرفہ فنڈ قایم کیا گیا۔ اسی سال عورتوں کے لئے مہیلا سمردھی یوجنا قایم کی گئی۔ اس ضمن میں یہ بتانا ضروری ہے کہ سماجی ترقی اور رویوں کی تبدیلیاں ایک مشکل اور دیر طلب عمل ہے اس مشکل راستے کو عبور کرنے کے لئے مستحکم ارادہ، عوامی شرکت، مناسب منصوبہ بندی، عمل درآمد، کام کی پیش رفت کی جانچ ہونا ضروری ہے اس کے بعد مردوں اور عورتوں میں مساوات کا تصور ابھر سکے گا اور عورتوں کو ترقیاتی پروگراموں میں عملی شرکت اور با اختیار ہونے کا موقعہ مل سکے گا۔ ●

بقیہ: قبائلیوں کی مربوط ترقی

صحت اور صفائی ستھرائی پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

ستو پداد کاس منڈل کے کاموں نے اسے ایک عظیم قابل تقلید مثال بنا دیا ہے، جن سے وہ اس بات کا مظاہرہ کر رہا ہے کہ عام کسانوں کو زراعتی ترقی کے عمل میں کس طرح شامل کیا جا سکتا ہے۔ ●

بقیہ: مولانا محمد علی جوہر کے تعلیمی افکار

اعلیٰ (یونیورسٹی کی) تعلیم

اعلیٰ تعلیم میں بھی عربی ادب کی تعلیم کے علاوہ دینیات کی تعلیم ضروری قرار دی جائے۔ ان مضامین میں مہارت حاصل کرنے کے علاوہ طالب علم اپنی دلچسپی کے دیگر مضامین بھی لے سکتے ہیں جیسے تاریخ، سماجیات، فلاسفی، علم الحساب، سائنس، ادب اور قانون وغیرہ۔ ان مضامین کی تعلیم ایم۔ اے اور ایم۔ ایس سی تک دی جانی چاہیئے۔ لیکن یہاں طریقہ تدریس بنیادی اور ثانوی طریقہ تدریس سے مختلف ہوگا۔

مذکورہ بالا نظریات یہ واضح کرتے ہیں کہ مولانا جوہر کا تعلیمی نقطہ نظر بنیادی طور پر مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ ادب اور تاریخی و جدید سائنسی علوم پر زیادہ نظر آتا ہے اور دوسرا اہم نظریہ مقامی زبان سے انگریزی زبان میں تبدیلی کا نظریہ تھا۔ لیکن اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکالنا چاہیئے کہ قومی مسلم یونیورسٹی کا خیال صرف مذہبی لسٹ اور غیر مسلموں پر اسلام کو تھوپنے کے طور پر عمل میں آیا بلکہ مولانا نے جہاں مسلمانوں کے لئے اسلامی تعلیمات میں قرآن اور عربی کی تعلیمات کو لازمی قرار دیا وہیں انھوں نے دوسری طرف غیر مسلم طلباء کے لئے ان کے مذہبی عقائد کے مطابق مذہبی تعلیم کو بھی پیش کیا ہے۔ مولانا سے قومی مسلم یونیورسٹی کے نظریے کے مطابق غیر مسلم طلباء کو بھی مسلم طلباء کی طرح بنیادی درجے سے اعلیٰ تعلیمی درجات تک اسی طرح مذہبی تعلیم دی جائے گی جس طرح مسلمانوں کو دی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ یہ تعلیم عربی اور اسلامی کے بجائے ان کے اپنے مذہبی عقائد کے مطابق سنسکرت زبان میں دی جائے۔

مندرجہ بالا تجزیہ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ مولانا یونیورسٹی کو صرف ایک تکنیکی اور پیشہ ورانہ ادارہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ دانشگاہوں کو تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اخلاقی درسگاہ بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے جس کا مکمل اظہار ان کی تعلیمی پالیسی سے بخوبی ہوتا ہے۔ مولانا نے اتنی باریکی سے تعلیمی درجوں کا مطالعہ کیا اور ہر درجہ کے لئے مختلف تعلیمی انداز کا اظہار کیا۔ اسی لئے آج مولانا کا نام ہندوستان کے ممتاز تعلیمی معماروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی نظام تعلیم کو جامعہ کی شکل میں منتقل کر کے اپنے اس خواب کو تعبیر کی خوشگوار منزلوں سے ہمکنار کیا۔ ●

عورتیں اور سماجی ترقی

جب کسی سماج میں مرد اور عورتیں، امیر اور غریب، پڑھے لکھے اور ان پڑھ، دیہی اور شہری سب بلا لحاظ مذہب و ملت، نسل و عقائد اور جنس کی تفریق کے بغیر قانون کی نگاہ میں برابر ہوتے ہیں اور ان کا تحفظ بلا امتیاز یکساں طور پر کیا جاتا ہے اور انھیں تعلیم، ملازمت اور انصاف حاصل کرنے کے لیے مساوی مواقع دستیاب ہوتے ہیں تو ایسے سماج کو ایک فلاحی اور سماجی انصاف پر مبنی سماج کہا جاتا ہے۔

لیکن سماجی اور ثقافتی حقیقت یکسر مختلف تصویر پیش کرتی ہے۔ ایک خاص قسم کے سماج میں جہاں چند چھوٹے فیصلوں کو چھوڑ کر تمام بڑے فیصلے صرف مرد ہی لیتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی عورتوں کو مرد سے کمتر درجے پر رکھا جاتا ہے۔ عورتوں کو پیدائش کے وقت سے ہی ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جو عورتوں کے لیے ہی مخصوص سمجھے جاتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ مردوں اور عورتوں کے لیے اقدار اور اصول الگ الگ ہوتے ہیں۔ مساوات اور مساوی مواقع با قوت سے کمزوروں کا تحفظ مرفع الحال لوگوں سے بچھڑے ہوئے لوگوں کی حفاظت، اقلیتوں کے حقوق و جذبات کا تحفظ اور استحصال پسندی کی مخالفت وغیرہ نظریات جمہوریت کی مثبت خصوصیات ہیں اور ہم ہندوستانیوں نے اپنے لیے جمہوریت کو چنا ہے جس کا ہم بہت احترام کرتے ہیں۔

آئیے دیکھیں کہ ان جمہوری اصولوں نے فرد اور سماج کو، خصوصاً عورتوں اور ان سے متعلق مسائل کے تئیں مردوں کے رویے کو کس حد تک متاثر کیا ہے؟

اس سے قبل کہ ہم جنسی تفریق پر بحث کریں، ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان کا آئین بنانے والوں نے پوری طرح سوچ سمجھ کر مردوں اور عورتوں کو برابر کے حقوق عطا کیے ہیں۔ ہمارا قانون عورتوں پر تعلیم، پیشے اور روزگار کے تعلق سے کسی بھی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔ کوئی بھی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں عورتیں نہیں جا سکتیں۔ آئین میں مندرج سرکاری پالیسی کے رہنما اصولوں پر عمل آوری کے لیے مرکزی پارلیمنٹ اور ریاستی قانون سازیوں نے متعدد قانون پاس کیے۔ ان مخصوص قوانین میں جہیز سے متعلق امتناعی قانون، ستی کی رسم ختم کرنے کا قانون، بچوں کی شادیاں روکنے کا قانون، سرپرستی اور پرورش سے متعلق قانون، نابالغوں کی فروخت پر امتناع کا قانون، مساوی مشاہرہ کا قانون، کم از کم اجرت کا قانون، زچگی کے دوران ملنے والے فائدوں اور صنعتی تنازعات سے متعلق قانون اور خصوصی شادیوں کا قانون وغیرہ شامل ہیں یہ قوانین صحیح معنوں میں لاگو کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں تاکہ آئین میں مندرج اصول حقیقت کی شکل اختیار کر سکیں۔

لیکن آئین کی ضمانتوں اور انھیں لاگو کرنے کے لیے بنائے گئے قوانین کے باوجود ان نیک ارادوں کو پوری طرح عملی شکل نہیں دی جا سکی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عورتوں کی جدوجہد ابھی تک جاری ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم

لڑکیوں کے لیے تعلیم کو کبھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ لڑکیوں کو خصوصاً دیہات میں بچپن ہی سے بہت سے گھریلو کام کرنے پڑتے ہیں۔ جب مائیں کھیت پر کام کرنے جاتی ہیں تو گھر پر انھیں ماں کے سارے کام کرنا پڑتے ہیں۔ انھیں کھانا پکانا پڑتا ہے، بڑے بوڑھوں کی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے، مویشیوں کو نہلانا دھلانا پڑتا ہے، انھیں چارہ اور پانی دینا پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ نہ صرف گھر کے مرد اور بڑے بوڑھے بلکہ عورتیں خود لڑکیوں کو تعلیم دلانا ضروری نہیں سمجھتیں۔ ہمیشہ یہی دلیل دی جاتی ہے کہ انھیں تو بڑی ہو کر سسرال جانا ہے۔ اس لیے دیہات کے لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو محض تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔

ملک میں گزشتہ ۴۰ سال سے فلاح و بہبود کے مختلف پروگرام اور عوام میں تحریک پیدا کرنے والی اسکیمیں چل رہی ہیں۔ سینٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ نے ریاستوں کے سماجی بہبود کے مشاورتی بورڈوں کے ساتھ مل کر عورتوں کو لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت کا احساس کرانے کے لیے متعدد اسکیمیں تیار کی ہیں۔ انھیں صحت اور صفائی ستھرائی کے بارے میں بتانے کے لیے بھی کئی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ عورتوں میں تحریک عمل پیدا کر کے ان کی صلاحیتوں کو سماجی و اقتصادی ترقی کے لیے بروئے کار لانے کے پروگرام بھی وضع کیے گئے ہیں کیوں کہ سماجی و اقتصادی ترقی کی بدولت وہ اپنی ہنرمندیوں کو بڑھا کر روزگار حاصل کر سکتی ہیں یا خود اپنا روزگار شروع کر سکتی ہیں اور اپنی اقتصادی حیثیت کو بہتر بنا سکتی ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی رضاکار تنظیمیں بھی قائم ہو گئی ہیں جو ان کے ساتھ مل کر کام

کر رہی ہیں اور دیہی زندگی میں عورتوں کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ تعلیمی نظام کو بھی درست کیا گیا ہے تاکہ وہ دیہی عوام کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکے۔ پنجسالہ منصوبوں میں تعلیم اور سماجی بہبود کے لیے تخصیص زر میں بتدریج اضافہ کیا گیا ہے تاکہ لڑکیوں کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی جا سکے اور عورتوں کے لیے تربیت اور روزگار کے زیادہ مواقع پیدا کیے جا سکیں۔ لیکن ان اقدامات کے باوجود دیہی عوام میں ابھی تک روزمرہ زندگی میں خواندگی اور تعلیم کی کی ضرورت کا پورا احساس پیدا نہیں ہو سکا ہے۔

سماج کا رویہ

لیکن چوں کہ خود عورتوں میں اپنی شبیہہ کو بہتر بنانے کی کوئی پرزور خواہش موجود نہیں ہے اور نسل ذات اور مذہب کے نام پر عورتوں کے خلاف جو امتیاز برتا جاتا ہے وہ ایک مستقل صورت اختیار کر چکا ہے اس لیے تبدیلی کے لیے کوئی نئی سوچ پیدا نہیں ہو پائی ہے۔ لیکن اب وہ عورتیں بھی جو کارکنان تعلیم کی نصیحت پر کان نہیں دھرتی تھیں، دھیرے دھیرے لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت محسوس کرنے لگی ہیں اور یہ سمجھنے لگی ہیں کہ صرف تعلیم ہی سماج میں ان کی حیثیت کو بہتر بنا سکتی ہے۔ جہیز کا مسئلہ بھی لڑکیوں کے والدین کے لیے سخت دردِ سر بنا ہوا ہے۔ بہت سے والدین اس کی وجہ سے ہی اپنی لڑکیوں کو اسکول نہیں بھیجتے۔ کیوں کہ لڑکی کو پڑھانے کا مطلب یہ ہے اس کی شادی کے لیے لڑکا بھی پڑھا لکھا چاہیے اور پڑھے لکھے لڑکوں کی جہیز کی مانگ کافی زیادہ ہوتی ہے اگرچہ قانوناً جہیز لینا اور دینا منع ہے۔

بہت سی عورتیں اپنی لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے ہی صحتی خدمات سے مستفید نہیں ہو پاتیں۔ بیماریوں کے متعلق اپنے توہمات اور غلط خیالات کی وجہ سے وہ نیم حکیموں اور جھاڑ پھونک کرنے والوں کے شکنجے میں پھنس جاتی ہیں جو غلط سلط علاج اور جھاڑ پھونک سے انھیں موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں۔ حکومت نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ صحتی مراکز کی تعداد علاج کی محتاج عورتوں کی تعداد کے مقابلے میں کم ہے۔ متبادل طریقِ ہائے علاج کی حوصلہ افزائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ دور دراز علاقوں میں جہاں طبی سہولیات کی کمی ہے متبادل طریق ہائے علاج کے معالج عوام کی خدمت کر سکیں اور جو کیس بہت سنگین ہوں انھیں برائے علاج بڑے اسپتالوں میں بھیج دیا کریں۔

بعض علاقوں میں والدین پر سماجی و ثقافتی مجبوریوں کا اتنا اثر ہے کہ وہ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مار دیتے ہیں۔ ہمارا سماج ابھی تک اس وہم میں گرفتار ہے کہ لڑکی پیدا ہونے کے لیے ماں ہی قصوروار ہوتی ہے۔ اس پر لعن طعن کی جاتی ہے کہ اس نے لڑکا کیوں نہیں پیدا کیا، لڑکی کیوں پیدا کی۔ ایسا علم یا سائنٹی فک معلومات کی کمی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ مرد اس سچائی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ لڑکی یا لڑکے کی پیدائش کے لیے وہ خود ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جہالت ابھی تک رسم و رواج کے پردے میں نہاں ہو کر لوگوں اور خصوصاً عورتوں کو دستیاب سہولیات، جانکاری اور معلومات سے دور رکھتی ہے۔ دودھ پلانے والی ماؤں کو اچھی اور طاقت بخش غذا میسر نہیں آتی اور بچے چیچک، ٹیٹنس، ڈپتھیریا اور اسہال سے غیر محفوظ رہتے ہیں کیوں کہ انھیں ان بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے نہیں لگوائے جاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سے بچے جلد ہی مر جاتے ہیں۔

عورتوں کو اپنے کنبے کے سائز کا فیصلہ کرنے اور خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں کا استعمال کرنے کا مشورہ دینے کی سہولیات موجود تو ہیں مگر ناکافی ہیں۔ لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ جہاں یہ سہولیات موجود ہیں وہاں کم عورتیں اس سہولت کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ صحتی مراکز کے باوجود عوام کو صحت کی سہولیات بہم پہنچانے کا انتظام تسلی بخش نہیں ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں مثلاً توسیعی کارکنان اور تربیت یافتہ نیم طبی عملے کا کافی تعداد میں دستیاب نہ ہونا وغیرہ۔ بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گھر گھر صحتی خدمات بہم پہنچانے کے بندوبست کو مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔ تعلیم، باخبری اور صحتی سہولیات تک رسائی کے مسئلے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ان پر بھی توجہ دینا ضروری ہے۔

سماجی تبدیلیوں پر قانون کے اثر کے بارے میں کئی مطالعاتی جائزے لیے جا چکے ہیں۔ جہاں تک برابر کے موقعے ملنے کا سوال ہے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ لڑکیوں کو لڑکوں کا مقابلہ کرنا ہوگا تبھی وہ ان شعبوں میں قدم رکھ سکیں گی جو صرف لڑکوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ تعلیم سے محروم ہونے کے سبب دیہات کی جوان لڑکیاں اور عورتیں ترقیاتی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ نہیں لے پاتیں۔ ملازمت میں مردوں کو اولین ترجیح دی جاتی ہے اگرچہ بہت سی ریاستی حکومتوں نے یہ حکم جاری کر رکھا ہے کہ پرائمری اسکولوں میں ریٹائر ہونے والے مرد اساتذہ کی جگہ پر خاتون ٹیچروں کو مقرر کیا جائے۔ توقع ہے کہ معمولی شروعات کے بعد قریب مستقبل میں لاکھوں خاتون ٹیچروں سے تبدیلی کی ایک نئی فضا پیدا ہوگی۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کئی پیشوں میں عورتوں کو اس لیے ترجیح نہیں دی جاتی کہ مالکان انھیں زچگی کی چھٹیاں نہیں دینا چاہتے، نہ بچہ ہونے سے پہلے نہ بچہ ہونے کے بعد۔ اگر وہ عورتوں کو ملازمت دیتے بھی ہیں تو جب زچگی کا وقت آتا ہے تو وہ انھیں ملازمت سے الگ کر دیتے ہیں۔

جرائم

عورتوں کے خلاف جرائم میں اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔ یہ بات کافی تشویشناک ہے کہ عورتوں پر جبر و ستم، اغوا اور آبرو ریزی کے واقعات عام ہو گئے ہیں۔ تعزیرات ہند میں ان میں سے ہر جرم کی سزا مقرر ہے۔ مجرموں کو ان کے جرائم کی سزا ضابطۂ فوجداری، قانونِ شہادت اور تعزیرات ہند کی مختلف دفعات کے تحت دینے کا اہتمام ہے۔

لیکن اکثر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ عورتوں کے خلاف جرائم کی رپورٹ پولیس تھانوں میں درج نہیں کی جاتی اور کئی بار تو شکایت درج کرنے سے صاف انکار کر دیا جاتا ہے۔ لیکن چوں کہ انصاف حاصل کرنے کے لیے پہلا قدم پولیس تھانے میں رپورٹ درج کرانا ہے اس لیے اگر کسی عورت کے خلاف جرم کو رپورٹ درج نہ کر کے ابتدائی مرحلے پر ہی نظر انداز کر دیا جائے گا تو مظلوم عورت کو انصاف کیسے ملے گا۔ یہ بات واقعی بہت تشویشناک ہے۔ ہمیں انصاف کا عمل تیز کرنے کے لیے خصوصی پولیس تھانوں کی ضرورت ہے۔ اگر پولیس فوراً معاملہ درج کر کے ملزم کو گرفتار نہیں کرتی اور اس پر مقدمہ نہیں چلاتی تو ملزم کو فرار کی راہ اختیار کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

مظلوم عورتوں کو جلد انصاف دلانے کی غرض سے پارلیمنٹ نے ۱۹۸۴ء میں فیملی کورٹس کا قانون

پاس کیا۔ حکومت مظلوم عورتوں کو تیزی سے انصاف دلانے کے لیے ملک بھر میں ۸۰۰ فیملی عدالتیں قائم کرنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن قانون پاس ہونے کے دس سال بعد بھی آج صرف ۵۰ فیملی عدالتیں ہی کام کر رہی ہیں وہ بھی کسی قدر نیم دلی کے ساتھ۔ البتہ ایسی کچھ عدالتیں شادی کے دونوں فریقوں میں سمجھوتہ کروا کر اور مستحق / مطلقہ عورتوں کو ان کا "استری دھن" دلوا کر موثر خدمات انجام دے رہی ہیں۔

مقدمات کی بھاری تعداد کو دیکھتے ہوئے عدالتی نظام ناکافی نظر آرہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کئی مقدمات تو دسیوں برس یا اس سے زیادہ عرصے تک چلتے رہتے ہیں۔ اسی لیے فیملی عدالتیں قائم کی گئی ہیں تاکہ انصاف مانگنے والی عورتوں کو بلا تاخیر انصاف دلایا جاسکے۔ تمام خاندانی جھگڑوں کا فیصلہ فیملی عدالتیں ہی کرتی ہیں۔ قومی کمیشن برائے خواتین نے فیملی عدالتوں کے بارے میں اپنی حالیہ کانفرنس میں ماڈل قواعد مرتب کیے تھے تاکہ ریاستی حکومتیں اپنی مقامی ضرورتوں کے مطابق انھیں جوں کا توں یا ضروری ترمیم کے ساتھ اختیار کرسکیں۔ فیملی عدالتوں کے قیام کی مخالفت بھی ہوئی۔ ان کے بجائے مہیلا عدالتیں مجرمانہ کیسوں کا فیصلہ کرنے کے لیے قائم کی گئیں ان میں وکیلوں کو بھی حاضر ہونے کی اجازت دی گئی۔ علاوہ ازیں مرکز اور ریاستوں میں قانونی امداد مہیا کرنے والے بورڈوں نے بھی ضرورت مند عورتوں کو مقدمہ دائر کرنے میں مدد دے کر اور ان کے مقدمات کی پیروی کرکے انصاف چاہنے والی عورتوں کی بہت بڑی خدمات کی۔ ان کے مقدمات کی پیروی کے لیے وکلا نے معمولی فیس لی جو قانونی امداد مہیا کرنے والے حکام نے ادا کی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انصاف دو ذرائع سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو چھوٹی / بڑی اور سب سے بڑی عدالت کے مسلمہ عدلیہ نظام کے ذریعے اور دوسرے فیملی عدالتوں، لوک عدالتوں اور مہیلا عدالتوں کے ذریعے۔ مسلمہ عدالتی نظام سے انصاف حاصل کرنے میں زیادہ خرچ آتا ہے اور دیر بھی زیادہ لگتی ہے کیوں کہ اس میں مقدمات کی سماعت مقررہ ضوابط کے تحت شہادتوں وغیرہ کی مدد سے قانون کی دفعات کے تحت ہوتی ہیں اور دوران سماعت ایسے تکنیکی نکات پیش کیے جاتے ہیں جن کی تشریح و وضاحت میں دیر لگتی ہے۔ اس کے مقابلے میں فیملی عدالتوں، لوک عدالتوں اور مہیلا عدالتوں کا طریقہ لچکدار ہے۔ خواتین کی تنظیمیں انہی کی مانگ کر رہی ہیں۔ عدل گستری کا یہ متوازی نظام کم خرچیلا ہے اور اس میں زیادہ پریشانی اٹھائے بغیر انصاف بھی جلد ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایک فیملی عدالت میں اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ ایک پریشان عورت جسے پہلے ہی کافی ہراساں کیا جاچکا ہے ایک دوستانہ ماحول میں کسی ڈر یا خوف کے بغیر بلا جھجک اپنے درد و غم کی داستان بیان کرسکے گی۔ جج بھی اسے صحیح مشورہ دیتا / دیتی ہے اور اگر شادی کو برقرار نہیں رکھا جاسکتا تو ویسا فیصلہ دیتا / دیتی ہے اور پھر اس کے شوہر کو گزارہ الاؤنس دینے کا حکم دیتا / دیتی ہے۔ جو عورتیں لوک عدالتوں سے رجوع کرتی ہیں انھیں لوک عدالتیں انصاف دلاتی ہیں۔ مہیلا عدالتیں خاص طور پر عورتوں پر جبر و ظلم کے معاملات یا عورتوں کے خلاف جرائم کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے ہی قائم کی گئی ہیں لیکن وہ اتنے لچیلی نہیں ہیں۔

حقیقت پسندی

حکومت ہند نے ترقی اور حقوق انسانی کو عملی جمہوریت کا جزو اعظم بنانے کے لیے ۷۳ویں اور ۷۴ویں ترامیم کے ذریعے آئین میں ترمیم کی ہے۔ جب کہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ مغربی ممالک اپنے معاشروں کا رخ حقوق انسانی کی طرف موڑنے اور سماجی انصاف کا دور شروع کرنے کا طریقہ ڈھونڈ رہے ہیں، ہندوستان نے ایک لمبی جست لگا کر سب سے نیچے کی سطح سے جمہوریت کا آغاز کردیا ہے۔ جہاں عورتیں مقامی اور قومی مسئلوں پر فیصلے لینے کے کام میں شریک ہو رہی ہیں۔

تاہم عورتوں کی اس شرکت کو ابھی حقیقی بننا ہے۔ عورتوں کی بلا خوف و خطر ہمسری کی بنیاد پر شرکت کے لیے ہمیں پرانے طرز فکر، پرانے رویئے اور جنسی تعزیق کی تمام پرتیں اپنے دل و دماغ پر سے ہٹا دینی ہوں گی۔

یہ اندیشہ کہ عورتوں کی شرکت حقیقی ثابت ہونے والی نہیں ہے، پنچایتوں اور میونسپل اداروں میں دو تین انتخابات کے بعد ایک تہائی نشستوں پر عورتوں کے چُنے جانے کا دستور پوری طرح لاگو ہوجانے پر خود بخود دور ہوجائے گا۔

اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکومت سرکاری دفاتر، پبلک سیکٹر کے اداروں، پولیس، ریلوے وغیرہ میں خاتون کارپردازوں کے لیے ایک کوٹا مقرر کرنے کے بارے میں غور کر رہی ہے۔ کچھ ریاستی حکومتیں تو سرکاری دفاتر وغیرہ میں عورتوں کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے پہلے ہی قدم اٹھا چکی ہیں۔

چوں کہ درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبیلوں اور اقلیتوں کے لیے ریزرویشن کا جو اہتمام موجود ہے اس کے تحت عورتوں کو مناسب نمائندگی ملنا یقینی نہیں ہے اس لیے مرکز اور کچھ ریاستوں کی حکومتوں نے درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبیلوں اور پسماندہ طبقات کی عورتوں کے لیے عہدوں / نشستوں کی تخصیص کو یقینی بنانے کے لیے پہل کی ہے۔

جہاں تک اقلیتوں مثلاً عیسائیوں کا تعلق ہے عدالتی فیصلوں کے نتیجے میں شادی، طلاق اور وراثت کے قوانین میں تبدیلی کردی گئی ہے۔ عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ۱۹۹۲ء میں خواتین کے لیے جو قومی کمیشن قائم کیا گیا تھا اس نے مختلف ریاستوں کے دوروں میں مختلف اطلیتی فرقوں کی خواتین سے تبادلۂ خیال کیا۔ ان خواتین نے یہ رائے ظاہر کی کہ تمام عورتوں کو برابر کا انصاف ملنا چاہیے۔ جمہوریت نہیں کہتی کہ مرد اور عورت برابر نہیں ہیں۔ ہمارے آئین کے تین بنیادی اصول ہیں: آزادی، برابری اور بھائی چارہ۔

یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لوگوں کے طرز فکر، رویئے اور طرز عمل پر سماجی اقدار اور روایات کی گرفت کتنی مضبوط ہے۔ اسی لیے لوگوں میں برابر کے حقوق کا احساس پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی اپنی صلاحیت، طاقت اور حق عمل کا احساس کرانا بہت ضروری ہے۔

سماج میں بیداری پیدا کرنے کے لیے غیر سرکاری تنظیمیں اور رضاکار گروپ چھوٹے چھوٹے ماڈل تیار کر رہی ہیں۔ قومی کمیشن برائے خواتین [illegible]

خواتین کے خلاف جرائم کا سدّباب

ہندوستانی آئین کے آرٹیکل ۵۱(اے) میں ہندوستان کے ہر شہری کا یہ بنیادی فرض بتایا گیا ہے کہ عورتوں کے وقار کے منافی کسی بھی طریق کار کو نہ اپنایا جائے۔ مزید براں آئین میں ریاستی رہنما یا نہ اصولوں کے آرٹیکل ۳۹ میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ریاست کو اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ کارکنوں کی صحت اور قوت خواہ وہ مرد ہوں یا عورت نیز کمسن بچوں کا استحصال نہ کیا جائے اور وہ اپنی اقتصادی مجبوریوں سے ایسا کوئی پیشہ اختیار نہ کریں جوان کی عمر اور طاقت کے لیے موزوں نہ ہو، اسی آرٹیکل میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مردوں اور عورتوں کو یکساں کام کے لیے یکساں اجرتیں دی جائیں۔ لیکن ان میں سے بہت سے فرائض کی تکمیل ابھی باقی ہے اور ریاستی پالیسی کے رہنمایانہ اصول بہت سے وہ ہیں جنھیں مکمل طور پر عملی جامہ نہیں پہنایا گیا ہے۔

مساویانہ شہریت کی حیثیت سے عورتیں قانون کی نظر میں مردوں کے مساوی ہیں اور از روئے قانون ان کو مکمل تحفظ دیے جانے کا حق حاصل ہے۔ لیکن حیاتیاتی اعتبار سے عورتیں مردوں سے مختلف ہیں، اس لیے وہ کمزور دکھائی دیتی ہیں، عورتوں پر مختلف طرح کے ظلم و ستم اقتداری نظام کی شکست و ریخت کو ظاہر کرتے ہیں ان کے پیچھے مختلف تاریخی اور دیگر اسباب کارفرما ہیں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ سماج میں زیادہ مبنی بر انصاف نظام رائج کیا جائے اور جاگیردارانہ طریق کار کو کم کیا جائے، یہ نظام تعلیم، شعور کی پختگی، عورتوں کے لیے روزگار کے دروازے کھول کر رائج ہو سکتا ہے۔ جب عورتیں خود کفیل ہوں گی اور اپنی ضرورتوں کے لیے مردوں کی محتاج نہ ہوں گی تو سماجی ڈھانچہ عورتوں کے لیے زیادہ سازگار ہوگا۔ کام کرنے کا اپنا الگ ایک مزہ ہے، چناں چہ عورتوں کو تخلیقی کاموں میں جوڑ کر، جس سے انھیں کچھ آمدنی بھی ہو، ان میں ایک نئی قوت پھونکی جا سکتی ہے اور وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہو سکتی ہیں اور اپنے حقوق کا خود تحفظ کر سکتی ہیں۔

پارلیمنٹ نے ۱۹۹۰ء میں ایک قانون پاس کیا، اس کی رو سے ۳۱ر جنوری ۱۹۹۲ء سے عورتوں کے لیے قومی کمیشن تشکیل دیا گیا۔ اس کمیشن کے تین کام ہیں۔ اول تو یہ اس بات پر نظر رکھتا ہے کہ عورتوں کے حق میں موجودہ قوانین پر عمل درآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں جہاں کہیں وہ قانونی سقم پاتا ہے یا آئینی ترمیم کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو وہ سفارشات پیش کرتا ہے۔ دوسرے وہ عورتوں کی سماجی اور اقتصادی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کے عمل سے خود کو جوڑتا ہے۔ تیسرے وہ اس بات پر بھی نظر رکھتا ہے کہ جیلوں میں عورتوں کی دیکھ بھال وغیرہ کے سلسلے میں ضروری انتظامات کو یقینی بنایا جائے، کمیشن کو ان اداروں کی جانچ اور دیکھ بھال کے اختیارات حاصل ہیں۔ اگر ان میں سے کسی قانون پر عمل درآمد کے بارے میں کوئی شکایت ہوگی تو یہ کمیشن انکوائری کر سکتا ہے۔

ان اختیارات کو بروئے کار لانے کے لیے کمیشن کے پاس وسیع اختیارات ہیں۔ کمیشن کوئی بھی ریکارڈ طلب کر سکتا ہے یا شہادت کے لیے کسی بھی شخص کو بلا سکتا ہے اور پھر اس سے جرح کر سکتا ہے بالکل ایسے ہی جیسا کہ کسی عدالت میں کارروائی ہوتی ہے۔ کمیشن کسی بھی قانونی دفعہ پر بحث کر سکتا ہے حتیٰ کہ ہندوستانی آئین کے بارے میں سوال جواب کر سکتا ہے اور پھر اس میں ترمیم کا مشورہ دے سکتا ہے۔

عورتوں کو اذیت پہنچانا، ان کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا، عصمت دری کرنا اور اس طرح کے دیگر مظالم ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۲ء کے درمیان پہلے کے مقابلے زیادہ ہوئے ہیں۔ البتہ جہیز کے باعث مرنے والی عورتوں، اغوا کی وارداتوں میں کمی آئی ہے۔ اگر ان مسائل کی سنجیدگی پر غور کیا جائے تو ان کے ازالہ کے لیے بھی اسی قدر سنجیدگی سے اقدامات کی ضرورت محسوس کی جائے گی۔ ممکن ہے کہ ماضی میں بھی اسی قدر ظلم و ستم دیکھنے کو ملتے ہوں گے لیکن خود اعتمادی کی کمی، شعور کی کمی یا سرکاری مشینری کی حمایت کی کمی وغیرہ کے باعث اکثر جرائم کا نوٹس نہیں لیا گیا۔

اس سال کے شروع میں کمیشن نے عورتوں پر کیے جانے والے مظالم کے خلاف سرکاری تفتیش کا بندوبست کیا۔ اس موقع پر بہت سی عورتوں نے شہادتیں دیں۔ انھوں نے کھل کر بے باکی سے اپنے تجربات اور اپنی حالت زار کا نقشہ کھینچا۔ ذرائع ابلاغ نے بھی اس پر کافی توجہ دی۔ اگر اسی طرح کی تفتیش کا سلسلہ جاری رہے تو کمیشن اس بات کا جائزہ لے سکتا ہے کہ ان مظالم کرنے والوں کے خلاف کیا کارروائی کی گئی۔ اس جائزے سے مظالم کرنے والوں کو اس عمل سے باز رہنے میں مدد ملے گی۔ اس سے سرکاری مشینری ٹال مٹول کے طریقوں سے بھی باز رہے گی۔

جہیز کا مسئلہ بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جس

کے باعث عورتوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ بھی سماجی تانے بانے میں لڑکوں اور لڑکیوں کے رتبے میں عدم مساوات کا شاخسانہ ہے۔ اگر لڑکی کو ماں باپ کی جائداد میں اس کا جائز حق مل جایا کرے تو جہیز کا جواز بن سکتا ہے لیکن جہیز باپ کے سماجی مرتبے کے اظہار کا ذریعہ اور نام ونمود کی نمائش کا طریقہ سمجھا گیا ہے۔ لڑکی کی شادی اور اس میں جہیز کا دینا باپ کی طرف سے اس بات کا کھلے عام اظہار رہے کہ اس کی اقتصادی قوت کتنی ہے اور سماج میں وہ کتنا اوپر ہے۔ اس طرح وہ یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ اپنی دولت اور نام ونمود کے اظہار کی صلاحیت کے باعث اس نے ایسا رتبہ حاصل کیا ہے جو اپنے سماجی مرتبے سے بھی اوپر ہے۔ اگر باپ نے یہ رقم لڑکی کی تعلیم وتربیت پر صرف کی ہوتی تو بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی سسرال میں زیادہ باعزت مقام حاصل کر پاتی۔

شادی کے بعد اگر کنبے کی آپسی کسی رنجش کو سلجھانا ہو تو اس کے لیے ایک قانون ہے جسے فیملی کورٹس ایکٹ کہتے ہیں۔ بہت سی ریاستوں نے اس قانون کو لاگو نہیں کیا ہے جب کہ کمیشن کا خیال یہ ہے کہ خاندانی جھگڑے خاص کر میاں بیوی کے آپسی اختلافات عدالتوں سے باہر کے ماحول میں طے ہوں۔ اس پس منظر میں دسمبر ۱۹۹۴ء میں کمیشن نے فیملی کورٹس کے موضوع پر ایک قومی کانفرنس بلائی۔

عورتوں سے متعلق ایکٹ ۱۹۹۰ء کے قومی کمیشن کے سیکشن ۱۰ (۴) کے تحت کمیشن کو یہ اختیارات حاصل ہیں کہ عورتوں کی حقوق کی خلاف ورزی کے معاملات کی از خود چھان بین کرے۔ یہ کمیشن عورتوں کے تحفظ سے متعلق بنائے گئے قوانین پر عمل درآمد نہ ہونے کی صورت میں بھی معاملہ کی چھان بین کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں متعلقہ حکام سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ اس ایکٹ کی دفعات کی روشنی میں کمیشن مختلف طرح کی ذمہ داریاں نبھا رہا ہے، اس سلسلے میں مشورہ اور نصیحت سے لے کر عورتوں کے حقوق کی خلاف ورزی کرنے اور ان پر ظلم کرنے والوں کو سزا دلانے تک کی ذمہ داریاں اسی کمیشن کی ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں سے آئی ہوئی درخواستوں پر یہ کمیشن غور کر رہا ہے، کچھ حالتوں میں کمیشن کے ارکان نے خود دورہ کر کے متعلقہ حکام کے ساتھ اس سلسلے میں بات چیت کی۔ مثبت رجحان اور کمیشن کے نزدیک ایک مثبت اور خوش آئند رجحان یہ ہے کہ تمام سطحوں پر حکام نے کھا ہے یہ کہا ہے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ عورتوں پر کیے جانے والے ظلم وستم کا سدّباب کریں گے۔ کچھ انھیں سرکاروں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں اس سلسلے میں طریق کار وضع کر لیا گیا ہے۔ عورتوں اور لڑکیوں کو بڑھاوا دینے کے لیے موجودہ طریق کار کے علاوہ کچھ نئے اقدامات بھی ضروری سمجھے گئے ہیں، عورتوں کی شکایات کے ازالے کے سلسلے میں کمیشن نے جو تجربات کیے ان کی بنیاد پر کمیشن نے کچھ سفارشات مرتب کیں جن کی رو سے عورتوں پر ظلم وستم کا ازالہ ہو سکے گا۔ اس سلسلے کی کچھ سفارشات درج ذیل ہیں:۔

ہر ریاست اور ہر ضلع میں ایسے اداروں کا قیام ضروری بتایا گیا جن کی ذمہ داری یہ ہو کہ وہ معاملات پر نظر رکھے اور ہر ضلع میں عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم پر نگاہ رکھنے کے لیے ایک نظام مرتب کیا گیا۔ اس طرح کی کوششوں میں معروف تنظیم کو میلا سرکشا سمیتی کہتے ہیں۔ اسی طرح کی کمیٹیاں ریاستی پولیس افسران اور مجسٹریٹوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ قانونی امداد دینے والے کارکن بھی اس میں ہوتے ہیں۔ خاتون افسران بھی اس میں شامل کی جاتی ہیں، ہر ریاست میں اس کے ذمہ داران الگ الگ ہیں۔ قانونی امداد کے ماہرین بھی اس میں شامل ہوئے۔ یہ کمیٹیاں اس طرح تشکیل دی گئی ہیں کہ اس پر قانونی امداد کے ماہرین بھی شامل ہیں۔ کمیٹی میں بالعموم پولیس افسران، کہیں کہیں مجسٹریٹ بھی شامل ہیں، عورتوں کے خلاف مظالم کی روک تھام کے سلسلے میں ہندوستان نے رہنمایانہ کردار ادا کیا ہے۔

ملک کے رضاکار ادارے اس سلسلے میں رہنمایانہ کردار نبھا رہے ہیں۔ انھوں نے مختلف مہمات کی مدد کی تاکہ عورتوں کے خلاف جبر واستحصال کو روکا جا سکے۔ رضاکار اداروں کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگاتے ہوئے مرکز اور ریاستی سرکار کو مزید اختیارات دیے جانے کی ضرورت محسوس کی گئی، رضاکار اداروں کے ذمے یہ کام بھی لگایا گیا کہ جہاں کہیں بھی عورتوں پر ظلم وستم ہو اس کے معاملات کمیشن تک پہنچائے جائیں۔ کمیشن نے یہ سفارش کی ہے کہ غیر سرکاری تنظیموں کی امداد کی موجودہ اسکیم کو اس طرح بدلا جائے جس سے عورتوں کے خلاف مار پیٹ کے واقعات بھی اسی کے دائرہ کار میں شامل ہو سکیں۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ مرکزی سرکار ایسی اسکیم لاگو کرے جس سے غیر سرکاری تنظیموں کی امداد ہو سکے اور تشدد کے واقعات بھی یہ تنظیمیں نپٹا سکیں۔

بڑے شہروں میں عورتوں کے لیے سیل یا پولیس اسٹیشن قائم کیے گئے ہیں جن کے ذریعے سے عورتوں پر تشدد کے خلاف معاملات سے نپٹا جا سکے۔ عورتوں کے تھانوں کا قیام ایک نیا تصور ہے۔ اسی لیے یہ ابھی تک پورے ملک میں قائم نہیں کیے جا سکے، کمیشن نے سفارش کی ہے کہ یہ کام ترجیحی بنیادوں پر ہونا چاہیے۔ ایسے تمام شہروں میں اس طرح کے تھانے قائم کیے جائیں جن کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ ان کو سماجی فنڈ اور اختیارات اور ضروری عملہ دیا جانا چاہیے۔

اب ہم اکیسویں صدی میں قدم رکھ رہے ہیں لیکن پھر بھی عورتوں پر تشدد کے خلاف معمولی انداز میں ہی دیکھا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں قانون نافذ کرنے والے ادارے ان واقعات کو سرسری طور سے دیکھتے ہیں۔ عورتوں پر تشدد کی روک تھام کے نظام کو حساس بنانا ہے تاکہ عورتوں کے خلاف اس طرح کے امتیازات کو ختم کیا جا سکے۔ اس طرح سے عورتوں کے مسائل کے تئیں بیداری لانے کے لیے تمام انتظامیہ میں ہر سطح کے تربیتی پروگرام میں اس عنصر کو شامل کیا جانا چاہیے۔ پولیس، مجسٹریٹ، طبی، قانونی عملہ اور انگلیوں وغیرہ کے نشانات کے ماہرین کو اس کام کی تربیت دی جانی چاہیے۔ عدلیہ کے لیے بھی اس مسئلہ پر حساس ہونا ضروری ہے۔

شادی شدہ عورتوں کو سسرال میں ہراساں کیا جاتا ہے، یہ اور بھی گھناؤنا جرم ہے۔ گھر سے باہر عورتوں پر کیے جانے والے مظالم سے بھی زیادہ نفرت انگیز وہ اذیتیں ہیں جو عورت کو سسرال میں ملتی ہیں، شوہر یا دیور کی

باقی صفحہ ۲۶ پر

محمد عارف

ہندوستان کی ترقی کا ضامن
نیا اقتصادی منظر نامہ

ہندوستان کے افرادی اور قدرتی وسائل بجا طور پر اس بات کے لیے دلالت کرتے ہیں کہ عالمی معاشی نظام میں ہندوستان کی بڑی اہمیت ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں اقتصادی اصلاحات کا سلسلہ اس پس منظر میں شروع کیا جا سکا اور ۱۹۹۱ء کے وسط سے ہندوستانی معیشت نے اصلاحات کے عمل کے تحت تیز رفتار ترقی کے ثبوت دیئے۔ موجودہ سرکار نے جب زمام حکومت سنبھالی، اس وقت ملکی معیشت کی شرح ترقی ایک فی صد سے بھی کم ہو گئی تھی لیکن اب یہ بڑھ کر ۵ر۵ فی صد ہو گئی ہے۔ صنعتی رفتار ترقی نصف فی صد سے بڑھ کر ۷ر۸ فی صد ہو گئی۔ اندرون ملک صنعتی سرمایہ کاری بڑھی اور اس کے ساتھ ہی غیر ملکی براہ راست سرمایہ کاری میں بھی اضافہ ہوا جس سے روزگار کے مواقع بڑھنے کے امکانات روشن ہوئے۔ اس طرح کی کامیابیاں صرف اس لیے میسر ہو سکیں کہ چونکہ ہمہ جہت اقتصادی ترقی کی بنیادیں مضبوط ہو چکی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حصول آزادی کے بعد سے ہی ہندوستان نے اقتصادی ترقی کے پروگرام خود کفیل اور سماجی انصاف کے اصولوں کو ساتھ لے کر چلے ہیں۔

ہندوستان میں ۱۹۵۱ء سے منصوبہ بند ترقی کا عمل شروع ہوا، چنانچہ سب سے پہلے زرعی پیداوار کی ترقی پر توجہ دی گئی تاکہ ملک کو قحط سالی اور خوراک کی کمی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ بنیادی اور کلیدی صنعتوں کو استوار کرنے کی کوشش کی گئی ان کوششوں کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ ملک خوراکی اجناس کی ضرورتوں میں خود کفیل ہے بلکہ آج ملک سے باہر اناج برآمد کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ ملک میں صنعتی ڈھانچہ کو اس قدر مضبوطی ملی کہ اب ہندوستان مینوفیکچرنگ سرگرمیوں کے تمام شعبوں میں قدم جمائے ہوئے ہے۔ تحقیق و ترقی کا جدید ڈھانچہ اندرون ملک فراہم کر لیا گیا ہے اس وقت ہندوستان میں سائنسی اور تکنیکی عملے کی تعداد اتنی ہے جو نہ صرف اندرون ملک جدید ترین شعبوں کی ضرورتوں کو پورا کر رہی ہے بلکہ اپنی خدمات سے دوسرے ملکوں خاص کر ترقی پذیر ملکوں کو فائدہ پہنچا رہی ہے۔ ملک میں بینکنگ کا نظام دور دراز دیہی علاقوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اشیاء کی فروخت اور تقسیم کا استوار وسیع نظام موجود ہے جس سے ملک کے تقریباً ۴ ہزار شہر اور قصبات نیز ۵ لاکھ سے زیادہ دیہات فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ان شعبوں کی کامیابیاں ہندوستانی معاشی نظام کے لیے ایک ایسی قوت ثابت ہوئی ہیں کہ بین الاقوامی مقابلے میں ان کی حیثیت اب کسی طور کم نہیں ہے۔ اقتصادی اصلاحات کے عمل سے قبل ہندوستان کی صنعتی ترقی لائسنسنگ کے نظام اور ضابطوں پر منحصر تھی اور درآمدات کی پابندیاں اور ٹیرف محصولات کی بڑھتی ہوئی شرحیں اس کو باہر ملکوں سے مقابلہ کی سکت پیدا کرنے نہیں دیتی تھیں۔

۱۹۹۰ء کے آغاز میں ملکی معیشت کو اس وقت دھکا پہنچا جبکہ ملک میں افراط زر کی شرح بڑھ کر ۱۷ فی صد تک جا پہنچی۔ اندرون ملک مجموعی پیداوار میں مشکل سے ۱/۲ فی صد سالانہ اضافہ ہو سکا تھا بین الاقوامی تجارت کے منفی رجحانات کے سبب توازن ادائیگی خطرناک صورت حال اختیار کر چکی تھی۔

خام تیل کی قیمتوں میں اضافے اور خلیجی جنگ کے سبب حالات کافی خراب ہو چکے تھے، چنانچہ اقتصادی اصلاحات کا عمل ایک جرأت مندانہ قدم تھا، جس کے باعث معیشت نے چند ماہ میں ہی کھوئی ہوئی طاقت بحال کر لی۔ سخت اقتصادی ضابطوں سے بجٹ کا گھاٹا اور مالی گھاٹا قابو میں لانے کی کوشش کی گئی۔ جولائی ۱۹۹۱ء سے اقتصادی ترقی کا جو عمل شروع کیا گیا تھا، اس کے باعث حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے۔ آج ہندوستانی معیشت بڑی حد تک پختہ کاری کی طرف بڑھ چکی ہے اور جدید کاری کے عمل نے اسے پائیداری بخشی ہے اور اس کی وجہ سے وہ خود کو بین الاقوامی منڈی میں دوسروں سے کمتر نہیں پاتی۔ سرمایہ کاری کی فضا میں نمایاں بہتری دیکھنے کو ملی ہے۔ صنعتوں کے تمام زمروں کے لئے اب منظوری ضروری نہیں رہ گئی ہے۔ پبلک سیکٹر کے لئے اب صرف ایٹمی توانائی، ریلویز، اور دفاعی ساز و سامان کو محدود کر دیا گیا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کار اب زیادہ تر صنعتی کارخانوں کو لگانے کے لئے آزاد ہیں۔ ہندوستانی سٹاک بازار میں غیر ملکی سرمایہ کاری کرنے والے روپیہ لگا سکتے ہیں۔ کمپنیاں، غیر ملکی سیکورٹی منڈیوں سے رقم لے سکتی ہیں۔ اور باہر ملکوں میں سرمایہ کاری کر سکتی ہیں جس سے کہ عالمی تجارت میں توسیع ہو سکے۔ امور محنت سے متعلق قوانین کو اس طرح ڈھال دیا گیا ہے جو کام کرنے کے لئے ایک بہتر ماحول کے ضامن ہوں۔

یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ اقتصادی اصلاحات

۱۲۔ لے جتی پورم، کالونی ظہیر الدنان، غازی آباد

کے نتیجے ہیں مینوفیکچرنگ سیکٹر میں شرح ترقی ۹/۲ فی صد تک پہنچ گئی اور بھاری سامان کی تیاری میں یہ اضافہ ۷/ 24 فی صد تک ہے، یہ اضافے ان لوگوں کے اعتراضات کا عملی جواب ہیں جو ان اصلاحات کو ہندوستانی صنعتی ترقی کے لیے مضر بتلاتے تھے۔

زراعت، ہندوستانی معیشت کا سب سے اہم سیکٹر رہا ہے۔ ملک کی مجموعی پیداوار کا ایک تہائی حصہ اسی شعبے سے ملتا ہے اور ملک میں کام کرنے والی جس قدر قوت ہے، اس کا ۶۶ فی صد حصہ اس شعبے سے وابستہ ہے۔ ۱۹۹۲ء میں غلہ کی پیداوار گھٹ کر ۱۶ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن رہ گئی تھی لیکن اس سال غلہ کی پیداوار کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے اور یہ ۱۸ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن سے تجاوز کر جائے گی، کسانوں کو اجناس کی نفع بخش قیمتوں کے ملنے سے یہ کامیابی ممکن ہو سکی ہے، ۱۹۵۰ء میں ہندوستان کو باہر سے غلہ منگانا پڑتا تھا۔ اب ہندوستان دوسرے ملکوں کو غلہ برآمد کرنے کی سوچ رہا ہے، گندم اور چاول کے معاملے میں ملک پوری طرح خود کفیل ہے۔

زراعت سے متعلق دیگر سرگرمیوں کو بڑھانے پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ مثلاً مویشی پروری باغبانی، مرغی پالنا، سور پالنا وغیرہ، مچھلی پالن پر خاص زور ہے اور بحری مصنوعات کی برآمدات میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے، زراعت کو ہندوستانی معیشت میں کلیدی مقام حاصل ہے اور اس سے بحیثیت مجموعی اقتصادی حالات میں استحکام آسکا ہے۔ آب رسانی والے رقبے اور کیمیاوی کھادوں کے استعمال والے رقبے کے اعتبار سے ہندوستان کا شمار دنیا کے چند گنے چنے ملکوں میں ہوتا ہے۔ چائے کی پیداوار کے اعتبار سے ہندوستان پہلے نمبر پر ہے، اس طرح مونگ پھلی کی پیداوار میں بھی یہ سب سے اول ہے۔ البتہ چاول کی پیداوار کے اعتبار سے یہ دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ گندم کی پیداوار کے اعتبار سے یہ دنیا میں چوتھے نمبر پر ہے۔ بجلی کی پیداوار میں یہ دنیا کے ملکوں کے مقابلے میں آٹھویں نمبر پر ہے جبکہ سیمنٹ کی پیداوار میں یہ چوتھے نمبر پر ہے۔

ہندوستان میں تیل، فولاد، ٹیلی کمیونی کیشن اور بجلی جیسی بنیادی صنعتوں میں پیداوار بڑھانے کی بڑی گنجائش ہے۔ پٹرولیم اب بھی درآمد کیے جانے والا سب سے بڑا آئٹم ہے، البتہ ملک میں تیل صاف کرنے اور تیل کے ذخائر دریافت کرنے کی کوششوں سے ملک میں تیل کی ضروریات کا ۵۰ فی صد حصہ اندرون ملک حاصل کردہ تیل سے پورا کر لیا جاتا ہے، قدرتی گیس کی پیداوار ۱۹۸۰ء کے بعد سے تیزی سے بڑھی۔ قدرتی گیس کی تقسیم کے لیے قومی سطح پر ایک پائپ لائن بچھانے کا نظام چالو کیا جا رہا ہے۔ حالیہ اصلاحات کی روشنی میں اندرون ملک اور غیر ملکی پرائیویٹ کمپنیوں کو تیل اور گیس کی کھوج کے لیے اجازت دے دی گئی ہے، اس طرح اب پرائیویٹ کمپنیاں چاہے وہ ملکی ہوں اور غیر ملکی مٹی کے تیل کی فروخت اور ایل پی جی (پکوان گیس) کی فروخت کے لیے آزاد ہیں۔

ہندوستان میں بحری جہازوں کی تیاری ہوائی جہازوں کی تیاری، آٹو موبیل، مشینی پرزوں صنعتی اور زراعتی آلات، کیمیاوی اجزا، پٹرو کیمیکلز فرٹیلائزر، جراثیم کش دوائیں، ڈرگس، ٹربائن، جنریٹر اور دیگر پیچیدہ سامان، کاغذ، گتہ، انجینئرنگ کا ہلکا اور بھاری سامان، الیکٹرانکس اور دیگر بہت سا جدید ترین سامان اور مشینری تیار کرنے کی سہولتیں پیدا کر لی گئی ہیں۔ ایٹمی توانائی، خلائی تحقیق اور بحریات میں تو ہندوستان نے رہنمایانہ کردار کیا ہے۔

اشیائے صارفین کے زمرے میں تو ہندوستان نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔

ٹیلی کمیونی کیشن

ہندوستان نے ٹیلی مواصلاتی سیٹلائٹ کا اپنا نظام وضع کیا ہے جس سے دنیا بھر کے ملکوں کے ساتھ اس کا رابطہ قائم ہے۔ ملک میں ۱۱۰۰۰ سے زیادہ مقامات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ہندوستان کا 212 ملکوں کے ساتھ ٹیلی مواصلاتی رابطہ قائم ہے۔ اس نظام کی توسیع و ترقی کو ملک میں کافی اہمیت دی گئی ہے۔ اس شعبے کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر نیز دس لاکھ دس ہزار مزید لائنوں کی تنصیب کے ایک منصوبے کو سامنے رکھتے ہوئے پرائیویٹ سیکٹر میں ٹیلی مواصلاتی ساز و سامان کی تیاری شروع کی جا چکی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کو سیلولر فون، وائس میل الیکٹرک میل، ریڈیو پیجنگ وغیرہ سروسوں میں دعوت دی جا رہی ہے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔

ٹرانسپورٹیشن

ہندوستان میں ٹرانسپورٹ کا ایک وسیع و عریض نظام موجود ہے۔ مسافروں اور ساز و سامان کی نقل و حمل کے لئے ریلوے کا نظام سب سے بڑا ہے۔ اس کے بعد سڑکوں کے ذریعہ ٹرانسپورٹ کا نظام ہے، ان کے علاوہ ہوائی جہاز، بحری جہاز، اندرون ملک آبی راستے، روپ ویز (ROPE WAYS) اور پائپ لائنیں بھی اس میں بڑی حد تک مددگار ہیں، ہندوستان میں ریلوے کا نظام 62500 روٹ کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے، یہ ایشیا کا سب سے بڑا نظام ہے۔ ریلوے کے ذریعے ہر سال 37 کروڑ ٹن سامان ڈھویا جاتا ہے، ریلیں ہر سال، تقریباً ۴ ارب مسافروں کو نقل و حرکت کراتی ہیں، جدید کاری کے عمل سے نیز نئی سرمایہ کاری کی مدد سے اسے مزید توسیع دی جا رہی ہے، بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے پرائیویٹ سیکٹر کو اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ ریلوے کے مستقبل کے توسیعی پروگراموں میں حصہ لے۔

ہندوستان میں تقریباً ۱۹ لاکھ کلومیٹر فاصلہ بذریعہ سڑک طے کرنے کی سہولت موجود ہے۔ مال کی ڈھلائی میں اس کا آدھا حصہ ہے۔ طویل فاصلہ اگرچہ ریلوے کے ذریعے سے ہی طے کیا جاتا ہے لیکن چھوٹے موٹے فاصلوں پر بس کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس طرح ۶۰ فی صد مسافر بسوں سے سفر کرتے ہیں۔ اس وقت سڑکوں پر تقریباً ۲۰ لاکھ گاڑیاں دوڑ رہی ہیں اور ان میں ہر سال دس فی صد اضافہ ہو رہا ہے۔

ہندوستان میں ساحل سمندر تقریباً 67 ہزار کلومیٹر ہے، ہندوستان کی ۱۱ بڑی بندرگاہیں اور ۱۳۹ چھوٹی بندرگاہیں ہیں جن میں چھ ہزار بحری جہاز سفر کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی بندرگاہوں پر سالانہ ۱۵ کروڑ ٹن مال لادا اور اتارا جاتا ہے۔

ہندوستان یورپ اور مشرق نیز جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں سے بذریعہ ہوائی جہاز بھی جڑا ہوا ہے۔ آسٹریلیا، افریقہ، امریکہ اور کینیڈا کے لیے ملکی اور بین الاقوامی پروازوں کی سہولتیں موجود ہیں۔ بمبئی، دہلی، کلکتہ اور مدراس میں بڑی بین الاقوامی ایئرلائنوں کے دفاتر موجود ہیں۔ ایئر انڈیا کی سروس دنیا کے چالیس ملکوں کے ساتھ براہ راست ہے۔

انرجی کی تیاری

انرجی حاصل کرنے کے پانچ وسیلے ہیں جو سب کے سب ہندوستان میں موجود ہیں یعنی پن بجلی تھرمل پاور، نیوکلیر بجلی، ہوا سے حاصل ہونے والی طاقت اور شمسی توانائی، بائیو گیس انرجی کے شعبے میں ہندوستان نے رہنمایانہ کردار ادا کیا ہے، بجلی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ۹۷-۱۹۹۶ء تک مزید ۵۰۰۰ ہزار میگا واٹ بجلی حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی جائے گی۔ بجلی کی تیاری کے لئے پرائیویٹ سیکٹر کو اجازت مل چکی ہے، اس سلسلے میں غیر ملکی سرمایہ کاری اور نجی سرمایہ کاری کے لئے بہت سی مراعات دی گئی ہیں۔ ہندوستان میں تیل اور کوئلہ انرجی کی اہم وسائل ہیں مگر نیوکلیر انرجی سے بھی کام لیا جانے لگا ہے۔ انرجی کے غیر روایتی وسیلوں پر اب زیادہ توجہ ہے، یعنی بائیو گیس، بائیو ماس شمسی توانائی، وغیرہ۔

بجلی تیار کرنے کی صلاحیت بڑھ کر ۷۶ ہزار میگا واٹ ہو چکی ہے، اس میں سے تقریباً ۷۰ فی صد کوئلے، گیس اور نیوکلیر ذرائع سے حاصل ہوتی ہے، باقی پن بجلی ہوتی ہے۔ بجلی کی تیاری میں ۸ تا ۹ فی صد سالانہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اس میں بھی نجی سرمایہ کاری خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ ہندوستان نے جی۔ پندرہ گروپ کے ملکوں میں شمسی توانائی کے استعمال کے سلسلے میں تال میل قائم کرنے میں رہنمایانہ رول ادا کیا ہے۔ ساحلی علاقوں میں ہوائی قوت سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

ملک میں صنعت، تجارت، تعمیر مکانات، زراعت اور متعدد دیگر شعبوں کو مضبوط بنانے کے لئے بنکوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ان میں صنعتی ترقی کے بھارتی بنک، صنعتی قرضوں اور سرمایہ کاری کی بھارتی کارپوریشن، انڈسٹریل فنانس کارپوریشن، درآمدات و برآمدات کے بھارتی بنک، زراعت اور دیہی ترقی کے قومی بنک، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لئے ترقیاتی بنک، ہاؤسنگ ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن، شپنگ کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ کمپنی، ٹورزم فنانس کارپوریشن آف انڈیا وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ زندگی بیمہ کارپوریشن اور جنرل انشورنس کارپوریشن نے بھی کلیدی شعبوں کی سرمایہ کاری میں اہم رول ادا کیا ہے۔

حال ہی میں سیکورٹیز اینڈ ایکسچینج بورڈ آف انڈیا قائم کیا گیا ہے۔ جس کی مدد سے ہندوستان کی سرمایہ منڈی مضبوط ہو گی، ملک میں ۲۲ سٹاک ایکسچینج ہیں جن کی مدد سے وسائل کی فراہمی ہوتی ہے، بمبئی سٹاک ایکسچینج کا کاروبار نیویارک اور لندن کے ایکسچینج دفاتر کی طرح سے ہی کام کرتا ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی اقتصادی اصلاحات نے ہندوستان کے زرعی، صنعتی، تکنیکی اور ترقیاتی منظر نامے کو ایک ایسی قوت عطا کی ہے جس کے باعث آج ہندوستان دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی طرح سے ہی اپنا سر فخر سے اونچا کر سکتا ہے۔ ●

بقیہ: اردو نظم: ایک تعارفی خاکہ

عمیق حنفی، قاضی سلیم، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد علوی، مظہر امام، ندا فاضلی، سحر ان کے بعد کشور ناہید، پروین شاکر، غلام جیلانی اصغر، جیلانی کامران، صلاح الدین پرویز، عین رشید، رب نواز مائل اور عین تابش وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔

اس تفصیلی گفتگو کے ضمن میں یہ بات بھی شاید ضروری ہے کہ اردو نظم کے ارتقار کی تاریخ میں نظم معریٰ جو انگریزی کی BLANK VERSE کے زیر اثر سامنے آئی کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ نظم معریٰ کی شروعات کو ہم ایک نئے رنگ میں اردو نظم کا باضابطہ ارتقار بھی کہہ سکتے ہیں۔ اردو نظم معریٰ میں نظم کے بہترین نمونے پیش کیے گئے اور ایسی نظمیں سامنے آئیں جنھیں ہم دنیا کی اچھی نظموں کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔ نظم معریٰ آج بھی جاری و ساری ہے لیکن آزاد نظم کی ارتقار پذیری نے بڑی حد تک نظم معریٰ کے ارتقار پر اثر ڈالا ہے اور عصر حاضر میں دراصل آزاد نظم ہی اردو نظم کی پہچان بن گئی ہے۔ اسی سلسلے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ دو دہائیوں میں لکھی گئی اردو نظمیں جن میں معریٰ اور آزاد دونوں شامل ہیں، فکری سطح سے اسلوبیاتی اجتہاد تک نظم کے بہترین، عہد ساز اور ناقابل فراموش نمونے پیش کرتی ہے اور یہ کہنا مشکل نہیں کہ آج اردو نظم دنیا کی کسی زبان اور کسی ادب کی شاعری کے مدمقابل رکھی جا سکتی ہے۔ اس نے اگر ایک طرف فنی تجربے کیے ہیں تو دوسری طرف عصری معاملات و مسائل سے پوری فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ نبرد آزما ہوئی ہے اور تاریخ ادب کے صفحات پر اپنے دستخط ثبت کر دیے ہیں۔ ●

بقیہ: عورتیں اور سماجی ترقی

نے اسی قسم کا ایک تجربہ پانڈیچری میں کیا تھا جس سے دوسری ریاستوں کو بھی یہ ماڈل اپنانے کی تحریک ملی ہے۔ پانڈیچری کے منگلم نامی گاؤں کی عورتوں پر یہ ماڈل آزمایا گیا جس سے خود اپنے بارے میں ان کا نظریہ صرف چار روز کے اندر بدل گیا۔ اس تجربے کی کامیابی کے لیے محکمۂ سماجی بہبود، لیگل ریسورس سروس ایسوسی ایشن اور سماجی بہبود کے ریاستی مشاورتی بورڈ نے بھی اپنا تعاون دیا۔

عورتوں کو بہتر شرکت کے لیے سماجی تبدیلی کی ایسی ہی اسکیمیں معمولی شروعات کے بعد رفتہ رفتہ کامیاب ہو رہی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ دیہی عورتیں اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے عورتوں کے ذریعے عورتوں کو انصاف کی جانب آگے بڑھیں گے

ہندوستان نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حقیقی جمہوریت نچلی سطحوں سے آتی ہے اوپر کی سطح سے نیچے کی طرف نہیں۔ نچلی سطح پر جمہوریت کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ عورتوں کو کتنا اختیار حاصل ہے یعنی یہ کہ وہ اپنے کنبے کے سائز کا فیصلہ کرنے، اپنی صحت کی فکر کرنے اور لڑکیوں کو اسکول بھیجنے کے بارے میں نیز لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مار دینے کی بدعت اور بچوں کی شادی کے غلط رواج کو ختم کرنے کے لیے فیصلے لینے میں کہاں تک آزاد ہیں۔ اگر لڑکیوں کو تعلیم، صحیح جانکاری اور عقل دی جائے تو امید کی جا سکتی ہے کہ عورتیں جلد ہی سماج میں اپنا جائز مقام حاصل کر لیں گی۔

ظہیر الحسن

اسٹیل کی صنعت
عالمی لیڈرشپ کی راہ پر

پبلک سیکٹر کمپنی اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا (سیل) ترقی یافتہ ممالک کی اسٹیل کمپنیوں سے کئی معاملات میں نہ صرف سب سے آگے ہے بلکہ اسے دنیا میں سب سے سستا اسٹیل پیدا کرنے کا بھی فخر حاصل ہے۔

برٹش ہاؤس آف لارڈس کی ایک منتخبہ کمیٹی نے دنیا کے کئی ممالک میں ٹیکس سے پہلے اسٹیل کے پیداواری خرچ کا جائزہ لیا۔ جائزے میں پایا گیا کہ اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا کے تحت چلنے والے کارخانوں میں دنیا میں سب سے زیادہ سستا ہاٹ رولڈ اور کولڈ رولڈ اسٹیل پیدا ہوتا ہے۔ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ٹیکس سے پہلے کولڈ رولڈ اسٹیل کا پیداواری خرچ برطانیہ میں ۴۱۳ ڈالر، آسٹریلیا میں ۴۶۸ ڈالر، جنوبی کوریا اور تائیوان میں ۵۱۱ ڈالر، امریکہ میں ۵۱۳ ڈالر، برازیل میں ۵۲۸ ڈالر، جرمنی میں ۵۵۸ ڈالر اور جاپان میں ۵۷۲ ڈالر تھا۔ جب کہ اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا کے کارخانوں میں یہ خرچ صرف ۳۷۲ ڈالر تھا۔ اسی طرح سیل کے کارخانوں میں ہاٹ رولڈ اسٹیل کا پیداواری خرچ ۲۷۰ ڈالر سے کم تھا جب کہ برطانیہ میں ۳۲۲ ڈالر، امریکہ میں ۳۶۶ ڈالر، جنوبی کوریا میں ۳۹۰ ڈالر، برازیل میں ۴۱۰ ڈالر، جرمنی میں ۴۲۷ ڈالر اور جاپان میں ۴۳۲ ڈالر تھا۔

یونین بینک آف سوئزرلینڈ کی ایک شاخ یو بی ایس سیکورٹیز کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس صدی کے اختتام تک ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا فولاد پیدا کرنے والا ملک بننے جا رہا ہے اور یہاں اس دھات کا استعمال بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ بینک نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ ایشیا کی دوسری بڑی کمپنیوں جیسے جنوبی کوریا کی یونائیٹڈ آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی (پی او ایس سی او) اور چائنا اسٹیل کارپوریشن کے مقابلے سیل کو کچھ فائدے حاصل ہیں۔ رپورٹ میں جن فائدوں کو گنایا گیا ہے ان میں کچے مال (آئرن اور کوئلہ) کی قیمتوں میں استحکام کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اسے دوسری کمپنیوں کی طرح بھاری مقدار میں کچا مال درآمد کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً غیر ملکی زرمبادلہ کی دقت پیش نہیں ہوتی۔

ایک اور جائزہ "ورلڈ اسٹیل ڈائنامکس" کے مطابق فولاد کے پیداواری خرچ کے معاملے میں سیل ترقی یافتہ ممالک کی فولاد پیدا کرنے والی کمپنیوں سے ایک قدم آگے ہے۔ جائزہ میں کہا گیا ہے کہ سیل خاص کچا مال (آئرن اور) اور مزدوری کے معاملے میں برطانیہ، امریکہ اور جرمنی کی کمپنیوں کے مقابلے میں زیادہ فائدہ میں ہے۔ جہاں ایک ٹن بکری لائق اسٹیل کی پیداوار میں سیل کا آئرن اور خرچ ۱۹ ڈالر فی ٹن ہے وہیں امریکہ کی فولاد پیدا کرنے والی کمپنیوں کا یہ خرچ ۴۷ ڈالر، جرمنی میں ۶۳ ڈالر اور برطانیہ میں ۶۰ ڈالر تھا۔ اسی طرح جہاں ایک ٹن بکری لائق اسٹیل پر سیل کا مزدوری خرچ صرف ۵۲ ڈالر تھا وہیں امریکہ میں یہ ۱۶۱ ڈالر، جرمنی میں ۱۹۰ ڈالر اور برطانیہ میں ۱۱۳ ڈالر تھا۔ (ظ۔ ح)

آزادی کے بعد سے یہاں منصوبہ بند ترقی کا راستہ اپنائے جانے کی وجہ ہندوستان میں فولاد کی صنعت نے بھاری ترقی کی ہے۔ اس صنعت نے مختلف قسم کے فولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کے علاوہ فولاد پیدا کرنے کی اپنی کل صلاحیت میں بھی کافی اضافہ کیا ہے۔ حال کے برسوں میں سرکار کی نئی اقتصادی وصنعتی پالیسی سے اس صنعت کو نئی ترغیب ملی ہے اور سرکاری وغیر سرکاری کمپنیاں نہ صرف اپنی پیداواری صلاحیت بڑھانے بلکہ پیداواری تکنیک میں سدھار کرنے کے اپنے اپنے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے میں سرگرم عمل ہیں۔ آج یہ صنعت ملک کی ۹۰ فی صد ضرورت پوری کرنے کے لائق ہو گئی ہے اور درآمد شدہ فولاد پر ملک کا انحصار کم ہوتا جا رہا ہے۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں ہم ملک کی کل ضرورت کا گیارہ

موہن دھارا روڈ، حسین آباد، کاشی۔ ۲۲۱۰۰۲

فی صد فولاد درآمد کر رہے تھے یہ ۹۲-۱۹۹۱ء میں گھٹ کر ۵ فی صد رہ گیا۔ اگلے برس یعنی ۹۷-۱۹۹۶ء میں یہ اور کم ہوکر صرف ۳ فی صد رہ جائے گا۔

پیداوار میں تیز اضافہ کی وجہ سے جہاں ایک طرف فولاد کی درآمد میں کمی واقع ہو رہی ہے وہیں اس کی برآمد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں یہ اضافہ ۱۴۴ فی صد رہا اس سال ملک نے ۹۲-۱۹۹۱ء کے ۸۰۷ کروڑ روپے مالیت کے ۱٫۹۱ لاکھ ٹن فولاد کے مقابلے ۱۴۷۸ کروڑ روپے کی مالیت کا ۲٫۲۲ لاکھ ٹن فولاد برآمد کیا۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں اس دھات کی گھریلو مانگ میں اضافہ کی وجہ سے اس کی برآمد میں معمولی کمی آئی۔

فولاد کی درآمد میں کمی اسی لیے ممکن ہوسکی کہ صنعتی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھنے والی اس دھات کی پیداوار پچھلے چند برسوں میں تیزی سے بڑھی ہے۔ بکری کے لائق فولاد کی پیداوار جو ۹۱-۱۹۹۰ء میں ۳٫۹۳ لاکھ ٹن تھی ۹۵-۱۹۹۴ء میں بڑھ کر ۲٫۶۶۱ لاکھ ٹن ہو گئی۔ پیداوار میں ۹۵-۱۹۹۴ء میں ہی پچھلے سال کے مقابلے پندرہ فیصد کا اضافہ ہوا۔ پچھلے برس پیداوار میں ہوئے اس اضافہ میں اسٹیل اتھارٹی آف انڈیا (سیل) کے پانچوں کارخانے، وشاکھا پٹنم اسٹیل پلانٹ، ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کے علاوہ ثانوی درجے کے کارخانوں کا بھی بھرپور تعاون رہا۔ اس سال اسٹیل اتھارٹی کے کارخانوں نے اپنی صلاحیت سے زیادہ کام کرتے ہوئے ۹۰٫۴ لاکھ ٹن، وشاکھا پٹنم اسٹیل کارخانے نے ۱۶٫۴ لاکھ ٹن اور ٹاٹا آئرن اور اسٹیل کمپنی نے ۲۴٫۴ لاکھ ٹن اور ثانوی درجے کے کارخانوں نے ۳۵ لاکھ ٹن فولاد پیدا کیا۔ اسٹیل اتھارٹی کے بھلائی کارخانہ کی پیداوار ۳۴ لاکھ ٹن رہی، راورکیلا میں ۱۲ لاکھ ٹن اور درگاپور کارخانے میں ۸٫۵ لاکھ ٹن بکری لائق فولاد پیدا کیا گیا۔

چار ہزار سو کروڑ روپے کی لاگت سے درگاپور کارخانے کی تجدید و توسیع کا کام اپنی تکمیل کو پہنچ رہا ہے اور کئی تجدید شدہ اکائیوں نے کام کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ راورکیلا کارخانے کی تجدید کا دوسرا دور جاری ہے۔ یہ کام جولائی ۱۹۹۷ء تک مکمل ہو جائے گا تب اس کارخانہ کی خام فولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ۴۰ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۴۵ لاکھ ٹن ہو جائے گی اور بکری کے لائق اسٹیل کی پیداوار بھی ۳۱٫۶ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۳۷٫۸ لاکھ ٹن ہو جائے گی۔ بوکارو کارخانہ کی بھی تجدید کا کام شروع کیا گیا ہے جس پر ۷۱ سو کروڑ روپے خرچ ہوگا۔

اسٹیل اتھارٹی کے سیلم کارخانے نے ۹۵-۱۹۹۴ء میں نہایت ہی شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیداوار اور برآمد کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس کارخانہ میں بکری کے لائق فولاد کی پیداوار ۵۵٫۸۷ ٹن رہی۔ راشٹریہ اسپات نگم نے ۱۵٫۶ لاکھ ٹن بکری لائق فولاد پیدا کیا اور اس کی کل بکری ۹۴-۱۹۹۳ء کے ۱۹ سو کروڑ روپے کے مقابلے ۲۳ سو کروڑ روپے ہو گئی۔ نتیجہ میں اس کارخانہ نے نہ صرف مارچ کے مہینے میں ۴٫۷ کروڑ روپے کا خالص منافع حاصل کیا بلکہ ۹۵-۱۹۹۴ء کے پورے سال کے دوران اس کا نقدی منافع ۵۵ کروڑ روپے رہا۔

ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کی ملک میں فولاد کی بکری میں ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۲٫۰۶ لاکھ ٹن کا اضافہ ہوا۔ اس سال کمپنی کی فولاد کی کل بکری ۲۲٫۲ لاکھ ٹن رہی جو پچھلے سال کی بکری ۲۰٫۱۴ لاکھ ٹن کے مقابلے ۱۰٫۲۸ فی صد زیادہ ہے۔ کمپنی نے ۲۲٫۲ لاکھ ٹن کی کل بکری کا ۲۱٫۱ لاکھ ٹن فولاد اپنے کارخانہ میں پیدا کیا باقی ۱٫۲۱ لاکھ ٹن کمپنی نے یا تو درآمد کیا یا خریدا تھا۔ کمپنی اپنی تجدید کا چوتھا دور اس سال کے آخر میں شروع کر رہی ہے جس کے ۱۹۹۸ء میں مکمل ہونے کی امید ہے۔ اس تجدید کے بعد کمپنی کی پیداواری صلاحیت میں دس لاکھ ٹن کا اضافہ ہوگا۔

جندل آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کی کل تجارت بڑھ کر ۸۹٫۲ ، ۵ کروڑ روپے ہو گئی۔ اس کمپنی کے برآمدات میں بھی اضافہ ہوا اور وہ ۸۵ کروڑ روپے رہا۔ کمپنی نے اپنی ہاٹ رولنگ صلاحیت ۱۵ لاکھ ٹن سے بڑھا کر ۲۸ لاکھ ٹن کر لی ہے۔ جندل وجے نگر اسٹیل کارخانہ کے اسٹیل کوائل کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کر... اسے ۲۴ لاکھ ٹن سالانہ کیے جانے کی تجویز ہے۔ مل رہی اطلاعات کے مطابق کمپنی کی ہاٹ اسٹرپ مل ستمبر ۱۹۹۶ء میں تیار ہو جائے گی اور اسی وقت اس میں پیداوار بھی شروع ہو جائے گی۔

مرکزی کابینہ کی بیرونی سرمایہ کاری کمیٹی نے میسکو کو ۲۹، ۲ کروڑ روپے کی لاگت سے اڑیسہ میں اسٹیل کارخانہ لگانے کی اجازت دے دی ہے۔ اس کارخانہ میں ۱۲ لاکھ ٹن ہاٹ رولڈ کوائل اور ۵ لاکھ ٹن پگ آئرن پیدا کیا جائے گا۔ پیداوار ۱۹۹۷ء کے ابتدا میں شروع ہو جائے گی۔ میسکو کے اس کارخانہ کی برآمدات کے لیے ہوں گی۔ کارخانہ کی کل پیداواری صلاحیت ۴۵ لاکھ ٹن ہوگی جسے کمپنی دو ادوار میں مکمل کرنا چاہتی ہے۔

ان تمام کمپنیوں کے علاوہ لائیڈز اسٹیل، ایسٹر گجرات، نپن ڈینزو، میلویکا اسٹیل اور مونیٹ اسپات لمیٹیڈ کے توسیعی پروگراموں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگلی صدی میں داخلے کے وقت ۳٫۱۰ کروڑ ٹن اسٹیل کی گھریلو مانگ پوری کرنے کے بعد صنعت برآمد کے لیے بھی اسٹیل پیدا کر رہی ہوگی۔

سرکاری و غیر سرکاری کارخانوں کی شاندار کارکردگی ملک میں اعلا درجے کے کچے مال کی آسان دستیابی و ہنرمند و نیم ہنرمند مزدوروں کی بڑی تعداد کی بنا پر ہوسکی۔ نیشنل منرل ڈیولپمنٹ کارپوریشن (این ایم ڈی سی) نے ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۱۲٫۷۵ لاکھ ٹن اور کدریمکھ آئرن اور کمپنی نے ۸۴٫۴ لاکھ ٹن آئرن اور (۶۲ لاکھ ٹن کن سنٹریٹ اور ۲۲٫۴ لاکھ ٹن پیلیٹ) پیدا کیا۔ اس سال میٹل اسکریپ کارپوریشن (ایم ایس ٹی سی) نے بھی تین لاکھ ٹن اسکریپ درآمد کیا جس کی وجہ سے ملک میں فولاد کی صنعت کے لیے بنیادی خام مال کی دستیابی آسان بنی رہی۔

ملک میں آئرن اور کی کانیں بہار، اڑیسہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، گوا، کرناٹک، آندھرا پردیش اور راجستھان میں مرکوز ہیں۔ ملک میں فولاد کی پیداوار میں اضافہ کے ساتھ آئرن اور کی مانگ بھی بڑھ رہی ہے۔ اچھے درجے کے آئرن اور کی بین اقوامی بازار میں بھی اچھی مانگ ہے اور اس وقت ہندوستان آئرن اور کی اپنی کل پیداوار کا تقریباً نصف برآمد کرتا ہے۔ ایران، چین، جنوبی کوریا، پاکستان اور جاپان ہندوستانی آئرن اور کے بڑے خریدار ہیں۔ سرکار کی نئی معدنی پالیسی کانوں کی تلاش اور ان سے پیداوار حاصل کرنے میں نہ صرف غیر سرکاری کمپنیوں کو بھی حصہ لینے میں ترغیب دیتی ہے بلکہ ملک کے باہر سے برآمد کی گئی تکنالوجی کی بھی حمایت کرتی ہے۔

ملک میں آئرن اُور کے بھرپور ذخائر ہونے کے باوجود فولاد کی صنعت کے لیے اس بنیادی خام مال کی آسان دستیابی میں کچھ دقتیں محسوس کی جا رہی ہیں جیسے اس کے نقل و حمل کے لیے مناسب سہولیات کی کمی ہے، ریل بھاڑے اور ڈیمرج وغیرہ کی شرحیں اونچی ہونا وغیرہ۔ ان کے علاوہ ان کانوں سے کچا لوہا نکالنے کے لیے جدید تکنالوجی کا استعمال نہ ہونے کی وجہ سے ان کانوں سے اُور کی حصولیابی بھی کافی کم ہے۔ کان کنی کی نئی پالیسی میں کئی سرکاری پابندی ہٹا لیے جانے کے باوجود غیر سرکاری اور غیر ملکی کمپنیاں اس صنعت میں سرمایہ لگانے میں دقت محسوس کر رہی ہیں۔ کانوں سے خام لوہا کی حصولیابی میں بہتری لانے کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ان کانوں کو میکانکی بنایا جائے۔ لیکن جہاں پہلے ہی سے ضرورت سے زیادہ مزدور لگے ہوئے ہوں وہاں ان مزدوروں کے مفادات پر کسی قسم کی کوئی آنچ نہ آنے دیتے ہوئے ان کانوں کو میکانکی بنانا ایک بڑا چیلنج ثابت ہو رہا ہے۔

فولاد کارخانوں میں کوکنگ کول کو بھٹیوں میں تپا کر کوک میں تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ فولاد کے پیداواری خرچ میں کوک پر ہونے والا خرچ تقریباً ۳۵ فی صد ہوتا ہے۔ فولاد کارخانوں کو کوکنگ کول کی اپنی ضرورت کے لیے کول انڈیا کی کانوں پر منحصر رہنا پڑتا ہے یا پھر دوسرے ممالک سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ ملک کی کانوں سے حاصل ہونے والا کوکنگ کول دوسرے ممالک میں دستیاب کوکنگ کول کے مقابلے کم درجہ ہوتا ہے کیوں کہ ہندوستانی کوئلے میں راکھ کی مقدار بہت زیادہ یعنی زیادہ سے زیادہ ۱۰ فی صد کے بجائے ۱۸ فی صد ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے فولاد کارخانوں کو اپنا پیداواری درجہ بنائے رکھنے کے لیے کوکنگ کول زیادہ قیمت ادا کر کے دوسرے ممالک سے درآمد کرنا پڑتا ہے جہاں اس کی قیمت ہندوستان کے مقابلے تقریباً ۷۰ فی صد زائد ہے۔

سرکار کی نئی اقتصادی اور صنعتی پالیسی سے اس صنعت کو نئی ترغیب ملی ہے اور اس نے اب بین اقوامی منڈی میں قدم جمانے کے پروگرام پر عمل شروع کر دیا ہے۔ لیکن عالمی منڈی میں قدم رکھنے سے پیشتر اس صنعت کو اپنی پیداوار کے درجے میں سدھار اور لاگت خرچ کو کم کر کے عالمی معیار پر لانا ہوگا۔ ایسا کرنے کے لیے اسے اپنی فرسودہ تکنالوجی کو خیرباد کہہ کر نئی اور کم خرچ تکنالوجی اپنانا ہوگا۔ نئی تکنالوجی اپنانے کے بعد ہی اسے ملک میں دستیاب اعلا درجہ کے خام مال اور سستے مزدوروں کا پورا پورا فائدہ مل سکے گا۔ سستی مزدوری اور سستا خام لوہا سے ملنے والا فائدہ فرسودہ تکنالوجی کے استعمال کی وجہ سے دوسری مدوں پر ہونے والے زیادہ خرچ کی وجہ سے نہیں کے برابر ہو جاتا ہے۔ ایک تخمینے کے مطابق فولاد کی پیداوار میں مزدوری پر ۲۳ سے ۲۵ فی صد، توانائی پر تقریباً ۳۵ فی صد سے ۳۷ فی صد، سود پر تقریباً دس فی صد، مشینوں کی گھساوٹ پر ۱۲ سے ۱۵ فی صد اور نقل و حمل پر ۳۰ فی صد خرچ ہوتا ہے۔ مختلف کمپنیوں کے لیے بدلے ہوئے حالات میں پیداواری خرچ کی ان مدوں پر ہونے والا خرچ کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔

ہندوستانی فولاد کی صنعت کو اعلا درجہ کا خام لوہا اور وہ بھی کافی سستے دام دستیاب ہونے کی وجہ سے اسے ترقی یافتہ ممالک کی صنعتوں کے مقابلے بہت بڑا فائدہ حاصل ہے۔ اب تک خام لوہے کے جتنے ذخائر کی تصدیق ہو چکی ہے ان میں ۱۰۲۳ ارب ٹن خام لوہا موجود ہے۔ ان ذخائر میں موجود خام لوہے کی بھاری مقدار اعلا درجے کے خام لوہے کی ہے جن میں ۶۰ فی صد سے زیادہ لوہا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں فولاد کی پیداوار میں خام لوہے پر ہونے والا خرچ تقریباً چھ سات فی صد ہوتا ہے کیوں کہ مقامی بازار میں اس کچے مال کی قیمت ۱۸۰ روپے سے لے کر ۲۷۰ روپے فی ٹن ہوتی ہے جب کہ بین اقوامی منڈی میں اسی درجہ کے خام لوہے کی قیمت ۱۱۰۰ روپے فی ٹن ہوتی ہے۔ ہندوستان کا ہنرمند مزدور بھی ترقی یافتہ ممالک کے ہنرمند مزدوروں کے مقابلے کافی سستا ہے۔ یہاں ایک ہنرمند مزدور کے ایک گھنٹہ کام کی اوسط مزدوری ایک امریکی ڈالر ہوتی ہے جب کہ امریکہ میں یہی مزدوری ۲۰ ڈالر ہوتی ہے۔ ہندوستان اور ترقی یافتہ ممالک میں تکنالوجی کا فرق ہونے کے باوجود یہاں فولاد کی پیداواری لاگت میں مزدوری کا حصہ دس فی صد ہوتا ہے جب کہ امریکہ اور یوروپ کے ممالک میں یہ خرچ ۲۰ سے ۳۰ فی صد ہوتا ہے۔

کچھ ترقی یافتہ ممالک جیسے بیلجیم، لکسمبرگ، نیدرلینڈ، مغربی جرمنی، برطانیہ، آسٹریا، فن لینڈ، جاپان اور جنوبی کوریا اپنے یہاں پیدا ہونے والے کل فولاد کا ۷۰ فی صد سے زیادہ حصہ بلاسٹ آکسیجن فرنیس کی جدید تکنیک سے پیدا کرتے ہیں جب کہ ہندوستان میں اس تکنیک سے کل ۹ ۳ فی صد فولاد ہی پیدا ہوتا ہے باقی فولاد نسبتاً پرانی تکنیک سے پیدا کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے یہاں توانائی پر خرچ جدید تکنیک کے مقابلے ۳۰ فی صد زیادہ ہوتا ہے۔ فولاد کے پیداواری خرچ میں بجلی پر خرچ ایک اہم حصہ ہوتا ہے یہ اس دھات کی لاگت خرچ کا تقریباً ۴۰ فی صد ہوتا ہے۔ پرانی تکنیک سے فولاد پیدا کرنے والے کارخانوں میں ایک ٹن فولاد پیدا کرنے کے لیے ۷۰۰۔۵۰۰ یونٹ بجلی خرچ ہوتی ہے جب کہ بلاسٹ فرنیس کی جدید تکنیک میں اتنا ہی فولاد پیدا کرنے کے لیے ۱۰۰۔۱۵۰ یونٹ بجلی خرچ ہوتی ہے اور پھر ہندوستان میں بجلی کی شرح بھی ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے زیادہ ہے۔

سائنس و تکنالوجی کی بے پناہ ترقی کی وجہ سے فولاد کے بدل کی حیثیت سے پلاسٹک کا استعمال دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن اب بھی فولاد صنعتی ترقی میں ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ہندوستان میں تقریباً ۱۵۰ لاکھ ٹن فولاد ہر سال پیدا ہوتا ہے اور دنیا کے فولاد پیدا کرنے والے ممالک میں اس کا مقام دسویں نمبر پر آتا ہے پھر بھی ہندوستان میں اس دھات کا ۲۶ کلو فی کس سالانہ استعمال دنیا کے ۱۴۹ کلو فی کس کے مقابلے بہت کم ہے۔ ہندوستان ان معنوں میں خوش نصیب ہے کہ اس صنعت میں لگنے والے کچے مال جیسے خام لوہا، کوکنگ کول اور دھاتوں کو پگھلانے والی دھاتیں یہاں وافر مقدار میں پائی جاتی ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں فولاد کی جدید تکنیک: بلاسٹ فرنیس (بی۔ایف)۔ بلاسٹ آکسیجن فرنیس (بی۔او۔ایف) طریقہ پر مرکوز ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں بلاسٹ آکسیجن تکنیک پر صرف ۴۱٫۳ فی صد فولاد ہی پیدا ہوتا ہے جب کہ اس طریقہ سے بیلجیم میں ۹۱ فی صد، جرمنی میں ۸۱٫۵۰ فی صد، برازیل میں ۴۷ فی صد، برطانیہ میں ۷۳٫۸ فی صد اور جاپان میں ۷۸٫۶ فی صد فولاد پیدا ہوتا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر ممالک میں فی مزدور فی سال پیداواریت ہندوستانی مزدور کی اوسط پیداواریت کے مقابلے سات آٹھ گنا زیادہ ہے۔ حال کے برسوں تک ہندوستان میں اس صنعت پر ٹیکس کی اونچی شرح بھی فولاد کی قیمت زیادہ رہنے کی ایک وجہ رہی ہے۔ لیکن پچھلے سال اور اس سال کے بجٹوں میں اسٹیل

پرٹیکس کی شرحوں میں کافی کمی کی جاچکی ہے جس سے امید کی جارہی ہے کہ فولاد کے پیداواری خرچ میں کافی کمی آئے گی۔

ٹیکس کی اصلاح پر سجھاؤ دینے کے لیے نامزد ڈاکٹر جے اہلوالیا کمیٹی نے ہندوستان کی فولاد کی صنعت کا کافی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے صنعت کے مقابلے میں ہندوستانی صنعت کو لاکھڑا کرنے کے سلسلے میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں چند سفارشات کی ہیں۔ رپورٹ میں یہاں اعلا درجہ کا خام لوہا کی افراط اور سستے داموں کی دستیابی کا ذکر کرتے ہوئے اس صنعت میں استعمال ہونے والے دوسرے کچے مال پر لگائی گئی امپورٹ ڈیوٹی میں بتدریج کمی کیے جانے کی سفارش کی ہے۔ رپورٹ میں ۹۸-۱۹۹۷ء تک کوکنگ کول پر ۵ فی صد، کم گندھک والے کوک اور دیگر کوئلے پر دس فی صد، ریفریکٹریز پر ۱۵ فی صد اور ریفریکٹریز میں استعمال ہونے والے کچے مال پر دس فی صد، خام لوہے کی گولیوں (آئرن پیلیٹ) پر دس فی صد اسپنج آئرن پر دس فی صد، اسٹین لیس اسٹیل اور دیگر کھوٹ پر ۲۰ فی صد اور لوہا اور فولاد کی دوسری اشیا پر ۳۰ فی صد تک کم کیے جانے کی سفارش کی ہے۔

۹۶-۱۹۹۵ء کے بجٹ سے یہ پتا چلتا ہے کہ سرکار نے ان سفارشات پر پوری تندہی کے ساتھ عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ مارچ میں بجٹ پیش کرتے ہوئے وزیر مالیات ڈاکٹر منموہن سنگھ نے اپنے بیان میں فولاد کے پیداواری خرچ کو کم کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے لوہے والی اور غیر لوہے والی (فیرس اور نان فیرس) دھاتوں پر امپورٹ ڈیوٹی کی شرح کم کرکے ۴۰ فی صد کر دی تاکہ گھریلو صنعت آج کے بدلتے ہوئے دور میں اپنے آپ کو بین اقوامی مقابلے کے لیے تیار کر سکے۔ ری رولنگ کے لیے ہاٹ رولڈ کوائل پر امپورٹ ڈیوٹی ۴۰ فی صد سے گھٹا کر ۳۰ فی صد اور اسٹین لیس اسکریپ پر ۳۰ فی صد سے کم کرکے ۲۰ فی صد کم کر دی ہے۔ اسپنج آئرن پر امپورٹ ڈیوٹی ۳۰ فی صد سے کم کرکے ۲۰ فی صد کر دی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہلوالیا کمیٹی نے ان اشیا پر ۹۸-۱۹۹۷ء تک امپورٹ ڈیوٹی کی شرح دس سے ۳۰ فی صد تک کم کرنے کی جو سفارش کی ہے اس پر عمل شروع ہو چکا ہے۔

اب یہ فولاد کی صنعت کی ذمہ داری ہے کہ وہ سرکار کی طرف سے ملنے والی ان سہولتوں کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس صنعت کو عالمی معیار پر لاکھڑا کرے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا کہ منہ سے کہہ دینا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے صنعت کو اپنے اطلاعاتی نظام میں سدھار کرتے ہوئے بازار کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے نظریہ اور کام کے طریقوں میں تبدیلی لانی ہوگی۔ اگر ایسا ہوا تو یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگلی صدی کے شروع ہوتے ہوتے جب پرانے کارخانوں کی تجدید و توسیع کا کام بھی پورا ہو چکا ہوگا اور جدید تکنالوجی والے نئے کارخانے بھی بن کر تیار ہو چکے ہوں، ہندوستانی فولاد کی صنعت عالمی لیڈرشپ حاصل کرنے کی راہ پر آگے بڑھنے کے لیے بالکل تیار ہوگی۔

۹۰-۱۹۸۹ کو حاصل کیے جا سکنے والے خام لوہے کے مصدقہ ذخائر

(لاکھ ٹن)

نمبر شمار	زون/ریاست	اونچی قسم ۶۵ فی صد	درمیانہ قسم ۶۵-۶۲ فی صد	نچلی قسم ۶۲ فی صد	جس کی درجہ بندی نہیں کی گئی	کل
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۱۔	زون الف					
	بہار	۸۵۰	۱۷۹۲۰	۹۰۳۰	۱۸۷۰	۲۹۶۷۰
	اڑیسہ	۳۲۲۰	۱۲۸۸۰	۷۵۲۰	۳۰۵۰	۲۶۶۷۰
۲۔	زون ب					
	مدھیہ پردیش	۶۳۰۰	۴۸۳۰	۵۱۶۰	۴۱۶۰	۲۰۴۵۰
	مہاراشٹر	-	۳۵۰	۱۵۰	۱۲۶۰	۱۷۶۰
۳۔	زون پ					
	کرناٹک	۲۲۱۰	۴۳۸۰	۷۳۰	۱۹۷۰	۹۲۹۰
۴	زون ت					
	گوا	۱۴۰	۱۵۳۰	۴۶۵۰	۱۳۰۰	۷۶۲۰
۵	زون ٹ					
	آندھرا پردیش	۷۰	۵۰	۳۲۰	۳۰	۴۷۰
	راجستھان	-	-	۷۰	۲۰	۹۰
		۱۲۷۹۰	۴۱۹۴۰	۲۷۶۳۰	۱۳۶۶۰	۹۶۰۲۰

بجلی کے شعبے میں نجی سرمایہ کاری

حکومت نے ۱۹۹۱ء میں ایک پالیسی وضع کی تھی جس کے تحت بجلی کے شعبے میں نجی صنعت کاروں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو وسائل کی کمی تھی اور دوسرے یہ کہ بجلی کی مانگ میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اس پالیسی کے مثبت نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ اب تک ۱۹۵ بجلی پروجیکٹوں میں نجی سرمایہ کاری کے سلسلے میں دلچسپی ظاہر کی جا چکی ہے، جس کی وجہ سے ۷۷،۶۹۹۱۵۰ میگاواٹ بجلی تیار کی جا سکے گی اور جن کے لیے ۲۸۶۴۰۳،۹۷ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری درکار ہوگی۔

ان میں سے ۴۳ تجاویز غیر ملکی سرمایہ کاروں کی طرف سے موصول ہوئیں ہیں۔ ان میں غیر مقیم ہندوستانیوں اور مشترکہ پروجیکٹوں کی تجاویز بھی شامل ہیں۔ ان تجاویز کے مطابق ۳۲۱۰۰ میگاواٹ بجلی تیار کرنے کی مزید صلاحیت پیدا کی جاسکے گی اور اس کے لیے تقریباً ۱۲۵۰۹۵ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری درکار ہوگی۔ ان میں سے ۲۴ تجاویز پہلے ہی غیر ملکی سرمایہ کاری کو بڑھاوا دینے والے بورڈ کے زیر غور آچکی ہیں۔ ان میں سے ۱۴ تجاویز کو غیر ملکی سرمایہ کاری سے متعلق کابینہ کمیٹی نے منظوری دے دی ہے۔ تین دیگر تجاویز کے سلسلے میں غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ دینے سے متعلق بورڈ نے سفارش کی ہے اور غیر ملکی سرمایہ کاری سے متعلق کابینہ کمیٹی کو ان تجاویز پر غور کرنا ہے۔

۳۱ مارچ ۱۹۹۲ء تک بجلی کے شعبے میں نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی پالیسی کا مکمل پیکج دستیاب کر دیا گیا تھا اور ٹیرف کے ضابطوں کو بھی حتمی شکل دے دی گئی تھی۔ ان پروجیکٹوں کو پیش کرنے والے زیادہ تر لوگ اب ریاستی بجلی بورڈوں اور ریاستی حکومتوں کے ساتھ بجلی کی خرید اور دیگر معاون معاہدے کرنے میں مصروف ہیں۔ پروجیکٹوں کے ذمہ دار لوگ عالمی بینک، اے ڈی بی، آئی ایف سی جیسے مالی اداروں سے مالیات کے سلسلے میں معاہدے اور شرائط طے کر رہے ہیں۔ نجی شعبے کی موجودہ کمپنیاں تقریباً ۱۳۴۰ میگاواٹ بجلی کی مزید صلاحیت پیدا کرنے کے کام میں پہلے ہی خود کو مصروف کر چکی ہیں، مثلاً بمبئی مضافاتی بجلی سپلائی ٹاٹا الیکٹرک ۳۴۲ میگاواٹ اور کلکتہ بجلی سپلائی کمپنی ۵۰۰ میگاواٹ بجلی تیار کرنے کے کاموں میں مصروف ہیں۔ بجلی کی تیاری سے متعلق نئی تجاویز میں گیس پر مبنی کچھ بجلی پروجیکٹ شامل ہیں مثلاً آندھرا پردیش میں جگورو پاڈو (۲۲۵ میگاواٹ) اور گوداوری (۲۰۸ میگاواٹ) گجرات میں پاگوتھان (۶۵۵ میگاواٹ) اور مہاراشٹر میں ڈابھول کا پہلا مرحلہ (۶۹۵ میگاواٹ)۔ ان کی عمل آوری کے لیے مقابلتاً کم وقت درکار ہے۔ توقع ہے کہ یہ ۱۹۹۷ء تک مکمل ہو جائیں گے۔

اس عرصے میں حاصل شدہ تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے وقتاً فوقتاً ٹیرف نوٹیفیکیشن میں ترمیم کی جاتی رہی ہے تاکہ پالیسی پر مناسب نظر ثانی کی جاسکے۔ حال ہی میں ۱۲ جنوری ۱۹۹۵ء کو ایک ترمیم کے ذریعے بجلی پروجیکٹوں کے لیے آسان شرائط والے ٹیرف (محصول) کے طریقوں کا اعلان کیا گیا ہے اور کچھ معاملات کی وضاحت کی گئی ہے مثلاً کمپنی کی طرف سے بڑھائے گئے سرمایہ پر منافع کی شرح سے ہونے والی کمائی پروجیکٹ قائم کرنے کے بعد موجودہ کمپنی کی طرف سے داخلی وسائل سے کی گئی سرمایہ کاری وغیرہ۔

بجلی کی خرید کے معاہدوں سے حاصل شدہ تجربات کی بنیاد پر حکومت نے ریاستی بجلی بورڈوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کی ضرورت محسوس کی تاکہ وہ بجلی کی خرید کے معاہدوں کے سلسلے میں نجی سرمایہ کاروں سے معاملہ کر سکیں۔ اس سلسلے میں ریاستی حکومتوں اور ریاستی بجلی بورڈوں کو رہنمایانہ خطوط بھیجے جا چکے ہیں۔ چند ایسے اہم مسائل کی طرف بھی ان کی توجہ دلائی گئی ہے، جن کو وہ دھیان میں رکھ کر بجلی کی خرید کے معاہدوں کے سلسلے میں بات چیت کریں۔

بجلی کی تیاری کے پروجیکٹوں کا ابتدائی بیچ بالعموم ریاستی بجلی بورڈ اور ایک فریق کے درمیان بات چیت کی بنیاد پر دیا گیا ہے۔ ریاستی بجلی بورڈ اور ریاستی حکومتوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ بجلی تیار کرنے والے لوگوں کے انتخاب نیز پروجیکٹ دینے کے عمل میں زیادہ مقابلہ جاتی عنصر شروع کریں اور صرف مقابلہ جاتی بولی کی بنیاد پر ہی نئے پروجیکٹ دینے پر غور کریں۔ حکومت نے بجلی کے نجی پروجیکٹوں کو قطعی شکل دینے کے واضح نظام کا عزم کیا ہوا ہے۔ لہٰذا ۶ جنوری ۱۹۹۵ء میں یہ طے کیا گیا تھا کہ مرکزی بجلی اتھارٹی کسی بھی ایسے نجی پروجیکٹ کی تجویز پر غور نہیں کرے گی جو مقابلہ جاتی بولی کے ذریعے نہیں دیا گیا ہوگا۔ اس سلسلے میں ریاستی حکومتوں کو تفصیلی رہنمایانہ خطوط بھیجے جا چکے ہیں۔

اگرچہ موجودہ پالیسی میں بجلی کے پروجیکٹوں کی جدید کاری کے کام میں نجی شرکت کو بھی شامل کیا گیا ہے تاہم اس سلسلے میں ردعمل حوصلہ افزا نہیں ہے۔ حکومت اس شعبے میں نجی شرکت کی حوصلہ افزائی کے لیے رہنمایانہ خطوط مرتب کر رہی ہے۔

ریاستی بجلی بورڈوں کی تنظیم نو کی ترجیحات کی عدم

باقی صفحہ ۳۵ پر

ڈاکٹر ہیرا سنگھ

ڈرگس کا بے جا استعمال
ایک بھیانک خطرے کا مقابلہ

ہر سماج کے افراد کچھ نہ کچھ ایسی منشیات اور دیگر اشیاء کے عادی ہو جاتے ہیں جن کو اگر وہ نہ لیں تو ان کے قویٰ مضمحل نظر آتے ہیں اور اس طرح ان اشیاء پر ان کا انحصار بڑھ جاتا ہے۔ ہندوستان میں عرصہ دراز سے لوگ الکحل، افیم، چرس، گانجہ وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔ اب ان منشیات میں کچھ جان لیوا ڈرگس اور شامل ہو گئی ہیں مثلاً ہیروئن، حشیش، ایل۔ ایس۔ ڈی وغیرہ۔ یہ یقیناً نئے رجحان کہے جا سکتے ہیں چنانچہ آج ہندوستان محض ایک ایسا ملک نہیں جہاں سے ہو کر یہ منشیات ایک ملک سے دوسرے ملک کو جاتی ہیں، بلکہ یہ خود بھی ان منشیات کی کھپت کی ایک امکانی منڈی بن گیا ہے۔ ایک زمانے تک منشیات کا استعمال ایک برائی کے روپ میں تھا اور چند مخصوص قسم کے افراد یا گروہ اخلاقی طور پر ان سے پرہیز کیا کرتے تھے اور اس طرح یہ نشیلی دوائیں مسئلے کی صورت میں سامنے نہیں آتی تھیں لیکن حالیہ مدت میں اس برائی میں اضافہ ہوا ہے اور سماج میں مختلف طبقات اس کے استعمال کو سماجی، ثقافتی اور اقتصادی اظہار کا ذریعہ سمجھنے لگے ہیں جس کی وجہ سے خاندان، سماج اور افراد بڑے پیمانے پر اس کے برے اثرات کا شکار ہیں۔ اس طرح نوع انسانی کے مستقبل کے لئے یہ ایک بڑا خطرہ بن گیا ہے۔

ماضی میں منشیات کا استعمال سماجی صحت کے مسئلے کی صورت میں خطرہ بن کر سامنے نہیں آیا تھا اس کا سبب ایک تو سماجی تعزیرات اور معاشرتی پابندیاں تھیں۔ دوسرے از خود نظم و ضبط بھی انسانی مزاج کا ایک خاصہ تھا جو شرکت کنندہ کا نظم و نسق، ڈسپلن قائم کئے ہوئے تھا اور اس کے دور رس اثرات دیکھنے کو ملتے تھے۔ سماجی تبدیلی کا عمل، صنعت کاری کا پھیلاؤ اور شہری آبادیوں میں اضافہ نیز دیہی آبادی کا شہروں کی طرف منتقل ہونا، یہ سب وہ عناصر ہیں جن سے سماجی بندھنوں کا روایتی تانا بانا بکھر چکا ہے اور انسانی رشتے سماجی ضابطوں اور روایتی بندشوں سے آزاد ہو چکے ہیں۔ آج کی جدید زندگی کا دباؤ انسان کو اس بات کے لئے مجبور کر چکا ہے کہ وہ تنازعات، مایوسی، دل شکستگی اور سماجی اونچ نیچ کا شکار ہو۔ مستزاد یہ کہ ہمارے مواصلاتی نظام، تجارت کے فروغ، ذرائع نقل و حمل کی آسانیوں نے منشیات کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کو آسان بنا دیا ہے اور اب یہ منظم جرائم کی شکل میں ابھرتا ہوا کاروبار بن چکا ہے اور اب منشیات کا کاروبار نہ صرف ملک کے اندر بلکہ باہر تک ہوتا ہے۔ آج ہمارے ملک میں منشیات کے دھندے جس طرح فروغ پا رہے ہیں، اُس سے ہمارے آئین سازوں کی دور اندیشی کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے آئین میں آرٹیکل ۴۷ شامل کر کے ریاست کو ہدایت کی کہ وہ منشیات کی کھپت پر روک تھام لگائے اور اس کو دوا کے طور پر استعمال کرنے کے علاوہ دوسری صورت میں روک دے چنانچہ آئین میں صحت کے لئے مضرت رساں نشیلی دواؤں اور مشروبات پر پابندی لگانے کو کہا گیا ہے۔

قومی سطح پر ایسا کوئی سروے اب تک نہیں کیا گیا ہے جس سے ڈرگس کے عادی افراد کی صحیح تعداد کا اندازہ ہو سکے، حقیقت یہ ہے کہ نشیلی دواؤں کے قانون مجریہ ۱۹۸۵ کے تحت ڈرگس کے استعمال کرنے والوں یا نشیلے مادوں کے عادی افراد کو سزا دینے کی جو بات کہی گئی، اس سے یہ مسئلہ بہت کچھ پردہ کے سامنے سے ہٹ گیا ہے۔ البتہ کچھ تحقیقی پراجیکٹوں کو صحت اور خاندانی بہبود کی وزارتوں کی طرف سے متعین کردہ ریسرچ اسکالروں کو سونپا گیا۔ یہ کام تعلیمی اداروں کے تعاون سے انجام دیا گیا ان مطالعوں کی روشنی میں کچھ اہم نکات سامنے آئے۔ مثلاً یہ کہ جو لوگ ڈرگس کے عادی بن چکے ہیں، ان میں سے اکثر ذہنی بیماریوں کے شکار ہیں، یا یہ کہ صنعتی مزدوروں میں یہ بری عادت بڑے پیمانے پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ کچھ عام نوعیت کے افراد اور کچھ دماغی طور پر بیمار افراد بھی ڈرگس کے عادی ہیں۔ اس طرح کے بہت سے مطالعوں میں کئی طرح سے مدد لی گئی ہے قوانین کو نافذ کرانے والے اداروں کا تعاون، سرکاری ہسپتالوں کے اعداد و شمار اور اس میدان میں کام کرنے والے رضاکار اداروں کی طرف سے جمع کردہ اطلاعات کی بنیاد پر ان مطالعاتی سرگرمیوں کو مرتب کیا جا سکا ہے ان سے ڈرگس کی علت کی نوعیت اور اس کے طریقوں کا پتہ چلتا ہے۔

سنہ ۱۹۸۹ء میں وزارت بہبود نے کچھ سرکردہ سائنسدانوں کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ ملک گیر پیمانے پر ۳۳ شہروں میں اس طرح کے مطالعے کریں۔ یہ ایسے شہر تھے جہاں عوام الناس ڈرگس کے زیادہ بڑے پیمانے پر عادی تھے، اس سلسلہ میں جو مطالعے کئے گئے ان سے درج ذیل معلومات حاصل ہوئیں:

تمام مذہبی گروپوں اور ذاتوں پر مبنی گروپوں میں مشروبات اور ٹھوس مادوں کی شکل میں مختلف نشیلی اشیاء رائج ہیں، البتہ کہیں کم، کہیں زیادہ۔ ڈرگس استعمال کرنے والے زیادہ تر خواندہ تھے۔ ۱۶ سال سے ۳۵ سال تک کی عمر کے درمیان کے لوگ ڈرگس کی لت میں زیادہ پھنسے تھے۔ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ ہر دو زمروں کے لوگ اس میں پھنسے تھے۔ نچلی سطح کے لوگ زیادہ تر نشہ کے عادی تھے، لوگ محض تنہائی کے سبب، ہی اس کے عادی نہ تھے۔ بے روزگار افراد کی بڑی تعداد اس برائی میں مبتلا تھی، مزدور، ٹرانسپورٹ ورکر، نوجوان طلبا اس کے زیادہ عادی تھے۔ الکحل، ہیروئن، بھنگ، چرس، گانجہ زیادہ تر نشہ کے طور پر استعمال کیا

جاتا ہے بہت سے لوگ ان مادوں کو اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ وہ استعجاب اور ایک دبے ہوئے شوق کو اس کے ذریعہ پورا کرنا چاہتے ہیں۔ مزدور طبقہ، ٹرانسپورٹ ورکر ہی اس کے زیادہ عادی ہیں۔ پھیری والے ان نشہ آور گولیوں اور مادوں کو چھوٹی چھوٹی دکانوں پر رکھ دیتے ہیں جہاں سے یہ لوگ بآسانی انہیں حاصل کر لیتے ہیں۔ لوگ اور ان کے کنبہ کے ارکان ان نشہ آور مادوں کے مضر اثرات سے بخوبی واقف ہیں مگر زیادہ تر علاقوں میں لوگ ان سہولتوں سے واقف نہیں جو اس لت سے چھڑانے کے سلسلہ میں کی جارہی ہیں۔ اس کے علاج کی سہولتوں سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔

حکومت نے ایک ایسا جامع قانون تیار کیا جس کی رُو سے ڈرگس کا ناجائز دھندا روکا جاسکے۔ ۱۹۸۵ء میں ایک قانون پاس کیا گیا جسے NAREOTIC DRUGS PSYEHOTROPIC SUBSPANCES ACT- کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس میں مجرموں کو سخت سزا دینے کی گنجائش رکھی گئی ہے اس کے تحت دس سال سے ۲۰ سال تک قید با مشقت کی سزا دی جاسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک لاکھ روپے سے ۲ لاکھ روپے تک جُرمانہ بھی ہو سکتا ہے۔ جُرمانہ کی رقم اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے مگر اس کے لئے حاکم کو اس کا جواز بھی لکھنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ ۱۹۸۸ء میں بھی اس طرح کا ایک اور قانون پاس کیا گیا، اس کے نفاذ کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ منظم طور پر یہ کاروبار کر رہے ہیں، ان کو احتیاطی نظر بندی کے طور پر حراست میں رکھا جاسکے۔ دسمبر ۱۹۸۹ء میں اس قانون میں مزید ترمیم کی گئی جس کی رُو سے اس کاروبار کو سرمایہ فراہم کرنے والوں اور اس قبیل کے مجرموں کی پشت پناہی کرنے والوں کو اور بھی زیادہ سخت سزائیں دی جاسکیں، یہ قانون موت تک کی سزا دلا سکتا ہے۔ اس دھندے سے پیدا کی گئی جائیداد ضبط ہو سکتی ہے۔

ساتویں منصوبے سے وزارت بہبود ڈرگس کی روک تھام کے لئے عوام الناس کے تعاون اور شرکت پر مبنی انداز نظر اپنائے ہوئے ہے۔ اس سلسلہ میں عوامی تنظیموں کو اولاً بیدار کرنے پر زور دیا گیا۔ رضاکار اداروں کا تعاون حاصل کیا گیا۔ اور مشورہ دینے والے ڈرگس کی عادت چھڑانے میں مدد دینے والے اور اس کے بعد متاثرہ افراد کی خبر دینے، لینے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کے لئے مراکز کھولے گئے۔ گذشتہ سات برسوں میں یہ پروگرام کافی پھیلا اور اب یہ متعدد ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں چلایا جا رہا ہے اس سلسلہ میں سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی کوششوں کو مربوط کیا گیا۔ یہ مسئلہ چوں کہ متعدد طریقوں سے حل چاہتا ہے اور اس کی جڑیں دور دور تک پہنچی ہوتی ہیں۔ لہٰذا مربوط کوششوں سے ہی اسے حل کرنے پر زور دیا گیا۔ چنانچہ اس کام سے ان متعدد تنظیموں کو جوڑا گیا جو نچلی سطح سے عوامی بہبود میں مصروف ہیں۔ اس سلسلہ میں احتیاطی تدابیر پر خاص زور دیا گیا تاکہ ایسے لوگوں کو جو اس برائی میں مبتلا ہونا چاہتے ہیں، قبل از وقت ہی اس خطرناک گڑھے میں گرنے سے بچایا جاسکے اور قبل اس کے کہ تمام تدابیر ناکام ہوتی دکھائی دینے لگیں، پہلے ہی سے عوام کو آگاہ کر کے اس راستہ پر نہ چلنے دیا جائے۔

چند اہم اقدامات

ماضی کے تجربات کو سامنے رکھ کر سال گزشتہ نشہ بندی اور ڈرگس کے استعمال کی روک تھام کی اسکیم پر نظر ثانی کی گئی۔ مشورہ دینے والے مراکز کو شعور پیدا کرنے والے مراکز کی حیثیت دی گئی۔ مشورہ دینے والے مراکز اور امداد دینے والے مراکز کا دائرہ وسیع کیا گیا تاکہ یہ سماج کے سبھی طبقات کے کام آسکیں۔ سابق میں ڈرگس کے استعمال کی روک تھام کے مراکز اور پھر بعد کی دیکھ بھال کے مراکز کو بحالیاتی مراکز کے روپ میں بدل دیا گیا تاکہ اس برائی میں مبتلا افراد کی مکمل امداد ہو سکے اور وہ سماج میں مل جُل کر ڈرگس کی لعنت سے آزاد شہری کی حیثیت سے معاشرے کے کام آسکیں۔ صنعتی کارکنوں کے لئے خدمات کا خصوصی طریقہ سوچا گیا ہے تمام شہروں اور اس پروگرام سے جڑے ہوئے علاقوں میں غیر سرکاری تنظیموں کے فورم قائم کئے جائیں گے جو اس برائی سے صنعتی کارکنوں کو دور رکھ سکیں۔ اس سلسلہ میں تکنیکی تبادلوں اور افرادی قوت کے فروغ کے لئے مالی امداد دی جائے گی۔ اس نئی اسکیم کے تحت انفرادی بنیادوں پر دیادہ لچکدار نظام شروع کیا جا رہا ہے جس سے کہ ہر وہ شخص جو اس برائی میں مبتلا ہے، اس سے نجات پاسکے۔

اس برائی کی روک تھام کے سلسلے کے تجربات یہ بتلاتے ہیں کہ محض قانونی کارروائیوں یا ڈرگس کے مریضوں کے علاج معالجے کے پروگرام ہی کافی نہیں ہیں، اس کی روک تھام کے لئے ہمہ گیر حکمت عملی درکار ہے۔ اس کا تعلق عوامی شعور کی بیداری اور احتیاطی تعلیم سے ہے تاکہ انہیں قبل از وقت آگاہ کیا جاسکے۔ اس طرح کے نوجوان اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کر اس برائی سے خود کو بچا سکتے ہیں۔

اس سلسلے کے قانونی اقدامات کی کامیابی کا انحصار بھی عوامی تعاون پر ہے۔ اس سلسلے میں اس طرزِ حیات کو فروغ دینا ہے جس میں ڈرگ کی مانگ ہی نہ ہو۔ اس سلسلے میں سماجی فضا کو ہموار کرنا ہے۔ عام آدمی کو اس برائی کی حقیقت کا پتہ ہی نہیں ہوتا وہ اس وقت تک اس سے دور رہنے کی نہیں سوچتا جب تک وہ خود اس کے مضر اثرات براہ راست تجربہ نہ کرنے لگے۔ تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ بھی افراد اور ڈرگس کے باہمی مضر اثرات اور اس کے ردّ عمل کے بارے میں نہیں سوچ پاتا۔ پورے معاشرے پر اس کے اثرات کس طرح مرتب ہوتے ہیں۔ اس بارے میں بھی یہ طبقہ لاعلم رہتا ہے۔

افراد اور ان کے کنبوں پر اس کے مضرت رساں اثرات کے بارے میں شعور کو بیدار کرنا ضروری ہے۔ اور یہ ایسی حقیقت ہے کہ اسے سب تسلیم کرتے ہیں اور احتیاطی عمل کے طور پر اس کی اہمیت مانتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپسی رابطے بھی بے حد اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے تحت مثبت انداز کے باہمی شخصی رابطے قائم ہوتے ہیں اور کچھ گروپ اور سرگرمیاں شروع کی جاتی ہیں جن سے عوام کو اس کے مضر اثرات سے آگاہ کرایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے سچی اور حقیقی باتوں کو عوام تک پہنچایا جاتا ہے تاکہ وہ ڈرگس کے مضر اثرات سے واقف ہو سکیں۔ منفی رویے کو اگر ایک بار اپنا لیا جائے تو اس سے کتنے خطرات لاحق ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں عوام کو آگاہ کرایا جاتا ہے۔ زندگی کے تئیں مثبت رویوں کو اپنانے پر زور دیا جاتا ہے۔

جس مزاج، معیار اور کردار کے طبقہ میں ڈرگس کی برائیوں کو بتانا مقصود ہوتا ہے، وہاں کے حالات کو سامنے رکھ کر یہ کام تدریجی طور پر شروع کیا جاتا ہے۔ شروع میں اسے کم کرنے اور رفتہ رفتہ ترک کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ سماجی طور پر قابل قبول ڈرگس کے آغاز سے اس برائی کو جنم ملتا ہے اور پھر اس کا سلسلہ مستقل نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس ضمن میں یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ وہ کیا حالات ہیں جن میں افراد ڈرگس کے عادی بنتے ہیں اور پھر اس عادت کو ترک کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ شخصیت کے بنانے کے سلسلے کے تحقیقی اور ڈرگس کے عادی افراد کے تجزیاتی مطالعہ سے یہ واضح ہوا کہ مختلف طرح کے دباؤ کے تحت جن میں کچھ داخلی ہوتے ہیں اور کچھ خارجی، انسان اس برائی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

اس لئے اس سلسلے میں تعلیمی کوششوں کے

ذریعے سے عوام کو پیشگی آگاہی دینی ضروری ہے کہ اس برائی کو اختیار کرنے سے ان کو مختلف طرح کے خطرات کا سامنا کرنا ہی نہیں بلکہ ان کی صحت پر کس قدر برا اثر اور اس ماحول کو کس قدر بہت ہوگا جہاں انسان اس برائی میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور کس طرح ختم ہوتی ہے کہ نوجوان شوق اور جاننے کی خواہش کے تحت ڈرگس استعمال کرتے ہیں۔ ابتدا میں یہ محض تفریح، فلفطا پھر تناؤ کم کرنے کیلئے شروع کی جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں اگر بروقت تعلیمی اقدامات کئے جائیں تو بہت مفید رہتے ہیں۔ مختلف سماجی اقدار کے اور رسم ورواج کے پیش نظر ڈرگس کے مضرات کے بارے میں تعلیم بہت مفید ہوتی ہے اس سلسلے کے تعلیمی مواد کو اس طرح تشکیل دینا ہوتا ہے کہ اس کی مخالفت کی تعلیم سے نوجوانوں میں اسے جاننے کی غیر ضروری خواہش نہ پیدا ہو۔ عوام کو اس کے مضرات سے آگاہ کرانا تو ضروری ہے لیکن اس کی بہت زیادہ جانکاری سے الٹے اثرات بھی پڑ سکتے ہیں۔ اس سلسلے کے پیغامات میں ایسی زندگی کی خوبیوں کا اظہار ضروری ہے جو ڈرگس کی لعنت سے آزاد ہوں۔ ڈرگس کے عادی افراد کی بگاڑ سے زیادہ، اس برائی سے محفوظ افراد کی خوبیوں پر نظر ڈالنا زیادہ مفید ہے۔

بحیثیت مجموعی انداز نظر

ڈرگ کے استعمال کا مسئلہ نفسیاتی، سماجی، طبی مسئلہ ہے۔ متعلقہ افراد کو اس سے روکنے کے لئے ان کی زندگی کے مجموعی انداز پر نظر ثانی ضروری ہے۔ ہر شخص کے اپنے مسائل کو سامنے رکھ کر اس کے علاج کا عمل شروع کیا جاتا ہے اس سلسلے میں ہر ایک کے الگ الگ حالات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اس کام کے لئے ایک ایسی ٹیم درکار ہے جو مختلف طرح سے تربیت یافتہ ہو اور جو کنبہ کے ارکان کے ساتھ مل جل کر کام کر سکے۔ وزارت بہبود اس مقصد کے تحت بہار دری کے اندر موجود ڈرگس کے عادی افراد کے علاج کے لئے ایک مربوط طریقہ کار اپنانے کے اقدامات کر رہی ہے۔ یہ بات اب تسلیم شدہ ہے کہ ڈرگس کے عادی افراد کے سلسلے کئی طرح کی کوششیں کر کے ان کی یہ برائی دور کرائی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے سمجھانا بجھانا تو ہے ہی، اس کے علاوہ نفسیاتی، سماجی بحالی اور ڈرگس کی عادت چھڑانا بھی ضروری ہے۔ یہ کام مرحلہ وار بنیادوں پر انجام دیتا ہے۔ جو لوگ ڈرگس کی عادت چھوڑ دیں ان کو سماجی معاشرے میں شامل کرانا ہوتا ہے۔ ایسے بہت سے لوگوں کو جو اس عادت کو اس کام کو چھوڑنے کے بعد کوئی اور سہارا نہیں رکھتا ان کو طویل مدتی بنیادوں پر ایسا نظام

دیکھ ریکھ کے لئے ایک نظام کی ضرورت ہے۔ تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ ڈرگس کے عادی افراد کی نشاندہی کے فوراً بعد ہی اس کی بحالی کے لئے کوششیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اسے علاج کے لئے مرکز پر لایا جاتا ہے اگر اس کی یہ بری عادت چھوٹ گئی اور وہ قانون کی پابندی کرنے والا شہری بن گیا اور کسی روزگار سے لگ گیا تو فی الحقیقت وہ سماج میں خود کو کھپا سکے گا۔ ایسے افراد کو نفسیاتی، سماجی اور اقتصادی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے اس کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور ہنرمند بن کر وہ صحت مند زندگی گذار سکتا ہے۔ اسے ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جس میں رہ کر اس کا علاج ہو سکے اور جہاں وہ کچھ سیکھ سکے اور دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کر سکے، اس کا وجود دوسروں کے لئے مفید ثابت ہو سکے اور وہ اچھے سماجی تعلقات قائم کر سکے۔ اس کے لئے مختلف طرح کے افراد، گروپوں اور معاشرے میں اسے ملانا ہوگا۔ یہ ملاپ ہر شخص کا اس اس کے مزاج، عادت اور ماحول کے مطابق کرنا ہوگا۔ دوسرے لوگوں سے ملاقات کر کے اُسے اپنی کمزوریوں کے بارے میں آگاہی ہوگی اور اسے ہنگامی حالات اور بحران سے نکلنے کا حوصلہ ہوگا۔ اور ان کو ایسی اقدار، رویوں اور صلاحیتوں سے آشنا کرانا ہوگا جس سے وہ بالآخر اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہو سکیں۔

اس مقصد برآری کے لئے ایک مصنوعی ماحول تیار کرنا ہوگا اور اس میں ایسے منصوبہ بند مختلف پروگرام شروع کرنے ہوں گے جہاں ڈرگس کے مریضوں کی مکمل بحالی عمل میں آسکے۔ اور ان کو دوبارہ سماج میں شرکت کرنے کا موقع مل سکے۔

اس مسئلے کا تعلق ایک خاص قسم کے کلچر سے بھی ہے، اس لئے اس کے حل کے لئے ایسے نئے طریقے وضع کرنے ہوں گے جو اس کی گھریلو، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی ضرورتوں کے پس منظر میں موزوں ثابت ہوں۔ ڈرگس کے عادی بن جانے اور پھر اس سے نجات حاصل کرنے کا تعلق اس بات پر بھی منحصر ہے کہ اس میں اندرونی قوت ارادی کس قدر ہے اور وہ کس حد تک ان پابندیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انسان کی زندگی اس کے ماحول سے عبارت ہے، اس لئے سماجی نظام ایسا ہونا ضروری ہے جہاں اس برائی کو روکنے اور اس سے دور رہنے کی سکت ہو، مقامی سماجی حالات کی مدد سے اس سے بچا جا سکتا ہے۔ اسی لئے اجتماعی زندگی کے طریقوں کی حرکت کے تحت ڈرگس سے بچا جا سکتا ہے اور اسی نظام کی مدد سے ڈرگس کے عادی افراد کا علاج ممکن ہے۔ نیز ان لوگوں کو جو اس عادت سے باز آجائیں، سماجی زندگی میں

باعزت مقام دلایا جا سکتا ہے۔ یہی مقصد آٹھویں منصوبے کی حکمت عملی سے واضح ہوتا ہے۔

بقیہ کور ۳: ہندوستان میں ماحولیات و ترقی کی صورت حال

پروگرام کو آگے بڑھایا ہے۔

عالمی کوششیں

ہندوستان نے ماحول کو صاف ستھرا بنانے کی عالمی بحث میں عملاً حصہ لیا ہے۔ حیاتیاتی تنوع کی دستاویز پر بھی اس نے دستخط کیے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں آب و ہوا کی تبدیلی سے متعلق اقوام متحدہ کی کنونشن پر بھی دستخط ثبت کیے ہیں۔ اس نے ایجنڈا ۲۱ کی حمایت کی ہے جس کی رو سے وسائل کی تبدیلی کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس طرح شمالی ملکوں سے تکنیکی اور مالی وسائل کو جنوبی ملکوں کی طرف منتقل کیے جانے کی حمایت کی ہے۔

اوزون پرت کے تحفظ کے سلسلے کی عالمی کوششوں میں بھارت نے مانٹریل معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔ اس میں ترقی پذیر ملکوں کی ان دشواریوں کا تذکرہ ہے، جن کی وجہ سے ان ملکوں سے وہ مادے خالی ہوتے جا رہے ہیں جن سے اس پرت کا تحفظ ہوتا ہے، اس معاہدے کی رو سے ایک کثیر الملکی فنڈ قائم کیا گیا ہے جس کی مدد سے ترقی پذیر ملکوں کو ایسی تکنیکی امداد مل سکے گی جو اوزون پرت کے تحفظ میں معاون ہوگی، یہ امداد ایسے ملکوں کے لیے ہوگی جہاں اوزون پرت کو خالی کرنے والے مادوں کی کھپت ۰.۳ کلو گرام فی شخص ہوگی۔

۱۹۷۲ء میں انسانی ماحول کے تحفظ کے سلسلے میں اسٹاک ہالم میں کانفرنس ہوئی تھی اس کے بعد سے ہندوستان نے ماحولیات کے تحفظ پر بہت زور دیا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں ریو ڈی جینرو میں ماحولیات کی حفاظت کے لیے چوٹی کانفرنس ہوئی، چنانچہ ان درمیانی ۲۰ برسوں میں ہندوستان میں ماحول کے تحفظ کے لیے بہت سے قانون بنائے گئے اور بہت سے پروگرام شروع کیے گئے۔ ۱۹۷۲ء میں جنگلی جانوروں کے تحفظ کا قانون، ۱۹۸۰ء میں جنگلات کے تحفظ کا قانون اور ۱۹۸۶ء میں ماحولیات کے تحفظ کا قانون اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں، ان قوانین میں ایسی ضروری تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں جن سے یہ موجودہ تقاضوں کو پورا کر سکیں۔

ماحولیات کا تحفظ محض سرکار کی ہی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ ہر ہندوستانی شہری کا بنیادی فرض بھی ہے۔ ●

ڈاکٹر عرفان علیمی

ملیریا۔ ایک موذی مرض

ملیریا ایک موذی مرض ہے اور انسانی جانوں کا ایک بہت بڑا قاتل ہے۔ اس مرض کے خاتمے کے لیے عالمگیر پیمانے پر جدوجہد کی گئی۔ عالمی ادارہ صحت نے بھی اس ضمن میں پوری کوشش کی اور ساری دنیا میں اس مرض سے لڑنے کے لیے ادویات اور دیگر سازوسامان فراہم کرائے جس کے نتیجے میں اس مرض پر قابو تو ضرور پالیا گیا لیکن مکمل طور پر اس مرض کا خاتمہ ممکن نہ ہوسکا۔ اس مرض کو ختم کرنے کے لیے آج بھی کوششیں جاری ہیں اور ہر طرح کی حکمت عملی اپنائی جارہی ہے لیکن ابھی بھی اس مرض کے خاتمے کے امکان نظر نہیں آتے اور آج بھی دنیا میں کروڑوں انسان اس مرض میں مبتلا ہو کر لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔

اگرچہ اس مرض کی تاریخ بہت پرانی ہے تاہم یہ دریافت ۱۹ویں صدی میں ہوئی کہ یہ ایک متعدی مرض ہے۔ یہ مرض مادہ مچھر کے کاٹنے سے ہوتا ہے۔ انوفلیز نام کے مچھروں میں ملیریا کے طفیلی جراثیم پائے جاتے ہیں جنھیں ملیریا پیراسائٹ کہا جاتا ہے۔ مچھر کے کاٹنے کے بعد یہ جراثیم خون میں شامل ہو کر خون کے سرخ ذرات کی توڑ پھوڑ کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں جاڑے کے ساتھ تیز بخار آنے لگتا ہے۔

اقسام

ملیریا پیراسائٹ کی اگرچہ چار اقسام ہیں تاہم علامات تقریباً سب میں یکساں پائی جاتی ہیں۔

(۱) پلازموڈیم وائی ویکس
(۲) پلازموڈیم فیلسی پیرم
(۳) پلازموڈیم ملیری
(۴) پلازموڈیم اوویل

مندرجہ بالا اقسام میں پلازموڈیم وائی ایکس اس مرض کے پھیلانے کے سب سے زیادہ ذمے دار ہوتے ہیں یعنی ۶۵ سے ۶۹ فی صد ملیریا پلازموڈیم وائی ایکس سے ہی پھیلتا ہے۔ ۳۰ سے ۳۵ فی صد ملیریا پلازموڈیم فیلسی پیرم کے سبب پھیلتا ہے جو سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہوتا ہے۔ تیسری قسم یعنی پلازموڈیم ملیری کی وجہ سے ہونے والے ملیریا کی شرح ایک فی صد یا اس سے بھی کم ہوتی ہے اور چوتھی قسم یعنی پلازموڈیم اوویل سے ہونے والا ملیریا نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

جب مادہ انوفلیز مچھر کسی مریض کو کاٹتی ہے تو مریض کے خون میں موجود طفیلی کیڑے مچھر کے پیٹ میں پہنچ جاتے ہیں جہاں مختلف مراحل سے گزر کر مچھر کے لعاب میں آجاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ جب ایسا مچھر پھر کسی کو کاٹتا ہے تو ملیریا کے کیڑے اس میں منتقل کر دیتا ہے اور یہی کیڑے اس کے خون کے سرخ ذرات میں شامل ہو کر پھلتے پھولتے ہیں اور پلازمہ میں آکر بخار کا سبب بنتے ہیں۔

ملیریا کی چاہے جو بھی قسم ہو لیکن علامات تقریباً سب میں یکساں ہوتی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ملیریا کا بخار کبھی ایک دن چھوڑ کر آتا ہے، کبھی تیسرے یا چوتھے دن آتا ہے جس کا سبب مختلف طفیلی کیڑوں کا سرخ ذرات میں رکنے کا دورانیہ ہوتا ہے کیونکہ کچھ طفیلی کیڑے ۴۸ گھنٹے تک اور کچھ ۷۲ گھنٹے تک سرخ ذرات میں رہائش پذیر رہتے ہیں اس لیے بخار آنے کی مدت مختلف مریضوں میں مختلف ہوتی ہے۔

علامات

اس مرض میں بخار سے قبل طبیعت سست ہوتی ہے، بدن ٹوٹنے لگتا ہے اور بھوک ختم ہو جاتی ہے، تیز سردی لگتی ہے، جسم میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے اور لحاف و کمبل اوڑھنے کے بعد جسم کانپتا رہتا ہے۔ یہ کیفیت ایک سے چھ گھنٹے تک رہتی ہے۔ اس کے بعد تیز بخار ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت تبھی پیدا ہوتی ہے جب طفیلیات خون کے سرخ ذرات میں پہنچ کر انھیں تباہ و برباد کر دیتے ہوتے ہیں، اس کے بعد گرمی لگنے لگتی ہے، پیاس کی شدت بڑھ جاتی ہے، نبض کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی بخار کی شدت کی وجہ سے متلی اور قے ہونے لگتی ہے۔ اس کے بعد پسینہ نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ پسینے کی زیادتی کے سبب کپڑا اور بستر بھیگ جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ بخار کم ہونے لگتا ہے۔ کچھ دیر بعد بخار بالکل اتر جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس مرض میں مختلف پیچیدگیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں جس کے سبب مریض لقمۂ اجل بن جاتا ہے۔ اس مرض کے بار بار کے حملے سے خون کے سرخ ذرات میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور تلی بہت بڑھ جاتی ہے مریض کا جسم بالکل پیلا پڑ جاتا ہے۔

باقی صفحہ پر

بیگم سرائے۔ الہ آباد، ۱۵-۲۱۱

ایس۔اے رسول

قبائلیوں کی مربوط ترقی

خاص طور سے دیہی علاقوں کے غریب لوگوں کی سماجی واقتصادی ترقی کے لیے متعدد پروگرام اور اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں۔ ان پروگراموں کے فوائد نچلی سطح پر عوام تک پہنچانے کے لیے ان پر مقامی ضروریات اور حالات کے مطابق عمل درآمد کیا جانا چاہیے۔ تجربات سے پتا چلا ہے کہ مقامی غیرسرکاری تنظیمیں یہاں فیصلہ کن رول ادا کر سکتی ہیں۔ ان کی اہمیت سمجھتے ہوئے حکومت نے ہمیشہ ہی مالی اور تکنیکی امداد کے ذریعے ان رضاکاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

دیہی ترقی کے پروگراموں میں مصروف متعدد غیرسرکاری تنظیموں نے عوام میں ترقی کے اشتراکی عمل کو کامیابی کے ساتھ مقبول بنایا ہے۔ ستوپداوکاس منڈل ایسی ایک شاندار مثال ہے۔ یہ منڈل پال گاؤں کے قبائلیوں کے لیے کام کرتا ہے جو ستوپدا پہاڑی سلسلے میں مہاراشٹر میں بھساول کے تقریباً ۰ہ کلومیٹر شمال کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس علاقے کے اہم قبیلے تدان (۰ہم فی صد) بنجارہ (۳۰ فی صد) اور پوارہ (۲۰ فی صد) ہیں، جو بنیادی طور سے چھوٹے اور بہت چھوٹے کسان ہیں۔ یہاں کی مقامی فصلیں جوار، دالیں، کپاس، مونگ پھلی اور سبزیاں ہیں۔ بہتر زراعتی طریقے شروع کرنا ستوپداوکاس منڈل کے اہم کاموں میں سے ایک ہے۔

کسانوں کو ضروری ساز وسامان کی سپلائی کو یقینی بنانے کے لیے منڈل نے یہاں بیجوں اور کیمیاوی کھادوں کا ایک بینک قائم کیا ہے۔ قبائلی کسانوں کو ساز وسامان مفت دیا جاتا ہے۔ منڈل نے کرشی پربودھن کیندر (زراعتی بیداری کام کرنا کے نام سے ایک علاحدہ شعبہ قائم کیا ہے تاکہ تحقیق، تربیت اور توسیع کے کام میں تیزی لائی جائے۔ مہاتما پھولے زراعتی یونیورسٹی راہوری نے اس مرکز کو ایک تحقیقی ادارے کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔

ضرورت اور ہنر پر مبنی مختصر اور طویل مدتی پیشہ ورانہ تربیتی کورسز شروع کرنے کے لیے ستوپداوکاس منڈل کو زراعتی تحقیق کی بھارتی کاؤنسل نے کرشی وگیان کیندر (زراعتی سائنس مرکز) دیا ہے۔ کرشی وگیان کیندر کی ہ فیکلٹیاں ہیں جو فصلوں کی پیداوار، باغبانی، بنیادی سائنس، زراعتی انجینئرنگ اور مویشی پالن سے متعلق ہیں۔ کھیتوں اور گاؤں میں مظاہرہ کر کے تربیتی پروگراموں کو فروغ دیا جاتا ہے۔

زراعتی ترقی سے متعلق سب سے اہم پہلو خرید وفروخت کا ہے۔ منڈل نے خرید وفروخت کے انتظامات امداد باہمی انجمنوں کے ذریعے کیے ہیں۔ حسب موقع منڈل خود بھی خرید وفروخت کا کام انجام دیتا ہے۔

علاقے میں آب پاشی کے پروجیکٹ پن دھاراؤں کے فروغ کے منظم طریقے کے ذریعے چلائے گئے ہیں۔ انفرادی کنوؤں کی کھدائی کے لیے امداد فراہم کر کے عوام کے لیے کنوئیں بنانے میں مدد کی جاتی ہے۔ آب پاشی کے فروغ میں ایک اہم کامیابی قبائلی لوگوں کو اجتماعی لفٹ آب پاشی کی اسکیموں کے تحت منظم کرنا رہی ہے۔ فصلیں اگانے کے طریقوں کے ایک مناسب امتزاج کے ساتھ آب پاشی کی سہولت کی وجہ سے پیداوار دوگنی اور کچھ معاملوں میں تین گنا ہو گئی ہے۔ پال اور گارکھیڑا میں لفٹ آب پاشی کی دو بڑی اسکیمیں بھی وضع کی گئی ہیں۔

اس کی شروعات ہی سے باغبانی کے فروغ پر کرشی پربودھن کیندر کی خصوصی توجہ رہی ہے۔ کھیتی باڑی کی تقریباً ایک چوتھائی زمین پر انار، آم، شریفے، امرود اور دیگر پھل اگائے گئے ہیں۔ اس علاقے میں بگڑتے ہوئے ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے جنگل بانی کے وسیع پروگرام کے ساتھ منڈل سماجی جنگل بانی کے شعبے میں بھی سرگرم عمل رہا ہے۔ منڈل نے کپارٹ کی امداد سے سماجی جنگل بانی کا یہ پروگرام شروع کیا ہے۔ بانس، بور اور چنیچ وغیرہ کے پودے لگائے گئے ہیں اور ایک نرسری بھی قائم کی گئی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کو بھی پودے لگانے، دیکھ بھال اور فصل کاٹنے وغیرہ کی تربیت دی جاتی ہے۔

متعلقہ ترقیاتی پروگراموں میں سب سے نئی سرگرمی ریشم سازی کی شروعات ہے۔ اس پروگرام میں شہتوت کی پودکاری کے ساتھ ایک پیداواری یونٹ اور ایک تربیتی مرکز قائم کرنے کا کام شامل ہے۔ کھادی اور دیہی صنعتوں سے متعلق کارپوریشن نے اس کے لیے امداد فراہم کی ہے۔

ستوپداوکاس منڈل مختلف طبی سرگرمیوں کا بھی اہتمام کرتا ہے جن میں صحتی کیمپ، آنکھوں کے کیمپ نیز جراحی اور تشخیص کے دیگر کیمپ شامل ہیں۔ منڈل نے پروجیکٹ والے علاقے میں ہر ایک گاؤں میں پینے کا تازہ اور صاف پانی مہیا کرنے کے انتظامات کیے ہیں۔ گھریلو حفظان

باقی صفحہ پر

بقیہ کور ۲ : اقلیتی مسائل اور اقلیتی کمیشن

کوچنگ کلاسیز

وزارت فلاح وبہبود اقلیتی طبقات کے افراد کو ملازمت کے حصول کے لیے مقابلہ جاتی امتحانات میں شریک ہونے کے لیے باقاعدہ کوچنگ کلاسیز چلا رہی ہے۔

قومی اقلیتی کمیشن

اقلیتوں کے بڑھتے ہوئے مسائل پر قابو پانے اور انھیں حل کرنے کے لیے مرکزی حکومت نے قرارداد مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۷۸ء کے ذریعہ مرکز میں اقلیتی کمیشن قائم کیا اور دستور ہند میں اقلیتوں کے دیے گئے حقوق اور تحفظات پر عمل درآمد کی ذمہ داری اس کے سپرد کی۔

یہاں یہ ذکر خارج از بحث نہ ہوگا کہ اس وقت یہ کمیشن وزارت داخلہ کے تحت قائم کیا گیا تھا مگر جب مرکز میں وزارت فلاح وبہبود قائم ہوئی تو اقلیتی کمیشن کو اس وزارت میں منتقل کر دیا گیا۔

۱۹۹۲ء میں پارلیمنٹ میں بل پاس ہوا۔ اس ایکٹ کے ذریعہ اقلیتی کمیشن "قومی اقلیتی کمیشن" کے نام سے موسوم کیا گیا اور کمیشن کو سول کورٹ کے اختیارات تفویض ہوئے۔ اس طرح ایک جانب جہاں کمیشن کی اہمیت میں اضافہ ہوا وہیں دوسری طرف حکومت کی ساکھ بھی بڑھی کہ اقلیتوں کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں حکومت کی نیت صاف ہے۔ علاوہ ازیں اس ایکٹ کے تحت مرکزی حکومت نے نوٹی فیکیشن کے ذریعہ حسب ذیل کو "مذہبی اقلیتیں" تسلیم کیا ہے۔

۱۔ مسلم
۲۔ عیسائی
۳۔ سکھ
۴۔ بدھ مت
۵۔ پارسی

قومی اقلیتی کمیشن کے ذریعہ کیے گئے اقدامات

۱۔ قومی اقلیتی کمیشن، پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر، نیم فوجی دستوں، پولیس، مسلح افواج، بینکوں اور دیگر محکموں میں اقلیتوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے ملازمت میں لیے جانے کو یقینی بنانے کے لیے وقتاً فوقتاً سفارشات پیش کرتا رہا ہے۔

۲۔ اقلیتوں کے ذریعہ قائم کردہ تعلیمی اور تکنیکی اداروں کو منظور کیے جانے کے سلسلے میں کمیشن نے رہنما خطوط متعین کیے اور مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو اس سلسلے میں ضروری ہدایات جاری کی ہیں۔

۳۔ ووٹر لسٹوں سے مسلمانوں کے ناموں کے اخراج کا معاملہ کمیشن نے بڑی سنجیدگی سے لیا اور ریاستی حکومتوں کے سربراہوں اور چیف الیکشن کمشنر سے گفتگو کرنے کے علاوہ تحریری طور پر مسئلہ کی سنگینی سے انھیں آگاہ بھی کیا۔

۴۔ وقف املاک میں دخل اندازی، قبرستانوں کی زمین پر ناجائز قبضے جیسے مسائل کو متعلقہ ریاستی حکومتوں کے علم میں لاکر کمیشن ان سے فوری تصفیہ کے لیے سفارش کرتا ہے۔

۵۔ یہ حقیقت ہے کہ انسداد دہشت گردی قانون "ٹاڈا" کا مسئلہ پچھلے چند برسوں میں سنگین شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس قانون سے بڑھ کر اس کے بے جا استعمال کو روکنے کی ضرورت اولین تھی۔

لہٰذا قومی اقلیتی کمیشن نے اس کا ہر پہلو سے جائزہ لے کر جون ۱۹۹۴ء میں اسے ختم کرانے کے لیے پہل کرتے ہوئے ایک قرارداد پاس کی اور اسے وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کو ضروری کارروائی کے لیے بھیجا۔

۶۔ سول کورٹ کے اختیارات کے تحت کمیشن میں پہلا کیس جو دائر کیا گیا وہ محمد کٹی صاحب میموریل ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بنام حکومت کیرالہ ہے۔

دیگر اقدامات

۱۔ قومی اقلیتی ترقیاتی ومالیاتی کارپوریشن

مرکزی حکومت نے اقلیتی طبقات کے افراد کو اپنا روزگار شروع کرنے کے قابل بنانے کی غرض سے سرمایہ فراہم کرنے کے لیے کمیشن کی سفارش پر قومی اقلیتی ترقیاتی ومالیاتی کارپوریشن قائم کی۔ اس کارپوریشن کا سرمایہ ۵۰۰ کروڑ روپے ہے۔

یہ کارپوریشن اقلیتی طبقات کے خواہش مند افراد کو روزگار شروع کرنے کے لیے آسان شرطوں پر قرض فراہم کرے گی۔

۲۔ یونین پبلک سروس کمیشن

سول سروس امتحانات سے چند غیر ملکی زبانوں کے ساتھ عربی اور فارسی کو بھی خارج کر دیا گیا تھا۔ اس پر کمیشن نے غور کرنے کے بعد ان زبانوں کو دوبارہ شامل کرنے کی سفارش کی ہے۔

۳۔ وزارت برائے اقلیتی امور

کمیشن نے ۱۵ نکاتی پروگرام اور فلاح وبہبود کی دیگر اسکیموں پر خاطر خواہ عمل درآمد کرانے کے لیے مرکز میں "وزارت برائے اقلیتی امور" کے قیام کی تجویز بھی حکومت کو پیش کی ہے۔

کسی بھی جمہوری ملک میں اقلیتوں، اقلیتوں کے بنیادی حقوق سے انکار ممکن نہیں۔ لہٰذا ملک کی تمام اقلیتیں دوسرے شہریوں کی طرح ملک کی وفادار ہیں اور بلاشبہ اکثریت کے ساتھ مساوی حقوق کی مستحق ہیں۔

لہٰذا اقلیتوں کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے شہریوں کے برابر سمجھیں اور احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں۔ حکومت ان کو جو سہولیات فراہم کر رہی ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر اپنی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کو دور کرنے کے کام میں جی جان سے لگ جائیں۔ اقلیتی طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کو آئین کے تحت جو حقوق اور اختیارات حاصل ہیں اگر اس کے بارے میں کوئی شکایت ہو تو وہ بلا جھجک اس بارے میں کمیشن کو لکھ سکتے ہیں کمیشن ان کی شکایت کے بارے میں متعلقہ ریاست اور وزارت سے رابطہ قائم کرکے اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے۔ کمیشن کا پتہ مندرجہ ذیل ہے:

قومی اقلیتی کمیشن
لوک نائیک بھون
خان مارکیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

اہلِ قلم حضرات

اب ہمیں قدرے ضخیم مضامین بھی ارسال کر سکتے ہیں کیونکہ "یوجنا" کے صفحات میں اضافے کے باعث اب طویل مضامین بھی شائع کیے جا سکتے ہیں۔
براہ کرم کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط تحریر کریں۔
(ادارہ)

ڈاکٹر بی۔ این۔ سہائے

معذور افراد کی بہبود

جسمانی معذوری کی لعنت اتنی ہی پرانی ہے جتنا انسانی سماج۔ انسان کو ہمیشہ ہی کسی نہ کسی طرح جسمانی معذوری کا سامنا کرنا پڑا ہے، خواہ خود اس کا شکار ہونے کے سبب یا اپنے خاندان کے کسی معذور رکن یا کسی معذور دوست و واقف کار کی وجہ سے۔ جسمانی معذوری جنگوں یا حادثات کے نتیجے میں یا ناقص غذائیت یا بیماری وغیرہ کے سبب پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگوں کی معذوری پیدائشی بھی ہوتی ہے۔

جسمانی طور پر معذور لوگوں کی تعداد کے بارے میں مرتب کیے گئے اندازے اکثر ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے اس کی وجہ معذوری کی وہ تشریح ہے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی اندازہ مرتب کیا جاتا ہے، اندازہ مرتب کرنے کا طریقہ کیا ہے اور یہ بات کہ اندازہ مرتب کرتے وقت معذوری ناپنے والے سائنسی آلے کا استعمال کیا گیا ہے یا نہیں۔ نیشنل سروے آرگنائزیشن آف انڈیا (این ایس ایس او) نے ۱۹۸۱ء میں بصری، سماعی اور عضوی تین قسموں کی معذوریوں کے بارے میں ایک ملک گیر سروے کیا تھا۔ اس کے مطابق ملک کی ۸ر۱ فی صد آبادی یا تقریباً ایک کروڑ ۲۰ لاکھ افراد کسی نہ کسی معذوری میں مبتلا تھے۔ این ایس ایس او نے ۱۹۹۱ء میں ایک اور سروے کیا جو درج ذیل معذوریوں کی بنیاد پر کیا گیا (۱) آنکھ کی معذوری (۲) کان کی معذوری (۳) زبان کی معذوری (یعنی قوت گویائی سے محرومی) اور (۴) عضوی معذوری۔

اس سروے کے مطابق ملک میں معذور افراد کی مجموعی تعداد ایک کروڑ ۶۰ لاکھ تھی یعنی ملک کی کل آبادی کا ۹ر۱ فی صد۔ دیکھا گیا ہے کہ دیہات میں تقریباً بیس فی صد لوگ کسی نہ کسی قسم کی معذوری کا شکار ہیں جب کہ شہروں میں معذور لوگوں کی تعداد ۱۶ فی صد ہے۔ معذور ہونے کی شرح مردوں میں عورتوں سے کچھ زیادہ ہے۔

ان دونوں جائزوں میں دماغی طور پر پسماندہ لوگوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم اس زمرے کے معذوروں کے بارے میں این۔ ایس۔ او نے ۱۹۹۱ء میں ایک نمونہ جاتی سروے کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا ملک میں صفر سے ۱۴ سال تک کے بچوں کی مجموعی آبادی کا تین فی صد حصہ ذہنی طور پر پسماندہ ہے۔ لیکن ایک اور نمونہ جاتی سروے کے مطابق ملک کی کل آبادی کا ۲ تا ۵ر۲ فی صد حصہ ذہنی پسماندگی کا شکار ہے۔

۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۹ء تک کی مدت میں ڈاکٹر مدن موہن نے وزارت صحت و خاندانی بہبود کے تحت بصارت سے محروم لوگوں کے بارے میں ایک سروے کیا تھا۔ اس کے مطابق ملک میں نابینا لوگوں کی کل تعداد ۹۲ر۱۱ ملین ہے جب کہ این ایس ایس او کے ۱۹۸۱ء کے سروے میں نابینا لوگوں کی کل تعداد کا اندازہ ۷۴ر۳ ملین لگایا گیا تھا۔

تاہم این ایس ایس او کا ۱۹۹۱ء کا سروے ملک میں لوگوں کے نابینا ہونے کی شرح میں کمی واقع ہونے کی خبر دیتا ہے۔ این ایس ایس او کی ۱۹۹۱ء کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ "ماہرین کا خیال ہے کہ ترقی کی تیز تر رفتار اور شہر کاری کی وجہ سے معذوری پیدا ہونے کی شرح میں بھی اضافے کا امکان ہے۔" دوسری طرف ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۱ء تک کی دہائی میں صحت کی بہتر دیکھ بھال اور میڈیکل سائنسوں کی ترقی کے نتیجے میں کچھ قسموں کی معذوری کے پیدا ہونے کی شرح میں کمی ہونے کا امکان ہے اگرچہ جیسا کہ سروے کی رپورٹ کہتی ہے، ان عناصر کا مجموعی اثر یہ ہوا ہے کہ کل ملا کر سبھی اقسام کی جسمانی معذوری میں معمولی اضافہ ہوا ہے۔

اندھے پن کی روک تھام کے قومی پروگرام (عالمی ادارہ صحت کی رپورٹ برائے ۱۹۸۹ء) کے مطابق تقریباً ۵۶ر۲۸ ملین اشخاص ضعف بصارت میں مبتلا ہیں۔ انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ (آئی سی ایم آر) کے ایک مطالعاتی جائزے کے مطابق ملک کے دیہی علاقوں میں ۸ر۷ فی صد اور شہری علاقوں میں ۸ر۱۰ فی صد لوگ کافی اونچا سنتے ہیں۔

ملک میں کوڑھ کی بیماری میں مبتلا افراد کا اندازہ تقریباً ۴۰ لاکھ ہے جن میں سے پانچواں حصہ بچوں کا ہے۔ تقریباً ۱۵۔۲۰ فی صد کیس ایسے ہیں جن میں مریض کے جسمانی اعضا میں خرابی آگئی ہے۔ ملک کے ۱۹۶ اضلاع میں اس بیماری کے لاحق ہونے کی شرح پانچ فی ہزار ہے اور تقریباً ۴۴ کروڑ لوگ انہی اضلاع میں رہتے ہیں۔

اقدامات

زمانۂ قدیم میں معذور افراد کی ضروریات گھر کے لوگ یا برادری پوری کیا کرتے تھے۔ اس وقت بریل سسٹم یا دیگر جدید امدادی ساز و سامان موجود نہ تھا جس سے معذور افراد کو مدد ملتی۔ آزادی کے بعد ہندوستان نے معذوروں کے مسئلے کو ایک مربوط انداز میں سائنٹفک طریقوں سے

حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں سرکاری اقدامات کی مختصر تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

(۱) معذور افراد کے لیے سہولیات کی فراہمی اور ان کی بحالی و باز آبادکاری، پیشہ ورانہ رہنمائی و مشاورت اور تربیت کے لیے درج ذیل چھ قومی انسٹی ٹیوٹ قائم کیے گئے ہیں۔

(ا) بصارت سے محروم لوگوں کا قومی انسٹی ٹیوٹ بمقام دہرہ دون

(ب) ہڈیوں کی کمزوری وغیرہ سے متعلق قومی انسٹی ٹیوٹ بمقام کلکتہ

(ج) دماغی طور پر پسماندہ لوگوں کا قومی انسٹی ٹیوٹ بمقام سکندر آباد

(د) قوت سماعت سے متعلق علی یاور جنگ قومی انسٹی ٹیوٹ بمقام بمبئی

(ہ) قومی انسٹی ٹیوٹ برائے ریسرچ، ٹریننگ اور باز آبادکاری بمقام کٹک

(و) جسمانی معذوروں کا انسٹی ٹیوٹ بمقام دہلی

(۲) ان کے علاوہ مصنوعی اعضا تیار کرنے کی ایک کارپوریشن پبلک سیکٹر کے ایک ادارے کے طور پر ۱۹۷۲ء میں کانپور میں قائم کی گئی تھی۔

(۳) قومی انسٹی ٹیوٹوں میں بی ایس سی/ڈپلوما کورس کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ ان اداروں سے پاس ہونے والے طلبا کی ملک میں اور ملک سے باہر بڑی مانگ ہوتی ہے۔ اس لیے ڈگری/ڈپلوما کورسوں کے لیے نشستیں بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

(۴) معذور افراد کی باز آبادکاری کے لیے خدمات عموماً رضاکار تنظیموں کی وساطت سے فراہم کی جاتی ہیں کیوں کہ ان کو تجربہ بھی ہوتا ہے اور ان کے اندر خدمت کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے لیے امدادی گرانٹیں دینے کی یہ چار اسکیمیں چل رہی ہیں:

(ا) رضاکار تنظیموں کو امداد دینے کی اسکیم کے تحت تعلیم، تربیت اور باز آبادکاری کی خدمات فراہم کرنے کے لیے ان تنظیموں کو شہری علاقوں کے لیے ۹۰ فی صد تک اور دیہی علاقوں کے لیے ۹۵ فی صد تک امداد دی جاتی ہے۔ گزشتہ برسوں میں نہ صرف ان تنظیموں کو دی جانے والی امداد میں نمایاں اضافہ کیا گیا ہے بلکہ ان تنظیموں کی تعداد بھی ۲۶۲ سے بڑھ کر ۳۱۵ ہو گئی ہے۔ اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ تعداد ۴۰۰ ہو جائے گی۔

(ب) کوڑھ کے شفایاب مریضوں کے لیے امدادی گرانٹیں دینے کے واسطے ایک اور اسکیم شروع کی گئی ہے۔ اس کے تحت ۹۰ فی صد امداد دی جاتی ہے۔ دماغی طور پر پسماندہ افراد سے متعلق اسکیم کے تحت سو فی صد امداد دی جاتی ہے۔

(ج) تقریباً ۱۲۰۰ اسکول معذور افراد کے لیے کھلے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی ملک میں ۲۴۰ اضلاع ایسے ہیں جن میں ایسا کوئی اسکول نہیں ہے۔ اس قسم کے خصوصی اسکولوں کے قیام اور ترقی کے لیے ۹۴-۱۹۹۳ء میں امدادی گرانٹیں دینے کی ایک نئی اسکیم شروع کی گئی ہے جس کے تحت ۹۰ فی صد امداد دی جاتی ہے۔

(۵) جسمانی طور پر معذور افراد کو جن کی آمدنی ۱۲ سو روپے ماہوار سے کم ہے، مفت امدادی آلات مہیا کرنے کی ایک اسکیم بھی چل رہی ہے۔ ۱۲۰۱ سے ۲۵۰۰ روپے ماہوار کی آمدنی والے معذور افراد کو نصف قیمت پر امدادی آلات مہیا کیے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت کسی معذور شخص کو ۳۶۰۰ روپے تک کی قیمت کا امدادی آلہ فراہم کیا جا سکتا ہے۔

(۶) چوں کہ ۸۰ فی صد معذور افراد دیہات میں رہتے ہیں اس لیے معذور افراد کی باز آبادکاری کے لیے ایک قومی پروگرام کی اسکیم صرف دیہی علاقوں کے لیے بنانے کے بارے میں غور کیا جا رہا ہے۔

(۷) معذور افراد کی باز آبادکاری کے لیے دی جانے والی تربیت کا ایک ہی جیسا معیار برقرار رکھنے، باز آبادی کا ایک مرکزی رجسٹر رکھنے اور متعلقہ امور کے بندوبست کے لیے ری ہیبی لی ٹیشن کونسل آف انڈیا ایکٹ کے نام سے ایک قانون وضع کیا گیا ہے جو ۳۱ جولائی ۱۹۹۳ء سے نافذ ہو چکا ہے۔

(۸) معذور افراد کے لیے ۲۳ خصوصی دفاتر روزگار اور عام دفاتر روزگار میں ۵۵ خصوصی شعبے کھول دیے گئے ہیں۔ ان دفاتر کے چالو رجسٹروں پر ۱۹۹۰ء میں ۲۹۵۸۴۶، ۱۹۹۱ء میں ۳۱۳۳۹۱ اور ۱۹۹۲ء میں (ماہ جون تک) ۳۱۸۹۷۳ معذور متلاشیان روزگار کے نام درج تھے۔ ان تین برسوں میں بالترتیب ۳۹۳۹، ۴۵۹۹ اور ۴۳۰۲ (دسمبر ۱۹۹۲ء تک) معذور افراد کو روزگار دلایا گیا۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ دفاتر روزگار کل ۴۸۸۹۶ معذور افراد کو روزگار دلا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں معذور افراد کے لیے پیشہ ورانہ تربیت کے ۱۷ مراکز بھی کام کر رہے ہیں۔

(۹) معذور افراد کے لیے سرکاری اور پبلک سیکٹر کے اداروں میں تین فی صد خالی اسامیاں معذور افراد کے لیے مخصوص کر دی گئی ہیں۔ اس میں سے ایک فی صد جسمانی معذور والے افراد کے لیے، ایک فی صد بصارت سے محروم افراد کے لیے اور ایک فی صد سننے کی طاقت سے محروم افراد کے لیے ہے۔ معذور افراد کے لیے مخصوص اسامیوں میں سے جو اسامیاں خالی رہ جاتی ہیں انھیں پُر کرنے کے لیے خاص بھرتی مہمیں چلائی جاتی ہیں۔

(۱۰) سائنس اور تکنالوجی اس دور میں نمایاں پیش رفت کر رہی ہے جس کی وجہ سے قریب قریب روزانہ ہماری طرز زندگی میں تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ معذور افراد کو سائنس اور تکنالوجی کی مدد سے موزوں اور ترقی یافتہ امدادی آلات فراہم کرنے اور ان کی نقل و حرکت بہتر بنانے، ان کے لیے زیادہ روزگار فراہم کرنے اور انھیں ملک کے عام دھارے میں شامل کرنے کی غرض سے ۱۹۸۸ء میں ایک سائنس اور تکنالوجی پروجیکٹ شروع کیا گیا جو ایک مشن کی طرح چلایا جا رہا ہے۔ تحقیق و ترقی کے پروجیکٹ شروع کیے جا رہے ہیں اور ان کے لیے سو فی صد امداد دی جا رہی ہے۔ سائنس اور تکنالوجی کی مدد سے تیار کیے گئے آلات میں سے ایک قابل ذکر آلہ اسپیچ سنتھے سائزر (SPEECH SYNTHESIZER) ہے جو بازار میں عموماً دستیاب ہے۔ اس آلے کی مدد سے بصارت سے محروم شخص کمپیوٹر پر کام کر سکتا ہے۔ اسی طرح ایک اور نہایت کار آمد آلہ ایک کمپیوٹرائزڈ بریل امبوزر (COMPUTERISED BRAILLE EMBOSSER) ہے۔ اس کے علاوہ ایک نیا انٹرپوائنٹنگ بریل رائٹنگ فریم (INTERPOINTING BRAILLE WRITING FRAME) بھی تیار کیا گیا ہے۔ اس قسم کے دس ہزار رائٹنگ فریم معذور افراد میں مفت تقسیم کیے جا چکے ہیں۔ کلوز سرکٹ ٹی وی جس کی تصویر کو کافی بڑا کر کے دکھایا جا سکتا ہے۔ دوسری ایجادات میں ایک نئی قسم کی وہیل چیئر ہے

جو معذور افراد کے لیے زیادہ کارآمد ثابت ہوگی کیونکہ اسے وہ بآسانی چلا سکیں گے۔

(۱۱) دماغی طور پر پسماندہ بچوں کے والدین کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہوتی ہے کہ ان کے بعد ان کے (بچوں کا) کیا ہوگا۔ اس لیے دماغی طور پر پسماندہ بچوں کی بھلائی کے لیے ایک قومی ٹرسٹ قائم کرنے کی تجویز پر غور کیا جا رہا ہے۔

(۱۲) معذور افراد کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک جامع قانون بنانے کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کی جا رہی ہے تاکہ انھیں برابر کے مواقع مل سکیں اور وہ قومی زندگی میں برابر کے حصہ دار بن سکیں۔ اس سلسلے میں پہلی کوشش ۱۹۸۱ء میں کی گئی تھی۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں سپریم کورٹ کے ایک سابق جج اور ممبر پارلیمنٹ شری جسٹس بہارالاسلام کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی نے کئی سفارشات پیش کیں جن پر غور کیا جا رہا ہے۔

(۱۳) راشٹرپتی معذور لوگوں کے بین اقوامی دن، معذور لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کرنے والے درج ذیل زمروں کو انعامات عطا کرتے ہیں:۔

(ا) بہترین فرد (ب) بہترین ادارہ (ج) بہترین ملازم (د) بہترین مالک (ہ) معذور افراد کو روزگار دلانے والا بہترین افسر (و) بہترین قومی ٹکنالوجی۔

تاہم یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک ہم بازآبادکاری کی خدمات، فوائد اور رعایات صرف شدید طور پر معذور افراد کو ہی بہم پہنچاتے رہے ہیں، معمولی معذور والے افراد کو نہیں۔ کسی بھی رعایت یا فائدے کا مستحق بننے کے لیے معذوری کی حد ۴۰ فی صد ہونی چاہیے۔

مثال کے طور پر کمزور بینائی والے لوگوں اور پڑھنے اور سیکھنے میں مشکل محسوس کرنے والے، دماغی طور پر کمزور افراد کے لیے پروگرام نہیں ہے۔

بہت سے بچوں میں سیکھنے کی صلاحیت کم ہونے کی وجہ سے انھیں پڑھنے یا حساب کے سوالات حل کرنے میں، لکھے ہوئے یا بولے جانے والے الفاظ کو سمجھنے اور پھر سیکھنے میں بہت دقت پیش آتی ہے۔ کچھ بچے کسی حد تک مرگی کی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن ان کے لیے یا مرگی کے مریضوں کے لیے کوئی پروگرام وضع نہیں کیا گیا ہے۔

سماج میں معذور لوگوں کے سماجی اور نفسیاتی ادغام کے ساتھ ساتھ معذور لوگوں کے لیے ان کی صلاحیتوں کے مطابق خاص قسم کے کھیل تیار کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

بہرحال معذور لوگوں کی بحالی و بازآبادکاری کی خدمات میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ ہر سال نئے پروگرام اور نئی خدمات شروع کی جا رہی ہیں۔

آج کل ہم ایشیا اور بحرالکاہل کے خطے کی اقتصادی، سماجی اور ثقافتی کونسل (ایسکیپ) کی اعلان کردہ "معذور افراد کی دہائی" سے گزر رہے ہیں جو ۱۹۹۳ء سے ۲۰۰۲ء تک منائی جا رہی ہے۔ امید ہے اس دہائی میں مندرجہ بالا پہلوؤں پر توجہ دی جائے گی۔ ٹکنالوجی کی نمایاں پیش رفت کے ساتھ شاید معذور افراد کے لیے بھی دور سے تعلیم دینے کا کوئی سسٹم نکالا جا سکے گا۔ حکومت اور عوام میں ان تمام چنوتیوں کا سامنا کرنے کے لیے روزافزوں بیداری پیدا ہو رہی ہے اور مستقبل روشن اور پرامید نظر آ رہا ہے۔ ●

بقیہ: خواتین کے خلاف جرائم کا سدباب

طرف سے نہتی عورتوں پر ظلم ڈھایا جاتا ہے۔ اس سے عورت کا جذباتی سکون چھن جاتا ہے، کمیشن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کسی عورت کو جہیز کی وجہ سے پریشان کیا جائے اور اسی میں اس کی موت واقع ہو جائے تو شوہر کی املاک ضبط کر لی جائیں یا دیور وغیرہ کی جائداد ضبط کر لی جائے۔ جہیز سے ہونے والی اموات میں اس طرح کی سزاؤں کو قانونی حیثیت دینے کے لیے کمیشن نے سفارش کی ہے۔

عورتوں پر ظلم و ستم روکنے کے لیے محض قوانین کا سہارا لینا یا سمجھانا بجھانا ہی کافی نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے انسانی رویوں میں تبدیلی لانی ضروری ہوگی۔ عورتوں کو تعلیم دے کر، ان کو زیادہ آزادی دے کر اور زیادہ مواقع دستیاب کرا کر ہی یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ترقیاتی پروگراموں کو مربوط انداز پر چلانا ضروری ہے کمیشن اگرچہ اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے، پھر بھی اس کی کوشش یہی ہے کہ موجودہ صورت حال میں عورتوں کو ظلم و ستم سے بچانے کی بھرپور کوشش کرے تاوقتیکہ انسانی رویوں میں تبدیلی آ جانے سے عورتوں کے ساتھ معاملات آئیڈیل صورت میں سامنے آئیں۔ ●

بقیہ: ملیریا۔ ایک موذی مرض

احتیاط اور بچاؤ

احتیاط علاج سے بدرجہا بہتر ہے، اس مقولے پر عمل کرتے ہوئے احتیاط لازمی ہے۔ اس مرض سے تحفظ کے لیے صفائی ستھرائی کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہوتی یعنی مکان صاف ستھرا اور روشن رہے۔ ایسے مقامات جہاں گندہ پانی جمع ہوتا ہو اس کو صاف رکھیں، وہاں مٹی کا تیل اور ڈیزل ڈال دیں۔ گڑھوں اور نشیبی علاقوں کو صاف رکھیں۔ اگر ممکن ہو سکے تو گھر کے دروازوں اور کھڑکیوں میں جالی لگوا دیں، سونے کے وقت مچھردانی کا استعمال کریں۔ مچھروں کو بھگانے کے لیے اب تو جدید قسم کی ٹکیاں آ گئی ہیں جن کے استعمال سے ایک عجیب سی بو پیدا ہوتی ہے اور مچھر بھاگ جاتے ہیں لیکن دیہی علاقے اور جھگی جھونپڑی میں جہاں یہ سہولتیں میسر نہیں ہیں وہاں شام ہوتے ہی نیم کی پتی یا لوبان سلگا دینا چاہیے۔ اس کے دھوئیں سے بھی مچھر بھاگ جاتے ہیں مگر کوشش اس بات کی ہونی چاہیے کہ مچھروں کی پیدائش پر ہی روک لگانے کے امکانات پر غور کر کے عملی تدابیر اختیار کی جائیں جس کے لیے لازمی ہے کہ پانی کا جماؤ نہ ہونے دیا جائے، اگر نالیاں اور گڈھے کھلے ہوئے ہوں تو انھیں کسی پتھر وغیرہ سے ڈھک دیں اور دواؤں کا چھڑکاؤ اکثر و بیشتر کرتے رہیں۔

علاج

اگر تمام احتیاطی تدابیر کے بعد بھی یہ مرض ہو جائے تو سب سے پہلے ہلکا سا جلاب دے کر آنتوں کی صفائی کر دیں اور اس کے بعد ملیریا کی دوائیں۔ ملیریا کی دواؤں میں کونین کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ طب یونان کے مطابق "افنتین" اس مرض کا شافی علاج ہے۔ علاوہ ازیں کرنجوہ کے پتے ۱۰ گرام، کالی مرچ ۵ عدد کو پیس لیں اور چھان کر ۲-۳ دن تک استعمال کرانے سے ملیریا کا بخار ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تلسی کے پتے ۱۰ گرام اور کالی مرچ ۷ عدد کو پانی میں پیس کر پلانا بھی مفید ہوتا ہے۔ اگر ان ادویات سے بھی خاطر خواہ افاقہ نہ ہو تو کسی مستند معالج سے رجوع کریں۔ ●

سب کے لیے روزگار:
ایک قابل حصول نشانہ

آٹھویں پنچسالہ منصوبے کے لئے روزگار سے متعلق حکمت عملی اس دسے ہے (۲۰۰۲-۱۹۹۲) کے اختتام تک تقریباً مکمل روزگار کا نشانہ حاصل کرنے کے دس سالہ تناظر کے ایک حصہ کے طور پر ۱۹۹۲ میں تشکیل دی گئی تھی۔

آٹھویں منصوبے کی شروعات پر کل بے روزگاری کا تخمینہ ۳۱۹ کروڑ مزدوروں میں سے ۲ء۱ کروڑ لگایا گیا ہے۔ بے روزگار لوگوں میں تعلیم یافتہ بے روزگار لوگوں کی تعداد تقریباً ۴۰ فی صد ہے۔ آٹھویں پنچسالہ منصوبے کے دوران اور آئندہ پانچ برسوں (۲۰۰۲-۱۹۹۷) میں مزدوروں کی تعداد میں اضافے کا تخمینہ بالترتیب ۳۵ء۳ کروڑ اور ۳۶ء۳ کروڑ لگایا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ۲۰۰۲ تک تقریباً مکمل روزگار کا نشانہ حاصل کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہوگی کہ روزگار کے مواقع میں سالانہ ۵ء۶ فی صد کی شرح ترقی سے مطابقت رکھتے ہوئے 2.6 فی صد سے لے کر 2.8 فی صد کی اوسط سالانہ شرح کے حساب سے اضافہ کیا جائے۔ چنانچہ آٹھویں منصوبے کا مقصد روزگار کے مواقع میں اضافہ کی مطلوبہ سطحیں حاصل کرنے کے لئے روزگار کے بہت زیادہ مواقع والے شعبوں اور ضمنی شعبوں کی تیزی سے ترقی و فروغ کی لامرکزی اور گوناگوں حکمت عملی اختیار کرنا ہے۔ اس حکمت عملی کے اہم جزو یہ ہیں۔

۱۔ زراعت کی تیزی سے نیز جغرافیائی طور سے اور فصل وار متنوع ترقی و فروغ۔

۲۔ زراعت اور زراعت پر مبنی صنعتوں سے متعلق سرگرمیوں کا تیزی سے فروغ۔

۳۔ دیہی علاقوں میں غیر زرعی، خاص طور سے اشیا سازی کی سرگرمیوں کا فروغ۔

۴۔ اشیا سازی کے چھوٹے اور لامرکزی شعبے کی ترقی و فروغ پر خصوصی توجہ۔

۵۔ خاص طور سے دیہی علاقوں میں صحت اور تعلیم کی بنیادی سہولیات کو مستحکم بنانا۔

۶۔ مناسب امداد کے نظاموں کے ذریعے خدمات اور غیر رسمی شعبے کی سرگرمیوں کا تیزی سے فروغ۔

آٹھویں منصوبے میں یہ تجویز بھی کیا گیا ہے کہ چوں کہ تقریباً مکمل روزگار کا نشانہ صرف مقررہ مدت میں حاصل کئے جانے کی توقع ہے، اس لئے فی الحال روزگار کے خصوصی پروگرام جاری رکھنا اور اس کی توسیع کرنا ضروری ہے۔ قومی ترقیاتی کونسل نے ۱۹۹۲ میں روزگار کے متعلق جو کمیٹی قائم کی تھی اس نے تجویز کیا تھا کہ اجرتی روزگار کے پروگراموں کو دیہی بنیادی ڈھانچے کی ترقی و فروغ نیز چھوٹے اور درمیانہ درجے کے شہروں کی مربوط ترقی سے وابستہ کیا جانا چاہئے اور محدود روزگار کی ضمانت کا سلسلہ منتخبہ علاقوں میں شروع کیا جانا چاہئے۔

۹۵-۱۹۹۲ میں کی گئی پیش رفت آٹھویں پنچسالہ منصوبے کے پہلے تین برسوں میں روزگار کے مزید 1.878 کروڑ مواقع پیدا کئے گئے ہیں جس سے روزگار کے مواقع میں سالانہ 2.03 فی صد کی اوسط شرح اضافہ کا پتہ چلتا ہے۔

آٹھویں منصوبے کے پہلے تین برسوں میں روزگار کی صورت حال میں کچھ بہتریاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آٹھویں منصوبے کے پہلے تین برسوں میں روزگار کے مواقع میں اضافہ کی اوسط سالانہ شرح اس سے پہلے کے سات برسوں یعنی ۹۲-۱۹۸۵ کے دوران روزگار کے مواقع میں اضافہ کی اوسط سالانہ شرح (1.73 فی صد) کے مقابلے میں زیادہ (۲.۰۳ فی صد) رہی ہے۔ اسی طرح سے ۹۵-۱۹۹۲ کے دوران روزگار کے کل سالانہ مزید مواقع کی تعداد بھی ۹۲-۱۹۸۵ کی مدت کے مقابلے میں (۵۰ لاکھ) کہیں زیادہ (۶۳ لاکھ) رہی ہے۔ یہ اضافہ اس حقیقت کے باوجود ہوا ہے کہ مذکورہ مدت کے دوران مجموعی اندرون ملک پیداوار میں اضافہ اس سے پہلے کی مدت میں حاصل کردہ اضافے نیز آٹھویں منصوبے کے لئے تجویز کردہ اضافہ کے مقابلے میں بھی کم رہا ہے۔

دوسری یہ کہ مذکورہ منصوبے کے پہلے تین برسوں میں ترقی میں روزگار کے مواقع کے عنصر میں اضافہ ہوا ہے نیز روزگار کے مواقع میں کمی کا رجحان پلٹ گیا ہے۔ مذکورہ مدت کے دوران روزگار کے مواقع میں بہتری نسبتاً پسماندہ علاقوں میں زراعت جیسے شعبوں، اشیا سازی کے غیر منظم شعبے تجارت اور نقل و حمل کے شعبے اور خدمات کے شعبے میں تیزی سے ترقی کی وجہ سے آئی ہے۔

روزگار کے خصوصی پروگرام

دیہی علاقوں میں آجکل روزگار کے جن خصوصی بڑے پروگراموں پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے ان میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام، جواہر روزگار یوجنا اور یقینی روزگار کی اسکیم شامل ہیں

شہری علاقوں میں چلائے جانے والے پروگراموں میں نہرو روزگار یوجنا اور شہروں میں غریبی کے خاتمے کے سلسلے میں چھوٹے شہروں کے لئے حال ہی میں شروع کردہ وزیر اعظم کا مربوط پروگرام شامل ہے۔ مختلف ریاستی حکومتیں بھی روزگار کے خصوصی پروگراموں پر عملدرآمد کرتی ہیں، جن میں قابل ذکر مہاراشٹر کی روزگار ضمانتی اسکیم ہے۔ وزیر اعظم کی روزگار یوجنا اکتوبر ۱۹۹۳ء میں شروع کی گئی تھی جس میں تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لئے خود روزگار کا پروگرام ضم کر دیا گیا ہے۔ وزیر اعظم کی روزگار یوجنا سے شہری اور دیہی دونوں علاقوں کے لوگوں کو مستفید کیا جاتا ہے۔

گزشتہ برسوں میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کو بہتر بنانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں. ان اقدامات میں سرمایہ کاری اور ہنروں کی سطحوں میں اضافہ کر کے پروجیکٹوں کی پائیداری میں اضافہ کرنا اور سرگرمیوں کے دائرے کی توسیع کرنا شامل ہیں۔ مثال کے طور پر فی کنبہ سرمایہ کاری کی رقم ۹۳-۱۹۹۲ میں ۷۸۸۹ روپے سے بڑھا کر ۹۵-۱۹۹۴ء کے پہلے آٹھ مہینوں میں تقریباً ۱۱۰۰۰ روپے کر دی گئی ہے۔

جواہر روزگار یوجنا کی گذشتہ برسوں میں توسیع کی گئی ہے اور اب اس پر تین زمروں کے تحت عملدرآمد کیا جاتا ہے۔ پہلے زمرے میں اس پروگرام کے کل فنڈز کا تین چوتھائی حصہ تمام ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں کو گاؤں کے غریب لوگوں کے لئے ان کے حصے کے طور پر جاتا ہے۔ دوسرے زمرے میں ان فنڈز کا پانچواں حصہ ان ۱۲۰ پسماندہ اضلاع کے لئے جاتا ہے، جہاں بہت زیادہ بے روزگاری اور کم روزگاری ہے اور تیسرے زمرے میں فنڈز کا بقیہ حصہ خصوصی اور اختراعی پراجیکٹ شروع کرنے کے لئے ہے۔ ۱۹۹۲ میں جواہر روزگار یوجنا کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس کے مطابق، جواہر روزگار یوجنا کے تحت اس یوجنا میں شرکت کرنے والے ہر ایک کنبے کے لئے ایک مہینے میں روزگار کے اوسطاً ۲ء۵ افرادی دن یا ایک سال میں تقریباً ۳۰ دن فراہم کئے گئے ہیں۔ یہ تعداد جواہر روزگار یوجنا کی توسیع کے لئے مزید فنڈز کی دستیابی اس یوجنا میں مزید زمرے شروع کئے جانے اور یقینی روزگار کی اسکیم شروع کرنے کی وجہ سے بعد کے برسوں میں اور زیادہ ہو گئی ہوگی۔

یقینی روزگار کی اسکیم سے ۲۶۱ اضلاع کے ۱۷۷۸ پسماندہ بلاکوں میں فی کنبہ روزگار کی کم سے کم سطح کے لیے ضمانت کا ایک جزو شروع کیا گیا ہے۔

۹۵-۱۹۹۴ء کے پہلے گیارہ مہینوں میں ان پروگراموں کے حقیقی اخراجات کی رقم ۳۵۳۳ کروڑ روپے ہے، جبکہ ۹۳-۱۹۹۲ میں یہ رقم ۲۷۱۰ کروڑ روپے تھی۔ منصوبہ بندی کمیشن کے جائزے میں مجموعی طور سے ان پروگراموں سے دیہی علاقوں میں ہاتھ سے کیے جانے والے بغیر ہنر والے کام کے لیے تقریباً آدھی مانگ پوری ہوتی ہے۔

نہرو روزگار یوجنا پر شہری علاقوں میں عملدرآمد کیا جا رہا ہے جو تین جزویاتی اسکیموں سے تیار کی گئی ہے۔ ایک جزو شہروں میں چھوٹے کاروبار یا صنعتیں قائم کرنے کے لئے ہے اور دو جزو تعمیرات عامہ کے ذریعہ نیز رین بسیروں کو بہتر بنا کر اجرتی روزگار کے لئے ہیں۔ ۹۵-۱۹۹۲ کی مدت کے دوران خود روزگار کے جزو کے تحت تقریباً ۵ لاکھ افراد کی امداد کی گئی ہے۔ عارضی تخمینوں کے مطابق مجموعی طور سے دیگر دو جزو سے مذکورہ مدت کے دوران اجرتی روزگار کے لئے تقریباً ۲۷۵ لاکھ افرادی دن مہیا کیے گئے ہیں۔

تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے خود روزگار کے تحت ۹۴-۱۹۹۲ کی مدت کے دوران خود روزگار والے کام شروع کرنے کے سلسلے میں تقریباً ۱۳۰۰۰ نوجوانوں کی مدد کی گئی ہے۔ وزیر اعظم کی روزگار یوجنا کے تحت جس میں ۹۵-۱۹۹۴ سے مذکورہ پروگرام کو ختم کر دیا گیا ہے، ۹۵-۱۹۹۳ کی مدت کے دوران ۲۰۹۰۰۰ نوجوانوں کی مدد کی گئی ہے۔

امکانات

زراعت کی کارکردگی سے مجموعی طور سے روزگار کے مواقع میں اضافے پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے، جس کی وجہ روزگار کے کل مواقع میں اس کا مسلسل بہت زیادہ حصہ ہے۔ چونکہ بھارت میں زراعت کی ترقی و فروغ اب بھی ایک ایسے مرحلے میں ہے، جس میں پیداوار میں اضافہ کی وجہ سے روزگار کے مواقع میں کافی اضافہ ہوتا ہے اس لیے زراعت کی ترقی و فروغ سے روزگار کے مواقع میں اضافہ ہوتا رہے گا، تاہم یہ ضروری ہے کہ خاص طور سے گاؤوں میں روزگار کے پروگراموں کے ذریعے آب پاشی اور دیگر دیہی بنیادی ڈھانچے کو مستحکم بنانے کے لئے زراعت کے شعبے میں پبلک سرمایہ کاری میں اضافہ کیا جائے۔ خاص طور سے خشک زمینوں سے متعلق تکنالوجیوں کو فروغ دینے اور ان کا استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ بارشوں پر زراعت کے انحصار کو کم کرنے کی غرض سے کی جانے والی کوششوں سے زراعت کی مناسب ترقی و فروغ یقینی ہوگی۔

جہاں تک روزگار کے بہت زیادہ مواقع والے دیگر شعبوں میں مذکورہ مواقع میں اضافے کے امکانات کا تعلق ہے، چھوٹے پیمانے کے شعبے کے سلسلے میں ۱۹۹۱ کی پالیسی چھوٹے پیمانے کے یونٹوں میں بڑے اور درمیانہ درجے کے صنعتی ایوانوں کے ذریعے ۲۴ فی صد تک سرمایہ جاتی شرکت کی اجازت دینے، دیہی اور چھوٹی صنعتوں کے لئے مناسب اور بروقت قرضے کو یقینی بنانے کے سلسلے میں ریزرو بینک آف انڈیا کے ذریعے اقدامات کے پیکیج کے اعلان نیز بنیادی ڈھانچے کی مربوط ترقی و فروغ کے مراکز قائم کرنے جیسے حالیہ اقدامات سے خاص طور سے پسماندہ علاقوں میں چھوٹے پیمانے کے شعبے کی صنعتوں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہونے کی توقع ہے۔ امدادی سہولیات کے ذریعے پھلوں، سبزیوں ڈبہ بند خوراک، مچھلی اور مچھلی کی مصنوعات جیسی اشیاء کی برآمدات کے فروغ سے، جس کے لئے بڑی تعداد میں مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے، روزگار کے مواقع میں مزید اضافہ ہوگا۔ سیاحت کے شعبے میں، جو روزگار کے مواقع میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں کافی تعاون کرتا ہے، اب بھی ایسی صلاحیت موجود ہے جسے بروئے کار نہیں لایا گیا ہے۔ اس صلاحیت کو ضروری بنیادی ڈھانچے کی ترقی و فروغ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی ڈھانچہ تیار کرنے اور مالی رعایات دینے کے سلسلے میں مزید

باقی صفحہ ۴۴ پر

کے۔کے۔ کھلر

ہندوستانی ریاضی کی بنیادیں

ہندوستان میں ریاضی کا تصور وادیٔ سندھ کی تہذیب سے وابستہ ہے جو دنیا کی سب سے قدیم ترین تہذیب ہے۔ موہن جوداڑو اور ہڑپا کے کھنڈر یہ بتاتے ہیں کہ وادیٔ سندھ کے لوگ علم ریاضی، انجینیرنگ اور دیگر سائنسی علوم سے بخوبی واقف تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں لکھتے ہیں کہ ہندوستانی ریاضی انسانی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

مذہبی فرائض کی ادائیگی کی خاطر ایک مناسب کھلی جگہ کا تعین کرنے کی ضرورت کے تحت ہندوستانیوں نے بہت جلد ہی اقلیدس کی ایک سادہ سی میناج مرتب کر لی تھی لیکن عملی علم کے میدان میں دنیا ہندوستانی ریاضی کی بہت زیادہ ممنون ہے جس کا ارتقا گپتا عہد میں اس منزل تک ہوا جہاں قدیم دنیا کی کوئی اور قوم نہ پہنچ پائی۔ آریہ بھٹ اور بھاسکر آچاریہ ہندوستانی ریاضی کو بہت بلندیوں پر لے گئے۔

ہندوستانی ریاضی کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ مجرد عدد کا ایک واضح تصور کرتے تھے جو اشیا کی عددی شماری اور مکانی وسعت سے مختلف تھا۔ یونانیوں کا علم ریاضی زیادہ تر اقلیدس پر مبنی تھا لیکن ہندوستان بہت پہلے ہی ان تصورات سے آگے نکل چکا تھا اور ایک سادہ عددی ترسیم کی مدد سے ایک ابتدائی الجبرے کو مرتب کیا جس کی وجہ سے کئی پیچیدہ مسئلے حل ہو گئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف عدد کی خاطر ہی مطالعہ عدد کی راہیں ہموار ہو گئیں ویسے بھی جیومیٹری کو علم سنہ یا علم ہندسہ یعنی ہندوستانی علم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اسے ریکھا گنیت بھی کہتے ہیں۔ یعنی LINE WORK ۔ اعداد کو لکھنے کا سادہ طریقہ بھی ہندوستان کی دین ہے۔ تین کا قاعدہ یا تین کا طریقہ یعنی RULE OF THREE بھی ہندوستانیوں کی ایجاد ہے۔ صفر کا صحیح استعمال سب سے پہلے ہندوستان میں ہوا۔ وہ قدیم ترین کتبہ جس میں نو ہندسوں اور ایک صفر کے استعمال سے تاریخ کا اندراج عمل میں آیا، گجرات سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا سن ۵۹۰ء ہے۔ ہندوستان سے یہ نیا دستور شام پہنچا پھر چین اور پھر ساری دنیا میں۔ ریاضی کی دنیا میں یہ ایک انقلاب تھا جس نے ریاضی کو نئی وسعتیں دیں۔

کئی صدیوں تک یہ سوچا جاتا رہا کہ اعشاریہ کا نظام عربوں نے ایجاد کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہندوستانی کی ایجاد ہے۔ عرب خود بھی ریاضی کو ہندوستانی فن... ہندسات کہتے تھے۔ اب کوئی کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہا کہ عربوں نے اعشاریہ کا استعمال یا تو ہندوستانی اور دیگر تاجروں سے سیکھا جو مغربی ساحل پر تجارت کرتے تھے یا پھر اس وقت جب انہوں نے خود ۷۱۲ء میں سندھ فتح کیا اور عربوں کے ذریعہ یہ علوم یورپ پہنچے۔

آج یورپ جن عظیم دریافتوں اور ایجادات پر فخر کر رہا ہے وہ ریاضی کے ایک ترقی یافتہ نظام کے بغیر ناممکن تھا اور ریاضی کا یہ علم ناممکن الحصول تھا۔ اگر یورپ رومی اعداد کے ناقابل گرفت طریقے پر پابند رہتا۔ ہندوستانی ریاضی نے یورپ کو اس دقیانوسی گرفت سے آزاد کرایا اس کو ایک نئی سوجھ دی۔ ایک نیا تحفہ دیا۔ اعداد کو سادگی سے لکھنا، صفر کا صحیح استعمال اور اعشاریہ کی اہمیت۔ ان ایجادات کے بغیر جدید ریاضی کا تصور مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اے۔ ایل۔ باشم اپنی کتاب "ہندوستان کا شاندار ماضی" میں لکھتے ہیں:

"وہ نامعلوم شخص جس نے ریاضی کے نئے نظام کو ترتیب دیا وہ دنیاوی نقطۂ نظر کے اعتبار سے مہاتما بدھ کے بعد ہندوستان کا اہم ترین فرد تھا۔ اس کے کارنامے کو اگرچہ عیاں حق قبول کر لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ درجہ اول کے ایک تجرباتی ذہن کا نتیجہ تھا، جو اعزاز اس کو حاصل ہوا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ کا مستحق ہے۔"

اعلیٰ ریاضی کی یہ روایت عہد وسطیٰ نے برقرار رکھی۔ نہ صرف برقرار رکھی بلکہ اس کو آگے بڑھایا۔ ساتویں صدی میں برہم گپت، نویں صدی میں مہاویر، دسویں صدی میں سری دھر اور بارہویں صدی میں بھاسکر نے ایسی ایجادیں کیں جو یورپ کے ریاضی دانوں کے علم میں نہ تھیں۔ ان ریاضی دانوں نے پائی کی کسر کو اعشاریہ کے نو مقامات تک آگے بڑھایا۔ پائی پہلے $\frac{22}{7}$ ہوا کرتی تھی۔ یعنی ۳.۱۴۱۶۔ آریہ بھٹ نے اسے $\frac{۶۲۸۳۲}{۲۰۰۰۰}$ بتایا۔ لیکن اس کو اعشاریہ کے نو مقامات تک آگے بڑھانا کسی ہندوستانی ریاضی داں کا ہی کام تھا۔ البیرونی اپنی کتاب "تحقیق ہند" میں لکھتا ہے کہ ہندوستانی ریاضی اس کے ہندوستان آنے سے پہلے اتنے عروج پر تھی کہ اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ کسی غیر ملکی ریاضی کو وہ جانتا ہے اور اس کے علم ریاضی کی وہ تعریف کرے تو ہندوستانی اس پر یقین نہیں کرتے اور ہنستے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یقیناً اس غیر ملکی استاد نے علم ریاضی کسی ہندوستانی استاد سے سیکھا ہوگا۔ البیرونی نے ہندوستان میں، اجین۔ امراوتی۔ پشاور میں رصد گاہوں یعنی OBSERVATIONS کی نشاندہی کئے ہیں جن کا دوسرے ممالک کی OBSERVATIONS کے ساتھ روزمرہ کا لین دین تھا۔ جیسے کہ ان

بقیہ صفحہ ۳۴ پر

کی ۸/۲۴۸، روسنت کنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۷۰

مولانا محمد علی جوہر کے تعلیمی افکار

مولانا محمد علی جوہر کا شمار ہندوستان کے اُن تاریخ ساز قائدین میں ہوتا ہے جنہوں نے ہندوستان کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور نہ صرف جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسی عظیم دانش گاہ کی بنیاد رکھی بلکہ اس کے اولین شیخ الجامعہ بھی مقرر ہوئے۔ مولانا محمد علی جوہر نے ہندوستان کے تعلیمی نظام میں بالخصوص مسلم اقلیت کے تعلیمی نظام کے سلسلہ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

مولانا ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء میں رامپور کے ایک ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عبدالعلی رامپور ریاست سے وابستہ تھے۔

مولانا نے بریلی سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۸۹۰ء میں اپنے بھائی شوکت علی کے ساتھ علی گڑھ آگئے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویٹ ہونے کے بعد آپ کو رامپور ریاست کی جانب سے انگلینڈ جانے کا وظیفہ حاصل ہو گیا چنانچہ آپ نے تین یا چار سال تک انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی اور ۱۹۰۲ء میں ہندوستان واپس آگئے۔

انگلینڈ سے واپسی کے بعد مولانا کا تقرر رام پور ریاست میں مرکزی تعلیمی افسر کی حیثیت سے ہو گیا لیکن آپ جلد ہی اس ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور اس کے بعد بڑودہ میں ملازمت اختیار کر لی لیکن یہ نوکری بھی آپ کو زیادہ عرصہ تک باندھے نہیں رکھ سکی اور ۱۹۱۰ء میں آپ نے بڑودہ سرکار سے بھی استعفا دے دیا اور اپنی پوری زندگی ملک و قوم کے لئے وقف کر دی۔ اپنے اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آپ نے قلم کا سہارا لیا اور ملک کے نمائندہ اخباروں اور جریدوں میں آپ نے باقاعدگی سے مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ ہندوستان کے ایک اہم اخبار THE TIMES OF INDIA میں باقاعدگی سے آپ کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

۱۹۱۱ء میں مولانا نے کلکتہ سے ایک اخبار "کامریڈ" کی اشاعت شروع کی۔ اس اخبار کا پہلا شمارہ ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء میں منظر عام پر آیا جس میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا تھا۔ بعد میں "کامریڈ" کلکتہ سے دہلی منتقل ہو گیا۔ اس کے ایک سال بعد ہی ایک اُردو روزنامچہ "ہمدرد" کے عنوان سے شائع ہونا شروع ہوا جس کا مقصد آزادی سے متعلق عوام کے نظریات کو جاننا اور سمجھنا تھا۔

مولانا کا زمانہ ہندوستان کا پُر آشوب زمانہ تھا کیونکہ انگریز حکومت مکمل طور سے اپنا تسلط قائم کر چکی تھی۔ سائنس نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ صبح اور شام نئی نئی ایجادیں عمل میں آ رہی تھیں۔ سائنس کی ترقی کے آگے قدیم علوم اب فرسودہ اور دقیانوسی سمجھے جانے لگے۔ ایسے وقت میں جہاں پرانی اقدار کو فرسودہ قرار دیکر دامن جھڑایا جا رہا تھا وہاں ایک ایسے علم کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو ملک اور قوم دونوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو سکے حالانکہ سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک پورے ملک میں پھیل چکی تھی لیکن اس تعلیم کا سارا زور صرف دنیاوی ترقی، جدید سائنسی علوم و ایجادات پر مبنی تھا۔ ایسے میں مولانا محمد علی جوہر نے ایک ایسی دانشگاہ کا تصور پیش کیا جو دین اور دنیا کے درمیان توازن برقرار رکھ سکے۔ جہاں نہ صرف جدید علوم کی تعلیم دی جائے بلکہ دینی علوم کی ضرورت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ چنانچہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو قومی مسلم یونیورسٹی کا قیام "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ دیوبند کے مولانا محمود حسن نے صدارتی خطبہ پیش کیا حالانکہ جامعہ کا قیام ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں عمل میں آچکا تھا لیکن جون ۱۹۲۵ء میں بعض مصلحتوں کے تحت جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کر دیا گیا۔

عام طور پر مولانا پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ایسے تعلیمی ادارے قائم کئے جن میں صرف مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ اپنی ایک تقریر میں مولانا نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا مقصد مسلمانوں کو صرف فنی تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ وہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کرنے کے خواہشمند ہیں، جو ہندوستانی عوام کو انگریزی سرکار کی ذہنی و روحانی گراوٹ سے نجات دلا سکیں۔

حالانکہ مولانا نے کبھی ماہرِ تعلیم ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا لیکن تعلیمی میدان، انکی دلچسپی اور توجہ کا خاص مرکز تھا اس لئے انھوں نے تعلیم کو بنیاد بنا کر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ تعلیم کو محض اپنے شوق اور دلچسپی کی وجہ سے کیریئر بنانا ہی کافی نہ تھا بلکہ اس کی ایک اہم وجہ وقت کی مانگ تھی جس سے مولانا بخوبی واقف تھے، جو معیارِ تعلیم کو جانچنے، جاننے اور سمجھنے کے لئے ایک ماہر کی سی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہندوستان کے تعلیمی نظام پر مولانا کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں جو ابتدائی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیمی منزلوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں سائنس، تاریخ و مذہب، ذریعہ تعلیم اور حرفہ وغیرہ کی تعلیم پر کھل کر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا بنیادی طور پر ایک جرنلسٹ تھے، قوم کا درد ان کے دل میں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح وہ خلقِ خدمت کر سکیں اور اس وقت تعلیم ہی وہ ذریعہ تھا جس کے تحت وہ قوم و ملک کی سچی خدمت کر سکتے تھے۔ عملی طور پر مولانا قوم کے دل میں انسانیت کا درد اور محبت پیدا کرنے کے لئے تعلیم کو از حد ضروری خیال کرتے تھے اور قومی تعلیم کی اس ضرورت کو انہوں نے اس وقت شدت سے محسوس کیا جب بیسویں صدی عیسوی کے

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

آغاز میں تقسیم بنگال کا سانحہ رونما ہوا۔ اس تحریک نے ایک بار پھر مولانا کو جھنجھوڑ دیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ مستعدی سے قوم کو تعلیمی شاہراہ پر لانے کے لئے کوشاں ہو گئے۔

اس پوری تحریک کے دوران مولانا محمد علیؒ گاندھی جی حکیم اجمل خان، مختار احمد انصاری کے ساتھ ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کا دورہ کیا اور طالب علموں کو خطاب کیا کیوں کہ علی گڑھ کالج ہی وہ واحد جگہ تھی جو اس وقت مختلف تحریکوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔

جہاں تک مولانا کے تعلیمی نظریات و تفکرات کا تعلق ہے اس سلسلے میں مولانا کا خیال تھا کہ بنیادی تعلیم یا تو مادری زبان میں دی جائے یا علاقائی زبان میں۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ طالب علم کو اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز دلچسپی سے کرنا چاہئے اگر ایسا نہ ہو تو طالب علم کو مواد کو سمجھنے کے ساتھ زبان کو سیکھنے میں مزید دشواری ہو سکتی ہے جس سے طالب علم کی دلچسپی ختم ہو کر الجھن میں بدل جائے گی اور وہ تعلیم کو ایک بوجھ کی طرح اٹھائے گا۔ حالانکہ مولانا ہندوستانی زبانوں کی اہمیت سے واقف تھے لیکن ثانوی تعلیم کے طالب علموں کے لئے وہ ہندوستانی کے علاوہ انگریزی تعلیم کو بھی ضروری خیال کرتے تھے کیونکہ جدید دور میں یورپی زبانوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں تھا۔ ان زبانوں کو نظر انداز کرنے کا مطلب جدید علوم کو نظر انداز کرنے کے مترادف تھا۔ ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں:-

"کوئی بھی یورپی زبان جیسے فرانسیسی
اور جرمنی زبان انگریزی زبان کے
ساتھ ساتھ پڑھائی جانی چاہیئے"

مولانا طالب علموں کے لئے صرف کتابی علم کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، بلکہ کتابی علم کے ساتھ ساتھ وہ "حرفے" یعنی ہاتھ کے کام کو بھی اہم سمجھتے تھے۔ مولانا کے خیال میں ہاتھ کا کام کرنے کی تربیت اور حرفے کی مہارت تعلیم کا ایک ضروری حصہ ہونی چاہئیں۔ دیہاتی اور قصباتی اسکولوں میں کاشت کاری کے جدید طریقے اور عملی تربیت کو بروئے کار لایا جائے۔ اس کے علاوہ حفظان صحت کے اصولوں کے ساتھ پھلوں اور سبزیوں کی کاشت آسانی سے کرنے کی جانب بھی توجہ مبذول کرائی جائے۔

لیکن چونکہ شہری اسکولوں میں کاشت کاری کی سہولت فراہم کرنا مشکل ہے اس لئے شہروں میں دوسری طرح کے حرفوں کو اپنایا جا سکتا ہے اور یہ اسکولوں کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کون سے حرفہ کی تربیت کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ جیسے علی گڑھ کے اسکولوں میں تالے بنانے کی صنعت کو تربیت کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے اس کے علاوہ اسٹینوگرافی، ٹیلرنگ و کڑھائی۔ جلد باندھنا، کپڑے سے مختلف چیزیں بنانا وغیرہ اپنائی جا سکتی ہیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ اگر طالب علم صرف کتابی علم پر ہی اکتفا کریں گے تو انہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لئے زیادہ وقت لگ سکتا ہے اور یوں بھی ہر تعلیم یافتہ انسان کو صرف سرکاری نوکری پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیئے بلکہ حرفے کی معلومات کی بنیاد پر کوئی کام چھوٹے پیمانے سے شروع کر کے اپنی محنت اور قابلیت سے آگے بڑھا جا سکتا ہے

چنانچہ اپنے تعلیمی نظریات کو مولانا نے تین درجوں میں تقسیم کیا تاکہ تعلیم کے مختلف درجوں میں تعلیمی اسکیم کی وضاحت ہو سکے۔

۱۔ بنیادی (پرائمری) تعلیم
۲۔ ثانوی (سکنڈری) تعلیم
۳۔ اعلیٰ (یونیورسٹی کی) تعلیم

بنیادی (پرائمری) تعلیم

اس سلسلہ میں مولانا کا کہنا تھا کہ بچوں کو کتابی علم سے زیادہ عملی تجربوں کی مدد سے پڑھانا زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اس طرح وہ پڑھنے سے زیادہ دیکھ کر زیادہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے LESSON PLAN اس مہارت سے تیار کیا جانا چاہیئے کہ بچوں کی رسائی آسانی سے مجوزہ سبق تک ہو سکے۔ کیونکہ مولانا ایک سچے اور باعمل انسان تھے اور انسانی زندگی میں مذہب کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کو بھی ضروری قرار دیا۔ طالب علم عقائد فقہ اخلاق اور سیرت جیسے مضامین پڑھ کر اپنے اندر ایک خاص عملی صلاحیت پیدا کر سکے۔

مولانا نے جہاں تک طلباء کی دینی تعلیم کو ضروری خیال کیا وہیں انہوں نے جدید علوم کو بھی نظر انداز نہیں کیا جب کہ ان کا کہنا تھا کہ دینی تعلیم اخلاق و کردار کو مضبوط بناتی ہے اور دنیوی علم شخصیت میں اعتماد پیدا کرتا ہے۔ اس لئے تعلیم کو کسی ایک علم کے حاصل کرنے تک محدود نہیں کرنا چاہیئے بلکہ دینی اور دنیوی تعلیم کا امتزاج ہی ایک مکمل اور متوازن شخصیت کی تخلیق کرتا ہے چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے جدید سائنس کی تعلیم کو بنیادی درجے میں بھی لازمی قرار دیا۔ اس کے علاوہ ریاضی کی تعلیم بھی ضروری خیال کی گئی۔ جدید سائنس اور علم الحساب کی تعلیم دینے کا مقصد تھا کہ طلباء اپنی روزمرہ کی زندگی میں آنے والے حساب کتاب کے مسائل از خود حل کر سکیں۔ اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس درجہ میں نفع نقصان اور سادے سوالات رکھے جائیں۔ رہا سوال جیومیٹری اور الجبرا کا تو وہ پرائمری درجہ کے لئے غیر ضروری ہے۔

پرائمری درجے میں چونکہ طالب علم کی عمر زیادہ سے زیادہ ۱۲ برس ہوتی ہے اس لئے اس عمر میں علم تاریخ کی تدریس کرتے وقت طلباء کو مختلف تحریکوں اور تاریخی واقعات کا علم تاریخی عمارتوں کے چارٹ یا تاریخی عمارتوں کی سیر کے ذریعے کرایا جائے تو یہ معلومات زیادہ پُراثر ہوگی اور یہ انداز طلباء کے ذہنوں پر ایک خوشگوار تاثر قائم کرے گا۔

• جغرافیہ پڑھانے کا مقصد اس درجے میں طلباء کو اپنے گرد و پیش کا ماحول، گاؤں، شہر، جھیل، سمندر، پہاڑ وغیرہ کی معلومات بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ ......
بچوں میں مزید دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ڈرائنگ کی کلاس بھی ضروری ہے اس سے بچے کے دل میں فنون لطیفہ سے دلچسپی پیدا ہوگی۔ اس کے علاوہ حرفے کی تعلیم اسی درجے سے دینی شروع کر دینی چاہیئے۔ خاص طور سے چرخہ کاتنا اور کھادی بُننا، جو گاندھی جی کے تعلیمی اصولوں میں سے ایک ہیں۔

ثانوی (سکنڈری) تعلیم

اس درجے میں تعلیمی معیار پرائمری کے مقابلے میں کچھ مختلف ہوتا ہے اس لئے تعلیم کے مقاصد اور معیار بھی مختلف ہوتے ہیں۔ پرائمری درجے میں طلباء کو اس انداز سے تدریس کی جاتی ہے کہ ان کی دلچسپی کے ساتھ ان کی علمی معلومات میں بھی اضافہ ہو سکے۔ اس درجہ میں بھی عربی اور قرآن پاک کی تعلیم ضروری ہے جس میں عربی ادب کو پڑھانے کے لئے عربی کی نظمیں بھی شامل کرنی چاہیئے۔
فقہ، عقائد۔ اور سیرت اسلامی کی تعلیم جس معیار پر دینی چاہیئے، اس پر جامعہ آج بھی عمل پیرا ہے۔ اس کے علاوہ یورپی زبانوں کی تعلیم بھی دینی چاہیئے جیسے انگریزی زبان ایک یورپی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، نصاب میں داخل کی جائے لیکن اسے ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائے اور اس درجہ میں جو مضامین طلباء کو پڑھائے جائیں انہیں علم الحساب، جیومیٹری، جغرافیہ، تاریخ، شہریت اور سیاسیات، معاشیات، سائنس، نفسیات، فنون لطیفہ اور اس کے علاوہ حرفہ کی تعلیم کو بھی شامل کیا جائے۔

باقی صفحہ پر

ڈاکٹر زمن راعش

اردو نظم : ایک تعارفی خاکہ

شعری زبان میں لفظ "نظم" دو حیثیت سے استعمال ہوتا ہے ایک تو "نثر" کے متضاد کے طور پر اور دوسرے صنف شاعری کے اعتبار سے۔ "نثر" کے مقابلے میں ہر وہ کلام جو شاعرانہ اوصاف کے ساتھ موزوں طور پر ہمارے سامنے آتا ہے اسے ہم نظم کہتے ہیں۔ اس طرح غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعہ اور دیگر تمام اصناف شعری نظم کے زمرے میں آجاتی ہیں، لیکن صنفی حیثیت سے نظم اس شعری تخلیق کو کہتے ہیں جو اپنے آپ میں پوری طرح مربوط اور موضوع کی وحدت رکھتی ہو۔

اردو غزل کا مطالعہ ہمیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ صنف غزل اردو شاعری کی نہ صرف قدیم ترین صنف ہے بلکہ اپنے تاریخی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ محبوب ترین صنف بھی رہی ہے، لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں غزل کی لخت لخت کیفیت نے جہاں ایک طرف اسے قابل ذکر حسن عطا کیا وہیں دوسری طرف بعض معاملات میں شعراء کے لیے پریشانی کا سبب بھی ثابت ہوئی۔ اس کا ہر شعر چوں کہ جداگانہ اور منفرد معانی و مفاہیم پیش کرتا ہے اس لیے اس میں کسی موضوع پر مربوط اور بھرپور گفتگو ممکن نہیں ہے۔ اردو میں شاید اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے غزل کے بااقتدار ہونے کے باوجود نظم کی طرف توجہ دی گئی بلکہ عہد بہ عہد اس کا قابل ذکر ارتقاء بھی ہوا۔ نظم اور غزل کا سب سے بڑا اور بنیادی فرق یہی ہے کہ غزل کا ہر شعر جہاں الگ الگ معنویت رکھتا ہے وہیں نظم کے تمام اشعار ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہوتے ہیں اور

پوری نظم میں افسانے یا ناول یا کسی قصّہ کی طرح کوئی ایک موضوع ہی دائرہ تحریر میں آتا ہے۔

ہیئت کے اعتبار سے نظم نے غزل کے مقابلے میں تین نمایاں تبدیلیاں اختیار کیں۔ اس طرح اردو نظم کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ پابند نظم ۲۔ نظم معرّیٰ ۳۔ آزاد نظم

پابند نظم :- پابند نظم دراصل ہیئت کے اعتبار سے غزل کی ہی دوسری شکل یا غزل کا ہی ایک بدلا ہوا لہجہ ہے۔ یہاں پر شاید یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ اگر غزل مسلسل کو پابند نظم کے ساتھ رکھا جائے تو دونوں کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو جائے گا۔ پابند نظم میں بھی غزل کی طرح ہی قوافی اور ردیف کے تقاضے پورے کیے جاتے ہیں۔ اس کا پہلا شعر بھی مطلع غزل کی طرح ہوتا ہے اور درمیان کے تمام اشعار میں غزل کی ہی طرح قافیہ پیمائی کی جاتی ہے بلکہ بہت سارے پابند نظموں میں تو مقطع کی رسم بھی پوری کی جاتی ہے۔ اردو نظم کے مطالعے کے دوران نظم کے جو ابتدائی نقوش ملتے ہیں وہ دراصل پابند نظم کی ہی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ چناں چہ نظیر اکبر آبادی کی پوری شاعری پابند نظم پر ہی مشتمل ہے۔

نظم معرّیٰ :- نظم معرّیٰ سے مراد وہ نظم ہے جس میں قافیہ اور ردیف کا التزام نہیں کیا گیا ہو اور وزن کو ملحوظ رکھتے ہوئے ردیف و قافیہ کی پابندی سے نظم کو آزاد کر دیا گیا ہو۔ چوں کہ نظم معرّیٰ کے ہر مصرعے میں ارکان کے نظم و ضبط کا خیال رکھا جاتا ہے اس لیے اس میں تسلسل کچھ زیادہ ہی پیدا ہو جاتا ہے اور یہی روانی اس کا نقطۂ شناخت بنتی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے حالاں کہ مسدّس کے فارم میں خود پابند نظم لکھی لیکن اس کے باوجود وہ نظم معرّیٰ کی پوری طرح وکالت کرتے نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری کی اصلاح کے تعلق سے اپنی شہرۂ آفاق تنقیدی کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" میں انھوں نے لکھا ہے:

> "یورپ میں غیر مقفّیٰ نظم کی بہ نسبت مقفّیٰ کا زیادہ رواج ہے۔ اگرچہ قافیہ بھی وزن کی طرح شعر کا حسن بڑھا دیتا ہے مگر قافیہ اور اس کی قیود اور ساتھ میں ردیف کی قید اظہار مطلب میں خلل ڈالتی ہے۔"

نظم معرّیٰ پر انگریزی کی BLANK VERSE کے اثرات آغاز میں تو بالکل ارادی اور شعوری تھے لیکن بعد میں ان کی حیثیت غیر شعوری اور غیر ارادی اثرات کی ہو گئی۔

آزاد نظم : پابند اور معرّیٰ نظموں کے مقابلے میں آزاد نظم نے زیادہ اجتہادی راستے اختیار کیے۔ آزاد نظم ایک بحر میں کہی جاتی ہے لیکن اس کے مختلف مصرعے ارکان کی کمی و زیادتی اختیار کرتے ہیں لہٰذا اگر ایک مصرعے میں آٹھ ارکان موجود ہیں تو دوسرے میں ۲، ۴ بھی ہو سکتے ہیں۔

ظاہری ہیئت کے اعتبار سے اردو نظم کی ان تین قابل ذکر تبدیلیوں کے ساتھ ہی گزشتہ چند برسوں قبل نمو پذیر ہونے والی چوتھی تبدیلی کا ذکر بھی یہاں پر شاید ضروری ہے کہ اب اس کا چلن بھی اردو نظم نگاری کا ایک اہم حصّہ بن گیا ہے اور بڑی تعداد میں شعراء اس نوعیت کی نظمیں کہہ رہے ہیں جن کا نام انھوں نے نثری نظم رکھا ہے۔ حالاں کہ شعراء کا ہی ایک طبقہ اسے شعری تخلیق کی حیثیت دینے سے انکار کرتا ہے، لیکن دوسرا طبقہ اس کی وکالت

فخرالدین ہاؤس، سنگر ٹولی، پٹنہ - ۴

کرتا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح قافیہ اور ردیف کی پابندی اور قید نظم کے لیے مناسب نہیں اسی طرح بحر اور وزن کی قید بھی نامناسب ہے۔

مذکورہ بالا تمام تر گفتگو کے پیش نظر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نظم فنی طور پر مستقل ارتقار پذیر رہی ہے اور موضوعاتی تنوع کا تو پوچھنا ہی کیا اس نے ہمیشہ عصری تبدیلیوں کو لبیک کہا اور اس فراخدلی کی وجہ سے اردو شاعری ہی نہیں بلکہ دنیا کی شاعری کا ایک اہم حصہ بن گئی۔

اردو شاعری میں نظم کا آغاز کافی تاخیر سے ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تاریخی اور تحقیقی طور پر یہ بات اب تک پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچ سکی ہے کہ صنف نظم کا آغاز ٹھیک ٹھیک کس صدی کی کس دہائی میں ہوا۔ کچھ محققوں کا خیال ہے کہ نظم کا آغاز بھی غزل کے آس پاس سے ہی ہو چکا تھا لیکن وہ ادبی رواج کے طور پر سامنے نہیں آئی تھی ویسے بھی اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ غزل کے علاوہ جو بھی اصناف شعری ہیں وہ نظم کے ہی ذیل میں آئیں گی تو یہ کہنا بہت مشکل نہیں رہ جائے گا کہ نظم کا آغاز اس وقت سے بہت پہلے ہوا جس کا اندازہ ہم تحقیقی طور پر پیش کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ جہاں ایک طرف نظم کے ابتدائی نقوش کی تلاش دکنی دور میں بھی کی جا سکتی ہے اور دکنی شعرار کی مثنویوں میں نظم کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، وہیں دوسری طرف خود صوفیائے کرام کے یہاں بہت ایسے متفرق مصرعے مل جاتے ہیں جنھیں ہم غزل نہیں کہہ سکتے ہاں مختصر نظم کا نام ضرور دے سکتے ہیں، جب کہ قلی قطب شاہ کے علاوہ دہلی کے ابتدائی دور میں لکھی گئی فائز اور حاتم کی بھی نظمیں ملتی ہیں لیکن یہ بات بہرحال مستند اور پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اردو نظم کی باضابطہ ابتدار نظیر اکبرآبادی سے ہوئی۔

نظیر اکبرآبادی نے اردو نظم کو اعتبار اور اعتماد بھی عطا کیا اور اسے بحیثیت صنف ایک بلند مرتبہ بھی۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ عوام الناس کو شاعری سے شاعری کو عوام سے پوری طرح جوڑ دیا اور اپنی نظموں کے ذریعہ نہ صرف نظم کے اعلا نمونے پیش کیے بلکہ اخلاق، حب الوطنی، اتحاد انسانیت، قومیت، تہذیبی روایات، سیکولرزم اور صوفیانہ آہنگ کے بھی نہ مٹنے والے نقوش ہمارے سامنے پیش کیے۔ نظیر سے ہی اردو نظم کا باضابطہ ارتقار بھی شروع ہوتا ہے جو اپنے عرصہ وجود کے لحاظ سے خاصہ تیز نظر آتا ہے۔ اردو نظم نے اپنے اس ارتقائی سفر میں تجربے اور اجتہاد کی انگنت منزلیں بھی طے کیں اور روایت کی پاسداری بھی کی۔

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کا عہد خاص اہمیت کا حامل ہے۔ غدر کے بعد ملک کے نظام حیات میں مختلف قسم کی تبدیلیاں مختلف شعبوں میں ہوئیں۔ اس انقلابی لہر نے ادب کو بھی متاثر کیا لہٰذا اردو ادب میں ایک پورا گروپ ابھر کر سامنے آیا جس میں شاعر بھی تھے، ناقد بھی، افسانہ نگار بھی، ناول نگار بھی، مزاح نگار بھی اور مورخ، محقق، مفکر بھی۔ اس گروپ میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کا نام شاعر اور خصوصاً نظم نگار کی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے۔ ان دونوں حضرات نے وقت کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ نظر رکھا اور اپنی نظموں کے ذریعہ نہ صرف اپنی باتیں کہیں بلکہ لوگوں کے دلوں کے تاروں کو بھی چھیڑا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اردو نظم نے قابل ذکر کارنامے انجام دیے اور اسی وقت یہ بھی ہوا کہ باضابطہ مشاعروں کے لیے شعرار کو نظموں کے موضوعات دیے گئے اور شعرار نے انھیں موضوعات پر مشاعروں میں نظمیں پڑھیں۔

آزاد اور حالی کے بعد کا عہد بھی اردو نظم نگاری کے تناظر میں خاصہ اہمیت کا حامل رہا ہے اس عہد میں اسماعیل میرٹھی، عظمت اللہ خان اور دیگر اہم حضرات کے علاوہ اکبر الٰہ آبادی نے اپنے مخصوص رنگ و آہنگ کے ذریعہ اردو نظم کو بام عروج پر پہنچایا۔ اس عہد میں بعض تجربات بھی ہوئے قافیوں اور ردیف کی پابندی سے مبرا نظمیں بھی لکھی گئیں اور دیگر زبانوں کے ترجمے بھی اردو میں کیے گئے۔ اکبر الٰہ آبادی کو اس سلسلے میں خصوصی اہمیت اس لیے بھی حاصل ہے کہ انھوں نے موضوع اور اسلوب دونوں سطح پر انتہائی بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ سخت رخ اختیار کیا۔ اس طرح ان کی نظموں میں صرف مغربیت کے کریہہ اصولوں اور نظام زندگی کی دھجیاں اڑائی گئیں بلکہ اپنی مذہبی تعلیم، معاشرت، تہذیب اور روایات کے سلسلے میں علم حمایت بھی بلند کیا گیا۔ اکبر نے ان سب کے ساتھ ساتھ اردو نظم کو پہلی بار ایک نیا رنگ اور آہنگ بھی عطا کیا۔

اکبر الٰہ آبادی کے بعد اور ترقی پسند شعرار کے سامنے آنے سے قبل تک اردو نظم کے اہم ترین شاعر کی حیثیت سے جو نام سامنے آتے ہیں ان میں سر محمد اقبال، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، سیماب اکبرآبادی اور مولانا صفی وغیرہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان سب میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت علامہ اقبال کو حاصل رہی۔ اقبال، غالب کے بعد اردو کے دوسرے بڑے شاعر تھے جو شاعر کے ساتھ ساتھ ایک بڑے فلسفی اور مفکر بھی تھے۔ انھوں نے تاریخ، تہذیب، فلسفہ اور افکار عالم کا جو مطالعہ کیا اس نے ان کی شاعری خصوصاً نظم نگاری پر اپنے زبردست اثرات مرتسم کیے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جو فلسفہ خودی پیش کیا، اس نے اقبال کو بھی عظمت و بلندی عطا کیا اور اردو شاعری کو بھی ملی اور وطنی موضوعات پر لکھی گئی اقبال کی نظموں کو شہہ کار کی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور ترقی پسند خیالات و نظریات کی تبلیغ کو خصوصیت کے ساتھ مقصدِ ادب بنایا گیا تو دیگر اصناف شعر و نثر کے ساتھ ساتھ اردو نظم بھی نئے اسلوب و آہنگ اور قدر سے موضوعات سے بھی نبرد آزما ہوئی اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اردو نظم کو بلند آہنگی حاصل ہوئی، جوش ملیح آبادی جن کے یہاں مارکسی فلسفے یا اشتراکی فکر کا گہرا اثر موجود تھا، ان کی نظموں میں پوری طرح ابھر کر سامنے آیا، انھوں نے سیاسی اور انقلابی نظمیں لکھیں۔

اقبال کے بعد اور جوش کے ہی ساتھ ساتھ نظم کا جو لیک اور بانکا سجیلا شاعر سامنے آیا وہ فیض ہے۔ فیض کے علاوہ مشہور ترین اور اہم ترین نظم نگار شعرار میں اختر شیرانی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجاز، جمیل مظہری، اختر الایمان، معین احسن جذبی، مخدوم محی الدین، علی جواد زیدی، تصدق حسین خالد، ن۔م۔ راشد اور میراجی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء کے درمیان ادب کی سطح پر ترقی پسند خیالات و نظریات اور اس سے متعلق تحریک تقریباً اپنا بستر سمیٹ لیتی ہے اور تب ایک نئی فکر سامنے آتی ہے جسے ہم جدیدیت کا نام دے سکتے ہیں۔ اسی نئی فکر کے زیر اثر اردو نظم نگاری کے میدان میں جو شہسوار ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں خلیل الرحمن اعظمی،

باقی صفحہ ... پر

مارکسی تنقید — حقیقت و ماہیت

عہد بہ عہد رجحان کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادبی نظریات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ یونان قدیم سے دورِ حاضر تک خیالات کا یہ اختلاف نظر آتا ہے۔ کبھی ادب کے اخلاقی پہلو پر زور دیا گیا اور کبھی اسے صرف "ادب برائے ادب" سمجھا گیا اور کبھی "ادب برائے زندگی" کے تصور کو عام کرنے کی کوشش کی گئی۔ شعر و ادب کی افادیت کے حامیوں نے ادب کو حیاتِ انسانی کے لئے مفید اور رہنما قرار دیا اور زندگی سے ادب کے رشتے کو ہموار اور استوار کرنے پر قوت صرف کی۔ شعر و ادب سے متعلق نظریات کا یہ اختلاف شروع سے رہا اور بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ جاری بھی رہے گا۔ اسی اختلاف نے نقد و انتقاد کے مختلف دبستانوں کو بھی جنم دیا اور تنقید کے مختلف اصول و نظریات متعین کئے۔ "مارکسی تنقید" بھی اسی ردّ و قبول کی صورت میں سامنے آئی اور اس نے ادب کی نئی تفہیم و تعبیر پیش کی۔ مارکسی تنقید جن اصولوں پر مبنی ہے اس کے جاننے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہمہ گیر اصول و نظریات کی حامل ہے اور اس نے بدلتے ہوئے وقت اور تقاضے اور ادبی معاشرتی قدروں کا ساتھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تنقیدی دبستان نے ہمہ گیر اثرات مرتب کئے ہیں۔

مارکسی تنقید نے ادب کو نئی معنویت اور نئی سمت و راہ سے متعارف کرایا اور ادب کی جانچ پرکھ کے ایسے پیمانے بنائے جس کے ذریعہ ادب اور زندگی کا رشتہ زیادہ مستحکم اور مزید استوار ہوا۔ اور ادب کا منصب و منشاء یہ قرار دیا کہ زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے میں مددگار و معاون ثابت ہو اس کے لیے مارکسی تنقید نے ادب کو زندگی کے وسیع تر پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ زندگی کی پیچیدگیوں اور تہہ در تہہ حقیقتوں تک پہنچنے کے لیے تاریخی، سماجی، سیاسی، اقتصادی اور طبقاتی حوالے سے مطالعہ کی روایت قائم کی۔ اس طرح جہاں مارکسزم نے افادی نقطۂ نگاہ سے ادب کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی وہیں ادب کے حُسن و لطافت و نزاکت کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے مواد، ہیئت، لفظ و معنیٰ اور جمالیاتی اقدار و معیار سے متعلق بھی باتیں کیں۔ مارکسی تنقید کے ان اصول و نظریات سے ادب کی افادیت و معنویت میں قابل قدر اضافہ ہوا جس کا اثر ادبیاتِ عالم پڑنا ناگزیر تھا بالخصوص اُردو ادب نے تو بہت حد تک اس کے اثرات کو قبول کیا۔

مارکسزم ایک فلسفۂ حیات ہے جس نے معاشرے اور سماج کے اقدار و تصورات میں انقلاب انگیز تبدیلیاں پیدا کیں ساتھ ہی اس فلسفۂ حیات نے ادب اور تنقید کے نظریات و افکار کو مفید اور بیش قیمت تبدیلیوں سے ہمکنار کیا۔ مارکسزم کے نظریات و تصورات کے حوالے سے جن ادبی اقدار و معیار کی بات کی جاتی ہے اسے مارکسی تنقید کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مارکسی تنقید دراصل ادب و فن کو تاریخی حیثیت، طبقاتی کشمکش، مادی جدلیت اور پیداواری رشتوں کے حوالوں سے دیکھنے کا نام ہے۔ مارکسی تنقید ادب میں جہاں موضوع مواد اور فکر کو اہمیت دیتی ہے وہیں ادبیت کے حُسن اور جمالیاتی لطف و انبساط کو بھی ملحوظ رکھتی ہے۔ چونکہ مارکسی نظریے کی رو سے ادب زندگی کے لئے ہوتا ہے جو زندگی کے نہ صرف اعلیٰ اقدار و معیار اور صلاح و اصلاح کی بات کرتا ہے بلکہ زندگی کو سنوارنے کی راہ بھی ہموار کرتا ہے۔

مارکسزم ادب کی تنقید کو زندگی کی تنقید بتاتا ہے مارکسزم کے نزدیک ادب سماجی شعور کا حصہ ہے۔ مارکسزم کے نزدیک انسانی زندگی کا نظام مادی ہے اور یہی مادی زندگی کا نظام پیداوار انسان کی سماجی و ذہنی کیفیتوں کا تعین کرتا ہے اس بات سے ظاہر ہے کہ ذہن پر جو اشیاء اپنا اثر ڈالتی ہیں یعنی جس سماجی یا طبقاتی کشمکش کا ادیب یا فنکار شکار ہوگا اس کی جھلک اس کی تخلیقات میں آئے گی لیکن ان باتوں سے ہرگز یہ مراد نہیں لینا چاہئے کہ مارکسزم صرف نظریات کی بنیاد پر ہی ادب کی پرکھ کرتا ہے۔

مارکسزم نہ صرف زندگی کی اصلاح کی بات کرتا ہے بلکہ عملی طور پر بھی اسے بہتر سے بہتر بنانے کی بھی کوشش کرتا ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب ادب میں صداقت اور عصری حیثیت موجود ہو، انہیں عناصر کی تلاش و جستجو میں مارکسی نظریے کے علمبردار ادب کی تخلیق کے محرکات، حقیقت کی نوعیت، اظہار کے طریقے اور اس کی افادیت سے متعلق مختلف زاویوں اور پہلوؤں اور سائنسی طرزِ فکر سے اس کو پرکھتے ہیں اور جانچتے ہیں۔ مارکسزم کی رو سے اچھا آرٹ وہ ہے جو صداقت کے ساتھ ساتھ حقیقت کی واضح عکاسی کرے کہ جس میں مثبت طور پر جمالیاتی عناصر موجود ہوں۔

مارکسی نظریاتِ ادب نے ادب کو ہمہ گیری عطا کی اور اسے زندگی کی حقیقتوں کا ترجمان بنایا۔ مارکسی نقاد ادب و زندگی کے رشتے کو نہ صرف استوار کرنا چاہتے ہیں بلکہ اسے مستحکم تصور بھی دینا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ادب کے مسائل میں عموماً یہ باتیں کہی جاتی رہی ہیں کہ ادب کا زندگی سے قریبی تعلق ہے، یا ادب کا زندگی سے رشتہ لازم و ملزوم ہے لیکن مارکسی نقطۂ نظر ادب و زندگی کے اس رشتہ کو نئی معنویت عطا کرتا ہے۔ مارکسزم صرف اتنا کہنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ ادب کا زندگی سے گہرا رشتہ ہے بلکہ مارکسزم ادب و سماج کے دوسرے رشتے کو بھی دیکھتا ہے۔ مثلاً ادب سماج کو متاثر کرتا ہے اور سماج ادب کو۔ اور یہ دونوں اثرات عمل اور ردِّ عمل کے ایک سلسلے کو جنم دیتے ہیں۔ ایک صحیح مارکسی نقاد ادب کو محض سماج کا مجہول عکس قرار دینے کی غلطی نہیں کرتا چونکہ ادب پر جو اثرات پڑتے ہیں وہ ایک طرف تو سماج کے ہوتے ہیں تو دوسری طرف خود ادبی روایات کے بھی ہوتے ہیں گویا ان میں مادی و فکری دونوں عناصر ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

اس تصور سے ادب کے سلسلے میں ایک اہم بات

۱۷۲، سابرمتی ہاسٹل، جے۔ این۔ یو، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

یہ سامنے آتی ہے کہ ادب کے جو تخلیقی محرکات ہوتے ہیں وہ ہمارے ہی سماج کے ارد گرد کے حالات و واقعات ہوتے ہیں اور یہ تمام کوائف و عوامل دراصل مادّے سے نمو پذیر ہوتے ہیں اور مادّے ہی کے سبب اس میں نشیب و فراز اور بتدریج تبدیلیاں آتی ہیں۔ اس طرح سے مارکسی نقطۂ نظر میں فلسفۂ مادیت کو اساسی اہمیت حاصل ہے چونکہ مارکس اور ان کے حامیوں نے مادّے ہی کو اشیاء کے مظاہر کا سبب مانا ہے۔ مارکس اور اینگلس نے انھیں رموز و اسرار کے پیش نظر مادّے کی اوّلیت کو، اس کی حرکت اور آپسی کشمکش کو بیان کیا ہے۔ اس آپسی کشمکش سے ہمیشہ ایک نئی صورت پیدا ہوتی ہے جو پہلے کی صورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ عمل ایک تاریخی عمل ہے اور ایک متواتر عمل ہے جو ہمیشہ متحرک ہے اور نئی نئی صورتوں میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مادّے کی اوّلیت کے باوجود مارکسی ناقدوں نے خیال کی قوت اور فرد کی کارکردگی اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا ہے۔ مارکسی نظریات کے تحت ہمارے سارے خیالات و تصوّرات مادّی زندگی یا ماحول سے پیدا ہوتے ہیں اور چونکہ خیالات اور تصوّرات کا دامن اتنا وسیع ہے کہ آرٹ کے تمام مظاہر اس میں آجاتے ہیں۔ لہٰذا ادب کی تخلیق بھی انھیں مادّی اثرات کے تحت ہوتی ہے۔

چونکہ ادب انسان کے جذبات و خیالات کا نام ہے اور اس کے خیالات و جذبات کی بنیاد تجربات ہوتی ہے جب ہم ادب کے لئے یہ بات کہتے ہیں تو اس کا سلسلہ زندگی اور اس کے مادّی حالات اور عوارض سے مل جاتا ہے، کیونکہ ادب و فن کا ارتقاء خلاء میں وجود رکھنے والا خود مختار عمل نہیں ہے۔ اس کی تخلیقات انھیں روایات و سماجی ماحول سے وابستہ ہوتی ہیں جن میں وہ سانس لیتا ہے۔ جن حالات سے اس کی زندگی دوچار ہوتی ہے اس کے نقوش خیالات کے ذریعہ ادب میں دکھائی دیتے ہیں۔ مارکس اس لئے خیال و عمل کی مطابقت پر زور دیتا ہے۔ ادب چونکہ خیالات و جذبات کا اظہار ہے لیکن ساکن و جامد تصوّرات کا اظہار نہیں بلکہ لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے معاشرتی نظام، تہذیبی ابتداد، اور سماج کے ارتقاء کا ایک جزو ہے سجاد ظہیر نے ان خیالات کو اس طرح ظاہر کیا ہے۔

> "فنکار کی تخلیق اسی روایت اور اسی
> سماجی ماحول سے پیدا ہوتی ہے جو انھیں
> ورثہ میں ملتی ہے اور جس میں ان کی
> تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ وہ مسائل
> فنکاروں اور ادیبوں کو بھی درپیش
> ہوتے ہیں جو ایک خاص عہد یا
> موقعہ پر کسی قوم کو خاص طور پر یا نوع
> انسان کو عام طور پر پیش ہوتے ہیں"[1]

اس طرح ادب کو اس زمانے کے سماجی، سیاسی و مادّی پس منظر میں دیکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس پر کوئی پابندی عائد کر دی جائے یا اسے سماج کے متنازعہ گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے بلکہ اس کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ادب میں دلچسپی رکھنے والے اس کی صحیح قدروں کو آسانی سے سمجھ سکیں اور دیکھ سکیں کہ فنکار میں کتنی گہرائی و صداقت ہے اور اس کے ذہنی رجحانات کن سماجی طاقتوں سے قوت حاصل کر رہے ہیں۔ جس طرح ایک عام آدمی خارجی اسباب و حالات سے متأثر ہوتا ہے اسی طرح ایک فنکار بھی اثر قبول کرتا ہے اس لئے ادب کو زندگی کا آئینہ کہا گیا ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ مارکسی نظریۂ تنقید نے ادب کو زندگی کا حقیقی ترجمان بنایا اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو ارتقائی صورت اور اس کے نتیجے میں ہونے والے تغیّر و تبدّل کے تناظر میں دیکھا ہے۔ اس لئے مارکسی تنقید محض زندگی کی حقیقتوں کو جامد و ساکت بنا کر پیش نہیں کرتی بلکہ اس حقیقت میں بھی تبدیلی کے عمل کو ملحوظ رکھتی ہے اور اس کے مختلف الجہات پہلوؤں کو کسی فوٹوگرافر کی آنکھ سے نہیں دیکھتی جو ظاہری سچائیوں کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ مارکسی تنقید خارجی عوامل کے ساتھ ساتھ داخلی عوامل کی تلاش و جستجو بھی کرتی ہے کیونکہ ظاہر میں نظر آنے والی شئے باطن میں اپنے ظاہر سے مختلف بھی ہو سکتی ہے لہٰذا کسی حقیقت کے ادراک، اس کی تفہیم کا مناسب و بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ خارجی و داخلی عوامل و محرکات کو بھی مدّنظر رکھا جائے اور مارکسی تنقید کا طریقۂ کار یہی ہے۔

اس اعتبار سے اگر اس دبستان کے اصول و نظریات کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مارکسی تنقید نے ادب کی افہام و تفہیم کے لئے ایسے سائنٹفک اصول مرتب کئے جو نہ صرف زندگی سے ادب کے رشتہ کو مضبوطی کے ساتھ جوڑتے ہیں بلکہ ادب کو زندگی کا ترجمان بناتے ہیں جو زندگی کے لئے رہنما بھی ہیں اور ادب کے بنیادی مقصد لطف و انبساط کی تسکین کا سبب بھی۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مارکسی نظریۂ تنقید ہمہ گیر اور دائمی اقدار کا حامل ہے جس نے ادب کے افادی اور انبساطی دونوں پہلوؤں کا بخوبی احاطہ کیا ہے۔ ●

---

[1] "حیات" ہفتہ وار دہلی۔ جنوری ۱۹۴۶ء۔ ترقی پسند ادب تحریک اور اس کے متعارضین۔ سجاد ظہیر۔

بقیہ: بجلی کے شعبے میں نجی سرمایہ کاری

عدم موجودگی میں اس کام میں دلچسپی رکھنے والے نجی سرمایہ کاروں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ریاست اس سلسلے میں ضمانت لے اور حکومت ہند بھی کاؤنٹر ضمانت لے کہ وہ ریاستی بجلی بورڈوں کی ادائیگی کی ذمہ دار ہیں تاکہ پروجیکٹ کے لیے قرضہ دینے والے لوگ مطمئن ہو سکیں۔ حکومت ہند کی کاؤنٹر ضمانت کی اسکیم ایک عارضی اقدام کے طور پر شروع کی گئی تاکہ نجی سرمایہ کاری کو فروغ دیا جائے۔ غیر ملکی سرمایہ کاری کے لحاظ سے منظور کیے گئے آٹھ ابتدائی پروجیکٹوں کے لیے کاؤنٹر ضمانت دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان میں سے دو پروجیکٹوں کے سلسلے میں کاؤنٹر ضمانت کی دستاویز پر دستخط کیے جا چکے ہیں۔

چوں کہ کاؤنٹر ضمانت ایک عارضی اقدام ہے، لہٰذا ایسے متبادل طریقوں کو حتمی شکل دی جا رہی ہے جو اس اسکیم کے متبادل بن سکیں مثلاً ایچ ٹی صارفین کے لیے آئی پی پی کی طرف سے براہ راست بجلی فراہم کی جائے، ایک کھاتہ کھول کر صارفین کے ذمہ واجب الادا رقم کو اس میں جمع کرایا جائے۔ آئی۔ پی۔ پی کو رقم کی ادائیگی اس کھاتے سے ہوگی، مالیے اداروں کے ساتھ تال میل، ملی جلی کاؤنٹر گارنٹی، پی پی اے مع بجلی گرڈ کارپوریشن، بجلی کی تیاری اور تقسیم کے کام میں تال میل، عالمی بینک گارنٹی اسکیم وغیرہ۔

بجلی کے شعبے میں نجی شعبے کی شرکت کی پالیسی میں بجلی کی تقسیم اور ترسیل نیز اس کی تیاری کا کام شامل ہے۔ اتر پردیش میں نوئیڈا میں بجلی کی تقسیم کا کام حال ہی میں نجی کمپنی کو دے دیا گیا ہے۔ اڑیسہ میں دو شہروں میں بجلی کی تقسیم کی تجاویز کے سلسلے میں مفاہمت کے میمورنڈم پر دستخط کیے گئے ہیں۔ یہ تجاویز نجی کمپنیوں کو سونپنے پر غور کیا جا رہا ہے۔ بجلی کی تقسیم اور ترسیل کے کام میں نجی شعبے کی شرکت کی حوصلہ افزائی کے لیے حکومت تفصیلی رہنمایانہ خطوط وضع کرنے کے سلسلے میں کام کر رہی ہے۔

درحقیقت زراعت، صنعت وغیرہ جیسے مختلف شعبوں میں ہمہ جہت ترقی کے لیے بجلی کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔ ملک میں بجلی کی کٹوتی، کم وولٹیج وغیرہ کی شکایات عام ہیں۔ اسی لیے حکومت نے یہ پالیسی تشکیل دی ہے تاکہ نجی شعبے میں بجلی کے پروجیکٹ قائم کرنے کے سلسلے میں سرمایہ کاروں کی حوصلہ افزائی کی جا سکے اور بالآخر گھریلو استعمال نیز زراعتی و صنعتی کاموں کے لیے درکار بجلی کی مسلسل سپلائی کے حتمی مقصد کی تکمیل عمل میں آ سکے۔ ●

ادب اور انسانیت نوازی

ادب زندگی کے واسطے سے ارد گرد کے ماحول سے جڑا ہوتا ہے حالات، واقعات سیاسی اور سماجی آثار چڑھاؤ اس کے آئینے میں منعکس ہوتے رہتے ہیں۔ ہر عہد کا ادب اپنے دور کا آئینہ ہوتا ہے۔ حضرت امیر خسرو سے لے کر تیرھویں صدی کے صوفی شاعر اور موسیقار سے آج کے عہد تک کا ادب اسی طرح زمانے کا تجزیہ و تبصرہ کرتا رہا ہے۔

ادب کا تعلق واقعہ کے شخصی ردعمل سے ہوتا ہے۔ ادب عام آدمی کی ترجمانی اپنی آب و تاب سے حاصل کرتا ہے عہد بہ عہد بدلتی ہوئی انسانی قدروں سے اکتساب نور کرتا ہے یہ انسانوں کو مذہبی اقتصادی اور ذات پات کے خانوں میں بانٹنے کے بجائے اکائی کے روپ میں دیکھتا دکھاتا ہے۔ ہر عہد کا ادب اسی رویے کا حامل رہا ہے یہ زندگی کا اس کی تمام وسعتوں کے دائرے میں اظہار کرتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے وابستہ عقیدتمندوں میں ایک نام حضرت امیر خسرو کا بھی ہے۔ امیر خسرو تاریخ کے اس موڑ پر ملتے ہیں جہاں کھڑی بولی کا جس کی دو بیٹیاں ہندی اور اردو ہیں دراصل یہ دونوں ماں جائی بہنیں ہیں گرچہ لب و لہجہ اور خدو خال میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلا خوب صورت تجربہ ہے ان کی ایک غزل میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو اس طرح سمویا گیا ہے کہ غزل کے مصرعوں میں آدھا مصرعہ فارسی میں ہے اور آدھا ہندوستانی میں جیسے

زحال مسکیں مکن تغافل، دورائے نیناں بنائے بتیاں

اس طرح گولکنڈہ کے تاجدار سلطان قلی قطب شاہ اکبر کے عہد میں اس تہذیبی وراثت کے وارث ہیں جو ہند اسلامی میل جول کا نمونہ ہے۔ اس کے دور حکومت میں آپسی بھید بھاؤ کی کوئی گنجائش نہیں وہ بیک وقت تیلگو، اردو اور فارسی کا شاعر تھا اسے اپنی ماں کی کوکھ سے ہندوستانی کلچر کا احساس ملا تھا اس میں اس نے اپنے والد کے اسلامی عناصر کو شامل کیا تھا اس کا ایک شعر ہے

نبی صدقے بسنت کھیلا قطب شاہ
رنگیلا ہو رہا ترلوک سارا

محمد قلی قطب شاہ کے بعد ولی اورنگ آبادی نے بھی اپنی محبوبہ کو کبھی موہن کبھی رادھا اور کبھی محبوب کے ناموں سے پکارا ہے وہ اورنگ زیب کے عہد میں زندگی کا نغمہ نگار ہوا ہے اس کی نظر ہر بھید بھاؤ سے دور انسان کو انسان کے روپ میں پہچانتی ہے اس کا ایک شعر ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

کبیر داس نے بھی ہندو مسلم دونوں کے مصنوعی رجحانات پر کڑی تنقید کی ہے۔

"موکو کہاں ڈھونڈے بندے میں تو تیرے پاس میں
نہ دیول نہ مسجد نہ کاوے کیلاس میں"

ڈاکٹر اقبال نے کبیر داس ہی کی طرح موجودہ عہد میں ایک ایسی عبادت گاہ کا تصور پیش کیا جس کی تعمیر میں محبت، انسانیت اور خلوص کا اینٹ گارا تیار کیا گیا تھا جس میں پیار شامل تھا۔ انھوں نے اپنی نظم "نیا شوالہ" میں ہندو مسلم دونوں کے مصنوعی مذہبی رجحانات پر کڑی تنقید کی ہے

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

اس طرح عہد بہ عہد اردو شاعر صوفیوں سنتوں کے پیغامات اور ان کی بانیوں کو اپنی منزل بناتے رہے ہیں۔

شمالی تہذیب کے اولین شعراء میں سے ایک فائز دہلوی کی "پنگھٹ" ہندوستان کے اصلی تناظر کو پیش کرتی ہے۔ اردو کے شاعر کس قدر انسانیت نواز تھے اس کا اندازہ انیس کے مرثیوں سے ملتا ہے۔ واقعات کربلا کا پس منظر اگرچہ ملک عرب ہے لیکن انیس نے امام حسین کی صاحبزادی اور بھتیجے کی شادی کے موقع پر ہندوستانی رسوم بیان کی ہیں۔ صندل، مہندی، نتھ، کنگن اور سہرا خالص ہندوستانی سنگھار کی چیزیں ہیں۔ دولہا کے سر پر بہنوں کا آنچل ڈالنا خالص ہندوستانی رسم ہے — انیس فرماتے ہیں

بہنیں کدھر ہیں ڈالنے آنچل نبے پہ آئیں
اب دیر کیا ہے حجرے سے باہر دولہن کو لائیں

انقلاب زندہ باد کا نعرہ اردو ہی نے

مدھو ساگر انند، ۱۰۹ پروکٹر روڈ، نزد گرانٹ روڈ اسٹیشن، بمبئی ۷....۴۰۰

ہماری جنگ آزادی کو: یا جس کا آج بھی استعمال اتنا ہی ہو رہا ہے جتنا ۱۹۴۷ء سے قبل ہوا کرتا تھا۔ انسانیت نوازی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اردو نے ہمیں اتنا خوبصورت معنی خیز نعرہ دیا۔

ایک مصنف کا خیال ہے کہ "... تمام تاریخ کے تذکرے گم کر دیے جائیں اور صرف اردو لٹریچر باقی رہ جائے تو آپ ہندوستان کی عہد بہ عہد مسلسل تاریخی کڑیوں کو جوڑ سکتے ہیں اور آپ کو صرف اردو کے ذریعہ ہندوستان کی مکمل تاریخ سے آگاہی ہو سکتی ہے۔"

سکندر علی وجد نے کیا خوب کہا ہے۔

سیاہ دور غلامی خیال و خواب ہے آج
بلند عظمت انسان کا آفتاب ہے آج

برسات ہندوستان کا خوب صورت ترین موسم مانا جاتا ہے۔ روح کو گدگدانے والا یہ موسم کیسی کیسی یادوں کو پکڑ پکڑ کر لاتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ان یادوں کو شربت کی مانند پیتے رہیں۔ اس لیے جہانگیر نے اپنی کتاب "تزک جہانگیری" میں لکھا ہے کہ "برسات ہی ہندوستان کا موسم بہار ہے۔"

دکن کے ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اپنی کتاب "نورس" کے ایک گیت میں لکھا ہے۔

"ہندوستان کی مثالی عورت برسات کی مانند ہے کیوں کہ اس کے دانت دنیا کو روشن کرنے والی بجلی ہیں۔ رنگ برنگ لباس بادل معلوم ہوتے ہیں اور پسینہ گھنگھور گھٹا ہے جو برس رہی ہے جسم کے بادل پودے ہیں اور جوانی پھل کی طرح ہے۔"

میر تقی میر نے تقریباً ۳۰ مثنویاں لکھی ہیں جن میں چار مثنویاں برسات کے بارے میں ہیں جیسے

رُت ہے برسات کی بہت پیاری
موج زن جھیلیں ندیاں ساری
کھیت دھانوں کے لہلہے شاداب
کر رہے ہیں نظر کی دلداری

نظیر اکبر آبادی کی وہ واحد شخصیت ہے جس نے ہندوستانی موسموں، تہواروں اور ہندوستان کے ہر حسن کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ جیسے

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھم جھماہٹ قطرات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اور اختر شیرانی کی یہ نظم بھی اسی جذبے کی حامل ہے:

او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا
کس حال میں ہیں یاران وطن
آوارۂ غربت کو بھی سنا
کس رنگ میں ہیں کنعان وطن

مولانا عبدالحق بابائے اردو نے اپنے خطبات میں لکھا ہے کہ "اردو کی تنظیم و ترتیب میں اگر ہندوؤں کی شرکت نہ ہوتی تو یہ وجود ہی میں نہ آ سکتی تھی۔" علامہ شبلی نعمانی کی نظم کا یہ شعر سنیے۔

دلھن کی پالکی لائے تھے جو خود اپنے کاندھوں پر
وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھے

(یہ شعر جودھا بائی کی وداع کے بارے میں ہے)

فراق گورکھپوری نے لکھا ہے:

"ہماری اردو زبان میں کتنی وسعتیں اور کتنے بڑے امکانات پیدا ہو جائیں گے اگر اردو لغت میں دو ڈھائی ہزار سنسکرت الفاظ کا بھی اضافہ ہو جائے کتنی قوت دور رسی کتنی جہتیں اور کتنی جھلکیاں اور پرچھائیاں کتنا رس کتنا سگندھ کتنا رچاؤ، کتنا سگھڑپن، کتنی نئی گونجیں، کتنی خوش تدبیریں، کتنا تموج اور ٹھہراؤ کتنی لوچ اور لچک اردو میں پیدا ہو جائے گی اگر سنسکرت الفاظ کی کرنوں کی کھنک بھی غزل فارسی اور ہندی الفاظ کی کھنک رس اور جھنکار کے ساتھ سازِ اردو سے سنائی دینے لگے۔" واجد علی شاہ کے عہد میں امانت کے منظوم ڈرامہ اندر سبھا میں بھی ہندوستانی جھلک نظر آتی ہے۔

جان نثار اختر کی رباعیوں کے مجموعے "گھر آنگن" میں ہندوستانی تہذیب کی دھوپ حسن اور روپ سبھی کچھ ملتا ہے۔

ہندوستانی آنگن کی مٹی سونگھنے کے تصور ہی سے ہر شاعر اور ادیب زندہ ہے اس کا اندازہ جان نثار اختر کے ان اشعار سے آپ لگا سکتے ہیں ۔

یہ تیرا سبھاؤ یہ سلیقہ یہ سروپ
لہجے کی یہ چھاؤں گرم جذبوں کی یہ دھوپ
سیتا بھی شکنتلا بھی رادھا بھی تو ہی
یگ یگ سے بدلتی چلی آئی ہے روپ

اسی طرح علی سردار جعفری، ندا فاضلی، شہریار کے علاوہ اور دوسرے شاعروں نے بھی ہندوستان کے مشترکہ کلچر اور انسانی محبت کا اپنے کلام میں درس دیا ہے۔ ندا فاضلی نے کیا خوب کہا ہے ۔

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلو یوں کر لیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

شہریار کا ایک شعر ہے ۔

گھر کی تعمیر تصور میں ہی ہو سکتی ہے
میرے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

ادب سیاستوں کی طرح سرحدوں کی تقسیم کا شکار کبھی نہیں ہوتا وہ ہر تقسیم سے بالا ہو کر انسان کا رشتہ تمام عالم کے انسانوں سے جوڑتا ہے یہ وہی فلسفہ ہے جسے قرآن حکیم میں ربّ العالمین کی اصطلاح سے ظاہر کیا گیا ہے۔

مرزا غالب کو اپنے وطن سے کتنا پیار تھا حالاں کہ وہ اپنے وطن میں نادار اور محتاج بن کر رہ گئے تھے۔ ان پر ان گنت قرض کی تلواریں لٹک رہی تھیں لیکن انھیں اس ملک سے پیار تھا جس کی جھلک اس قطعہ میں ملتی ہے جس کا پہلا شعر ہے ۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال تھا کہ غالب نے کلکتہ کی تعریف اس لیے کی تھی کہ انگریزوں کی پسند کو اپنی پسند دینا چاہتے تھے لیکن یہ صحیح نہیں۔ غالب ۱۸۲۸ء سے ۱۸۳۰ء تک کلکتہ میں رہے اس وقت کلکتہ واقعی جنت البلاد تھا مولانا آزاد اور کوثر چاند پوری نے جن تصانیف کا حوالہ دیا ہے وہ اس وقت کی ہیں جب کلکتہ گنجان آبادی کے سبب بیماریوں کا گھر بننے لگا تھا۔ گارساں دتاسی نے لکھا ہے ان کے خطبات کا یہ جملہ ملاحظہ فرمائیے "اس عہد میں ہندوستانی مسلمان بنگال کو جنت البلاد ہی کہتے تھے۔"

بہرکیف غالب کو شہر کلکتہ سے واقعی انس

باقی صفحہ [illegible] پر

خاندانی منصوبہ بندی

(مزاحیہ)

دنیا میں خاندانی منصوبہ بندی کا رواج بہت دیر سے شروع ہوا اور اب بھی دنیا کے کئی ایسے علاقے ہیں جہاں یہ شروع ہی نہیں ہوا ہے۔ اس کی تحریک وہاں ضرور پہنچی ہے لیکن رواج نہیں پہنچ پایا ہے اور کچھ ملک ایسے ہیں جہاں اس کی نوعیت ثانوی تعلیم کی سی ہے۔ بے درودیوار خستہ عمارتوں میں کہیں تعلیم ہوتی ہے۔ اسی بدانتظامی (جسے اکثر لوگ طوائف الملوکی کہنا پسند کرتے ہیں) کی وجہ سے والدین کا بہت نقصان ہو رہا ہے وہ اقلیت ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہر گھر میں بچوں کی اکثریت ہے اس لیے والدین کی کچھ چل نہیں رہی ہے اور ظاہر ہے اس میں قصور بچوں کا نہیں ہے۔ وہ تو بعد میں آتے ہیں (اور پھر آتے رہتے ہیں) خود والدین کو ہوشیاری سے کام لینا چاہیے تھا۔ یوں تو قانون قدرت یہی ہے کہ والدین ان مراعات سے محروم رہیں جو اکثریت کے لیے مخصوص ہیں کیوں کہ تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی ملک میں والدین کو اکثریت حاصل ہوئی ہو۔ یہ شاید دنیا کی بقا کے لیے ضروری بھی تھا لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور والدین اگر جی جان سے چاہتے تو ان کی تعداد قدرے بہتر اور نتیجہ خیز ہو سکتی تھی۔ اس کی ترکیب یہ تھی کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کا حربہ استعمال کرتے اپنی عمر اور تجربہ کار ہونے کا فائدہ اٹھاتے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اتنی بڑی تعداد سے مقابلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس مقابلے میں فتح و شکست کا معاملہ بالکل طے شدہ بات ہے۔ "دلِ ناتواں" کو کوئی داد بھی نہیں دے گا۔ پاسبانِ عقل کی ایسے موقعوں پر رہنمائی اور رہبری کی ضرورت پیش آتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں اگر یہی صورتِ حال جو اس وقت ہے آئندہ بھی برقرار رہی تو دنیا جو پہلے ہی سے گول ہے غبارے کی صورت اختیار کر لے گی اور غبارے کی قسمت تو صرف پھوٹنا ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی اگر صحیح وقت پر شروع کی جاتی تو دنیا میں رونق اتنی نہ ہوتی جتنی اب ہے لیکن راہ گیروں کو راستہ چلتے وقت اتنے دھکے نہیں کھانے پڑتے۔ ہر جگہ قطار باندھ کر کھڑا نہ ہونا پڑتا۔ ۳۔۴ گھنٹے قطار میں کھڑے رہنے کے بعد جب آدمی "لب بام" پہنچتا ہے تو کمند اور کمر کے ٹوٹ جانے کی کیفیت سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ مدرسوں میں بچے فرنیچر پر بیٹھتے، ٹرینوں میں سفر کرنے کے لیے ریزرویشن حاصل کرنے کی صعوبت برداشت نہ کرنی پڑتی مطلب یہ کہ آرام و اطمینان کے ایسے کئی پہلو نکلتے اور آدمی کو ہر پہلو قرار آتا۔ کھلی فضا بہت اچھی چیز ہے اور فٹ پاتھ کی فضا بھی بہرحال کھلی مانی گئی ہے لیکن فٹ پاتھ رہائش کے لیے استعمال کی جگہیں ہماری اپنی وجہ سے ہو گئیں ورنہ نہ ان پر اتنی دوکانیں لگتیں نہ اتنے بستر کھلتے اور امن کے کسی محافظ کی آواز پر کھلنے سے پہلے ہی انھیں لپیٹ لینا پڑتا۔ یہ ساری برکتیں بربنائے رونق ہی تو ہیں۔

اس وقت صورت حال جو مستقبل کے لیے خطرناک ہے یہ ہے کہ ہر گھر میں والدین تو صرف دو ہیں لیکن ان کے تابعین تعداد میں دگنے ہوں تو خیر کوئی بات نہیں لیکن کہیں کہیں تو یہ چار گنا بھی ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں "جدھر دیکھیے گا ہمیں پائیے گا"

اس غیر معمولی رونق کا جسے افراط رونق کہنا چاہیے ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ والدین اپنے لیے جو چیز بھی بنواتے یا کوئی خاص سامان تیار کرواتے ہیں بچے اسے ضرور استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہماری چند فلمیں ہیں جو صرف بالغوں کی تربیت اور ملاحظے کے لیے بنائی جاتی ہیں اور ان کے کاسٹیوم پر بالخصوص کثیر رقم صرف کی جاتی ہے کہ فلم دیکھنے والوں کو مشاہدہ کرتے وقت اپنی بصارت پر زیادہ زور نہ ڈالنا پڑے۔ ان فلموں کے مناظر اور مکالموں میں بلوغیت زیادہ ہوتی ہے لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ یہ فلمیں بھی جو مخصوص ہوتی ہیں اور صرف بالغوں کی توسیعی معلومات کے لیے تیار کی جاتی ہیں نابالغوں کے تصرف میں چلی جاتی ہیں (ایسے موقعوں پر تھیٹر انتظامیہ اس بات کی نگرانی کرتا ہے کہ کہیں کوئی نابالغ بلیک میں ٹکٹ حاصل نہ کر لے) والدین سینما ہال جاتے ضرور ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں کہ وہاں بھی نابالغوں کا ہجوم ہے تو منہ چھپا کر کسی پارک میں چلے جاتے ہیں اور مونگ پھلی کھا کر اپنا وقت گزار لیتے ہیں (کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ع وقت گزرا نہیں گزارا ہے) شاید یہی وجہ ہے کہ بمبئی میں مونگ پھلی فروخت کرنے والوں نے اس نعمت کا نام ہی "پاس ٹائم" رکھ چھوڑا ہے۔ مضافاتی ٹرینوں میں اس نعمت کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ جب تک اس سے مستفید ہوتے رہتے ہیں خاموش رہتے ہیں۔ آوازوں کی اس بستی میں اگر کسی کو ایک منٹ کی خاموشی بھی نصیب ہو جاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو ہزار مصائب و مسائل کے باوجود خوش نصیب سمجھنے لگتا ہے۔ مونگ پھلی کے ذکر سے وہ سینما ہال والی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ ناخواندہ والدین کو سینما ہال پر دیکھ کر کچھ بچے ان سے یہ تک کہہ دیتے ہیں کہ آپ تعلیم بالغان کے مراکز پر کیوں نہیں جاتے سینما ہال میں آپ کا کیا کام ہے۔ والدین کی ہچکچاہٹ انھیں چپ رہنے کا مشورہ دیتی ہے ان کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب ہوتا بھی کہاں ہے۔ لوگ یہ بھی پوچھتے ہیں کہ تعلیم بالغان کے مراکز پر سناٹا کیوں ہوتا ہے حالاں کہ وہاں "ڈونیشن" پیش کیے

۱۹۔ "الہلال" ریکلیمیشن باندرہ، بمبئی ۴۰۰۰۵۰

جانے کی پابندی نہیں ہے۔

بچوں نے یہ ماننا پڑے گا کہ ہر شعبۂ حیات میں خاصی ترقی کی ہے اور چند صورتوں میں انھیں بہادری کے انعامات بھی دیے جاتے ہیں اور یہ تقریب اس لیے یادگار تقریب ہوتی ہے کہ اس میں والدین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے لیکن تقریب کی کامیابی کی وجہ بچے ہوتے ہیں والدین نہیں۔ والدین کی حیثیت اس جلسے میں وہی ہوتی ہے جو شادی کی دعوتوں میں بچوں کی ہوتی ہے۔ ایسی ہی ایک تقریب میں ایک بچے نے جسے بہادری کا انعام دیا جارہا تھا اپنے دونوں والدین میں سے ایک کو منتخب اور مخاطب کرکے کہا "ڈیڈی آپ بھی بہادری کا کوئی کام کرتے تو آج میرے ساتھ آپ کو بھی انعام مل جاتا!" بچے کی زبان سے یہ بات سن کر بچے کی والدہ ہنس دیں اور والد جیسا کہ عام والدوں کا دستور ہے، کھسیا کر رہ گئے حالاں کہ اگر ان میں ہمت ہوتی تو وہ کہہ سکتے تھے کہ بیٹا، تمہاری ماں سے شادی کرنے کا انعام دینے کی سکت ہے کس میں۔

بچوں کے بارے میں یہ ہمیشہ کہا جاتا رہا ہے کہ یہ آگے چل کر ہمارے رہنما ہوں گے اور ملک وقوم کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں ہوگی۔ بچوں نے یہ بات سن لی اور اس پر عمل کرنے کی مشق انھوں نے اپنے گھر ہی میں کرلی۔ تختۂ مشق اب کوئی اور ہے۔ کئی ملکوں میں بچوں کے حقوق والدین کے حقوق سے زیادہ ہیں اور وہاں کوئی بھی بچہ جس کے دودھ کے دانت گرنے شروع ہوئے ہوں، اپنے والدین کی تنبیہ کے لیے انتظامیہ کو فون کرکے گھر پر طلب کرسکتا ہے۔ ان ملکوں میں والدین بچوں کو صرف دور سے دیکھتے ہیں ہاتھ نہیں لگاتے۔ ہاتھ نہیں لگانے کا مطلب یہ کہ لگا نہیں سکتے۔ وہاں قانون کے ہاتھ زیادہ لمبے ہوگئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان ملکوں میں بچوں کے مبارک ہاتھوں سے کیے ہوئے جرائم نہ صرف تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں بلکہ ان میں چابکدستی ذرا زیادہ ہی ہوتی ہے۔ ان علاقوں میں شاید انہی وجوہ کی بنا پر خاندانی منصوبہ بندی پر زیادہ زور دیا جاتا اور اس پر سلیقے سے عمل کیا جاتا ہے جب کہ کچھ علاقوں میں اس سلسلے میں جو تدابیر زیر استعمال لائی جاتی ہیں وہ کارگر نہیں ہوتیں صرف کاری گری کا نمونہ ہوکر رہ جاتی ہیں اور خواہش مند خواتین وحضرات خاندانی منصوبہ بندی کا نام سن کر ہی کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں کہ کم سے کم سماعت تو محفوظ رہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کا راست نہ سہی، بالواسطہ تعلق بہر حال بچوں سے ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بازیچۂ اطفال سمجھ لیا جائے۔ کرکیٹ کو کرکیٹ کی طرح کھیلا جاتا ہے گلی ڈنڈے کی طرح نہیں۔ اس منصوبے کی کامیابی دست شفقت پر نہیں دست شفا پر منحصر ہے۔ دنیا کی آبادی اب ارب او رکھرب کا حصار توڑ کر باہر نکل بھاگنے والی ہے۔ زمین سونا چاندی گندم جوار سب پیدا کرچکی۔ جب تک یہ نرم تھی سب کچھ ٹھیک تھا۔ اب یہ (ہمارے دل کی طرح) سخت ہوتی جارہی ہے۔ بعض علاقوں میں جہاں پہلے یہ زرخیز تھی اب شر خیز ہوگئی ہے۔ ہر وہ شخص جس نے سن رکھا ہے کہ آرام حرام ہے دوسرے کی زندگی حرام کرنے پر کمر بستہ ہے۔ (اس معاملے میں اس کی کمر میں درد نہیں ہوتا اور نہ وہ بیٹھتی ہے۔) یہ تو بیسویں صدی نے بتایا کہ آدمی میں جرم کرنے کی کتنی زبردست صلاحیت ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ پریشان تو سب ہیں پشیمان کوئی نہیں۔

دنیا کی آبادی کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے آب تک جتنے دانشور اور ماہرین معاشیات وارضیات جمع ہوتے تھے سب ایک ہال میں سما جاتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ دنیا کے بے حال ہونے کی یہ چھوٹی سی مثال ہے۔ یہی راستہ بدحالی کی سمت میں جاتا ہے۔ اس سے پہلے کہ دوسرے راستے بند ہوجائیں راہِ راست اختیار کرلینی چاہیے۔ فیملی اتنی مختصر ہونی چاہیے کہ اس میں کسی فیملی ڈاکٹر کی بھی گنجائش نہ رہے۔ ●

بقیہ: ہندوستانی ریاضی...

رصدگاہوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں لیکن اگر سترہویں یا اٹھارہویں صدی کی رصدگاہیں کوئی ثبوت ہیں تو یہ یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ دلی اور جے پور کے جنتر منتر ایک عجوبہ ہیں جو آج بھی بیرونی سیاحوں کے لیے باعث حیرت بنے ہوئے ہیں جو حیرت ناک طور پر سورج کی شعاعوں اور پانی کے عکس سے صحیح وقت، صحیح پیمائش اور صحیح نتائج دیتے ہیں۔ انہیں اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ نصابی غلطی کا کم سے کم امکان ہو۔ وقت بینی کمال کا تصور جو ہندوستانی علم ہیئت میں ہے وہ کہیں اور نہیں۔

بھاسکر کی لیلاوتی ایک ایسی کتاب ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ لیلاوتی ایک فرضی لڑکی کا نام ہے جسے بھاسکر علم ریاضی سکھاتا ہے۔ اس علم میں شامل ہیں ضرب، جمع، تفریق، تقسیم اعشاریہ، کراعشاریہ ایک مقدار شمار جو صحیح ہے اور دوسرا مقدار شمار جو صحیح نہ ہو۔ اعداد وشمار، ترتیب، تبدیلی۔ نصف ثانی، جذر یعنی SQUERE ROOT مسدس مستوی، متوازی اور مساوی خطوط۔ مربع، مستقیل سب شامل ہیں۔

ان کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی ریاضی داں نرم گفتار تھے، پُرفکر تھے۔ اور ہمیشہ اپنے علم میں اضافہ کرنے کے کوشاں تھے۔

ریاضی کی اس شاندار روایت کو بیسویں صدی، آغاز میں ایک نوجوان جس کا نام راما نجم تھا، نے آگے بڑھایا۔ راما نجم نے NUMBERS کی نئی تھیوری نکالی۔ وہ ایک ایسا GENIUS تھا جس کا سکہ OXFORD کے پروفیسر ہارڈی نے مانا۔ راما نجم کی قبل از وقت موت نے دنیا سے ایک ایسا ریاضی داں چھین لیا جو نئی دنیا کے لیے ایک مشعلِ راہ بن سکنے کا ملکہ رکھتا تھا۔

آزاد ہندوستان میں قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۶۸ میں اور قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں جسے نئی تعلیمی پالیسی بھی کہتے ہیں، ریاضی کی تعلیم کو پرائمری، اَپر پرائمری اور ثانوی سطح پر مضبوط بنانے کی اہم سفارش ہے NCERT نے اسکولی تعلیم میں ریاضی کو تقویت دینے کے لیے کئی قدم اٹھائے ہیں۔ حال ہی میں ایک نئی اسکیم کے تحت جس کا نام ہے MINIMUM LEVEL OF LEARNING ریاضی کو پرائمری اور اَپر پرائمری کے سلیبس میں ایک اہم مضمون کی شکل میں ڈالا گیا ہے۔ ترمیم شدہ قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۹۲ء میں اس سفارش کو دہرایا گیا ہے۔

ریاضی علم کی کنجی ہے۔ یہ بچوں کو صحیح اور مکمل بناتی ہے۔ اس کے بغیر تعلیم ادھوری ہے۔ نہ صرف تعلیم بلکہ زندگی ادھوری ہے۔ روم اور یونان میں ریاضی خواص کے لئے تھی۔ ہندوستان میں ریاضی عوام کی ملکیت تھی۔ یوروپ میں ریاضی ایک منظر تھی اور ہندوستان میں منزل، ایسی منزل جس کی تلاش نے لوگوں کو فارغ البال بنا دیا۔ اور ہندوستان سونے کی چڑیا کہلانے لگا۔ مشہور ریاضی داں سوامی رام تیرتھ کے الفاظ میں ریاضی موسیقی ہے۔ اس کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ ●

چھان سے اتر کر اس نے اپنی چرخی اور پتنگیں کوٹھے کے حمام کی الماری میں رکھیں جو زیادہ تر بند پڑا رہتا تھا۔ چٹخنی لگا کر دروازے کو باہر سے بند کیا۔ پھر زینے اتر کر نیچے لابی میں آکر کھڑا ہو گیا۔

گھر کے اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے اندر کا جائزہ لیا۔ اندر خاموشی تھی۔ نہ تو ڈرائنگ روم سے ٹی وی کی آواز آرہی تھی اور نہ ہی کچن میں برتن کھڑکھڑا رہے تھے۔ بڑے ہال میں بھی سناٹا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ممی ڈرائنگ روم میں نہیں ہیں۔ سیما آنٹی کالج سے ابھی گھر نہیں لوٹیں اور سالم بھائی یا تو سو گئے ہیں یا پھر کہیں گھر کے کسی کونے میں بیٹھے اپنی انجینئرنگ دکھا رہے ہیں۔ اپنے اس شوق میں کتنی قیمتی چیزیں انھوں نے کھول کر پھینک دیں۔ مثلاً کیمرہ، ٹارچ، لائٹر، ریڈیو وغیرہ۔

اس نے سوچا اور اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا چہرہ سرخ اور جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا اور گلا سوکھ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے بڑے ہال کی جانب جہاں پر ریفریجریٹر رکھا ہوا تھا، قدم بڑھایا چرر کی آواز کے ساتھ صدر دروازے کے ہینڈل گھومنے کی آواز ہوئی۔ وہ دروازے کی آڑ میں ہونے کو لپکا ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" لابی میں داخل ہوتے ہوئے سالم بھائی نے سوال کیا۔

"وضو" برجستہ بابی نے جواب دیا۔

"جمعہ پڑھا تھا؟"

"اور نہیں تو کیا۔"

"جھوٹ بول رہے ہو؟"

"میں کیوں بولوں گا جھوٹ"

"پتنگ اڑا رہے تھے چھت پر"

"ابا ان کی سنو!"

"ان کی سنو نہیں!... منھ دیکھو اپنا"

"کیا ہوا؟" اس نے لابی میں لگے سفید چینی کے واش بیسن میں پنجوں کے بل ذرا اونچے ہو کر اپنا منھ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"لال ہو رہا ہے" "لگتا ہے کسی سے لڑ کر آرہے ہو۔"

"میں کیوں کرنے لگا لڑائی" اس نے اکڑ کر کہا۔

"پھر یہ پینٹ کیسے پھٹی" بھائی نے گھٹنوں پر پھٹی پینٹ کی جانب اشارہ کیا۔

"پہلے سے ہی پھٹی تھی۔ دھوبی نے پھاڑی ہوگی..."

"دھوبی نے پھاڑی ہوگی! چلو ممی سے پوچھیں" یہ کہتے ہوئے بڑے بھائی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو اس نے ہاتھ چھڑایا اور دور جا کر بولا ــــ پینٹ میری ہے تمھیں اس سے کیا۔"

"ڈر گئے؟" بڑے بھائی نے چڑایا۔

"میں کیوں ڈروں گا۔ الٹے تمھیں ہی ڈانٹ پڑے گی ــــ ہزار بار کہا ہے ذرا ذرا بات کی چغلی مت کھایا کر۔ چغلی کرنا بری بات ہے۔ اللہ میاں منھ ٹیڑھا کر دیتے ہیں" اس نے ماں کی نقل اتار کر کہا۔

تبھی چھان پر سے کچھ آوازیں آئیں۔ وہ چونکا۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کچھ نہ کچھ کر کے آیا ہے" بڑا بولا۔

بابی بڑے ہال میں جا کر ماہی کی کڑیوں والے جھولے پر بیٹھ گیا۔

ہلکی آوازیں سناٹے کو چیر کر اور تیز آنے لگیں۔

"بھوجی!"

"بھوجی!"

"بھوجی جرا سنیے!"

"نہیں ہیں بھوجی" بابی نے اوپر کی آواز پہچان کر کہا۔

"بھوجی!"

"بھوجی!"

"سنائی نہیں دیتا۔ بھوجی نہیں ہیں" بابی چڑ کر بولا۔

"نیچے چل کر گھنٹی بجاؤ" کسی نے اوپر سے رائے دی۔

یہ سنتے ہی بابی جھولے پر سے اٹھا اور دوڑ کر بجلی کی مین لائن کو بند کر دیا جیسے اکثر ہی وہ غصہ میں آکر بند کر دیا کرتا تھا۔ جب اس کی پسندیدہ کارٹون فلم یا پھر پرائم سپورٹ کے وقت ماں اسے اٹھا کر کوئی کام بتا دیتی تھیں۔

اس کے بعد صدر دروازہ کو بند کر کے بیلن لگایا اور پھر آکر جھولے پر بیٹھ گیا۔

"کہتا تھا نا میں کہ جھگڑا کر کے آئے ہو؟" بڑا بھائی پھر بولا۔

"میں نے نہیں کیا جھگڑا!" بابی نے پھر اکڑ دکھائی۔

گوریہ گنج پوسٹ آفس، لکھنؤ

"تو پھر یہ سب کون ہیں؟ اور کیوں چلا رہے ہیں؟"

"مجھے کیا معلوم"

"نہ جانے کون ہے جو اتنی زور سے دروازہ پیٹ رہا ہے؟" بجلی چلے جانے اور زور زور سے دروازہ پیٹے جانے کی آواز سے ممی کی آنکھ کھل گئی سیاہی چپل پیروں میں ڈال کر بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر آئیں۔

"ارے! تم لوگ کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھے ہو کیا؟ سنائی نہیں پڑتا۔ جا کر دیکھا بھی نہیں جاتا؟" دونوں بیٹوں کو ہال میں چپ بیٹھا دیکھ کر غصہ سے بولیں۔

"یہ جانے دے تب نا!" بڑے نے شکایت آمیز لہجہ میں کہا۔

"کیوں! یہ جانے کیوں نہیں دیتا؟"

"میں نے کب روکا؟"

"اچھا تمہیں تو پکڑے تھے"

"اب دونوں لڑتے ہی جاؤ گے یا جا کر باہر دیکھو گے بھی؟" ماں نے یہ بات کچھ اس زور سے کہی کہ باہر دروازے تک آواز گئی ہوگی۔ دروازے پر خاموشی ہوگئی۔

"رادھے! جو احاطہ میں رہتا ہے اس کی اماں ہے آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے احاطہ کی اور عورتیں بھی ہیں۔" بڑے نے دروازے سے لوٹ کر ماں کو بتایا۔

پہلے تو ماں سوچ میں پڑ گئی لیکن پھر اپنے پیر کی چپل "جو ایک الٹی ایک سیدھی تھی درست کی، ململ کے دوپٹہ کو سینے پر پھیلا کر اوڑھا اور دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔

"کیا بات ہے ساوتری!" صدر دروازے کا تھوڑا سا پٹ کھول کر وہ ساوتری سے مخاطب ہوئیں۔

"بات یہ ہے بہو جی! چھوٹے بابوجی۔۔۔

"ہاں ہاں کہو کیا کیا چھوٹے بابوجی نے؟

"متھا پھوڑ دیا۔"

"کس کا؟"

"بھیا کیرا،"

تمہارے بھیا کا؟ ماں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں ۔۔۔ یا دیکھو" ساوتری نے اپنے بیٹے رادھے کو آگے کیا۔

پہلے تو اس کی بات پر ماں کو یقین نہیں آیا لیکن جب اس نے بیٹے کو آگے کیا۔ "جھوٹ تو نہیں کہہ رہی زخم تو ہے ماتھے پر۔" ماں نے دل میں خیال کیا اور پھر ساوتری سے مخاطب ہو کر بولیں ۔۔۔

"لیکن ہوا کیا تھا؟"

"میں بتاؤں بھابی؟" غول میں کھڑا ایک ننگ دھڑنگ لڑکا جس کے جسم پر صرف ایک کپڑے کی جانگھیہ تھی۔ چہک کر بولا۔

"تو کیا بتائے گا ۔۔۔ میں بتاتی ہوں"۔ ساوتری نے لڑکے کو گھور کر دیکھا اور کہا ۔۔۔

"ای کا بتیہیں امی! ای تو رہیو نہ کریں"۔ قریب ہی کھڑا ایک دوسرا لڑکا بولا ۔۔۔

"بھیا چھت پر پتنگ اڑاوت رہا ۔۔۔ بابوجی پتھر کھینچ کر مار دین۔" ساوتری نے دونوں لڑکوں کی بات کی پروا نہ کرتے ہوئے بتایا۔

"جھوٹ۔ ایک دم جھوٹ۔" بابی سے چپ نہ رہا گیا وہ بول پڑا۔

"تو چپ کر" ماں نے بیٹے کو ڈانٹا۔

"نہیں بھابی یہی جھوٹ بول رہی ہے۔" پہلے والا لڑکا پھر بولا۔

"کیسا چپکا کھڑا ہے اپنی بات نہیں بتاتا۔ کہ اس نے کیا کیا۔" بابی پھر بیچ میں بولا ۔۔۔

"اگر یہ جھوٹ بول رہی ہے تو پھر یہ زخم اب اپنے آپ بن گیا کیا ۔۔۔؟" ماں نے پھر سوال کیا۔

"یہ بیجو کو مار رہا تھا۔ وہ بے چارہ گونگا کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔"

"تو وہاں بیجو بھی تھا؟"

"ہاں اسی کی پتنگ توڑی رادھے نے لنگڑ سے۔ اس نے مانگی۔ تو مارا اسے۔ کہتا۔ آ! دیں پتنگ" اور جب وہ پاس آتا گھونسے سے مارتا۔ کہتا پھر مانگے گا بول؟ یہ روز اس کی پتنگ توڑتا اور مانگنے پر روز مارتا تھا۔ آج تو حد ہی کر دی زمین پر پٹخ پٹخ کر مار رہا تھا۔ پوچھ لیجیے چاہے لڑکوں سے" بابی نے تفصیل بتائی۔

"بابی بھیا ٹھیک کہہ رہے ہیں بھابی۔ اگر بابی بھیا نہ بچاتے تو بیرا سے اور مارتا۔"

غول میں کھڑا تیسرا لڑکا چہک کر بولا۔

"مارتا تو مارتا۔ تجھے کیا پڑی تھی۔ پہنچ گیا رستم بن کر۔"

"آپ ٹھیک کہن ۔۔۔ بابوجی کو کیا جرورت بولنے کی ہے۔" ساوتری نے چہک کر کہا۔

"ٹھیک ہے ساوتری تم جاؤ۔ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں ہوگی۔ میں ماروں گی بھیا کو ۔۔۔ اتنا کہہ کر ماں نے دروازہ بند کرنا چاہا تبھی ساوتری آگے آ کر بولی ۔۔۔

"ڈاکڑ کو تو دکھانا ہوگا ۔۔۔ دیکھیے نا کتنا گہرا جکھم ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر کی ضرورت نہیں پڑے گی میرے پاس ہے ایک اچھی دوا لگائے دیتی ہوں ٹھیک ہو جائے گا۔" انھوں نے ساوتری سے کہا اور پاس کھڑے بڑے بیٹے سے فریج میں رکھے سوفرامائسن ٹیوب کو نکال کر لانے کی ہدایت کی۔ بیٹا دوڑ کر ٹیوب نکال لایا۔ ماں نے رادھے کو قریب بلا کر ماتھے پر ٹیوب لگایا اور دوپٹہ کے کونے سے ایک روپیہ کھول کر دیتے ہوئے کہا ۔۔۔ ٹافی لے کر کھالینا۔"

"ایک بار لگانے سے کیا ہوتا ہے بہو جی۔ کئی بار لگانا پڑے گا۔" ساوتری نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم اسے رکھ لو۔" ماں نے ٹیوب اسے دیتے ہوئے کہا۔

"اس میں ہے ہی کتنا! دوسری بار کا بھی تو نہیں۔"

ساوتری کی ڈھٹائی پر ماں کو غصہ آ گیا لیکن اپنے غصہ پر قابو رکھتے ہوئے انھوں نے سوچا۔ "یہ آسانی سے ٹلنے والی نہیں۔ آخر ٹھہری نا ذات کی کھدڑگ۔"

"یہ لو روپیہ سامنے میڈیکل اسٹور سے ٹیوب دکھا کر خرید لو۔" دوپٹہ کے آنچل سے ایک دس کا نوٹ نکال کر دیتے ہوئے انھوں نے بات کو رفع دفع کیا۔ ماں نے دروازہ بھیڑا تو دونوں بیٹے آگے آگے اندر کی جانب چلے۔

تم کہاں چلے! ادھر آؤ ذرا؟" ماں نے بابی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا ۔۔۔

"اب بتا کیوں مارا تھا اسے؟"

"میں نے نہیں مارا ۔۔۔"

تو نے نہیں مارا تو یوں ہی وہ شکایت

لے کر آئی ہے"

"وہ جھوٹا ہے۔"

"وہ جھوٹا تو بڑا سچا ہے"

اس بار بابی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیوں بولتا کیوں نہیں جواب دے؟"

"کہا نا میں نے نہیں کیا جھگڑا۔ وہی مار رہا تھا بے چارے کو" بابی نے پھر صفائی پیش کی۔

"تو تجھے کیا۔ مارنے دیتا۔ ان کا کیا کل کو پھر ایک ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات تری عقل میں کہاں آنے کی۔ تو نے یہ نہ سوچا کیچڑ میں ڈھیلا پھینکے گا تو چھینٹے تجھ پر بھی آئیں گے؟

"بول اب جائے گا وہاں اور کرے گا لڑائی"

یہ کہتے ہوئے ماں نے اس کے گال پر کئی تھپڑ اس زور کے مارے کہ پانچوں انگلیوں کے نشان چہرے پر مثبت ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے لیکن وہ رویا نہیں نگاہوں میں بجو کا چہرہ مار کھاتا ہوا ناچ گیا۔ کانوں کو رادھے کی گندی گالیاں جو مارتے ہوئے وہ بجو کو بک رہا تھا کی آواز بھی سنائی دی۔

"ہاں" غصہ اور بے خیالی میں بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا۔

"کیا کہا تو نے؟" "ابھی بتاتی ہوں" یہ کہہ کر ماں مزید پٹائی کے لیے بڑھیں لیکن تب تک وہ اپنا ہاتھ چھڑا چکا تھا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے بھاگا۔ آگے آگے بابی اس کے پیچھے ماں۔ ڈائننگ ٹیبل کے گرد بھاگ رہے تھے لیکن بابی ماں کے ہاتھ نہیں آیا۔ ماں نے غصہ میں آکر پیر کی جوتی نکال کر اسے کھینچ کر ماری۔ جوتی پھلپھلاتی ہوئی چہرے پر پڑی۔ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پاسکا۔

"مارو جتنا جی چاہے مارو" بھاگنا بند کر کے ہاتھ پیر پٹخ کر وہ چلایا۔

"ارے! ارے! یہ کیا ہو رہا ہے۔"

کالج سے لوٹ کر آئی ہوئی سیما آنٹی تماشا دیکھ کر بولی۔

"اب تو محلے میں یہ رہنے بھی نہیں دے گا" ماں نے کہا۔

"کیوں؟ کیا کیا اس نے؟"

"یہ پوچھو کیا نہیں کیا" ماں نے اپنی چھوٹی بہن سے کہا۔

"پھر بھی یہ چوہا بھاگ بلی آئی کا کھیل کیوں؟" سیما نے بڑھ کر بابی کو اپنی تحویل میں لے کر کہا۔ "روز کسی نہ کسی سے جھگڑا کر کے آتا ہے۔ پوچھو اس سے کرے گا اب پھر جھگڑا؟"

"ہاں کروں گا"

"دیکھی تم نے اس کی ڈھٹائی"

"نہیں بابی گندی بات۔ ممی سے کیا اس طرح بات کی جاتی ہے؟"

"میں نے نہیں مارا تھا۔ پہل اسی نے کی۔ وہی مار رہا تھا گھونسوں سے بجو کو دھکا دے کر زمین پر پٹخ دیا اسے۔ میں نے تو بچایا نہیں تو۔ اور مارتا۔ وہ بیچارہ گونگا۔"

"آپ ہی نے تو کہا تھا۔ کسی پر ظلم ہوتے دیکھ کر چپ رہنا۔ بزدلی ہوتی ہے۔"

"بولیے کہا تھا کہ نہیں؟" بابی نے آنٹی کو آنٹی کی بات یاد دلائی۔

"تمہیں نے اسے خراب کیا ہے۔ چھوڑو مجھے دو اسے" ماں نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ لیکن سیما نے اسے نہیں چھوڑا۔

"آنے دو اس کے ڈیڈی کو۔ آج ہی سے درست کرواتی ہوں۔ پھر ہمیشہ کے لیے چھت پر جانا اور لڑائی کرنا بند۔ اور دیکھو خبردار جو کسی نے اسے کھانا دیا۔" یہ کہتی اور بڑبڑاتی ماں نے باورچی خانہ کا رخ کیا۔

کچھ دیر بعد بابی بھی سب کچھ بھول کر اپنی میز پر جا کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ بڑا بھائی بھی پاس کی میز پر اپنا اسکول کا سبق یاد کر رہا تھا۔

ماں نے باورچی خانہ میں پلاؤ دم پر لگایا تو جوز جوتری اور کیوڑے کی خوشبو گھر میں اڑی۔

"پلاؤ پکا ہے" بڑے بھائی نے بابی سے مخاطب ہو کر کہا۔ چھوٹا اپنے کام میں لگا رہا بڑے کی بات کا جیسے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔

"مزا آئے گا" بڑا پھر بولا۔

"اس میں مزے کی کیا بات کوئی پہلی بار پک رہا ہے۔"

"تمہیں نہیں ملے گا"

"کس نے کہا"

"ممی نے کہا"

"ممی یوں ہی کہتی ہیں۔ بعد کو دے دیتی ہیں۔"

"نہیں سچ مچ آج تمہیں نہیں ملے گا۔"

اس سے پہلے کہ چھوٹا پھر کوئی جواب دیتا ڈیڈی کی کھنکار سے سب کو ڈیڈی کے گھر میں داخل ہونے کی خبر ہو گئی۔

بہن کو کچن میں چھوڑ کر ماں باہر آئیں۔ میاں کے ہاتھ سے بریف کیس لیا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ڈیڈی نے ہال میں پڑی ڈرائنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ٹائی کی ناٹ کو ڈھیلا کیا۔ قمیص اور ٹائی اتار کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینہ پر ٹانگ تبھی ماں ان کی لنگی کرتا لے کر کمرے سے باہر آئی۔ ڈیڈی نے کپڑے تبدیل کیے اور ممی پسینے سے بھیگی بنیائن، قمیص اور پینٹ کو لے کر ٹیرس پر بندھی الگنی پر پھیلانے چلی گئیں۔

"چائے پیجئے گا یا کھانا لگاؤں؟" واش بیسن پر منھ ہاتھ دھو رہے میاں سے ماں نے سوال کیا۔

ہال کی دیوار پر آویزاں سنہری کالی گھنٹے والی گھڑی پر نظر جمائے ہوئے ڈیڈی بولے۔

"کھانا تیار ہو تو کھانا ہی لگاؤ۔ چائے بعد میں پی لیں گے۔"

"ہاں یہی ٹھیک رہے گا۔ پلاؤ بھی گرم ہے۔"

سیما نے کھانا لگایا۔

"بابی کھا چکا؟" ہاتھ دھو کر جب سب لوگوں نے کرسی سنبھالی سوائے بابی کے تو ڈیڈی نے پوچھا۔

"نہیں" بڑے بیٹے نے جواب دیا۔

"تو بلاؤ اسے۔"

"آپ کھائیے" بیوی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا کر رہا ہے؟"

"سزا دی ہے میں نے۔ بہت پریشان کر رکھا ہے مجھے۔ آج اس کا کھانا بند۔"

"ایسی سزا دینے سے کیا فائدہ جس پر خود ہی عمل نہ کر سکو۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ابھی خود ہی سوتے میں منھ

میں نوالے ڈالوگی۔"

"تو کیا کروں۔ دل سے مجبور ہوں۔"

"تو بلاؤں اسے؟" میاں نے بیوی سے اجازت چاہی۔ بیوی نے خاموش رہ کر گویا اجازت دے دی۔

"بابی!" ڈیڈی نے آواز دی تو وہ "جی" کرتا ہوا فوراً آگیا جیسے آواز دے جانے کے انتظار ہی میں بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے آج کل بڑی شکایتیں سننے میں آرہی ہیں۔؟" ڈیڈی نے کہا تو وہ کچھ بولا نہیں۔

"کیوں کیا کیا تھا؟"

"رادھے کو مارا اس کا ماتھا پھوڑ دیا" بڑے بیٹے نے بتایا۔

"تم نے دیکھا؟" بابی تڑاک سے بولا۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ کیا کیا تھا تم نے؟"

"میں نے کچھ نہیں کیا وہی مار رہا تھا بے چارے کو۔"

"کیوں کیا کتے نے کاٹا تھا اسے جو بلا وجہ مار رہا تھا کوئی وجہ؟"

"بیچارہ گونگا اسکول کی چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ لنگر مار کر توڑ ڈالی رادھے نے۔ اس نے اپنی پتنگ مانگی تب لگا وہ مارنے۔ کبھی گھونسے کبھی زمین پر گرا کر پیروں سے۔"

"ہوں۔" منہ میں نوالہ تھا ڈیڈی نے بند منہ سے کہا۔

"میں نے بچایا اسے" بابی نے کہا۔

"یہ تو کوئی برائی نہیں ہوئی۔" مظلوم کو بچانا تو اچھی بات ہے۔۔۔ بیٹھو کھانا کھاؤ۔" ڈیڈی نے بیٹے سے کہا۔

"اس نے کہا اور آپ نے مان لیا۔۔۔ بچانے کا یہ مطلب تو نہیں کہ بدلے میں ایسا مارو کہ ماتھا ہی پھوڑ دو۔۔۔ شکایت لے کر آئی تھی ساوتری ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا دروازہ پر یہ تو کہو بات دس کے نوٹ پر ٹل گئی۔۔۔" ماں نے تفصیل بیان کی۔

"بچانے میں ماتھا پھوڑ دیا جاتا ہے۔؟" ڈیڈی بابی سے مخاطب ہو کر بولے۔

"میں نے نہیں پھوڑا ماتھا۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ وہی گر گیا تھا آپ ہی زمین پر اور چوٹ آگئی۔۔۔ چاہے چندن سے پوچھ لیجیے۔"

"یہ چندن کون ہے؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"ہوگا کوئی اس کا سگا۔ ماں نے کہا۔

"جب تک آپ اس کا پتنگ اڑانا بند نہیں کریں گے روز کے یہ تماشے ختم نہیں ہونے والے۔" ماں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

سب سے پہلے ڈیڈی کھانا کھا کر اٹھے اور ٹیرس پر ہاتھ دھونے چلے گئے پھر باقی لوگ ایک ایک کر کے اٹھے۔ سیما نے میز پر کے جھوٹے برتن سمیٹنا شروع کیے۔ ماں نے میاں کے لیے پان لگایا۔ "کہاں چلے گئے؟ ابھی تو یہیں تھے۔۔۔؟" ماں نے کہا ہی تھا کہ میاں ایک ہاتھ میں چرخی دوسرے ہاتھ میں لال، ہری، نیلی، پیلی، اودی اور چت کبری پتنگیں لئے ہوئے لابی کی طرف سے آتے ہوئے نظر آئے۔ بابی ہال میں کھڑا تولیہ سے ہاتھ پونچھ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑکا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے سیما آنٹی کی جانب کنکھیوں سے دیکھا۔ لیکن مداخلت کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

ڈیڈی نے کارنر میں رکھے تیل کے لیمپ سے ماچس نکالی اور ٹیرس پر چلے گئے۔ پتنگوں کو توڑا مروڑا ان کے بیچ چرخی کو رکھا ماچس دکھاتے ہی شعلہ بھڑک اٹھا۔

شوق کی ارتھی جلتے دیکھ کر بابی کے چہرے کا رنگ بدلا اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور کنپٹی تک تمام نسیں تن گئیں۔ وہ جہاں کھڑا تھا کھڑا رہ گیا۔ ڈیڈی سے اسے اس بات کی امید نہیں تھی۔ اسے پچھلے کئی جھگمٹ ایک ساتھ یاد ہو آئے۔ جب صبح کے چڑھے ڈیڈی شام کو چھت سے نیچے آتے تھے اور وہ دوڑ دوڑ کر نیچے سے کبھی چاول پکے ہوئے تو کبھی آٹا گھول کر پتنگ جوڑنے کے لیے لایا کرتا تھا۔ پتنگ اڑانا اس نے اپنے ڈیڈی ہی سے سیکھا تھا۔۔۔ آج ڈیڈی کو کیا ہو گیا۔" اس کے دل میں خیال آیا تو آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ اس نے اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کیا۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی بڑی لڑائی ہار گیا ہے۔ اس کا جی چاہا اپنی بے بسی پر رو دے۔ اسے غم تھا تو اس بات کا کہ اس کے ساتھ بے انصافی ہوئی لیکن وہ اس بے انصافی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ اپنی مجبوری اور بے بسی پر اسے رہ رہ کر رونا آرہا تھا۔ لیکن کوشش کر کے اس نے اپنے آنسوؤں پر قابو پا لیا۔

پتنگیں جل گئیں تو ڈیڈی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ماں بھی ادھر ہی چلی گئی۔ بڑے کو سوئے دیر ہو چکی تھی لیکن وہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد آنٹی جو وہیں موجود تھیں قریب آئیں۔

"کب تک کھڑے رہو گے چلو لیٹ جاؤ صبح کو جلدی اٹھنا ہے۔" کہتے ہوئے سیما نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر لے جانا چاہا۔ وہ ہلا نہیں۔

"میری بات نہیں مانو گے۔"

"آپ ہی کی بات تو مانی تھی۔" بابی نے رو کر کہا۔

"تو تم نے اسے نہیں مارا! کیوں؟" سیما نے کہا تو وہ چپ رہا۔

"ٹھیک ہے اگر تم سچ بول رہے ہو تو یاد رکھو جیت ہمیشہ سچ کی ہی ہوتی ہے دیر بھلے ہو جائے اللہ کے گھر دیر ہوتی ہے اندھیر نہیں۔" سیما نے کہا اور سمجھا کر بستر پر لے آئی۔ اس کے آنسو پونچھے اور سر کو سہلا کر سلانے کی کوشش کی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں تو سیما نے دعا کی۔" اللہ میاں میری بات کا مان رکھیے گا۔" دعا کرتے کرتے اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

رات کے کسی پہر میں جب سیما کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بابی دونوں ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے آنکھیں چھت میں گڑائے ہوئے ہے اس نے جسم کو چھو کر دیکھا بھٹی کی مانند جل رہا تھا اور گلے سے گھٹی گھٹی غر رر کی آواز بھی نکل رہی تھی۔

بابی! بابی! کیا بات ہے" سیما نے گھبرا کر بابی کو ہلایا۔ پھر جگ سے پانی انڈیل کر چمچے چمچے منہ میں ڈالنا چاہا لیکن اس نے منہ کو کس کر بھینچ لیا، دانت کس گئے۔

"تیز بخار ہو تو ماتھے پر ٹھنڈی پانی کی پٹیاں رکھنی چاہیے" اس خیال کے آتے ہی اس نے فریج سے ٹھنڈا پانی نکالا اور دوپٹہ کے آنچل کو بھگو بھگو کر ماتھے پر رکھنے لگی۔ دوپٹہ کے دوسرے کونے کو بھگو کر ہتھیلی اور تلوؤں کا مساج کیا۔ اس پر بھی جب بخار نہیں اترا اور کیفیت پہلے جیسی برقرار رہی تو۔۔۔" اپیا کو جگانا چاہیے" دل میں اس خیال کے آتے ہی اس نے اپیا کا کمرا بھڑ بھڑایا۔

"کیا بات ہے؟" بہن کی آواز پہچان کر بہن نے دروازہ کھولا۔۔۔ سیما نے بابی کی کیفیت کے بارے میں بتایا تو دونوں میاں بیوی کمرے سے

نکل کر آئے۔ بابا کی پیشانی پر ہاتھ رکھا "ارے! یہ تو تپ رہا ہے" دونوں نے فکر سے کہا۔
صبح ہونے میں دیر تھی۔ ڈیڈی نے بیٹے کو گود میں اٹھایا اور ٹہلنے لگے۔ بخار کا سیرپ تھرمس میں رکھا تھا پلانے کی کوشش کی گئی۔ بڑی مشکل سے سیرپ حلق سے نیچے اترا۔
ڈیڈی بیٹے کو اپنے بستر پر اٹھا لائے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ کر بخار کو اتارنے کی جدوجہد جاری رہی جب بخار تھوڑا کم ہو گیا اور بابا کو نیند آگئی تو دونوں بہنیں بڑے ہال میں بچھے چوکے پر جاکر لیٹ رہیں۔
صبح ہونے پر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد جب ڈیڈی بیٹے کو لے کر گھر لوٹ رہے تھے تو راستہ میں سیب، انگور اور انار خریدے۔ لیکن بابی نے کسی چیز میں دلچسپی نہیں دکھائی۔ پھل اور دوا دے کر ڈیڈی آفس کو روانہ ہو گئے۔
دوپہر کی خوراک دیے جانے پر بھی جب بخار کم نہیں ہوا تو ماں زیادہ ہراساں نظر آئی۔
"اب کیا ہوگا؟ بخار تو کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے" انھوں نے بہن سے کہا۔
"یہی میں بھی سوچ رہی تھی"
"دوسرے ڈاکٹر کو دکھاؤں؟"
"اس سے کیا فائدہ — یہ ڈاکٹر بھی تو برا نہیں"
"پھر؟"
"ایک بات کہوں آپیا؟" کچھ دیر خاموش رہ کر سیما نے کہا۔
"کیا —؟"
"مجھے تو کچھ اور ہی بات معلوم ہوتی ہے"
یہ کہتے ہوئے سیما نے بہن کے کان کے قریب منہ لے جاکر چپکے سے کچھ کہا۔
"ٹھیک ہے اگر یہ بات ہے تو ایسا ہی کرکے دیکھو" یہ کہتے ہوئے آپیا اٹھیں الماری سے پرس نکالا اور پھر اس کو کھول کر ۵۰ کا ایک نوٹ نکال کر سیما کی ہتھیلی پر لاکر رکھ دیا۔ سیما نوٹ پکڑ کر اٹھی اور آپیا بیٹے کے قریب بیٹھ کر پٹیاں رکھنے لگیں۔
شام کو جب میاں آفس سے گھر لوٹے تو گھر میں داخل ہوتے ہی انھوں نے پوچھا —
"بابی کیسا ہے؟ بخار اترا؟"
"جی" بیوی نے مختصر سا جواب دیا۔
"ڈاکٹر نے دوا بھی بہت اچھی دی تھی — کہتا تھا انشاء اللہ شام تک بالکل اتر جائے گا۔"
"جی نہیں" بیوی نے لفظوں پر زور دے کر کہا۔
"پھر؟"
آپ خود ہی جاکر دیکھ لیں کمرے میں۔ یہ کہتے ہوئے وہ خود ہی میاں کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی جانب لے گئیں — بابی بستر پر گاؤ سے ٹیک لگا کر بیٹھا اپنی آنٹی کی مدد سے چرخی پر ڈور چڑھا رہا تھا۔ جالی کے پردے کی اوٹ سے انھوں نے دیکھا۔ مختلف رنگوں کی پتنگیں بستر کے قریب رکھی میز پر پھیلی ہوئی تھیں۔
کمرے میں داخل ہو کر بیٹے کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے ڈیڈی نے کہا "ارے واہ بخار تو بالکل نہیں ہے"۔ بیٹے کو پیار کرتے ہوئے وہ پھر بولے — "کیوں بابی ہمیں دیجیے گا پتنگ اڑانے کے لیے؟" "کیوں نہیں ڈیڈی! آپ ساری پتنگیں لے لیجیے"
"ہاتھ ملاؤ یہ ہوئی کوئی بات" یہ کہتے ہوئے ڈیڈی نے اپنا ہاتھ بیٹے کی جانب بڑھایا۔ ڈیڈی سے ہاتھ ملاتے وقت اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ہاری ہوئی بڑی لڑائی وہ دوبارہ جیت گیا ہے۔ اس کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلے جنھیں وہ روک نہ سکا۔ ●

بقیہ: تبصرے

(۳) عدالتی ماحول کا اثر۔
(۴) علی گڑھ کی اقامتی زندگی اور درس تدریس کی انجام دہی۔
(۵) متقدمین اور مغربی ادبا کی تحریروں کے اثرات۔
رشید احمد صاحب کو زبان و بیان پر مکمل دسترس حاصل ہے اور وہ اپنے مخصوص انداز میں پتے کی بات کہہ جاتے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں۔
"اگر انسان کو بدترین دشمن کی تلاش ہو تو اس کو اپنے عزیزوں میں مل جائیں گے اور بہترین دوست کی ضرورت ہو تو غیروں کا جائزہ لینا چاہیے"۔
مختصر یہ کہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش لکھنؤ کے جزوی تعاون سے چھپی یہ کتاب مختصر اور جامع بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس میں اگر ان چند دلچسپ واقعات اور لطائف کا ذکر اور آجاتا جو رشید صاحب سے منسوب ہیں اور ابھی سیکڑوں ادیبوں اور دوستوں کے سینوں میں محفوظ ہیں تو اس کی دلچسپی اور افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ کتابت اچھی ہے البتہ پروف ریڈنگ میں ایک دو جگہ چوک ہو گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کاوش قابل قدر ہے اور ریسرچ کرنے والے طلبا کے لیے ایک نہایت ہی کارآمد کتاب ہے۔ ●

بقیہ: ایک قابل حصول نشانہ

تری سے شعبوں میں سرگرمیوں اور روزگار کے مواقع میں مزید اضافہ ہوگا۔ مالی اور کاروباری خدمات کے شعبے کی بھی توسیع ہوئی ہے اور اسی طرح سے اس میں روزگار کے مواقع میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ توقع ہے کہ سرگرمیوں میں اضافے کا یہ رجحان جاری رہے گا۔
مذکورہ جائزے کی روشنی میں، ۲۰۰۲ء تک تقریباً مکمل روزگار کا نشانہ حاصل کرنے کے لیے درکار، روزگار کے مواقع میں سالانہ ۳ر۱ فی صد کی شرح اضافہ ممکن نظر آتی ہے۔ آئندہ برسوں میں روزگار کے مواقع میں تقریباً ۰ر۴۵ کی لچک کی توقع کرنا نامناسب نہیں ہوگا جو کہ گذشتہ تین برسوں کے لیے تخمینہ شدہ اعداد شمار کے قریب ترین ہے۔ ۲۰۰۲ تک سب کے لیے روزگار کے نشانے کا حصول بنیادی طور سے ۱۹۹۵-۲۰۰۲ء کے دوران مجموعی اندرون ملک پیداوار میں اوسطاً سالانہ تقریباً ۷ فی صد کی شرح اضافہ حاصل کرنے پر مبنی ہوگا۔ معیشت کی ترقی کے امکانات کے موجودہ جائزے سے بھی یہ شرح اضافہ ممکن نظر آتی ہے۔

غزل

نثار سمر بانوی

رکھا جو میں نے پہلا قدم شہر ناز میں
جادو سا جاگ اٹھا نگہ نیم باز میں

آہ و فغاں میں اور نہ کچھ سوز و ساز میں
رہتا بھرم ہے عشق کا اخفائے راز میں

پردہ اٹھا دیا کبھی پردہ گرا دیا
گزری شب حیات یوں راز و نیاز میں

ملتا نہیں سراغ فضائے بسیط کا
انسان اڑ رہا ہے اگرچہ جہاز میں

ہر ذرہ کہہ رہا ہے یہی کائنات کا
کتنی کشش ہے دیکھیے آئینہ ساز میں

اب زندگی ہے شاہد مسجود پر نثار
سجدے تڑپ رہے ہیں جبین نیاز میں

مکرو پوسٹ سمریاواں بازار ضلع بستی۔ یو پی۔ ۲۷۲۱۲۶

رباعیات

عادل اسیر

باقی تو سمندر میں بھی رہ جاتا ہے
منہ زور تھپیڑوں کو بھی سہہ جاتا ہے
ذرہ جو جٹا توں سے الگ ہو عادل
اک جوئے تنک آب میں بہہ جاتا ہے

○

دانائی تو غصے کی ہے اک ادنیٰ کنیز
ہیں ہوش و خرد بھی یہاں بیکار سی چیز
ہو جاتا ہے غصے میں جنونی انسان
پھر نیک کی بد کی نہیں رہتی ہے تمیز

○

کس چیز کی رہتی ہے یہ کاوش پیہم
ہے عقل جو آمادۂ سازش پیہم
آنکھوں میں تھکن اور جلن سی کیوں ہے
کیوں دل میں شب و روز ہے شورش پیہم

○

در پر ترے افتادہ جبیں بھی تو نہیں
ظاہر میں تو موجود کہیں بھی تو نہیں
مشکوک رہوں تجھ سے تو فطرت یہ کہاں
اے دوست مگر تیرا یقیں بھی تو نہیں

○

ہے آگ کہاں سوز دروں سے پوچھو
کیا چیز خرد ہے یہ جنوں سے پوچھو
مظلوم بظاہر میں نظر آتا ہوں
تم ظلم مرے نفس زبوں سے پوچھو

○

تعریف کے دامن سے لپٹ سکتی ہے
تنقیص کے پہلو میں سمٹ سکتی ہے
مخفی ہے کہیں مجھ میں عدم بھی عادل
ہستی مری دو حصوں میں بٹ سکتی ہے

۲۳۱۲، پھاٹک تیلیاں۔ ترکمان گیٹ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

غزل

سیوک گورداسپوری

کہاں پہ چھوڑ دیا مجھ کو لاکے اپنوں نے
سلگ رہی ہیں میرے دل میں حسرتیں کیسی

کسی نے وحشی کہا اور کسی نے دیوانہ
ہمارے نام لگی ہیں یہ تہمتیں کیسی

مجھے بنا کے ہی چھوڑیں گی اب تو دیوانہ
نظر میں گھوم رہی ہیں یہ صورتیں کیسی

تمام عمر رہی جن کی جستجو ہم کو
کوئی بتائے کہ ہوں گی وہ منزلیں کیسی

مجھے یہ دیکھ کے لگتا ہے اک عجیب سا ڈر
تیری جبیں پہ پڑی ہیں یہ سلوٹیں کیسی

گیا جہاں بھی میں "سیوک" کو اڑ بند ملے
میرے نصیب میں لکھی ہیں ٹھوکریں کیسی

[illegible]

تبصرے

نام کتاب	:	ابلاغ وترسیل
مصنف	:	ڈاکٹر محمد یوسف خورشیدی
اشاعت اول	:	اکتوبر ۱۹۹۳ء
کتابت	:	عبیدالرحمٰن صوفی
صفحات	:	۱۵۵
قیمت	:	۵۰ روپے
ملنے کے پتے	:	۱۔ مکتبہ جامعہ دہلی ۲۔ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴ ۳۔ کتاب منزل، سبزی باغ، پٹنہ ۴ ۴۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸ وکیل اسٹریٹ، ڈاکٹر مرزا احمد علی مارگ، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶
ناشر	:	مصنف
مبصر	:	عادل صدیقی

پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو اور ڈین جناب محمد یوسف خورشیدی نے حال ہی میں مختلف موضوعات پر دس ادبی مضامین کا مجموعہ "ابلاغ وترسیل" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ یہ اردو ادب سے ان کے قلبی لگاؤ، وسیع مطالعے، تدریسی شوق، تخیلاتی طلسم کاری، تاثراتی کیفیات، حسن بیان اور زور قلم کی طلسم آفرینی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ یہ کتاب بقول ان کے احساس فرض کے تقاضے کے تحت لکھی گئی ہے۔ اس میں مصنف نے جن دس ادبی موضوعات پر مضامین سپرد قلم کیے وہ یہ ہیں:

(۱) اردو غزل کی تہذیبی میراث (۲) تغزل تصوف، تفلسف (۳) داغ دہلوی (۴) اکبر الٰہ آبادی

یوجیشا، نئی دہلی

(۵) حامد عظیم آبادی (۶) ہمارا تہذیبی سرمایہ، مرگاوتی، (۷) ابلاغ وترسیل (۸) عظیم آباد کا ایک گمنام شاعر۔ عبدالغفور کامل (۹) مشترکہ کلچر تاریخی پس منظر (۱۰) مشاعرہ۔

یہ مضامین غالباً پروفیسر موصوف نے اپنے طلبا کے لیے نوٹس کی شکل میں مرتب کیے ہوں گے پھر انھیں عام استفادہ کے لیے کتابی شکل میں منتقل کر دیا۔ عوامی استفادے کی خاطر یہ ایک اچھا قدم کہا جا سکتا ہے۔

"اردو غزل کی تہذیبی میراث" کے عنوان سے انھوں نے اپنے اس مضمون میں عربی، ایرانی اور ہندوستانی تہذیب کو شاعری کے ادبی مزاج کی تعمیر میں کم وبیش حصہ دار بتایا ہے اور یہ اشارہ بھی دیا ہے کہ دکن کی ابتدائی اردو شاعری میں شمالی ہندوستان کی مقامی بھاشاؤں کے عوامی گیتوں کی گونج ہر جگہ پائی جاتی ہے اور وہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد سے زیادہ کرشن، رادھا اور نل دمن سے واقف اور مانوس ہے موصوف ہمارے بعض نقادوں کی اس رائے سے متفق نہیں کہ انیس نے مراثی میں ہر جگہ واقعۂ کربلا کو ہندوستانی معاشرے کے سانچے میں ڈھالا ہے، ان کے خیال میں اردو شاعری اور خصوصیت کے ساتھ غزل گوئی عربی تغزل کے صالح اور تندرست جذبات سے بالکل محروم ہے، البتہ ہماری غزلوں میں خمریات ایرانی ورثے کا احترام ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ ہماری شاعری دیہی ہندوستان کے جذبات وروایات نیز مظاہر و مناظر سے تقریباً خالی ہے۔ موصوف نے جمیل مظہری کی غزلیات کو فکری ثقالت کا شکار بتایا ہے، البتہ انھوں (جمیل مظہری) نے پریم گیتا لکھ کر بڑی حد تک اس کی تلافی کی۔ ڈاکٹر خورشیدی ایرانی اور ہندوستانی تغزل کو سلیقے سے گھلا ملا دیکھنا چاہتے ہیں اور اس رجحان کو تقویت پہنچانے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

دوسرے مضمون "تغزل، تصوف، تفلسف" میں پروفیسر خورشیدی کا کہنا ہے کہ دکنی تغزل میں اظہار محبت اور اظہار جذبات عورت ہی کی زبان سے ہوتا ہے، عاشق ومعشوق کا تصور فارسی شاعری کی دین ہے، یہاں مرد ہی عاشق ہے، مرد ہی معشوق البتہ اردو غزل دہلی سے لکھنؤ پہنچتے پہنچتے معشوق کے تصور کے لحاظ سے کچھ کی کچھ ہو گئی۔ اب معشوق ایک طرحدار عورت ہے لیکن تہذیبی وتاریخی اسباب کی بنا پر علامت تانیث نہیں، علامت تذکیر استعمال ہو رہی ہے آپ نے یہ بھی لکھا کہ جس طرح ضدی مریض کو کونین کی گولی شکر میں لپیٹ کر دی جاتی ہے، اسی طرح ایران کے سلیقہ مند صوفی شاعروں نے مسائل تصوف کو شراب میں ڈبو کر نشیلا بنا دیا۔ مرشد کے دل کے لیے سبو و مینا اور مریدوں کے دل کے لیے جام وساغر کے استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ استعارے گویا پردے تھے جن کی آڑ میں حقانیت کے دقیق مسائل کے بیان کی کوششیں ہوتی رہیں۔

اس کتاب کے تیسرے مضمون میں داغ دہلوی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ داغ کے سلسلے میں یہ اظہار خیال خاص معنویت کا حامل ہے کہ ایسی معاملہ بندی کے اشعار جو عریاں نگاری تک پہنچیں، آپ کو شاذ ونادر ہی کسی غزل میں نظر آئیں گے۔ اس سلسلے میں انھیں

نے داغ کو میر پر ترجیح دینے کی کوشش کی، داغ کو اردو زبان اور اردو محاوروں پر گرفت ہے، اس کا تمثیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے مصنف کا یہ جملہ ناقدینِ ادب کو دعوتِ فکر دے رہا ہے "کوئی ذہین قاری میرے بیان سے یہ نہ سمجھ لے کہ میں داغ کو غالب سے برتر یا کم از کم ان کے ہم پلہ قرار دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایسی کوشش ایک تنقیدی جنون ہی کہی جا سکتی ہے اور بفضلہ یہ حقیر مقالہ نگار ایک تندرست دماغ رکھتا ہے لیکن اس سلسلے میں اتنی بات کہنا از روئے انصاف اپنا فرض سمجھتا ہے کہ ثقیل اور گمبھیر فلسفیانہ مضامین کو سہل ترین پیرایۂ تغزل میں بیان کرنا میر نے داغ کو سکھلایا اور یہ سلیقہ اپنے فکری جلالت کے باوجود غالب کو نہ آسکا۔" انھیں اس بات پر حیرانی ہے کہ داغ کے رنگ تغزل کو عامیانہ اور سوقیانہ کہا گیا۔

چوتھا مضمون اکبر الٰہ آبادی پر ہے۔ مصنف کو اس بات پر افسوس ہے کہ اکبر الٰہ آبادی مصلح طنز نگار کی حیثیت سے ہی جانے گئے مگر غزل گوئی کی حیثیت سے نہیں جب کہ بقول مصنف بحیثیت غزل گو ان کی عظمت اتنی مسلم ہے جو انھیں ان کے عہد کے ممتاز ترین غزل گویوں کے پہلو بہ پہلو بٹھائے جانے کا مستحق بناتی ہے۔ اس مضمون میں خالص غزل گو کی حیثیت سے اکبر کا تعارف کرایا گیا ہے۔

پانچواں مضمون حامد عظیم آبادی پر ہے۔ داغ کے شاگردوں کی بڑی تعداد کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے کہا کہ دبستان عظیم آباد میں حامد عظیم آبادی کا ایک خاص مقام ہے۔ اس میں انھوں نے عظیم آباد کی ایک بے پناہ شخصیت کا قرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ داغ کے رنگ میں حامد صاحب نے بہت سے اشعار کہے: مثلاً

بیان مدعا کو سیکھ لے طرز زباں میری
یہ قاصد سے کہو لے لے دہن میں اب زباں میری

پیش آتے ہیں وہ مکر سے، حیلے سے، دغا سے
دل کھول کے ملتے ہیں کہاں اہلِ وفا سے

ہمارا تہذیبی سرمایہ "مرگاوتی" اس عنوان سے مصنف کا چھٹا مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔ مرگاوتی ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ سلطان جونپور، سلطان حسین شرقی نے سنسکرت اور فارسی ادب کے باہمی تراجم کا ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس کے ایک رکن شاعر قطبن تھے جنھوں نے سلطان حسین شرقی کی ایما پر ۴ محرم ۹۰۱ھ کو یہ منظوم داستان شروع کی اور دو ماہ دس دن میں اسے مکمل کیا۔ حمد و نعت و منقبت کے بعد پیر کی مدح کی اور اس کے بعد بادشاہ وقت سلطان حسین شرقی کی مدح کی گئی۔ اس کے ۵ نسخے دستیاب ہیں مگر سب نامکمل۔ دو نسخے بیکانیر کی سنسکرت لائبریری کی ملکیت میں ہیں ایک نسخہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہے، چوتھا نسخہ دہلی کی کسی خانقاہ سے دستیاب ہوا اور پانچواں منیر شریف کی خانقاہ سے۔ آخر الذکر دو نسخوں کو ادبی دنیا سے روشناس کرانے کا سہرا ہند و پاک کے مشہور مورخ پروفیسر سید حسن عسکری صاحب کے سر ہے۔ ان تمام نسخوں کی مدد سے ڈاکٹر ماتا پرساد گپت نے ایک چھٹا نسخہ ترتیب دیا۔ اس نسخہ کو پرمارنک پرکاشن آگرہ نے ۱۹۶۸ء میں پہلی بار شائع کیا۔ اس کتاب میں عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ اول بتایا گیا ہے۔

اس مضمون میں منجھن کی مدھومالتی، قطبن کے مرگاوتی اور جائسی کی پدماوت کے تقابلی مطالعہ پر زور دیا گیا ہے۔

ساتواں مضمون "ابلاغ و ترسیل" کے عنوان سے ہے۔ اس مختصر مضمون میں نظم و نثر میں ابلاغ کی سلیقگی اور بے سلیقگی کے حوالے سے رقعات ظہوری، رقعات ابوالفضل کو نثر کے دائرے میں شمار نہیں کیا گیا بلکہ کہا گیا کہ شاعر ہو یا نثار، اپنے بیان میں حسن پیدا کرنے کے سلسلے میں جب حد اعتدال سے گزر جاتا ہے تو لفظ و معانی کا توازن برقرار نہیں رہتا اور ابلاغ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ موضوع کے لحاظ سے ابلاغ کے طریقوں کو بدلنا چاہیے۔ تاریخ اور افسانہ بنیادی طور پر ایک ہی چیز ہے لیکن اس کے باوجود افسانہ کی زبان اگر تاریخ میں استعمال کی جائے اور افسانے میں فلسفہ کی بھاری بھرکم زبان استعمال کی جائے تو اس سے مصنف کی بے شعوری کا پتا چلے گا۔

آٹھواں مضمون عظیم آباد کے گمنام شاعر عبدالغفور کامل سے متعلق ہے۔ اس میں ایک تو یہ شکایت کی گئی ہے کہ پٹنہ اور بہار کی یہ روایت ہے کہ وہ اپنے باکمالوں کی قدر کرنا نہیں جانتے مگر مصنف نے یہ ایک ایسی عام بات کہی ہے جس کا شکوہ ہر دور اور ہر طبقے میں سننے کو ملتا ہے۔ عبدالغفور کامل ۱۸۷۹ء میں صندل پور میں پیدا ہوئے اور یکم جنوری ۱۹۴۵ء کو انتقال فرمایا۔ انھوں نے کہنہ مشق شاعر دقیق سے اصلاح لی، خواجہ عبدالرؤف عشرت سے جو میر تقی میر دہلوی کے شاگرد تھے، اصلاح سخن لی اور ان کی اکثر زمینوں میں اشعار کہنے کی کوشش کی۔

مشترکہ کلچر کے عنوان سے نویں مضمون میں کہا گیا ہے کہ دنیا کا پہلا حیوان ناطق جو آسمانوں کی بلندی سے اترا، اس کی فطری زبان کیا تھی، اگر اس کا سراغ ہمیں مل جائے تو وہی زبان دنیا کی تمام زبانوں کی ماں ثابت ہو گی۔ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ تہذیبوں کا سلسلہ باہمی عمل سے چلتا ہے اور دنیا کی کوئی بھی تہذیب خالص نہیں ہے۔ اپنے اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے اسلامی اثرات اور ہندو اثرات دونوں من و تو کی تمیز مٹا کر کم و بیش کارفرما ہیں۔ یہ ایک بیش قیمت مضمون ہے اور دور حاضر میں جب کہ قومی یکجہتی کا نعرہ ہر طرف بلند کیا جا رہا ہے اس کی خاص معنویت ہے اور یہ عصری تقاضوں کو پورا کر رہا ہے۔ اس میں بڑی محنت سے مختلف مثالوں اور تاریخ کے مختلف ادوار کے حوالے سے تہذیبوں کو بغل گیر ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

آخری عنوان "مشاعرہ" ہے۔ مشاعرے کی مختصر تاریخ، پس منظر اور اس کے ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن یہ مطالعہ درمیان میں رہ گیا ہے اور اس کی بہت سی بعد کی کڑیاں حذف کر دی گئی ہیں جس کی وجہ سے اس کا مطالعہ تشنگی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اس میں آزادی کے بعد کے دہلی یا لکھنؤ کے چند اہم مشاعروں کو شامل کر لیا گیا ہوتا تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی۔

بہر طور یہ کتاب طلبا اور شائقین اردو ادب کے لیے دلچسپ اور معلوماتی مواد فراہم کرتی ہے۔ درسی نوعیت کے یہ مضامین اردو کے امتحانات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو دنیا کے رنگ و آہنگ کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ غالباً یہ مضامین مختلف موقعوں پر طلبا کی مختلف ضرورتوں کے پیش نظر لکھے گئے مضامین ہیں جن کو کتابی شکل دے کر مفاد عامہ کے خیال سے شائع کرایا گیا ہے، خواہ اس کی نوعیت کچھ بھی کیوں نہ ہو یہ ایک اچھی کاوش ہے اور مصنف کے وسیع مطالعے کی مظہر ہے۔ اس میں کچھ ایسے نکات پیش کیے گئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر اہل ادب بحث کے نئے گوشوں کا آغاز کر سکتے ہیں۔ ●

نام کتاب	:	رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ
مصنف	:	خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات	:	۱۷۶
قیمت	:	۶۰ روپے
سال اشاعت	:	۱۹۹۴ء
کتابت	:	ایم ، عمران اعظمی
ملنے کا پتا	:	تخلیق کار پبلیشرز، ۱۰۷۷ کوچہ دکھنی رائے دریا گنج ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲
مبصر	:	عادل صدیقی

ذرا کسی سے یہ کہہ دیجیے کہ آپ میں طنز و مزاح کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں پھر دیکھیے کہ اس کی بھنویں کیسے تنتی ہیں اور وہ بلا وجہ بھی آپ سے ناراض دکھائی دے گا۔ اسی ایک حقیقت سے طنز و مزاح کی زندگی میں اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ بات کو پرکھنے کی طبعی حس جسے عام بول چال میں "کامن سنس" کہتے ہیں ایک عام صلاحیت سمجھی جاتی ہے اس کی عدم موجودگی میں آدمی نا سمجھ اور بے وقوف تک پکارا جاتا ہے۔ طنز و مزاح ویسے بھی خالص انسانی فعل ہے۔ روئے زمین پر تمام مخلوق خوشی کے اظہار کا اپنا اپنا طریقہ رکھتی ہے مگر حضرت انسان کی ایک "دو غلی پالیسی" یہ بھی ہے کہ وہ اکثر ایسے موقعوں پر بھی ہونٹوں کو ہنسی کے اظہار کے لیے کھولنے کی کوشش کرتا ہے جب کہ اسے ہنسی نہیں آتی لیکن وہ اپنے مزاج کی صنائی کو بروئے کار لاتا ہے۔ عام بول چال میں اسے خوش خلقی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہنسی سے بظاہر یہ دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہم بہت خوش ہیں۔ جب کہ بہ باطن اس کے دل و جگر کو زخمی کرنے کے لیے بہت سے آلام تحت الشعور میں کام کر رہے ہوتے ہیں۔

اس پس منظری مواد کا تذکرہ اس وجہ سے کرنا پڑا کہ "رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ" نامی ایک اچھی کتاب حال ہی میں پڑھنے کو ملی جس کے مصنف خواجہ محمد اکرام الدین ہیں جو ..... جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر ہیں۔ یہ کتاب "تخلیق کار پبلیشرز" کے زیر اہتمام نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے اس کا انتساب انھوں نے اپنے والد مرحوم جناب مولانا شمس الدین سہروردی اور والدہ صاحبہ کے نام کیا ہے یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے اس کے پہلے باب میں طنز و مزاح کا فکری و فنی جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اردو طنز و مزاح کے اسالیب کا جائزہ لیا گیا ہے تیسرے باب میں رشید احمد صدیقی کے معاصرین پر روشنی ڈالی گئی ہے چوتھے باب میں رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور ان کی مجموعی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے آخر میں "کتابیات" شامل ہے۔

بلا شبہ اردو کے مایۂ ناز ادیب رشید احمد صدیقی کا شمار ان وسیع خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھیں طنزیات و مضحکات سے علمی نسبت اور طبعی مناسبت ہے ظرافت، نکتہ سنجی، بات میں بات پیدا کرنا ان کا خاص فن ہے مگر خاص بات یہ ہے کہ بہت سے مزاح نگاروں کی طرح سے ان کا قلم کبھی بھی پست ذوقی کی طرف نہیں جاتا اس لحاظ سے ان کا معیار فن بلند تر ہے۔ آپ کا انداز تحریر تیکھا پن اور بانکپن لیے ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ منفرد طرز کے ادیب ہیں، رشید احمد صدیقی کے طنز و مزاح کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر عبد المغنی لکھتے ہیں :

"رشید احمد صدیقی کی تنقیدی تخلیقات پر مشتمل تین کتابیں اس وقت میرے سامنے ہیں : طنزیات و مضحکات ، جدید غزل ، غالب کی شخصیت اور شاعری۔ ان میں پہلی ہی کتاب میرے خیال میں ان کی بہترین نقدی تصنیف ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کتاب کے موضوع سے ان کی نسبت علمی ہے اور طبعی مناسبت بھی واضح ہے۔ اس کے علاوہ اس تصنیف کے ساتھ صدیقی صاحب کے اسلوب تنقید کی بھی پوری موافقت ہے۔ طنزیات و مضحکات ظرافت اور نکتہ سنجی نیز جملہ بازی کا فن ہے جس کے صدیقی صاحب ماہر ہیں اور اس میں ان کو کمال حاصل ہے چناں چہ اس موضوع پر موصوف نے زیر نظر کتاب میں خوب خوب گل فشانیاں کی ہیں اور ایک سے ایک ہنسنے کی باتیں نکالی ہیں۔"

خواجہ محمد اکرام الدین کی یہ تصنیف دور حاضر کے ریسرچ اسکالرز کے سامنے عرق ریزی کی ایک عملی مثال ہے۔ طنز و مزاح کا جائزہ لیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

کہ : یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہنسنے کا عمل انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتا ہے کیوں کہ حیوانات اس طرح کے احساسات سے بے نیاز تو نہیں ہوتے مگر اس طرح کے رد عمل سے نابلد ضرور ہوتے ہیں انسان کبھی بے ساختہ ہنسی پر مجبور ہوتا ہے اور کبھی اضطراراً ہر دو صورتوں میں انسان کا رد عمل ہنسا ہی ہوتا ہے۔ حیات و کائنات کی اس پیچیدگی میں ہنسنے کا عمل نہ صرف ہماری طبعی احتیاج پر مشتمل ہوتا ہے بلکہ فرائڈ کے مطابق یہ مصائب سے فرار حاصل کرنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ اس عمل کا اثر انفرادی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس کا اطلاق اجتماعی زندگی پر بھی ہوتا ہے۔ مصباح الحسن قیصر کے حوالے سے مصنف نے مزاح کو ۵ چیزوں کا مرکب بتایا ہے۔

(۱) احساس برتری (۲) ناپسندیدگی (۳) تمسخر (۴) دعوت غور و فکر (۵) جذبۂ ہمدردی۔

اردو طنز و مزاح کے اسالیب کے حوالے سے آپ نے غالب کے رقعات، سجاد حسین کے اودھ پنچ، سرشار کا فسانۂ آزاد، نیز مرزا مچھو بیگ ستم ظریف پنڈت تربھون ناتھ ہجر، سجاد حیدر یلدرم، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، محفوظ سلطان حیدر جوش، ملا رموزی اور قاضی عبد الغفار کا ذکر کیا ہے۔

رشید احمد صدیقی کے معاصرین کے اسالیب کے عنوان سے تحریر کردہ باب میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا اسلوب، مرزا عظیم بیگ چغتائی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور وغیرہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

باب چہارم کو رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ کے لیے وقف کیا گیا ہے اس میں مذکور ہے کہ رشید صاحب کے اسلوب کے مطالعہ میں ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک ایسا انداز تحریر اپنایا جو قدیم سرمائے سے بالکل منفرد ضرور ہے اور ایسا کہ آنے والی نسلوں نے تقلید کی ہر ممکن کوشش کی مگر تقلید نہ ہو سکی۔ رشید صاحب جن ادیبوں سے متاثر رہے ان میں غالب، سرسید، شبلی، سجاد، شاہ نذیر غازی پوری اہم ہیں۔

رشید صاحب کی فقرہ تراشی کا کمال ان جملوں سے واضح کیا گیا ہے :

"محبت ایک فسون شباب ہے اور عورت ایک فریب حیات۔ دنیا کا ہر قانون ناجائز اور ہر بندش بے جا۔" آخری باب میں رشید صاحب کے اسلوب کے تشکیلی عناصر اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) آبائی وطن جون پور کی تہذیب و معاشرت۔
(۲) رشید صاحب کا گھریلو ماحول۔

باقی صفحہ ۴۳ پر

بڑھتے قدم۔۔۔

(ترقیاتی خبرنامہ)

مہیلا سمردھی یوجنا کی پیش رفت

مہیلا سمردھی یوجنا کو دیہی خواتین کی جانب سے حوصلہ افزا رد عمل حاصل ہوا ہے۔ ۳۰ اپریل ۱۹۹۵ء تک اس اسکیم کے تحت ڈاک خانوں میں ۱۴٫۸۸ لاکھ کھاتے کھولے گئے ہیں۔ ڈپازٹ کردہ مجموعی رقم ۵۱٫۸۸ کروڑ روپے ہے۔

صرف اپریل ۱۹۹۵ء میں ۳٫۷۷ لاکھ کھاتے کھولے گئے اور ڈپازٹ بڑھ کر ۳۰٫۷ کروڑ روپے ہو گیا۔ مہیلا سمردھی یوجنا ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو شروع ہوئی تھی۔ اس کا مقصد دیہی خواتین کو اقتصادی لحاظ سے بلند کر کے ان کی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ ۳۰ اپریل تک کھولے گئے کھاتوں کے لحاظ سے تامل ناڈو سرفہرست ہے۔ یہاں ۱۱٫۱۶ لاکھ کھاتے کھولے گئے۔ آندھرا پردیش میں ۱۵٫۶۸ لاکھ، مدھیہ پردیش میں ۹٫۸۳ لاکھ اور اتر پردیش میں ۹٫۳۰ لاکھ کھاتے کھولے گئے۔

رقومات جمع کرنے کے لحاظ سے آندھرا پردیش سرفہرست ہے۔ یہاں ۱۵٫۴۶ کروڑ روپے جمع ہوئے۔ اتر پردیش میں ۱۱٫۳۸ کروڑ، تامل ناڈو میں ۹٫۱۱ کروڑ اور کرناٹک میں ۸٫۵۸ کروڑ روپے جمع کرائے گئے۔

تمام کھولے گئے کھاتوں میں سے ۳٫۴۰ لاکھ کھاتے قبائلی علاقوں میں کھولے گئے اور ۷٫۵۳ کروڑ روپے کی رقم جمع ہوئی۔ اس زمرے میں مدھیہ پردیش، آسام اور اڑیسہ سرفہرست ریاستیں ہیں۔

اس اسکیم کو مقبول عام بنانے کے لیے ریاستوں کی جانب سے کی جانے والی کوششوں کے اعتراف میں مرکزی حکومت نے ۵۰ ہزار روپے سے لے کر ایک لاکھ روپے تک کے نقد انعامات شروع کیے

ہیں۔ ●

آٹھویں منصوبے کے لیے روزگار سے متعلق حکمت عملی

مقصد

☆ ۲۰۰۲ء تک سب کے لیے روزگار۔

نشانہ

☆ ۱۹۹۲ء-۲۰۰۲ء کی مدت کے دوران روزگار کے مواقع میں ۲٫۷ فی صد کی شرح اضافہ۔

حکمت عملی

☆ مندرجہ ذیل امور کو یقینی بنانے کے لیے نظریے کو لامرکزی اور گوناگوں بنانا:

(ا) روزگار کے بہت زیادہ مواقع والے شعبوں اور دیگر ضمنی شعبوں کی تیزی سے ترقی و فروغ۔

(ب) روزگار کے خصوصی پروگراموں کی توسیع۔

(ج) اجرتی روزگار کے پروگراموں کو دیہی بنیادی ڈھانچے کی ترقی و فروغ نیز چھوٹے اور درمیانہ درجے کے شہروں کی مربوط ترقی سے وابستہ کیا جائے گا۔

(د) منتخبہ علاقوں میں محدود روزگار کی ضمانت کے سلسلے کی شروعات۔ حکمت عملی کے اہم جزو مندرجہ ذیل ہیں، جن کی توثیق روزگار کے متعلق قومی ترقیاتی کونسل کی کمیٹی نے بھی کر دی ہے:

(ا) زراعت کی جغرافیائی اور فصل وار گوناگونی کے ذریعہ تیزی سے ترقی و فروغ۔

(ب) زراعت اور زراعت پر مبنی صنعتوں سے متعلق سرگرمیوں کا تیزی سے فروغ۔

(ج) بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانا اور ان کا پیداواری استعمال۔

(د) دیہی علاقوں میں غیر زرعی سرگرمیوں کا فروغ۔

(ہ) اشیا سازی کے چھوٹے اور لامرکزی شعبے کی ترقی و فروغ پر خصوصی توجہ۔

(و) خاص طور سے دیہی علاقوں میں صحت اور تعلیم کی بنیادی سہولیات کو مستحکم بنانا۔

(ز) مناسب امدادی نظاموں کے ذریعے خدمات اور غیر رسمی شعبے کی تیزی سے ترقی و فروغ۔

۱۹۹۲ء-۹۵ میں کی گئی پیش رفت

روزگار کے مزید ۱۸٫۷ ، ۱۸ لاکھ مواقع پیدا کیے گئے ہیں، جس سے روزگار کے مواقع میں ۹۲-۱۹۹۵ء کے دوران ۷٫۸ فی صد کے مقابلے میں سالانہ ۲٫۰۳ فی صد کی شرح اضافہ کا پتا چلتا ہے۔ ●

پیٹرول اور ڈیزل کو ماحولیات کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے اقدامات

قومی شاہراہوں پر واقع ۲۳ پٹرول دوکانوں نے غیر سیسہ آمیز پیٹرول کی فروخت شروع کر دی ہے۔ یہ دوکانیں ایسے مقامات پر واقع ہیں جو چار بڑے شہروں سے باہر جانے والی سڑکوں سے متعلق ہیں۔

وزارت پیٹرولیم اور قدرتی گیس نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ دوسرے مرحلے میں غیر سیسہ آمیز پیٹرول تمام ریاستوں کی راجدھانیوں مرکزی انتظام کے علاقوں کی راجدھانیوں میں فراہم کرایا جائے۔ یہ کام ۱۹۹۸ء تک شروع ہو پائے گا۔ تیسرے مرحلے میں غیر سیسہ آمیز پیٹرول منتخبہ پٹرول دوکانوں کے ذریعہ ملک بھر میں فراہم

کرایا جائے گا۔ یہ کام ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء تک ہوگا۔
یہاں اس بات کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ غیر سیسہ آمیز پیٹرول کو چار بڑے شہروں میں ایسی گاڑیوں کے لیے دستیاب کرانے کا انتظام کیا گیا ہے جن میں مخصوص پرزے لگے ہوں جو اس طرح کے پیٹرول کے استعمال کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ یہ فراہمی یکم اپریل ۱۹۹۵ء سے منتخب دوکانوں سے شروع ہوئی تھی۔ اب تک چار بڑے شہروں میں ۱۵۶ اپٹکر دوکانیں غیر سیسہ آمیز پیٹرول فروخت کر رہی ہیں۔

ڈیزل میں سلفر یعنی گندھک کے عناصر کو کم کرنے کی غرض سے وزارت پیٹرولیم و قدرتی گیس نے ایک پروگرام شروع کیا ہے اس کے تحت موجودہ گندھک سطح کو جو ایک فی صدی ہے گھٹا کر ۰.۵ فی صد تک لے آنا ہے۔

ہائی اسپیڈ ڈیزل میں بھی کم گندھک کی سطح والی تیل فراہم کرانے کا ارادہ ہے۔ یہ کام اپریل ۱۹۹۶ء سے ہوگا۔ ۱۹۹۹ء تک آخری مرحلے میں ہائی اسپیڈ ڈیزل میں گندھک کی آمیزش گھٹا کر ۰.۲۵ فی صد کی سطح تک کر دی جائے گی۔

مذکورہ اقدامات وزارت کے ذریعہ وضع کردہ ایک بڑے پروگرام کا حصہ ہیں اس پروگرام کا مقصد موٹر گاڑیوں کے دھوئیں سے لاحق ہونے والی آلودگی کو کم کرنا اور ایندھن کوالٹی کو وقتاً فوقتاً بہتر بنانا ہے۔ ●

پہاڑی بنجر علاقوں کے لیے زرعی جنگل بانی ماڈل

ہمالیائی علاقے میں پامال پہاڑی علاقوں کی ہریالی بحال کرنے کے لیے ایک نئی تکنالوجی وضع کی گئی ہے نیز اس پر کامیابی سے تجربہ بھی کیا گیا ہے۔ اس نئی تکنالوجی کا نام سلوپنگ ویسٹ لینڈ ماحولیاتی انجینیرنگ تکنالوجی (ایس ڈبلیو ای ای ٹی) ہے۔ اسے جی بی پنت ادارہ برائے ہمالیائی ماحولیات و ترقیات واقع الموڑہ نے ماحولیات و جنگلات کی وزارت کی نگرانی میں وضع ہے۔

مذکورہ تکنالوجی وضع کرتے وقت مختلف سماجی، سائنسی، اقتصادی، ثقافتی، ترقیاتی و ماحولیاتی پہلوؤں کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ کھیتوں کی مٹی کے کٹاؤ کی روک تھام، زرخیزی میں اضافہ، فصلوں کی پیداواریت میں اضافہ، نقد آمدنی والے پھلوں کی پیداوار

چارے کی فصل اور غیر بارش والے مہینوں میں پانی کی بہم رسانی کا انتظام کرنے کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔ ●

جنگلات لگانے کے پروجیکٹوں کے لیے ۲۱۳ کروڑ روپے کی اسکیم

مرکزی حکومت نے آٹھویں پنجسالہ منصوبے کی بقیہ مدت میں ماحولیات و جنگلات دو اسکیموں پر عمل درآمد کے لیے اضافی ۲۱۳ کروڑ روپے مختص کیے ہیں۔ مذکورہ دونوں مرکزی اسکیمیں مخصوص علاقے سے متعلق ایندھن کی لکڑی اور چارے کی اسکیمیں اور ادویہ جاتی پودوں کے تحفظ و ترقی سمیت غیر عمارتی لکڑی و جنگلاتی پیداوار کے تحفظ و ترقی کی ہیں۔

اقتصادی امور کی کابینہ کمیٹی نے اپنی میٹنگ میں مخصوص علاقوں سے مناسبت رکھنے والی ایندھن کی لکڑی و چارے کی اسکیم کو آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے دوران ۱۵۸ کروڑ روپے کی لاگت سے جاری رکھنے کو اپنی منظوری دے دی ہے۔ اس اسکیم پر ریاستی محکمۂ جنگلات اور پود کاری ترقیات کارپوریشن کے توسط سے عمل درآمد ہوگا اور لاگت کو مرکز و ریاستیں نصف نصف کی بنیاد پر برداشت کریں گی۔ کمیٹی نے اس اسکیم کو نویں منصوبے میں بھی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس اسکیم کے تحت ۳.۰۶ لاکھ ہیکٹر پامال جنگلاتی علاقے اور آس پاس کی زمینوں میں جنگلات لگانے کی تجویز ہے۔ اس سے درج فہرست ذاتوں، قبیلوں کے لوگوں، بے زمین مزدوروں وغیرہ کو ۶۸۵ افرادی دن کے بقدر روزگار فراہم ہوگا جو آس پاس کے جنگلاتی علاقے میں سکونت پذیر ہوں۔ دوبارہ وجود میں آنے والے جنگلات سے دیہی آبادی کو سالانہ بنیاد پر ۱۶ لاکھ ٹن ایندھن اور چارہ دستیاب ہوگا۔ یہ اسکیم بنیادی طور پر ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۵۵ کروڑ روپے کی تخصیص سے شروع کی گئی تھی۔ یہ ریاستی حکومتوں میں بڑی مقبول ہوئی اور انھوں نے اپنی جانب سے زیادہ رقم کی تخصیص کی تھی۔ ●

گوہاٹی راجدھانی ایکسپریس کی فری کوئنسی بڑھائی جائے گی

۲۴۲۴/۲۴۲۳ نئی دہلی۔ گوہاٹی راجدھانی ایکسپریس کی فری کوئنسی ہفتے وار سے بڑھا کر ایک ہفتے میں تین بار کر دی جائے گی۔ اس ضمن میں تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ جب تک یہ اعلان عمل میں نہیں آتا نئی دہلی۔ گوہاٹی راجدھانی ایکسپریس نئی دہلی سے ہفتے میں ایک مرتبہ ہی جایا کرے گی۔ یہ ریل گاڑی پیر کو نئی دہلی سے روانہ ہوتی ہے اور گوہاٹی سے بدھ کو روانہ ہوتی ہے۔

فی الوقت ریلوے پیداواری اکائی میں گوہاٹی راجدھانی ایکسپریس کا ایک نیا ریک زیر تکمیل ہے۔ جیسے ہی نیا ریک بن کر دستیاب ہو جائے گا گوہاٹی۔ راجدھانی ایکسپریس کی فری کوئنسی بڑھا دی جائے گی اور تب یہ گاڑی ایک ہفتے میں تین بار چلنے لگے گی۔ ●

تیز رفتار نقل و حمل مال گاڑی ڈبے

بھارت ریلوے کے تحت تحقیق و ڈیزائن ونگ نے اعلا صلاحیت والے ہو پر ویگن کی اندرون ملک ڈیزائن تیار کر لی ہے۔ اس کے ذریعہ مال کی مجموعی لدان میں ۱۳ فی صد کا اضافہ ہوگا۔ یہ ویگن ۷۰ ٹن سے کا پے لوڈ (PAYLOAD) اٹھا سکتا ہے اور دھری پر ۲۵ ٹن کے لوڈ کے اہتمام کے ساتھ وضع کیا گیا ہے۔ یہ مال گاڑی ڈبہ سو کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے کھینچا جا سکتا ہے اور اس میں ڈسک بریک لگے ہوئے ہیں۔ پروٹوٹائپ کی تیاری زیر غور ہے۔

دریں اثنا تحقیق و ڈیزائن ادارہ زونل ریلویز کے تحت رکھ رکھاؤ کے ورکشاپوں میں کام کا کوالٹی کے لحاظ سے احتساب کر رہا ہے اس سے رکھ رکھاؤ کے طریقوں کو بہتر بنایا جا سکے گا اور مختلف ریلوے ورکشاپ اپنے اپنے مقررہ نشانے حاصل کر سکیں گے۔ ●

۹۶-۱۹۹۵ء میں ۵۰۰ ڈاک گھروں کی جدید کاری

مزید ۵۰۰ ڈاک گھروں کو ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران جدید بنایا جائے گا۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۱۱۶ ڈاک گھروں کی جدید کاری عمل میں آئی تھی۔ ملک میں ڈاک خدمات کی جدید کاری کے ضمن میں وضع کردہ منصوبہ بندی کا یہ ایک حصہ ہے۔

جدید کاری سے متعلق حکمت عملی کے تحت صارفین کو زیادہ سے زیادہ تسلی بخش خدمات فراہم کرانا، ڈاک ملازمین کے لیے کام کاج کے ماحول کو بہتر بنانا شامل ہے۔ صارفین خدمات اور دیگر متعلقہ خدمات

میں بہتری لانے پر زور دیا جا رہا ہے۔

آٹھویں پنجسالہ منصوبہ کے دوران ڈاک کا محکمہ نئی ٹکنالوجی کے استعمال سے ڈاک آپریشنوں کو جدید ترین بنائے گا۔ دیگر کاموں کے علاوہ ۵۰۰۰ کثیر المقصد کمپیوٹر پر مبنی مشینیں لگائی جائیں گی تاکہ بچت بینک سمیت تمام دیگر خدمات ایک ہی کاؤنٹروں سے فراہم ہو سکیں۔ ڈاک چھانٹنے، حساب کتاب، ادویٹری کنٹرول، ذخیرہ اور اعداد وغیرہ کے ضمن میں بھی کمپیوٹر پر مبنی ٹکنالوجی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ●

دفاعی ٹیم نے ہمالیائی چوٹی سر کرلی

نہرو انسٹی ٹیوٹ آف ماؤنٹیرنگ اترکاشی کی ایک کوہ پیما ٹیم نے گڑھوال ہمالیہ میں چوکھمبا-II چوٹی سر کرلی، یہ چوٹی ۷۰۶۸ میٹر بلند ہے اور کوہ پیما اسے سر کرنا ایک دشوار امر تصور کرتے ہیں۔ ماضی میں ایک اطالوی اور دوسری کوریائی کوہ پیما ٹیمیں اس سلسلے میں ناکام واپس آئے ہیں۔

حوالدار لکشمن سنگھ اور حوالدار ایم ایس گرنگ ۹ جولائی ۱۹۹۵ء کو ۱۲:۲۵ بجے بروز اتوار اس چوٹی پر پہنچ گئے۔ اسی دن ۱۳:۱۵ بجے کرنل ایم پی یادو، میجر ایس جوشی اور سینیر انسٹرکٹر رتن سنگھ نے چوکھمبا-II چوٹی سر کرلی۔ کوہ پیمائی تاریخ میں یہ ایک قابل ذکر کامیابی ہے۔ ●

ثقافتی انجمنوں کے لیے بلڈنگ گرانٹ

ثقافت کا محکمہ ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران اپنی بلڈنگ گرانٹس کی اسکیم کے تحت رضا کار ثقافتی اداروں کے قیام کے لیے مالی امداد فراہم کرے گا۔ ادارے جو بنیادی طور پر ثقافت مثلاً رقص، ڈراما، موسیقی، فنون لطیفہ، ادب اور ہندوستانیات کے شعبے میں معروف عمل ہیں اور گزشتہ ۵ برسوں سے سوسائٹیوں کے رجسٹریشن کے ایکٹ کے تحت یا چیریٹیبل ٹرسٹ ایکٹ کے تحت درج رجسٹر ہیں اس کے لیے مستحق ہیں۔ مذہبی ادارے اور وہ ادارے جن کی کفالت مکمل طور پر ریاستی حکومتیں کرنے ذمہ ہے، اس اسکیم کے تحت گرانٹ کے لیے مستحق نہ ہوں گے۔

مذکورہ اسکیم کے تحت رقم مساوی بنیاد پر دی جائے گی۔ اس کے تحت پروجیکٹ کی تخمینہ لاگت کا پچاس فی صد بشمول زمین کی قیمت دی جائے گی۔ ایک انجمن کو زیادہ سے زیادہ دس لاکھ روپے دیے جائیں گے۔ ساز و سامان کے لیے ایک لاکھ روپے دیے جائیں گے۔

اس سلسلے میں متعلقہ فارم ریاست و مرکز میں ثقافت کے محکمے کے تحت اور سات زونل ثقافتی مراکز کے تحت دستیاب ہیں۔ حکومت ہند کا محکمہ ثقافت براہ راست کوئی درخواست قبول نہیں کرے گا۔ ●

دلیپ کمار کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ

۱۹۹۴ء کا دادا صاحب پھالکے ایوارڈ معروف فلم اداکار دلیپ کمار (محمد یوسف خاں) کو دیا گیا ہے۔ ایوارڈ حاصل کرنے والے وہ ۲۶ ویں فرد ہیں۔ اس ایوارڈ کی تشکیل ۱۹۶۹ء میں ہوئی تھی جو بھارتی سینما کی ترقی و فروغ میں تعاون کے اعتراف کے طور پر دیا جاتا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک "سورن کمل"، ایک شال ایک لاکھ روپے نقد پر مشتمل ہوتا ہے۔

دلیپ کمار ۱۱ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پشاور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا فلمی کیریر ۱۹۴۴ء میں فلم جوار بھاٹا کے ساتھ شروع ہوا۔ دو دہوں تک وہ ہندی فلموں میں سرفہرست فنکار کی حیثیت سے چھائے رہے۔ ان کی یادگار فلموں میں مغل اعظم، نیا دور، آزاد، دیدار، رام اور شیام، گنگا جمنا، انسانیت، سنگھرش، سگینہ، شکتی، محل، ودھاتا، قانون اپنا اپنا، کرما وغیرہ شامل ہیں۔ اپنے فلمی کیریر کے دوران دلیپ کمار نے فلمی صنعت کی سرکردہ فنکاراؤں مثلاً دیویکا رانی، مینا کماری، وجینتی مالا، وحیدہ رحمان، راکھی وغیرہ کے ساتھ کام کیا۔ مرد فنکاروں میں وہ پرتھوی راج کپور، راج کپور، اشوک کمار اور دیو آنند کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ انھوں نے کے۔ آصف، بمل رائے، ہری کیش مکھرجی، بی۔ آر۔ چوپڑہ اور سبھاش گھئی جیسے ڈائرکٹروں کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔

شری دلیپ کمار اب تک تقریباً سو فلموں میں کام کر چکے ہیں اور متعدد سماجی و تعلیمی انجمنوں سے وابستہ رہے ہیں۔ انھیں فلم فیئر ایوارڈز میں ۸ مرتبہ بہترین اداکار قرار دیا جا چکا ہے۔ ●

تمباکو نوشی کے بارے میں حقائق

دنیا بھر میں ۱.۱ ارب لوگ ایسے ہیں جو ہر سال ۶۰۰۰ ارب سگریٹ پیتے ہیں۔

- ترقی یافتہ ممالک میں ۴۱ فی صد مرد اور ۲۱ فی صد خواتین سگریٹ نوشی کرتی ہیں۔
- ترقی پذیر ممالک میں ۵۰ فی صد مرد اور ۸ فی صد خواتین سگریٹ، بیڑی پیتی ہیں۔
- دنیا بھر میں تمباکو نوشی کرنے والی خواتین کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔
- ترقی پذیر ممالک میں جہاں دنیا کی تین چوتھائی آبادی رہتی ہے، بالغوں میں سگریٹ کی کھپت نویں دہے کے شروع میں فی سال ۱۱۵۰ سگریٹ سے بڑھ کر دسویں دہے کے شروع میں فی سال ۱۴۰۰ سگریٹ ہو گئی ہے اور اس میں ۲ فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔
- ترقی یافتہ ممالک میں سگریٹوں کی سالانہ کھپت میں نویں دہے کے شروع میں فی بالغ ۲۸۰۰ سگریٹ سے گھٹ کر دسویں دہے کے شروع میں فی بالغ ۲۴۰۰ سگریٹ ہو گئی ہے۔
- ایک سال میں تقریباً ۳۰ لاکھ افراد کی موت سگریٹ نوشی کی وجہ سے واقع ہوتی ہے جن میں تقریباً ایک تہائی افراد کا تعلق ترقی پذیر ممالک سے ہوتا ہے۔
- اگر تمباکو نوشی کا موجودہ رجحان جاری رہتا ہے تو ۳۰ سے ۴۰ برسوں میں تمباکو نوشی کی وجہ سے ہر سال ایک کروڑ افراد کی موت واقع ہوا کرے گی جن میں سے ۷۰ فی صد افراد کا تعلق ترقی پذیر ممالک سے ہوگا۔
- ترقی پذیر ممالک میں جتنے لوگوں کی بھی موت واقع ہوتی ہے ان میں سے ۲۰ فی صد سے کم افراد کی موت اس وقت سگریٹ نوشی کی وجہ سے واقع ہوتی ہے۔
- تمباکو نوشی کے شکار ہر ۶ افراد میں سے ایک فرد کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ ۱۹۹۰ء میں عالمی تنظیم صحت کے جمع کردہ اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان میں تقریباً ۵۲ فی صد مرد اور ۳ فی صد عورتیں تمباکو نوشی کرتی ہیں۔
- ایک حالیہ برطانوی جائزے کے مطابق تمباکو نوشی ۲۴ مختلف طریقوں سے جان لیوا یا مضر ثابت ہو سکتی ہے۔
- تمباکو نوشی کرنے والی ماؤں کی وجہ سے اسقاط

عمل، پیدائش کے وقت بچوں کے کم وزن اور بچوں کی نشوونما رک جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

● باپ کی تمباکو نوشی کی وجہ سے شیر خوار بچوں کی اچانک موت کے علاوہ بچوں میں سانس کے امراض نرخرے کی نالیوں کے ورم، انفلوئنزا، زکام اور نمونیا کے زیادہ امکانات رہتے ہیں۔

● تمباکو کے دھوئیں سے پھیپھڑوں کا کینسر اور دیگر بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اس سے الرجی اور دمے کے امکانات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ ●

تمباکو نوشی سے اجتناب ضروری

تمباکو نوشی سے ہر سال پوری دنیا میں تقریباً ۳۰ لاکھ افراد کی موت واقع ہوتی ہے۔ مرنے والے ہر ۱۰ افراد میں سے ایک فرد ہندوستان کا ہوتا ہے۔ تمباکو نوشی سے مختلف طرح کے مہلک امراض لاحق ہو جاتے ہیں مثلاً پھیپھڑوں کا کینسر، منہ کا کینسر، آواز کی نلی کا کینسر، خوراک کی نلی کا کینسر، پیشاب کے بلیڈر کا کینسر وغیرہ۔

تمباکو نوشی میں ۵۰ فی صد اضافے سے کینسر کے ۲۵ فی صد امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ تمباکو سے نرخرے کی نالیوں کا ورم، فالج، شدید تناؤ، لقوہ، امراض قلب، پیٹ میں زخم، بینائی کی کمزوری اور دیگر بہت سی بیماریاں لاحق ہونے کے امکانات رہتے ہیں۔

تمباکو میں تقریباً ۴۰ ہزار کیمیاوی اجزا ہوتے ہیں۔ ان میں سے اہم نکوٹین اور تار ہیں، جن کے بہت زیادہ نقصان دہ اثرات ہوتے ہیں۔

تمباکو کے جلنے سے کاربن مونو آکسائیڈ نکلتا ہے جو زہریلا ہوتا ہے اور خون کی آکسیجن لے جانے کی صلاحیت کم کر دیتا ہے۔ نتیجتاً جسم کو کم آکسیجن ملتی ہے۔ چناں چہ تمباکو نوشی سے زہریلے اثرات آہستہ آہستہ جسم میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

مردوں، عورتوں، بچوں، غرضیکہ تمباکو نوشی کرنے والوں اور تمباکو نوشی نہ کرنے والوں دونوں پر تمباکو نوشی کے مضر اثرات ہوتے ہیں۔

تمباکو نوشی سے عورتوں پر مختلف قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں مثلاً ان کی جلد پر جھریاں پڑ جاتی ہیں، بال کمزور پڑ جاتے ہیں، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، منھ سے بدبو آنے لگتی ہے، دانت پیلے پڑ جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ان پر دیگر مضر اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔

تمباکو نوشی سے صرف وہی لوگ متاثر نہیں ہوتے جو تمباکو نوشی کرتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے آس پاس رہنے والے وہ لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں جو تمباکو نوشی نہیں کرتے۔

تمباکو نوشی کی وجہ سے ہونے والے نقصان کا اندازہ صرف جزوی طور پر ہی لگایا جا سکتا ہے۔ تمباکو نوشی کی وجہ سے تکالیف، وسائل کا نقصان، ماحولیاتی آلودگی وغیرہ وہ نقصانات ہیں جن کا اندازہ آسانی سے نہیں لگایا جا سکتا۔

اب وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس بات کی تشہیر کے لیے تحریک چلائی جائے کہ مستقبل میں تمباکو سے ہونے والے نقصانات کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ ●

۹۶-۱۹۹۵ء میں ۳۰ لاکھ فون کنکشن

ٹیلی مواصلات کے محکمے نے ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۳۰ لاکھ نئے ٹیلی فون کنکشن فراہم کرانے کا نشانہ مقرر کیا ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۹۶-۱۹۹۵ء میں مہانگر ٹیلی فون لمیٹڈ (ایم ٹی۔ این ایل) دہلی میں ۱،۲۰ لاکھ اور بمبئی میں ایک لاکھ ٹیلی فون کنکشن فراہم کرائے گا۔ مدراس میں ۲۵ء۱ لاکھ اضافی کنکشن اور کلکتہ میں .... ۹ کنکشن ہوں گے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۲۰۹۰۰۳۰ نئے ٹیلی فون کنکشن فراہم کرائے گئے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء تک ویٹنگ لسٹ ۱۳،۲۰ لاکھ پر ٹھہری ہوئی تھی۔

آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے دوران ۷۵ لاکھ لائنیں فراہم کرانے کے مقررہ نشانے کے مقابلے میں ٹیلی مواصلات کا محکمہ پہلے تین برسوں میں ۳۹،۸ لاکھ لائنیں فراہم کرا سکا ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ آزادی کے بعد ۴۴ برسوں میں ۵۰ لاکھ کنکشنوں کا اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ ۵ برسوں میں ٹیلی فون کی تعداد دوگنی ہو گئی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ۸۶۰۰۰ سے بھی کم ٹیلی فون تھے جو اب تک ایک کروڑ کے لگ بھگ ہو گئے ہیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء تک ملک میں ۱۹۲۰۰ ٹیلی فون ایکسچینج تھے اور ۹۸ لاکھ ٹیلی فون تھے۔ ●

خواتین کے روزگار کے لیے نئی ٹکنالوجیاں

خواتین کے قومی کمیشن کے ذریعہ اسپانسر مطالعے کے بعد یہ صلاح دی گئی ہے کہ زراعت میں خواتین کو مزید اختیار بنانے کے لیے نئی دستکاری ٹکنالوجیاں وضع کی جائیں۔ اس سے پیداوار میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ٹکنالوجیوں کے ضمن میں مقامی لوگوں کا عمل دخل و تربیت بھی ضروری ہوگا۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ صنف بنیاد پر خواتین کے ساتھ کوئی بھید بھاؤ نہ برتا جائے اور خواتین پر مزید بوجھ نہ لادا جائے۔ خواتین پر ان نئی ٹکنالوجیوں کے اثر پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے۔

قومی ادارہ برائے سائنس و ٹکنالوجی و ترقیات مطالعہ (این آئی ایس ٹی اے ڈی ایس) کے ذریعہ منعقد مطالعہ میں زراعت میں خواتین کے لیے سائنس و ٹکنالوجی پروجیکٹوں پر مطالعہ مرکوز کیا گیا۔ اس کے تحت ماہی گیری، ریشم کے کیڑے پالنے، ڈیری ترقیات و خوراک ڈبہ بندی اور دیگر مطالعات کی فہرست بندی ہوئی۔ اس کے علاوہ مختلف محکموں کی جانب سے اسپانسر شدہ مطالعہ پروجیکٹوں پر بھی کام ہوا۔ ●

بقیہ: ادب اور انسانیت نوازی

اور لگاؤ پیدا ہو گیا تھا جس کی تصدیق ان کے بعض خطوط سے ہوتی ہے۔

حرمت الاکرام نے بھی کلکتہ کی باہوں میں سمٹنے کے بعد ہی یہ محسوس کیا ہوگا کہ

لیلاؤں کے جزیرے دل آراؤں کے دیار
ہر ہر نظر پہ فکر و نظر کے طلسم زار
حلقے تجلیات کے ظلمات کے حصار
لے کر کہاں کہاں نہ پھری روح بے قرار

سیماب اکبر آبادی نے آگرہ کے بارے میں کیا خوب نکتے کی بات کہی ہے۔

یہ ارض تاج یعنی اکبر آباد
امین عظمت ہندوستان ہے
اسی کے سر پہ ہے وہ مرمریں تاج
جو نازش گاہ اقوام جہاں ہے

ندا فاضلی کی شام کی یہ تڑپ جمالیاتی ذوق کو حد سے زیادہ تسکین بخشتی ہے۔

سوکھے کپڑوں کو چھت سے چنتی ہوئی
پیلی کرنوں کا بار چنتی ہوئی
گیلے بالوں میں تولیہ لپٹائے
دائیں بازو پہ تھوڑی دھوپ سجائے
سیڑھیوں سے اتر کے آئی ہے

ان اشعار کا ماحول اور پس منظر خالص ہندوستانی ہے جس میں یہاں کی تہذیب کی مہک ہے۔ ●

نئی دھلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

سب ایڈیٹر : ڈاکٹر توحید خان

فون : 677591

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : کلدیپ سنگھ

جلد : ۱۵ شمارہ : ۶

ستمبر ۱۹۹۵ء (۱۰ بھادر تا ۸ آشون شک ۱۹۱۷)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن انچارج : کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (جیتا) نئی دہلی، ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطہ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

پی۔ بی۔ ناگپال

صنعت فلم سازی، چند حقائق

مصنف کا خیال ہے کہ ہندوستانی فلمی صنعت کو عموماً ایسے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے جیسے یہ شان و شوکت، نام و دولت، آرام و آسائش اور رومانس سے بھری ہو مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ جب ہم سینما کے سو سال پورے ہونے کی تقریب منا رہے ہیں ہندوستان فلم سازی کے میدان میں سب سے آگے نکل گیا ہے، لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ترقی پذیر ملک ہونے کے باوجود ہمارے یہاں ہر سال اتنی زیادہ فلمیں بن رہی ہیں تو کسی قدر حیرت ہوتی ہے۔

اگرچہ مختلف وجوہات کے سبب گزشتہ چند برسوں میں ملک میں بننے والی فلموں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے پھر بھی ہمارے یہاں مختلف زبانوں میں ہر سال آٹھ سو سے زیادہ فیچر فلمیں بنتی ہیں۔ ہندوستانی سینما ۸۰ کی دہائی کے وسط میں نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد وڈیو کیسٹس کا انقلاب آیا، تیز رفتاری سے ٹیلی ویژن کی توسیع ہوئی، کیبل ٹی وی آیا اور سٹیلائٹ چینلوں کی دوڑ شروع ہو گئی۔

ہندوستانی سینما ۱۹۸۵ء میں نئی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ اس سال ملک میں ۹۱۲ فلمیں بنی تھیں جب کہ ۱۹۸۰ء میں ۷۴۲، ۱۹۸۲ء میں ۷۶۳ اور ۱۹۸۴ء میں ۸۳۳ فلمیں بنائی گئی تھیں۔ لیکن اس کے بعد یہ تعداد رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ سٹیلائٹ انقلاب کے آنے سے قبل ۱۹۹۰ء میں ہندوستان میں سب سے زیادہ ۹۴۸ فیچر فلمیں بنی تھیں۔ یہ تعداد گھٹ کر ۱۹۹۱ء میں ۹۱۰ اور ۱۹۹۲ء میں ۸۳۶ ہو گئی۔ مزید کمی کے بعد یہ تعداد ۱۹۹۳ء میں ۸۱۲ اور ۱۹۹۴ء میں ۷۵۵ پر آگئی۔ رواں انگریزی سال میں یکم جنوری سے ۳۱ مارچ تک صرف ۱۷۹ فلمیں بنیں۔ تین ماہ کی مدت کے لیے یہ تعداد کم معلوم ہوتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود فلم سازی کی رفتار میں کوئی ڈرامائی کمی واقع نہیں ہوئی ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے فلم سازی کے شعبے میں کام کرنے والے بیشتر لوگ اس میڈیا سے پیار کرنے لگے ہیں اور وہ اونچے ٹیکس اور سینما گھروں میں فلم بینوں کی تعداد میں کمی اور دوسری دقتوں کے باوجود فلمیں بنانا جاری رکھیں گے۔

اگرچہ سینما ہندوستان میں جولائی ۱۸۹۶ء میں آیا تھا جب لومیئر برادرس نے بمبئی کے واٹسن ہوٹل میں اپنی ایجاد کی نمائش کی تھی۔ تاہم ۱۹۱۳ء کو ہندوستان میں سینما کے آغاز کا سال مانا جاتا ہے کیوں کہ ہندوستان میں پہلی فلم اسی سال بنی تھی۔ اس کا نام تھا "راجہ ہریش چندر"۔ یہ فلم دادا صاحب پھالکے نے بنائی تھی جنھیں ہندوستانی سینما کا "جنم داتا" تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ہندوستانی سینما نے دھیرے دھیرے ترقی کی منزلیں طے کرنا شروع کیں لیکن سینما عام آدمی کا ذریعۂ تفریح ۱۹۳۱ء میں ہی بنا جب اردشیر ایرانی نے پہلی بولتی فلم "عالم آرا" بنائی۔ موضوع کے اعتبار سے ہندوستانی سینما دھارمک سے تاریخی فلموں تک گھریلو اور سماجی فلموں سے رومانی فلموں تک، تصوراتی فلموں سے لے کر حقیقت پسندانہ فلموں تک مختلف ادوار سے گزرا ہے۔ آزادی سے قبل ان موضوعات کو انگریزی حکمرانوں کے خلاف ہندوستانیوں کو جگانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ماہنامہ تحریک دہلی

اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ

ہماری فلم انڈسٹری کے سپنوں کے سوداگروں نے راہ ترقی پر قدم بڑھاتے ہوئے قومی کردار ادا کرنے والی فلمیں بنائی ہیں جنھوں نے ذات پات، نسل ومذہب اور جغرافیائی وطبقاتی حدود کو عبور

کرتے ہوئے لوگوں میں اتحاد و ہم آہنگی کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہندوستانی فلمیں تمام طبقوں، ریاستوں اور خطوں کو متحد کرنے کا سب سے طاقتور ذریعہ ہیں کیوں کہ وہ تماشائیوں میں یہ احساس پیدا کرتی ہیں کہ وہ کہیں بھی ہوں ان کا دکھ سکھ، ان کی خوشیاں اور غم، ان کے آنسو اور ان کی اداسی سبھی جگہوں پر ایک جیسی ہے۔

فلم میڈیا — فلمی رسائل اور اب ویڈیو اور ٹیلی ویژن میگزین ہمیشہ فلم انڈسٹری کو ایک دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ فلمی دنیا کی زندگی شان وشوکت، چمک دمک، نام ودولت، آرام وآسائش اور رومانس سے بھرپور ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کوئی اور بات حقیقت سے اتنی بعید نہیں ہو سکتی۔

جتنا کہ یہ خیال ہے۔ گو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سینما ایک خیالی اور تصوراتی دنیا پیش کرتا ہے تاہم جو لوگ فلم انڈسٹری میں کام کرتے ہیں وہی جانتے ہیں کہ انھیں کتنی محنت کرنی پڑتی ہے اور کن کن تکلیفوں اور مصیبتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

بھاری سرمایہ کاری

ایک اندازے کے مطابق تقریباً چھ لاکھ افراد براہ راست یا بالواسطہ طور پر فلم انڈسٹری سے روزی کماتے ہیں۔ ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اسٹوڈیو یا فلموں کی تقسیم کا کام کرتے ہیں۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری کے تمام شعبوں میں بھاری سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اس کے اعداد وشمار حسب ذیل ہیں:

تقسیم اور ڈسٹری بیوشن: ۵۰۲۵ کروڑ روپے، تقسیم کار کی یونٹوں: ۵۰۴ کروڑ روپے، مستقل سینما اور ٹورنگ ٹاکیز: ۱۲۰۰ کروڑ روپے، لیبارٹریاں: ۴۰ کروڑ روپے، ریکارڈنگ اسٹوڈیوز: ۴۰ کروڑ روپے، ڈسٹری بیوشن (تقسیم کاری) آٹھ کروڑ روپے، درآمدات وبرآمدات، ساز وسامان وغیرہ کے اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔

باکس آفس کی مجموعی آمدنی پر ٹیکس کا اندازہ تقریباً ۱۱ سو کروڑ اور خالص آمدنی پر ۶ سو کروڑ روپے سے کچھ کم ہے۔ ریاستی حکومتوں کے عائد کردہ تفریحی ٹیکس کی رقم تقریباً ۵۴۰ کروڑ بنتی ہے۔ دیگر ٹیکسوں سے قریباً دو کروڑ روپے کی وصولی ہوتی ہے۔

عمومی طور پر دیکھا جائے تو فلم پروڈکشن پر ہر سال تقریباً ۳۰۰ کروڑ روپے کا سرمایہ لگایا جاتا ہے اور ایک فلم بنانے پر اوسطاً ۷۵ لاکھ روپے سے ایک کروڑ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ ایک فلم سے فی علاقہ اوسطاً ۱۵ لاکھ روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فلم بنانا کتنا مشکل کام ہے۔

باکس آفس کی آمدنی

ملک میں تقریباً ۱۳ ہزار سینما گھر ہیں۔ ان میں سے قریباً ۹ ہزار مستقل نوعیت کے تھیٹر ہیں اور باقی ٹورنگ (سفری) یا ملٹری سینما ہیں۔ ملک بھر کے سینماؤں میں ہر ہفتے تقریباً ڈیڑھ کروڑ افراد فلمیں دیکھتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ۹۵-۱۹۹۴ء میں تقریباً ۱۶۰ تھیٹر مختلف وجوہات سے بند رہے۔

گزشتہ سالوں میں باکس آفس کی آمدنی میں اضافہ ہوا مگر وہ زیادہ تر ٹکٹوں کے دام بڑھنے کی وجہ سے ہوا۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں تفریحی ٹیکس کاٹ کر ۲۳۵ کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی جو بڑھتے بڑھتے ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۲۸۶ کروڑ، ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۳۴۸.۱۰ کروڑ اور ۸۹-۱۹۸۸ء میں ۶۹۶.۵۱ کروڑ روپے ہو گئی۔

فلموں پر ٹیکس سے ریاستی حکومتوں کو ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۲۲۵ کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی جو ۸۸-۱۹۸۷ء میں ۵۲۵ کروڑ روپے تک پہنچ گئی۔

درآمدات وبرآمدات

چند سال پہلے تک تمام درآمدات وبرآمدات کی ذمہ داری پبلک سیکٹر کے ادارہ نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن (این ایف ڈی سی) پر

دا کرنی تھی۔ تاہم اب درآمدات اور برآمدات کی اجازت ہے اور این ایف ڈی سی کو اس میدان میں بھی کاروباری اداروں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

اس وقت ہماری فیچر اور غیر فیچر فلمیں تقریباً ۹۰ ملکوں کو برآمد کی جا رہی ہیں۔ ان میں بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں کوئی ہندوستانی آبادی نہیں ہے۔

۸۰-۱۹۷۹ء میں فلموں کی برآمدات سے صرف ۱۲ کروڑ روپئے سے کچھ زیادہ کی آمدنی ہوئی تھی۔ لیکن

نوے کی دہائی میں برآمداتی آمدنی میں بتدریج اضافہ ہوا ہے اور اب وہ بشمول فیچر فلموں، ڈاکیومنٹری فلموں اور اشتہاری فلموں کے ۵۰ کروڑ روپئے تک پہنچ گئی ہے۔

ہندوستان کی درآمدات زیادہ تر این ایف ڈی سی کی وساطت سے ہوتی ہیں۔ فلمیں درآمد کرنے کے لیے بھی درآمد کاروں کو اپنا نام درج رجسٹر کروانا پڑتا ہے۔ اس لیے درآمدات کی مالیت کا پتا لگانا مشکل ہے۔ تاہم این ایف ڈی سی دس برس سے زیادہ عرصے سے منافع کما رہی ہے۔

ملک میں ایک سال میں کل جتنی فلمیں بنتی ہیں ان میں تقریباً ۲سو ہندی فلمیں ہوتی ہیں جن میں کچھ مدراس میں بنائی جاتی ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ملک میں ہر سال تقریباً ۳سو ہندی فلمیں بنانے کا اعلان کیا جاتا ہے لیکن ۲سو سے کم فلمیں ہی بن پاتی ہیں۔ باقی یا تو ادھوری چھوڑ دی جاتی ہیں یا ان کے بننے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔

مشہور فلم ساز اَمِت کھنہ نے جو پلس چینل سے وابستہ ہیں، ۱۹۸۰ء میں ایک سروے کیا تھا۔ اس سروے کے مطابق اس سال ۳سو فلمیں شروع کی گئی تھیں مگر اس میں سے صرف ۱۵۰ ہی مکمل ہوئیں۔ کل سو فلمیں ریلیز کی گئیں جن میں صرف ۵ فلمیں ہٹ ہوئیں۔ مزید ۵ فلمیں اوسط درجے کی ہٹ فلمیں نکلیں، دس فلموں کی لاگت اور آمدنی برابر رہی جب کہ ۸۰ فلموں میں نقصان ہوا۔

یوجنا، نئی دہلی

اس سال فلموں میں ۵۰۰ کروڑ روپئے کا سرمایہ لگایا گیا تھا۔ سرمائے کی مد میں ۵۰ کروڑ روپئے کا نقصان ہوا۔ اس کے باوجود سال کے آخر میں ۲سو فلمیں زیر تکمیل تھیں۔

ملک میں ہر سال تقریباً ۲۵ زبانوں اور مقامی بولیوں میں فیچر فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں ۲۵ زبانوں اور بولیوں میں فلمیں بنائی گئیں اور انھیں سینٹرل بورڈ آف فلم سرٹیفکیشن کے ۹ مختلف علاقائی دفاتر سے نمائش کے لیے سرٹیفکٹ جاری کیے گئے۔

تیلگو میں سب سے زیادہ ۱۷۴ فلمیں بنیں، ہندی ۱۵۶، تامل میں ۱۵۳۔ اور کنڑا اور ملیالم زبانوں میں ۷۰-۷۰، بنگالی میں ۴۴ اور مراٹھی میں صرف ۲۲ فلمیں بنائی گئیں۔ چار فلمیں انگریزی میں اور کل چھ فلمیں تلو، بنا جیلی، ہریانوی اور کوڈوا مقامی بولیوں میں بنائی گئیں۔

تقریباً دس برس پہلے تک تمام فلمیں صرف بمبئی اور مدراس ہی میں سنسر کی جاتی تھیں یا ان کی نمائش کے لیے سرٹیفکیٹ وہیں سے جاری کیے جاتے تھے۔ اگرچہ سینٹرل بورڈ آف فلم سرٹیفکیشن کا صدر مقام بمبئی ہے، تاہم اس کے نو علاقائی دفاتر بمبئی، کلکتہ، مدراس، دہلی، بنگلور، گوہاٹی، ترواننت پورم، حیدرآباد اور کٹک میں کام کر رہے ہیں۔

سال زیر تبصرہ کے دوران بمبئی کے دفتر نے ۲۱۰ فلموں کے سرٹیفکیٹ جاری کرکے سرفہرست رہا۔ صرف جنوبی ہند کے دفاتر ہی نے مجموعی طور پر ۵۶۴ فلموں کے سرٹیفکیٹ جاری کیے۔

فلمی ستاروں کی آمدنی کے بارے بھی کئی غلط کہانیاں مشہور ہو گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ میگا اسٹار امیتابھ بچن کسی وقت ایک فلم سے ۵۰ لاکھ روپے کماتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے ہمیشہ اس کی تردید کی ہے۔ لیکن یہ بات تو یقینی ہے کہ فلمی شخصیتیں ملک کے سب سے زیادہ ٹیکس ادا کرنے والے لوگوں میں شمار ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کے ادا کیے ہوئے ٹیکس کے بارے میں اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں تاہم ۹۴-۱۹۹۳ء کے اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹ فلمی شخصیتوں کے ذمہ ٹیکس کا ۱۲٫۱۹ کروڑ روپیہ واجب الادا تھا اور فرداً فرداً ان میں سے ہر شخص کو زائد از دس لاکھ روپیہ ادا کرنا تھا اور کم از کم تین فلمی شخصیتیں اس وقت زندہ نہیں تھیں۔

ہندوستانی سینما کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈس میں بھی آگیا ہے۔ اس کے مطابق بھی ہندوستان ہر سال سب سے زیادہ فلمیں بنانے والا ملک ہے، جگدیش راج نے سب سے زیادہ فلموں میں پولیس افسر کا رول ادا کیا ہے، آنجہانی پریم نذیر نے سب سے زیادہ ۶سو فلموں میں رومانی ہیرو کا رول ادا کیا ہے، لتا منگیشکر نے فلموں میں سب سے زیادہ گانے گائے ہیں۔ یہ گلوکارہ ۲۰ ہزار گانے گا چکی ہے۔
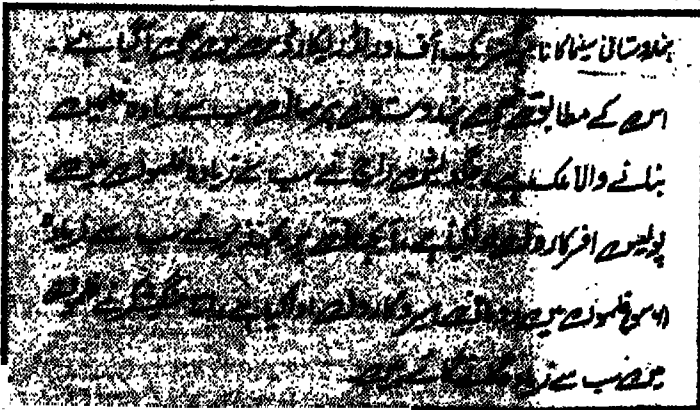
یہ امر باعث فخر ہے کہ ہندوستان نے دنیا کو ستیہ جیت رے جیسا ماہر فلمی صناع دیا

باقی صفحہ ۲۹ پر

جان ڈی سی شنکر امنگلم

فلم سازوں کی تربیت

سینما کو اتنی طویل تاریخ کے ہر موڑ پر تکنالوجی کے مختلف ذرائع سے بیش قیمت اور غیر معمولی امداد ملتی رہی ہے اور سینما کی موجودہ طاقت اور خوبصورتی تکنالوجی ہی کی مرہون منت ہے۔ سینما اور ٹیلی ویژن کا مستقبل اعلا تربیت یافتہ تکنیکی ہاتھوں میں ہے۔

مجھے حال ہی میں سینما کے ایک معلّم کی تقریر سننے کا موقع ملا جو پچھلی صدی جس میں کہ سینما کا جنم ہوا تھا، میں بنائی گئی فلموں کی تعریف میں مبالغہ آمیزی سے کام لے رہا تھا۔ وہ اپنے سامعین کو تفصیل سے ان پرانی خاموش فلموں کے بارے میں بتا رہا تھا جن کے بارے میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔ وہ ایک صدی پرانی فلموں کے غیر تسلیم شدہ حسن اور جمالیاتی اقدار کی حد سے زیادہ تعریف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس ضمن میں وہ خاص طور سے لوئی لومیئر، ایڈ ون ایس پورٹر اور جارج میلیز کا ذکر کر رہا تھا۔ کوئی بھی ان کی فلموں کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ عظیم تخلیق اور جمالیاتی قدروں کی حامل تھیں۔ یہ فلم ساز ہاتھ میں تھامے جانے والے کیمرے سے دلچسپ مناظر کی تصویر کشی کرتے تھے۔ اسے زیادہ سے زیادہ ایک شوق کی تکمیل کہا جا سکتا تھا، تخلیقی جوہر کا استعمال نہیں۔ سینما کی ایجاد کی صدی میں تیار ہوئی فلموں کے بھونڈے پن کو چھپایا نہیں جا سکتا۔

سو سال بعد سینما اپنے ابتدائی دور یا شوقیہ فلم سازی کے زمانے سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ اب یہ جوان ہو چکا ہے لیکن کون جانے کہ اب کدھر جا رہا ہے۔ کیا ہم سینما کی موت کی دہلیز پر کھڑے ہیں؟ یا ایک نئی شکل میں اس کا دوبارہ جنم ہونے والا ہے؟

سینما تفریح کا سب سے سستا ذریعہ ہے اور عوام میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ یہ غریب اور امیر کا یکساں دل بہلاتا ہے۔ سینما دوسرے تمام فنون سے الگ ہے۔ یہ خالصتاً ایک مصنوعی آرٹ ہے جو تکنالوجی کی ایجادات سے پیدا ہوا ہے۔ اگر آپٹکس اور فوٹو کیمسٹری کی سائنس نہ ہوتی تو یہ پیدا بھی نہیں ہوتا۔ سینما کو اپنی طویل تاریخ کے ہر موڑ پر تکنالوجی کے مختلف ذرائع سے بیش قیمت اور غیر معمولی امداد

یہ خالصتاً ایک مصنوعی آرٹ ہے جو تکنالوجی کی ایجادات سے پیدا ہوا ہے۔ اگر آپٹکس اور فوٹو کیمسٹری کی سائنس نہ ہوتی تو یہ پیدا بھی نہیں ہوتا۔

ملتی رہی ہے اور سینما کی موجودہ طاقت اور خوب صورتی اسی کی مرہون منت ہے۔ ایک سو سال کے اندر سینما ایک بہت خوبصورت اور نفیس اظہار بن گیا ہے۔ اس لیے سینما کے پیچھے جو تکنالوجی ہے اسے سمجھے بغیر محض نظریاتی مطالعوں سے سینما کو پوری طرح سمجھنے میں مدد نہیں ملے گی۔ اگر سینما کا کوئی پرستار سینما کے تکنالوجیکل بنیاد کے بارے میں نہیں جانتا تو سینما پر کوئی تحریر، کوئی تقریر، کوئی تبصرہ یا کوئی تجزیہ محض اوپری سطح کو کھرچنے کے مترادف ہوگا۔

خاموش فلموں کے زمانے میں ایسے کیمرے استعمال کیے جاتے تھے جنھیں ہاتھ میں پکڑ کر فلم کھینچنا پڑتی تھی۔ پھر وہ وقت آیا جب فلم کی ریل چلانے کی معیاری اسپیڈ حاصل کی گئی۔ جب بولتی فلمیں آئیں تو اونچی آواز کے لیے ۲۴ فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے ریلیں چلائی جانے لگیں۔ عمدہ قسم کے کیمرے تیار ہوئے اور سیاہ و سفید فلموں کی بجائے رنگین فلموں کا دور شروع ہوا۔ فوٹو کیمسٹری اور آپٹکس کے شعبے میں نمایاں پیش رفت ہوئی۔ ٹیلی ویژن کو مقابلے سے ہٹانے کے لیے سینما کے اسکرین کا سائز بڑھایا گیا۔ یہ سبھی مرحلے تکنالوجی کی پیش رفت کے مظہر تھے۔ ان کے نظریاتی، عملی اور تخلیقی پہلوؤں پر گہری نظر ڈالنا ضروری ہے۔ یہاں اٹھتا ہے فلم سازوں کو تربیت دینے کا سوال۔

سینما کا پہلا جامع ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بالشویک انقلاب کے بعد ماسکو میں قائم کیا گیا تھا۔ دنیا کے سب سے پہلے کمیونسٹ ملک کے مارکسٹ اور لیننسٹ نظریات کی تشہیر کے لیے سینما کو ایک طاقتور میڈیم تصور کیا گیا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ سینما کو ایک نیا اور ابھرتا ہوا آرٹ

سینما کی ابتدا ہی سے توجہ دی جائے۔ ۲۰ کی دہائی میں سینما کے سنہری دور کے دوران جرمنی میں کیے گئے عظیم تجربات و اختراعات نے اور بعد ازاں دوسری عالمی جنگ میں ہٹلر کے جنگی محکمے کے تحت پروپیگنڈہ فلموں کے بھاری اثر نے اس میڈیم کو عوام کی تفریح کا ایک اہم ذریعہ بننے میں مدد دی۔ جنگ کے دوران ٹکنالوجیکل اور جمالیاتی ترقی کا سینما کی ٹکنالوجیکل ترقی پر براہ راست اثر پڑا۔ اسٹوڈیو میں اس وقت بھاری کیمرے استعمال کیے جاتے تھے لیکن سینما کے لیے اسٹوڈیو سے باہر فلم بندی کا سلسلہ شروع ہوا تو ہلکے پھلکے کیمروں اور ایسی روشنیوں کی ضرورت محسوس کی گئی جنھیں بآسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکے۔ فلموں میں حقیقت پسندی کا زور بڑھا اور جنگ کے بعد کے زمانے کے سماجی و اقتصادی عناصر کے زیر اثر ایسی فلمیں بنیں جنھیں نئی حقیقت پسندانہ فلموں کا نام دیا گیا۔ خلائی عہد میں اہم واقعات کو ریکارڈ کرنے کی ضرورت اور تحقیقی کوششوں کے نتیجے میں خصوصاً آپٹکس فوٹو کیمسٹری اور الیکٹرانکس میں شبیہہ سازی (PICTURE FORMULATION) کے عمل میں مزید نفاست آئی۔ اگرچہ شروع شروع میں اس کا استعمال خلائی پروگراموں کی نمایاں پیش رفتوں کو ریکارڈ کرنے کے لیے کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ اسے سینما کے لیے بھی بروئے کار لایا گیا۔ امریکہ میں زیر زمین فلمیں بنانے کے لیے کیے گئے تجربات سے بھی سینما کو ایک نئی سمت ملی۔

ٹیلی ویژن ٹکنالوجی میں نئی اختراعات کا سینما کی امیج ٹکنالوجی (IMAGE TECHNOLOGY) پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ ابتدائی ادوار میں الیکٹرانک کیمرے سے حاصل ہونے والی شبیہہ اتنی عمدہ نہیں ہوتی تھی جتنی کہ ایک فلم کیمرے سے حاصل ہونے والی تصویر ہوتی ہے۔ ریسرچ کرنے والے محققین نے سرگرم کوششیں کیں جن کے نتیجے میں اب الیکٹرانک کیمرہ تصویر سازی اور کلر پروڈکشن میں فلم کیمرے کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ ہائی ڈیفنیشن ٹیلی ویژن میں کیے جا رہے تجربات سے شبیہہ سازی کی ٹکنالوجی کو حد کمال تک پہنچانے میں مدد مل رہی ہے۔

ہالی ووڈ کی سائنسی افسانوں پر مبنی فلموں کی عظیم کامیابی اور اسپیشل ایفیکٹس یعنی فلموں میں طرح طرح کی آوازیں بھرنے کے فن کو حد کمال تک پہنچانے کے لیے سائنٹفک ذہنوں کی انتھک کوششیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ سینما اور ویڈیو ٹکنالوجی کو ایک ساتھ جینا ہوگا۔ وہ وقت بہت دور نہیں ہے جب ان دونوں کو ڈیجیٹل ٹکنالوجی میں مکمل ہم آہنگی نظر آئے گی۔ سینما اور ٹیلی ویژن دونوں کے میکنیکی ماہرین ایسے طریقے تلاش کر رہے ہیں جن سے اسکرین پر بہترین آواز اور بہترین تصویر پیش کی جا سکے۔

ڈیجیٹل ٹکنالوجی اور شبیہہ سازی (PICTURE FORMULATION) میں کمپیوٹر سافٹ ویئر کے بے پناہ استعمال کی وجہ سے بصری اور سماعی مقاصد کے لیے تجربہ کرکے غلطیوں سے سیکھنے کا طریقہ قریب قریب ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سینما اور ٹیلی ویژن کا مستقبل اعلا تربیت یافتہ تکنیکی ہاتھوں میں ہے۔

لومیئر اور لوپرٹ نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ سینما سو سال بعد اتنی ترقی کرے گا۔ اسی طرح ماسکو میں بالشویک انقلاب کے فوراً بعد قائم کیے گئے اولین فلم انسٹی ٹیوٹ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ کبھی مختلف ملکوں میں اتنے زیادہ فلم انسٹی ٹیوٹ کھل جائیں گے۔ آج ۵۲ سے زیادہ ملکوں میں زائد از ۹۸ فلم اینڈ ٹیلی ویژن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کام کر رہے ہیں۔ شروع میں ان میں سے بیشتر انسٹی ٹیوٹوں میں صرف فلم کی تربیت دی جاتی تھی لیکن آج انھوں نے اپنے نصابات میں ٹیلی ویژن کی تربیت کو بھی شامل کر لیا ہے۔

ہندوستان میں فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا ۱۹۶۱ء میں پونے میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ بھی حال اور مستقبل کی ضرورتوں کے مطابق اپنے نصابات میں تبدیلیاں کرتا رہا ہے۔ تربیت میں نئی ٹکنالوجیوں کو بھی شامل

باقی صفحہ ۱۱۱ پر

ستمبر ۱۹۹۵ء

یوجنا نئی دہلی

ٹیلی ویژن ٹکنالوجی میں نئی اختراعات کا سینما کی امیج ٹکنالوجی (IMAGE TECHNOLOGY) پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔ ہالی ووڈ کی سائنسی افسانوں پر مبنی فلموں کی عظیم کامیابی اور اسپیشل ایفیکٹس یعنی فلموں میں طرح طرح کی آوازیں بھرنے کے فن کو حد کمال تک پہنچانے کے لیے سائنٹفک ذہنوں کی انتھک کوششیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ سینما اور ویڈیو ٹکنالوجی کو ایک ساتھ جینا ہوگا۔

اگر سینما کا کوئی پرستار سینما کی ٹکنالوجیکل بنیاد کے بارے میں نہیں جانتا تو سینما پر کوئی تحریر، کوئی تقریر، کوئی تبصرہ یا کوئی تجزیہ محض اوپری سطح کو کھرچنے کے مترادف ہوگا۔

ہندوستان میں فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا ۱۹۶۱ء میں پونے میں قائم کیا گیا تھا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ بھی حال اور مستقبل کی ضرورتوں کے مطابق اپنے نصابات میں تبدیلیاں کرتا رہا ہے۔ تربیت میں نئی ٹکنالوجیوں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ داخلے کے لیے طلباء کے انتخاب میں کافی احتیاط برتی جاتی ہے۔

رتنوتم سین گپتا

غیر روایتی سینما

غیر روایتی سینما سے ہماری مراد وہ سینما ہے جس کی جڑیں شاید ہندوستانی سینما کی انسانی اور سماجی طور سے معنی خیز تہذیب میں پیوست ہیں۔ یہ کچھ متعین انسانی قدروں سے پہچانا جاتا ہے اور سماجی مسائل سے اس کا ایک خاص تعلق ہے۔

پوری دنیا میں سینما اور سماج کا آپس میں ایک گہرا رشتہ ہے اگرچہ یہ رشتہ ہمیشہ نظر نہیں آتا۔ لاکھوں افراد کی سوچوں کو اپنے سحر میں گرفتار کرنے والی ٹکنالوجی اور تخلیقیت کی یہ اولاد ایسے فن لطیف کی طرح جو تفریح کے ساتھ ساتھ سماج کے ضمیر کی پاسبانی کرتا ہے، پوری دنیا پر حکمراں ہے۔ اسی طرح اس سے پہنچنے والا نقصان بھی بے پایاں ہوگا یہی وجہ ہے کہ برطانیہ جیسا ماڈرن اور تکنیکی اعتبار سے ترقی یافتہ سماج بھی اس خبر یا افواہ کی بنیاد پر کہ نیچرل بارن کلرس فرانس میں ایک اشتعال انگیز حادثہ کا سبب ہوئی ہے فلم پر پابندی عائد کر دیتا ہے۔ یہ دوسری تمام فلموں کے برعکس پوری طرح تشدد میں ڈوبی ہوئی ہے۔ کیا یہ ردعمل شدید ہے؟ ممکن ہے۔ مگر کوئی بھی سماج یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوگا۔ اگر ایسے کسی سنگین حادثہ کا سامنا ہو کہ ٹیلی ویژن پر کوئی منظر دیکھ کر کوئی چھوٹا سا بچہ اپنے سے بھی چھوٹے دوسرے بچے کو مار ڈالے۔ اب اگر اپنے ہی وطن میں اس کے یہ اثرات ہو سکتے ہیں تو ہندوستانی سماج پر اس کے اثر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کوئی اور نہیں بلکہ جواہر لال نہرو نے سینما کو دورِ جدید کا سب سے مؤثر ذریعہ کہا ہے۔ بقول ان کے "بہت سی چیزیں لوگوں کو متاثر کرتی ہیں، کتابیں، اخبارات وغیرہ وغیرہ، لیکن میرے خیال سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ہندوستان میں سینما کا اثر اخبارات و کتب سے کہیں زیادہ ہے اور شائد یہ اثر ہندوستان کی جنوبی ریاستوں سے زیادہ واضح کہیں نہیں جہاں ایک کے بعد دوسرے وزیر اعلیٰ فلم بین طبقہ میں اپنی مقبولیت کی بنا پر سیاسی بام تک پہنچ گئے۔"

نہرو نے ٹیلی ویژن کا ذکر نہیں کیا ہے جو ہندوستان میں داخل ہونے والا تھا۔ آج کے سیاق و سباق میں جبکہ سینما خود بھی ٹیلی ویژن کے زیر اثر محسوس ہوتا ہے، ان کا یہ تجزیہ صحیح ہے کیوں کہ فلمی تخلیقات پر مبنی پروگرام

> **کوئی اور نہیں جواہر لال نہرو نے سینما کو دور جدید کا سب سے مؤثر ذریعہ کہا ہے**

ناظرین کی ایک بڑی تعداد کے لئے زیادہ کشش رکھتے ہیں اگر "سپرہٹ مقابلہ" کی شہرت کا تقابل کیا جا سکتا ہے تو اسی طرح سے فلمی گانوں پر مبنی دوسرے پروگرام مثلاً فلپس ٹاپ ٹین' اور بی پی ایل اونے سے اور فلمی گانوں کے بارے میں اب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جن فلموں کے لئے یہ گانے لکھے جاتے ہیں ان کا ایک نمونہ سمجھے جاتے ہیں اور پورے ملک میں فلموں کی کامیابی کا دار و مدار بڑی حد تک ان ہی گانوں پر ہوتا ہے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ اگر چولی کے پیچھے' یا 'سرکائی لیو کھٹیا' جیسے گانوں سے ہماری قدروں کی پامالی کا احساس ہوتا ہے تو ایک شور برپا ہو جاتا ہے۔

یہ ہے وہ سیاق و سباق جس کے ضمن میں غیر روایتی سینما کے بارے میں بات کرنا چاہوں گا۔ ایسے وقت میں جب کہ معاشی اصلاحات زندگی کے ہر شعبہ کو ایک نئی شکل عطا کر رہی ہیں۔

عام روش سے الگ یا غیر روایتی

آکسفورڈ ڈکشنری کے حوالے سے "آف بیٹ" کا مطلب ہے غیر معمولی، عجیب و غریب یا غیر روایتی۔ شاید آخری لفظ "آف بیٹ" کے مفہوم کو صحیح طور سے ادا کرتا ہے جو ان فلموں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو یقینی کامیابی والے فارمولوں یا روایات پر پوری نہیں اترتیں مگر ہندوستان کو سب سے زیادہ فلمیں بنانے والے ملک کا مبہم اعزاز عطا کرتی ہیں۔

جب ہم "آف بیٹ" سینما کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مدعا مخصوص فلمیں ہیں جن کی جڑوں شائد ہندوستانی سینما کی انسانی اور سماجی طور سے معنی خیز سینما سے وابستہ ہیں جیسے ہم راہی، دو بیگھہ زمین، ہیڈ ماسٹر، آدمی، مدر انڈیا، آوارہ، پیاسا، سُجاتا وغیرہ۔ فلمیں جو نسلی تعصب، سوشلزم، ذات پات عورتوں کی سماجی حیثیت سے متعلق ہیں اگرچہ ان میں سے کوئی بھی "آف بیٹ" نہیں۔ یہ سب اسی معروف سینما کا حصہ تھیں۔ ان میں سے ہر فلم کسی نہ کسی سماجی مسئلہ پر مبنی تھی جو ہمارا اس آدمی کا مسئلہ تھا جس نے صدیوں کی غلامی، جاگیردارانہ نظام اور تنگ نظر بھائیوں کی متعصبانہ خونریزی کے بعد آزادی اور جمہوریت حاصل کی تھی اور ان میں سے ہر فلم بھی سرمایہ سے تیار

کی گئی تھی۔

یہ تحریک جسے "نیو آف بیٹ سینما" سے تعبیر کرتے ہیں کچھ متعین انسانی قدروں سے پہچانی جاتی ہے انھوں نے ہمیشہ غریبوں اور مظلوموں کی بے چارگی کا اظہار کیا۔ سبھی نے یکساں طور پر سماج اور سماج کی متعین

چالیس کا زمانہ ہندوستانی سینما کی تاریخ کے لیے ایک موثر تھا جو ۱۹۳۰ء کے عشرہ میں پورے شباب پر تھا۔ یہ وہ دور تھا جب مہاتما گاندھی ملک کو نئے عزائم دے رہے تھے۔ اس ماحول نے فلم سازوں کو بھی ایک آدرش دیا۔

قدروں پر رہی مگر انسان اور انسان کی باغیانہ خوبا حالات کو بدلنے کے عزم پر اپنے یقین کا اظہار کیا۔ انھوں نے حقیقت پسندانہ نظریات اور طور طریقوں سے ترغیب پائی۔ موضوع کے انتخاب اور عمل داری میں انھوں نے پرانی روایات کی سراسر خلاف ورزی کی اور نمایاں فنی سنجیدگی کے ساتھ ہندوستان کی وہ اخلاقی تصویر پیش کی جو صحیح معنوں میں واجب تھی۔ برخلاف معروف سینما کے۔

یہ متوازی تحریک شاید کامیاب نہ ہوتی اگر فلم انکوائری کمیٹی نے بمبئی کے ایس۔ کے پاٹل کی سربراہی میں ہندوستان میں صحت مند سینما کے فروغ کے لئے کچھ تجاویز نہ رکھی ہوتیں۔ خاص طور پر ۱۹۵۰ء کے آس پاس تقسیم کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر اس کمیشن کے درج ذیل نکات کے مدنظر حکومت نے مستقبل کے فلم سازوں کی تربیت کے لئے ایک ادارہ قائم کیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا نظم ادارہ قائم کیا کہ وہ فلم ساز جو اپنی تخلیقیت کو دبانا یا بازار کے تقاضوں سے سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتے تھے ان کو سرمایہ فراہم ہو سکے۔ دونوں ادارے پونے کی فلم انسٹی ٹیوٹ اور فلم فنانس

بمل رائے سینما میں حقیقت پسندی اور سماجی برابری کے اوتار تھے۔ اول الذکر نے ۱۹۴۴ء میں نیو تھیٹرز سے ادیب پاتھے (بعد میں ہمراہی) بنائی اور آخر الذکر نے دو بیگھہ زمین اپنے پروڈکشن سے ۱۹۵۳ء میں۔

کارپوریشن (جو بعد میں نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کہلائی) ہندوستانی سینما کا رخ بدلنے میں دور رس اثرات کے حامل ہوئے جس میں معروف سینما بھی شامل تھا۔ لیکن اس سے پیشتر حکومت کو اس کی کیا ضرورت آپڑی تھی کہ وہ مداخلت کرے اور سینما کے صحت مند فروغ کے

لئے کچھ اقدام کرے؟ کیوں ۱۹۴۰ء تک جب یہ ادارے وجود میں آئے، سینما ہندوستانی زمین پر پچاس سال پورے کر چکا تھا اور ایسی نمایاں شخصیتیں جیسے دادا صاحب پھالکے، بی این سرکار، پرمتھیش بروا، دی شانتا رام، ہمانشو رائے وغیرہ، دوسرے لوگوں کے ساتھ سینما

کی تاریخ قلم بند کر چکے تھے اور ۱۹۵۰ء کے آس پاس جب فلم انکوائری کمیٹی کو قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، اسی زمانہ میں ستیہ جیت رے، رتوک گھٹک، مرنال سین جیسے لوگ سینما کے اوتار کی حیثیت سے ابھر رہے تھے جب کہ بمل رائے دونوں

کچھ لوگ ۱۹۴۸ء کو ہمارے فلم کلچر میں تبدیلی کا سال مانتے ہیں۔ اسی سال چندر لیکھا ریلیز ہوئی تھی۔ اس کی بے پناہ کامیابی نے بہت سے لوگوں کو فلم میں سرمایہ کاری کی تحریک بخشی۔ ان لوگوں کی آمد کے ساتھ فلم بجٹ آسمانوں کو چھونے لگے۔

دنیاؤں کا بہترین امتزاج پیش کر رہے تھے اور راج کپور اور گرو دت ان کی تقلید میں تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء کا زمانہ ہندوستانی سینما کے لئے ایک موثر تھا جو ۱۹۳۰ء کے عشرہ میں شباب پر تھا اور فلم سازی کے لئے نئے مراکز مثلاً نیو تھیٹرز، پربھات اسٹوڈیوز اور بمبئی ٹاکیز ہدایت کاری، فلم سازی اور ادارت میں بہترین

پیشہ ور اہم مہارت کے لوگ ڈھال رہے تھے اور یقیناً اداکاری میں بھی۔ اس کے علاوہ یہ وہ دور تھا جب گاندھی ملک کو نئے عزائم دے رہے تھے اس ماحول نے فلم سازوں کو بھی ایک آدرش دیا۔ شاید ان فلموں کا کچھ تعلق شہری اور پڑھے لکھے طبقہ

سے بھی تھا۔

لیکن دوسری جنگ عظیم نے دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندوستانی سینما کی جڑیں ہلا دیں۔ جنگی معاہدے کچھ لوگوں کے لئے دولت کا ذریعہ بن گئے جو سینما کے ذریعہ شہرت اور آسائش حاصل کرنا چاہتے تھے مگر دوسری طرف تقسیم ملک نے فلم سازی کے مشرقی سیکٹر کے لئے بحران پیدا کر دیا کیوں کہ مشرقی پاکستان نے بنگالی فلموں پر (اور کتابوں پر بھی) پابندی عائد کر دی جہاں اُردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ بنیادی طور پر زراعتی سماج کی صنعت کاری نے بڑے شہروں کو بھی جنم دیا جس کا لازمی نتیجہ جھگی جھونپڑی میں پناہ لینے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اپنی بدحالی سے فرار کا آسان طریقہ وہ سب رنگی قصے تھے جو تو دولتئے خوابوں کے سوداگر ان کے لئے پردے پر سجا رہے تھے سینما اپنے حقیقت سے قریب لگنے کی وجہ سے لاکھوں

افراد کے ذہنوں پر اپنی گرفت رکھتا تھا مضحکہ خیز طور پر حقیقت کے دائرے سے باہر نکل کر سینما نے تخیل کی دوڑ سے بے مثال کامیابی حاصل کی۔

کچھ لوگ ۱۹۴۸ء کو ہمارے فلم کلچر میں تبدیلی کا سال مانتے ہیں۔ اسی سال چندر لیکھا ریلیز ہوئی تھی۔ ایس۔ ایس۔ داس کی ہدایت میں تیار ہوئی یہ مدراسی فلم معجزوں سے پوری طرح لیس تھی۔ ظاہر ہے اس پر کافی سرمایہ خرچ ہوا ہوگا۔ اس فلم کی بے تحاشا کامیابی نے بہت سے سرمایہ داروں کو فلم میں سرمایہ کاری کی تحریک بخشی، ان لوگوں کے لئے فلم سازی سے زیادہ سے زیادہ ایک کاروباری سودا تھی۔ ان کی آمد کے ساتھ فلم بجٹ آسمانوں کو چھونے لگے۔ بڑے اداکاروں کی مانگ نے مثلاً اشوک کمار، خصوصاً قسمت کی کامیابی کے بعد فلم کے ساتھ کالے دھن کی برائی بھی جوڑ دی۔ فنکار یہاں تک کہ تکنیکی عملہ نے بھی اپنے طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر اسٹوڈیوز کا وسیع نظام ٹوٹ گیا۔ اس صورت حال نے بہت سے باصلاحیت

افراد کو جو فلم کو رابطے کا ایک بہترین ذریعہ سمجھتے تھے، بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔

دو ستون

اگر قریب سے دیکھا جائے تو ہندوستانی سینما کے دو بڑے ستون بمل رائے اور راج کپور کی خوبصورت فلم سازی کے انجام کے پیش نظر حکومت کی تشویش بجا تھی۔ بمل رائے سینما میں سماجی برابری اور حقیقت پسندی کے اوتار تھے۔ اول الذکر نے ۱۹۴۰ء میں نیو تھیٹرز سے ادیب یاتھی (بعد میں ہمراہی) بنائی اور آخر الذکر نے "دو بیگھہ زمین" اپنے پروڈکشن کی پہلی فلم ۱۹۵۳ء میں بنائی اگرچہ وہ بعد میں بھی فنی دستاویزیں تیار کرتے رہے جیسے پرینیتا (۱۹۵۳) بیرج بہو (۵۴ء) اور دیوداس (۵۵ء)۔ پہلی دو فلمیں دوسرے پروڈیوسرس کے لئے۔ بمل رائے کے لئے مالی اعتبار سے پہلی کامیاب فلم مدھومتی (۱۹۵۸) تھی۔ پُنر جنم اور محبت کی ایک خوبصورت کہانی لیکن کسی بھی اعتبار سے "دو بیگھہ زمین جیسی بامقصد کے خالق سے بعید از توقع تھی۔

"سُجاتا" نے بمل رائے کی کھوئی ہوئی ساکھ کو بحال کر دیا اور "بندنی" ایک بہترین فلم ثابت ہوئی لیکن ان میں سے کسی بھی فلم نے باکس آفس پر ویسی کامیابی نہیں حاصل کی جو کسی بھوتے والی فلم کے حصہ میں آئی جس میں ایک بُرا آدمی تو شکل سے بُرا نظر آتا ہے مگر قبائلی لوگ قبائلی نہیں دکھائی دیتے۔ اس دور کے اشتہارات سے بہت سی چیزیں سامنے آتی ہیں کہ تقسیم ملک سے پہلے "ادیب یاتھی" نے کیسی بے مثال کامیابی حاصل کی تھی۔ فلم کی کہانی سگریٹ کی دکانوں پر دستیاب تھی جو ایک کروڑ پتی باپ اور اس کی بیٹی کے گرد گھومتی ہے جو ایک بے روزگار مصنف کے لئے طبقاتی حدیں توڑ دیتی ہے۔

اسی طرح راج کپور نے بھی آنکھوں میں بڑے خواب سجائے زندگی کا آغاز کیا اور بائیں بازو کے لوگوں کا انقلابی لہجہ اختیار کیا۔ سماج کے ڈھالے ہوئے

> آوارہ نے راج کپور کی اس تاریخی شخصیت کو متعین کیا جس سے وہ آج پورے ہندوستان اور بیرون ملک پہچانے جاتے ہیں مگر آر کے فلمز کی ساکھ کو خود اداکار فلم سازی کی وجہ سے نقصان پہنچا جنہوں نے اداکاراؤں کے حسن اور عُریانی کو کافی سمجھنا شروع کر دیا۔

لوگ جنہیں یا تو سب کچھ حاصل تھا یا ان کی حیثیت صرف ایک کچرے کی تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں ایک معمولی اٹھائی گیرا یا ایک ممتاز قانون داں۔ "آوارہ" نے راج کپور کی اس تاریخی شخصیت کو متعین کیا جس سے وہ آج پورے ہندوستان اور بیرون ملک پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن آر۔ کے بینرز کی ساکھ کو خود اداکار فلم سازی کی وجہ سے نقصان پہنچا جنہوں نے ہیروئن کے حُسن اور عُریانی کو کافی سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ انقلاب اتنا مکمل تھا کہ دھرم کرم ایک ایسا نظریہ پیش کرتی ہے جس میں لوگ اپنے آپ کچھ نہیں بلکہ جنین کی پیداوار تھے۔ کسی گلوکار کا لڑکا، اگرچہ اس کی پرورش قانون شکن کے ہاتھوں ہوئی ہو وہ اتنا ہی معتبر ہے جتنے اس کے گیت، اور ایک اوباش آدمی کا لڑکا اوباش ہی ہوگا خواہ اس کی پرورش کسی طرح ہوئی ہو۔

گہرا اثر

ایف ایف سی کا قیام ہندوستانی سینما

پر ایک گہرا اثر ڈالنے والا تھا حالاں کہ اس کا احساس صرف دہائی کے اختتام پر ہی ہوا۔ غیر روایتی سینما کے کارواں کی سربراہی مرنال سین کر رہے تھے اور صرف ۱۹۶۹ء میں ہی ایف ایف سی نے عام روش سے الگ فلموں کے چھ ایوارڈ حاصل کئے جیسے سین کی "بھون شومے"، باسو چٹرجی کی "سارا آکاش" کانتی لال راٹھور کی گجراتی فلم "کنکو" اُڑیا کی "اُدین میگھ" اور منی کول کی "اُس کی روٹی"۔ اگلے چار سالوں نے سنجیدہ فلم بین طبقہ کو سیدھا بیٹھنے اور نوٹس لینے پر مجبور کر دیا۔ راجندر سنگھ بیدی کی "دستک" باسو بھٹاچاریہ کی "انو بھو" اور گوپال کرشنن کی "سویمبرم" کمار ساہنی کی "مایا درپن"، ایم۔ ایس ستھیو کی "گرم ہوا" منی کول کی "دُودھا"، رتوک گھٹک کی "جکتی تکو آر گپو" وغیرہ۔ یہ صحیح ہے کہ ساری فلمیں کاروباری طور پر "بھون شومے" یا "گرم ہوا" کی طرح کامیاب نہیں رہیں مگر اچھے سے اچھا اسٹوڈیو یا بینر بھی یقینی کامیابی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ دوسری طرف مبصرین بھی ان فلموں کے معیار یا

> سرمایہ کاری، حکومت کے تعاون کا صرف ایک پہلو ہے گو کہ ایک اہم پہلو۔ فلم فیسٹولز ڈائرکٹریٹ کے ذریعہ جب ان فلموں کی پوری دنیا میں نمائش ہوتی تھی تو اضافی شرف بھی ان کے حصہ میں آتا۔

ان تجربوں کی افادیت کے معاملے میں کوئی اختلاف نہیں رہا حالاں کہ ان پر شکل پسندی اور خود ستائی کا الزام بھی لگا۔

شاید ان فلموں نے ایک ایسا ماحول ضرور تیار کیا جو صحت مند سینما کے لئے موزوں تھا یا پھر ایک نئی تحریک کے لئے وقت سازگار تھا کیوں کہ ان ہی سالوں میں بہت سے باصلاحیت افراد ابھرے مثلاً پٹھی رما ریڈی "سنسکار" کے ساتھ شیام بینیگل "انکور" کے ساتھ، جی اروندن "اُتّرائن" "کنچن سیتا" گریش کرناڈ اور "کاڈو" بی وی کرنتھ اور "چومن دوڈی" راجندر دھرم راج اور "چکر" گریش کساروَلی اور "گھٹ شرادھا" وغیرہ۔ حالاں کہ یہ فلمیں نجی سرمایہ سے تیار ہوئی تھیں مگر اسی طرز کی فلمیں تھیں جو ایف ایف سی کی فلموں کا خاصہ تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعد میں ان ہدایت کاروں کی ترقی صرف ایف ایف سی کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ متوازی سینما اپنی ابتدا کی

> ایف۔ ایف۔ سی کا قیام ہندوستانی سینما پر گہرا اثر ڈالنے والا تھا مرنال سین غیر روایتی سینما کے کارواں کی سربراہی کر رہے تھے اور صرف ۱۹۶۹ء میں ہی ایف۔ ایف۔ سی نے چھ سے زیادہ فلموں کے ایوارڈز حاصل کیے۔

حیثیت اس تعاون کی بنیاد پر پاسکا۔ اسی تعاون سے بنگالی سینما ان خوبیوں کی تلاش میں کامیاب ہوسکا اور بدھو دیو داس گپتا، گوتم گھوش، اپرنا سین اور اُتپلندر چکرورتی جیسے نام اوپر آسکے۔ اُڑیا فلموں کی دنیا جو اب تک فارمولا فلموں پر قانع تھی اور جذباتی یا ذہنی تحریکات سے عاری، اسے بھی نیرد مہا پاتر، بیلپ لائے چودھری اور بعد میں اے۔ کے بیرا اور منموہن مہا پاتر کی شکل میں ایک تازہ سانس لینے کا موقع ملا۔ اسی طرح شمال مشرق بھی جاہنو بروا، اریبم شیام اور بھابیل سائیکیہ کی فلموں کے ذریعہ قومی نظارے میں شامل ہوگیا حتیٰ کہ مراٹھی سینما جو ہندوستان میں سینما کا رہبر رہا ہے جبار پٹیل اور امول پالیکر کی کارکردگی سے اپنے وقار میں اضافہ کرسکا۔

اضافی فائدے

سرمایہ کاری، حکومتی تعاون کا صرف ایک پہلو ہے گو کہ ایک اہم پہلو۔ فلم مکمل ہونے کے بعد صدارتی ایوارڈز کے ذریعہ قومی سطح پر ان فلموں کے معیاری ہونے کا اعتراف بھی ہوتا ہے اور فلم فیسٹولز کی ڈائرکٹوریٹ کے ذریعہ پوری دنیا میں ان فلموں کی نمائش ہوتی ہے تو اضافی شرف بھی ان کے حصہ میں آتا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر، ریاستی حکومتوں نے بھی صحت مند سینما کے فروغ کے لئے کوششیں کیں۔ اگر گجرات نے اُن فلموں پر ایک معین مدت کے لئے ٹیکس معاف کیا جو ریاستی اسٹوڈیوز میں فلمائی گئی تھیں تو آندھرا پردیش نے اُن ساری فلموں کو رعایت دی جو درون ریاست فلمائی گئی تھیں۔ مہاراشٹر نے فلم سازوں کو آئندہ مہمات کے لئے تفریحی ٹیکس لوٹا دیا۔ مغربی بنگال نے آگے بڑھ کر ایک فلم ترقیاتی کارپوریشن قائم کرڈالا جو نہ صرف فلمیں بناتا اور ان میں سرمایہ کاری کرتا تھا بلکہ اس کی اپنی ایک کلر لیبوریٹری بھی تھی۔ اس نے اسٹوڈیوز خریدے اور لائبریری اور آڈیٹوریم سے

معروف سینما نے غیر روایتی سینما کی طرح سماجی مسائل کو اپنا لیا اور سماجی برابری، گاؤں سے ہجرت، فرقہ پرستی، نسل پرستی، تحریک نسواں اور یہاں تک کہ سیاسی جرم پرستی جیسے موضوعات مقبول سینما میں جگہ پانے لگے

آراستہ نندن فلم کامپلیکس بھی قائم کیا۔ اُڑیسہ نے فلم سازی کو ایک چھوٹے پیمانے کی صنعت کا درجہ دیا۔ ان ساری اسکیموں میں سے کچھ بے سود بھی ہوسکتی ہیں مگر ان سے ظاہر ہے کہ ریاستی سرکاریں جو باکس آفس کی زیادہ نہیں تو آدھی آمدنی ضبط کرلیتی تھیں، اب صحت مند سینما کے معاملہ میں سنجیدہ تھیں۔ اس کے علاوہ فلم انکوائری کمیٹی کی تجویز کی بنیاد پر ایک اور ادارہ ایف۔ ٹی۔ آئی۔ آئی (FTII) قائم کیا گیا تھا۔ یہ افراد کی تربیت کرتا تھا جو فلم تکنیک کے ساتھ ساتھ جمالیات پر بھی عبور رکھتے تھے۔ اگر ۷۰ء کے ابتدائی عشرہ میں ایف۔ ٹی۔ آئی۔ آئی کے تربیت یافتہ (مثلاً منی کول اور کمار ساہنی) اپنی شناخت قائم کر رہے تھے تو ۸۰ء کی دہائی میں وہ ہر جگہ نظر آنے لگے غیر روایتی ٹیلی ویژن، یہاں تک کہ کمرشیل سینما میں بھی سعید مرزا، کیتن مہتہ، کندن شاہ، پرکاش جھا، سبھانکر گھوش، آنند مہندر وغیرہ نے اپنی پہلی فلموں میں ہی یہ ثابت کردیا کہ انہیں اس ذریعہ کا صحیح استعمال معلوم ہے اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے ایک کے بعد دوسرے سیریل کے ذریعہ لوگوں کے ٹیلی ویژن کے بارے میں تأثرات کو یکسر بدڈالا اور ثابت کردیا کہ وہ ناظرین کے نبض شناس بھی ہیں۔

رخصت

اس معاملہ کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ معروف سینما نے جو پروڈیوسرس کے کاروباری نفع و

ایک آزاد کاروباری ماحول میں مقصد صرف زیادہ نفع ہوتا ہے۔ کیا غیر روایتی سینما اس سمجھوتے کے سامنے ٹھہر سکتا ہے اور اگر نہیں تو کیا ہمیں اس تحریک سے دست بردار ہوجانا چاہیے جو دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ ضمیر کا کردار ادا کرتی رہی۔

نقصان کے تئیں ہمیشہ حساس رہا ہے، اس بدلتی روش کا تیزی سے فائدہ اٹھایا۔ غیر روایتی سینما کی طرح اس نے بھی سماجی مسائل کو اپنا لیا اور سماجی برابری، گاؤں سے ہجرت، فرقہ پرستی، نسل پرستی، تحریکِ نسواں یہاں تک کہ سیاسی جرم پرستی جیسے موضوعات بھی مقبول سینما میں جگہ پانے لگے۔ بہرحال سب سے واضح علامت، افراد کی آمد تھی۔ سب سے پہلے اداکار آئے۔ جیہ بہادری، شبانہ اعظمی، شترگھن سنہا، ڈینی، اسرانی، نصیر الدین شاہ، پھر تکنیکی لوگ، کے۔ کے مہاجن اور اے۔ کے بیر، چودھری اور رینو سلوجا، ہیتن گھوش اور ڈیوڈ دھون جنہوں نے دوسرے سینما کے تمام فنی محاسن مقبول سینما میں سموکر اس کے حُسن کو اور نکھار دیا۔ اور پھر ہدایت کار جو دنیا کے بہترین سینما سے آشنا ہونے کی وجہ سے فارمولے اور تخیل کو بڑی آسانی کے ساتھ استعمال کرسکتے تھے۔ نتائج سب کے سامنے ہیں۔ ہندوستانی سینما کا سب سے نمائشی آدمی، سبھاش گھئی ایف ٹی آئی آئی کا تربیت یافتہ ہے اور وہ بھی ہدایت کاری میں نہیں۔

ہندوستانی سینما میں صحت مند رجحانات کے فروغ میں حکومت کے معاون کردار کی یہ داستان اب کچھ اور اہم ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے نہیں ... کہ بھون شوم نے ۲۵ سال پہلے پردہ جگمگایا تھا یا سینما سو سال پورے کرچکا ہے بلکہ معاشی اصلاحات کے حق میں رائے عامہ فضائی تحریر کے طور پر پڑھی جاسکتی ہے۔ پوری سرکاری مشینری کو معاشی آزادی کے نفاذ کے لئے حرکت میں ڈال دیا گیا ہے اس سلسلہ کا ایک اہم فیصلہ یہ ہے کہ پبلک سیکٹر کے ادارے کسی سرکاری تعاون کے حق دار نہیں ہوں گے۔ یہ بات ان اداروں پر بھی لاگو ہوتی ہے جو صحت مند سینما کے فروغ کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ بہر نوع اکثر لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ

پوری دنیا میں سینما کی ترقی و فروغ پرائیوٹ سیکٹر سے ہی ہوا ہے تو پھر ہندوستان جیسا محدود ذرائع والا ملک اس سے الگ کیوں ہے؟ اس لئے حکومت کا اصرار ہے کہ این۔ ایف۔ ڈی۔ سی کو کاروباری سطح پر ہی کام کرنا چاہیے۔ این۔ ایف۔ ڈی سی جو ایک معقول نفع کی پابند ہے اپنے مقاصد سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہے کیوں کہ متوازی سینما میں معیار اور تعداد کے لحاظ سے ندرتِ خیال مشکل نظر آتی ہے بالخصوص ایسے کاروباری ماحول میں جہاں مطمح نظر زیادہ سے زیادہ منافع ہو تو کیا غیر روایتی سینما اس سمجھوتے کے سامنے ٹھہر سکتا ہے اگر نہیں تو کیا ہم کو اس تحریک سے دست بردار ہو جانا چاہیے جو ضمیر کا کردار ادا کرتی رہی اور سماجی زیادتیوں اور خامیوں سے آگاہ کرتی رہی۔

یہاں پر مناسب ہوگا کہ فرانس کے تجربہ پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے جو سینما کی جائے پیدائش ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ سینما کو اشیاء صارفین میں نہیں گنا جا سکتا اور اسی وجہ سے GATT مذاکرت میں تجارتی محصول کی بات بھی نہیں کی جا سکتی لیکن فرانس نے جو یورپ کے دوسرے ممالک کی بھی نمائندگی کر رہا ہے، اس موقف کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ وہ اپنے سینما کو ہالی وُڈ کے اثر سے پاک رکھنا چاہتا تھا۔ ایک ایسا ملک جو اپنے گانے نہیں گا سکتا، اپنی کہانیاں نہیں لکھ سکتا اور پردے پر اپنی فلمیں نہیں دکھا سکتا، یقیناً ایک غریب ملک ہے یہ یورپ کے ان ملکوں کا احساس ہے جنھیں ہالی وڈ کے خطرہ کا سامنا ہے۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ہمارا ہے جہاں معروف سینما ہالی وڈ کی طرح اور اکثر ہالی وڈ کے بل بوتے پر فروغ پا رہا ہے۔ اسے کامیابی کی نقل کرنے میں کوئی باک نہیں اور بالکل مذہبی انداز سے ہماری خاطر ہالی وڈ کی کامیاب نقلوں سے کی جا رہی ہے اور اگر یہ نقل کسی بڑے فلم مرکز میں کامیاب ہو جائے تو دوسرے مراکز اس کی بھی نقل تیار کر ڈالتے ہیں۔ اس طرح ایک کامیاب کئی مقابلوں کو جنم دے ڈالتا ہے۔ بمبئی کی ایک کامیاب فلم، کلکتہ کی کئی ناکام فلموں کا چربہ ہوتی ہے۔ ناکامیوں کے تعلق سے یہ بھی ایک سانحہ ہے کہ بمبئی کی مشکل سے ۵ فیصد

فلمیں ہی کاروباری دم رکھتی ہیں اور یہ فلمیں سینما کے انقلاب پذیر زبان کے تجربہ یا ہندوستان کو سینما کی دنیا میں ایک جائز مقام دلانے کے سلسلہ میں بھی کوئی کلمۂ تحسین نہ پا سکیں۔

جب ہم سرکاری تعاون سے تیار ہونے والی فلم بھون شومے کی بات کرتے ہیں جس نے معیاری سینما کی بنیاد ڈالی تو یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ ایف۔ ایف۔ سی نے رے کی 'چارولتا' کو (۱۹۶۵ء) جو رے کی پسندیدہ اور دنیا کی گنی چنی کلاسکس میں سے ہے، پردے پر لانے میں ایک اہم کردار انجام دیا تھا کئی سالوں کے بعد دل کے دورے سے صحت یاب ہونے پر این۔ ایف۔ ڈی۔ سی نے ہی رے کی فلموں میں واپسی کو سہل بنایا تھا۔ یا تو پنچالی کے خالق کا یہ دوسرا جنم تھا جو دنیا کی فلمی تاریخ میں ایک انسانی دستاویز کی حیثیت سے اپنا ایک مستقل مقام رکھتا ہے، درحقیقت پاتو پنچالی آرک لیمپس کی روشنی نہ دیکھ پاتی اگر مغربی بنگال کی حکومت نے سرکاری بجٹ سے سڑک کی تعمیر کے لیے فنڈز نہ فراہم کئے ہوتے۔ سالوں بعد فلم نے ہندوستانی سینما کو دنیا کے نقشہ پر لا کھڑا کیا اور اس کے خالق کو مختلف اعزازات، انگلینڈ سے آنرس کا سا، فرانس سے لیجن آف آنر اور امریکہ کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دلائے۔ البتہ بھارت کے سب سے بڑے اعزاز بھارت رتن کے برعکس، کلکتہ کی سڑکوں کے گڈھے آج بھی اتنے ہی تاریخی ہیں۔

یہ سب چیزیں ثابت کرتی ہیں کہ بسا اوقات کسی پسماندہ ملک میں بھی سرکاری خزانہ سے نکلا ہوا پیسہ کسی فن یا سامان نشاط سینما کی پاسبانی کر سکتا ہے۔ ●

بقیہ: پہاڑی علاقے کی ترقیاتی منصوبہ کاری

ہیں اور لمبی دوری تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ایسے مقامات پر قلی، مزدوروں اور خچروں کے لیے پگڈنڈیاں بنا کر ان کی پوری طرح دیکھ بھال کی جائے۔ ان خطوں کے مقامی اور معاشی پیش رفت کو مزید تقویت دینے کے لیے سڑکوں کی تعمیر ہر لحاظ سے پوری ہونی چاہیے۔

امید ہے کہ ان طریقوں سے ہمارے قدرتی ماحولیات اور روزمرہ کی زندگی کے نظام کے لیے ضروری ماحولیات کے توازن کا تحفظ کرنے اور پہاڑی علاقوں کی اجتماعی ترقی کے معاملے میں طویل المدتی اثرات مرتب ہوں گے۔ ●

بقیہ: فلم سازوں کی تربیت

کیا جاتا ہے۔ داخلے کے لیے طلبا کے انتخاب میں کافی احتیاط برتی جاتی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کی کوشش ہوتی ہے کہ بیشتر درانہ تربیت حاصل کرنے کے بعد انسٹی ٹیوٹ سے باہر آنے والوں میں "امیجنگ ٹکنالوجی" کے متعلق مکمل اعتماد ہو۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ایسے شعبوں کی تربیت پر کافی زیادہ خرچ آتا ہے۔

سینما اور ٹیلی ویژن کے شعبوں میں تربیت یافتہ تکنیشینوں کی بڑی مانگ ہے۔ اس ضرورت کو کئی ریاستی حکومتوں نے بھی محسوس کیا ہے اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ ہندوستان میں ایسے دو اور انسٹی ٹیوٹ کھولے جا رہے ہیں۔ ایک بنگلور میں اور دوسرا کلکتہ میں۔ آج سے زائد از ۵۰ سال پہلے ۱۹۴۲ء میں مدراس میں ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا، جو اب ایک علاقائی انسٹی ٹیوٹ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہاں زیادہ تر تامل ناڈو کے طلبا کو تربیت دی جاتی ہے۔ امید ہے کہ تربیت یافتہ تکنیکی ماہرین کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مستقبل میں مزید تربیتی انسٹی ٹیوٹ کھولے جائیں گے۔ ●

بقیہ: گوئٹر۔ مسئلہ اور مداوا

۱۹۶۲ء میں نیشنل گوائٹر کنٹرول پروگرام کی شروعات کی تھی جس کے تحت گوئٹر متاثرہ علاقوں کا دورہ کر کے آیوڈین آمیز نمک تقسیم کیا گیا تھا لیکن اس پروگرام کو خاطر خواہ کامیابی نہ مل سکی تھی۔ متاثرہ علاقوں میں عام نمک کی خرید و فروخت پر بھی پابندی لگا دی گئی ہے اور آیوڈین آمیز نمک کے استعمال کی ہدایت کی گئی ہے۔ لیکن محض سرکاری احکامات سے ہی اس مرض پر قابو پانا آسان نہ ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فلاحی انجمنیں و تنظیمیں بھی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے عوام کو بیدار کریں اور آیوڈین آمیز نمک کے استعمال کی ہدایت کریں۔ معالجین و تعلیم یافتہ افراد کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو آیوڈین کی اہمیت سے واقف کرائیں، آیوڈین کی کمی سے ہونے والے امراض کے بارے میں تعلیم دیں اور آیوڈین آمیز نمک کے استعمال کا مشورہ دیں تبھی اس مرض سے تحفظ ممکن ہے۔ ●

ڈاکٹر ایس ایم شرما

پہاڑی علاقے کی ترقیاتی منصوبہ کاری

پہاڑی علاقوں میں جنگلوں کی کٹائی اور زمین کے دھنسنے کا اثر ماحولیات پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ ان دونوں وجوہات سے آبی وسائل کے سوتے خشک ہوتے جارہے ہیں۔ سیلاب میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اناج کی پیداوار میں کمی ہورہی ہے۔ مویشیوں کی چراگاہ میں کمی، سڑکوں، باندھوں اور متوسط درجے کی صنعتوں کی تعمیرات سے پہاڑی علاقوں کے ماحولیات میں مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ اس مضمون میں کچھ مشورے دیے گئے ہیں جو قدرتی ماحولیات اور زندگی بسر کرنے کے نظام کے لیے ضروری ہیں۔ حالات کو متوازن رکھنے کے لیے پہاڑی علاقوں کی ترقیاتی سرگرمی کو مفید بنانے میں یہ مشورے مفید ثابت ہوں گے۔

پہاڑی علاقے میں ترقیاتی منصوبہ کاری کی ضرورت اور اہمیت پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے میونسپل کارپوریشنوں کی کانفرنس سال ۱۹۸۹ء میں پہاڑی علاقوں اور شمال مشرقی علاقے کے لوگوں کی روایتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے ان علاقوں کے عوام کی خصوصی ضرورتوں کی اطلاعات فراہم کی گئی تھیں جن کی تکمیل میونسپل کارپوریشنوں سے متعلق ۷۴ ویں آئینی ترمیم ۱۹۹۲ء میں کی گئی تھی۔ اس قانونی مسودہ کو صدر جمہوریہ کی منظوری ۲۰ اپریل ۱۹۹۳ء کو ہوئی اور یہ قانون یکم جون ۱۹۹۳ء سے نافذ العمل ہو گیا۔ اس وقت یہ بھی محسوس کیا گیا تھا کہ پہاڑی علاقوں کی تعمیری کاموں کی لاگت میدانی علاقوں کی بہ نسبت زیادہ ہے اس لیے بڑے پیمانے پر ان علاقوں میں سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔ اسی طرح شہر کی مجموعی آبادی کو دھیان میں رکھتے ہوئے وارڈوں کی حد چھوٹی ہونی چاہیے لہٰذا اسی لیے ایسے علاقوں میں وارڈوں کے حلقے چھوٹے ہونے چاہیے۔

پہاڑی علاقے کے شہر صحت مند آب و ہوا اور جنت نظیر ہونے کے احساسات دلاتے ہیں اس لیے ان شہروں اور علاقوں کو سیاحت کے تناظر میں دیکھتے ہوئے ان مراکز کے تحفظ، ان کے فروغ اور رکھ رکھاؤ کے انتظامات کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا مقامی اداروں کو ریاست کے محکمہ سیاحت اور ٹرانسپورٹ کے ساتھ تبادلہ خیال کرکے ترقی کا مرحلہ وار انتظام اور پروگرام طے کرنا ضروری ہیں۔

جنگلوں کی کٹائی اور زمین کے کٹاؤ پہاڑی علاقوں کے اہم مسائل ہیں۔ انھیں وجوہات سے آبی سوتے خشک ہوتے جارہے ہیں۔ سیلاب میں اضافہ ہورہا ہے۔ اناج اور نقد فصلوں، چارے، ایندھن اور دیگر جنگلاتی پیداواروں میں گراوٹ آتی جاتی ہے۔ طویل عرصے تک چراگاہوں میں مویشیوں کے چرنے سے پہاڑی علاقے میں ماحولیات کے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مکانات کی تعمیر، سڑکوں کی تعمیر، باندھوں کی تعمیر، چھوٹی اور بڑی صنعتوں کے قیام، معدنیات کی کھدائی، پہاڑوں کے توڑنے وغیرہ سے ماحولیات کے مسائل بڑے پیمانے پر پیدا ہوئے اور دن بہ دن اس میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔

کچھ ابھرتے ہوئے پہلو

"نیشنل اٹلس آف انڈیا" نے بھارت کی طبیعات کو سات شعبوں میں تقسیم کیا ہے جن میں خاص طور پر پہاڑی زمینی علاقے شامل ہیں۔ بھارت کے پہاڑی علاقوں کی زمرہ بندی حسب ذیل ہے: (۱) شمالی پہاڑ جس میں ہمالیہ اور شمال مشرق کے پہاڑوں کے سلسلے شامل ہیں (۲) مرکزی اونچی زمین ــــ اس پہاڑی زمین کے علاقے کے مغرب میں اراوالی کی پہاڑیاں ہیں اور جنوب میں ستپوڑا کی پہاڑیاں ہیں۔ (۳) جزیرہ نما پہاڑ جس میں مغربی گھاٹ (پہاڑ) ستپوڑا کا پہاڑی سلسلہ، گرجلہ پہاڑ، راج محل پہاڑ اور مشرقی گھاٹ شامل ہیں۔

آسام، جموں و کشمیر، ناگالینڈ، پنجاب، اترپردیش، مغربی بنگال، ہماچل پردیش، منی پور اور تریپورہ جیسی ریاستیں اور مرکزی منتظمہ علاقے ہیں جن میں یہ پہاڑ اور پہاڑی شہر واقع ہیں۔ ہر علاقے اور ریاستیں بھارت کے شمال مغرب اور شمال مشرق سرحدوں تک پھیلے ہیں۔ صرف ایک علاقہ تریپورہ ایسا ہے جس کی طبعی بناوٹ الگ

یوجنا، نئی دہلی

تعلق ہے ۔ ان تمام ریاستوں میں پہاڑ اور پہاڑی علاقے الگ الگ طبعی نوعیت کے ہیں۔ قومی ترقی کے لحاظ سے بھی مختلف پہاڑی علاقوں اور پہاڑیوں کے لیے الگ الگ طبعی علاقے ہیں۔ اس لحاظ سے پہاڑی علاقوں کی الگ خصوصیتیں ہیں۔ لہٰذا پہاڑ اور پہاڑی علاقوں کی ترقی کے لیے منصوبہ کاری بہت اہم ہے۔

پانی کی فراہمی، بجلی کی سپلائی اور مکانات کی فراہمی کے لحاظ سے پہاڑی علاقوں کی حالت تشویشناک ہے۔ کیوں کہ ان علاقوں میں سماجی اور معاشی سہولتوں کی کمی ہے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ جنگلاتی ریاستوں کے قوانین میں مقامی ضرورتوں کی فراہمی کا ذکر کیا جائے۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ پہاڑی علاقوں میں ٹھیکیدار جنگلات کی منظور شدہ کٹائی سے زیادہ پیڑ کاٹ دیتے ہیں جس کی وجہ سے پہاڑی علاقوں میں شہروں کا فروغ متوازن طور پر نہیں ہو پاتا۔

مرکزی سرکار نے سال ۱۹۷۴ء میں پہاڑی ترقیاتی پروگرام شروع کیا تھا جس میں اتر پردیش کے آٹھ، آسام کے دو، تامل ناڈو میں نیل گری اور مغربی بنگال میں دارجلنگ ضلع کے تین ضمنی علاقے اور مغربی کنارہ، جس میں مہاراشٹر، کرناٹک، کیرالا، تامل ناڈو اور گوا کی ریاستوں کے حصے شامل ہیں۔ اس ترقیاتی پروگرام میں شامل کیے گئے تھے۔

پانچویں پانچ سالہ منصوبہ میں ان علاقوں کے لیے ۱۷۰ کروڑ روپے کی مرکزی خصوصی امداد دی گئی تھی جو ساتویں منصوبے میں بڑھا کر ۸۷۰ کروڑ روپے کر دی گئی تھی۔ پہاڑی خطوں کو خصوصی طور پر دی جا رہی امداد کی اہمیت کو دھیان میں رکھتے ہوئے منصوبہ بندی کمیشن نے پہاڑی خطوں کے منصوبہ کاری اور ترقی کے پیش نظر پالیسی تیار کرنے اور ساتویں منصوبے میں فنڈ کی فراہمی سے متعلق امور کے تعین کے لیے ایک ذیلی گروپ کی تشکیل کی گئی تھی۔ بھارت میں پہاڑی علاقوں میں دریاؤں، جنگلاتی وسیلوں، پیڑ پودوں، جڑی بوٹیوں، مویشیوں اور معدنیات کا ذخیرہ کافی مقدار میں موجود ہے۔ پہاڑی خطوں اور قریبی علاقوں میں چھوٹے قصبوں کی ترقی سے متعلق کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق جنگلات پہاڑی خطوں کی ایک بیش قیمت ملکیت ہے۔ جنگلات آب و ہوا کو تازہ بنانے، بارش لانے، دریاؤں کے بہاؤ کو قابو میں کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں ۔ اس کے علاوہ یہ زمین کے کٹنے یا دھنسنے سے روکنے میں معاون ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ متعدد قسموں کی پیداواروں کے فروغ میں مددگار ہوتے ہیں ۔ جنگلاتی پیداوار میں عمارتوں میں کام آنے والی لکڑیاں، ایندھن کے کام آنے والی لکڑیاں، بروز (ریزن)، جڑی بوٹیاں اور کچھ دیگر پھل وغیرہ بھی شامل ہیں۔

قانون میں جنگلاتی وسائل کے قدرتی تحفظ کا مقصد ضروری تھا۔ ہمارے ملک میں طبعی حدود کی حفاظت طبعی حالات کرتے ہیں۔ لہٰذا پہاڑی زمینی حصے جو بھارت کو اس کے پڑوسی ملکوں سے جدا کرتے ہیں، ان ملکوں میں غیر قانونی طور پر مداخلت کی روک تھام کے لیے موثر قانون اور متحرک انتظامی مشینری کی بڑی ضرورت ہے۔

پہاڑی خطوں میں جنگلوں کے کاٹنے سے ماحولیات پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ پہاڑ خواہ ان کی چٹانیں کتنی ہی قدیم ہوں روئے زمین پر ایک کی موجودگی قدرت کی بے مثال تخلیق ہوتی ہے۔ پہاڑی جنگلات، پتھریلی چٹانوں کے درمیان ایک ناقابل شکست قوت کے طور پر کام کرتے ہیں اور ان سب کو ملا کر ایک پہاڑی سلسلے کی تخلیق ہوتی ہے۔ جب پہاڑوں سے ہرے بھرے جنگلات کا خاتمہ ہوتا ہے تو پھر زمین کھسکنے یا زمین دھنسنے کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ گزشتہ کچھ دہے سے بڑے پیمانے پر معدنیات کی کھدائی کی جا رہی ہے جس کے لیے جنگلات کے کاٹنے کا عمل بڑے پیمانے پر ہوتا ہے بڑے پیمانے پر چونا، پتھر اور دھاتوں کے لیے ڈائنامائیٹ سے کیے جا رہے دھماکے کے نتیجے میں پہاڑی خطے ویران ہوتے جا رہے ہیں اور قدرتی پہاڑی جنگلات ویران، ننگے اور کھوکھلے پتھریلے ڈھانچے بن رہے ہیں جس کا نتیجہ زمین کے پھسلنے اور طوفان وغیرہ کی صورت میں سامنے آ رہے ہیں، جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ پہاڑی خطوں کی پوری سماجی معاشی زندگی جنگلات پر مبنی ہے اس لیے مکمل طور پر قانونی کارروائی کے بغیر تحفظ کی بات پہاڑی خطوں کے بے بس عوام کے درد میں اضافہ ہی کرے گی۔

کسی زمانے میں پہاڑی ڈھلانوں پر واقع گھنے جنگلات جن میں بڑی مقدار میں عمارتی کام آنے والی لکڑیاں، جڑی بوٹی، پیڑ پودے اور ہری بھری پتیوں کے ڈھیر ہوتے تھے آج ان کی حالت یہ ہے کہ وہ ویران علاقے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس طرح تمام جنگلاتی نظام اپنی خوب صورتی کھوتا جا رہا ہے اور جنگلات کے مسلسل کٹاؤ سے پہاڑی خطوں کے لوگوں کی زندگی بے حد دشوار ہوتی جا رہی ہے۔ فضائے بسیط میں پتھروں کے اجزا کی مقدار میں زیادتی کا ہونا انسانوں اور جانوروں یہاں تک کہ پیڑ پودوں میں طبعی تغیر کی خاص وجہ ہے۔ بائیو سسٹم تکنیک کے ردعمل کو روکے جانے کی ضرورت ہے کیوں کہ پتھروں کے سفوف کے اجزا پتوں کے سوراخوں کو بند کر دیتے ہیں۔ اسی طرح برسات کے موسم میں کانکنی سے نکالی گئی اشیا دھرتی پر چھا جاتی ہیں جس کے نتیجے میں فصلوں کو نقصانات ہوتے ہیں اور سڑکوں پر رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ بڑے پیمانے پر کیے گئے کانکنی اور جنگلوں کے کٹاؤ سے پانی کی سطح میں بھی کمی آئی ہے اور پہاڑی علاقوں میں رہنے والوں کی مصیبتیں دن بدن بڑھ رہی ہیں۔

پہاڑی خطوں میں کانکنی کے بڑے پیمانے پر ہونے والے کاموں کے نتیجے میں فضائے بسیط میں کثافت پیدا ہو رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ فضا میں پتھروں کے ذروں کی مقدار میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے جو زیادہ درجہ حرارت کا باعث ہے اس طرح کی علامات کے ساتھ ساتھ سبزیوں کے خاتمے سے برسات کے موسم میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ گڑھوال، ہمالیہ اور ہماچل پردیش کے پہاڑی علاقوں میں آبی ذخائر کا گمبھیر مسئلہ پیدا ہونا اسی کا ایک حصہ ہے۔ پہاڑی خطوں میں برف کی پرتوں میں کمی ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ سبزیاں غائب ہو رہی ہیں اور اس طرح آبی سوتوں کا خشک ہونا قدرتی بات ہے۔ پہاڑی مقامات سیر و تفریح کی اپنی قدرتی خوبصورتی کھو رہے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ آب و ہوا کی خصوصیت بھی اب ختم ہو رہی ہے۔ کانکنی کے عمل سے دون کی وادی اور ہماچل پردیش میں سولن اور ان کے دیگر پہاڑی علاقے متاثر ہوئے ہیں۔ حالات کا توازن بگڑ گیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ قدرتی نقصانات ہر پہاڑی طرف دیکھے جا رہے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں رہنے والوں کے درد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں

پہاڑی زمین کے کھسکنے کا عمل روزمرہ کا معمول سا بن گیا ہے۔

کان اور معدنیات (ضابطہ اور فروغ) قانون مجریہ ۱۹۴۷ء جو کوئلہ اور لوہے کی خام اشیاء کے علاقے پر لاگو ہوتا ہے۔ اسے پہاڑی علاقوں میں بے دردی سے کی جارہی کانکنی کی روک تھام کے لیے سختی سے استعمال کرنا چاہیے تاکہ پہاڑی علاقوں کے ساتھ حفاظتی اقدام ہو سکے۔

پہاڑی خطوں میں جنگلاتی خطے بہت حد تک ناپید ہو رہے ہیں۔ جنگلوں کے بڑے پیمانے پر کاٹنے سے پہاڑوں کی اوپری پرت غائب ہو رہی ہے۔ اس کی واضح مثال مسوری کی پہاڑوں پر چونا پتھر کی کھدائی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ پہاڑی علاقوں میں جنگلوں کے کاٹنے سے یہاں کی جنگلاتی زندگی متاثر ہو رہی ہے اور فصلوں کی پیداوار میں کمی ہو رہی ہے اور زمین کے کھسکنے سے سیلاب کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

پہاڑی خطوں میں ترقی کا ایک اہم نکتہ ماحولیات اور حالات کے تحفظ کا ہے۔ جنگلاتی ریاستوں کے وسائل کے پیش نظر باندھوں کی تعمیر اور اس کی پیش رفت ایک اہم پہلو ہے اور اس کو دھیان میں رکھتے ہوئے ممکن ہے کہ سائلینٹ ویلی کا احساس چھوڑ دیا گیا ہو۔ ٹیہری باندھ کی وجہ سے بجلی کی پیداوار اور دیہی علاقے کے ایک بڑے حصے کی سینچائی سے متعلق جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پہاڑی علاقہ اور باندھ کی تعمیر پر بھی کچھ مسئلے پیدا ہوئے کیوں کہ یہ علاقہ زلزلہ کے نظریہ سے انتہائی حساس علاقہ ہے۔ پہاڑی علاقوں کی ترقی سے متعلق قانونی پہلو کو جنگلات کی کٹائی کی روک تھام کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے اور جنگلات سے متعلق قانون کے تحت پیڑوں کی کٹائی پر پابندی لگانی چاہیے۔

پہاڑی خطوں کی ترقی مرحلہ وار طور پر ہوئی کیوں کہ یہاں کی بکھری آبادی کی وجہ سے میونسپل کارپوریشن کا وجود نہیں ہے۔ لہٰذا عوام کے مفاد کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ چوں کہ مالیا کی عدم دستیابی اور میونسپل کارپوریشن کے قوانین کی کمی اور ترقیاتی پیش رفت کی وجہ سے پہاڑی خطوں کے قصبوں کی منصوبہ کاری سے متعلق پہلوؤں کو نقصان پہنچا ہے۔ پہاڑی قصبوں میں اونچے اونچے مکانات کی وجہ سے قدرتی حسن کو نقصان پہنچا ہے اور پہاڑوں کی زمین پر دباؤ بڑھا ہے۔

یوجنا، نئی دہلی

مسوری اور منالی کی اونچی اونچی عمارتیں میونسپل کارپوریشن کے قانون کی خلاف ورزی کرکے بنائی گئی ہیں۔ یہ ایک زندہ مثال ہے جس کی وجہ سے سیکڑوں پیڑ برباد ہو گئے۔ پہاڑی قصبوں میں لاجوں، آرام دہ ہوٹلوں، ویڈیو کلبوں، ہیلتھ کلبوں اور مارکیٹنگ کمپلکسوں کی تعداد میں اندھا دھند اضافے کی روک تھام اور عمارتوں کی تعمیر سے متعلق قوانین کو سختی سے نافذ کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔

پہاڑی خطوں کی میونسپل کارپوریشنوں کو قانون کے دائرہ کار میں لانا ضروری ہے۔ میونسپل کارپوریشنوں کے قوانین کو مکانات کی تعمیر سے متعلق قوانین پانی کی فراہمی، ٹرانسپورٹ بجلی وغیرہ جیسی عوامی سہولتوں کے ضمنی قوانین کے تحت لانا چاہیے۔ میونسپل کارپوریشنوں کے معیار کو بڑھایا جائے اور ان کے قوانین پر سختی سے عمل درآمد ہونا چاہیے ان حقائق کو میونسپل کارپوریشنوں کی کانفرنس میں باضابطہ طور پر منظور کیا گیا تھا۔

موثر قانونی ڈھانچہ

پہاڑی خطوں میں ماحولیات کو متوازن بنائے رکھنے کے لیے مجوزہ قوانین کے حسب ذیل پہلوؤں کو یقینی بنانا چاہیے۔

(۱) پہاڑی علاقوں میں پھیلے جنگلات کو موثر طور پر بچانے کے لیے کوشش ہونی چاہیے اور ان کا استعمال تجدید نو کے قابل وسائل کے طور پر کیا جائے اور دستیاب زمروں کے پیڑ پودوں میں اضافہ کیا جائے اس کے لیے پودوں کے ذخیرے لگائے جائیں۔

(۲) جنگلاتی زمین پر کسی بھی کام کے لیے قبضے کی منظوری نہیں دی جائے۔

(۳) جنگلاتی زمین کی منتقلی غیر جنگلاتی پروجیکٹوں کے لیے نہ کی جائے، خواہ وہ پروجیکٹ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو۔

پہاڑی علاقوں سے متعلق ماحولیات کے توازن کو قائم رکھنے کے مقصد سے ۱۹۸۰ء میں جنگل (تحفظ) سے متعلق قانون بنایا گیا تھا۔ اس قانون میں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ کوئی بھی ریاستی سرکار یا کوئی اتھارٹی جنگلاتی زمین یا محفوظ جنگلات کو غیر جنگلاتی پیداواروں کے لیے منتقلی کی منظوری نہیں دیں گے۔ جنگلات سے متعلق موضوع کا نوٹیفکیشن کر دینے سے اتھارٹی کی مرکزیت کیے جانے کے ایک طریقہ کار کی شروعات ہو گئی۔ پہاڑی علاقوں کے جنگلوں کا تحفظ اور ہمہ جہت ترقی ریاستوں کی ذمہ داریاں نہیں تھیں ایسی بات نہیں تھی بلکہ پہاڑی علاقہ کے جنگلات کے فروغ کے طریقہ کار سے علاقائی کوششوں میں اور بھی رکاوٹ پڑنے کا امکان بڑھ گیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر اس کا بھرپور اندیشہ ہے کہ صنعتی استعمال کے لیے بڑے پیمانے پر جنگلات کے کاٹنے کا اہتمام کیا جائے گا اور پہاڑی علاقوں کے حدود کے ہی برباد ہونے کے خطرات میں اضافہ ہو جائے گا۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مختلف ریاستوں نے اس قانون کے تئیں بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے کیوں کہ یہ پہاڑی علاقوں کے فروغ سے متعلق منصوبوں کے عمل درآمد میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ سال ۱۹۸۲ء میں پارلیمنٹ میں ترمیم پیش کی گئی تھی جس میں سرکار کے لیے یہ لازمی کیے جانے کی مانگ کی گئی تھی کہ وہ سڑکوں، پینے کے پانی کے منصوبوں، مواصلاتی لائنوں اور بجلی لائنوں جیسی عوامی استعمال کی خدمات کی فراہمی کے طور پر جنگل کاٹنے کے لیے اپنی منظوری نہ روکیں۔ اس ترمیم میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ سڑکوں کے لیے جنگلوں کے کاٹنے میں رکاوٹ نہ ڈالیں اور ریاستی سرکاریں جب کبھی اپنے منصوبے مرکزی سرکار کو منظوری کے لیے بھیجیں تو ایسے منصوبوں، پروجیکٹوں اور اسکیموں کو ۱۵ دنوں کے اندر منظوری دے دی جائے۔ قانون پر عمل درآمد کے بارے میں تفصیلی بحث و تمحیص کی کمی اور زیادہ سے زیادہ اطلاعات دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس ترمیم کو حتمی شکل نہیں دی جا سکی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری جنگلاتی پالیسی اس معیار پر مبنی ہے کہ پہاڑی علاقوں کے جنگلوں کو جنگل میں رہنے والوں سے خطرہ ہے اور اس لیے ان جنگلوں کو تحفظ دیا جائے۔ سال ۱۹۸۰ء کے قانون کے مسودے میں متعلقہ جرائم کی فہرست میں اضافہ کیا گیا تھا اور اس میں جنگلاتی پیداوار گھاس، پھولوں، پتیوں اور شاخوں کو جمع کرنے جیسے امور بھی شامل کیے گئے تھے۔ جنھیں ابھی تک جنگل میں رہنے والے اپنے طور پر جمع کر رہے تھے۔ مجوزہ سزا کو

مزید سخت بنایا گیا تھا اور اس کے تحت تین برس جیل کی سزا یا ۵ ہزار روپے تک کا جرمانہ یا دونوں کی سزا ہو سکتی تھی۔

پہاڑی علاقوں میں رہنے والوں کی یہ رائے ہے کہ تحفظ فراہم کرنے میں سرکار کا اہم رول ہے کیوں کہ انھیں جنگلات سے متعلق قوانین کی زیادہ جانکاری نہیں ہے۔ چپیا پہاڑ کے رہنے والے لوگوں کو جنگلات کے کٹاؤ سے برے اثرات کا علم ہے کیوں کہ انھوں نے گاؤں کی سطح پر پیڑوں کے تحفظ سے متعلق کمیٹیاں بنائی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ صرف قانون کے ذریعہ جنگلات کی حفاظت نہیں ہو سکتی بلکہ ماحولیات کے توازن کو برقرار رکھنے کے لیے تحفظ اور بچاؤ کے لیے عوامی بیداری لانی ہوگی۔ عوام کو آلودگیوں کے برے اثرات سے باخبر کرنا ہوگا اور ماحولیات کے تجدیدنو کے لیے ان کی خدمات کو متعین کرنا ہوگا۔ پیڑوں کو مسلسل غیر قانونی طور پر گرایا جا رہا ہے۔ موجودہ قانون میں اس کے لیے جیل اور نقد جرمانے کی سزا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر سختی سے عمل درآمد نہیں ہوتا ہے۔

پہاڑی علاقوں میں جنگلات سے متعلق قوانین میں حسب ذیل نقطوں پر دھیان دیا جانا چاہیے: ماحولیات کے توازن کا تحفظ اور پودے لگانے کے وسائل سے ماحولیات کی دائمی حیثیت کو برقرار رکھنا، باقی قدرتی جنگلوں اور عوام کی بنیادی ضرورتوں خصوصاً دیہی اور قبائلی لوگوں کے لیے ایندھن اور چارے کی فراہمی کرنا، جنگلوں کی حفاظت اور اردگرد لوگوں اور قبیلوں کے درمیان بہتر تعلقات قائم کرنا، جنگلاتی وسائل سے متعلقہ روایتی اختیارات کا تحفظ فراہم کرنا، قانون کے تحت خصوصی (مجسٹریل) اختیارات دیے جانے کی ضرورت ہے تاکہ ایسے لوگوں پر جرمانہ عائد کیا جائے اور جیل کی سزا دی جائے جنھوں نے اپنے تجارتی منافع/امکان کے لیے جنگل کے علاقے پر قبضہ کیا ہے۔ جنگلات کے وسائل کے تحفظ کے لیے پہاڑی خطوں میں ماحولیات سے متعلق عدالت قائم کرنے پر بھی توجہ دینے کی ضرورت مناسب ہوگی۔

چوتھے پانچسالہ منصوبہ میں پہاڑی ترقی کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا تھا اور سرمایہ کاری کی زیادہ لاگت اور کم آمدنی کے حالات کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ پہاڑی ریاستوں کے لیے مرکزی امداد خصوصی طور پر فراہم کی جائے اور مرکزی امداد دینے کے لیے طریقۂ کار کو مزید کشادہ بنایا جائے تاکہ انھیں اپنے منصوبہ بند وسائل میں سے دستیاب فنڈ فراہم کرنے کے لیے حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ اس طریقۂ کار پر عمل درآمد ہوا ہے۔ ۳۰ فی صد مرکزی امداد کے مقابلے میں ان علاقوں میں کیے گئے اخراجات پر ۵۰ فی صد مرکزی امداد کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ہمالیہ پہاڑ کے کچھ سرحدی علاقوں میں اس طریقۂ کار میں ۹۰ فی صد امداد بطور گرانٹ اور ۱۰ فی صد بطور قرض شامل ہیں۔ پانچویں پانچسالہ منصوبہ میں مرکزی سرکار کی طرف سے مناسب رویہ اپنانے کے علاوہ ان علاقوں کی ترقی کے منصوبوں کے لیے کافی مقدار میں رقوم مہیا کی گئی تھیں۔ اس منصوبہ میں پسماندہ اور قبائلی علاقہ کے عنوان سے الگ ایک باب دیا گیا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ پسماندہ علاقوں میں ترقیاتی کام ترجیحی بنیاد پر کیے جائیں تاکہ تمام عوام کو برابری اور سماجی انصاف دلانے کے مقصد کو ٹھوس شکل دی جائے۔ اس میں اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا تھا کہ پسماندہ علاقوں کی منصوبہ کاری ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس میں یہ بھی ذکر موجود تھا کہ مارکٹنگ کرنے والی قوتیں عام طور پر اس طرح اپنا کام کرتی ہیں کہ ترقی کا رخ پہلے سے ہی ترقی یافتہ خطے میں مرکوز ہو جاتا ہے اور معاشی نظام کا تنظیمی طریقۂ کار متعدد سیکٹروں کے درمیان نابرابری اور عدم توازن میں اضافہ کرتا ہے۔ پانچویں پنجسالہ منصوبہ میں پہاڑی علاقوں کی ترقی کے پروگرام کو منافع بخش بنایا گیا تھا۔ ساتویں منصوبے میں پہاڑی علاقوں میں ماحولیات کے فروغ پر زور دیا گیا تھا۔ (۱) ماحولیات کی باز آبادکاری (۲) ماحولیات کا تحفظ اور (۳) ماحولیات کے فروغ پر منصوبہ بند طریقے کے پیش نظر خصوصی توجہ بھی مرکوز کی گئی تھی۔

آٹھویں پانچ سالہ منصوبہ کے مسودہ میں پہاڑی علاقوں کی ترقی کے طبعی اور سماجی و اقتصادی پہلو پر خصوصی دھیان، پہاڑی علاقوں کے زمرے میں گراوٹ کی روک تھام، زمین کی پیداوار کی صلاحیت میں اضافہ، نیم، پیپل، جامن اور آم جیسے مختلف مقاصد پیڑوں کی موجودگی کے لیے ان کے پودے بڑے پیمانے پر لگانے کی طرف دھیان کی بڑی ضرورت ہے۔ ایک ہی طرح کے یوکلپٹس کے پودوں کے لگائے جانے کے رجحان میں کمی کرنی ہوگی کیوں کہ یہ پہاڑی علاقوں میں سیلاب کی روک تھام میں معاون نہیں ہیں۔ اس لیے آٹھویں منصوبہ کے دوران قانون میں مکمل طور پر ترمیم کر کے تجارتی مقاصد کے لیے جنگل کے استعمال کو روکنا ضروری ہوگا۔

پالیسی کے نظریہ سے ضروری پہلو

پہاڑی علاقوں میں چراگاہوں اور چاروں کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے کوشش کے ساتھ ساتھ نایاب پہاڑی جو مسائل کا سائنسی استعمال کیے جانے کے کاموں پر مناسب دھیان دینا ہوگا جس سے زمینی علاقے کے لیے خوراک کی اشیاء ایندھن، لکڑی، چارے کی مقامی ضرورتوں کی تکمیل ہو سکے۔ غیر روایتی توانائی کے فروغ اور لکڑی کے بغیر ایندھن کے وسائل کے استعمال پر زیادہ زور دینا چاہیے۔ اجتماعی ترقی کے لیے آبی ذخائر کے فروغ کو منصوبہ بند کرنا بھی ضروری ہے کیوں کہ یہ عوام کے لیے پانی کی ضرورتوں کی تکمیل کرنے کے ساتھ ساتھ پانی اور قدرتی وسائل کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

پہاڑی علاقوں میں ہر گاؤں یا گاؤں کے گروہوں کا اپنا اپنا جنگل ہونا چاہیے جس سے یہ جنگل ان کی ایندھن، لکڑی، چارے اور عمارتی لکڑی کی ضرورتوں کو پوری کر سکیں۔ پہاڑی علاقوں کے باغات کی پیداوار کو ڈبہ بند کرنے کے لیے لکڑی کے استعمال میں کمی لانے کے لیے پلاسٹک یا گتے جیسی متبادل کے استعمال سے راحت مل سکتی ہے۔ قانون اور شرائط کو رہنما اصولوں کے طور پر استعمال کیا جائے تاکہ پہاڑی علاقوں میں لکڑی کے غلط استعمال کو روکا جا سکے کیوں کہ ایسا کرنا بیش قیمت جنگلاتی میراث کا غلط استعمال کرنا ہے۔

آٹھویں پانچ سالہ منصوبہ کے دوران ایک اہم قابل غور بات یہ طے کرنی ہے کہ پہاڑی راستوں کی تعمیر آمدورفت کی ضرورتوں، سائنسی نقطۂ نظر اور پہاڑی علاقوں کے لیے موزوں خصوصیتوں کے حسب حال کیا جائے جس سے پہاڑوں کی ترقی ہو سکے اور پانی کے بہاؤ کے پورے نظام کو فروغ دیا جا سکے۔ اس کے ساتھ پہاڑوں کے پھسلنے، زمین کے کٹنے وغیرہ کے حادثے کم کیے جا سکیں۔ پہاڑی علاقوں میں آبادی کا تناسب کم ہے اور گاؤں چھوٹے چھوٹے

باقی صفحہ [illegible] پر

بقیہ کور ۳: اپنا گھر۔ مسائل اور امکانات

کرتی ہے۔ ہوڈکو کی طرف سے لاتور میں زلزلہ سے متاثرین کے لیے باز آبادکاری کے مقصد سے بننے والے مکانات کے لیے رعایتی شرح پر مالی امداد بھی فراہم کی جا رہی ہے۔ مکانات کی تعمیر کے لیے مالی امداد فراہم کرنے میں ایل، آئی، سی، ہاؤسنگ فائنانس لمیٹڈ، ہاؤسنگ ڈیولپمنٹ لمیٹڈ، کینرا بینک وغیرہ کی طرف سے ریاستوں کو ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۸۳ر۲۰۱ کروڑ روپے کے قرضے فراہم کیے گئے۔ جی آئی سی، ہاؤسنگ فائنانس لمیٹڈ کا قیام تقریباً ساڑھے چار سال قبل جنرل انشورنس کارپوریشن اور اس کی سبسڈیری کمپنیوں کی مدد سے کی گئی تھی۔ کمپنی رہائشی یونٹوں کے لیے قرض فراہم کرتی ہے۔ مکانات کی تعمیر کے لیے ۳۱ر مارچ ۱۹۹۴ء تک ۹۰۴۱ مکانات کے لیے مجموعی طور پر ۸۰ر۱۰۶ کروڑ روپے کے قرضے منظور کیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے ۸۱٫۰۲ کروڑ روپے تقسیم کیے جا چکے ہیں۔ متعدد افراد، کمپنیوں، بلڈروں اور بھارت سے باہر رہنے والے بھارتیوں کے لیے کمپنی کی طرف سے کئی اسکیمیں چلائی گئی ہیں۔

مسائل حل کرنے کے لیے کچھ تجاویز

——— مسائل کے حل کے لیے ضروری ہے کہ قانونی ڈھانچے میں تبدیلی کی جائے۔ ملکیت کی منتقلی کے قانون اربن سیلنگ اینڈ رینٹ کنٹرول ایکٹ شہری ملکیت کی حد بندی اور کرائے کے کنٹرول سے متعلق قانون میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ زمین کی سرکاری نیلامی بند ہونی چاہیے۔

——— حاصل شدہ زمین کا فوری طور پر استعمال کیا جائے، اس میں تاخیر سے زمین کی قیمتیں تیزی سے بڑھ سکتی ہیں۔

——— حقدار گاہکوں کو ترجیح دی جانی چاہیے — سرمایہ کاری کرنے والوں پر بھی ایک حد کے بعد پابندی لگا دی جائے تاکہ وہ مکانات کی قیمتوں کو من چاہے ڈھنگ سے نہ بڑھا سکے۔ مکانات کے مالکوں کی منافع خوری کو بھی قابو میں کیا جانا چاہیے۔

——— سرکار کو چاہیے کہ وہ بڑے پیمانے پر زمین فراہم کرے، اگر بڑے پیمانے پر مکانات بنائے جائیں گے تو قیمتیں یقیناً کم ہوں گی۔

——— اس سلسلے میں کوآپریٹو سیکٹر زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کے تحت سوسائٹی کے اراکین اجتماعی طور پر زمین اور بلڈنگ میٹریل مناسب شرح پر خرید لیتے ہیں اور بڑے پیمانے پر تعمیرات وغیرہ کے کام کیے جاتے ہیں اس انتظام سے افرادی اور مشینی قوتوں کا بھرپور استعمال ہوتا ہے اور دلالوں اور سٹے بازوں کا رول برائے نام رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مکانات کی ڈیزائننگ، پلاننگ اور کنسٹرکشن منظور شدہ معیار کے مطابق ہوتی ہے جس سے ایک اچھی تعمیر ہو پاتی ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ دنیا کے بیشتر ملکوں میں امداد باہمی کے اداروں نے مکانات کی تعمیر میں اہم رول ادا کیے ہیں۔

——— اینٹ، ٹائلس، کنکریٹ، سیمنٹ جیسے خام مال کی پیداواری لاگت کم کی جائے۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں منعقدہ ۳۸ ویں کنونشن میں اینٹ اور ٹائلس مینوفیکچر ایسوسی ایشن نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اینٹ اور ٹائلس کی تیاریوں میں جدید تکنیک اپنائی جائے اور اس طرح لاگت میں کمی کی جائے۔ تاکہ صدی کے اختتام تک ہر کنبہ کو کم لاگت والے مکان فراہم کرانے کا نشانہ پورا کیا جا سکے اس کے لیے چار کروڑ مکانات اور تقریباً ۲۸۶۵۰ کروڑ اینٹوں کی ضرورت کا تخمینہ لگایا گیا ہے۔ آسٹریلیا سے آئے ایک ماہر اینٹ ساز گیلبرٹ ہاؤ کلا بھارت میں اینٹ کی تیاری سے متعلق ایک مفید طریقہ لے کر آئے تھے۔ یہ طریقہ کار کس قدر مفید ہوگا یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ اسی کنونشن میں اینٹ کی تیاری کے کام کو صنعت کا درجہ دینے اور اس سلسلے میں ایک ریسرچ سینٹر کے قیام کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا۔

——— ایک تخمینے کے مطابق اس صدی کے اختتام تک مکانات کی مانگوں اور ان کی فراہمی میں ایک بڑا فرق مالیہ کی کمی بھی ہے۔ ایسے میں ان کمپنیوں کے امکانات کافی روشن ہیں جو مکانات کی تعمیر کے لیے قرضے فراہم کر رہی ہیں۔

——— مکانات کی تعمیر کے لیے قرضے کی فراہمی سے بہت سے لوگوں کو مکانات حاصل ہو سکتے ہیں لیکن ان مالی کمپنیوں کی شرائط بہت مشکل ہیں۔ اگر قرض کی ادائیگی کی مدت طویل ہو اور سود کی شرح کم ہو تو قرض خواہوں کو قرض کی ادائیگی میں دشواریاں نہیں پیش آئیں گی۔ قرض کی قسطوں کی رقم اور ادائیگی پر ٹیکس کی چھوٹ ہونی چاہیے۔ مالی صنعت کاری میں تعاون کا ماحول ہونا چاہیے تب ہی مناسب قیمت پر عوام کو مکانات حاصل ہو سکیں گے۔

——— شہری علاقے میں واقع بازاروں کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کیا جائے تاکہ رہائش کے قابل زمین فراہم ہو سکے اور مناسب قیمت پر مکانات حاصل ہو سکیں۔

یہ بات سچ ہے کہ سرکار نے بڑے پیمانے پر مکانات فراہم کیے ہیں اور مستقبل میں بھی سرکاری منصوبے میں مکانات فراہم کرنے کا ذکر ہے لیکن مسئلہ جوں کا توں بنا ہوا ہے۔ بڑھتی آبادی کے دباؤ نے حالات کو بدتر بنا دیا ہے۔ آسانیاں تو فراہم کی جا سکتی ہیں لیکن اتنی بڑی آبادی کے لیے زمین کی فراہمی ناممکن ہے۔ مسائل کے حل کے لیے کسی پالیسی کو اپناتے وقت یہ دھیان رکھنا ہوگا کہ مکان زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت تو ہے ہی ساتھ ہی یہ ملک کی سماجی، معاشی اور اقتصادی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ مکانات کی تعمیر معاشی صنعت کی عمل آوری کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، روزگار کے مواقع فراہم کرتی ہے ساتھ ہی صحت مند زندگی بسر کرنے کی بنیادیں بھی فراہم کرتی ہے۔ معاشی ترقی میں تعمیرات کی صنعت کو دھیان میں رکھ کر ہی آٹھویں منصوبے میں اس صنعت کو ترجیح دی گئی ہے۔ ●

بقیہ: فضائی آلودگی اور اوزون سطح

پیداوار میں کچھ کمی ہوئی۔ لیکن بعد میں اس میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا۔ ان گیسوں کا استعمال صنعتی یونٹوں میں کیا جاتا ہے جس سے کافی فائدہ حاصل ہوتا ہے مگر اس سے فضائی آلودگی میں زبردست اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ فضا میں ۱۰۰ سے چار سو برسوں تک بنی رہتی ہے۔ جب یہ گیسیں اوزون سطح تک پہنچتی ہیں تو ہمارے لیے نقصان دہ ULTRA VIOLET شمسی شعاعیں ایک کلورین جوہر کو چھوڑتی ہے جن کے نتیجے میں یہ اوزون ذرہ میں سے فوراً آکسیجن جوہر کو علاحدہ کر دیتا ہے اور یہ اس طرح اوزون کو برباد کرتا ہے۔

لہٰذا ہم سب کو فضائی آلودگی اور اس کے نتیجے پر ہمیشہ متفکر رہنا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو آلودگی کم کرنے میں مدد کرنی چاہیے۔ ●

سہیل احمد

فضائی آلودگی اور اوزون سطح

حقیقتاً اوزون آکسیجن کی طرح ہی ایک گیس ہے۔ آکسیجن کا کیمیائی فارمولا O_2 ہے جب کہ O_3 کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اوزون کی خصوصیات آکسیجن سے مختلف ہے۔ یہ عام آکسیجن کے برعکس زہریلی ہوتی ہے۔ آکسیجن میں کوئی بو نہیں ہوتی جب کہ اوزون میں ایک خاص طرح کی بو ہوتی ہے۔ اکثر سمندر کے کنارے یا ایسی جگہ پر جہاں حال ہی میں بجلی چمکی ہو یا طوفان آیا ہو اوزون کی بو کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ گیس صحت کے لیے فائدہ مند بھی ہوتی ہے۔

اوزون کا استعمال اکثر BLEACHING AGENT، اور DEODORANT کے طور پر پانی کو جراثیم سے پاک کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ فضا میں سورج کی ULTRA VIOLET کرنوں کے اثر سے مسلسل اوزون بنتی رہتی ہے۔ کچھ AIR POLLUTANTS خاص کر موٹر گاڑیوں سے نکلی گیسوں پر سورج کی روشنی کے میل ہونے سے بھی اوزون پیدا ہوتی ہے۔ اوزون دھوپ کہرے (SMOG) کا ضروری رکن ہے۔ یہ اوزون صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔

سائنس دانوں نے ہماری فضا کو ۵ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ جو کرۂ ارض سے سب سے قریب ہے۔ ۲۰ کلومیٹر کی اونچائی تک کے اس حصے کو TROPOSPHARE کہتے ہیں۔ ۲۰ سے ۵۰ کلومیٹر کے درمیانی حصے کو STRETOSPHARE کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تیسرا حصہ ۸۰ کلومیٹر کی بلندی تک پھیلا ہوا ہے۔ اسے MICOSPHARE، چوتھا حصہ THERMOSPHARE ۵۰۰ کلومیٹر تک کا ہے جب کہ پانچواں سب سے بلندی والا ہے۔ ۹۰۰ کلومیٹر کی اونچائی تک کے اس حصے کا نام ہے EXOSPHARE۔ ۱۵ سے ۵۰ کلومیٹر کے درمیانی حصے میں ہی اوزون ایک سطح کے روپ میں موجود ہے۔ یہ حصہ STRETOSPHARE کے تحت آتا ہے۔ اوزون کا ۹۰ فی صد حصہ اسی میں پایا جاتا ہے اور یہی اوزون سطح سورج سے نکلی ULTRA VIOLET شعاعوں کو جذب کر لیتا ہے۔ یہ ایسی شعاعیں ہیں کہ اگر یہ براہ راست ہماری زمین پر پہنچ جائیں تو معمولی زندگی درہم برہم ہو سکتا ہے۔ ہر ذی روح اس سے متاثر ہوگی یہاں تک کہ یہ پوری طرح انھیں برباد بھی کر سکتی ہیں۔

آج انسان زندگی کے اس موڑ پر پہنچ گیا ہے جس میں بین اقوامی موسمیات کو بدل سکتا ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں کے اعداد و شمار اور اطلاعات کے مطابق اس بات کا انکشاف ہو چکا ہے کہ آئندہ برسوں میں موسم کے حالات میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ فضا میں موجود گیسوں کی مقدار کا توازن دن بہ دن بگڑتا جا رہا ہے۔ اس عدم توازن کی ایک مثال یہ ہے کہ فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار صنعتی دور کے قبل ۲۸۰ ڈگری پر ملین تھی۔ یہ مقدار ۱۹۸۰ء میں ۳۴۰ ڈگری تک پہنچ گئی اور اگر اب بھی اس کی روک تھام نہ کی گئی تو آئندہ صدی کے نصف تک یہ ۵۶۰ ڈگری پر ملین تک بڑھ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جون ۱۹۹۲ء میں برازیل کے ریوڈی جنرو شہر میں ایک بین اقوامی جلسۂ ارض کا انعقاد کیا گیا۔ جسے یو۔ این۔ کا جلسۂ ماحولیات بھی کہا گیا ہے۔ اس میں دنیا کے بیشتر ممالک نے ماحول میں مسلسل ہو رہی تبدیلیوں پر غور و خوض کیا۔

اس جلسے میں حصہ لینے والے تمام ملکوں نے ماحولیات میں سدھار کے لیے کوئی کارگر منصوبہ بنانے پر زور دیا۔ اس عام سمجھوتے سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ آئندہ تقریباً دس برسوں میں ان گیسوں کے نکلنے میں کمی لائی جائے گی جو ماحول کو زبردست آلودہ کرتی ہیں۔

ماحول میں زبردست آلودگی کے باعث اوزون سطح کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ جسے اوزون میں سوراخ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اوزون جو زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے اس کو نقصان پہنچانے کی تمام تر ذمہ داریاں انسانوں پر ہی عائد ہوتی ہیں کیونکہ انسانی زندگی میں پیش آنے والے عمل ہی اوزون کو متاثر کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی جوہری تجربہ کیا جاتا ہے اور اس کا اثر زمین کے ۱۵ کلومیٹر کی بلندی سے اوپر تک پہنچتا ہے تو یہ لازمی طور پر اوزون سطح کو متاثر کرے گا۔ ۱۵ کلومیٹر سے نیچے اڑنے والے کسی بھی جٹ طیارے سے اوزون کو کوئی خاص نقصان نہیں ہے۔ مگر اس سے اوپر اڑنے والے طیارے اوزون کو ضرور متاثر کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ جن گیسوں کا اوزون سطح پر سب سے زیادہ اثر ہے وہ ہے کلورو فلورو کاربن (C.F.C.)۔ یہ گیس ہیلی کاربن نامی ایک کنبہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں کاربن اور ہیلوجن (فلورین، کلورین اور برومین) جو ہرات والی انسان کے ذریعہ بنائی گئی گیسیں شامل ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ استعمال کی جانے والی ہیلو کاربن گیسیں C.F.C-11 اور C.F.C-12 ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں ان گیسوں میں کافی اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی کے درمیان اس کی

باقی صفحہ ۱۹ پر

میر حسن روڈ، نو بہار گنج، نزد اسعد نگر، یو پی

ڈاکٹر اقبال محی الدین

ایک ہمہ گیر شخصیت
مولانا ابوالکلام آزاد

برطانوی حکومت کا تسلط ہندوستان پر دو سو سال سے بھی زیادہ رہا۔ ان کے عہدِ حکومت میں ہندوستانیوں پر بہت ظلم و ستم ہوتے رہے۔ عوام و خواص سبھی ایسے ماحول سے تنگ آ چکے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ انگریزی حکومت کا خاتمہ ہو جائے اور ہندوستان میں ہندوستانیوں کی حکومت قائم ہو جائے اور ہمارا ملک ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائے۔ اس سلسلہ میں ہندوستانی عوام نے مل جل کر قومی تحریک چلائی جسے ہم جد و جہد آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

آزادی کی اس تحریک کے اہم رہنماؤں میں گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، سردار پٹیل، مولانا محمد علی، بال گنگادھر تلک، لالہ لاجپت رائے، گوپال کرشن گوکھلے، فیروز شاہ مہتہ، سبھاش چندر بوس، خان عبدالغفار خاں اور سروجنی نائیڈو کا شمار صفِ اول کے سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ ان مشہور ہستیوں کے علاوہ اور بھی بہت اہم رہنما تھے جنھوں نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں حصہ لیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد بیسویں صدی کے عظیم ہندوستانیوں میں سے ایک ہیں جن کی گہری علمیت، فضیلت اور سیاسی بصیرت کی بنا پر ان کا شمار اس دور کے عظیم مفکروں میں کیا جا سکتا ہے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی برسوں ہی میں وہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے وابستہ ہو گئے تھے اور انھوں نے ملک کی ساری عوامی تحریکوں میں اہم رول انجام دیا۔ ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے بہترین نمائندے کی حیثیت سے انھوں نے آزاد ہندوستان کی سماجی و معاشی اور تعلیمی پالیسیوں کو تشکیل دینے میں بھی اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے مدتوں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور فرقہ پرست عناصر کی زیادتیاں سہیں لیکن اپنے راستے سے نہیں ہٹے۔ وہ ایک اعلا کردار و پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ قدرت نے انھیں تحریر و تقریر دونوں پر دسترس عطا کی تھی۔ ان کی پُرجوش تحریروں اور تقریروں نے ہندوستانی مسلمانوں میں ایک ذہنی انقلاب برپا کر دیا۔ مذہب، سیاست، ادب اور صحافت، ہر میدان میں انھوں نے اپنا سکہ جما دیا تھا۔

مولانا آزاد عظیم کیسے بنے؟۔ انھوں نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں کیا رول ادا کیا اور ان کا تاریخ میں کیا مقام ہے؟ یہ سب جاننے کے لیے ہمیں مولانا کی زندگی، تعلیم، صحافت، ان کا ادبی و سیاسی مقام اور ان کی سیاسی بصیرت پر پوری طرح روشنی ڈالنی ہو گی۔

ابتدائی زندگی اور تعلیم

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء میں مکہ (سعودی عرب) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مولانا خیرالدین دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک عالم اور بزرگ شخصیت تھے جن کی شہرت حجاز، مصر اور شام میں بھی بہت تھی اور ہندوستان میں بھی لاکھوں لوگ ان کے مرید تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے ملک کی سیاسی فضا بہت خراب ہو چکی تھی۔ دہلی کے شرفا اور علما نے عرب ممالک کی طرف ہجرت شروع کر دی تھی۔ مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین کے نانا منورالدین نے بھی ہجرت کا ارادہ کیا اور دوسرے سال وہ روانہ ہوئے۔ مولانا خیرالدین بھی اس سفر میں اپنے نانا (مولانا منورالدین) کے ساتھ تھے۔ بمبئی پہنچ کر انھوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہیں ان کی شادی بھی ہو گئی۔ لہٰذا انھوں نے مکہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا اور وہیں اپنا ذاتی مکان بھی تعمیر کروا لیا اور گزر اوقات کے لیے حرم شریف میں وعظ کا سلسلہ شروع کیا اور بازار میں ایک کپڑے کی دوکان بھی کھول لی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ابتدائی دن مکہ ہی میں گزرے۔ ان کی مادری زبان عربی تھی۔ انھوں نے قرآن کی تعلیم اپنی والدہ سے لی۔ قرأت سیکھنے کے لیے وہ حرم شریف میں جایا کرتے تھے۔ اردو کی تعلیم کا وہاں کوئی انتظام نہیں تھا۔ لہٰذا وہ مکہ میں عربی اور فارسی کی تعلیم ہی حاصل کر سکے۔ مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین اپنے علاج کے سلسلہ میں مکہ سے کلکتہ آئے اور کلکتہ میں رہنے لگے۔ ان کے ساتھ ہی مولانا آزاد بھی آ گئے۔ یہیں انھوں نے اردو کی تعلیم حاصل کی۔ جب وہ ٹھیک ہو کر کلکتہ سے مکہ جانے لگے تو مولانا آزاد کی والدہ کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے سفر ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ مولانا خیرالدین کے مرید بھی اصرار کرنے لگے کہ وہ کلکتہ ہی میں رہیں۔ لہٰذا وہ یہاں رک گئے اور اپنے بیٹوں کی تعلیم کا انتظام بھی کر دیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم تو وہ حاصل کر ہی چکے تھے، اب ان کو علوم و فنون کی طرف توجہ دلائی گئی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد مولانا آزاد کی طبیعت شاعری کی طرف مائل ہو گئی۔ وہ اشعار کہنے لگے اور آزاد تخلص رکھا۔

۵۴۔ بی۔ ڈی۔ ڈی۔ اے فلیٹ۔ قطب اینکلیو۔
نزد قطب ہوٹل۔ نئی دہلی۔۱۱۰۰۱۶

عربی اور فارسی کے علاوہ مولانا آزاد نے اردو سیکھی اور انگریزی کی تعلیم کی طرف راغب ہوئے اور بہت جلد اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی۔ ترکی زبان بھی سیکھنے کی کوشش کی مگر تکمیل نہ کر سکے۔

مذہبی رجحان

مولانا آزاد ایک عالم دین تھے۔ انھوں نے مذہبی ماحول میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد مذہبی رہنما اور پیر تھے جن کے لاکھوں مرید ہندوستان اور دیگر ممالک میں تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت اسی ماحول میں ہوئی۔ مولانا آزاد نے "ترجمان القرآن" کے نام سے ایک تفسیر لکھنی شروع کی۔ کچھ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے تفسیر مکمل نہ ہو سکی اور قرآن کے ۳۰ پاروں میں سے صرف ۱۸ کی تفسیر وہ لکھ سکے۔ ۱۹۲۱ء میں ان کی گرفتاری کے وقت تفسیر کے مسودات حکومت نے ضبط کر لیے۔ اس وجہ سے مولانا بد دل ہو گئے اور تفسیر لکھنے کا کام چھوڑ دیا۔

مولانا آزاد نے مذہب کے متعلق کئی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن ان میں سب سے اہم ہے "تذکرہ"۔ کہنے کو یہ ان کی سوانح حیات ہے لیکن اصل میں اس کو اسلامی فکر پر ایک مقالہ سمجھنا چاہیے۔ مولانا کی جادو نگاری نے اس کتاب کو اردو ادب میں بھی ایک بڑی حیثیت دے دی ہے۔ وہ صاحب طرز نثر نگار تھے۔ ان کا اسلوب و انداز بیان بے مثال تھا۔

صحافت

تقریباً گیارہ سال کی عمر سے ہی مولانا آزاد نے شعر و شاعری کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انھیں ایک گلدستہ بھی شائع کرنے کا خیال آیا۔ ۱۸۹۹ء میں "نیرنگ عالم" کے نام سے انھوں نے ماہانہ گلدستہ شائع کرنا شروع کیا لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد کلکتہ سے انھوں نے "المصباح" نام کا رسالہ جاری کیا۔ وہ بھی کچھ ہی دن نکل سکا۔ اس کے بعد انھوں نے "لسان الصدق" جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا تھا جس کا مقصد مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا، اردو زبان کے علمی ادب کے دائرہ کو وسیع کرنا، علمی مذاق کی اشاعت کرنا اور اردو تصنیفات پر منصفانہ ریویو کرنا تھا۔ جس وقت یہ پرچہ نکلا تو مولانا کی عمر صرف ۱۵ سال کی تھی مگر انھوں نے اپنی تحریروں سے "لسان الصدق" کو واقعی سچائی کی زبان بنا دیا۔ رسالہ کے مضامین کا معیار بہت بلند ہوتا تھا اور مولانا کا انداز دلکش جس کی بنا پر اس کا صف اول کے رسالوں میں شمار ہونے لگا۔ اس پرچے میں شائع ہونے والی مولانا کی تحریروں سے متاثر ہو کر انجمن حمایت اسلام نے انھیں لاہور آنے کی دعوت دی۔ اس سفر کے دوران مولانا آزاد کی ملاقات مولانا الطاف حسین حالی سے ہوئی۔ حالی کو جب معلوم ہوا کہ مولانا آزاد "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں تو وہ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ساتھ ساتھ تعجب بھی ہوا کہ ایک نوعمر صاحب زادے اتنے پایہ کے رسالے کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ رسالہ بھی بہت دن تک نہ چل سکا اور ۱۹۰۵ء میں بند ہو گیا۔ اسی سال مولانا شبلی نے مولانا آزاد کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی تاکہ وہ ندوۃ العلماء کے ماہانہ رسالہ "الندوہ" کی ادارت میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں۔ کچھ دنوں تک مولانا آزاد اس رسالہ کے کام کو سنبھالے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے اپنی دیگر مصروفیات کی بنا پر اس کام کو چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ امرتسر چلے گئے جہاں اخبار "وکیل" کی ادارت کا کام سنبھالنے لگے۔ لیکن وہاں بھی زیادہ دن تک قیام نہ رہ سکا۔

۱۹۱۲ء میں مولانا آزاد نے کلکتہ سے "الہلال" جاری کیا جو بقول نیاز فتحپوری "ایک شعلہ تھا"۔ مولانا کا رجحان سیاست کی طرف کب اور کیوں ہوا؟ اس کی ابتدا اسی وقت ہوئی جب مصر کے جامعہ ازہر میں انھیں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریک آزادی کے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئے تو یہ چنگاری اپنے سینے میں لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی مدت و تیزی بڑھتی گئی اور آخر کار شعلہ جوالہ بن کر "الہلال" کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔ حکومت بنگال کی نظروں میں وہ کھٹکنے لگے تھے۔ حکومت نے ان کے رسالہ کو بند کر دیا۔ "الہلال" کی جگہ انھوں نے "البلاغ" جاری کیا۔ دونوں پرچوں میں محض نام کا فرق تھا۔ تحریر اور انداز تحریر یکساں تھا۔

اسلامی ممالک کے سفر سے ہندوستان واپس آکر مولانا آزاد نے سیاسی مضامین لکھنے شروع کر دیے جنھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک نئی گرمی پیدا کر دی۔ ہندوستانی مسلمان کی سیاسی دلچسپی اس وقت ترکی، بلقان اور طرابلس پر جمی رہتی تھیں۔ ملکی سیاست سے انھیں کم دلچسپی تھی۔ وہ ہندوستان کی تحریک آزادی سے زیادہ باہری ممالک کی سیاست اور اسلامیت سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان حالات میں مولانا نے "الہلال" کی اشاعت کے ذریعہ ان کی توجہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی طرف مرکوز کی۔ لوگوں کو مولانا کی تحریر میں ایک نیا ذہن، نئی فکر اور نیا انداز نظر آیا۔ مولانا نے صحافت کے وقار کو ہمیشہ زندہ رکھا اور لوگوں کے ذہن کو ہندوستان کی تحریک آزادی کی طرف مائل کر دیا۔ مولانا آزاد نے صحافت میں ایک نیا معیار قائم کر دیا۔ ان کے بلند پایہ مضامین نے صحافت کی زبان اور انداز بیان کو مستند بنا دیا۔ "الہلال" نئے خیالات و رجحانات کا نقیب تھا۔ وہ سیاسی پرچہ بھی تھا اور مذہبی بھی۔ اس میں ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے اور بلقان کی لڑائی، طرابلس کے انقلاب، ندوے اور علی گڑھ کی سرگرمیوں اور مسلم لیگ اور کانگریس کے جھگڑوں کا جائزہ بھی لیا جاتا تھا۔ انھوں نے "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعہ فرقہ وارانہ اتحاد کی کوشش کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ مل کر غیر ملکی حکومت کی غلامی سے نجات حاصل کریں۔ ان دونوں اخباروں نے مسلمانوں کی سیاست اور ہندوستانی سیاست کے دھارے کا رخ جد و جہد آزادی کی طرف موڑ دیا۔

ادبی زندگی

مولانا آزاد نے احمد نگر قلعے کی قید کے دوران "غبار خاطر" کتاب لکھی جو ایک ادبی شہ پارہ ہے۔ ۱۹۳۶ء کے درمیان اور بعد کے برسوں میں مولانا کی سیاسی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ ان کو لکھنے پڑھنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی ایک نازک مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ اگست ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس زمانے میں مولانا کانگریس کے صدر تھے۔ انگریزی حکومت نے مولانا آزاد اور کانگریس کے دوسرے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا تھا اور احمد نگر کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔ انگریزوں نے تو ہندوستان کی تحریک آزادی پر کاری ضرب لگایا تھا اور لیڈروں کو گرفتار کر لیا تھا۔ اس سے خاندہ

یہ ہوا کہ مولانا آزاد کو "غبار خاطر" لکھنے کا موقع مل گیا۔ "الہلال" اور "البلاغ" کی تحریروں کو ایک چڑھتی ہوئی ندی، ایک امنڈتا ہوا دریا کہا جائے جو اپنے ساتھ سب کچھ بہائے جاتے ہیں تو "غبار خاطر" کی تحریر کو ایک گنگناتا یا پہاڑی چشمہ سمجھیے جو پتھروں سے کھیلتا، پودوں کو آئینہ دکھاتا چلا جاتا ہے۔ ان کی تحریر میں زمانے کی نبض چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا آزاد اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں تھے اور اس بصیرت کو ادب میں ڈھالنے کے فن سے پوری طرح واقف تھے۔

مولانا آزاد بہترین مقرر تھے۔ ان کی تقریر میں تسلسل اور روانی ہوتی تھی جو سننے والوں پر جادو کا کام کرتی تھی۔ مولانا کی تحریر اور تقریر دونوں بہت پُر اثر ہوتی تھیں۔ انھیں اپنی تقریر اور تحریر دونوں پر پوری قدرت حاصل تھی۔ یوں تو مولانا نے ہزاروں تقریریں کیں جو اپنی اپنی جگہ بعد اہم تھیں لیکن ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد جو قیامت خیز حادثات اور واقعات ہوئے انھوں نے مسلمانوں کو بے حد پریشان کر دیا تھا۔ اس وقت مولانا نے ایک لکھنؤ میں اور دوسری جامع مسجد دہلی میں ایسی تقریریں کی تھیں جن کی گونج مدتوں تک ملک کے گوشے گوشے میں سنائی دیتی رہی۔ ان دونوں تقریروں کو مولانا کی خطابت کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔ مولانا کی جامع مسجد کی تقریر ان کے دُکھے ہوئے دل کی آواز تھی۔ انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو فرقہ پرستی کے اندھیرے سے نکالنا چاہا، انھیں صحیح راستہ دکھانا چاہا۔ انھوں نے کوشش کی کہ مسلمان ایک متحد قوم کی شکل میں ہندوستان میں ہی رہیں۔ اس کوشش میں ان کو کافی حد تک کامیابی بھی ملی۔

سیاسی زندگی

۱۹۰۵ء میں علی گڑھ تحریک کے حامیوں کی کوشش سے مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ یہ تنظیم مسلمانوں میں کانگریس کا اثر زائل کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ ۱۹۰۶ء میں اس کا پہلا اجلاس ہوا جس میں مولانا آزاد نے بھی شرکت کی۔ یہیں سے ان کی سیاسی زندگی کی شروعات ہوتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ۱۹۰۸ء میں مولانا نے اسلامی ممالک کا سفر کیا جہاں جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے خیالات سے وہ متاثر ہوئے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد ان کے خیالات میں زبردست تبدیلی نظر آنے لگی۔

اس زمانے میں کئی اہم سیاسی واقعات رونما ہو چکے تھے۔ مہاتما گاندھی انگلستان سے بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر کے ہندوستان آئے۔ یہاں سے ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں وہ جنوبی افریقہ گئے اور وہیں رہ گئے اور ۲۲ سال بعد ۱۹۱۵ء میں ہندوستان واپس آئے۔ جنوبی افریقہ میں خود ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس نے ان کے اندر زیادتیوں کے خلاف جدوجہد کرنے اور ہندوستانیوں کے لیے باعزت زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرنے کے جذبات پیدا کر دیے۔ ہندوستانیوں کے خلاف جنوبی افریقہ میں انگریزی حکومت امتیازی سلوک کرتی تھی۔ گاندھی جی نے پُرامن مزاحمت کا راستہ اختیار کیا اور وہاں کے ہندوستانیوں کے رہنما بن گئے۔

۱۹۱۹ء میں انگریزی حکومت نے ہندوستان میں دو بلوں کے مسودے امپریل لیجسلیٹو کونسل میں پیش کیے تاکہ رولٹ کمیٹی کی سفارشات کو قانونی شکل دی جا سکے۔ ان کا مقصد تھا ملک میں پیدا ہونے والے انقلابی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنا۔ ہندوستانیوں نے ان بلوں کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ ملک بھر میں ہڑتالیں کی گئیں، جلوس نکالے گئے اور جلسے کیے گئے۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر مائیکل اوڈائر نے بھی بڑی سختی کے ساتھ عوامی تحریک کو کچلا۔ اس نے جلیانوالہ باغ میں سیکڑوں مردوں اور عورتوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ اس سانحہ سے سارے ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور لوگوں میں انگریزی حکومت کے خلاف نفرت اور بے چینی پیدا ہو گئی۔

کانگریس نے اس کا جواب عوامی تحریک کی شکل میں دیا جس کا مقصد تھا آزادی حاصل کرنا، پنجاب کے مظالم کی تلافی کرنا اور خلافت کی عظمت اور وقار کو بحال کرنا۔ گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس نے مسلمانوں کے مطالبوں کی حمایت کی۔ انھوں نے ایک اپیل جاری کی جس میں ترکِ موالات کی پُرامن تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو یومِ احتجاج منایا گیا جس کے بعد یہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی۔ خلافت کمیٹی کی میٹنگ ۹ جون ۱۹۲۰ء کو الہ آباد میں ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ انگریزوں کے دیے ہوئے خطابات اور اعزازات واپس کر دیے جائیں، سرکاری سول ملازمتوں سے استعفے دیے جائیں، پولیس اور فوج کی ملازمتوں سے استعفے دیے جائیں اور محصول ادا نہ کیا جائے۔ گاندھی جی کی ہدایت کے مطابق ترکِ موالات کی تحریک یکم اگست سے شروع ہوئی۔ مولانا آزاد شروع سے اس تحریک میں شامل تھے۔ کلکتہ میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا تھا جس کے صدر مولانا آزاد تھے۔

کانگریس کا اجلاس لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں ہوا جس میں کافی نمائندوں نے حصہ لیا اور خاص طور سے مسلمانوں کی تعداد بہت تھی۔ گاندھی جی نے اور دوسرے رہنماؤں نے زور دیا کہ کانگریس کو بھی ترکِ موالات میں حصہ لینا چاہیے تاکہ آزادی حاصل کی جا سکے۔ مولانا آزاد نے بھی اس جلسہ میں حصہ لیا۔ اس کے بعد آگرہ میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو ہوا۔ مولانا آزاد اس کے صدر تھے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ یہ تحریک ملکی تحریک میں تبدیل ہو کر ایک ساتھ ہندوستانی عوام انگریزی حکومت سے تعاون نہ کریں اور ان پر اتنا دباؤ ڈالیں کہ وہ خود اس ملک کو چھوڑ کر واپس چلے جائیں اور عنانِ حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آ جائے۔

مولانا آزاد تحریک خلافت کے ساتھ کانگریس میں بھی شامل تھے۔ ۱۹۲۳ء میں دہلی میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس ہوا جس کی صدارت مولانا نے کی۔ اس جلسے میں مولانا نے جو خطبہ صدارت دیا اس میں فرقہ پرستی پر بھرپور وار کیا گیا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد سے حکومت گھبرا گئی تھی اور ان میں پھوٹ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔ مولانا آزاد نے فرقہ پرستی اور فرقہ پرستوں کی سخت مذمت کی۔ ان ساری کوششوں کے باوجود انگریزی حکومت ہندو مسلم اتحاد کو منتشر کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ ان حالات سے گاندھی جی کو بہت تکلیف ہوئی۔ انھوں نے ۲۱ دن کا برت بھی رکھا مگر پھر بھی حالات نہ سدھرے۔ زیادہ تر مسلمان رہنما تحریک خلافت کو ایک مذہبی تحریک سمجھتے تھے۔ یہ تحریک کمزور ہوئی تو وہ کانگریس سے علاحدہ ہو گئے۔ اس کے برعکس مولانا آزاد نے ہمیشہ اس تحریک کو قومی آزادی کی تحریک سمجھا اور اسی لیے وہ کانگریس سے نہ ہٹے۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن آئینی اصلاحات کے لیے بنایا گیا۔ ہندوستان میں اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا تو حکومت نے سختی برتی۔ کانگریسی لیڈروں پر لاٹھیاں برسائی گئیں۔ لالہ لاجپت رائے بھی دوسرے رہنماؤں کے ساتھ زخمی ہوئے مگر وہ زخموں کی تاب نہ لاسکے اور ان کا انتقال ہوگیا۔

۱۹۲۹ء میں کانگریس کا اجلاس پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں ہوا جس میں مکمل آزادی کی تجویز پاس کی گئی۔ مولانا آزاد بھی نہرو کے شانہ بہ شانہ رہے اور ہر طرح ان سے تعاون کرتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں کانگریس نے ستیہ گرہ شروع کی۔ گاندھی جی نے ڈانڈی کی طرف سفر کیا اور وہاں پہنچ کر سمندر کے کنارے نمک بنایا۔ نمک بنانے کا قانون توڑ کر گاندھی جی اور دوسرے عظیم رہنماؤں نے یہ ثابت کر دیا کہ برطانوی حکومت کی طاقت کو للکارنے کے لیے اب ہندوستانیوں میں ہمت اور طاقت آچکی ہے۔ وہاں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ مولانا آزاد کو بھی گرفتار کیا گیا۔ مولانا نے ستیہ گرہ میں پورا حصہ لیا اور مسلمانوں کو اس میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ ان کے کہنے پر ہندوستان کے مسلمان دل و جان سے ستیہ گرہ کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی چاہتے تھے کہ مسلمان ستیہ گرہ میں حصہ نہ لیں لیکن مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی اور خان عبدالغفار خان اور دوسرے رہنماؤں کی کوششوں سے مسلمان اس تحریک میں حصہ لیتے رہے۔ ہزاروں لوگ جیلوں میں بند کر دیے گئے۔ مولانا آزاد بھی دہلی کی جیل میں قید رہے۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۵ء کا عرصہ تحریک آزادی کے لیے بہت آزمائش کا دور تھا۔ گاندھی جی نے نمک کے قانون کو توڑ کر جس تحریک کا آغاز کیا تھا وہ سارے ملک میں پھیل چکی تھی اور سول نافرمانی کی تحریک نے شدت اختیار کر لی تھی۔ لوگوں نے ٹیکس ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس تحریک نے حکومت کو پریشان کر دیا تھا۔ اسی زمانے میں دہشت پسندی کی تحریک بڑھنے لگی اور ملک میں کمیونزم پھیلنے لگا جس کی بنا پر مزدور اپنی مانگیں پوری کرانے کے لیے ہڑتال کرنے لگے۔ نوجوانوں اور پڑھے لکھے لوگوں میں بھی مایوسی اور بے چینی پائی جانے لگی۔

۱۹۳۵ء میں انگلستان کی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ بنایا۔ انگلینڈ میں لیبر پارٹی کی حکومت بن جانے کے بعد کچھ پیش رفت ہوئی۔ ہندوستان میں ایکٹ کو پسند نہیں کیا گیا۔ کانگریس، مسلم لیگ اور ہندوستانی ریاستیں اس کے خلاف تھیں لیکن حکومت برطانیہ نے اس کا نفاذ کر دیا۔ اس کے بعد صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے جن میں کانگریس نے پانچ صوبوں میں اکثریت حاصل کر لی اور چار صوبوں میں وہ سب سے بڑی پارٹی کی شکل میں ابھری۔ کانگریس کی حکومتیں بننے کے بعد کانگریس کا ایک پارلیمنٹری بورڈ بنایا گیا۔ مولانا آزاد کو اس کا ممبر بنایا گیا۔ ان کے علاوہ سردار پٹیل اور ڈاکٹر راجیندر پرشاد بھی اس کے ممبر تھے۔ کانگریسی حکومتیں بنیں تو فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر پریشان ہو گئے لیکن عام لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ حکومتیں دو سال بھی کام نہ کر سکیں۔

۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے یہاں کے عوام کی مرضی کے بغیر ہندوستان کی طرف سے جنگ کا اعلان کر دیا اور ہندوستانی افواج میدانِ جنگ کی طرف بھیج دی گئیں۔ عوام اس بات سے بھڑک اٹھے کہ انگریز ہندوستان کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں اور یہاں کے لوگوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے وائسرائے سے اس سلسلہ میں لکھا مگر انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس بات پر کانگریس وزارتوں نے آٹھ صوبوں سے استعفےٰ دے دیا۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے مطابق جو انتخابات ہوئے تھے اس میں مسلم لیگ کو زیادہ کامیابی نہ ملی۔ محمد علی جناح بڑی مشکل میں پڑ گئے۔ وہ کانگریس سے تعاون کرنا چاہتے تھے تاکہ وزارتوں میں کچھ مسلم لیگی بھی شامل ہو جائیں لیکن مسلم لیگ کے شدت پسند عناصر اس کے خلاف تھے۔ چناں چہ مسلم لیگ اور کانگریس میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ جناح نے اعلان کیا کہ "یوم نجات" منایا جائے۔ اس کی وجہ سے ملک میں فسادات برپا ہو گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات بڑھ گئے اور مسلم لیگ کو اپنے نظریات کا پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل گیا۔

ہندوستان ان حالات سے گزر رہا تھا جب مولانا آزاد دوسری مرتبہ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور کانگریس کے ۵۳ ویں جلسے کی صدارت رام گڑھ میں کیا۔ اس جلسہ میں کانگریس نے ایک طویل قرار داد جنگ اور اس میں ہندوستانیوں کی مرضی کے خلاف ہندوستان کی شرکت کے بارے میں پاس کی۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو ایک تجویز مسلم لیگ کے لاہور کے اجلاس میں منظور ہوئی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کو فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کیا جائے اور مسلمانوں کی ایک آزاد ریاست قائم کی جائے۔ یہ تجویز قرار داد پاکستان کے نام سے مشہور ہے۔ جناح کے دو قوموں کے نظریے کے خلاف سب سے زیادہ جد و جہد مولانا آزاد نے کی۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ۷ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں منعقد ہوا جس میں "ہندوستان چھوڑو" تحریک منظور کی گئی۔ انگریزوں نے بہت سے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا اور لوگوں پر بہت ظلم و ستم کیے۔ گاندھی جی نے ۱۰ فروری ۱۹۴۲ء سے ۳ مارچ تک برت رکھا تاکہ انگریز حکومت پر دباؤ پڑ سکے۔ دنیا کی دوسری حکومتوں نے اور خاص طور سے امریکہ نے انگریز حکومت پر دباؤ ڈالا کہ ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے۔

۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول نے انگلستان سے اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ اب پورے اختیارات ہندوستانیوں کو سونپنے کو تیار ہے۔ مسلم لیگ اور کانگریس سے کہا گیا کہ وہ حکومت بنائیں۔ شملہ کی گول میز کانفرنس ہوئی جس میں مولانا آزاد کانگریس کی طرف سے شریک ہوئے اور انھوں نے وہاں لارڈ ویول سے گفتگو کی۔

مسلم لیگ ملک کا بٹوارہ چاہتی تھی مگر مولانا آزاد اس تقسیم کے خلاف تھے۔ انھوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے اسکیم پیش کی۔ ورکنگ کمیٹی کو وہ اسکیم منظور تھی لیکن مسلم لیگ نے اس اسکیم کو منظور نہیں کیا اور راست اقدام کی دھمکی دی۔ بنگال میں بڑے پیمانہ پر فساد ہوا لیکن وائسرائے نے عارضی حکومت بنانے کا فیصلہ لیا۔ پہلے تو مسلم لیگ اس میں شامل نہیں ہوئی مگر کچھ روز بعد وہ بھی اس میں شامل ہو گئی جس کے سربراہ پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ مولانا آزاد کیبنٹ پلان کے حق میں تھے۔ اس سے ہندوستان کی سالمیت باقی رہ سکتی تھی۔ انھوں نے پنڈت نہرو کو بھی اس پر آمادہ کرنے کی

کوشش کی مسلم لیگ کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے آخر ملک کے بٹوارے پر انھیں آمادہ ہونا پڑا اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان اور پاکستان دنیا کے نقشے پر دو نئے ملک کی شکل میں ابھرے۔ اس تقسیم سے مولانا آزاد کو بہت تکلیف ہوئی مگر وہ تاریخ اور سیاست کے اس دھارے کو موڑنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ مولانا آزاد نے اپنی پوری سیاسی زندگی میں یہی کوشش کی کہ یہ ملک تقسیم نہ ہونے پائے اور سارا ملک پیار اور محبت کی لڑیوں میں گندھا رہے۔

مولانا آزاد بحیثیت وزیرِ تعلیم

آزادی کے بعد جو پہلی حکومت بنی اس میں مولانا بحیثیت وزیرِ تعلیم شامل ہوئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو وزیرِ اعظم بنے۔ مولانا آزاد کو تعلیم سے بہت دلچسپی تھی لہٰذا ان کے سپرد وزارتِ تعلیم کی گئی۔ انھوں نے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے بہت بڑے کام کیے۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن، سکنڈری ایجوکیشن کمیشن، آل انڈیا کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن، انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹکنالوجی اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن جیسے ادارے مولانا آزاد کے زمانے میں ہی قائم ہوئے۔

مولانا آزاد نے تعلیم پر اور خاص طور سے ٹیکنیکل تعلیم پر بہت زور دیا۔ تعلیم کی توسیع کے لیے بھی انھوں نے بہت کام کیے۔ انھوں نے فنونِ لطیفہ کی طرف بھی توجہ دیا تھا۔ ان کی کوششوں سے ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی اور للت کلا اکادمی وجود میں آئیں۔ ان کے ہی زمانے میں انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز بھی قائم کی گئی جس کا مقصد تھا باہر کے ممالک سے کلچرل روابط بڑھانا۔

باوجود سیاسی و دیگر مصروفیات کے مولانا آزاد نے ایک بہت معرکتہ الآرا کتاب "انڈیا ونس فریڈم" لکھی۔ یہ کتاب بہت عمدہ ہے اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کی عمدہ داستان ہے۔ وہ بحیثیت ماہرِ تعلیم ایک بہت ہی کامیاب وزیرِ تعلیم رہے۔ ان کی انتھک کوشش یہی ہوتی تھی کہ تعلیم کے میدان میں زیادہ سے زیادہ توسیع کی جائے اور تعلیم کی روشنی عوام تک پہنچے۔

۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا آزاد کا انتقال ہوگیا اور ان کی جامع مسجد دہلی کے پاس تجہیز و تکفین ہوئی۔ ان کے انتقال سے تاریخ کا ایک اہم باب ختم ہوا۔ مولانا آزاد کو ہم جتنا بھی خراجِ عقیدت دیں وہ کم ہوگا کیوں کہ مولانا آزاد کی شخصیت کے بہت سے پہلو تھے۔ وہ مذہبی رہنما تھے، مقرر تھے، عالم تھے، صاحبِ طرز ادیب تھے اور سیاست داں تھے۔ ان کے علاوہ وہ ایک شریف اور ہمدرد انسان تھے، رنگ و نسل و مذہب کے تعصبوں سے پاک تھے۔ وہ ہمیشہ قومی اتحاد اور قومی یک جہتی کے لیے کوشش کرتے رہے۔ وہ جدید ہندوستان کے ایک نمایاں دانشور تھے۔ ان کا علم بہت وسیع تھا۔ وہ نہ صرف موجودہ دور کے ایک جینیس تھے بلکہ ان کے خیالات اور تصورات میں مشرق اور مغرب کا ایک عجیب و غریب امتزاج تھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا آزاد کے لیے کہا تھا "انھوں نے قومی تحریک کی جو رہنمائی کی اس کی وجہ سے انھیں ہماری تاریخ میں ایک بلند اور پائندہ مقام حاصل رہے گا"۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے مولانا آزاد کو علم و عمل کے سنگم سے تعبیر کیا تھا۔ مسلمانوں کی سیاست کی باگ ڈور علی گڑھ تحریک کے ہاتھوں میں تھی جو کانگریس کی مخالف تھی اور حکومتِ وقت سے تعاون کرنا چاہتی تھی۔ مولانا آزاد نے اس کے خلاف بغاوت کی اور اپنے خیالات کو عام مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے تحریر اور تقریر سے کام لیا۔

مولانا آزاد کا عقیدہ تھا کہ اعلیٰ تہذیبی اور اخلاقی قدریں کسی قوم کی ملکیت نہیں ہیں۔ وہ سب کی ہیں اور ان کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ اس تاریخی نظریہ نے مولانا کے اندر انسان دوستی کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔

مولانا آزاد ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کی زندگی سے ہمیں روشنی ملتی ہے۔ ان کے ادبی کارنامے ادب کی دنیا میں شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی صحافت، خطابت اور سیاسی بصیرت آنے والی نسلوں کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر وہ بھی ان سے مستفید ہوسکتی ہیں۔

●

لوجنسا، نئی دہلی

بقیہ: سردار بھگت سنگھ کی شہادت

میں بجلی کے مانند کچھ ہی وقتوں میں پھیل گئیں عوام نے اس کے خلاف بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہرے کیے اور اپنے غم و غصّے کا اظہار کیا۔ ان کے احباب و اعزار اس مقام پر آئے جہاں انھیں سپردِ آتش کیا گیا تھا۔ ان کی باقیات کو جمع کر کے لاہور لائے اور انھوں نے ایسے وطن پرست نوجوان کو گل ہائے عقیدت پیش کر کے اپنے طور سے ان کی آخری رسوم ادا کی۔

یہ تھی سردار بھگت سنگھ اور ان کے دوستوں کی مختصر کہانی۔ جسے پڑھ کر ان کی وطن پرستی، بے لوث قربانیوں اور ملک و قوم سے سچی محبت کی قسمیں کھائی جاسکتی ہیں۔

ان کی شہادت کے تین دن بعد کراچی کے کانگریس اجلاس میں انھیں خراج عقیدت پیش کی گئی۔ ڈاکٹر پی۔ سیتارمیا کے الفاظ میں "یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت سردار بھگت سنگھ کا نام گاندھی جی کے نام کے مانند مشہور تھا" صفحہ ۴۵۶

(سیتارمیا۔ دی ہسٹری آف دی نیشنل کانگریس۔ جلد۔ ۱)

آخر کار ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ان کی قربانیوں نے رنگ لایا اور ان کی زندگی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ لیکن ملک کی آزادی کے ساتھ تحت الشعور میں کچھ ایسے کاری زخم بھی لگے ہیں کہ ان کی کسک بیتے دنوں کی یاد دلاتی ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں اس جائے مقام کو جہاں انھیں سپردِ آتش کیا گیا تھا حکومت ہند نے پاکستان سے حاصل کی اور ۱۹۶۱ء میں وہاں پر شہیدی میلا منایا گیا۔ ان کا وہاں مجسمہ نصب کیا گیا۔ ان کی سیرت پر دو فلمیں بھی بنائی گئیں۔ ایک کا نام شہید اور دوسرے کا شہید بھگت سنگھ ہے۔

کتابیات

۱۔ بھگت سنگھ اور دت کی امر جوڑی۔ چمن لال آزاد نئی دہلی ۱۹۴۱ء

۲۔ بھگت سنگھ اینڈ ہز کامریڈس۔ اجے گھوش بمبئی ۱۹۴۵ء

۳۔ این آٹو بایوگرافی۔ جواہر لال نہرو۔ نئی دہلی ۱۹۶۲ء

۴۔ شہید اعظم بھگت سنگھ۔ دی مین اینڈ ہز آئیڈیولوجی گردیو سنگھ دیول پٹیالہ ۱۹۷۸ء

۵۔ انڈیاز اسٹرگل فار انڈیپنڈنس۔ ۱۸۵۷ء ۱۹۴۷ء بپن چندر اینڈ ادرس نئی دہلی ۱۹۸۹ء

●

کلیم اللہ

نئی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ:

سردار بھگت سنگھ کی شہادت

پانچ دریاؤں سے سیراب پنجاب کی سرزمین پر ایسے سپوتوں کا جنم ہوا جن کے قول و فعل اور حرکات و سکنات نے اس زمین کی اس قدیم میراث کو تقویت بخشی جس پر آج بھی صرف پنجاب کے عوام ہی نہیں بلکہ عالمی برادری کے لوگ بھی رشک کرتے ہیں۔ تہذیب و تمدن، بہادری و شجاعت، دریا دلی و سخاوت، بھائی چارگی و پدرانہ شفقت کے علاوہ اور بھی دوسرے عناصر ہیں جس کی آمیزش سے اس قدیم میراث کی تشکیل ہوئی ہے۔

بیسویں صدی میں پنجاب کے ان سپوتوں میں سردار بھگت سنگھ کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی مادر وطن کی چیخ و پکار، آہ و بکا کو سن کر عین عنفوان شباب میں اسے آزاد کرانے کی خاطر اپنی جان عزیز کو دیدہ و دانستہ طور سے اس کی نذر کر دی تھی۔ ایسے محب وطن، جدوجہد کے پجاری، انسانیت کے پاسبان اور آزاد ہندوستان کی تاسیس رکھنے والے سردار بھگت سنگھ کا جنم ضلع لائل پور کے گاؤں بانگا میں ۲۷ ستمبر ۱۹۰۷ء بروز سنیچر کو ہوا تھا۔ ان کے خاندان کے افراد قومی جذبے و وطن کی محبت میں سرشار تھے اور انگریزوں کے پٹھو ہندوستانی زمین داروں اور امرا کے ذریعہ کاشت کاروں و سادہ لوح عوام پر کیے جا رہے جبر و تشدد اور استحصال کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے۔ ان کے دادا ارجن سنگھ سادھو جاٹ تھے جنھوں نے سکھ رہنماؤں کی تبلیغ کے زیر اثر سکھ مذہب قبول کر لیا تھا۔ وہ قوت لایموت کی خاطر کاشت کاری کے علاوہ طب کے پیشے سے بھی وابستہ تھے۔ غریبوں و مفلوک الحال کا مفت علاج کرتے تھے۔ علاوہ ازیں سماجی، تعلیمی اور رفاہی سرگرمیوں میں مشغول تھے۔ سماجی و مذہبی توہمات اور ضرر رساں رسومات کو دور کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ اسی لیے جب ۱۸۷۷ء میں لاہور میں آریہ سماج نے اصلاحی سرگرمیاں شروع کی تو وہ اس میں پیش پیش رہے۔ بھگت سنگھ کے والد کشن سنگھ اور چچا اجیت سنگھ اور سورن سنگھ اپنے والد کے نقش قدم پر ہی چل رہے تھے۔ کشن سنگھ اصلاحی اور رفاہی کاموں میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور حتی الامکان اپنی خدمت بھی پیش کرتے تھے جب کہ ان کے چھوٹے بھائی اجیت سنگھ اشتراکی و مارکسی خیالات کے حامی تھے۔ وہ سیف و قلم کے ذریعہ انگریزی حکومت کا کالعدم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن باغیانہ ذہنیت کے باعث سیف کی طرف ان کا رجحان کچھ زیادہ ہی تھا اسی لیے انھوں نے دہشت گردی کا سہارا لیا اور اپنے جنگجو ساتھیوں کی مدد سے بھارت ماتا سوسائٹی قائم کی اور اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے اخبار "پیشوا" کا بھی اجرا کیا جس کے مدیر صوفی امبا پرشاد تھے۔

ایسے ماحول میں سردار بھگت سنگھ کی پرورش و پرداخت ہوئی تھی جو انقلابی سرگرمیوں کا پیش خیمہ تھا۔ وہ زمانہ انقلاب آور، عہد آفریں اور تاریخ ساز تھا۔ گھر کے ماحول کے ساتھ ساتھ ملک کے حالات نے بھی ان کے فطری جذبے کو اجاگر کرنے میں ایک تاریخی رول ادا کیا۔ ان کے تولد کے وقت والد محترم کشن سنگھ لاہور سینٹرل جیل میں قید تھے اور چچا اجیت سنگھ منڈلے جیل میں نظر بند۔ ایک یا دو روز کے بعد والد و چچا گھر آئے۔ لڑکے کے جنم کی وجہ سے ان کے خوشیوں کی انتہا نہ تھی کیوں کہ لڑکوں کا جنم نیک شگن مانا جاتا تھا۔ دادی ماں کے نام پر ان کا عرف نام بھگوان والا[1] رکھا گیا لیکن بعد میں وہ سردار بھگت سنگھ کے نام سے ہی مشہور ہوئے۔

کمسنی سے ہی سردار بھگت سنگھ کے دل و دماغ میں مادر وطن کی الفت و قومی جذبے نے گھر کر لیا تھا۔ اس کا اندازہ مہتا آنند کشور اور بھگت سنگھ کی گفتگو سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس گفتگو کے زیر اثر کشور نے ان کے والد سے اس کی بشارت کی تھی کہ یہ لڑکا ایک دن دنیا میں نام و شہرت کا حامل ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں ان کا نام امر و اجر ہو جائے، جس کی تعبیر بھگت سنگھ نے اپنے قول و فعل سے کی۔

بھگت سنگھ نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں حاصل کی جہاں وہ اپنی ذہانت و جسارت کے باعث طلبا کے درمیان ہر دلعزیز تھے۔ مادر وطن کی خدمت اور یہاں کے عوام کی فلاح و بہبود ان کا دھرم و ایمان تھا۔ مہتا آنند کشور، لالہ پنڈی داس، صوفی امبا پرشاد اور

---

[1] بھگوان والا ایک پنجابی لفظ ہے جس کے معنی اقبال مند ہوتا ہے [illegible]

۳۴۶ ستلج ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

اور لالہ لاجپت رائے جیسے قومی رہنماؤں کی صحبت نے ان کے اس خیالات کو تقویت بخشی۔

سردار بھگت سنگھ ان رہنماؤں کے بھی قریب آئے جنھوں نے ۱۵-۱۹۱۴ء میں یو۔ ایس۔ اے اور کناڈا میں غدر تحریک چھیڑی تھی۔ غدر تحریک کے ہیرو کرتار سنگھ سرابھا کے افکار کا ان پر گہرا اثر تھا۔ وہ ان کے مداح اور رفدوی تھے۔ لاہور سازش کے معاملے میں جب ۱۹۱۹ء میں کرتار سنگھ کو پھانسی دی گئی تو ۹ برس کے سردار بھگت سنگھ کے دماغ پر اتنا اثر ہوا کہ کرتار سنگھ سرابھا کے افکار و خیالات، عادات و افعال ان کے زندگی کا جزو لاینفک بن گئے اور حب الوطنی کی اولوالعزمی میں اور اضافہ ہوا، جس سے ان کی معمول زندگی میں ایک انقلاب آفریں بدلاؤ آیا اور مستقبل میں ان خیالات کو عملی جامہ پہنا کر وہ ایک تاریخ ساز شخصیت بن گئے۔

۱۷-۱۹۱۶ء میں گاؤں کے اسکول سے فارغ ہوکر لاہور کے ڈی۔ اے۔ وی اسکول میں انھوں نے داخلہ لیا جہاں وہ اپنی تعلیم کے لیے کمیٹیڈ تھے۔ انھوں نے اپنے درسی علوم کے علاوہ اپنی محنت ولگن سے دوسرے علوم میں بھی اچھی خاصی استعداد پیدا کرلی تھی۔ زبان وادب کے ساتھ ساتھ تاریخ وسیاست ان کے دلچسپ موضوع تھے۔

اسی عرصے میں انسانیت سوز جلیان والہ سانحہ پیش آیا۔ رولٹ ایکٹ، جس کے تحت کسی بھی فرد کو شبہ یا دوسری وجوہات کی بنا پر بغیر وارنٹ کے حراست میں لیا جاسکتا تھا، کے خلاف ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء میں یوم بیساکھی پر جلیانوالہ باغ میں ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں ہزاروں کی تعداد میں محبان وطن نے شرکت کی۔ کانگریس عمائدین سیف الدین کچلو اور ست پال ملک نے اجتماع سے خطاب کیا۔ شقی القلب جنرل ڈائر نے بغیر کسی وارننگ کے جلسے پر گولی چلانے کا حکم دیا، جس سے ۳۷۹ افراد گولیوں کے زخموں کی تاب نہ لاکر اجل کو لبیک کہا۔ جس میں مرد، عورت اور بچے بھی تھے۔ ایک ہزار افراد زخمی ہوئے۔ اس قتل عام اور اہانت ملک و قوم سے بھگت سنگھ کے دل میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے مگر صبر وضبط سے کام لیا۔ ان کے اس نیک فعل کو اودھم سنگھ نے ۱۳ اپریل ۱۹۴۰ء کو انجام پہنچایا۔

یوجنا، نئی دہلی

رولٹ ایکٹ مخالف تحریک کے بعد خلافت تحریک وجود میں آئی جس کی قیادت مہاتما گاندھی جی نے کی تھی۔ تحریکوں کی اس کڑی میں ۲۲-۱۹۲۱ء میں عدم تعاون کی تحریک شروع کی گئی۔ جس میں عوام سے اسکول وکالج، کورٹ، خطابات، سرکاری نوکریوں، کونسل کی ممبر شپ وغیرہ سے کنارہ کش ہونے کی اپیل کی گئی تھی۔ سردار بھگت سنگھ اسی تحریک کے زیر اثر ڈی۔ اے۔ وی کالج کو چھوڑ کر نیشنل کالج لاہور میں داخلہ لیا، جو بھائی پرمانند اور لالہ لاجپت رائے کے ذریعہ شروع کیا گیا تھا۔ نیشنل کالج میں تعلیم کے دوران بھگت سنگھ، بھگوتی چرن، سکھ دیو، یش پال، سدام کرشنا اور تیرتھ رام کی صحبت میں آئے۔ اس اسکول میں درسی علوم کے علاوہ وطن پرستی، حب الوطنی، انگریزوں کے جبر واستبداد وغیرہ پر تقاریر بھی کی جاتی تھیں۔ جس کے ذریعہ نوجوانوں کی ایک نسل کو ملک وقوم کی بے غرض و بے لوث خدمت کے لیے تیار کیا جاتا تھا۔ تاریخ کے استاد پروفیسر جے چندر ودیالنکر وقتاً فوقتاً انقلابات کی تواریخ اشتراکیت اور دوسرے موضوعات پر عالمانہ و مدللانہ خیالات کا اظہار کرتے تھے جو نوجوانوں کی ذہنی نشوونما میں بہت کارآمد ثابت ہوئے۔ پروفیسر ودیالنکر کا تعلق اتر پردیش کے ان انقلابی گروپوں سے تھا جو ملک کی جنگ آزادی میں مشغول تھے۔ انھیں کے توسط سے بھگت سنگھ کا تعلق کانپور کے گنیش شنکر ودیارتھی سے ہوتا ہے۔ جب وہ عائلی مسائل سے بچنے کے خاطر کالج چھوڑ کر کانپور تشریف لے جاتے ہیں۔

کانپور میں قیام کے دوران وہ بٹوکیشور دت، چندر شیکھر آزاد، جوگیش چندر چٹرجی اور وجے کمار سنہا جیسے انقلابیوں کے قریب آتے ہیں اور انھیں کے زیر اثر وہ ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن میں شریک ہوتے ہیں، جس کا مقصد متحد ہندوستان میں مسلح انقلاب کے ذریعہ وفاقی جمہوری نظام قائم کرنا تھا۔

مگر وہ بادل نخواستہ دادی ماں کے بیمار ہونے کی خبر سن کر لاہور آئے اور ان کی تیمارداری میں جی جان سے جٹ گئے۔ دادی ماں کو مخلصانہ عیادت کی وجہ سے شفا نصیب ہوتی ہے مگر ان کے حب الوطنی کے جذبے میں شدت آتی ہے۔ ایسے نازک حالات میں انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر مارچ ۱۹۲۶ء میں نوجوان بھارت سبھا قائم کرتے ہیں۔ رام کرشنا اس کے صدر اور خود سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔ اس تنظیم کی تشکیل سے آٹھ ماہ قبل ۸ اگست ۱۹۲۵ء میں کاکوری کا معاملہ پیش آیا جس میں ایچ۔ آر۔ اے۔ کے کارکنوں نے ہردوئی سے لکھنؤ جانے والی آٹھ ڈاؤن ٹرین کو کاکوری سے ایک میل کے فاصلے پر روک کر ۴۶۷۹ روپیہ ۱، آنا اور ۶ پیسے لوٹ لیا جس سے سرکاری حلقہ میں ہنگامہ برپا گیا۔ سرکاری عملے نے اس معاملے میں ملوث افراد کی دھڑ پکڑ کے لیے تادیبی کارروائیاں تیز کردیں اور بالآخر چار ملزموں کو دار پر چڑھنا پڑا جن میں رام پرشاد بسمل اور اشفاق اللہ بھی شامل تھے۔ رام پرشاد کا تحریر کیا ہوا یہ انقلابی نغمہ آج بھی زبان زد ہے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن کا نام ۱۹۲۸ء میں بدل کر ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن رکھ دیا گیا تھا اس سے واضح ہے کہ اس وقت کے زیادہ تر انقلابی اشتراکی فلسفے کے قائل بھی تھے اور تابع بھی۔ وہ اپنی مسلح سرگرمیوں کے ذریعہ ہندوستان میں ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتے تھے جہاں ذات وپات، نسل وگروہ، مذہب اور جنس کی تمیز نہ ہو۔ بلکہ سبھی کو یکساں فطری حقوق حاصل ہوں جس کو بروئے کار لاکر انسانیت کے دامن کو اور وسیع کیا جاسکے۔

سردار بھگت سنگھ کی انقلابی سرگرمیوں میں شدت لانے میں سائمن کمیشن جیسے بدنام زمانہ قوانین کا بہت بڑا رول ہے۔ ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمس فورڈ ایکٹ کے تحت یہ بات کہی گئی تھی کہ اس ایکٹ کے ذریعہ وضع کردہ قانونی اصلاحات پر نظر ثانی کے لیے دس برس کے اندر ایک کمیشن کی تشکیل کی جائے گی جو اس کا کما حقہ طور سے جائزہ لے گا۔ لیکن باد مخالف کے باعث ۱۹۲۷ء میں ایک نفری کمیشن کی تشکیل کی گئی۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والے اس کمیشن میں ہندوستان کا ایک بھی ممبر شامل نہیں تھا۔ اس سے ہندوستان کے عوام کی انا کو مجروح

کیا گیا۔ عوام نے اس کی مخالفت کے لیے ملک گیر پیمانے پر جلسے جلوس کا انعقاد کیا۔ کوچوں اور گلیوں سے احتجاجی مظاہرے نکالے گئے۔ ہڑتال اور سیاہ علم کے ذریعہ اس کمیشن کے ممبران کا استقبال کیا گیا۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جب اس کمیشن کے ممبران نے لاہور کی سرزمین پر قدم رکھا تو سونی گلیوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس کے خلاف احتجاجی مظاہرے کیے گئے اور یہ فلک شگاف یہ نعرہ بلند کیا جا رہا تھا کہ

ہندوستانی ہیں ہم ہندوستان ہمارا
مڑ جاؤ سائمن جہاں کہ ہے تمہارا

لیکن ان مظاہروں اور نعروں سے سفید فام انگریزوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ بلکہ اس کے برعکس انھوں نے اس جائز مظاہرے و منصفانہ آواز کا جواب گولیوں کی بوچھار سے دیا جس کے نتیجے میں کئی افراد جاں بحق ہو گئے۔ ہر دلعزیز قائد و شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے کو بھی پولیس سپرنٹنڈنٹ مسٹر اسکاٹ نے لاٹھیوں سے لہولہان کر دیا۔ ان کے شیر ببر کے جیسے سینے کو رائفل کی بٹ سے کوٹا گیا جس کے زخموں کی تاب نہ لا کر ۱۸ نومبر ۱۹۲۹ء کو اس مرد مجاہد نے دم توڑ دیا۔ ہمت جواں مردی تو یہ تھی کہ وہ مرتے دم تک عزم بالجزم سے اپنے نیک ارادوں پر قائم رہے اور اپنے ساتھیوں کو اس پر ثابت قدم رہنے کی تنبیہہ کی۔

اس مظاہرے میں شریک تمام ہندوستانیوں نے اس شقی القلبی پر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ لیکن وہ لوگ اہنسا کے پجاری کے طور پر اپنے فرائض کو بخوبی انجام دیتے رہے۔ اس کے برعکس نوجوانوں کی ایک ٹولی نے اس اہانت آمیز عمل کے تدارک کرنے کی ٹھان لی اور ۱۷ دسمبر ۱۹۲۸ء کو اسکاٹ کو گولی کا نشانہ بنایا مگر کچھ غلط فہمیوں کے باعث اسکاٹ بال بال بچ گیا اور اس تنے میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس سونڈرس ہلاک ہوا۔ اس مہم کو انجام دینے والوں میں بھگت سنگھ، راج گرو، سکھ دیو اور اجے گوپال شامل تھے۔ انھوں نے اپنے اس عمل کا جواز ان الفاظ میں پیش کیا۔

"ایک معمولی پولیس آفیسر کے ناپاک ہاتھوں سے ایسے قائد کا قتل جو لاکھوں ہندوستانیوں کا ہر دلعزیز ہو، ملک کی عوام کے لیے شرم کی بات تھی۔ اس لیے یہ ہندوستانیوں کا عین فرض تھا کہ وہ اس کا ازالہ کریں۔" صفحہ ۲۴*

بھگت سنگھ سونڈرس کا قتل کر کے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ اس قتل کے پس پردہ ان کی نیک نیتی شامل تھی کوئی شہرت کا خواب نہیں۔ ان کا یہ قدم انتہا پسندانہ نہ تھا بلکہ اس عمل کے ذریعہ انھوں نے لالہ لاجپت رائے کی عزت کی لاج رکھی اور ملک کو وقار بخشا۔ جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں اس بابت لکھا ہے کہ

"سردار بھگت سنگھ ایک علامت بن گئے۔ سونڈرس کے قتل کے عمل کو فراموش کر دیا گیا۔ علامت زندہ رہی۔ کچھ ہی ماہ کے اندر ان کا نام پنجاب کے ہر گاؤں، قصبے اور کچھ حد تک شمالی ہند کے شہرت کے حامل ہوئے جو تعجب خیز تھی۔" صفحہ ۱۷۵، ۱۷۶

(THE AUTORIOGRAPHY 1992 NEW DELHI)

ملک کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ حکومت اپنے نوآبادیاتی نظام کے تحفظ کے لیے نت نئے قوانین وضع کر رہی تھی، جو ہندوستانیوں کے مفاد کے برعکس ہوتا تھا۔ اسی قسم کے دو قوانین پبلک سیفٹی بل اور ٹریڈ ڈسپیوٹ بل قانون ساز ایوان میں پیش ہونے والا تھا۔ اس مضر قوانین کی مخالفت کے لیے انقلابی نوجوانوں نے اسمبلی میں بم پھینکنے کا منصوبہ تیار کیا۔ ۸ اپریل ۱۹۲۹ء میں ایوان کے اندر بھگت سنگھ اور بی۔ کے۔ دت نے اس وقت بم کا دھماکہ کیا جب ان قوانین کو آخری شکل دینے کے لیے بحث و مباحثہ کیا جا رہا تھا۔ بم کے دھماکے سے کچھ ممبران ایوان کو معمولی چوٹیں آئیں۔ اس کا مقصد کسی کو قتل کرنا نہیں بلکہ بہروں کو آواز دینا تھا۔ سردار بھگت سنگھ اور دت اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ ایوان کے اندر ایک دستی اشتہار بھی گرایا گیا جس میں ان کے اس عمل اور اس کے پردہ خیالات کی وضاحت کی گئی تھی۔ انھوں نے بچ نکلنے کی بالکل سعی نہیں کی کیوں کہ ان کا مقصد عدالت کو اپنے خیالات کے لیے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرنا تھا، جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

پولیس نے انھیں گرفتار کر کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے قید کر دیا جہاں ان کے ساتھ عام ملزموں کی طرح سے سلوک کیا گیا۔ انھوں نے اس پر احتجاج کیا اور ایک سیاسی قیدی جیسے سلوک کا مطالبہ کیا۔ اپنے مطالبے میں شدت لانے کی غرض سے بھوک ہڑتال کا سہارا لیا لیکن وہ کارآمد ثابت نہ ہوئی۔ بی۔ کے۔ دت جیل کی ایذاؤں سے بچنے کے لیے خودکشی کرنے کا ارادہ کیا مگر دانائے راز بھگت سنگھ نے انھیں ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ ایسی موت سے بہتر وہ پھانسی کا پھندا ہے جس کا ہم سب بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف ذاتی پریشانیوں کو ختم کرنا نہیں بلکہ ملک کو فرنگیوں کی حکومت سے آزاد کرانا ہے۔

ان کے والد کشن سنگھ نے پدرانہ شفقت کے زیر اثر انھیں آزاد کرانے کی خاطر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جو بے سود تھا۔ بھگت سنگھ اپنے والد کے اس عمل پر بے حد برہم ہوئے اور انھیں ایسا کرنے سے منع کیا کیوں کہ انھیں اس کا پورا یقین تھا کہ ان کا مقدر پھانسی کا پھندا ہے جس کا انھوں نے خود عنفوان شباب میں انتخاب کیا تھا۔ اس لیے اس کی دفاع کے لیے کوشش بے سود ہوگی اور کسر شان بھی۔

۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو بھگت سنگھ، راج گرو اور بی۔ کے۔ دت کے پھانسی کا دن مقرر کیا گیا تھا۔ بابا چھبار سنگھ نے جب اس کی اطلاع سردار بھگت سنگھ کو دی تو انھوں نے اس پر تاسف کے بجائے خوشی کا اظہار کیا اور کہا

"پھانسی کا پھندا ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں"۔

۲۳ مارچ کو شام ۷ بجے ان ملک کے سپوتوں کو جیل سپرنٹنڈنٹ مسٹر چوپڑا، ڈپٹی کمشنر لاہور، انسپکٹر جنرل آف پولیس اور انسپکٹر جنرل آف پریزن کی موجودگی میں پھانسی دی گئی اور متعین پروگرام کے مطابق ان کے جسد خاکی کو فیروز پور میں ستلج ندی کے کنارے لے جایا گیا جہاں ان کے مذاہب کے مطابق ان کی آخری رسوم ادا کی گئی۔

ان کی شہادت کی خبر ملک کے طول و عرض

بقیہ ص ۲۲ پر

* SHAHEED-E-AZAM SARDAR BHAGAT SINGH THE MAN AND HIS IDEOLOGY BY Z.S.DEOL 1978 PATIALA

محمد اسعد

سالم علی ۔ ماہر طیور

دنیا کے ہر شعبے میں کوئی نہ کوئی ماہر ہوتا ہے۔ کوئی علم کا ماہر ہوتا ہے، کوئی ادب کا، کوئی ادویہ کا، کوئی نباتات کا، کوئی فوجی امور کا، کوئی معاشیات کا ماہر ہوتا ہے تو کوئی علم حیات کا لیکن میں جس ماہر کی بات کر رہا ہوں وہ ماہر پرند تھے، جن کی مہارت کا شہرہ صرف بھارت ہی نہیں بلکہ عالمی پیمانہ پر تھا۔ ان کی یہ مہارت یوں ہی نہیں تھی بلکہ اپنی زندگی کا ایک حسین زمانہ کسی دیوانے کی طرح پرندوں کے ساتھ گزار دیا۔ دنیا ایسے ماہر پرند کو سالم علی کے نام سے جانتی ہے۔

سالم علی جب ۹ سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی پرورش ان کے ماموں نے کی۔ انھیں بچپن ہی سے چڑیوں سے فطری لگاؤ تھا۔ وہ حیوانیات کے مشہور ماہر "ڈاروِن" کی طرح اپنے آس پاس مرغی، بطخ، تیتر، بٹیر، کوّا، گوریا جیسے چرند پرند کو بڑے غور سے دیکھا کرتے تھے اور ان پر غور و فکر کرتے تھے۔ ایک چھوٹی چڑیا گوریا کی موت نے گیارہ سال کے سالم علی کو بمبئی کے نیچرل ہسٹری سوسائٹی سے متعارف ہونے میں معاونت کی پھر سالم علی کا تعلق اس ادارے سے مختلف طور پر رہا۔ جن میں چھوٹے عہدے سے لے کر نگراں تک کے منصب شامل ہیں۔

درسی تعلیم میں سالم علی کا دل کبھی نہ لگا۔ جب ان کے دوسرے ساتھی اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کی لیباریٹریوں میں کھوج کر رہے تھے۔ تب سالم علی جنگلوں، باغوں، چڑیا خانوں، چڑیا کی پناہ گاہوں میں چڑیوں کے قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کے لیے مارے مارے پھر رہے تھے۔ اس کے باوجود بھی سالم علی نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور بڑے بھائی کے پاس برما چلے گئے۔ جہاں انھوں نے علم تجارت میں داخلہ لیا اور آنرز تک پڑھائی کی۔ اس مدت میں انھوں نے کالج کے مضمون کے علاوہ پرندوں سے متعلق بہت سی معلومات حاصل کرلیں۔ اپنی تعلیم کے دوران وہ پرندوں سے متعلق اداروں سے بھی واقفیت حاصل کی۔ پرندوں کے علوم سے ان کے دلچسپی کو دیوانگی کہا گیا۔ وہ اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے جرمنی گئے۔

وہ ۱۹۳۵ء میں بھارت واپس آئے اس وقت تک ان کی علمیت کا اعتراف نہ صرف بھارت کو ہوا بلکہ ساری دنیا انھیں ایک ماہر پرند کے نام سے جاننے لگی تھی۔

سالم علی کو اپنے ملک بھارت سے بے حد پیار تھا۔ چناں چہ انھوں نے بھارت میں قیام کرتے ہوئے متعدد سرکاری اور غیر سرکاری قومی اور بین اقوامی اداروں کے لیے چڑیوں، پرندوں، طائروں وغیرہ کے مطالعے کے لیے جنگلوں، پہاڑوں، ندیوں، پارکوں، چڑیا خانوں، چڑیا کی پناہ گاہوں کے دورے کیے اور قریب سے ان کا جائزہ لیا۔ اس جائزے میں پرندوں کے رہن سہن، کھان پان، رنگ و نسل، نقل و حرکت وغیرہ جیسی فطری باتوں کی تفصیلات شامل تھیں۔ رنگ برنگ کے کمیاب اور نایاب پرندوں کی تفصیلات کے اس جائزے سے سالم علی کی شہرت نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک میں کافی بڑھ گئی تھی۔ پرندوں، طائروں اور چڑیوں سے متعلق دلچسپی رکھنے والے ماہرین نے سالم علی کو ایک مشہور ماہر طائران کی حیثیت سے تسلیم کرلیا۔

انھیں بیرونی ملکوں میں مدعو کیا جانے لگا اور ان سے چڑیوں کے موضوع پر تبادلہ خیال کیا جانے لگا۔ انھوں نے بھارت اور برصغیر کی چڑیوں سے متعلق متعدد اقسام کے موضوعات پر سات کتابیں تصنیف کیں۔ ان کتابوں میں بھارت میں رہنے والی چڑیوں، پرندوں، طائروں کے رہن سہن، رنگ و نسل، آمد و رفت، نقل و حرکت، پیدائش اور موت، کمی و بیشی وغیرہ جیسے موضوعات کو تصویروں کی مدد سے بہت حسین طور پر پیش کیا۔ جن سے ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

سالم علی کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بھارت کے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے جب سالم علی کی تصنیف "دی بک آف انڈین برڈس" کا نام سنا تو اسے نینی جیل میں منگوا کر پڑھی۔ اس میں بڑی بات یہ تھی کہ لاکھوں لوگوں کو آٹوگراف کی خواہش کی اور پھر اس کتاب کو "دی بک آف انڈین برڈس" کو اپنی بیٹی شریمتی اندرا گاندھی کو سال گرہ کے تحفے میں پیش کیا۔ جرمنی کے ایک ماہر پرند نے سالم علی کی ذاتی زندگی سے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک شریف انسان تھے۔ ان کی فطرت میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔ ان کی سادگی اور نرمی نے انھیں بے مثال شخصیت کا مالک بنا دیا تھا۔

امریکہ کے ایک "سینیٹر چارلس میک ماریتھ آس" جب ہندوستان آئے تھے تو انھوں نے قدرتی امور کے ماہر اور چڑیوں کے دوست سالم علی سے ملنے کی خواہش اندرا گاندھی سے کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ جنگلی مخلوقات سے دلچسپی پیدا کرنے میں سالم علی سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ اسی طرح برطانیہ کی ملکہ ایلزبتھ ۱۹۶۱ء میں بھارت تشریف لائیں تو انھوں نے سالم علی سے نہ صرف ملاقات کی بلکہ پرندوں سے متعلق بھی بہت سی باتوں پر تبادلہ خیال بھی کیا تھا، جن میں ماحولیات کا بچاؤ ایک بڑا موضوع تھا۔

باقی صفحہ ۴۲ پر

آئی ۔ ۳۳ ۔ مجنوں شیلہ، ارونا نگر، نئی دہلی ۔ ۵۴

ڈاکٹر عرفان علیمی

غوتر مسئلہ اور مداوا

غوتر جسے گھینگا یا گلہر کے نام سے جانا جاتا ہے، ایک ایسا مرض ہے جو ہمارے ملک کے لیے ایک اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس مرض کا سبب جسم میں آیوڈین کا فقدان ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نے تو اس مرض پر بہت حد تک قابو پالیا ہے لیکن ہمارے ملک میں آج بھی کروڑوں لوگ اس مرض کا شکار ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۴ کروڑ افراد آیوڈین کی کمی سے ہونے والے اس مرض نیز دیگر دماغی امراض میں مبتلا ہیں۔

نوعیت۔ مرض

انسان کے گلے میں ایک گلٹی پائی جاتی ہے جسے غدہ ترلیہ یا تھائرائڈ گلینڈ کہا جاتا ہے۔ یہ گلٹی گلے میں اعضا رساعت کے نیچے، آگے کی طرف پائی جاتی ہے جس کی شکل تلی سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس کے دو حصے ہوتے ہیں جو سانس نلی کے دونوں جانب واقع ہوتے ہیں۔ یہ گلٹی حجم میں چھوٹی ہونے کے باوجود انسانی جسم کے لیے بہت ہی مفید اور کارآمد ہوتی ہے کیوں کہ جسمانی نظام پر براہ راست اس کا اثر پڑتا ہے۔ جسم انسان کے مختلف افعال پر قابو رکھنے اور توازن برقرار رکھنے میں یہ اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جب آیوڈین کی مطلوبہ مقدار اس گلٹی کو نہیں مل پاتی تو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ گلٹی پھول جاتی ہے تاکہ وہ خون سے ضرورت کے مطابق آیوڈین کی مناسب مقدار حاصل کر سکے۔ اگر طویل مدت تک اس گلٹی کو آیوڈین کی مناسب مقدار دستیاب نہیں ہوتی تو گلٹی مستقل طور پر پھولی رہ جاتی ہے اور اس کا طبعی حجم بڑھ جاتا ہے۔ اس طرح گلے کے بغل میں تھیلے نما ایک بدنما ابھار نظر آنے لگتا ہے۔ اس مرض میں جہاں چہرہ بدنما لگنے لگتا ہے وہیں دماغی امراض کے لاحق ہونے کا بھی خطرہ بنا رہتا ہے۔ شروع میں اس گلٹی کا حجم اتنا کم ہوتا ہے کہ نہ تو مریض کو کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اس کی طرف کوئی توجہ دیتا ہے لیکن جب اس کا طبعی حجم بڑھ جاتا ہے تو سانس کی نلی دکھانے کی نلی پر دباؤ پڑنے کے سبب مریض کو نگلنے و سانس لینے میں دشواری ہونے لگتی ہے

متاثرہ علاقے

ہمارے ملک میں پہاڑی علاقوں کے باشندے اس مرض میں بری طرح مبتلا ہیں۔ خصوصاً جموں، کشمیر، سکم، آسام، ناگا لینڈ، اروناچل، ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش، پچھم بنگال کے علاوہ اتر پردیش کے گونڈا، دیوریا، گورکھپور، بستی، بہرائچ اور بہار کے کچھ اضلاع میں اس مرض کے مریض زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ میزورم کی تقریباً ۷۰ فی صد آبادی اس مرض کی گرفت میں ہے۔

آیوڈین کے ذرائع

انسان کے جسمانی نشو ونما اور ذہنی صلاحیت کے فروغ کے لیے آیوڈین کی قلیل مقدار ضروری ہوتی ہے جو پینے کے پانی اور پودوں سے حاصل ہو جاتی ہے اس لیے اسے علاحدہ سے لینے کے لیے ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ ہمارے ملک میں روزانہ ایک آدمی کو ۱۵۰ مائیکرو گرام آیوڈین کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہاڑی اور سیلاب زدہ علاقوں میں آیوڈین (جو مٹی میں گھلی ہوتی ہے) سیلاب کے ساتھ بہہ جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان علاقوں میں آیوڈین کی کمی ہو جاتی ہے اور وہاں کے باشندے آیوڈین کی کمی سے ہونے والے امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

آیوڈین کی اہمیت

انسان کے جسمانی و ذہنی نشو ونما کے لیے آیوڈین بہت ہی ضروری ہے۔ آیوڈین کی کمی سے جہاں ذہنی و جسمانی صلاحیت متاثر ہوتی ہے وہیں حاملہ خواتین کے پیٹ میں پل رہے بچے کی ذہنی و جسمانی نشو ونما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ بچے کمزور اور کم عقل پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں گونگے اور بہرے ہونے کا بھی خطرہ بنا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کا قد بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق حاملہ خواتین میں آیوڈین کی کمی کے سبب ہر سال تقریباً ۳ ہزار بچے مردہ اور ۱۲ لاکھ بچے ذہنی و جسمانی طور پر معذور و مفلوج پیدا ہوتے ہیں۔

مرض کے خاتمے کے لیے کیے جانے والے اقدامات

آیوڈین کی کمی سے ہونے والے امراض کی نزاکت کو دھیان میں رکھتے ہوئے مرکزی حکومت نے

باقی صفحہ ۱۱ پر

مدیر، نوائے طب وصحت بیگم سرائے، الہ آباد، ۱۵
پوجبا، نئی دہلی

مناظر حسین

صحت کا سرچشمہ: آملہ

مشہور محاورہ ہے کہ "آملے کا کھایا اور بڑوں کا کہا بعد میں پتا چلتا ہے" یعنی اس کی تصدیق بعد ہی میں ہوتی ہے۔ آملے کے بارے میں یہ محاورہ اس کے طبی فائدوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

آملہ ایک مشہور عام درخت ہے جو برصغیر کے اکثر گرم علاقوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ہمالیہ کے دامن میں جموں و کشمیر سے پورب کی طرف اور نیچے سری لنکا تک تقریباً ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اس کا درخت ۳۰ سے ۴۰ فٹ تک اونچا اور گولائی میں تین سے چھ فٹ تک موٹا ہوتا ہے۔ لیکن بعض درخت دس فٹ گولائی تک بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ درخت مضبوط، وسیع اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کی چھال ڈیڑھ انچ موٹی اور باہری جھلی بھورے رنگ کی ہوتی ہے اس پر چھوٹے بڑے داغ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اندر سے سرخ رنگ رکھتی ہے۔ اس کی لکڑی سرخ اور سخت ہوتی ہے۔ اگر اس کے درخت کو کاٹ کر رکھ دیا جائے تو اکثر پھٹ جاتا ہے یا خم کھا جاتا ہے اس لیے عمارت اور فرنیچر کے لیے کارآمد نہیں۔

آملہ کے پتے املی کے پتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور ہلکے سبز اور پھول سنہری مائل زرد رنگ کے گچھوں میں ہوتے ہیں۔ اس کا پھل تازہ بیر کی شکل کا گول اور خوبصورت ہوتا ہے اور اس کی چھ قاشیں ہوتی ہیں۔ کچے آملے کا رنگ سبز ہوتا ہے جو پکنے پر زرد یا سنہری مائل زرد ہو جاتا ہے۔ اسے سکھانے سے ان پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔

آملہ کی دو قسمیں ہیں ــــــ ایک جنگلی دوسرا پیوندی۔ جنگلی یا پہاڑی آملے چھوٹے ہوتے ہیں اور پیوندی والے بڑے ہوتے ہیں۔ پیوندی آملوں میں بنارس اور بریلی کے آملے زیادہ معروف ہیں۔ دودھ میں بھگو کر خشک کیے گئے آملے کو شیر آملہ کہتے ہیں۔ اس کے پھل میں گیلک ایسڈ ٹینک ایسڈ، گوند اور اسومن وغیرہ اجزا پائے جاتے ہیں۔ اس کا اچار بھی بنایا جاتا ہے اور مربّہ بھی۔ یہ وٹامن 'سی' کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ وٹامن سی کی کمی والے لوگوں کو آملے کا استعمال ضرور کرنا چاہیے۔ آملے کا شوربہ پی کر اگر بعد میں پانی پیا جائے تو بے حد لذیذ لگتا ہے اس قدر کہ بے تحاشہ پانی پینے کو جی چاہتا ہے۔

آملے میں فولاد بھی کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ آملہ جزوِ بدن بن جانے کی صلاحیت رکھنے والے فولاد کا ایک اچھا ماخذ ہے۔ فولاد کی تمام قدرتی یا مصنوعی شکلیں ہاضمے میں خرابی اور آنتوں میں سوزش پیدا کرتی ہیں، دست آور ہوتی ہیں۔ لیکن آملے کی خصوصیت یہ ہے کہ اچھا خون پیدا کرنے کے لیے بہترین فولاد فراہم کرتا ہے اور پیٹ کو خراب بھی نہیں ہونے دیتا۔ یہ کسی حد تک قبض کرتا ہے، اس خامی کو برابر وزن کی ہرڑ ملا کر دور کیا جا سکتا ہے۔ فولاد اور وٹامن 'سی' کے حسین امتزاج نے فولاد کے گرم مزاج کو معتدل کر کے اس کی تاثیر سرد اور خشک کر دی ہے۔

طبی خواص اور علاج

آملے کے تازہ پھل کی تاثیر سرد خشک اور پیشاب آور ملین تسلیم کی گئی ہے۔ خشک پھل قابض ہوا کرتے ہیں۔ آملے کا استعمال ہر مرض سے بچاتا ہے اور آدمی کی عمر سو سال تک پہنچ جاتی ہے۔ اس عمر تک بھی آدمی صحت مند اور چاق و چوبند رہتا ہے۔

آملہ ہرڑ کے مطابق اوصاف رکھتا ہے، لیکن اس میں ایک خاص وصف یہ ہے کہ یہ جسم کے خون کے لیے بے حد مفید ہے۔ قوت باہ کے لیے مجرب ہے اور کیمیا اثر ہے۔

دل کے امراض کے لیے آملہ بے حد مفید ہے۔ دل کمزور ہو اور دھڑکتا ہو تو آملے کا مربّہ استعمال کریں۔ دل کی کمزوری رفع ہو جائے گی۔

نکسیر، ہاتھ پاؤں کی جلن اور جسمانی حدت میں آملے کا استعمال مکمل آرام دیتا ہے۔ بلڈ پریشر کے لیے اس سے بہتر کوئی دوا نہیں۔ کھٹی ڈکاریں آتی ہوں، جی متلاتا ہو، قے آتی ہو، بدہضمی ہو، دست آتے ہوں تو آملہ بہترین علاج ہے۔ نظر کی کمزوری، بال گرنا، وقت سے پہلے بال سفید ہونا اور گنجے پن کا بھی بہترین علاج آملے سے کیا جاتا ہے۔ سر درد، سر چکرانا، دماغی کمزوری، یادداشت کا کمزور ہونا اور سر کے تمام امراض کے لیے آملہ بہترین دوا ہے۔ زیادہ پیاس لگنا اور قے آنا آملہ چوستے رہنے سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ بچے دانی سے خون آتا ہو تو دن میں تین چار بار آملے کا سفوف پانی کے ساتھ کھلانے سے مرض دور ہو جاتا ہے۔

پھیپھڑوں کی بیماریاں آملہ کھاتے رہنے سے جلد ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ آملوں کو پانی میں ڈال کر

موضع ڈبو، ڈاکخانہ سارا۔ وایا چاکند، ضلع گیہ ۸۰۴۴۰۴

یوجنا، نئی دہلی

رات بھر پڑا رہنے دیں، پھر اس پانی سے آنکھیں دھوئیں تو آنکھوں کی سرخی، جلن اور نظر کی کمزوری رفع ہوتی ہے۔ تازہ آملے کوٹ کر کپڑے سے نچوڑ کر اس کا عرق خشک کر لیں اور یہ کاجل آنکھوں میں لگاتے رہیں، آنکھوں کی تمام بیماریاں دور ہو جائیں گی۔

رات بھر بھیگا کر آملوں کے پانی سے سر دھوئیے۔ دماغی کمزوری اور سر چکر لانے کی شکایت دور ہو جائے گی۔ علاوہ ازیں بال ملائم، چمکدار، مضبوط اور گھنے ہو جائیں گے۔ خشک آملے کا سفوف منجن کی طرح انگلی سے دانتوں پر ملا جائے تو دانتوں سے خون آنا، دانتوں کا میل، دانت کا درد اور دانتوں کے ہلنے کی شکایت جاتی رہے گی۔ اگر چوٹ لگنے سے خون بند نہ ہو رہا ہو تو میدے کی طرح آملے کا سفوف کوٹ کر تیار کر لیں اور اسے زخم پر چھڑک کر پٹی باندھ دیں خون فوراً بند ہو جائے گا۔ اس سفوف سے پھوڑے بھی جلد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

رحم کی جلن اور اس کے دیگر امراض آملے کے عرق میں مصری ملا کر استعمال کرنے سے ختم ہو جاتی ہیں۔ مثانے کی گرمی، ہاتھ پاؤں کی جلن، پیشاب کی جلن، پیشاب رک رک کر یا کم آنا، نکسیر اور سوزاک وغیرہ کو مکمل آرام ملتا ہے۔

جسم میں کیلشیم کا حصہ کم ہو جانے پر آملہ اس کمی کو بہت جلد پورا کر دیتا ہے۔ چناں چہ کمزور اور ناتواں بچوں کو جنھیں سوکھے کا مرض ہو یا وہ آئے دن بیمار رہتے ہوں، اس کا استعمال کرایا جائے تو ان کی ہڈیاں مضبوط ہوتی ہیں اور ایسے بچے اس کی بدولت صحت و قوت جلد حاصل کر لیتے ہیں۔

حکما نے آملے کو نعمت الٰہی قرار دیا ہے۔ کھانسی کے ساتھ خون آرہا ہو یا پرانا بخار ہو تو آیورویدمیں آملہ چیون پراش کی شکل میں استعمال کرتے ہیں۔ چیون پراش آیوروید کی مشہور دواؤں میں سے ہے۔ اس دوا کے متعلق ایک روایت ہے کہ چیون رشی جب بہت بوڑھے اور کمزور ہو گئے یہاں تک کہ ان کا جسم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ایسے بڑھاپے کے عالم میں انھیں جوان ہونے اور اولاد پیدا کرنے کی خواہش ہوئی۔ اس وقت ویدوں (طبیبوں) نے اس رشی کو ایک معجون بنا کر استعمال کرنے کو کہا جس کے استعمال سے ان کی تمام کمزوریاں دور ہو گئیں اور وہ دوبارہ جوان ہو گئے۔ ●

بقیہ: صنعت فلم سازی: چند حقائق

ہے جو آسکر ایوارڈ بھی جیت چکا ہے۔ راج کپور نے بھی دوسرے ملکوں میں ہندوستانی سینما کو مقبول بنا کر ہندوستان کا نام روشن کیا۔

ناچ گانے ہندوستانی فلموں کی ایک نمایاں خصوصیت ہیں بلکہ یوں کہیے کہ وہ فلموں کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اگر کوئی فلم ناچ گانوں کے بغیر بنتی ہے تو وہ باکس آفس پر ناکام ہو جاتی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۳۰ کی دہائی میں ہندوستانی سینما کے ابتدائی دور میں بنی ہندی فلم "اندر سبھا" میں ۲۷ گانے تھے۔

عالمی سینما کی تاریخ میں ہندوستان کا نام اس لیے بھی روشن ہے کہ اس نے باکس آفس پر بے حد کامیاب ہونے والی فلمیں بنائی ہیں مثلاً "شعلے"، "میں نے پیار کیا" اور "ہم آپ کے ہیں کون" وغیرہ۔

ہمارے بعض فلم سازوں میں فلمیں بنانے کی اتنی لگن ہے اور وہ دنیائے فلم کے اتنے دلدادہ کہ ان کے لیے کوئی اور جائے ماندن نہیں ہے۔ جیسا کہ راج کپور نے اپنی فلم "میرا نام جوکر" میں ایک گانے میں کہا تھا۔ "جینا یہاں مرنا یہاں، اس کے سوا جانا کہاں؟" ان کا کہنا ہے کہ کھیل ہر صورت میں جاری رہنا چاہیے اور کھیل جاری ہے۔ ●

بقیہ: بڑھتے قدم

ٹیسٹ سسٹم، کارڈیاک کیتھیٹرز، دفاعی ساز و سامان کی تیاری اور تحقیق کی تنظیم نے میزائل پروگرام اور دفاعی مواصلات نظام کے دوران جو تکنالوجیاں اپنائیں ہیں، ان کے سبب ہی یہ طبی فائدے حاصل ہو سکے ہیں۔ ان طبی آلات پر کلینکوں میں تجربے جاری ہیں۔

پولیو کی وجہ سے معذور تقریباً ۵۰۰ افراد کو فلورری ایکشن اور تھوپیزر سے لیس کیا گیا ہے۔ یہ معاون سامان بھی دفاعی تحقیق و ترقی کی تنظیم کا ہی کارنامہ ہے۔ داخلی پیس میکر بھی کافی آگے تک تیاری کی منزل پر ہیں۔ ان کے علاوہ کاربن کمپوزٹ نظام پر مبنی ہڈیوں کی مدد سے جسمانی درستگی کرنا، انجیو پلاسٹی گائیڈ وائر، ہائیڈروٹیلی میٹری آلات اور ۵ رہ۳ کا طریقہ داخلی اعضا کے لیے اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

ان طبی آلات اور معاون سامان کی مدد سے بہت سے لوگوں کو فائدہ ہوگا۔ ان کی لاگت باہر سے منگائے جانے والے ان آلات کی قیمت کے مقابلے کم ہوگی۔ دفاعی تکنالوجیوں کے ضمنی فائدوں میں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے عوام کے لیے روزگار کے مواقع میں نیز مجموعی قومی پیداوار میں بھی اضافہ ہوگا جس کے عوض ملک کے عوام کا معیار زندگی بلند ہوگا اور ان کی خوشحالی بڑھے گی۔ ●

بقیہ: اردو شاعری میں موسم برسات

فوجیں بادل کی چلی آتی ہیں کرتی ہوئی کوچ
چوٹ پڑتی ہے گرجتے ہوئے نقاروں پر
آگ کی ڈور ہے، رنگوں کی کڑکتی ہے کمال
بجلیاں باندھی گئیں اندر دھنش پر کس کر
چھینٹا بارش کا ہے یا تیروں کی بوچھاریں ہیں
جو کیے دیتی ہیں متوالوں کے دل کو چھلنی

غرض یہ کہ اردو شعرا نے برسات کے حسن کو فن شاعری میں اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ موسم جتنا دلکش ہے اس سے کہیں زیادہ دلکش اردو نظموں میں نظر آتا ہے۔ ●

پہاڑی علاقوں کی ترقی

حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی بھی ریاست میں آٹھویں پنجسالہ منصوبے کے دوران فنڈوں کی قلت کی وجہ سے پہاڑی علاقہ ترقیات پروگرام کی توسیع کسی نئے پہاڑی علاقے کے لیے نہیں کی جائے گی۔ تاہم پہاڑی علاقہ ترقیات پروگرام کے تحت طے شدہ پہاڑی علاقوں کو خصوصی مرکزی امداد ملتی رہے گی۔ اسی طرح مغربی گھاٹ ترقیات پروگرام کے تحت طے شدہ تعلقوں کو دی جانے والی امداد بھی ملتی رہے گی۔

●

فردوس عنبر سیتھی

فضائی آلودگی

کرۂ ارض پر موجود دریا، سمندر، پہاڑ، جھیلیں، معدنیات، پھل، پھول، سبزیاں اور زمین کے ارد گرد موجود ہوائی غلاف سب مل کر ماحول کو تشکیل دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کرۂ ارض پر ابتدا سے ہی ایک انتہائی متوازن ماحول پیدا کیا ہے تاکہ اس پر بسنے والے انسان آرام اور آسائش سے زندگی بسر کر سکیں لیکن دنیا کی آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ انسان نے اپنی فہم و فراست کو بروئے کار لاتے ہوئے مزید آسائشوں کی خاطر بے شمار نئی نئی ایجادات کیں۔ ان نئی ایجادات سے صنعتی میدان میں تو انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں لیکن کرۂ ارض کے قدرتی ماحول کا توازن بگڑنا شروع ہو گیا۔ موجودہ دور جو انسانی خوشحالی اور ترقی کا دور سمجھا جاتا ہے، ماحولیاتی آلودگی کے انتہائی سنگین مسئلہ سے دوچار ہو چکا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ اب بین اقوامی اور قومی اداروں سے نکل کر عوام کا مسئلہ بن چکا ہے۔

ماحولیاتی آلودگی کی مختلف اقسام ہیں، فضائی آلودگی، آبی آلودگی اور زمینی آلودگی۔ ان میں سے سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی فضائی آلودگی ہے۔ زمین چاروں طرف سے مختلف گیسوں کے ایک دبیز پردے میں گھری ہوئی ہے جو کہ سورج سے نکلنے والی روشنی اور حرارت کو تو زمین پر گزرنے دیتا ہے لیکن اس سے نکلنے والی چند مضر شعاعوں کو جذب کر کے جانداروں اور نباتات کو ان کے مہلک اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ کرۂ ہوائی زمین پر حرارت کا توازن برقرار رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ فضا میں موجود خشک اور صاف ہوا بہت سی گیسوں کا مرکب ہے ان میں سے کچھ تو کافی زیادہ مقدار میں ہیں مثلاً آکسیجن اور نائٹروجن کچھ بہت قلیل مقدار میں پائی جاتی ہیں جن میں آبی بخارات آرگان، کاربن ڈائی آکسائیڈ شامل ہیں ان کے علاوہ فضا میں قدرتی طور پر چند مضر گیسیں مثلاً سلفر ڈائی آکسائیڈ، نائٹر آکسائیڈ اور کاربن مونو آکسائیڈ وغیرہ بھی موجود ہوتی ہیں لیکن جب تک ان کی مقدار اتنی قلیل رہے کہ وہ کسی جاندار یا نباتات کے لیے کسی قسم کے خطرے کا باعث نہ بنیں کسی قسم کے نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا لیکن اس کی مقدار میں اضافہ نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔

ہوا کو عموماً غیر آلودہ ہی سمجھا جاتا ہے بدقسمتی سے حقیقی زندگی میں غیر آلودہ فضا کا تصور بھی مشکل ہو چکا ہے۔ مختلف قدرتی اور انسانی عوامل ہوا کو کسی نہ کسی طور پر آلودہ کرتے ہی رہتے ہیں۔ ہوا میں پائی جانے والی آلودگی زیادہ تر سطح زمین کے نزدیک ہوتی ہے۔ زمین سے تقریباً دو ہزار فٹ اوپر آلودگی کی شرح بہت کم ہو جاتی ہے اس طرح فضائی آلودگی انسانی صحت اور نباتات وغیرہ پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ فضائی آلودگی کا تقریباً نوے فی صد حصہ مندرجہ ذیل گیسوں کا مرہون منت ہے۔ کاربن مونو آکسائیڈ نائٹروجن گیس، ہائیڈرو کاربنز سلفر آکسائیڈ گیس ٹھوس ذرات، یہ گیس اور ٹھوس ذرات مختلف قسم کے ایندھن جلنے سے فضا میں پھیل جاتے ہیں اس وقت تقریباً ۴۵۰۰ کے لگ بھگ مختلف صنعتی یونٹ مہاراشٹر میں کام کر رہے ہیں جن میں تقریباً پانچ ہزار یونٹ تشویشناک حد تک آلودگی پھیلا رہے ہیں ان میں کھاد چینی، چمڑا، کاغذ، کیڑے مار دوائیں اور کیمیکل بنانے والی فیکٹریاں شامل ہیں جن سے نکلنے والا دھواں اور زہریلی گیسیں دن رات فضا کو آلودہ بنا رہی ہیں۔

کاربن مونو آکسائیڈ ایک بے رنگ اور بے بو گیس ہے جو زیادہ تر پٹرول، کوئلے اور گیس کے کم آکسیجن میں جلنے سے پیدا ہوتی ہے خاصیت کے اعتبار سے یہ ایک انتہائی مہلک گیس ہے جس کی موجودگی کا انسان کو پتا تک نہیں چلتا یہ گیس سانس کے راستے انسانی جسم میں داخل ہو کر خون کے سرخ ذرات کو تباہ کر دیتی ہے اور انسان خاموشی سے موت کا شکار ہو جاتا ہے اس کی وجہ سے انسان تھکاوٹ افسردگی اور ذہنی کمزوری میں بھی مبتلا رہتا ہے۔

ایسے بے پناہ عوامل ہیں جو ماحولیاتی آلودگی کا سبب بن رہے ہیں ان میں سے کچھ تو قدرتی ہیں مثلاً آندھیوں کا چلنا، آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا، مختلف نامیاتی مرکبات کے گلنے سڑنے سے مضر صحت گیسوں کا پیدا ہونا اور فضا میں شامل ہونا، بجلی چمکنے سے فضا میں موجود گیسوں کے مرکبات بننا وغیرہ۔ ہندوستان بھی دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جہاں آلودگی کی شرح بے پناہ ہو چکی ہے۔ ہندوستان کے بڑے شہروں میں شور انتہائی زیادہ ہے اس کی وجہ سے لوگ نفسیاتی اور اعصابی دباؤ کا شکار رہتے ہیں۔ ماحول کو آلودگی کے ساتھ ساتھ شور کی آلودگی بھی انسانوں میں دل کی بیماریوں، جسمانی بے قاعدگیوں، ذہنی کھنچاؤ اور جذباتی دباؤ کا سبب بن رہی ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ ہر وقت کسی نہ کسی طرح کے شور میں رہتے ہیں ان میں دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ چڑچڑاپن پایا جاتا ہے ایسے لوگوں میں کان کے عارضے عام ہوتے ہیں۔ زیادہ عرصہ شور شرابے میں رہنے سے بہرے پن کا اندیشہ بھی ہو سکتا ہے

باقی صفحہ ۳۳ پر

کلاں محلہ انزد مسجد۔ اورنگ آباد، ۸۲۴۱۰۱

یوجنا، نئی دہلی

ایس۔ ایم۔ شاہ نواز

خوشحالی کی کنجی

ایک انگریزی کہاوت ہے کہ وقت پر ایک ٹانکا نو ٹانکوں کو بچاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم کسی مسئلے یا پریشانی کے کھڑے ہوتے ہی اس کا تدارک کر لیں تو آنے والے وقت میں ہم بہت سی پریشانیوں سے خود کو بچا سکتے ہیں۔

اس وقت بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ بھی بہت سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ اس کے ایسے بھیانک نتائج سامنے آرہے ہیں کہ ساری دنیا کے ماہرین پریشان ہیں کہ اسے کیوں کر حل کیا جائے۔ کس طرح آنے والی نسلوں کو اس کے تباہ کن نتائج سے بچایا جائے۔

اب یہ مسئلہ کسی مخصوص علاقے، خطے یا ملک تک محدود نہیں رہا ہے، بلکہ پوری دنیا اس کی لپیٹ میں ہے۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر ترقی پذیر اور غریب ملکوں پر پڑ رہا ہے۔

پچھلے دنوں واشنگٹن میں قائم "ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ" نے اپنی ایک رپورٹ میں دنیا کو خبردار کیا تھا کہ ایٹمی جنگ کا خطرہ ٹل جانے کے بعد اب تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی دنیا کے مستقبل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

اس مسئلے نے اتنی سنگین صورت حال اس لیے اختیار کر لی ہے کہ ہم نے پہلے سے اس پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دی۔ ہماری حکومت نے تو اسے شروع سے ہی اپنے ترقیاتی منصوبوں میں شامل کر رکھا ہے۔ اس مد پر خرچ کی جانے والی رقم میں ہر پنجسالہ منصوبے میں خاطر خواہ اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن پھر کیا وجہ ہے کہ ان کوششوں کے وہ نتائج سامنے نہیں آئے، جو آنے چاہئیں تھے۔

پچھلے ۴۸ برسوں میں ملک نے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس وقت ہندوستان کو دنیا کے دس بڑے صنعتی ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سائنسی اور تکنیکی صلاحیت اور مہارت رکھنے والے افراد کی تعداد کے لحاظ سے دنیا میں ہندوستان کا نمبر تیسرا ہے۔

لیکن اس افتخار کے باوجود ملک کی ۴۰ فی صد سے زائد آبادی غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے نو آزاد ملکوں کے مقابلے میں آج بھی لاتعداد ہندوستانیوں کا معیار زندگی اطمینان بخش سطح تک نہیں آسکا ہے۔ ملک میں مکانات کی قلت ہے۔ بے شمار افراد جھگی جھونپڑیوں میں قابل رحم زندگی گزار رہے ہیں۔ ملک میں اسکولوں اور اسپتالوں کی کمی ہے۔ زندگی کی آسائشیں اور سہولتیں حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو بے پناہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ہماری ساری ترقی، ہماری تمام کامیابیوں کو بے روک ٹوک بڑھتی ہوئی آبادی نے بے اثر کر ڈالا ہے، جس شرح سے ملک کی آبادی بڑھ رہی ہے اس کے مطابق ایک پورا آسٹریلیا ہر سال ہمارے ملک کی آبادی میں بڑھ جاتا ہے۔ بھلا سوچئے اس شرح اضافہ کے اعتبار سے کتنے لوگوں کے لیے مکان تعمیر کیے جا سکتے ہیں؟ کتنے اسکول اور اسپتال کھل سکتے ہیں اور نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع کس طرح پیدا کیے جا سکتے ہیں؟ آبادی کا یہ بڑھتا ہوا سیلاب نہ صرف ہماری معاشی ترقی بلکہ ماحولیات کے لیے بھی خطرہ بن گیا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ خاندانی بہبود یا خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام محض سرکاری کوششوں سے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے جب اسے ایک عوامی تحریک کی شکل دی جائے۔

اس کے لیے سب سے پہلے ذہنوں میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت ہے، خاص طور پر خواتین کی تعلیم پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ زیادہ بچوں اور معاشی پریشانی کا بوجھ زیادہ تر عورت کو ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کیرالہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہاں خواندگی کی شرح ملک میں سب سے زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں شرح پیدائش بھی دوسرے علاقوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم آبادی پر کنٹرول کے مسئلے کو مغرب کی نظر سے نہ دیکھیں۔ مغرب کا یہ اصول کہ ہر مسئلے کو تکنالوجی کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے، ہمارے لیے رہنما اصول نہیں بن سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم صرف مانع حمل اشیاء اور طریقوں کے استعمال پر زور دے رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح ہم اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لیں گے لیکن ہماری یہ خام خیالی ہے۔ ہمیں اپنے سماجی، معاشی، جغرافیائی اور ثقافتی حالات کے پیش نظر اس پروگرام پر نظر ثانی کرنی پڑے گی، اسی صورت میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

جی۔ڈی۔چندن

ابتدائی تعلیم کی اہمیت

تعلیم ہمارے ملک کے ترقیاتی عمل کی ایک نہایت اہم تدبیر ہے۔ ملک کی منصوبہ بندی میں یہ ایک اعلا ترجیح کی حامل ہے۔ چناں چہ حصول آزادی کے بعد تعلیم کے میدان میں غیر معمولی توسیع ہوئی ہے۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ہمارے پاس کل پانچ لاکھ تیس ہزار اسکول تھے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں ان کی تعداد آٹھ لاکھ گیارہ ہزار بائیس ہوگئی۔ اسی عرصے میں اسکولوں میں داخلوں کی تعداد دو کروڑ ۴۰ لاکھ سے ۱۵ کروڑ ۷۰ لاکھ ہوگئی۔ اس رفتار ترقی کی پچھلے ۲۵ سال کے اعداد کے سطح وار کیفیت بھی قابل توجہ ہے۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں پرائمری (ابتدائی) سطح یعنی پہلی سے پانچویں جماعت میں داخلہ لینے والے چھ تا گیارہ سال کے بچوں کی تعداد ۵ کروڑ ۳۵ لاکھ تھی۔ ۹۱-۱۹۹۰ء میں اس میں چار کروڑ ۵۶ لاکھ کا اضافہ ہوا اور یہ نو کروڑ ۹۱ لاکھ ہوگئی۔ اسی عرصے میں مڈل اسکولوں میں داخلہ لینے والے یعنی گیارہ تا چودہ سال کے طلبا کی تعداد میں دو کروڑ آٹھ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ ۶۹-۱۹۶۸ء میں یہ ایک کروڑ ۲۵ لاکھ تھی اور ۹۱-۱۹۹۰ء میں یہ تین کروڑ ۳۳ لاکھ ہوگئی۔

یہ اضافے تعمیر وطن کے زینے ہیں اور ان میں مسلسل پیش رفت کرنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔

اس توسیع کی پشت پر قومی آئین کی ہدایت ہے کہ ملک کے تمام بچوں کی چودہ سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم کی تدبیریں کی جائیں۔ چناں چہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی کثیر اضافہ ہوا ہے اور ملک کی شرح خواندگی جو ۱۹۴۷ء میں صرف ۱۴ فی صد تھی ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں ۵۲٫۲۱ فی صد ہوگئی۔

تعلیمی سہولتوں کی توسیع ہماری منصوبہ بندی کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو اس کی کیفیت اور خصوصیات ہیں۔ ۱۹۷۶ء سے پہلے تعلیمی پروگرام کی ذمہ داری ریاستوں پر تھی۔ مرکزی حکومت اس کی تدبیروں میں تال میل پیدا کرتی تھی۔ تکنیکی اور اعلا تعلیم کے معیار مقرر کرتی تھی اور کچھ ایسے ہی مزید اقدام کرتی تھی لیکن ۱۹۷۶ء میں آئین میں ایک ترمیم کے ذریعہ تعلیم کا موضوع مرکز اور ریاستوں کی مشترکہ ذمہ داری ہوگیا۔

چھٹے پلان کے زمانے تک تعلیم کو محض ایک سماجی خدمت تصور کیا جاتا ہے۔ پھر اسی پلان کے آغاز سے اس نظریے میں تبدیلی کی گئی اور تعلیم کو ملک کی سماجی اور معاشی ترقی کا محور تسلیم کیا گیا۔ اب ابتدائی تعلیم کو ملک گیر بنانے اور ۱۵ تا ۳۵ سال کی عمر کے لوگوں میں تعلیم بالغان کے پروگرام کے ذریعے ناخواندگی کا انسداد کرنے کو ترجیحی درجہ دیا گیا ہے۔ ان دونوں مقاصد میں سماج کے کمزور طبقوں، لڑکیوں، شیڈولڈ ذاتوں اور قبیلوں کی تعلیم پر زور دیا گیا۔

۱۹۸۶ء میں تعلیم کی قومی پالیسی مرتب کی گئی اور اس میں انھیں پروگراموں کے ساتھ ساتھ ان کے ملحقہ امور کو بھی ترجیحی درجہ دیا گیا۔ ان میں تیکنیکل اور اعلا تعلیم، ثانوی تعلیم کی پیشہ ورانہ سمت، علاقائی زبانوں کی ترقی اور پنج سالہ پلان کے پروگراموں کی رفتار ترقی کی جانچ اور موثر تعمیل وغیرہ کی اہمیت پر نظر رکھنا شامل ہیں۔ مزید براں تعلیم کے سلسلے کے ساتھ سماجی فلاح اور روزگار کے پروگراموں کی قوت آفریں اور سودمند کڑیوں پر بھی خصوصی زور دیا گیا۔

۱۹۹۲ء میں تعلیم کی قومی پالیسی کے تعلق سے ایک نظر ثانی شدہ حکمت عملی تیار کی گئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ۲۱ویں صدی شروع ہونے سے قبل ۱۴ سال کی عمر تک کے تمام بچوں کو اطمینان بخش وصف کی مفت اور لازمی تعلیم مہیا کی جائے اور اب اسی پروگرام کو عملی شکل دی جا رہی ہے۔

دسمبر ۱۹۹۳ء میں نئی دہلی میں کثیر آبادی والے نو ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ اس صدی کے آخر تک سب کے لیے تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اس کے تحت ابتدائی تعلیم کے نشانے پورے کرنے کے لیے کوششیں تیز تر کردی گئیں۔ ان کوششوں میں پورے ملک میں ناخواندہ بالغوں کو خواندہ کرنا بھی شامل ہے۔

ملک کی سماجی اور معاشی ترقی کو تیز رفتار بنانے میں لڑکیوں اور ناخواندہ بالغ عورتوں کی تعلیم کی بہت اہمیت ہے۔ اس سمت میں حکومت نے موقع بہ موقع کئی اقدام کیے ہیں۔ تعلیم کی پالیسی میں اس پہلو پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

تعلیم کی نئی قومی پالیسی کے نفاذ کے بعد مرکزی حکومت نے اس میدان میں قدم رکھا اور تعلیم کی توسیع کی مہم کو متعدد تدبیروں سے مضبوط کیا۔

سب سے پہلے آپریشن بلیک بورڈ کے نام سے ایک اسکیم شروع کی گئی جس کے تحت پرائمری اسکولوں میں دستیاب سہولتوں کی اصلاح کی گئی۔ اس اسکیم سے ملک کے تقریباً تمام پرائمری اسکولوں کو وابستہ کیا گیا۔ استادوں کی ایک لاکھ ۴۹ ہزار اسامیاں منظور کی گئیں جن میں سے ایک لاکھ ۲۲ ہزار پر تقرریاں ہو چکی ہیں۔ اس میں اندازاً نصف (۵۶۱۳۲) اسامیوں پر عورتیں تعینات ہوئی ہیں۔ ملک کے ۹۹٫۹۰ فی صد پرائمری اسکولوں کے لیے پڑھانے اور سیکھنے کی اشیا منظور کی جا چکی ہیں۔ جن اسکولوں میں ایک سو سے زیادہ بچے ہیں ان کے ہاں تیسرا ٹیچر بڑھانے کے لیے ۱۴۵۳۵

اسامیاں منظور کی گئی ہیں۔ مزید ان اسکولوں میں تیسرا کمرہ مہیا کرنے کے بھی اقدام کیے جا رہے ہیں۔

ملک میں کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں تعلیمی عملہ نہیں پہنچ پاتا اور آبادی کے کچھ گروہ اس قدر معذور ہیں کہ ان کے بچے داخلے کے لیے اسکولوں تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے لیے غیر رسمی تعلیم کا طریقہ شروع کیا گیا۔ اس طریقے سے کام کرنے والے ڈھائی لاکھ مراکز قائم ہو چکے ہیں جن سے تقریباً ۶۲ لاکھ لوگ تعلیم پا رہے ہیں۔ اس اسکیم کا فیض ان لڑکیوں کو بھی پہنچ رہا ہے جو اسکولوں میں حاضری نہیں دے سکتیں۔

ساتھ ہی قومی سطح پر ایک نصابی ڈھانچہ تیار کیا گیا جس میں پرائمری سطح کی تکمیل کے بعد تعلیم کے کم سے کم ضروری معیاروں کے حصول کی ضرورت بتائی گئی اور ایسی حکمت عملی وضع کی گئی جس سے یہ معیار حاصل کیے جا سکیں۔ ضلع کی سطح پر پرائمری تعلیم کا پروگرام اسی نظام کے سیاق میں مرتب کیا گیا جو بہت کامیاب ثابت ہوا۔

ابتدائی تعلیم کی مہم کی تقویت کے لیے حال ہی میں غذائی امداد کا ایک قومی پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ عرف عام میں اسے مڈ ڈے میل (دوپہر کا کھانا) اسکیم کہا جاتا ہے۔ یہ اپنی قسم کی پہلی کل ہند اسکیم ہے جس کا اطلاق تمام ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں پر ہوگا۔

تین سال کے عرصے میں یہ اسکیم پہلی سے پانچویں جماعت تک کے سرکاری، مقامی اداروں اور نجی طور پر امداد یافتہ اسکولوں کے قریب گیارہ کروڑ بچوں پر لاگو ہوگی۔ اس کے پہلے سال کے مصارف کے لیے ۱۱۶۱ کروڑ چالیس لاکھ روپے مختص کیے گئے ہیں اور جب یہ کلی طور پر بر سر عمل ہوگی اس کے مصارف ۲۰۸۴ کروڑ نوے لاکھ روپے ہو جائیں گے۔

اس اسکیم کے ذریعہ اسکولوں میں حاضری میں بہتری ہوگی، تعلیم بیچ میں چھوڑ کر جانے والے بچوں کی تعداد کم ہوگی اور بچوں کی غذا پر مفید اثر ہوگا۔ اس پروگرام کے لیے درکار اناج مرکزی حکومت ریاستوں کو مفت مہیا کرے گی۔

اس اسکیم میں پنچایتیں اور نگر پالیکائیں اہم کردار ادا کریں گی کیوں کہ اس کے بنیادی نظام اور کھانا پکانے کی ذمہ داری انھیں کو سونپی جائیں گی۔ کھانا پکانے، اس کی نگرانی کرنے اور رسوئی گھر برقرار رکھنے کے تمام اخراجات مرکزی کی طرف سے غریبی ختم کرنے کے پروگرام کے تحت بطور امداد دیے جائیں گے۔ اس نظام میں یہ گنجائش رکھی جائے گی کہ غیر سرکاری ادارے، عورتوں کے گروپ اور والدین استادوں کی انجمنیں اس سے اشتراک کر سکیں۔

پہلے مرحلے میں یہ اسکیم روزگار دلانے کی اسکیم کے ۲۴۰۸ بلاکوں میں شروع ہوگی۔ دور افتادہ اور قبائل کے ان علاقوں میں بیشتر غریب لوگ رہتے ہیں۔ اسی مرحلے میں چالیس اور ایسے بلاک بھی شامل ہوں گے جہاں نسوانی خواندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔

دوسرے برس میں یہ اسکیم ۲۰۰۵ ایسے بلاکوں میں شروع کی جائے گی جہاں نسوانی خواندگی ۴۰ فی صد کی قومی سطح سے۔ بقایا ۸۲۸ بلاکوں میں یہ اسکیم ۹۸-۱۹۹۷ء میں شروع کی جائے گی۔

اس اسکیم کی جزئیات ایسی ہیں کہ اس سے پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کی منزل تیزی سے سر ہوگی۔ حالیہ اندازوں سے پتا چلا ہے کہ بیچ میں تعلیم چھوڑ کر جانے والے بچوں کی تعداد میں کمی ہوئی ہے لیکن پہلی سے پانچویں جماعت تک یہ تعداد اب بھی ۳۶ فی صد ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

غذائیت کی کمی کا مسئلہ بھی شدید ہے۔ اطلاعات کے مطابق ہر دس میں سے ۵ بچوں ہی کو نارمل غذا ملتی ہے۔ ہر ایک سو لڑکوں میں سے ۱۲ لڑکے اور ہر سو لڑکیوں میں ۱۶ لڑکیاں غذا کی شدید کمی کا شکار ہیں۔

دیہات میں غریب والدین کے اسکول جانے والے بچوں میں غذائیت کی کمی عام ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک بھوکا اور بیمار بچہ تعلیم کی طرف مائل نہیں ہوگا۔

اس اسکیم کے مصارف کا ایک ملحقہ اور اضافی فائدہ یہ ہے کہ اس سے غربت کے انسداد کے پروگراموں کو تقویت ملے گی۔ پچھلے تین سال میں تعلیم کی مد پر مرکزی حکومت کے منصوبہ جاتی مصارف میں ڈیڑھ گنا اضافہ ہوا ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں یہ رقم ۹۹۷ کروڑ روپے تھی۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں یہ ۱۸۲۵ کروڑ روپے تھی۔

ایک طرف خواندگی کی اسکیموں کو جوش و خروش سے چلایا جا رہا ہے اور دوسری طرف ابتدائی تعلیم کے پروگراموں کو نئی تدبیروں سے مضبوط اور وسیع تر بنایا جا رہا ہے۔ بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس صدی کے آخر تک سب کے لیے تعلیم کا نشانہ حاصل کر لیا جائے گا۔ ●

بقیہ: فضائی آلودگی

ہندوستانی شاہراہوں پر ٹریفک کا دھواں اور شور شرابہ بے حد زیادہ ہے جس کی وجہ سے بے خوابی، بلڈ پریشر اور سانس کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ تھکاوٹ، افسردگی اور ذہنی پریشانیاں عام ہیں۔ ہمارے یہاں ہر دوسرا آدمی پریشانیوں اور مصیبتوں میں گھرا نظر آتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں بڑھتی ہوئی ٹریفک اور دھوئیں کی وجہ سے ایک نیا سنگین خطرہ پیدا ہو گیا ہے جسے "لیڈ پوائزننگ" کہتے ہیں۔ سیسہ یا لیڈ مختلف کیمیائی مرکبات کی شکل میں پٹرول میں شامل کیا جاتا ہے تاکہ گاڑی کا انجن ناکنگ نہ کرے یعنی جھٹکا نہ کھائے۔ وہ لوگ جو لمبے عرصے تک معروف شاہراہوں پر ڈیوٹی انجام دیتے ہیں اس زہر کا شکار ہو سکتے ہیں کیوں کہ آلودہ ہوائیں سانس لینے کی وجہ سے ان کے خون میں سیسے کی مقدار عام شہریوں کی نسبت کافی زیادہ ہو جاتی ہے۔ سیسے کی خون میں آمیزش گردوں اور نظام ہاضمہ کے لیے مہلک اثرات پیدا کرتی ہے۔ کاربن مونو آکسائیڈ کی آلودگی تقریباً ۷۰ فی صد حصہ گاڑیوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر گاڑیوں کے انجن بالکل درست حالت میں ہوں تو سارے کا سارا پٹرول جل کر کاربن مونو آکسائیڈ کے بجائے کاربن ڈائی آکسائیڈ بنائے گا جس سے ایک تو انجن کی کارکردگی بہتر ہو گی اور دوسرا مونو آکسائیڈ کے زہریلے پن کی بہتات سے نجات مل جائے گی مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

مغربی ممالک میں سیسہ کی آلودگی کے بارے میں بھی لوگ بہت زیادہ متفکر ہیں اسی لیے وہاں پٹرول کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص پٹرول بھی متعارف کرایا گیا ہے اور آج کل ہمارے ملک میں بھی اس پٹرول کو استعمال کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ اس پٹرول میں سیسہ شامل نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی دھواں دینے والی گاڑی کے پیچھے ایک میل تک چلنے سے انسانی صحت اتنی ہی متاثر ہو سکتی ہے جتنی کہ تقریباً دو ہزار سگریٹ پینے سے ہو سکتی ہے۔ بمبئی، دہلی اور کلکتہ میں روزانہ ۸۵ سے ۹۰ فی صد تک زہریلا دھواں فضا میں چھوڑ رہی ہیں جس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے شہری کس قدر آلودہ ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ ہماری حکومت اس سے چھٹکارا پانے کے لیے مختلف حربہ استعمال کر رہی ہے جو مستقبل میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ●

مہتاب بانو

اردو شاعری میں موسم برسات

اردو زبان میں ہندوستانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اردو شعروادب ہندوستانی روایات، مذاہب، ثقافت اور تمدن کا آئینہ دار ہے۔ اردو ادیبوں نے رامائن کے تقدس، ویدوں کے فلسفۂ حیات، گیتا کی تلقین، گنگا کی روانی، جمنا کے حسن، اجنتا کی مجسمہ سازی، تاج محل کی عظمت، ایلورا کی عصمت، کشمیر کی وادیوں اور ہمالیہ کی چوٹیوں کو موضوع سخن بنایا۔ اردو شعرار نے ہندوستانی تیج تہواروں اور موسموں کی وہ منظر کشی کی کہ ایک ایک مصرعہ میں ہولی کے رنگوں کی مہک، دیوالی کے دیوں کی چمک اور عید کی خوشیوں کی دمک مجسم ہوکر سامنے آگئی اور غیر ہندوستانی بھی اردو شاعری پڑھ کر یاسن کر ہندوستان سے محبت کرنے کے لیے مجبور ہوگئے۔ اسی طرح اردو نظموں میں ہندوستانی موسموں کی تصویر کشی اس دلکش انداز میں کی گئی ہے کہ اگر آپ موسم سرما میں گرمی سے متعلق نظمیں پڑھیں تو پسینے میں تر ہوجائیں۔

ہندوستان کی ہر زبان کا شاعر چاہے وہ سنسکرت کے کالی داس ہوں یا ہندی کے سورداس، بنگلہ کے رابندر ناتھ ٹیگور ہوں یا میر تقی میرؔ اور نظیر اکبر آبادی جیسے اردو شعرار سب کو برسات کی رم جھم، ساون کی پھواروں، بھادوں کی گھٹاؤں اور کوئل کی صداؤں نے اس حد تک متاثر کیا کہ وہ برسات کے حسن کو اپنے اشعار میں قید کرنے کے لیے بے تاب ہوگئے۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے تو یہ برکھا رُت کی بہاروں سے مالا مال ہے اور تقریباً تمام اردو شعرار نے تھوڑا یا بہت برسات کے بارے میں ضرور کہا ہے۔ یہاں یہ تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ اردو شاعری نے رُت ورنن یعنی موسم کی تصویر کشی کرنے کی روایت سنسکرت اور دیگر ہندوستانی زبانوں سے لی ہے اور اس کے لیے فارسی یا عربی اصناف سخن کو نہیں بلکہ ٹھیٹ ہندوستانی اصناف سخن مثلاً "بارہ ماسہ" اور "رِتو ورنن" کو اختیار کیا۔ اردو زبان وادب کے مستند ناقدین اور محققین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بارہ ماسہ کی روایت اردو میں سنسکرت اور اپ بھرنش زبانوں سے آئی اور اردو شعرار نے اس روایت اور صنف سخن سے استفادہ کرتے ہوئے اردو زبان کو مختلف ہندوستانی موسموں سے متعلق نظموں اور اشعار سے آراستہ کیا۔ اردو کے قدیم شعرار نے بارہ ماسہ کی روایت کو آگے بڑھایا اور موسم سرما، موسم گرما اور موسم برسات کی شعری تصویریں پیش کیں۔ اردو شعرار کو برکھا رُت کی ادائیں بھائیں اور اسی لیے دکن کے ابراہیم عادل شاہ نے اپنی کتاب "نورس" کے ایک گیت میں کہا ہے کہ "ہندوستانی آدرش عورت برسات کی طرح ہے کیوں کہ اس کے دانت دنیا کو روشن کرنے والی بجلیاں ہیں، رنگ برنگے لباس بادل معلوم پڑتے ہیں اور پسینہ گھنگھور گھٹا ہے جو برس رہا ہے۔"

قدیم اردو شعرار مثلاً میراجی، وحیدالدین وجدی، ولی دکنی، سلطان محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب، ابن نشاطی، نوری، ہاشم، ملا قطبی، افضل وغیرہ نے برسات کے حسن کو اپنے اشعار میں قید کیا۔ اردو شعرار نے برسات کے بارے میں اتنا کچھ کہا ہے کہ اگر سب کا کلام یکجا کیا جائے تو کئی جلدوں میں ختم ہوگا لہٰذا مختلف ادوار کے چیدہ چیدہ شعرار کا منتخب کلام ہی اس مضمون میں دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اردو کے قدیم شاعر افضلؔ اپنی نظم "ساون" میں کہتے ہیں۔

گھٹا کاری جہار و اُودر چھائی
برہ کی فوج نے سینی چڑھائی
ارے جب کوک کوئل نے سنائی
تمامی تن بدن میں آگ لائی
اندھیری رات جگنو جگمگائے
جلے تن کو مرے دونا جلاوے
چلا ساون مگر ساجن نہ آئے
اری کن دوتیوں نے لوٹنے چلائے

افضلؔ کی یہ نظم اور اس کے الفاظ و انداز سے واضح ہوتا ہے کہ قدیم اردو شعرار نے نہ صرف ہندوستانی روایت کو آگے بڑھایا بلکہ کاری، ساجن، لوٹنے، سینی اور بمعنی طرف جیسے عام فہم ہندی الفاظ کو خوبصورتی کے ساتھ استعمال بھی کیا۔ دراصل اردو کے بیشتر ابتدائی شعرار نے برسات کے موسم سے متعلق اپنے کلام میں علاقائی زبانوں اور ہندی کے عام بول چال کے الفاظ ہی زیادہ استعمال کیے ہیں۔

دوسرے دور کے اردو شعرار مثلاً میر تقی میرؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، نظیر اکبر آبادی وغیرہ نے تو برسات کے بارے میں سیکڑوں نظمیں کہیں۔ میر تقی میرؔ نے تو خاص طور پر برسات کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر میرؔ صاحب اپنی ایک نظم بعنوان "برسات" میں فرماتے ہیں۔

رُت ہے برسات کی بہت پیاری
موجزن جھیلیں، ندیاں ساری
کھیت دھانوں کے لہلہے شاداب
کر رہے ہیں نظر کی دلداری
ننھی ننھی برستی ہیں بوندیں
روح پر ہوتی ہے خوشی طاری
سوندھی سوندھی زمین کی مٹی
بھینی بھینی چمن کی بو پیاری

۴/۱۱-۱۱۴ای حوض رانی مالویہ نگر، نئی دہلی، ۱۱۰۰۱۷

کوکلا، بگلہ، کوئلیں طاؤس
اپنی تانیں سُناتے ہیں پیاری

لیکن میر تقی میر نے برکھا رُت کے مذکورہ بالا روح پرور روپ کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ بارش ہونے کی وجہ سے درپیش مسائل کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ برسات کا موسم برق و باراں، ہریالی اور ٹھنڈک کے علاوہ اپنے ساتھ مکھیاں، مچھر، ملیریا اور سیلاب کے مشکلات اور تباہ کاریاں بھی لاتا ہے۔ میر صاحب اپنی ایک نظم "کثرتِ بارش" یوں کہتے ہیں۔

کیا کہوں اب کے کیسی ہے برسات
جوشِ باراں سے بہہ گئے ہیں بات
جیسے دریا اُبلتے دیکھے ہیں
یاں سوں پرنالے چلتے دیکھے ہیں
کیسے کیا میہ مینھ کی طغیانی
ہو گئی ہے سیاہی بھی پانی

اردو کے عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی نے بھی برسات کے حسن کو اپنی متعدد نظموں میں موضوعِ سخن بنایا ہے۔ مثال کے طور پر نظیر اپنی ایک نظم "برسات کی بہاریں" یوں کہتے ہیں۔

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

میر صاحب کی طرح نظیر اکبرآبادی نے بھی برکھا رت کے تکلیف دہ پہلو کو بھی نظم کیا ہے وہ کہتے ہیں۔

کوئی پکارتا ہے لو یہ مکان ٹپکا
گرتی ہے چھت کی مٹی اور سائبان ٹپکا
چھلنی ہوئی اٹاری کوٹھا ندان ٹپکا
باقی تھا اک اُسارا سو وہ بھی آن ٹپکا

تیسرے دور کے اردو شعرا مثلاً مولانا الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، منشی درگا سہائے۔ سرور جہان آبادی، بے نظیر شاہ وغیرہ نے بھی برسات کی دلکشی کو اپنے اشعار میں باندھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مولانا حالی کی ایک نظم "برکھا رت" ملاحظہ فرمائیں۔

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل
ہے گونج رہا تمام جنگل
کوئل کی ہے کوک دل لبھاتی
گویا کہ ہے دل میں بیٹھ جاتی
مینڈھک جو ہیں بولنے پر آتے
سنسار کو سر پہ ہیں اُٹھاتے
ملاحوں کے اُڑ رہے ہیں اوسان
بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان

منشی درگا سہائے، سرور جہان آبادی نے اپنی ایک نظم میں ابرِ بہار کی آمد پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوتے کہا ہے کہ

اٹھا وہ جھوم کے ساقی چمن میں ابرِ بہار
چٹک رہے ہیں شگوفے برس رہی ہے پھوار
ہے موتیوں کی لڑی یا قطار بگلوں کی
ہواہیں اُڑتے ہیں جگنو کہ چھوٹتے ہیں انار

اردو زبان کے جدید شعرا مثلاً جوش ملیح آبادی، عبدالمجید شمس، فراق گورکھپوری وغیرہ نے بھی برسات کی بہاروں کا تذکرہ اپنی نظموں اور غزلوں کے اشعار میں کیا ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی اپنی نظم "برسات کی پہلی گھٹا" یوں فرماتے ہیں۔

چھا گئی لو دفعتاً آموں کے باغوں پر بہار
اٹھ رہی ہے سوندھی سوندھی سی شمیم خوشگوار
شاخ پر کوئل غزل خواں ہے لب جو میگسار
گا رہے رکھ کے ڈولی نیم کے نیچے کہار
جھوم کر برسی ہے کیا پہلی گھٹا برسات کی

پڑ رہا ہے تیز پانی بک رہی ہیں بولیاں
رقص کرتا جا رہا ہے موجِ باراں میں دھواں
مہوشوں کی زیب و زینت الحفیظ و الاماں
ہر کلائی میں نظر آتی ہیں دھانی چوڑیاں
جھوم کر برسی ہے کیا پہلی گھٹا برسات کی

مشہور شاعر عبدالمجید شمس نے بھی اپنی ایک نظم "برسات" جو کافی طویل ہے، میں موسم باراں کی دلکش منظر کشی کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

برسنے لگا ابر تر ٹوٹ کر
ہوئیں کرنیں خورشید کی بے اثر
نہا کر تر و تازہ تھیں جھاڑیاں
پہننے لگیں پھر نئی ساڑیاں
خوشی سے لگیں جھومنے ڈالیاں
بجانے لگیں پتیاں تالیاں
جدھر دیکھیے ہے زمیں سبز پوش
نئی دوب ہر جا زمرد فروش
جھلکتی ہے پانی کی لہروں پہ دھوپ
نرالا ہے بارش سے فطرت کا روپ

مجاہد آزادی سید فضل الحسن حسرت موہانی نے بھی ہندوستان جنت نشان کے موسم برسات کی اپنی نظم "برسات کی اُمنگ" میں روح افزا تصویر پیش کی ہے۔ حسرت موہانی کہتے ہیں۔

گھر کے آخر آج برسی ہے گھٹا برسات کی
میکدوں میں کب سے ہوتی تھی دعا برسات کی
موجب سوز و سرور و باعثِ عیش و نشاط
تازگی بخشِ دل و جاں ہے ہوا برسات کی
سرخ پوشش پر ہے زرد و سبز بوٹوں کی بہار
کیوں نہ ہوں رنگینیاں تجھ پر فدا برسات کی

منشی دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی کی نظم "برسات کی بہار" بھی اردو شاعری کا ایک دلکش حصہ ہے۔ لکھنؤ کی مہکی مہکی زبان میں افق نے برکھا رت کے حسن کو قید کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس نظم کے چند بند ملاحظہ فرمائیں۔

کبھی اُودی گھٹا چھائی کبھی کالی گھٹا چھائی
جب اٹھی دل لبھانے والی متوالی گھٹا چھائی
چمک دکھلا کے کوندا اس طرح خاموش ہوتا ہے
کوئی جھلکی دکھا کر جس طرح روپوش ہوتا ہے
کہیں طاؤس کا غل ہے کہیں جھنکار جھینگر کی
کہیں ہے جانفزائی کوکلا کے دل رُبا سُر کی
کہاں تک ذکر ہو اس فصل عیش افزا کے عالم کا
فقط ہے ہند میں گھر اس بہار انگیز موسم کا

عصرِ حاضر کے مشہور اردو شاعر علی سردار جعفری نے "موسموں کے گیت" میں برکھا رُت کی تصویر نہایت بلیغ و فصیح الفاظ میں نئی نئی تشبیہات اور استعارات کے ساتھ پیش کی ہے۔ سردار جعفری کہتے ہیں،

دیکھنا میگھ کا وہ شاہسوار آ پہنچا
گونج اٹھے کوہ و دمن، گونج اٹھے دشت و جہاں
بجلی لہراتی ہے شعلوں کا سنہری پرچم
ابر کے فیل پہ بارش کا شہنشاہ سوار
گھر سے سب اس کے سواگت کو نکل آئے ہیں
غول عشاق کے، بدمست حسینوں کی قطار

باقی صفحہ ۲۹ پر

م.ک. مہتاب

بدصورت

وہ اپنی سیٹ پر نہیں تھی۔ لنچ کا وقفہ تھا شاید لنچ کرنے چلی گئی ہوگی۔ میں ہی قبل از وقت آگیا تھا۔ گھڑی دیکھی ابھی لنچ کا وقفہ ختم ہونے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ وقت گزارنے کے لیے ادھر اُدھر جھانکنے لگا۔ اس کی میز پر ایک بڑا شیشہ رکھا تھا جس کے نیچے ایک سفید کاغذ پر کسی دانشور کا یہ قول لکھا تھا۔

"ہاتھی اور چیونٹی دونوں خدا کی مخلوق ہیں اگر ہم یہ اعتراض کریں کہ ہاتھی اتنا بڑا کیوں ہے اور چیونٹی اتنی چھوٹی کیوں ہے تو یہ خدا کی عیب جوئی کے برابر ہے۔"

میں اس قول سے بہت متاثر ہوا۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے ہم اس میں خواہ مخواہ اپنی پسند ناپسند کو شامل کرتے رہتے ہیں اور پریشان ہوتے ہیں۔ یہ قول ضرور اس لڑکی کو پسند ہوگا اور میرے اندازے کے مطابق وہ ایک شاکر اور صابر قسم کی لڑکی ہوگی۔

کچھ دیر بعد وہ لوٹ آئی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کا ڈبہ تھا جو اس نے میز پر رکھ دیا اور مجھ سے پوچھا "کیا آپ میرا انتظار کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں! میرا نام سریش کھنہ ہے۔ میرا فائل آپ کے پاس آیا ہوا ہے اور مجھے سرٹی فیکٹ کی ضرورت ہے کہ میرے ذمہ کوئی ٹیکس واجب الادا نہیں ہے۔"

"تشریف رکھیے! میں ابھی دیکھ کر بتاتی ہوں۔" اس نے پانی کا گلاس مجھے پیش کرتے ہوئے کہا۔

دائیں جانب رکھے فائلوں میں سے کچھ فائل نکال کر دیکھنے لگی۔ پھر میز کی دراز میں سے دو گلاس نکالے اور اپنے تھرموس میں سے چائے گلاسوں میں ڈال دی۔ ایک گلاس مجھے پیش کیا اور دوسرے میں سے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے میرا فائل پڑھنے لگی۔

میں اس کی خوش اخلاقی سے بہت متاثر ہوا کیوں کہ ٹیکس وصول کرنے والے دفاتر کے بارے میں تو عام کہاوت ہے کہ وہاں کوئی آپ کی جانب کسی حسنِ طلب کے کوئی دیکھتا بھی نہیں۔

"کھنہ صاحب! افسوس ہے کہ آپ کی درخواست رد ہوگئی ہے کیوں کہ آپ نے فارموں میں پوری معلومات ہی درج نہیں کیں۔"

"لیکن مجھے تو انگلینڈ جانا ہے۔ میں نے ٹکٹ خرید لیا ہے "کوئی اعتراض نہ ہونے" کے سرٹی فیکٹ کے بغیر میں ملک سے باہر نہیں جاسکتا۔ میرا وہاں سخت نقصان ہو رہا ہے۔ پھر یہ کیسے ہوگا؟" میں پریشانی کی حالت میں کھڑا میڈم سے پوچھ رہا تھا۔

لیکن اس نے اپنا سکونِ خاطر نہیں کھویا۔ بڑے اطمینان سے بیٹھی رہی۔ میں نے سوچا کہ بنا کچھ لیے دیے یہاں کام نہیں بنے گا۔ لیکن اس نے مجھے اطمینان دلایا اور کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ فارم لیجیے اور ایک بار پھر دیکھیے اور جو معلومات رہ گئیں تھیں وہ سب پُر کر دیجیے۔ اس کے بعد میں دیکھوں گی کہ آپ کا کام جلد ہو جائے۔"

میں نے فارم پُر کر کے اسے دے دیے۔ ان نامساعد حالات میں وہ عورت مجھے رحم کی دیوی دکھائی دے رہی تھی جس نے میری پریشانی کا اندازہ لگاتے ہوئے مجھ پہ یہ مہربانی کی تھی۔ ورنہ مجھے ٹکٹ منسوخ کرانا پڑتا۔ اس نے مجھے ایک دن بعد آنے کے لیے کہا۔

یہ عورت جسے میں نے اپنی پریشانیوں کے سبب پہلے دن غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ سر جھکائے کام کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کیا اور مجھے کرسی پر بیٹھ جانے کے لیے کہا اور پھر کام کرنے لگی۔ وہ مٹیالے سے رنگ کی تھی۔ خد و خال بھی نمایاں نوعیت کے نہیں تھے۔ ایک سیدھی سادی سی ہندوستانی عورت۔ نہ آنکھیں دلکش نہ ادائیں مستانہ ہاں اپنی کرسی پر بیٹھی کام کرتی ہوئی کچھ موزوں ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے عرض کیا "میڈم آپ نے مجھے آنے کے لیے کہا تھا" "ہاں! لیکن ابھی تک آپ کا فائل اندر سے واپس نہیں آیا۔ میں پتا کرواتی ہوں۔"

اس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا اور اس سے کہا کہ فلاں نمبر کا فائل صاحب کے کمرے میں سے لے آیئے اگر اس پر دستخط ہو گئے ہوں۔"

چپراسی نے لوٹ کر بتایا کہ صاحب تو لنچ کے بعد لوٹے ہی نہیں سب فائل بنا دستخط ان کے کمرے میں ہی رکھے ہیں۔ یہ خبر سن کر مجھے پسینہ آگیا۔ اگلے دو روز چھٹی تھی اور سوموار کو میری فلائٹ تھی۔ اب جانا ناممکن تھا۔ لورپول میں میرے کاروبار پر کیا بیتے گی یہ تو اب خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں مایوس ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا اور ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"م... میڈم اب سرٹی فیکٹ ملنے کی کوئی امید ہے؟"

"کھنہ صاحب انسان کو امید کا دامن نہیں

۱۸/۸، بھیم وہار، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۶۳

یوجنا، نئی دہلی

چھوڑنا چاہیے۔ خدا کارساز ہے۔ ہوسکتا ہے کہ صاحب شام کو کام کرنے کے لیے لوٹ آئیں ورنہ ہمیں کل بھی کام نپٹانے کے لیے دفتر آنا ہے۔ اگر ممکن ہوا تو میں فائل پر دستخط کروالوں گی اور آپ کا سرٹی فیکٹ بنوادوں گی۔ آپ میرے گھر سے آکر لے جائیں۔"

"آپ کی رہائش کہاں ہے" میں تشکر کے لہجے میں پوچھا اس نے اپنا تعارفی کارڈ دراز میں سے نکال کر مجھے دے دیا۔ جس میں اس کا نام رجنی شرما اور گول مارکیٹ میں گھر کا پتہ درج تھا

میں اتوار دس بجے ہی رجنی کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ مجھے پانی کا گلاس دینے کے بعد ملازمہ کو آواز دی کہ وہ میرے لیے چائے لے آئے۔ خود شاید فائل لینے کے لیے اندر چلی گئی۔ میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کی سرکاری ملازم ہے؟ نہ کہیں غرور نہ تنک مزاجی نہ غصہ نہ برہمی۔ کیا برف کی سِل جیسا مزاج ہے جس میں کہیں کوئی چنگاری دکھائی نہیں دیتی۔

"کھنہ جی یہ لیجیے اپنا سرٹی فیکٹ۔ میں کل بنوا کر ہی لائی تھی۔ آپ خواہ مخواہ مایوس ہو رہے تھے میں نے کہا تھا نا کہ خدا کارساز ہے اس پر بھروسہ رکھنا چاہیے" رجنی نے لفافہ میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

میں اپنے ساتھ ایک ڈبہ لے گیا تھا وہ میں نے رجنی کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔

"اسے رکھ لیجیے۔"

"یہ کیا ہے؟"

"بچوں کے لیے کچھ چاکلیٹ اور ٹافیاں وغیرہ ہیں۔"

"لیکن بچے تو میرے ہیں ہی نہیں۔"

"کیوں؟" میں حیرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"کیوں کہ میں نے شادی ہی نہیں کی۔"

مجھے کوئی بات ہی نہیں سوجھ رہی تھی جو میں رجنی سے کہتا۔ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"میڈم یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کوئی مجھ سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا اور میں کسی کے گلے پڑنا نہیں چاہتی تھی۔"

رجنی قدرے مایوس ہو کر صوفے میں بیٹھ گئی ملازمہ چائے لے آئی۔

"آپ سرکاری ملازمہ ہیں۔ گھر بار بھی اچھا دکھائی دے رہا ہے۔ آپ کو ایسی بات کہنی نہیں چاہیے۔" میں نے رجنی کی ذات میں قدرے اور دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں کھنہ صاحب لیکن شاید آپ کو آج کے دور کا علم نہیں ہے۔ لوگ گلیمر گرل چاہتے ہیں جس کی نمائش وہ لوگوں کے سامنے کر سکیں انھیں بیوی کی نہیں عورت کی ضرورت ہے۔ میرے والدین کو دو تین جگہ بات چیت میں ناکامی کے بعد۔ ایک رشتہ دار عورت نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ایسی بدصورت لڑکی کو اٹھانے کے لیے تو ساتھ پانچ سات لاکھ روپیہ رکھنا ہوگا۔ مجھے اس بات سے سخت صدمہ ہوا تھا میں نے اپنی شکل خود نہیں بنائی خدا کی دین ہے۔ اگر میں نمائش میں رکھنے کے قابل کی چیز نہیں ہوں تو یہ میرا نہیں بنانے والے کا قصور ہے۔ اس کے لیے ہم سے پانچ چار لاکھ کا تقاضا کیوں۔ میں والدین کو مقروض یا زیر بار کر کے کسی کے گھر نہیں جانا چاہتی تھی اور میں نے منفی ڈھنگ سے سوچنا شروع کر دیا کہ کیا شادی کرنا ضروری ہے؟ میرے پاس وہ سب کچھ ہے جس سے ایک عورت اطمینان سے زندگی بسر کر سکتی ہے، پھر میں کسی ایسے شخص کا احسان کیوں اٹھاؤں جسے میری تنخواہ کا لالچ ہو یا جو ایک عورت کو قبول کرنے کے لیے ساتھ ایک موٹی رقم کا تقاضا کر رہا ہو۔ ایسے شخص کو میری تنخواہ کا لالچ ہو سکتا ہے میرے جہیز میں دلچسپی ہو سکتی ہے یا زیادہ سے زیادہ میرے جسم سے واسطہ ہو سکتا ہے وہ مجھے کبھی پیار نہیں کرے گا۔ عمر بھر مجھ پہ احسان جتاتا رہے گا کہ اس نے ایک واجبی سی شکل و صورت کی لڑکی سے شادی کی جب کہ اس "منڈی" میں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود تھی۔

شادی کے بازار میں لڑکے ملتے تو نہیں تھے یہ بات نہیں کہی جا سکتی لیکن میرے والد اپنی تعلیم یافتہ سلیقہ مند اور ہر لحاظ سے سگھڑ لڑکی کی رسی کسی عام شخص کے ہاتھ میں نہیں تھما دینا چاہتے تھے جو میرے نام پر ہمیشہ ان کو بلیک میل کرتا رہے یا جس کی شخصیت میرے مقابلے میں کم تر ہو۔

میں خود سمجھتی تھی کہ مجھے کس قسم کا شوہر چاہیے میں ہر کسی کے ساتھ صرف اس لیے جانے کے لیے تیار نہیں تھی کہ وہ مرد ہے اور میں عورت ہوں اور ہمارے سماج میں مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔

"لیکن"

"لیکن کی بات نہیں کھنہ صاحب" رجنی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"زمانہ اب بدل گیا ہے۔ سماج میں عورت کو برابر کا حق ملتا جا رہا ہے۔ اب عورت مرد کا صافہ پکڑ کر اس کے پیچھے پیچھے نہیں چلتی۔ زندگی کا کون سا شعبہ ہے جس میں عورت مرد سے پیچھے ہے۔ ہمارے ہی دفتر میں کتنے ہی مرد لوگ خواتین افسروں کے تحت کام کرتے ہیں۔ فائلیں اٹھائے ایک ایک گھنٹہ ان کی حضوری میں کھڑے رہتے ہیں۔ پھر بھی بیاہ شادی کے معاملے میں مرد کو یہ بالادستی کیوں حاصل ہے کہ وہ جس عورت کو چاہے خوبصورت کہہ دے اور جسے چاہے بدصورت کہہ کر دھتکار دے اُسے اپنے گھر لے جانے کے لیے معاوضہ طلب کرے۔ اب وہ روزی کمانے میں بھی اس کا ہاتھ بٹا رہی ہے اس کی روٹیوں کی محتاج نہیں ہے پھر اسے اس طرح بے عزت کیوں کیا جاتا ہے؟

"رجنی جی سماج کا کچھ چلن ہی ایسا ہے" میں نے کہا "یہ چلن بھی تو مرد ذات کی پیداوار ہے۔ آپ کو اس کاغذ کی ضرورت تھی تو آپ چار دن سے میرے دفتر کے چکر لگا رہے ہیں آپ نے میری شکل کو نہیں دیکھا یہ نہیں سوچا کہ میں خوبصورت ہوں یا نہیں۔ آپ صرف میری مروّت، ہمدردی اور سلوک کو دیکھا ہوگا۔ اس لیے مرد ذات صرف عورت کی جلد کی خوب صورتی کو ہی کیوں دیکھتی ہے کھال کے نیچے جو خوبیاں ہیں ان کی جانب کیوں نہیں جھانکتی؟

"لیکن شادی بھی تو ایک ضرورت ہے؟"

"ہاں جسم کے کچھ تقاضے ضرور ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ سرد پڑتے جاتے ہیں۔ ان تقاضوں کے تحت زندگی کو تو کسی بھٹی میں نہیں جھونکا جا سکتا اگر دنیا کی دیگر دلچسپیوں کی جانب توجہ دی جائے تو وقت اڑنے لگتا ہے ذہن بہت کچھ اور سوچنے لگتا ہے۔"

"آپ ایک پیالہ اور چائے لیجیے میری باتوں سے آپ ضرور بور ہو گئے ہوں گے۔ ہاں آپ یہ اپنے چاکلیٹ بھی لیجائیے۔

"نہیں نہیں۔ آپ نے اتنی خوب صورت باتیں کی ہیں کہ مجھے وقت کا احساس ہی نہیں ہوا اور یہ چاکلیٹ میری جانب سے اس بچپن کے خلوص کو دے دیں جو آپ کے لب و لہجہ سے مجھے جھانک رہا تھا۔ ●

خودشناسی

ساحل احمد

شام
چھو رہی تھی سرحد کو
راستوں میں بکھرے تھے
رنج و غم کے ریزے بھی
چن رہا تھا جن کو میں
زرد زرد پلکوں سے

دھوپ کی ہدایت پر
روز ہی کہانی میں
میں یہ ریزے لاتا ہوں
بھر کے اپنے دامن میں
بھر کے اپنی آنکھوں میں
ان کو بانٹ دیتا ہوں
طفل شیر خواروں میں

شام روز چھوتی ہے
بڑھ کے اپنی سرحد کو
وقت کی کسوٹی پر
خود کو آزماتی ہے
اس کی خودشناسی ہے!

گاؤں کی جانب چلو

بیدل سرحدی

گاؤں ہوتے ہیں وطن کی آبرو اور بانکپن — گاؤں زندہ ہیں تو رکھو یاد زندہ ہے وطن
ہوں نہ جس میں پھول اس کو کون کہتا ہے چمن — دل ہی کیا جس میں تمنا ہو نہ ہو کوئی لگن
وقت کہتا ہے اٹھو اور گاؤں کی جانب چلو
مسکراتی گیت گاتی چھاؤں کی جانب چلو

جائزہ لو جا کے کیا ہیں گاؤں میں دشواریاں — ان کا حل ڈھونڈو مہیا تم کرو آسانیاں
صاف ستھری ہوں کشادہ ہوں سبھی آبادیاں — ہر سہولت ہو انھیں جینے کی ہوں آزادیاں
وقت کہتا ہے اٹھو اور گاؤں کی جانب چلو
مسکراتی گیت گاتی چھاؤں کی جانب چلو

بینک سے کچھ قرض لینے میں مدد ان کی کرو — ان کے دامن میں خوشی کے پھول چن چن کر بھرو
سر اٹھا کر تم چلو ان سے کہو تم مت ڈرو — کامرانی کی طرف مل کر قدم آگے دھرو
وقت کہتا ہے اٹھو اور گاؤں کی جانب چلو
مسکراتی گیت گاتی چھاؤں کی جانب چلو

کچھ کرو تعلیم کا بچوں کی بہتر انتظام — تندرستی کے لیے ان کی کرو کچھ اہتمام
گاؤں بن جائیں ہمارے پھر مسرت کا مقام — شادمانی گائے بیدل کونے کونے صبح و شام
وقت کہتا ہے اٹھو اور گاؤں کی جانب چلو
مسکراتی گیت گاتی چھاؤں کی جانب چلو

ہیڈ ڈپارٹمنٹ آف اردو۔ ایونگ کرسچن کالج۔ الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

نگہبان شعبۂ اشاعت سنت نرنکاری منڈل، سنت نرنکاری کالونی، دھلی ۱۱۰۰۰۹

غزل

نثار جیراجپوری

جو قوم میں اک صدی گھایل رہی ہیں
وہ اپنے پاؤں پہ اب چل رہی ہیں

ہماری چاہتوں کے آسماں پہ
تری زلفیں کبھی بادل رہی ہیں

تھا اک دن وہ زمانہ جب گھٹائیں
تمہاری آنکھ کا کاجل رہی ہیں

گھٹاؤں کا جو رستہ دیکھتی ہیں
کبھی یہ ندیاں جل تھل رہی ہیں

جلانے آئی ہیں جو گھر کو میرے
مری پرچھائیاں وہ کل رہی ہیں

اٹھائے کاندھے پہ شب کا جنازہ
ہوائیں رفتہ رفتہ چل رہی ہیں

ڈپارٹمنٹ آف کامرس۔ شبلی نیشنل پی۔جی کالج۔ اعظم گڑھ ۲۷۶۰۰۱

غزل

کیفی بلگرامی

وحشت میں کر کے چاک گریباں کبھی کبھی
دیکھیں گے ان کو ہم بھی پریشاں کبھی کبھی

کیا کیجیے کہ ترکِ تمنا کے بعد بھی
آتی ہے یاد زلفِ پریشاں کبھی کبھی

اہلِ جنوں مناتے ہیں کس حوصلے کے ساتھ
دورِ خزاں میں جشنِ بہاراں کبھی کبھی

اب دل میں وہ خلش کہاں وہ سوزِ غم کہاں
ہوتا تھا جن سے درد کا درماں کبھی کبھی

فصلِ بہار و یادِ گل و گلستاں کے ساتھ
بہتر ہے ذکرِ خارِ بیاباں کبھی کبھی

یہ سوز بن نہ جائے کہیں مستقل خلش
کرتے رہو نوازشِ پنہاں کبھی کبھی

کیفی نظامِ گلشنِ ہستی سنوارنے
آتے ہیں وہ بہار بداماں کبھی کبھی

۲۲۴ بہزا سوداگر مشرقی ہردوئی۔ ۲۴۱۰۰۱

غزل

انور تاباں (علیگ)

یہی غم روز و شب کھاتا ہے مجھ کو
کہ اب تک کچھ نہیں آتا ہے مجھ کو

زمیں پر لفظ بے معنی ہوں شاید
جو آتا ہے مٹا جاتا ہے مجھ کو

مسافر ہوں۔ مگر بے راہ و رہبر
کوئی رہ پر نہیں لاتا ہے مجھ کو

ہوں کیا میں ایک تحریرِ شکستہ
کہ ہر اک پڑھ نہیں پاتا ہے مجھ کو

نئے سورج اُگاتا پھر رہا ہوں
اُجالا پھر نہیں بھاتا ہے مجھ کو

بسا اوقات تاباں سوچتا ہوں
غزل گوئی کا فن آتا ہے مجھ کو؟

۱۰۷/۴ منڈی اسٹریٹ، سہارنپور (یو۔پی)

تبصرے

نام کتاب :	اردو ادب کی تاریخ مع حواشی و تعلیقات
مصنف (انگریزی) :	ٹی گراہم بیلی
مترجم و مرتب :	سید محمد عصیم
صفحات :	۲۰۸
قیمت :	۲۰ روپے
تقسیم کار :	۱۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس گلی وکیل والی، کوچہ پنڈت دہلی ۶ ۲۔ سیمانت پرکاشن، کوچہ روح اللہ خان دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲
مبصر :	طاہر اسلم

سید محمد عصیم صاحب کی پہلی کتاب "پریم چند کا فنی و فکری مطالعہ" تھی "اردو ادب کی تاریخ مع حواشی و تعلیقات" ان کی دوسری پیشکش ہے۔ جو دراصل "ٹی گراہم بیلی" کی انگریزی میں لکھی گئی کتاب "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر" کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اردو والوں پر بیلی جیسے مصنفین کا بہت احسان ہے جنھوں نے انتہائی ایمانداری، محنت اور تحقیق سے ایسی کتابیں تحریر کیں جو آج ہمارے لیے بیش بہا خزانے سے کم نہیں۔

انگریزی پر دسترس رکھنے والے اردو داں، محققین اور شائقین و مورخین اردو ادب تو بیلی کی کتاب سے فیض یاب بھی ہوتے رہے ہیں اور اس کی اہمیت سے بخوبی واقف بھی ہیں مگر انگریزی نہ جاننے والے متذکرہ بالا اردو داں حضرات کی پہنچ اس کتاب تک نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسے لوگوں کی کثیر تعداد کے لیے ضروری تھا کہ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا جائے جو اب تک نہ ہو سکا تھا۔

دوسری اہم وجہ جیسے عصیم صاحب نے بجا طور پر محسوس کیا ہے کہ دورِ حاضر میں بیلی جیسے مستشرق مصنفین کی زیادہ سے زیادہ کتابوں کو سامنے لانے اور ان کے ترجمے کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ایسے غیر زبان مصنفین کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو آج نہیں بلکہ بہت پہلے ایک عالمی زبان بن چکی تھی۔

ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہیں، بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ ترجمے کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ دونوں زبانوں پر مکمل قدرت حاصل نہ ہو۔ ترجمے کی ایک بڑی صفت یہ ہے کہ وہ ترجمہ نہ ہو کر اصل معلوم دے، یہ دونوں صفات اس کتاب میں بدرجہ اتم موجود ہیں، ایمان کی تو یہ ہے کہ اگر ٹائٹل سمیت پہلے سولہ صفحات نکال کر کسی اردو داں قاری کو یہ کتاب دے دی جائے تو بعد از مطالعہ جب تک اسے بتایا نہ جائے وہ اس کتاب کو ترجمہ شدہ کتاب نہیں کہے گا۔

یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل اردو کی چھ سو سالہ تاریخ کی مستند دستاویز ہے۔ پہلے باب میں "اردو کے آغاز اور لفظ" پر بحث دوسرے باب میں ادبی و مذہبی حضرات کا گراں قدر تذکرہ، تیسرے باب میں دہلی شاعری کی پہلی صدی اور ۳۶ گراں مایہ شعرا، چوتھے باب میں انیسوی صدی کے شعرائے لکھنؤ، پانچویں باب میں، ذوق، غالب، مومن، تسکین و شیفتہ وغیرہ کے ساتھ دربارِ رامپور کے شاعروں کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام، چھٹے باب میں اردو نثر اور نثر نگار مثلاً بندہ گیسو دراز، شاہ میراں جی، ملا وجہی، میر جعفر زٹلی، فضل محمد، محمد حسین آزاد، سودا، مولوی محمد اسماعیل، شاہ رفیع الدین و شاہ عبدالقادر محدث دہلوی، رشک، فیض آبادی، مرزا جان طپش، انشا، غالب، امام شہید، رام چندر، شبلی، مولوی نذیر احمد، سرشار، امام بخش صہبائی، وحید الدین سلیم وغیرہ جیسے جلیل القدر عمرانِ اردو کے ستونوں کی نگارشات، اسلوبِ تحریر اور اردو کے تئیں ان کی خدمات کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے قیام و خدمات کا ذکر کیا گیا ہے، ساتویں اور آٹھویں باب میں حالی، آزاد، شوق قدوائی، عظمت اللہ خاں دہلوی وغیرہ کا مختصر مگر پُر از معلومات ذکر اور زبان و ادب کی خامیوں پر ایک ایک تفصیلی جائزہ تحریر ہے۔ اس کتاب میں ایسے اساتذۂ فن کا ذکر بھی مرقوم ہے جن کے نام نامی اور کارہائے نمایاں سے عام قاری کو بہت کم واقفیت ہے۔ نیز دہلی، لکھنؤ، رامپور، اور دکن کے اس زمانے کے کچھ حالات و واقعات بھی اس کتاب میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔

اس زیورِ معلومات پر حواشی و تعلیقات نے مزید حسن کا اضافہ کیا ہے جس کے لیے عصیم صاحب بہر طور تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔

کتاب کا کاغذ، کتابت، طباعت اور ضخامت دیکھنے کے بعد جب کتاب کی قیمت پر نظر جاتی ہے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید عصیم صاحب کو منفعت کی حرص نہیں بلکہ ان کا مقصد اردو کی مستند تاریخ کو اردو عوام تک پہنچانا ہے۔ عصیم صاحب کو منفعت کی حرص نہ سہی مگر امید ہے کہ "ھل

"جزاء الاحسان الا الاحسان" کے مصداق قارئین کی جانب سے انھیں اس کوشش کا خاطر خواہ صلہ ملے گا۔

●

نام کتاب	:	بچوں کی رباعیاں
مصنف	:	عادل اسیر دہلوی
صفحات	:	۳۲
قیمت	:	۶؍روپے
ناشر	:	مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۳۵۲۔ چتلی قبر۔ دہلی ۶
مبصر	:	طاہر اسلم

بچوں کے لیے کچھ کہنے یا لکھنے کی دشواریوں کو ایک شاعر یا ادیب ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے آسمان پر چمکنے والے بہت سے لازوال ستارے بھی اپنی چند کرنوں سے بچوں کی دنیا کو منور نہیں کر سکے۔

فن شعر میں بچوں کے لیے رباعیاں کہنا وہ بھی نو عمری میں، واقعی مشکل کام ہے مگر "جسے اللہ دے" کے مصداق عادل اسیر کی فطری شاعرانہ صلاحیتوں نے ان کے لیے اس کام کو آسان بنا دیا ہے۔

عادل اسیر کی منظوم کتاب "بچوں کی رباعیاں" ادب اطفال میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، جس میں ۴۵ رباعیاں ہیں۔ ہر رباعی بچوں کے نصیحت اور اخلاق کا ایک نیا آبدار موتی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

حالاں کہ تمام رباعیاں آسان زبان میں کہنے کی کوشش کی گئی ہے مگر کہیں کہیں بہ مجبوری مشکل الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اگر ان چند مشکل الفاظ کے معنی بھی کتاب میں کہیں لکھ دیئے جاتے تو بچوں کے لیے مضامین کا سمجھنا آسان بھی ہو جاتا اور ان کی معلومات میں قدرے اضافہ بھی ہوتا۔

بطور نمونہ ایک رباعی ملاحظہ کریں ؎

اک دوست زمانے میں مثالی ہے کتاب
مخلوق میں ہر چیز سے عالی ہے کتاب
ہیں فیض کی باتیں تو ہزاروں عادل
ہر قسم کے نقصان سے خالی ہے کتاب

●

نام کتاب	:	ہمارے سائنس داں
مصنف	:	عادل اسیر
صفحات	:	۳۲
قیمت	:	۲۰؍روپے
ناشر	:	"ادارہ فکر جدید"۔ ۹۲۲ کوچہ روہیلا خاں دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲
مبصر	:	طاہر اسلم

زیر تبصرہ کتاب "ہمارے سائنس داں" میں مادر وطن ہندوستان کے چار مایہ ناز سائنس داں ڈاکٹر چندر شیکھر وینکٹ رمن، ڈاکٹر میگھ ناتھ ساہا، ڈاکٹر ہومی جہانگیر بھابھا اور آچاریہ جگدیش چندر بوس کے مختصر حالات زندگی کے ساتھ ان کی جائے پیدائش سے متعلق جغرافیائی حالات اور تاریخی واقعات بھی اجمالاً تحریر کیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں من گھڑت کہانیاں نہیں بلکہ تحقیق و تجسس کے ان متوالوں کے سچے واقعات تحریر ہیں جن کے نام سائنس کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور جن کی ایجادات و معلومات سے انسانی برادری ہمیشہ فیضیاب ہوتی رہے گی۔ اسی لیے اس کتاب کا مطالعہ بچوں میں جذبۂ حب الوطنی اور زندگی کے ہموار ناہموار حالات میں قوم و وطن ہی نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کی بھلائی کے لیے کوہ و دمن کار ہائے نمایاں انجام دینے کے لیے جد و جہد کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

ٹائٹل پر چاروں نامور سائنس دانوں کی چھوٹی قلمی تصاویر کے علاوہ کتاب کے اندر بڑی تصاویر نے کتاب کو اور زیادہ جاذب نظر بنا دیا ہے۔ کتابت لائق تعریف اور طباعت صاف ستھری ہے۔ سادہ اور سلیس زبان میں [illegible] پوری کتاب میں شاید ہی کہیں کوئی مشکل لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ بچے اس کتاب کو اپنے مطالعے میں رکھیں گے اور جادۂ جستجو کے ان کامیاب مسافروں کے حالات زندگی کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں گے۔

●

بقیہ : سالم علی۔ ماہر طیور

سالم علی نے ماحولیات جنگلات، جانوروں کی پناہ گاہیں، چڑیا خانوں اور کمیاب اور نایاب پرندوں، جانوروں کی حفاظت کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی۔ یہ بات آج برسوں بعد اچھی طرح سمجھ میں آ رہی ہے، جب جنگلات کم ہو رہے ہیں، قدرتی مخلوقات نایاب ہو رہی ہیں۔ اس وقت سالم علی کی باتوں کی یاد آتی ہے کیوں کہ وہ فطرت کے پرستار تھے اور دنیا میں فطرت کے کسی بھی حسن کو دنیا کی ضرورت سمجھتے تھے، خواہ وہ جنگل ہو یا پہاڑ، ندی ہو یا جھیل، پھول ہوں یا کانٹے۔ سبھوں کو وہ اس ارضی توازن کے لیے لازمی سمجھتے تھے۔

سالم علی کا مذہب حسن تھا۔ وہ کسی بھی فطرت سے محبت کرتے تھے۔ وہ کسی روایتی مذہب کے پابند نہ تھے۔ انھیں فطرت کے مطالعہ میں سادھو سنتوں، پیروں، فقیروں، بھکشوؤں، لاماؤں، پادریوں اور تجرد پسند لوگوں سے تبادلۂ خیال کے بعد بہت سی معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ انھیں سرکاری یا غیر سرکاری معاونت سے بھی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے دھن کے پکے تھے۔ وہ ہر کام اپنے شوق کی تکمیل کی خاطر کرتے تھے۔ علم طیور کے شعبہ میں ان کی خدمت بے پناہ ہیں جن کے صلے میں انھیں متعدد ملکی اور غیر ملکی انعامات و اعزازات ملے مختلف ملکوں کے اعزازی دورے کیے۔ تعلیمی اداروں میں لکچر دیے۔

انھیں نظریاتی باتوں پر یقین نہیں تھا۔ وہ ایک عملی انسان تھے۔ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے انتہائی محنت، مشاہدہ اور مطالعہ کے بعد لکھا ہے۔ اس طرح انھوں نے بے زبان چرند پرند کی زندگی کو زبان دے دی ہے۔ جس کے اعتراف میں انھیں متعدد یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں نے اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کی تمام کمائی بمبئی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کو بخش دی۔ انھیں پدم بھوشن اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ ان کے نام سے ملک میں اور بیرونی ملکوں میں بہت سے ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ ان کی یاد میں ہر سال ۱۲ نومبر کو پرندوں کا دن جنم دن منایا جاتا ہے۔

جیم کاربیٹ کا نام مویشیوں کے تحفظ کے لیے جس طرح مشہور ہے۔ سالم علی اسی طرح پرندوں کی شناخت اور حفاظت کے لیے مشہور رہیں گے اور جب بھی ماحولیات کے تحفظ کی بات چلے گی، سالم علی کے ذکر کے بغیر بات مکمل نہ ہوگی کیوں کہ انھیں پتا تھا۔

صبح کو طائران خوش الحان
پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

●

بڑھتے قدم...

(ترقیاتی خبرنامہ)

اقلیتوں کے لیے یکساں مواقع

اقلیتوں کی بہبود نیز انھیں جان و مال کا تحفظ فراہم کرنے کے سلسلے میں حکومت کے عزم مصمم کا اظہار ان اقدامات سے بخوبی ہوتا ہے جو اس نے اقلیتوں کو قومی دھارے میں شامل کرنے اور انھیں اس قابل بنانے کے سلسلے میں کیے ہیں کہ وہ ملک کی تعمیر کے کام میں مساوی ساجھے دار بن سکیں۔ اس سلسلے میں چراغ راہ اقلیتوں کی بہبود کا وہ ۱۵ نکاتی پروگرام ہے جو مئی ۱۹۸۳ء میں وضع کیا گیا تھا۔

اس پروگرام کے اہم مقاصد ہیں:۔ اقلیتوں کو جان و مال کا تحفظ فراہم کرنا، روزگار کے سلسلے میں اقلیتوں کو خصوصی اہمیت دینا، ترقیاتی پروگرموں میں امتیاز نہیں کرنا اور مالی فوائد بہم پہنچانا۔

اقلیتوں کی اکثریت والے ۴۱ اضلاع میں ۱۵ نکاتی پروگرام کے عمل درآمد پر خصوصی توجہ مرکوز کی جارہی ہے۔ اس پروگرام سے ملک کی کل اقلیتی آبادی کے تقریباً ۳۰ فی صد حصے کو مستفید کیا جارہا ہے۔ حکومت جلد ہی ان اضلاع کی تعداد بڑھا کر تقریباً ۱۲۴ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس طرح اس ہر ایک ضلع کو مذکورہ پروگرام سے مستفید کیا جائے گا، جہاں ۲۰ فی صد یا اس سے زیادہ اقلیتی آبادی ہے۔ اس پروگرام پر تمام ریاستوں اور مرکزی انتظام کے تمام علاقوں میں عمل درآمد کیا جارہا ہے نیز مرکزی، ریاستی اور ضلعی سطحوں پر اس پروگرام پر عمل درآمد کے کام کی نگرانی کی جاتی ہے۔

تعلیم اور پروگرام عمل کے بارے میں قومی پالیسی ۱۹۹۲ء میں اقلیتی اکثریت والے علاقوں میں تعلیمی ادارے قائم کرنے، اساتذہ کے تقرر، تدریسی اور سماعتی سازو سامان اور سہولیات، طلبا کے لیے یونیفارم، وظائف دوپہر میں کھانے وغیرہ جیسی ترغیبات کا اہتمام کیا گیا ہے۔

اقلیتی اکثریت والے اضلاع میں تعلیمی سہولیات فراہم کرنے کی غرض سے علاقے پر مبنی پروگرام ۹۴-۱۹۹۳ء میں شروع کیا گیا تھا۔ پہلے یہ اسکیم اقلیتی اکثریت والے ۴۱ اضلاع تک ہی محدود تھی۔ اب اس اسکیم کو ۱۳ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے ۳ علاقوں کے ۳۳۱ بلاکوں میں لاگو کر دیا گیا ہے، جہاں تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اقلیتوں کی اکثریت ہے۔ اب تک اس اسکیم کے تحت ۵۷ر۴ کروڑ روپے کی رقم گرانٹ کے طور پر جاری کی جاچکی ہے۔

کمزور طبقوں اور اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھنے والے امیدواروں کو مختلف مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے تیار کرنے کی غرض سے بہبود کی وزارت نے ۹۳-۹۲ء ۱۹ سے ان امیدواروں کے لیے امتحان سے قبل کوچنگ کی اسکیم شروع کی ہے۔ یہ ایک منصوبہ جاتی اسکیم ہے جس کے لیے بجٹ میں ۱۰ کروڑ روپے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ حکومت منتخبہ اداروں کو سو فی صد مالی امداد فراہم کرتی ہے۔ اس اسکیم کے تحت اب تک ۲۵۰۰۰ امیدواروں کو کوچنگ فراہم کی جاچکی ہے۔

۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران حکومت نے مولانا آزاد تعلیمی فاؤنڈیشن کو ۰۱ر۲۵ کروڑ روپے کی گرانٹ دی ہے تاکہ سماج کے تعلیمی لحاظ سے پسماندہ طبقوں، خاص طور سے اقلیتوں، پسماندہ طبقوں اور عام طور سے دیگر طبقوں میں تعلیم کو فروغ دیا جائے، کم خواندگی والے علاقوں، ترجیحاً گندی بستیوں اور دیہی علاقوں میں (غیر سرکاری تنظیموں کے ذریعے) لڑکیوں کے لیے ۲۰ رہائشی اسکول قائم کیے جائیں، مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات اور خدمات کے بارے میں تحقیق کرنے کی غرض سے ۶ چیئرز۔ ۳ بھارتی یونیورسٹیوں میں اور ۳ غیر ملکی یونیورسٹیوں میں قائم کی جائیں اور ۱۵ لاکھ روپے کا انعام قائم کیا جائے، جو افراد میں بھائی چارے اور ملکوں میں امن و امان کو فروغ دینے کے سلسلے میں قابل تعریف کام کے لیے کسی ممتاز شخص کو دیا جائے گا۔

رضا کارانہ بنیاد پر سائنس، سماجی مطالعات اور زبانوں کی تعلیم کا سلسلہ شروع کرنے کی غرض سے مدرسوں اور مکتبوں کی جدید کاری کے سلسلے میں مالی امداد فراہم کرنے کی اسکیم ۹۴-۱۹۹۳ء میں شروع کی گئی تھی۔

اقلیتوں میں روزگار کو فروغ دینے کی اسکیموں کے تحت اقلیتی اکثریت والے ۱۹ اضلاع میں آئی ٹی آئی کو بہتر اور جدید بنایا گیا ہے تاکہ اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھنے والے دست کاروں کو تربیت فراہم کی جائے۔ تمام ۴۱ اقلیتی اضلاع میں کمیونٹی پولی ٹیکنکس کی اسکیم لاگو کی گئی ہے۔

پولیس، قومیائے گئے بینکوں، سرکاری دائرہ کار کے اداروں وغیرہ میں ملازمت کے سلسلے میں اقلیتوں کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ انتخاب کرنے والی کمیٹیوں میں اقلیتوں کا ایک نمائندہ ہوتا ہے تاکہ انتخاب کے عمل میں بھروسہ پیدا کیا جائے۔

اقلیتوں کے لیے قومی کمیشن کو قانونی درجہ دیا گیا ہے اور ۱۹۹۲ء میں اس کے دائرہ کار میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کمیشن کو گواہوں کو طلب کرنے اور دستاویزات پیش کرنے کے سلسلے میں دیوانی عدالت کے اختیارات دیے گئے ہیں تاکہ اس کو مزید موثر بنایا جائے۔

اقلیتوں کے لیے قومی ترقیاتی اور مالی کارپوریشن

۵۰۰ کروڑ روپے کے منظور شدہ سرمایہ حصص سے ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ء کو قائم کی گئی تھی تاکہ پیشہ ورانہ گروپوں اور خواتین کو ترجیح دیتے ہوئے اقلیتوں میں کمزور طبقوں کے لیے اقتصادی اور ترقیاتی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے۔ حکومت ۵۰ کروڑ روپے کی رقم پہلے ہی جاری کر چکی ہے اور ریاستوں کے حصے کا انتظار ہے۔ مذکورہ کارپوریشن ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء تک ۴۵۶۰ پروجیکٹوں کے لیے قرضوں کی منظوری دے چکی ہے اور ۳۰،۰۳ کروڑ روپے کی رقم تقسیم کر چکی ہے۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے قومی فاؤنڈیشن فسادات سے متاثرہ بچوں کی باز آبادکاری کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ یہ فاؤنڈیشن اب تک ایسے ۹۱۶ بچوں کو مالی امداد دے چکی ہے جو مختلف فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں نادار ہو گئے ہیں۔

حکومت نے سریع الحرکت فورس (ریپڈ ایکشن فورس) قائم کی ہے جس کے ذمہ فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پانے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ یہ فورس اس مقصد کے لیے خاص طور سے تربیت یافتہ اور مسلح ہے اور اس میں اقلیتوں کے نمائندے شامل ہیں۔

وقف قانون کو مزید موثر بنانے نیز وقف بورڈوں کے بہتر انتظام کو یقینی بنانے کے لیے پارلیمنٹ نے بجٹ اجلاس کے دوران ایک جامع بل منظور کیا ہے۔ یہ نیا بل اوقاف کے سلسلے میں موجودہ قوانین یعنی وقف قانون، ۱۹۵۴ء اور وقف ترمیمی قانون، ۱۹۸۴ء کی جگہ لایا گیا ہے۔ ●

قومی رہنماؤں پر فلمیں

حکومت نے سر رچرڈ ایٹن بورو کے ذریعے گاندھی جی پر فلم کی تیاری کے لیے نیشنل فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے توسط سے ۶ کروڑ ۳۶ لاکھ روپے کی مالی امداد فراہم کی ہے۔ جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کی تشکیلی عمر پر مبنی ایک فلم "میکنگ آف اے مہاتما" بنانے کی تجویز ہے۔ یہ کام جنوبی افریقہ کی براڈکاسٹنگ کارپوریشن اور نیشنل فلم ڈویلپمنٹ کارپوریشن کے اشتراک عمل سے انجام پائے گا۔ اس پر مجموعی طور سے ۴ کروڑ روپے کے اخراجات کا اندازہ ہے، جس میں ہندوستان کا حصہ ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے رہے گا۔

سردار پٹیل پر فلم کی تیاری کے لیے مالی امداد دینے کے سلسلے میں کوئی بھی درخواست نہ تو حکومت کو اور نہ ہی مذکورہ کارپوریشن کو موصول ہوئی ہے۔ لیکن سردار پٹیل پر حال ہی میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے متعلق فلموں کی فاؤنڈیشن نے تیار کی ہے۔

حکومت ہند کا فلمز ڈویژن وقتاً فوقتاً مختلف قومی رہنماؤں پر فلمیں تیار کرتا ہے۔ ●

ریلوے میں ٹکٹ چھاپنے والی خودکار مشین

ریلوے نے ۹۶-۱۹۹۵ء میں ۵۵۰ مائکرو پراسیسر پر مبنی ٹکٹ چھاپنے والی خودکار مشین تمام اہم اسٹیشنوں پر لگانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ تمام مسافروں کو ٹکٹوں کی فروخت کو یقینی بنایا جا سکے اور ٹکٹوں کے عدم اجرا سے ہونے والے نقصانات سے ریلوے کو بچایا جا سکے۔ یہ سہولت لمبے سفر اور مختصر سے سفر دونوں کے لیے ہوگی۔ اس سے مضافاتی مسافر بھی فائدہ اٹھا سکیں گے۔

مارچ ۱۹۹۵ء تک اس طرح کی ۲۲۵ مشینیں لگائی جا چکی ہیں۔ ان میں ۱۴ مشینیں سینٹرل ریلوے میں ۱۸ مشرقی ریلوے میں، ۱۰۸ شمالی ریلوے میں ۵۴ جنوبی ریلوے میں، ۹ جنوب مشرقی ریلوے میں اور ۲۲ مغربی ریلوے میں لگائی گئیں ہیں۔

جن اسٹیشنوں پر بغیر ریزرویشن والے ٹکٹوں کی بھاری فروخت ہے ان پر مشین لگانے کے لیے وزارت ریلوے نے تمام علاقائی ریلوے کے جنرل منیجروں کو ہدایت کر دی ہے۔ اس سے ٹکٹ جلد ملتا ہے، لمبی قطار میں کھڑا نہیں ہونا پڑتا، مضافاتی سفر، طویل اور مختصر فاصلے کے سفر کرنے والے لوگوں نے اس سہولت کو بے حد سراہا ہے۔ ●

دیہی برق کاری

آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے دوران ملک میں ۱۰۰۰۰ دور دراز گاؤں سمیت ۵۰۰۰۰ گاؤوں کی برق کاری کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ یہ کام توانائی کے غیر روایتی ذرائع سے انجام دیا جائے گا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء کے مطابق ۸۴،۵۰۰ گاؤوں میں برق کاری کا کام کیا جانا باقی ہے۔

بجلی سے متعلق ۱۴ ویں سروے کی رپورٹ کے مطابق ۹۵-۱۹۹۴ء تک پمپ سیٹوں اور ٹیوب ویلوں کے لیے نیز لفٹ آب پاشی کے لیے ۶۵۵۵۰ ایم کے ڈبلیو ایچ بجلی کی ضرورت تھی۔

بقیہ غیر برق کاری شدہ بیشتر گاؤں دور دراز، ناقابل رسائی اور دشوار علاقوں میں واقع ہیں، جن کی برق کاری کے لیے بہت زیادہ سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔ ریاستی حکومتوں اور ریاستی بجلی بورڈوں سے کہا گیا ہے کہ وہ بقیہ گاؤوں کی برق کاری کے کام کی تکمیل کو اعلا ترجیح دیں اور اس سلسلے میں ضروری منصوبہ عمل وضع کریں۔ ●

دفاع میں خودکفالت کی جانب پیش قدمی

نئے عالمی نظام نے نئے چیلنج سامنے لا کھڑے کیے ہیں۔ ایٹمی ہتھیاروں کی عدم توسیع کے معاہدے کا جائزہ لینے والی کانفرنس نے اس بہت زیادہ امتیاز والے معاہدے کی غیر معینہ عرصے کے لیے توسیع کر دی ہے۔ میزائل کی تکنالوجی کے کنٹرول کے نظام والے ارکان نے اپنے قومی قواعد وضوابط کے تحت یک طرفہ فیصلے کے طور پر اہم تکنالوجیوں کو دوسرے ممالک کے لیے منتقل کرنے سے انکار کرنے والے ان ممالک نے بشمول ہندوستان چند ملکوں کو نشانہ بنایا ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ممالک اپنے رویے میں اور زیادہ سختی اختیار کریں گے کیوں کہ جوں جوں ہماری طاقت میں اضافہ ہوگا ویسے ویسے ان ملکوں کی سختی بڑھے گی۔ یہ وہ عناصر ہیں جو ہماری دفاعی تیاریوں کے سلسلے میں ہماری کوششوں پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت نے دفاعی نظاموں میں خودکفالت حاصل کرنے کے لیے ایک دس سالہ پروگرام شروع کیا ہے۔ اس منصوبے کی رو سے چار اہم شعبوں پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔

چار نکاتی حکمت عملی

سوویت یونین کے الگ الگ ہو جانے اور نتیجتاً حصے پرزوں کی سپلائی کا سوتا خشک ہو جانے سے اس بات پر زور دیا گیا کہ حصے پرزوں کی تیاری ملک میں ہی شروع کر دی جائے۔ دوسرا اہم شعبہ جس پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔ دفاعی ساز وسامان کی جلد کاری اور ان کو بہتر سے بہتر بنانے کا ہے۔ یہ کام ملکی اور غیر ملکی ہر دو مہارتوں کی مدد سے انجام دیا جائے گا۔

تیسرا شعبہ ایک ایسے جدید ترین ملکی نظام کے وضع کرنے سے تعلق رکھتا ہے جس سے ممکنہ خطرات کو روکنے میں مدد ملے گی۔ تحقیق و ترقی کے امور پر بھی

توجہ دی جائے گی نیز ایسی تکنالوجیوں کو تیار کرنے اور ایجاد کرنے پر زور دیا جائے گا جس سے مستقبل کے نظاموں کے فروغ میں زیادہ وقت نہ لگے۔ ان ملکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے، جو تکنالوجی کو منتقل کرنے کے لیے تیار نہیں، اہم اور پیچیدہ سامان کی تیاری، حصے پرزوں کی تیاری اور تکنالوجیوں کے فروغ پر زور دیا جائے گا۔

دفاعی نظاموں کے فروغ کے دوران زیادہ تر تکنالوجیاں دوہرے مقصد کے تحت تیار کی گئی ہیں۔ ان تکنالوجیوں کو اپنی موجودہ شکل میں یا تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ شہری سیکٹر کے لیے خدمات انجام دینے اور مصنوعات تیار کرنے کے طور پر بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ اس مقصد کے تحت منصوبے کے چوتھے اہم حصے میں ایسی ہی تکنالوجیوں کو فروغ دینے پر زور ہے جن سے سول سیکٹر میں بھی کام لیا جا سکے اور عام آدمی کو معیاری سامان اور خدمات معقول قیمتوں پر فراہم کرایا جا سکے۔

یہ پلان خود کفالت کے حصول سے متعلق عمل درآمد کی کونسل کی ہدایت کے مطابق انجام پائے گا۔ اس کے چیئرمین وزیر دفاع کے سائنسی مشیر ہیں۔ اعلا سطح پر سائنسی محکمے آپسی تال میل کو اس طرح ترتیب دے رہے ہیں جس سے قومی کوششوں کے اس نظام کو مربوط کیا جا سکے۔

کامیابیاں۔ایک نظر میں

دفاعی تحقیق و ترقی کی تنظیم نے روسی ساخت کے ٹینک ۲۷-T کو جدید بنانے کا کام شروع کیا ہے جس سے کہ اس کی نقل و حرکت کو آسان بنایا جا سکے اور اس کی بچاؤ قوت اور حربی صلاحیت کو بڑھایا جا سکے۔ اس سلسلے کے دو اصلاح شدہ ٹینک ۷۲-T تکنیکی آزمائشوں کے مرحلوں سے گزر رہے ہیں اور مشاہدے کے عمل سے وابستہ کر دیے گئے ہیں۔ دسمبر ۱۹۹۵ء میں اس کی آزمائش کا آخری مرحلہ ہوگا۔ مگ ۲۱ کا معیار بڑھانے کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مگ ۲۷ اور مگ ۲۹ طیاروں کی معیار بندی اور اس کو بڑھانے پر زور دیا جائے گا۔

اس کے علاوہ کچھ اور بھی اہم کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں، جن میں پرتھوی میزائل کی کامیاب آزمائش، خشکی سے خشکی میں مار کرنے والے جنگی صلاحیتوں کے حامل میزائل، ۵۵۶ ایم ایم رائفل کی تیاری اور اسے فوج کے حوالے کرنا، بحریہ کے استعمال کے لیے بہت کم فریکوینسی والے ریسیوروں کی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور سسٹم مکمل کر لیے گئے ہیں مثلاً ۸۱ روشنی دینے والا بارود ایم کے ۱۱۔ مربوط مشاہداتی سامان، ایکوسٹک نشانہ، ڈرل اور مشقی تارپیڈو، بلٹ پروف گاڑیاں، ہیلون بیرج سسٹم وغیرہ۔ اندرا، جو پلس کمپریشن کم سطح والا راڈار ہے، آزمائشوں کے بعد فوجی خدمات کی غرض سے ان کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس سامان کو فوج نے قبول کر لیا ہے اور اس کی تیاری شروع ہو چکی ہے۔ بغیر پائلٹ والا نشانہ باز طیارہ محدود پیمانے پر تیار کیا جا رہا ہے۔ اس کی کامیاب جانچ ہو چکی ہے۔

کچھ اور نظام بھی کامیابی کے ساتھ تیاری کے مرحلے طے کر چکے ہیں۔ دفاعی تحقیق و ترقی کی تنظیم نے ان کو تیار کیا ہے اور فوج نے اسے قبول کر لیا ہے مثلاً ہاتھ سے تیار کیا جانے والا حملے کے وقت درکار پل، بسرعت مداخلت کرنے والی وھیکل، ریڈیو ٹرنک سسٹم، سونو بوائے پروسیسر، سم ہیکا، سمندری کانیں، عملہ مخالف کانیں، بکتر بند ایمبولینس، ٹریکڈ مارٹر کیریر، اسموک گرینیڈ ڈسچارجر، جو کہ ۵۵-T قسم کے جدید ٹینک میں کارآمد ہے۔ ان کے علاوہ جدید قسم کے مرکزی نظام پنچندریہ کو بھی کامیابی کے ساتھ وضع کر لیا گیا ہے۔

دور بیٹھ کر چلائی جانے والی وھیکل فیلکن کی پرواز کو آزمائشی مرحلے سے گزار لیا گیا ہے۔ ملٹی بیرل راکٹ سسٹم پناکا ۱۹۹۵ء کے آخری تین مہینوں میں آزمائشی مرحلے سے گزرے گا۔ توپ خانے کے لیے سی-۳۱ سسٹم اور پراسیسر کے نظام پر مبنی کان جانچ کے ضمنی مرحلوں سے گزر رہی ہے۔ ہلکا پھلکا حربی طیارہ یعنی LCA اگست ۱۹۹۵ء میں تیار ہوا چاہتا ہے۔ کاویری انجن کا کلیدی انجن کا بینی اس ہلکے پھلکے طیارے کے لیے کامیابی کے ساتھ آزمائشی مرحلے سے گزر چکا ہے۔ پلس پلس، جو ۳۲ ناڈ والا ایک متوازی کمپیوٹر ہے، ایجاد کیا گیا ہے۔ یہ کمپیوٹروں کے کرے (CRAY) کلاس کا مقابلہ کرے گا۔

حربی ٹینک ارجن بری فوج کے استعمال کے لیے تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اس کی صارفین کے ذریعے آزمائش جاری ہے اور یہ آزمائش کافی آگے بڑھ چکی ہے۔

میزائل تکنالوجی

نویں پنج سالہ منصوبے کے لیے دفاعی ساز و سامان کی تیاری کا خاکہ اور فوج کی ضرورتوں کا نقشہ تیار کیا جا رہا ہے۔ تکنالوجی ڈیمانسٹریٹر "اگنی" نے کامیابی کے ساتھ ہماری صلاحیت واضح کر دی ہے جس کا تعلق دوبارہ داخلے اور متعلقہ تکنالوجیوں سے ہے۔ اس صلاحیت کے باعث میزائل سسٹم کی نوعیت اور اس کی پسند کا اختیار بھی مل سکا ہے۔ اس کی وجہ سے روایتی پے لوڈ مقابلتاً طویل رینج تک جا سکے گا اور اس کا نشانہ بھی صحیح ہوگا۔

میزائل سسٹم آکاش، ناگ، ترشول تیاری کی راہ پر کافی آگے آ چکے ہیں۔ یہ ۱۹۹۶ء تک مکمل ہو جائیں گے۔ ان کو صارفین کی آزمائش کے لیے دیا جائے گا اور تجربہ کامیاب ہونے پر ان کی تیاری شروع کر دی جائے گی۔

گزشتہ برسوں میں دفاعی ساز و سامان کی تحقیق و ترقی کی تنظیم نے جو مختلف نظام تیار کیے ہیں ان کے تحت ان کی تیاری اور افواج کو حوالگی کا عمل انجام دیا جا سکا ہے۔ اس طرح سے افواج کو تقریباً چھ ہزار کروڑ روپے سے زیادہ کا سامان دیا جا چکا ہے۔ فنی حرب کے نظام ترتیب وار شامل کر لیے جانے سے سامان حرب کی اندرون ملک تیاری کے اخراجات کافی بڑھ جائیں گے اور غیر ملکی ساخت کے سامان کی حصولی کے اخراجات کم ہو جائیں گے۔ امید ہے کہ اس صدی کے آخر تک دفاعی سامان کی سالانہ حصولی کا نصف حصہ اندرون ملک وسائل سے ہی پورا کر لیا جائے گا۔

سماجی عزم

دفاعی کوششوں کے انسانی پہلو کا بھی پلان میں خیال رکھا گیا ہے۔ پانی کو صاف کرنے کی تکنالوجی جو کہ دفاعی سامان کی تحقیق و ترقی کی تنظیم کے ذریعے فروغ دی گئی ہے، راجستھان کے ضلع باڑمیر میں آبی مشن کے پروگرام چلانے میں کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے تقریباً سو دیہات میں بسنے والی ڈیڑھ لاکھ آبادی کو پینے کا صاف ستھرا پانی مفت فراہم کرایا جا سکا ہے۔ اس کے لیے دیہی ترقی کی وزارت نے رقومات فراہم کی ہیں اور راجستھان کے پبلک ہیلتھ انجینیرنگ کے محکمے نے تعاون کیا ہے۔

سوسائٹی برائے بایو میڈیکل تکنالوجی کے زیر اہتمام دفاعی ساز و سامان کی تیاری کے دوران کچھ اہم طبی کارنامے بھی انجام دیے گئے ہیں مثلاً کینسر کی تشخیص، بیرونی آلہ، جو پیس میکر کے طور پر امراض قلب کے لوگوں کے لیے مفید ہے، کارڈیو ویسکولر

باقی صفحہ ۲۹ پر

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

سب ایڈیٹر : ڈاکٹر توحید خان

فون : 677591

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق کلدیپ سنگھ

جلد : ۱۵ شمارہ : ۷

اکتوبر ۱۹۹۵ء (۹ آشون تا ۹ کارتک شک ۱۹۱۷)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن انچارج : کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق

خط۔کتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۵، آر۔ کے پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہے۔

ترتیب

مہیش پرساد

راستہ مشکل اور طویل ہے :

آٹھویں سارک کانفرنس

جنوبی ایشیا کی خطہ جاتی تعاون کی ایسوسی ایشن (سارک) کے سربراہان ریاست وحکومت کی آٹھویں کانفرنس اس دس سالہ تنظیم کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل تھی کیوں کہ اس میں جنوب ایشیائی ترجیحی تجارتی انتظامات (SAPTA) کو اس سال کے آخر تک روبہ عمل لانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی ایشیا کا " آزاد تجارت کا ایک علاقہ " قائم کرنے کے اقدامات پر غور کرنے کی ایک تجویز کی حمایت بھی کی گئی ہے۔ کانفرنس نے اقتصادی تعاون بڑھانے، غریبی ختم کرنے، تعلیم اور صحت کو فروغ دینے اور اضافہ آبادی کو روکنے کے اقدامات کا بھی اعلان کیا ہے۔ تاہم جیسا کہ سربراہان ریاست اور حکومت کی تقاریر سے بھی ظاہر ہے تنظیم کے بارے میں ابھی تک شبہات پائے جاتے ہیں۔ جب تک یہ شبہات موجود رہیں گے ترقی محدود رہے گی۔

سربراہ کانفرنس شروع ہونے سے پہلے ہی یہ بات ظاہر ہوگئی تھی کہ سارک کے سات رکن ممالک، بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، سری لنکا اور مالدیپ نے خود کو " جنوبی ایشیا کا آزاد تجارت کا علاقہ " (SAFTA) قائم کرنے سے بھی زیادہ بلند عزائم کا پابند کر رکھا ہے۔ بعد میں کانفرنس نے " ساپٹا " (یعنی جنوب ایشیائی ترجیحی تجارتی انتظامات) آٹھ دسمبر یعنی سارک کی دسویں سالگرہ تک روبہ عمل لانے کا فیصلہ کیا۔ " ساپٹا " کے ڈھانچے سے متعلق معاہدے پر اپریل ۱۹۹۳ء میں ڈھاکہ میں ساتویں سربراہ کانفرنس میں دستخط کیے گئے تھے۔ سارک کو کتنے شدید مسائل کا سامنا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ " ساپٹا " کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کرنے میں دو سال لگ گئے ہیں اور ترجیحی تجارت کے لیے ایشیا کی فہرستوں کے تبادلے میں بھی کافی زیادہ مشکلیں پیش آئی ہیں۔ سربراہ کانفرنس کے دوران ہی یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اس وقت تک سارک کے سات رکن ممالک میں سے صرف چار ہی نے " ساپٹا " معاہدے کی توثیق کی ہے۔ باقی ممالک " توثیق کے لیے ضروری آئینی انتظامات کی تکمیل " میں مصروف ہیں۔ اس سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ " آزاد تجارت کا علاقہ " " سافٹا " بنانے کی راہ میں کتنی مشکلات پیش آئے گی۔ خاص کر اس لیے اور بھی " سافٹا " کی تجویز " ساپٹا " کی تجویز سے عظیم تر ہے۔

جنوبی ایشیائی ترجیحی تجارت کے انتظامات " ساپٹا " کے بہ تعجیل عملی شکل دیے جانے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بین اقوامی مالی فنڈ (آئی ایم ایف) کے اعداد وشمار کے مطابق جنوبی ایشیا کے ممالک کے درمیان علاقائی تجارت صرف ۳ء۵ فی صد ہے جب کہ تمام ترقی پذیر ممالک کی مجموعی تجارت میں ان کی علاقائی تجارت کا حصہ ۳۹ فی صد ہے۔ ۱۹۸۵ء میں جب سارک کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت جنوبی ایشیا کے ممالک کے درمیان بین علاقائی تجارت کا تناسب ۵ء۴ فی صد تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سارک کی تشکیل کے بعد اس خطے کے ملکوں کی علاقائی تجارت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ سارک ممالک سے بھارت کی درآمدات اس کی مجموعی درآمدات کا محض ۰ء۴۳ فی صد تھیں۔ نیپال کے معاملے میں یہ تناسب ۱۶ء۱۶ فی صد تھا۔ خطے کے ممالک کو بھارت کی برآمدات اس کی درآمدات کا تقریباً آٹھ گنی تھیں۔

اس لیے سارک ممالک مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی تمام تر مشکلات کے باوجود بالآخر " ساپٹا " کو عملی شکل دینے کا فیصلہ کیا اور " سافٹا " کے قیام کے لیے ضروری اقدامات پر غور کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اگرچہ سیاسی رقابت اور نوآبادیاتی راج کی وراثت کے روپ میں چلے آرہے مدتوں پرانے مسائل خطے کے ملکوں میں اتفاق پیدا نہیں ہونے دیتے تاہم اقتصادی دباؤ انھیں یکجا ہونے پر مجبور کرتے ہیں۔ خطے کے چھوٹے ممالک ڈرتے ہیں کہ کسی بھی تجارتی معاہدے میں کہیں بھارت کا غلبہ نہ ہوجائے یا بھارتی بزنس ان کے کاروبار پر حاوی نہ ہوجائے۔ لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ خطے کے چھوٹے ممالک یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ وہ بھارت کے ساتھ نزدیک تر اقتصادی تعاون سے کافی فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔ جیسا کہ تجزیہ کاروں اور تنقید کاروں کا کہنا ہے، برصغیر خصوصاً ایک بہت بڑی منڈی فراہم کرتا ہے۔ اگر ترجیحی تجارت کے انتظامات روبہ عمل آجائیں اور آزاد تجارت کا علاقہ بن جائے تو برصغیر غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے زیادہ کشش انگیز بن جائے گا۔ وجہ یہ کہ وہ مال وخدمات کی آزادانہ نقل وحرکت یا یوں کہیے کہ ترجیحی محصول پر اشیا کے تجارت کی نقل وحرکت کے باعث وہ ایک واحد مارکیٹ بن جائے گا۔ مقامی کمپنیاں بھی مقامی منڈی تک ہی محدود نہیں رہیں گی۔ علاوہ ازیں تاجروں کے لیے عالمی منڈی میں داخل ہونے کے بہ مقابلے خطے کی ایک ایسی منڈی میں داخل ہونا بدرجہا آسان ہے جو تھوڑا عرصہ پہلے تک ایک ہی معاشی اکائی

کا حصہ تھی اور آج بھی جغرافیائی طور پر ایک ہی قدرتی معاشی اکائی کا حصہ ہے۔

آزاد تجارت کے علاقے کے نظریے کو کس قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اس کا کچھ اندازہ حالیہ سربراہ کانفرنس کے دوران ہی ہو گیا تھا۔ پاکستان نے کانفرنس کے منشور میں ایسی ترمیم کرنے کی بات کی جس سے وہ دو فریقی مسائل سارک کی میٹنگوں میں اٹھا سکے۔ نیپال اور مالدیپ نے اور کسی حد تک بھوٹان نے بھی اس کی حمایت کی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ "سافٹا" (جنوبی ایشیا کے آزاد تجارت کے علاقے) کو "ساپٹا" (جنوبی ایشیا کے ترجیحی تجارت کے انتظامات) پر کامیاب عمل درآمد ہونے تک انتظار کرنا ہوگا۔ "ساپٹا" کو روبہ عمل لانے کے فیصلے اور ترجیحی تجارت کے لیے اشیائے تجارت کی فہرستوں کا تبادلہ ہونے کے بعد اگلا قدم یہ ہوگا کہ رکن ممالک ایک ایک پروڈکٹ کی بنیاد پر ترجیحی محصول کے بارے میں بات کریں۔ سارک کے باقی تین ممالک کو بھی "ساپٹا" معاہدے کی توثیق کرنا ہوگی۔ جیسا کہ سری لنکا کی صدر شریمتی چندریکا بھنڈار نائکے کمار تنگا نے اپنے خطاب میں کہا تھا "ہمارے سامنے ایک لمبا اور کٹھن راستہ ہے خاص کر اس لیے کہ کسی اور خطے کی بہ نسبت ہمارے خطے کے ملکوں میں حجم، وسائل اور ترقی کی سطحوں کی نابرابریاں کہیں زیادہ ہیں۔"

خطے کا سب سے بڑا ملک ہونے کے ناطے بھارت سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ "ساپٹا" کو روبہ عمل لانے میں ایک بڑا کردار ادا کرے گا۔ وہ پہلے ہی اس خطے سے ۱۰۶ اشیا کی رعایتی شرائط پر درآمد کی اجازت دے کر دوسروں کی رہنمائی کر چکا ہے جب کہ پاکستان نے ۳۵ اشیا کی، سری لنکا نے ۳۱ اشیا کی، نیپال نے ۱۴ اشیا کی، مالدیپ نے ۱۷ اشیا کی، بنگلہ دیش نے ۱۲ اشیا کی اور بھوٹان نے ۷ اشیا کی درآمد رعایتی شرح پر کرنے کی اجازت دی ہے۔ ایک سرکاری ترجمان نے سربراہ کانفرنس سے قبل وزرائے خارجہ کی کانفرنس کے مختصرات صحافیوں کو بتاتے ہوئے کہا کہ اس سے سارک کے تئیں بھارت کا خلوص اور لگاؤ بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ ترجمان نے مزید کہا کہ بھارت تجارت میں نرم روی کے حق میں اور اشیا کی کافی طویل فہرست پیش کرنے میں اس نے نفع نقصان کو مدنظر نہیں رکھا۔

سارک نے چند اور فیصلوں کے ذریعے اقتصادی تعاون بڑھانے پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی ہے۔ خطے کے بیشتر ممالک میں سارک تجارتی میلے منعقد کیے جائیں گے اور اس سال کے ختم ہونے سے پہلے سارک ممالک کی صنعتوں کے سربراہوں کی ایک میٹنگ بھارت میں ہوگی۔ امید ہے اس سے خطے کے نجی سیکٹر میں اقتصادی تعاون میں کافی اضافہ ہوگا۔

وزیر اعظم شری پی۔ وی نرسمہا راؤ نے افتتاحی اجلاس میں تین روزہ سربراہ کانفرنس کی کارروائی کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا "مختصر یہ کہ عورتوں اور بچوں سے متعلق تمام اہم سماجی شعبوں میں تعاون بڑھانے، منشیات اور دہشت گردی کی لعنت کا مقابلہ کرنے کے لیے باہمی اشتراک عمل کو مستحکم کرنے نیز دیہی ترقی، ماحولیات، سائنس اور تکنالوجی اور مواصلات جیسے شعبوں میں اشتراک عمل میں اضافہ کرنے پر زور دیتے ہوئے اس کانفرنس نے اپنی تمام تر توجہ غربت کے خاتمے اور اقتصادی تعاون پر مرکوز کی ہے۔"

غربت کے خاتمے کے سوال پر سربراہان ریاست اور حکومت نے وزرائے خزانہ و منصوبہ بندی کی گزشتہ سال ڈھاکہ میں منعقد ہوئی میٹنگ کی اس سفارش کی حمایت کی کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جانا چاہیے جو منظور شدہ پالیسیوں کی روشنی میں خاتمۂ غربت کے پروگراموں کے متعلق اطلاعات، خصوصاً خاتمۂ غربت کے لیے فائدہ مند تکنالوجیوں کے متعلق اطلاعات کے تبادلے کے مرکز کی حیثیت سے کام کرے۔ وزرا کی سفارش کے مطابق یہ ایک تین سطحی ادارہ ہوگا۔ اس کی پہلی میٹنگ بھارت میں ہوگی اور ایک سال میں ایک مرتبہ ہوا کرے گی۔

غربت کا خاتمہ

کانفرنس نے ۱۹۹۵ء کو سال "خاتمۂ غربت کے سارک سال" کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ سربراہان ریاست و حکومت نے اپنے اس عہد کو دوہرایا کہ غریبوں کو اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنانے اور اپنے رہن سہن کے حالات سدھارنے کے لیے مزید مواقع فراہم کیے جائیں گے اور بے روزگاری، معذوروں اور بڑھاپے کے دنوں میں انھیں معاشی اور سماجی تحفظ عطا کیا جائے گا۔ آزاد منڈی کی معیشت کی جانب رجحان کے سیاق و سباق میں سربراہ کانفرنس نے لگاتار اقتصادی ترقی کے فروغ کے لیے منڈیوں کو بہتر بنانے، توسیع دینے اور سخت قواعد و ضوابط کی بندشوں سے آزاد کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ کانفرنس میں یہ بھی محسوس کیا گیا کہ منڈی میں کارفرما عناصر کے پیدا کردہ منفی اثرات کو ختم کرنا اور منڈیوں کو غریبوں کے لیے دوستانہ و مشفقانہ بنانا ضروری ہے۔

کانفرنس کے شرکا نے عورتوں کے بارے میں اپنے اس عزم کا اعادہ کیا کہ "وہ عورتوں اور لڑکیوں کے خلاف ہر طرح کے امتیاز و تفریق کو ختم کرنے کے اقدامات کریں گے۔" ۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۰ء تک کی دہائی کو بچیوں کی سارک دہائی کے طور پر منانے کے منصوبے پر عمل درآمد کے بارے میں کانفرنس نے وزرا سے درخواست کی کہ وہ دہائی کے پہلے پانچ برسوں کی کارگزاری کا جامع جائزہ لینے کا اہتمام کریں اور اس کی رپورٹ نویں سارک سربراہ کانفرنس میں پیش کریں۔

بچوں کے بارے میں جنوبی ایشیا کے ان رہنماؤں نے نوزائدہ بچوں کی شرح اموات گھٹانے اور تحفظی ٹیکوں کے پروگرام کو بڑھانے کے نصب العین کی تکمیل کے لیے قومی اور خطے کی سطحوں پر اپنی کوششیں تیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے ۱۹۹۴ء کو نوجوانوں کے سارک سال کے طور پر منانے کے منصوبہ عمل پر عمل درآمد پر بھی اطمینان ظاہر کیا اور عہد کیا کہ اس ضمن میں رکن ممالک میں جو ادراک پیدا ہوا ہے وہ اسے جاری رکھیں گے۔ رہنماؤں نے معذور افراد کی ترقی و تحفظ کی قرارداد کے تحت رکن ممالک میں شروع کیے گئے پروگراموں کا خیر مقدم کیا۔

سربراہ کانفرنس نے سرکاری ایجنسیوں اور غیر سرکاری اداروں کو حرکت میں لا کر "۲۰۰۰ء تک سب کے لیے مکان" کے عالمی نصب العین کے حصول کے لیے کام کرنے کے عزم کو دوہرایا۔ کانفرنس نے سال ۱۹۹۶ء کو "خواندگی کے سارک سال" کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا اور رکن ممالک سے کہا کہ وہ ۲۰۰۰ء تک لاعلمی و ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے زیادہ ٹھوس پروگرام شروع کریں۔

ماحولیات کے سلسلے میں سربراہان ریاست وحکومت نے ماحولیات وترقی کے بارے میں اقوام متحدہ کی جون ۱۹۹۲ء کی کانفرنس کے نتائج پر اپریل ۱۹۹۲ء کے ڈھاکہ اعلان کا ذکر کرتے ہوئے پروگراموں پر عمل درآمد کے لیے فوری طور پر نئے اور اضافی وسائل فراہم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے یاد دلایا کہ اقوام متحدہ نے ترقی یافتہ ملکوں کے لیے یہ نشانہ مقرر کیا ہے کہ وہ اپنی مجموعی قومی پیداوار کا ۰.۷ فی صد سرکاری ترقیاتی امداد کے طور پر مختص کریں۔ ابھی بیشتر ترقی یافتہ ممالک کو یہ نشانہ پورا کرنا ہے۔ سربراہوں نے ترقی یافتہ ممالک سے درخواست کی کہ وہ حیاتیات کی کثرت اور آب وہوا کی تبدیلی کے بارے میں اقوام متحدہ کی ڈھانچہ جاتی کنونشن کے تحت ترقی پذیر ممالک کو ان کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں مدد دیں۔

کانفرنس نے علاقائی پروجیکٹوں کے لیے سارک کے فنڈ اور سارک علاقائی فنڈ کو ملا کر ایک جنوب ایشیائی ترقیاتی فنڈ قائم کرنے کی حمایت کی۔ اس فنڈ کا تیسرا مقصد سماجی ترقی اور ذیلی ڈھانچے کی ترقی ہوگی۔ اس نئے فنڈ کے لیے نئے عطیات کی ضرورت نہیں ہوگی کیوں کہ یہ فنڈ تینوں موجودہ فنڈوں کے انضمام سے ہی بنے گا۔ بین اقوامی اقتصادی اور سماجی مسائل پر سربراہوں نے ورکروں کے مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے عہد کا اعادہ کرتے ہوئے ممالک سے کہا کہ وہ ورکروں کی ترقی اور تحفظ کے نام پر تجارتی بندشیں کھڑی نہ کریں۔ انھوں نے "سماجی کلاز" یا "ماحولیاتی کلاز" کی صورت میں بین اقوامی تجارت پر شرائط عائد کرنے کے رجحان کی مذمت کی۔

گوشوارہ نمبر۱

جنوب ایشیائی ممالک کے ساتھ بھارت کی تجارت

نمبر شمار	نام ملک	۱۹۸۰ برآمدات	درآمدات	۱۹۸۵ برآمدات	درآمدات	۱۹۹۰ برآمدات	درآمدات	۱۹۹۱ برآمدات	درآمدات	۱۹۹۲ برآمدات	درآمدات	۱۹۹۳ برآمدات	درآمدات
۱۔	بنگلہ دیش	۱۰۶	۱۲	۱۰۴	۲۹	۲۰۹	۱۵	۳۲۵	۱۵	۲۹۲	۹	۳۹۲	۱۳
۲۔	بھوٹان	-	-	-	-	-	۱	-	۲	۱	۵	۲	-
۳۔	مالدیپ	۳	-	۱	-	۵	۲	۵	-	۹	-	۷	-
۴۔	نیپال	۹۵	۲۱	۸۲	۵۰	۴۰	۱۵	۷۷	۱۹	۷۹	۲۲	۷۹	۱۹
۵۔	پاکستان	۲	۷۶	۱۲	۲۸	۴۳	۴۵	۴۰	۵۸	۵۳	۱۴۵	۵۶	۴۶
۶	سری لنکا	۱۰۱	۳۲	۷۱	۵	۱۰۲	۲۲	۱۷۵	۱۲	۱۹۹	۱۵	۲۹۹	۱۷
	کل	۳۰۷	۱۴۱	۲۷۰	۱۱۲	۳۹۹	۹۹	۶۲۳	۱۰۴	۶۲۳	۱۹۲	۷۶۸	۹۷

اعداد امریکی ملین ڈالروں میں

ذرائع: آئی ایم ایف ڈائرکشنز آف ٹریڈ اسٹیٹکس ایئر بک ۱۹۸۶ء ۔ ۱۹۹۴ء

دیگر علاقائی تجارتی تنظیموں کے ساتھ تعاون

ایک علاقائی تنظیم کی حیثیت سے سارک آسیان (ASEAN) ایپک (APEC) اور بحر ہند کے ممالک کی بین اقوامی تجارتی تنظیموں کے ساتھ تعاون کے امکانات تلاش کرے گی۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ وزرا کی کونسل سارک اور یوروپین یونین کے درمیان بین اقوامی تعاون کے ایک معاہدے پر نیویارک میں دستخط کرنے کا اختیار دے چکی ہے۔

مختصر یہ کہ سارک کی حال میں ختم ہوئی کانفرنس میں بہت اہم فیصلے کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ وزیر اعظم شری نرسمہا راؤ نے، جنھیں سارک کا چیئرمین چنا گیا، کہا "سربراہ کانفرنس کا مرکزی موضوع غریبی کا خاتمہ اور اقتصادی تعاون تھا۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "ہم نے اس خطے کے ملکوں کے عطیات کا موثر استعمال جاری رکھتے ہوئے سارک کو خطے کی اجتماعی خود کفالت اور ترقی کو زیادہ سے زیادہ حد تک بڑھانے کا موثر ذریعہ بنانے کے لیے ایک اور قدم اٹھایا ہے۔" سارک اپنی کوششوں میں کتنی کامیاب ہوتا ہے، اس کا دارومدار رکن ممالک کے سیاسی عزم وارادے پر ہوگا۔ اگر تمام ملک آپس میں تعاون کریں اور اپنی قوتیں مجتمع کریں تو بہت کچھ کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر انھوں نے دوفریقی تنازعات کو اپنی کوششوں میں حائل ہونے دیا تو جو نیک خیالات کانفرنس میں ظاہر کیے گئے ہیں وہ محض نیک بیانات ہی بنے رہیں گے۔ امید کی ایک کرن یہ نظر آرہی ہے کہ چھوٹے ممالک سارک کی کوششوں کو کامیاب بنانے میں دلچسپی رکھتے ہیں جو اس بات سے ظاہر ہے کہ انھوں نے "ساپٹا" کو اس سال کے آخر تک عملی شکل دینے کے فیصلے کی حمایت کی ہے۔ ●

سبھاش چندر ستیہ

انسانی وجود اور ماحولیات

یوں تو انسان بھی قدرت کا ایک حصہ ہے، لیکن برتاؤ کی سطح پر وہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہوئے قدرت کو ایک یونٹ کے طور پر دیکھتا ہے۔ نیچر سے علاحدگی کے اس رجحان نے اسی وقت جنم لیا تھا جب انسان نے ـــــ زندگی کو سہولت آمیز بنانے کی اجتماعی کوششیں شروع کیں ویسے یہ پہل کافی کارآمد رہی اور قدرت کے ساتھ انسان کا مکمل رابطہ رہا ہے لیکن آج صورت حال بدل چکی ہے۔ اب انسان قدرت کے آمنے سامنے ہے۔ اپنے چین و آرام کے لیے نیچر کا استحصال کرنے پر آمادہ ہے۔ قدرت ہمیشہ دل کھول کر اپنی پسند کے انسان اور دیگر جانداروں پر لٹتی رہی ہے۔ اس سے سب کچھ چھین لینے کے لالچ میں انسان نے اپنے آپ کو نئے خطرے میں ڈال لیا ہے۔ یہ خطرہ ہے آلودگی یعنی ماحولیات میں آ رہی ہے مسلسل گراوٹ۔

پانی، ہوا، ونا سپتی جیسی انسانی وجود کے لیے ضروریات آج آلودہ اور بے کار ہو چکی ہیں دوسرے الفاظ میں انسان کے وجود پر ہی خطرے کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ظاہر ہے اپنی اس بدحالی کے لیے انسان قصوروار ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کے برے اثرات اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ سیلاب کی تباہی قحط جیسے حالات کو قدرتی مصیبت سمجھ کر خدا کا قہر کہا جاتا ہے۔ وہ بھی اب انسان کی اپنی کرنی کا پھل دکھائی دے رہی ہے۔ ماحولیات کا موضوع کتنا اہم بن چکا ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے۔ تقریباً تین برس قبل جون ۱۹۹۲ء میں اس بارے میں آبادی سے متعلق جینیوا میں عالمی سطح کی چوٹی کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں ۱۷۸ ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی تھی اور ان میں بھی سو ملکوں کے صدر مملکت یا وزیر اعظم شامل تھے۔ اپنی طرح کی اس پہلی بین اقوامی چوٹی کانفرنس کے انعقاد میں ہندوستان کی طرف سے وزیر اعظم شری پی۔ وی نرسمہا راؤ نے شرکت کی تھی۔

آلودگی کا پھیلاؤ

آب و ہوا کو آلودہ کرنے والے عوامل کا وجود یوں تو ہمیشہ سے ہی رہا ہے لیکن جدید طرز زندگی اور سہولت و آرام کا سامان حاصل کرنے کے لیے صنعتوں کے قیام کا دور شروع ہونے کے بعد ان عوامل کی مقدار میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ آدمی کے جدید رہن سہن کا طریقہ مغرب کے ممالک میں رائج ہوا لیکن ماحولیات کے مضر نتائج زیادہ تر ترقی یافتہ لوگوں کو بھگتنے پڑ رہے ہیں۔ بھارت میں بھی آزادی کے بعد صنعتی کرن اور شہر آباد ہونے کی وجہ سے ماحولیات کی مشکلات دن بدن پیچیدہ ہوتی جا رہی ہیں۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ جب گنگا کو مقدس اور سب کو پاک کرنے والی مانا جاتا تھا وہ خود ہی آلودہ اور کئی جگہوں پر تو اس میں نہانا اور اس کا پانی پینا صحت کے لیے نہایت خطرناک ہو رہا ہے یہی بات کئی ندیوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، جس کے کنارے بسے شہروں اور قصبوں کی گندگی اور صنعتی کچرا اور کیمیاوی عوامل ندیوں میں ڈالے جاتے ہیں جس سے اس کا پانی آلودہ ہوتا جا رہا ہے۔ مرکزی آلودگی انسداد بورڈ کے ذریعہ کچھ سال پہلے کیے گئے جائزے سے معلوم ہوا کہ ملک کے ۱۳ شہر ہی آلودگی سے خاص طور سے متاثر ہیں یہ سبھی صنعتی شہر ہیں اور ان جگہوں پر ندیوں کا پانی پینے کے لیے تو دور سینچائی کے لیے بھی غیر موزوں بتایا گیا۔ آب و ہوا کی آلودگی بھی کس طرح سے نقصان دہ اور قابل تشویش ہے۔ کارخانوں اور موٹر گاڑیوں سے نکلنے والے دھوؤں میں موجود زہریلی گیسوں سے طرح طرح کے امراض پھیل رہے ہیں۔ دہلی کو دنیا کا تیسرا سب سے زیادہ آلودہ شہر قرار دیا جا چکا ہے۔ پچھلے کئی سالوں میں صنعتوں کے ساتھ موٹر گاڑیوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں آب و ہوا پراگندہ ساؤنڈ پالوشن دونوں نے خطرناک حد تک شکل اختیار کر لی ہے۔ بھارت میں موٹر گاڑیوں کی فروخت کافی تیزی سے بڑھ رہی ہے، جس سے ماحولیات کو اور بھی خطرے کا اندیشہ درپیش ہے۔

پیڑوں کی کٹائی

صنعتی دھوؤں سے ماحول میں پھیلنے والی کاربن ڈائی آکسائڈ اور دوسری زہریلی گیسوں کے اثر کو کم کرنے کے لیے جہاں ہمیں اور زیادہ جنگلات لگانے کی ضرورت ہے وہاں ہمارے یہاں کے جنگلاتی علاقے مسلسل گھٹتے جا رہے ہیں۔ نئی صنعتیں اور نئی بستیاں بسانے کے لیے زیادہ زمین حاصل کرنے کے لیے ملک بھر میں جنگلوں کو صاف کرنے کا سلسلہ جاری ہے جن جنگلات کے علاقوں کو سرکار نے محفوظ قرار دے کر پیڑ کاٹنے پر پابندی لگا رکھی ہے وہاں بھی چوری چھپے پیڑ کاٹنے کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ جدید طرز زندگی کے لیے آرام کی چیزیں بنانے اور عمارتوں کی بڑھتی ہوئی صنعت کے واسطے عمارتی لکڑیوں کی ضرورتیں جنگلوں کو کاٹ کر ہی پوری ہو سکتی ہیں۔ کہتے ہیں ہمارے

دیش کا پاسبان ہمالیہ بھی ننگا ہوتا جا رہا ہے اس کے علاوہ زمین کی قیمتیں بڑھ جانے اور زمین سدھار قانون نافذ ہو جانے کے بعد دیہات میں شاملات زمین اور چارہ گاہوں پر ناجائز قبضے ہونے لگے جس کی وجہ سے عام گاؤں والوں کو ایندھن اور چارے کے لیے جنگلوں کا سہارا لینا پڑا اس سے بھی جنگلاتی زمین گھٹنے لگی ہے۔ یہی نہیں بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے اناج، دالیں، سبزیاں، پھل وغیرہ کی پیداوار بڑھانے کے لیے بھی فاضل زمین کی ضرورت ہے، جو جنگلوں کو کاٹ کر ہی پوری کی جاتی ہے۔ بین اقوامی پیمانہ کے مطابق کل زمین کے کم سے کم ایک تہائی حصہ میں جنگل ہونے چاہئیں۔ سرکار نے ۱۹۵۲ء میں جنگلات پالیسی تیار کر لی تھی اور ۱۹۸۰ء میں جنگلات کا تحفظ قانون بنا کر بہت بڑے جنگلاتی علاقہ کو محفوظ کر دیا تھا۔ تاکہ جنگلوں کی کٹائی پر روک لگائی جا سکے اس کے علاوہ جنگلاتی میلہ سماجک پیڑ لگاؤ پروگرام اور ایک بچہ ایک پیڑ کے مقبول پروگرام کو چلا کر ماحولیات کے بچاؤ کے مناسب اقدامات کیے گیے ہیں لیکن پیڑوں کی کٹائی پر پوری طرح روک نہ لگ پانے اور ہوا کی آلودگی کو بڑھانے والے وجوہات کے بڑھتے جانے سے آلودگی میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

آبادی اور ماحولیات

پچھلے برس ستمبر میں مصر کی راجدھانی قاہرہ میں آبادی کا اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ماحولیات کی دشواریوں کو ایک نیا رخ ملا اس میں یہ بات ابھر کر آئی کہ ترقی اور آبادی کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے ان میں سے کسی بھی ایک مسئلہ کو الگ رکھ کر غور نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت میں یہ بات بالکل صحیح ہے اگر ہم اپنے ملک کے حالات کو ہی لیں تو صاف نظر آتا ہے کہ شہروں میں بڑھتی ہوئی آبادی کے لحاظ سے تنگ بستیوں کا جال بچھایا جا رہا ہے، جہاں لوگوں کو نہ تو صاف ہوا حاصل ہے اور نہ ہی صفائی قائم رکھی جا سکتی ہے۔ پانی کی نکاسی اور گندگی کے نکاس کا انتظام میونسپلٹیوں کے بس کے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ پینے کا پانی دستیاب کرانا ہی اپنے آپ میں ایک مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے زیادہ لوگوں کا پیٹ پالنے کے لیے اناج کی پیداوار بڑھانا ضروری ہے جس کے لیے جنگلوں کی صفائی کر کے کھیتی کے لائق زمین بڑھائی جاتی ہے۔ پیداوار بڑھانے کے لیے کیمیاوی کھاد اور کیڑے مار دوا کے استعمال سے بھی آب و ہوا کو خطرہ پیدا ہو رہا ہے۔ زیادہ لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے زیادہ چیزوں کی تیاری کرنی ہوگی جس کے لیے نئی نئی صنعتیں لگانے سے ہوا اور پانی کی آلودگی کو بڑھاوا ملتا ہے۔

اس طرح آبادی کو کنٹرول کرنا ماحولیات کے تحفظ کی ضروری شرط ہے یہی وجہ ہے کہ قاہرہ کے اجلاس میں یہ واضح کیا گیا کہ ماحولیات کے مسئلہ کی کنجی ماحولیات کے ماہرین کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خاندانی منصوبہ بندی چلانے والوں کے ہاتھ میں ہے۔

اور تاخیر نقصان دہ

پیڑوں کی اندھا دھند کٹائی صنعتوں اور شہروں کے پھیلاؤ، بڑھتی ہوئی آبادی اور کیمیاوی اور دیگر زہریلی عوامل کے وایو منڈل میں داخلہ کا ایک خطرناک نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ زمین کو سورج کی نقصان دہ گرمی سے بچانے والی اوزون کی پرت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ صورت حال پوری دنیا اور خاص کر بھارت جیسے موسم بہاراں آب و ہوا والے ملکوں کے لیے بہت خطرناک ہوگی اس سے سمندروں کی سطح بڑھنے کا اندیشہ ظاہر کیا جا رہا ہے جس سے سمندر کے قریب بسے کئی جزیروں کے غرقاب کا خطرہ ہے۔ اسی وجہ سے بارش اور موسموں کا چکر کچھ کچھ بدلتا جا رہا ہے، کہیں ہریالی ہوتی ہے اور کہیں خشک سالی ہو جاتی ہے۔ پیڑوں کی کٹائی سے سیلاب کا خطرہ بڑھ جاتا ہے اور سیلاب سے زمین کی زرخیز مٹی کا کٹاؤ ہوتا ہے اس طرح ہم ترقی کرنے کی خاطر تباہی کی طرف چلے جاتے ہیں جنگلات لگاؤ جیسے موثر اقدامات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اب مسئلہ اتنا پیچیدہ اور خطرناک دور میں پہنچ گیا ہے کہ پورے ترقیاتی عمل پر ہی نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے اور یہ سچ ہے کہ قلت کی موجودہ ماڈل کو نہ تو راتوں رات بدلا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے ایک دم سے روکا جا سکتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ چاہے تعلیم ہو یا صحت، زراعت ہو یا صنعت ہمیں زندگی کی ہر نقل و حرکت کے سلسلہ میں منصوبہ بناتے وقت ماحولیات پر پڑنے والے اثرات کو ذہن میں رکھا جانا چاہیے۔

خوشگوار صورت حال یہ ہے کہ اب نئی پیڑھی ماحولیات کے بارے میں پوری طرح بیدار ہے اور سرکار کے ساتھ ساتھ بہت سی رضاکارانہ تنظیم بھی اس سمت میں سرگرم بہت سی ریاستوں میں اسکولی تعلیم میں بھی ماحولیات کا تحفظ کا موضوع شامل ہے۔ لیکن کچھ ذاتی مفاد اور فوری فائدے کے لیے پوری انسانیت کی صحت اور وجود سے کھلواڑ کرنے سے باز نہیں آتے۔

اس سلسلہ میں سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے سے نئی امید جگاتیں ہیں پچھلے برس سپریم کورٹ نے دنیا کے مشہور سیاحتی مرکز تاج محل پر ہوائی آلودگی کے مضر اثرات کے متعلق ایک دائر رٹ پر اپنا فیصلہ سناتے ہوئے آگرہ اور اس کے آس پاس کے علاقوں صنعتی یونٹیں فوراً ہٹانے اور تاج محل کے چاروں طرف دور دور تک باغبانی کا وسیع پروگرام چلانے کے احکامات دیے گئے تھے اس کے بعد مرکزی پیٹرولیم وزارت نے ۱۰ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا جس میں ایسے طریقے شامل کیے گئے ہیں جن سے اس علاقے میں ہوا کی آلودگی پر پابندی لگے اور لوگوں میں اپنی اس تہذیبی اور تاریخی یادگار کو برباد ہونے سے بچانے کی بیداری پیدا ہو۔ متھرا ریفائنری سے بھی اور احتیاطی تکنیکیں اپنا کر تاج محل کو آلودگی کے مضر اثرات سے بچانے کا مشورہ دیا۔ سپریم کورٹ نے دہلی میں بھی ماحولیات کی حفاظت کے بارے میں ایک مفاد عامہ کی رٹ پر بہت ہی دلچسپ آمیز فیصلہ سنایا ہے۔ حال میں دیش کی عدالت عالیہ نے آلودگی پھیلانے والی اور کیمیاوی قسم کی تقریباً ۸ ہزار صنعتی یونٹوں کو بند کرنے یا انھیں پڑوسی ریاستوں میں منتقل کرنے کے احکامات جاری کیے۔ عدالت نے ہریانہ، راجستھان، اتر پردیش وغیرہ ریاستوں کی سرکاروں کو بھی حکم دیا ہے کہ وہ دیگر بنیادی سہولیات کا انتظام کریں۔ اس صنعتی یونٹوں کو نوٹس بھی جاری کیے جا چکے ہیں اس طرح ماحولیات سے محبت رکھنے والے افراد اور اداروں کی سرگرمی اور عدالتی کارروائی کی شراکت اور ذمہ داری کے جذبہ کے نتیجے میں ماحولیات تحفظ کے بارے میں امیدوں کی کرنیں

باقی صفحہ ۲۵ پر

مہندر پانڈے

بھارت میں آلودگی کی روک تھام کا قانون

ماحولیات کے تحفظ میں آلودگی کنٹرول کا رول بہت ہی اہم ہے۔ کیوں کہ آلودگی بڑھنے سے ماحولیات بگڑتا ہے۔ بڑھتی آبادی، شہروں کا آباد ہونا، صنعتوں کا پھیلاؤ اور معاملات میں بے قاعدگی اور صنعتی ترقی نے ماحولیات کو آلودہ کیا ہے۔ بھارت سرکار نے آلودگی کنٹرول کے لیے پچھلے کئی برسوں سے بہت سی کوششیں کی ہیں اور واضح پالیسیاں تیار کی ہیں۔ پیش کردہ مضمون میں اس سمت میں سرکار کی جانب سے کی جا رہی کوششوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

مرکزی آلودگی کنٹرول بورڈ دیش میں آلودگی کنٹرول پر عمل درآمد کرنے والا سب سے بڑا ادارہ ہے اس کا قیام آبی آلودگی کو ختم کرنے اور اس پر قابو پانے) قانون ۱۹۷۴ء کے تحت ستمبر ۱۹۷۴ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ آلودگی پر قابو پانے کے لیے بھارت سرکار کی جانب سے اٹھایا گیا یہ قدم اس سلسلہ میں سرکار کا مضبوط ارادہ طاقت اور ایمانداری کا نمونہ ہے، اخلاقی طور پر آبی آلودگی کے کنٹرول کے لیے بنایا گیا یہ ادارہ آج ہر ایک طرح کی آلودگی کو کنٹرول کرنے والا سرگرم ادارہ ہے، ہوا (آلودگی ازالہ اور کنٹرول) قانون ۱۹۸۱ء اور ماحولیات (تحفظ قانون ۱۹۸۱ء اور ماحولیات (تحفظ) قانون ۱۹۸۶ء نے مل کر مرکزی بورڈ کے دائرہ اختیار کو پائدار بنایا ہے۔

بھارت سرکار آلودگی کے خاتمہ اور قابو پانے کے لیے جو اقدامات کیے ہیں ان میں آلودگی کنٹرول سے متعلق قانون بہت اہمیت کا حامل ہے اور ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ سال ۱۹۷۴ء سے پہلے آلودگی کنٹرول سے متعلق کوئی باقاعدہ قانون نہیں تھا غیر واضح طور پر فیکٹری ایکٹ ۱۹۴۸ء، بمبئی (ریاستی) ایکٹ ۱۹۲۳ء، ندی (ریور) بورڈ ایکٹ ۱۹۵۶ء انڈین فشریز ایکٹ ۱۹۶۲ء وغیرہ میں دیگر سہولیات کے آلودگی کنٹرول سے متعلق دفعات بھی تھیں۔

ان مختصر دفعات میں مقاصد پورے نہیں ہو پا رہے تھے اس لیے سال ۱۹۶۲ء میں مرکزی وزارت صحت نے گھریلو اور صنعتوں سے نکلنے والے گندے پانی کے بہاؤ سے پیدا آلودگی کے مسئلہ سے نمٹنے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی اس کمیٹی کا خیال تھا کہ سرکار مرکز اور ریاستی سطح پر اس سے متعلق الگ سے قانون بنائے اور اس نظریہ کی بنیاد پر سرکار نے مرکزی سطح پر قانون بنانے کا فیصلہ کیا۔

۲۳ مارچ ۱۹۷۴ء کو صدر جمہوریہ سے منظوری ملنے کے بعد آبی آلودگی کا خاتمہ اور کنٹرول ایکٹ ۱۹۷۴ء کا نفاذ عمل میں آیا اس ایکٹ کی دفعات کے تحت ہر ایک ریاست میں ریاستی آلودگی کنٹرول بورڈ اور مرکزی سطح پر سینٹرل آلودگی کنٹرول بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ریاستی بورڈ کے ذریعہ ایکٹ کی خاص دفعات پر عمل کی غرض سے اقتصادی ضروریات کو ذہن میں رکھتے ہوئے سال ۱۹۷۷ء میں آبی (آلودگی خاتمہ اور کنٹرول) اپ کر ایکٹ ۱۹۷۷ء پاس کیا گیا، ہوا (آلودگی خاتمہ اور کنٹرول) ایکٹ کو نئی سمت دینے اور خطرناک کیمیاوی مادوں اور مضر اثرات کو ذہن میں رکھتے ہوئے حکومت نے ماحو (تحفظ) ایکٹ ۱۹۸۶ء نافذ کیا۔

۱۹ نومبر ۱۹۸۶ء سے نافذ ماحولیات (
ایکٹ ۱۹۸۶ء کا دائرہ اختیار بہت وسیع ہے ماحولیات تحفظ کے سبھی اہم ترین حصوں کو ذہن رکھتے ہوئے مرکزی سرکار کو خاص اختیارات ہیں مثال کے طور پر ماحولیات تحفظ اور بہ کے لیے اقدامات کرنے کی طاقت حکام کی کی ہدایات دینے کا اختیار مختلف طرح کے ماحو پیمانہ آلات قائم کرنے کا حق خطرناک کیمیکلوں کچرے میں کام کرنے والے افراد کی تحفظ کے رہنمائی اصول۔ ماحولیات لیبارٹریوں کی مان (تسلیم کرنا) وغیرہ اسی ایکٹ کے تحت ہیں۔

خطرناک صنعتی سرگرمیوں سے بڑھتے خط اور حادثات کو ذہن میں رکھ کر عوامی ذمہ دا بیمہ ایکٹ ۱۹۹۱ء نافذ کیا گیا۔ ۱۹۸۴ء امکانی خطرہ پر شست پہ بندش اور مہیا قانون بھی بنائے گئے، جس میں خطرناک اور ان کے بے جا استعمال اور بہاؤ سے متع ہدایات ہیں۔

آلودگی کنٹرول پروگرام کو کامیابی کے

نافذ کرنے کے لیے صنعتی دست اور نکاسی کے لیے اسٹینڈرڈ قائم کرنا ضروری ہے۔ مذکورہ آلودگی کنٹرول بورڈ نے اس سلسلہ میں کئی صنعتوں کے لیے کم از کم قومی اسٹینڈرڈ معیار مقرر کیے ہیں، جو تکنک اور اقتصادی طور پر اگر ریاستی بورڈ چاہے تو اسے ضرور سخت کیا جا سکتا ہے۔ آلودہ آبی کوالٹی اور خصوصیات کے لیے اسٹینڈرڈ معیار بنائے گئے ہیں جو حالات اور استعمال پر منحصر ہیں۔ آواز سے متعلق چند علاقوں اور گھریلو آلات کے بھی اسٹینڈرڈ (پیمانے) بنائے گئے ہیں۔ صنعتوں میں کام کر رہے مزدوروں کے لیے بھی آواز کی تیزی اور کام کرنے کے وقت سے متعلق بھی پیمانے بنائے گئے ہیں۔

مرکزی بورڈ نے ریاستی آلودگی کنٹرول بورڈوں کی مدد سے ماحولیات کے سلسلہ میں ۲۴ شہروں اور علاقوں کا پتا لگا کر انھیں آلودگی سے پاک کرنے کے لیے معیاری منصوبہ تیار کیا۔ یہ شہر اور علاقے ۱۵ ریاستوں اور ایک مرکز کے زیر انتظام پردیش میں لاگو ہے، اس کے علاوہ ۲۸ ندیوں میں ۱۴ آلودہ ندیوں کا پتا لگا کر ان کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔

مرکزی ماحولیات اور جنگلات وزارت اور سینٹرل کنٹرول بورڈ نے ۱۷ سیریز کی صنعتوں کا انتخاب کیا جن سے آلودگی کا امکانی خطرہ بہت زیادہ ہے، اس سیریز کی کل ۱۵۵۱ صنعتیں دیش بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سینٹرل بورڈ اور ریاستی بورڈوں نے ان صنعتوں میں آلودگی کنٹرول پر زیادہ توجہ دی جس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ دستیاب عدد وشمار کے مطابق ان میں سے ۱۱۵۴ صنعتیں مقرر کردہ اسٹینڈرڈ کو پورا کر رہی ہیں اور ۸۷ صنعتیں بند ہو چکی ہیں۔ باقی صنعتوں میں آلات نصب کیے جا رہے ہیں۔ ماحولیاتی تحفظ میں پربھودھن کی بہت اہمیت ہے کیوں کہ پورے عدد وشمار یات کی کمی کی صورت میں مفصل حکمت عملی بننا مشکل ہے، عدد وشمار کے لیے بہت سی ندیوں میں ۴۸۰ مقامات پر ہر ماہ جائزہ لیا جاتا ہے۔ راشٹریہ پر آلودہ آبی کوالٹی پربھودھن مشن کے تحت ۲۹۰ مرکز منظور ہیں جو دیش کی ریاستی، صنعتی کاروباری اور حساس ترین علاقوں میں قائم ہیں اور کئی مقامات ساحل کے کنارے کا بھی پربھودھن کیا جا رہا ہے۔ آواز کی رفتار ناپنے کے لیے ایسی کوئی مشین نہیں ہے جس سے وقتاً فوقتاً مختلف علاقوں میں آواز کی رفتار ناپی جائے۔

مرکزی بورڈ نے آلودگی کو کم کرنے کے لیے دیگر وزارتوں اور اداروں کو بھی تلقین کی ہے۔ وزارت صنعت، وزارت ٹرانسپورٹ اور وزارت پٹرولیم کی مشترکہ کوششوں سے سال ۱۹۹۵ء کے ماہ اپریل سے سیسہ سے پاک پٹرول کی فروخت شروع کر دی گئی ہے اور بہت جلد ہی کیٹلے ٹیک کنونٹر کاریں بھی چلنے لگیں گی۔ اس سے شہروں کی آلودہ ہوا میں بہتری آئے گی۔ میٹروپولیٹن شہروں میں ہوا آلودگی کی خاص وجہ گاڑیوں سے نکلنے والا دھواں ہے۔ دہلی میں ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کل ہوا میں آلودگی میں ۲۵ فی صد حصہ گاڑیوں کی دین تھی جو ۱۹۹۰ء کی دہائی میں یہ آلودگی کی سطح ۶۰ فی صد تک پہنچ گئی اور اگر اس پر قابو نہیں پایا گیا تو ۲۰۰۰ء تک صرف گاڑیوں کی وجہ سے ہی ۷۵ فی صد ہوا آلودہ ہو گی۔ سینٹرل بورڈ نے کئی برس پہلے گاڑیوں سے دھواں نکلنے کے لیے اسٹینڈرڈ (پیمانے) تیار کیے تھے اب کاروں میں کیٹلے ٹینک کنوتیٹر لگانے سے آلودگی کا زور بہت کم ہو جائے گا، سیسہ سے پاک پٹرول (لیڈ پٹرول) نہیں ہو گا۔ سیسہ ایک زہریلی دھات ہے اس سے بچوں کے دماغی صحت پر برا اثر اور حاملہ عورت کے پیٹ میں پل رہے بچوں کے لیے نقصان دہ ہے۔

انڈین اسٹینڈرڈ بیورو نے سینٹرل بورڈ کی پہل پر "پریاورن مترا تپادا" کے لیے لائسنس جاری کرنا شروع کر دیا ہے۔ تھرمل بجلی گھروں میں ہوا آلودگی کے آلات لگا دیے گئے ہیں لیکن زیادہ تر آلات مقررہ صلاحیت سے کام نہیں کر پا رہے تھے، اس لیے اب ایکشا کرت صاف تکنیک کی توجہ دی جا رہی ہے جس سے کم آلودگی پیدا ہو کوئلہ کو صاف کرنا اور دھونا ایسا ہی ایک قدم ہے بجلی گھروں میں جو کوئلہ کام میں آتا ہے اس میں راکھ کی مقدار ۴۲ فی صد ہے۔ اندازہ ہے کہ کوئلہ صاف کرنے اور دھونے کے بعد یہ مقدار ۳۴-۳۲ فی صد ہو جائے گی۔ اس میں توانائی کی بچت اور آلودگی میں کمی ہو گی اس طرح کے کوئلہ کے استعمال سے سلفر ڈائی آکسائڈ کی نکاسی بھی کم ہو گی۔ زیادہ تر نئے بھاپ بجلی گھروں اور پرانے قائم بجلی گھروں میں ایسے کوئلے کا استعمال شروع کر دیا ہے۔

آلودگی کنٹرول سے متعلق تکنیکی کتابیں مختلف قسطوں میں سینٹرل بورڈ شائع کرتا ہے۔ اس طرح عام آدمیوں کو آلودگی کی وجوہات اور اثرات کی معلومات وقت وقت پر کتابوں اور کتابچوں کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ آلودگی کنٹرول میں لوگوں کی ساجھے داری بڑھانے کے لیے اس سمت میں کام کر رہی بہت سی غیر سرکاری تنظیموں کو رجسٹرڈ کیا گیا ہے ان کے ذریعہ سے آبی آلودگی مطالعہ کے آلات اور کتابیں تقسیم کی جائیں گی۔ ماحولیات آلودگی سے متعلق عوامی شکایات پر فوراً کارروائی بھی کی جاتی ہے۔

سینٹرل بورڈ نے مختلف موضوعات پر ٹریننگ پروگرام منعقد کر کے دیش کو اس سلسلے میں ایک بہتر پیمانہ وسائل دیا ہے اس آلودگی کنٹرول کے پروگرام کو بہت تقویت ملی ہے۔ اب صاف ستھری تکنیک کے پروپیگنڈہ و فروغ کے لیے کوشش کی جا رہی ہے صاف ہے کہ آلودگی کنٹرول کے لیے ایک کارگر پالیسی ہے اور سینٹرل بورڈ نے آلودگی پر قابو پانے کے لیے بہت سے اقدامات کیے ہیں لیکن اس میں ایک عام انسان کا کردار بھی اہم ہے اور ہر ایک شہری کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا ہو گا تبھی ہمارا ماحول آلودگی سے پاک ہو سکے گا۔ ●

آپ

"یوجنا" (اردو) کی توسیع اشاعت کے لیے کیا کر رہے ہیں؟ کیا آپ نے:

۱۔ اسے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے حلقے میں متعارف کرایا؟

۲۔ کیا آپ نے انھیں بتایا کہ "یوجنا" اردو زبان میں شائع ہونے والا واحد رسالہ ہے جو ہندوستان کی منصوبہ بند ترقی سے آگاہ کرتا ہے اور طلبا، خاص طور سے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے والے طلبا کے لیے اس کا مطالعہ بے حد مفید و معاون ہے؟ یوجنا (اردو) ادبی گوشہ بھی پیش کرتا ہے جس کا مقصد شعر و ادب کے ذریعے ملک و قوم کی ترقیاتی سرگرمیوں کو اجاگر کرنا ہے۔

۳۔ کیا آپ نے اب تک "یوجنا" اردو کا ایک بھی خریدار نہیں بنایا؟ اگر نہیں تو ابھی پہل کیجیے۔ ●

ڈاکٹر گنیش کمار پاٹھک

ماحولیات کے تحفظ میں عورتوں کا کردار

تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان کی عورتیں کسی بھی میدان میں مردوں سے کم نہیں ہیں چاہے جنگ آزادی میں ساجھے داری کی بات ہو یا فن کا میدان ہو یا ادب کا میدان ہو یا سماجی خدمات کا میدان ہو اور ہمت بھرے کارناموں کا میدان ہو بھارت کی خواتین ہمیشہ ہی مردوں سے آگے رہیں ہیں بھلا ماحولیات کے تحفظ میں بھارت کی خواتین پیچھے کیوں رہیں۔ سب سے پہلے ہم اپنی تہذیب کا مطالعہ کریں اور سماجی رسوم اور ریتی رواجوں کو دیکھیں تو یہ پتا چلتا ہے کہ دور قدیم سے ہی خواتین ماحولیات کے تحفظ کے تئیں بیدار ہیں جس کا پختہ ثبوت آج بھی مہلاؤں کے ذریعہ برت تہوار کے موقع پر یا یوں ہی روزمرہ کاموں یا پوجا ارچنا میں کئی پیڑوں یعنی پیپل، تلسی، آنولا، اشوک، بیل، شمی، نیم، آم وغیرہ پیڑوں اور کئی پھولوں اور مختلف طرح کے جانوروں یعنی گائے، بیل، چوہا، گھوڑا، سانپ، بندر، آلو وغیرہ کو شامل کرنا اور ان کی پوجا ارچنا کے ذریعہ سے تحفظ دینا دیکھنے کو مل جاتا ہے اسی طرح ہماری عورتوں میں نہ صرف پیڑ پودوں، جانوروں اور پرندوں کے تئیں بھی تحفظ کا تصور دور قدیم سے چلا آرہا ہے، یہی نہیں پینے کے پانی کے تئیں بھی تحفظ کا جذبہ خواتین میں دور قدیم سے ہی قائم ہے، جیسے گنگا کی پوجا، کنوؤں کی پوجا کرنا اور تالاب کی پوجا کرنا۔

اس طرح سے صاف ہے کہ اس پوری صورت حال کو بنائے رکھنے کے تئیں عورتیں ہی آگے رہیں ہیں۔

ہماری ہندوستانی تہذیب میں رچی بسی خواتین کے ذریعہ نیچر کا تحفظ اور ماحولیا تحفظ کا یہ جذبہ پیڑھی در پیڑھی سے چلا آرہا ہے اور یہ آج بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔

یہاں ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ بھارت کے سماجی ڈھانچہ میں جہاں خواتین کی نسبت مرد کو کئی گنا زیادہ اہمیت اور سہولت ہے خاص طور پر دیہی علاقوں میں ماحولیاتی آلودگی نے خواتین کے طرز زندگی کو بری طرح سے متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماحولیات اور نیچر سے سیدھی طرح سے رابطہ قائم رکھنے کی وجہ سے یہ دیہی خواتین ماحولیات کے تحفظ کے تئیں زیادہ مستعد ہیں۔

آج ایسے میدانوں میں جہاں اندھا دھند پیڑ کاٹے جا رہے ہیں خواتین کو جلانے کے لیے لکڑی جمع کرنے کی غرض سے کئی کلومیٹر دور جانا پڑتا ہے خاص طور پر ریگستانی علاقوں اور پٹھار اور پہاڑی علاقوں میں پانی لانے کی ذمہ داری بھی خواتین پر ہے۔ ایک ایک گھڑا پانی پینے کے لیے ۱۰-۱۵ کلومیٹر دور تک پیدل چلنا پڑتا ہے۔

اس طرح سے صاف ہے کہ ان قدرتی وسائل یعنی جنگلات، مٹی اور پانی سے خواتین کا سیدھا گہرا تعلق ہے یہی وجہ ہے کہ عورتوں کو اس کا محافظ مانا گیا ہے خاص طور پر آدی واسی لوگوں میں جنگلات سمپدا کی معیشت میں خاص کر عورتوں کی ساجھے داری خاص طور پر اہمیت کی حامل ہو گئی ہے اور عورتیں اس کے تئیں پیداوار میں بھارت کے پہاڑی علاقوں میں اپنی پہچان بنا چکی ہے۔ چپکو تحریک نے ماحولیات کے تحفظ خاص طور پر جنگلات کے تحفظ کی سمت ایک نیا ولولہ پیدا کیا ہے۔ یہ تحریک دراصل خواتین سے جڑی ہوئی ہے اور اس تحریک نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو کام مرد نہیں کر سکتے اسے خواتین کر سکتی ہیں۔ چپکو تحریک اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

چپکو تحریک کی اہم کرتا دھرتا مہلائیں ہی ہیں۔ راجستھان کی بشنوئی برادری کی خواتین نے اس سلسلے میں ایک نرالی مثال پیش کی ہے۔ تھار ریگستان کے درمیان میں آباد بشنوئی برادری کی بستی ایک نخلستان کی طرح درختوں گھری ہوتی ہے یہ اس برادری کی خواتین کا پیڑوں کے تئیں صبر کا ہی پھل ہے۔ ان کے سماج میں ایک لوک کہانی مشہور ہے دور قدیم میں جب راجہ کے نوکر اور ملازمین راج محل بنانے کے لیے پیڑوں کو کاٹنے جاتے تھے تو بچانے کی نیت سے عورتیں پیڑوں سے لپٹ جاتی تھیں اور کرمچاری بے رحمی کے ساتھ پیڑوں کے ساتھ خواتین کو بھی کاٹ دیتے تھے۔ جب راجہ نے یہ سنا کہ پیڑوں کے ساتھ خواتین بھی کاٹ ڈالی جا رہی ہیں تو راجہ نے ان علاقوں میں جنگلوں کو کٹوانا روک دیا اس طرح بشنوئی برادری کی خواتین نے نہ صرف اس وقت پیڑوں کی حفاظت کی بلکہ ایک تاریخ بھی بنا دی جو آج بھی عورتوں کے لیے سبق کا کام کر رہی ہے اور آج بھی پہاڑوں پر مہلائیں یہی طریقہ اپنا کر پیڑوں کو بچانے میں لگی ہوئی ہیں۔

موجودہ وقت میں یہ چپکو تحریک اتر پردیش کے پہاڑی علاقوں۔ چمولی، کمایوں گڑھوال سے، پتھوڑا گڑھ وغیرہ سے شروع ہوئی اور جنگلوں کی تباہی کے خلاف کامیاب تحریک کی شکل میں اس کی تعریف کی گئی۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس تحریک کو چلانے والی خواتین پہاڑی دیہی علاقوں کی بسنے والی ناخواندہ اور جاہل عورتیں ہیں اور یہ عدم تشدد

پر مبنی تحریک دنیا کی تاریخ کو خواتین کی ایک قیمتی دین ہے، یہ تحریک ان کی اپنی زندگی کی حفاظت کی تحریک ہے۔ ان خواتین نے اپنی تحریک کو اس طرح سے منظم کیا ہے کہ ان کے دیہات پر ایک خاندان جنگلوں کی حفاظت کے لیے سیکورٹی ملازم تعینات کر کے اجتماعی چندہ مہم سے ان کی تنخواہ کی ادائیگی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ان خواتین کی ڈکشنری میں ناممکن کا کوئی لفظ نہیں۔ اس تحریک کی پیش کردہ اور رہنما گائتری دیوی ہیں جنھوں نے اعلان کیا ہے کہ جنگلوں اور ماحولیات کی حفاظت کی غرض سے مسلسل جدوجہد جاری رہے گی۔

راجستھان کے ادے پور کے قریبی دیہی علاقوں کی خواتین مردوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملاکر آگے ہیں اور ریتیلی زمین کو ہرے بھرے کھیتوں میں تبدیل کر رہی ہیں۔ ''سیوا منڈل'' نام کی ایک تنظیم نے پسماندہ بھیل طبقہ کو اتنا زیادہ متاثر کیا ہے کہ اب وہ سیکڑوں برسوں سے ویران پڑی زمین کو ہرا بھرا بنانے میں لگ گیا ہے۔ یہ تنظیم ادے پور کے ڈیولپمنٹ زون کی حفاظت میں بڑی ہمت کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ ان کی اسی ہمت اور کامیابی کو دیکھتے ہوئے ہی ماحولیا تحفظ کے لیے سال ۱۹۹۱ء کے۔ پی گو ینکا ایوارڈ ان خواتین کی طرف سے بنائی گئی سیوا منڈل نام کی تنظیم کو ملا ہے۔ ہماچل پردیش کی خواتین بھی ماحولیات تحفظ پروگرام میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ یہاں خواتین چھوٹے چھوٹے گروپ بنا کر تحریک میں سرگرم ساجھے داری نبھا رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اخبارات میں تذکرہ تک نہیں۔ ہماچل پردیش میں ہی رام پور پرگنہ میں لو روٹام کا ایک گاؤں ہے گاؤں کی خواتین نے دیودار میں پیڑوں کو کاٹنے سے بچا کر اچھا خاصہ تہلکہ مچا دیا ہے۔ کیشو دیو نام کی ایک عورت کی زمین پر دیودار پیڑ لگائے تھے جب اس کی موت ہو گئی تو اس کا لڑکا ان پیڑوں کو کاٹ کر اس زمین کا استعمال دوسرے کاموں میں کرنا چاہتا تھا لیکن مقامی مہیلا منڈل سے وابستہ خواتین سرگرم ہو گئیں اور انھوں نے پیڑوں کو کاٹے جانے کی کوشش کو ناکام کر دیا۔

نرمدا بچاؤ تحریک کو لے کر ادھر میدھا پاٹیکر بھی کافی مقبول رہیں اس میں انھیں اس تحریک کے لیے جیل بھی جانا پڑا ہے۔ ماحولیاتی تحفظ میں ان کے سرگرم کردار کو دیکھتے ہوئے انھیں بین اقوامی ''گرین رین ہیلپ یاورن ایوارڈ'' سے نوازا گیا ہے جو نوبل ایوارڈ کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ ان کو ایک کے بعد کئی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مس وندنا شیوا بھی اس طرح کی سرگرم ماحولیات ورکر ہیں۔ ماحولیات تحفظ میں ان کے کام کو دیکھتے ہوئے ہی انھیں سال ۱۹۹۳ء کے ''رائٹ سووی ہڈ'' بین اقوامی ماحولیات ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

اس طرح سے صاف ہے کہ ماحولیاتی تحفظ میں خواتین نے خاص کردار نبھایا ہے اور خاص طور پر دیہی علاقوں کی خواتین کے تعاون کو تو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا ہے۔ ●

بقیہ: دیہی ترقی کے چند اہم عناصر

ہے جو حیاتیاتی جرثوموں کی ملاوٹ سے پاک ہو یعنی جس کے پینے سے ہیضہ نہ ہو، میعادی بخار نہ ہو اور جس میں فاضل فلورائیڈ کھاری پن، فاضل لوہا وغیرہ نہ ہو۔

آٹھویں منصوبے میں دیہی ترقیاتی حکمت عملی

۱۔ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والی آبادی کو صفائی ستھرائی کی سہولتیں، پینے کے پانی کی سہولت، بیماریوں سے نجات اور گندگی کے سبب پھیلنے والی بیماریوں سے روک تھام۔

۲۔ صحتی تعلیم اور صحت کے بارے میں عوامی شعور بیدار کرنا اور ان کاموں میں رضاکارانہ اداروں کا تعاون حاصل کرنا۔ صاف ستھرے سنڈاس بنانا اور سرکاری سبسڈی پر انحصار کو کم کرنا۔

۳۔ ہاتھ سے صفائی کا عمل کم کرنا۔ دیہات میں کم خرچ فلش سسٹم پر مبنی سنڈاس قائم کرنا۔

آٹھویں منصوبے میں غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے کنبوں کو سبسڈی دی جائے گی۔

منتخبہ علاقوں میں صفائی ستھرائی خاص کر سینیٹری سنڈاس کے لیے بھرپور مہم چلائی جائے گی۔

ہندوستان میں ترقیاتی پروگراموں کا کوئی بھی عمل دیہات کی ترقی، صفائی، ستھرائی اور وہاں روزگار کے مواقع پیدا کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ لہٰذا ہندوستان کی منصوبہ بند ترقی میں شروع ہی سے دیہات کی ترقی کو اہمیت دی گئی ہے۔ آٹھویں منصوبے کے آخر تک دیہی علاقوں کی ترقی کا عمل اس طرح ترقی پا سکے گا جس سے وہاں کے عوام کو معیاری زندگی گزارنے کے طریقے میسر آ جائیں اور وہ ہندوستان کے بحیثیت مجموعی ترقی کے ڈھانچے میں ایک مناسب مقام حاصل کر سکیں۔ ●

مصنوعی سیارے کے ذریعے منی آرڈر خدمت میں توسیع

ڈاک کا محکمہ ملک میں ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ء تک ۷۵ بہت چھوٹے اپرچر ٹرمنلوں پر مشتمل نیٹ ورک کے قیام کی توقع رکھتا ہے تاکہ منی آرڈروں کی ترسیل مصنوعی سیارے کے ذریعہ ممکن ہو سکے ان ٹرمنلوں کے قیام کے لیے کام تکمیل کے مختلف مراحل میں ہے۔ چھوٹے اپرچر والے ٹرمنل بنگلور، بمبئی، دہلی، لکھنؤ، مدراس، پٹنہ، شملہ وغیرہ میں پہلے ہی لگائے جا چکے ہیں۔ دوسرے مرحلے کے تحت ایسے مزید ۲۰۰ مراکز کا اضافہ کر لیا جائے گا تاکہ پورے ملک پر احاطہ کیا جا سکے۔

مذکورہ وسیلے سے منی آرڈر کے ذریعہ نقد رقم منتقل کرنے کے کام میں تیزی لائی جا رہی ہے اور اس خدمت کو صارفین کی ضروریات سے مزید ہم آہنگ کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر سید مسعود حسین جعفری

نمکیات اور نائٹریٹ سے آبی آلودگی کیوں اور کیسے؟

زراعت میں بہتر پیداوار کا انحصار پانی، کھاد اور زمین کی زرخیزی پر ہے۔ ہمارے ملک میں بارش کا سالانہ اوسط تقریباً ۱۱۷ سینٹی میٹر ہے عالمی ریکارڈ کے مطابق دنیا کے کسی بھی ملک میں سالانہ بارش کا اس سے بہتر معیار نہیں ملتا۔ جائزے کے مطابق ملک میں بارش کے ذریعہ ملنے والی آبی صلاحیت چار ہزار لاکھ ہیکٹیئر میٹر ہے جب کہ تالابوں اور جھیلوں کے پانی کا مجموعی اندازہ ۱۸۰۰ لاکھ ہیکٹیئر میٹر ہے۔ تیسرا آبی وسیلہ زیر زمین آبی ذخیرہ ہے جس کا تخمینہ ۴۲۰ لاکھ ہیکٹیئر میٹر ہے لیکن اس ذخیرے سے اب تک ۵۰ فی صد حصہ کام میں لایا جاسکا ہے۔ بارش کا تقریباً ۱۶۰۰ لاکھ ہیکٹیئر میٹر دریاؤں کے ذریعہ بہہ کر سمندر سے جاملتا ہے اور اندازے کے مطابق ۱۷۰ لاکھ ہیکٹیئر میٹر پانی کو بڑے ڈیموں یا تالابوں میں اکٹھا کر کے سینچائی کے کام میں لاتے ہیں۔ باقی تعداد جو تقریباً ۷۰ لاکھ ہیکٹیئر میٹر ہوتی ہے جذب ہو کر زیر زمین آبی ذخیرے سے جاملتی ہے۔

ان اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہے کہ ملک کی آبی صلاحیت اطمینان بخش ہے پھر بھی زمین کا غیر معمولی رقبہ القلی اور آبی نمکیات سے متاثر ہے جسے اوسر یا بنجر کہتے ہیں۔

اوسر زمین کا وجود تین وجوہ سے ہے ۱۔ علاقائی بارش کی کمی ۲۔ شدید درجۂ حرارت ۳۔ سینچائی کے پانی میں نمکیات کی کثرت۔ نمکین پانی کے اہم اجزاء سوڈیم (SODIUM)، بوران (BORON) اور کاربونیٹ (CARBONATE) ہیں۔ اگر ان کی تعداد نقطۂ فاصل (CRITICAL POINT) سے تجاوز کرتی ہے تو یہ پانی زمین کی زرخیزی کے لیے مضر ہے۔ یہاں تک کہ مسلسل آبپاشی سے مٹی میں شوریت اور نمکیات کی کثیر المقداری کے سبب زمین اوسر اور بنجر میں تبدیل ہو جائے گی۔ لہٰذا احتیاطی طور پر آبپاشی سے پیشتر پانی کا کیمیائی تجزیہ ضروری ہے۔

تحلیل نمکیات کی مقدار جاننے کے لیے کئی پیمانے مروج ہیں۔ انھیں کی بنیاد پر شوریت کے حسب ذیل درجات ہیں۔ ۱۔ برقی موصلیت (ELECTRICAL CONDUCTIRITY) جس کی اکائی مائیکرومہو فی سینٹی میٹر (MICRO mho/cm) ۲۵ سینٹی گریڈ درجۂ حرارت پر معیاری ہے۔ ۲۔ سوڈیم کا انجذابی تناسب SOUDIUM ABSORPTION RATIO یا صرف SAR لکھتے ہیں اور تیسری اکائی ۳۔ پانی میں اجزاء کی تعداد فی لیٹر ناپی جاتی ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

بہ لحاظ شوریت پانی کی درجہ بندی	برقی موصلیت (مائیکرومہو فی سینٹی میٹر۔ ۲۵ سینٹی گریڈ درجۂ حرارت پر)
۱۔ متوسط	۲۵۰ سے کم
۲۔ اوسط سے زیادہ	۲۵۰ سے ۷۵۰ تک
۳۔ زیادہ	۷۵۰ سے ۲۲۵۰ تک
۴۔ بہت زیادہ	۲۲۵۰ سے ۵۰۰۰ تک

گوشوارہ نمبر ۲

بہ لحاظ سوڈیم کا انجذابی تناسب

(SODIUM ABSORPTION RATIO SAR)

شوریت کے درجات

شوریت کے درجات	سوڈیم کا انجذابی تناسب (SAR)
۱۔ کم	۱۰ سے کم
۲۔ معتدل	۵ سے ۱۰ تک
۳۔ زیادہ	۱۸ سے ۲۶ تک
۴۔ بہت زیادہ	۲۶ سے زیادہ

گوشوارہ نمبر ۳

بوران (BORON) اور کاربونیٹ (CARBONATE) اجزاء کے مطابق شوریت کے درجات

شوریت کے درجات	اجزاء میں معادل فی لیٹر پانی (MILLI EQUIVALENT PER LITRE)
۱۔ محفوظ	۱/۲۵ سے کم
۲۔ حاشیائی	۱/۲۵ سے ۲/۵ تک
۳۔ غیر مناسب اور مضر	۲/۵ سے زیادہ

شوریت اور نمکیات کے علاوہ پانی میں تحلیل نائٹریٹ (NITRATE) کے اجزاء کا روز افزوں اضافہ بھی تشویشناک ہے کیوں کہ آئندہ یہ انسانی صحت کے لیے سنگین مسئلہ بن سکتا ہے۔ ایک طرف انسانی

باقی صفحہ ۳۳ پر

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف شوگر کین ریسرچ۔ لکھنؤ

ڈاکٹر کلدیپ سنگھ

آبپاشی کے لیے ناقص پانی کا استعمال

فصلیں اگانے کے لیے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ ہے پانی۔ پانی کے بغیر کوئی چیز، حتیٰ کہ پودے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ آزادی کے ۴۸ سال بعد آج بھی ہمارے ملک میں ۷۰ فی صد زمین ایسی ہے جس پر آبپاشی کا انتظام نہیں ہے اور جو پانی کے لیے مون سون کے رحم و کرم کی محتاج ہے۔ ملک کے خشک اور نیم خشک علاقوں میں زیر زمین پانی کی کوالٹی ہر جگہ اچھی نہیں ہے۔ تازہ پانی کی کمی کے وجہ سے کاشت کاروں کو خراب کوالٹی کا پانی استعمال کرنا پڑتا ہے جس کے طویل مدتی استعمال سے مٹی خراب ہو جاتی ہے۔ ناقص کوالٹی کے زیر زمین پانی کے اندھا دھند استعمال فصلوں کی پیداوار پر خراب اثر پڑتا ہے۔ اس اثر کے حجم کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ پانی میں حل ہو جانے والے نمکیات کس کوالٹی کے ہیں اور کتنی مقدار میں پانی میں گھل کر فصل میں جذب ہوتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق ملک میں زیر زمین پانی کے ۳۲٫۸۳ فی صد ذخائر کا پانی ناقص کوالٹی کا ہے۔

آبپاشی کے لیے نہروں کا پانی سب سے عمدہ ہوتا ہے کیوں کہ اس میں گھلے ہوئے نمکیات کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ چوں کہ نل، کنوئیں یا ٹیوب ویل سے پانی کی سپلائی یقینی ہوتی ہے اس لیے آزادی کے بعد ملک میں ٹیوب ویلوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ زیر زمین پانی کے ٹیوب ویل کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جس کے پانی میں نمکیات کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں اس لیے آب پاشی کے لیے ان کے پانی کے لگاتار استعمال سے مٹی کی کوالٹی خراب ہو جاتی ہے اور زرعی پیداوار بھی متاثر ہوتی ہے۔ کھیتوں کے مشاہدات سے معلوم ہوا ہے کہ خشک اور نیم خشک علاقوں کے کاشت کار کھیتوں میں ایسا پانی استعمال کرتے ہیں جو آبپاشی کے لیے ناموزوں ہوتا ہے۔ یہ پانی یا تو کھاری ہوتا ہے (جس میں سوڈیم کلورائیڈ اور سوڈیم سلفیٹ ہوتا ہے) یا کافی الکلی اور سوڈیم کاربونیٹ اور بائی کاربونیٹ والا ہوتا ہے۔ کچھ جگہوں کے پانی میں زہریلے اجزار بھی ہوتے ہیں۔

جہاں اچھی کوالٹی کا پانی کافی مقدار میں دستیاب نہیں ہوتا وہاں ناقص کوالٹی کا پانی بھی آب پاشی کے اضافی وسیلے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ سمجھداری اور سائنٹفک انداز سے استعمال کیا جائے۔ ناقص کوالٹی کا یا زمین کے نیچے کا کھاری پانی آبپاشی کے لیے استعمال کرنے سے آبپاشی کے کم وسائل میں اضافہ ہوگا اور جن علاقوں میں آبپاشی کے لیے نہروں کا پانی استعمال کیا جاتا ہے ان میں زیر زمین پانی کی بڑھتی ہوئی سطح کو کم کرنے میں مدد ملے گی۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ٹیوب ویلوں، نل کنوؤں کے زیر زمین پانی کی مٹی اور پانی کی جانچ کرنے والی لیباریٹریوں سے جانچ کروائی جائے تاکہ آبپاشی کے لیے پانی کی کوالٹی کا پتا چل سکے اور اگر اس میں کچھ خرابی ہے تو یہ معلوم ہو سکے کہ یہ خرابی کس حد تک ہے۔ آبپاشی کے لیے ایسے پانی کی سفارش نہیں کی جاتی جس میں نمکیات بہت زیادہ مقدار میں موجود ہیں۔ لیکن جس پانی میں نمک یا الکلی بہت کم مقدار میں ہوا سے چند مخصوص طریقوں سے آبپاشی کے لیے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ بھارت میں مسئلہ زمینی پانی میں بہت زیادہ نمک کی موجودگی کا ہے یا پھر بہت زیادہ سوڈیم کاربونیٹس کی موجودگی کا۔ لیکن ملک کے مختلف حصوں میں زمینی پانی کے اجزائے ترکیبی مختلف ہیں۔ مشاہدات سے معلوم ہوا ہے کہ زمینی پانی میں نمکیات یا الکلی کی موجودگی کا مسئلہ خاص کر راجستھان، ہریانہ اور اتر پردیش میں زیادہ شدید ہے (دیکھیے گوشوارہ نمبر ۱) مختلف علاقوں میں زمینی پانی کے اجزار میں فرق کی وجوہ، پانی کی گہرائی، بڑی بڑی نہروں سے نزدیکی، موسمی حالات، زمین سے استعمال کے لیے نکالے جانے والے پانی کی مقدار وغیرہ بتائی جاتی ہیں۔ اس لیے الگ الگ علاقوں میں پانی کے بندوبست کے لیے الگ الگ طریقے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

آبپاشی کے لیے ایک لمبے عرصے تک نمکیات یا الکلی والے پانی کے استعمال سے مٹی میں نمک جمع ہو جاتا ہے جس کی مقدار کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ آب پاشی کے پانی میں کتنا نمک یا کتنی الکلی موجود ہے، مٹی کس قسم کی ہے، موسمی حالات کیسے ہیں اور ناقص کوالٹی کا پانی کتنے عرصے تک استعمال کیا گیا ہے۔ ملک کے کچھ حصوں میں جہاں مٹی کھردری قسم کی ہے کاشت کار آب پاشی کے لیے ایسا پانی بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کرتے رہے ہیں جس میں الیکٹریکل کنڈکٹی وٹی (ای سی) اور آر ایس سی یعنی بچے کھچے سوڈیم کاربونیٹ کافی مقدار میں ہوتے ہیں۔ آبپاشی کے لیے سوڈک (SODIC) پانی کے لگاتار استعمال سے MICRO NUTRIENTS خصوصاً جست، لوہے اور مینگنیز کی دستیابی کم ہو جاتی ہے کیوں کہ کاربونیٹ نمک ان اجزار کو بے اثر کر دیتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ آب پاشی کے پانی میں ای سی،

آر ایس سی اور ایس اے آر کی سطح بڑھ جانے سے فصلوں کی پیداوار کم ہو جاتی ہے اور یہ کمی نمکیات سے جلد متاثر ہونے والی فصلوں مثلاً مکئی کی پیداوار میں گیہوں اور چاول جیسی زیادہ قوت برداشت رکھنے والی اجناس کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ مٹی کی طاقت بڑھانے والے اجزا کے استعمال سے پیداوار بڑھتی ہے اور اجناس کی قوت برداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ٹیوب ویل لگانے سے پہلے پانی کی جانچ اور تجزیہ کروانا بہت ضروری ہے کیوں کہ بعض قسموں کے میٹھے لگنے والے سوڈک یا تیلیا پانی بھی آب پاشی کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک طرح کا پانی تمام قسموں کی زمینوں، فصلوں یا موسموں میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

کوالٹی کے لحاظ سے پانی کی زمرہ بندی

ملک کے مختلف حصوں میں کوالٹی کے لحاظ سے پانی کی زمرہ بندی کے لیے وقتاً فوقتاً کئی اصول تجویز کیے جاتے رہے ہیں۔ ان زمرہ بندیوں میں یا تو ای سی اور ایس اے آر کو یا ای سی اور آر ایس سی کو ملحوظ رکھا گیا۔

گوشوارہ نمبر ۱

کچھ ریاستوں میں مختلف زمروں کے پانی کا فی صد تناسب

نمبر شمار	نام ریاست	اچھا	حاشیائی	خراب
۱۔	پنجاب	۵۰	۲۲	۱۹
۲۔	ہریانہ	۳۷	۸	۵۵
۳۔	راجستھان	۱۶	۱۶	۶۸
۴۔	اتر پردیش	۱۷	۴۰	۴۳
۵۔	مدھیہ پردیش	۷۵	۱۰	۱۵
۶۔	گجرات	۷۰	۲۰	۱۰
۷۔	کرناٹک	۶۵	۱۰	۲۵
	اوسط	۵۱	۱۵	۱۴

پانی کا نمونہ کیسے لیں؟

پہلے ٹیوب ویل کو کم از کم نصف گھنٹہ چلانا ضروری ہے۔ اس کے بعد پانی کا نمونہ ایک ایسی بوتل میں لیا جانا چاہیے جو دھو کر صاف کر لی گئی ہو اور اچھی طرح سے سکھا لی گئی ہو اور جس پر موزوں لیبل لگا دیا گیا ہو۔ تجزیہ کے واسطے صرف ۲۵۰ تا ۳۰۰ ملی میٹر پانی کافی ہوگا۔ اگر ٹیوب ویل کافی وقت پہلے سے چل رہا ہو اور فصل کی پیداوار گھٹ رہی ہو تو پانی کا نمونہ لینے کے ساتھ ہر ایکڑ زمین کی ۹ تا ۱۰ سینٹی میٹر گہرائی سے مٹی کا نمونہ بھی لیا جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ فصلوں کی ادلا بدلی، بندوبست کے زیر استعمال طریقوں، فصل کی پیداوار اور پانی کب سے آبپاشی کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس بارے میں تمام اطلاعات بہم پہنچائی جانی چاہئیں تاکہ درست اور کارآمد سفارشات پیش کی جا سکیں۔

آبپاشی کے لیے گھٹیا درجے کے پانی یا نمکیات یا الکلی والے پانی کے محفوظ استعمال کے لیے ذیل میں کچھ ہدایات پیش کی جا رہی ہیں:-

۱۔ ہلکی ساخت کی مٹی کا استعمال

ناقص کوالٹی کا پانی آب پاشی کے لیے استعمال کرنے پر ہلکی ساخت کی مٹی میں پانی کے نمکیات کی تقطیر بہت آسانی سے ہوتی ہے کیوں کہ اس میں وہ جلدی جذب ہو جاتے ہیں۔ چونکہ مٹی ساخت کی مٹی میں تقطیر میں دیر لگتی ہے اس لیے پانی زیادہ دیر تک سطح ہی پر کھڑا رہتا ہے اور جب وہ بخارات بن کر اڑنے لگتا ہے تو نمکیات یا الکلی سطح پر باقی رہ جاتی ہے۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے ناقص پانی سے آبپاشی ہلکی ساخت کی مٹی والی زمین پر ہی کی جانی چاہیے۔

۲۔ زمین کو بخوبی ہموار کر لیں

زمین کو مناسب طور پر ہموار کر لینے سے ساری زمین پر نمکیات پانی کی تقطیر یکساں ہوتی ہے۔

۳۔ پانی کے نکاس کا معقول انتظام کیجیے

جن زمینوں پر پانی کے نکاس کا انتظام درست نہیں ہوتا اور جن کی مٹی معمولی سی گہرائی پر سخت ہوتی ہے ان پر طویل عرصے تک ناقص پانی سے آبپاشی کرنے سے نمکیات مٹی میں تیزی سے جمع ہونے لگتے ہیں اس لیے جن زمینوں پر ناقص پانی سے آبپاشی کرنی ہو وہاں پر پانی کے نکاس کا انتظام معقول ہونا چاہیے۔

۴۔ کاشت کے لیے مناسب فصل کا انتخاب کیجیے

جہاں ناقص کوالٹی کے پانی سے سینچائی کی جاتی ہو ان زمینوں پر جو، گیہوں، سرسوں، گوار، شکر قند اور چقندر جیسی فصلیں ہی اگائی جانی چاہئیں جو نمک کے خلاف قوت مزاحمت رکھتی ہیں۔ کپاس انکور پھوٹنے کے وقت بہت حساس ہوتی ہے اس لیے اگر کپاس کی کاشت کرنا ہو تو بوائی سے قبل اچھی قسم کے پانی سے سینچائی کرنی چاہیے۔ دالوں کی فصلیں بھی نمکیات اور الکلی کا اثر جلد قبول کرتی ہیں اس لیے ان کی سینچائی ناقص پانی سے نہیں کرنی چاہیے۔ جن فصلوں کے لیے زیادہ پانی درکار ہوتا ہے ان کی سینچائی بھی ناقص کوالٹی کے پانی سے نہیں کرنی چاہیے۔

۵۔ اچھا اور ناقص پانی ملا کر یا باری باری استعمال کیجیے

آبپاشی کے لیے اچھا اور ناقص پانی ملا کر یا باری باری استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فصل اگنے کے ابتدائی ایام میں ہمیشہ اچھی قسم کا پانی استعمال کرنا چاہیے۔ ناقص کوالٹی کا پانی بعد کے مرحلوں میں جب فصل نمکیات یا الکلی کو برداشت کرنے کے لائق بن جائے۔

استعمال کیا جانا چاہیے۔ بوائی کے وقت سبھی فصلیں بہت حساس ہوتی ہیں۔ گیہوں اور سرسوں کی فصلیں کونپلیں پھوٹنے کے وقت حساس ہوتی ہیں۔

۶۔ مٹی میں نمکیات یا الکلی کے جماؤ پر نگاہ رکھیے

کاشت کاروں کو مٹی میں نمکیات یا الکلی کے جماؤ پر نگاہ رکھنی چاہیے اور مٹی کے نمونوں کی باقاعدگی سے جانچ کرواتے رہنا چاہیے۔

۷۔ کھریا مٹی استعمال کیجیے

جب آبپاشی کے پانی میں آر ایس سی ۵ ر ۲ ایم ای/ا سے بڑھ جائے تو ایسی صورت میں کھریا مٹی کے استعمال کی سفارش کی جاتی ہے۔ کتنی مقدار میں کھریا مٹی استعمال کریں اس کا اندازہ مٹی اور پانی کی جانچ کرنے والی لیباریٹری سے کروانا چاہیے اور کھریا مٹی کا استعمال ایک فصل کے کٹنے کے بعد اجتماعی بنیاد پر کیا جانا چاہیے۔ دیکھا گیا ہے کہ کھریا مٹی کے استعمال سے الکلی والے سوڈک پانی سے سینچائی کے مضر اثرات کم ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً پیداوار کافی بڑھ جاتی ہے۔

۸۔ پانی کی تقطیر

کھریا مٹی کھیت میں دیے جانے کے بعد زمین میں پانی کی تقطیر ضروری ہے تاکہ وہ اچھی طرح سے گھل کر مٹی کے اندر جذب ہو جائے اور جڑ سے پیدا ہونے والے ردعمل کو ختم کر سکے۔ اس لیے زمین پر ایک سے ۱۰ سینٹی میٹر کی گہرائی کھریا مٹی ڈالنے کے بعد سینچائی کرنی چاہیے تاکہ قابل تحلیل نمکیات بخوبی گھل جائیں۔ جب گیہوں کاشت کرنا ہو تو کھریا مٹی ڈالنے کے بعد اور بوائی سے قبل تقریباً چار سینچائیاں (۲۸ سینٹی میٹر پانی) کی جانی چاہئیں۔

ناقص زمینی پانی والے علاقوں میں نمکیات سے متاثرہ زمین کو دوبارہ قابل کاشت بنانے کے لیے اچھی قسم کے نہری پانی کا استعمال کرنا چاہیے۔

۹۔ فاسفورس کا استعمال

بتایا جاتا ہے کہ ایک معقول مقدار میں فاسفورس کے استعمال سے زیادہ کلورائڈ کے نقصان دہ اثرات بڑی حد تک دور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اضافی مقدار میں فاسفورس کھاد کا استعمال مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۰۔ فصلیں مناسب ادل بدل کے ساتھ اُگائیے

چاول اور گیہوں ادل بدل کر اُگانے کے لیے سوڈک (الکلی والے) پانی کے استعمال کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔ یہی پانی گیہوں اور مکئی اور گیہوں اور ایک دو اور فصلیں باری باری سے اگانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر نہری پانی دستیاب ہو تو اسے بوائی سے قبل کی سینچائی یا پہلی سینچائی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سوڈک یا الکلی والے پانی کا استعمال بعد کی سینچائیوں کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

مستقبل کی حکمت عملی

ملک میں زراعت کی ترقی کے لیے حکمت عملی درج ذیل خطوط پر مرتب کی جا سکتی ہے اور بعد میں ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً ان میں اصلاح کی جا سکتی ہے۔

- مٹی اور پانی کی جانچ کرنے والی لیباریٹریوں میں کاشت کاروں کے مسائل کی فی الفور تشخیص اور موزوں ٹکنالوجی کی ملک کے گوشے گوشے تک منتقلی۔
- مٹی اور پانی کے تحفظ کے لیے مقررہ وقت کے اندر پورا کیا جانے والا پروگرام زیر عمل لایا جائے تاکہ شعبۂ زراعت میں قائم رہنے والی ترقی ہو سکے۔
- آبپاشی والے علاقوں اور زیادہ بارش والے علاقوں میں دونوں ہی میں پانی کا دانشمندانہ استعمال ہونا چاہیے۔
- کھادوں کے استعمال اور آبپاشی کے لیے پانی کی ضرورت کا تعین معقولیت کے ساتھ مٹی کی ساخت، گہرائی اور پانی کو روک رکھنے کی صلاحیت کے مطابق کیا جانا چاہیے۔
- فی الوقت مختلف مقاصد کے لیے زمین کا استعمال کسی معقول اصول کی بنیاد پر نہیں ہو رہا ہے۔ جنگلات کا رقبہ محدود ہے۔ اس سے معیشت حیوانات میں عدم توازن پیدا ہو سکتا ہے۔ کاشت کے لیے برسوں زمین کے مسلسل اور سرگرم استعمال اور زمین کو کچھ وقت کے لیے بھی خالی نہ چھوڑنے سے مٹی کی زرخیزی کم ہو جاتی ہے اور زمینی پانی کے وسائل بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اور زیادہ علاقہ جنگلات کے تحت لایا جائے۔ معیشت حیوانات کا توازن اسی طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

ب ہمارے ملک کی مٹی زرعی پیداوار کے لیے عظیم صلاحیتوں کی حامل ہے بشرطیکہ اس کا اور زمینی پانی کا استعمال معقول طریقے سے کیا جائے۔

- زمینی پانی کی جانچ کراتے رہنا چاہیے۔
- کہاوت ہے کہ پرہیز علاج سے بہتر ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ آبپاشی کے لیے استعمال ہونے والے پانی کا باقاعدگی سے تجزیہ کروانا چاہیے۔
- ہر پروجیکٹ میں پانی کے دانشمندانہ استعمال کے ماہرین کا ایک کیڈر ہونا چاہیے۔ کاشت کاروں کو پانی کے مناسب استعمال کی اہمیت کا احساس کرایا جانا چاہیے اور انھیں اور پانی کے استعمال سے متعلق عملے کو مناسب تربیت دی جانی چاہیے۔ ●

قلم کار حضرات سے

گزارش ہے کہ

(۱) مضامین / دیگر تصانیف جو یوجنا کو ارسال کریں انہیں کہیں اور چھپنے کے لئے قطعاً نہ بھیجیں۔

(۲) ہر مضمون کے آخر میں طبع زاد / غیر مطبوعہ لکھ کر اپنا دستخط، نام اور پتا ضرور درج کریں۔

(۳) مضمون کی اصل ہمیں ارسال کریں فوٹو سٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۴) مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کریں۔

(۵) مضامین میں جو اقوال .... (QUOTATIONS) استعمال کئے گئے ہیں، ان ---- کا حوالہ دینا لازمی ہے۔

قدرتی پودوں کے وسائل کا تحفظ

ہماچل پردیش میں پالم پور کے مقام پر سائنسی وصنعتی تحقیق کی کونسل یعنی سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کا ایک کمپلکس واقع ہے۔ اس کی سرگرمیاں مختلف النوع ہیں۔ ایک طرف اس نے چائے کے باغات کی پیداوار بہتر بنانے میں مدد دی ہے تو دوسری طرف پھلوں کی کاشت کے سلسلے کی تکنالوجیاں منتقل کی ہیں جن سے نہ صرف ہماچل پردیش کی معیشت میں سدھار آیا ہے بلکہ اترپردیش کی معیشت میں بھی بہتری لانے میں مدد ملی ہے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کا یہ کمپلکس، جو ایک نیشنل لیبارٹری کی صورت میں ہے ۲؍جولائی ۱۹۸۳ء کو قائم کیا گیا تھا تاکہ حیاتیاتی وسائل کو مستقل بنیادوں پر استعمال کی غرض سے تکنالوجیاں وضع کی جاسکیں۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کا یہ سب سے نیا تحقیق و ترقی کا ادارہ ہے۔

یہ کمپلکس ۲۲۷ ایکڑ اراضی پر قائم ہے۔ یہ پالم پور میں مغربی ہمالیائی علاقے میں واقع ہے۔ یہ ادارہ پہاڑی علاقوں میں چائے کی کاشت کے فن پر تحقیق کررہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے پہاڑی علاقوں میں پھولوں کی کاشت، بائیوتکنالوجی، قدرتی پودوں کی افزائش اور مغربی ہمالیائی خطوں میں حیاتیاتی گوناگونی کے تحفظ کے موضوع پر کام کیا ہے۔ اس میں مارکیٹنگ اور تکنالوجی ٹرانسفر کا یونٹ بھی ہے۔ مارکیٹنگ یونٹ یہاں کی تکنالوجیوں سے باخبر کرانے کے لیے ان کی تشہیر بھی کرتا ہے۔ اس کمپلکس نے کانگڑی چائے صنعت کے احیا کے لیے خاص کام کیا ہے نیز ہماچل پردیش میں پھولوں کی افزائش اور انھیں مقبول عام بنانے کے لیے بھی کام کیا ہے۔ خوشبودار پھولوں اور خوشبودار پودوں کی کاشت کو بھی ریاست میں کامیابی کے ساتھ فروغ دیا گیا ہے۔

اس کمپلکس کی چند دیگر اہم کامیابیاں بھی ہیں۔ مثلاً چائے کے باغات کے نظم ونسق کے لیے اصلاح شدہ زرعی تکنالوجی جس کی وجہ سے ہماچل پردیش میں چائے کی پیداوار، جو ۱۹۸۵ء میں چھ لاکھ ۷۷ ہزار کلوگرام تھی بڑھ کر ۱۹۹۴ء میں ۱۳ لاکھ کلوگرام ہوگئی ہے۔ پیداوار میں اضافہ، چائے کی پتیوں کو چننے کے طریقے میں سدھار نیز چائے کی پتیوں کو توڑنے کے سلسلے میں اصلاح یافتہ طریقوں کو اختیار کیے جانے سے ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بیماریوں پر قابو پانے نیز ایک جگہ کی پود کو دوسری جگہ منتقل کرنے اور پیوندی طریقوں سے کاشت کرنے کی وجہ سے بھی یہ اضافہ ہوا ہے۔ چائے کے باغات سے ان غیر ضروری گھاس پھوس یا پودوں کو کاٹ کر باہر پھینک دیا گیا، جن سے ان کی پیداوار متاثر ہوتی تھی۔ پھر اسے ضروری اور عمدہ قسم کی کھاد دی گئی۔ یہ سب تکنیک کمپلیکس کی اپنی ہی اختیار کردہ ہے۔

اس ادارے نے جراثیم اور ان کے باقیات کی جانچ کی ایک لیبارٹری قائم کی ہے۔ یہ قومی سطح کی لیبارٹری ہے۔ ان تجربات سے یہ واضح ہوا ہے کہ گانگڑہ اور دہرہ دون کی چائے میں جراثیم کا بہت معمولی اثر ہے۔ ایسے مشروبات تیار کیے گئے جو چائے پر مبنی ہیں۔ ان کو گھول کر پینے سے چائے کا مزہ آتا ہے۔ ان کو منتقلی کی غرض سے تیار کرلیا گیا ہے۔

پھولوں کی کاشت

ایسے بہت سے پھول اگائے گئے ہیں جو مقامی زرعی حالات سے مطابقت رکھتے ہیں اور ان کو بازار میں فروخت کرنے کی گنجائش بھی ہے۔

اس سلسلے میں مختلف قسم کے گلاب کے پھول نیز گلیڈیولس، کارنیشن، ٹولپ، ایسٹر لیلیز وغیرہ کو اگانے کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ اس ادارے میں دوسو سے زیادہ مختلف پودوں اور پھولوں کے جرثومے اور جرم پلازم جو تجارتی افادیت رکھتے ہیں، محفوظ کرلیے گئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہماچل پردیش جیسے پہاڑی علاقوں میں پھولوں کی کاشت کو دو یا تین گنا کرلیا گیا ہے۔

پالم پور میں سی ایس آئی آر کمپلیکس کا مقصد ایک ایسے زون کا قیام ہے جو حیاتیاتی تنوع میں خود کفیل ہو۔ اس کے لیے دشواریوں کی نشاندہی کرکے نیز اہمیت کو سامنے رکھ کر اور نئے طریقے وضع کرکے قدرتی وسائل سے اقتصادی فائدے اٹھانے پر زور دیا جارہا ہے۔ اس علاقے میں تقریباً ۹ ہزار اقسام کے پودے ہیں، جن میں استوائی، کم استوائی درجہ حرارت میں پھلنے پھولنے والے پودے بھی ہیں اور کشمیری آب وہوا کے پودے بھی ہیں، جو ہندوستان میں مغربی ہمالیائی خطوں کے پودے کہے جاسکتے ہیں۔ اس خطے کے پودوں کی ایک فہرست تیار کی جارہی ہے۔ اس زون میں پھولوں کی افزائش کے سروے سے یہ واضح ہوا ہے کہ تقریباً ۱۲۷۰ اقسام کے پھول ہیں جو ۷۶ کنبوں اور ۲۶۰ طرز کے پھولوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

کچھ پودے ادویاتی فائدے اور تجارتی فوائد کے بھی حامل ہیں۔ کچھ پودوں سے خوشبوئیں حاصل کرنے، کپڑوں کو رنگنے، چمڑا رنگنے کا کام لیا جاتا ہے۔ کچھ پودے بوٹنی سائنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ بوٹنی میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ بوٹنی یعنی پیڑ پودوں کی سائنس میں ان کی افادیت اور اہمیت تسلیم شدہ ہے۔

دس پودوں کی اقسام اور ان کو فروغ دینے کے سلسلے میں کام ہو رہا ہے۔

قدرتی پودوں کی مصنوعات

ہماچل پردیش کی پہاڑیاں لوینڈر کی کاشت کے لیے موزوں ہیں اور بھی بہت سے پودے یہاں اگائے جا سکتے ہیں مثلاً ٹیو بر روز۔ یہ اور دیگر بہت سے قدرتی پودے تیل نکالنے کی غرض سے بے حد اہم ہیں۔ ان میں ٹاگیٹس منوٹا، جیس مینئم گرانڈی فلورم اور سیٹرم ناک ٹرامم خاص طور پر تیل حاصل کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ دواسازی میں بھی ان کی اہمیت ہے۔

ہماچل پردیش میں گزشتہ تین یا چار برسوں میں ان نئی ٹکنالوجیوں کی مدد سے تقریباً ۲۰۵ ایکڑ اراضی پر روزا کے پودے اگائے گئے ہیں۔ روزا اور ٹیگیٹس سے تیل نکالنے کی افادیت کو پرکھا گیا ہے ٹیگیٹس تیل میں سات نئے مرکبات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان تیلوں سے دیگر بہت سی مفید اشیاء بھی تیار کی جا سکتی ہیں۔

ٹشو کلچر میں بھی اہم پیش رفت ہوئی ہے۔ چائے اور بانس کی بہت سی اقسام تیار کی گئیں ہیں۔ کانگڑہ اور کلو کی وادی میں نایاب آرچڈ کے ٹشو کلچر کو شروع کیا گیا ہے۔ بانس کی چند جدید اقسام سے ابتدائی نوعیت کے ٹشو حاصل کیے جا سکے ہیں۔ اسی طرح کی ایک قسم کا نام بوٹنی میں ڈنڈرو کلامس ہملٹنو ہے۔ کھیتوں میں ان کی امکانی صلاحیت کی جانچ کی جا رہی ہے۔ اسے مکر بمبو کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ اس سے مقامی نوعیت کی عمارتی لکڑی کی ضرورتیں پوری کی جا سکتی ہیں۔ سخت سردیوں میں یہ مویشیوں کا واحد چارہ ہے۔ لیبارٹری میں ٹشو کلچر سے جو پودے تیار کیے جاتے ہیں ان کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور وہ دیرپا ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس طرح نہیں کھلتے جس طرح کے دور حاضر میں کسانوں کے کھیتوں میں اگنے والے پودے۔

ٹکنالوجی کی منتقلی

سی ایس آئی آر کمپلیکس نے پھل اگانے کی جو تکنیک نکالی ہے اسے ریاست کے ضرورت مند دیہی عوام کو منتقل کر دیا گیا ہے۔ پڑوسی ریاست اتر پردیش نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ان دونوں ریاستوں کو اس سلسلے کے مشوروں اور تکنیکی امداد سے فائدہ پہنچایا گیا ہے۔ چنڈی گڑھ میں بڑے پیمانے پر تجارت کے لیے ٹشو کلچر لیبارٹری قائم کی جا رہی ہے جہاں اس کمپلیکس کی مدد سے صنعتی، باغبانی، سجاوٹی اور زرعی فصلوں کو اگایا جا سکے گا۔

اتر پردیش حکومت کا اتراکھنڈ و کاس وبھاگ اتراکھنڈ کی پہاڑیوں میں چائے کی صنعت کے فروغ کے لیے تکنیکی مہارت اس کمپلیکس سے حاصل کر رہا ہے۔ اس سے لوگوں کو روزگار ملے گا اور دیہی عوام کی آمدنی بڑھے گی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر کمپلیکس نے پودے لگانے کا بہت سامان اور پراسیسنگ یونٹ کے بہت سے ڈیزائن چھوٹے کاشتکاروں کو فراہم کرائے ہیں جن سے وہ صنعتی پیداوار میں استحکام حاصل کر سکیں۔

یہ ادویاتی پودوں پر دوسرے اداروں کے تعاون سے تحقیقی کام بھی کر رہا ہے تاکہ دواسازی کے لیے بنیاد مضبوط ہو سکے۔

یہ کمپلیکس اب پہاڑی علاقوں کی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے نئی تحقیق اور ٹکنالوجی کو بروئے کار لا رہا ہے تاکہ یہ علاقہ ان میدانی علاقوں سے مقابلہ کر سکے جو صنعتی اعتبار سے مالا مال کہے جاتے ہیں۔ ●

ماہی گیروں کو ایل پی جی کنکشن دیا جائے گا

پٹرولیم اور قدرتی گیس کے وزیر مملکت شری کیپٹن ستیش شرما نے اپنی وزارت کو ہدایت کی ہے کہ وہ سرکاری شعبے کی کمپنیوں کے ذریعے ملک میں ایل پی جی گیس کے کنکشن جاری کرنے کے سلسلے میں احکامات جاری کرے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ماہی گیر اپنی کشتیوں میں کھانا پکانے کے لیے مٹی کا تیل کا استعمال کرتے ہیں۔ حکومت کے موجودہ فیصلے سے ماہی گیر اپنی کشتیوں میں کھانا پکانے کے لیے آئل کمپنیوں کے ایل پی جی تقسیم کاروں سے ایل پی جی کنکشن حاصل کر سکتے ہیں تاکہ اس قسم کے ایل پی جی کنکشن حاصل کرنے کے لیے کچھ حفاظتی اقدامات کرنے ضروری ہیں۔

شہری علاقوں میں بجلی کی تقسیم کو بہتر بنانے کی اسکیم

مرکز نے ریاستی بجلی بورڈ (ایس ای بی) کو مشورہ دیا ہے کہ وہ بجلی کی ترسیل اور تقسیم کے لیے آئندہ دس سالہ اسکیم بنائیں۔ اسکیم وضع کرنے میں ضروری ہو تو ملکی و غیر ملکی ماہرین کی مشاورتی خدمات بھی حاصل کی جائیں۔ اس اسکیم کے درج ذیل اجزاء ہیں:۔

دو ولٹیج منتقلی سطحوں کی تعداد میں کمی لانا۔

موجودہ سب اسٹیشنوں پر جن کے ذریعہ بجلی کی تقسیم ہو رہی ہے۔ کم تناؤ والی لائنوں کی طوالت گھٹا کر ان کے لوڈ کا تعین کرنا۔

پرانے ساز و سامان کو بدل کر ان کی جگہ نئے اور جدید ساز و سامان لگانا۔

کیا ہر ممکن حد تک تقسیم والے فیڈروں میں اضافہ لانا۔ اس کے لیے کم ٹینشن والی لائنوں کا استعمال۔

ہائی وولٹیج سسٹم کو متعارف کرانا جہاں کہیں قابل عمل ہو۔

اس طرح کی اسکیم بنانے کی ضرورت شہری علاقوں میں بجلی کی روز افزوں ضرورت کی وجہ سے محسوس کی جاتی ہے۔ ان علاقوں میں ترسیلی نظام کی توسیع وقتاً فوقتاً کی جاتی ہے تاکہ گھریلو، صنعتی اور تجارتی صارفین کی فوری ضرورت کی تکمیل ہو سکے اس طرح کے نظاموں کی طویل المدت بنیادوں پر منصوبہ بندی نہیں کی جاتی ہے اس تیز رفتار ترقی کے نتیجہ میں شہری تقسیم نظام پر صلاحیت سے بوجھ عائد ہو گیا ہے اور یہ نظام بڑھتی ہوئی بجلی کی مانگوں کی تکمیل کے لیے ناکافی ہو گیا ہے۔

عادل صدیقی

دیہی ترقی کے چند اہم عناصر

ہندوستان میں غریبی دور کرنے اور نوجوانوں کی بڑی تعداد کو روزگار دلانے کے لیے نئے نئے پروگرام شروع کیے گئے۔ ان پروگراموں سے پسماندہ خطوں کو فائدہ پہنچانے اور زرعی مزدوروں، بندھوا مزدوروں، چھوٹے اور مارجنل کسانوں، دست کاروں، مندرج فہرست ذاتوں اور مندرج فہرست قبائل کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں جواہر روزگار یوجنا ملک میں روزگار دلانے والا واحد سب سے بڑا پروگرام ہے۔ ملک کے ۱۲۰ پسماندہ اضلاع میں جہاں بے روزگار اور کم روزگار افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ بھرپور انداز سے جواہر روزگار یوجنا شروع کی جاچکی ہے۔ اس طرح جواہر روزگار یوجنا اور بھرپور انداز پر شروع کی گئی۔ جواہر روزگار یوجنا سے تقریباً ۱۰۳۷ ملین افرادی دنوں کا روزگار ملنے کی توقع ہے۔ اس پروگرام میں مرکزی امداد کا حصہ ۳۸ ارب ۵۵ کروڑ روپے ہے۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں یقینی روزگار کی اسکیم شروع کی گئی تھی۔ اس اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ دیہات کے اکثر مزدوروں کو جو کھیتی کے دنوں میں تو روزگار حاصل کر لیتے ہیں، لیکن کھیتی کے دنوں کے علاوہ وہ بے روزگار دکھائی دیتے ہیں، سال میں کم سے کم سو دنوں کا روزگار یقینی طور پر مہیا کرایا جا سکے۔ اس سے بے روزگاری اور کم روزگاری کو دور کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اس اسکیم کے تحت ایک کروڑ سے زیادہ افراد رجسٹرڈ کیے جا چکے ہیں۔ اس سے ملک کے پسماندہ خطوں اور وسائل کے اعتبار سے غریب بلاکوں میں روزگار کو یقینی بنایا جا سکا ہے۔ شروع میں یہ اسکیم ۱۷۷۸ پسماندہ بلاکوں میں شروع کی گئی تھی اور خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کو فائدہ پہنچا رہی تھی لیکن اس کے بعد اسے مزید ۴۰۹ پسماندہ بلاکوں میں شروع کیا گیا۔ یہ روزگار دلانے والا پروگرام مسلسل ترقی کر رہا ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۲۰ کروڑ افرادی دنوں کا روزگار مہیا کرایا گیا جس کے لیے مرکز نے ۱۲.ارب روپے خرچ کیے۔

روٹی، کپڑا اور مکان، انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں، دیہات کے غریب عوام کو گھر بنانے کی سہولت نے ان کی زندگی میں آرام اور سکون کے معنی پیدا کر دیے۔ اس سے نہ صرف ایک بنیادی ضرورت پوری ہو سکی، بلکہ دیہات کے غریب عوام کو سماجی اعتبار سے ایک وقار مل سکا۔ جواہر روزگار یوجنا کا ایک حصہ اندرا آواس یوجنا بھی ہے۔ ہر ریاست اور ہر خطے میں اسے بڑی مقبولیت ملی ہے۔ ہر ریاست اس مد پر زیادہ سے زیادہ رقوم مانگ رہی ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء سے اندرا آواس یوجنا کے تحت دی جانے والی رقوم بڑھا دی گئیں۔ جواہر روزگار یوجنا کے تحت دی جانے والی کل رقومات کا چھ فی صد کے بجائے اب اسے دس فی صد کر دیا گیا ہے۔ تعمیر مکان کے لیے میدانی علاقے میں خرچ ۱۲۷۰۰ روپے سے بڑھا کر ۱۴۰۰۰ روپے کر دیا گیا۔ پہاڑی یا دشوار گزار علاقوں میں یہ رقم ۱۴۵۰۰ روپے سے بڑھا کر ۱۵۸۰۰ روپے کر دی گئی۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں اس پروگرام کے تحت ساڑھے تین لاکھ مکانات کی تعمیر کا پروگرام بنایا گیا۔

دیہی عوام کا معیار زندگی بلند کرنے اور انھیں راحت پہنچانے کے لیے دیہات کی مربوط ترقی کا پروگرام شروع کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دیہی علاقوں میں بچوں اور عورتوں کی ترقی کے پروگرام شروع کیے گئے اس کے علاوہ دیہی نوجوانوں کو از خود روزگار مہیا کرانے کے لیے تربیتی پروگرام شروع کیا گیا۔ پیداواری اثاثہ جات کی کمی کی وجہ سے غریب اپنی نہ تو آمدنی بڑھا سکتے ہیں اور نہ کوئی فاضل کام شروع کر سکتے ہیں، اس لیے دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام کے تحت آمدنی بڑھانے میں معاون اثاثہ جات غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کو دیے جاتے ہیں۔ ان میں کچھ حصہ بطور سبسڈی ہوتا ہے اور کچھ بطور قرض۔ اس سال سے دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام سے تقریباً ۲۰ لاکھ کنبے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام کا دائرہ وسیع کیا گیا ہے، اس میں زرعی سرگرمیوں کے علاوہ دوسری سرگرمیوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے ضلع واری سطح پر قرضوں کی تقسیم، بلاک کی سطح پر قرضوں کی فراہمی اور علاقہ وار ضرورتوں کی بنیاد پر سروس کی ضرورتوں کے منصوبوں اور نقشوں میں تال میل بڑھانے پر زور دیا گیا ہے اور دیہات کی مربوط ترقی کے لیے عملی پلان بنائے گئے ہیں تاکہ تکنیکی پیش رفتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکے اور مختلف ترقیاتی پروجیکٹوں کو کامیاب بنایا جا سکے، اب

انچارج پبلسٹی، دارالعلوم دیوبند (سہارنپور)

اس بات کی گنجائش نکالی گئی ہے کہ فی کنبہ سرمایہ کاری کی اوسط شرح کم سے کم ۱۲ ہزار روپے ہو، سال ۹۵-۱۹۹۴ء میں اس پروگرام کے تحت ۲ ہزار کروڑ روپے کے قرضے اور چھ سو کروڑ روپے کی سبسڈی دینے کا منصوبہ بنایا گیا۔ دیہات کے پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں کو از خود روزگار پیدا کرنے کی طرف خصوصیت سے راغب کیا گیا۔ ریزرو بینک آف انڈیا کے ماہرین کی کمیٹی نے دیہی ترقی اور روزگار کے امکانات کے سلسلے میں جو رپورٹ دی ہے، اس سے امید کی جاتی ہے کہ یہ پروگرام مزید تقویت پائے گا۔

خاندان کی ترقی میں عورت کا کلیدی رول ہے، اس سے سماج اور قوم ترقی کرتی ہے۔ دیہی خواتین نے آمدنی بڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، یہ ایک خوش آئند رجحان ہے، اب وہ جو مال تیار کرتی ہیں، اس کی مناسب قیمت وصول کرنا جان گئی ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کے رہن سہن میں بھی بہتری آئی ہے۔ عورتیں بچتوں کو بڑھاوا دینے میں بھی خصوصی مہارت رکھتی ہیں اور اپنے انفرادی اور اجتماعی فائدوں کے لیے بہت سی سرگرمیاں چلاتی ہیں۔ چناں چہ متعدد ریاستوں میں دیہات میں عورتوں اور بچوں کے ترقیاتی پروگراموں نے اچھی پیش رفت دکھائی ہے، دیہی عورتوں کی طرف سے ترقی کی اس شدید خواہش کو دیکھتے ہوئے اب یہ پروگرام ملک کے سبھی اضلاع میں شروع کر دیے گئے ہیں اس اسکیم کو مختصراً DPCRA کہتے ہیں۔ اس کے لیے گشتی فنڈ ہے جس کی رقم ۱۵ ہزار روپے سے بڑھا کر ۲۵ ہزار روپے کر دی گئی ہے۔

دیہی نوجوانوں کو روزگار دینے کا تربیتی پروگرام بہت کارآمد ثابت ہوا ہے، اس کے ذریعے دیہی نوجوان از خود روزگار مہیا کرنے کے لائق بن سکے ہیں۔ اسی لیے آئی ٹی آئی (انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹس)، پولی ٹکنک، کرشی وگیان کیندر وغیرہ تسلیم شدہ اداروں میں معیاری تربیت دینے کا بندوبست کیا گیا ہے، جن کاموں کی تربیت دی جاتی ہے، وہ وہی ہوتے ہیں جن کی علاقے کو ضرورت ہوتی ہے۔ زیر تربیت افراد کو دیے جانے والے وظیفہ کی رقم بڑھا دی گئی ہے۔

ہندوستان کے دیہی علاقوں میں بہت سے کاریگر، دست کار اور فنکار ایسے ہیں کہ ان کا اپنا آبائی پیشہ ہوتے ہوئے بھی وہ غریب ہی ہیں۔ ایک اسکیم کے تحت ان کی مہارت کو جدید بنانے پر زور رہے اور اس کے لیے جدید اوزاروں کا تھیلہ انھیں مہیا کرایا جاتا ہے۔ اب تک دو لاکھ سے زیادہ دست کاروں کو اس طرز کے جدید اوزار فراہم کیے جا چکے ہیں۔ بنکروں کی حالت سدھارنے پر خاص زور رہے، ان کے علاوہ چمڑے کا کام کرنے والے، لکڑی کا کام کرنے والے، پتھروں کی نقاشی کرنے والے، تالہ بنانے والے، لوہار وغیرہ کو اس اسکیم سے بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ اس تربیتی پروگرام کو مختصراً (TRYSEM) ٹرائی سم کہتے ہیں۔ اس میں ترمیم کر کے جدید تر تربیتی نظام کو داخل کیا گیا ہے اور ایسے اوزاروں کو شامل کر لیا گیا ہے جو زیادہ تر بجلی کی مدد سے چلتے ہیں۔ اس سے دست کاروں کو بے روزگاری سے نجات ملتی ہے اور وہ شہروں کی طرف نہیں بھاگتے بلکہ گاؤں میں رہتے ہوئے اپنے مال کی کوالٹی بہتر بناتے ہیں جس سے نہ صرف پیداواری صلاحیت بڑھتی ہے بلکہ ان کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

دیہات کی ترقی میں عوامی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے رضاکارانہ اداروں کی مدد لی گئی ہے، غیر سرکاری تنظیموں سے بھی مشورہ کیا گیا اور سرکاری نیز غیر سرکاری تنظیموں کا ایک ملا جلا نظام معرض وجود میں آیا تاکہ دیہات میں ترقیاتی پروگراموں کو کامیابی سے چلایا جا سکے۔

دیہی سماج میں زندگی گزر بسر کرنے کے لیے اراضی ایک اہم ترین مسئلہ ہے اسی لیے اراضی کی منصفانہ تقسیم کے لیے اراضی کی اصلاحات کے پروگرام نے اہم پیش رفت دکھائی ہے۔ چناں چہ زمین کی بالائی حد کے تعین کے ذریعے فاضل قرار دی گئی زمین ان لوگوں کو دی گئی جن کے پاس زمین نہیں تھی۔ اب تک ۵۱ لاکھ ایکڑ زمین تقریباً ۴۹ لاکھ افراد کو دی گئی، ان میں سے نصف تعداد ان کی ہے جو مندرج فہرست ذاتوں اور قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس بات پر نظر رکھی جاتی ہے کہ اصلاحات اراضی کے پروگرام سے دیہات کے غریب اور بے زمین لوگوں کو فائدہ پہنچے اور یہ کام غیر ضروری مقدمہ بازی کی وجہ سے نہ رک پائے۔

دیہات میں سڑکوں کی تعمیر و ترقی کے پروگرام بھی تیزی سے چلائے جا رہے ہیں، مرکز کے زیر اہتمام ایک اسکیم کے تحت اتر پردیش، مدھیہ پردیش اور راجستھان کے ایسے علاقوں میں سڑکوں کی تعمیر کے پروگرام کو ترجیحی بنیادوں پر شروع کیا گیا ہے جو ڈاکوؤں وغیرہ کے لیے بدنام ہیں۔ یہ کام ۸۶-۱۹۸۵ء سے راما ناتھن کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں آگے بڑھایا گیا ہے۔ ڈاکوؤں کے لیے بدنام علاقوں میں اقتصادی ترقی کے پروگراموں کو تیزی سے شروع کیا گیا۔ اس کام کے لیے مختص کردہ رقومات کا ۴۸ فی صد اتر پردیش کو، ۲۶ فی صد مدھیہ پردیش کو اور ۲۶ فی صد راجستھان کو دیا گیا۔

دیہات میں پینے کے پانی کی فراہمی بنیادی طور پر ریاستی سرکار کی ذمہ داری ہوتی ہے، ۱۹۸۶ء میں پینے کے پانی کے مسائل کو جدید طریقوں سے حل کرنے کے لیے نیز معیاری پانی کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے ایک قومی مشن قائم کیا گیا جس نے بعد میں تکنالوجی مشن کی صورت اختیار کر لی۔ شروع میں ۵۵ اضلاع کو چنا گیا تاکہ وہاں پینے کے پانی کی فراہمی کو یقینی بنا دیا جائے، ان کی مدد کے لیے ذیلی مشن قائم کیے گئے۔ اس قومی مشن یا تکنالوجی مشن کا معیار بڑھایا گیا اور اس کا نام راجیو گاندھی مشن رکھا گیا۔ اس کے تحت تمام دیہات میں پینے کے پانی کی فراہمی کو یقینی بنانے کا پروگرام ہے اس کے تحت دیہات کی آبادی کو پینے کے صاف پانی کی اہمیت بھی واضح کرائی جاتی ہے اور ان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ پینے کا صاف پانی میسر نہ آنے سے بہت سی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

دیہات میں پینے کے صاف پانی کی فراہمی کا معیار

۱۔ فی کس فی یوم ۴۰ لیٹر محفوظ پینے کا پانی

۲۔ ریگستانی علاقوں میں فی کس فی یوم مزید ۳۰ لیٹر پانی جس سے مویشیوں کی ضرورت کو بھی پورا کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ ۲۵۰ افراد کے لیے ایک ہینڈ پمپ

۴۔ میدانی علاقوں میں ۱.۶ کلو میٹر کے اندر پینے کا پانی مہیا ہونا چاہیے۔

پینے کا صاف اور محفوظ پانی وہ سمجھا جاتا

باقی صفحہ پر

یوجنا، نئی دہلی

راحت روش

مہلاسمردھی یوجنا: ایک جائزہ

حکومت ہند نے ہندوستانی سماج میں عورتوں کی حالت کو سدھارنے کے لیے حال ہی میں مختلف اسکیمیں شروع کی ہیں۔ جیسے اندرا مہلا یوجنا، راشٹریہ مہلا کوش، مہلاسمردھی یوجنا، وغیرہ ان سب اسکیموں کا بنیادی مقصد ہندوستانی عورت کو سماج میں ایک باعزت مقام دلانا ہے۔ عورتوں کو سماج میں اہم مقام دلانے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان اسکیموں کو لاگو کیا گیا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ عورت کو اقتصادی طور پر مضبوط کیا جائے تاکہ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکے اسے کسی دوسرے کا دست نگر بن کر نہ رہنا پڑے۔ عورت اگر خود کفیل ہوگی تو وہ اپنے استحصال کو خود روکنے میں کامیاب ہو سکے گی۔

اسی نظریہ کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے حکومت ہند نے ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو وزارت انسانی وسائل و ترقی نے اپنے محکمہ مہلا وبال وکاس کے تحت ہندوستانی دیہی عورتوں کے بہبود کی ایک اسکیم شروع کی جسے مہلاسمردھی یوجنا (ایم۔ ایس وائی) کا نام دیا گیا ہے کیوں کہ عورتوں کا استحصال شہر کی بہ نسبت گاؤں میں زیادہ ہوتا ہے اس لیے اس اسکیم کا محور غریب اور دیہی عورتیں ہی ہیں۔

اس اسکیم کا مقصد دیہی خواتین میں خود اعتمادی پیدا کرنا، انھیں معاشی طور پر مستحکم بنانا اور سماج میں باعزت مقام دلا کر مرد و زن کے روایتی نابرابری کو کم کرنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس اسکیم کے تحت عورتوں میں بچت کی عادت کو فروغ دینے کی غرض سے حکومت نے ایک لاکھ ۳۰ ہزار ڈاکخانوں میں دیہی عورتوں کے بچت کے کھاتے کھولے جانے کا ایک جامع منصوبہ بنایا ہے۔ دیہی عورتیں ان ڈاکخانوں میں اپنا کھاتہ کھول سکتی ہیں۔ اس کھاتہ کو "مہلاسمردھی یوجنا کھاتہ" کہا جاتا ہے۔ یہ کھاتہ صرف ۴ روپے کی قلیل رقم سے کھولا جا سکتا ہے۔ اس میں عورت سال بھر میں ۳ سو روپے تک کی رقم جمع کرا سکتی ہے۔ یہ رقم ۴ روپے کے حاصل ضرب کی قسطوں میں اپنی سہولت کے مطابق جمع کرائی جا سکتی ہے۔ سال میں ۱۲ ماہ کی لاک ان مدت والی جمع رقم پر حکومت ۲۵ فی صد یعنی ۷۵ روپے کی ترغیب (INCENTIVE) دیتی ہے۔ کھاتہ دار ایک سال میں کھاتے سے دو بار رقم (کم از کم ۲۰ روپے) نکال سکتی ہے۔ اس صورت میں بھی وہ نکالی گئی رقم پر ۱۲ فی صد ترغیب پانے کی مجاز ہے بشرطیکہ یہ رقم پوسٹ آفس میں کم از کم ۳۰ دن تک رکھی رہی ہو۔

پہلی رقم جمع کراتے ہی کھاتہ کھول دیا جاتا ہے اور فوراً ہی پاس بک جاری کر دی جاتی ہے۔ اس پاس بک میں رقم جمع کرنے کی تاریخ، اس کے پورا ہونے کی مدت (DATE OF MATURITY) اور سال کے آخر میں ادا کی جانے والی ترغیبی رقم درج کر دی جاتی ہے۔ ایم۔ ایس۔ وائی کھاتہ دار کسی دوسری اسکیم کے تحت بھی اپنا دوسرا کھاتہ کھول سکتی ہے۔

کسی اسکیم کی کامیابی اس کا اچھا آغاز ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کو لگاتار آگے بڑھانا بھی نہایت اہم ہے۔ یعنی اگر اسکیم کی دیکھ ریکھ (MONITEERING) اچھی طرح نہ کی جائے تو وہ اسکیم زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتی۔ مہلاسمردھی یوجنا کے بنانے والوں نے اس بات کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کی مانیٹرنگ (MONITEERING) کا جامع پلان مرتب کیا۔

اس اسکیم کی مانیٹرنگ کے لیے یوجنا آیوگ میں ایک اعلا سطحی مانیٹرنگ کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کا کام اس اسکیم پر عمل درآمد کا جائزہ لینا اس میں بہتری لانے کی تجاویز پیش کرنا ہے۔ یہ کمیٹی محکمہ جاتی سیکریٹریوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جس کی میٹنگیں (MEETINGS) مقررہ مدت کے بعد ہوتی رہتی ہیں۔ قومی سطح کے علاوہ اسکیم کی مانیٹرنگ، ریاستی اور ضلعی سطحوں پر بھی کی جا رہی ہے۔ ریاستی سطح پر اس کی مانیٹرنگ ریاستی سطح کی جائزہ کمیٹیاں کرتی ہیں اسی طرح ضلعی سطح پر ضلعی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ اب تک ۲۲ ریاستوں اور دو مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں اس طرح کی کمیٹیاں قائم کی جا چکی ہیں۔ یہ ریاستیں اور علاقے درج ذیل ہیں۔

ریاستیں اور مرکز کے زیر انتظام علاقے جہاں جائزہ کمیٹیاں کام کر رہی ہیں

ریاستیں

۱۔ آندھرا پردیش
۲۔ آسام
۳۔ دہلی
۴۔ گوا
۵۔ گجرات
۶۔ ہماچل پردیش
۷۔ ہریانہ
۸۔ جموں و کشمیر
۹۔ کرناٹک
۱۰۔ کیرالہ
۱۱۔ مدھیہ پردیش

مکان نمبر ۳۵-۱۲ (بالائی منزل) گلی محل سرائے، بلیماراں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

۱۲- مہاراشٹر
۱۳- منی پور
۱۴- میگھالیہ
۱۵- میزورم
۱۶- ناگالینڈ
۱۷- اڑیسہ
۱۸- پنجاب
۱۹- راجستھان
۲۰- تری پورہ
۲۱- اترپردیش
۲۲- مغربی بنگال

مرکز کے زیر انتظام علاقے

۱- انڈمان نکوبار ۲- چنڈی گڑھ

باقی ماندہ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں بھی اسی طرح کی کمیٹیاں قائم کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔

یہ مانیٹرنگ زیادہ تر ریاستی وضلعی حکام اور محکمہ ڈاک کے ذریعے حاصل کی گئی معلومات کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔

جس طرح کسی اسکیم کی کامیابی کے لیے اس کی اچھی مانیٹرنگ ضروری ہے اسی طرح اس کو آگے بڑھاوا دینے اور عوام میں مقبول بنانے کے لیے اچھی پبلسٹی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ آج کل ذرائع ترسیل بے انتہا ترقی کر چکے ہیں اور ہر چیز کی مقبولیت کا دارو مدار اس کی پبلسٹی پر ہو گیا ہے۔ اسکیم کی ترقی وفروغ کے لیے مناسب طور پر اس کی نشرواشاعت نہایت اہم رول ادا کرتی ہے خاص کر اگر اس کا تعلق عوام سے ہے۔ اسی بنیادی نکتے کو محسوس کرتے ہوئے حکومت نے مہیلا سمردھی یوجنا یعنی عورتوں کو با اختیار بنانے کی اسکیم کی وسیع پیمانے پر نشرو اشاعت (PUBLICITY) کا ایک جامع پروگرام ترتیب دیا ہے۔ اس کی اشاعت کے لیے ایک تال میل (COORDINATION) کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ مہیلا و بال وکاس محکمہ کی سکریٹری اس کی کرسی نشین اور ڈاک اور محکمہ اطلاعات کے سکریٹری اس کے ممبران ہیں۔

اس اسکیم کے روایتی انداز سے تشہیر کے لیے آسام، ہریانہ، ہماچل پردیش، جموں وکشمیر، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، اڑیسہ، پنجاب، راجستھان، تمل ناڈو اور اترپردیش میں وزارت اطلاعات و نشریات کے گیت وڈرامہ ڈویژن (SONG AND DRAMA DIVISION) کی مدد بھی لی جا رہی ہے۔

اس اسکیم کو شروع ہوئے ابھی تقریباً دو سال کا عرصہ گزرا ہے اور یہ اپنی ترقی کی منازل تیزی سے طے کر رہی ہے۔ اس کے قبول عام ہونے کا حال یہ ہے کہ اس کا نشانہ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء تک ڈیڑھ لاکھ کھاتے کھولنا تھا جب کہ اس مدت میں وزارت انسانی وسائل وترقی کی رپورٹ کے مطابق اس اسکیم کے تحت ۷، لاکھ ۹۲ ہزار کھاتے کھولے گئے اور آنے والے ہر ماہ میں ان کھاتوں کی تعداد میں نہایت تیز رفتاری سے اضافہ ہو رہا ہے۔ دیہی عورتوں نے اس اسکیم کا استقبال نہایت جوش وخروش سے کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کی اسکیم کے لیے پہلے سے ہی منتظر تھیں۔

مدھیہ پردیش کے ضلع مندسور میں واقع ۴۴ گاؤں کے ہر گھر میں کم از کم ایک عورت اس اسکیم کی کھاتہ دار ہے۔ مندسور کے کمشنر نے پورے ضلع کو کور کرنے کا قابل ستائش کام کیا ہے۔ اسی طرح کیرالہ میں ضلع پلاکڈ کے کیرالہ سیری (KERALA SERRY) پرایری (PIRAYIRI) اور بلاک الاتھور (ALATHUR) کے پتھی تھان (PATHITHAN) پنچایتوں نے اپنی کوششوں سے ہر خاندان میں سے ایک عورت کو اس اسکیم کا ممبر بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

جس طرح کسی اسکیم کی کامیابی کے لیے اس کا جامع ہونا، اس کی اچھی مانیٹرنگ ہونا اور اچھی پبلسٹی ہونا ضروری ہے اسی طرح اس کو اچھے انداز میں آگے بڑھانے کے لیے اس کے کارکنوں کی کارکردگی کی اہمیت کو نظر انداز نہیں نہیں کیا جا سکتا۔ اس اسکیم میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کے کارندوں میں جوش وخروش کو برقرار رکھنے کے لیے انھیں ترغیبات (INCENTIVES) دیے جانے کی اسکیم بھی ساتھ ساتھ تیار کی گئی ہے، جس کے تحت بے مثال کام کرنے کے لیے ریاستی سرکاروں اور ضلع انتظامیہ کو انعام دینے کا کام شروع کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کے عمل درآمد کے پہلے سال یعنی اکتوبر ۱۹۹۳ء سے ستمبر ۱۹۹۴ء کے دوران درج ذیل ریاستوں، مرکز کے زیر انتظام علاقوں اور ضلعوں کو انعامات سے نوازا گیا :-

ریاستی ایوارڈ (STATE AWARD)

اول انعام : تامل ناڈو
دوم انعام : آندھرا پردیش
سوم انعام : گوا

مرکزی علاقائی ایوارڈ (U.T.AWARD)

اول انعام چنڈی گڑھ
دوم انعام پانڈیچری

ضلعی ایوارڈ (DISTRICT AWARD)

ریاست	ضلع	انعام
آندھرا پردیش :	نالگونڈہ -	اول
	میڈک -	دوم
	گنتور -	سوم
آسام :	کریم گنج -	اول
	کچار -	دوم
گوا :	نارتھ گوا -	اول
ہریانہ :	سونی پت	اول
کرناٹک :	میسور	اول
	اتر کنڑ	دوم
	حسن	سوم
مدھیہ پردیش :	مندسور	اول
	بیتل	دوم
تامل ناڈو :	نلگری (NILGIRI)	اول
	پیریار	دوم
	کوئمبٹور	سوم
پنجاب :	لدھیانہ	اول
بہار :	دمکا (DUMKA)	اول
اترپردیش :	کانپور سٹی	اول

یوجنا، نئی دہلی

ریاست	ضلع	انعام
	باناره۔	دوم
	چمولی	سوم
مرکزی علاقہ:	لکش دیپ	اول

اسپیشل ایوارڈ

ریاست	ضلع
آندھرا پردیش:	آننت پور
	کرشنا
	گڈاپا
	چِتّور
	کرنول
	وارنگل
	رنگا ریڈی
	مغربی گوادوری
	وجیانگرم
	نظام آباد
تمل ناڈو:	دھرم پوری
	سلیم
	تریچوراپلی
	پڈوکوٹائی
	چنگل پٹو
	(CHINGALPATTU) ایم۔جی۔آر
	شمالی آرکوٹ امبیڈکر
	تھنجاور
کرناٹک:	کوڈاگو
اتر پردیش:	کانپور دیہات
	اناؤ
	ہمیرپور
	فتحپور
	بارہ بنکی
	سیتاپور
	پاؤری
کیرالہ:	کیرالہ سیری

یہ اسکیم شاید ادھوری رہ جاتی اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں اتنی زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکتی تھی اگر حکومت نے اس کے لیے فنڈ مہیا کرانے میں فراخدلی کا ثبوت نہ دیا ہوتا۔ کیوں کہ کسی اسکیم کی عمل درآمد کے لیے اگر مناسب رقوم حاصل نہ ہوں تو بھلے ہی وہ اسکیم اپنے آپ میں کتنی ہی عمدہ کیوں نہ ہو کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔ سال ۹۵-۱۹۹۴ء کے لیے حکومت ہند نے مہلا سمردھی یوجنا کے لیے ۵۰ کروڑ مختص کیے تھے۔ اس میں سے ۱۰ کروڑ روپے محکمہ ڈاک کو اس مد میں دیے گئے ہیں۔ اس کی نشر و اشاعت کے لیے تقریباً ایک کروڑ روپیہ مخصوص کیا گیا۔

اسکیم کے شروع کے دنوں کی مختلف پریشانیوں کے باوجود یہ بہت بڑی تعداد میں گاؤں کی عورتوں کو بچت آندولن میں حصہ لینے کے لیے ابھار چکی ہے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے اور انھیں معاشی آزادی دلانے میں نہایت کامیاب رہی ہے۔ اس نے غریب، اَن پڑھ دیہاتی، عورتوں میں بچت کی عادت کو فروغ دے کر ملک کی ترقی میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

اس اسکیم کی کامیابی کا سہرا ایک طرف تو اس اسکیم کی عمدہ پلاننگ کو جاتا ہے جس میں معمولی سے معمولی جزیات کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ جیسے کہ اس کو وسیع کرنے کے لیے فلک گیر پیمانے پر ڈاکخانوں کا استعمال، مانیٹرنگ کی اچھی اسکیم، اعلیٰ پبلسٹی، کارکنوں کو ترغیب اور انعامات وغیرہ کی اسکیمیں شامل ہیں۔ دوسری طرف اس اسکیم کو کارگر بنانے کے لیے اس کے کارندوں کا جوش و خروش اور فنڈز کے معاملہ میں حکومت کی فیاضانہ پالیسی کا بھی رول بہت اہم رہا ہے۔ یہی سب مجموعی وجوہات ہیں جن کے سبب ڈیڑھ سال کی قلیل مدت میں یہ اسکیم ملک کے ہر کونے کے دیہاتوں میں پہنچ گئی ہے۔ غریب سے غریب عورت بھی اس کا ممبر بن کر اس سے استفادہ حاصل کر سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ مہلا سمردھی یوجنا کی جامعیت، اس پر کی جانے والی محنت، لگاتار مانیٹرنگ، زبردست پبلسٹی اور فنڈز کے مناسب استعمال نے اس کو مقبول عام بنا دیا ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے جہاں اس کے کارکنان کی خدمات قابل ستائش ہیں وہیں حکومت ہند کا ہندوستانی دیہی عورتوں کی بہبود کا یہ قدم مبارکباد کے قابل ہے ●

بقیہ: بچہ مزدوری۔ ایک اہم مسئلہ

تحفظ فراہم کیا جاتا ہے؟ (۳) کیا سرکاری سطح یا نجی سطح پر کوئی قانون موجود ہے؟ (۴) کیا حقوق کی خلاف ورزی پر کوئی قانون موجود ہے؟ نیز اس پر عمل درآمد ہوتا ہے یا نہیں ہے۔

ان سوالات کی روشنی میں ملنے والے جوابات کے ذریعے یہ بات واضح ہوئی کہ لیبر قوانین میں فیکٹری ایکٹ کے باب میں جو نوجوانوں اور بچوں کے لیے شرائط مقرر کی گئی ہیں وہ حقوق کے تحفظ کے لیے ناکافی ہیں اور جو موجود ہیں وہ قطعی طور پر بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں۔ آخر نہ تو قانون پر عمل کرتا ہے اور نہ قانون بچوں کو کوئی تحفظ فراہم کرتا ہے جو کچھ بھی قوانین بنائے گئے وہ بے اثر اور بے معنی ہیں۔ موزونیت کا صداقت نامہ، بچوں کے کام کرنے کے اوقات پر پابندی، ضابطہ کار یہ سب کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ دیوانی و فوجداری قوانین میں بھی تحفظ ملتا ہے لیکن وہ بھی بے مقصد ہے۔ اکثر آجر اپنے بنائے ہوئے سینہ بہ سینہ قوانین پر متفق ہیں وہ کہاں اتنی لمبی چوڑی تاویل میں جائیں۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں جائیں کون سے قانونی ہرکارے ان ننھے کارکنوں کی کی طرف سے متفکر ہیں یا ان جابر آجروں کی گوشمالی کے لیے بے قرار ہیں یہ قانون تو صرف کارخانوں یا فیکٹریوں تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ادھر ادھر یہاں وہاں بچے کام کاج کرتے پھرتے ہیں وہاں کوئی قانون نہیں کوئی انصاف نہیں لگتا ہے یہ جگہیں قانون سے بالاتر ہیں۔

ہمارے ملک میں کیا کوئی ایسا نہیں جو ان جگہوں کی نشاندہی کرے؟ ان بچوں کے لیے میدان عمل میں آکر ان کے حقوق کے تحفظ کو یقینی بنائے، اخلاقیات اور انسانیت کے علم بردار جو انفرادی و اجتماعی طور پر بڑے سرگرم عمل نظر آتے ہیں، جو معاشرے سے برائیوں کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے کے دعویدار ہیں، جو طرح طرح کے سیمینار منعقد کرتے ہیں ان میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو بچوں کے لیے آگے آئے، ان کے مسائل کو محسوس کرے، ان کے احساسات کو جاننے کی کوشش کرے، ان کی خون پسینے کی اجرت میں دھاندلی بند کروائے، ملک کے ہر معاشی محاذ پر ظلم کا شکار ہونے والے ان بچوں کی شنوائی کہیں نہیں۔

بھارت میں بسنے والے آج کے بچے کیا بھارتی قوم کے فرزند نہیں؟ کیا ان کی قومیت مشکوک ہے؟ ان کے لیے کون انصاف فراہم کرے گا؟ اور کب کرے گا؟

یہ سوال ہماری، آپ کی، سب کی توجہ کا طالب ہے۔!!! ●

ثروت جہاں

خاندانی بہبود کی اہمیت

ہندوستان کی سماجی، ثقافتی اور اقتصادی زندگی میں اشتراکِ عمل اور باہمی رواداری کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ اس وسیع و عریض ملک میں وسائل اکثر کم پڑ جاتے ہیں اور سبھی عوام کو یکساں طور پر نہیں مل پاتے، اسی لیے بسا اوقات علاقائی اور طبقاتی مفادات، قومی مفادات پر غالب آجاتے ہیں اور اس تمام تر تنوع اور گوناگونی کی موجودگی میں ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنا ایک چیلنج بن جاتا ہے لیکن یہاں کی صدیوں پرانی روایات جو یہاں کے عوام کو ایک رشتے میں پروئے ہوئے ہیں، اس چیلنج سے نپٹنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہمارا کنبہ اور خاندان ہے۔

ہندوستان کی آبادی ۸۵ کروڑ سے بھی تجاوز کر رہی ہے، یہ آبادی ہر سال ۲ر۱۱ فی صد کے حساب سے بڑھ رہی ہے، آئندہ پچاس برسوں میں ہندوستان کی آبادی سب سے زیادہ ہو جانے کا اندیشہ ہے، ہر سال ملک میں تقریباً ایک کروڑ، لاکھ افراد کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ شرحِ اموات میں کمی اور صحتی خدمات کی توسیع و ترقی نے بھی آبادی میں اضافے کو جنم دیا ہے۔ اس طرح ملک کے قدرتی وسائل پر بڑا بوجھ پڑتا ہے اور ترقی کے نتیجے میں ہونے والے فائدے بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اضافۂ آبادی کا مسئلہ ملک کی بہبود و ترقی سے براہِ راست جڑا ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ ترقی کے عمل کے نتیجے میں ہی آبادی میں اضافے کی شرح کم ہو سکے گی۔ اس سلسلے میں خاندانی بہبود کی اہمیت اگر ذہن نشین کرادی جائے تو پھر یہ ہر گھر کی ضرورت بن جاتی ہے، خاندانی بہبود سے مراد یہ ہے کہ بچوں کو تغذیہ بخش خوراک ملے، ان کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ٹیکے لگوائے جائیں، گھر کے سبھی افراد کے لیے صحتی خدمات فراہم کی جائیں، زچہ بچہ کی دیکھ بھال ہو سکے، عورتوں کی بہبود کے پروگراموں کو آگے بڑھایا جا سکے تاکہ وہ بھی قوم و وطن کی تعمیر کے لیے کام کریں نیز اپنے کنبہ کی آمدنی بڑھانے میں معاون ہوں، چھوٹے بچوں کی تعلیم کے غیر رسمی پروگراموں کو خواندہ اور تعلیم یافتہ ماؤں کی مدد سے آگے بڑھایا جائے، بہبود کے یہ پروگرام پسماندہ دیہی علاقوں اور قبائلی آبادی والے علاقوں میں اور بھی زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، حکومت ہند نے آزادی کے فوراً بعد کنبہ کی بہبود کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا چناں چہ ۱۹۷۴ء میں بچوں کی بہبود سے متعلق قومی پالیسی تشکیل دی گئی تھی اور بچوں کو قوم کا بیش قیمت اثاثہ بتایا گیا تھا۔ قومی پالیسی کی قرارداد میں یہ کہا گیا تھا کہ ریاستوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بچوں کی پیدائش سے قبل اور مابعد پیدائش ان کی بہبود کے لیے بہتر سے بہتر خدمات مہیا کرائیں تاکہ ان کی جسمانی اور ذہنی ترقی کو یقینی بنایا جا سکے اور ان کی شخصیت کی تعمیر و ترقی بہتر طور پر انجام پا سکے۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء میں بچوں کی بہبود کے مربوط پروگرام کو تیزی سے آگے بڑھایا گیا اور اس سلسلے کے ۳۳ پروجیکٹ شروع کیے گئے، ۱۹۸۲ء میں مزید سو پروجیکٹوں کا اضافہ کیا گیا، اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا اور اب ۳۰۰ سے بھی زیادہ پروجیکٹوں پر کام ہو رہا ہے۔ ہندوستان کی اوسط آمدنی مشکل سے اتنی ہے کہ آبادی کے دو تہائی حصے کا پیٹ بھرا جا سکتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خاص کر دیہات میں زیادہ غریبی ہے۔ بڑھتی ہوئی پیدائش اور گھٹتی ہوئی شرحِ اموات کے دور سے گزرتا ہوا ہندوستان دنیا میں آبادی کے شدید ترین دباؤ کا علاقہ ہے، آبادی کے رجحانات میں تبدیلی کا اثر دو تین پشتوں کے بعد ظاہر ہوتا ہے اور اتنی ہی مدت اولاد پیدا کرنے کے رویے کو بدلنے میں لگتی ہے، ماہرین کے اندازوں کے مطابق اس صدی کے آخر تک ہندوستان کی آبادی سو کروڑ تک پہنچ سکتی ہے، مسئلہ یہ ہے کہ ان نئے پیدا ہونے والوں کا پیٹ کیسے بھرا جائے، یہ درست ہے کہ ہر شخص ایک منہ کے ساتھ دو ہاتھ بھی لے کر پیدا ہوتا ہے لیکن منہ تو پیدا ہوتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے جب کہ ہاتھوں کو کسی مفید کام کرنے کے لائق بنانے میں کم سے کم ۲۰ سال لگتے ہیں، اس کے علاوہ صنعتی ترقی کے نتیجے میں لوگ دیہات سے شہروں کی طرف جا رہے ہیں، اس لیے اصل مسئلہ رسد اور بڑھتی ہوئی آبادی میں توازن قائم کرنے کا ہے اور اسی سے خاندانی بہبود کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ چناں چہ آج کل ماہرینِ معاشیات اور سیاسیات کے دماغ اس مسئلے کی طرف لگے ہیں کہ آبادی کی موجودہ تیز رفتاری پر کیسے روک لگائیں کیوں کہ اس سے ہر کنبہ کی خوشحالی متاثر ہو رہی ہے، ضبطِ تولید یا پیدائش پر قابو اور روک لگانے کا طریقہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے بلکہ یہ زمانۂ قدیم سے ہی رائج ہے۔ یونان کے ایک مشہور فلاسفر نے چھ سو برس قبل مسیح ایک نظم میں لکھا تھا۔

"مویشیوں اور حیوانوں کے بچے انسان سے بہتر اور طاقتور ہوتے ہیں۔ انسان اپنے لیے گدھا،

وائی ڈبلیو سی اے، اتر دبنگلہ صاحب، نئی دہلی

گھوڑا، بھیڑ، بکری، کتا وغیرہ خریدتے وقت اس کی نسل اور جسمانی طاقت پر گہری نظر ڈالتا ہے، مگر افسوس کہ یہی انسان اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق کوئی احتیاط نہیں کرتا بلکہ مال، دولت، جاہ و حشمت سے مرعوب ہو کر انسانی نسل کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ مصر کے قدیم نسخوں میں بھی ضبط تولید کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔

اس طرح اس کی تائید میں ٹھوس اور وزن دار دلائل منظر عام پر آنے نیز تعلیم کا پھیلاؤ ہونے سے لوگ اب خاندانی بہبود کی اہمیت سے واقف ہوتے جا رہے ہیں، کم اولاد اور مختصر کنبہ کی صورت میں اخراجات میں کمی ہوتی ہے اور معیار زندگی بلند ہوتا ہے، انسان کو غم و آلام سے بھی نجات ملتی ہے اور وہ امن و سکون فارغ البالی اور خوشحالی کی ایسی زندگی گزارنے لگتا ہے کہ دوسرے لوگ اس پر رشک کرتے ہیں، افریقی ممالک کے زیادہ تر لوگ مٹھی بھر اناج اور دو گھونٹ پانی کے لیے بلکتے ہیں۔ چھوٹے کنبہ کے تصور میں جسمانی مفاد، روحانی پاکیزگی اور اخلاقی وسعت مضمر ہے، محدود کنبوں میں بزرگوں کی صالح روایات کے ساتھ ساتھ جدید طرز معاشرت کی اچھی باتوں کو اپنانے اور ان پر اولاد کو عمل کرانے میں سہولت ہوتی ہے، اولاد زیادہ ہونے کی صورت میں والدین ہمت ہار جاتے ہیں، اس طرح اولاد بے راہ رو ہو جاتی ہے اور اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے، تعلیم کے مواقع پہلے کے مقابلے کہیں زیادہ ہیں لیکن ان کا تعلق بھی اخراجات سے ہے، اس لیے اکثر لوگ اپنے بچوں کو محنت مزدوری پر لگا دیتے ہیں جہاں ان کا استحصال ہوتا ہے، نہ جانے کتنے ہی اعلا دماغ سپوت اور ہونہار اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، آج کل سے مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔

مہنگائی، سرمایہ داری، تقسیم دولت میں عدم مساوات، اصراف بے جا، غیر ضروری نمائش اور ایسے ہی متعدد اسباب کی وجہ سے ہے لیکن بڑھتی ہوئی آبادی بھی اس کا خاص سبب ہے، اس کی وجہ سے مانگ اور رسد میں تناسب قائم نہیں ہو پاتا۔

ازدواجی زندگی کا مقصد صرف بچے پیدا کرنا ہی نہیں ہوتا، اس کا اصل مقصد جسمانی اور روحانی یگانگت سے خلوص و محبت کے انسانی رشتوں کو مضبوط کرنا ہے، زیادہ بچے والدین کی محبت کی کمی محسوس کرتے ہیں، جب انھیں ماں، باپ کا پیار نہیں ملتا تو وہ جائز اور ناجائز طریقے اپناتے ہیں جس کی وجہ سے بچوں کے کردار کو صدمہ پہنچتا ہے، اولاد کم ہوتی ہے تو والدین مشترکہ طور پر بچوں کی تربیت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، اس طرح مختصر کنبہ آسودگی حاصل کر سکتا ہے۔

جب ہم خاندانی بہبود کی بات کرتے ہیں، تو ان تمام مسائل پر نظر ڈالنی پڑتی ہے جن کے خاندان کے افراد کی زندگی متاثر ہوتی ہے، اس طرح کے مسائل میں سگریٹ نوشی اور تمباکو نوشی کا مسئلہ بھی ہر کنبہ کو متاثر کیے ہوئے ہے، برطانیہ میں پچھلے ۵۰ سال کے عرصے میں پھیپھڑوں کے کینسر سے مرنے والے لوگوں کی تعداد میں دو ہزار فی صد کے حساب سے اضافہ ہوا اس طرح نشہ بھی ہر آدمی اور ہر کنبہ کا دشمن ہے۔ شراب نوشی سے صحت و زندگی کے لیے خطرات لاحق رہتے ہیں۔

خاندانی بہبود ہر شخص کی دلی تمنا ہے، مگر اس کا تعلق مضبوط ارادے اور عمل سے ہے۔ قدرتی طور پر ہر ماں اور ہر ایک باپ کی یہ خواہش ہے کہ اس کے کنبہ کے لوگ خصوصاً اس کے بچے کامیاب و کامراں زندگی گزاریں، اچھی تعلیم حاصل کریں، صحت مند رہیں، اچھی جگہ رہائش پذیر ہوں، اچھی خوراک کھائیں، اچھا کپڑا پہنیں، مگر یہ وہ تمنائیں ہیں جو یقیناً پوری ہو سکتی ہیں مگر کب؟ جب ہم دیوار کا لکھا پڑھ لیں یعنی بچوں کی تعداد محدود رکھیں جس سے ہماری خوشیوں میں اضافہ ہو اور ہمارے تفکرات کم سے کم ہوں، اس طرح ہم نہ صرف اپنے گھر، اپنے کنبے کی بلکہ قوم و ملک کی وسیع تر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

ہندوستان میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام ۱۹۵۱ء میں شروع کیا گیا تھا، ہندوستان کا شمار ان چند ملکوں میں ہوتا ہے جنھوں نے بڑھتی ہوئی آبادی کے سنگین مسئلے پر اولین فرصت میں توجہ دی۔ ہندوستان کی خاندانی منصوبہ بندی پالیسی میں یہ مقصد بھی واضح کیا گیا کہ شرح پیدائش کو اس حد تک کم کر دیا جائے کہ ہندوستان کے معاشی وسائل یہاں کی آبادی کی ضرورتوں کے لیے پورے ہو سکیں۔ ذیل کے نقشے سے خاندانی بہبود کے پروگرام کے تحت حاصل کی گئی کامیابیوں کا ایک مختصر خاکہ واضح ہو جاتا ہے۔

نمبر شمار	خاندانی منصوبہ بندی کے چند اہم حصے	۱۹۵۱-۶۱	۱۹۸۱	۱۹۹۳
۱۔	شرح پیدائش	۴۱٫۷	۳۷٫۲	۲۸٫۵
۲۔	شرح اموات	۲۲٫۸	۱۵٫۰	۹٫۲
۳۔	مجموعی شرح افزائش	۵٫۹۷	۴٫۵	۳٫۶
۴۔	بچوں کی شرح اموات (ایک ہزار بچوں کی پیدائش پر)	۱۴۶	۱۱۰	۷۴
۵۔	پیدائش جو روکی گئیں	۰٫۰۴	۴۴٫۲	۱۶۸٫۸۰

آٹھویں منصوبے میں اس محاذ پر متعینہ نشانے اس طرح ہیں:۔

۱۹۹۷ء تک حاصل کیے جانے والے نشانے

آٹھویں منصوبے کے اختتام تک حاصل کیے جانے والے نشانے

۱۔	شرح پیدائش	۲۶٫۰۰
۲۔	بچوں کی شرح اموات (ایک ہزار پیدائشوں پر)	۶۰٫۰۰

اس سلسلے میں کیرالہ اور تمل ناڈو میں آبادی میں اضافے کی روک تھام کی کوششیں کامیاب رہیں۔ کیرالہ میں شرح پیدائش گھٹ کر ۱۷٫۳ اور تمل ناڈو میں ۱۹٫۲ رہ گئی، اس کے برعکس بہار میں (۳۲٫۱) مدھیہ پردیش میں (۳۳٫۴)، راجستھان میں (۳۳٫۶)، اتر پردیش میں (۳۶٫۰) رہی۔ ان ریاستوں میں ہندوستان کی کل آبادی کا ۴۰ فی صد حصہ آباد ہے۔

ہندوستان میں صحت اور کنبہ کی بہبود کے لیے بنیادی سہولتوں کا جال پھیلایا جا چکا ہے لیکن عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے ابھی اسے مزید پائدار اور مستحکم بنانا ضروری ہے۔

خاندانی بہبود کے محکمے نے اس سلسلے میں کچھ نئی پیش رفت دکھائی ہے۔

بچوں کی زندگی یقینی بنانے اور ماں کی صحت کو محفوظ رکھنے کا پروجیکٹ

اس پروگرام کے تحت زچہ بچہ کی صحت کی مربوط انداز پر دیکھ بھال کی جاتی ہے، یہ پروگرام ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۵۱۔ اضلاع میں شروع کیا گیا تھا۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں مزید ۱۰۳۔ اضلاع کو اس میں شامل کیا گیا۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں مزید ۱۰۱۔ اضلاع کو اس میں شامل کرنا تھا۔ اس پروگرام کے ذریعے بچہ کی ماں کی صحت کی حفاظت اور بچوں کی اموات کے امکانات کو کم کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔

ٹیکہ کا پروگرام

۹۳-۱۹۹۲ء سے بچوں کے ٹیکہ لگانے کے پروگرام پر خصوصی زور دیا گیا ہے تاکہ بچوں کی حفاظت ہو سکے اور انھیں جان لیوا امراض سے نجات دلائی جا سکے، چناں چہ ملک کے سبھی اضلاع میں اعلا پیمانے پر اس پروگرام کو شروع کیا گیا ہے۔ ایسے علاقوں کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں ان پروگراموں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور پھر ان علاقوں پر خصوصی توجہ صرف کی گئی۔

خاندانی منصوبہ بندی پروگراموں کی حقیقت عوام پر روشن کرنے کے لیے ثقافتی سرگرمیوں سے بھی مدد لی گئی۔ نکڑ ڈرامے، بیہو، لوک ناچ، بھجن منڈلی، نوٹنکی وغیرہ سے اس پروگرام کی اہمیت سے عوام کو روشناس کرایا جا رہا ہے۔ شادی شدہ جوڑوں کو خاندانی منصوبہ بندی کے مختلف طریقوں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور اتر پردیش میں ایسے اضلاع میں جہاں خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت سے عوام الناس واقف نہیں، مربوط کوششوں کے ذریعے اس پروگرام کو عوامی حیثیت دی جا رہی ہے۔ ان ریاستوں کے لیے ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے اس مقصد کے لیے دیے گئے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کی وزارت نے ۹۴-۱۹۹۳ء میں اس پروگرام میں ان لوگوں کا تعاون حاصل کرنے پر زور دیا جو رائے عامہ پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، اس کام کو بروئے کار لانے کے لیے درج ذیل ریاستوں کو رقومات فراہم کی گئیں۔

اتر پردیش، بہار، راجستھان، مدھیہ پردیش، گجرات، کیرالہ، مغربی بنگال، آندھرا پردیش، ہریانہ، کرناٹک، تمل ناڈو، آسام، اڑیسہ۔ نوجوانوں کو اس پروگرام سے جوڑنے کے لیے نہرو یووک کیندروں سے بھی مدد لی گئی۔ انھوں نے ۱۳۵۔ ایسے اضلاع میں کام کیا جہاں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام نے خاطر خواہ اثرات نہیں دکھائے تھے۔

مہلا سواستھ سنگھ

۹۵-۱۹۹۴ء میں اس اسکیم کے لیے ۸ کروڑ ۱۵ لاکھ روپے دیے گئے۔ اس میں سے ۴ کروڑ ۸ لاکھ ان مہلا سواستھ سنگھوں کے لیے دیے گئے جو پہلے سے کام کر رہے تھے، جب کہ ۳ کروڑ ۷۶ لاکھ روپے ایسے سنگھوں (تنظیموں) کو دیے گئے جن کو تشکیل دیا جانا تھا اور جن کی تعداد ۲۴۵۷۶ رکھی گئی تھی۔ ان میں سے ۲۵۰۰ سواستھ سنگھ ہندی بولی جانے والی ۴ ریاستوں یعنی بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور اتر پردیش میں قائم کیے جائیں گے۔

اس وقت ۱۶ ریاستوں میں ۱۱ علاقائی پروجیکٹ زیرِ عمل ہیں، ان کے مجموعی مصارف ۱۴۔ ارب ۹ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے ہیں۔ اس کام کے لیے عالمی بینک اور اقوام متحدہ کے آبادی کی روک تھام سے متعلق فنڈ سے مدد ملتی ہے۔ ان کے علاوہ ڈنمارک کے بین اقوامی ترقیاتی ادارے اور غیر ملکی ترقیاتی ادارے کی طرف سے بھی امداد ملتی ہے۔

خاندانی بہبود کے دیہی مراکز

ہندوستان میں اس وقت دیہی خاندانی بہبود کے ۵۴۳۵ مراکز کام کر رہے ہیں۔ یکم اپریل ۱۹۸۰ء کے بعد سے خاندانی منصوبہ بندی خدمات پرائمری ہیلتھ سینٹروں کی مربوط انداز کی طبی خدمات کی شکل میں فراہم کی جا رہی ہیں۔ نئی دہلی میں طبی شماریات کے تحقیقی ادارے نے خاندانی بہبود دیہی مراکز کے کاموں کا جائزہ لیا۔

خاندانی منصوبہ بندی پروگراموں میں غیر سرکاری سیکٹر کی شرکت کو بھی اہم اور ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس سیکٹر کے ذریعے سے کنبہ کو چھوٹا رکھنے کی کوششوں کو بڑھایا جا رہا ہے۔ سرکار نے رضاکار اداروں کو اس کام سے جوڑنے کے لیے اخبارات اور ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کے پروگراموں سے بھی مدد ملی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی مدد سے عوام الناس کو ان اسکیموں سے مطلع کیا جاتا ہے جو رضاکار ادارے اپنے طور پر چلا رہے ہیں۔ غیر سرکاری سیکٹر میں خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں سے وابستہ اداروں کے کام پر نظر رکھنے کے لیے ہر ریاست میں ایک افسر کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی ہے۔ اس پروگرام کی کامیابی کے لیے ضروری تربیتی پروگراموں کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ اس مقصد کے لیے ریاستوں سے کہا گیا ہے کہ سرکاری سیکٹر کے کسی ایک ادارے سے تربیتی پروگرام شروع کرائیں اور اگر ضرورت ہو تو غیر سرکاری سیکٹر کے کسی ایک ادارے کو بھی اس کام کے لیے کہیں۔

مختصراً یہ کہ اب یہ پروگرام ہر گھر کی ضرورت بن چکا ہے۔ ہر کنبہ اپنے بچوں کے مستقبل کو خوشگوار بنانے کی تمنا رکھتا ہے اور اس کے لیے چھوٹے کنبے کی ضرورت و اہمیت پوری طرح واضح ہو چکی ہے۔ ●

نئے ڈیزائن کا مال ڈبہ

بھارتی ریلوے کی لکھنؤ پر مبنی تحقیق، ڈیزائن اور معیارات سے متعلق تنظیم نے ۲۵ ٹن کا ایکسل لوڈ ہوپر مال ڈبے کا ڈیزائن تیار کیا ہے۔ تیار ہونے پر نئے ڈیزائن کا یہ ہوپر مال ڈبہ ۴۲۲ ٹن کے ذریعے ایک مال گاڑی کی تھرو پٹ (پے لوڈ) فی ریک میں اضافہ کرے گا۔ درحقیقت پے لوڈ موجودہ بوبرن مال ڈبوں کی ۳۲۳۵ ٹن فی ریک سے بڑھ کر ہوپر مال ڈبوں کا ۳۶۵۷ ٹن فی ریک ہو جائے گا۔ آج کل بوبرن مال ڈبہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہوپر مال ڈبہ ۱۰۰ کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے چلے گا۔

پ۔ آنند کمار

بیکٹیریا کے ذریعے مچھروں کا خاتمہ

مچھر مدتوں سے حیات انسانی کے دشمن سمجھے جاتے رہے ہیں۔ وہ ملیریا، ڈینگیو فیور دگردن توڑ بخار) وغیرہ بہت سی بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ اسی طرح کا بلیکیلی (BLACKILIE) نام کا ایک کیڑا مغربی افریقہ میں دریائی اندھاپن پھیلاتا ہے۔ لیکن ان سب بیماریوں میں ملیریا گرم ممالک میں سب سے زیادہ قہر نازل کرتا ہے اور اس پر قابو پانا آسان نہیں ہے۔ دنیا بھر میں مچھروں پر قابو پانے کے لیے بہت برسوں سے کیمیاوی طریقوں سے بنائی ہوئی نامیاتی کیڑے مار دوائیں استعمال کی جاتی رہی ہیں لیکن وہ زیادہ کامیاب نہیں رہیں۔ الٹے ماحولیات اور صحت انسانی ہی کو نقصان پہنچا۔ حال ہی میں دیکھا گیا ہے کہ ملیریا پھیلانے والے مچھروں میں ملیریا کی روایتی دواؤں کے خلاف قوت مزاحمت پیدا ہو گئی ہے۔ ابھی تک ملیریا کا ٹیکہ نہیں بن پاتا ہے۔ مگر ناامیدی کی کوئی بات نہیں ہے کیوں کہ قدرت اپنے اندر بہت سے حل چھپائے ہوئے ہے۔ مچھروں پر قابو پانے کے لیے ایسا ہی ایک حل مٹی کے اندر پایا جانے والا بیکٹیریا جسے بی ٹی BACILLUS THURINGIENSIS (BT) کہتے ہیں۔

بی ٹی (BT) بطور جیسے صاف وشفاف پروٹین کے لیے مشہور رہے، جو ہماری زرعی فصلوں کو نقصان پہنچانے والے بہت سے کیڑوں کے لیے تیز زہر کا کام کرتا ہے۔ ان پروٹینوں سے انسانوں یا جانوروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ بی ٹی سے تیار کی گئی ادویہ مغربی ممالک میں گزشتہ تین دہائیوں سے فصلی کیڑوں کو مارنے کے لیے استعمال کی جاتی رہی ہیں۔

۱۹۷۷ء میں اسرائیل میں دو سائنس دانوں گولڈ برگ اور مارگولٹ نے بی ٹی کی ایک خاص ذیلی قسم کا پتا لگایا جو ایسے پروٹین پیدا کرتی ہے جو مچھروں اور بلیکیلی نامی کیڑوں کے لاروا کے لیے سم قاتل کا اثر رکھتی ہے۔ اس کی دریافت کے چند سالوں کے اندر اس کی تجارتی تراکیب تیار کی گئیں اور افریقہ میں وسیع پیمانے پر استعمال کی جانے لگیں۔ گزشتہ دو دہائیوں میں مغربی افریقہ کے دریاؤں میں بلیکیلی (BLACKILIE) کے لاروا پر بی ٹی کے ترکیبی ادویہ کے ہوائی چھڑکاؤ سے تقریباً ۶۰۰۰ مربع کلومیٹر کے رقبے میں بیماری کو روکنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔

ملیریا کے دوبارہ سر اٹھانے سے پیدا شدہ فکروتشویش کے بعد اب بی ٹی ترکیب کے استعمال سے ملیریا پر قابو پانے پر توجہ مرکوز کی جارہی ہے۔ ٹیکنار (TEKNAR) اور ویکٹوبی (VECTOBAE) جیسی بی ٹی تراکیب مچھروں کے لاروا کو ختم کرنے میں کارگر پائی گئی ہیں۔ پرائیویٹ انڈسٹری اس میدان میں داخل ہو کر انسانی صحت کے تحفظ میں مدد دے سکتی ہے۔

بی ٹی کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اب جینٹک انجینئرنگ کی تکنیکوں کو بھی استعمال کیا جارہا ہے۔ مچھروں کے لاروا کو نیلگو سبز کائی سے خوراک ملتی ہے، جو جھیلوں، تالابوں اور ٹھہرے ہوئے پانی کی جگہوں پر پائی جاتی ہے۔ زہریلے اثر والی بی ٹی کے لیے GENES کو کائی یا نیلگو سبز کائی مثلاً ANACYSTIS اور SYNECHOCYSTIS پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ اس ترکیب سے زیادہ زہریلی بی ٹی پیدا ہوتی ہے اور لگاتار پیدا ہوتی رہتی ہے۔ تالابوں اور جھیلوں میں جہاں مچھر پیدا ہوتے اور پلتے ہیں ان کے لاروا اس زیادہ زہریلی بی ٹی کے اثر سے ختم ہو جاتے ہیں۔

حال ہی میں یہ دریافت ہوئی ہے کہ ایک اور قسم کے بیکٹیریا BACILLUS SPHAERICUS میں ایسی پروٹین پائی جاتی ہے جو مچھروں اور مکھیوں کے لیے زیادہ زہریلی ہوتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے اس قسم کے بیکٹیریا کے بارے میں ایسے تحقیقی پروگرام شروع کریں جن سے مچھروں سے پیدا ہونے والی بیماریوں پر قابو پانے میں مدد ملے۔ اس سے نہ صرف لاکھوں روپیہ جو دواؤں پر خرچ کیا جاتا ہے بچے گا بلکہ ہمارا ماحول بھی محفوظ رہ سکے گا۔ ●

بقیہ : انسانی وجود اور ماحولیات

نظر آتی ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ماحولیات تحفظ اب نہ صرف سرکار کا سر درد نہیں رہا پرائیویٹائزیشن کے آج کے دور میں یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ہر ایک شخص سماجی تنظیم صنعتی اور کاروباری کمپنیاں، سرکاری محکمہ، پنچایتیں اور میونسپلٹی جیسی مقامی خود کار ایجنسیاں وغیرہ سبھی اس میں اپنا ہاتھ بٹائیں جو لوگ بھلائی اور اہم فرض کی شکل میں مذہبی نیت سے عطیہ دیتے ہیں انھیں باغبانی کو بھی ثواب کا ذریعہ بنانا چاہیے دیوار پر لکھے اس سندیش کو اب سمجھ لینا چاہیے کہ ماحولیات کا بھی ہوا، پانی اور خوراک کی طرح سے ہمارے وجود سے واسطہ ہے۔ ●

فروغ صبا جامی

بچہ مزدوری۔ ایک اہم مسئلہ

ہمارے ملک میں ایک ایسا طبقہ بھی آباد ہے جو غربت وافلاس کی آخری سیڑھی پر اپنی تمام تر مصیبتوں اور پریشانیوں کے ساتھ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ ہمدردی کے مستحق یہ بدنصیب خاندان وہ ہیں جن کے کفیل یا تو بھوک و بیماری کی نذر ہوگئے یا پھر مفلسی کی تاریک راہوں پر چلتے چلتے تھک چکے ہیں ایسے گھروں میں اپنے ساتھ لاتعداد مسائل لے کر پیدا ہونے والے بدنصیب بچے جوانی کی منزل سے گزرے بغیر ہی بڑھاپے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ پیدائشی حق سے محروم یہ بچے اپنے گھر کی تنگ دستی کو دیکھتے ہوئے محنت مزدوری کرتے ہیں۔ کسی گھر میں محض ہاتھ بٹانے کے لیے کام کیا جاتا ہے تو کسی گھر کے سرپرست یہی کم سن سپہ سالار ہوتے ہیں جو غربت وافلاس سے جنگ کرتے ہوئے اپنی ننھی ننھی خواہشوں کا گلا دبا دبا کر اپنے گھر والوں کے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔ غربت ومفلسی میں پروان چڑھنے والے، تعلیم سے ناآشنا، زندگی کی ہر آسائش سے دور انسانیت کی زمین پر اگنے والے یہ بدنصیب پھول اپنا بچپن سخت ترین مشقت اور جھڑکیوں میں گزارتے ہیں اور انہیں بار برداری میں کام آنے والے جانوروں کے برابر سمجھا جاتا ہے۔

بھوک، محنت اور بیماری کے گرد گردش کرنے والے بھارت کے یہ ناشاد تارے اپنی محنت ومشقت کوڑیوں کے مول بیچ رہے ہیں یہ ننھے ننھے چھوٹے چھوٹے ہاتھ، یہ پیارے پیارے معصوم و مغموم چہرے آپ سے بھیک وخیرات کے طالب نہیں یہ تو اپنی محنت کا جائز محنتانہ مانگتے ہیں تاکہ یہ بھی اپنے گھر والوں کی صحیح طریقے سے کفالت کر سکیں۔ اس ملک میں لاکھوں ایسے گھر موجود ہیں جن میں چولہا ان کم عمر بچوں کی مشقت کے بعد جلتا ہے۔

حصول معاش کے سلسلے میں یہ بچے کہاں کہاں نظر نہیں آتے کیا کچھ نہیں کرتے، مئی جون کی چلچلاتی دھوپ ہو یا دسمبر جنوری کی کڑکڑاتی ہوئی سردی بارشوں کا شور ہو یا طوفانی ہواؤں کے جھکڑ، ان ننھے مزدوروں کی ضرورت موسموں کے بدلتے ہوئے تیوروں پر حاوی نظر آتی ہے تب ہی تو یہ جوان اور توانا مزدوروں کے شانہ بہ شانہ کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آٹھ گھنٹے سے لے کر بارہ چودہ گھنٹے مشقت کرنے والے یہ محنتی بچے عملی زندگی کے ہر میدان میں نظر آئیں گے۔ آگ کے بھٹوں پر، اینٹوں کی پکائی ہو یا شیشے اور دوسری دھاتوں کے ظروف بنانے کے کارخانے، کپاس بیلنے کا خطرناک کام ہو یا بیلے ہوئے گنے کا رس سے کڑھاؤ میں گڑ بنانے کا عمل، فصلوں کی کٹائی کے کام سے لے کر آٹا، مرچ کی پسائی، بھرائی کا کام، منڈیوں اور بازاروں میں باربرداری کا کام ہو یا سیمنٹ گارے کی ڈھلائی، آگ جیسے کول تارے سڑکیں بنانے کا کام ہو یا سڑکوں پر اخبار، پھول فروشی کا دھندا، سگنلز پر رکتی ہوئی گاڑیوں کی صفائی ہو یا ٹیکسی اسٹینڈوں پر چھوٹی بڑی گاڑیوں کی دھلائی، پٹرول پمپوں پر گاڑیوں میں پٹرول ڈالنے کا کام ہو یا موٹر گیراجوں میں مرمت کا کام، بس اسٹاپ پر ٹھنڈے پانی کے گلاسوں کی فروخت ہو یا قبرستان میں قبروں پر پانی کا چھڑکاؤ یہ باہمت وعظیم بچے ان جیسے بے شمار کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود معاشرے کی بے رحمی اور ناانصافیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق مہینے میں سو سے لے کر ۳۰ گھنٹے تک دوکانوں اور کارخانوں میں مزدوری کرنے والے اکثر بچوں کو ایک روپیے سے لے کر دو روپیے فی گھنٹہ تک کا معاوضہ ادا کیا جاتا ہے حالاں کہ ہر بچہ اپنی عمر اور قوت کے لحاظ سے بھرپور کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اپنی محنت کا ناکافی معاوضہ وصول کرنے والے یہ پریشان حال بچے کارخانوں اور دوکانوں کے کام کے ساتھ ساتھ اپنے آجر کے گھر باہر کے وہ تمام کام انجام دیتے ہیں جو کوئی غلام ہی کرسکتا ہے ان کو کوئی اضافی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ملک کے اکثر شہر کی منڈیوں میں باربرداری کا کام خچروں اور گدھوں سے لیا جاتا ہے۔ بوجھ سے لدے ان جانوروں کی سست رفتاری یا رکھنے کی صورت میں انھیں مار پڑتی ہے یا بری بھلی سننی پڑتی ہے بالکل ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونے والے یہ کم عمر کارکن اکثر بازاروں اور منڈیوں میں اپنے وزن سے زیادہ بوجھ اٹھائے اپنا کام انجام دیتے رہتے ہیں۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ملک میں کیا کوئی ایسا قانون موجود ہے جو ان بچوں کو ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دے ہم نے بچوں کے حقوق بذریعہ "لیبر قوانین" کی عدالت کے سول جج اور وکیل سے چند سوالات کیے جس کی وضاحت مزید تشریح کے ساتھ یہاں کی جا رہی ہے۔

(۱) کیا مروجہ لیبر قوانین میں کم عمر بچوں کے حقوق کا احاطہ کیا گیا ہے۔؟ (۲) کیا قوانین کے ذریعے کوئی

باقی صـ۲۱ـ پر

کلامی محلہ، نزد مسجد۔ اورنگ آباد۔ ۸۲۴۳۱۰۱

غفران احمد

ایک سرکردہ مجاہد آزادی اور محب وطن

مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانی

ہندوستان میں بیسویں صدی کی تاریخ زندگی کے مختلف شعبوں میں جن اہم اور نمایاں واقعات سے بھری پڑی ہے، ان میں سب سے نمایاں تحریک آزادی ہے۔ برطانوی سامراج کے خلاف ملک کے تمام طبقوں نے متحد ہوکر جدوجہد کی۔ جان ومال کی قربانیاں دیں۔ ہزاروں مجاہدین حریت سالہا سال قید وبند کی زندگی سے گزرے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی اسی جہاد حریت کا ثمرہ ہے۔

تحریک آزادی ہماری قومی زندگی کا ایک روشن باب ہے اور دیوبندی مکتب فکر سے وابستہ علماء کی اس میں سرگرم شرکت ایک تاریخی حقیقت ہے۔

ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا، علماء کی جماعت نے خاص کردار انجام دیا۔ علماء کی یہ جماعت اپنے طرز فکر کے بنا پر ولی اللہ جماعت کہلاتی تھی۔ دہلی کے علاوہ ان کی سرگرمیوں کے مراکز میرٹھ، مظفر نگر اور سہارنپور اضلاع تھے۔ شاملی اور تھانہ بھون کے محاذوں پر ۱۸۵۷ء میں ناکامی کے بعد علماء کی اس جماعت نے شکست تسلیم نہیں کی اور تھوڑے سے وقفہ کے بعد خود کو ازسرنو منظم کرلیا۔ لیکن اب راستہ بدل دیا تھا۔ مسلح جدوجہد کا دور ختم ہوگیا تھا اور حصول آزادی کے لیے دوسرے طریقے اپنائے جانے لگے تھے۔ تحریک آزادی کا ایک مرکز قصبہ دیوبند تھا، جہاں اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس کے بانیوں اور اساتذہ کی اکثریت تحریک آزادی سے وابستہ رہی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا اس تحریک کے روح رواں تھے۔

مولانا مفتی عتیق الرحمان عثمانی اسی تاریخی قصبہ کے ایک علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے جد امجد مولانا فضل الرحمان دارالعلوم کے چار بانیوں میں سے ایک تھے۔ والد گرامی دارالعلوم میں منصب افتاء پر فائز تھے۔ علماء اور مشائخ کی صف میں ان کا ایک ممتاز مقام تھا۔

مفتی عتیق الرحمان کی ولادت ۱۹۰۱ء میں ہوئی۔ بچپن دیوبند کے پاک صاف ماحول میں گزرا۔ ان کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ کی گئی۔ ایک ہونہار اور ذہین طالب علم کی حیثیت سے مفتی صاحب نے اسلامی علوم میں جلد ہی کمال حاصل کرلیا۔ سب سے پہلے آپ نے قرآن پاک حفظ کیا۔ پھر دارالعلوم کے درجہ فارسی میں پانچ برس تک ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد عربی درجہ میں داخل ہوئے جہاں ان کی ذہانت کا جوہر اور بھی نکھر کر سامنے آیا۔ وہ ہر درجہ میں اعلا نمبروں سے کامیاب ہوتے چلے گئے اور دورہ حدیث میں، جو کہ تکمیل علوم کا آخری سال تھا، پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس زمانہ میں جلیل القدر محدث علامہ انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث تھے۔ مفتی عتیق الرحمان عثمانی کا شمار ان کے ذہین اور ممتاز شاگردوں میں ہوتا ہے۔

تکمیل علوم کے بعد ان کو دارالعلوم ہی میں معلم اور مفتی کی خدمات سپرد کی گئیں۔ مفتی اور مدرس کی حیثیت سے جلد ہی دارالعلوم میں ان کو شہرت حاصل ہوگئی۔ لیکن دیوبند کی محدود سرزمین کی بجائے انھوں نے اپنی سرگرمیوں کے لیے دوسرے مقامات کو اپنی جولان گاہ بنایا، جیسا کہ آنے والے برسوں کے واقعات سے پتا چلتا ہے۔ دارالعلوم میں اساتذہ میں اختلافات ہوئے تو وہ اپنے استاد علامہ انور شاہ کے ہمراہ گجرات کے مقام ڈابھیل منتقل ہوگئے، جہاں عربی مدرسہ میں انھیں معلمی اور افتاء کی خدمات سپرد کی گئیں۔ ان کے ساتھ مجاہد آزادی مولانا حفظ الرحمان بھی اسی مدرسہ میں تھے۔

طالب علمی کے دور ہی سے مفتی عتیق الرحمان تحریک آزادی سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اس زمانہ میں انھوں نے ایک دیواری اخبار نکالا، جس میں ولولہ انگیز مضامین ہوتے تھے۔ قوم پرستانہ طرز فکر جو انھوں نے دور شباب میں اپنایا تھا، ان کی ساری زندگی پر حاوی رہا۔ اسی بناء پر تمام قوم پرور تحریکوں سے ان کا تعلق رہا۔ قوم پرست تنظیم جمعیت علماء ہند کے صف اول کے رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ طویل مدت تک وہ اس کے ورکنگ صدر رہے۔ کانگریس سے ان کی وابستگی اسی دور میں شروع ہوئی، جب وہ دیوبند سے نکلنے کے بعد قومی میدان میں آئے۔ مفتی عتیق الرحمان نے دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس کے رکن تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے۔ کئی تعلیمی اور علمی اداروں سے ان کا تعلق تھا۔ خود انھوں نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ ادارہ ندوۃ المصنفین کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے نے علوم اسلامی اور مشرقی علوم پر جو تصانیف شائع کیں، ریسرچ اور معیار کے لحاظ سے انھیں یوروپ کے کسی بھی معیاری ادارہ کی تصنیفات کے مقابلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اسی ادارہ سے ماہنامہ برہان جاری کیا، جس نے جلد ہی ملک اور بیرون ملک کے علمی حلقوں میں اپنا ایک خاص مقام بنالیا۔

ڈابھیل (گجرات) کے اسلامی مدرسہ کے زمانہ ملازمت میں مفتی عتیق الرحمان عثمانی کو ایک خاص واقعہ سے گزرنا پڑا، جس سے قوم پرستی کی تحریک میں ان کے خیالات کا پتا چلتا ہے۔ بطور مفتی وہ اسلام کے ترجمان کہلائے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلے میں مہاتما گاندھی نے ڈانڈی مارچ کا اعلان

کیا۔ ڈانڈی مقام سے گاندھی جی ستیاگرہیوں کے ہمراہ
جب دھراسیا گاؤں پہنچے تو مفتی عتیق الرحمان عثمانی، مولانا
حفظ الرحمان اور دیگر علماء ڈابھیل سے وہاں گئے تاکہ گاندھی
جی سے ملاقات کرسکیں۔ اس ملاقات کی تفصیل خود مفتی مرحوم
نے اپنے ایک مضمون میں بیان کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"ہم گاندھی جی کے پاس پہنچے تو وہ ہمیں دیکھ کر
بہت خوش ہوئے اور خندہ پیشانی سے انھوں نے کہا:
آؤ مولانا! پھر ہم سے بیٹھنے کو کہنے سے بھی پہلے انھوں نے
پوچھا کہ مولانا میں نے سنا ہے کہ "آں حضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا ہے کہ پانی، گھاس اور نمک پر کوئی ٹیکس
ڈیوٹی نہیں" میں نے اس کی تصدیق کی تو وہ اور خوش
ہوئے اور دیر تک کرید کرید کر تفصیل پوچھتے رہے۔ میں
نے تفصیلات بیان کیں تو انھوں نے کہا کہ بڑی مہربانی
ہوگی اگر آپ انھیں لکھ کر بھیج دیں۔ ہم وہاں دن بھر رہے
اور واپس آنے کے بعد میں نے لکھ کر بھیج دیا۔"

ڈانڈی مارچ کے ذریعہ نمک کا قانون توڑ
کر گاندھی جی نے تحریک آزادی کو جو ایک نیا موڑ دیا تھا
اس میں علماء کرام کا نمایاں حصہ رہا۔ ۱۹۲۰ء ہی میں پانچ سو
علماء ترک موالات و عدم تعاون کا فتویٰ دے چکے تھے۔
برطانوی حکومت سے کسی طرح کے تعاون کو مذہبی لحاظ
سے ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی مفتی
عتیق الرحمان کا ایک فتویٰ بھی ہے۔ یہاں کی سیاسی اور
قومی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، جب سردار ولبھ بھائی
پٹیل نے باردولی کی تحریک چلائی۔ اس تحریک کو کچلنے
کے لیے تشدد، قید و بند اور جائدادوں کی ضبطی کا سہارا
لیا گیا تو لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا۔ جائدادوں کی
ضبطی اور نیلامی کے سلسلہ میں ایک گاؤں کے مکھیا نے
جب ان سے فتویٰ پوچھا کہ عدم ادائیگی ٹیکس کی وجہ سے
نیلام پر چڑھی ہوئی جائدادوں کو خریدنا شرعی نقطۂ نظر
سے کیسا ہے تو مفتی صاحب نے فتویٰ دیا:"

"ضبط شدہ جائدادوں کا خریدنا ظلم و عداوت
و زیادتی کی کھلی حمایت ہے۔ ایسی جائدادوں کو خریدنا
اور اس کی بولی بولنا حرام ہے"۔

فتوے کے نتیجہ میں گجرات میں ہلچل مچ گئی۔
مسلم پریس گجرات نے فتویٰ لاکھوں کی تعداد میں چھاپ
کر تقسیم کردیا۔ اس پریس کو ضبط کر لیا گیا۔ پولیس کی پوچھ
تاچھ شروع ہوئی۔ وارنٹ بھی نکل گئے۔ لیکن اسی دوران
میں گاندھی ارون پیکٹ ہوگیا۔ جیلوں سے ستیاگرہیوں
کی رہائی شروع ہوگئی اور یوں مفتی عتیق الرحمان گرفتار
ہوتے ہوتے رہ گئے۔

گجرات کے بعد مفتی عتیق الرحمان مختصر مدت کے
لیے کلکتہ بھی رہے۔ درس و تدریس کا سلسلہ تھا لیکن
یہاں بھی اپنے قوم پرستانہ خیالات کے باعث حکومت
کی نظروں سے نہ بچ سکے۔ کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد
کے ساتھ ان کی طویل ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اس کے بعد
مفتی عتیق الرحمان دہلی چلے آئے اور یہاں ۱۹۳۸ء میں
مولانا حفظ الرحمان اور دوسرے رفقاء کے صلاح مشورہ
سے ادارہ ندوۃ المصنفین قائم کیا۔ ۱۹۴۷ء کے
پرآشوب دور میں یہ ادارہ جو قرول باغ میں تھا، تباہ
کردیا گیا لیکن کچھ ہی مدت بعد علاقہ جامع مسجد میں
ایک عمارت میں اس کا دوبارہ آغاز ہوا۔ مفتی صاحب
نے اس ادارہ کو معیاری بنانے میں جو کاوش کی وہ ان
ہی کا حصہ تھی۔

۱۹۶۴ء میں بزرگ کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید
محمود نے مسلم مجلس مشاورت قائم کی تو مفتی عتیق الرحمان
صاحب سے پورا پورا تعاون اس میں لیا۔ یہ ایک غیرسیاسی
تنظیم تھی جو ڈاکٹر سید محمود نے انتہا پسند سیاسی خیالات
میں توازن لانے اور امن و امان کا ماحول پیدا کرنے کے
لیے بنائی تھی۔ اس تنظیم کے رہنماؤں نے فضا کو بہتر
بنانے کے لیے ملک بھر میں دورے کیے، جس کے خوشگوار
نتائج سامنے آئے۔

مفتی عتیق الرحمان عثمانی کے قوم پرورانہ خیالات
پر ان ہی کے ایک ساتھی مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ان
الفاظ سے روشنی ڈالی ہے:

"نیشنلزم یعنی قوم پروری اور استخلاص وطن کی
تڑپ جیسے مفتی صاحب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس معاملہ
میں جتنا سنجیدہ فکر اور پختہ خیال میں نے مفتی صاحب کو
پایا، ان کے معاصرین میں کسی کو نہیں پایا۔ ان کی طالب علمی
کے زمانہ میں طلباء کا ایک قلمی اخبار بھی نکلتا تھا۔ اس
اخبار کی ایک اشاعت میں مفتی صاحب کا ایک طویل
مضمون نہایت مدلل، بصیرت افروز، پرزور اور شگفتہ
و دلکش زبان میں تھا۔ انھوں نے اس مضمون میں جو کچھ
لکھا تھا، اس کے عملی پیکر وہ خود تھے۔ مفتی صاحب اس
زمانہ میں بھی کھدر پہنتے تھے۔"

کیا تحریر اور کیا تقریر۔ دونوں میں مفتی عتیق الرحمان
عثمانی کو ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ افسوس کہ گردش
زمانہ نے انھیں تصنیف و تالیف کا زیادہ موقع
نہیں دیا، لیکن انھوں نے جو تحریریں یادگار چھوڑی
ہیں ان سے ان کے علمی مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی زندگی
میں مفتی عتیق الرحمان عثمانی نے کئی بین اقوامی کانفرنسوں
میں ہندوستانی علماء کی نمائندگی کی۔ سوویت یونین،
سعودی عرب، عراق اور پاکستان میں منعقدہ کانفرنسوں
میں شرکت کے علاوہ مفتی صاحب نے حکومت ہند کے
نمائندے کی حیثیت سے جکارتہ کی افریشیائی اسلامی
کانفرنس میں بھی حصہ لیا تھا۔

مفتی عتیق الرحمان کا انتقال ۱۲/مئی ۱۹۸۴ء کو
دہلی میں ہوا۔ وہ تحریک آزادی کے اہم ستون تھے۔
ان کی موت سے یہ ستون گر گیا۔ مفتی عتیق الرحمان عثمانی
نے متحدہ قومیت سے متعلق اپنے طرز فکر اور سیکولر
نظریات پر کبھی سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد،
رفیع احمد قدوائی اور قوم پرور علماء نے مذہب کی بنیاد
پر ملک کی تقسیم کی مخالفت کی تھی۔ علماء کی اس صف
میں مفتی عتیق الرحمان ممتاز تھے۔ وہ قوم کے لیے
ایک مثال قائم کر گئے۔

ریل انجنوں کی پیداوار میں اضافہ

چترنجن برقی ریل انجن ورکس
(سی ایل ڈبلیو) میں برقی ریل انجنوں کی
پیداوار ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۱۲۵ تھی جو ۹۵-۱۹۹۴ء
میں بڑھ کر ۱۵۰ ہوگئی۔ آٹھویں پنجسالہ منصوبے
کے پہلے تین برسوں میں ۴۱۵ ریل انجن
بنائے گئے ہیں۔ ۲۵۰ برقی ریل انجن
آٹھویں پنج سالہ منصوبے کی بقیہ مدت میں
تیار کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ میسرز
بھارت ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ کے تحت
۳۰ اے سی/ڈی سی ریل انجن آرڈر
کیے گئے ہیں۔ بی ایچ ای ایل نے ماہ
اگست ۱۹۹۵ء کے آخر تک سات ریل
انجن نومبر ۱۹۹۵ء تک سپلائی کر دیں گے۔

حسن ضیاء

ثانوی تعلیم اور روزگار کے امکانات

علم ان اہم ستونوں میں سے ایک ہے جس پر کسی مہذب سماج کا ڈھانچہ ٹکا ہوتا ہے۔ دور حاضر میں تعلیم ایک تہذیبی ضرورت اور انسانی شخصیت کے ارتقار وارتفاع کے لیے معاون ہونے کے ساتھ ساتھ روزی روٹی کمانے کے لیے بھی ازحد ضروری ہو گئی ہے۔ انسانی سماج کی ترقی کے مسلسل عمل کے نتیجے میں آج بیشتر پیشوں کو اپنانے کے لیے تھوڑی بہت تعلیم تقریباً لازمی ہو گئی ہے۔ پیشہ ورانہ ضروریات سے قطع نظر روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل کے لیے بھی بنیادی تعلیم نہ ہونے کی شکل میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔

ہمارے سماج کی بدنصیبی یہ رہی ہے کہ ڈگریوں کا حصول، وقار کا مسئلہ بنا لیا گیا ہے جس کے دوررس نقصانات اور مضر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اسی سبب لگن کے ساتھ علم حاصل کرنے پر ڈگریوں کی تعداد میں اضافے کو ترجیح دی جانے لگی۔ اعلاتعلیم کے شعبے میں ایسے افراد داخل ہو گئے جن کو نہ تو علم سے کوئی دلچسپی تھی نہ ان کا مطالعے اور تحقیق کی جانب کوئی حقیقی یا طبعی رجحان تھا۔

اگر ہمیں تعلیم کے ذریعہ سماج کی ہمہ گیر بہتری کا کام لینا ہے تو ڈگری کے حصول کے بجائے حصول علم کی جانب توجہ منتقل کرنی ہو گی۔ ڈگریوں اور اعلاتعلیم سے وابستہ مصنوعی وقار کو ختم کرنا ہو گا اور یہ بات سمجھنی ہو گی کہ بنیادی تعلیم ہر شہری کا حق ہے، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ثانوی سطح تک تعلیم حاصل کرنی چاہیے مگر اعلاتعلیم کی جانب ان لوگوں کو ہی رخ کرنے کی ضرورت ہے جن میں اس کے لیے حقیقی دلچسپی، رجحان اور صلاحیت (APTITUDE) ——— موجود ہو۔

حصول تعلیم میں ثانوی سطح بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ایک ایسا موڑ ہے جس پر کسی طالب علم کے آئندہ کیریئر کا تعین ہوتا ہے۔ اگر اس سطح پر صلاحیت کی بنیاد پر زیادہ تر طلبا کے تعلیمی سفر کا رخ کارآمد اور روزگار کے اچھے امکانات رکھنے والے پیشوں کی جانب موڑ دیا جائے تو یہ بے مقصد تعلیم جاری رکھنے سے کہیں بہتر ہو گا اور تعلیمی نظام پر بوجھ بھی کم پڑے گا نیز یہ کہ ایسا شخص بغیر وقت ضائع کیے سماج کا باکار اور خود کفیل حصہ بن سکے گا۔

ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ ثانوی تعلیم کی سطح کے بعد تعلیم کو روزگار سے جوڑنا بہت اہم ہے۔ تعلیم سے متعلق امور پر غور کرنے کے لیے بنائے گئے کوٹھاری کمیشن (۱۹۶۴ تا ۱۹۶۶) کی رائے تھی کہ بیشتر پیشوں کے لیے یونیورسٹی کی ڈگری ضروری نہیں ہے۔ ان پیشوں کو ہائر سیکنڈری سطح کے بعد تربیت یافتہ طلبا بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ کمیشن کا خیال تھا کہ کم از کم ۵۰ فی صد طلبا کو دسواں درجہ پاس کرنے کے بعد پیشہ ورانہ تربیت دلائی جائے تو یونیورسٹیوں پر بوجھ کم ہو گا ساتھ ہی مذکورہ بالا طلبا کو بآسانی روزگار مل سکے گا۔

کوٹھاری کمیشن کی سفارشات، ۱۹۶۸ء کی قومی تعلیمی پالیسی اور کئی پنج سالہ منصوبوں کے باوجود ثانوی تعلیم کو پیشہ ورانہ رخ دینے کے کام کی رفتار سست رہی۔ بہت سی ریاستی حکومتوں نے بھی پیشہ ورانہ تعلیم کے پروگرام شروع کیے گو انہیں کو بہت زیادہ کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے پروگرام کی توقعات پر پورا نہ اترنے کی جن وجوہ کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں وسائل کی کمی، انتظام وانصرام سے متعلق خامیاں، تکنیکی مہارت کی کمی اور اساتذہ کی تیاری اور تربیت میں خامیاں شامل ہیں۔

مندرجہ بالا صورت حال کے پیش نظر تعلیم کو روزگار سے قریب تر لانے اور پیشہ ورانہ بنانے کے سلسلے میں مرکزی حکومت نے اپنی شرکت ضروری سمجھا۔ منصوبہ بندی کمیشن نے ساتویں پنج سالہ منصوبے کے لیے ثانوی تعلیم کا جو ورکنگ گروپ تشکیل دیا تھا اس نے بھی مرکزی حکومت کی جانب سے اس سلسلے میں اقدامات کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ ۱۹۸۶ء کی قومی پالیسی میں تعلیم کو پیشہ ورانہ رخ دینے کے پروگرام کو بہت زیادہ ترجیح دی گئی۔ اس پالیسی نے پیشہ ورانہ تعلیم کو ایک ایسا الگ مضمون قرار دیا جس کے تحت طلبا کو مختلف پیشوں کے لیے تیار کیا جائے گا۔ فروری ۱۹۸۵ء میں وزارت تعلیم نے انا یونیورسٹی مدراس کے وائس چانسلر ڈاکٹر وی سی کلندئی سوامی کی صدارت میں جو ورکنگ گروپ بنایا تھا اس نے سفارش کی تھی کہ پیشہ ورانہ تعلیم کے سلسلے میں پالیسی سازی، تال میل، معیار بندی، نصاب کی تیاری اور مشاورتی خدمات کی ذمہ داری مرکزی حکومت اپنے ذمے لے۔ اپریل ۱۹۸۷ء میں منعقدہ ریاستی وزرائے تعلیم کی کانفرنس میں بھی پیشہ ورانہ تعلیم کے سلسلے میں بڑی

سی۔۱۹۷، قدوائی نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳

حد تک اتفاق رائے ہو گیا تھا۔

قومی تعلیمی پالیسی کے تحت ثانوی تعلیم کو پیشہ ورانہ بنانے کی جو اسکیم بنائی گئی ہے اس کے اہم مقاصد میں تعلیمی مواقع کو متنوع بنا کر روزگار کے امکانات کو وسیع تر کرنا، تربیت یافتہ افرادی قوت کی مانگ اور دستیابی کے فرق کو کم کرنا اور اعلا تعلیم کی جگہ متبادل نظام تعلیم فراہم کرنا ہے۔

اس پالیسی کے تصور میں پیشہ ورانہ تعلیم ایک ایسا الگ راستہ ہوگا جس پر چلنے والوں کی منزل پہلے سے متعین ہوگی۔ ثانوی سطح کے بعد پڑھائے جانے والے یہ کورسیز عام تعلیمی اداروں میں پڑھائے جائیں گے اور ان کی مدت ایک برس سے تین برس کے درمیان ہوگی۔

پیشہ ورانہ تعلیم کی مرکزی اسکیم پر عمل درآمد کی ذمہ داری ریاستی حکومتوں کی ہوگی۔ اس اسکیم کے تحت قومی سطح پر پیشہ ورانہ تعلیم کی ایک جوائنٹ کونسل قائم کی گئی ہے۔ ایسی ہی کونسلیں ریاستوں میں بھی پالیسی وضع کرنے کا کام انجام دیں گی۔ قومی سطح کی کونسل کے دائرہ کار میں جو امور شامل ہیں وہ ہیں، مختلف تنظیموں اور وزارتوں کے ذریعہ چلنے والے پیشہ ورانہ تعلیم کے پروگراموں کی منصوبہ بندی اور ان میں تال میل، افرادی قوت کی ضرورت کا جائزہ، ہر سطح پر پیشہ ورانہ پروگراموں کی شروعات، اساتذہ کی تربیت، درسی کتابوں اور دیگر تدریسی ساز و سامان کی تیاری، غیر سرکاری تنظیموں کو پیشہ ورانہ تعلیم عام کرنے کے پروگراموں میں شرکت کرنے کے اصول متعین کرنا اور ان پروگراموں پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی شامل ہیں۔

۱۹۹۳-۹۴ء میں نویں اور دسویں درجے کے طلبا کو پیشہ ورانہ تربیت دینے کے لیے "پری ووکیشنل اسکیم" بھی شروع کی گئی تھی۔ تعلیمی تحقیق و تربیت کے ادارے (NCERT) نے بھوپال میں پہلی جولائی ۱۹۹۳ء کو پنڈت سندر لال شرما مرکزی انسٹی ٹیوٹ برائے پیشہ ورانہ تعلیم قائم کیا ہے۔ یہ ادارہ ملک میں ثانوی سطح پر تعلیم کو روزگار سے جوڑنے کے کام میں اہم امداد فراہم کر رہا ہے۔ اس ادارے نے چھ شعبوں سے متعلق ۸۲ نصابات تیار کیے ہیں۔

بارہویں درجہ کی سطح پر اس اسکیم کو نافذ کرنے کی ذمہ داری ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی ہے۔ ۱۹۹۳-۹۴ء کے آخر تک ۵ ہزار سے زائد اسکولوں میں ۱۶۴۵۰ سیکشن کھولے گئے جو طلبا کو مختلف پیشوں سے متعلق تربیت دیتے ہیں۔ اس طرح اس سطح کے آٹھ لاکھ سے زائد طلبا کو یہ سہولت دستیاب کرادی گئی ہے کہ وہ اپنی تعلیم کو پیشہ ورانہ رخ دے سکیں۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے نصاب میں، روزگار کی منڈی میں مانگ کو مد نظر رکھنے اور درمیان میں تعلیم ترک دینے والوں کو بھی پیشہ ورانہ تربیت دینے کی تجویز ہے۔ سرکاری عملے کی وزارت نے مختلف مرکزی وزارتوں اور محکموں سے کہا ہے کہ وہ نوکریاں دینے میں ان امیدواروں کا بھی خیال رکھیں جنھوں نے پیشہ ورانہ تربیت حاصل کی ہے۔

مندرجہ بالا سرکاری اقدامات سے قطع نظر یہ بات لائق توجہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والوں میں تعلیم میں مقصدیت پیدا کرنے کا رجحان عام ہو اور بے مقصد ڈگریاں حاصل کرنے کے رجحان کو روکا جا سکے۔ ●

بقیہ: بڑھتے قدم

کا تناسب معلوم کرنے کے لیے پانی کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

بڑے کاموں پر اخراجات مرکزی اور ریاستی حکومتیں مساوی طور سے برداشت کریں گی جب کہ کام کاج اور دیکھ بھال کے اخراجات مکمل طور سے متعلقہ ریاست برداشت کرے گی۔ ●

بقیہ: سماجی و اقتصادی مسائل سے کیسے نکلا جائے

کرنا ہے۔ تاکہ مستقبل میں ہمارا سماج ان مسائل سے چھٹکارا پا سکے اور عوام خوشگوار زندگی گزار سکیں۔ اردو ناول نگاری میں کرشن چندر کا بہت اہم مقام ہے۔ اردو فکشن میں ان کا نام اسی ناول کی وجہ سے روز روشن کی مانند زندہ رہے گا۔

●

پن بجلی پروجیکٹ کے لیے ۲۷۳ تجاویز

حکومت ہند کی نئی پاور پالیسی کو کافی پذیرائی ہوئی ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس سلسلے میں ۲۷۳ پن بجلی پروجیکٹ کے قیام کے لیے تجاویز موصول ہوئی ہیں۔ ان سب پروجیکٹوں کی پیداواری قوت ۲۵ر۱۳۹۸۱ میگاواٹ ہے جب کہ اس پر ۶۱۵ر۵۴۸۳۴ کروڑ روپے کا خرچ آئے گا۔

ان تجاویز میں ۱۹ آندھرا پردیش سے آئی ہیں، جن کی کل پیداواری قوت ۷۵ر۳۲۲۷ میگاواٹ ہے اور ان پر ۰۵۵ر۱۵۸۶۱ کروڑ روپے کے اخراجات عائد ہوں گے۔ کرناٹک سے ۱۴ پروجیکٹ ہیں جن کی پیداواری قوت ۵۰ر۸۰۱ میگاواٹ ہے۔ ان پر ۵۰۷-۲۶۳۹ کروڑ روپے کے اخراجات آئیں گے۔ جب کہ کیرالہ سے ۱۱ تجاویز آئی ہیں جن کی پیداواری قوت ۵۰-۱۰۰ میگاواٹ ہے ان پر ۵۱-۳۴۹ کروڑ روپے کے اخراجات آئیں گے۔

تمام تر تجاویز ۲۴۳ ہیں جن کی کل پیداواری قوت ۳۴۹۲۹۵ میگاواٹ اور خرچ ۹۰۵ر۱۳۱۸۳۳ کروڑ روپے ہیں۔

خواجہ عبدالخالق

ہمارے ذرائع رسل و رسائل:

دوریوں کے خاتمے کے ضامن

انسان ایک معاشرتی اور سماجی مخلوق ہے اور مختلف سطحوں پر مختلف النوع رشتوں کا طالب۔ وہ بنیادی طور پر سماجی رشتوں اور میل جول کا بھوکا ہے جس کے حصول کے لیے دوسروں سے راہ و رسم اور روابط رکھنا ضروری ہے۔ مستثنات درکنار، انسان خلوت پسند نہیں، جلوت پسند ہے۔ تنہائی اس کے لیے ایک سزا ہے۔ اسی لیے تعزیرات ہند میں قید تنہا، بھی ایک سزا ہے جو بعض حالات میں بعض جرائم کے لیے دی جاتی ہے۔ انسان اپنی اس فطری اور سماجی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں سے برابر ملتا جلتا رہتا ہے اور گر وہ دور دراز علاقوں میں ہوں جہاں جاکر ملاقات کرنا ممکن نہ ہو یا مشکل ہو تو پھر وہ خط و کتابت یا دوسرے ذرائع سے پیغام بھیج کر ان سے رابطہ قائم رکھنا چاہتا ہے۔ کاروباری مقاصد کے لیے بھی اسے ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پیغام رسانی کے ذرائع وقت کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ سائنسی دور سے قبل یہ کام کبوتروں اور ہرکاروں سے لیا جاتا تھا لیکن پچھلے ڈیڑھ سو سال میں آمد و رفت اور خبر رسانی کے ذرائع کی حیرت انگیز ترقی کی بدولت خبر رسانی کا عمل نہ صرف بہت آسان اور زود رفتار ہو گیا ہے بلکہ ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، ٹیلیکس اور فیکس کے ذریعہ تو خبریں، پیغامات اور تصویریں آناً فاناً دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہیں۔ لیکن جدید ذرائع پیغام رسانی بہت مہنگے ہیں اور انھیں بروئے کار لانے کے لیے ایک بڑے نظام کی ضرورت ہوتی ہے جسے بہت بڑے ادارے ہی چلا سکتے ہیں۔

ہمارے ملک ہندوستان میں خبر رسانی کے ذرائع کو چلانے کا ذمہ حکومت نے لے رکھا ہے جسے وہ انتہائی خوبی سے سرانجام دے رہی ہے اور سائنسی و تکنیکی دریافتوں، ایجادات اور اختراعات کو استعمال کرتے ہوئے ہمارے اطلاعاتی نظام کو وسیع سے وسیع تر اور خوب سے خوب تر بنائی جا رہی ہے۔ نتیجتاً اس وسیع و عریض ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگوں کے درمیان مادی فاصلوں کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے اور وہ ایک دوسرے کے قریب تر آتے جا رہے ہیں۔ ہمیں یہاں یہ دیکھنا ہے کہ ہماری حکومت یہ سب کچھ کیسے کر رہی ہے۔

ہمارے اطلاعاتی نظام میں اولین حیثیت ڈاک کے نظام کی ہے جو ملک کے کونے کونے میں پھیلا ہوا ہے اور جسے ملک کا عام آدمی استعمال کرتا ہے۔ ملک کا کوئی گاؤں بھی ایسا نہیں ہے جہاں ڈاک نہ پہنچتی ہو بلکہ جہاں سرکاری ڈاکیہ گھر گھر ڈاک نہ پہنچاتا ہو۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی دنیا بھر میں کوئی مثال نہیں ہے۔ ہمارے ڈاک نظام کی وسعت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس وقت ملک میں ۱۵۲۷۸۶ ڈاکخانے ہیں۔ ڈاکخانوں کی تعداد میں یہ اضافہ زیادہ تر ملک کی آزادی کے بعد ہوا ہے۔ چوں کہ ملک کی آبادی کی بہت بڑی اکثریت دیہاتوں میں رہتی ہے اس لیے ڈاکخانوں کا جال اس طرح بچھایا گیا ہے کہ وہ ۸۹۰۵ فی صد دیہاتوں کو احاطہ کرتا ہے۔ دیہی علاقوں میں تقریباً ہر ۲۳ مربع کلومیٹر اور ۴۶۰۰ لوگوں کے لیے ایک ڈاکخانہ اور شہری علاقوں میں تقریباً ہر تین مربع کلومیٹر اور ۱۳۰۰۰ لوگوں کے لیے ایک ڈاکخانہ ہے۔ اسی کے ساتھ ہمارے ملک میں ڈاک کی کثرت پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہو گا کہ اس ملک کے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا کام کتنا بڑا ہے۔ ۱۹۹۳-۹۴ء میں بھارتی ڈاک نظام نے ۵۴۳ کروڑ ۹۰ لاکھ غیر رجسٹر شدہ خط وغیرہ اور ۳۳ کروڑ ۴۰ لاکھ رجسٹر شدہ خط وغیرہ ان کے منزل مقصود تک پہنچائے۔ ہمارے ملک میں ترسیل شدہ اشیائے ڈاک کی تعداد میں ہر سال بڑا اضافہ ہوتا ہے جو ملک کی سماجی و معاشی ترقی کا آئینہ دار ہے۔ سال مذکورہ میں اس سے پہلے سال کے مقابلے میں رجسٹر شدہ اشیائے ڈاک کی تعداد میں دو کروڑ اور غیر رجسٹر شدہ اشیائے ڈاک کی تعداد میں ۲۹ کروڑ ۴۴ لاکھ منی آرڈر پہنچائے گئے جن کی کل مالیت ۳۱۸۲ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے تھی۔ اس مالیت میں اس سے پہلے سال کے مقابلے میں ۲۷۰ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے یعنی ۹ فی صد کا اضافہ ہوا۔

یہاں یہ بتا دینا خالی از دلچسپی نہیں ہو گا کہ ہمارے ملک میں ڈاک کا پھیلاؤ بہت غیر مساوی ہے۔ صرف چھ بڑے شہروں: بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس، بنگلور اور حیدرآباد میں، جن کی آبادی کل ملا کر ۳ کروڑ ۵۵ لاکھ ہے صرف اندرون ملک کے لیے روزانہ ۷۰ لاکھ خطوط ڈاک میں ڈالے جاتے ہیں جو ملک کی کل ڈاک کا ۵۹ فی صد ہے۔

ڈاک کے پھیلاؤ میں اس بڑے فرق کی وجہ سے ڈاک کا نظام چلانے میں مثلاً ڈاک کی چھنٹائی میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں۔ انسانی ہاتھوں سے ڈاک کی چھنٹائی میں دیر لگتی ہے۔ اس لیے اپریل ۱۹۹۳ء میں بمبئی میں ڈاک کی چھنٹائی کا پہلا خودکار مرکز کھولا گیا جہاں اب ۲۴ گھنٹے میں ۱۲ لاکھ خطوں کی چھنٹائی ہوتی ہے۔ ایسا ہی دوسرا مرکز ۱۹۹۵ء میں

مدراس میں چالو کیا جارہا ہے۔ ان کے علاوہ ملک کے ۱۵۰ ڈاکخانوں میں ایسی خود کار کھڑکیاں ہیں جن پر رجسٹرشدہ بیمہ شدہ، وی۔ پی خط، منی آرڈر پارسل وغیرہ لیے جاتے ہیں اور ایک آدمی کو ایک منٹ میں نپٹا دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شہری ڈاکخانوں میں لوگوں کی لمبی قطاریں قصۂ پارینہ بنتی جارہی ہیں اور محکمۂ ڈاک کا یہ آدرش جلد ہی پورا ہوتا نظر آرہا ہے کہ کسی کو پانچ منٹ سے زیادہ قطار میں کھڑا ہونا نہ پڑے۔

ان سب کامیابیوں کے باوجود ایک قابل تشویش بات یہ ہے کہ ہمارا ڈاک نظام خسارہ میں چلتا ہے اور یہ خسارہ سال بہ سال بڑھ رہا ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں یہ خسارہ ۲۰۷ کروڑ ۹ لاکھ روپیہ تھا جب کہ ۹۳-۱۹۹۲ء میں یہ صرف ۱۶ کروڑ ۱۸ لاکھ تھا۔ خسارہ کی موٹی وجہ تو یہ ہے کہ لاگتیں تو بڑی بے رحمی سے بڑھ رہی ہیں لیکن سماجی و فلاحی مقاصد کے پیش نظر اشیائے ڈاک کی قیمتیں ان لاگتوں سے بہت کم ہیں۔ پھر زیادہ تر ان اشیائے ڈاک کا استعمال بڑھا ہے جن کی قیمت فروخت ان کی لاگت سے بہت کم ہے اور جس فرق کو محکمۂ ڈاک اپنی جیب سے پورا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر پوسٹ کارڈ کی تیاری اور ترسیل کی لاگت کا ۵۹٫۵۷ فی صد اور اخباروں کی ترسیل کی لاگت کا ۹۲ فی صد محکمۂ ڈاک اپنے پاس سے پورا کرتا ہے۔ حکومت بلکہ سارے ملک کو یہ مسئلہ حل کرنا ہوگا۔

ذرائع رسل و رسائل میں ڈاک کے بعد تار کا نمبر آتا ہے جسے عام آدمی ضرورت کے وقت استعمال کرتا ہے۔ یہ انتہائی اطمینان اور خوشی کی بات ہے کہ اب ملک کے سارے ۳۰۰ شہروں اور ۴۶۸۹ قصبوں اور ایک بڑی تعداد میں گاؤوں میں تار گھروں کے ذریعہ عوام کو تار دینے کی سہولتیں مہیا ہیں۔ اس مقصد کے لیے تار محکمہ کے ۹۰۷ تار گھر، ۴۳۵۰۵ مخلوط دفاتر اور ۱۸ ٹیلیکوم مراکز ہیں جہاں سے لوگ تار دے سکتے ہیں۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں کل ملا کر ۶ کروڑ ساڑھے پانچ لاکھ اندرون ملک تار دیے گئے جن میں سے تقریباً گیارہ فی صد سرکاری اور اخباری تار تھے اور باقی ۸۹ فی صد عام لوگوں کے دیے ہوئے۔ اس کے علاوہ ۸ لاکھ ۲۰ ہزار بین اقوامی تار بھی دیے گئے۔ تار محکمہ کی مستعدی یا غیر مستعدی کی پرکھ یہ ہے کہ ۹۲٫۷۵ فی صد تاروں کے ۱۲ گھنٹوں کے اندر اپنی منزل مقصود کو پہنچا دیے گئے۔ تار نظام کی جدید کاری کے لیے بھی بہت سے اقدامات کیے گئے ہیں اور کیے جارہے ہیں۔

ٹیلی فون کی زبردست اہمیت مسلّم ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ دو افراد کے درمیان خواہ کتنی ہی دور ہوں آناً فاناً میں بات چیت ہو جاتی ہے لیکن یہ ایک مہنگا نسخہ ہے اور ہر شخص ٹیلی فون نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے حکومت پبلک ٹیلی فون سسٹم کو فروغ دے رہی ہے تاکہ کوئی بھی آدمی کسی بھی وقت ٹیلیفون کر سکے۔ تار کی سہولتوں کی طرح ٹیلی فون کی سہولتیں بھی ملک کے تمام ۳۰۰ شہروں اور ۴۶۸۹ قصبوں میں مہیا ہیں اس کے علاوہ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کے کل ۵ لاکھ ۷۶ ہزار دیہاتوں میں ۱۴۲۵۵۲ دیہاتوں میں پبلک ٹیلی فون کی سہولتیں مہیا ہیں۔ ڈاک و تار کی طرح ٹیلی فون نظام کو بھی برابر وسیع تر کیا جارہا ہے۔ چنانچہ ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۱۵۰۱ نئے ٹیلی فون ایکسچینج چالو کیے گئے اور اب ملک میں ان کی تعداد ۱۸۹۵۶ ہو گئی ہے۔ اسی طرح سال مذکورہ میں ۱۲ لاکھ ۲۹ ہزار نئے ٹیلی فون کنکشن دیے گئے اور اب ان کی کل تعداد ۸۰ لاکھ ۲۰ ہزار ہو گئی ہے۔ اسی طرح سال مذکورہ میں ۱۲ لاکھ ۲۹ ہزار ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ سال مذکور میں ۱۴۰۰۵ ایسے پبلک ٹیلی فون مراکز کھولے گئے جہاں سے ملک اور بیرون ملک کے مختلف شہروں سے براہ راست بات چیت (STD) ہو سکتی ہے اور ۸۵۳۲ مقامی پبلک ٹیلی فون مراکز بھی کھولے گئے۔

حکومت کی کوشش ہے کہ ۳۱ مارچ ۱۹۹۷ء تک ملک کے تمام دیہاتوں کو ٹیلی فون سے جوڑ دیا جائے۔ ملک کے تمام ضلع صدر مقاموں میں براہ راست ٹیلی فون (STD) کی سہولتیں مہیا کی جاچکی ہیں اور منصوبہ یہ ہے کہ ایک سال کے اندر تمام تحصیلوں کے صدر مقاموں میں بھی یہ سہولت مہیا کر دی جائے۔ ٹیلی فون نظام تیزی سے خودکار بھی بنایا جارہا ہے اور ایک سال کے اندر یہ کام پورا ہو جائے گا۔ آٹھویں پلان (۹۷-۱۹۹۲ء) کے آخر تک ملک کے ۳ لاکھ ۶۰ ہزار دیہاتوں میں مزید ۷۵ لاکھ ٹیلی فون مہیا کر دیے جائیں گے۔ اپریل ۱۹۹۷ء تک تمام ایکسچینجوں میں STD کی سہولت اور شہری علاقوں میں ہر ۵۰۰ افراد کے لیے ایک پبلک کال آفس (PCO) مہیا کر دیا جائے گا۔ قومی ٹیلیکوم پالیسی ۱۹۹۴ء نے ٹیلی فون نظام میں پرائیویٹ سیکٹر کی شرکت اور سرمایہ کاری کا راستہ کھول دیا ہے تاکہ اپریل ۱۹۹۷ء تک ملک بھر میں ٹیلی فون کا جال ایسے نرخوں پر بچھا دیا جائے جسے ایک معمولی آدمی بھی برداشت کر سکے۔

ٹیلکس (TELEX) سروس کی کاروباریوں کے لیے بڑی اہمیت ہے کیوں کہ وہ اس کے ذریعہ ایک دوسرے کے پیغامات کو تحریری شکل میں فی الفور حاصل کر لیتے ہیں اس لیے حکومت ٹیلیکس سروس کو پھیلا رہی ہے۔ چنانچہ ۹۴-۱۹۹۳ء میں سات نئے ٹیلیکس ایکسچینج کھولے گئے اور اب ان کی تعداد ۲۱۴ اور مقامی لائنوں کی تعداد ۵۸۸۳ ہو گئی ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۴ء کو ملک میں ۴۷۱۶۱ ٹیلیکس کنکشن کام کر رہے تھے اور ۱۶۱۹ اشخاص ٹیلیکس سروس پانے کے منتظر تھے۔

پیغام رسانی کی مذکورہ بالا سروسوں کے علاوہ اور بھی بہت سی مخصوص سروسیں ہیں جو حکومت اور کاروباریوں کی مخصوص ضرورتیں پوری کرتی ہیں۔

ہم نے اس طرح دیکھا کہ حکومت ہند ہمارے پیغام رسانی کے نظام کو وسیع تر اور قریب تر بنانے میں نہ صرف پوری طرح کوشاں ہے بلکہ اس میں بہت کامیاب بھی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اپنے اس فرض منصبی سے بھی پوری طرح باخبر ہے کہ ان تمام سائنسی اور تکنیکی ترقیات کو، جو اب تک ہو چکی ہیں یا آئندہ ہوں گی، اپنایا جائے اور ان کا استعمال تمام ہندوستان کی خدمت کے لیے کیا جائے تاکہ اکیسویں صدی میں ہمارا ملک دنیا کے کسی اور ملک سے پیچھے نہ رہ جائے۔ ●

ڈاکٹر سید اقبال احمد

اردو ادب اور زندگی کی تعمیری قدریں

اردو ادب کے بکھرے ہوئے نگینے اور سنگریزے پر پڑے گرد و غبار کی سطح جب میں صاف کرتا ہوں تو زندگی کی تعمیری قدریں اپنے احساسات اور ان لمحات کی نمائندگی کرتی ہیں جہاں زندگی کو برتنا ہے اور بامقصد زندگی کی تلاش کا دامن وسیع کرنا ہے۔

اردو ادب کی دنیا نے جو عمر پائی ہے وہ عالمی ادب کے میزان پر زیادہ وزن نہیں رکھتی ہے۔

لیکن اردو ادب نے سماج کی نبض پر ہاتھ رکھ کر زندگی کی تعمیری قدروں کو اجاگر کیا ہے اور ادب کی وسعت نے ہدایت اور تہذیب کی جڑوں کو مضبوط کرتے ہوئے انھیں صحت مند اور مستحکم بنانے میں بھی ایک اہم کڑی کا کام کیا ہے۔

ادب ایک ایسا موضوع ہے جس کا وسیع النظری سے جائزہ لینے کے بعد یہ صداقت ذہن کی سطح پر ابھرتی ہے کہ اردو کا ادبی معیار و میزان بھی زندگی کے اہم مقاصد کا خاکہ کھینچتا ہے اور معیار زندگی کی راہ کا تعین بھی کرتا ہے۔

یہ وہ قیمتی سرمایہ ہے جسے مہذب دور میں داخل ہونے کے لیے مدتوں کی مسافت طے کرنی پڑی اور اپنے دشوار گزار مراحل و بنجر زمین کے سینے کو چیر کر زندگی کی تعمیری قدروں کو یکجا کیا ہے۔ زیست و موت کی کشمکش ہو یا تنازع و بقا، علم و ادب کی تلاش و جستجو ہو یا ہدایت و تہذیب کو تعمیری سطح پر لانا ہو، سماج کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھنا ہو، یا مقصد حیات کی تکمیل ہو۔

اردو ادب نے ایسے تمام مسائل و موضوعات پر سنجیدگی سے غور کیا ہے۔

ادب اور زندگی کے گہرے رشتے نے جہاں حالات کی بنیاد پر مختلف اصناف، اخلاقی قدروں اور اعلا کرداروں کو جنم دیا ہے وہاں سنجیدہ موضوعات کو اردو ادب نے نہایت سلیقے سے احاطہ کیا ہے۔ اس ضمن میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اردو ادب جس انتشار اور سیاسی بحران کا ایک کھلا چیلنج تھا وہ اس کی ادبی رفتار اور منتشر خیالات سے ظاہر ہے۔ وہ دور جس میں آسودگی تھی سرمایہ دارانہ نظریات کی نمائش کا مرکز تھا اور وہ دور جہاں ادب برائے ادب گویا ادب نوازوں کے نذرانۂ عقیدت کا احترام کیا جاتا رہا وہاں اردو ادب نئی تہذیب میں داخل ہو رہا تھا۔ دونوں عہد کو جس رفتار سے اردو ادب نے طے کیا ہے وہ اس کی نزاکت اور تقاضائے وقت کی کڑی تھی۔ لیکن دونوں دور کی آمیزش نے ایک ایسے دور کا آغاز کیا، جہاں اعلا کردار اور غیر معمولی ذہن کے انسان کا جنم ہوا۔ اور انھوں نے اپنی دور بینی اور روحانی قوت کا سہارا لے کر سماجی، سیاسی اور معاشی روایات کو بدلنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان عظیم ہستیوں نے تعمیری قدروں کی پرکھ مختلف حالات اور واقعات پر کی ہے۔ اس صداقت کی نفی نہیں کی جا سکتی ہے کہ خاص طور سے صنف شاعری نے جن اہم پہلوؤں اور موضوعات کو انسانیت، وطن پرستی، انسانی آزادی، محبت و معاشرتی نظام تمدن کے لیے پیش کیا ہے۔ ان میں نظیر اکبر آبادی، میر تقی میر، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، پنڈت برج نارائن چکبست، کی کارکردگی نے معیار زندگی کو بلند کیا ہے اور وطن پرستی کے جذبے سے سرشار ہو کر جن شعرائے کرام نے زندگی کی تعمیری قدروں میں اضافہ کیا ہے۔ ان میں علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض سبقت لے جاتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے غلامی پر آزادی کو ترجیح دے کر انقلابی شاعری کی گھن گرج سے روح آزادی کو آواز دی ہے۔

دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو جوش کی انقلابی شاعری اردو ادب کی دنیا میں تعمیری قدروں اور اعلا قدروں کے لیے ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ قوم پرستی اور وطن پرستی کے اچھوتے انداز اقبال کی نظموں میں دیکھیے۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

جہاں انسانیت اور محبت عالمی سطح کا دامن چھوتی ہے۔ اقبال نے اردو کے ادبی معیار کو اتنا وسیع کیا ہے کہ زندگی کی تعمیری قدریں آج کے مشینی اور سائنسی دور میں بھی زندگی کے تلخ حقائق کا اصول مرتب کرتی ہیں۔

فیض احمد فیض نے ترقی پسندی کے رجحانات کی ایک نئی کڑی جوڑ کر ادبی رفتار میں اس طرح اضافہ کیا ہے کہ تعمیری قدریں عوامی سطح پر ابھریں اور انسانیت کو پستی سے بچا کر بلندی کی راہ دکھلائی اور ایک صحت مند معاشرے کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ترقی پسند شاعری نے اردو ادب کا ایک نمایاں حصہ بن کر جو ادبی تحریک چلائی، اس کی چھاپ اور نقش معاشرے کے رہنے سہنے، استعمال زدہ اور طبقے کو تعمیر کی طرف لگایا۔ ادب نے اس کی بابت عہد کے مزاج کو سمجھ کر اجتماعی آزادی، اجتماعی مسائل کے حل اور پوری انسانیت کے وجود کی بیش بہا ضروریات کی تکمیل اور بنیادی حقوق کی طرف زور

نوبیری ہاؤس، وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا۔ ۲۸۳۰۰۱

گیا ہے۔

افسانوی فضا میں اعلا قدروں نے سانس لی ہے اور زندگی کی پیچیدگیوں کو نمایاں کرتے ہوئے اندرونی خدوخال کا جائزہ لیا ہے۔ ان میں جن مشاہیر فنکاروں نے اپنی عظمت کا لوہا منوایا ہے۔ ان میں پریم چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سہیل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی اور شکیلہ اختر صف اول کے مستحق ہیں۔ جن حالات سے ان شخصیتوں نے حق گوئی کی منزلیں تلاش کی ہے۔ وہ حالات کبھی خود ظہور میں نہیں آئے بلکہ ان کے پس پشت سیاسی بحران، معاشی، نفسیاتی اور فنی روایات کی لہریں تھیں اور ان ہی کی رو میں جذبات، احساسات و خیالات بہتے رہے اور اس بحر بے کراں میں قومیں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں۔ اس کی بابت میں اس بات کی طرف رجوع کرانا چاہوں گا کہ قوموں کی معیار زندگی پستی و بلندی کے لیے ادب ایک میزان ہے۔ اردو کے بانی اور ادب کے معمار نے آخر کن وجوہات کی بنیاد پر عہد کے حالات، نظریات و اخلاقیات کو پڑھا ہوگا۔ ایسا کیوں نہیں کہ غیر زبانوں کے تاثرات انھوں نے قبول کیے، یا پھر دور دراز ملکوں کا اعلا نمونہ اردو ادب میں پیش کیا۔ اس ضمن میں یہ کہنا حق بہ جانب ہوگا کہ علاقائی ماحول نے ان اذہان کو اپنی جانب رجوع کیا اور براہ راست اپنے اثرات کا کرشمہ دکھایا ہوگا۔

اس طرح چند گوشے انسانیت کی بقا کے لیے تلاش کیا ہے۔ اردو ادب میں ایسے نظریات نے بھی جنم لیا ہے، جنھوں نے زندگی کی تعمیری قدروں پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ کیا یہ ہدایت اور تہذیب کی جڑوں کو کمزور کر دیں گے؟ یا اس کے استحکام کی علامت ہوگی؟ میں سمجھتا ہوں ان سوالات سے ذہن پر جمود نہیں طاری ہوتا ہے۔ بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے فکر کی پرواز کا وسیلہ ہے، جو زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کو عالمی ادب کی کسوٹی پر کھرا ٹھہرا سکے۔

قدرے مختلف انداز میں جدید ادب نے جس سمت کو دستک دی ہے۔ وہ تعمیری سطح پر اثر انداز کمزور ہو رہا ہے لیکن دوسرا پہلو پرکشش ہے۔ ان سوالوں کو لے کر سائنسی اور مشینی دنیا نے ادبی بحران پیدا کر دیا ہے۔ دراصل ان کے صحت مند قدروں پر چلے جا رہے ہیں۔

اردو ادب کا بیشتر حصہ اعلا قدروں، اخلاقی قدروں، روحانی قدروں اور تعمیری قدروں کی اساس رہا ہے۔ ایسی خصوصیات کے باوجود اس حقیقت کی نفی نہیں کی جا سکتی ہے کہ ادیبوں اور فنکاروں کا ایسا حلقہ بھی سرگرم رہا ہے جس نے معاشرے میں غیر صحت مندانہ، غاصبانہ و جارحانہ رویہ اور مزاج کو نمائشی انداز میں ہوا دے کر زندگی کی تعمیری قدروں کے معیار و امتیاز میں ایک خلیج حائل کر دیا ہے۔

طرز فکر یا نظریات کا جو خاکہ اردو ادب میں پیش کیا گیا ہے اس کے مبادیاتی پہلوؤں میں تعمیری قدروں کے بدلتے ہوئے عروج کی گہری چھاپ پائی جاتی ہے۔ تاریخی پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو ان تلخ حقائق اور واقعات کی گتھیوں کو اردو ادب نے جس سنجیدگی سے سلجھایا ہے وہ آنے والے وقتوں کی نمائندگی کرے گی۔ ●

لقیہ: نمکیات اور نائٹریٹ سے آبی آلودگی کیوں اور کیسے؟

آبادی میں تیزی سے اضافہ اس کی کفالت اور خوراک کے لیے زراعت میں مہم جوئی یعنی کیمیاوی کھادوں کا بے دریغ استعمال خصوصاً نائٹریٹ حامل فرٹیلائزر یا نائٹریٹ میں بدل جانے والی کھادیں یہ سب افعال مربوط ہیں اور ان پر نگاہ رکھنی ضروری ہے۔ اب تک کی تحقیق سے ان ذرائع کی نشاندہی ہوئی ہے جو نائٹریٹ کے مخرج ہیں اور ان سے پانی کی آلودگی بڑھی ہے۔ مگر نائٹریٹ کی کتنی مقدار ہر سال پانی کے ذخیروں میں شامل ہو رہی ہے نامعلوم ہے۔ سائنسی تحقیق سے معلوم ہوا کہ نائٹروجن حامل کیمیاوی کھاد، کمپوسٹ (COMPOST) انسانی اور جانوروں کے فضلار کے علاوہ مردہ جسموں کے گلنے سڑنے سے بھی نائٹریٹ کا اخراج ہوتا ہے جو زیر زمین پانی کے ذخیرہ کو مسلسل آلودہ کر رہا ہے۔ ملک میں نائٹروجن حامل کیمیاوی کھاد عام طور پر یوریا اور ڈائی امونیم فاسفیٹ (DIAMMONIUM PHOSPHATE) کی صورت میں استعمال ہوتی ہے۔ ان سے خارج ہونے والے نائٹروجن کو مخصوص بیکٹیریا (BACTERIA) نائٹریٹ کے سالموں میں تبدیل کرتے ہیں۔ پودے اپنی ضرورت کے مطابق نائٹریٹ اور امونیم دونوں قسم کے سالموں کو بطور خوراک جذب کرتے ہیں۔ اس کے باوجود نائٹریٹ کی فاضل تعداد رس کر زیر زمین آبی ذخیرے سے جا ملتی ہے۔ لہٰذا غیر متناسب کیمیاوی کھاد کا بکثرت استعمال اور نائٹریٹ حامل پانی سے کھیتوں کی آب پاشی دونوں سے زیر زمین آبی ذخیرے میں آلودگی کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ●

قلم کار حضرات سے گذارش

۱۔ ترقیاتی معلوماتی اور سائنسی موضوعات پر لکھنے والے حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ادارہ سے رابطہ قائم کریں تاکہ ان سے حسب ضرورت مقالات حاصل کئے جا سکیں۔

۲۔ مقالہ نگاروں سے گزارش ہے کہ وہ مضامین جامع بھیجیں۔ مضامین ورق کے صرف ایک طرف خوشخط لکھے جائیں اور بین السطور کافی چھوڑا جائے۔

۳۔ یوجنا میں اشاعت کے لیے غیر نشر شدہ غیر مطبوعہ اور طبع زاد تخلیقات روانہ کی جائیں۔

۴۔ کاربن کاپی یا زیروکس کاپی کے بجائے اصل مسودہ روانہ فرمائیں۔

۵۔ مختصر اور بامقصد کہانیوں/ڈراموں کو ترجیح دی جائے گی۔

۶۔ شعری تخلیقات اگر موجودہ ترقیاتی، معاشی، سماجی اور تعلیمی پہلوؤں سے متعلق ہوں تو بہتر ہے۔

۷۔ جواب طلب امور کے لیے جوابی خط/لفافہ یا ڈاک ٹکٹ روانہ فرمانے کی زحمت نہ فرمائیں۔ ادارہ کی طرف سے ہر خط کا جواب دیا جاتا ہے۔

۸۔ تبصرے کے لیے اردو میں چھپی نصابی کتابوں کو ترجیح دی جائے گی۔ براہ کرم تبصرے کے لیے دو کاپیاں روانہ کریں۔

(ادارہ)

عبدالسلام صدیقی

کرشن چندر کا ناول شکست اور سماجی واقتصادی مسائل کی عکاسی

کرشن چندر نے شکست کے ذریعے اردو ناول نگاری کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اردو ادب میں ان کو جو شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی اس سے ان کے اندر پوشیدہ جواہر کا انکشاف ہوتا ہے۔ یہ ناول قبل آزادی ۱۹۴۳ء میں منظر عام پر آیا، جسے ادیبوں اور دانشوروں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی تعریف و توصیف کی بعض نقادوں نے اس کی تنقید و تنقیص کی۔ یہ ناول تین ابواب پر مشتمل ہے، جس کا ہر باب اپنی فنی نوعیت اور ناول نگاری کی خصوصیت کے اعتبار سے بے حد کامیاب ہے۔

کرشن چندر نے اس ناول کا مواد اس دور سے اخذ کیا ہے جہاں زمین دار، جاگیر دار اور مہاجنی طبقے سے ظلم و جبر اور آمرانہ نظام کی بو آتی ہے۔ مظلوموں کی بے بسی و بے کسی اور لاچاری و مجبوری اور سرمایہ دار طبقے کا سفاکانہ برتاؤ اپنے عروج پر ہے۔ سماج میں توہم پرستی اور ذات پات کی بنیاد پر قائم فرسودہ نظام کی پاسبانی اپنی شان بان سمجھی جاتی ہے۔ سماج کے پاسبان اور مفاد پرست عناصر بے گناہ اور دبے کچلے ستم زدہ لوگوں پر بے جا ظلم ڈھاتے ہیں، جو سماج میں نیچی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ سماجی مفاد پرست عناصر اور ان کا بنایا ہوا قانون محنت کش غریبوں اور محتاجوں کو تمام جائز حقوق سے محروم کر کے عزبت کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ تعصب پرستی جس سماج کے افراد کا دھرم، ایمان ہو اس سماج کے خمیر سے "شکست" کی تشکیل ہوئی ہے۔

"شکست" میں کرشن چندر ان تمام سماجی اور اقتصادی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں، جس سے سماج میں بدعنوانیاں پیدا ہو رہی تھیں اور عوام اس سے دوچار تھے۔ انھوں نے اس ناول میں ذات پات کی تفریق، سرمایہ دارانہ استحصال، دھرم کے نام پر انسانیت کا خون اور جبر و تشدد کے نظام کی سخت مخالفت کی ہے اور اس کے بالمقابل مساوات و بھائی چارے پر مبنی سماج، ہندو مسلم اتحاد کی وکالت، قومی یک جہتی اور اشتراکی نظام کے قیام کی پرزور حمایت کی ہے۔

ناول کے مقصد کے بارے میں کرشن پرساد کول کا کہنا ہے کہ :-

"ناول کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے یہاں تفریق ذات پات کی پابندیوں اور امیری غریبی کے فرق کی وجہ سے مختلف فرقوں اور طبقوں کے لوگوں میں شادی بیاہ کا ہونا ممکن نہیں اور جس سے فی زمانہ اچھے اور شریف لڑکے اور لڑکیوں کی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ باوصف باہمی محبت اور اختلاط کے شادی کا رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے تباہ کن نتائج کو ناظرین پر ظاہر کر کے ان کے دلوں پر اثر ڈالا جائے تاکہ سوسائٹی کے برے رسم و رواج سنبھل سکیں اور ایسی پابندیاں ٹوٹ سکیں۔"[1]

"شکست" میں دو کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ ایک کا ہیرو شیام جو تحصیل دار کا لڑکا ہے۔ اس کی محبوبہ "ونتی" ہے۔ یہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کی ماں کو سماج کے پاسبانوں نے سماج سے باہر نکال دیا ہے۔ کرشن چندر نے شیام کے کردار میں اس دور کے ایسے نوجوان کو پیش کیا ہے جس کے دل میں اس سماج سے بے حد نفرت ہے۔ وہ اشتراکیت اور باہمی مساوات پر مکمل یقین رکھتا ہے۔ مگر اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ "ونتی" اور "درگا داس" کی شادی کے خلاف ہوتے ہوئے اس مخالفت پر سماج سے بغاوت کر دے۔ اس کے لیے اپنے آپ کو آمادہ بھی نہیں کر پاتا۔ اس کے برخلاف "ونتی" جب شیام کی شادی کی خبر پاتی ہے تو یہ غم برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے دم توڑ دیتی ہے۔

دوسری جانب چندرا اور موہن سنگھ کی محبت کی کہانی ہے۔ موہن سنگھ ایک راجپوت گھرانے کا چشم و چراغ ہے اور چندرا ایک شیڈولڈ کاسٹ لڑکی ہے۔ موہن سنگھ نئے عزم و ارادے کا پکا نوجوان ہے اور چندرا اپنے سماج برادری اور سماجی رہنماؤں سے نفرت کرتی ہے۔ اپنے باغیانہ خیالات کی وجہ سے سماج سے بغاوت

---

[1] نیا ادب، کرشن پرساد کول، صفحہ ۳۴۲

۲۵۴-اے۔ برہم پترا ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۷

کرد ینا چاہتی ہے۔ جاہل ہوتے ہوئے بھی ترقی پسندی پر قائم ہے۔ اس کے دل میں اس سماج سے نفرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

دوسری جگہ چندرا کو جب اس کی ماں اس سماج اور لوگوں کے بارے میں سمجھاتی ہے تو وہ بھڑک پڑتی ہے اور چیخ کر کہتی ہے، جس سے اس کی سماج اور برادری کی نفرت ظاہر ہوتی ہے۔

"برادری جائے چولہے بھاڑ میں برادری نے ہمیں کون سا سکھ پہنچایا ہے۔ جو میں ان کی خوشامد کرتی پھروں۔" [1]

موہن سنگھ ایک راجپوت اور چندرا ایک شیڈولڈ کاسٹ طبقے کی۔ اس دور کا سماج اسے کہاں قبول کر سکتا تھا اور وہ سماج جس کا پیشوا سروپ کشن ہو۔ ناول نگار ایک جگہ سروپ کشن اور چندرا کے کردار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"اگر چندرا "باغی تھی تو "سروپ کشن" روایت پرستا ایسا روایت پرست، کٹر اس نے اپنی زندگی میں بہت کم دیکھا تھا۔ وہ موجودہ تہذیب سے کہیں بھی کسی بھی حالت میں صلح کرنے کو تیار نہ تھا۔ یا وہ شاید ایک سچ مچ بے درد، سنگ دل انسان تھا۔ جسے اپنے ہم جنسوں کو ذلیل کرنے اور ستانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ کیوں ان دو نوجوانوں کی رفاقت کو تباہ و برباد کرنا چاہتا تھا۔ اس سے اسے کیا حاصل ہو سکتا ہے شاید زندگی جس دھارے پر جا رہی تھی وہ اس کی رو میں ایک چٹان بن کر کھڑا ہونا چاہتا تھا اور دنیا کو بتا دینا چاہتا تھا کہ پرانی قدریں اب بھی صحیح ہیں اور اسی شدت کے ساتھ زندہ ہیں جس طرح آج سے ہزاروں سال پہلے تھیں، اجنتا کی تصویروں کی طرح جسے اجنتا کی تصویروں کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن اجنتا کی تصویروں پر نئی زندگی کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی تھی، جو اجنتا کے غاروں میں مدھم ہو رہی تھیں۔ پھر کس لیے وہ یہ ہاری ہوئی لڑائی لڑ رہا تھا۔ کس طرح وہ سازش، مکر و فریب کے داؤ چلا کر تاریخ کے اس پہاڑ کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا جو ایک سیلاب عظیم کی صورت میں جمہور کے ضمیر پر چھا رہا تھا اور پرانی قدر وں، پرانی روایتوں اور رسموں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لیے جا رہا تھا۔ یہاں اس کی مانند رکی وادی میں شاید یہ سیلاب ابھی نہ آیا تھا۔ لیکن کیا چندرا کی باغی طبیعت اس آنے والے طوفان کا پیش خیمہ نہ تھی؟ کیا موہن سنگھ کی سرکشی اس دور کی غمازی نہ کر رہی تھی۔" [2]

اس اقتباس سے کرشن چندر کے خیالات واضح ہوتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب جبر و ظلم کا دور ختم ہو کر وہ دور آنے والا ہے، جس میں صرف ترقی پسندیت ہوگی۔ چندرا اور موہن سنگھ کی بغاوت اس طوفان کا پیش خیمہ تھا۔

موہن سنگھ شکار کے دوران زخمی ہو کر اسپتال میں داخل ہوتا ہے۔ چندرا کی محبت سے متاثر ہو کر اور شیام کی سفارش سے مسلمان ڈاکٹر چندرا کو موہن سنگھ کی تیمارداری کی اجازت دے دیتا ہے ایک نیچے طبقے کی لڑکی کو اونچے طبقے سے متعلق شخص کی تیمارداری کے لیے اجازت دینے پر ڈاکٹر کے خلاف سماجی پاسبان اور سرمایہ دار خفا ہو کر کمیشن بٹھانے کی درخواست دیتے ہیں اور ڈاکٹر معطل ہو جاتا ہے۔ اس سے تعصب پرستی ظاہر ہوتی ہے۔ اس فرقہ وارانہ مسائل پر بحث کرتے ہوئے کرشن چندر کہتے ہیں :-

"جہاں فرقہ وارانہ سوال پیدا ہو جائے وہاں بدقسمتی سے لوگ دلائل کے بجائے جذبات سے کام لیتے ہیں۔" [3]

ناول نگار کا خیال ہے کہ معاملہ جتنا جذباتی ہے اتنا ہی اقتصادی بھی۔ یہاں پر ان کی اشتراکیت ظاہر ہو رہی ہے۔ کرشن چندر چاہتے ہیں کہ سبھی کو اقتصادی طور پر مضبوط کر دیا جائے تاکہ تعصب پرستی اور فرقہ وارانہ خلیج ہموار کی جا سکے۔ اسے ختم کرنے کے لیے بچوں کی خاص طور سے بھائی چارے امن و امان، قومی یک جہتی، اتحاد و اتفاق اور بہترین معاشرت وغیرہ کے ماحول میں پرورش اور تربیت ہونی چاہیے۔ اس کے لیے کئی نسلوں تک جدوجہد کرنی پڑے گی۔ کیوں کہ جہاں فرقہ وارانہ مسائل کھڑے ہوتے ہیں وہاں فرقہ واریت کا نظریہ نشو و نما پانے لگتا ہے۔

موہن سنگھ صحت یاب ہو رہا تھا اور اس کے زخم ٹھیک ہو رہے تھے کہ اسی دوران ایک دن وہ خبر پاتا ہے کہ اس کے محبوب سے بسنت کشن بدتمیزی و چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے۔ اس اطلاع کے ملتے ہی وہ رات کے وقت اسی حالت میں اسپتال سے بھاگ کر اسے مارنے کی کوشش میں شدید زخمی ہو جاتا ہے اور چند دنوں بعد اسی حادثے کی وجہ سے موت ہو جاتی ہے۔ چندرا اس دردناک صدمے کو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے پاگل ہو کر گاؤں گاؤں گھومتی اور اپنے پریتم کو ڈھونڈھتی ہے۔

کرشن چندر نے شکست کے ذریعے قاری کو یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ وہ دور بہت جلد آنے والا ہے جب انصاف کا بول بالا ہوگا۔ سب کو ہر طرح کی آزادی ملے گی اور انسانی مساوات ہوگی۔ غریبوں کے سماجی اور اقتصادی مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں :-

"سیداں" نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ اپنی اپنی قسمت اور ہمیں اتنا کام ہوتا ہے کہ سوچنے کی بھی فرصت نہیں ہوتی۔" [4]

دوسری جگہ سماج میں ظلم و تشدد، توہم پرستی اور تعصب پسندی کو اختیار کرنے والے غیر سماجی عناصر کے عوامل کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

"جاگیردار کے وقت میں تو بیگار سے کام لیا جاتا ہوگا۔" "شیام" نے پوچھا۔ ہاں۔ غیر سماجی عناصر اور غنڈے گاؤں کے گاؤں باندھ لاتے تھے، جو سامنے آیا لاٹھی سے آگے دھکیل لیا گیا۔ اسی طرح شکار ہوتا تھا، سیکڑوں ہنکے بنے ہوتے تھے۔" [5]

سماجی استحصال کرنے والوں کی بربریت، رشوت خوری اور عوام کو پریشان کرنے کی عادت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

---

۱۔ شکست، کرشن چندر، صفحہ ۹۸ ۲۔ شکست، کرشن چندر، صفحہ ۹۴ ۳۔ شکست، کرشن چندر، صفحہ ۱۲۷ ۴۔ شکست، کرشن چندر، صفحہ ۸۹ ۵۔ شکست، کرشن چندر، صفحہ ۳۲

"میں تو غریب گھر کی لڑکی تھی۔ محنت مزدوری سے مجھے عار نہ تھا۔ لیکن وہ ایسی جگہ رہ چکا تھا جہاں اسے مفت مال ہضم کرنے اور لوگوں پر رعب جمانے کا چسکا لگا تھا۔" [1]

سماجی رہنماؤں اور سرمایہ داروں سے کسان ...ز و ر طبقے کس حد تک ڈرتے تھے اور ان کو کتنا ہراساں ...جاتا تھا۔ ان مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے کرشن ...در کہتے ہیں :-

"مثلاً اگر کوئی کسانوں سے ان کی عمر پوچھے تو اول وہ کہے گا کہ مجھے پتا نہیں صاحب! یہ لوگ اپنی عمر بتاتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ غالباً سوچتے ہیں کہ اونچے لوگ ...یں کہیں عمر پر بھی مالیہ نہ لگا دیں۔ کسانوں کو ان سے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔" [2]

"شکست" میں ـــــــــــــ

ـــــ کرشن چندر نے قدیم و جدید ذہن ...شمکش کو نمایاں کیا ہے۔ جدید دور کے انتشار، ...ہنی وکرب کے ساتھ ساتھ قدروں کی تبدیلی ...، نوجوانوں کے ذہنوں اور خیالات میں ہونے ...تبدیلیوں کو۔ ـــــ فطری حسن اور رومان انگیز ...منظر میں پیش کیا ہے۔ فرسودہ نظام کے مقابلے ...ت مند اور تازہ و توانا نظام اور نوجوانوں کی ...ی اور صحت مند محبت کی شکست پیش کی ...ا ہے۔ قدیم و جدید نظریات کی کشمکش کو پیش ...تے ہوتے فرسودہ نظام کی فولادی اور مضبوط ...ت کو بھی ظاہر کیا گیا ہے، جس میں شیام ...ونتی کی محبت کامیاب ہوتی ہے اور نہ ہی ...درا اور موہن سنگھ کا عشق۔

اس ناول کی رومانیت صرف رومانیت ...نہیں بلکہ اس دور کی حقیقت نگاری بھی ہے۔ ...ہ دور تھا جس میں قدیم عقائد ٹوٹ چکے تھے ...نئے حالات میں نئی قدروں کی تلاش کی جا رہی ...۔ پرانی قدروں سے یہ بیزارگی نئے حالات اور ...د کا تقاضہ تھی۔ اس میں نئی قدروں اور حالات ...کے لیے ذہن کو تیار کرنے کی بے اختیارانہ کوشش ...گئی ہے۔ ناول نگار نے فرسودہ اور غلط سماجی بندھنوں اور رسم و رواج کو نمایاں کرتے ہوئے بیمار اور مریضانہ جنسی تعلقات کو خاص طور پر ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ اصل میں فنکار کا اصل مقصد سماج کی ان غلط اور خود غرضانہ بندشوں کی پردہ دری کرنا تھا جو صحت مند اور اخلاق کے نقطۂ نگاہ سے بھی جائز محبت کو ـــــ کچلنے کی کوشش کرتی ہیں مگر غیر صحت مند اور قابلِ ملامت جنسی تعلقات کی طرف سے چشم پوشی کر لیتی ہیں۔ چوں کہ یہ تمام بندشیں قطعی طور پر نا انصافی پر مبنی ہیں اس لیے ناول نگار اسے قابلِ ملامت قرار دیتا ہے۔

"شکست" کی رومانیت صحت مند ہے مریضانہ نہیں کیوں کہ یہ حقائق کے ادراک سے پیدا ہوئی ہے۔ ناول نگار نے ہندوستانی زندگی کے تلخ سماجی اور اقتصادی مسائل کو پیش کرتے ہوئے اس کی رومانیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں سرمایہ اور محنت کی کشمکش سے محبت کا خون نہیں ہوتا بلکہ روایت پرستی اور فرسودہ سماجی بندشوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ انھوں نے نمایاں طور پر اسی بات کو پیش کیا ہے کہ ابھی نوجوان نسل میں اتنی طاقت نہیں پیدا ہوئی کہ وہ پرانی قدروں کی بیڑیوں اور فرسودہ سماجی بندشوں کو توڑ پھینکیں۔ اس کی اہمیت میں اس کی منظرکشی کا بھی بڑا ہاتھ ہے فطرت کا حسن اور سماج کی بدصورتی جگہ جگہ پیش کی گئی ہے۔

اس ناول میں فنکار نے ہندوستانی عورتوں کو پیش آنے والے سماجی مسائل اور ذہنی و جسمانی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ سماج میں عورت کا مقام اس کے پچھڑے پن کی وجہ ان سبھی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں :-

"جہاں پریوں کے پر پیدا ہوتے ہی قطع کر دیے جاتے ہیں اور انھیں بچانے کے لیے کوئی خوبصورت ملکوتی شہزادہ نہیں آتا۔ جہاں حسن روپے کے پیمانے پر تلتا ہے نہ کہ پھولوں کے پیمانہ پر۔ اور اسے پانچ پھولوں والی شہزادی کی کہانی یاد آئی جو اس قدر خوبصورت اور نازک اندام تھی کہ اگر ایک پلڑے میں شہزادی ہو اور دوسرے میں پانچ پھول تو دونوں پلڑے برابر ہوں گے۔ اس نے سوچا کہ عورتیں اب بھی شہزادیاں ہیں ہاں ان کے تلنے کا پیمانہ بدل گیا ہے، کوئی عورت ۵ روپے میں تل جاتی ہے کوئی ۵ ہزار پر صرف پیمانے الگ الگ ہیں۔ پریوں کی تہذیب کا پیمانہ پھول ہے۔ آدمیوں کی تہذیب کا پیمانہ روپیہ، کون سا پیمانہ بہتر ہے پھول یا روپیہ۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔" [3]

ناول نگار کے خیال میں ہندوستانی عورتوں کی سماجی حیثیت نہایت پست ہے جب کہ کسانوں اور مزدوروں کی عورتوں کی سماجی حیثیت ـــــــــ پھر بھی غنیمت ہے۔ کیوں کہ اپنی اقتصادی حالت درست کرنے کے لیے عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتیں ہیں، جیسا کہ مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے :-

"شیام کو یکایک یاد آیا کہ یہاں بہت سے کسان لوگ اپنی باتوں میں عورتوں کو ـــــ کے لقب سے پکارتے ہیں۔

ـــــــــــــــــــــــــــ

ـــــــــــــــــــــــــــ

ـــــــــــــــــــــــــــ

ـــــــــــــــــــــــــــ

"شیام کو کچھ اس سے بھی پتا چلا تھا کہ ہندوستانی سماج میں جس کے بیشتر افراد کسان تھے، عورتوں کی سوشل حیثیت کیا ہے ـــــــــ

ـــــــــــــــــــــــــــ

ـــــــــــــــــــــــــــ

ـــــــــــــــــــــــــــ

ـــــــــــــــــــــــــــ

ـــــــــــــــــــــــــــ

ـــــــــ اور پھر شیام کو خیال آیا کہ خود اس کے طبقے اور اس سے اوپر کے طبقے میں تو بھی خرید و فروخت

---

[1] شکست، کرشن چندر، صفحہ ۳۲ [2] شکست، کرشن چندر، صفحہ ۱۴۳ [3] شکست، کرشن چندر، صفحہ ۵۲

ہوتی تھی۔ تو سبھی ہندوستانی طبقوں میں عورتوں کی حالت زبوں تھی۔ لیکن شاید کسانوں اور مزدوروں کے طبقے میں باقی طبقوں سے بہتر تھی۔"[1]

کرشن چندر ہندوستانی عورتوں کی سماجی حیثیت اور زبوں حالی کا احساس کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"شیام کو احساس ہوا جیسے سیتا کے نہیں بلکہ سارے ہندوستانی عورتوں کے آنسو چھلک رہے ہیں، جن کی زندگیاں صدیوں سے تاریک، خاموش اور اداس ہیں"[2]

اس دور کے ہندوستانی سماج میں کمزور طبقے کی ۔ ۔ ۔ عورتوں کی سماجی حیثیت اور بھی نازک تھی۔ سرمایہ داروں اور سماجی رہنماؤں کے د پاسبانوں کے نزدیک ایک کمزور لڑکی سے کوئی بھی ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ کر سکتا تھا۔ اس کی عزت اور عصمت کسی بڑے گھرانے کی بہو بیٹیوں کے مقابلے کچھ بھی نہیں تھی۔ ناول نگار اس کی وضاحت حسب ذیل عبارت سے کر رہا ہے:۔

"تو اس میں کیا ہے۔" ایک اور بولا۔" اس ۔ ۔ ۔ چندرا کا کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی آوارہ عورت تھی۔ اگر بسنت کشن نے اس سے دو مذاق بھی کر لیے تھے تو کون سی آفت آگئی تھی۔ وہ کون سے ایسے عالی نسب خاندان سے تھی، ملکہ تھی؟ شہزادی تھی؟ کیا تھی وہ؟ کل تک وہ اور اس کی ماں ٹکے ٹکے کے لیے ماری ماری پھرتی تھیں اور آج بڑی عزت والی بن گئی ہیں۔ اونہہ!"[3]

شکست کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کرشن چندر ہندوستانی سماج کی طبقاتی کشمکش سے پریشان ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں ظلم و تشدد اور جبر و ستم نہ ہو۔ اس کے لیے وہ جمہوری نظام کی حمایت کرتے ہیں اور اسے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے بہتر اور سودمند بتاتے ہیں۔

کرشن چندر کا یقین ہے کہ جمہوری نظام اور ترقی پسندیت کے بغیر ہم انسانیت کو اس کی معراج تک نہیں پہنچا سکتے ہیں۔ سماجی و اقتصادی مسائل کو حل کرنے اور سماج کو بدلنے کے لیے ہمیں سوشلزم کے اصولوں کو اپنانا پڑے گا۔

ناول کے موضوع کی تہہ میں ہندوستان کی طبقاتی کشمکش اور اقتصادی مسائل و سماجی بدحالی کی داستان پوشیدہ ہے۔ اسی سے متعلق کرشن چندر اشتراکیت کے اصولوں سے بحث اور ہندوستانی سماج کے بہت سارے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ "علی جو" "شیام" سے کہتا ہے:۔

"سیاسی بیداری! اجی صاحب یہ سب نئی اصطلاحیں ہیں اور کیا میں خوب سمجھتا ہوں یہ سیاسی بیداری۔ جہاں پہلے جاگیردار لوٹتے تھے وہاں اب غیر سماجی عناصر لوٹتے ہیں۔ عوام تو ایک غیر منظم اور منتشر قوت ہے۔ اسے سنبھالنا، اسے استعمال کرنا چند سمجھ دار لوگوں کا کام رہا ہے۔ شیام صاحب بات دراصل یہ ہے کہ یہ سب اصطلاحیں لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے گھڑی گئی ہیں اور وہ شکار بھی تو ان لوگوں کو قابو میں رکھنے کا ایک حربہ تھا۔ سیکڑوں آدمی اس کام پر لگائے جاتے اور انھیں بید اور ڈنڈے کی سزا دی جاتی۔ ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو چند راتوں کے لیے گھر سے بے گھر کیا جاتا تھا۔ تب جا کر ان لوگوں کے دلوں میں نظام کا رعب بیٹھتا تھا۔"[4]

کرشن چندر نے "شکست" میں قدیم اور جدید خیالات سے بحث کی ہے اور دونوں کے فرق کو واضح طور پر بیان کرتے ہوئے آخر میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سوشلزم ہی سے عوام الناس تک ان کے حقوق کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے تلقین کی ہے کہ آدمی اپنے مقصد میں تبھی کامیاب ہو سکتا جب کہ وہ پختہ عزم کے ساتھ آگے بڑھے۔

"شکست" میں رومانیت کا عنصر موجود ہے لیکن اس کا ہونا کوئی عیب نہیں۔ ہاں ایسی رومانیت نہیں ہونی چاہیے جس سے سماجی زندگی پر منفی اثرات پڑے۔ اس میں ماضی پرستی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج کے مسائل کو اجاگر کرنے کی بے پایاں کوشش کی گئی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان کی رومانیت میں انقلابی رجحان کی کمی ہے، جس کی وجہ سے ناول نگار انقلاب سے مایوس ہو کر عشق کے خیالاتی اور تصوراتی دنیا میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ مگر جلد ہی حقیقت پسندی کی طرف واپس ہو کر محبت کا رشتہ اقتصادیات یعنی روٹی سے جوڑ کر حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"ہاں بہت محبت کرتا تھا۔ وہ تلخ لہجے میں بولی، فاقے کرتا تھا، ہر روز پٹتا تھا، ہر روز رات کو ہمبستری کرتا تھا۔ ۔ ۔ سچ محبت کو بھی روٹی کی حاجت ہے، محبت بھی چاہے وہ کتنی ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو محض خالی خولی ہمبستری کے سہارے نہیں جی سکتی۔ عشق کو بھی روٹی چاہیے۔"[5]

ناول نگار کے نقطۂ نگاہ سے سماجی اور اقتصادی مسائل کا حل اور سماجی برائیوں کو دور کرنے کا واحد علاج جمہوریت اور انصاف پسندی میں مضمر ہے۔

اس میں ہر طرح کی کشمکش کا نتیجہ مہاجنی نظام کی کارفرمائی ہے۔ جس کی جھلک ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں دکھائی دیتی ہے۔ فرقہ وارانہ کشمکش کے علاوہ ذات پات کے تمام جھگڑے، عورتوں کے ساتھ بے انصافی اور حق تلفی، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ تمام لوازم "شکست" پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اس میں پریم چند کے ناولوں کی طرح گاؤں کے لوگوں کی سماجی و اقتصادی پریشانیوں، ان کی مجبوریوں، بے کسوں کا تذکرہ جگہ جگہ ملتا ہے۔ اس میں انسانیت کے عنصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں انسانیت کے ساتھ ساتھ اس میں ایک ایسی رومانیت کی آمیزش بھی ہے، جس سے ناول نگار کا مقصد فوت نہیں ہونے پاتا۔ رومانیت اور حقیقت پسندی کا جتنا اچھا امتزاج اس میں ملتا ہے دوسری جگہ ناپید ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کرشن چندر نے "شکست" میں ۔ ۔ ۔ عوام کے سماجی اور اقتصادی مسائل کو اٹھا کر نئی نسل کو ایک نئی راہ پر گامزن کیا اور اسے یہ بتا دیا کہ ان مسائل کو ہمیں کس طرح اور کس زاویۂ نگاہ سے حل

باقی صفحہ ۳۰ پر

---

[1] شکست، کرشن چندر، صفحہ ۴۴ [2] شکست، کرشن چندر، صفحہ ۱۴۹ [3] شکست، کرشن چندر، صفحہ ۱۷۹ [4] شکست، کرشن چندر، صفحہ ۲۹ [5] شکست، کرشن چندر، صفحہ ۱۴۳

شاہنواز عالم*

پریم چند کے افسانے اور ہریجنوں* کے مسائل

پریم چند کا افسانوی سفر" دنیا کا سب سے انمول رتن" سے شروع ہو کر "کفن" تک پہنچتا ہے۔ ان کا یہ سفر نہ صرف ان کی فنکارانہ بلندیوں کو نمایاں کرتا ہے بلکہ ان کے عہد کی تمام مطلوبہ اقدار مثلاً وطن پرستی، انسان دوستی، سماجی اصلاح اور معاشی مساوات کا ایک واضح اور متعین تصور بھی پیش کرتا ہے۔

یوں تو پریم چند کے افسانوں میں دیہاتی زندگی کے تمام مسائل در آئے ہیں لیکن ان کے نمائندہ افسانوں میں وہی افسانے سرِفہرست جگہ پاتے ہیں جن میں ہریجنوں کے مسائل کو خاص طور سے موضوع بنایا گیا ہے۔ لہٰذا موضوع اور مواد کے اعتبار سے ان کے افسانوں میں ہریجنوں کے مسائل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پریم چند جس عہد میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے اس عہد میں ہریجنوں کی حالت بڑی قابل رحم تھی۔ ان کے ساتھ اونچی ذات کے لوگ انتہائی شرمناک سلوک کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ جانوروں سے بھی بدتر خیال کیے جاتے تھے۔ ان کو کھانے کے لیے جھوٹا پتل دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ نہ تعلیم حاصل کر سکتے تھے نہ مذہبی کتابوں کو چھو سکتے تھے اور نہ مندروں میں جا سکتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کا علاحدہ کنواں ہوتا تھا جہاں سے وہ پانی حاصل کرتے تھے۔ دراصل صدیوں سے ہونے والے ظلم نے سماج کے ان مجبور اور مقہور لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا کر دیا تھا کہ بھگوان نے مندر میں گھسنے یا کنوئیں کا پانی لینے کا حق انھیں دیا ہی نہیں ہے۔ حد تو یہ تھی کہ ان کی عورتوں کا جنسی استحصال تک کیا جاتا تھا لیکن وہ اتنے بے بس اور مجبور تھے کہ صدائے احتجاج بلند کرنے کے بجائے وہ اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر خاموش رہتے تھے۔ چوں کہ پریم چند کا تعلق بھی دیہات سے تھا اس لیے ہریجنوں پر اونچی ذات کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کو انھوں نے نہ صرف دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا بلکہ ان کی مظلومیت کی نفسیات کو بخوبی سمجھا تھا۔ "صرف ایک آواز"، "نجات"، "ٹھاکر کا کنواں"، "وفا کی دیوی"، "دودھ کی قیمت" اور "کفن" اس تعلق سے ان کے بہترین افسانے شمار کیے جاتے ہیں۔ ان افسانوں میں جہاں سماج کے گرے پڑے ہریجنوں کی خارجی اور باطنی زندگی کی سچائیاں نہایت مکروہ شکل میں ابھر کر سامنے آتی ہیں وہیں ان کے پیچھے برسرِ کار اعلا طبقہ کے جارحانہ رویوں کی نفسیات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے، جو پریم چند کی تخلیقی ذہانت اور پختہ شعور کی وجہ سے ہیئت اجتماعی اور انسانیت کے وسیع تر حقائق اور مسائل کا علامت بن گئی ہے۔

پریم چند نے اپنے افسانوں میں ہریجنوں کی مظلومیت کے ساتھ ساتھ اس صورت حال کو پوری سچائی کے ساتھ من و عن پیش کیا ہے جس کی وجہ سے ہریجنوں کے اندر یہ احساس خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کہ مندر میں گھسنے یا کنوئیں کا پانی لینے کے حقدار وہ کیوں نہیں ہیں۔ "ٹھاکر کا کنواں" اور "جرمانہ" اسی احساس کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کہانیوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں ہے کہ پریم چند ہریجنوں کو ان کی صورت حال سے باخبر کرانا چاہتے ہیں اور انھیں عا[م] انسانی زندگی کے دھارے میں شامل کرنا چاہتے ہ[یں] کیوں کہ ان کے نزدیک اعلا انسانی قدریں کسی ایک ذات یا پھر برادری تک محدود نہیں تھیں بلکہ اسے پوری انسانی برادری سے منسوب کرتے تھے۔ کو یہ بات قطعی قابل قبول نہیں تھی کہ بدی اور اخلا[قی] معائب نچلے ذات کی وراثت ہے اور اونچی ذات [کا] ہر فرد اعلا اقدار اور حسن و خیر کا مجسمہ ہے۔ افسا[نہ] "گھاس والی" میں پریم چند نے بیک وقت ان تما[م] مسائل کو پیش کیا ہے۔ ایک طرف ملیا کا کردار ہ[ے] جو غریب اور چمارن ہونے کے باوجود اپنی عزت ا[ور] عصمت کو اپنا انسانی حق سمجھتی ہے۔ دوسری طرف گاؤں کا زمین دار ٹھاکر چین سنگھ ہے جو عام سم[اجی] رویوں کے مطابق نیچی ذات کی ہر حسین عورت کو ا[پنا] حق سمجھتے ہوئے ملیا کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہ[تا] ہے۔ لیکن ملیا نہ صرف اپنی عزت کی طرف ٹھاکر کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو سختی سے جھٹک دیتی ہے بلکہ اپنی باتوں سے اس کی نام نہاد شرافت کی دھجیاں اڑا دیتی ہے۔

"ملیا کے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم نمودار ہو گیا۔ بولی۔ اگر اسی طرح مہابیر تمہاری عورت کو چھیڑتا تو تمہیں کیسا لگتا۔ تم اس کی گردن کاٹنے پر تیار ہو جاتے کہ نہیں۔ بولو! کیا سمجھتے ہو مہابیر چمار ہے تو اس کے بدن میں لہو نہیں۔ شرم نہیں آتی ہے اپنی اجت آبرو کا خیال نہیں۔ میرا روپ رنگ تمہیں بھاتا ہے۔ کیا مجھ سے بہت سندر عورتیں شہر میں ندی کے گھاٹ پر

---

* ۳۰۲، پیریار ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۶۷

* اس لفظ کو ہر جگہ شیڈولڈ کاسٹ پڑھا جائے

نہیں گھوما کرتیں۔ میرا منہ ان کے تلوؤں کے
برابر بھی نہیں کر سکتا۔ تم ان میں سے کسی سے
دیا نہیں مانگتے۔ کیا ان کے پاس دیا نہیں۔
مگر تم وہاں نہ جاؤ گے کیونکہ وہاں جاتے تمہاری
چھاتی دہلتی ہے۔ مجھ سے دیا مانگتے ہو کہ میں
چمارن ہوں۔" ۱۲ (پریم چند کی کہانیاں۔
جوگندر پال۔ صفحہ ۱۶۴)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پریم چند
جی صورت حال کی نفسیات کو پیش کرنے پر کس
قدر مہارت رکھتے تھے۔ دبی دبی سی صدائے احتجاج
کے ساتھ یہاں پریم چند کا اصل مقصد سماج کی اس
مکروہ شکل کو دکھانا ہے جسے طبقاتی درجہ بندی
نے جنم دیا ہے اور جہاں انسانی قدریں دو حصوں میں اس
قدر بٹ گئی ہے کہ ایک عورت کسی مرد کے ہوس کا
شکار صرف اس لیے بن سکتی ہے کہ وہ ہریجن ہے۔
سلیا کا یہ کہنا "مجھ سے دیا مانگتے ہو کہ میں چمارن ہوں"
نچلے طبقے کی قابل رحم صورت حال کی پوری تشریح ہے
اور یہی وہ صورت حال ہے جسے پریم چند ہندوستانی
معاشرے کے لیے ناسور سمجھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا
کہ اونچ نیچ، ذات پات ایسی بیماری ہے جس سے
ساری انسانی قدریں افسوسناک حد تک تباہ
ہو جاتی ہیں۔ انسانی قدروں کے بکھرنے اور پامال
ہونے کا اندازہ "دودھ کی قیمت" اور "کفن" سے
لگایا جاسکتا ہے۔

"دودھ کی قیمت" میں زمین دار کا بیٹا
سریش منگل کی ماں کا دودھ پی کر ایک سال تک
پرورش پاتا ہے۔ لیکن ایک سال کے بعد بھونگی
کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے کہ بچہ کا دھرم بھرشٹ نہ
ہو جائے۔ بھونگی جب سانپ کاٹنے سے مرجاتی
ہے تو منگل زمین دار کے یہاں خستہ حالی میں پرورش
پاتا ہے۔ اس کی اس خستہ حالی میں اس کا کتا ٹامی بھی
برابر کا شریک ہے۔ دونوں جاڑا، گرمی، برسات ہر
ایک موسم میں نیم کے پیڑ کے نیچے سوتے ہیں۔ کھانے
کے لیے جھوٹی روٹی کے سوکھے ٹکڑے اور گالیاں
ملتی ہیں۔ لیکن ایک دن منگل کو وہاں سے بھی نکال دیا
جاتا ہے۔ منگل کی اس ذلت بھری زندگی کے احساس
کو پریم چند ٹامی کی زبان سے بیان کرتے ہوئے
لکھتے ہیں۔

"اس طرح کی ذلتیں تو زندگی بھر سہنی ہیں۔
یوں ہمت ہار دو گے تو کیسے کام چلے گا مجھے
دیکھو نا جس کسی نے ڈنڈا مارا تو چلا اٹھا۔
پھر ذرا دم ہلاتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔
ہم دونوں اسی لیے بنے ہیں بھائی"۔ ۱۳
(پریم چند کی کہانیاں۔ جوگندر پال صفحہ ۴۲)

اور بالآخر پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے منگل پھر
اسی در پر ٹامی کے ساتھ آتا ہے اور ضمیر کو کچلتے
ہوئے لات کی ماری ہوئی روٹیاں کھانے پر
مجبور ہوتا ہے۔

"منگل اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ اتنے
میں ایک کہار جھوٹن کی تھال ہاتھ میں
لیے نکلا۔ اب دونوں میں صبر نہ ہو سکتا
تھا۔ منگل اندھیرے سے نکل کر روشنی میں
آگیا۔ کتا تو پہلے ہی روشنی میں تھا۔" لے
کھالے میں پھینکنے جا رہا تھا"۔ منگل اور
کتا وہیں نیم کے پیڑ کے نیچے جھوٹن کھانے
لگے"۔ ۱۴
(پریم چند کی کہانیاں۔ جوگندر پال صفحہ ۴۳)

یہاں انسانی منگل حقیقی معنوں میں انسان نہیں رہ
جاتا ہے بلکہ اعمال اور اطوار کے تناظر میں نام نہاد
منگل اور حقیقی کتا ٹامی دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔
پتل چاٹنے کے بعد منگل ٹامی سے کہتا ہے۔
"سریش کو اماں نے ہی پالا ہے۔ لوگ کہتے
ہیں دودھ کی قیمت کوئی نہیں چکا سکتا اور
مجھے دودھ کا یہ دام مل رہا ہے"۔ ۱۵
(پریم چند کی کہانیاں۔ جوگندر پال صفحہ ۴۴)

دودھ کا جو "دام" منگل کو مل رہا ہے وہ
منگل کا تو المیہ ہے ہی، پورے سماجی نظام کے تناظر
میں اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ
"دودھ کی قیمت" کے در پردہ پریم چند نے سماج
کے ایک ایسے پسماندہ طبقہ کی بھوک اور افلاس کی
نشاندہی کی ہے جو شب و روز کی محنت کے باوجود
منگل جیسی زندگی جینے پر مجبور ہے۔ گویا پریم چند نے
منگل کے کردار کو پیش کر کے نہ صرف ہریجنوں کی سماجی
حیثیت کی وضاحت کی ہے بلکہ ان قوتوں کی بھی نشاندہی
کی ہے جو اس غیر انسانی سماج کے ذمہ دار ہیں۔ ہریجنوں
کی یہی قابل رحم صورت حال اور اعلا طبقہ کی قابل
مذمت استحصال پسندی "کفن" میں زیادہ مکروہ
شکل میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ "کفن" کے مناظر کو ہم
یاد کرتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف
دردِ زہ کی مصیبت سے مادھو کی بیوی بدھیا جھونپڑی
میں چیخ اور کراہ رہی ہے لیکن گھیسو اور مادھو آلو کھانے
میں لگے ہوئے ہیں۔ دونوں میں سے کوئی اس کے قریب
جانے کو تیار نہیں ہے کیونکہ دونوں کو اندیشہ ہے کہ الاؤ
میں بھون بھون کر چوری کیے ہوئے جو آلو وہ کھا رہے ہیں
دوسرا ان کا بڑا حصہ صاف کر دے گا۔ یہ افسانہ جس
دردناک حقیقت کو بیان کرتا ہے وہ پوری انسانیت
کا المیہ ہے۔ یہاں استحصال پسند طبقہ نے ان مجبور اور
مقہور طبقے کا استحصال اتنا کیا ہے کہ وہ انسانی حس
تک سے محروم ہو گیا ہے۔ افسانہ کے دو کردار مادھو
اور گھیسو اس المیہ کے ہیرو ہیں جو کفن کے لیے مانگے
ہوئے پیسے کو پوری کچوڑی اور تاڑی پینے میں اڑا دیتے
ہیں۔ لیکن اس حیوانیت پر انھیں ذرا بھی افسوس نہیں
ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں "بڑی اچھی تھی بیچاری مری
بھی تو خوب کھلا پلا کر"۔ دونوں کرداروں کی یہ بے غیرتی
اور بے حسی اس لیے ہے کہ ان کی روح بھوکی ہے۔ برسوں
سے انھیں بھر پیٹ کھانا نصیب نہیں ہوا ہے۔
بھوک کی یہ شدت اتنی تیز ہے کہ انھیں اپنے انسان
ہونے کا مطلق خیال ہی نہیں ہے۔ لیکن ستم ظریفی تو یہ
ہے کہ حیوان کی سطح پر زندہ رہنے کے لیے گجرے یہ
دونوں اپنے آپ سے ریاکاری کرنے پر مجبور ہیں ورنہ
گھیسو اپنے بیٹے مادھو کو بھلا ایسے کیوں سمجھاتا:۔
"کیوں روتا ہے بیٹا۔ خوش ہو کہ وہ مایا
جال سے مکت ہو گئی، جنجال سے چھوٹ
گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ
کے بندھن توڑ دیے"۔ ۱۶
(پریم چند کی کہانیاں۔ جوگندر پال صفحہ ۲۲۸)

الغرض سماج کا یہ مجبور اور مقہور انسان
کس کس طرح خود کو دھوکہ دیتا ہے اور کیسے کیسے سمجھوتوں
سے زندہ رہتا ہے، ان تمام باتوں کی بے لاگ ترجمانی
پریم چند کرتے ہیں تو ہریجنوں کی پوری سماجی حیثیت
کھل کر سامنے آجاتی ہے اور انسانیت کے منہ پر
زبردست طمانچہ بن جاتی ہے۔ مذکورہ افسانوں کے
علاوہ کئی دوسرے افسانے بھی ہیں جس میں پریم چند
نے ہریجنوں کے مسائل کو بے لاگ اور بے باک
ہو کر پیش کیا ہے۔ ایسے افسانوں میں جہاں پریم چند
نے ہریجنوں کی مظلومیت، ان کی بے کسی اور بے بسی

باقی ٹائٹل کور ۳ پر

دھرتی کا گہنا

رضا امروہوی

پیڑوں سے آباد ہیں گلشن
پیڑ ہی دھرتی کا گہنا ہیں
یارو! کچھ کہنا ہے آؤ　　پیڑ لگاؤ، پیڑ اُگاؤ
جیون کی بگیا کو سجاؤ　　دھرتی کو آفت سے بچاؤ
پیڑ تو دھرتی کا گہنا ہیں
پیڑ ہی دھرتی کی شوبھا ہیں
پیڑ ہی دھرتی کی دولت ہیں　　اپنا ساہس ہیں ہمت ہیں
اپنی محنت ہیں طاقت ہیں　　من کا چین ہیں اور راحت ہیں
مت کاٹو یہ پیڑ، نہ کاٹو
پیڑوں کی بھاشا کو سمجھو
واتاورن کو صاف بنائیں　　دھرتی کو کٹنے سے بچائیں
ریگستان نہ اور بڑھائیں　　باڑھوں پر بھی روک لگائیں
پیڑ ہر اک دکھ جھیل رہے ہیں
اپنی جان پہ کھیل رہے ہیں
پیڑوں سے سب کا ناطہ ہے　　پیڑوں کا بھی اک کنبہ ہے
پیڑ کسی سے کیا کہتا ہے　　اس کے دل میں درد چھپا ہے
آندھی طوفانوں کو روکے
چڑھتے دریاؤں کو ٹوکے
پیڑ رسیلے پھل دیتے ہیں　　جیون کو یہ بل دیتے ہیں
اور ہوا شیتل دیتے ہیں　　چھاؤں بھی یہ پل پل دیتے ہیں
دھرتی کی سنتان ہیں یہ بھی
اپنا دھرم، ایمان ہیں یہ بھی

پی اینڈ ٹی ڈی، بلاک نمبر ۱۳، کوارٹر نمبر ا۔ سی، کالی باڑی مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

غزل

واجد سحری

کیسے یہ انقلاب آنے لگے
بچے اب آئینہ دکھانے لگے

تتلیوں کو پرکھنا آتا ہے
پھول کیوں کاغذی سجانے لگے

اور آنکھیں ابھی تو کھلنی ہیں
کانٹے راہوں سے کیوں ہٹانے لگے

شیشۂ دل جنھوں نے توڑ دیا
خود کو آئینہ گر بتانے لگے

گھر کی دیمک نے کر دیا احسان
پھر دریچے نئے لگانے لگے

لگ نہ جائے نظر زمانے کی
اپنے زخموں کو ہم چھپانے لگے

بوڑھے ہونے لگے ہو کیا واجد
باتیں بچوں سی کیوں بنانے لگے

●

ب۔ ۲۸ طبیہ کالج قرول باغ نیو دہلی ۵

غزلیں

منور بستوی

ملے جو منزل دار و رسن تو کیا ہوگا
حیات اوڑھ کے نکلے کفن تو کیا ہوگا

جو راز، راز ہی اب تک رہا مرے ہمراز
کھلا وہ راز سرِ انجمن تو کیا ہوگا

ابھی تو آپ چھڑاتے ہیں اپنے دامن کو
سنبھل گیا مرا دیوانہ پن تو کیا ہوگا

سفر سے پہلے مسافر کو سوچ لینا ہے
سفر میں آئی جو یادِ وطن تو کیا ہوگا

بکھر گیا جو نہ پا کر کبھی منوؔر کو
تمہارے ہاتھ پہ رنگ سخن تو کیا ہوگا

سمریاواں بازار۔ بستی۔ یوپی

مس آفرین صبا

سانسوں کا سلسلہ ہے کبھی ٹوٹ جائے گا
یہ زندگی کا آئینہ ہے پھوٹ جائے گا

بڑھ کر گلے لگائے گا انسان موت کو
صبر و رضا کا ساتھ اگر چھوٹ جائے گا

بھولے سے اپنے حال پہ تم ناز مت کرو
آکر لٹیرا وقت کا سب لوٹ جائے گا

سوکھے شجر پہ اپنا نشیمن بناؤ مت
یہ خود ہے بے سہارا کبھی ٹوٹ جائے گا

نفرت کی آگ گھر میں لگانا تو ہے گناہ
اس سے زمانہ تم سے صبا روٹھ جائے گا

معرفت مقوا اسپاٹ" بی۔ ایچ روڈ ترکیرے۔ ۵۷۷۲۲۸ کرناٹک

ایس۔ عابد نظر

جگر کو تاب بصیرت نگاہ کو دے گا
وہ حوصلہ مرے قلب تباہ کو دے گا

وہی سکندر اعظم بنے گا دنیا میں
شجر خلوص کے جو شاہراہ کو دے گا

اگرچہ درد نہیں نالہائے بے جاں ہیں
متاع درد ہی تو سوز آہ کو دے گا

جو کرب آگہی رکھتا ہو کچھ اثر اپنا
بنے گا شعلہ اثر بھی کراہ کو دے گا

اگر بچانا ہے اس کو بچائے گا شر سے
وہ عنکبوت کا جالا پناہ کو دے گا

۳۷۔ پاٹا نالہ۔ لکھنؤ

بڑھتے قدم۔۔۔

(ترقیاتی خبرنامہ)

روزگار کی خصوصی اسکیم

روزگار کی مندرجہ ذیل اسکیمیں مختلف وزارتوں/شعبوں کے زیر نگرانی جاری ہیں۔

۱۔ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام (آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی)

آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی۔ خود روزگار کا پروگرام ہے جس کے تحت خط غریبی سے نیچے زندگی گزارنے والے دیہی کنبوں کو سبسڈی اور بینک کے قرضے فراہم کیے جاتے ہیں تاکہ یہ لوگ غریبی کی سطح سے اوپر آنے کے لیے مستقبل بنیاد پر روزگار کے لیے ضروری رقم اور ساز و سامان حاصل کرسکیں۔ اس پروگرام کی دو ذیلی اسکیمیں ہیں (۱) خود روزگار کے لیے دیہی نوجوانوں کی تربیت، جس کا مقصد خط غریبی سے نیچے کی سطح پر زندگی گزارنے والے دیہی نوجوانوں کو تکنیکی اور روزگار کی بنیادی معلومات فراہم کرنا ہے۔ (۲) دیہی علاقوں میں عورتوں اور بچوں کی ترقیاتی اسکیم جس میں غریب کنبوں کی عورتوں پر خاص توجہ دی جاتی ہے تاکہ انھیں مستقبل کی بنیاد پر خود روزگار حاصل کرنے میں مدد دی جاسکے۔ اس پروگرام سے ۹۵-۱۹۹۲ء کے دوران ۳۲ر۶۲ لاکھ خاندانوں کو فائدہ پہنچا ہے۔

۲۔ جواہر روزگار یوجنا (جے آر وائی)

جواہر روزگار یوجنا اجرتوں کا روزگار پروگرام ہے جو تین شاخوں میں نافذ العمل ہے۔ پہلی شاخ کے تحت مختص رقم کا ۵ر۷ فی صدی حصہ ملک بھر میں پروگرام پر عمل درآمد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جے آر وائی کی دوسری اور تیسری شاخ کا آغاز ۹۴-۱۹۹۳ء میں ہوا۔ دوسری شاخ کے تحت جے آر وائی کے ذریعے مختص کیا گیا ۲۰ فی صد فنڈ ملک کے ان ۱۲۰ پسماندہ اضلاع کو فراہم کیا جائے گا جہاں بے روزگار یا غیر اطمینان بخش روزگار والے افراد کی بھاری تعداد موجود ہے۔ تیسری شاخ کے تحت الیف آر وائی کے فنڈ کا پانچ فی صد حصہ خصوصی اور اختراعی پروجیکٹوں کے لیے مختص کیا جاتا ہے۔ ان پروجیکٹوں میں مزدوروں کی ہجرت روکنے، دیہی خواتین کے روزگار کے فروغ، رضاکار تنظیموں کے ذریعے خشک سالی کی روک تھام اور بنجر زمینوں کی ترقیات کے خصوصی پروگرام شامل ہیں جو مستقل روزگار مہیا کریں۔ جے آر وائی کے تحت ۹۵-۱۹۹۲ء کے دوران تقریباً ۶۳۶۱۵۲ لاکھ روزگاری دنوں کی گنجائش نکالی گئی ہے۔

۳۔ روزگار کی تحفظاتی اسکیم (ای اے ایس)

اس اسکیم کا آغاز ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ میں خشک سالی سے متاثرہ اضلاع کے شناخت شدہ ۱۷۷۸ بلاکوں میں کیا گیا تھا۔ یہ تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں، سوائے گوا، پنجاب، چنڈی گڑھ، پانڈیچری اور دہلی کے ۲۴۴۳ بلاکوں میں نافذ العمل ہے۔ اس اسکیم کے تحت دیہی علاقوں میں ۱۸ سال سے زیادہ اور ۶۰ سال سے کم کے تمام مستحق اور ضرورت مند لوگوں کو مندی کے زراعتی سال کے دوران سرکاری طور پر منظور شدہ کم سے کم اجرتوں پر سو دنوں کا روزگار فراہم کیا جائے گا۔ اس اسکیم کے تحت اس کے آغاز سے فروری ۱۹۹۵ء تک ۲۳۹۹ لاکھ روزگاری دن فراہم کیے گئے۔ اس اسکیم کا کوئی نشانہ مقرر نہیں کیا گیا ہے کیوں کہ یہ ضرورت پر مبنی پروگرام ہے۔

۴۔ نہرو روزگار یوجنا

اکتوبر ۱۹۸۹ء میں یہ اسکیم شروع کی گئی تھی اور اس کا مقصد شہری علاقوں کے ان نوجوانوں کی مدد کرنا تھا جو روزگار سے محروم ہیں یا جن کا روزگار اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہ اسکیم شہری بستیوں میں غریبی سے نیچے کی سطح پر زندگی گزارنے والوں اور مندرجہ فہرست ذاتوں و قبائل کی خواتین کا احاطہ کرتی ہے۔ اس یوجنا میں تین اسکیمیں شامل ہیں۔

(۱) شہری علاقوں میں چھوٹے کارخانہ داروں کی اسکیم (SUME) کا مقصد شہری علاقوں کے غریب افراد کو ہنرمندی کا معیار بڑھانے اور سبسڈی اور قرضوں کی سہولت فراہم کرنا ہے تاکہ ۵۹ صنعت، خدمات اور تجارت میں چھوٹی اکائیاں قائم کرکے روزگار حاصل کرلیں۔

(۲) مکان بنانے یا ان کی حالت سدھارنے کی اسکیم کا مقصد تعمیراتی کاموں میں تربیت مہیا کرنا ہے۔ اس کے تحت ایک ہزار روپے کی سبسڈی اور ۹۹۵۰ روپے تک کا قرض ہڈکو سے دستیاب ہوگا جس کے ذریعے معاشی طور پر کمزور افراد فائدہ اٹھاسکیں گے۔

(۳) شہری اجرتوں کے روزگار کی اسکیم شہری علاقوں کے غریب افراد کے لیے اقتصادی اور سماجی اعتبار سے فائدہ مند کارخانے وغیرہ قائم کرنے

مقصد سے شروع کی گئی ہے۔

۳۰ اپریل ۱۹۹۵ء تک شہری علاقوں کے ۹،۱۵ لاکھ غریب افراد کی مدد کر کے ایس یو ایم ای اور ایس ایچ اے ایس ای کے تحت چھوٹے کارخانے قائم کرائے گئے ہیں۔ آٹھویں منصوبے کے تحت ۵،۳۰ لاکھ غریب شہری باشندے خود روزگار حاصل کرنے کے لیے مدد اور تعاون حاصل کریں گے اور اس کے ساتھ ساتھ ۸۰،۴ لاکھ روزگاری دن پیدا کیے جائیں گے۔ نیز ۵،۱۰ لاکھ گھروں کی حالت سدھاری جائے گی۔

پی ایم آر وائی اسکیم یعنی وزیر اعظم کی روزگار یوجنا جو تعلیم یافتہ بے روزگار افراد کے لیے ہے اور آٹھویں منصوبے کے دوران اس اسکیم کے تحت سات لاکھ چھوٹے کارخانے قائم کر کے ایک ملین سے زیادہ افراد کو فائدہ پہنچایا جائے گا۔ یہ کارخانے صنعت خدمات اور تجارت کے شعبوں میں قائم کیے جائیں گے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں اس اسکیم کو شہری علاقوں کے لیے نافذ العمل کیا گیا اور بعد میں اسے دیہی اور شہری دونوں علاقوں کے لیے قابل عمل بنا دیا گیا۔ ۹۵-۱۹۹۴ء سے ۹۷-۱۹۹۶ء تک سالانہ نشانہ ۲،۲۰ لاکھ افراد کا رکھا گیا ہے۔ مندرجہ فہرست ذات و قبائل کو ترجیح دی جائے گی اور او۔ بی سی کے لیے ۲۷ فیصد ریزرویشن ہے۔

مندرجہ بالا خصوصی روزگار اسکیموں کے علاوہ ایک نئی اسکیم اکتوبر ۱۹۹۴ء سے شروع کی گئی ہے جس کے تحت کھادی اور دیہی صنعتی کمیشن میں ۲۰ لاکھ اضافی روزگار کی گنجائش ہے۔ ●

اقلیتوں کی تعلیم کے سلسلے میں نگرانی کمیٹی

حکومت نے اقلیتوں کی تعلیم کے سلسلے میں ایک قومی نگرانی کمیٹی تشکیل دی ہے تاکہ پروگراموں پر عمل درآمد کے کام میں تیزی لائی جائے۔ انسانی وسائل کی ترقی و فروغ کے وزیر شری مادھو راؤ سندھیا اس کمیٹی کے چیئرمین ہوں گے۔ کمیٹی کے اراکین میں کیرالہ کے وزیر تعلیم شری ای ٹی محمد بشیر، ڈاکٹر گرجا ویاس ایم پی، شری کے ایم خاں ایم پی، حیدرآباد کے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، راجستھان اردو اکیڈمی کے چیئرمین شری انعام الحق، انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم، شری انل بورڈیا، اقلیتوں سے متعلق کمیشن کے رکن سکریٹری، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر نیز بہار، آندھرا پردیش، اترپردیش اور جموں و کشمیر میں اسکولی تعلیم کے محکمے کے سکریٹری شامل ہیں۔ تعلیم کے محکمے میں منصوبہ بندی بیورو کے جوائنٹ سکریٹری اس کمیٹی کے رکن سکریٹری ہوں گے۔

یہ کمیٹی اقلیتوں کی تعلیم کے سلسلے میں مختلف پروگراموں پر عمل درآمد کے کام کی نگرانی کرے گی۔ یہ کمیٹی ابتداً تین سال کے لیے تشکیل دی گئی ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقلیتوں کی تعلیم کو فروغ دینے کے سلسلے میں ۹۴-۱۹۹۳ء میں دو مرکزی اسکیمیں شروع کی گئی تھیں۔ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اقلیتوں کے لیے علاقائی جامع پروگرام کے تحت اب تک ۵،۴۷ کروڑ روپے کی گرانٹ جاری کی جا چکی ہے۔ ۱۳ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے تین علاقوں میں تعلیمی لحاظ سے پسماندہ اقلیتوں کی اکثریت والے ۳۳۱ بلاکوں کے لیے اس کی توسیع کی گئی ہے۔ مدرسوں کی جدید کاری کی اسکیم کے تحت، اترپردیش، مدھیہ پردیش اور ہریانہ کے لیے ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۶۸،۶ لاکھ روپے اور ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۹۹،۱۸ لاکھ روپے کی رقم جاری کی گئی ہے۔ ●

دیہی علاقوں میں کمپیوٹر نظام کے فروغ پر زور

رکن پارلیمنٹ کی مقامی علاقائی ترقیاتی اسکیم کے تحت ملک بھر کے تعلیمی اداروں میں بڑے پیمانے پر کمپیوٹر لگائے جائیں گے۔ الیکٹرونکس کا محکمہ دیہی ترقی کے لیے الیکٹرونکس کو فروغ دینے کے لیے ایک اقدام کے طور پر ریاستی مشنری کے ساتھ قریبی رابطہ قائم کرے گا تاکہ دیہی علاقوں میں بنیادی ڈھانچے کی موجودہ سہولیات کو فروغ دیا جائے۔ اس امر کا انکشاف الیکٹرونکس کے وزیر مملکت شری ایڈوارڈو فلیرو نے کل یہاں سائنس کے محکموں سے وابستہ پارلیمانی مشاورتی کمیٹی کی ایک میٹنگ میں کیا۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس اسکیم سے پانچ سے سات سال کی مدت میں روزگار کے تقریباً ۸ لاکھ مواقع پیدا ہوں گے۔ ●

کمپیوٹر کے ذریعے زمینی ریکارڈ رکھنے کے پروجیکٹ

کمپیوٹر کے ذریعے زمینوں سے متعلق ریکارڈ رکھنے کی اسکیم کے تحت ملک کی ۲۵ ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں ۱۰۲ پروجیکٹ شروع کیے گئے ہیں۔ مرکزی طور سے اسپانسر شدہ اس اسکیم کے تحت اب تک ۲۴۲۷ لاکھ روپے کی رقم خرچ کی جا چکی ہے۔ مرکز موجودہ مالی سال کے دوران مزید پروجیکٹوں کے لیے رقم فراہم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ مرحلے وار طریقے سے اس نظام کو پورے ملک میں شروع کرنے کا مقصد حاصل کیا جا سکے۔

امید ہے کہ زمینوں سے متعلق ریکارڈ کے نظام کی جدید کاری سے مقدمات کی تعداد میں کمی آئے گی۔ دیہی علاقوں اور روزگار کے وزیر ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے حال ہی میں وزرائے اعلا کو لکھا ہے کہ وہ زمینی اصلاحات سے متعلق اقدامات پر تیزی سے عمل درآمد کرائیں۔ ●

تقریباً ۵ لاکھ گاؤوں کی برق کاری

دیہی برق کاری کارپوریشن (آر ای سی) جو سرکاری شعبے کا ایک ادارہ ہے، دیہی علاقوں میں بجلی کی تقسیم کے نظام کی توسیع کے سلسلے میں مسلسل کوششیں کرتی رہی ہے۔ چنانچہ ان کوششوں کے نتیجے میں ۴،۹۷ لاکھ گاؤوں کو اب بجلی دستیاب ہے، جو کل ۵،۷۹ لاکھ گاؤوں کا ۸۶ فی صد حصہ ہیں۔ بجلی سے چلنے والے پمپ سیٹوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور ملک میں تیار کردہ کل بجلی کے تقریباً ایک چوتھائی حصے کا استعمال زرعی شعبہ کر رہا ہے۔

مارچ ۱۹۹۵ء تک قبائلی علاقوں کے ۱،۱۲ لاکھ گاؤوں میں سے ۸۱۸۱۳ گاؤوں کی برق کاری کی جا چکی ہے۔ ۲،۶۵ لاکھ گاؤوں میں درج فہرست ذاتوں کی کالونیوں میں اسٹریٹ لائٹ فراہم کر دی گئی ہے۔ مذکورہ کارپوریشن بقیہ ۸۵۰۰۰ گاؤوں میں بھی بجلی فراہم کرنے کی کوششیں کر رہی ہے۔ ●

دریاؤں کے تحفظ کا قومی منصوبہ

مرکز نے "دریاؤں کے تحفظ سے متعلق قومی منصوبے" کی ایک اسکیم کو منظوری دے دی ہے جس پر ملک بھر میں عمل درآمد کیا جائے گا۔ اس اسکیم پر ۷۷۲ کروڑ روپے کے اخراجات آئیں گے۔ یہ اسکیم دس ریاستوں میں ۱۸ دریاؤں پر مشتمل ہے۔ منصوبے میں ان دریاؤں میں پانی کے معیار کی نگرانی کا کام شامل ہے۔ مختلف اجزا

باقی صفحہ ۳ پر

نئی دھلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی. کے. بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

سب ایڈیٹر : ڈاکٹر توحید خان

فون : 677591

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : سریش کمار

جلد : ۱۵ شمارہ : ۸

نومبر ۱۹۹۵ء (۱۰ کارتک تا ۹ اگرہاین شک ۱۹۱۷)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵ روپے :

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن انچارج : کے. آر. کرشنن

مضامین سے متعلق

خط وکتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۵، آر. کے. پورم (مین) نئی دھلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

خواجہ عبدالحق

اقوام متحدہ — امن عالم کی نقیب

اقوام متحدہ آج ۵۰ سال کی ہو گئی ہے اور کرۂ ارض کے سبھی ملک جو اس کے ممبر ہیں اقوام متحدہ کے منشور میں درج اصول و مقاصد پر عمل آوری میں اپنا تعاون دینے کے لیے قانونی طور پر پابند ہیں۔ ان اصول و مقاصد میں جنگ کا خاتمہ، انصاف اور بین اقوامی قانون کا احترام، انسانی حقوق، معاشی و سماجی ترقی اور مختلف ملکوں کے مابین دوستانہ تعلقات کو فروغ دینا شامل ہے۔

انسانی تاریخ میں ایک ایسے عالمی ادارہ کی ضرورت ہے جو دنیا کو جنگ کی لعنت سے محفوظ رکھے نیز مذکورہ بالا مقاصد کو پورا کرے۔ پہلی بار پہلی عالم گیر جنگ (۱۸-۱۹۱۴ء) کے بعد محسوس کی گئی تھی جس نے عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ چناں چہ اس وقت لیگ آف نیشنز (LEGUE OF NATIONS) وجود میں آئی جو کچھ اپنی ترکیبی خامیوں اور غلط مفروضات کی بنا پر ناکام رہی اور اس کے قیام کے صرف ۲۰ سال بعد ۱۹۳۹ء میں دوسری عالم گیر جنگ چھڑ گئی جس نے اپنی ہولناکیوں کی بنا پر پہلی عالم گیر جنگ کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ چناں چہ دوسری عالم گیر جنگ کے دوران ہی عالمی مدبر اور مفکر اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ اب ایک ایسی عالمی تنظیم کی ضرورت ہے جو لیگ آف نیشنز سے زیادہ کارگر ہو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ نئی تنظیم ان اسباب پر حاوی ہو جو جنگ کا سبب بنتے ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر امریکہ کے شہر سان فرانسسکو میں ۲۵ اپریل سے ۲۶ جون ۱۹۴۵ء تک بین اقوامی تنظیم سے متعلق اقوام متحدہ کانفرنس" منعقد ہوئی جس میں ۵۰ ملکوں کی حکومتوں کے نمائندوں نے اقوام متحدہ کا منشور لکھا اور ۲۶ جون ۱۹۴۵ء کو اسے منظور کر کے اس پر دستخط کیے۔ منشور کا مسودہ امریکہ، برطانیہ، فرانس، سوویت یونین اور چین نے تیار کیا تھا۔ لیکن اقوام متحدہ کا یوم تاسیس ہر سال ۲۴ اکتوبر کو منایا جاتا ہے کیوں کہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء تک منشور پر دستخط کرنے والے ملکوں کی اکثریت نے منشور کی تصدیق کر دی تھی۔

اقوام متحدہ کی ۴۸ ویں جنرل اسمبلی نے ۱۹۹۳ء میں فیصلہ کیا تھا کہ اقوام متحدہ کے منشور کے نفاذ کی ۵۰ ویں سالگرہ منانے کے لیے جنرل اسمبلی کا ایک خاص یادگاری جلسہ بلایا جائے۔ چناں چہ یہ یادگاری جلسہ نیویارک میں واقع اقوام متحدہ کے صدر مقام میں امسال ۲۲ تا ۲۴ اکتوبر کو ہوا جس میں سربراہان ریاست و حکومت شریک ہوئے اور اس بات کا جائزہ لیا گیا کہ اقوام متحدہ اپنے مقاصد کے حصول میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہے۔ اس جلسہ کے بعد ایک اعلانیہ جاری کیا گیا اور سربراہان حکومت و ریاست کے دیے گئے بیانات کو ایک کتابی شکل میں بھی شائع کیا جائے گا۔ اقوام متحدہ کو اس وقت متعدد اہم مسائل درپیش ہیں جن پر سربراہان ریاست و حکومت جنرل اسمبلی کے خاص اجلاس کے دوران اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ ان تمام مسئلوں میں ہندوستان کو گہری دلچسپی ہے اور بعض پر تشویش بھی ہے لیکن ان پر بحث کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عالمی تاریخ میں اقوام متحدہ جیسے بین اقوامی تعاون کی کوئی مثال نہیں ہے کیوں کہ اپنی بہت سی خامیوں کے باوجود اقوام متحدہ نے دنیا کو ۵۰ سال تک نہ صرف تیسری عالم گیر جنگ سے محفوظ رکھا ہے بلکہ اس نے اور اس کی مختلف مخصوص ایجنسیوں نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اقوام متحدہ نے ان ۵۰ برسوں میں چھوٹی چھوٹی مقامی جنگوں کو روکنے اور ان کے قضیوں کو سلجھانے کے لیے ۲۶ دفعہ" قیام امن کی کارروائیاں" کیں، ان جنگوں اور دوسری آفات ارضی و سماوی کے شکار کروڑوں لوگوں کو پناہ دینے اور ان کی بازآبادکاری میں مدد کی، دنیا کے دس کروڑ لوگوں کو نوآبادیاتی نظام سے آزادی اور خود مختاری دلانے میں نمایاں کردار ادا کیا، بین اقوامی قانون کی توسیع و تدوین کی، دنیا سے چیچک جیسے موذی مرض کا خاتمہ کیا اور ۷۰ ایسی قانونی دستاویزیں منظور کیں جن سے انسانی حقوق کا احترام یا تو لازمی ہو گیا یا پھر انھیں فروغ ملا اور اس طرح ساری دنیا میں آزادی فکر و عمل کی عام توقعات میں ایک تاریخی انقلاب رونما ہوا۔

لیکن اقوام متحدہ کے مقاصد کے حصول کا سفر طویل ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کیا جانا ضروری ہے۔ یہ رکاوٹیں دنیا کے سامنے مسئلوں کی شکل میں ہیں جن پر اکثر متضاد رائے پائی جاتی ہیں۔ ایک بڑا مسئلہ اقوام متحدہ کی اصلاح و تشکیل نو نیز سلامتی کونسل کی توسیع کا ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستان کا موقف یہ ہے کہ کونسل کے مستقل اور غیر مستقل دونوں قسم کے ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے اور اس مقصد کے لیے کچھ معروضی اصول طے کیے جائیں جن میں جغرافیائی تقسیم و ترتیب، آبادی، معیشت کا قد و قامت اور امن و سلامتی کے قیام کی کوششوں میں شرکت وغیرہ شامل ہوں۔ اقوام متحدہ کی اصلاح و تشکیل نو کے وسیع تر مسئلہ پر غور و خوض کے لیے اسمبلی کے اجلاس رواں میں ایک کارکن گروپ قائم کیا گیا ہے جو اجلاس کے ختم ہونے سے پہلے اپنی رپورٹ پیش کر دے گا۔ ہندوستان اور نیوزی لینڈ اس گروپ کے مشترکہ چیئرمین ہیں۔

معاشی وسماجی ترقی

اقوام متحدہ کے قیام کا اولین مقصد بین اقوامی امن وسلامتی کا قیام تھا۔ چناں چہ اس کے منشور کی پہلی دفعہ بھی یہی ہے لیکن آج امن وسلامتی سے مراد صرف فوجی مقابلہ وتصادم کی غیر موجودگی نہیں لی جاتی ہے بلکہ یہ مسئلہ دنیا میں موجود بھوک، بیماری، غریبی جیسے تلخ سماجی اور معاشی حقائق سے جڑا ہوا ہے اور یہی تلخ حقائق اکثر وبیشتر قومی، علاقائی اور بین اقوامی کشیدگیوں کی تہہ میں ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ اب تسلیم کیا جاچکا ہے کہ دنیا کے سبھی حصوں کی سماجی اور معاشی ترقی قیام امن کے لیے لازمی ہے۔

چناں چہ اقوام متحدہ کا بیشتر خرچ اور عملہ ان پروگراموں سے متعلق ہے جن کا مقصد ترقی پذیر ملکوں میں سماجی اور معاشی ترقی کا حصول ہے یہ صحیح بھی ہے کیوں کہ دنیا کی دو تہائی آبادی ان ہی ملکوں میں رہتی ہے جس میں سے اکثر بھوک، بیماری، بے روزگاری اور ناخواندگی کا شکار بھی رہتی ہے۔ اقوام متحدہ کا یہ کام اس کے منشور کی دفعہ ۵۵ کے عین مطابق ہے جس کے الفاظ ہیں! "اقوام متحدہ بہتر معیار زندگی، مکمل روزگار اور معاشی وسماجی ترقی اور بہتری کے حالات کو فروغ دے گی۔"

اپنے اسی مقصد کی برآوری کے لیے اقوام متحدہ نے ۱۹۶۰ء، ۱۹۷۰ء، ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کے چار مسلسل دہوں کو "اقوام متحدہ کے ترقیاتی دہے" قرار دیا تاکہ غریب ملکوں کے ترقیاتی کاموں کے لیے بین اقوامی تعاون وامداد کو مجتمع کیا جا سکے۔ جنرل اسمبلی نے اس غرض سے کئی اعلانیے اور پروگرام منظور واختیار کیے ہیں۔ پہلے ترقیاتی دہے میں حاصل شدہ تجربہ کے بعد یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ایک عالمی لائحہ عمل یا حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ اس لیے جنرل اسمبلی نے ۱۹۷۰ء میں "دوسرے دہے کے لیے ایک بین اقوامی حکمت عملی" منظور کی اور چار سال بعد ۱۹۷۴ء میں "ایک نئے بین اقوامی معاشی نظام کے قیام سے متعلق اعلانیہ اور لائحہ عمل" منظور کیا جو ملکوں کے معاشی اور سماجی نظاموں سے قطع نظر ان کے درمیان تعاون کو فروغ دینے نیز ان کی خود مختاری کے احترام کے اصولوں پر مبنی تھا۔ اسی نئے بین اقوامی معاشی نظام کی تعمیل میں جنرل اسمبلی نے ۱۹۷۴ء ہی میں ملکوں کے معاشی حقوق وفرائض کا ایک منشور بھی منظور کیا جس کے بموجب ہر ملک کو اپنی قومی حدود کے اندر واقع اپنی دولت اور قدرتی وسائل پر مکمل اور مستقل اقتدار اعلا حاصل ہے۔ اس کے بعد جنرل اسمبلی نے ۱۹۷۹ء میں تیسرے ترقیاتی دہے (۱۹۸۱۔۹۰ء) کے ایک بین اقوامی ترقیاتی حکمت عملی منظور کی لیکن اس کے بعد عالمی معیشت کی حالت خراب ہو گئی جس کی وجہ سے اس کے بہت سے مقاصد پورے نہیں ہو سکے اور اس دہے کے ختم ہونے تک یہ عام خیال تھا کہ بہت سے ترقی پذیر ملکوں کو اس دہے میں ترقیات کے نقطۂ نظر سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اگر اگلے دہے میں بھی یہی حالت رہی تو یہ عالم گیر انتشار کو دعوت دینا ہوگا۔ اس لیے ۱۹۹۰ء میں جنرل اسمبلی نے دو دستاویزیں منظور کیں جن میں ممبر ملکوں نے اعلان کیا کہ وہ عالمی معیشت کی مسلسل ترقی کے لیے بین اقوامی معاشی تعاون کو فروغ دینے کی سختی سے پابندی کریں گے تاکہ سارے بنی نوع انسان کو بھوک، بیماری، غریبی، جہالت اور خوف سے آزاد ہو کر زندگی گزارنے کا بنیادی حق حاصل ہو سکے۔"

یہاں ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹۸۰ء کے دہے کے آخری برسوں اور ۱۹۹۰ء کے دہے کے شروع کے برسوں میں معاشی وسماجی ترقی کے لیے بازاری معیشت کی راہ اختیار کرنے پر زیادہ زور دیا جانے لگا مگر انسانی فلاح وبہبود کے ضمن میں ریاست کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ساتھ ہی معاشی ترقی اور انسانی فلاح وبہبود کے درمیان گہرے تعلق پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ مزید یہ کہ یہ دونوں مقصد قومی کوششوں اور بین اقوامی معاشی امداد دونوں سے مل کر ہی پورے ہو سکتے ہیں۔

معاشی وسماجی ترقی کے میدان میں اقوام متحدہ کے مذکورہ بالا اقدامات کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ترقیاتی مسئلوں کو جو اعلا فوقیت ملنی چاہیے وہ نہیں مل رہی ہے۔ "ترقی کے ایجنڈے" کو قطعی شکل دینے کے لیے ہو رہے مذاکرات کی رفتار بہت سست ہے۔ ہندوستان اور دوسرے ترقی پذیر ملکوں کی کوشش یہ ہے کہ ترقیاتی مسئلوں کو اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر سب سے زیادہ اہمیت دی جائے اور کوپن ہیگن میں سماجی ترقی سے متعلق بین اقوامی کانفرنس میں جو اقرار نامے کیے گئے ہیں ان کا مناسب تحفظ کیا جائے۔ برخلاف اس کے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ "ترقی کے ایجنڈے" کے نام پر اقوام متحدہ کی مخصوص ایجنسیوں میں کچھ محدود اصلاحات کر دی جائیں اور بس۔

جنرل اسمبلی کا خاص یادگاری جلسہ جس میں سربراہان ریاست وحکومت شریک ہوئے ہیں، متعدد بڑی اہم بین اقوامی کانفرنسوں کے بعد ہوا ہے۔ وہ کانفرنسیں ہیں، (۱) ماحول سے متعلق ۱۹۹۲ء کی ریو ڈی جینیرو کانفرنس (۲) انسانی حقوق سے متعلق وی آنا میں ۱۹۹۳ء کی کانفرنس (۳) آبادی اور ترقیات سے متعلق ۱۹۹۴ء کی قاہرہ کانفرنس (۴) سماجی ترقیات سے متعلق ۱۹۹۵ء کی کوپن ہیگن! خواتین اور ترقیات سے متعلق ۱۹۹۵ء کی بیجنگ کانفرنس۔ ان کانفرنسوں میں بڑی جانفشانی کے بعد کچھ اہم فیصلے کیے گئے تھے لیکن انھیں عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں کوئی کام نہیں ہوا ہے خاص طور پر ان کانفرنسوں میں جن ترقیاتی پروگراموں کی خاص طور پر نشان دہی کی گئی تھی اور ان کے لیے مزید رقمیں مہیا کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا وہ ابھی تک کاغذ پر ہیں۔

علاوہ ازیں، اس وقت اقوام متحدہ مالی بحران سے دوچار ہے جس کی بڑی وجہ قیام امن کی کارروائیوں پر بہت زیادہ خرچ ہے نتیجتاً ترقیاتی سرگرمیوں کے لیے دستیاب وسائل میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ اس مسئلہ پر اعلا سطحی گروپوں کے مذاکرات میں ہندوستان بہت سرگرم حصہ لے رہا ہے۔

ہندوستان نے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں میں ہمیشہ سرگرم حصہ لیا ہے۔ جواہر لال نہرو کے یہ الفاظ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں: "اقوام متحدہ کے تئیں ہندوستان کا رویہ پورے تعاون اور اس کے منشور کی غیر مشروط پابندی کا ہے اس مقصد کی برآری کے لیے ہندوستان اس کی مختلف سرگرمیوں میں پوری طرح شریک رہے گا اور اس کی مجلسوں میں وہ کردار ادا کرنے کی کوشش کرے گا جس کا وہ اپنی جغرافیائی جائے وقوع، آبادی اور پر امن ترقی کی جانب اپنی عملی کوششوں کی بنا پر مستحق ہے۔"

چناں چہ آزاد ہندوستان نے اپنے محدود وسائل کے مطابق اقوام متحدہ کے مقاصد کے حصول میں پوری مدد کی۔ ہندوستان نے عالمی امن وسلامتی کے قیام اور فروغ میں اور بین اقوامی بحرانوں میں

باقی صفحہ ۳۰ پر

ایس۔کے۔سنگھ

اقوام متحدہ۔ ایشیا میں مناسب سرگرمی کی ضرورت

دوسری جنگ عظیم ۵۰ سال پہلے ختم ہوگئی تھی۔ اقوام متحدہ کا منشور اسی وقت وجود میں آیا تھا۔ یہ ایک کثیر ملکی معاہدہ تھا جس میں تمام ملکوں کی مساوات کے اصول پر زور دیا گیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس اصول کی اس بات کے ذریعے نفی بھی تھی کہ ۵ بڑے طاقتوں کو سلامتی کونسل میں مستقل طریقے پر ویٹو کے اختیارات دے دیے گئے تھے۔

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ۵ مستقل ارکان وہ تھے جن کے پاس نیوکلیر ہتھیاروں کی اجارہ داری تھی۔ اس کے علاوہ ان ملکوں کے پاس جامع انداز کے میزائلوں کا نظام بھی تھا۔ ایٹمی ہتھیاروں کے عدم توسیع کے معاہدے کی غیر محدود توسیع نیز عام اور مکمل ترکِ اسلحہ کے مطالبہ سے صرفِ نظر کا معاملہ ہمیشہ کے لیے تعطل میں ڈال دیا گیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ معاہدہ ایسا ہے جس سے امتیاز برتنے کی بو آتی ہے اور اس تعطل کے نتیجے میں نیوکلیر اور میزائلوں کے سلسلے میں صورتِ حال جوں کی توں بنی رہے گی۔ یہ واضح نہیں کہ اس کا اثر آنے والے دنوں میں بجلی کی تیاری اور نظاموں پر کیا پڑے گا، خاص کر ترقی پذیر ملکوں میں۔ بڑی اقتصادی قوتوں نے جس طرح تیل کی عالمی قیمتوں کو بڑھنے سے روکا ہے، اس کی وجہ سے اس کی پیچیدگی اور بھی زیادہ ہے۔ اس سے ان ملکوں کی طاقت متاثر ہوئی ہے اور ان کی اقتصادیات پر برا اثر پڑا ہے اجو تیل پیدا کرتے ہیں۔

اب وہ عام تاثر کہ شمال۔ شمال اور جنوب۔ جنوب میں اقتصادی اشتراکِ عمل بڑھایا جا سکے، تذکرہ میں نہیں آتا۔ نئے عالمی اقتصادی نظام کی تعمیر کا خواب چکنا چور ہو گیا ہے۔

گزشتہ تقریباً دس برسوں میں چند نئی بین ملکی انتظامی خامیاں سامنے آئی ہیں، انھیں دور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خامیاں بین ملکی بڑے مسائل کی شکل میں سامنے آئی ہیں مثلاً منشیات کی اسمگلنگ، سرحد پار سے دہشت گردی، نقلِ وطن، انسانی حقوق کی عالمی سطح پر خلاف ورزی، نسلی اور متعلق مسائل جن کا تعلق علاحدگی پسندانہ رجحانات سے ہے، عالمی سطح پر ماحولیاتی مسائل، ایڈز نیز تکنالوجی سے متعلق جرائم۔ بڑی طاقتیں بھی ان مسائل کو یکطرفہ طور پر حل کرنے میں کچھ نہیں کر سکتیں۔ اس سلسلے میں کوئی بھی بڑی طاقت کوئی حکمِ ناطق جاری نہیں کر سکتی اور نہ وہ ان مسائل کے حل میں موثر ثابت ہو سکتا ہے۔

اقوام متحدہ نہ تو دنیا کو ایٹم بم کے خطرے سے آزاد کرا پائی ہے اور نہ ہی کوئی اقتصادی مرکز بنا پائی ہے، جس سے کہ کوئی قابلِ ذکر نتیجہ برآمد ہو سکے۔

ایک طرف برٹن ووڈس اداروں اور دوسری طرف ڈمبارٹن اوکس نظریات میں فرق نے اقوام متحدہ اور اس کے اداروں کے لیے بین اقوامی اشتراکِ عمل کی سنجیدہ تعمیر میں نیز مضبوط قدم اٹھانے میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ اس اشتراکِ عمل کے بغیر مذکورہ بالا خامیوں پر قابو پانا تقریباً ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ مسائل ہیں جنھیں عالمی سطح پر باہمی اشتراکِ عمل سے حل کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ تو اور کوئی دوسری صورت ان کے حل کی نہیں ہے۔

آئیے اس بات کا جائزہ لیں کہ ایشیا میں ہمیں اقوام متحدہ کو کس نظر سے دیکھنا چاہیے۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے اور اقوام متحدہ کے آغاز کے ساتھ ہی ایشیائی ملکوں میں یورپی دور ختم ہو گیا۔ سرد جنگ کے خاتمے پر ایشیائی ملکوں میں یہ تصور جڑ پکڑ گیا کہ وہ یوروپی ملکوں کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے ہیں، یہی نہیں بلکہ ایشیائی ممالک تکنالوجی، صنعت، اقتصادی ترقی کے شعبوں میں روس اور امریکہ سے بھی ٹکر لے سکتے ہیں نیز یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ ایشیائی ملکوں کے اشتراکِ عمل کے بغیر ماحولیات، منشیات، ہتھیاروں پر کنٹرول، دہشت گردی اور نقلِ وطن وغیرہ کے مسائل حل نہیں کیے جا سکتے۔

یہاں ایک اور سوال اٹھتا ہے: اقوام متحدہ نے اپنے آغاز کے بعد ۵۰ برسوں میں ایشیائی ملکوں کی امداد اور ان کے مسائل کو سمجھنے میں کس حد تک خود کو اہل پایا ہے؟ اور اقوام متحدہ نے ایشیائی عوام کے مسائل پر کس حد تک یا کس قدر توجہ دی ہے؟

تاریخ کا عمل تاریخ داں کے تجزیے کے لیے رک نہیں جاتا۔ تاریخ کا عمل جاری وساری رہتا ہے۔ تاریخی وضاحتیں جو مورخین اپناتے ہیں وہ خواہ کتنی بھی منطقی ہوں، ایک طرفہ ہونے کا رجحان رکھتی ہیں۔ بعد کے واقعات بلاشبہ سابقہ واقعات کے سلسلے میں تاریخ دانوں کی تحسین کا موجب بنتے ہیں۔

ابھی اقوام متحدہ عہد طفولیت میں ہی تھی کہ کوریا کی جنگ شروع ہو گئی۔ اس سے دنیا پر یہ روشن ہوا کہ سودیت یونین اور چین ایک ہی نظریات نہیں رکھتے، صرف نام کے لیے ایک ہیں۔ ان کے ثقافتی، جغرافیائی اور قوم پرورانہ تصورات میں بہت زیادہ فرق ہے۔ دونوں ہی ملک اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ جنگی مقاصد کے تئیں بھی ان کے یکساں خیالات

نہیں ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دونوں ملک اپنے مخصوص ایجنڈے پر کاربند تھے۔ کسی کو اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ شمالی اور جنوبی کوریا کو اس بحران کے حل کے لیے خرچ کرنے سے کیسے روکا جائے۔ بلکہ ہر ایک ملک کے اپنے مقاصد تھے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ بڑی طاقتیں بھی اقوام متحدہ کے منشور پر مکمل عمل درآمد کو ضروری نہیں سمجھتی تھیں۔ جنرل اسمبلی کو اختیارات کے کچھ وہ حصے بھی منتقل کر دیے گئے جو بالعموم سلامتی کونسل کے پاس ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قیام امن کے لیے پہلی بار بڑے پیمانے پر اقوام متحدہ کی کارروائی کی۔ اس طرح ایک بڑی طاقت نے وسائل اور رہنمائی دونوں فراہم کیں۔

اقوام متحدہ کے نام پر امریکہ ہر کارروائی کرنے لگا۔ اس سلسلے میں سوویت یونین نے بڑے پیمانے پر آواز بلند کی۔ تاہم وہ امریکہ کی ان کارروائیوں سے زیادہ ناخوش نہیں تھا۔ بین اقوامی برادری ہندوستان کی طرف ایک بار پھر راغب ہوئی تاکہ اقوام متحدہ کی دیگر کارروائیوں کی طرح سے ہی اس میں بھی ہندوستان فوجی قیادت کرے۔ جنرل تھمیا نے ۴۴۳ افسر والے اور ۵۶۹۶ دیگر فوجی ارکان کے ساتھ یہ ذمہ داری سنبھالی۔

۵۴-۱۹۵۳ء کے ہند-چین بحران میں اقوام متحدہ کو کسی رول کی ادائیگی کی اجازت نہیں دی گئی۔ جنیوا معاہدے میں ہونے والی بات چیت میں بھی اس کو شریک نہیں کیا گیا، جس میں بین اقوامی کنٹرول کمیشن قائم کیا گیا نیز ہندوستان، پولینڈ اور کینیڈا کو اس کا ممبر بنایا گیا تاکہ یہ کمیشن ویتنام، کمبوڈیا اور لاؤس کے معاملات دیکھے۔ ان تمام معاملات میں اقوام متحدہ کو شامل نہیں کیا گیا۔ لبعد میں فرانس نے جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا اور امریکہ ویتنام کی جنگ میں پھنس گیا مگر اقوام متحدہ کو پھر بھی الگ رکھا گیا۔ البتہ صدر کینیڈی کی وفات کے بعد اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل یوتھانٹ نے جنگ بندی کے لیے سبھی فریقوں کو آمادہ ہونے کی اپیل کی اور سب سے بات چیت شروع کرنے کو کہا۔ امریکی صدر لنڈن جانسن نے یوتھانٹ کو ڈانٹ دیا۔ مگر بعد میں جانسن نے ہی یوتھانٹ کی مدد چاہی تاکہ یہ معاملہ طے ہو جائے۔ اس وقت تک یوتھانٹ نے اس مسئلے سے دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔

اقوام متحدہ ایشیائی ملکوں کے بہت سے معاملات کے حل میں قلد سے تسلی بخش کارروائی کر سکا۔ ۱۹۴۶ء میں سوویت یونین نے ایران کے آذر بائیجان صوبے کو بذریعہ طاقت ہتھیانا چاہا تو یہ بحران اقوام متحدہ کی مداخلت سے ٹھنڈا پڑ گیا۔ اکتوبر ۱۹۷۱ء میں چین نے اقوام متحدہ کے کاموں میں پھر سے شرکت شروع کی۔ سلامتی کونسل نے چین کے حقوق بحال کر دیے۔ اس سے قبل اس کے لیے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تحریک پیش ہوئی تھی۔

ہندوستان نے ۱۹۴۷ء میں کشمیر کا معاملہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں پیش کیا۔ اس وقت سے یہ معاملہ سلامتی کونسل میں چلا آرہا ہے۔ چھٹے دہے میں اقوام متحدہ نے بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کے حل کے لیے کوششیں کیں۔ اس سلسلے میں کچھ آسٹریلیائی شخصیتوں کی بھی مدد مدد لی گئی۔ مگر سابق نوآبادیاتی طاقت برطانیہ اور نئی سپر پاور امریکہ نے اس مسئلے کی بنیادی حقیقتوں کو نظرانداز کر دیا۔ اس وقت وہ پاکستان کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتے تھے کیوں کہ پاکستان سینٹو اور سیٹو میں بخوشی شریک ہو گیا تھا۔ اقوام متحدہ کو اس طرح غلط فیصلوں کی طرف مائل کر دیا گیا اور سلامتی کونسل کی بحث میں غیر حقیقت پسندانہ باتیں کہی گئیں۔ امریکہ اور برطانیہ کی شہ پر پاکستان نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں ہندوستان سے جنگ کی۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں البتہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں تلخ خانہ جنگی ہوئی اور بنگلہ دیش معرض وجود میں آیا۔

۱۹۷۷ء میں مغربی ایشیا میں اقوام متحدہ نے مجبور ہو کر سینائی میں اقوام متحدہ کی ہنگامی افواج کے مشن کو منسوخ کیا۔ یہ منسوخی اسرائیل عرب جنگ شروع ہونے سے ذرا پہلے عمل میں آئی۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۸ء تک اقوام متحدہ ایک بار پھر مفلوج ہو کر رہ گئی۔ اسرائیلی افواج بار بار لبنان کے علاقے میں داخل ہوتی رہیں۔ مجبور ہو کر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اقوام متحدہ کی عبوری فوج تیار کی، جو لبنان سے اسرائیلی افواج کی واپسی کے کام کا مشاہدہ کرتی رہی۔ اب بھی مشرق وسطیٰ میں امن کا جو عمل جاری ہے اس میں اقوام متحدہ کا رول برائے نام ہی ہے۔

۱۹۷۹ء سے ۱۹۹۲ء تک طویل عرصے تک چلنے والے افغانستان کے المناک بحران میں جب کہ سوویت یونین نے فوج بھیج کر افغانستان کے علاقے کی خلاف ورزیاں کیں اور پاکستانی انٹلی جینس سروسیز اور امریکہ نے اسلامی فنڈامینٹلسٹوں کے ارکان پر مشتمل گوریلا فورس تیار کی، وہاں بھی اقوام متحدہ کا رول صرف پناہ گزینوں کو نکالنا اور انھیں کھانا دینے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ بعد ازاں امریکی، روسی، پاکستانی اور افغانی سفارت کاروں کے لیے، جنھوں نے جنیوا میں ملاقاتیں کیں، بات چیت اور فوٹو کے مواقع کی حمایت کرنے تک ہی اقوام متحدہ کا رول رہا۔ ان بات چیت میں اقوام متحدہ نے مبہم رول ادا کیا۔ صورت حال کو پرامن بنانے کی غرض سے امن برقرار رکھنے والی فوج قائم کرنے کے لیے کوئی تحریک نہیں چلائی گئی۔ چناں چہ افغانستان میں خانہ جنگی اب بھی تباہی مچا رہی ہے۔ حالاں کہ روس کی افواج کو وہ علاقہ چھوڑے سات برس ہو چکے ہیں اور امریکی عملہ بھی پاکستان اور افغانستان چھوڑ چکا ہے۔ افغانستان کا بحران اور جنگ حقیقی ہیں لیکن اس بحران کو عالمی تشویشناکیوں کی فہرست میں نہیں رکھا گیا ہے۔ نہ ہی کوئی اس کو روزانہ ٹی وی پر دیکھتا ہے۔ افغانستان میں امن نہیں ہے مگر دنیا میں اس پر کوئی تشویش نہیں ہے۔

چین نے ۱۹۶۲ء میں ہندوستانی ہمالیائی علاقے پر حملہ کیا۔ ۱۹۷۹ء میں ویتنام سے اس کی زبردست جنگ ہوئی۔ نویں دہے کے آغاز میں چین سوویت سرحد پر ٹکراؤ ہوا مگر اقوام متحدہ خاموش رہا۔ کارروائی تو کجا، اس نے اس کا ذکر تک بھی نہیں کیا۔ عراق، ایران کے درمیان ۸ برس تک مسلسل جنگ رہی، اقوام متحدہ زیادہ تر دور ہی رہا۔

یہ سچ ہے کہ اقوام متحدہ کی صلاحیتیں اس بات پر منحصر ہیں کہ اس کے ممبروں کی خواہشات، توقعات اور پیش قدمیاں کیا ہیں، خاص کر اس کے زیادہ اہم ممبروں کی، پانچ مستقل ارکان کی اور دیگر عالمی اور علاقائی کھلاڑیوں کی۔ بہر حال وجوہات کچھ بھی ہوں لیکن اقوام متحدہ ایشیا میں کم سے کم سرگرم رہا ہے۔

عراق-کویت جنگ کے دوران، جسے دوسری خلیجی جنگ بھی کہا جاتا ہے، امریکہ نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو متحرک بنانے کے لیے بہت سی پیش قدمیاں کیں اور بہت جلد کارروائی کے لیے اسے ذریعہ بنایا تاکہ عراق کی کوششوں کی مخالفت کی جائے مگر اس کے پیچھے امریکی مفادات تھے اور امریکی صلاحیت

جس سے کہ وہ کارروائی کرے، اس کے ساتھ ہی کم سے کم دو مستقل ارکان سمیت متعدد غیر مستقل ملکوں کی عدم دلچسپی اور امریکی اقدامات کی مخالفت سے گریز بھی اس کارروائی کو آگے بڑھانے کا سبب بنتی گئی۔

اسی طرح سے اقتصادی اور سماجی معاملات میں بھی اقوام متحدہ کا رول ایشیا میں بہت سرگرم نہیں رہا ہے۔ ایشیائی ملکوں نے یونیسکو اور آئی ایل او وغیرہ سے مختلف بڑی طاقتوں کے وقتاً فوقتاً پیچھے ہٹ جانے کو پسند نہیں کیا۔ اس طرح پیچھے ہٹ جانے سے ان اداروں کے داخلی اور مالی معاملات متزلزل ہو گئے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ بہت برسوں تک برما نے اقوام متحدہ سے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ ۱۹۶۰ء کے دہے میں دو سال تک انڈونیشیا نے اقوام متحدہ کے کام کاج میں عملی شرکت سے گریز کیا۔

۱۹۵۰ء کے دہے کے وسط سے ۱۹۶۰ء کے دہے کے آخر تک ایشیا اور مشرق بعید کے ملکوں کے اقتصادی کمیشن نے ایشیا کو جوڑنے کے لیے ترقیاتی منصوبے بنائے، جو کافی اہم ہے۔ میکانگ ریلے ڈیولپمنٹ پلان، ایشین ہائی وے اسکیم، ایشین ریل روڈ سسٹم کی تکمیل وغیرہ سے ایشیائی ملکوں میں ایک نیا جوش پیدا ہوا لیکن بڑی طاقتوں نے، جو بین اقوامی سطح پر مالیات فراہم کرنے والی بڑی طاقتیں تھیں، ان پر عمل درآمد روک دیا کیوں کہ جب بھی وسائل کے موضوع پر بات چیت شروع ہوئی، وہ اس سے الگ رہیں۔ ایک طرح سے انھوں نے دنیا کو یہ تباد یا کہ ان اسکیموں کو بھول جاؤ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ انہے کو دوبارہ بھی زندہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کو ایشیا میں مجموعی بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کا حصہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اقتصادی و سماجی کمیشن برائے ایشیا اور پیسیفک کو ان موضوعات پر وسیع تر پس منظر میں غور کرنا ہے۔ ایشیائی ملکوں کو عرصہ سے یہ دیکھنے کی امید رہی ہے کہ اقوام متحدہ میں کچھ سرگرمی پیدا ہو اور وہ اپنے منشور میں مندرج اصولوں اور مقاصد پر کاربند ہو، جس سے ایشیا کا بھی بھلا ہو۔ جہاں تک ایشیائی ملکوں کے مفادت اور توقعات کا تعلق ہے، خواہ وہ امن، سلامتی یا ترک اسلحہ سے متعلق ہوں یا پھر اقتصادی اور سماجی ترقی سے متعلق ہوں، اقوام متحدہ کے فورموں میں ان کو کم ہی سامنے رکھا گیا ہے اور غیر ایشیائی عالمی طاقتوں نے گزشتہ ۵۰ برسوں میں ایشیائی ملکوں کے جذبات اور مفادات کے تئیں لاپرواہی اور عدم توجہی دکھائی ہے۔

اس پس منظر میں ہم اقوام متحدہ سے کیا توقعات وابستہ کر سکتے ہیں؟ بلاشبہ اقوام متحدہ کے تال میل سے اہیں چیلنجوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ اقوام متحدہ کے تال میل سے مراد یہی بنتی ہے کہ اقوام اور برادریوں کا ایسا عالمی سیاسی سماج، جس میں کچھ طاقتوں کو دوسروں کے مقابلے کلیدی رول ادا کرنا ہوتا ہے۔ ایشیائی ملکوں کے سامنے چیلنجوں کی اپنی ایک فہرست ہے، جسے کسی دوسری سطح پر ہم مقاصد کا اپنا منشور بھی کہہ سکتے ہیں:—

۱۔ کوآپریٹو امن و سلامتی کا چیلنج
۲۔ حقوق انسانی اور ذمہ داریوں کا چیلنج
۳۔ جمہوریت اور قانون کی برتری کا چیلنج
۴۔ پیداواریت اور مقابلہ جاتی صلاحیت کا چیلنج
۵۔ سماجی انصاف کے ساتھ زبردست اور پائیدار ترقی کا چیلنج
۶۔ سماجی اور نفسیاتی تبدیلی کا چیلنج

کیا اقوام متحدہ ہماری ان کوششوں میں معاون ہو سکتی ہے۔ اقوام متحدہ نے اس طرح کے معاملات میں افریقہ یا بحرالکاہل یا لاطینی امریکہ کے ملکوں میں اپنا کیا ریکارڈ چھوڑا ہے۔ آنے والی صدی کے پہلے ۲۵ برسوں میں ایشیائی ملکوں میں کس طرح کی ترقی کی امید کی جا سکتی ہے؟ ان معاملات میں اقوام متحدہ یا پھر عالمی برادری کیا رخ اپنا رہی ہے۔ یہ سب گہری سوچ والے مسائل ہیں جن کے جوابات بہت کم ہیں۔ کیا مہلک ہتھیاروں پر پابندی کا ہمارا خواب پورا ہوگا؟ کیا نوع انسانی عالم گیر پیمانے پر بغیر کسی فرق اور امتیاز کے ترک اسلحہ کا اصول لاگو کر سکے گی؟ کیا دنیا کچھ برسوں پہلے وضع کردہ عالم گیر بحری قوانین کو لاگو کرنے پر رضامند ہے؟ ایشیائی ملک جہاں ترقی کا عمل شروع ہو چکا ہے اور جو اب بیدار ملکوں میں شمار ہوتے ہیں، ان سوالات کے جوابات چاہتے ہیں۔ کیا اقوام متحدہ کے منشور پر نظر ثانی کے لیے رضاکارانہ اور حقیقت پسندانہ کوشش ہو سکے گی؟ جس سے کہ عالمی ماحولیات اور معیشت کے پہلوؤں اور نوع انسانی کے وسیع تر مفادات کو شامل کیا جا سکے۔ کیا اقوام متحدہ اس قدر وسیع النظر ہوگا کہ وہ اضافۂ آبادی، حقوق انسانی، پانی اور زمین کی فراہمی اور سیاسی انداز فکر کے وسیع تر پس منظر کو نیز بہت سے دیگر حقیقی مسائل کو اپنے دائرۂ کار میں سموئے گا کہ مستقبل میں نوع انسانی کو اس کا فائدہ پہنچے۔ بہت سے ممالک مثلاً ہندوستان اور برازیل کو اختیار اور اثر سے محروم رکھا جا سکتا ہے، جب کہ مسلمہ طاقتیں اس ادارے پر یوروپی ملکوں کا غلبہ بھی دیکھنا چاہتی ہیں تاکہ وہ سلامتی کونسل میں ویٹو کے اپنے اختیارات کا استعمال کر سکیں۔ ●

بقیہ: بچہ مزدوری۔ اسباب اور انسداد

رکھتے ہیں۔ لہٰذا بچہ مزدوری کو ختم کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایسے کنبوں کو ضروری اخراجات کے بقدر آمدنی کا انتظام کرا دیا جائے۔ یہ یقینی بنایا جائے کہ وہ اپنے گزارے کے لیے مناسب مواقع حاصل کر کے اپنا معیار زندگی بلند کر سکتے ہیں۔ ان کنبوں کو مطلوبہ معیار تک اٹھانے کے لیے وزارت دیہی فروغ مندرجہ ذیل فائدے فراہم کرنے میں ان کو فوقیت دینے پر راضی ہو گئی ہے۔

۱۔ جواہر روزگار یوجنا کے تحت ایسے کنبوں کے دو بالغ افراد کو ہر سال سو دن کا روزگار فراہم کرنا۔ اس امر کو یقینی بنانے کی ذمہ داری متعلقہ ضلع کے ڈی۔ ایم پر ہے۔

۲۔ مکانوں کے لیے جگہ اور تعمیری اخراجات کا انتظام کرنے میں درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں اور ضرورت مند بندھوا مزدوروں کے ساتھ بچہ مزدوروں کے کنبوں کو بھی اندرا آواس یوجنا کے تحت اولیت دی جائے گی۔

۳۔ بچہ مزدوری سے متعلق کنبوں کو مالی امداد دے کر انھیں روایتی پیشوں میں یا دیگر روزگار میں مناسب تربیت دے کر لگایا جائے گا تاکہ ان کی آمدنی میں ۵ ہزار سے ۷ ہزار روپیہ سالانہ اضافہ ہو جائے۔ علاوہ ازیں ان کے لیے خام مال اور پیداوار کی کھپت کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔

بھارت سرکار کے ذریعے چلائے گئے مذکورہ پروگراموں پر اگر متعلقہ حکام محنت اور ایمانداری کے ساتھ عمل پیرا ہوں تو ہندوستان سے بچہ مزدوری کی لعنت متوقع مدت میں ختم ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ملک کے باشعور عوام کو بھی اپنی ذمہ داری نبھانی ہوگی۔ ●

جمال فہمی

یونیسکو اور اس کی خدمات

"چوں کہ جنگیں انسانوں کے ذہنوں سے ہی شروع ہوتی ہیں اس لیے انسانوں کے ذہنوں میں ہی امن وسلامتی کا قائم کیا جانا بہت ضروری ہے۔"

اقوام متحدہ کی جس تنظیم کا دستور العمل اسی مرکزی خیال پر مبنی ہے اسے عرف عام میں (UNESCO) یونیسکو کہا جاتا ہے۔ یعنی اقوام متحدہ کی تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی تنظیم۔

۱۶ نومبر ۱۹۹۵ء کو جب جنرل کانفرنس اپنا ۲۸ واں اجلاس منعقد کرے گی تو اس تاریخی دن کو پچاس سال گزر چکے ہوں گے، جب لندن میں ۴۴ ملکوں کے نمائندوں نے یونیسکو کے آئین کے مسودے کو تیار کیا تھا۔

تاریخ کے آئینہ میں جھانک کر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ یونیسکو کا باقاعدہ قیام تو ۴ نومبر ۱۹۴۶ء کو عمل میں آیا تھا لیکن دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاریوں کے دوران جب ۲۶ ملکوں کے نمائندوں نے دنیا کو تہس نہس کر ڈالنے پر آمادہ قوتوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کا عہد کیا تھا تب ہی یونیسکو کی داغ بیل بھی پڑ چکی تھی۔

اقوام متحدہ چارٹر کی تیاری ۵۰ ملکوں کے نمائندوں کے ذریعہ بین اقوامی تنظیم کے یو۔ این۔ او۔ اجلاس میں کی گئی تھی۔ اس کی میٹنگ سان فرانسیسکو میں ۲۵ اپریل سے ۲۶ جون ۱۹۴۵ء تک کے دوران ہوئی۔ اقوام متحدہ چارٹر پر ۵۰ ملکوں کے نمائندوں کے ذریعہ ۲۶ جون ۱۹۴۵ء کو دستخط کیے گئے سرکاری طور پر تو اقوام متحدہ تنظیم معرض وجود میں ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو ہی آچکی تھی جب چارٹر کے مسودے پر چین، فرانس، سابق سوویت یونین، انگلینڈ اور امریکہ سمیت دیگر ملکوں کے نمائندوں نے باقاعدہ دستخط کر کے اس کی تصدیق کی تھی اسی لیے ہر سال ۲۴ اکتوبر اقوام متحدہ کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔

یونیسکو اقوام متحدہ کی ایک خصوصی اہمیت کی حامل تنظیم ہے جس نے دنیا بھر کے لوگوں کو تعلیم سائنس اور ثقافت کے ذریعے ایک دوسرے کے نزدیک لانے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔

۴ نومبر ۱۹۴۶ء کو عالم وجود میں آنے کے وقت اس کے ممبر ملکوں کی تعداد صرف ۲۰ تھی جو اکتوبر ۱۹۹۲ء تک بڑھ کر ۱۷۱ ہو چکی ہے۔ یونیسکو کا اولین مقصد تعلیم، سائنس، ثقافت اور مواصلات کے ذریعہ سے ملکوں کے درمیان تعاون کو فروغ دے کر دنیا میں امن وآشتی کے تئیں خدمات انجام دینا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے یونیسکو تعلیم کو فروغ دیتا اور رہنمائی کرتا ہے تاکہ ہر ملک کے باشندے خود اپنی ترقی اور خوشحالی کے لیے موثر ڈھنگ سے کام کر سکیں، سائنس وتکنالوجی کے اداروں، جن کے ذریعہ ہر ملک اپنے وسائل کا بہترین اور بھرپور استعمال کر سکتا ہے جس کے قیام میں بھی یونیسکو کی جانب سے مدد دی جاتی ہے۔ قومی ثقافتی، اقدار اور ثقافتی ورثہ کی بقا کو یقینی بنانا بھی یونیسکو کا اہم اور خصوصی مقصد ہے۔ یونیسکو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتا ہے کہ ممبر ممالک اپنی ثقافتی شناخت کے تنوع کو قربان کیے بغیر جدید تکنالوجی سے بھرپور فائدہ اٹھائیں معلومات کے آزادانہ تبادلے اور وسیع پیمانہ پر متوازن خبر رساں نظام اور مواصلاتی فروغ اور انسانی حقوق کے انصاف اور امن وسلامتی کے لیے وسائل کی صورت میں معاشرتی سائنس کو بڑھاوا دینا بھی یونیسکو کے ترجیحی مقاصد میں شامل ہے۔

ایک دوسرے کے طریقۂ زندگی اور اقدار وروایات سے ناواقفیت انسانی تاریخ میں لوگوں کے درمیان ایک دوسرے کے تئیں شکوک وشبہات اور عدم اعتماد کی بنیادی وجہ رہی ہے۔ یہی عدم اعتماد اور شبہات شدید اختلافات کا سبب رہے ہیں جن کی بدولت نوبت قتل وغارت گری اور جنگ وجدال تک پہنچتی رہی ہے۔ یونیسکو کے قیام کا مقصد دنیا بھر کے لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے تئیں اعتماد کی بحالی رہا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد یہ ضمیر انسانیت کی کال پر اس وقت عالم وجود میں لائی گئی جب بہت سے ممالک جنگ کی تباہی سے بری طرح متاثر تھے۔ اس وقت یونیسکو کا قلیل مدتی اور فوری مقصد اشد لازمی ضروریات کو پورا کر کے اور اسکالرز کے درمیان تباہ ہو جانے والے رشتوں کو از سر نو مستحکم کر کے جنگ زدہ دنیا کی مدد کرنا تھا مگر اب یونیسکو کا عملی میدان بہت وسیع ہو چکا ہے۔ اس کے فوری مقاصد قلیل مدتی سے طویل مدتی نوعیت کے ہو گئے ہیں یونیسکو نے تعلیم، سائنس وتکنالوجی معاشرتی سائنس، ثقافت اور ابلاغ عامہ کے ذریعہ دنیا بھر میں امن وسلامتی کو فروغ دینے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ تاکہ جنس، مذہب، نسل اور رنگ کے امتیاز کے بغیر حقوق انسانی کا تحفظ ممکن ہو سکے۔ عدل وانصاف کو یقینی بنایا جا سکے اور قانون کا راج نافذ ہو سکے۔

بھارت اور یونیسکو

بھارت یونیسکو کے بانی ممبروں میں سے ایک ہے۔ بھارت نے اقوام متحدہ نظام کے اس خصوصی ادارے

بلاک ۱۵۔ مکان نمبر ۸۲-۱-۸، ترلوک پوری، دہلی ۹۱-۱۱۰۰

میں نہایت سرگرم، اہم اور موثر رول ادا کیا ہے۔ یونیسکو کے بجٹ میں قابل قدر تعاون دینے کے علاوہ بھارت نے اپنے نامور ماہرین تعلیم، سائنس دانوں اور مختلف میدانوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین کو یونیسکو سکریٹریٹ کے لیے مہیا کرایا تاکہ وہ دنیا بھر کے لوگوں کی خدمت میں ہاتھ بٹا سکیں۔ یونیسکو کے ایگزیکٹیو بورڈ میں بھارت کے دو سابق صدر جمہوریہ اور ایک وزیراعظم کے علاوہ جو ممتاز شخصیات اس کے بین اقوامی پینلوں، کانفرنسوں کی ایڈوائزری کمیٹیوں اور بورڈوں میں ہمیشہ شامل رہی ہیں ان میں پروفیسرز، آرٹسٹ، صحافی، سائنس داں اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین شامل ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ بھارت یونیسکو کے ایگزیکیٹو بورڈ میں اس وقت سے شامل ہے جب سے ۱۹۴۶ء میں اس کا قیام عمل میں آیا ہے۔ بھارت آج بھی ایگزیکیٹو بورڈ کا ممبر ہے۔ ایگزیکیٹو بورڈ کے کل ممبروں کی تعداد ۵۱ ہے۔

بھارت ترقی پذیر ملکوں میں وہ پہلا ملک ہے جسے یونیسکو کی جنرل کانفرنس کے اجلاس کی میزبانی کرنے کا شرف حاصل ہوا اور جنرل کانفرنس کے نویں اجلاس کے لیے جو ۱۹۵۶ء میں منعقد ہوا تھا۔ دہلی میں پروقار اور عظیم وگیان بھون خصوصی طور پر تعمیر کرایا گیا تھا۔ اس جنرل کانفرنس کے بعد تو بھارت نے یونیسکو کی متعدد کانفرنسوں، میٹنگز، سمپوزیموں، سمیناروں، ورکشاپس اور تربیتی کورسز و کیمپوں کی میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ ایشائی ترقی کے لیے سائنس و ٹکنالوجی کی اہمیت پر یونیسکو کی سب سے پہلی کانفرنس نئی دہلی میں ۱۹۷۰ء میں ہوئی تھی۔ یونیسکو اپنے تمام اہم ترقیاتی پروجیکٹوں اور پروگراموں میں تو بھارت سرکار کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام یو۔ این ڈی۔ پی کے مالی تعاون پروگراموں کے نفاذ میں بھی بھرپور امداد فراہم کرتی ہے۔ یونیسکو بھارت کی ہمہ جہت پسماندگی کو دور کر کے اس کے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ترقی و خوشحالی کی لہر دوڑانے میں کتنی دلچسپی لیتی ہے اس بات کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ یونیسکو نے دہلی میں اپنا ایک نمائندہ دفتر تو قائم کر ہی رکھا ہے اس کے علاوہ جنوبی و وسطی ایشیا میں سائنس و ٹکنالوجی کی اس کی تمام تر مہم بھی دہلی سے ہی چلائی جاتی ہیں۔ دہلی میں اس مہم کو چلانے کے لیے علاقائی دفتر قائم کیا گیا ہے، جو بھارت کے علاوہ پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، بھوٹان، ایران، نیپال، سری لنکا، برما (اب میانمار) مالدیپ اور منگولیا میں یونیسکو کے ترقیاتی پروگراموں کو نافذ کرتا ہے اور ان کی نگرانی کرتا ہے۔

بھارت میں بے شمار سرکاری نیم سرکاری اور رضاکار و خود مختار سماجی و فلاحی ادارے یونیسکو کی مالی، اخلاقی اور دیگر اقسام کی مدد و تعاون سے چل رہے ہیں۔ یونیسکو کے جنوب و وسطی ایشیا کے لیے سائنس و تکنالوجی کے علاقائی دفتر کی جانب سے روڑکی کے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہائیڈرولوجی، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (نئی دہلی) پوسٹ گریجویٹ، ہائیڈرولوجیکل ایجوکیشن اینڈ ریسرچ۔ روڑکی (یوپی) پوسٹ گریجویٹ انجینئرنگ ایجوکیشن اینڈ ریسرچ۔ بڑودا پوسٹ گریجویٹ انجینئرنگ ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (کوئمبٹور) دہلی یونیورسٹی کے شعبہ ایسٹروفزکس، پونا کے واٹر اینڈ پاور ریسرچ سینٹر، لکھنؤ کی قومی ریسرچ لیبارٹری برائے تحفظ ثقافتی املاک جیسے متعدد اداروں کو ہر قسم کی مدد دی جاتی ہے۔ یہ مدد مختلف ترقیاتی شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین کی خدمات کی شکل میں ہوتی ہے۔ گرانٹ کی شکل میں بھی ہوتی ہے۔ بسا اوقات ہونہار طلبا کو فیلوشپ کی فراہمی، انھیں غیر ممالک میں اپنے صرفہ پر اعلا تعلیم کے حصول کے لیے بھیجنے کی شکل میں بھی ہوتی ہے۔ دہلی میں یونیسکو کے علاقائی دفتر نے ۱۹۸۵ء میں ہونہار نوجوان سائنس دانوں کے لیے ایوارڈ اسکیم تیار کی، جس کے تحت بھارت کے اب تک سب سے زائد یعنی ۳۴ نوجوان سائنس دانوں کو ۵۰۰ امریکی ڈالر پر مبنی گرانٹ دی جاچکی ہے۔

یونیسکو تعلیم کے فروغ کو اپنے پروگراموں میں سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ تعلیمی پروگرام کے تحت یونیسکو کے تین اہم مقاصد ہیں۔ سب کے لیے بیسک ایجوکیشن۔ تعلیم برائے ۲۱ ویں صدی اور تعلیمی پیش قدمی کے لیے ایکشن، سب کے لیے بنیادی تعلیم یعنی (BASIC EDUCATION FOR ALL) کا نشانہ ۱۹۹۰ء میں تھائی لینڈ کے شہر جومتین میں منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس میں مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ہر ممبر ملک کو اپنی ثقافت، تہذیب، روایات واقدار کی روشنی میں بنیادی تعلیم کے تصور کو عملی شکل دینی ہوگی۔ یونیسکو کی جانب سے ممبر ملکوں کو براہ راست مدد دے کر تعلیم عام کرنے اور روزگار کے حصول میں معاون تعلیم کو فروغ دینے کا کام سب سے زیادہ اہم طریقہ سے کیا جاتا ہے۔ یونیسکو تعلیم کے تحت ہی اساتذہ کی تربیت، لڑکیوں اور خواتین کے لیے خصوصی تعلیم، تعلیم برائے امن اور بین اقوامی مفاہمت، ماحولیاتی تعلیم، ایڈز جیسی مہلک بیماری کی روک تھام کے لیے تعلیم، صفائی ستھرائی اور صحت کے لیے تعلیم، سائنسی و تکنیکی تعلیم کے شعبوں کو کور کرتا ہے۔

بین یونیورسٹی تعاون کا ایک پروجیکٹ ترتیب دیا گیا ہے جس کا مقصد ترقی پذیر ملکوں میں اعلا تعلیم کو فروغ دینا ہے۔ اس کے علاوہ اس پروجیکٹ کے تحت دنیا بھر کی یونیورسٹیوں اور سائنسی تعلیم کے اداروں کے درمیان رابطہ مفاہمت اور تعاون کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ یونیسکو تعلیم کے مختلف شعبوں اور جزئیات سے متعلق رسائل، جریدے اور دیگر مواد شائع کرتا ہے۔

یونیسکو ثقافتی ورثہ کے تحفظ کو یقینی بنانے میں بھی پیش پیش رہتا ہے۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں اور ثقافتوں کو بچانے میں یونیسکو نے اہم رول ادا کیا ہے ان میں بالائی مصر کے قدیم مندروں کا تحفظ اور انڈونیشیا کے ایک ہزار سال قدیم بودھ مندر کی تعمیر نو اہم ہیں۔ اس وقت یمن میں تاریخی شہر ثنا کے تحفظ کی مہم چلائی جارہی ہے۔ پاکستان کے موہن جوداڑو جسے دنیا کا قدیم ترین شہر قرار دیا جاتا ہے اس کو محفوظ رکھنے کے لیے خصوصی مہم اور پروگرام چلائے جارہے ہیں۔

یونیسکو کا انتظام

یونیسکو کا انتظام والفرام چلانے کے لیے ممبر ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل جنرل کانفرنس ہے، جو یونیسکو کی پالیسیوں، پروگراموں اور بجٹ کو طے کرنے کے لیے ہر دوسرے برس ایک اجلاس منعقد کرتی ہے۔ جنرل کانفرنس کے ذریعہ منتخب ۵۱ رکنی ایگزیکیٹو بورڈ ہے جس کی سال میں کم از کم تین میٹنگ ہوتی ہیں۔ یہ جنرل کانفرنس کے ذریعہ منظور اور تجویز کردہ پروگراموں کے نفاذ اور ان کی نگرانی کا کام کرتا ہے۔ یونیسکو کا اپنا ایک سکریٹریٹ ہے جس میں ایگزیکیٹو بورڈ کے ذریعہ نامزد اور جنرل کانفرنس کے ذریعہ منظور شدہ ڈائرکٹر جنرل ہوتا ہے۔ ڈائرکٹر جنرل ہی سکریٹریٹ کے دیگر اسٹاف کا تقرر اور نامزدگی کرتا ہے مگر اسے جنرل کانفرنس

باقی صفحہ ۳۵ پر

محمد قمر الہدیٰ

بچوں کی شخصیت کی تعمیر میں خاندان کا کردار

ماہرین نفسیات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پیدائشی طور پر نہ کوئی بچہ اچھا ہوتا ہے نہ برا، نہ نیک خو ہوتا ہے نہ شریر النفس، نہ ہمدرد ہوتا ہے نہ ظالم بلکہ پیدائش کے وقت صرف چند جبلتیں اور اضطراری کیفیات و توانائی کی محدود صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ صلاحیت کسی میں زیادہ ہوتی ہے اور کسی میں کم۔ صلاحیت کو اس کے پیمانے کے مطابق اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کی شخصیت کی نشو و نما کے لیے وہ کون سے ذرائع ہیں جن کے ذریعہ بچوں کی تربیت کی جاتی ہے؟ چوں کہ بچہ کسی خلا میں پرورش نہیں پاتا بلکہ وہ سماج میں رہ کر ہی نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ اس لیے سماج میں بچوں کی بالیدگی و روئیدگی کے لیے مختلف ذرائع ہیں۔ یہاں مضمون کے مشمولات کو طوالت کی گراں باری سے محفوظ رکھنے کے لیے اس دائرہ بحث کی حد بندی یوں کر سکتے ہیں (۱) گھر یعنی خاندان (۲) معاشرہ اور (۳) اسکول یا مدرسہ۔ ان میں سب سے پہلے بچہ کا سابقہ جس سے پڑتا ہے وہ اس کا گھر یعنی خاندان ہے اور میری اس بحث کا ما حصل اس کے صرف ایک حصے بلفظ دیگر خاندان تک ہی محدود ہے۔ قبل اس کے کہ خاندان کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی جائے بہتر ہوگا کہ اس کی وضاحت کر دی جائے کہ شخصیت سے میری مراد کیا ہے؟ نفسیات کی اس اصطلاح "شخصیت" کا معاملہ بہت نازک ہے اور جس کی تشریح دقت طلب بھی، کیوں کہ صوفیوں کے یہاں اس کا مفہوم کچھ اور ہے، سیاسی معنوں میں شخصیت سے کچھ اور مراد ہوتا ہے اور اخلاقی معنوں میں کچھ اور۔ ان سب سے قطع نظر ہم شخصیت کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ :

"شخصیت سے مراد مکمل انسان ہے، جس میں اس کے موروثی رجحانات اور صلاحیتیں اس کے تمام اکتسابات ان عوامل کے مخصوص برتاؤ کے نمونوں میں امتزاج، نیز اس کے آئیڈیل اقدار اور توقعات سب شریک ہیں۔"

اس طرح شخصیت کی لپیٹ میں جسمانی و ذہنی نشو و نما کے علاوہ، جذبات، محرکات، اکتساب، حافظہ، قوت فکر، مشاہدہ، جذبۂ ہمدردی، خود اعتمادی، ذہانت، شوق و تجسس، کھرے کھوٹے کی پرکھ اور جمالیاتی حس وغیرہ سب آ جاتے ہیں۔

بچے کی شخصیت اور کردار سازی کی نشو و نما اور تعمیر میں خاندان کا اہم کردار ہوتا ہے۔ کیوں کہ بچے کی اولین درسگاہ گھر کی زندگی اور خاندان کے افراد ہی ہوتے ہیں پہلے ماں کی گود میں اور پھر اس کے بعد گھر والوں کی شفقت و محبت میں بچہ وہ ابتدائی حرکات و سکنات اور مشاغل سیکھتا ہے جو زندگی کو قائم رکھنے کے لیے لازمی ہیں۔ بچہ بچپن میں ماں باپ اور گھر کے دوسرے لوگوں کی بہت سی باتیں سیکھتا اور نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو بعد میں اس کی شخصیت کا جزو بن جاتی ہیں۔ کچھ ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ پانچ چھ سال کی عمر تک بچہ جو باتیں سیکھ لیتا ہے وہ بعد میں حاصل کی ہوئی باتوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کل اس زمانے کی تعلیم و تربیت پر بہت زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے۔ چوں کہ بچہ غیر معمولی طور پر حساس ہوتا ہے اور اس عمر میں جس قسم کے تجربے اور کیفیت سے دوچار ہوتا ہے اس کا اثر اس کی آئندہ زندگی پر ایک انمٹ نقش کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی عمر میں بچہ مجبوری، مخالفت، ہمدردی، خود اعتمادی اور جذبۂ محبت وغیرہ سے بھی روشناس ہوتا ہے یہی نہیں بلکہ بچوں کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت بھی زیادہ تر گھر کے افراد کے ذریعہ اسی عمر میں پروان چڑھتی ہے۔ یہاں وہ سب سے پہلے یہ محسوس کرتا ہے کہ کس طرح متعدد افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ باہمی احتیاج اور امداد کا یہ احساس ساری اخلاقی اور تمدنی تربیت کی بنیاد پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ امر کہ خاندان کا اثر بچے کی طبیعت اور خیالات پر خوش گوار ہوگا یا نہیں؟ کچھ تو بچہ کو وراثت میں ملی ہوئی توانائی اور اضطراری افعال پر مشروط و موقوف ہوتا ہے تو کچھ خاندان کی پرانی روایات، اصول اور بزرگوں کے طرز عمل پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر گھر کے محدود ماحول میں ایسے مواقع موجود ہیں جن سے بچے استفادہ کر کے اپنی شخصیت کی تشکیل و تکمیل اور اپنی جبلتوں کا اظہار کر سکیں تو اس کا اثر بچوں کی زندگی پر خوش آئند ہوگا۔ برعکس اس کے اگر خاندانی روایات تنگ نظری پیدا کر کے بچوں کے مشاغل اور دلچسپیوں کا میدان مقید و محدود کر دیتی ہیں تو خاندان کی اس تنگ نظری اور والدین کی سخت گیر طبیعت کے دباؤ سے بچوں کی شخصیت ابھرنے نہیں پاتی اور اس کا مجموعی اثر بچوں کی شخصیت پر کس طرح پڑتا ہے اس کا اندازہ "کافکا" کے ذریعے لکھے گئے اپنے والد کو ایک طویل خط کے ان چند اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے۔

"آپ میری مدد کرنے یا ہمت بندھانے کے بجائے مجھے احساس کمتری کا شکار کر دیتے اور میں مایوس و مغموم اپنے

---

۲۳۷ ستلج ہوسٹل جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی ۶۷

کرے میں چلا جاتا۔ میری ہمت، میرا حوصلہ، میرا جذبہ اور میری قوتِ ارادی آپ کے جلال کے سامنے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے۔"

• مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے سامنے تین دنیائیں ہوں (۱) پہلی دنیا میری اپنی تھی جس میں میری حیثیت غلام کی تھی (۲) دوسری دنیا آپ کی تھی جہاں آپ ان تمام اصولوں کو توڑتے رہتے تھے جن پر مجھے عمل کرنے کی تلقین کرتے تھے اور (۳) تیسری دنیا باقی لوگوں کی تھی جہاں وہ آزادی و خود مختاری کی زندگی گزارتے تھے ۔۔۔۔ میں عجیب تضاد کا شکار رہتا۔ اگر میں آپ کا کہا مانتا تو غلام محسوس کرتا اور اگر نہ مانتا تو ناخلف اولاد سمجھا جاتا۔ میرے لیے فرار اور رہائی کا کوئی راستہ نہ تھا۔

• آپ کے اس رویے کا میری ذات کو ایک نقصان یہ ہوا کہ میں دوسرے لوگوں سے بات چیت کرنے کے قابل نہ رہا۔ مجھ میں خود اعتمادی کا فقدان ہو گیا کہ میں اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار کے قابل نہ رہا اور محفلوں میں خاموش رہنے لگا۔ چوں کہ میں آپ کی کسی رائے سے اختلاف نہ کر سکتا تھا اس لیے میں اپنی رائے کا اظہار بھی نہ کر پاتا تھا۔ میں اندر ہی اندر کڑھتا رہتا اور گفتگو میں یا تو تتلاتا یا خاموش رہتا اور میری یہ کمزوری آج بھی میری شخصیت کا حصہ ہے۔ میں جذباتی طور پر مفلوج ہو چکا ہوں۔ اگر میں شروع ہی سے آپ کی رائے سے اختلاف کا حوصلہ رکھتا اور اپنے جذبات کا اظہار کرتا تو شاید آج میری نفسیاتی حالت اتنی دگرگوں نہ ہوتی۔۔۔ اب میں اپنی نگاہوں میں بھی ناکام ہوں اور آپ بھی مجھ پر نادم ہیں۔ آپ کو شاید کبھی یہ اندازہ نہیں ہوا کہ میرے احساسِ کمتری کا آپ کے جابرانہ اور حاکمانہ رویے سے کتنا قریبی تعلق ہے۔"

(صفحہ ۳۶۔۳۵۔۳۴ بحوالہ سوغات، مارچ ۱۹۹۵ء، کافکا مترجم خالد سہیل)

• آپ کی تربیت کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں آپ سے دور بہت دور چلا جانا چاہتا تھا اور اس کام سے جذباتی بُعد رکھنا چاہتا تھا جو کسی بھی صورت میں آپ سے مشابہت رکھتا ہو۔ اس لیے میں نے زندگی کی ان تمام پہلوؤں سے کنارہ کشی اختیار کر لی جو آپ کو پسند تھے۔" (صفحہ ۳۸ بحوالہ مذکور)

• بطور ادیب میں اس کینچوے کی طرح تھا جس کے جسم پر کسی کا جوتا پڑے تو وہ دو حصوں میں بٹ جائے ایک حصہ جوتے کے نیچے رہ جائے اور دوسرا حصہ آگے بڑھ جائے۔ میں ادیب کے طور پر کینچوے کا دوسرا حصہ تھا۔ جو آپ کے اثرات سے آزاد ہو گیا تھا اور ایک حد تک خود مختار ہو گیا تھا۔ آپ کی میری تخلیقات سے ناپسندیدگی مجھے پسند آئی کیوں کہ اس طرح میں ادیب کے طور پر آپ کے اثرات سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ جب بھی میں نے آپ کو اپنی نئی کتاب پیش کی آپ نے بڑے بے دلی سے کہا۔ "اسے میری میز پر رکھ دو" لیکن میں خوش ہوتا کہ آپ کو میری کتاب پڑھنے کا نہ تو وقت تھا اور نہ ہی دلچسپی۔ میں یہ صورتِ حال دیکھ کر اپنے آپ سے کہتا "اب تم آزاد ہو" میں جانتا تھا کہ وہ آزادی کا احساس خود فریبی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ کیوں کہ میری تمام تخلیقات کا مقصد اور منتہٰی آپ کے اثرات سے آزادی حاصل کرنا تھا، جو آزادی میں جذباتی اور خاندانی طور پر حاصل نہ کر سکا تھا وہ میں تخلیقی اور ادبی طور پر حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس میں بھی پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ آپ کے اثرات سے آزاد ہونے کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔"

(صفحہ ۴۰۔ حوالہ مذکور)

مذکورہ اقتباس سے اس حقیقت کی بھی وضاحت و صراحت ہو رہی ہے کہ کسی ادیب و فنکار کی تخلیقات کا جائزہ لیتے وقت ادیب کے ماحول اور نفسیات کو بھی ملحوظِ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ اس کے بغیر اس کے فن پارے کی صحیح قدر و قیمت کا تعین نہیں کیا جا سکتا اور "ایمیل" میں پیش کردہ روسو کے اس خیال کی بھی توثیق ہو رہی ہے کہ "جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو آزاد ہوتا ہے، لیکن سماج اور معاشرہ اس کو غلام بنا دیتا ہے۔" کافکا کو شادی کے سلسلے میں جس ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کا اظہار ان لفظوں میں کرتا ہے:

" مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میری زندگی کی ناکامیوں میں وہ سب سے بڑی ناکامی ہے مجھ میں اور میری شادی میں میری کمزوری، خود اعتمادی کا فقدان اور احساسِ گناہ جیسے وہ سبھی عوامل حائل ہیں جو آپ کی تربیت کا ماحصل ہے ۔۔۔۔ کسی شخص کا شادی کرنا، بچے پیدا کرنا، بیوی سے اچھا سلوک کرنا اور بچوں کی نگہداشت کرنا اس کی بلوغت اور کامیابی کی دلیل ہے ۔۔۔۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میں بچپن اور جوانی میں ان ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ انسان یہ باتیں اپنے والدین اور خاندان کے بزرگوں کو دیکھ کر سیکھتا ہے، لیکن میں جس ماحول میں پلا بڑھا اس نے مجھے اس قابل بنایا ہی نہیں کہ میں ایک صحت مند اور بالغ زندگی گزار سکتا اور خاندانی ذمہ داریوں کو نبھا سکتا۔ میں ہمیشہ احساسِ گناہ اور عدم تحفظ کے احساسات تلے اتنا دبا رہا کہ زندگی میں کوئی کام بھی خوش اسلوبی سے نہ کر سکا۔" (صفحہ ۴۱۔ حوالہ مذکور)

یہ تو معاملہ "کافکا" کا ہے جس کا ماحول، معاشرہ اور خاندانی ڈھانچہ ہمارے ماحول، معاشرے اور خاندانی ڈھانچے سے قدرے مختلف اور یہاں سے بہت دور یورپ کا ہے۔ خود ہمارے یہاں اس طرح کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ یہاں میں صرف دو مصنفین کی مثالوں پر ہی اکتفا کروں گا۔ پہلی مثال جوش ملیح آبادی کی خود نوشت "یادوں کی برات" سے ماخوذ ہے اور دوسری گیان سنگھ شاطر کے سوانحی ناول "گیان سنگھ شاطر" سے اخذ کی گئی ہے۔ جوش نے اپنی "یادوں کی برات" میں اپنے والد کی سخت گیر طبیعت کا ذکر مختلف مقامات پر مختلف انداز میں کیا ہے۔ جوش کے ساتھ ان کے والد کا جو رویہ اور برتاؤ تھا اور انھوں نے جوش

کی جس انداز میں تربیت کی تھی اس کا اثر ان کی شخصیت پر کیا پڑا ان ہی کے لفظوں میں ملاحظہ ہوں:

"میں اپنے باپ سے بے حد ڈرتا تھا اور اس قدر کہ جب ان کے سامنے جاتا تھا تو میری چال بدل جایا کرتی تھی۔"

(صفحہ ۳۲۔ یادوں کی برات)

دوسری جگہ اپنے مخصوص انداز میں رقم طراز ہیں:

"میرے باپ نے مجھ کو اس بے پایاں احتیاط کے ساتھ پروان چڑھایا تھا کہ آج کل اس احتیاط کے ساتھ لڑکیوں کی بھی پرورش نہیں کی جاتی ہے اور اسی بنا پر مجھ میں کنواری لڑکیوں کی سی جھجک پیدا ہو گئی تھی اور کسی مردانہ جرأت کا تو ذکر ہی کیا مجھ میں اس قدر شرمیلا پن پیدا ہو گیا تھا کہ جب میں اپنے باپ کی بھری محفل یا کسی مشاعرے میں جاتا تو دل دھڑکنے اور پنڈلیاں کانپنے لگتی تھیں اور ، گوری۔ دھیرے چلو۔ گگریا چھلک نہ جائے کا عالم طاری ہو جایا کرتا تھا۔"

(صفحہ ۶۲۷۔ یادوں کی برات۔ جوش ملیح آبادی)

گیان سنگھ شاطر نے اپنے سوانحی ناول میں بھائیا جی کے مزاج اور گھر میں ان کے برتاؤ اور خود اپنے ساتھ برتے جانے والے رویے کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے:

"میرے بھائیا جی بری قسم کے لڑاکے تھے اور بات بات پر پھاڑ کھانے کو دوڑتے، وہ سیدھی سادھی بات بھی کرتے تو لتاڑنے لگتے۔ ان کے کڑوے بول گھر میں ایسے بکھرے نظر آتے جیسے تازہ قتل کے بعد خون کے دھبے۔ ان کی موجودگی میں گھر میں بولتے رن کا سماں ہوتا تھا اور ہر شے پر موت کا سایہ منڈلاتا دکھائی دیتا تھا۔۔۔ میرے بھائیا جی نے مجھے قصور بے قصور اس بے دردی سے پیٹا ہے کہ اس کی یاد سے بدن کپکپانے لگتا ہے۔ کہتے ہیں کہ مہارانا سنگرام سنگھ کے جسم پر جنگی زخموں کے ۸۰ نشان تھے۔ میرے جسم پر ۸۰ نہ سہی لاٹھیوں اور درانتیوں کے آٹھ نشان ضرور موجود ہیں۔ سر پر، ماتھے پر، انگلیوں پر، پنڈلیوں پر، ٹخنوں پر، داغ دیکھنے کو سطحی اور معمولی ہیں لیکن ان کی گہرائی خطرناک گھاٹیوں کی طرح ناقابل پیمائش ہے۔"

"میرے بھائیا جی مجھے بے ضرورت پٹنے کی کی طرح پیٹتے۔ میں وار بچانے کی کوشش کرتا تو ان کا ہاتھ پورا نہ پڑتا۔ اس صورت میں ان کا لپکنا، جھپٹنا بڑھ جاتا۔ میں مار کی تاب نہ لا کر بھاگ کھڑا ہوتا وہ میرا پیچھا کرتے راستوں سے روڑے اور کھیتوں سے ڈھیلے اٹھا کر مجھے مارتے۔ میری کسمپرسی سارا زمانہ دیکھتا۔ لیکن کوئی بیچ بچاؤ نہ کرتا، میرے گرنے اور ادھ موا ہونے تک ان کا وبال ٹھنڈا نہ ہوتا۔ وہ اپنی بھڑاس نکال کر چلتے بنتے۔ لیکن میں مقام حادثہ پر دکھوں کی گٹھری کی طرح پڑا رہتا۔ میں اپنے آپ سے عاجز سینے میں سر چھپائے روتا، روتا اور روتا۔ میرے آنسو رک جاتے لیکن ان کا سیلاب رگوں میں ٹھاٹھیں مارتا رہتا۔"

(صفحہ ۴۰۔ بحوالہ گیان سنگھ شاطر)

"۔۔۔ میرے بھائیا جی! لاڈ پیار تو دور کی بات ہے، وہ نرم نگاہی کے لمس ہی سے بیگانہ تھے۔

۔۔۔ ان کے جبر و ستم کے آگے میری ماں کی احتجاج سے خاموش دست برداری میرے جنم کے گناہوں کا بوجھ تھی جس نے مجھے دور اندر تک کچل رکھا تھا۔ بھائیا جی کی آہٹ پا کر میں اندھیرے گوشے میں چھپ جاتا۔ اگر سامنا ہو ہی جاتا تو میں خوف سے کانپتا ہوا اس شے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا جس کے پاس کھڑا ہوتا میں چھپ نہ سکتا تو آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتا اور خود کو محفوظ سمجھتا۔ میرا یہ عمل اندھیرے میں رہنے والے کیڑے کا سا ہوتا جو روشنی دیکھنے سے اندھا ہو جاتا ہے۔ کئی بار یوں بھی ہوا کہ میں کانپتا کانپتا پیروں میں دھنس گیا جیسے پانی میں ریت۔" (صفحہ ۱۴۔ حوالہ مذکور)

مذکورہ بالا تینوں مصنفین کے ان چند طویل اقتباسات سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی خاندان یا گھر میں بچوں کے ساتھ اس طرح کا جابرانہ، ظالمانہ، تحکمانہ رویہ اور ناروا سلوک برتا جائے گا تو بچوں کی ذہنی اپج، قوت ارادی اور خود اعتمادی جیسے جذبات و احساسات پارہ پارہ ہو کر رہ جائیں گے۔ نتیجتاً بچہ بری طرح احساس کمتری کا شکار ہو جائے گا۔ بعض دفعہ یہ بھی دیکھنے اور سننے کو ملتا ہے کہ اس طرح کے بچوں کو اس کی کامیابی بھی مایوسی اور ناامیدی کی اتھاہ گہرائیوں میں پہنچا دیتی اور بچے کے لیے اس کی یہ کامیابی سوہان روح بن کر اس کی ذہنی پریشانیوں کو دور کرنے کے بجائے اتنی زیادہ بڑھا دیتی ہے کہ وہ سماج کا ذمہ دار شہری بننے کے بجائے عضو معطل بن کر رہ جاتا ہے۔

آج جب کہ پوری دنیا کے خاندانی حالات اور نظام میں کافی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ ماں باپ اور خاندان کے دوسرے افراد اپنے بچوں کی طرف توجہ دینے سے قاصر ہیں۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ آج امریکہ میں ایک ماں باپ ۲۴ گھنٹے میں اپنے بچوں کو صرف ۷ منٹ وقت دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں بچوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی، خاندان کی/ معاشرے کی اور ملک و قوم کی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دے سکیں گے بڑا مشکل اور دشوار کن مرحلہ ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بچوں پر مناسب وقت صرف کیا جائے اور ان کی تعلیم و تربیت اس ڈھنگ سے کی جائے کہ ان کی مکمل شخصیت پروان چڑھ سکے، اگر بچوں کی تربیت کی بنیاد کمزور ہو گی اور اس پر جو بھی عمارت تیار ہو گی وہ کسی طرح بھی مستحکم، مضبوط اور پائدار نہیں ہو سکتی۔ بقول شاعر ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

نفسیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ بچوں کی شخصیت اور کردار سازی میں خاندان کی زندگی کے دو اثرات واضح طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ بچے کو تمدنی زندگی کے سادہ نظام سے آشنا کرتا ہے اور اس کے دل میں محبت و ہمدردی اور تعاون کا بیج بوتا ہے اور دوسرے بچے کی شخصیت اور انفرادیت کی حفاظت کرتا ہے۔ بچپن میں جب عادتیں پائدار اور مستحکم ہونی شروع ہوتی ہیں جذباتی میلانات نشوونما پاتے ہیں تو دوسرے اثرات کے بہ نسبت خاندانی اثر زیادہ دیرپا ہوتا ہے اور

بھی اثر جب بچہ نوجوانی کے دور میں اپنے بچپن کے توازن کو تہ و بالا کرتا ہوا نظر آتا ہے اور نئی جبلتیں، نئے جذبات و احساسات سے نبرد آزما ہوتا ہے طرح طرح کے تجربوں اور کوششوں کے درمیان اپنے لیے راہ نکالتا ہے تو اس وقت اس کے گھر کی فضا اور روایات ہی اس کی رہنمائی کرتی ہیں۔ اس طرح بچے کی شخصیت کی تعمیر و تکمیل ہوتی ہے۔ اگر ایسے وقت میں والدین بھائی بہن اور عزیز تر رشتہ داروں کی صحبت خاموشی کے ساتھ بچوں میں باقاعدہ اثر ڈالتی ہیں تو بچہ کی زندگی ہمیشہ کے لیے بن اور سنور جاتی ہے، بقول ڈاکٹر و ہیلر:

"والدین اور بھائی بہن کی محبت، گھر کی مسرت بخش زندگی، عزیزوں کی باہمی مراعات و بے تکلفی اور ارتباط جو ایک چھوٹی انسانی قدرتی جماعت ہی میں پیدا ہو سکتا ہے۔ حفظ حقوق، مراتب کی فضا میں زندگی بسر کرنا، حق خیر اور حسن کا احترام، یہی وہ چیزیں ہیں جو فرد کے جذبات کی تربیت کرتی ہیں۔"

(و ہیلر۔ بحوالہ اصول تعلیم خواجہ غلام السیدین (صفحہ ۷۶)

اس نقطۂ نظر سے اگر ہندوستانی گھروں یا خاندان کا جائزہ لیا جائے تو یہاں ہمیں دو واضح اور نمایاں صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعض اوقات والدین اپنے بچوں کے ساتھ اس قدر بے جا ناز برداری اور رعایت سے کام لیتے ہیں کہ وہ بڑے ہو کر معاشرتی زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہتے۔ یہ بہت تلخ تجربے، تگ و دو اور مشکل مراحل سے گزرنے کے بعد دوسروں کے حقوق و فرائض کا احترام کرنا سیکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے ساتھ اس قدر بے جا سختی اور ناروا سلوک کا برتاؤ کیا جاتا ہے کہ ان میں آزادی اور خود اعتمادی سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ ان کی شخصیت دب کر رہ جاتی ہے اور ان کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے۔ یا پھر ان کے دل میں والدین اور عزیزوں کی طرف سے نفرت اور خوف کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ جو انھیں اندر ہی اندر "باغی" اور "سرکش" بنا دیتے ہیں۔ ان دونوں صورتِ حال کا اندازہ اور پس منظر مثالوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک ہی بچہ کے ساتھ دونوں قسم کا برتاؤ کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اپنے بڑوں کے ساتھ صحیح اور مستحکم تعلقات قائم کرنے سے قاصر رہتا ہے اور ان کی صحبت کے عمدہ اثرات سے مستفید ہونے سے معذور۔ اسی لیے والدین کا فرض ہے کہ بچوں کی صحیح تربیت اور ان کے ساتھ وہی سلوک کریں جو بچوں کے ساتھ کیا جانا چاہیے تاکہ ان کی فطری طور پر بالیدگی ہو سکے اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے کہ جب بچوں کے ساتھ ان کے والدین تحکمانہ اور جابرانہ برتاؤ کے بجائے دوستانہ تعلقات قائم کریں کیوں کہ گھر صرف گھر ہی نہیں ہوتا بلکہ بچوں کے لیے ایک تعلیمی درسگاہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس طرح گھر کو بچوں کی تربیت میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور گھر کے افراد کو بچوں کی نفسیات سے آگاہی اور ان کی صحیح تربیت ان کی شخصیت کی نشو و نما کے لیے نہایت ضروری اور لازمی قرار پاتی ہے۔

مختصر یہ کہ گھر یا خاندان جہاں ایک طرف بچوں کی شخصیت کی تکمیل و تشکیل اور تعمیر کے لیے ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے وہیں دوسری طرف بچوں کے لیے سماج اور اسکول کے مابین ایک عمدہ اور سازگار ماحول پیدا کرنے میں ممد و معاون بھی ہوتا ہے۔●

بقیہ: فیشن ٹکنالوجی کا قومی ادارہ

- میں شروع کی گئی۔

۲۔ فیشن ڈیزائن جو ۱۹۸۷ء میں شروع کیا گیا۔

۳۔ اپرل کے مختلف ڈیزائنوں کی تجارتی پیمانے پر فروخت جو ۱۹۸۸ء میں شروع کی گئی۔

۴۔ گارمنٹ مینوفیکچرنگ ٹکنالوجی جو ۱۹۸۸ء میں شروع کی گئی۔

۵۔ چمڑے کے کپڑوں کی ڈیزائن سازی اور ٹکنالوجی جو ۱۹۹۳ء میں شروع کی گئی۔

۶۔ بنائی سلائی کے ڈیزائن اور ٹکنالوجی جو ۱۹۹۴ء میں شروع کیے گئے

۷۔ ٹیکسٹائل کے ڈیزائن اور ان کا فروغ جو ۱۹۹۴ء سے شروع کیا گیا۔

یہ سبھی ڈپلومہ پروگرام ہر سال ۳۰ طلبا کو ہر کورس میں داخلہ دیتے ہیں۔ فیشن ڈیزائن اینڈ اسیسری (ACCESSORY) ڈیزائن پروگرام انڈر گریجویٹوں کے لیے ہیں اور تین سال کی تعلیم کے بعد ڈپلومہ دیا جاتا ہے۔

باقی پروگرام گریجویٹس کے لیے ہیں اور دو سال بعد پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ دیا جاتا ہے۔

بورڈ آف گورنرز

فیشن ٹکنالوجی کا ادارہ بورڈ آف گورنرز کے تحت ہے۔ یہی بورڈ پالیسی بناتا ہے۔ اس میں منصوبہ سازوں اور فیشن ایکسپورٹ انڈسٹری کے ماہرین شامل ہیں۔ ٹیکسٹائل وزارت کے سکریٹری بورڈ آف گورنرز کے چیئرمین ہیں۔

فنانس (مالیات): ادارے کی سرگرمیوں کو چلانے کے لیے مرکزی سرکار گرانٹ دیتی ہے۔ اس ادارے کے مختلف پروجیکٹوں مثلاً مشاورتی خدمات، فیس وغیرہ سے بھی مالی امداد حاصل ہوتی ہے۔

تقرری: یہ ادارہ ایسے انتظامات کر رہا ہے جس سے اس ادارے کے گریجویٹوں کو کوئی جگہ دلائی جا سکے۔ اس سلسلے میں ادارے کے احاطے میں مختلف کمپنیوں کے ماہرین انٹرویو لیتے ہیں۔ پچھلے تین برسوں میں ۳۰۷ طالب علموں کی تقرریاں عمل میں آئیں ان کو دہلی، بنگلور، بمبئی، مدراس وغیرہ میں رکھا گیا ہے۔

صنعتی پروگرام: صنعتی اداروں کے مختلف ارکان بھی اس ادارے میں تربیت حاصل کرتے ہیں اور اپنی تکنیکی مہارت کو بڑھاتے ہیں۔ اس پروگرام کو تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کا پروگرام (CONTINUING EDUCATION PROGRMME) کہتے ہیں۔ مختلف صنعتوں سے آئے ہوئے نمائندے اس ادارے میں تربیت لیتے ہیں۔ ہر سال مختلف صنعتی اداروں کے ۵۰۰ سے زیادہ ارکان کو اس ادارے میں تربیت دی جاتی ہے یہ پروگرام صنعتی ضرورتوں اور مخصوص نوعیت کے کاموں کے لیے ہوتے ہیں اور جز وقتی تعلیم کے طور پر ان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی ترقیاتی سروس کے تحت غیر ملکی ماہرین ان پروگراموں کو چلاتے ہیں ادارے اور مہمان فیکلٹی کی طرف سے ان غیر ملکی ماہرین کو آنے کی دعوت دی جاتی ہے، اس ادارے کے امیدواروں کو اعلا ہنر مندیوں کے شعبوں میں تربیت دی گئی، ان کو کپڑوں کی تیاری، نمونہ سازی، پیداوار، نظم و نسق، فیشن کی پیشکش کوالٹی کنٹرول وغیرہ کی تربیت بھی دی گئی۔

نئے ادارے: فیشن تعلیم کے بڑھتے ہوئے مطالبات پورا کرنے کے لیے وزارت ٹیکسٹائل نے اس ادارے کی بمبئی، حیدرآباد، مدراس، کلکتہ اور گاندھی نگر (گجرات) میں شاخیں کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔

یہ نئے مراکز جولائی ۱۹۹۵ء سے کام کرنے لگے ہیں ان میں ہر سال ۵۰ طلبا کو تربیت دینے کی سہولت دی گئی ہے۔ یہ طلبا فیشن ڈیزائن کی تربیت پائیں اس طرح ہر سال ۵۰ طلبا کو گارمنٹ مینوفیکچرنگ ٹکنالوجی میں تربیت دینے کا اہتمام کیا گیا ہے یہ مراکز اس اسکیم کے تحت ہر ریاست کی سرکار کے تعاون سے قائم کیے گئے ہیں۔●

شکیل جہانگیری

بچہ مزدوری ـ اسباب اور انسداد

کسی بھی ملک کے مستقبل کا انحصار وہاں کے عوام پر ہوتا ہے۔ اگر عوام خوش حال ہوں گے تو ملک خوش حال ہوگا۔ عوام مفلسی اور بد حالی کا شکار ہوں گے تو ملک غریب و پسماندہ کہلائے گا۔ اسی طرح اگر عوام تعلیم یافتہ ہوں گے تو ملک کو عالمی برادری میں عزت و افتخار حاصل ہوگا ورنہ اس کے برعکس ہوگا۔ لیکن عوام کا معیارِ زندگی تبھی بلند ہو سکتا ہے جب ملک کے ہر فرد کو تعلیم اور روزگار کے مواقع یکساں طور پر حاصل ہوں۔ آزادی کے بعد ہماری حکومت کا دھیان سب سے پہلے ملک میں پھیلی ہوئی اقتصادی و تعلیمی پسماندگی کی طرف گیا اور تبھی سے اس برائی کو ختم کرنے کے لیے مسلسل کوششیں جاری ہیں۔ اس ضمن میں آزاد ہندوستان کے آئین میں یہ بات طے کر دی گئی کہ تعلیم اور روزگار ملک کے ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ لہٰذا آئین کے مطابق مرکزی و صوبائی حکومتوں پر یہ فرض عائد ہے کہ وہ تمام بچوں کو ۱۴ سال کی عمر تک مفت تعلیم فراہم کریں۔ لیکن اپنے اس حق کا استعمال سارے لوگ نہیں کر پاتے کیوں کہ اپنی اقتصادی حالت کو سدھارنے کے لیے بیشتر بچوں کے والدین انھیں کام پر لگا دیتے ہیں لہٰذا جو وقت انھیں تعلیم حاصل کرنے میں صرف کرنا چاہیے تھا وہ محنت مزدوری میں ضائع ہو جاتا ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے آئینی طور پر مقرر کی گئی عمر میں کی جانے والی مزدوری اور روزگار کو "بچہ مزدوری" یا "چائلڈ لیبر" کی اصطلاح دی گئی ہے۔

بچہ مزدوری کو روکنے کی حکومتی سطح پر کی جانے والی تمام انسدادی کوششوں کے باوجود ہندوستان میں آج بھی بد قسمتی سے یہ لعنت موجود ہے۔ ہندوستان میں بچہ مزدوری کا وجود صرف اخلاقی نقطۂ نظر ہی سے قابل افسوس نہیں ہے بلکہ اس لیے بھی یہ ایک المناک صورت حال ہے کہ انسانی وسائل کا ایک بہت بڑا حصہ بجائے اس کے کہ تعلیم و تربیت پا کر ملک کی ترقی میں معاون ہوتا، غیر تعمیری کاموں میں برباد ہو رہا ہے جب کہ ۱۴ سال تک کے بچے کو کسی کارخانے، کان یا دیگر خطرناک کام میں لگانا قانوناً منع ہے۔ لیکن آزادی کے تقریباً نصف صدی بعد بھی بچہ مزدوری کا تناسب کچھ زیادہ کم نہیں ہوا ہے۔ جن بچوں کو درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنی چاہیے تھی اور خالی اوقات میں جنھیں کھیل و تفریح سے دل کو مسرور کرنا تھا، وہ کارخانوں اور فیکٹریوں میں یا دیگر پیشوں میں خطروں سے کھیل رہے ہیں، اپنی صحت اور مستقبل کو برباد کر رہے ہیں۔ یا ہوٹلوں اور ڈھابوں پر جھوٹے برتن دھو کر زندگی کے سنہرے لمحات کو ضائع کر رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۹۴ء میں شائع شدہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے محکمۂ محنت کی ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں بچہ مزدوری کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ حکومت ہند کے مطابق ملک میں ایک کروڑ ۸۰ لاکھ بچہ مزدور ہیں لیکن دیگر مختلف تنظیموں کے مطابق یہ تعداد ۴۴ سے لے کر دس کروڑ تک ہے۔ ان میں وہ بچہ مزدور بھی شامل ہیں جو جز وقتی یا پورے سال کام نہ کر کے چند دن کام کرتے ہیں۔ ان میں مار جنل بچہ مزدور بھی شامل ہیں۔ بین اقوامی تنظیم برائے محنت کے مطابق دنیا کے کل بچہ مزدوروں میں سے ۵۰ فی صد ہندوستان، بنگلہ دیش، پاکستان، نیپال اور سری لنکا میں ہیں۔ یہ حقیقت جنوبی ایشیا کے تمام ملکوں کے لیے باعث شرم ہے۔

بچہ مزدوروں کو "سماجی طور پر معذور" بھی کہا گیا ہے۔ اس اصطلاح کا اطلاق روزگار سے وابستہ ان بچوں پر ہوتا ہے جن کا روزگار ان کے استحصال کا سبب بنتا ہے خواہ یہ استحصال ان کے والدین کے ذریعے ہو، یا سرپرست کے، اس استحصال کا مقصد والدین یا سرپرستوں کا اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ اس استحصال کا مطلب ہوتا ہے کہ بچے اپنی جسمانی قوت و استعداد سے زیادہ کام کریں اور یہ کام ان کی صحت کے لیے مضر رساں ہو سکتا ہے۔ اس مشقت کے عوض بہت کم معاوضہ ان کو دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے روزگار میں بچے کو تعلیم اور تفریح وغیرہ کا کوئی وقت نہیں دیا جاتا جو کہ اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے لیے لازمی ہے۔ دیہی کاشت کاروں اور اہل حرفہ عوام کے ان بچوں پر اس اصطلاح کا اطلاق نہیں ہوتا جن کو اپنا آبائی پیشہ سیکھنے کے لیے کام کرنا پڑتا ہے کیوں کہ اول تو یہ ان بچوں کا شوق ہوتا ہے اور اس میں انھیں تعلیم و تفریح کا موقع بھی مل جاتا ہے، دوسرے یہ بچے اپنے کنبوں کی نگہداشت میں رہتے ہوئے کام کرتے ہیں۔ لیکن شہری بچے اپنے کنبوں سے دور اپنی صحت اور مستقبل کی قیمت پر کم اجرت میں استعداد جسمانی سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ اس ضمن میں گاؤں سے

---

*۲۳۲، کاویری ہوسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی ۶۷

شہروں میں آنے والے بچہ مزدور بھی آتے ہیں۔ ہندوستان میں بچہ مزدوری کی صورت حال کو سمجھنے کے لیے ذیل کے گوشوارے معاون ہو سکتے ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۱

ہندوستان کی کل آبادی میں ۱۴ سال کی عمر کے بچے

(ملین میں)

علاقہ	۱۹۵۱ء			۱۹۶۱ء			۱۹۷۱ء			۱۹۸۱ء		
	کل افراد	ذکور	اناث	کل افراد	ذکور	اناث	کل افراد	ذکور	اناث	کل افراد	ذکور	اناث
ہندوستان	۱۳۴	۶۹	۶۵	۱۸۰	۹۲	۸۸	۲۳۰	۱۱۹	۱۱۱	۲۶۳	۱۳۵	۱۲۷
دیہی				۱۴۹	۷۶	۷۳	۱۸۸	۹۷	۹۱	۲۰۵	۱۰۶	۹۹
شہری				۳۱	۱۶	۱۵	۴۲	۲۲	۲۰	۵۷	۲۹	۲۷

گوشوارہ نمبر ۲

ہندوستان میں بچہ مزدوروں کی آبادی اور دیہات و شہر میں ان کی تقسیم

	۱۹۵۱ء			۱۹۶۱ء			۱۹۷۱ء			۱۹۸۱ء		
	کل افراد	ذکور	اناث	کل	ذکور	اناث	کلے	ذکور	اناث	کلے	ذکور	اناث
ہندوستان	—	—	—	۱۴٫۵	۸٫۷	۵٫۸	۱۰٫۷	۷٫۹	۲٫۸	۱۱٫۱	۷٫۴	۳٫۷
دیہی	—	—	—	۱۳٫۷	۸٫۱	۵٫۶	۹٫۹	۷٫۲	۲٫۷	۱۰٫۱	۶٫۷	۳٫۵
شہری	—	—	—	٫۸	٫۶	٫۲	٫۸	٫۷	٫۱	۱٫۰	۰٫۷	٫۲

گوشوارہ نمبر ۳

پیشے اور جنس کے اعتبار سے بچہ مزدوروں کی صیغہ وار تقسیم

شمار	پیشہ	۱۹۶۱ء			۱۹۷۱ء			۱۹۸۱ء		
		کلے	ذکور	اناث	کلے	ذکور	اناث	کلے	ذکور	اناث
۱۔	مجموعی بچہ مزدور	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰

۲۔	بالی	۵۱٫۱۰	۳۸٫۶۲	۵۴٫۸۷	۳۶٫۰۵	۳۹٫۴۴	۲۶٫۱۵	۴۲٫۰۹	۴۳٫۴۴	۳۷٫۵۰
۳۔	گلہ بانی، ماہی گیری، جنگل بانی، شجرکاری، کان	۷٫۱۹	۹٫۹۴	۳٫۵۱	۸٫۳۵	۹٫۶۳	۴٫۹۹	۲٫۲۲	۲٫۳۷	۱٫۷۹
۴۔	زراعتی مزدور	۲۲٫۰۶	۲۰٫۱۷	۲۴٫۸۹	۴۲٫۷۰	۳۸٫۱۰	۵۵٫۴۴	۲۶٫۳۱	۱۹٫۸۳	۴۴٫۷۹
	ابتدائی صیغہ	۸۰٫۳۵	۶۸٫۷۳	۸۳٫۲۷	۸۷٫۱۰	۸۷٫۱۷	۸۶٫۵۸	۷۰٫۵۹	۶۵٫۸۴	۸۴٫۰۸
۵۔	کانوں میں کام کرنے والے	–	–	–	۰٫۱۲	۰٫۱۷	۰٫۳۱	۰٫۵۲	۰٫۶۱	۰٫۲۷
۶۔	اشیا سازی و مرمت، (الف) گھریلو	۱۰٫۲۳	۱۰٫۶۸	۹٫۶۸	۳٫۱۵	۲٫۵۲	۴٫۸۷	۳٫۵۱	۳٫۱۸	۴٫۴۴
	(ب) گھر سے باہر رہ کر	۱٫۶۷	۲٫۱۴	۰٫۹۶	۲٫۹۴	۳٫۰۴	۲٫۶۱	۷٫۳۷	۸٫۸۵	۳٫۱۴
۷۔	تعمیر	۰٫۴۶	۰٫۵۰	۰٫۳۸	۰٫۵۶	۰٫۵۷	۰٫۶۱	۱٫۵۲	۱٫۸۱	۰٫۶۸
	ثانوی صیغہ	۱۲٫۳۶	۱۳٫۳۲	۱۰٫۹۵	۶٫۸۷	۶٫۳۰	۸٫۴۰	۱۲٫۹۲	۱۴٫۴۵	۸٫۵۳
۸۔	تجارت و معیشت	۱٫۰۷	۱٫۴۰	۰٫۴۲	۱٫۹۷	۲٫۵۰	٫۴۹	۵٫۸۴	۷٫۲۸	۱٫۷۵
۹۔	نقل و حمل، ذخیرہ گری اور ارسال و ترسیل	۰٫۱۷	۰٫۲۴	۰٫۰۲	۰٫۳۸	۰٫۴۵	۰٫۲۱	۲٫۵۱	۳٫۲۹	۰٫۲۹
۱۰۔	دیگر خدمت	۶٫۰۵	۶٫۵۳	۵٫۳۲	۳٫۷۸	۳٫۵۸	۴٫۳۲	۸٫۱۴	۹٫۱۲	۵٫۳۵
	صیغہ ثالث	۷٫۲۹	۸٫۲۵	۵٫۷۸	۶٫۱۳	۶٫۵۳	۵٫۰۲	۱۶٫۴۹	۱۹٫۶۹	۷٫۳۹

مآخذ: ۱۹۵۱ء، ۱۹۶۱ء، ۱۹۷۱ء اور ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے، شماریات

یہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ گو بچہ مزدوروں کی آبادی میں بتدریج کمی آئی ہے لیکن یہ کمی تسلی بخش نہیں ہے۔ انسدادِ بچہ مزدوری کی جو کوششیں اب تک کی گئی ہیں وہ کاغذی زیادہ اور عملی کم ہیں۔ حالاں کہ سرکار اس معاملے میں بے حد سنجیدہ ہے۔

بچہ مزدوری کے انسداد کی غرض سے بنائے گئے قوانین

۱۹۳۳ء سے اب تک مرکزی و ریاستی قانون ساز ایوانوں میں بچہ مزدوری کے انسداد کے لیے متعدد قانون پاس کیے گئے ہیں جن کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

(الف) ضمانتِ مزدوری قانون ۱۹۳۳ء

بہت سے والدین ملوں، فیکٹریوں اور فرموں وغیرہ کے مالکان سے پیشگی رقم لے کر اپنے بچوں کو ضمانت کے طور پر ان کے یہاں مزدوری کے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ یہ قانون اس برائی کے خاتمے کے لیے فروری ۱۹۳۳ء میں بنایا گیا تھا اور اس کا نفاذ ملک کے تمام صوبوں میں یکساں طور پر ہوتا تھا۔ اس قانون کی رو سے کوئی بھی تحریری یا زبانی معاہدہ کالعدم قرار دیا گیا جو ۱۵ سال سے کم عمر کے کسی بچے کو ضمانتِ مزدوری پر دینے کے لیے اس کے والدین یا سرپرست اور مالکانِ فرم یا روزگار دینے والے کے مابین کیا گیا ہو خواہ وہ قرض لوٹانے کی غرض سے ہو یا کسی اور فائدے کے عوض۔ تاہم ایسا معاہدہ غیر قانونی نہیں سمجھا گیا جس کی رو سے بچے کی صحت کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا تھا اور اس کام کے عوض جائز یومیہ مزدوری یا تنخواہ اس کو دی جاتی تھی نیز ملازمت سے علاحدہ کرنے کے لیے کم از کم ایک ہفتہ پہلے اطلاع دی جاتی تھی۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد اگر کوئی شخص قصداً ایسا معاہدہ کرتا

تو اس پر ۱۰۰ سو روپیہ تک جرمانہ عائد کیا جاتا اور اگر والدین قصداً اپنے بچوں کو اس طرح کی ضمانت پر رکھتے تھے تو ان پر ۵۰ روپے تک جرمانہ ڈالا جاتا تھا۔

(ب) روزگار اطفال قانون، ۱۹۳۸ء

۲۳ دسمبر ۱۹۸۶ء کو بنائے گئے بچہ مزدوری (انسداد و ضابطہ بندی) قانون کے بعد روزگار اطفال قانون ۱۹۳۸ء ختم کر دیا گیا۔

(ج) بچہ مزدوری (انسداد و ضابطہ بندی) قانون ۱۹۸۶ء

اس قانون کا بنیادی مقصد ۱۵ سال سے کم عمر کے بچوں کو کچھ مخصوص روزگاروں میں ڈالنے سے باز رکھنا ہے اور دیگر مخصوص پیشوں میں بچوں کے کام کی نوعیت کو ضابطہ بند کرنا ہے۔ اس قانون کے مطابق فہرست کے حصہ الف کے چوتھی شق میں درج پیشوں میں سے کسی بچے کو روزگار دینے یا اس بچے کو کام کرنے کی اجازت نہیں:

(الف) ۱۔ نقل و حمل: ریل کے ذریعے مسافر، ساز و سامان اور ڈاک کالے جانا۔
۲۔ کوئلے کی راکھ اٹھانا، راکھ کے گڑھے صاف کرنا یا ریلوے کے احاطے میں تعمیر کا کام کرنا۔
۳۔ ریلوے اسٹیشن کے ہوٹلوں یا چائے کے اسٹالوں میں کام کرنا اور سامان کو ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم اور چلتی ٹرینوں کے اندر یا باہر لے جانا۔
۴۔ ریلوے اسٹیشن کی تعمیر یا اس طرح کا کوئی بھی کام جو ریلوے لائنوں کے درمیان یا بہت نزدیک ہو۔
۵۔ کسی بھی بندرگاہ کی حدود میں یا کارخانے میں ایسا کام کرنا جو فہرست "ب" کی چوتھی شق میں درج ہے۔

(ب) ۱۔ بیڑی بنانا ۲۔ قالین بنانا ۳۔ سیمنٹ بنانا (اس میں سیمنٹ کو بوروں میں بھرنا بھی شامل ہے) ۴۔ کپڑوں کی رنگائی اور بُنائی ۵۔ ماچس، دھماکہ خیز اور آتش گیر چیزیں بنانا، ابرق کاٹنا اور پھاڑنا ۷۔ چپڑا لاکھ بنانا ۷۔ صابن بنانا ۸۔ چمڑا کمانا اور کھالیں رنگنا ۹۔ اون صاف کرنا اور ۱۰۔ صنعت تعمیر میں کام کرنا۔

اس قانون کو نافذ کرنے کی ذمہ داری متعلقہ شعبوں کے تعلق سے، مرکزی و ریاستی حکومتوں پر ہے۔

خاص انتظامات

اس قانون کی رو سے کسی بچے کو شام کے سات بجے سے صبح کے آٹھ بجے کے درمیان کام کرنے اور کرانے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ ہی اسے اوور ٹائم کام کرنے کی اجازت ہو گی۔ ہر روز کام کا وقت اس طور پر متعین ہو گا کہ کوئی بھی وقت تین گھنٹے سے زیادہ نہیں ہو گا اور کوئی بچہ تین گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کرے گا قبل اس کے کہ اسے کم از کم ایک گھنٹے کا وقفہ آرام کے لیے حاصل ہو۔ ہر روز کے کام کی مدت بمعہ وقفہ آرام چھ گھنٹوں سے تجاوز نہیں کرے گی۔ اس میں کام کے انتظار میں گزارا گیا وقت بھی شامل ہے۔ کسی بچے کو، جس روز وہ پہلے ہی کسی کارخانے میں کام کر رہا ہو، کسی دوسری جگہ کام کرنے کی اجازت نہیں ہو گی اور نہ وہ طلب کیا جائے گا۔ ہر بچے کو جو کسی کارخانے میں کام کر رہا ہو، ہر ہفتہ پورے دن کی چھٹی دی جائے گی۔ اگر کوئی مالک کارخانہ کسی بچے کو ملازم رکھتا ہے تو اسے انسپکٹر کو پیشگی مطلع کرنا ہو گا اور اسے اپنے کم سن ملازمین سے متعلق جملہ معاملات کے اندراج کے لیے ایک رجسٹر رکھنا ہو گا جسے پابندی کے ساتھ پُر کیا جائے گا۔ یہ رجسٹر کسی بھی معائنہ کرنے والے افسر کو کام کے اوقات میں کسی بھی وقت دستیاب ہو گا۔

یہ قانون کمسن ملازمین کو صحت اور تحفظ بھی فراہم کرتا ہے اور متعلقہ حکومت کسی بھی کارخانے یا اس کی شاخ میں کام کرنے والے کمسن ملازمین کی صحت اور تحفظ سے متعلق قانون بنا سکتی ہے۔

کوئی بھی آجر جو مذکورہ قانون کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرتا ہوا پایا جائے گا اس کو اسی قانون کے تحت تین ماہ سے ایک سال تک کی سزا ہو سکتی ہے یا دس سے بیس ہزار روپیہ تک جرمانہ بھگتنا پڑ سکتا ہے یا دونوں قسم کی سزائیں مل سکتی ہیں اور اگر کسی نے سزا پانے کے بعد دوبارہ اسی جرم کا ارتکاب کیا تو یہ سزا دوگنی ہو سکتی ہے۔

بچہ مزدوری (انسداد و ضابطہ بندی) قانون ۱۹۸۶ء میں ان قوانین کے مشتملات بھی شامل ہیں جو اس سے قبل بنائے گئے تھے مثلاً ۱۔ کارخانوں کا قانون ۱۹۴۸ء ۲۔ کانوں سے متعلق قانون ۱۹۵۲ء ۳۔ بحری جہازوں پر سوداگری کا سامان لادنے اور اتارنے کا قانون ۱۹۵۸ء اور ۴۔ موٹر ٹرانسپورٹ میں کام کرنے والوں سے متعلق قانون ۱۹۶۱ء۔
(انڈین ایئر بک ۱۹۸۹ء صفحہ ۲۰۳، ۲۰۴)

ان قانونی تحفظات کے باوصف بچہ مزدوری کا مسئلہ برقرار ہے۔ ہماری حکومتوں نے یقیناً ایسے بہت سے قانونی تحفظات اس ضمن میں فراہم کیے ہیں جو کہ ۱۵ سال سے کم عمر کے بچوں کو ان پیشوں اور روزگاروں میں جانے سے روکتے ہیں جو ان کی عمر اور جسمانی استعداد کے اعتبار سے ان کے لیے مضرت رساں ہیں۔ ایسے قوانین کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے جو ان بچوں کی صحت اور دیگر مفادات کے محافظ ہیں لیکن تنہا قانونی تحفظات اس مسئلے کو ختم کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ بیشتر افلاس زدہ بچوں کے سامنے دو متبادل ہوتے ہیں۔ یا تو وہ استحصال کا شکار ہوں ورنہ فاقہ زدگی کی زندگی گزاریں۔ لہٰذا بچے اول الذکر صورت حال میں گرفتار ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یہ صورت حال اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک کہ ملک میں وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے افلاس کے خلاف سرکاری طور پر باقاعدہ سماجی تحفظات قائم کرنے کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔ کیوں کہ اس غربت و افلاس کے سبب ہی ملک میں بچہ مزدوری کا مسئلہ برقرار ہے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک کوآپریشن اینڈ چائلڈ ڈیولپمنٹ، بمبئی کی شائع کردہ ایک رپورٹ میں بچہ مزدوری کے مندرجہ ذیل اسباب بتائے گئے ہیں۔

۱۔ روزگار کی قلت / کنبے کی قلیل آمدنی ۶۳٫۳ فی صد
۲۔ قدرتی آفات ۷٫۳ فی صد
۳۔ قلت اراضی یا غیر اقتصادی اراضی ۶٫۶ فی صد
۴۔ گھر کے کمانے والے افراد کا فوت ہو جانا ۱۵٫۷ فی صد
۵۔ بہتر مستقبل کے امکانات کی تلاش ۶٫۹ فی صد

اس طرح تمام شواہد اس امر کی جانب اشارہ

کرتے ہیں کہ بچوں کو روزگار کے لیے مجبور کرنے والا سب سے بڑا سبب اقتصادی بدحالی ہے۔ اس مسئلے کے خاتمے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے وزیراعظم ہند نے ۱۵ اگست کو یوم آزادی کے موقع پر تقریر کے دوران کہا تھا :

"آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں تقریباً دوکروڑ بچے اسکول جانے کے بجائے اپنے والدین اور سرپرستوں کی آمدنی میں اضافے کے لیے کارخانوں میں کام کررہے ہیں۔ کارخانوں میں کام کرنے کا مقصد ان بچوں کی تعلیم اور شخصیت کے ارتقا کا خاتمہ۔ ایسے ۲۰ لاکھ بچے ہیں جو خطرناک کاموں میں مصروف اپنی صحت کو برباد کررہے ہیں۔ ہمارا منصوبہ ہے کہ آئندہ پانچ سال میں ان بچوں کو اس طرح کی صنعتوں سے نکال کر انھیں اسکول میں داخل کرایا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان بچوں کے والدین کو مکمل روزگار فراہم کرایا جائے تاکہ ان کی آمدنی ان کے اخراجات کا ساتھ دے سکے۔ کیوں کہ یہ والدین اس قدر مفلس ہیں کہ اپنے بچوں کی اضافی آمدنی کے بغیر ان کا گزارہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اگر ان کو مناسب آمدنی والا روزگار فراہم کردیا جائے تو وہ اپنے بچوں کو بخوشی اسکول کیوں نہیں بھیجیں گے۔ بچوں کو مضر صحت کاموں سے نکال کر انھیں بہتر مستقبل دینے کی غرض سے ایک نیالائحہ عمل مرتب کیا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

اس اعلان کے نتیجے میں وزارت محنت حکومت ہند کی جانب سے ۲۶ ستمبر ۱۹۹۴ء کو ایک "قومی اتھارٹی برائے انسداد بچہ مزدوری" قائم کی گئی جس نے بچہ مزدوری کے خاتمے کی غرض سے مرکزی و ریاستی حکومتوں کے تحت متعلقہ قوانین کے نفاذ کو موثر بنانے نیز بہت سے سماجی و اقتصادی ترقی کے پروگراموں میں معاونت کرنے کے لیے جائزہ میٹنگوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔

بچہ مزدوروں کی شناخت اور متعلقہ قوانین کے نفاذ میں سختی

فی الحال بچہ مزدوروں کی شناخت، ان کی رہائی اور آبادکاری کا کام خاص طور پر محکمۂ محنت کے افسران کی نگرانی میں چل رہا ہے۔ مطلوبہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات ضروری ہیں :

(الف) کم سن مزدوروں اور ان کے کاموں کی نوعیت اور ان کے کنبوں کا پتا چلانے کے لیے ایک معینہ مدت میں ان اضلاع کا سروے کلی طور پر ضلع مجسٹریٹ کی زیرنگرانی کیا جانا چاہیے جہاں بچہ مزدوری اپنا وجود رکھتی ہے۔

(ب) سروے کے علاوہ بچوں کو روزگار دینے والے مالکان اور کام کرنے کے مقام کا پتا چلانے کے لیے تفتیش و معائنے کو زیادہ سے زیادہ موثر بنایا جائے تاکہ موجودہ قوانین کے تحت ان پر مقدمہ چلایا جاسکے۔ فی الحال محکمۂ محنت کے عمال قانونی جانچ پڑتال کا کام کررہے ہیں لیکن وہ وسعتِ علاقہ، قلتِ افراد اور محدود حرکت پذیری کے باعث مطلوبہ نتائج کے حصول میں رکاوٹ محسوس کررہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ضلع، بلاک اور گاؤں کی سطح پر محکمۂ مال سے وابستہ افسروں کو بھی بچہ مزدوروں کے معاملات میں بااختیار بنایا جائے اور ایگزیکیوٹو ججوں کو بھی اس سلسلے میں معائنہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ ان تمام امور کو موجودہ قوانین کے تحت قابلِ دست اندازی پولیس بنانا چاہیے اور ایگزیکیوٹو ججوں کو خصوصی اعتبار سے بچہ مزدوروں سے متعلق مقدموں کو سرسری طور پر طے کرنے کے لیے ان تمام قوانین کے تحت بااختیار بنانا چاہیے (جس طرح قانون برائے انسداد بندھوا مزدوری سسٹم کی دفعہ یو/ایس ۲۱ پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔) بچہ مزدوروں کو روزگار دینے والے آجروں کے خلاف استغاثہ دائر کرتے وقت متعلقہ بچے کی آبادکاری اور اس کے کنبے کی اقتصادی بہتری کو لازمی کیا جانا چاہیے۔

(ج) ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی چیئرمین شپ کے تحت مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل افراد کی ایک اسٹینڈنگ کمیٹی اضلاع میں بچہ مزدوروں سے متعلق مسائل کو دیکھے گی اور تاریخی ترتیب کے ساتھ (ہر سہ ماہی میں کم از کم ایک بار) متعلقہ امور کا جائزہ لے گی، سروے کا نظم سنبھالے گی اور موثر نگرانی کے لیے معائنہ اور قانونی نفاذ کو روبہ عمل لانے کے لیے معاون افسران کو ذمہ داریاں تقسیم کرے گی۔

افسران

۱۔ صدر ضلعی مالی انتظامیہ ۲۔ ضلع کے تمام پرگنہ مجسٹریٹ ۳۔ ضلع افسر محنت، ضلع پریشد کا چیف ایگزیکیوٹو، ضلع افسر نگراں برائے ابتدائی تعلیم، ضلع افسر برائے بہبودی خواتین و اطفال، ضلع افسر برائے سماجی بہبود۔ ۴۔ بچہ مزدوروں کے لیے کام کرنے والی علاقے کی رضاکار تنظیموں کے ایک یا دو نمائندے۔ ۵۔ بچہ مزدوروں کی رہائی اور آبادکاری کے کام میں مصروف ایک یا دو بااثر سماجی کارکن۔ ۶۔ پروجیکٹ ڈائرکٹر ڈی۔ آر۔ ڈی۔ اے۔ ۷۔ بچہ مزدوروں کی فلاح و بہبود سے وابستہ پریشد کی اسٹینڈنگ کمیٹی۔

اس کمیٹی کا کام کلی طور پر یہ ہوگا کہ وہ بچہ مزدوروں کا پتا لگائے، انھیں خلاصی دلائے، آباد کرے اور ان کی تعلیم اور اقتصادی استحکام کے پروگراموں کو روبہ کار لائے نیز ان والدین کو مناسب روزگار دلانے کا بندوبست کرے۔ اس فہرست میں انسداد بندھوا مزدوری قانون کی دفعہ دس کے تحت ضلع اور پرگنے کی سطح پر قائم کی گئی وجیلینس کمیٹیوں کے ممبران کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے اور بچہ مزدوری کے انسداد میں دلچسپی رکھنے والے دیگر اداروں اور ایجنسیوں کا تعاون بھی لیا جاسکتا ہے۔

بچہ مزدوروں کی آبادکاری

بچہ مزدوروں کا پتا چلانے اور انھیں ان کے روزگاروں سے خلاصی دلانے کے بعد ان کی آبادکاری اور ان کے کنبوں کی اقتصادی بہتری کا اہم کام باقی رہ جاتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے بچہ مزدوری کے اسباب کا ذکر کیا تھا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے ایسے بچوں کے کنبوں کو یہ یقین دلایا جائے کہ بچہ ان پر بوجھ نہیں ہے۔ اس کے لیے بچوں کو ان کے روزگار سے خلاصی دلاکر ایسے اسکولوں اور تربیت گاہوں میں داخل کرایا جائے جہاں اچھی تعلیم اور ہوسٹل کا بندوبست ہو۔ جن اضلاع میں ایسے اسکول نہیں ہیں ان میں وزارت محنت کی طرف سے اس کا بندوبست کیا جائے۔ تاکہ ان بچوں کی صحت سدھاری جاسکے اور ان کا مستقبل بھی سنور سکے۔

بچہ مزدوری والے کنبوں کی اقتصادی آبادکاری

یہ ظاہر ہے کہ بچہ مزدوری کے لیے مجبور ہونے والے کنبے سماج کے پسماندہ طبقے سے تعلق

باقی صفحہ ۵۱ پر

ڈاکٹر اقبال محی الدین

ہندوستان میں مزدور بچوں کے مسائل اور ان کا حل

ہندوستان اکیسویں صدی میں داخل ہونے جا رہا ہے جس میں امید ہے ہر طرف ترقی ہوگی اور کمپیوٹر کے ذریعہ جدید مشینی دور ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کو بالکل الگ طرح کے کام کرنے والوں کی ضرورت ہوگی جن کو تکنیکل تربیت دی گئی ہو۔ آج کے کام کرنے والے بچے کل کے نوجوان کام کرنے والوں کی پوری فوج ہوگی لیکن ان بچوں کو یہ موقع ہی نہیں مل پاتا کہ وہ تکنیکی تربیت حاصل کرکے کل کے اچھے شہری بن سکیں۔ عام طور پر بچے کام ایسے کرتے ہیں جن میں یا تو تکنیکل کام بہت کم ہوتا ہے یا بالکل نہیں ہوتا۔

سماج کے مختلف حصوں اور مختلف معاشی حالات سے جڑے بچوں کی زندگیوں کے درمیان بہت فرق ہے۔ کہیں بچے مشینی اور جدید طرز کے کھلونوں اور عیش و عشرت کے سازوسامان کے ساتھ بڑے ہو رہے ہیں تو کہیں بچوں کو پیٹ بھرنے کے بھی لالے پڑے رہتے ہیں۔ ملک میں ایسے بچوں کی تعداد کم نہیں ہے جو بچوں کی فلاح کے قانون کے ہوتے ہوئے بھی خطرناک حالات میں مشکل اور سخت جسمانی محنت کرکے نہ صرف خود کے بلکہ اپنے خاندان کے لیے بھی دو وقت کی روٹی جٹانے کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔

امیر گھرانوں کے بچے اچھے اسکولوں میں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے اچھے مستقبل کی طرف بڑھتے جاتے ہیں لیکن ملک میں لاتعداد بچے ایسے ہیں جنھیں خاندانی حالات اور معاشی کیفیت کی وجہ سے ابتدائی تعلیم تک کے مواقع نصیب نہیں ہوتے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بجائے وہ اپنی اور اپنے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری کچی عمر سے ہی اٹھا لیتے ہیں۔ ان بچوں کو اپنی روزی روٹی کمانے کے علاوہ یہ تک نہیں معلوم کہ ملک کے کس حصے میں کیا ہو رہا ہے؟ ایسے لاتعداد بچے یا تو یتیم ہیں یا اپنے خاندان کی غریبی کی چکی میں پستے ہوئے، اپنے نازک کندھوں پر خاندان کے لیے روزی روٹی کمانے کا بار ڈھو رہے ہیں۔

مزدور بچے اور ان کے مسائل

مزدور بچے کون ہیں اور ہندوستان میں ان کی کیا کیفیت ہے، ان کے کیا مسائل ہیں اور ان کے لیے حکومتِ ہند نے کیا کیا قانونی اقدام ایسے اٹھائے ہیں جن سے ان کے مسائل کا حل نکل سکتا ہے۔ ہم ان باتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

حکومتِ ہند نے چائیلڈ لیبر بل ۱۹۸۵ء میں بنایا تھا جس کے مطابق "بال مزدور" وہ لوگ ہیں جو ۱۵ سال کی عمر سے کم ہوتے ہیں اور وہ مزدوری یا بغیر مزدوری کے تھوڑے وقت یا پورے وقت کام کرتے ہیں۔ ان میں وہ بچے بھی شامل ہیں جن کی عمر چار پانچ سال کی بھی ہوتی ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں وہ بچے جو چلنا شروع کرتے ہی ہیں کہ ان کے نازک کندھوں پر کام کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشی ضرورتوں کے تحت ان کے والدین یا خاندان کے لوگ ان بچوں کو کام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کا بچپن کام کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتا ہے۔ کھیلنے اور پڑھنے کی بجائے وہ اپنے لیے اور خاندان کے لیے روزی روٹی کمانے میں لگ جاتے ہیں جس سے وہ جسمانی اور دماغی دونوں طرح سے گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔

ہندوستان میں مزدور بچوں کی حالت

ہندوستان میں مزدور بچوں کی کیا حالت ہے؟ اس بات پر تفصیل سے روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ ۴۶ افریقی ممالک میں کل ملا کر جتنے بچے ہیں ہندوستان میں اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں ۳۱۰ ملین بچے ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۲۴ ملین بچے مزدوری کا کام کرتے ہیں۔ ان میں آدھے سے کچھ ہی کم لڑکیاں ہیں۔

معاشی ضرورت کے تحت کام کرنے کے لیے مجبور ان بچے بچیوں میں سے ۸۷ فی صد دیہی علاقوں میں رہتے ہیں بقیہ ۱۳ فی صد شہروں میں اپنی مجبور زندگی گزار رہے ہیں۔ اس طرح دنیا کے کسی بھی ملک کی سب سے بڑی "بال مزدوری طاقت" ہندوستان میں ہے۔

ہندوستان کے شہروں میں مزدور بچے عام طور پر گھریلو نوکر، ہوٹل بوائے، سڑک کے کنارے بنے ڈھابوں، ٹی اسٹالوں، مٹھائی کی دوکانوں میں بیرے کی حیثیت سے، قلی، ٹرانسپورٹ ہیلپر، کار کلینر، اخبار فروخت کرنے والے، بس اسٹاپ پر بوجھ چڑھانے اتارنے کے لیے، سبزی منڈی میں، صنعتی جگہوں میں، آٹوموبائیل مرمت میں، پٹرول پمپوں پر اور گندے کام میں، صفائی بوائے وغیرہ کی شکل میں کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیہاتوں میں بھی کم عمر کے بچے کھیتی و سینچائی کے کام میں

۵۲۔ بی ڈی ڈی۔ ڈی۔ اے۔ فلیٹ، قطب انیکلیو
نزد قطب ہوٹل۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۶

بہت لگ جاتے ہیں۔ معاشی مشکلات یا سماجی دباؤ کی وجہ سے یہ کم عمر بچے اسکولوں میں پڑھنے کی بجائے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کے لیے اپنی چھوٹی سی عمر میں ہی روزی روٹی کمانے نکل جاتے ہیں۔

مزدور بچوں کا یہ تکلیف دہ پہلو ان کے والدین یا رشتہ داروں کی غریبی اور مجبوری کو ظاہر کرتا ہے۔ خاندانی بجٹ میں راحت کے لیے وہ بچوں کو کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ غریبی اور آبادی کا اضافہ ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ زیادہ بچے پیدا کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ آمدنی کے ذرائع پیدا ہو جائیں۔ دراصل یہی مزدور بچوں کا مسئلہ ہے۔

مزدور بچوں کے مسائل کا حل

کچھ پیشوں میں ۱۴ سال سے کم عمر کے بچوں کو نوکری دینے سے انکار کرنے کے لیے ۵ نومبر ۱۹۸۶ء کو راجیہ سبھا نے CHILD LABOUR PROHIBITION AND REGULATION BILL پاس کیا۔ جن پیشوں میں مزدور بچوں کو نوکری دینے کی بات کہی گئی ہے ان میں کام کی شرطوں کو بھی بتایا گیا ہے۔

مزدور بچوں پر پہلا قانون ۱۹۳۸ء EMPLOYMENT OF CHILDREN ACT بنا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں دو اور قانون بنائے گئے۔ وہ تھے COAL MINES LABOUR WELFARE FUND ACT اور MICA MINES LABOUR WELFARE ACT -

آزادی کے بعد بچوں اور ان کے مناسب روزگار دونوں میں تفریق کے لیے کئی قانون بنائے گئے۔ ۱۹۴۸ء کے فیکٹری قانون میں ۱۴ سال سے کم عمر بچوں کو کسی فیکٹری میں کام نہ دینے کو کہا گیا ہے مگر اس کے باوجود ۱۴ سال سے کم عمر بچے مختلف فیکٹریوں میں خطرناک قسم کے کام کرتے ہیں جن سے ان کی صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

صحت کے معاملے میں یہ بچے اتنے بدقسمت ہیں کہ معمولی بیماریوں سے بھی ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ایک میڈیکل سروے کے مطابق ہندوستان میں ہر دو منٹ پر ایک بچہ خسرہ کی بیماری سے مر جاتا ہے۔ اوسطاً سال میں دو لاکھ ۸۰ ہزار بچے ٹٹنس سے، ایک لاکھ ۱۸ ہزار کالی کھانسی سے، تین لاکھ ۱۴ ہزار تپ دِق سے، دو لاکھ پولیو سے اور کئی ہزار ڈپتھیریا کی وجہ سے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

یونی سیف کے ذریعہ بچوں کی دیکھ بھال اور امداد

حال ہی میں UNICEF کی مدد سے جنوبی ایشیائی بچوں کے بارے میں ایک کانفرنس نے سارک ممالک میں بچوں کی تشویش ناک حالت پر دھیان دلایا ہے۔ UNICEF جہاں ساری دنیا میں بچوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لئے ہوئے ہے، اس نے ہندوستانی بچوں پر بھی دھیان دیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے کے طور پر یورپ اور چین میں لاکھوں بچے بھوک، بے گھر اور بیماریوں کا شکار ہو گئے۔ دنیا کے مستقبل کی امیدیں ان ہی بچوں پر تھیں۔ اس بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے محسوس کیا گیا کہ بچوں کی پرورش و نشوونما بین اقوامی ذمہ داری ہے۔ اس نقطہ نظر کے تحت اقوام متحدہ نے ۱۹۴۶ء میں UNICEF کی بنیاد رکھی۔ اس کے ذمہ جو کام سونپا گیا وہ تھا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت، بچوں کو بیماریوں سے بچانا، ان کے کھانے اور دودھ کا انتظام، دوائیاں، کمبل، کپڑے وغیرہ کا انتظام کرنا۔ عالمی جنگ عظیم کے بعد جب یورپ کے حالات ٹھیک ہونے لگے تو کچھ لوگوں نے سوچا کہ یہاں UNICEF کا کام پورا ہو گیا لہٰذا اس کو ایشیائی ملکوں کے بچوں کی ترقیات کے لیے کام کرنا چاہیے۔

۱۹۴۹ء میں UNICEF نے ہندوستان میں کام کرنا شروع کیا جس کا مقصد بچوں کی صحت، آسانیاں، غذائیت، اسکولی تعلیم، پینے کا صاف پانی، ماحول کی صفائی، رہنے کی جگہ کا انتظام اور بچوں کی دیگر ضرورتوں کی تکمیل کرنا تھا۔ UNICEF ہمیشہ اس اصول پر کام کرتا رہا ہے کہ بچے خواہ کسی بھی ملک کے ہوں وہ وہاں کے بہت اہم ذخائر ہیں۔

معاشی اور سماجی مسائل اور ان کا حل

مزدور بچوں کے مسائل زیادہ تر معاشی اور سماجی ہیں جن کی وجہ سے ۱۴ سال سے کم عمر کے بچوں کو اپنی مرضی کے خلاف جبراً مزدوری کرنی پڑتی ہے اور نہ صرف اپنا بلکہ اپنے خاندان کو بھی پالنا پڑتا ہے۔

ان مزدور بچوں کی خستہ حالی دیکھ کر حکومت ہند نے ان کے مسائل کا حل نکالا ہے جن پر تفصیل سے روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

حکومت ہند کے ۲۰ نکاتی پروگرام میں مزدور بچوں کی ترقیات و بہبودی کے لیے یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ کھیتی اور دوسری صنعتوں میں کام کرنے والے مزدور بچوں کے لیے ان کی مزدوری اور کام کرنے کے اوقات بھی طے کر دئے گئے ہیں۔ ان بچوں کو پڑھنے کی آسانیاں (NON-FORMAL SCHOOLS CENTRES) میں دی گئی ہیں۔ ان کی صحت قائم رکھنے کے لیے بھی حکومت نے یقین دہانی کرائی ہے۔

۱۹۸۶ء CHILD LABOUR BILL ہندوستانی مزدور بچوں کے مسائل کا حل نکالتا ہے تاکہ ان کے معاشی اور سماجی حالات کو سدھارا جا سکے۔

سب سے پہلے تو یہ قانون مزدور بچوں کو جو ۱۴ سال سے کم عمر کے ہیں ان کو کسی بھی خطرے والے کام سے روکتا ہے۔ ان کو ایسی جگہوں پر نوکری دینے پر پابندی لگاتا ہے جہاں ان کو جسمانی یا دماغی طور سے کوئی خطرہ ہو۔ چائلڈ لیبر بورڈ (CHILD LABOUR BOARD) کی بھی تشکیل کی گئی جو یہ دیکھے گا کہ مزدور بچوں کو نوکری کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے یا ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔

بغیر خطرے والے کام کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت مزدور بچوں کی تعلیم، دستکاری کی تربیت، اچھی خوراک اور اچھی صحت کی دیکھ بھال بھی کرتی ہے۔ ان کو اپنی یونین بنانے کا بھی حق دیتی ہے۔ اس کے علاوہ سرکار نے ایسے قانون بنائے ہیں جن سے مزدور بچوں کو نوکری دینے والے کے لیے کم سے کم فائدہ ہو۔ یعنی اگر وہ "بال مزدوروں" کو نوکری دیں گے تو ان کو پڑھنے کے لیے وقت بھی دینا ہوگا۔ ان کی صحت کا خیال بھی رکھنا ہوگا اور ان کو چھٹی بھی دینی ہوگی۔ یہ سب اس لیے کیا گیا ہے تاکہ نوکری دینے والے، بچوں کی بجائے بڑوں کو ملازمت دیں۔

نیشنل چائیلڈ لیبر ایڈوائزری بورڈ کی بھی تشکیل کی گئی ہے۔ یہ "بال مزدوروں" کی پالیسی

بنانے والا بورڈ ہے جس کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ دیکھے کہ بچوں کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی تو نہیں ہو رہی ہے۔ صوبائی حکومتیں اپنے صوبوں میں CHILD LABOUR TRIBUNALS بنا رہی ہیں جو مزدور بچوں کے قانونی مسائل کو دیکھیں گی۔ بہت سے صوبائی حکومتوں نے ایسے TRIBUNALS بنا لیے ہیں جو عمل پیرا ہیں۔ مزدور بچوں کو ہفتہ میں ۳۰ گھنٹے ہی کام کرنا ہوگا اور ہفتہ پانچ دن کا ہوگا۔ یعنی گرہستی والے کاموں میں بال مزدوروں کو ۴ گھنٹے تک کام کرنا ہوگا۔ چائیلڈ لیبر بورڈ ان مزدور بچوں کی مزدوری بھی طے کرے گا اور یہ بھی دیکھے گا کہ ان کی صحت پر برا اثر تو نہیں پڑ رہا ہے۔

چائیلڈ لیبر ایکٹ (CHILD LABOUR ACT) کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ مزدور بچوں کے لیے حکومت ان کی ترقیات کے لیے نئی نئی اسکیمیں بنائے گی۔ ان کے لیے رسمی اور غیر رسمی تعلیم کا انتظام ہوگا۔ دست کاری کی تربیت ان مزدور بچوں کو دی جائے گی اور ان کی ملازمتی ترقیات پر دھیان دیا جائے گا۔ ان کو اچھی خوراک دی جائے گی اور ان کی صحت کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اس کے علاوہ مزدور بچوں کی تفریح کے لیے کلچرل پروگرام کا بھی انتظام کیا جائے گا۔ دیہی بال مزدوروں کے لیے اسکول میں ہی رہنے کا انتظام سرکار کرے گی تاکہ ان کو شہر سے دیہاتوں میں جانے میں مشکل نہ ہو اور چھٹی کے دو دن ان کو تربیت بھی دی جاسکے۔

دست کاری کی ٹریننگ دینے کے ساتھ ساتھ صنعتوں کے مالکان کو ملازمتی تربیت بھی مزدور بچوں کو دینا ہوگا۔ ADULT AND CONTINUING EDUCATION BOARDS اس بات کی ذمہ داری لیں گے کہ ان کی ذہنی ترقیات کے لیے اچھے تعلیمی پروگرام بنائیں اور ان کے لیے درسی کتابیں مہیا کریں اور سلیبس بھی تیار کریں۔

NUTRITION AND HEALTH PROGRAMMS کے تحت بال مزدوروں کو کم سے کم دن میں ایک وقت ان کے EMPLOYERS اچھا کھانا دیں گے۔ ان کی جسمانی جانچ ڈاکٹر کرتے رہیں گے تاکہ ان کی صحت کی طرف سے بورڈ کو اطمینان رہے۔ مزدور بچوں کو بغیر پیسہ دیئے ہیلتھ انشورنس اسکیم بھی دی جائے گی۔ ان کی بیماری کی چھٹی تنخواہ کے ساتھ دی جائے گی۔ ان کے اسپتال میں داخلہ اور علاج کا سارا خرچ ان کے نوکری دینے والوں کو اٹھانا ہوگا۔ کارخانوں میں کام کرتے وقت اگر کسی مزدور بچے کا حادثہ ہو جائے تو اس کے EMPLOYERS کو اس کا ہرجانہ دینا ہوگا، علاج کرانا ہوگا اور اس کے صحت مند ہونے تک اس کی پوری تنخواہ دینی ہوگی۔ اگر کوئی والنٹری آرگنائزیشن مزدور بچوں کی مدد کرنا چاہے تو وہ چائیلڈ لیبر ڈیولپمنٹ بورڈ کے ذریعہ مالی یا دوسری امداد کر سکتے ہیں۔

مزدور بچوں کے لیے سماج کی ذمہ داری

مزدور بچوں کی ترقی اور ان کی نشو و نما کی ذمہ داری سماج پر بھی ہوتی ہے۔ بچے اپنی اور اپنے خاندان کی غریبی سے تنگ آکر مجبوراً نوکری کرتے ہیں، جو ان کے اسکول جانے، کھیلنے کودنے اور موج مستی کے دن ہوتے ہیں اس میں اس ننھی سی جان کو زبردستی کام پر لگا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے نہ تو وہ جسمانی طور سے اور نہ ہی دماغی طور سے صحت مند رہ پاتے ہیں۔ زیادہ تر بچے دیہاتوں میں کھیتی اور دوسرے دھندوں میں لگ جاتے ہیں۔ مالکوں کو بھی ان کو ملازمت دینے میں دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو مزدوری بہت کم دینی ہوتی ہے اور دوسرے بچے زیادہ پھرتیلے ہوتے ہیں اور کام جلدی کر لیتے ہیں۔ ان مزدور بچوں کے ماں باپ خوشامد درآمد کرکے اپنے بچوں کو روزگار پر لگا دیتے ہیں تاکہ ان کی مالی حالت بہتر ہو سکے۔ اس موقعہ کا مالکان پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ مزدوری کم دیتے ہیں اور کام زیادہ لیتے ہیں بلکہ ان مزدور بچوں کو بعض اوقات جنسی طور سے بھی غلط استعمال کرتے ہیں۔ اس نازیبا حرکت سے بال مزدوروں کے ترقی کرنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے کو مجبور پاتے ہیں اور ایسے جال سے بہت کم نکل پاتے ہیں۔ سرکاری قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھی ان مزدور بچوں کو زری کے کام، سیسہ گلانے کے کام، قالین بننے کے کام، کپڑا بننے کے کام اور آتش بازی بنانے جیسے خطرناک کام کرنے پڑتے ہیں جس سے ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسی خطرناک بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے ان کا نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے اور موت کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔

مزدور بچوں کو نہ تو مالک تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ دیتا ہے اور نہ ہی ان کو کسی ماہر کارگری کا کام سکھاتا ہے۔ بس ہر طرح سے ان کو نچوڑتا ہی رہتا ہے۔ ایسی حالت میں جسمانی اور دماغی دونوں اعتبار سے مزدور بچہ اپاہج ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان حالات میں ہندوستانی قانون کی دفعہ ۲۴۔ اور ۳۹ کے تحت بال مزدوروں کو کسی بھی جوکھم کے کام میں ملازمت نہیں دی جاسکتی جس سے ان کی صحت خراب ہو جائے۔

انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (ILO) بھی ۱۵ سال سے کم عمر بچوں کو نوکری نہ کرنے کی صلاح دیتا ہے۔ حکومت ہند نے اس سلسلہ میں قانون بھی بنائے ہیں۔ جو خاندان غریبی کی لائن سے نیچے ہیں، ان کی امداد کے لیے بھارت سرکار نے مختلف اسکیمیں تیار کی ہیں۔

گروپد سوامی کمیٹی نے حکومت ہند کو اپنی سفارش میں کہا ہے کہ بال مزدوروں کی ترقیات کے لیے ان کے مالکان بچوں کو پڑھنے کی ہر آسانیاں فراہم کریں اور ان کو رسمی یا غیر رسمی تعلیم دلوائیں۔ ان کا ڈاکٹری معائنہ کرواتے رہیں اور ان کی تفریح کے لیے کلچرل پروگرام کا بھی انتظام کرتے رہیں۔

حکومت قانون کے ذریعہ مزدور بچوں کی ترقیات کے لیے قومی مقصد اس طرح پورا کر سکتی ہے کہ بال مزدوروں کو کسی بھی جوکھم کے کام میں نہ لگایا جائے۔ ان کے معاشی اور سماجی حالات کو سدھارا جائے۔ ان کی صحت کا پورا خیال رکھا جائے۔ ان کو دست کاری کی تربیت دی جائے تاکہ اس ہنر کے ذریعہ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی معاشی حالت سدھار سکیں۔ ان کو مزدوری کے کام سے روکنے کی بجائے ان کو تکنیکل تعلیم و تربیت دی جائے۔ ان کی نوکری کی بندشوں میں سدھار لایا جائے۔ مالکان سے مزدور بچوں کی مزدوری کا در مقرر کرا دیا جائے۔ ان کو PROVIDENT FUND اور بیماری کی چھٹی پوری تنخواہ کے ساتھ دی جائے، ان کو بونس دیا جائے، ان کے کسی صنعتی حادثہ کی حالت میں مالکان ان کی پوری معاشی اور معالجی امداد کریں۔ ان کی تعلیم کی ذمہ داری بھی مالکان پر عائد کرائی جائے۔ حکومت ہند

باقی صفحہ ۳۳ پر

پروفیسر حاجی شمس الدین

جواہر لال نہرو باپو کی نظروں میں

پنڈت جواہر لال نہرو کی تعریف میں کئی لوگوں نے کئی طرح کے تبصرے کیے ہیں لیکن مہاتما گاندھی نے ان کے لیے جو تبصرہ کیا ہے وہ بڑا باخلاصہ اور بامقصد ہے۔ انھوں نے کہا ہے: "ایک باپ، بھائی، مصنف مسافر، وطن پرست یا بین اقوامی شخصیت کی شکل میں وہ فطری طور پر چمک اٹھتے ہیں۔ تاہم وہ ایک ممتاز وطن پرست کی حیثیت میں اپنے ملک اور اس کی آزادی کے لیے سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ اس حیثیت میں وہ سب سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔" جواہر لال نہرو ۱۴ر نومبر ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ نہرو جی کا بچپن دولت وثروت کے درمیان گزرا۔ ابتدائی تعلیم وتربیت فرنگی استاد کے ذریعہ حاصل کرنے کے بعد اعلا تعلیم کے لیے انھیں غیر ممالک بھیجا گیا۔ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ نوجوان جواہر لال اپنے ملک میں ہونے والے واقعات کے تئیں ہمیشہ بیدار رہے۔ ۱۹۱۲ء میں قانون کی ڈگری حاصل کر کے جیسے ہی وہ ہندوستان واپس آئے انھیں الہ آباد ہائی کورٹ میں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے داخل کر دیا گیا لیکن حب الوطنی کے جذبے سے بھرا ان کا دل کورٹ میں کہاں لگنے والا تھا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کی کانگریس کانفرنس میں جواہر لال کی پہلی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی۔ وہ نئے نئے جنوبی افریقہ سے لوٹے تھے نیز جلد ہی ہندوستان کی جنگ آزادی کے نگہبان بننے والے تھے۔ گاندھی جی نے جواہر لال کو دیکھا۔ جوش وخروش اور جستجو سے بھرا ایک خوبصورت نوجوان جس کے قدموں میں رفتار، بازوؤں میں طاقت اور آنکھوں میں ایسی چمک جیسے کچھ کر گزرنے کے لیے بے تاب ہو۔ پہلی نظر میں ہی انھوں نے جواہر لال نہرو کو سمجھ لیا اور ملک کی آزادی کی لڑائی میں فوجی پیشوا کی شکل میں اپنے ساتھ لے لیا۔

اس کے بعد گاندھی جی کے ذریعہ شروع کیے گئے مختلف ستیہ گرہوں اور تحریکوں میں جواہر لال نہرو برابر ان کے ساتھ رہے اور آزادی کی لڑائی میں اپنا تعاون دیتے رہے۔ پہلی عالمی جنگ میں ہندوستان کو گھسیٹے جانے پر نہرو جی نے انگریزوں کی مخالفت کی۔ برٹش ایکٹ کے ذریعہ انھیں دبانے کی کوشش کی گئی لیکن نہرو جی کی قیادت میں اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں عدم تعاون تحریک میں حصہ لینے پر انھیں جیل جانا پڑا۔ جیل سے چھوٹنے پر ۱۹۲۷ء میں انھوں نے سائمن کمیشن کی مخالفت میں مظاہرہ منعقد کیا جس میں لاٹھی چارج میں بری طرح زخمی ہوئے۔ اس حادثے کا پورے ملک میں تیز ردعمل ہوا۔ مہاتما گاندھی بھی اس حادثہ سے بے چین ہو گئے اور انھوں نے دعا کرتے ہوئے کہا "ایشور تمھیں کئی برسوں تک محفوظ رکھے اور ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے اعلا ترین ذرائع بنائے۔"

نہرو جی بڑے نڈر اور صاف گو انسان تھے۔ جو بات انھیں خوشگوار نہیں لگتی اس کے لیے بڑے سے بڑے شخص کے سامنے بھی مودبانہ طور پر مخالفت کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں اپنے والد موتی لال نہرو کی صدارت میں تشکیل کردہ نہرو کمیٹی کی نوآبادیاتی خود مختار حکومت کی مانگ کی جواہر لال نے مخالفت کی۔ اس مخالفت کی وجہ وہ مکمل آزادی چاہتے تھے۔ جواہر لال کے بارے میں گاندھی جی کے یہ خیالات قابل ذکر ہیں:

"بہادری میں کوئی اسے مات نہیں دے سکتا وطن پرستی میں کون اس سے آگے بڑھ سکتا ہے؟ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ جذباتی اور جوشیلا ہے۔ آج کے دور میں یہ ایک اضافی صلاحیت ہے اور پھر اگر اس میں ایک دلیر کی طرح تیزی اور ٹکر لینے کی عادت ہے تو اس میں ایک سیاسی شعور بھی تو ہے۔"

۱۹۲۹ء میں بھارتی قومی کانگریس کی لاہور کانفرنس کے لیے صدر کا انتخاب کرنا تھا۔ اس کے لیے دو نام آئے۔ ایک پنڈت موتی لال نہرو کا اور دوسرا مہاتما گاندھی کا۔ دونوں ہی سب کے لیے برابر ہی سے معزز تھے۔ سوال اٹھا کہ کیا کیا جائے۔ اس کا حل حاصل کرنے کے لیے لکھنؤ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی نشست ہو رہی تھی۔ اسی وقت موتی لال نہرو اور گاندھی جی نے اکیلے میں لمحہ بھر کے لیے گفتگو کی اور حل نکل آیا۔ اعلان ہوا اس بار کانگریس کے صدر کے عہدے کی ذمہ داری جواہر لال نہرو سنبھالیں گے۔ سب نے ایک آواز سے اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔ گاندھی جی نے کہا "یہ مناسب ہوا ہے کہ جواہر لال نہرو کی "تاجپوشی" ہو۔ مستقبل ملک کی نوجوان طاقت کا ہی ہونا چاہیے۔"

۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو راوی کے کنارے کانگریس نے مکمل آزادی حاصل کرنے کا حلف لیا۔ اس کے بعد سے تحریک آزادی نے ایک نئی رفتار کے ساتھ نیا موڑ لے لیا۔ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی تحریک میں سرگرم حصہ لینے کے نتیجہ میں جواہر لال نہرو گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۹۳۲ء برٹش حکومت کے ذریعہ اعلان کردہ فرقہ وارانہ انتخابی نظام کی نہرو جی نے جیل سے ہی مخالفت کی۔

۱۵۰/۷۔ بیج ناتھ پارہ۔ رائے پور، ۴۹۲۰۰۱

اسی درمیان نہرو جی کی زندگی میں قدرتی آفت آن پڑی۔ ۱۹۳۲ء میں ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ لمحہ بھر کے لیے انھیں محسوس ہوا کہ وہ تنہا رہ گئے ہیں لیکن جلد ہی باپو نے یہ کمی پوری کردی۔ اس کے بعد جواہر لال نہرو کو جب بھی کسی صلاح و مشورہ کی ضرورت ہوتی تو وہ فوراً گاندھی جی کے پاس جاتے۔ ایک بچہ کی مانند کبھی کبھی جواہر لال جی گاندھی جی سے لڑتے، ان کی مخالفت بھی کرتے لیکن آخر کار ان میں ہی اپنا حقیقی خیر خواہ اور رہنما پاتے۔ باپو نے ایک بار ان سے کہا تھا "میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ میں تمہارے لیے ایک ذہین باپ کی طرح ہوں اور میرے دل میں تمہارے لیے موتی لال جی سے کم محبت نہیں ہے۔"

۱۹۳۶ء میں ان کی شریک حیات کملا نہرو جنہوں نے زندگی کے ساتھ ساتھ نہرو جی کی جنگ آزادی کے میدان عمل میں ہمیشہ ان کا ساتھ دیا تھا، انھیں چھوڑ کر دنیا سے کوچ کر گئیں۔ اس وقت نہرو جی جیل میں تھے اور کملا جی غیر ملک میں علاج کے لیے داخل تھیں۔ اسی وقت نہرو جی کو کچھ وقت کے لیے جیل سے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ وہ اپنی بیوی کا علاج کرا سکیں۔ لیکن تب تک کافی دیر ہو چکی تھی اور بچایا نہیں جا سکا۔ نہرو جی لمحہ بھر کے لیے غمگین ہو گئے لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے دل پر قابو پا لیا۔ ملک کے عظیم دکھ کے سامنے انھوں نے اپنے ذاتی دکھ کو بھلا دیا اور حسب سابق جنگ آزادی میں کمر بستہ ہو گئے۔ ان کے ایثار اور خدمت کے جذبہ سے متاثر ہو کر باپو نے کہا تھا "اس بات سے ہمارے دلوں میں خوشی ہونی چاہیے کہ ہمارے اسی خوبصورت ملک نے ایسے عظیم شخص پیدا کیے ہیں جن میں ایثار اور خدمت کے غیر معمولی جذبات بھرے ہوئے ہیں۔ جواہر حقیقت میں سچا جواہر (ہیرا) ہے۔"

۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ اس میں ہندوستان کو شامل کرنے پر نہرو جی نے مخالفت کی اور بھی ستیہ گرہ شروع کر دیا۔ ہندوستان کی آزادی پر تبادلہ خیال کرنے کرپس مشن آیا لیکن نہرو جی نے اس کی بھی مخالفت کی۔ اس وقت ایک واقعہ رونما ہوا جس کا ذکر گاندھی جی نے بڑی دلچسپی اور فخر کے ساتھ کیا ہے۔ "جنگ کی تجویز پر ایک ڈرافٹ تیار کرنے کے لیے مجھے بلایا گیا اور جواہر لال کو بھی۔ میں اپنے ڈرافٹ پر بڑا فخر محسوس کر رہا تھا لیکن وہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ بغیر دلیل پیش کیے، دباؤ ڈالنے میں اپنی تجویز نہیں لے جا سکتا۔ لیکن ایسی کوئی میری خواہش نہیں تھی۔ پھر ہم نے جواہر لال کی تجویز سنی اور میں نے فوراً قبول کیا کہ اس میں ملک کے خیال کو یہاں تک کہ پوری ورکنگ کمیٹی کی رائے کو میری توقع سے زیادہ سچائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے" اور باپو نے نہرو جی کی ذہنی صلاحیت کے سامنے ہار مان لی۔

جواہر لال نہرو کے ہمہ گیر استعداد سے گاندھی جی اتنے متاثر تھے کہ پالیسی سے متعلق کچھ باتوں پر یا کام کرنے کے طریقے پر اختلاف ہونے کے باوجود بھی انھوں نے نہرو جی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ وہ کبھی ان سے الگ نہیں ہوئے۔ سچ پوچھا جائے تو نہرو جی ان کی طاقت، فعل، ذہانت اور جذبے کے رہبر تھے۔ باپو نے اس بارے میں کہا ہے کہ "ہر قدم پر میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک تصویر رہتی ہے جواہر لال کی اور وہ کیا کہے گی یہ ہی سوچتا رہتا ہوں۔ جہاں تک کانگریس پر میرے اختیار کا تعلق ہے وہ میرا وارث ہے۔ میں تو صرف اس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھال رہا ہوں۔"

اگست ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے "بھارت چھوڑو تحریک" چھیڑی۔ اس وقت ملک کے بڑے رہنماؤں کے ساتھ جواہر لال جی بھی گرفتار ہوئے۔ فروری ۱۹۴۶ء میں برٹش کیبنٹ مشن بھارت آیا جس کے نتیجہ میں جواہر لال نہرو کو گورنر جنرل کی مجلس عاملہ کا نائب صدر مقرر کیا گیا۔ مسلم لیگ کے اڑ جانے پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کی اسکیم پیش کی۔ گاندھی جی اس کے حق میں نہیں تھے لیکن مجبور ہو کر نہرو جی کو اسے منظور کرنا پڑا۔ ملک آزاد ہوا اور نہرو جی اس کے پہلے وزیر اعظم بنے۔ ملک کی تقسیم کے دوران رونما حادثات نے گاندھی جی اور نہرو جی دونوں کو گہری چوٹ پہنچائی تھی اور وہ آنے والے برسوں کی مشکلات اور مسائل سے پوری طرح باخبر تھے۔ اس وقت گاندھی جی نے نہرو جی سے کہا تھا "تمہیں قوم کی خاطر کانٹوں کا تاج پہننا ہی ہوگا" اور نہرو جی نے اسے بسر و چشم قبول کیا۔

نہرو جی کو کسی قسم کے مادے اثاثے کی طلب نہیں تھی۔ شان و شوکت کے مالک، والد کے تن تنہا پسر ہونے کے باعث وہ شہزادگی کی زندگی بسر کر سکتے تھے لیکن ملک کی خاطر انھوں نے شروع سے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔

وزیر اعظم کے سب سے اعلا عہدہ پر پہنچنے کے بعد بھی انھیں مال و زر سے کبھی انسیت پیدا نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ اپنی عظیم آبائی رہائش گاہ آنند بھون کو بھی انھوں نے ملک کے حق میں نذر کر دیا۔ شاید اس لیے مہاتما گاندھی نے ان کے متعلق کہا تھا "ان میں ایثار کا عمیق جذبہ ہے۔ وہ اپنے تمام حقوق اور اختیارات کو اسی طرح بآسانی چھوڑ سکتے ہیں جس طرح ایک سانپ بڑی سہولت سے اپنی کینچلی اتار پھینکتا ہے۔"

نہرو جی کا نظریہ ہمہ گیر تھا۔ ان کا قومی رشتہ صرف اپنے ملک تک ہی محدود نہ تھا بلکہ دنیا کے تمام ممالک تک لامحدود اور غمزدہ، آلام و استحصال کے مارے تمام لوگوں سے انھیں محبت تھی۔ گاندھی جی نے اسی پس منظر میں کہا ہے کہ "پنڈت جواہر لال نہرو ذہنی طور پر ہندوستانی ہیں لیکن چوں کہ وہ بین اقوامی ذہن کے آدمی تھے اس لیے انھوں نے ہمیں ہر چیز میں بین اقوامی نظریہ رکھنے کا عادی بنا دیا۔" اتنا ہی نہیں اس معاملہ میں ان کی اعلا ظرفی کو آسانی سے قبول کرتے ہوئے گاندھی جی نے مزید حد تک یہ بھی کہہ دیا کہ "پنڈت نہرو ان معلمات میں میرے استاد ہیں۔"

جواہر لال جی اور گاندھی جی کے درمیان کئی معاملات میں اختلاف تھا اور یہ اختلاف بلا دلیل ہوا کرتا تھا۔ پھر بھی گاندھی جی کو ان پر پورا اعتماد اور بے انتہا لگاؤ تھا۔ انھوں نے اس بات کا بار بار اعادہ کیا ہے "پنڈت جواہر لال نہرو میرا قانونی جانشین ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب میں اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا وہ ان تمام کاموں کو حسن و خوبی انجام دے گا جنھیں میں انجام دیتا رہا ہوں۔ وہ بہت جرأت مند ہے۔ اکثر وہ مجھ سے جھگڑا کرتا ہے لیکن جب میں نہ ہوں گا تو وہ میرے کاموں کی اہمیت کو سمجھے گا۔" انھوں نے بڑی بصارت اور دور اندیشی کے ساتھ پھر کہا "وہ کہتا ہے کہ میری زبان اس کے سمجھ میں نہیں آتی اور جو زبان وہ بولتا ہے وہ میرے لیے غیر ملکی ہے۔ اس میں سچائی ہو یا نہ ہو لیکن دلوں کو

باقی صفحہ [illegible] پر

رئیس مرزا

مہاتما گاندھی — حیات و افکار

ہندوستان کو آزادی دلانے والے ہندوستانی قوم کے باپو مہاتما گاندھی کی شخصیت نے تاریخ پر جو زبردست اثر ڈالا ہے وہ اس زمانے کے اور بڑے لوگوں کو نصیب نہیں ہوا۔

موہن داس کرم داس چند گاندھی ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو بمقام پور بندر کاٹھیاواڑ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے خاندان کے افراد تقریباً تین پشتوں سے کاٹھیاواڑ کی مختلف ریاستوں میں دیگر بڑے بڑے عہدوں پر معمور رہے تھے۔ اس لیے یہ خاندان نہایت معزز و ممتاز خاندان شمار کیا جاتا تھا۔

آپ کے دادا کا ایک قصہ مشہور ہے کہ وہ پور بندر میں وزیر اعظم تھے لیکن ریاستی سازشوں کی وجہ سے آپ کو قریب کی ایک ریاست میں پناہ لینے کی ضرورت پیش آئی۔ وہاں آپ نے والئی ریاست کو بائیں ہاتھ سے سلام کیا۔ پوچھا گیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا تو آپ نے نہایت مستقل مزاجی سے جواب دیا کہ میرا داہنا ہاتھ پور بندر کے ساتھ وفاداری کے عہد میں بندھا ہوا ہے۔

. . . . . مہاتما گاندھی کے والد . . اپنی آزاد خیالی کی بنا پر بہت مشہور تھے۔ آپ اپنی آخری عمر میں ریاست راجکوٹ ڈکاتیر میں دیوان ہوگئے اور اسی ریاست کے پنشن خوار ہو کر آپ نے وفات پائی۔

موہن داس کرم چند گاندھی اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کی ماں نہایت ہی پرانے خیال کی خاتون تھیں اور پوجا پاٹ اور برت رکھنے میں زیادہ مشغول رہتی تھیں جس کا بہت زیادہ اثر گاندھی جی پر بھی پڑا جو دنیا میں ایک عظیم الشان شخصیت کے مالک بنے۔

گاندھی جی کی تعلیم و تربیت ایک مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اگرچہ آپ کا خاندان برہمن خاندان نہ تھا لیکن کئی پشت سے خاندان میں علم و دولت چلی آرہی تھی۔

آپ ایک محنتی طالب علم تھے اور کھیل کود اور ورزش وغیرہ کو ناپسند کرتے تھے۔ خود آپ نے یہ کہا کہ میں شرمیلا لڑکا تھا اور لوگوں سے ملنے جلنے سے جی چراتا تھا۔ بس اپنی کتاب اور سبق سے مجھے کام تھا۔ اسکول کا گھنٹہ ہوتے ہی اسکول جانا اور اسکول بند ہوتے ہی گھر چلے آنا یہی میرا روزمرہ کا معمول تھا۔

سات سال کی عمر تک آپ پور بندر میں رہے۔ وہاں سے آپ کا خاندان راجکوٹ گیا۔ جہاں ان کے والد کو ریاست میں عہدہ مل گیا۔

۱۳ سال کی عمر میں گاندھی جی کی شادی ہوگئی ایک برس تک تعلیمی سلسلہ منقطع رہا۔ پھر آپ نے ایک ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی۔ یہاں آپ نے سنسکرت کی شدھ بدھ حاصل کی جس سے آپ کو بعد میں ہندو دھرم کی مذہبی کتابیں پڑھنے میں مدد ملی۔ آپ کہتے تھے کہ تمام ہندوستانی بچوں کو ہندی، سنسکرت، اردو، فارسی، عربی اور انگریزی سکھائی جائے۔

۱۷ سال کی عمر میں آپ نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا اور شامل داس کالج بھاؤنگر میں بحیثیت طالب علم داخل ہوئے لیکن وہاں آپ کو بڑی مشکل پیش آئی جس کا بیان آپ نے خود کیا ہے کہ "کالج میں لیکچروں کو سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس سے دلچسپی لینا تو بڑی بات ہے۔

بالآخر رشتہ داروں نے آپ کی ماں کو جو اب بیوہ ہوگئی تھیں، مشورہ دیا کہ لڑکے کو انگلینڈ بھیج دیا جائے تاکہ بیرسٹر بن جائے اور یہ ایک آسان کام ہے۔ آپ کی ماں ان کو انگلینڈ بھیجنے پر راضی ہوگئیں۔ ستمبر ۱۸۸۷ء میں آپ بمبئی سے لندن روانہ ہوگئے۔

انگلینڈ میں آپ نے کیا کیا اور کن لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور کس طرح زندگی بسر کی یہ سب آپ نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں مفصل لکھا ہے۔ بہت سے خطرات تھے لیکن آپ ان سے محفوظ رہے کیوں کہ آپ کی عقلمند ماں نے آپ سے عہد لیے تھے۔ اور ماں کے عہد کا احترام آپ کے دل پر غالب تھا۔ آپ نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ شراب اور گوشت سے پرہیز کریں گے اور عورتوں سے نہ ملیں گے۔ آپ نے انگلینڈ میں قانون کی تعلیم میں بڑی محنت کی اور اسی کے ساتھ لاطینی اور فرانسیسی زبان بھی سیکھ لی اور لندن کا میٹریکولیشن امتحان بھی پاس کر لیا۔ آپ نے مغربی رقص اور گٹار بجانے کے فن کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کی اور انگریزی طرز زندگی اپنانے میں منہمک رہے۔

انگلینڈ میں بھی آپ نے مسز اینی بسینٹ اور میڈم بلاوٹسکی سے ملاقات کی اور ان ہی اثرات کے تحت آپ نے ہندو فلاسفی کی کتابوں کا مطالعہ غور و خوض سے شروع کیا۔ عیسائی مذہب کی طرف بھی آپ کا کچھ رجحان ہوگیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مشہور وعظ جو انھوں نے زیتون پر دیا تھا آپ بہت پسند کرتے تھے۔ برائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی تعلیم کا آپ پر خاص اثر ہوا اور آپ نے ہندو مذہبی کتابوں میں اس کی نظیر اور مثال

ڈھونڈنی شروع کی۔

۹ ماہ کی محنت اور مطالعہ کے بعد آپ نے جون ۱۸۹۱ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کرلیا اور اس کے دو روز بعد ہی ہندوستان روانہ ہو گئے۔

آپ نے بمبئی اور راجکوٹ میں بیرسٹری شروع کی۔ راجکوٹ میں آپ کو تھوڑی سی کامیابی ہوئی لیکن مقدمات میں سازش کی فضا سے آپ کا جی گھبرانے لگا۔

پوربندر کے ایک تجارتی ادارے کی شاخ جنوبی افریقہ میں تھی۔ اس تجارتی فرم نے آپ سے کہا کہ افریقہ جاکر ایک اہم مقدمہ میں ہماری امداد کیجیے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر آپ اپریل ۱۸۹۳ء میں افریقہ روانہ ہو گئے۔

یہ واقعہ آپ کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوا۔ ابتدا میں آپ کا ارادہ تھا کہ ایک سال افریقہ میں رہیں۔ لیکن وہاں ۲۰ سال تک آپ کا قیام رہا۔ اس بیچ میں صرف ایک بار چند دن کے لیے آپ ہندوستان آئے تھے۔

نٹال میں جب آپ پہنچے تو آپ میں سیاسی کام کا جذبہ پیدا ہوا۔ کیوں کہ وہاں ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا سلوک نہایت ہی شرمناک اور ذلت آمیز تھا۔ جس روز آپ نٹال پہنچے ہیں اسی روز آپ کو ڈربن میں ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں جانا پڑا۔ آپ کو حکم دیا گیا کہ اپنی پگڑی اتارلو۔ آپ نے اپنی پگڑی نہیں اتاری اور عدالت سے باہر چلے آئے۔ چند روز کے بعد آپ ریلوے ٹرین سے پریٹوریا جا رہے تھے۔ حالاں کہ آپ کے پاس فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ لیکن آپ کو فرسٹ کلاس کے ڈبہ سے زبردستی نکال دیا گیا اور جب کبھی آپ کو گھوڑا گاڑی سے سفر کرنا ہوتا تھا وہاں آپ کو کوچوان کی بغل میں بیٹھنا پڑتا تھا۔

ہندوستانیوں کے ساتھ افریقہ میں جو سلوک برطانوی حکومت کرتی تھی اس کا آپ پر بہت اثر پڑا۔ آپ نے ایک درخواست تیار کی جس پر بہت سے ہندوستانیوں کے دستخط تھے۔ اس کو نٹال مجلس قانون ساز میں بھیجا گیا اور لارڈ ڈربن وزیر مالیات کے پاس ایک میمورنڈم بھیجا گیا جس پر دس ہزار ہندوستانیوں کے دستخط تھے۔ گاندھی جی کو وہاں کے ہندوستانیوں نے مجبور کیا کہ وہ افریقہ میں رہ کر ان کی رہنمائی کریں اور ہندوستان واپس نہ جائیں اور آپ کے اخراجات کے لیے یہ انتظام کیا گیا کہ ہندوستانی تجارتی اداروں کے مقدمات آپ ہی سے کرائے جائیں۔

افریقہ میں جب آپ نے رہنے کا پکا ارادہ کرلیا تو پھر ہندوستانیوں کے قومی وقار، خودداری اور ان کے حقوق کے لیے آپ نے کام شروع کیا۔ مئی ۱۸۹۴ء میں آپ نے نٹال انڈین کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۹۴ء میں آپ چھ ماہ کے لیے ہندوستان واپس آئے اور نٹال میں ہندوستانیوں کی حالت کے متعلق آپ نے متعدد جلسوں میں تقریریں کیں اور ایک رسالہ بھی نکالا جس کی بڑی اشاعت ہوئی۔ افریقہ میں آپ ہندوستانیوں کے لیڈر بن گئے۔ ڈربن کے قریب آپ نے ایک آشرم بھی بنایا جہاں سادہ اور پاکباز زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی جاتی تھی۔

جس مقدمے میں گاندھی جی حصہ لے رہے تھے وہ کئی ماہ تک پریٹوریا میں ہوتا رہا۔ گاندھی جی کے موکل مسلمان تھے اور اسی زمانے میں سب سے پہلے آپ نے مذہب اسلام سے دلچسپی لینی شروع کی اور قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا۔

گاندھی جی افریقہ سے ہندوستان آگئے اور انھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی کو ایک نیا رخ دیا۔ یہاں انھوں نے ہر لڑائی ستیہ اور اہنسا کے فلسفے کی بنیاد پر لڑی۔ چاہے وہ سول نافرمانی کی تحریک ہو یا چورا چوری کا واقعہ ہو۔ گاندھی جی نے کہیں بھی ستیہ اور اہنسا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہ ہندوستان کے تمام لوگوں کو دل سے عزیز رکھتے تھے چاہے وہ کسی بھی فرقہ یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔ ان کی پرارتھنا سبھائیں تاریخ کا یادگار باب ہیں۔ جو ان کے پریہ بھجن رگھوپتی راگھو راجہ رام۔ ایشور اللہ تیرے نام سے شروع ہوتی تھیں۔

مہاتما گاندھی نے ہندوستان اور یہاں کے عوام کی ترقی اور خوشحالی کے لیے جو خواب دیکھے تھے مندرجہ ذیل سطور میں انھیں کے الفاظ میں ان کی ایک جھلک پیش خدمت ہے:

"میں اس ہندوستان کے لیے کام کروں گا جسے ایک غریب سے غریب آدمی بھی اپنا وطن سمجھتا ہو اور اس کی تعمیر میں اس کی آواز موثر ہو۔ اس ہندوستان کے لیے کام کروں گا جس میں اونچے اور نیچے آدمیوں کا فرق نہ ہوگا۔ جس میں تمام فرقے پورے اتحاد اور اتفاق سے رہ سکیں گے۔"

"اس ہندوستان کے لیے کام کروں گا جس میں چھوت چھات کی لعنت نہ ہوگی۔ جہاں عورتیں اسی طرح بہرہ مند ہوں گی جس طرح مرد ہمارا رشتۂ محبت ساری دنیا سے استوار ہوگا اس لیے ہم نہ کسی ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور نہ ہی اس کا موقعہ دیں گے کہ ہم سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھائے۔"

"سوراج جس کی بنیاد اہنسا پر ہے۔ اس میں لوگوں کو اپنے حقوق جاننے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ان کو اپنے فرائض منصبی جاننے کی بھی ضرورت ہے۔ کوئی حق ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ ہی فرض نہ پیدا ہوتا ہو۔ سچے حقوق وہی ہیں جن کے فرائض کی ادائیگی ہو۔"

"جمہوریت کے متعلق میرا عقیدہ یہ ہے کہ جس کے تحت کمزور ترین اور مضبوط ترین دونوں یکساں طور پر حقوق رکھتے ہوں۔"

"میں غائر مطالعہ اور تجربہ کے بعد ان نتائج پر پہنچا ہوں۔
تمام مذاہب سچے ہیں۔
تمام مذاہب مجھے اسی طرح عزیز ہیں جیسے مجھے میرا ہندومت۔
میں تمام عقیدوں کا اسی طرح احترام کرتا ہوں جس طرح اپنے عقیدے اور ایمان کا۔"

"میرا مذہب انتہائی سچائی اور عدم تشدد ہے۔ عدم تشدد میرے ایمان کا پہلا اور آخری رکن ہے۔ ساری انسانیت کے لیے وہی ایک زبردست طاقت ہے۔ عدم تشدد بہادری کی بلند چوٹی ہے، وہ ایک کبریائی شعاع عمل ہے۔ عدم تشدد کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا۔"

"اگر میری زندگی میں نہیں تو میرے مرنے کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کو معلوم ہوگا اور

باقی صفحہ کور ۳ پر

فیشن تکنالوجی کا قومی ادارہ

۱۹۸۰ء کے بعد سے ہندوستان نے آہستہ آہستہ تیار کپڑوں کی اہم صنعت میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ ہندوستان کی دھوتی، ساڑی، رنگ دستر، کنگی وغیرہ بغیر سلے کپڑوں کی جگہ روایتی انداز سلے سلائے کپڑے استعمال کرنے کا رواج مقبول ہوا۔ اس طرح ہندوستان میں تیار کپڑوں کی پسند اور ان کی جدید طرز پر تیار مقابلتاً ایک نیا تصور ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں کپڑے کی صنعت خاص کر تیار کپڑوں کی صنعت مضبوط تر ہوتی گئی۔ ریڈی میڈ کپڑوں کے صنعت نے یوں تو ہر شعبے میں ترقی کی ہے تاہم برآمدات کے شعبے میں اس کی کارگزاری بے حد اہم ہے۔ اقتصادی اصلاحات کا عمل، عالمی تجارتی تنظیم کی تشکیل، کوٹہ سسٹم کا رفتہ رفتہ خاتمہ، مشینوں وغیرہ کی فراخدلانہ درآمدات وغیرہ نے ایک ایسی فضا بنا دی جس میں سلے سلائے کپڑوں کی صنعت نے تیزی سے ترقی کی ریڈی میڈ گارمنٹ ہماری برآمداتی اشیار کی فہرست میں اہم ترین شے ہے۔

ہندوستان نے سلے سلائے کپڑوں کی برآمدات بالعموم ترقی یافتہ ملکوں کے کمتر بازاروں میں شروع کی ابتدا میں سب سے زیادہ نفع جو مقابلتاً حاصل رہا، وہ اس لیے تھا کہ ہندوستان میں محنت کش طبقے کی مزدوری کم ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ تیار کپڑوں کی برآمدات سے بحساب فی یونٹ اچھی قیمت ملنی شروع ہو گئی اور یہ صورت حال بہتری کی طرف مائل رہی، پارچات کی طویل تاریخ کے باوجود اور ہنر مندیوں اور دست کاریوں کے سابقہ قیمتی مدد کے ہوتے ہوئے بھی ہندوستان کا حصہ کپڑے کی بین اقوامی تجارت میں ۳ تا ۴ فی صد ہی تھا۔ ہندوستان میں کپڑے کی صنعت کو ہینڈلوم کے گوناگوں ڈیزائنوں اور چھپائی کے مخصوص نمونوں کی وجہ سے نیز ہندوستان سوت کی پیداوار کی جگہ ہونے کی وجہ سے تقویت ملی، البتہ ہم ان سب وسائل سے بھرپور استفادہ نہ کر سکے اہماری روایت عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکیں چنانچہ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر ٹیکسٹائیلز کی وزارت نے ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس کی جس میں تیار کپڑوں کی ضرورت کو پورا کرنے والے ماہرین تیار ہو سکیں اور یہی پس منظر فیشن تکنالوجی کے قومی ادارے واقع نئی دہلی کے قیام کا باعث بنا۔ چنانچہ یہ ادارہ ۱۹۸۶ء میں نئی دہلی میں قائم کر دیا گیا۔

ادارے کے اغراض و مقاصد

عالمی سطح پر صنعتی شعبوں میں مقابلہ ہر مال فروخت کرنے کی جو ضرورت سامنے آئی اس کو پورا کرنے کے لیے فیشن کی صنعت نے فروغ پایا اور یہی اس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ کپڑے کی صنعت کے ماہرین کی فراہمی میں یہ ادارہ معاون ہے اور اس طرح غیر ملکی زر مبادلہ کمانا ہی اس کا اہم رول ہے۔ ۲۲ جنوری ۱۹۸۶ء کو اس ادارے کے لیے سوسائیٹیز رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۶۰ء کے تحت رجسٹریشن عمل میں آیا۔ یہ سوسائٹی جن اغراض و مقاصد کے تحت قائم کی گئی وہ کچھ اس طرح ہیں۔

فیشن تکنالوجی ادارے واقع نئی دہلی کا نظم و نسق سنبھالنا اور ایسے اہل کاریگر تیار کرنا جو تکنیکی اعتبار سے بلند مقام رکھتے ہوں۔ یہ کام تحقیق، خدمات اور تربیت کے پیشہ ورانہ پروگرام کے تحت انجام دینے پر زور دیا گیا جس سے فیشن تکنالوجی فروغ پا سکے۔

ادارے کے ذمہ ڈپلومہ سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا کام رکھا گیا جو مختلف سطحوں پر دی جا سکیں، اس ادارے کے تربیت یافتہ کاریگروں کو یہ اسناد دی جاتی ہیں۔ اس طرح کی اسناد کی تقسیم سے قبل ایک معیار پر ان کو پرکھا جاتا ہے اور اس کے بعد قابلیت سرٹیفکیٹ اور دیگر اعزازات دیے جاتے ہیں۔

یہ ادارہ فیلڈشپ، اسکالرشپ، انعامات اور میڈل عطا کرنے کے لیے مجاز قرار دیا گیا اس سلسلے میں قواعد و ضوابط مرتب کیے گئے ہیں۔

اعزازی ایوارڈز اور دیگر اعزازات عطا کرنے کے لیے بھی یہ ادارہ مجاز ہے۔ فیشن کی صنعت کی تحقیق اور عملی مطالعے بھی اس ادارے کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔ مقامی طور پر تیار مال، اس سلسلے میں مقامی طور پر تیار مال کا استعمال بڑے پیمانے پر کپڑوں کی تیاری بہترین ڈیزائن سازی اور بین اقوامی مال سے استفادہ وغیرہ بھی اس ادارے کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں۔

ادارہ فیشن تکنالوجی سے متعلق جدید ترین معلومات اور تجارتی اعداد و شمار پر مبنی لٹریچر تیار کراتا ہے جس میں ہندوستانی ڈیزائنوں کی تیاری اور مقبولیت کے بارے میں خصوصی معلومات ہوتی ہیں۔

دست کاروں، مینوفیکچررس، ڈیزائن سازوں اور فیشن کی اشیار کو برآمد کرنے والوں کو تکنیکی امداد فراہم کرنا بھی اس ادارے کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

ڈپلومہ پروگرام

یہ ادارہ درج ذیل پروگراموں میں پیشہ ورانہ مہارت فراہم کرتا ہے:

۱۔ معاون پرزوں کے ڈیزائنوں کی تیاری جو ۱۹۹۱ء

باقی صفحہ ۱۲ پر

ڈاکٹر عرفان علیمی

مرگی۔ ایک اذیت ناک مرض

مرگی ایک دماغی مرض ہے جو دنیا کے ہر ممالک میں پایا جاتا ہے اور بچے، جوان، بوڑھے سبھی اس مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ ویسے یہ مرض عموماً بچوں کو ہی اپنا شکار بناتا ہے۔ آج بھی اس مرض کے بارے میں لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں اور اپنی لاعلمی اور عدم واقفیت کے سبب اسے دیوی دیوتاؤں کی ناراضگی اور بھوت پریت کا چکر سمجھ کر مرگی کے مریضوں کے ساتھ (دورہ پڑنے کی حالت میں) عجیب وغریب حرکتیں اور تدابیر اختیار کرتے ہیں جس کو دیکھنے کے لیے مجمع لگ جاتا ہے۔ کوئی مریض کو چپل اور جوتا سنگھاتا ہے تو کوئی جھاڑ پھونک کر کے مریض کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ نہ تو پاگل پن کا دورہ ہے اور نہ ہی بھوت پریت اور دیوی دیوتاؤں سے اس کا کوئی تعلق ہے۔

یہ مرض کیوں ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں طب اور سائنس اپنی تمام تر ترقی کے باوجود مرض کا اصل سبب متعین نہیں کر سکی ہے جب کہ معالجین نے ہزاروں سال قبل اس مرض کی تشخیص اور تفصیلات کتابوں میں درج کی ہیں لیکن اب تک جو تحقیقات اور تجربات ہوئے ہیں ان کی بنیاد پر ہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ مرض دماغی خلیوں میں خرابی یا کمی کے سبب ہوتا ہے۔ اس میں دماغ کے کچھ خلیات خود بخود فعال ہو جاتے ہیں جس کے سبب وقفے وقفے سے دورہ پڑنے لگتا ہے۔ اگر دوروں کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے تو دماغی کمزوری یا دماغی معذوری پیدا ہو سکتی ہے اور موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

دماغ میں مختلف رطوبتیں ہوتی ہیں۔ اگر ایک رطوبت اسٹائل کولین (ACETYL-CHOLINE) میں زیادتی اور گابا (GABA) نامی رطوبت میں کمی ہو جانے کے سبب دماغ کے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مختلف حصے غیر ضروری طور پر متحرک ہو جاتے ہیں جس سے یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ دماغی خلیوں میں تبدیلی اور خرابی آنے کے سبب بھی یہ مرض ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دماغ کے اندر یا باہر کسی طرح کی چوٹ لگنے سے بھی یہ مرض ہو جاتا ہے۔ دماغ میں رسولی ہونے کے سبب بھی دورے پڑتے ہیں۔ گردن توڑ بخار یا ایسے امراض جن میں دماغ میں سوزش یا نقصان پہنچے، دورے کا سبب بن سکتا ہے۔ دماغ کے آپریشن کے بعد بھی کچھ لوگ اس مرض کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ قے دست ہونے پر بچوں کے جسم میں ELECTROLYTES کا توازن بگڑ جانے سے بھی دورے پڑ سکتے ہیں۔ موروثی وجوہات کے سبب بھی یہ مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ خون میں شکر کی کمی یا زیادتی، آکسیجن کی کمی، زہریلے مادوں کی زیادتی کے سبب بھی دورے پڑ سکتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے خون میں URIA کی زیادتی ہو جائے تو بھی اس قسم کا دورہ پڑ سکتا ہے۔ بچوں میں دورہ پڑنے کا بیشتر سبب پیٹ میں کیڑوں کی موجودگی ہوتی ہے۔ کچھ ایسی دوائیں بھی ہیں جن کے استعمال سے دورے پڑ سکتے ہیں۔

اس مرض کی کئی قسمیں ہیں لیکن سب سے زیادہ پائی جانے والی قسم GRAND MAL EPILEPSY ہے۔ اس میں سب سے پہلے مریض کی دماغی حالت تبدیل ہونے لگتی ہے یعنی مریض کو دورہ پڑنے کا احساس پہلے ہی ہونے لگتا۔۔ جیسے جیسے دورے کا وقت قریب آتا ہے، مریض کو پیٹ کے اوپری حصے میں عجیب طرح کا احساس ہونے لگتا ہے تب دورے کی شروعات ہوتی ہے یعنی مریض بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے اور جسم میں غیر معمولی اکڑن پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ لمحات تک یہی حالت بنی رہتی ہے اس کے بعد چہرے، ہاتھ، پیر اور عضلات مڑنے تڑنے لگتے ہیں۔ منھ سے جھاگ نکلنے لگتا ہے اور بول و براز غیر ارادی طور پر خارج ہو جاتا ہے۔ یہ مدت چند لمحوں کی ہوتی ہے، اس کے بعد دورہ ختم ہو جاتا ہے۔ مریض پرسکون ہو جاتا ہے۔ عضلات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور مریض نیند کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔ دورے کے کچھ دیر بعد تک مریض میں غور و فکر کی قوت نہیں رہ جاتی ہے اور اس کے سر میں تیز درد بھی ہو سکتا ہے۔

بچوں میں PETI TMAL EPILEPSY خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ اس میں دورے بچوں کو بخار کی تیز حالت میں آتے ہیں۔ جو اکثر بخار اترنے کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں مگر کبھی کبھی مکمل مرگی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ عام طور پر اس مرض کا شکار ۵ سے ۷ سال کے بچے ہوتے ہیں۔ اس میں بچہ چند لمحے کے لیے اپنا ہوش و حواس کھو دیتا ہے۔ آنکھیں اور حرکت رک سی جاتی ہیں۔ جسم کو معمولی سا جھٹکا محسوس ہوتا ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے یہ احساس تک نہیں رہتا کہ چند لمحے پہلے تک اس کی کیا حالت تھی؟

مرگی کی ایک قسم TEMPORALLOBE EPILEPSY ہوتی ہے جس میں مریض کی حرکتیں عجیب وغریب اور غیر متوقع ہوتی ہیں مثلاً اچانک

مدیر نوائے طب و صحت، بیگم سرائے۔ الہ آباد۔ ۱۵

یوجنا، نئی دہلی

شدید غصے میں آنا، اچانک تیز چلنا، توڑ پھوڑ کرنا، سامان ادھر ادھر پھینکنا، عجیب سی بو محسوس کرنا، سننے کی طاقت کا کم ہو جانا اور دیکھنے و چکھنے کی طاقت کا کمزور ہو جانا وغیرہ۔ اکثر ان علامات کا مریض بے ہوش ہو جاتا ہے لیکن وہ پوری طرح بے ہوش نہیں ہوتا ہے بلکہ اسے اپنے اردگرد کے ماحول کا احساس رہتا ہے۔

کچھ مریضوں میں مرگی کا دورہ جسم کے کسی ایک حصے میں مرکوز ہوتا ہے۔ یعنی مریض کے جسم کا صرف ایک حصہ متاثر ہوتا ہے جیسے ایک ٹانگ یا ایک بازو کو جھٹکا لگتا ہے۔ مریض بے ہوش ہو جاتا ہے اور جسم بے جان۔ یہ کیفیت چند سیکنڈ کے لیے ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ جھٹکا مکمل دورے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کبھی یہ دورہ جسم کے کسی ایک حصے کو متاثر کرکے بعد میں پورے جسم میں پھیل جاتا ہے۔ اسے JACKSONIAN-FITS کہتے ہیں۔

مرگی کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جس میں مسلسل دورہ پڑتا ہے یعنی ایک دورہ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا ہے۔ اسے STATUS-EPILEPTICUS کہتے ہیں۔

اگر دورہ نوجوانی میں پہلی بار آتا ہے تو دماغ میں ٹیومر ہونے کا خطرہ رہتا ہے، اگر بڑھاپے میں آتا ہے تو اس کا سبب عام طور پر دماغ میں خون کی نالیوں کا کوئی مرض ہوتا ہے۔

اس مرض کی تشخیص کے لیے مریض کے گھر والے یا وہ لوگ جنھوں نے مریض کو دورے کی حالت میں دیکھا ہو ان کا بیان ہی اس مرض کی تشخیص کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پھر بھی مرض کے سبب کا پتا لگانے اور مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے درج ذیل امتحانات کرانا مفید ہوتا ہے۔

(۱) دماغ کا ایکسرے
(۲) کیٹ اسکین CAT SCAN
(۳) ای۔ای۔جی ELECTROENCEPHALOGRAM

احتیاط و علاج

علاج، معالج کے مشورے کے مطابق کریں، نہ تو دوائیں ناغہ کریں اور نہ ہی خوراک میں کمی و بیشی۔ آگ، پانی، بلندی اور دیگر خطرناک مقامات سے دور رہنے کی مریض کو ہدایت کریں۔ نشہ آور اشیاء کا استعمال ترک کر دیں۔ ٹی وی کی خراب تصویر، جھلملاتی روشنی و تصاویر سے دور رہیں۔ شور و غل سے پرہیز کریں، وقت مقررہ پر کھانا کھانے کی عادت ڈالیں۔ فاقہ کرنے سے پرہیز کریں کیوں کہ اس سے خون میں شکر کی مقدار کم ہو سکتی ہے جس سے دورہ پڑنے کا خطرہ رہتا ہے۔ ایسے مریضوں کو زیادہ جاگنا بھی مضر ہوتا ہے اس لیے وقت مقررہ پر سونے کی عادت ڈالیں۔ جسمانی اور ذہنی تناؤ سے بچیں کیونکہ یہ بھی دورے کا سبب بن سکتا ہے۔

علاج، معالجوں کی تمام تر سہولتوں اور طب کے میدان میں نئی نئی تحقیقات کے باوجود اب تک اس کا کوئی شافی و قطعی علاج دریافت نہیں ہو سکا تاہم بازار میں ایسی بااثر دوائیں دستیاب ہیں جن کے استعمال سے اس مرض پر قابو رکھا جا سکتا ہے۔ اگر مریض، معالج کے مشورے کے مطابق پابندی سے ادویات کا استعمال کرے اور پرہیز رکھے تو خوش حال زندگی گزار سکتا ہے۔ صحیح علاج تبھی ممکن ہے جب کہ مرض کے اصل سبب کا پتا لگ جائے۔ اگر یہ مرض ابتدائی عمر میں لاحق ہو اور دماغ کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہ ہو تو مریض کی شفا یابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ کیوں کہ جس مریض کی عمر زیادہ ہوگی اس کے اس مرض سے چھٹکارا پانے کے امکانات کم ہوں گے۔

مریض کے دورے کی حالت میں اس کے قریب بھیڑ نہ لگائیں، کھلی ہوا آنے دیں، جسم پر اگر کپڑے کسے ہوں تو انھیں ڈھیلا کر دیں، جوتے اتار دیں۔ دورے کے وقت کوئی ملائم چیز جبڑے میں اس طرح رکھ دیں کہ زبان نہ کٹنے پائے۔ جھاگ صاف کر دیں۔ ●

بقیہ: بڑھتے قدم

اب دنیا میں ۱۳ ویں نمبر پر ہے۔

ٹیلی مواصلات کی قومی پالیسی برائے ۱۹۹۴ء کے مطابق یہ جال ۱۹۹۷ء تک ۱۵ کروڑ ٹیلی فون لائنوں کا نشانہ پار کرے گا۔ اس سے نہ صرف یہ کہ مواصلات کا جال بڑھے گا بلکہ سائز کے اعتبار سے بھارتی ٹیلی مواصلاتی نیٹ ورک دنیا کا دسواں سب سے بڑا نیٹ ورک بن کر ابھرے گا۔ ●

ریلوے پیداواری یونٹوں کی اچھی کارکردگی

ریلوے کے تمام پیداواری یونٹوں نے اگست ۱۹۹۵ء کو ختم ہونے والے موجودہ مالی سال کے پہلے چھ مہینوں میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان میں سے ایک پیداواری یونٹ نے نشانے سے تجاوز کیا ہے۔

وہیل اور ایکسل پلانٹ، بنگلور نے ۲۸۸۳۱ پہیوں کے نشانے کے مقابلے میں ۲۸۸۷۶ پہیے اور ۱۵۰۶۹ ایکسلوں کے نشانے کے مقابلے میں ۱۵۵۶۰ ایکسل تیار کیے ہیں۔ چترنجن لوکوموٹیو ورکس اور ڈیزل لوکوموٹیو ورکس، وارانسی نے اپنا مقررہ نشانہ پورا کیا ہے لیکن انٹیگرل کوچ فیکٹری، مدراس اور ریل کوچ فیکٹری، کپورتھلہ کی کارکردگی نشانے سے کچھ کم رہی ہے۔ ●

ریلوے کے تحت توانائی کی بچت کے اقدامات

ریلوے کے محکمے نے برق کاری سے آراستہ ریل لائنوں پر توانائی کی کھپت کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ ان میں موثر ڈرائیونگ اور بریک لگانے کی تکنیک، کمپیوٹر پر مبنی ڈیزائن اپنا کر رولنگ اسٹاک کے وزن میں کمی، ہلکی دھاتوں کا استعمال، کوئلے کے انجنوں کا استعمال ترک کرنا، جہاں تک ہو سکے ملٹی پل یونٹوں کا استعمال وغیرہ شامل ہیں۔

بجلی کے لوڈ میں کمی لانے کے لیے بھی کچھ اقدامات کیے گئے ہیں۔ بھاپ والے انجنوں کی جگہ بجلی کے اور ڈیزل سے چلنے والے موثر ریل انجنوں کو اپنا کر بھارتی ریلوے کی گڈس سروس کی توانائی کھپت میں بھی خاطر خواہ کمی آئی ہے۔ ●

فردوس عنبریں یحییٰ

الکحل

الکحل دراصل عربی زبان کا لفظ ہے جو کحل سے ماخوذ ہے جس کے معنی سرمہ ہیں جو آنکھوں میں لگایا جاتا ہے۔ دراصل الکحل اس خارجی جوہر کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کی اصل اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ یہاں مراد شراب کی روح ہے۔ وہ الکحل جو پی جاتی ہے اس کا کیمیائی نام ایتھانول (ETHANOL) ہے۔ ایتھانول اور کاربن ڈائی آکسائڈ وہ اجزاء ہیں جو خمیر اپنے وجود سے اس وقت خارج کرتی ہے جب شکر کو جوش دیا جاتا ہے۔ شکر، پھل میں، اناج میں، عرق میں، پھولوں کے رس میں، تمام پودوں میں ہوتی ہے اور خمیر بھی ہر جگہ اپنا وجود رکھتی ہے۔ قدیم بابل اور مصر کے باشندوں نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا تھا کہ اگر وہ انگور کو کچل کر دھوپ میں سڑنے دیں یا گیلے اناج کو دھوپ میں پڑا رہنے دیں تو کچھ عرصے کے بعد ان کی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس میں سے جھاگ اٹھنے لگتے ہیں اور اگر اس کثیف عرق کو نوش کیا جائے تو دماغ ہواؤں میں اڑنے لگتا ہے۔ اب تک کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ الکحل کی تقطیر سب سے پہلے قرون وسطیٰ میں اٹلی کے شہر سلیرنو کے ایک طبی اسکول میں کی گئی تھی۔ اس دور میں شراب کو ایک اہم دوا کا درجہ حاصل تھا۔ اس دوا کو زیادہ زود اثر بنانے کے لیے اسے ابالا گیا اور اس کے بخارات کو ٹھنڈا کر کے ایک مختصر جامع اور زیادہ طاقتور دوا بنائی گئی۔ ایک ہسپانوی دانشور نے برانڈی کی اس بگڑی ہوئی شکل کو AQUA VITAE یا آب حیات کا نام دیا۔ روس میں کشید کی گئی الکحل کو واڈکا کا نام دیا گیا۔ ہالینڈ اور فرانس والے اسے جینور کہتے ہیں اور اہل انگلستان نے اسے مختصر کر کے جن کر دیا۔ آپ کو ہر قسم کے الکحل ملیں گے۔

ایک الکحل میتھانول (METHANOL) ہے جو پہلے لکڑی سے بنائی جاتی تھی لیکن اب زیادہ تر میتھین سے بنائی جاتی ہے۔ میتھانول کو پہلے فورمل ڈی ہائیڈ میں تبدیل کیا جاتا ہے جو ایک قسم کی جراثیم کش دوا ہے اور پھر اس سے پلاسٹک بنائی جاتی ہے۔ فورمیکا بھی اس کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ اگر کوئی شخص میتھانول پی لے تو اس کے فوراً بعد اس کی آنکھوں کا حصہ پھول جائے گا اور اس کے نتیجے میں اس کی بصارت بھی زائل ہو سکتی ہے۔ الکحل کی ایک قسم ایتھیلیس گلائیکول ہے جو منجمد اشیاء کو پگھلانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور آئیسو پروپانول وہ الکحل ہے جس سے ربر کی تیاری میں مدد لی جاتی ہے۔

ایتھانول وہ الکحل ہے جو گلاب اور جیرینیم کے پھولوں کے عرق میں پائی جاتی ہے، پھلوں، پیڑوں میں اور سمندری گھانسوں میں بھی یہ الکحل موجود ہوتی ہے۔ سنگتروں اور ٹماٹر کے جوس میں بھی ایتھانول کا پتا چلا ہے۔ مغرب وسطیٰ بالخصوص برازیل میں پٹرول کے ساتھ الکحل ملا کر ایندھن کا کام لیا جاتا ہے۔ جہاں اس آمیزش کو گیسوہول (GASOHOL) کا نام دیا گیا ہے۔ الکحل انتہائی کم درجہ حرارت یعنی منفی ۱۷۹ فارن ہائٹ پر جمتی ہے اس کی اسی خصوصیت کے پیش نظر اسے بعض مخصوص تھرمامیٹروں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور ایک دور میں الکحل سے قطب نما میں بھی استعمال ہو رہی تھی جب بھٹکے ہوئے ملاح اس کی مدد سے راستہ تلاش کیا کرتے تھے۔

ایتھانول دوسری چیز میں حل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اسے رنگ و روغن اور وارنش وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پرفیوم اور خوشبویات میں بھی الکحل شامل ہوتی ہے۔ الکحل چنبیلی کے پھولوں سے اس کا جوہر اور باقلے سے ونیلا کی مہک کھینچ لیتی ہے۔ جب آپ اپنی کان کی لو کے پیچھے پرفیوم ملتے ہیں تو یہ دراصل الکحل ہی ہوتی ہے جس کی خوشبو آپ کے نتھنوں سے ٹکرا کر آپ کو مسحور کر دیتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے جب بھی موقع ملا، جب بھی بہانہ دستیاب ہوا لوگوں نے الکحل پی، کبھی غذا کے طور، کبھی سادے پانی کی جگہ، کبھی زندگی کی تلخیوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے، کبھی پرمسرت لمحات کو طول دینے کے لیے، سالگرہ، شادی بیاہ، تہواروں اور تقریبات کے مواقع پر الکحل انڈیلی گئی۔ الکحل نہ صرف یہ کہ اکثریت کے لیے قابل قبول تھی بلکہ لائق توقیر و تعظیم سمجھی جاتی تھی۔

فلسفیوں کا کہنا ہے اعتدال میں ہر کام بہتر ہوتا ہے اور الکحل کے بارے میں بھی ان کا یہی خیال ہے اگرچہ بہت زیادہ شراب نوشی سے دل کے عضلات برباد ہو سکتے ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر اب ایک نئی تحقیق سامنے آئی ہے اور طبی ماہرین نے دعویٰ کیا ہے کہ الکحل کی تھوڑی مقدار کے استعمال سے معمولی اقسام کے امراض قلب سے بچا جا سکتا ہے۔ بظاہر الکحل میں کوئی چیز ایسی شامل ہوتی ہے جس سے ایچ۔ ڈی۔ ایل یعنی خون میں "اچھے" کولیسٹرول کی سطح بلند ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے اتھیرواسکیلروسیس (ATHEROSCLEROSIS) یعنی خون کے شریانوں میں چربی کی تہہ جمنا بند ہو جاتی ہے

کلامی محلہ نزد مسجد، اورنگ آباد (بہار) ۸۲۴۱۰۱

رچہ ماہرین کو بہت پہلے الکحل کی اس خوبی کا علم تھا یکن اسے لوگوں سے پوشیدہ رکھا گیا کیوں کہ انھیں یہ وف تھا کہ لوگ ابتدا میں اس خوبی سے فائدہ اٹھانے ے لیے الکحل پینا شروع کر دیں گے لیکن بعد میں مختصر مدت کے اندر رہنا ان کے لیے ناممکن ہوگا اور جب ہ بلانوش بن جائیں گے تو الکحل کی یہ تھوڑی سی بی ان کے لیے وبال جان بن جائے گی۔

۱۸۳۰ء تک امریکہ کے گلی کوچوں میں ےدہ نوشی کی وبا پھیل چکی تھی۔ آج امریکہ میں ایک ام آدمی ایک دن میں جتنی شراب پیتا ہے اس مانے میں فی کس تین گنا زیادہ شراب پی جا رہی تھی پہلے پہل ایک حد کے اندر شراب پینے پر کسی کو عتراض نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ تمام حدیں پامال کی ئیں اور بظاہر زندگی شراب میں ڈبو دی گئی لوگوں کو اجرت بھی شراب کی صورت میں ادا کی جانے لگی یہ صورت حال زیادہ عرصے تک قبول نہ کی جا سکی ور الکحل کے خلاف پروٹسٹنٹوں نے زبردست تحریک چلائی۔ ۱۹۱۹ء میں امریکی آئین میں ۱۸ویں ترمیم کے ذریعہ مے نوشی پر پابندی عائد کی گئی اور تقریباً دو لاکھ میخانے تباہ کر دیے گئے لیکن بعد میں چور دروازوں سے شراب کی فروخت دوبارہ شروع ہو گئی۔ ہالی ووڈ کے اداکاروں نے شراب نوشی کو مردانگی کی علامت کے طور پر پیش کیا اور اسے اونچی سوسائٹی کا طرۂ امتیاز قرار دیا گیا جس کے بعد آئین کی مذکورہ ترمیم ۱۹۳۳ء میں منسوخ کر دی گئی اور الکحل کا چلن پھر عام ہو گیا۔ اس دور کا یہ دلچسپ واقعہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ امریکہ کے جن پہلے چھ ادیبوں کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا ان میں سے پانچ یعنی سنکلیئر لیوس، ولیم فاکنر، ارنسٹ ہیمنگ وے، جون اسٹین بیک اور یو جین او نیل بلانوش تھے۔

ایتھانول (الکحل) ایک سادہ سالمہ ہے اور پانی سے اس کی مماثلت کی وجہ سے یہ انسانی جسم میں ان تمام مقامات تک جا سکتا ہے جہاں تک پانی کی رسائی ہو سکتی ہے۔ خون میں چوں کہ پانی کا ایک بڑا حصہ شامل ہوتا ہے لہٰذا ہمارا خون ہی الکحل کو جسم کے مختلف حصوں تک پہنچاتا ہے۔ خون میں الکحل کی جس قدر مقدار شامل ہوا سے فی صد کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً ۱ر۰ فی صد بی اے سی (بلڈ الکحل کنسنٹریشن) چوں کہ مردوں اور عورتوں میں غذا کے جزو بدن بننے کی رفتار اور عورت کے جسم میں چربی کی مقدار مردوں سے کم ہوتی ہے اس لیے ایک عورت مرد کی نسبت، خواہ دونوں کا وزن یکساں کیوں نہ ہو الکحل کے اثرات بہت تیزی کے ساتھ محسوس کر سکتی ہے۔ چربی کی خصوصیت ہوتی ہے کہ یہ پانی کو آسانی سے جذب نہیں کرنے دیتی۔ اس طرح الکحل خون میں جمع ہوتی رہتی ہے۔

الکحل چھوٹی آنتوں کے ذریعہ خون میں شامل ہوتی ہے، جب کہ اس کی بہت تھوڑی مقدار معدے میں جذب ہوتی ہے اور بہت معمولی مقدار سانس، پسینے اور پیشاب میں خارج ہوتی ہے۔ اگر کوئی شراب پینے کے ساتھ ساتھ کچھ کھاتا بھی رہے تو الکحل نسبتاً سست روی سے خون میں شامل ہوگی اور اس کے اثرات بھی تاخیر سے ظاہر ہوں گے۔ لیکن اگر پیٹ خالی ہو یا شراب کاربونیٹیڈ ہو یعنی شیمپین ہو یا وہسکی سوڈے کے ساتھ پی جائے تو یہ بہت سرعت کے ساتھ تمام اعضائے رئیسہ تک پہنچ جائے گی۔

ایک وقت تھا جب الکحل کو بے ہوشی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا لیکن یہ عمل بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ الکحل کے ذریعہ بے ہوش کیا جانے والا شخص مرگ اور نیم مرگ کے درمیان معلق رہتا تھا۔ حالیہ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ خون میں اگر الکحل کی مقدار ۴ر۰ سے ۶ر۰ فی صد موجود ہو تو پینے والے کی سانس بند ہو سکتی ہے۔ الکحل کے زہریلے اثرات کی وجہ سے جو لوگ مر جاتے ہیں انھیں بظاہر اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ابتدا میں شراب کے چند گھونٹ حلق سے اتارے جائیں تو غنودگی کا احساس جاگے گا لیکن اس سے نیند میں تعطل کی شکایات عام ہو جاتی ہیں۔ طویل عرصے تک اور بہت زیادہ شراب نوشی سے دل اور دماغ تباہ ہو جاتے ہیں، معدے میں سوزش ہو جاتی ہے، اضطراب بڑھ جاتا ہے اور جسم غذا کی شدید کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ کثرت شراب نوشی سے جسم کا خود مدافعتی نظام بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ جو لوگ بلانوش ہوتے ہیں ان میں گلے کے کینسر کے زیادہ واقعات سامنے آئے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ لوگ بہت زیادہ سگریٹ پینے والے بھی ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر افسردگی اور یاس و ناامیدی کی کیفیت بہت زیادہ شراب پینے کا نتیجہ ہوتی ہے، سبب نہیں۔

وہ خواتین جو ماں بننے کے قریب ہوتی ہیں، جب شراب پیتی ہیں تو چند منٹوں کے اندر ہی ان کے بطن میں موجود جنین کے پیٹ میں وہی شراب پہنچ جاتی ہے۔ آج مغربی دنیا میں الکحل کو ذہنی معذوری کا ایک اہم اور بنیادی سبب قرار دیا جا رہا ہے۔ شکم مادر میں موجود جنین کے نازک جسم میں جب الکحل کا زہر سرایت کرنے لگتا ہے تو اس سے وہ انتہائی نازک دماغ بھی تباہ ہو جاتا ہے جو ابھی نشو و نما کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ فیٹل الکحل سینڈروم (FETAL ALCOHOL SYNDROME) ایک قیامت ہے جو ان معصوم جانوں پر ٹوٹتی ہے۔ جن کی مائیں دوران حمل شراب نوشی کرتی ہیں۔ ان ماؤں کے بچے لاغر جسم اور کسی نہ کسی جسمانی معذوری کے ساتھ دنیا میں آتے ہیں۔ ایف۔ اے۔ ایس کا مرض سب سے پہلے ۱۹۷۰ء میں منظر عام پر آیا تھا اور آج بھی ہر سال ایسے ہزاروں بچے جنم لے رہے ہیں جن کے جسم یا ذہن کو ماں کی بہت زیادہ یا کم شراب نوشی سے معمولی یا شدید نوعیت کا نقصان پہنچا ہے۔ جو بچے معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں انھیں فیٹل الکحل افیکٹ کا شکار کہتے ہیں۔ ان بچوں کی تعداد ایف۔ اے۔ ایس بچوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ماں کے الکحل پینے سے جو بچے معمولی طور پر متاثر ہوتے ہیں وہ کسی چیز پر پوری توجہ دینے سے قاصر رہتے ہیں ان میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

دل بڑا ہونا ایک محاورہ ہے جس کے معنی سخی ہونا یا دوسرے الفاظ میں فراخ دل ہونا سمجھے کہتے ہیں لیکن جو لوگ کثرت سے شراب پیتے ہیں ان کے دل عام افراد کے دل سے بڑے تقریباً دگنا ہو جاتے ہیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انسان کا دل ایک سال میں ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ بار خون کو پورے جسم میں پھیلاتا ہے۔ شراب کی کثرت سے شرابی کا دل بڑھنے لگتا ہے۔ یہ پلپلا اور ڈھیلا ڈھالا ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کے پٹھوں کو خون پمپ کرنے کے لیے معمول سے زیادہ زور لگانا

پڑتا ہے پھر وہ وقت بھی آتا ہے جب دل اپنا یہ کام اچھی طرح انجام نہیں دے پاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خون پھیپھڑوں میں جمع ہونا شروع ہو جاتا ہے اور شراب پینے والا وریدی استسقاء یا OEDEMA کا مریض بن جاتا ہے۔ یہ وہ مرض ہے جس سے رگوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ پھیپھڑے پھول کر دگنا وزنی ہو جاتے ہیں اور اگر انھیں نچوڑا جائے تو اس میں سے کوکا کولا جیسے بلبلے ابلتے دکھائی دیں گے۔ ایسے بدنصیبوں کے دل کے تہائی پٹھے بے کار داغدار نسیجوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو حد سے زیادہ شراب پینے کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ عادی شرابیوں کے جسم میں اتنا وافر خون موجود نہیں ہوتا کہ ضرورت سے زیادہ اس بڑے دل کو مناسب آکسیجن کے ساتھ فراہم کیا جا سکے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے دل ان کی زندگی ہی میں سیکڑوں بار بڑی بے قاعدگی سے دھڑکتے ہیں اور پھر ایک دن دل دھڑکنا ہی بند ہو جاتا ہے اور مریض دوسری دنیا سدھار جاتا ہے۔

دنیا میں اس وقت جتنے بھی نشہ کرنے کے سامان موجود ہیں ان میں الکحل کی تخریبی صلاحیت سرفہرست ہے۔ الکحل کے کثرت استعمال سے خاندان اجڑ رہے ہیں، دوستانہ تعلقات خطرے میں پڑ رہے ہیں، صحت تباہ ہو رہی ہے، جیل اسپتال اور مردہ خانے بھر رہے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں صرف امریکی معاشرے کو الکحل کے کارن ایک کھرب ۳۶۔ ارب ڈالر کا خسارہ برداشت کرنا پڑا جب کہ ۶۵ ہزار انسانوں کی جانیں الکحل کی بھینٹ چڑھ گئیں ان میں سے ۲۲ ہزار افراد وہ ہیں جو امریکہ کی شاہراہوں پر عالم بے خودی میں ڈرائیونگ کرتے ہوئے دم توڑ گئے۔ فرانسیسی باشندوں کو مے خواری کے لحاظ سے دنیا بھر میں سب پر فوقیت حاصل ہے۔ ۱۹۵۵ء میں وہ جتنی شراب پی رہے تھے اس کا ایک تہائی حصہ اب وہ نہیں پیتے اس لحاظ سے الکحل کے سبب مرنے والوں کی تعداد میں ۶۰ فی صد کمی ہو گئی ہے۔ گزشتہ ۳۰ سالوں میں ہنگری کے رہنے والے تقریباً دگنی شراب پینے لگے ہیں اور اسی وجہ سے سیروسیس (CIRRHOSIS) یا جگر کی خرابی کے باعث اموات کی شرح میں ۵ گنا اضافہ ہو چکا ہے۔

لوگ شراب نوشی میں حد سے کیوں گزر جاتے ہیں؟ یہ سوال اتنا ہی پیچیدہ ہے جتنا شراب پینے والے کی شخصیت یا وہ ثقافتی ماحول جس میں وہ رہتا ہے۔ عادات، رسوم و رواج، رویے اور شراب کی تقابلی قیمتیں یہ تمام چیزیں بلا نوشی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بعض صورتوں میں شراب نوشی موروثی بھی ہوتی ہے اور سائنس داں اس کا تعلق بعض مخصوص جینیات سے جوڑنے میں بھی کوشاں ہیں۔

جنوبی کوریا اور جاپان میں شراب نوشی کے لیے سماجی دباؤ اتنا شدید ہے کہ تقریباً تمام مرد اور جاپان کی نصف خواتین بھی شراب پیتی ہیں۔ گزشتہ ۳۰ سالوں کے دوران جنوبی کوریا میں حد سے زیادہ شراب نوشی ایک وبائی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس ملک میں فی کس جتنی اسپرٹ کی کھپت ہوتی ہے اتنی دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں ہوتی۔ جاپان کی سڑکوں پر چلتے ہوئے سڑک کے کنارے رکھی وینڈنگ مشینوں کا لیور دبا کر آپ تیار اسکاچ اور سوڈا ایک کین میں حاصل کر سکتے ہیں۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں جاپانی جس قدر شراب پی رہے تھے اب وہ تقریباً اس کا دگنا پی رہے ہیں غالباً دنیا کے کسی اور ملک میں شراب نوشی اتنی مہنگی یا تجارتی تعلقات کے ساتھ اتنی جڑی ہوئی نہیں ہے جتنی کہ جاپان میں ہے۔ دفتر میں کام کرنے کے بعد جام لنڈھانا نہ صرف کمپنی کی طرف سے مراعات میں شامل ہے بلکہ اب یہ ایک لازمہ بن چکا ہے۔ اگر آپ کا جاپانی باس آپ کو باہر شراب پینے کی پیشکش کرے اور آپ اس سے انکار کر دیں تو یقین مانیے کہ آپ نے اس فرم میں اپنی ملازمت کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔

اٹلی میں الکحل کا استعمال یورپ کے دیگر علاقوں کی طرح بتدریج گھٹ رہا ہے لیکن اس کے باوجود اسے کم نہیں کہا جا سکتا اور دیگر ملکوں کی نسبت یہ اب بھی زیادہ ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ شراب پیدا کرنے والا ملک ہے اس لیے بیشتر اطالوی شراب کے رسیا ہیں۔

ہمارے ملک ہندوستان میں بھی شراب کے رسیا ہیں خاص کر ہندوستان کے بڑے شہروں میں شراب پی کر نشے کی حالت میں سڑکوں پر پڑے رہتے ہیں۔ شراب کی دوکانوں پر کافی بھیڑ ہوتی ہے خاص کر چھٹی کے دن۔ جب کہ ہمارے قومی رہنما بار بار کہتے رہے ہیں کہ شراب آدمی کو پی لیتی ہے۔ الکحل کے زہر سے ہر سال ۵ ہزار سے کچھ زائد ہندوستانی ہلاک ہو رہے ہیں۔ کاش شراب کو زہر سمجھ کر ہمارے ہندوستانی عوام چھوڑ دیں۔ ●

انسیٹ ۲سی خلا میں داغا گیا

سٹیلائٹ انسیٹ ۲سی کو سیریز سے متعلق انسیٹ ۲سی سیارہ (۷ اکتوبر ۱۹۹۵ء) کو فرنچ گوئیانہ سے خلا میں داغ دیا گیا ہے۔ ایئر فرانس کے بوئنگ ۷۴۷ ایئر کرافٹ میں ۳۰ ٹن وزن کے کل ۸۰ پیکجز پر مشتمل ہے یہ ایئر فرانس ہال ایئرپورٹ، بنگلور سے علی الصبح ۳ بجے روانہ ہوا۔ اس دن اس ایئر کرافٹ کو مخصوص طرز کے بنائے گئے کینٹروں میں رکھا گیا تھا، جن میں تھرتھراہٹ اور نائٹروجن کے اخراج وغیرہ سے بچنے کے لیے خصوصی انتظام تھا۔ تاکہ اس ایئر کرافٹ کو لے جانے میں کسی طرح کے نقصان کا اندیشہ نہ رہے۔

اس سٹیلائٹ کے چھوڑے جانے سے ٹی۔ وی۔ پروگراموں کا دائرۂ کار ہندوستانی سرحدوں کے پار بہت دور تک پھیل جائے گا۔ اس کی بدولت جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں موجود غیر مقیم ہندوستانی بھی ہندوستان کے ٹی وی پروگرام دیکھ سکیں گے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا سیارہ ہوگا جو کاروباری مواصلات اور کیو بینڈ بھی مہیا کرائے گا۔

اس کے بعد طے شدہ پروگرام کے تحت اگلے ماہ ۲۰۷۰ کلو گرام وزنی انسیٹ ۲سی یورپین خلائی ایجنسی سے ایرین سے چھوڑا جائے گا۔ ●

نثار احمد صدیقی

کرکٹ کا ارتقاء

کرکٹ کی ابتدا کب، کہاں اور کیسے ہوئی؟ یہ تاریخ کے نامعلوم سوالات میں شامل ہیں لیکن کرکٹ کے متعلق یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا آغاز براعظم یورپ سے ہوا۔ مورخین کا خیال ہے کہ موجودہ کرکٹ یا اس سے ملتا جلتا کھیل بارہویں یا تیرہویں صدی عیسوی میں شروع ہو چکا تھا۔ اس سلسلے کے قدیم ترین شواہد ایک پینٹنگ میں ملتے ہیں جس میں ایک نوجوان ایک سیدھی چھڑی اور ایک گیند پکڑے ہوئے ہے اور ایک بزرگ شخص جو بظاہر نوجوان کا استاد معلوم ہو رہا ہے ایک بڑے ڈنڈے سے ضرب لگانے میں معروف ہے۔ وہ پینٹنگ ۱۳۴۴ء کی ہے، کرکٹ کا قدیم ترین اور مستند تحریری حوالہ انگلینڈ کے بادشاہ ایڈورڈ اوّل کے دور کا ہے۔ ۱۲۷۲ء کے اس تذکرے میں تحریر ہے کہ شہزادہ ایڈورڈ کریگ نامی کھیل میں نہ صرف دلچسپی رکھتے تھے بلکہ اس کھیل میں وہ خود بھی حصہ لیتے تھے۔

آکسفورڈ کی بوڈلیئن لائبریری میں ایک ایسی پینٹنگ موجود ہے جو کرکٹ کی واضح اور مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔ اس پینٹنگ میں ایک خاتون کو کسی مرد کی طرف ایک گیند پھینکتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور مرد گیند پر ضرب لگانے کے لیے بلّے کو اپنے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ہے۔ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر کئی مرد اور خواتین بیٹسمین کی گیند کو کیچ کرنے یا اسے پکڑنے کے انتظار میں ہیں۔

کرکٹ سے متعلق ایک اور قدیم دستاویز کا تذکرہ رسل کی کتاب "ہسٹری آف گلڈ فورڈ" میں کیا گیا ہے۔ وہ قدیم دستاویز ۱۶/جنوری ۱۵۹۸ء کی ہے جو اب گلڈفورڈ کے میئر کی تحویل میں ہے۔ اس دستاویز میں ایک قطعہ اراضی کے تنازعے میں لکھا ہوا ہے کہ "۱۵۵۰ء کے قرب وجوار میں سرے کاؤنٹی میں ملکہ برطانیہ کے درباری جان ڈیرک جب فری اسکول (گلڈ فورڈ) میں اسکالر تھے تو وہ ان کے دوست اور اسکول کے بچے وہاں اور دیگر مقامات پر کرکٹ کھیلتے تھے۔" اس حوالے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ ہنری ہشتم (۱۴۹۱ء تا ۱۵۴۷ء) کی بادشاہت کے اختتام تک کرکٹ کا کھیل عوام خصوصاً نوجوانوں میں مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔

۱۵۶۲ء میں مالڈن کارپوریشن کے عدالتی ریکارڈ میں جان پورٹر (عرف براؤن) نامی غلام کے خلاف مقدمے میں تحریر ہے کہ "وہ ایک غیر قانونی کھیل کلیکٹ کھیلتا تھا"۔ ۱۷ویں صدی کی ولیم گولڈ کے ایک لاطینی نظم میں ایک مقابلے کا احوال بیان کیا گیا ہے جو جدید کرکٹ سے کافی حد تک مشابہ ہے۔

"کرکٹ" کا لفظ پہلی بار کب استعمال کیا گیا؟ اس کا بھی اب تک کوئی واضح تعین نہیں کیا جا سکا ہے تاہم یہ لفظ انگریزی زبان میں اینگلو سیکسن دور میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ چند مورخین جو کرکٹ کی جائے پیدائش فرانس قرار دیتے ہیں، ان کا نظریہ ہے کہ کرکٹ کا لفظ فرانسیسی زبان کے ایک لفظ سے لیا گیا ہے، جس کا صحیح تلفظ "کرک۔کے" ہے لیکن یہ لفظ ۱۴۷۸ء تک فرانسیسی زبان کا حصہ نہیں بن سکا تھا۔ اکثر تاریخ داں متفق ہیں کہ یہ قدیم انگریزی لفظ "کرک کرک" کی ترقی یافتہ شکل ہے جس کے معنی "ڈنڈے" یا "لاٹھی" کے ہیں۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں انگلینڈ اور دیگر یورپی ممالک میں ایک ہی کھیل مختلف ناموں سے کھیلا جاتا تھا۔ ان عوامی کھیلوں میں ہر علاقے کے ضابطے مختلف تھے۔ اس زمانے کے کھیلوں کو تین عام اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم میں فٹبال، ہرلنگ اور ہینڈ بال شامل تھے۔ ان کھیلوں میں کھلاڑی دوڑتے ہوئے گیند کو اپنے ہاتھ، پیر یا کسی چھڑی کی مدد سے ضرب لگاتے تھے۔ پوائنٹس کے اسکور کے لیے ایک ہدف (گول) مقرر تھا۔ جہاں ہر ٹیم کے کھلاڑی نشانہ لگاتے تھے۔ دوسری قسم میں گاف، بینڈی اور پیل میل نامی کھیل شامل کیے جا سکتے ہیں۔ ان کھیلوں میں ساکن کھلاڑی لکڑی کے ڈنڈے یا ہتھوڑے کی مدد سے گیند کو کسی مقررہ ہدف (حلقے یا سوراخ) تک پہنچاتے تھے۔ تیسری قسم کے کھیل موجودہ کرکٹ سے قریب ترین کھیل کہے جاتے ہیں۔ ان میں اسٹول بال، ٹریپ بال، ٹپ کیٹ اور کیٹ اینڈ ڈاگ شامل تھے۔

اسٹول بال میں ایک اسٹول میدان میں رکھ دیا جاتا تھا۔ ایک کھلاڑی (بیٹسمین) اس کی جانب پشت کر کے کھڑا ہو جاتا تھا جب کہ اس کا حریف (بالر) اس سے کچھ فاصلے سے بیٹسمین کی طرف گیند اچھالتا۔ بالر کا مقصد اسٹول کو نشانہ بنانا ہوتا تھا بیٹسمین گیند کو اسٹول پر لگنے سے بچاتا اور اسے اپنے ہاتھوں سے دھکیلتا تھا۔ اگر گیند اسٹول پر لگ جاتی یا بالر گیند زمین پر لگنے سے پہلے ہی گیند پکڑ لیتا تو بیٹسمین کی باری ختم ہو جاتی اور بالر کھیلنا شروع کر دیتا۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا۔ مقابلے کے اختتام پر اس شخص کو فاتح قرار دیا جاتا جو گیند کو سب سے زیادہ مرتبہ اپنے ہاتھوں سے ضرب لگاتا۔

کلامی محلہ نزد مسجد، اورنگ آباد۔ بہار۔ ۸۲۴۱۰۱

کیٹ اینڈ ڈاگ میں، چھڑی یا ڈنڈے کو ڈاگ اور لکڑی کے چار انچ لمبے اور ایک انچ قطر کے ٹکڑے کو کیٹ کہا جاتا تھا۔ میدان میں تقریباً ایک فٹ قطر کے دو گڑھے (وکٹ) کھودے جاتے تھے یہ گڑھے سات انچ گہرے ہوتے تھے اور ان کے درمیان تقریباً ۲۲ فٹ کا فاصلہ ہوتا تھا۔ اس کھیل میں تین کھلاڑی حصہ لیتے تھے۔ دو افراد (بیٹسمین) اپنے اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے لیے گڑھے کے قریب کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک گڑھے سے ایک شخص (بالر) کیٹ کو پہلے بیٹسمین کی طرف پھینکتا اور بیٹسمین اس کیٹ کو ڈنڈے کی مدد سے گڑھے میں جانے سے روکتا۔

یہ کرکٹ کی خام اشکال تھیں۔ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ کرکٹ کا آغاز انگلینڈ کے جنوب مشرقی حصے کے سبزہ زاروں اور چراگاہوں سے ہوا۔ چرواہوں سے یہ کھیل عوام تک پہنچا اور اس کے بعد امراء اس سے آشنا ہوئے۔

ملکہ الزبتھ اول کا دورِ حکومت (۱۵۵۸ء یا ۱۶۰۳ء) انگلینڈ کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ ان کے عہد میں ملک کو استحکام ملا۔ ۱۵۸۸ء میں اسپین کے مشہور بحری بیڑے آرمیڈا کو شکست دینے سے ملک کے وقار میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ ان کے دور میں فنونِ لطیفہ کے ساتھ کھیلوں میں بھی ترقی ہوئی۔ سولہویں اور سترہویں صدی کے سنگم ۱۶۰۳ء میں جب ملکہ الزبتھ اول کا انتقال ہوا اور اسکاٹ لینڈ کے جیمز ششم جیمز اول کے خطاب سے دونوں سلطنتوں کے فرمانروا بن گئے تو برطانوی معاشرہ ایک بار پھر ابتری کا شکار ہو گیا۔ کھیلوں کو تضیع اوقات سمجھا جانے لگا اور کھلاڑیوں کا شمار اوباش اور بدکردار افراد میں ہونے لگا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ گرجا گھروں میں عبادت کے لیے آنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ لوگ عبادت کے وقت اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے، چناں چہ حاکمِ وقت کی پہلی بجلی کھیلوں پر گری۔ عیسائیوں کے مقدس دن اتوار کو کرکٹ سمیت دیگر عوامی کھیلوں پر پابندی لگا دی گئی۔ ۱۶۴۲ء میں سرے میں کرکٹ کے چند متوالوں کو ان کے شوق کی سزا میں داخلِ زنداں کر دیا گیا۔ لیکن یہ پابندیاں صرف عوامی کھیلوں پر تھیں جو غریب لوگ کھیلتے تھے، امراء کے کھیل (تیر اندازی کشتی اور باؤلز) اس پابندی سے مستثنیٰ تھے۔

۱۶۴۲ء سے ۱۶۴۹ء کے دوران برطانیہ میں خانہ جنگی اپنے عروج کو پہنچ گئی جس کا نتیجہ ۱۶۴۹ء میں بادشاہ چارلس اول کے قتل کی صورت میں نکلا جس کے بعد ۱۶۵۳ء میں وہاں کے مشہور سیاست داں اولیور کرام ویل (۱۵۹۹ء تا ۱۶۵۸ء) اقتدار پر قابض ہو گئے۔ ان کے پانچ سالہ دورِ حکومت میں کرکٹ کو پھلنے پھولنے کا خاص موقع ملا۔ کرام ویل خود فٹ بال، کرکٹ اور کشتی میں مہارت رکھتے تھے۔ لیکن ان کے دور میں کرکٹ کی ترقی ایک حادثاتی اتفاق تھی۔ مستقبل کی بے یقینی کی وجہ سے لندن کے بیشتر امراء اور شاہی خاندان کے افراد لندن کے قرب میں واقع اپنی جاگیروں میں منتقل ہو گئے تھے۔ شہر کے ہنگاموں، سیاست کی ریشہ دوانیوں اور سلطنت کے بوجھل کاموں سے دور نرم دھوپ میں سرسبز میدانوں میں کھیلی جانے والی کرکٹ ان کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ کرکٹ نے بھی اپنے گیسو پھیلائے اور وہ اس زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو گئے۔ کرکٹ تو دلوں میں بستی اور دماغوں میں رہتی ہے۔ کرکٹ نے امراء کی شرط لگانے کی خوابیدہ عادت کو دوبارہ انگڑائیاں لینے پر مجبور کر دیا۔

کرام ویل کے دور میں اتوار کو کرکٹ کھیلنے اور شرط لگانے پر سابقہ پابندی برقرار رہی۔ ان کے دورِ اقتدار کے دوسرے ہی سال ۱۶۵۴ء میں کاؤنٹی کینٹ کے مقام ایلتھم میں گرجے کے چند نگراں افراد نے اتوار کو کرکٹ کھیلنے کے جرم میں سات افراد پر دو شلنگ فی کس جرمانہ عائد کیا جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی۔ آئرلینڈ میں تو کرام ویل کے جرنیلوں نے کرکٹ پر مکمل پابندی عائد کر دی تھی۔ ۱۶۵۸ء میں کرام ویل کی آنکھیں بند ہونے کے بعد ۱۶۶۰ء میں برطانیہ میں بادشاہت کا سورج ایک بار پھر طلوع ہوا۔ چارلس دوئم (۱۶۳۰ء تا ۱۶۸۵ء) کے سر پر تاجِ برطانیہ رکھا گیا۔ دارالحکومت میں حالات معمول پر آتے ہی شہزادے، درباری، جاگیردار اور امراء دوبارہ لندن لوٹنے لگے۔ لندن واپسی پر وہ تنہا نہیں تھے۔ اب ان کے ساتھ کرکٹ بھی تھی۔ کرام ویل کے دور سے پہلے کرکٹ غریبوں اور متوسط طبقے تک محدود تھی۔ اب وہاں کا اعلیٰ طبقہ بھی کرکٹ کے جام پی چکا تھا اور اس کا سرور ان کو شاداں کیے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگلینڈ کا معاشرہ ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ اس دور میں ان کی روایتی فوجی طاقت کمزور ہو گئی تھی۔ جس کے سبب سوسائٹی کا اعلیٰ طبقہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے نئی دلچسپیاں تلاش کر رہا تھا۔ انھیں کرکٹ ایک جھیل کی مانند پُرسکون دکھائی دی۔ ان ہی لوگوں کی سرپرستی سے کرکٹ آہستہ آہستہ انگلینڈ کی ثقافت کا ایک اہم جزو بن گئی۔

کرکٹ کا پہلا میچ ۱۶۴۶ء میں انگلینڈ کی کاؤنٹی کینٹ کے مقام کوکس ہیتھ میں ہوا۔ اس زمانے میں کرکٹ برطانوی باشندوں کے ساتھ ساتھ دنیا کے دیگر علاقوں میں پہنچتی جا رہی تھی۔ ۱۷۰۶ء میں برطانوی شاہی بحریہ کے تین جہازوں کے ملاحوں کا ایک گروپ مشرقِ وسطیٰ کے دورے پر آیا۔ وہ ترکی کے شہر انطاکیہ کے قریب بحیرۂ روم کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے۔ پھر وہ وہاں سے تقریباً ۸۰ کلومیٹر مغرب میں شام کے شہر حلب کے مقام پر آئے جہاں انھوں نے ۶ مئی کو وہاں آباد برطانوی باشندوں کے ساتھ کرکٹ کا ایک میچ کھیلا۔ اگرچہ اس میچ کا اسکور کارڈ دستیاب نہیں لیکن وہ کرکٹ کا قدیم ترین میچ ہے جو انگلینڈ سے باہر کسی اور ملک میں کھیلا گیا۔

انگلینڈ میں صحیح معنوں میں کرکٹ کا پہلا میچ ۱۶۹۷ء میں پچاس اشرفیوں کے حصول کے لیے سسیکس میں کھیلا گیا تھا۔ اس میچ میں گیارہ گیارہ کھلاڑیوں کی دو ٹیموں نے حصہ لیا اس میچ سے ۲۰ سال قبل ۱۶۷۷ء میں سسیکس کے ایک نواب کے خزانچی نے اپنے کھاتے میں یہ تحریر کیا تھا کہ اس کا مالک ڈکر میں ایک کرکٹ میچ دیکھنے گیا تھا۔ اس زمانے میں کرکٹ کا مرکز لندن کے قریب جنوبی کاؤنٹیاں تھیں۔ مئی ۱۷۰۹ء میں کینٹ اور لندن کے درمیان لیمس کان ڈیٹ فیلڈز (موجودہ بلومس بری) میں ایک میچ ہوا جسے بجا طور پر پہلا انٹر کاؤنٹی میچ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ۱۷۳۰ء میں لندن کے محلے فنس بری کے آرٹلری گراؤنڈ میں ایک میچ کھیلا گیا یہی میدان کرکٹ کا پہلا بڑا مرکز تھا۔ وہاں آج بھی کرکٹ میچوں کا سلسلہ جاری ہے۔

کرکٹ کا وہ پہلا میچ جس کا پورا اسکور کارڈ دستیاب ہے۔ اسی میدان میں ۱۸ جون ۱۷۴۴ء کو کینٹ اور آل انگلینڈ کے درمیان کھیلا گیا جس میں کینٹ کی ٹیم نے ایک وکٹ سے کامیابی حاصل کی۔ وہ میچ چار اننگز پر مشتمل تھا جس میں کھلاڑی کا سب سے بڑا انفرادی اسکور ۱۸ رنز تھا۔ اس دور کی خاص بات کرکٹ سمیت تمام کھیلوں میں شرط

لگانے کا رواج تھا۔ شرط کے بغیر کسی کرکٹ میچ کا تصور بھی محال تھا اس وجہ سے کرکٹ میں بھی وہاں کے ہر طبقے کی دلچسپی خاصی بڑھ گئی تھی۔ بڑے میچوں میں خاص طور پر بڑی شرطیں لگائی جاتی تھیں۔ اس دور کے تماشائی عموماً غیر منظم رہتے تھے اور میچوں کے دوران لوگوں کا میدان میں داخل ہو جانا اور تشدد کا مظاہرہ کرنا ایک عام سی بات تھی۔ بہت سے کھلاڑی میچ میں شرکت کے لیے ایک بہت بڑی رقم بطور فیس وصول کر لیتے تھے لیکن میچ جیتنے کے لیے نہیں بلکہ ہارنے کے لیے۔

ایک زمانے میں کرکٹ پر پابندی عائد رہی اور اسے ایک غیر قانونی کھیل سمجھا جاتا رہا۔ ۱۷۴۸ء میں کرکٹ کو ایک بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ محبان کرکٹ کی ایک اپیل کے جواب میں اس سال شاہی عدالت نے یہ فیصلہ کیا کہ "یہ (کرکٹ) ایک بہت ہی شریفانہ کھیل ہے۔ اس کھیل میں کوئی برائی نہیں، لیکن دس پونڈ سے زیادہ مالیت کی شرائط نے اسے برا بنا دیا ہے۔ اصل برائی شرائط ہیں جو قانون کے بھی منافی ہیں۔"

کرکٹ کے ارتقا میں ہیمبلڈن کلب نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کلب کا قیام غالباً ۱۷۵۰ء میں انگلینڈ کی کاؤنٹی ہیمپشائر کے ایک دیہات ہیمبلڈن میں عمل میں آیا۔ کلب کے تمام کھلاڑی دیہات کے ہنرمند تھے۔ اس زمانے میں کینٹ کی ٹیم کرکٹ پر چھائی ہوئی تھی۔ ادھر سرے میں بھی بے شمار کلب، کرکٹ کے گیسو سنوار رہے تھے لیکن ہیمبلڈن کلب بہت کم عرصے میں شہرت کے بام عروج پر پہنچ گیا۔ اس کلب کے عہدیداروں نے امرا کی سرپرستی سے نہ صرف ہمپشائر بلکہ اپنے سے ملحقہ کاؤنٹیوں سرے اور سسیکس کے اچھے کھلاڑیوں کی خدمات بھی حاصل کر لیں۔ ہیمبلڈن کلب کے کھلاڑیوں کی مہارت کا اندازہ جون ۱۷۷۷ء کے اس میچ سے لگایا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے انگلینڈ کی ایک نمائندہ ٹیم کو ایک اننگ اور ۱۶۸ رنز سے شکست دی۔ کلب کے کھلاڑیوں کی بیٹنگ، بالنگ اور فیلڈنگ کی تکنیک، کرکٹ کو دوسرے علاقوں تک پہنچانے میں بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ اس کلب کا سب سے بڑا کارنامہ کرکٹ کو پہلی بار چند اہم ضابطوں کا پابند بنانا تھا۔ اس کا سہرا ہیمبلڈن کے مشہور جاگیردار رچرڈ نائرن کے سر ہے جو کلب کے پہلے کپتان اور سکریٹری ہونے کے علاوہ کلب کے صدر دفتر "بیٹ اینڈ بال ان" کے مالک بھی تھے۔ انھوں نے ہی کلب کے قیام کے سلسلے میں رائے عامہ کو ہموار کیا۔ لوگوں کو ابھارا اور ان کا تعاون حاصل کیا۔

۱۷۷۴ء سے پہلے کرکٹ کے لیے کوئی باقاعدہ قوانین موجود نہیں تھے۔ فریقین میچ شروع ہونے سے پہلے چند قواعد طے کر لیتے تھے۔ جب کوئی ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوتا جس کا ذکر قواعد میں نہ ہوتا تو صورت حال کشیدہ ہو جاتی اور نوبت مارکٹائی تک پہنچ جاتی تھی۔ ۱۷۷۴ء میں کرکٹ کو جہان نو ملی۔ ۲۵ فروری ۱۷۷۴ء کو کینٹ کے امرا اور معزز افراد کا ایک اجلاس اسٹار اینڈ گارٹر (پال مال) میں ہوا۔ اس تاریخی اجلاس کی صدارت سر ولیم ڈاپیر نے کی۔ ان افراد کی کوششوں سے کرکٹ کے نئے قوانین وجود میں آئے۔ ان میں بعض قوانین ایسے بھی ہیں جن میں دو صدیاں گزر جانے کے باوجود کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ کرکٹ کی گیند کا وزن اور بلے کی چوڑائی جو ۱۷۷۴ء میں مقرر کی گئی تھی آج بھی وہی ہے۔ ایل۔ بی۔ ڈبلیو کے متعلق کسی قانون کا تذکرہ بھی پہلی بار اسی مسودے میں کیا گیا تھا لیکن ان قوانین میں کھلاڑیوں کی تعداد سے متعلق اہم شق شامل ہونے سے رہ گئی۔ ۱۸۸۴ء میں ان قوانین کا از سر نو جائزہ لیا گیا اور ایک ٹیم کے کھلاڑیوں کی تعداد کو گیارہ تک محدود کر دیا گیا۔ اس سے قبل ایک ٹیم گیارہ یا بارہ کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ لیکن آل انگلینڈ کی ٹیم بعض اوقات ۲۲ کھلاڑیوں سے بھی فیلڈنگ کرتی تھی۔

جس زمانے میں ہیمبلڈن کلب، کرکٹ کی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اسی دور میں (۱۷۸۲ء) لندن میں وہائٹ کون ڈیٹ کلب کے نام سے ایک اور کلب قائم کیا گیا جو بعد میں کرکٹ کا سرخیل بنا۔ اس نئے کلب کے زیادہ تر سرپرستوں کا تعلق ہیمبلڈن کلب ہی سے تھا۔ وہائٹ کون ڈیٹ کلب کے کھلاڑی موجودہ مقام ازلنگٹن میں کرکٹ کھیلتے تھے۔ اس زمانے میں لندن کو وسعت دینے کا منصوبہ زیر غور تھا۔ وہ میدان بھی اس منصوبے کا ایک حصہ بن گیا۔ اس کلب کے کھلاڑیوں کو ایک نئے میدان کی ضرورت پیش آئی چناں چہ ان کی خواہش پر لندن میں رہائش پذیر یارک شائر کے ایک مخیر تھامس لارڈ نے میریلون (موجودہ ڈورسیٹ اسکوائر) کے مقام پر ایک قطعہ اراضی حاصل کیا جہاں ۱۷۸۷ء میں پہلا میچ کھیلا گیا۔ اسی سال میریلون کرکٹ کلب (ایم سی سی) قائم کیا گیا جس میں وہائٹ کون ڈیٹ کلب کو ضم کر دیا گیا۔ اگلے سال کلب نے کرکٹ کے قوانین پر نظر ثانی کی۔ آؤٹ ہونے کے قوانین میں ہٹ وکٹ کا اضافہ کیا اور ایل۔ بی۔ ڈبلیو کے لیے وکٹ کی لائن میں گیند پڑنے کی پابندی عائد کی۔ اسی دن سے یہ کلب کرکٹ کا غیر سرکاری حکمراں بن گیا۔ میریلون میں لارڈ نے کرکٹ میچ دیکھنے والے شائقین کے لیے چھ پینس کا ٹکٹ بھی مقرر کیا۔ پٹہ ختم ہونے کے بعد ۱۸۰۸ء میں لارڈ نے کلب کو ایجنٹ پارک میں منتقل کر دیا۔ لیکن صرف تین سیزن گزرنے کے بعد اس میدان کے عین درمیان سے ایک نہر نکالنے کا منصوبہ بنایا گیا جس کی وجہ سے ایم۔ سی۔ سی نے ایک بار پھر نئے میدان کی تلاش شروع کی۔ چناں چہ سینٹ جان وڈ میں ایک میدان حاصل کر لیا گیا جہاں ۲۲ جون ۱۸۱۴ء کو پہلا میچ کھیلا گیا۔ اس میدان کو تھامس لارڈ کے نام پر لارڈز کرکٹ گراؤنڈ کہا جاتا ہے اور اس میدان کے احاطے میں واقع عمارت میں انٹرنیشنل کرکٹ کانفرنس کا صدر دفتر بھی قائم ہے۔

اس کے بعد ملکوں ملکوں کرکٹ کا سفر شروع ہوا۔ کرکٹ کو جہاں بھی محبت کرنے والے افراد ہموار میدان اور سبز مخملیں فرش نظر آئے وہیں اس نے بسیرا کر لیا۔ ●

بقیہ: ہندوستان میں مزدور بچوں کے مسائل اور ان کا حل

کے بنائے ہوئے CHILD LABOUR اور CHILD DEVELOPMENT FUND LABOUR LAW کا مقصد بھی یہی ہے کہ مزدور بچوں کی جسمانی، دماغی، معاشی اور سماجی ترقیات ہوں۔ یہ تو بات رہی حکومت کی اور قانون کی۔ سوسائٹی کا بھی تو فرض ہے کہ وہ اس بات کی ذمہ داری لے کہ مزدور بچوں پر کسی طرح کا ظلم و ستم ان کے مالکان نہ کرنے پائیں اور یہ بھی دیکھے کہ حکومت نے ان بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو قانون بنائے ہیں اس پر کہاں تک روزگار دینے والے عمل پیرا ہیں؟ اگر ہم اپنے اس فرض کو بخوبی نبھا سکے تو ہمارا سماج ان مزدور بچوں کے مستقبل کو ضرور روشن بنا سکے گا اور ان کے لیے ترقیات کے دروازے کھول سکے گا۔

●

ڈاکٹر زین رامش

اردو غزل: ایک تعارفی خاکہ

صنفی حیثیت سے غزل اردو شاعری کی محفل میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو گلہائے رنگارنگ کے درمیان گلاب کی ہے۔ غزل جو بنیادی طور پر ایران سے بذریعہ زبان فارسی ہندوستان آئی اور جس نے سب سے پہلے تصوف کے مضامین کو اپنا لباس بنایا، اپنے مزاج اور اپنی ہیئت کے اعتبار سے ایسی اثر انگیز اور جادو صفت ثابت ہوئی کہ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری اردو شاعری کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا۔ جہاں تک اس کی صنفی خوبیوں کا تعلق ہے ان کی بہت زیادہ تفصیل سے گریز کے باوجود شاید غزل کی صرف ایک ہنرمندی ہی اس کا نقطۂ کمال کہی جاسکتی ہے اور وہ ہے اختصار میں مضامین نو بہ نو کو سمیٹ لینا جو کوزے میں دریا بند کرنے کے مماثل ہے۔ غزل جو چند اشعار پر مشتمل ہوتی ہے اس کا ہر شعر اپنے اندر ایک مکمل تخلیقی اور فنی دنیا آباد رکھتا ہے۔ کون سے ایسے مضامین ہیں جو غزل میں نہیں باندھے گئے۔ معرفت سے رندی تک، عشق و جنوں سے عقل و خرد تک، قصۂ عروج سے افسانۂ زوال تک، تصوف کی فلسفیانہ گتھیوں سے سماجی اور سیاسی تبدیلیوں تک غزل نے ہر موضوع اور ہر مضمون کو اپنے ظرف میں سنبھال رکھا ہے۔ اس کے حسن میں ایک انوکھی ترتیب ہے۔ مطلع ایک جہانِ رنگ و بو کا آغاز کرتا ہے۔ درمیان کے اشعار خواہ پانچ ہوں، سات ہوں، نو ہوں یا سہ غزلہ یا چہار غزلہ کی صورت ہو وہ سارے اشعار ایک خاص ماحول تیار کرتے ہیں جن کا محاکمہ مقطع میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

موضوعات کے انتشار کے باوجود تمام اشعار میں ایک ایسا تسلسل موجود رہتا ہے جو اسے ایک طرف تو ایک اندازِ حسن تیار کرنے میں کامیاب کرتا ہے تو دوسری طرف نظم کے تسلسل سے قطعی دور رکھتا ہے، انتشارِ خیال کی شکایت ہی تھی جس نے کلیم الدین احمد سے غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن کہلوایا اور ترتیبِ خیال کا کمال ہی ہے جو اسے تخلیق کے مرحلے سے نغمگی کی منزل تک پہنچاتا ہے۔

اس ضمن میں دو خصوصیتیں جو غزل کو دوسری اصناف سے ممیز کرتی ہیں تغزل اور غزل کی زبان ہیں۔

تغزل

تغزل جسے غزل کا ملبوس کہا جاسکتا ہے غزل کی بنیادی ضرورت ہی نہیں بلکہ اس کا حسنِ اول ہے۔ یہ دراصل اس کی خصوصی کیفیت ہے جو شعریت اور وجدان سے مل کر غزل کا سانچہ تیار کرتی ہے۔ یعنی مضامین شعر کچھ بھی ہوں اسلوبِ شعر یا اسلوبِ غزل ہمیشہ ایک خاص نوعیت کا ہوگا جس میں ایک مخصوص شعری اور وجدانی کیفیت ہوگی جسے ہم تغزل کے نام سے یاد کریں گے۔ تغزل کا ایک بڑا وسیلہ اس کا لفظیاتی نظام ہے جس کی طرف ڈاکٹر عین تابش یوں اشارہ کرتے ہیں۔

"عموماً تغزل کا انطباق ایک خاص قسم کے لفظیاتی نظام پر کیا جاتا رہا ہے جس کے زیر اثر بلبل، صیاد، قفس، آب و دانا، میکدہ، جام، مے، رند، واعظ، رقیب، وصل، ہجر، آتش فراق، انتظار، شبنم اور ایسے بہت سے الفاظ رہے ہیں"۔

پھر انھوں نے اس کی وضاحت تصوف اور عشقِ حقیقی کے حوالے سے یوں کی ہے:

"تصوف میں عشقِ حقیقی تجلیات کے پردوں میں ہیں جھانکنے کا شوق رکھتا ہے لہٰذا جو علامتیں، استعارے اور اشارے تغزل کا سرمایہ ہیں، تصوف کے حوالے سے ان کا سرچشمہ نور اور انوار میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔"

پھر اسی سلسلے میں یہ بھی کہا ہے کہ:

"تغزل کا کمال صرف طرزِ سخن کی میناکاری نہیں ہے۔ اس کی معراج تو یہ ہے کہ جو بات کہی جائے وہ خود دل میں اتر جانے والی ہو اور جس انداز میں کہی جائے وہ انداز بھی اپنے اندر جاذبیت اور جادو رکھتا ہو۔"

مندرجہ بالا سطور سے یہ اندازہ ہوا کہ تغزل دراصل غزل کا بنیادی ملبوس ہے جو موسموں کے فرق سے بے پروا ہوتا ہے اور موضوعات کے بدلنے کے باوجود غزل کا تغزل بہرحال غزل کی بنیادی ضرورت ہے۔

غزل کی زبان

غزل کی زبان کا معاملہ بھی تغزل سے کسی حد تک جڑا ہوا ہے۔ یعنی جب ہم تغزل کو ہیئت یا اسلوب کی شکل میں دیکھیں گے تو غزل کی زبان میں اس کے ساتھ موافقت ضروری ہوگی لیکن یہ سوال یقیناً اٹھتا ہے کہ مختلف حالات اور مختلف ادوار میں غزل کی زبان تو بدلتی رہتی ہے اور اس تبدیلی کے باوجود تغزل موجود رہا ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غزل کی زبان

• ارم کدہ" فخر الدین ہاؤس. لنگر ٹولی، پٹنہ ۴

بدلتے ہوئے حالات میں اپنی کیا نوعیت رکھتی ہے اس سلسلے میں بس اتنا کہنا کافی ہے کہ عہد بہ عہد تبدیلیوں کے مطابق غزل کی زبان تبدیل ہوتی رہی ہے اور یہ تبدیلی مستحسن بھی ہے۔

بقول ڈاکٹر ظہور رضوی برق "قلب کا سوز و گداز روح کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر جب لفظی سانچوں میں ڈھلتا ہے اور ان کی ترکیب سے جو صورتیں سامنے آتی ہیں وہ اپنے فنکار کی نمائندہ بن جاتی ہیں"۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی کہ غزل کی زبان بڑی حد تک فنی تقاضوں کی نمائندگی کرتی ہے لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ زبان سے ہمیشہ موضوعات سے متاثر ہوتی ہے اور ٹھیک اسی طرح موضوعات زبانِ غزل سے متاثر ہوتے ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل کی زبان نے ہمیشہ موضوع و اسلوب کی ایک اکائی قائم کی ہے اور یہ اس کا بنیادی وصف ہے۔

ارتقاء

اردو غزل کے سلسلے میں اردو کے دو بڑے ناقدوں نے دو انتہائی مختلف اور متضاد دعوے کیے ہیں، رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ "غزل اردو شاعری کی آبرو ہے" اور پروفیسر کلیم الدین احمد اسے "نیم وحشی صنف سخن" گردانتے ہیں۔ مذکورہ دونوں انتہاؤں سے قطع نظر کہ "غزل اردو شاعری کی آبرو" اور نیم وحشی صنف سخن ہے کہ نہیں ایک مسلم الثبوت بڑی حقیقت جو ہمارے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ غزل نے اپنی ابتدا یعنی عہد قلی قطب شاہ سے لے کر عہد حاضر تک بتدریج ارتقاء کی جو منزلیں طے کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے اور غزل کی اہمیت اور اس کی تاریخ ساز حیثیت قائم کرنے کے لیے کافی ہے۔

اردو غزل کے ابتدائی سفر میں جو سب سے پہلا نام ہمارے سامنے آتا ہے وہ سلطان قلی قطب شاہ کا ہے جنھوں نے اردو غزل کا آغاز کرتے ہوئے معرفت اور عشق کے مضامین سے اس صنف شاعری کا تعارف کرایا۔ قلی قطب شاہ کے سلسلے میں بعض اطلاعات یہ دعویٰ بھی کرتی ہیں کہ انھیں پہلے صاحب دیوان غزل گو شاعر کی حیثیت بھی حاصل تھی لیکن بعض اطلاعات ولی دکنی کو پہلا صاحب دیوان غزل گو بتاتی ہیں۔ قلی قطب شاہ سے ولی دکنی تک اردو غزل جو سفر طے کرتی ہے اس سفر میں وجہی، نشاطی اور غواصی وغیرہ اس کے شریک سفر ہوتے ہیں۔ لیکن ولی دکنی اول اول غزل کو ہیئتی سطح پر مزین اور مرتب کرتے نظر آتے ہیں اور اس صنف کے مستقبل کے لیے راہیں ہموار کرتے ہیں۔ چناں چہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ولی نے اردو غزل کو لائق تقلید صنف بنا دیا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ غزل دکن سے چھلانگ لگا کر دہلی پہنچ گئی اور اسی کے ساتھ شمالی ہند میں بھی شاعری نے باضابطہ طور پر اپنا اثر جمانا شروع کیا۔ متعدد شعرا نے غزل کی صنف میں طبع آزمائی کی۔ یہ الگ بات کہ معاملہ ولی دکنی کی روایت سے آگے نہ بڑھ سکا لیکن اسی دوران مظہر جان جاناں اور خان آرزو وغیرہ جیسے چند شعرا نے غزل کے ارتقاء میں معاونت بھی کی۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہوا ناخدائے سخن میر تقی میر تک پہنچتا ہے اور غزل ایک عروس سخن بن جاتی ہے اور فارسی غزل کے اثرات سے پوری طرح الگ ہو کر اردو غزل اپنی منفرد شناخت قائم کرتی ہے۔ میر تقی میر کے ساتھ ہی ساتھ شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کے دوسرے دور میں ہوتے ہیں مرزا محمد رفیع سودا، میر درد اور میر غلام حسن جسے ہم بحیثیت مجموعی اردو غزل کا اہم ترین دور کہہ سکتے ہیں۔ غزل نزاکت، نفاست، سادگی، سلاست کے ساتھ ہی ساتھ تصوف کی مخصوص کیفیات سے آشنا ہوتی ہے۔ خواجہ میر درد کے صوفیانہ غزل، غزل کے مضامین کو لافانی کیفیات سے لبریز کر دیتی ہے۔

میر تقی میر، سودا اور خواجہ میر درد سے لے کر غالب اور مومن تک غزل کے ارتقائی سفر میں شریک سفر ہوتے ہیں۔ مصحفی، انشا، جرأت اور آتش، کچھ معرکے ہوئے کچھ بے روی پیدا ہوئی اور کچھ مثبت انداز فکر بھی اختیار کیا گیا۔ اسی دوران لکھنؤ کے دبستان شعری نے جنم لیا اور بہت حد تک اردو شاعری اور خصوصاً اردو غزل کی اس عظمت کو دھکا پہنچایا۔ جو میر نے اسے بخشی تھی اور غزل ان اوصاف سے محروم ہوتی نظر آئی جو قابل ذکر تھے۔ لیکن اسی وقت غزل کی عزت و عظمت کو غالب نے سنبھال دیا اور انھیں کے ساتھ تھے مومن اور ذوق۔ غالب میر کے بعد اردو غزل کا دوسرا نقطۂ عروج بن کر سامنے آئے، انھوں نے غزل کو اس قدر نیا بن دیا اور دور رس بنا دیا کہ وہ عہد ساز صنف سخن بن گئی۔ میر نے اگر ایک طرف غزل کو زمین سے جوڑنے کی کوشش کی اور واردات قلب کے اظہار کا ذریعہ بنایا تو غالب نے اس میں فلسفۂ حیات و کائنات کا رنگ بھر کر بے مثال اور لازوال کر دیا۔ اسی عہد میں مومن خاں مومن تھے جنھوں نے خیالات کی نزاکت کو اپنی غزلوں کا نقطۂ شناخت بنایا اور جن کے ایک شعر ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

پر غالب نے اپنا پورا دیوان قربان کر دینے کی خواہش ظاہر کی، جب کہ شاہ ظفر کے استاد ذوق نے غزل میں دقیق مضامین کی روایت کا آغاز کیا اور زبان کی شستگی پر خصوصی توجہ دی۔ بہادر شاہ ظفر نے اثر انگیزی کے ساتھ مخصوص لہجے میں کیفیات دل بیان کیا۔

اس سے قبل کہ اردو غزل اپنا ارتقائی سفر طے کرتی ہوئی شاعر مشرق علامہ اقبال تک پہنچے دو اہم ناموں کا تذکرہ ضروری اور لازمی ہے اور وہ دو نام ہیں داغ دہلوی اور امیر مینائی جن کی غزلوں کی بعض دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں اردو غزل کی تاریخ میں شاید پہلی مرتبہ دہلی اور لکھنؤ کے مزاج شعری کا امتزاج ملتا ہے۔ اقبال کو عام طور پر نظم کا شاعر سمجھا گیا ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری بھی اپنے اندر وہی نکتہ سنجی رکھتی ہے جو نظم میں اقبال کی خاصیت ہے۔ اسی دور کے نمائندہ شعرا کی حیثیت سے حالی اور چکبست بھی ہمارے سامنے آتے ہیں اور پھر غزل اس عہد میں داخل ہوتی ہے جہاں موجود ہیں جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، حسرت موہانی اور کئی دوسرے لیکن یہیں پر ایک وہ نام بھی موجود ہے جس نے اردو غزل کو ناقابل فراموش عظمت و بلندی اور سرخروئی عطا کی اور وہ نام ہے شاد عظیم آبادی۔ آج سے تقریباً چالیس پچاس سال قبل علامہ نیاز فتح پوری نے کہا تھا کہ گزشتہ پچاس سالوں میں شاد سے بڑا کوئی دوسرا غزل گو پیدا نہیں ہوا جب کہ کلیم الدین احمد نے میر، غالب اور شاد کو اردو غزل کی تثلیث بتایا۔ جمیل مظہری اور فراق گورکھپوری سے غزل

باقی صفحہ ۳۸ پر

کوثر مظہری

مجاز کے بارے میں

جس طرح کائنات میں اس کے عناصر تغیر پذیر ہیں یا یوں کہیں کہ جس طرح اشیائے کائنات میں ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے اسی طرح انسانی فکر اور انسانی ذہن میں لمحہ لمحہ تغیر ہوتا رہتا ہے۔ ہر تغیر کا ایک نتیجہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ کوئی کم ٹوٹتا ہے کوئی زیادہ مگر ہر انسانی شخصیت بکھرتی اور اکٹھا ہوتی رہتی ہے۔ ایک بات قابل توجہ ہے کہ شخصیت کی شکست و ریخت میں جن عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے، وہ مختلف شخصیت میں مختلف ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی میں حرکت و عمل کا ہونا ہی اس کی زندگی پر دال ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان ہی شاعر ہوتا ہے جو اسی دنیا اور اسی سماج میں جیتا ہے۔ سب کچھ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ بلکہ دوسرے افراد معاشرہ سے کہیں زیادہ اچھی طرح دیکھتا ہے اور کچھ آگے بڑھیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ کارساز فطرت کی دروں بینی ایک شاعر ہی کر سکتا ہے۔ دوسرے افراد معاشرہ اس وصف خاص سے محروم ہیں۔ بقول شخصے ؎

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دل شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

شاعر کا زاویۂ نگاہ، اس کی تربیت، ارتقائے فکر اور معاشرے کے کوائف سے ترکیب پاتا ہے۔ یہاں مجاز کی زندگی، ان کی فکری بصیرت، عادات و اطوار، تنظیم حیات اور شعری کائنات میں جھانکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ شاید کوئی ایسی بات نکل آئے جو اب تک ہماری آنکھوں سے اوجھل تھی۔

مجاز آگرہ میں سائنس کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اچھے طالب علم بھی تسلیم کیے جاتے تھے۔ آگرہ میں میکش بھی تھے اور استاد شاعر فانی بھی۔ جذبی بھی زیر تعلیم تھے۔ رات رات بھر شعر و شاعری میں گزرنے لگی۔ ہاسٹل میں اور ہاسٹل سے باہر بھی۔ کورس کی کتابیں مجاز کے مزاج سے پٹتے نہیں کھاتی تھیں۔ دوستوں کو بھی یہی مشورہ دیتے تھے ؎

رکھ بھی دے اب اس کتاب خشک کو بالائے طاق

نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ فیل ہو گئے۔ ان کے والد علی گڑھ میں آ گئے تھے۔ سب پریشان ہوئے۔ انھیں علی گڑھ بلا لیا گیا۔ علی گڑھ میں اصغر گونڈوی، حسرت اور جگر کی شاعری جوان تھی۔ پھر وہی شاعری کا ماحول ملا یعنی تاڑ سے گرے کھجور پر لٹکے۔ گھر والوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اب سائنس اس کے بس کا نہیں۔ بی اے میں فلسفہ، معاشیات اور اردو کے مضامین رکھے۔ حاضری پوری نہیں ہوئی اور امتحان نہیں دے سکے۔ خیر کسی طرح بی اے تو انھوں نے کر لیا مگر ایم۔ اے میں داخلے کے باوجود اسے پورا نہیں کر سکے۔ وہاں کی محفلیں سبط حسن، سردار جعفری، جاں نثار اختر اور اختر امام سے گرم رہتی تھیں۔ شب و روز کے لمحے گپ بازیوں اور ادبی بحثوں میں گزر جاتے۔ یہاں کی فضا میں مجاز کی شاعری اور ان کا سحر خیز ترنم گونج گیا۔ ہر طرف پذیرائی ہوئی۔ اسی طالب علمی کے زمانے میں انھیں آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ملازمت مل گئی۔ آل انڈیا ریڈیو کے اردو پرچے "آواز" کا نام مجاز نے ہی تجویز کیا تھا۔ وہ اس کے نائب مدیر بھی تھے۔ ایک اتفاق کہیے کہ اسی مرکز پر ڈھیرے ڈھیرے ن۔م راشد، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، بیدی اور پطرس سب جمع ہو گئے۔ ڈھیرے ڈھیرے دوستوں کے ماحول میں رہ کر مجاز کی زندگی میں بے اعتدالیاں سما گئی تھیں۔ شراب نوشی، حسن پرستی اور کوچہ گردی نے نظام حیات کو خراب کر دیا۔ حالاں کہ اس وقت ان کی شاعری کے چرچے خوب ہو رہے تھے۔ ان کے دل میں کہیں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ وہ اپنی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کی بنا پر جیسے چاہیں جی سکتے ہیں۔ حالاں کہ وہ ایک سادہ دل انسان تھے۔ مگر کبھی کبھی کسی بات پر نوک جھونک ہو جاتی۔ بہرحال انھوں نے اس ملازمت سے استعفا دے دیا۔

دہلی کے دوران قیام وہ جس فلیٹ میں رہتے تھے اسی میں نورا سنگھ نام کی ایک پرائیویٹ نرس رہتی تھی۔ وہ پری پیکر مجاز کی شاعری پر مرتے مرتے مجاز پر مرنے لگی تھی۔ اس معشوق حسینہ کی تصویر کشی بیگم حمیدہ سالم نے اپنے مضمون "جگن بھیّا" میں اس طرح کی ہے:

"دہلی کے چوٹی کے خاندان کی اکلوتی بیٹی،
چنچل، البیلی، خوب صورت، لاڈ پیار میں
پلی ہوئی، عیش و عشرت کی عادی، ایک
عالدبھاری بھرکم شوہر کی ملکیت یا مالک
جو کچھ سمجھئے، یہ بیل منڈھے چڑھتی تو
کیوں کر۔" (مجاز ایک آہنگ)

یہ ضروری نہیں کہ یہ نورا سنگھ کا ہی ذکر ہو۔ دہلی میں ان کی اور بھی منظور نظر تھیں اور کئی دوسری لڑکیوں سے بھی مراسم تھے۔ علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے میں بھی ایک پروفیسر صاحب کی صاحبزادی پر عاشق ہو گئے تھے مگر گرم جوشی اور شدت پیدا نہ ہو سکی۔ بقول علی جواد زیدی "وہ کسی ایک (عورت) کا ہو کر نہیں رہ سکتا تھا" (بحوالہ۔ مجاز حیات اور شاعری منظر سلیم)

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

یہی وہ ذہنی کشمکش اور فکری انتشار تھا جس کے نتیجے میں، آوارہ، نمائش میں، آج کی رات، دہلی سے واپسی، حسن و عشق، نورا، مادام، شکوہ، مختصر، کس سے محبت ہے وغیرہ نظمیں وجود میں آئیں۔ ان کے شعروں میں جذبات کا جو فطری آہنگ ہے وہ اپنے اندر دعوائے محبوبیت بھی رکھتا ہے۔ ؎

میں بہت سرکش ہوں لیکن اک تمہارے واسطے
دل بچھا سکتا ہوں میں آنکھیں بچھا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردہ اٹھا سکتا ہوں میں

(نذر دل)

یہ ۱۹۳۶ء کا کلام ہے۔ مگر جب وہ اپنی نظم "مجبوریاں" تخلیق کرتے ہیں تو فکری جست معصوم اور یاس انگیز ہو جاتی ہے۔

میں آہیں بھر نہیں سکتا میں نغمے گا نہیں سکتا
سکوں لیکن مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا
وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

ان کے شعروں میں جو حسن پرستی، احساسات و جذبات کی عکاسی اور رومان پرور معصومیت اور یاسیت کے تیور بکھرے پڑے ہیں — کیا انھیں کھوکھلا اور جھوٹا قرار دیا جا سکے؟ یہ سچ ہے کہ مجاز شراب، شباب اور شاعری یعنی تین شین کی تثلیث میں خراب ہوئے۔ اگر تین شین کا اجتماع نہ ہوتا تو مجاز کی شخصیت اس سے دوسری ہوتی۔ حسن پرستی بری شے نہیں ہے۔ کچھ لوگ حسن پرستی اور حسن پسندی کو الگ الگ خانوں میں رکھتے ہیں۔ حالاں کہ حسن پسندی ہونے کے ساتھ ساتھ حسن پرستی آ ہی جاتی ہے اور دل ہی دل "حسن پارہ" کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ تو کیا فنون لطیفہ کی نازک ترین شاخ شاعری سے محفوظ ہونا امتناعی عمل ہے؟ میں سمجھتا ہوں فنون لطیفہ کی تمام شاخوں سے باطنی حظ حاصل کرنا احساس لطیف کا کام ہے جو فطری طور پر ہر انسان کے اندر کم و بیش تناسب میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ جمالیاتی حس کی رسائی کہاں تک ہو سکتی ہے، اس کا کوئی شعوری پیمانہ نہیں ہے۔

علامہ اقبال نے عطیہ فیضی کو خطوط لکھے۔ بیشتر خطوط کے مطالعے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اقبال پر عطیہ فیضی کے حسن نے طلسماتی اثر ڈالا تھا۔ انھوں نے جرمنی میں مس ویگے ناسٹ سے لگاؤ پیدا کیا جس کے نام انھوں نے جرمن زبان میں خطوط لکھے اور بار بار انگریزی میں دل کے معاملات حل کرنے کی التجا کرتے رہے۔ علامہ شبلی نعمانی بھی عطیہ فیضی کے اسیر ہو گئے تھے۔ غرض یہ کہ "حسن" ایک ایسا منشور (PRISM) ہے جس سے مختلف رنگوں کی کرنیں ہر چہار جانب بکھرتی رہتی ہے۔ علامہ اقبال اور علامہ شبلی نے حتی الامکان اپنی تخلیقات اور تحریرات میں انھے چیزوں کو آنے نہیں دیا۔ گرچہ ان کے نجی خطوط سے متذکرہ بالا گوشے روشن ہو گئے۔ ٹھیک اس کے برخلاف مجاز نے اپنے خطوں میں کم اور اپنی شاعری میں حسن و عشق کے معاملات اور اپنے نجی محسوسات کو دل کھول کر پیش کیا۔ یہاں بات اخلاقی جرأت کی نکل آتی ہے۔ شاعر کی شاعرانہ اخلاقی جرأت جناب شمس الرحمان فاروقی نے ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

"۔۔۔۔ سے مراد یہ ہے کہ شاعر زندگی کے ان مسائل سے آنکھ ملانا سیکھے جو اس نے خود چھیڑے ہیں۔ کیوں کہ شاعر کو یہ حق ہے کہ وہ صرف انہی مسائل کو اٹھائے جن کے ذریعہ اس کے ذہن میں کوئی تخیلی تحریک پیدا ہوتی ہے۔"

(اثبات و نفی۔ ص ۱۲۹)

مجاز کی زندگی کی المناکی اور شاعری کی نشاط آفرینی دونوں مل کر اجتماع ضدین کی مثال پیش کرتی ہیں۔ یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ یہ ان کے اخلاقی جرأت ہی تھی کہ انھوں نے نورا اور شہناز کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ اپنی محبوباؤں کی سیاہ زلفوں، گداز جسموں، دراز قامتوں، سرخ ہونٹوں، مرمریں باہنوں، شاداب اور گلابی چہروں اور ان کی شکر ریز مسکراہٹوں نیز ان کے ذریعہ دی گئی جراحتوں کا ذکر خلوص کے ساتھ کھل کر کیا۔

یہاں یہ بات بھی صاف ہو جائے کہ مجاز کی محبوبہ شاہی رکھ رکھاؤ سے عاری ہے۔ وہ متوسط طبقہ کی دوشیزہ ہے یا شادی شدہ ہے مجاز کو اپنے اوقات کا پتا ہے۔ ان کے عشق میں جذبے کی فراوانی ہے مگر وقار کا فقدان ہے۔ اس سلسلے میں جناب وارث علوی کے مضمون "مجاز کی یاد میں" سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

"یہاں حسن کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ پُروقار اور پُر تمکنت حسن کی نہیں یعنی ان میں قلوپطرہ اور نورجہاں کی آراستگی، اشرافیت اور شاہانہ انداز دل ربائی کے نہیں۔ مجاز کے یہاں حسن کی تصویر متوسط طبقہ کی معمولی گھریلو شرمیلی دوشیزہ کی ہے۔"

(ذہن جدید، فروری ۱۹۹۵ء)

مجاز کی شاعری میں جو نشاط آفرینی ترکیب پاتی ہے اس میں ان کی وضع کردہ اور اپنائی ہوئی اصطلاحوں کا ہاتھ ہے۔ مے و مینا و ایاغ، جام و صہبا اور نہ جانے ایسی کتنی اصطلاحیں استعمال کی ہیں جن میں عکس پیکر جمال بھی ہے اور ان کی آنکھوں کا جام بھی۔ ؎

وہ تبسم ہی تبسم کا جمال پیہم
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات
چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

مجاز کی اس رومانی شاعری کو نقطۂ عروج حاصل نہ ہو سکا۔ لفظوں کی آواز کو انھوں نے اچھی طرح برتا۔ ان کی آوارہ مزاجی، شراب نوشی اور حسن پرستی نے ان کی شاعری کا زاویہ بدل دیا۔ گرچہ وہ شراب، شباب اور شاعری کے تثلیثی حصار میں رہے مگر کوائف دل و نظر معاملات حسن و عشق اور رنگینیٔ طبع کو جس شدت احساس کے ساتھ انھوں نے اپنی تخلیقات میں پیش کیا' وہ مجاز کا اپنا حصہ ہے۔ ہاں یہاں پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر شراب نوشی چھوڑ کر زندگی کے دوسرے اہم مسائل پر سنجیدگی سے سوچتے تو شاید شاعر کی فکر کی سطح اور بھی اونچی ہو جاتی۔ اسی طرح اگر ان کی زندگی تاہل کی ہوتی تو شعر گوئی میں مزید استحکام کا امکان پیدا ہو سکتا تھا۔ شاعری کا خمیر اور انسانی فطرت کا خمیر دونوں مل کر ایک بامعنی اور پُراسرار (ابہام سے پرے) دنیا پیدا کرتے لیکن اگر ایسا نہیں ہوا اور وہ شراب پیتے رہے، اپنے دل میں ناکام محبت کی آگ لے کر جیتے رہے اور گریبان حیات کو عزلت گزیں ہو کر سیتے رہے، تو کیا ان کی شاعری بے معنی تصور

کی جائے گی؟ ایسا نہیں ہوگا۔ یہ تو بڑی بات ہے کہ ناکامی اور محرومی کے باوجود، شراب نوشی اور زندگی سے متعلق غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود اتنی اچھی شاعری پیش کی۔ جہاں تک شراب نوشی کی بات ہے تو یہ رشتۂ بنت عنب کل بھی طے ہوتا تھا اور آج بھی جوڑا جاتا ہے۔

مجاز کی زندگی کے لمحوں اور حقیقی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاعری اور زندگی میں متوازن مطابقت و موانست کی تلاش بے معنی بھی ہوسکتی ہے۔ ان کی رومانی زندگی جس میں المناکی کے عناصر زیادہ ہیں، کیا یوں ہی رد کی جاسکتی ہے؟ کیا رومانی زندگی اور رومانی شاعری کا نقطۂ ارتکاز محو ہوچکا ہے؟ کیا شاعری اور زندگی میں کھوکھلے پن کے علاوہ کچھ بھی نہیں؟ کچھ لوگوں نے اسے کھوکھلا ہی تصور کیا ہے۔ اریب کی شاعری پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے جناب شمس الرحمان فاروقی لکھتے ہیں:

"لیکن یہ رومانی مزاج اگر صرف اس طرح کی خود فریبی آمیز جرأت مندی تک محدود ہوتا تو اریب کی شاعری مجاز کی طرح جھوٹے گوٹے کی شاعری ہوتی جس کا جادو آج چلنا مشکل ہے۔"

یہاں اریب کی شاعری پر بات کرنے کا موقع نہیں ہے۔ یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ مجاز نے خود کو فریب نہیں دیا بلکہ مخمور ہوکر بھی ہوش مندی کی باتیں کیں۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز کو خوب سمجھتے تھے ؎

رشک صد ہوش ہے مستی میری
ایسی مستی ہے کہ ہشیار ہوں میں
آہ وہ چکر دیے ہیں گردش آلام نے
کھول کر رکھ دی ہیں آنکھیں تلخی ایام نے
سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے

حق تو یہ ہے کہ مجاز کی شاعری میں آج بھی TIREDNESS اور اکتاہٹ کے عناصر نہیں ملتے بلکہ جو تازگی تب تھی وہ اب بھی ہے۔ چوں کہ وہ ترقی پسندوں کی صف میں تھے اس لیے انھوں نے بھی مزدوروں کے گیت گائے۔ انقلابی نظمیں لکھیں اور جنسی اور نفسیاتی باریکیوں کو لفظوں کا لطیف پیکر عطا کیا۔ البتہ انقلابی نظمیں لکھتے وقت جوش کی طرح کھوکھلے بھاری بھرکم اور پرجلال الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ مگر انھوں نے اس روش پر جوش کا ساتھ دور تک نہیں دیا۔

اس وقت شاعری میں ہیئتی تجربے بھی ہو رہے تھے۔ ن۔م۔ راشد، فیض، میرا جی، سردار جعفری، مخدوم، اختر الایمان وغیرہ نے آزاد اور نیم پابند نظموں کا تجربہ کیا۔ بعد میں ن م۔ راشد اور میرا جی نے حلقۂ ارباب ذوق کے نام۔۔۔ سے الگ ایک ادبی حلقہ بنا لیا۔ ان ہیئتی تجربوں سے مجاز نے خود کو الگ ہی رکھا یا یوں کہیں کہ ان کی موزونیٔ طبع اس طرف مائل ہی نہ ہوئی۔ اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

"تکنیک کے معاملے میں وہ پرانی روش سے سرمو انحراف نہیں کرتے اور انھوں نے جدید وضع کے تجربوں سے ہمیں روشناس نہیں کرایا۔"
(علی گڑھ میگزین، مجاز نمبر)

مجاز کی سرشت میں تہذیبی قدریں بھی جاگزیں تھیں۔ نذر علی گڑھ، ساتھی، لکھنؤ، وطن آشوب جیسی پرکار نظمیں اسی نوع کی نظمیں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کیٹس کی طرح وہ بھی حسن کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ عشق میں دونوں ناکام۔ دونوں کی شاعری کا مرکزی خیال ایک سا۔ لہٰذا حسن و عشق کے رموز و نکات اور شاعر کے جذبات اور کرب و سوز کو سامنے رکھ کر مجاز کی شاعری کا تجزیہ پیش کیا جانا چاہیے۔ ان کی شاعری کو محض رومان انگیز کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا۔ ●

بقیہ: اردو غزل: ایک تعارفی خاکہ

کی ایک نئی آواز شروع ہوتی ہے۔ اسی آواز کے ساتھ ناصر کاظمی کا حزن شامل ہوتا ہے اور فیض کی انقلابی لے اور پھر آگے بڑھ کر مجروح کا تغزل، مجاز کی انقلابیت، سردار جعفری اور پرویز شاہدی کا بلند آہنگ اور خلیل الرحمان اعظمی کا اسلوب لطیف۔ پھر ۱۹۶۰ء کے بعد غزل کا لہجہ یکسر تبدیل ہوتا ہے اور یہ عہد نو کے تقاضوں کا استقبال کرتی ہے۔ اس سفر میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں حسن نعیم، شاذ تمکنت، منیر نیازی، شہرت بخاری، احمد فراز، ظفر اقبال، شکیب جلالی، جون ایلیا، بانی، مظہر امام، شہریار، محمود سعیدی، سلطان اختر، لطف الرحمان، علیم اللہ حالی، صدیق مجیبی، پھر سفر کچھ اور آگے بڑھتا ہے اور عرفان صدیقی، عین تابش، اقبال ساجد، حسن عباس رضا، اسعد بدایونی اور بہت سارے دوسرے نام غزل کو نئے تجربات اور نئے ذائقے سے روشناس کراتے ہیں۔ یہ سارے نام آج بھی غزل شناسی اور غزل گوئی کے راستے پر پوری آب و تاب کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ ●

بقیہ: یونیسکو اور اس کی خدمات

کو اعتماد میں لینا پڑتا ہے۔

اس وقت یونیسکو کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدے پر فیڈریکو مایر فائز ہیں۔ ڈائرکٹر جنرل کا عہدہ چھ برس کے لیے ہوتا ہے۔ ●

میگسیٹ اسکیم کے تحت روزگار کے ۴۶۰۰۰ مواقع

سائنس اور ٹکنالوجی کے ذریعے بڑے پیمانے پر روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی اسکیم (میگسیٹ) کے تحت اب تک روزگار کے ۴۶۲۰۰ مواقع پیدا کیے جاچکے ہیں۔ یہ اسکیم سائنس اور ٹکنالوجی کے محکمے کے تحت ۱۹۹۱ء میں شروع کی گئی تھی۔ اس اسکیم میں سائنس اور ٹکنالوجی کے طریقوں کے ذریعے پائیدار روزگار کے مواقع پیدا کرنے کا اہتمام ہے۔ اس اسکیم کے تحت بے روزگار نوجوانوں کے لیے تربیت کے پروگراموں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

اس اسکیم پر انجینئرنگ کالج، تعلیمی ادارے، تکنیکی مشاورتی ادارے اور غیر سرکاری تنظیمیں عمل درآمد کر رہی ہیں۔ اس اسکیم کی کامیابی سے دیہی ترقیات کی وزارت کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے کہ وہ روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے پروگراموں میں کچھ ترامیم کرے۔ ●

اعجاز بن ضیا اوگانوی

قصّہ گو اور اجنبی

مسجد کی کارنس پر دو کبوتر پر پھیلائے گھوم گھوم کر آپس میں پیار و محبت کا اظہار کر رہے تھے اور کبھی کبھی والہانہ انداز میں چارہ بدلنے لگتے۔ ان کبوتروں کے قریب ہی گور تیے کا ایک معصوم بچہ کبوتروں کو چارہ بدلتے دیکھ کر چیں چیں کرتے ہوئے اپنے پروں کو پھڑ پھڑا کر بار بار اپنی چونچ کھولتا ہے اور مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھا ایک اجنبی ان کبوتروں کو بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے ہونٹوں پر زبان بھی پھیر لیتا ہے۔ اس کی نقاہت اور دبی ہوئی آواز سے اندازہ لگانا قطعی دشوار نہیں کہ وہ کئی ایک وقتوں سے بھوکا ہے۔ جمعہ کی نماز سے قبل اس اجنبی کو کسی نے نہیں دیکھا تھا اور کسی کو بھی یہ معلوم نہیں کہ یہ کون ہے، کیا ہے اور یہاں کیوں آیا ہے۔ پہلی نظر میں تو وہ یقینی طور پر کوئی مخبر یا جاسوس نظر آتا تھا۔ اس کا حلیہ اس بات کا شاہد ہے۔ الجھی ہوئی داڑھی، بے ترتیب بال، پیوند زدہ لباس، دبلا پتلا جسم، ناک کھڑی، آنکھیں بڑی بڑی لیکن سرخ اور نشیلی۔ اس قدر کم سخن کہ لوگوں کو کوفت ہونے لگتی۔ دو چار بار استفسار کیجیے تو نہایت مختصر جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ اس کے اسی رویے نے لوگوں کو مشتبہ بنا دیا ہے۔ اب تو لوگ اس فکر میں بھی ہیں کہ کسی بھی حالت میں اسے یہاں سے منتقل کر دیا جائے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے نظریں ملا سکے یا اس کے سامنے یہ تجویز رکھے کہ ۔ ۔ ۔ ۔

قصہ گو اس قدر کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ نہ جانے واقعات کے کس کلائمکس پر اس کے خیالات کا پرندہ پر مارنے کی سعی میں مصروف ہے یا پھر وہ منتشر واقعات کو سمیٹنے یا اس کے اور چھور ملانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن نہیں۔ شاید اس واقعہ نے جو ہم لوگوں کے درمیان آج پیش کرنے والا ہے۔ اسے متاثر کیا ہے۔ اس کے حسِ باطنی کو شدید جھٹکا دیا ہے۔ یہ ذہنی طور پر منتشر دکھائی دینے لگا ہے۔ وہ قصے کو ایک نکتہ پر لانے میں مصروف ہے مگر اس کے لب لرز کر رہ جاتے ہیں۔ شاید اس کو قوتِ گویائی اس کے خیالات کا ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ ہر کسی کی نگاہیں قصہ گو پر مرکوز ہیں کہ اسی درمیان اس نوکِ مژگاں پر آنسو کے دو قطرے آکر ٹھہر جاتے ہیں۔ ہم نے جان لیا ہے کہ کوئی واقعہ ہے کوئی خاص واقعہ ہے جب ہی تو بے انتہا کوشش کے باوجود قوتِ گویائی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر رہی ہے۔ وہ خود میں تمام تر قوتوں کو یکجا کر کے یک بارگی کہہ اٹھتا ہے۔

تم لوگ تو سمجھ رہے ہو گے کہ واقعات سے میرا ازلی رشتہ ہے، میں واقعات و حادثات گڑھ لیتا ہوں، فرضی کہانیاں بنا کر تم لوگوں تک پہنچاتا ہوں لیکن یاد رکھو! ہر واقعہ اور قصے کہانیوں کے درمیان حقیقت کے نقوش پوشیدہ ہوتے ہیں ہر ایک کہانی اصلیت کی ردا میں لپٹی ہوتی ہے۔ بس اسے پیش کرنے کا فن چاہیے۔ خواہ مخواہ میں تم لوگوں کو اس کہانی کے پس پردہ کچھ بے ربط سی بات کہہ گیا اور اصل کہانی کے درمیان ایک حدِ فاصل کھنچ گیا۔ اس قدر کہنے کے بعد قصہ گو اس کہانی کی طرف لوٹ آتا ہے۔

کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس سے نظریں ملا سکے یا اس کے سامنے تجویز رکھے کہ آپ یہاں غیر ضروری طور پر قیام پذیر ہیں، جب کہ مسجد کے چہار جانب صحن، برآمدے، دروازے اور اس سے باہر علاقے کے لوگوں کی ایک جمِ غفیر تھی کہ اسی درمیان ایک تاجر اس کے قریب دو زانو ہوتا ہے اور بڑے ہی ادب کے ساتھ سرگوشیوں میں کچھ کہتا ہے لیکن اس کی سرگوشیاں بے اثر ہوتی ہیں پھر وہ قدرے باآواز کہتا ہے۔

بابا! آپ کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں۔ کوئی مقصد؟

وہ نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھتا ہے، پھر اپنی روایت کے مطابق ان کبوتروں پر نگاہیں مرکوز کر دیتا ہے۔

وہ ایک بار پھر ہمت جٹا کر استفسار کرتا ہے۔ بابا! کیا آپ نے کچھ کھایا؟

یک بارگی وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا ہے جیسے اس تاجر نے اس کی دکھتی رگ میں انگلیاں پھنسا دی ہے۔

کیا تو کھلا پائے گا۔؟

کیوں نہیں؟ وہ تاجر فاتحانہ انداز میں مجمع پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتا ہے اور بڑی ہی عجلت میں لذیذ کھانے اس کے روبرو پیش کرتا ہے۔ لیکن وہ اجنبی دسترخوان کی جانب دیکھے بغیر کہہ اٹھتا ہے۔

کیا یہ حلال ہے؟

اردو شعبہ بہار قانون ساز اسمبلی، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۱۵ (بہار)

ہاں، میں ایک تاجر ہوں لیکن اس میں حرام کا شائبہ تک نہیں۔

ہاں، تم نے ٹھیک ہی کہا۔ تم ایک تاجر ہو۔ تو کیا تم زیادہ منافع کے لالچ میں ذخیرہ اندوزی نہیں کرتے ؟ کیا تم اضافی قیمت کا لیبل سابقہ سامانوں پر نہیں لگاتے جب کہ وہ پرانی قیمت کم ہوا کرتی ہے۔ یقین مانو۔ کبھی صاف و شفاف اور پاک پانی میں ناپاکی کا ایک قطرہ نہ صرف پانی کو ناقابل استعمال بنا دیتا ہے بلکہ اس برتن کی طہارت بھی جاتی رہتی ہے اور تمہارا یہ مال، تمہاری بیغذا جیسے تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ نظریں جھکائے ہوئے اپنا محاسبہ کرتا ہے اور قصہ گو اس قدر کہہ کر کچھ اور سوچنے لگتا ہے۔ سب کی نگاہیں اس کی جانب ہیں کہ وہ پھر گویا ہوتا ہے۔

ایک دوسرا شخص اس تاجر کی جگہ لے لیتا ہے اور اس اجنبی سے مخاطب ہوتا ہے۔

بابا! آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے ؟ میں سرکاری دفتر میں ایک عہدے پر فائز ہوں۔ لیکن یقین مانیے میں نے کمیشن کو ہمیشہ رشوت کی مانند گناہ عظیم گردانا اور اسے حلال نہ سمجھا۔ ناجائز مال پر جائز کا لیبل لگانا میری سرشت میں داخل نہیں۔

اچھا! تم ایک سرکاری ملازم ہو؟ کیا تم اپنے پیشے کے اعتبار سے ایماندار ہو؟

ہاں، بلاشبہ۔

تو کیا تم ڈیوٹی آور میں دفتر سے غائب نہیں ہوتے؟

نہیں، قطعی نہیں۔

تو کیا تم ہفتہ عشرہ میں نصف دو تم کی غیر حاضری کو فرض عین اور جائز قرار نہیں دیتے جب کہ اس کا ذکر تمہاری ملازمت کے کسی بھی خانے میں درج نہیں ؟

نہیں، کبھی نہیں۔

تو کیا تم وقتاً فوقتاً فرنچ لیو میں نہیں رہتے جس کا رجسٹر میں اندراج کرانے سے کترا یا کرتے کیا ہو ؟

نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔

تو کیا تم اکثر و بیشتر دس بیس منٹ تاخیر سے دفتر نہیں پہنچتے ؟ اور پھر تم وقت کے خانے میں اپنی ایمانداری کا۔

وہ نظریں جھکا لیتا ہے۔

اور اب تم ہی بتاؤ کہ تمہاری یہ عادت ایمانداری کے کس کھاتے میں منضبط کی جائے ؟ اور تم کہتے ہو کہ میرا یہ کھانا ۔ ۔ یاد رکھو! میں ایک مسافر ہوں، اجنبی مسافر۔ اگر خدانخواستہ فاقوں سے میری موت واقع ہو گئی تو تم ۔ تم سب اس گناہ کی دلدل سے اپنے ضمیر کو نکال نہ پاؤ گے ۔ یہ قتل ہوگا اور اس کے چھینٹے تمہارے دامن پر ہوں گے۔ کیا تم اپنے ضمیر کے دامن سے ان دھبوں کو مٹا پاؤ گے ؟

اور پھر مجمع پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کہہ اٹھتا ہے۔ کوئی ہے جو اس مسافر کی جان بچائے۔ ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، لیکچرر، تم وہ اور وہ۔ میں ڈھائی دن سے فاقے کر رہا ہوں

سب اپنا اپنا محاسبہ کرنے لگتے ہیں۔ ہر کسی کی نگاہیں ایک دوسرے کی جانب اٹھ جاتی ہیں اور خود بخود ندامت سے جھک جاتی ہیں۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد قصہ گو کی آواز گلوگیر ہو چکی تھی، مگر کہانی کی ڈور کا آخری سرا اس کے ہاتھ تھا۔ وہ ہمارے درمیان نم آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہہ اٹھتا ہے ـــــ کہ اسی درمیان کبوتروں کے قریب سے وہی گوریے کا جوڑا بے تابی میں پھڑپھڑا کر چھت سے نیچے آگرتا ہے اور اپنی کمزور ٹانگوں کو کھینچنے لگتا ہے۔ سب کی نگاہیں اس جانب اٹھ جاتی ہیں۔ اور وہ کبوتر اچانک انجانے حادثے کے خوف سے اڑ جاتے ہیں ـــ اور اب وہی اجنبی مسافر جس کے سامنے وہ پورا منظر تھا، مسجد کی دیوار کے ٹیک لگا کر غیر ارادی طور پر اپنی ٹانگیں پھیلا دیتا ہے۔ ●

بقیہ: جواہر لال نہرو باپو کی نظروں میں

جوڑنے میں زبان رکاوٹ نہیں ہوتی اور میں یہ جانتا ہوں کہ جب میں چلا جاؤں گا تو وہ میری زبان بولے گا۔"

اگرچہ راج جی، ولبھ بھائی پٹیل، راجندر بابو کی طرح کئی مجاہدین جنگ آزادی میں تھے جنہوں نے نہ صرف آزادی حاصل کرنے بلکہ ہندوستان کی تعمیر میں اہم رول ادا کیا اور وہ سب گاندھی جی کے محبوب تھے لیکن جواہر لال تو بس اپنی طرح سے ہی ایک تھے جو باپو کے دل و دماغ میں سما گئے تھے۔ اس لیے نہایت خلوص، انسانیت اور حق کے جذبے کے ساتھ باپو کہتے ہیں "وہ اسپھٹک کی مانند ایک دم صاف ستھرا ہے۔ اس کی عقیدت اور محبت کا کوئی جواز نہیں۔ دور ماضی میں اس سے مجھ سے کئی خیالی لڑائیوں کے باوجود آج وہ بلا تنازعہ مجھ سے سب کچھ لے جاتا ہے۔ اس نے اپنی محبت میں مجھے باندھ لیا ہے اور اسی لیے میں نے چاروں طرف اعلان کیا ہے کہ میں جواہر لال کا قیدی ہوں۔" اور پھر محبت سے خوش ہو کر باپو کہتے ہیں "ہمارا یہ تاج کا بادشاہ ہے جواہر لال نہرو۔ وہ ہمارے لیے انتظامیہ کا کام کر رہا ہے۔ راجہ کی طرح نہیں بلکہ ہمارے پہلے خدمت گار کی طرح۔ اس کی یہ خواہش ہے کہ وہ ہندوستان کی خدمت کرتے ہوئے دنیا کی خدمت کر لے۔"

ایسے تھے ہمارے جواہر لال باپو کی نظروں میں۔ ●

بقیہ: اقوام متحدہ ۔ امن عالم کی نقیب

عالمی امن کو درپیش خطرے سے دور کرنے میں اقوام متحدہ کی کوششوں میں تعاون کیا مثلاً انڈونیشیا (۱۹۴۷-۴۸ء) کوریا (۱۹۵۰ء) انڈوچائینا (۱۹۵۴ء) مصر (۱۹۵۶ء) لبنان (۱۹۵۸ء) کانگو (۱۹۶۰-۶۴ء) یمن (۱۹۶۲-۶۴ء) اور سائپرس (۱۹۶۴ء) کے بحرانوں میں۔

ہندوستان نے بین اقوامی قضیوں کے پرامن تصفیہ کے اصول پر اپنے یقین کا بار بار ثبوت دیا ہے اور کسی بھی ریاست کی علاقائی سالمیت اور سیاسی آزادی کی خلاف ورزی پر اپنی آواز اٹھائی ہے۔ ہندوستان نے سرد جنگ اور فوجی گٹھ جوڑوں کی بھی اس بنا پر مذمت کی کہ وہ بین اقوامی امن کے لیے خطرہ ہیں۔ ہندوستان نے غیر وابستگی کی پالیسی اور پنچ شیل کے اصول کو مقبول عام بنایا اور مکمل ترک اسلحہ کے لیے کوشش کی۔ ہندوستان نے نو آبادیاتی نظام اور سامراج کے خاتمہ کے لیے بھی انتھک کوششیں کیں کیوں کہ ان کا خاتمہ پرامن بین اقوامی ماحول کے لیے لازمی ہے اور اس لیے اس نے ایشیائی اور افریقی ملکوں میں قومی آزادی کی تحریکوں کی پرزور حمایت کی۔ غرضیکہ اقوام متحدہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں ہندوستان نے حصہ نہ لیا ہو اور جواہر لال نہرو کے مذکورہ بالا تاریخی الفاظ کو عملی شکل نہ دی ہو۔

غزلیں

یعقوب عامر

انسانیت کے دور میں کردار دیکھ لو
ہر ہاتھ میں سجی ہوئی تلوار دیکھ لو

دشمن نہ آئے گا کوئی شب خون مارنے
یاروں کو شام سے پسِ دیوار دیکھ لو

محرومیوں کے دور میں منصف نہ تم ہوئے
اب ہر قدم پہ مجھ کو گنہگار دیکھ لو

لو آ گئے ہیں شہر میں جنگل کے حادثے
رہزن قدم قدم سرِ بازار دیکھ لو

اظہارِ حال نے مجھے مجرم بنا دیا
ہر شخص غیر کا ہے طرفدار دیکھ لو

روشن کیا تھا جن کو لہو کے چراغ سے
اب سب وہی نشانیاں مسمار دیکھ لو

عامرؔ کو ہم نے اس طرح دیکھا نہ تھا کبھی
اب ہر کسی سے برسرِ پیکار دیکھ لو

غمگین قریشی

پھول کو چاہا کانٹے پائے خاک ہوئے ارمان بہت
راہِ وفا اپنا کر نکلا اپنا دل نادان بہت

مرنے کی خواہش تو ہم کو آپ کے غم میں ہوتی ہے
آپ اگر ہوں پاس ہمارے جینے کے سامان بہت

جن کے نام سے اہلِ دل تک پیار کی خوشبو پھیلی ہے
آج کی دنیا میں بھی ہوتے کاش وہی انسان بہت

آنسو، آہیں، ان کا تصور، دردِ جدائی سوز تڑپ
رات مرے چھوٹے سے گھر میں ٹھہرے تھے مہمان بہت

غمگیںؔ روح کی پیاس بجھانا شبنم کی تاثیر نہیں
سوکھے ہونٹ لیے پھرتا ہوں میں کب سے ویران بہت

شفیع اللہ خاں رازؔ

فضا میں بڑھتی ہوئی تیرگی کی فکر نہیں
کسی کو گھٹتی ہوئی روشنی کی فکر نہیں

کچھ ایسا رونقِ دنیا میں کھو گیا ہے بشر
ذرا بھی روح کی پاکیزگی کی فکر نہیں

لہو میں ڈوبا ہوا عکس تم سے پوچھے گا
بتاؤ، آئینۂ زندگی کی فکر نہیں

نکل رہی ہے فضائیں دھواں مشینوں کا
مگر کسی کو بھی آلودگی کی فکر نہیں

بتاؤ کون تمہارا خیال رکھے گا
تمہیں خود اپنی اگر زندگی کی فکر نہیں

زمیں کو آگ کے طوفان نگلنے والے ہیں
بشر کو بڑھتی ہوئی شعلگی کی فکر نہیں

نہ جانے کون سے مرکز پہ آ گئی ہے حیات
کسی کو رازؔ ذرا بھی کسی کی فکر نہیں

۱۵۰، غالب اپارٹمنٹس، پرہلاد روڈ، تیمیم پورہ، دہلی ۱۱۰۰۳۴
ڈھولیکھال، سہارنپور، یوپی
کٹرا عبدال خاں، اردو روڈ، اٹاوہ ۔ ۲۰۶۰۰۱ یوپی

غزلیں

مجیب بستوی

بے کیف میکدہ ہے کہ پیرِ مغاں نہیں
اظہارِ تشنگی ہے یہ حسنِ بیاں نہیں

ٹھوکر سے پائمال نہ کرنا اسے کبھی
میری جبیں کا اور کوئی آستاں نہیں

ہاں آپ کے حضور ہی رہتا ہوں بے زباں
رکھنا نہ یہ گمان کہ منہ میں زباں نہیں

نظارۂ جمالِ محبت میں محو ہوں
میری نگاہ سے کوئی جلوہ نہاں نہیں

چھپیے نہ اس کو غیب کہ ہے عالم شہود
ذرہ ہے کون سا کہ تو اس سے عیاں نہیں

آگے قدم بڑھاؤ ذرا اور کچھ مجیب
کوشش کبھی ہوتی ہے کوئی رائیگاں نہیں

سمریاواں بازار، ضلع بستی۔ یوپی

نثار جیراجپوری

دھواں دھواں تھا نہیں آسکا نظر آ گئے
قریب منزل مقصود تھی مگر آ گئے

کہیں بھی ختم کوئی راستہ نہیں ہوتا
ضرور ہوگی یہیں پہ کوئی ڈگر آ گئے

ابھی اٹھاؤ نہ لنگر جہاز کے اپنے
ابھی ہے پانیوں میں دور تک بھنور آ گئے

انھیں تھا شوق بہت قتل عام کرنے کا
اسی کو دیکھ کے ڈالا تھا میں نے سر آ گئے

ذرا سا عکس مجھے دے دے آئینے والے
مرے صدف میں نمایاں بھی ہو گہر آ گئے

نہ ہار حوصلہ اے رات کے مسافر تو
بڑھا یہ پاؤں ملے گی تجھے سحر آ گئے

ڈیپارٹمنٹ آف کامرس۔ شبلی نیشنل پی جی کالج،
اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱

فرحان حنیف

مکان چہرے، دکان چہرے
ہماری بستی کی جان چہرے

اُجاڑ نسلوں کے نوحہ گر ہیں
خزاں رسیدہ جوان چہرے

دھواں دھواں منظروں کا حصہ
خیال، خوشبو، گمان، چہرے

کوئی تاثر ہو زندگی کا
کریں خوشی، غم، بیان، چہرے

کوئی نہیں ہے کسی سے واقف
نگر میں سب بے نشان چہرے

حنیف، قدریں بدل چکی ہیں
نہ ڈھونڈ، اب وہ مہان چہرے

ٹھکر ڈر رمضان بانگی چال، کمرہ نمبرہ، فرسٹ فلور،
کامٹھی پورہ، ٹھکر ڈین، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

ٹرائی سیم۔ کامیابی کا زینہ

ہر سال ہزار ہا دیہی نوجوان روزگار اور روزی روٹی کے لیے شہروں کی طرف دوڑتے ہیں۔ چوں کہ وہ کسی کام کے تربیت یافتہ نہیں ہوتے اس لیے ان کو زبردست دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ مشکل ہی سے کوئی بہتر کام پاتے ہیں۔ مرکزی حکومت نے غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے کنبوں کے دیہی نوجوانوں کے لیے تکنیکی اور صنعت کاری سے متعلق کاموں کی تربیت کے لیے ایک اسکیم شروع کر رکھی ہے۔ اس کے ذریعے سے وہ از خود اپنا روزگار شروع کر سکتے ہیں اور زراعت نیز اس سے متعلقہ دیگر سرگرمیوں میں خود کو مشغول کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنا کاروبار یا کوئی صنعت شروع کر سکتے ہیں۔ اس اسکیم کا نام ہے خود روزگار کے لیے دیہی نوجوانوں کی تربیتی اسکیم جسے مختصراً ٹرائی سیم کہتے ہیں۔ یہ اگست ۱۹۷۹ء میں شروع کی گئی تھی مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے ایک حصے کے طور پر اسے شروع کیا گیا تھا۔ اس وقت سے ۳۰ لاکھ سے زیادہ دیہی نوجوانوں کو اس اسکیم کے تحت تربیت دی جا چکی ہے۔ آٹھویں منصوبے میں ۱۹ لاکھ نوجوانوں کو اس اسکیم کے تحت تربیت دینے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

ضرورت پر مبنی تربیت

یہ تربیت انھیں پیشوں اور کاموں کے لیے دی جاتی ہے جن کی اس علاقے یا ملک کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تربیت روایتی قسم کے اداروں کے ذریعے سے اور غیر ادارہ جاتی طریقوں مثلاً ماسٹر کرافٹ مینوں کی خدمات کے ذریعے سے دی جاتی ہے۔ ۱۸ سال سے ۳۵ برس کے نوجوانوں کو مختلف کاموں کا تکنیکی ہنر سکھایا جاتا ہے۔ البتہ بیوہ عورتوں، آزاد کرائے بندھوا مزدوروں، ترقیاتی پروجیکٹوں کو بروئے کار لانے کے نتیجے میں بے گھر ہوئے لوگوں وغیرہ کے لیے عمر کی حد ۴۵ سال تک ہے۔ کوڑھ کے مرض سے نجات پائے ہوئے افراد بھی ۴۵ سال کی عمر تک اس تربیت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ منتخبہ امیدواروں میں ۴۰ فی صد خواتین اور ۵۰ فی صد درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔

کامیابی کے ساتھ تربیت مکمل کر لینے کے بعد، مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت خواہش مند امیدواروں کے لیے انتظامات کیے جاتے ہیں یا پھر جن میں خود روزگار کی صلاحیت ہے، ان کے لیے بھی بندوبست کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کو با اجرت روزگار حاصل کرنے کے سلسلے میں رہنمائی کی جاتی ہے۔

چینگل پٹو کا تجربہ

تمل ناڈو کا ایک ضلع چینگل پٹو ہے۔ اس نے اس اسکیم کو کامیابی سے لاگو کرنے میں نمایاں مقام پایا ہے۔ مثال کے طور پر کٹن کولاٹور بلاک میں پیسری گاؤں کو لے لیجیے۔ اس میں گڑیاں بنانے کے لیے ایک پیپر مشین لگائی گئی ہے۔ یہ مشین ہر رنگ اور ہر سائز کی گڑیاں تیار کرتی ہے۔ کھادی کرافٹ، پوم پوہر، کیرالی وغیرہ میں یہ گڑیاں فروخت ہوتی ہیں۔ ۳۸ ارکان پر مشتمل ایک سوسائٹی اسے چلاتی ہے۔ دسہرہ کے سیزن میں یہ ۵۰ ہزار روپے کی مالیت کا سامان فروخت کر دیتی ہے۔

اس گاؤں میں ۲۰ نوجوان عورتوں کو جنھیں ٹرائی سیم اسکیم کے تحت گڑیاں بنانے کے کام کے لیے منتخب کیا گیا، ماسٹر کرافٹ مین شری تولو کا نم تربیت دے رہے ہیں تاکہ وہ اس مشین پر گڑیاں تیار کر سکیں۔ گڑیوں کے ماڈل، ان کی سجاوٹ، نقاشی وغیرہ سبھی پہلوؤں کی تربیت دی جا رہی ہے۔ بہت سی عورتیں جو آس پاس کے علاقوں سے آ رہی ہیں اور جو آٹھویں پاس ہیں، یہ تربیت پا رہی ہیں اور ان کو ۲۵۰ روپے ماہانہ کے حساب سے وظیفہ بھی دیا جا رہا ہے۔ ان کو آٹھ سو روپے کی مالیت کے اوزار بھی دیے جاتے ہیں۔ تربیت کے بعد یہ خود کفیل بن سکیں گی اور تقریباً ۲۰ روپے یومیہ کما سکیں گی۔ اس یونٹ میں مختلف بیچوں میں ۱۸۸ عورتوں کو تربیت دی جا چکی ہے اور بہت سی عورتوں نے دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام کے تحت اپنا کام خود شروع کر رکھا ہے۔ چینگل پٹو میں نہ صرف پیپر مشین کے ذریعے گڑیاں بنانے کی تربیت دی جاتی ہے بلکہ اور بہت سے کاموں کی بھی تربیت دی جاتی ہے مثلاً آٹو الیکٹرک ورک، پرنٹنگ، کمپیوٹر پروگرامنگ، ڈیسک ٹاپ پبلشنگ، فینسی چمڑے کی مصنوعات، موٹر ری وائنڈنگ، ریڈیو، ٹی وی کا بنانا، الیکٹرک ورک، ٹیلرنگ، ٹائپ رائٹنگ، ویلڈنگ، بڑھئی کا کام، ایر کنڈیشنگ، ریفریجریشن، اسکرین پرنٹنگ، ڈیزل انجن، سنگ تراشی۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں یہاں دو ہزار سے زیادہ نوجوانوں کو تربیت دی گئی جس پر ۶۷ لاکھ روپے کے اخراجات آئے۔ اسی عرصے میں پورے تمل ناڈو میں ۳۰ ہزار افراد کو تربیت دی گئی جس پر کل ۸ کروڑ روپے کے اخراجات آئے۔

نظرثانی شدہ تربیتی پروگرام

ٹرائی سیم اسکیم پر نظر ثانی کرکے اسے مستحکم بنایا گیا ہے۔ تسلیم شدہ آئی ٹی آئی، پالی تکنیک، کرشی وگیان کیندروں وغیرہ میں اب معیاری تربیت کا بندوبست کیا گیا ہے۔ مقامی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر ان کاموں کا انتخاب کیا جاتا ہے جن کی تربیت ضروری ہوتی ہے۔ اس انتخاب میں یہ بات ملحوظ رہے گی کہ تربیت کے بعد کن کاموں میں اس افرادی قوت کی کھپت ہے۔ وظیفہ کی رقم بڑھا دی گئی ہے تاکہ ان کو بہتر طریقے سے تربیت دی جا سکے۔

مرکز نے ریاست سے کہا ہے کہ تربیتی مراکز پر مال تیار کرنے کا کام بھی شروع کیا جائے۔ اس طرح یہ تربیت و پیداوار کے مراکز ہوں۔ اس سے مال کی تیاری میں اضافہ ہوگا اور اس اسکیم کے تحت سامان بھی فروخت کیا جا سکے گا۔ ●

ہندوستان میں ڈاک کا نظام جدید کاری کی طرف گامزن

ہندوستان میں ڈاک کا نظام ملک میں قدیم ترین عوامی خدمات میں سے ایک ہے۔ یہ ہندوستان کی ایک قدیم ترین پبلک سروس آرگنائزیشن ہے۔ ہندوستان کا کوئی بھی فرد خواہ وہ کسی دور افتادہ جگہ رہا ہو یا کسی بڑے شہر میں، اس سروس سے یکساں طور پر فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ہندوستان میں ڈاک کے نظام کو ۱۴۰ برس ہو چکے ہیں۔ اب یہ بالکل بدلا ہوا ایک جدید نظام ہے اور بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر نئی خدمات پیش کر رہا ہے۔

ڈاک کے نظام کو جدید کاری کی مدد سے زیادہ موثر اور گاہکوں کی توقعات اور آرزوؤں کا مظہر بنایا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے ڈاک سروس بہت اچھی، تیز رفتار اور موثر ہو گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ محکمہ ڈاک کے ملازمین کے کرنے کے ماحول میں بھی بہتری آئی ہے۔ اب وہ جدید، صاف ستھرے اور سازگار ماحول میں کام کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر اس بہتر کارکردگی کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ گاہک اس کی طرف مائل ہوں گے۔

اس محکمہ نے کمپیوٹری نظام کو ڈاک کاؤنٹروں پر لاگو کیا ہے جو ایک جدید نظام ہے۔ پورے ملک میں پوسٹل کاؤنٹروں پر کمپیوٹروں کی مدد سے کام کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ ۱۸۰۰ سے زیادہ کمپیوٹر کام کر رہے ہیں۔ رواں سال میں مزید ایک ہزار کمپیوٹر لگا دیے جانے کی توقع ہے۔ اعداد و شمار اور متن کی ترسیل کے لیے ۲۸ وی ایس۔ اے ٹی (بہت چھوٹے اپرچر ٹرمینل) سینٹروں پر اپنے الیکٹرانک ہائی وے ہیں، جن سے وہ بخوبی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ سال کے خاتمے پر اسی قسم کے مزید ۷۴ مراکز کھل جائیں گے۔ اس نئے نظام کے تحت مختلف سروسیں چالو ہیں مثلاً ملی جلی ڈاک سروس جو سیٹلائٹ کے ذریعے پیغامات بھیجتی ہے اور چھپی کاپیوں کی شکل میں پیغام موصول کرتی ہے، جن کو ڈاکیہ گاہک کے دروازے پر پہنچا دیتا ہے۔ سیٹلائٹ منی آرڈر سروس سیٹلائٹ مواصلاتی نظام کے ذریعے کارپوریٹ گاہکوں کے لیے نیز افراد کے لیے بھی نقد ٹرانسفر میں معاون اور مفید ہے۔

پریمیم اسپیڈ پوسٹ سروس کو مزید مستحکم کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ٹریک اینڈ ٹریس نام کی ایک سہولت فراہم کی گئی ہے جو کمپیوٹر کی مدد سے کام کرتی ہے۔ ابتدا میں یہ سروس دہلی اور بمبئی کے لیے ہے۔ اس سہولت کے ذریعے گاہک کے سوال کا فوری جواب ملتا ہے اور نگرانی کا موثر نظام وجود میں آسکا ہے۔ رواں سال میں یہ سہولت مزید آٹھ مراکز پر دے دی جائے گی۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں اسپیڈ پوسٹ سے ایک کروڑ ۲۵ لاکھ آرٹیکل کی نقل و حمل ہوئی۔

بمبئی میں مکمل طور پر خودکار ڈاک پروسیسنگ مرکز قائم کیا گیا ہے۔ ایسا ہی ایک مرکز مدراس میں جلد کام کرنے لگے گا۔ اس پر میٹرو چینل، راجدھانی چینل، بزنس چینل اور ایسے ہی بہت سے چینلوں سے اہم ڈاک بسرعت آ جا سکتی ہے۔

ملک میں اس وقت ایک لاکھ ۵۲ ہزار پوسٹ آفس ہیں اور ان میں سے ایک لاکھ ۳۴ ہزار ڈاک خانے دیہات میں ہیں۔ محکمہ ڈاک، پنچایت ڈاک سیوا سروس کی تجویز پر غور کر رہا ہے تاکہ گاؤں گاؤں ڈاک کا نظام پھیل سکے۔ اس سے دیہات کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو روزگار مل سکے گا۔ دیہی علاقوں میں حال ہی میں ڈاک کے محکمہ کی طرف سے ڈاک زندگی بیمہ اسکیم شروع کی گئی ہے تاکہ عوام اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ محکمہ ڈاک کی طرف سے عوام کی وسیع تر بہبود کے لیے یہ ایک اہم اقدام ہے۔ اسی طرح سے مہیلا سمردھی یوجنا ہے۔ دیہی ڈاک خانوں کے توسط سے اس اسکیم سے خواتین فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ گزشتہ دو برس میں جب سے یہ کہ شروع ہوا ہے، یہ پروگرام کافی مقبول ہوا ہے۔ چھوٹی بچتوں کے ذریعے سے خواتین کو خودکفیل بنانے اور انھیں اختیارات دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت جو ایک کروڑ کھاتے کھولے گئے ہیں ان میں مجموعی طور پر ۳۱ جولائی ۱۹۹۵ء تک ۱۰۳ کروڑ ۳ لاکھ روپے جمع ہو چکے ہیں۔

فوری مواصلات کے اس دور میں ڈاک کا نظام ہم میں سے بہتوں کی بہترین پسند ہے۔ ●

ڈاک ڈلیوری کے لیے موپیڈ سوار ڈاکیے

دہلی پوسٹل سرکل نے دور دراز علاقوں مثلاً روہنی اور پٹپڑ گنج میں ڈاک پہنچانے کے لیے موپیڈ سوار ڈاکیوں کا اہتمام کیا ہے، پانچ موپیڈ سواروں کے دو بیچ دہلی سرکل کے چیف پوسٹ ماسٹر جنرل شریمتی پدما بالاسبرامنیم نے روہنی میں اور پوسٹ ماسٹر جنرل شری آئی ایم خان نے پٹپڑ گنج میں ڈاک خانوں سے جھنڈی دکھا کر رخصت کیے۔

ڈاکیوں کو اپنی ڈاک موپیڈ پر حفاظت سے لے جانے کے لیے خصوصی کینٹر فراہم کرائے گئے ہیں جو موپیڈ کے دونوں جانب لگے ہیں۔ کینٹر اور ہیلمٹ پر محکمہ ڈاک کے نعرے مختلف رنگوں میں لکھے ہیں۔

میکانکی ڈلیوری نظام کے تحت ڈاکیے تیزی سے لمبی دوری طے کرکے ڈاک پہنچائیں گے۔ دونوں ڈاک گھروں میں ڈاکیوں نے اپنے لیے موپیڈ کی فراہمی پر مسرت کا اظہار کیا۔ ●

ایک کروڑ سے زائد ٹیلی فون کنکشن

ملک میں ایک کروڑ سے زائد ٹیلی فون کنکشن فراہم کرائے جا چکے ہیں۔ یکم جولائی ۱۹۹۵ء تک ملک میں ۱۰۰۳۵۸۵۱ ٹیلی فون کنکشن فراہم کیے جا چکے تھے۔ ملک میں ٹیلی فون کنکشنوں کی تعداد نے ایک سو افراد پر ایک ٹیلی فون فراہم کرنے کا نشانہ پہلے ہی پار کر لیا ہے۔ سائز کے اعتبار سے بھارتی ٹیلی مواصلات کا نیٹ ورک

باقی صفحہ ۴۲ پر

نئی دہلی
یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابد کرہانی
سب ایڈیٹر : ڈاکٹر توحید خان

فون : 677591

تزئین و کتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : جتندر سنگھ

جلد : ۱۵ شمارہ : ۹
دسمبر ۱۹۹۵ء / ۱۰ اگرہائن تا ۱۰ پوش شک ۱۹۱۷

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زر سالانہ : ۵۰ روپے
(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے
دس فی صد رعایت
زر سالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر
کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن انچارج : کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق
خط و کتابت کا پتا :
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴
لیول ۵، آر۔ کے پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"
منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

ڈاکٹر پی. وی. اندریسن

پنچایتی راج حقیقت کیسے بنائیں؟

مصنف کی رائے میں پنچایتی راج ایکٹ میں ایک ایسی دفعہ شامل کی جانی چاہیے جس سے اس قانون کی تعمیل یقینی ہو جائے۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں پنچایت افسروں کا سیاسی دخل اندازی سے تحفظ کیا جانا چاہیے۔ پنچایتی راج کا نچوڑ ہے مکمل کھلا پن جس میں کوئی رازداری نہ برتی جائے۔ مصنف نے پنچایتوں کے لیے جرائم سے پاک طریقہ انتخاب کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے تجویز کیا ہے کہ ووٹر کو تمام امیدواروں کو مسترد کرنے کا حق دینا ایک ایسی بات ہوگی جو تمام سیاسی جماعتوں کو صرف اچھے امیدوار ہی کھڑے کرنے پر مجبور کر دے گی۔

آئین کو قانون کی عمل داری میں سب سے بلند مقام حاصل ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ بلا چوں و چرا اس کی تعمیل کی جائے گی۔ آئین میں ۷۳ ویں ترمیم کا بل ۱۹۹۲ء میں اس منشا سے پاس کیا گیا تھا کہ پنچایتوں کے قائم کیے جانے کو لازمی قرار دے کر عوام کو اقتدار کے قریب تر لایا جائے۔ اس کو کئی سال گزر چکے ہیں لیکن ایسا کچھ نہیں دکھائی دیتا جس سے معلوم ہوتا ہو کہ ریاستی حکومتیں آئین کی اس اہم اور خصوصی ہدایت کو سنجیدگی سے لے رہی ہیں۔

ریاستی حکومتیں پنچایتی راج جیسے قابل تعریف قانون کی مزاحمت کیوں کر رہی ہیں؟ کیا وجوہات ہیں جو قریب قریب سبھی ریاستی حکومتوں کو وہ طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہیں جو انھوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ کیا ان کی مزاحمت کی وجہ یہ ہے کہ آئینی دفعات موزوں انداز میں مرتب نہیں کی گئی ہیں۔

پنچایتی راج ایکٹ کا لب لباب یہ ہے کہ وہ ریاستی حکومتوں کے کچھ اختیارات پنچایتوں کو منتقل کرتا ہے، جس کی وجہ سے یہ جیت اور ہار کا کھیل بن گیا ہے۔ ایک ایسا کھیل جس میں ایک فریق دوسرے فریق کی قیمت پر فائدہ اٹھاتا ہے۔ گو اختیارات کی یہ منتقلی جائز بھی ہے اور مناسب بھی۔ لیکن ریاستی حکومتیں اپنے وہ اختیارات کیوں چھوڑیں جو انھیں اتنے سالوں سے حاصل رہے ہیں۔ جھگڑا اسی بات کا ہے۔

کوئی بھی تبدیلی تبھی بخوشی قبول کی جاتی ہے جب اس سے دونوں ہی فریقوں کو فائدہ پہنچتا ہو۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پنچایتی راج قانون میں کمی نظر آتی ہے۔ اس میں ایسا کچھ شامل نہیں کیا گیا ہے جو اس قانون کی تعمیل کو یقینی امر بناتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ پنچایتی راج قانون میں ایسی اصلاح کی جانی چاہیے جس سے ریاستی سطح کے سیاست دانوں کو (اور بیوروکریٹ کو بھی) کوئی نہ کوئی راست فائدہ پہنچے اور اگر وہ قانون پر عمل نہ کریں تو انھیں سزا بھی دی جا سکے۔ نہ صرف یہ بلکہ کچھ ایسا اہتمام بھی کیا جانا چاہیے جس کی وجہ سے قانون پر عمل درآمد نہ کرنا ناممکن ہو جائے۔ پنچایتیں تبھی پھل پھول سکیں گی۔

پنچایتی راج قانون کو سب کے لیے جیت کا کھیل بنانے اور اس کے اندر اس قانون کی تعمیل کروانے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے آئین میں ترمیم کرنا ہوگی۔ مثال کے طور پر اگر قانون میں یہ شق رکھی جائے کہ صرف پنچایت بورڈوں کے موجودہ ممبران ہی ریاستی مجالس قانون ساز کے چناؤ لڑ سکیں گے۔ یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ پنچایت بورڈوں کے ممبران الیکٹرل کالج کا کام نہیں دیتے بلکہ ایک "پول" کا کام دیتے ہیں جس میں سے امیدوار منتخب کیے جا سکتے ہیں) تو مجالس قانون ساز کے ممبروں کے چناؤ سے پہلے پنچایت بورڈوں کے چناؤ کرانا لازمی ہو جائے گا۔ اس طرح کا قاعدہ بنا دینے سے مجالس قانون ساز کے ممبران پنچایتوں کے جمہوری طریق کار کی حمایت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس سے غیر سنجیدہ امیدوار بھی جو ہمارے سبھی چناؤں میں درد سر رہے ہیں، چناؤ میدان سے دور رکھے جا سکیں گے۔ اس طرح اس اصلاح سے دوہرا فائدہ ہوگا۔

اس قسم کی تجویز کی بلاشبہ کسی نہ کسی بنا پر مزاحمت کی جائے گی کیوں کہ مثال کے طور پر یہ تجویز اس عقیدے کے خلاف ہے کہ چناؤ لڑنے والے امیدواروں کے لیے کوئی "کوالیفکیشن" ضروری نہیں ہونی چاہیے لیکن اصلاحات کرتے وقت مزاحمت کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ عوام عموماً تبدیلی کے خلاف ہوتے ہیں۔ وہ منطقی طور پر درست حلوں کی بھی مزاحمت کرتے ہیں کیوں کہ وہ ان کے عادی نہیں ہوتے۔

پنچایتی راج کی حدود

چوں کہ پنچایتوں کا طاقتور سماج دشمن عناصر

کے زیر اثر آجانا کوئی ناممکن بات نہیں ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان عناصر کے سبب پنچایت راج غیر منصفانہ راج بن سکتا ہے اور ان میں ذات پات، نسل فرقہ کی تفریق اور کرپشن وغیرہ پھیل سکتی ہے اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ پنچایتیں اہل ایڈمنسٹریٹروں کو اپنے یہاں کام کرنے کے لیے راغب نہیں کرسکتیں۔ اس کمی کی وجہ سے ان کی کارکردگی میں نااہلیت آسکتی ہے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا کہ خود پنڈت نہرو بھی پنچایتوں کو اختیارات منتقل کرنے پر آمادہ نہیں تھے اگرچہ پنچایتی راج گاندھی جی کو بہت عزیز تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تین مسئلے ایسے ہیں جن پر پنچایتی راج کے قانون میں مناسب توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ جن افسران کو اس قانون پر عمل درآمد کرانا ہے وہ اسے اپنی بالادستی کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ قانون پنچایتوں کو چلانے کے لیے اہل ایڈمنسٹریٹر مہیا کرنے کی گارنٹی نہیں دیتا اور تیسرے یہ کہ یہ قانون یہ اعتماد بھی پیدا نہیں کرتا کہ سماج دشمن یا رجعت پسندانہ عناصر کو پنچایتوں پر حاوی نہیں ہونے دیا جائے گا۔

پنچایتوں کو طاقتور بنانا

اس کا علاج یہ ہے کہ پنچایتوں کو اتنا طاقتور بنادیا جائے کہ پنچایتیں اپنی حفاظت خود کرسکیں، اہل ایڈمنسٹریٹروں کو اپنے یہاں کام کرنے پر آمادہ کرسکیں اور ریاستی حکومتوں کو اپنی طرف متوجہ کرسکیں۔ اس کے لیے پہلی بات تو یہ ہے کہ پنچایتوں کو ٹیکسوں سے کافی آمدنی ہونی چاہیے لیکن چوں کہ وہ بہت چھوٹی ہوتی ہیں اس لیے کسی منقولہ جائداد پر ٹیکس نہیں لگاسکتیں۔ اگر وہ منقولہ سامان پر ٹیکس لگاتی ہیں تو ٹیکس دہندگان اپنا سامان ایسی جگہوں پر منتقل کردیں گے جہاں ٹیکس کی شرحیں کم ہیں۔ اس لیے پنچایتیں صرف غیر منقولہ جائداد، زمین اور عمارتوں پر ہی ٹیکس لگاسکیں گی۔ قیمتی جائدادیں جن پر بھاری ٹیکس وصول کیا جاسکتا ہے صرف شہروں ہی میں پائی جاتی ہیں گاؤوں میں نہیں۔ لہٰذا ہمیں قیمتی جائدادیں بنانے یا رکھنے والوں کو گاؤوں میں منتقل ہونے کی ترغیب دینا ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ہم پنچایتوں کے مالی اختیارات پر الگ سے غور نہیں کرسکتے، شہری علاقوں کے ساتھ ہی غور کرسکتے ہیں۔ اس لیے آئیے مندرجہ ذیل خطوط پر قانون بنانے کی سوچیں:۔

جائداد ٹیکس ان باتوں کی بنا پر عائد کیا جانا چاہیے:۔

(ا) جائداد کی بازار کی قیمت

(ب) عمارت کی فلور اسپیس ریشو اگر کوئی عمارت اس جائداد پر بنائی گئی ہو اور

(ج) جس علاقے میں عمارت بنائی گئی ہو

(د) اس اسٹریٹ کی سڑک پر جہاں عمارت تعمیر کی گئی ہو، ٹریفک کی سطح۔

اس قسم کے فارمولے سے گاؤوں کی بہ نسبت شہروں میں ٹیکس کی شرح بہت اونچی ہوگی۔ مثال کے طور پر دہلی جیسے شہر میں دو بیڈروم والے ایک فلیٹ کی قیمت دس لاکھ روپے ہوسکتی ہے۔ اگر یہ ایک خاص قسم کی بلڈنگ میں ہو تو اس کی قابل ٹیکس قیمت ۲۰ لاکھ روپے ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر یہ بلڈنگ ایک معروف اور بارونق سڑک پر واقع ہو تو یہ ۴۰ لاکھ تک بڑھ سکتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک قریبی گاؤں میں ایک ایسے ہی فلیٹ کی قیمت صرف چار لاکھ ہوسکتی ہے۔ پراپرٹی (جائداد) ٹیکس کی صرف ایک فی صد کی معمولی شرح سے شہر کے فلیٹ پر ۴۰۰۰۰ روپے فی سال کا ٹیکس حاصل ہوسکے گا جب کہ گاؤں میں اس کا فقط بیسواں حصہ ہی حاصل ہوسکتا ہے یا اور بھی کم۔ اسی لیے ہم ٹیکس کی آمدنی میں کافی نابرابری کی بات کررہے ہیں۔

شہروں میں اکثر کار مالکوں کے پاس کار کھڑی کرنے کے لیے اپنا گیراج نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ سڑکوں پر اپنی کاریں کھڑی کرکے لاکھوں روپے کی جگہ گھیر لیتے ہیں اور اس کے لیے ایک پیسہ بھی ادا نہیں کرتے۔ اس طرح گھیری جانے والی جگہ کی مارکیٹ ویلیو پر دس فی صد سود وصول کیا جائے تو کار مالکوں کو ہر ماہ ہزاروں روپے ادا کرنے پڑیں گے۔ چوں کہ مجوزہ ٹیکس کافی زیادہ ہے اس لیے متوسط گھرانوں کے کار مالکان شہروں کے بجائے گاؤوں میں رہنے لگیں گے اور وہیں اپنی کاریں بھی رکھیں گے۔ (اور اصلیت بھی یہی ہے کہ یہ کار مالکان نقل مکانی نہ کریں تو شہروں میں مستقبل قریب میں بازار میں آنے والی لاکھوں کاروں کے رکھنے کے لیے جگہ نہیں بچے گی) شہروں سے گاؤوں میں اس طرح کی الٹی ہجرت ترقی کی ایک قدرتی ضرورت ہے جس پر ہمارے منصوبہ سازوں نے توجہ نہیں کی ہے۔ اس الٹی ہجرت سے گاؤں امیر ہوجائیں گے۔ مالدار آدمیوں کے گاؤں میں آنے سے زیادہ ٹیکس حاصل ہوگا اور بہتر تعلیم پائے ہوئے لوگ زیادہ دولت پیدا کرسکیں گے۔

اس ہجرت سے یہ اندیشہ بھی دور ہوجائے گا کہ چوں کہ گاؤں پنچایتیں قابل ایڈمنسٹریٹروں کو اپنی طرف راغب نہیں کرسکیں گی اس لیے گاؤں پنچایتوں کو اہلیت کے ساتھ نہیں چلایا جاسکے گا۔ گاؤوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بڑھ جانے پر اصلاح و ترقی کے دشمن جاگیرداروں اور زمینداروں کی طاقت بھی کم ہوجائے گی، جن کا کہ اس وقت گاؤوں میں بول بالا ہے۔

دخل اندازی سے تحفظ

یہ ایک عام تجربہ ہے کہ جتنی چھوٹی تنظیم ہوتی ہے اس کے کام میں اتنی ہی زیادہ دخل اندازی کی جاتی ہے، جس سے انتظامیہ عدم استحکام پیدا ہوتا ہے۔ ان کی حالت دگرگوں ہوجاتی ہے اور ان کی جگہ کوئی اور ادارہ لے لیتا ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ بعض میونسپلٹیاں اور کارپوریشنیں (حتیٰ کہ ریاستی سرکاریں بھی) کتنی جلدی جلدی بدلی گئی ہیں۔ پنچایتوں کے معاملے میں یہ خطرہ بہت حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ پنچایتوں کی انتظامیہ حالت خراب ہوجانے سے ریاستی حکومتوں کو انھیں توڑنے کی ترغیب مل سکتی ہے۔ کوئی اور وجہ نہ ہو تو اس بنا پر ہی انھیں توڑا جاسکتا ہے کہ انھیں سیاسی مخالفین چلارہے ہیں۔ اس لیے پنچایتوں کو مسلسل خطرہ لاحق رہتا ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ قاعدہ بنانا چاہیے کہ جہاں پنچایت چناؤ ہوچکے ہوں اور پنچایتیں جمہوری انداز سے اپنا کام کررہی ہوں وہاں متذکرہ بالا پراپرٹی ٹیکس سے وصول ہونے والی رقم کا ایک بڑا حصہ (یا کہیے آدھا حصہ) ریاستی خزانے میں منتقل کردیا جانا چاہیے۔ جہاں پنچایتوں کے چناؤ نہیں ہوئے ہیں یا جنھیں منسوخ کردیا گیا ہے وہاں کا یہ حصہ مرکزی حکومت کو منتقل کیا جانا چاہیے۔ ظاہر ہے ایسا ہونے پر ریاستی سرکاریں پنچایتی راج کو فائدے کا سودا سمجھیں گی کیوں کہ مقامی جمہوریت سے ان کی آمدنی بھی بڑھے گی۔

اس طرح کی اصلاحات سے تینوں تنظیمی اعتراضات جن کا ذکر پہلے کیا گیا ہے دور ہوجائیں گے۔

میں ایک بار پھر کہوں گا کہ صرف یہ تجاویز ہی ضروری نہیں ہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ گاؤں کو روپے پیسے اور قابلیت دونوں لحاظ سے اتنا طاقتور بنا دیا جائے کہ وہ شہروں کا مقابلہ کر سکیں۔ تبھی ریاستی سرکاریں پنچایتوں کو قیمتی اثاثہ سمجھیں گی جب کہ آج وہ انھیں ایک بوجھ سمجھتی ہیں۔

پنچایتیں اور بیوروکریٹ

جب کہ بہت سے لوگ سیاست دانوں کی دخل اندازی کی شکایت کرتے ہیں، بہت کم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیوروکریسی (یا افسر شاہی) کا رویہ بھی پنچایتی راج کے خلاف ہو سکتا ہے۔ اعلا افران بھی پنچایتوں کو اپنی بالادستی کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ پنچایتوں کی تشکیل اس طرح کی جائے کہ افسران بھی انھیں ایک مثبت موقع سمجھیں۔ مثال کے طور پر ہم ایسا قاعدہ بنا سکتے ہیں جس کے تحت پنچایتوں میں کام کرنے پر آمادہ ہونے والے ہر سرکاری افسر کو پنچایتوں میں ہر ایک سال کے کام کے عوض ریٹائرمنٹ پر ملازمت میں تین ماہ کی توسیع دی جائے۔ ایسا ہونے پر وہ سرکاری افسر ۵۸ سال کی عمر میں ریٹائر نہیں ہوگا بلکہ کئی سال کے بعد ہوگا۔ اس طرح پنچایتوں کو بھی کافی تعداد میں تجربہ کار افسران کی خدمات حاصل ہو سکیں گی۔

جب سیاست دانوں اور بیوروکریٹوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو پنچایتوں میں کرپشن اور جارحیت کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ اگر ایڈمنسٹریشن صحیح معنوں میں پیشہ ورانہ ہاتھوں میں ہوگا تو یہ خطرہ کم رہے گا۔ لہٰذا پنچایت افسران کو ان کے عام فرائض کی انجام دہی کے دوران سیاسی مداخلت سے بچانا ضروری ہے۔ یہ کام دو طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ عوام اور پریس کو تمام پنچایتوں کے ریکارڈ دیکھنے کا حق دیا جائے تاکہ پنچایتوں کی کارکردگی میں کھلا پن آ سکے۔ درحقیقت کھلا پن اور رازداری کا بالکل نہ ہونا ہی پنچایتی راج کا نچوڑ ہے۔ دوسرے یہ کہ افسران کو ان کی ہر کارروائی کے لیے انفرادی طور پر ذمہ دار قرار دیا جائے۔ جب ذمہ داری مقرر کر دی جائے گی اور کارکردگی میں کھلا پن آ جائے گا تو افسران میں غیر قانونی احکامات کی تعمیل نہ کرنے کی جرأت پیدا ہو گی اسی طرح جیسے چناؤ افسران آج کل کرتے ہیں۔ ایسا ہونے پر پنچایتوں کے ایسے موڑ پر آنے کا امکان کم ہو جائے گا جہاں انھیں منسوخ کرنا ضروری سمجھا جائے۔

پنچایت چناؤ

سبھی جانتے ہیں کہ ہمارے انتخابات کے دوران کافی جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ پنچایتوں کے انتخابات میں تو کوئی ”سیشن“ بھی نہ ہوگا جس سے شکایت کی جا سکے اس لیے ہمیں ایسے انتخابی نظام کی ضرورت ہے جو جرائم سے پاک ہو اور جو گاؤوں کو انتہا پسندوں اور سماج دشمن عناصر کے ہتھکنڈوں سے بچا سکے۔ اس کے لیے بھی مضبوط تحفظی انتظام کی ضرورت ہے۔ یہ امید کرنا کہ سیاست داں مناسب طرز عمل اختیار کریں گے یا ضبط سے کام لیں گے فضول ہے۔

موجودہ طریقہ جس میں لکیر سے آگے نکل جانے والے پہلے شخص کو فاتح قرار دیا جاتا ہے۔ انتہا پسندی اور نفرت کے پھیلاؤ کا امکان پیدا کرتا ہے۔ اس طریقے کے مطابق ایک امیدوار کے لیے ۵۱ ووٹ حاصل کرنا کافی ہے چاہے ۴۹ دوسرے کھلے جائیں۔ اس لیے اگر امیدواروں کو اقلیتوں کی ایک بڑی تعداد کے خلاف نفرت پھیلانے سے اکثریت حاصل ہو سکے تو وہ اس کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں۔

چناؤ کے موجودہ طریقے میں ایک اور نقص بھی ہے۔ یہ طریقہ امیدواروں کے متعلق نامکمل اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ یہ صرف ایک امیدوار ہی کے بارے میں اطلاعات فراہم کرتا ہے اور دوسرے امیدواروں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ یہ نقص یہ قاعدہ بنا کر دور کیا جا سکتا ہے کہ ہر ووٹر ہر امیدوار کے لیے ووٹ دے، جو امیدوار اسے قبول ہو اس کے لیے مثبت ووٹ ڈالے اور جو قبول نہ ہوں ان کے لیے منفی ووٹ دے مگر کسی طرح اپنا ووٹ خالی نہ چھوڑے۔ صرف اسی طرح وہ اپنی رائے کا مکمل اظہار کر سکتا ہے کسی اور طرح سے نہیں۔ اس طرح اس بارے میں پوری اطلاع مل سکتی ہے کہ وہ امیدواروں کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ اس طریقے میں زیادہ اہم بات یہ ہوگی کہ جو امیدوار سماج کو تقسیم کرنے یا نفرت پھیلانے کی کوشش کریں گے انھیں پھوٹ ڈالنے والی حرکتوں کی وجہ سے منفی ووٹ ملے گا۔ اگر یہ اصلاح عمل میں لائی جائے تو امیدواروں پر مثبت طرز عمل اختیار کرنے کے لیے دباؤ پڑے گا۔

موجودہ طریقے میں اگر تمام امیدوار کرپٹ ہیں تو بھی ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور جیتے گا۔ اس کے برعکس مجوزہ طریقے میں تمام امیدواروں کو مسترد کرنا بھی ممکن ہوگا۔ موجودہ طریقے میں ووٹر کو تمام امیدواروں کو مسترد کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ اگر یہ اختیار ووٹر کو مل جائے تو سیاسی جماعتیں صرف اچھے امیدوار ہی کھڑے کرنے پر مجبور ہو جائیں گی، پھر ان میں سے کوئی بھی جیتے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

موجودہ طریقے میں ہارنے والے امیدوار کے حق میں ڈالا گیا ووٹ ضائع ہو جاتا ہے۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس کے مقابلے میں مجوزہ طریقے میں ہر ووٹر کو اہمیت حاصل ہو جائے گی اس لیے امیدوار ووٹ بینکوں کے بجائے اتفاق رائے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے زیادہ سلجھے ہوئے لوگ سامنے آئیں گے، انتہا پسند نہیں، وہ ایسے لوگ ہوں گے جو امن اور ہم آہنگی چاہیں گے جھگڑا فساد نہیں۔ چناؤوں کے لیے، خاص کر پنچایتوں کے انتخابات کے لیے ایسا قاعدہ بنانا ضروری ہے۔ زیادہ سلجھے ہوئے لوگوں کے آنے سے پنچایتوں کے لیے عدم استحکام کا خطرہ جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے بہت کم ہو جائے گا۔

عورتوں کو اختیار دینے کا عمل

پنچایتی راج قانون میں عورتوں کو اختیار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مقصد چناؤ کے موجودہ طریقے میں یہ اصلاح کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے کہ چناؤ ہر سال کرائے جائیں، پنچایت بورڈوں کے ممبروں کی تہائی تعداد ہر سال ریٹائر ہوتی جائے۔ ایک سال میں صرف مردوں کو اور دوسرے سال میں صرف عورتوں کو، تیسرے سال میں پھر صرف مردوں کو اور چوتھے سال میں پھر صرف عورتوں کو چناؤ لڑنے کی اجازت ہو اور یہ سلسلہ باری باری سے چلتا جائے۔ اس طرح سے عورتوں کو متبادل سالوں میں دو تہائی اکثریت حاصل ہوگی

اور وہ اپنی بات منوا سکیں گی جب کہ وہ موجودہ ریزرویشن پالیسی کے تحت ایسا نہیں کر سکتیں۔

یہ قاعدہ بھی بنانا چاہیے کہ جس سال کوئی امیدوار ریٹائر ہو اس سال صرف جنس مخالف کی امیدوار ہی کو چناؤ لڑنے کی اجازت ہو۔ اس طرح سے کوئی بھی فوراً بعد دوبارہ چناؤ نہیں لڑ سکے گا۔ سبھی امیدواروں کو ایک سال تک انتظار کرنا ہوگا۔ اس سے سیاستداں زیادہ سمجھ دار بنیں گے اور منتخب ہونے کے لیے سیاسی اتھارٹی کا غلط استعمال نہیں کریں گے۔

ہر سال چناؤ کرانا ایک اور لحاظ سے ایک مثبت قدم ہے۔ ہمارے ملک میں ایک عام بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ شروع میں کسی پارٹی کو خواہ کتنی ہی زیادہ اکثریت حاصل ہو رفتہ رفتہ یا ایک سال کے اندر اس کے لیے عوام کی حمایت تیزی سے کم ہو جاتی ہے۔ اس سے بھی عدم استحکام پیدا ہوتا ہے۔ جب الیکشن ہر سال ہوا کرے گا تو عوام اپنی مرضی کے مطابق پنچایتیں دوبارہ منتخب کر سکیں گے۔

لب لباب

پنچایتی راج ایکٹ کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ دو باتوں کے ضمن میں اس کا مسودہ درست انداز میں تیار نہیں کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں کسی ایسے ڈھانچہ جاتی بندوبست کی رنحہ نہیں ہے جس کے تحت ریاستی سرکار کو اس قانون کی سوفی صد تعمیل پر مجبور کیا جا سکے۔ اس کے برعکس اصلیت یہ ہے کہ پرجوش انداز سے قانون پر عمل درآمد کے معاملے میں ریاستی سرکاروں کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ چوں کہ گاؤں اپنے موجودہ حالات میں قابل انتظامیہ عملے کو اپنی طرف راغب نہیں کر سکتے اس لیے اس معاملے میں انھیں سرکار کی خیرات پر گزارہ کرنا پڑتا ہے اس سے وہ ہمیشہ اس کے تابع رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں پنچایتی راج کے متعلق یہ اندیشہ بھی ہے کہ اس پر تشدد پسند و انتہا پسند اور ظلمت پسند عناصر حاوی ہو جائیں گے۔ ان اندیشوں نے پنڈت نہرو تک کا ہاتھ روک لیا۔ ان مسئلوں کے حل کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی گئی ہیں:-

۱۔ صرف پنچایت بورڈوں کے ممبر ہی ریاستی مجالس قانون ساز کے چناؤ لڑنے کے اہل قرار دیے جائیں۔

۲۔ پراپرٹی ٹیکس کی شرحیں زیادہ آبادی اور بھیڑ بھاڑ والے شہروں میں کافی زیادہ اور گاؤوں میں معمولی ہوں۔

۳۔ پراپرٹی ٹیکس سے وصول ہونے والی رقوم کا ایک حصہ (یا کہیے نصف حصہ) ریاستی سرکاروں کو دیا جائے لیکن تب جب مقامی ادارے جمہوری طریقے سے کام کر رہے ہوں اور ان کے چناؤ کروائے جا چکے ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوا ہو تو یہ حصہ مرکزی سرکار کو منتقل کیا جائے۔

۴۔ جو سرکاری افسر ڈیپوٹیشن پر پنچایتوں میں کام کرنے کو تیار ہوں انھیں ریٹائر ہونے کی عمر میں پنچایتوں میں ایک سال کی خدمت کے عوض ۳ ماہ کی توسیع دی جائے۔

۵۔ ووٹر سبھی امیدواروں کے لیے ووٹ دیں، قابل قبول امیدوار کو مثبت ووٹ دیں اور ناقابل قبول امیدواروں کو منفی۔

۶۔ راجیہ سبھا کی طرح پنچایت بورڈ بھی ناقابل تحلیل ادارے ہوں اور ان کے ایک تہائی ممبر ہر سال ریٹائر ہوا کریں۔

۷۔ عورتیں اور مرد باری باری سے ایک سال کے چھوڑ کر چناؤ لڑیں۔ یعنی ایک سال میں صرف عورتیں ہی چناؤ میں کھڑی ہوں اور دوسرے سال میں صرف مرد، تیسرے سال میں پھر صرف عورتیں اور چوتھے سال میں پھر صرف مرد۔

یہ تجاویز مجموعی طور پر متوازن ہیں۔ انھیں عمل میں لانے سے ریاستی سرکاریں پنچایتی راج کا مکمل احترام کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ اگر انھیں تسلیم کر لیا جائے تو یہ گاؤوں کو امیر بنا دیں گی اور دیہات سے شہری علاقوں میں ہجرت کا رخ پلٹ جائے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان اصلاحات کے نتیجے میں صرف وہی امیدوار چنے جائیں گے جو امن و ہم آہنگی میں یقین رکھتے ہیں۔ پھوٹ ڈالنے والے امیدوار مسترد کر دیے جائیں گے۔

ان تجاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ کن مسئلوں کو حل کرنے کی ضرورت ہے اور انھیں کیسے حل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ انھیں حل کرنے کے اور طریقے بھی ہو سکتے ہیں لیکن کوئی بھی اصلاح کرتے وقت ان باتوں کا دھیان رکھنا ہوگا کہ

۱۔ نظام میں کوئی ایسا بندوبست کیا جائے کہ ریاستی سرکاریں قواعد کی تعمیل کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

۲۔ ایسا بندوبست کیا جائے جو پنچایتوں اور ریاستی حکومتوں دونوں کے لیے فائدہ مند ہو۔

۳۔ پنچایتیں سماج دشمن عناصر کے تابع سے محفوظ رہ سکیں۔

۴۔ پنچایتوں کو روپے پیسے اور انسانی سرمائے دونوں کے لحاظ سے طاقتور بنایا جائے۔

یہ سب تبھی ہو سکتا ہے جب ہم پہلے یہ تسلیم کریں کہ صورت حال تسلی بخش نہیں ہے اور پھر اصلاحی اقدامات کرنے کو تیار ہوں۔ ●

بقیہ: زراعت سے وابستہ خواتین کے لیے نئی ٹکنالوجی

آبپاری۔

(۶) محافظت آب۔

(۷) زرعی جنگلاتیات۔

(۸) مالدار جاگیرداروں اور دلالوں کے استحصال کا مقابلہ۔

(۹) مارکیٹنگ کے لیے کوآپریٹو سوسائیٹی۔

(۱۰) سماجی اقتصادی حالات میں سدھار۔

اگر سائنس اور ٹکنالوجی کے عامل کو ایک بار بھی دور افتادہ گاؤوں اور قبائل تک پہنچا دیا جاتا ہے تو پھر واپسی کا سوال نہیں ہوتا۔ ان کی زندگی کا سارا ڈھانچہ بدل جاتا ہے اور یہ عمل انقلاب کی طرح پھیل جاتا ہے۔ مفلس و نادار لوگ انتظار میں ہیں کہ کوئی انھیں غریبی اور مشکلات سے نکلنے کا راستہ دکھا دے۔ ان لوگوں سے ملنے اور ان کے مسائل پر غور کرنے کے لیے تعلیم یافتہ سماجی کارکن اور سائنس داں حاصل کر لینا خود ایک کامیابی ہے۔ نئے طریقوں کو آزمانے کے لیے عورتوں میں جبلی قوت اور جرأت موجود ہے۔ ●

بقیہ: پنچایتی راج کا مستقبل

اور یہ سلسلہ شروع بھی ہو چکا ہے۔ اگر ریاستی حکومتوں کا منفی انداز نظر یوں ہی جاری رہا تو پنچایتی راج اداروں کو ریاستی حکومتوں کے سخت اور غیر ہمدردانہ رویے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ ●

فیسر ایس۔ این مشرا اور سوبیتا مشرا

آئین کی ۷۳ ویں ترمیم اور

پنچایتی راج کا مستقبل

مصنفین کا خیال ہے کہ اگرچہ آئین میں ۷۳ ویں ترمیم کے قانون سے پنچایتی راج کے نظریے کو ایک نئی وسعت حاصل ہو گئی ہے تاہم صرف قانونی اور انتظامیہ اقدامات ہی سے ہمارے کثیر العقائد معاشرہ کو جمہوری نہیں بنایا جا سکتا۔ غیر سرکاری تنظیموں، علمی اداروں اور سیاسی جماعتوں وغیرہ کو اس بات کی پرزور حمایت کرنی چاہیے کہ اختیارات ان کو بحال کیے جانے چاہئیں جن کا ان پر حق ہے۔ اقتدار کے دلالوں اور مخفی مفادات کو دور رکھنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مصنفین کا خیال ہے کہ سب سے نچلی سطح پر جمہوریت کی اکائیوں کی حیثیت سے پنچایتی راج اداروں کے قیام سے ایک ایسا سیاسی، سماجی اور اقتصادی انقلاب آئے گا جس سے ہمارا جمہوری ڈھانچہ مزید مستحکم ہو گا۔ لیکن اس ضمن میں ریاستی حکومتوں کی سیاسی رضا اور عزم سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

ہندوستان میں پنچایتی راج ادارے سب سے نچلی سطح تک اختیارات کی منتقلی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ آبادی کے دباؤ کے سبب اور ترقی کے لیے کم یاب وسائل کے بہترین استعمال کی ضرورت کے پیش نظر ان اداروں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ وہ عوام کے اختیارات عوام تک پہنچانے کے لیے ایک گاڑی کا کام دیتے ہیں۔

پنچایتی اداروں کی کامیابی بڑی حد تک مناسب فرمان، خود اختیاری اور مالی خود مختاری پر منحصر ہے۔ ان عناصر کی کمی کی وجہ سے پنچایتی راج ادارے اپنے قیام کے وقت سے ہی مقامی سطح پر ایک مضبوط ڈھانچہ بننے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ سوال آئین میں ۷۳ ویں ترمیم کا قانون ۱۹۹۲ء پاس ہونے کے بعد بھی برقرار ہے۔ اکیسویں صدی کے شروع ہونے تک ہندوستان پنچایتی راج اداروں کے کیا امکانات ہیں؟

پنچایتی راج کا نظریہ

اپنے اس تجزیے میں ہم پہلے اس سوال پر بحث کریں گے کہ پنچایتی راج کا ہمارے آئین کے بانیوں کے ذہن میں کیا تصور تھا۔ اس کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ آئین میں ۷۳ ویں ترمیم کا قانون اس نظریے کے بارے میں کس حد تک اتفاق رائے پیدا کرتا ہے۔

پنچایتی راج کے حامی اور مخالف شروع سے اس نظریے کی مختلف تشریحیں کرتے رہے ہیں۔ ایک طرف تو زیادہ سے زیادہ مقامی خود مختاری اور حکام بالا کی کم سے کم نگرانی اور کنٹرول پر زور دیا گیا اور دوسری طرف کچھ لوگوں نے اسے ملک کی تباہی کا ذریعہ سمجھا۔ ایک اور اختلاف رائے پنچایتی راج اداروں میں سیاسی جماعتوں کے کردار پر تھا۔ اس پس منظر میں آئین میں ۷۳ ویں ترمیم کا قانون پنچایتی راج کے نظریے کو ایک نئی وسعت دیتا ہے۔

گاندھی جی کا نظریہ

قومی منظر پر مہاتما گاندھی کے نمودار ہونے پر دیہی اداروں کو اور زیادہ خود مختاری دینے کی دلیل کو تقویت حاصل ہوئی۔ انھوں نے قومی ترقی کے لیے قدیم ہندوستان کے پنچایت سسٹم کی طرز پر خود مختار دیہی ادارے بنانے کا نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے گاؤں پنچایتوں کا ایک پانچ سطحی نظام تجویز کیا۔ تعلقہ پنچایتیں، ضلع پنچایتیں، صوبائی پنچایتیں اور کل ہند پنچایتیں۔ ان کے تصور کے مطابق اونچی سطح کی پنچایتوں کو گاؤں پنچایتوں کو ٹھوس مشورے، ماہرانہ رہنمائی اور معلومات فراہم کرتے ہوئے ان کی سرگرمیوں میں تال میل پیدا کرنا اور ان کی نگرانی کرنا تھا تاکہ ان کا بندوبست اور عوامی خدمات بہتر بنائی جا سکیں۔ مگر مرکز کو ہدایت بنیادی یونٹ ہی دیتے نہ کہ یہ کہ مرکز کی طرف سے

ی یونٹوں کو ہدایات دی جائیں۔ اس سے پورا
سلہ الٹ جاتا اور گاؤں ایڈمنسٹریشن کے
اور متحرک یونٹ ہو جاتے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کا خیال

لیکن ڈاکٹر امبیڈکر نے جن کا ہندوستانی
ن کا مسودہ تیار کرنے میں سب سے زیادہ
تھا، آئین میں پنچایتوں کو کوئی جگہ نہیں
۔ انھوں نے صاف اور غیر مبہم الفاظ میں
ں پنچایتوں کی مذمت کرتے ہوئے انھیں
امیت کا ایک کنواں اور جہالت، تنگ
ی اور فرقہ پرستی کا غار" قرار دیا۔ انھوں نے
ال ظاہر کیا کہ گاؤں ری پبلکن ملک کے
تباہی لاتے ہیں اور ملک کے معاملات
اس کا مقدر بنانے میں کوئی پارٹ ادا
کرتے۔

کا راستہ

اس کے بعد گاندھی جی کے گاؤں پنچایتوں
نظریے اور ڈاکٹر امبیڈکر کے ذریعے پنچایتوں کی
ت کے بیچ کا راستہ اختیار کیا گیا۔ مقامی خود مختاری
ہ صرف رسمی طور پر قبول کیا گیا اس کے ساتھ ہی
ی کا توازن سیلف گورنمنٹ کے مقامی اداروں کے
ں کرنے کی پرزور مخالفت کی جا رہی تھی۔ اس کا
یہ ہوا کہ گاؤں پنچایتوں کی ہندوستانی آئین کے
ہدایتی اصولوں (آرٹیکل ۴۰) ہی میں شامل
ا۔

۔پی۔ کا نظریہ

پنچایتی راج کے بارے میں جے پرکاش
ن کا ایک مختلف نظریہ تھا۔ انھوں نے یہ رائے
ی کہ پنچایتی راج کی کامیابی کا دارومدار اس بات
ہے کہ سیاسی جماعتیں پنچایتوں میں دخل دینے سے
حد تک باز رہتی ہیں اور کہاں تک وہ انھیں
ہاتھوں کا کھلونا اور اقتدار کے زینے پر چڑھنے
لیہ نہیں بناتیں۔ "گروہی جھگڑوں کے ذریعے
نتار۔ حکومت آپ اپنی حکومت نہ ہو کر اپنی
ہو گی۔" پنڈت نہرو نے بھی پنچایتوں کے متفقہ
بات کے لیے ترغیب دینے کی تجویز رکھی۔ ان کے
مطابق پنچایتیں دو قسم کی ہونی چاہئیں۔ متفقہ طور پر چنی
گئی پنچایتوں کو زیادہ اختیارات دیے جانے چاہئیں
اور محض اکثریتی ووٹ سے چنی گئی پنچایتوں کو کم۔

ایک نئی جہت

تاہم پارلیمانی جمہوریت کے حامی پنچایتی
راج کو پارلیمانی سرکار اور سیاسی جماعتوں کے مابین
ایک باہمی رشتہ قرار دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ
منظم سیاسی جماعتوں اور انتخابات پر مبنی پارلیمانی
جمہوریت ہی موثر پارلیمانی سرکار قائم کرنے کا واحد
اور یقینی ذریعہ ہے۔ تاہم اتفاق رائے کا اصول ایک
طرح کی مطلق عنانی کی طرف لے جا سکتا ہے۔ اب آئین
میں ۷۳ ویں ترمیم کے قانون نے براہ راست انتخابات
اور سیاسی جماعتوں کے لیے چناؤ لڑنے اور ایک
موثر رول ادا کرنے اور پنچایتی راج کو ایک آئینی
حیثیت دینے والی دفعات شامل کر کے پنچایتی
راج کے نظریے کو ایک نئی جہت بخشی ہے۔

موجودہ تناظر

موجودہ عہد میں پنچایتی راج کو گاؤوں تک
جمہوریت کی توسیع کے طور پر قبول کر لیا گیا ہے اور
سیاست داں اس کی حمایت کر رہے ہیں۔ اکثر کہا
جاتا ہے کہ عوام کا صرف مرکزی اور ریاستی مجالس قانون ساز
کے لیے اپنے نمائندے چننا ہی کافی نہیں ہے۔ دوسرے
الفاظ میں عوام کی شرکت بھی ضروری ہے اور اس کے
لیے قانونی اور ڈھانچہ جاتی اقدامات کی ضرورت ہے۔
۷۳ ویں آئینی ترمیمی بل لوک سبھا نے ۲۲ دسمبر
۱۹۹۲ء کو قریب قریب متفقہ طور پر پاس کیا تھا
راجیہ سبھا نے اسے ۲۳ دسمبر ۱۹۹۲ء کو پاس کیا۔
۱۷ ریاستی اسمبلیوں کی توثیق کے بعد یہ ۷۳ ویں آئینی
ترمیمی قانون کی شکل اختیار کی اور اس کا نفاذ ۲۴ اپریل
۱۹۹۳ء کو عمل میں آیا۔ یہ ترمیمی قانون پنچایتی راج
اداروں کے بارے میں مقرر کی گئی کئی سابقہ کمیشنوں اور
ذیلی کمیٹیوں کی مختلف تجاویز پر مبنی ہے اور پنچایتی
راج اداروں کو ایک مستقل حیثیت دیتا ہے۔

اہم خصوصیات

اس قانون کی اہم خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱۔ ہر گاؤں میں ایک گرام سبھا ہوگی جسے گاؤں
کی سطح پر وہی اختیارات و فرائض حاصل
ہوں گے جو کسی ریاست کے لیجس لیچر کو حاصل
ہوتے ہیں۔

۲۔ ہر ریاست میں گاؤں اور ضلع کی سطح پر اور
ان کے بیچ کی سطح پر پنچایتیں بنائی جائیں گی
اور اسی طرح پنچایتی راج کے ڈھانچے میں
یکسانیت لائی جائے گی۔ لیکن جس ریاست کی
آبادی ۲۰ لاکھ سے زیادہ نہ ہو اسے درمیانی
سطح کی پنچایتیں قائم نہ کرنے کی آزادی ہوگی۔

۳۔ سبھی سطحوں کی پنچایتوں کے ممبروں کے چناؤ
براہ راست ہوں گے۔ درمیانی اور ضلع کی
سطح کی پنچایتوں کے چیئرمین کے عہدے
کا چناؤ بالواسطہ ہوگا۔ گاؤں کی سطح کی
پنچایتوں کا چناؤ کس طرح کا ہو اس کا فیصلہ
ریاستی سرکاروں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

۴۔ ہر سطح کی پنچایت میں درج فہرست ذاتوں
اور درج فہرست قبیلوں کے لیے ان کی
آبادی کی نسبت سے نشستیں ریزرو رکھی
جائیں گی۔ کل نشستوں کی ایک تہائی تعداد
عورتوں کے لیے مخصوص رکھی جائے گی اور
یہ نشستیں کسی پنچایت کے مختلف انتخابی
حلقوں کو باری باری سے الاٹ کی جائے گی۔
چیئرمین کے عہدے کے لیے بھی اسی طرح
کے ریزرویشن کا انتظام کیا گیا ہے۔

۵۔ پنچایتی راج اداروں کی مدت کار ۵ سال ہوگی
اور اگر کوئی پنچایت اس سے پہلے منسوخ یا
تحلیل کی جائے گی تو ایسا کرنے کی تاریخ سے
چھ ماہ کے اندر اندر ان کی دوبارہ تشکیل کے
لیے چناؤ کرائے جائیں گے۔

۶۔ پنچایتوں کو موزوں مقامی ٹیکس عائد اور
اکٹھا کرنے کا اختیار دینے کا اختیار ریاستی
لیجس لیچروں کو دیا گیا ہے۔ پنچایتوں کو
ریاست کے CONSOLIDATED FUND
سے امدادی گرانٹیں دینے کا اختیار بھی ریاستی
لیجس لیچروں کو دیا گیا ہے۔

۷۔ پنچایتوں کی مالی صورت حال کا جائزہ لینے
اور ریاست اور مقامی اداروں کے درمیان
فنڈس کی تقسیم کے بارے میں مناسب
سفارشیں پیش کرنے کے لیے ہر ۵ سال

بعد ایک مالی کمیشن کی تشکیل کی جائے گی۔

۸۔ تسلسل بنائے رکھنے کے لیے ترمیمی قانون میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ اس قانون کے نفاذ سے فوراً پیشتر جو پنچایتیں کام کر رہی تھیں وہ اپنی مدت پوری کرنے تک کام کرتی رہیں گی بشرطیکہ ریاستی لیجس لیچر ایک قرارداد پاس کر کے انھیں تحلیل نہ کر دے۔

۹۔ ریاستی لیجس لیچر اپنے پنچایت قوانین میں ضروری ترمیمات اس ترمیمی قانون کی تاریخ نفاذ سے ایک سال کے اندر اندر پاس کریں گی تاکہ ریاستی پنچایت قوانین کو آئین کی دفعات کے مطابق بنایا جا سکے۔

عمل درآمد

۷۳ ویں آئینی ترمیم کے قانون ۱۹۹۲ء نے اس وقت تک ملک میں اہم اور کارگر پنچایتی راج اداروں کے قیام کے لیے صرف رہنما خطوط ہی فراہم کیے ہیں۔ وہ پنچایتی راج اداروں کو ایک آئینی حیثیت دیتا ہے اور ان کے لیے ایک یکساں اور مستقل تین سطحی نظام تجویز کرتا ہے۔ پنچایتی راج اداروں کی مدت کے ختم ہونے پر ہر ۵ سال بعد چناؤ کرانا لازمی قرار دے کر ان کے چناؤں میں باقاعدگی لاتا ہے اور ریاستی چناؤ کمیشن کو یہ چناؤ اپنی نگرانی میں کروانے کی ہدایت دیتا ہے، ریاستی مالی کمیشن کی تشکیل اور پنچایتی راج اداروں کو زیادہ مالی خودمختاری کا اہتمام کرتا ہے۔ لیکن سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ اس قانون پر ریاستی سرکاروں کا ردعمل کیا ہے اور کس رفتار سے اس پر عمل درآمد کر رہی ہیں۔

بخوبی کہا جا سکتا ہے کہ پنچایتی راج اداروں کو مستحکم بنانے کے لیے ریاستوں میں نئے قانون بنانے کا عمل ۲۳ اپریل ۱۹۹۴ء کو پورا ہو جانے کے بعد ہندوستان سب سے نیچے کی سطح میں سیاسی اقتدار کی تاریخی منتقلی کی دہلیز پر کھڑا ہے۔

ضروری قانون سازی کا کام تمام ریاستوں میں مکمل کیا جا چکا ہے مگر عمل درآمد کا کام مختلف ریاستوں میں مختلف مراحل میں ہے۔ مغربی بنگال، مدھیہ پردیش، ہریانہ، پنجاب اور راجستھان جیسی ریاستوں میں سبھی سطحوں کی پنچایتوں کے لیے انتخابات مکمل کیے جا چکے ہیں لیکن بہار، یوپی، تمل ناڈو اور کیرالہ جیسی کچھ ریاستوں میں پنچایت انتخابات ملتوی کر دیے گئے ہیں۔ کچھ جگہوں کو چھوڑ کر باقی مقامات پر مقامی اداروں پر بیوروکریسی کی بالادستی ہنوز جاری ہے اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ مقامی حکومت خود اختیاری کے اصول نے ابھی تک دیہی عوام کے دلوں میں گھر نہیں کیا ہے یہ اس بات سے ظاہر ہے کہ پنچایتی راج اداروں کے چناؤ وقت پر نہ کرائے جانے پر وہ کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرتے۔

ہندوستان جیسے جمہوری ملک کے لیے افسوس کی بات ہے کہ ۷۳ ویں آئینی ترمیم کے قانون کے پیچھے پنچایتوں کو حکومت خود اختیاری کے ادارے بنانے کا جو بنیادی آدرش رہا ہے اسے ریاستوں کے حال ہی میں پاس کیے ہوئے قوانین میں بڑی حد تک نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مجالس قانون ساز کے ممبران پارٹی لائنوں سے اوپر اٹھ کر اور عوام کو اقتدار منتقل کرنے اور موجودہ سسٹم کی خامیوں کو پر کرنے کے لیے خلوص دل سے کام کریں۔ ہمارے آئین اور ہمارے سیاسی ڈھانچے کی جمہوری نوعیت کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مرکز، ریاستیں اور مقامی ادارے باقاعدگی اور صلاحیت سے کام کریں۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ہمارا آئین اپنے مشمولات اور عمل درآمد کے اعتبار سے کافی مسخ ہو جائے گا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں پنچایتی راج ادارے ابھی جڑ نہیں پکڑ سکے ہیں۔ لیکن وہ باقاعدگی سے چناؤ نہ کرائے جانے کے باوجود زندہ ہیں۔ یہ بات ان کی اندرونی طاقت کو ظاہر کرتی ہے۔ ضرورت صرف انھیں مضبوط بنانے کے عزم کی ہے۔

عوام کی شرکت

پنچایتی راج ادارے جمہوریت کے بنیادی ادارے ہیں جن کی سرگرمیوں میں گاؤں، بلاک اور ضلع کے لوگ براہ راست حصہ لے سکتے ہیں۔ ان کے سوا کوئی ادارہ جس میں عوام کی براہ راست شرکت ممکن ہو۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے مقامی لوگ ترقی کے خاص دھارے اور عوامی معاملوں میں حصہ لیتے ہیں۔ پنچایتی راج ادارے "براہ راست جمہوریت" کے نظریے کو عملی جامہ پہنانے کا ذریعہ ہیں۔ گرام سبھائیں اس خیال سے بنائی گئی ہیں کہ ان میں ترقیاتی مسئلوں پر بحث کی جائے، ترقیاتی پروگرام شروع کیے جائیں اور یہ طے کیا جائے کہ ترقیاتی اسکیموں کا فائدہ کن لوگوں کو پہنچنا چاہیے۔

سماجی و اقتصادی ترقی

ملک میں اقتصادی نرم روی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس سے پنچایتی راج کے امکانات بہتر ہوں گے اور یہ ادارے جواہر روزگار یوجنا، مربوط دیہی ترقی کے پروگرام (آئی آر ڈی پی) خود روزگار کے لیے دیہی نوجوانوں کی تربیت کے پروگرام (ٹرائسیم) اور علاقائی ترقی کے پروگراموں ڈی پی اے پی اور ڈی ڈی پی وغیرہ پر مناسب عمل درآمد کی نگرانی کرنے والے ادارے بن جائیں گے۔ اس طرح وہ دیہی علاقوں میں سماجی و اقتصادی ترقی کی رفتار تیز کرنے میں ایک اہم رول ادا کریں گے۔

پنچایتی راج اداروں کے لیے مزید اختیارات

۷۳ ویں آئینی ترمیمی قانون کے تحت پنچایتی راج اداروں کو آئندہ سالوں میں مزید اختیارات اور مالی وسائل حاصل ہوں گے۔ اس قانون کے پس منظر میں آٹھویں منصوبے میں دیہی ترقی کے لیے رقوم کی تخصیص بڑھا کر ۳۰ ہزار کروڑ روپے کر دیے جانے کی اہمیت فزوں تر ہو جاتی ہے۔ آئین کے تحت قائم شدہ کسی اور جمہوری ادارے کی مانند پنچایتوں کا مستقل وجود ایک یقینی امر بن گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ پنچایتوں کو دیہی ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کی اقتصادی ترقی کے پروگراموں پر عمل آوری کے لیے کافی انتظامیہ اور مالی اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔

یہ بات بھی کافی حوصلہ افزا ہے کہ ریاستوں کو ۱۹۹۴-۹۵ء سے اپنے کل منصوبہ جاتی مصارف کا ۴۶ فی صد حصہ ریاست سے نیچے کی سطح کے منصوبہ بندی کرنے والے اداروں کو منتقل کرنا ہوگا۔ اس ۴۶ فی صد میں سے ۳۰ فی صد دیہات میں پانی کی سپلائی، سڑکوں، بجلی، تعلیم اور دیگر مقامی اسکیموں کے لیے یک مشت گرانٹوں کی شکل میں دیا جائے گا۔ ۷۳ ویں آئینی ترمیمی قانون

کے گیارہ شیڈول میں مندرج شعبوں کی فہرست بڑھا دی گئی ہے۔ پنچایتی راج اداروں کو مقامی وسائل اور مسائل کے مطابق مزید اسکیموں کا انتخاب کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ ریاست کے منصوبہ جاتی مصارف کا ۵ فی صد ایک "یونائیٹڈ فنڈ" کی صورت میں کہ ضلع یا گاؤں کے اداروں کو مہیا کیا جائے گا جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں گے۔ باقی ایک فی صد غریبی دور کرنے اور روزگار پیدا کرنے والے پروگراموں کے لیے ہوگا، جن کی منصوبہ بندی اور مالیات کی فراہمی گاؤں کی سطح پر ہی کی جائے گی۔ ان سب پروگراموں پر موزوں عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے پنچایتی راج اداروں کی کڑی نگرانی ضروری ہوگی تاکہ وہ اپنی حد سے آگے نہ بڑھیں اور اپنے دائرہ اختیار میں رہنے والے لوگوں کو ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچائیں۔ اس کے لیے اتفاقیہ رائے سے آڈٹ کا ایک یکساں طریقہ اختیار کرنا ضروری ہوگا۔

ہمارے کثیر العقائد معاشرہ کو جمہوری بنانے کے عمل کو صرف قانون سازی اور انتظامیہ اقدامات کے ذریعے ہی یقینی نہیں بنایا جا سکتا۔ عوام کو بھی حرکت میں لانا ہوگا اور ان کی حمایت حاصل کرنی ہوگی۔ غیر سرکاری تنظیموں، اکادمیوں اور پیشہ ورانہ اداروں، سیاسی جماعتوں اور دوسرے گروپوں کو اس بات پر زور دینا ہوگا کہ اقتدار پر جن کا حق ہے انہی کو منتقل کیا جانا چاہیے۔ اقتدار کی لامرکزیت کی پوری مشق میں اسکولی اساتذہ، ترقی پسند کسانوں، سماجی کارکنوں اور پیشہ ور لوگوں کو شامل کیا جانا چاہیے۔ ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ پنچایتی راج اداروں کے منتخب امیدواروں کو یہ بات سکھائی جانی چاہیے کہ وہ انتخابی رقابتوں سے اوپر اٹھ کر اپنے فرائض انجام دیں۔ رقابتیں انتخاب کے مکمل ہوتے ہی ختم ہو جانی چاہیے۔

تجاویز

پنچایتی راج کے امکانات کو روشن بنانے کے لیے کچھ تجاویز ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں۔

۱۔ پنچایتوں کے منتخب ممبران کو ماتحتی کا رول ادا کرنے کے بجائے سرکاری افسروں پر نگرانی اور کنٹرول رکھنا چاہیے۔

۲۔ پنچایتوں کے قانونی، مالی اور انتظامیہ معاملات حل کرنے کے لیے ہر ریاست میں ایک بین اضلاعی پنچایت پریشد بنائی جائے جس کے چیئرمین وزیر اعلیٰ ہوں۔ ضلع کی سطح کے منصوبہ ساز ادارے کا صدر ضلع پنچایت کے چیئرمین کو بنایا جائے۔

۳۔ مالی معاملات کے بارے میں جواب دہی کی ذمہ داری پوری کرنے کا انتظام کیا جانا چاہیے اور کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل کو اس کی نگرانی کرنی چاہیے۔ نچلی سطح کی پنچایتوں کے بارے میں جوابدہی کی ذمہ داری اور انھیں تحلیل کرنے کا اختیار سرکاری افسران کے ہاتھوں میں نہ ہو کر اگلی بلند تر پنچایت کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔

۴۔ کوآپریٹو سوسائٹیوں کے چناؤ باقاعدگی سے کرائے جانے کو یقینی بنانے کے لیے آئین میں ترمیم کی جانی چاہیے کیوں کہ پنچایتی راج کی کامیابی کے لیے ایک طاقتور کوآپریٹو نظام کا ہونا ضروری ہے۔

آخر میں ہم یہ سوال کرنا چاہیں گے کہ کیا ہم جمہوری لامرکزیت لانے میں سنجیدگی سے یقین رکھتے ہیں یا یہ محض ایک کاغذی مشق ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر پنچایتوں کے چھوٹے بڑے مسائل حل نہ کیے گئے۔ اگر مخفی مفادات اور اقتدار کے دلالوں کو بیچ میں سے نہ ہٹایا گیا، اگر جمہوری لامرکزیت لانے کے لیے محض نیم دلانہ اور غیر منصوبہ بند کوشش کی گئی اور اگر جواب دہی والی مالی خود مختاری کو بہتر نہ بنایا گیا تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوں گے۔ اگر سرکار کی پنچایتی راج تحریک کو بڑھاوا دینے کی پالیسی پر صدق دلی سے عمل کیا جائے تو اس سے ایک ایسا سیاسی، سماجی اور اقتصادی انقلاب آئے گا جس سے نہ صرف ہمارے معاشرہ کے جمہوری کردار کی جڑیں مضبوط ہوں گی بلکہ مستقل طور پر ایک توانا لیڈر شپ بھی ملتی رہے گی جو ملک کی حالت یکسر بدل دے گی۔

لب لباب

یہ مضمون ختم کرتے ہوئے ایک اور سوال ہمارے ذہن میں آ رہا ہے جو ہو سکتا ہے کہ اور لوگوں کے ذہن میں بھی اٹھ رہا ہو۔ یہ سوال یہ ہے کہ ۲۰۱۵ء تک پنچایتی راج اداروں کا کیا مستقبل ہوگا؟ نچلی سطح پر جمہوریت کی اکائیوں کی حیثیت سے پنچایتی راج اداروں کے مستقبل کے بارے میں ہم بہت پر امید ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پنچایتی راج اداروں کی کامیابی کا دارومدار خاص کر متعلقہ ریاستی حکومتوں کے سیاسی عزم پر ہوگا۔ تاہم پنچایتی راج اداروں کو آئینی حیثیت دینے اور ان کے انتخابات میں باقاعدگی لانے سے ان کے مستقبل کا روشن ہونا یقینی ہے مگر اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ریاستی اور مرکزی سطحوں پر انتخابات میں باقاعدگی ہونے کے بعد بھی ہم اپنے جمہوری نظام کو روشن مستقبل کی طرف نہیں لے جا سکے ہیں۔ لیکن ہمارے خیال سے یہ صورت حال دیہی سیاسی نظام پر زیادہ اثر انداز ہونے والی نہیں ہے۔ اگرچہ ہمارے دیہی عوام ناخواندہ اور لاعلم ہیں مگر وہ بہت حساس اور ایسے فیصلے کرنے کے اہل ہیں جو سماج کے وسیع تر مفاد میں ہوں۔ علاوہ ازیں وقت مقررہ پر ہونے والے لازمی انتخابات کی بدولت وہ پنچایتی راج اداروں کی لیڈر شپ کو بدل سکیں گے اور اس طرح امیدواروں کو ذہن نشین کرا سکیں گے کہ پنچایتی راج اداروں میں صرف وہی لیڈر ٹک سکیں گے جو پر خلوص، دیانت دار اور غیر جانب دار ہوں گے اور جنھیں گاؤں کی ترقی عزیز ہوگی۔ ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ ۲۰۱۵ء تک پنچایتی راج ادارے دیہی معاشرہ میں گہری جڑ پکڑ لیں گے اور دیہات میں تبدیلی اور ترقی کا اصل ذریعہ بن جائیں گے۔ واحد خطرہ جس کا ہم تصور کر سکتے ہیں ریاستی حکومتوں کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ یہ شبہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ۷۳ویں آئینی ترمیم میں ریاستوں کو اپنے پنچایتی راج قوانین میں بروقت ضرورت اور حسب ضرورت مناسب ترمیمیں کرنے کے لیے بہت ڈھیل دی گئی ہے

باقی صفحہ ۸ پر

زراعت سے وابستہ خواتین کے لیے نئی ٹکنالوجی

ہندوستان کی قومی پیداوار کا ۳۲ فی صد حصہ کا سبب زراعت ہے۔ محنت کش آبادی کا تقریباً ۷۰ فی صد حصہ اور معاش میں مصروف خواتین کا ۸۴ فی صد حصہ زراعت میں لگا ہوا ہے۔ اس طرح خواتین زرعی قوت کا ۴۶ فی صد حصہ ہیں۔ شماریاتی حقائق سے پتا چلتا ہے کہ مزدور عورتوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ان خواتین میں کاشت کار اور زرعی مزدور دونوں شامل ہیں۔

۹۰ فی صد دیہی خواتین فنی اعتبار سے غیر تربیت یافتہ اور ناخواندہ ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ استحصال کا شکار ہوتی ہیں۔ ناقص غذا اور کام کی زیادتی کی وجہ سے ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے اور ان کا پیداواری عمل محدود ہو جاتا ہے۔ تاہم ان کو جوتنے کھاد ڈالنے، نرائی، پودوں کی منتقلی، کٹائی، گہائی اور اسٹور میں بحفاظت رکھنا جیسے مختلف زرعی کام کرنے پڑتے ہیں نیز مویشیوں، پولٹری اور ایندھن کی مزدورتوں، پانی بھر کر ذخیرہ کرنا جیسے کاموں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ اندرون خانہ ان کی سرگرمیوں کو گھریلو کام کاج کا نام دیا جاتا ہے، معاشی میں اس کا کچھ حصہ نہیں مانا جاتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا زیادہ تر کام نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔

اعداد و شمار کی کیفیت کی جانچ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواتین اہم پیداواری کا رکن ہیں۔ کوئی جس قدر غریب ہوتا ہے اسی قدر خواتین کی پیداآوری پر اس کا انحصار ہوتا ہے۔

ہندوستان کے زرعی نظام میں ابھی تک زراعت کے مفہوم کو ایک مساویانہ نسوانی سرگرمی کی حیثیت سے متعین نہیں کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں مردوں ہی کو غلبہ حاصل ہے اور وہ ہی ریسرچ اور توسیعی سرگرمیوں کی توجہ کا مرکز ہیں۔ ٹکنالوجی کی ریسرچ کے سلسلہ میں بھی مردوں کے حق میں واضح میلان پایا جاتا ہے۔ کچھ اوزار جو روایتاً صرف خواتین ہی استعمال کرتی تھیں وہ زیادہ کارآمد ہو جانے پر مردوں کے ہاتھ میں چلے گئے ہیں۔ گویا اوزاروں کا استعمال بھی استعمال کنندہ کی سماجی حیثیت سے تعلق رکھتا ہے۔ مرد بہتر اور زیادہ کارگر اوزار استعمال کرتے ہیں جب کہ خواتین زیادہ محنت طلب اوزار استعمال کرتی ہیں۔

حال میں انسٹی ٹیوٹ آف سائنس ٹکنالوجی اینڈ ڈیولپمنٹ اسٹڈیز (NISTADS) نے قومی کمیشن برائے خواتین کی جانب سے ایک تحقیقی مطالعہ کیا گیا جس کا مقصد زراعت میں خواتین کی شرکت پر ٹکنالوجی کے اثرات کا جائزہ لینا تھا۔ سرکاری شعبوں جیسے DST وزارتِ زراعت DANIDA IDRC ICAR IARI UNIFEM جیسے بین اقوامی اداروں سے ۸۰ سائنس ٹکنالوجی پروجیکٹ منتخب ہوئے۔

مشاہدہ میں آیا ہے کہ دیہی خواتین کی ٹکنالوجیکل ترقی کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اس کا شروع ہی سے آغاز کیا جائے۔ اس عمل میں مہارت تکنیک اور تنظیم شامل ہیں۔ خواتین اس نئی ٹکنالوجی کو قبول کرتی ہیں یا نہیں، اس کا انحصار زیادہ تر اس امر پر ہے کہ ٹکنالوجی کس طرح وجود میں آئی اور یہ کہ امکانی صارفین نے اس کی ترقی میں خود اپنے تعاون سے کس انداز میں حصہ لیا۔ کسی بھی پیش کردہ پروگرام کے نفاذ کے لیے سماج کے ثقافتی اور تنظیمی ڈھانچے کو بدلنا ناممکن ہوتا ہے۔ اگر اپنی خوبیوں کی بنیاد پر کوئی پروگرام ایک بار بھی خواتین میں مقبول ہو جائے تو اس کے نفاذ کے پھیلاؤ میں وہ از خود مستعد ہو جائے گی۔

اس تحقیقی مطالعہ میں جن نئی ٹکنالوجیوں کا ثبوت ملتا ہے وہ یہ ہے۔

زراعت

زراعت کے پروجیکٹ سب سے زیادہ مہاراشٹر، تامل ناڈو، آندھرا پردیش اور یوپی کے گڑھوال علاقے میں ہیں۔ مہاراشٹر میں موزک کے مہلک اثر سے پاک گنے کی افزائش کے سلسلہ میں کچھ پروجیکٹ روبہ عمل ہیں جب کہ دیگر پروجیکٹ غیر کیمیاوی زراعت پر کام کر رہے ہیں۔ آندھرا پردیش کے زیادہ تر پروجیکٹ چاول کی اقسام کو بہتر بنانے یا دیگر آلات کے ڈیزائن بنانے میں مصروف ہیں۔ خاص قسم کے میکانیکی ٹرانسپلانٹر آلات ان خواتین کے لیے بنائے گئے ہیں جو دھان کے کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ ترمیم شدہ چارا کاٹ مشینیں اور گہائی مشینیں خواتین کے لیے شروع کی گئی ہیں۔ کیرالا اور تامل ناڈو میں سبزیوں اور اناج کے پروجیکٹوں پر زور دیا جا رہا ہے۔

یوپی کے زلزلہ زدہ گڑھوال علاقے میں جہاں زراعت میں جان ڈالنے کی ضرورت تھی وہاں بہت سے پروجیکٹ شروع کیے گئے ہیں۔

حیاتیاتی، حرکیاتی باغبانی مہاراشٹر اور تامل ناڈو میں شروع کی گئی ہے۔ آندھرا پردیش میں فیروزی سمندری کائی کو حیاتی کھاد کے طور پر

استعمال کرنے کے افزائشی پروگرام پر پروجیکٹ کام کر رہے ہیں۔ غیر کیمیاوی کھیتی باڑی کا تصور مہاراشٹر میں بہت پسندیدہ ثابت ہوا ہے۔ پودوں کی پتیوں کے ذریعہ شمسی توانائی حاصل کرنے، نامیاتی فضلہ کو بطور کھاد استعمال کرنے، نباتی پیداوار کو ضرر رساں کیڑوں کے کنٹرول کرنے، زمین، پانی اور محنت کے صحیح ترین استعمال اور پیداوار کو بڑھانے کے لیے تکنیکیں اختیار کی گئی ہیں۔ مہاراشٹر میں کم لاگتی اسپرولینا کاشت کی تکنیک شروع کی گئی ہے۔ اسپرولینا وٹامن اور معدنیات سے بھرپور غذائیت بخش خوراک ہے۔ خواتین کو اس کی کاشت، کٹائی اور استعمال کی تربیت دی گئی ہے۔

ریشم سازی (سیری کلچر)

ریشم سازی کی صنعت ایک اہم ملک گیر تکنالوجی کی حیثیت سے نمایاں ہوئی ہے۔ چوں کہ صنعت تجر کاری کا ایک آسان طریقہ ہے اور اس سے کسان خواتین کو اچھا نفع ہوتا ہے۔ اس کی کھیتی چوں کہ زیادہ تر منتشر زمینوں پر ہوتی ہے اس لیے اس کے لیے زرعی زمین کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ مغربی بنگال کے بنکورا علاقے میں CWDS کا ایک بڑا پروجیکٹ ہے: جموں و کشمیر، یوپی، مدھیہ پردیش، تامل ناڈو، اڑیسہ، کیرالا، گجرات، بہار اور آندھرا پردیش میں دوسرے اور پروجیکٹ ہیں۔

ترقی پذیر مراکز میں دستیاب زمینوں کو کامیابی سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے خواتین کو اپنے گاؤں کے اندر رہ کر اپنے وقت اور توانائی کو استعمال کر کے فائدہ اٹھانے کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ ریشم سازی کی صنعت سے روزگار ملتا ہے اور گاؤں کے بے روزگار لوگوں کی سماجی و اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔

شہتوت کی درخت کاری سے علاقے کے ماحولیاتی عدم توازن کو روکا جا سکتا ہے۔ کسان مرد و عورتوں کو ریشم کے کیڑے پالنے اور کویا (کوکون) اور ریشم کے تاروں کی پیداوار کے لیے شہتوت کی پتیوں کے استعمال کرنے کی تربیت دی جا رہی ہے۔ ریشم کے مراکز کو ترقی دی جا رہی ہے تاکہ ملک کی اس ڈوبتی ہوئی صنعت کو سہارا مل سکے۔ ریشم کی پیداوار کے لیے دیہی مارکٹنگ مراکز کو فروغ دینے کے لیے کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کی جا سکتی ہیں۔ ریشم سازی ایک ایسی صنعت ہے جس میں بہت زیادہ مشقت کی ضرورت نہیں پڑتی، گاؤں میں چھوٹے پیمانے پر چلائی جا سکتی ہے اور اس کے فائدے بھی بہت ہیں۔ ساتھ ہی دیہی عورتوں کی ایندھن کی بڑھتی ہوئی ضرورت بھی اس سے پوری ہو جاتی ہے۔

ڈیری اور مویشی پالنا

NISTADS کے تحقیقی مطالعہ میں جو پروجیکٹوں کی شہادت ملتی ہے وہ راجستھان، مدھیہ پردیش، گجرات اور مغربی بنگال میں نافذ کیے جا رہے ہیں۔ دیگر ریاستوں جیسے پنجاب، یوپی اور کرناٹک وغیرہ میں دودھ کی اسکیمیں اس عمل کو بڑے پیمانے پر قوت پہنچا رہی ہیں۔ یہ شاید دوسرا شعبہ ہے جس میں خواتین سے کام لیا جا رہا ہے۔

"قومی تناظر پلان برائے خواتین ہند" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۷۵ ملین خواتین دودھ کی صنعت اور ۱۵ ملین دوسرے چھوٹے جانور پالن میں کام کر رہی ہیں۔ ان سیکٹروں میں مردوں کی مقابل تعداد بالترتیب ۵ اور ۲ ملین ہے۔ مسلمہ طور پر سب سے زیادہ محنت کے کام جیسے مویشیوں کی دیکھ بھال، چارے کی فراہمی، چرانا، چھپروں کی صفائی، مویشیوں کی صفائی اور دودھ دوہنا خواتین ہی کے کام ہیں اس لیے سائنٹفک جانور پالن اور مویشیوں کے بنیادی علاج معالجہ کے سلسلے میں خواتین کی تربیت مردوں سے زیادہ ضروری ہے۔

فوری قبولیت اور نفاذ کے لیے خواتین تربیت کاروں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جانور پالن کی تربیت میں مویشیوں کی بیماریوں پر قابو، چارہ کی تیاری، مویشیوں کی اچھی نسل افزائی کے طریقے اور دوغلی نسل کشی، مصنوعی تخم کاری، جانوروں کی زچگی اور ان کی پیدا کرنے کی صلاحیت جیسے سب کام شامل ہیں۔ خواتین کو خالص دودھ کی پیداوار، گایوں کو صاف ستھرا رکھنے کی اہمیت، جگہ اور اس کی دیکھ ریکھ کی تربیت دی جاتی ہے۔ بڑھتے ہوئے جانوروں کو چرانے کے سائنٹفک طریقوں اور حاملہ جانوروں کی دیکھ بھال سے بہتر نتائج حاصل ہوتے ہیں، فاضل آمدنی اور بہتر غذا کے لیے خرگوش، بھیڑ، بکری، مرغی، سور، شہد کی مکھیاں۔ جگہ کی ضرورت کے مطابق پالی جا سکتی ہیں۔

UNIFEM اور UNDP جیسی ایجنسیاں مقامی زبانوں میں پمفلٹ تیار کرا کر خواتین میں تقسیم کرتی ہیں۔ افزائش نسل کے معقول طریقے استعمال کرنے سے نقصان کم سے کم ہوتا ہے۔ اچھے دودھ اور گوشت کی فراہمی کی بنیاد اچھے قسم کے چارہ پر ہے۔ اگر سائنٹیفک طریقے اختیار کیے جائیں تو جانوروں کی پرورش تیزی سے اور کم تر شرح اموات پر کی جا سکتی ہے۔

دیہی غریبوں کو فصلوں کی ناکامی کی صورت میں بھیڑ بکری کی پرورش سے بڑی مدد ملتی ہے۔ چوں کہ یہ ان کی آمدنی کا فاضل ذریعہ ہیں اسی لیے انھیں رہن چھڑانے کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔ خواتین کو کیڑوں سے چھٹکارا اور دوسرے احتیاطی اقدامات کے بارے میں سائنٹیفک طریقوں کی تربیت دی جاتی ہے تاکہ جانور بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ گھریلو پرندوں کو ٹیکہ لگا کر مہلک بیماریوں خاص طور پر چھوت کے امراض جن کا کوئی علاج نہیں ہے ان سے بچایا جا سکتا ہے۔ پرندوں کی اقامت گاہیں بھی حفظان صحت کے اصول کے مطابق ہونی چاہئیں ان کا حد سے زیادہ یکجا ہونا بھی نقصان دہ ہے۔ طبعی ماحول انڈے اور گوشت کی بہتر پیداوار کا سبب ہوتا ہے۔ خواتین کے لیے خرگوش پالن ایک اور نفع بخش پیشہ ہے۔ اس کو کم غذا کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ اس کی پیداواری شرح بلند ہوتی ہے۔ گوشت، اون اور سمور کے لیے انھیں پالا جا سکتا ہے۔

ایکوا کلچر

اڑیسہ اور کیرالا کی ساحلی پٹی پر بہت سے پروجیکٹ ہیں کئی اور پروجیکٹ منی پور اور مدھیہ پردیش میں بھی شروع کیے گئے ہیں۔ مہاراشٹر اور مغربی بنگال بھی آب انباری (ایکوا کلچر) کے وافر ذخائر والے علاقے ہیں۔ اگرچہ پروجیکٹ یہاں کم ہیں۔ ان علاقوں میں مزید پروجیکٹ شروع کیے جا سکتے ہیں۔

آب انباری کی صنعت سے دیہی خواتین کی اقتصادی ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔ کسی بھی روایتی پیشے کے ساتھ ساتھ اس کو عملی شکل دی جا سکتی ہے۔ آب انباری کی تکنالوجی سے گھر کی پشت پر واقع تالاب اور حوض بھی اس کا کامیاب ذریعہ

سکتے ہیں۔ دیہاتوں میں ایسے بہت سے تالاب جوہڑ ہیں جن کا کوئی اقتصادی مصرف نہیں ہوتا۔

آب انباری کے کام کو اگر باغبانی، پولٹری لیلیٹی پالن کے ساتھ شروع کیا جائے تو اس میں گھر کے مریں خانہ دار خواتین کی معاشی سرگرمیوں کی وسیع یاد فراہم ہوتی ہے۔ موثر تربیت اور عملی مظاہروں یہ پروگرام جو تکنالوجی کی ضرورتوں پر مبنی ہوں، ب ابناری کے پیشے کو کافی فروغ دے سکتے ہیں۔ م تکنالوجی کو بہا طور خواتین کی جسمانی صلاحیت کے طابق ہونا چاہیے۔ (۲) اختیار کرنے میں آسانی اور قتصادی اعتبار سے نفع بخش ہوں (۳) کم سرمایہ اور تھوڑا وقت چاہتے ہیں۔ (۴) گھریلو یا مقامی طور پر دستیاب ذرائع کے استعمال پر مبنی ہوں۔ (۵) وقت کے ساتھ ساتھ ان کی توسیع آسان ہو اور درمیانی درجے سے ترقی دے کر بڑے کاروبار میں تبدیل کیا جا سکے۔

پروجیکٹ شروع کرنے کے لیے ماہی تخم، ماہی سمیات وغیرہ فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ خواتین کی ہمت افزائی کی جائے تاکہ اس کے بعد پشتوں پر سبزیاں، کیلا، پپیتا وغیرہ لگانے کے جامع پروجیکٹوں میں حصہ لیں۔ پولٹری اور لیلیٹی پالن کے پروجیکٹ بھی ساتھ ہی ساتھ شروع کیے جا سکتے ہیں۔

اچھی تربیت کی مدد سے ایک ایسا ذریعہ آمدنی پیدا کیا جا سکتا ہے جو سال بھر چلتا رہے۔ چھوٹی مچھلیوں، پونگوں اور بڑی مچھلیوں کی پرورش کے لیے ایک ہی تالاب کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خواتین نے جال سازی کا ہنر سیکھنے کی بڑی مہارت ہوتی ہے اس ذریعے کو بھی خانگی یافت کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خواتین کی سرگرمیاں آب انباری میں جدت پیدا کرنے میں بہت اہم ثابت ہوئی ہیں۔ مسلمہ طور پر مکان سے ملحق ۱۰ر۰ ہیکٹیر کے رقبہ میں سال بھر کی ضرورت کی مچھلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ نفع بخش کام فرصت کے اوقات میں دیگر مشاغل اور گھریلو کام کاج میں حرج کے بغیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کام میں شریک ترقی پسند خواتین نے کارپ مچھلی کی پرورش کی تکنیک میں مہارت حاصل کرلی ہے۔ مچھلی کے انڈوں کی پیداوار ایک اچھا ذریعۂ آمدنی ہے اور اس سے چھوٹی مچھلیوں کی پیداوار کا ابتدائی میٹریل بھی مہیا ہو جاتا ہے۔ بڑی مچھلی کے پیداوار کا بنیادی مشغلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ آب انباری کے کامیاب عمل کے لیے ہر مرکز کو اپنے طور پر دیکھ بھال کر ترقی دینی ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ مچھلی پالن، مچھلیوں کی تخم ریزی جیسے کاموں کو جداگانہ طور پر انجام دینے کی پیشہ ورانہ مہارت فروغ پا سکتی ہے۔ تجارتی پیمانہ پر یہ تکنالوجی بہت مفید ثابت ہوئی ہے اس کو درمیانی درجہ سے بڑے پیمانہ کے کاروبار تک پھیلایا جا سکتا ہے اور حوصلہ مند خواتین اس کا انتظام چلا سکتی ہیں اس کے لیے لازمی طور پر توسیعی امداد سرکاری محرکات اور گاؤں کے مردوں کا تعاون ضروری ہے۔

آب انباری دیہی خواتین کے روزگار کا ایک ممکنہ میدان ہے۔ چارہ کی ناکافی مقدار ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ گاؤں کی سطح پر چارہ کاری کی واقفیت سے اس رکاوٹ پر بھی قابو پایا جا سکتا ہے اور خصوصاً خواتین کو روزگار کے نئے مواقع بھی مل جائیں گے۔

کیرالا میں آب انباری کے نظام کے تحت کھارے پانی کے علاقوں کو جھینگا فارم میں تبدیل کرکے جھینگوں کی پیداوار کو دوگنا کیا جا سکتا ہے۔ ایک تخمینہ کے مطابق اضافی خوراک سازی کے لیے ۲۵۰۰۰ ٹن چارے کی ضرورت ہوگی جس کی مدد سے معقول تکنالوجی کو ترقی اور دیہی خواتین کو تربیت دے کر ۵ ہزار کی تعداد میں روزگار مہیا کیا جا سکتا ہے۔ کیرالا میں آب انباری کا ۱۳۵ کروڑ کا ترقیاتی پروجیکٹ ہے۔ ضروری ترمیم کے ساتھ دیگر ریاستوں میں بھی چارہ کاری کی کامیاب تکنالوجی کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ خانگی سطح پر جھینگے کا چارا فیکٹریوں کی سطح پر ہونے والی پیداوار کے مقابلے میں ایک جدت ہے جس پر خواتین کامیابی سے عمل کر سکتی ہیں اور گاؤں کی سطح متوازن غذا بھی فراہم ہو سکتی ہے۔

دافع امراض پودے (میڈیسنل پلانٹس)

خواتین کے لیے دافع امراض پودوں پر کیے گئے سائنس اور تکنالوجی پروجیکٹ کے مطالعہ سے روایتی ادویات کے نباتی نظام کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ بہت سے قیمتی اعداد و شمار توثیق اور احیا کیا گیا ہے۔ فنا پذیر پودے جمع کرکے ان کی شناخت اور پرورش ہوئی ہے۔ اس کے زیادہ تر پروجیکٹ تامل ناڈو، منی پور، مہاراشٹر، مغربی بنگال، کیرالا، آندھرا پردیش اور گجرات میں ہیں۔

ان پروجیکٹوں کے کئی انضباطی مقاصد ہیں۔ دافع امراض پودوں کی کاشت زراعت میں سامنے آنے والی ایک اہم برانچ ہے، جس میں بہت سا سائنس اور تکنالوجیکل مواد موجود ہے۔ ان پروجیکٹوں کے دیگر پہلو یہ ہیں۔

۱۔ کمیاب اور فنا پذیر پودوں کا تحفظ۔
۲۔ دیسی طبی نظام کی ترغیب۔
۳۔ ادویاتی پودوں کی کاشت اور فروخت سے خواتین کی آمدنی۔
۴۔ مشکل ادویاتی پودوں کے لیے زرعی تکنالوجی کا فروغ۔
۵۔ ادویاتی پود گھروں اور جرم پلازم مراکز کا قیام۔

ان پروجیکٹوں سے دیہی خواتین کو مقامی ذرائع سے حاصل ہونے والے پودوں کو استعمال کرکے اپنی صحت کی نگہداشت کے بارے میں مدد ملتی ہے۔ ایک اور مفید بات جو ان پروجیکٹوں سے حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ گاؤں کی خواتین میں بہت سے غلط عقائد اور قصے مروج ہیں۔ جو صحت سے متعلق جانکاری حاصل کرنے کے بعد ختم ہو سکتے ہیں۔ وہ قصے اور عقیدے خواتین کی صحت اور زچگی کے بارے میں ہیں۔

دیکھا گیا ہے کہ اس مطالعہ سے متعلق تمام پروجیکٹ ۱۹۲۲ء کے بعد شروع کیے گئے۔ یہ زیادہ تر کیرالا، مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور تمل ناڈو میں ہیں اس سے جنوبی ہند کی ریاستوں کی بالادستی ظاہر ہوتی ہے۔ ادویاتی پودوں کی کاشت نمایاں طور پر پھیلتی جا رہی ہے اور خواتین کے اختیار کردہ زرعی طرز میں سب سے زیادہ مفید اور نفع بخش بن جائے گی

نئی ضابطہ بندیوں کی تخلیق میں خواتین کا اہم رول ہے۔ دیہی خواتین حتمی طور پر اس سے مستفید بھی ہیں اور صارف بھی۔ فطری بات ہے کہ خانہ دار خواتین پودوں کی کاشت ان کی شناخت اور عام بیماریوں کے گھریلو علاجوں میں بہت دلچسپی رکھتی ہیں۔

فوڈ پروسیسنگ

ICAR کی طرف سے امور خانہ داری سے متعلق مختلف پروجیکٹ بالخصوص فوڈ پروسیسنگ خواتین

کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ پنجاب، ہماچل پردیش۔ یہاں پیداوار کی بہتات ہے یہ پروجیکٹ عمل میں لائے جا رہے ہیں۔

منی پور اور کیرالا کے کچھ علاقوں میں چند پروجیکٹوں کا ہدف خواتین کے لیے اضافی قیمت والی پیداواروں کی طرف ہے۔ مثلاً بنگلور میں خواتین خام املی اکٹھی کر کے دو روپے فی کلو کے بھاؤ سے فروخت کر رہی تھیں۔ CFTR1 کی ایک سادہ سی تکنالوجی کی مدد سے ان کو املی کا کنسنٹریٹ تیار کرنا سکھایا گیا جو ۱۵ روپے فی کلو کے بھاؤ سے بکتا ہے۔ غذائی پروسینگ تکنالوجی جیسے اچار اور خوراک کا تحفظ وغیرہ سے کھیت پر کام کرنے والی خواتین کی آمدنی بڑھنے میں مدد ملی ہے۔

اس مطالعہ سے فوڈ پروسیسنگ میں بہت کم پروجیکٹوں کی شہادت ملتی ہے۔ ایسے یونٹ پنجاب اور ہماچل پردیش میں قائم کیے گئے ہیں۔ یو پی میں گنگا جمنا اور مغربی بنگال سبز زرخیز پٹیوں کے کنارے ایسے پروجیکٹ بنائے جا سکتے ہیں۔ ان پروجیکٹوں کو "ہوم سائنس نیوٹریشنل اسٹڈیز ڈویژن" کے تحت ICAR کی جانب سے فروغ دیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں نامیاتی کھیتی باڑی کا تصور تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ کسان خاص طور پر خواتین اس بات کو محسوس کر چکی ہیں کہ کیڑے مار دوائیں اور کیمیاوی کھادیں بہت نقصان دہ ہیں اور ان سے مٹی اپنے قدرتی اجزاء سے محروم ہو جاتی ہے۔

NADEP مخلوط کھاد سازی ایک سادہ سا عمل ہے جس کے ذریعے گوبر اور زرعی فضلہ کو موثر طریقے سے سڑا کر نامیاتی کھاد بنائی جاتی ہے۔ CAPART گجرات، راجستھان، ہماچل پردیش اور کرناٹک وغیرہ میں مخلوط کھاد سازی کے گڑھوں کو ترقی دے رہی ہے۔ NADEP کھاد سازی زرعی فضلہ کو مختصر مدت میں زرخیز کھاد میں بدلنے کا ایک سادہ اور کارگر طریقہ ہے۔ زرعی فضلہ کا تناسب مٹی، گائے کا گوبر ۴ : ۶۰ : ۱۰۰ ہے۔ استعمال میں آنے والے گوبر کی مقدار بہت کم ہوتی ہے جو خورد نامیاتی وائرس بردار ٹیکہ کی حیثیت سے مخلوط کھاد کو سڑاتی ہے۔ نامیاتی کھیتی باڑی کا رجحان ہندوستان میں تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

دیگر سرگرمیاں جو مخلوط کھاد سازی سے وابستہ ہیں۔

- سماجی جنگل کاری پروگرام
- مہیلا منڈیوں کے تحت فارم جنگل کاری
- پانچ ہزار کنبوں میں رسوئی باغبانی
- حیاتیاتی مادوں کی مقدار اور بے کار زمین کا استعمال

کھمبی تکنالوجی (مشروم تکنالوجی)

خواتین کے لیے سائنس اور تکنالوجی پروجیکٹوں میں یہ ایک حالیہ اضافہ ہے۔ خواندہ عورتیں اس کا ہدف مقرر کی گئی ہیں چوں کہ وہ نباتی روئیدگی کی سائنٹیفک انداز میں بہتر دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔ اس مطالعہ میں منی پور، ناگپور اور دہلی میں پروجیکٹوں کی نشاندہی ملتی ہے۔ کھمبی جموں و کشمیر اور دوسرے سرد آب و ہوا کے علاقوں میں اگتی ہے۔ سفارش کی گئی ہے کہ اس نفع بخش فصل کو سازگار آب و ہوا میں فروغ دیا جائے۔

ماحصل

سبز انقلاب کے دوران تکنیک کی ترقی کے نتیجے میں خواتین کی شمولیت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اس نہج سے ان کو اصل دھارا میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ زراعت میں تکنیکی ترقی کے موضوع پر خواتین کے رول کو حال ہی میں خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس سے پہلے ترقیاتی حکمت عملی سے متعلق مذاکروں میں یہ موضوع ابھر کر سامنے نہیں آیا تھا۔ دیہی خواتین کو اوپر اٹھانے کی ضرورت کو اب مزید نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مشاہدہ کیا گیا ہے کہ تقریباً تمام سائنسی تکنالوجی پروجیکٹ علاقے کی کھیتی کی سرگرمیوں اور ان میں خواتین کے رول کے مقامی سروے کے بعد شروع کیے جاتے ہیں اور یہ کہ ان کے رول کی صورت حال کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ پیداآوری کی سطح کو بلند کرنا اور خواتین کی زندگی کو بہتر بنانا اس کا مقصد ہے۔

زیادہ تر پروجیکٹوں کی منصوبہ بندی سماجی اور سائنٹیفک مشاہدات اور ان کی معنویت کے گرد گھومتی ہے۔ مقامی جماعتیں اور گروہ جیسی سوسائٹیاں اور سنستھائیں N.G.O. S وغیرہ تشکیل دی گئی ہیں تاکہ تکنیکی امداد مہیا کی جا سکے۔ مقامی خواتین کو اکٹھا کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مسائل کو منظر عام پر لائیں اور ان کے حل زیر بحث آئیں۔

تکنالوجیوں کا انتخاب کر کے ان کو خواتین کے مخصوص گروہوں کی ضرورت کے مطابق بنایا گیا ہے اور متعلقہ معلومات تربیت کے ذریعے ان تک پہنچائی جاتی ہے۔ سرکاری ذرائع اور دیگر تحقیقی اداروں سے زمین، بیج پودے اور نباتی روئیدگی حاصل کر کے خواتین کو پہنچا جا رہی ہے۔ محرکات تخلیق کرنے کے خیال سے تربیت پانے والی خواتین کی نشاندہی کی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے باری آنے پر دوسری خواتین کو زراعتی سرگرمیوں میں سدھار لانے سے متعلق تکنیکی طریقوں کی جانکاری کی تربیت دیں۔ تربیت میں وہ زور اور شدت ہونی ضروری ہے جس سے معنی خیز تاثر پیدا ہو۔ ہر تربیت یافتہ خاتون کا دوسری پانچ خواتین کو تربیت دینا فرض ہے۔ ان کو اپنی مرضی سے گروپ منتخب کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔

NISTADS کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سائنس تکنالوجی کے ان پروجیکٹوں سے اخذ کردہ امور یہ ہیں۔

(۱) مٹتے ہوئے مقامی ادویاتی پودوں کی کاشت کر کے ان کے روایتی معالجات کی توثیق۔ روایتی معالجانہ طریقوں کے احیا کے ساتھ ساتھ ان کی توثیق اور شواہد کی ضابطہ بندی کر کے ہندوستانی جڑی بوٹیوں کی روایتی ادویہ کے بارے میں مبینہ حقائق کا مخزن مرتب کیا جا سکتا ہے۔

(۲) جنگل کاری: خواتین بالعموم زمینوں کی مالک نہیں ہوتیں اس لیے ان کے لیے ان جنگلات میں شجر کاری کے منصوبے شروع کرنا زیادہ آسان ہے جو انسان نے اجاڑ دیے ہیں۔

(۳) ترقی اور سماجی تغیر: ماہرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ خواتین کی تعلیم و تربیت کے بغیر کسی بھی شعبے میں کامل ترقی ممکن نہیں ہے۔ کسی قسم کی ترقی کے لیے خواتین کو آگے لانا ہے۔ سماجی تغیر صرف اسی وقت ممکن ہے جب کہ عورتیں تعلیم یافتہ اور مضبوط ہوں۔

(۴) حیاتیاتی مقدار کا استعمال۔

(۵) بے کار زمینوں کی ترقی اور سوکھی زمینوں کی

باقی صفحہ پر

ڈاکٹر راجیندر پرساد

دیہی معیشت کی ترقی میں "سارک" کا کردار

شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۹۸۲ء میں اسٹاک ہوم میں ماحولیاتی کانفرنس کے موقع پر کہا تھا کہ "کرہ ارض کی سب سے بڑی آلودگی غربت ہے۔" ماحول کی آلودگی کا مسئلہ ایک بڑی حد تک غریبی سے منسلک ہے۔ ترقی پذیر ممالک کا بنیادی مسئلہ غریبی ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے بین اقوامی سطح پر کوششیں کی جارہی ہیں کیوں کہ حالات کے تجربوں سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ماحولیات کا مسئلہ صحت مند سماجی ماحول سے وابستہ ہے۔ صحت مند سماجی ماحول بنانے کے لیے صحت مند اور متوازن قدرتی ماحول کا ہونا ضروری ہے۔ غیر صحت مند قدرتی حالات صحت مند قدرتی ماحول کے لیے سازگار نہیں ہوتے۔ اس لیے سماجی اور اقتصادی حالات میں بہتری لانا اشد ضروری ہے۔ اس ضمن میں غریبی ختم کرنے کو اولین ترجیح دی جانی چاہیے۔

کوئی بھی قوم اپنی معیشت کو اس وقت تک مضبوط اور خوشحال نہیں بنا سکتی جب تک کہ اس کی سماجی کیفیت خوشحال نہ ہو۔ اس کے لیے اقتصادی حالات کا درست ہونا ضروری ہے اور اقتصادی حالات کی درستی ہی موافق اقتصادی پالیسی کی ضامن ہے۔ موافق اقتصادی پالیسی کی بنیاد پر ہی ماحول کی صفائی ستھرائی منحصر ہے۔ اسی لیے گاندھی جی کا یہ قول سو فی صد درست ہے کہ "اقتصادی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی نامکمل ہے۔"

صحیح ہے کہ اس سلسلے میں آج بین اقوامی مجالس منعقد ہو رہی ہیں۔ ترقی پذیر ممالک نے اپنی دیہی معیشت کی خوشحالی کے لیے کئی پیکیج تیار کیے ہیں۔ ان میں "سارک" پیکیج کا کردار قابلِ تعریف ہے۔

سارک تنظیم کا مقصد

"سارک" جنوبی ایشیا کے سات ممالک بھارت، سری لنکا، مالدیپ، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور بھوٹان کی تنظیم ہے۔ پانچ اہم اصولوں پر مبنی یہ تنظیم اقتصادی ترقی کی تنظیم ہے۔ بین اقوامی مقابلے میں شامل ہونا اور سماجی، اقتصادی اور ماحولیاتی ترقی اس تنظیم کا نصب العین ہے۔ "سارک" تنظیم کے اہم مقاصد یہ ہیں :- اقتصادی خوشحالی کے لیے علاقائی کوششیں، دو فریقی بنیاد پر مسئلوں کا حل، جدید تکنالوجی کا باہمی تبادلہ، تعلیم اور صحت کو ترجیح اور غریبی ختم کرنے کے پروگرام۔

"سارک" تنظیم کا قیام ۱۹۸۵ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ اس وقت سے یہ تنظیم اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشاں ہے۔

"سارک" تنظیم کے اراکان دنیا کے سب سے زیادہ غریب ممالک میں سے ہیں۔ دنیا کے غریبوں کی کل تعداد کا ۴۵ فی صد جنوبی ایشیا میں رہتا ہے۔ جنوبی ایشیائی ممالک کی برآمدات دنیا کی مجموعی برآمدات کا ۸٫۰ فی صد ہیں۔ یہاں کے ملکوں کا غیر ملکی زرمبادلہ کا ذخیرہ دنیا کے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخیرے کا فقط ۷٫۰ فی صد ہے۔ ان حالات میں ترقی پذیر ممالک ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں کیسے آسکتے ہیں۔ اس لیے رکن ممالک "سارک" تنظیم کی وساطت سے باہمی تعاون کے ذریعے بچت، سرمایہ کاری اور اپنی مصنوعات کی مانگ بڑھا کر اپنا غیر ملکی زرمبادلہ کا ذخیرہ بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

متذکرہ بالا تعمیری کوششوں کے نتیجے میں "سارک" ملکوں کے معیار زندگی میں تبدیلی آئی ہے اور عالمی سطح پر ان کی شناخت بنی ہے لیکن پھر بھی انھیں ترقی کی دوڑ میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ملکوں کا سیاسی و معاشی عدم استحکام بنیادی مقاصد کے حصول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس تنظیم کے بیشتر ممالک کی غیر ملکی تجارت خسارے میں چل رہی ہے۔ غیر ملکی قرضوں کی بازادائیگی میں مشکلات پیش آرہی ہیں۔ لہٰذا حصول مقاصد کے لیے مزید تعاون اور مضبوط پالیسیوں کی ضرورت ہے۔

اس صورت حال کے باوجود "سارک" کی کامیابی حوصلہ افزا ہے۔ یہ ممالک بین اقوامی سطح پر خوشحالی کے ممکنہ وسائل رکھتے ہیں۔ وہ عظیم قدرتی دولت کے مالک ہیں۔ انسانی وسائل انھیں کافی تعداد میں دستیاب ہیں۔ اگر ان بنیادی ترقیاتی وسائل کا صدق دل سے منصوبہ بند طریقے سے استعمال کیا جائے تو سارک ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے۔ آج کے بدلتے ہوئے اقتصادی و سماجی حالات میں روایتی انداز نظر کے بجائے جدید انداز نظر کا اختیار کیا جانا اس ضمن میں ایک حوصلہ افزا علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ممالک اپنے علم اور واقفیت میں اضافہ کرکے مقابلے کی معیشت میں سب سے آگے نکل رہے ہیں۔ اس عمل میں آپس میں سیاسی اور اقتصادی تعاون نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی مثالیں مشرقی اور مغربی جرمنی کا متحد ہونا، کینیڈا کا مشترکہ بازار، مشرقی اور مغربی یوروپ کے ملکوں کے درمیان اقتصادی

تعاون کی لہراور اے پی سی سی (ایشیا بحرالکاہل اقتصادی تعاون کی تنظیم) یہ سب باتیں "سارک" ممالک کو تحریک عمل بھی فراہم کرتی ہیں اوران کے لیے ایک چیلنج بھی ہیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ "سارک" کی تنظیم انہی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وجود میں آئی ہے۔ اسی لیے اس کا خاص مقصد علاقائی عدم توازن کو دور کر کے اقتصادی برابری کی طرف آگے بڑھنا ہے۔

علاقائی عدم توازن کا عالمی نظام پر خراب اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا ہر سطح پر اس عدم توازن کا مقابلہ کرنا ضروری ہے خواہ وہ اقتصادی عدم توازن ہو یا قدرتی، سماجی مسائل ہوں یا سیاسی ہمیں ان سے نجات پانی ہوگی۔ اس سمت میں بھارت کا مثبت کردار قابل ذکر ہے۔ اس کی تہذیب وثقافت پنچ شیل کے اصولوں کی شہادت دیتی ہے جس کی روشنی میں پوری انسانیت کا بھلا ہو سکتا ہے۔

"سارک" کا تعمیری کردار

"سارک" نے اپنے منشور کے مطابق اپنی دیہی معیشت کی ترقی کے لیے روایتی طریق ہائے کار میں تعمیری اصلاحات کی ہیں جنھیں ہم "سارک" کی دیہی تعمیر نو کا منصوبہ کہہ سکتے ہیں۔ "سارک" نے اپنے رکن ممالک کو دستیاب وسائل کا حتی الوسع زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہوئے مطلوبہ ترقی حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل تعمیری اقدامات کیے ہیں :۔

- انسانی وسائل کو ہنرمند بنانا
- تربیت و تحقیق کے اداروں کی توسیع
- خواندگی اور خاندانی بہبود کے لیے علاقائی تعاون پر مبنی پروگراموں کی تشکیل
- سرمایہ جاتی پیداوار اور توانائی کے تجدیدی وسائل کو ترجیح
- علاقائی امدادی فنڈ کا قیام
- تحفظ ماحولیات کے جدید طریقوں کی حوصلہ افزائی اور سماجی جنگل بانی کا فروغ
- ترقی کے لیے نئے مواقع کی تلاش

اس طرح ان اقدامات کے ذریعے مربوط دیہی ترقی کے پروگرام اور ماحولیاتی توازن کی طویل مدتی اسکیم کو بڑھاوا دیا گیا ہے۔ منشا یہ ہے کہ قدرت سے جتنا کچھ حاصل کیا جائے اتنا لوٹایا بھی جائے۔ انسانی معاشرہ کی حفاظت اور متوازن ترقی کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ متوازن اقتصادی ترقی غریبی دور کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ بھارت میں، جو سارک کا ایک سرکردہ رکن ہے، ۱۹۸۶ء میں اصلاح شدہ ۲۰ نکاتی اقتصادی پروگرام کو غریبی دور کرنے کا ایک بڑا پروگرام تصور کیا گیا۔ اس پروگرام کے تحت صرف ہمارے ملک میں مارچ ۱۹۹۴ء تک غریبی کا فی صد تناسب ۴۸ فی صد سے گھٹ کر ۳۲ فی صد ہو گیا ہے۔ ساتویں منصوبے کے تحت مربوط دیہی ترقی کے پروگرام (آئی آر ڈی پی) کے لیے ۳.۲۳ ارب ۵۹ کروڑ روپے مختص کیے گئے تھے۔ ٹرائسم (دیہی نوجوانوں کو خود روزگار کے لیے تربیت دینے کے پروگرام) کے تحت گاؤں گاؤں میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ہنرمند بنانے کی جامع اسکیم زیر عمل لائی گئی ہے۔ اصلاح اراضی اور خاطر خواہ زرعی پیداوار کے لیے "کنٹور فارمنگ" کی تکنیک اختیار کی جا رہی ہے۔ آب پاشی اور کیمیاوی کھادوں کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔ اس کام میں عورتوں کے اہم رول پر بھی خاص توجہ دی جا رہی ہے کیوں کہ عورتیں خاندان کی ترقی میں ایک بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ ●

بقیہ: گرین ہاؤس اور ہماری زندگی

بہرحال نظام فطرت میں جو بھی تبدیلی لاحق ہے اس کی خاص وجہ گرین ہاؤس اثرات ہی ہے۔ صرف کاربن ڈائی آکسائڈ ہی اس گرین ہاؤس کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ میتھن، نائٹرس آکسائڈ، فری اون اور کلوروفلورو کاربن (C.F.C) وغیرہ بھی گرین ہاؤس اثرات کی ذمہ دار ہیں۔ C.F.C دراصل رفریجریٹر وں اور ایئرکنڈیشنڈ وغیرہ میں استعمال ہوتی ہے۔ جب فریجوں وایئرکنڈیشن وغیرہ کو توڑا یا کھولا جاتا ہے تو یہ گیسیں فضا میں پہنچتی ہیں اور یہ ایسی گیسیں ہیں جو فضا میں سیکڑوں برسوں تک ایک تہہ کے روپ میں برقرار رہتی ہیں۔ اوزون سطح کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والی یہی گیسیں ہیں۔ لہٰذا بنی نوع انسان کی بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان اثرات کو کم کرنے کے لیے کوئی موثر قدم اٹھایا جائے۔

سب سے پہلے تو آبادی میں ہونے والے اضافہ پر قابو پانا ضروری ہے۔ اگر کاربن ڈائی آکسائڈ کا پھیلاؤ ۳۔ ارب ٹن سالانہ کم کر دیا جائے تب کچھ برسوں کے لیے فضا میں کاربن کی مقدار کو متوازن کیا جا سکتا ہے۔ ایندھن وغیرہ کے لیے غیرمروّج تجدید پذیر توانائی کا استعمال کرنا ہوگا۔ خاص طور سے رفریجریٹر و ایئرکنڈیشن کو چلانے کے لیے شمسی توانائی وغیرہ کا استعمال کرنے کا طریقہ نکالنا ہوگا۔ جس سے فضا میں زہریلی گیسوں کی پیداوار میں کمی آئے گی۔ درختوں کا لگانا ان کو بچانا اور ان کی دیکھ بھال کرنا بہت ہی اہم ہے۔ ان اعمال سے کرۂ ارض اور کرۂ باد کی آلودگی میں کمی آئے گی اور ہر ذی روح کے لیے جینے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ ایسے ممالک جو ماحول کو سب سے زیادہ آلودہ کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ آلودگی کم کرنے کے لیے وہ سب سے زیادہ مالی تعاون کریں۔ ترقی یافتہ ممالک کے ماہر ماحولیات کو چاہیے کہ غیرآلودہ ماحول بنانے کے لیے نئی نئی تکنیک منظرعام پر لائیں جس سے کہ عام انسان بھی آلودگی کم کرنے میں مدد کر سکے سستے اور گھٹیا قسم کی تکنیک جس سے آلودگی میں اضافہ ہوتا ہو، کو دنیا بھر کے لوگ ترک کریں۔

مندرجہ بالا طریقے کو اپنا کر دنیا کے لوگ گرین ہاؤس اثرات سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور جب تک عام انسان اس مسئلہ پر غور نہ کرے گا تب تک اس کے متعلق بیداری نہ آئے گی۔ لہٰذا دنیا کے ماہرین ماحولیات و سائنس دانوں کے علاوہ ہمیں بھی آلودگی کم کرنے کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ ●

بقیہ: کہکشاں اور سیارے

دوگنے یا نصف ثابت ہو سکتے ہیں۔

ماخوذات

۱۔ علم جدید کا چیلنج۔ مصنف وحیدالدین خان
۲۔ روزنامہ سیاست جدید۔ کانپور
۳۔ روزنامہ قومی آواز۔ لکھنؤ
۴۔ دینک آج (ہندی) کانپور

●

سید ساجد علی ٹونکی

پرتیمیم سیونگس بینک سروس اسکیم

ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے لاکھوں ڈاک خانے قومی بچت کی مختلف اسکیموں کے ذریعہ عرصۂ دراز سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں، ڈاکخانوں میں چلنے والی ان اسکیموں کی مدد سے نہ صرف عوام میں بچت کی عادت پیدا ہوتی ہے بلکہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو سرمایہ کاری کے لیے بھاری رقوم بھی مہیا ہوتی ہیں، ڈاک خانہ بچت بینک کی تمام اسکیموں کو دو خانوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے ایک معینہ مدتی کھاتے دوسرے غیر مدتی کھاتے۔ مدتی کھاتوں میں سرمایہ کاری مخصوص مدت کے لیے کی جاتی ہے مثلاً آر ڈی (پانچ سالہ کھاتے) ٹی ڈی (ایک سالہ، دو سالہ، تین سالہ اور پانچ سالہ) سی ٹی ڈی (دس سالہ یہ کھاتے اب کھلنا بند ہو چکے ہیں)۔ اسی طرح سرٹیفکٹیں میں اندرا وکاس پتر اور کسان وکاس پتر ساڑھے پانچ سالہ مدت میں مکمل ہوتے ہیں۔ این ایس سی آٹھواں اجرا چھ سال کی مدت میں مکمل ہوتے ہیں۔ این ایس ایس میں جمع رقم چوتھے سال میں نکالی جاسکتی ہے، جب کہ پی پی ایف ۱۵ سال میں اسی طرح ایم آئی ایس میں چھ سال بعد رقم نکالی جاسکتی ہے۔ وزیر اعظم نے گزشتہ سال ۱۵ اگست کو ایک نئی اسکیم کا اعلان کیا تھا جسے ایم ایس وائی یعنی مہیلا سمردھی یوجنا کہا جاتا ہے۔ اس میں اگرچہ تمام اسکیموں کے مقابلہ سود کی شرح سب سے زیادہ رکھی گئی ہے (یعنی ۲۵ فی صد) لیکن کھاتا کھولنے کی سہولت صرف دیہی خواتین کو ہی دی گئی ہے۔ اس اسکیم کا مقصد دیہی خواتین کو گھروں کے تنگ دائرے سے نکال کر باہر لانا اور ان میں اعتماد پیدا کرنا ہے۔ کچھ اسکیموں میں کھاتیدار کو انکم ٹیکس میں چھوٹ (REBATE) بھی دی جاتی ہے مثلاً این ایس ایس ۹۲ اور این ایس سی آٹھواں اجرا، وغیرہ میں یہ سہولت دی جارہی ہے۔

اس کے برعکس غیر مدتی کھاتوں میں رقم کو کبھی بھی کھاتے میں ڈالا اور نکالا جاسکتا ہے۔ ایسے کھاتوں میں سود کی شرح بہت کم ہوتی ہے۔ اس میں سب سے اہم ہے عام بچت بینک کھاتے جن میں شرح سود ساڑھے پانچ فی صد ہے۔ اسی طرح سرکاری ادارے مثلاً اسکول کالج کے طلبا کے فنڈس، پنچایت سمیتیاں وغیرہ کے کھاتے جنہیں عام بول چال میں پبلک کھاتے کہا جاتا ہے ان میں سود کی شرح پانچ فی صد ہے۔ اسی طرح سوسائٹیز کے کھاتے جو دیگر کھاتوں کے ذیل میں آتے ہیں ان کھاتوں پر تین فی صد سود کی شرح ہے۔

جہاں تک "پرتیمیم سیونگس بینک سروس" یا پی ایس بی ایس کا تعلق ہے محکمہ ڈاک کے نوٹیفکیشن نمبر ۲-۸-۳۲/۹۵-۹۴ جو ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو جاری ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے "بہت جلد یہ اسکیم دہلی میں پندرہ پوسٹ آفسوں میں شروع ہو رہی ہے" اس سلسلہ میں تقریباً تمام ابتدائی تیاریاں کرلی گئی ہیں اور ملازمین کو اس سلسلہ میں ابتدائی تربیت بھی دی جارہی ہے۔ اس اسکیم کو "منافع کی بچت بینک خدمت" یا پی ایس بی ایس کے نام سے پکارا جائے گا۔ اس اسکیم کا آغاز فی الحال دہلی میں ہی کیا جارہا ہے لیکن توقع ہے کہ بہت جلد یہ اسکیم ملک گیر پیمانے پر شروع ہو جائے گی اور قوی امید ہے کہ موجودہ سیونگس بینک اسکیم کے مقابلے یہ بہت جلد مقبول ہو کر دیگر اسکیموں سے زیادہ گاہکوں کی توجہ اپنی جانب مرکوز کرے گی۔

پی ایس بی ایس اسکیم کے آغاز کے لیے دہلی کے جن پندرہ ڈاک خانوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ پارلیمنٹ اسٹریٹ ہیڈ پوسٹ آفس دہلی ۱
۲۔ نئی دہلی جی پی او دہلی ۱
۳۔ اندر پرستھ ہیڈ پوسٹ آفس نئی دہلی ۲
۴۔ دہلی جی پی او دہلی ۶
۵۔ لودھی روڈ ہیڈ پوسٹ آفس نئی دہلی ۳
۶۔ قرول باغ ڈاک گھر دہلی ۵
۷۔ مشرقی کورٹ ڈاک گھر نئی دہلی ۱
۸۔ لاجپت نگر ڈاک گھر نئی دہلی ۲۴
۹۔ مالویہ نگر ڈاک گھر نئی دہلی ۱۷
۱۰۔ حوض خاص ڈاک گھر نئی دہلی ۱۶
۱۱۔ آر۔ کے پورم پوسٹ آفس نئی دہلی ۲۲
۱۲۔ جانگیر پورہ پوسٹ آفس نئی دہلی ۲۱
۱۳۔ وسنت وہار ڈاک گھر نئی دہلی ۵۷
۱۴۔ جنک پوری ڈاک گھر نئی دہلی ۵۸
۱۵۔ پٹ پڑ گنج پوسٹ آفس دہلی ۵۱

بچت کی اس نئی اسکیم کو حقیقت میں جس کا خاص مقصد چھوٹی بچتوں کو فروغ دینے سے زیادہ گاہکوں کو سہولت دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں بچت کی عام اسکیموں پر ڈاک خانہ اضافی رقم بیاز کی شکل میں ادا کرتا ہے اور اپنی خدمات کے سلسلہ میں کسی قسم کا معاوضہ نہیں لیتا ہے اس کے برعکس پی ایس بی ایس کے تحت کھاتیدار کو ہر سال ڈیڑھ سو روپیہ بطور خدمت فیس بھی ادا کرنی ہوگی۔ مذکورہ بالا تمام ڈاک گھروں میں بیک وقت اس اسکیم کا آغاز ہوگا اور کوئی بھی جمع کنندہ کسی بھی برانچ آفس

اشوک وہار ہیڈ پوسٹ آفس۔ دہلی ۱۱۰۰۵۲

زی آفس (پارلیمنٹ اسٹریٹ ہیڈ پوسٹ آفس)
رقم جمع کر سکتا ہے یا نکال سکتا ہے۔

مرکزی آفس کو جسے CENTRAL ACCOUNT
OFFIC بھی کہیں گے اور اس آفس کی اس برانچ کو جہاں
ے اس اسکیم کو کنٹرول کریں گے اسے CENTRAL
ACCOUNTING CENT کہا جائے گا۔ کھاتا کھولنے
قبل متعلقہ فارم ایس بی ۳ جو بچت کی دیگر اسکیموں
، عام طور سے استعمال ہوتا ہے اس کی خانہ پری
کے مذکورہ بالا پندرہ آفسوں میں سے کسی بھی کاؤنٹر
دیا جائے گا۔ ان ٹرمنل آفسوں پر فارم کی جانچ
تال کے بعد معاون پوسٹ ماسٹر (APM) کے
بعد پی ایس بی ایس کارڈ کے لیے متعلقہ فیس ۵۰۰
پے جمع کرانے کی اجازت دے دی جائے گی اس
ح کھاتیدار ہ سو روپے جمع کرانے کے بعد رسید نمبر
ACG- حاصل کرلے گا اس کے بعد رقم جمع کرانے
فارم ایس بی ۱۰۳ کی خانہ پری کر کے کھاتا کھولنے
کم از کم مقررہ رقم ڈھائی سو روپے جمع کرانے کے
سبھی کاغذات کو برانچ آفس سے ہیڈ آفس یا
زی اکاؤنٹ آفس نئی دہلی بھیج دیا جائے گا۔

ن سے متعلقہ کارڈ PSBS جاری کر دیے
ئیں گے۔ عام طور سے مرکزی آفس سے دو قسم کے پی
بی ایس کارڈ جاری کیے جاتے ہیں۔ ایک گاہک
لیے جس پر اس کا نام و پتہ آفس کا لوگو (LOGO)
ھاتہ نمبر درج ہوگا جب کہ دوسرا کارڈ سپروائزر س
لیے جاری ہوگا۔ جب ایک سپروائزر کا ٹرانسفر
جائے گا تو اس کے پن بھی تبدیل ہو جائیں گے
طرح وہ کارڈ بھی تبدیل ہو جائے گا۔

ایک پی ایس بی ایس کھاتے میں کم از کم
ائی سو اور زیادہ سے زیادہ پچاس ہزار روپے جمع
ائے جا سکتے ہیں۔ ایک دن میں کسی بھی آفس میں
بار رقم جمع بھی کرائی جا سکتی ہے اور رقم نکالی بھی
سکتی ہے۔

جیسے ہی مرکزی آفس سے PSBS کارڈ برانچ
نل آفس پہنچا ہے وہاں کھاتیدار کو بلوا کر رسید
صل کرنے کے بعد متعلقہ کارڈ اس کو دے دیا جاتا ہے۔
کارڈ پر پن کوڈ سب کوڈ اور سات ہندسوں میں
نٹ نمبر کے پن بھی ہوتے ہیں۔ کارڈ حاصل کرنے
بعد کھاتیدار خود ان ہندسوں کی مدد سے اپنے کھاتہ نمبر
کرتا ہے اور انھیں نمبروں کی بنیاد پر اس کھاتے سے
وہ لین دین (TRANSACTION) کر سکتا ہے۔

اگر کوئی شخص اپنا کھاتہ نمبر بھول جائے اور
غلطی سے غلط نمبر پر اپنا کارڈ ڈال کر رقم نکالنا چاہے
تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا چناں چہ ٹرمنل پر غلط
اکاؤنٹ نمبر کا اشارہ مل جائے گا۔ اس طرح اس عمل
کو بار بار کرنے سے اس کا کارڈ شک کے دائرے میں
آجائے گا اور وہ کارڈ خود بخود ٹرمنل میں پھنسا رہ
جائے گا۔

جہاں تک رقم جمع کرانے کا تعلق ہے اس
کے لیے اس کارڈ کی مدد سے کوئی بھی شخص رقم جمع کرا سکتا
ہے اس میں کسی خاص کوڈ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔
صرف پہلی بار رقم جمع کرانے میں متعلقہ فارم ایس۔
بی۔ ۱۰۳ بھر کر رقم جمع کرانا لازمی ہے بقیہ تمام رقم جمع
کرانے سے قبل کسی فارم کے بھرنے کی ضرورت نہیں
ہے۔

اس کے برعکس رقم نکالتے وقت کسی بھی قسم
کے فارم کے بھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس اسکیم
کے تحت نہ صرف گاہکوں کو بہت آسانی ہو جائے گی بلکہ
محکمہ کے اسٹاف کو بھی بہت سہولت ہو جائے گی
اس اسکیم کے تحت کسی بھی قسم کا لیجر وغیرہ تیار نہیں کرنا
پڑے گا۔ اگر کوئی شخص اپنے لین دین کی فہرست حاصل
کرنا چاہے تو پچھلے چالیس۔۔۔۔ لین دین
(TRANSACTION) کی فہرست فوری طور پر اسے
دی جا سکتی ہے۔

تمام برانچ آفسوں سے ہر روز سبھی لین دین
کی فہرست سازی کے بعد اس کی تفصیل ہیڈ آفس
بھیجی جائے گی۔ اگر کسی کھاتیدار کا پی ایس بی ایس
کارڈ گم ہو جائے گا اس کو مرکزی آفس سے دوسرا کارڈ
جاری کر دیا جائے گا اور گم شدہ کارڈ کی سیاہ فہرست
ہر روز سبھی آفسوں میں بھیجی جائے گی۔ اس اسکیم کے تحت
جاری کارڈوں کا انڈیکس رجسٹر مرکزی آفس کے پوسٹ
ماسٹر کے پاس رہے گا۔

ہر سال ۳۱ مارچ کے بعد جیسے ہی کوئی پی ایس
بی ایس کارڈ کسی بھی آفس میں لین دین کے لیے آئے گا
متعلقہ کلرک اس کارڈ کو اپنے پاس رکھ کر کارڈ کے اصولی
کی رسید ایس۔ بی ۲۸ کھاتیدار کو دے کر اس کارڈ
کو مرکزی آفس بذریعہ ڈاک بھجوا دے گا وہاں اس
کھاتے میں اس سال کے بیاج کا اندراج کر کے کارڈ
کو لوٹا دیا جائے گا جو بعد میں کھاتیدار کو دے دیا
جائے گا۔ کھاتا بند کرتے وقت کھاتیدار سے کارڈ
واپس لے لیا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں موجودہ دور میں تقریباً
سبھی محکموں میں کمپیوٹر اور سپر کمپیوٹر کا استعمال دنوں
دن بڑھ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اب ہمارا ملک
آزاد تجارت اور کھلے پن کے عالمگیر اصول پر چل کر
عالمی برادری کے شانہ بشانہ چل رہا ہے۔ اس قسم کے تجربات
دنیا کے دیگر ممالک کی تقلید پر ہی ہمارے ملک میں بھی
کیے جا رہے ہیں۔ اس اسکیم کی مقبولیت میں اس وقت
مزید اضافہ ہو جائے گا جب اسی قسم کے ڈاک خانے
دوسرے شہروں میں بھی قائم ہوں گے۔ اس سے ایک شہر
سے دوسرے شہر میں رقم کی منتقلی آسان ہو جائے گی۔
اس طرح ملکی اور بیرونی تجارت میں بہت آسانی
ہو جائے گی۔ اس لیے اس بات کے قوی امکانات ہیں
کہ قریب مستقبل میں یہ اسکیم عوام و خواص سب میں
بہت مقبول ہوگی اور ملک کی ترقی کے لیے بھی معاون
و مددگار ثابت ہوگی۔ ●

بقیہ: الزائمرز ــــ ایک لاعلاج مرض

کرنا دشوار ہے کہ مریض کو الزائمرز ہے یا نہیں۔ ڈاکٹروں
کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کی الزائمرز کی وجہ سے موت
واقع ہوئی ہے ان کے پوسٹ مارٹم رپورٹوں سے
یہ ظاہر ہوا ہے کہ ان کے دماغ میں آلمینیم کی مقدار
بہت زیادہ تھی لہٰذا ماہرین کی صلاح ہے کہ آلمینیم کے برتنوں
کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

ضروری اطلاع

یوجنا اردو کا ماہ جنوری
۱۹۹۶ء کا خصوصی شمارہ "سماجی بہبود"
پر مشتمل ہوگا۔

قارئین حضرات اپنے ایجنٹ
سے بک کرا لیں یا درج ذیل
پتا پر رابطہ قائم کریں۔

بزنس مینیجر، پبلی کیشنز ڈویژن
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ڈاکٹر سید علی

عالمی آبادی کی ترقی اور تقسیم

پروفیسر تھامس رابرٹ مالتھس کے مطابق آبادی اور معیار زندگی کے درمیان منفی تعلق پایا جاتا ہے۔ لیکن ایڈون کیانن (Edwin Cannan) کے مطابق "متوازن آبادی" سے کم آبادی والے ممالک میں آبادی اور فی کس آمدنی میں مثبت تعلق پایا جاتا ہے۔ جب آبادی "متوازن آبادی سے" زیادہ ہوجاتی ہے تو فی کس آمدنی میں کمی ہوتی ہے۔ معاشی ترقی اور آبادی میں تبدیلی کے تعلق کو اے۔ جے. کول ('oale) اور ای۔ ایم۔ ہوور (E.M.Hoover) کے نظریۂ آبادی میں (Theory of Demographic Transition) بہتر انداز میں پیش کیا گیا۔ اس نظریہ کے تین مرحلے ہیں۔ معاشی ترقی کے پہلے مرحلے میں شرح پیدائش اور شرح اموات میں زیادتی رہتی ہے اور آبادی کی شرح ترقی کم رہتی ہے۔ اس مرحلہ میں غذا اور طبی سہولتوں میں کمی کی وجہ سے اموات میں زیادتی رہتی ہے۔ ناخواندگی اور لوگوں کے سوچنے کا انداز پرانا و فرسودہ رہنے کی وجہ سے شرح پیدائش میں زیادتی رہتی ہے۔ معاشی ترقی کے دوسرے مرحلے میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیے سے اشیار کی پیداوار میں زیادتی ہونے کے ساتھ ساتھ طبی سہولتوں میں اضافہ ہوتا ہے جس سے لوگوں کی غذائی ضرورت کی تکمیل ہوتی ہے اور مہلک قسم کی بیماریوں پر قابو پالیا جاتا ہے اور شرح اموات گھٹ جاتی ہے۔ لیکن شرح پیدائش میں کمی نہیں ہوتی ہے کیوں کہ آبادی کی اکثریت اس مرحلہ میں بھی ناخواندہ ہوتی ہے اور سماجی قدروں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

شرح اموات میں کمی اور شرح پیدائش میں زیادتی رہنے سے آبادی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے۔ معاشی ترقی کے تیسرے مرحلے میں شرح اموات اور شرح پیدائش گھٹ جاتی ہیں اور آبادی کی شرح ترقی میں کمی ہوجاتی ہے۔ اس مرحلے میں معاشی ترقی اور معیار زندگی بلند رہنے کی وجہ سے شرح اموات میں کمی ہوجاتی ہے۔ سماجی قدروں میں تبدیلی آتی ہے اور لوگوں کے سوچنے کا انداز سائنٹیفک ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خواندگی میں زیادتی رہنے سے شرح پیدائش گھٹ جاتی ہے۔ آج دنیا کے ممالک کو ان تین مرحلوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی شرح پیدائش اور شرح اموات میں زیادتی والے ممالک، شرح اموات کی بہ نسبت شرح پیدائش میں زیادتی والے ممالک اور شرح پیدائش اور شرح اموات میں کمی والے ممالک۔

دنیا کی آبادی کی شرح ترقی

۱۹ویں صدی کے ابتدا میں دنیا کے چند ممالک میں آبادی کی مردم شماری کی گئی۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام تک بھی تیسری دنیا کے کئی ممالک میں مردم شماری کا آغاز نہیں ہوا۔ اس لیے دنیا کے بیشتر ممالک میں حالیہ برسوں میں ہی آبادی کے اعداد و شمار حاصل کیے گئے۔ ۱۹۰۰ء سے پہلے دنیا کی آبادی کے پیمائش مختلف اسکالرز نے مختلف طریقوں سے کی۔ اقوام متحدہ (یو۔ این۔ او) نے مختلف ذرائع سے حاصل کی گئی معلومات کی بنیاد پر ۱۹۲۰ء سے دنیا کی آبادی تخمینہ کا آغاز کیا۔ گوشوارہ نمبر ۱ میں دنیا کی آبادی میں اضافہ کو بتایا گیا ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

۱۰۰۰۰ ق م تا ۱۹۰۰ء کے دوران دنیا کی آبادی کی شرح ترقی

سال	آبادی	آبادی کی شرح ترقی
۱۰۰۰۰ ق م	ایک لاکھ۔ ۱۰ لاکھ	غیر اہم
۵۰۰۰ ق م	۵۰ لاکھ۔ ۲ کروڑ	〃
سنہ ۱ء	۲۵۶ ملین	〃
سنہ ۱۳۰۰ء	۴۰۰ ملین	〃
سنہ ۱۶۵۰ء	۵۰۰ ملین	۰٫۱
سنہ ۱۷۰۰ء	۶۰۰ ملین	۰٫۱
سنہ ۱۷۵۰ء	۷۰۰ ملین	۰٫۳
سنہ ۱۸۰۰ء	۱٫۲ ملین	۰٫۵
سنہ ۱۹۰۰ء	۱٫۶ بلین	۰٫۶
سنہ ۱۹۲۰ء	۱٫۸ بلین	۰٫۶۵
سنہ ۱۹۳۰ء	۲ بلین	۱٫۰۷
سنہ ۱۹۴۰ء	۲٫۲ بلین	۱٫۱۱
سنہ ۱۹۵۰ء	۲٫۵ بلین	۱٫۱۰
سنہ ۱۹۶۰ء	۳ بلین	۱٫۸۶
سنہ ۱۹۷۰ء	۳٫۷ بلین	۲٫۰۶
سنہ ۱۹۸۰ء	۴٫۴ بلین	۱٫۷۷
سنہ ۱۹۹۰ء	۵٫۳ بلین	۱٫۷۴

SOURCE :

1. Ralph Thomlinson, Population Dynamics, Newyork, Random House, 1965, P.13.

مکان نمبر ۵-۹-۵-۵۔ منیام چلکا، نال گونڈا۔ ۵۰۸۰۰۱

2. Jan O.M. Brock and John W. Webb, A Geography of Mankind, Newyork, Mc GrawHill Book Company, 1973, P.450.
3. From 1920 to 1950, United Nations Demographic Year Book, 1962, P 124.
4. 1950 to 1985 Results of tho Demgraphic Estimates as Assessed in 1982, 1950-1985, United Nations, World Population Trends, Population and inter Relations and Population Policies 1983 Monitoring Report, Vol.1, 1985 P.22.
5. United Nations, Word Population Prospects 1990, Newyork, 1991 P.19.

گوشوارہ نمبر۱ سے یہ بات ظاہر ہورہی ہے کہ ۱۶۵۰ء سے پہلے دنیا کی آبادی کی ترقی سست رفتار تھی۔ ۱۰۰۰۰ ق م میں یعنی برفانی دور (Ice-age) کے اختتام پر دنیا کی آبادی ایک لاکھ تا دس لاکھ کے درمیان تھی۔ ۵۰۰۰ ق م میں دنیا کی آبادی بڑھ کر ۵۰ لاکھ اور دو کروڑ کے درمیان ہوگئی۔ یکم عیسوی تا ۱۳۰۰ء کے دوران آبادی ۲۵۷ ملین سے بڑھ کر ۴۰۰ ملین ہوگئی۔ ۱۶۵۰ء تا ۱۹۰۰ء کے درمیان آبادی کی شرح ترقی ۱ر۰ فی صد سے بڑھ کر ۷ر۰ فی صد سالانہ ہوگئی۔ ۱۹۰۰ء کے بعد آبادی کی شرح ترقی میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۰۰ء میں دنیا کی آبادی ۶ر۱ بلین تھی اور آبادی کی شرح ترقی سالانہ ۶ر۰ فی صد تھی۔ ۱۹۵۰ء میں دنیا کی آبادی بڑھ کر ۵ر۲ بلین ہوگئی اور آبادی کی سالانہ شرح ترقی ۱۰ر۱ فی صد ہوگئی۔ ۱۹۷۰ء میں دنیا کی آبادی بڑھ کر ۷ر۳ بلین اور آبادی کی شرح ترقی بڑھ کر ۰۶ر۲ فی صد سالانہ ہوگئی۔ ۱۹۸۰ء میں دنیا کی آبادی ۴ر۴ بلین اور ۱۹۹۰ء میں ۳ر۵ بلین ہوگئی۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۷۰ء کے دوران دنیا کی آبادی میں ۲ر۱ بلین کا اضافہ ہوا (۴۵٪)۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۹۰ء یعنی ۴۰ سال کے عرصہ میں دنیا کی آبادی میں ۱۱۲٪ اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں آبادی کی سالانہ شرح ترقی سب سے زیادہ تھی یعنی ۰۶ر۲ فی صد تھی لیکن ۱۹۸۰ء میں گھٹ کر ۷۷ر۱ فی صد اور ۱۹۹۰ء میں ۷۴ر۱ فی صد ہوگئی۔

ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں آبادی کی شرح ترقی

گوشوارہ نمبر۲ میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں ۱۶۵۰ء تا ۱۹۹۰ء کے درمیان آبادی کی شرح ترقی بتائی گئی ہے۔

گوشوارہ نمبر۲

ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں آبادی کی شرح ترقی

	سالانہ اوسط اضافہ کی شرح	
مدت	ترقی یافتہ ممالک	ترقی پذیر ممالک
۱۶۵۰ء تا ۱۷۵۰ء	۰٫۳۳	۰٫۳۴
۱۷۵۰ء تا ۱۸۰۰ء	۰٫۶۲	۰٫۴۷
۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۰ء	۰٫۸۳	۰٫۳۱
۱۸۵۰ء تا ۱۹۰۰ء	۱٫۰۵	۰٫۵۳
۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۰ء	۰٫۹۲	۰٫۵۲
۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء	۰٫۹۱	۱٫۱۱
۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء	۰٫۸۵	۱٫۲۸
۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۰ء	۰٫۳۵	۱٫۴۴
۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۰ء	۱٫۲۰	۲٫۰۳
۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۰ء	۱٫۰۶	۲٫۳۱
۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۵ء	۰٫۸۹	۲٫۳۹
۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء	۰٫۷۵	۲٫۱۱
۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۵ء	۰٫۶۴	۲٫۰۱
۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء	۰٫۶۰	۱٫۹۴

SOURCE :

1. Up to 1950, Donald J. Bo Gue, Principles of Demography, Newyork, John Willey and Sons, 1969, P.49.
2. From 1950 to 1970 COMPUTED From the Uinited Nations, World Population Prospects as Assessed in 1973, Population Studies No. 60, 1977, P.P. 90-93.
3. From 1970 to 1990 United Nations, World Population Trends, Population and Dev,t Interrelations and Population Policies, 1987, Monitoring Report, Vol.1, NEwyork, 1988, P. 21.

گوشوارہ نمبر۲ سے ظاہر ہے کہ ۱۶۵۰ء تا ۱۷۵۰ء کے دوران ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں آبادی کی سالانہ شرح ترقی بہت ہی کم تھی اور دونوں میں تقریباً یکسانیت تھی۔ ۱۷۵۰ء تا ۱۹۲۰ء کے دوران ترقی پذیر ممالک کی بہ نسبت ترقی یافتہ ممالک میں آبادی کی سالانہ اضافہ کی شرح زیادہ تھی۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد کم ہوگئی۔

ترقی یافتہ ممالک میں آبادی کی سالانہ شرح ترقی ۱۶۵۰ء تا ۱۷۵۰ء کے دوران ۳۳ر۰ فی صد تھی لیکن یہ شرح بڑھ کر ۱۷۵۰ء تا ۱۸۰۰ء کے دوران ۶۲ر۰ فی صد، ۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۰ء کے دوران ۸۳ر۰ فی صد اور ۱۸۵۰ء تا ۱۹۰۰ء کے دوران ۰۵ر۱ فی صد ہوگئی۔ ۱۹۰۰ء تا ۱۹۵۰ء کے دوران یہ شرح مسلسل گھٹ گئی۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۰ء کے دوران آبادی میں اضافہ کی شرح سب سے زیادہ تھی یعنی ۲۰ر۱ فی صد۔ اس کے بعد یہ شرح مسلسل گھٹ کر ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء کے دوران ۶۰ر۰ فی صد ہوگئی۔

ترقی پذیر ممالک میں ۱۶۵۰ء تا ۱۹۲۰ء کے دوران آبادی کی شرح ترقی ایک فی صد سے بھی کم تھی۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۵۰ء کے دوران یہ شرح ۱۱ر۱ فی صد سے بڑھ کر ۴۴ر۱ فی صد ہوگئی۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۷۵ء کے دوران اس میں مسلسل اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۵ء میں آبادی میں اضافہ کی شرح ۳۹ر۲ فی صد تھی لیکن یہ شرح گھٹ کر ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء میں ۱۱ر۲ فی صد، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۵ء میں ۰۱ر۲ فی صد اور ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء میں ۹۴ر۱ فی صد ہوگئی۔

مختلف براعظموں میں آبادی کی شرح ترقی

گوشوارہ نمبر۳ میں ۱۶۵۰ء تا ۱۹۸۵ء کے دوران مختلف براعظموں میں آبادی کی سالانہ شرح ترقی بتائی گئی ہے۔ یوروپ میں ۱۶۵۰ء تا ۱۷۵۰ء کے دوران آبادی کی شرح ترقی کم تھی کیونکہ قحط،

جنگ، بیماری اور فصلوں کی ناکامی کی وجہ سے شرح اموات میں زیادتی تھی۔ اس کے بعد یوروپ میں زرعی اور صنعتی انقلاب آیا جس سے سماجی اور معاشی ترقی ممکن ہو سکی۔ طبی سہولتوں میں اور غذائی اجناس کی سپلائی میں اضافہ کی وجہ سے شرح اموات میں کمی ہو گئی اور آبادی کی شرح ترقی بڑھ گئی۔ لیکن ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء کے دوران عالمی معاشی بحران کی وجہ سے لوگ شادی اور بچوں کی پیدائش کو ملتوی کیے جس کے نتیجہ میں آبادی کی شرح ترقی گھٹ گئی۔ ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۰ء کے دوران دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے آبادی کی شرح ترقی گھٹ کر ۰٫۰۵ فی صد ہو گئی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد یوروپ میں شرح پیدائش میں اضافہ ہوا اور آبادی کی شرح ترقی میں ۱۹۶۵ء تک مسلسل اضافہ ہوا لیکن اس کے بعد کمی ہو گئی۔ یوروپ اور رشیا کی آبادی میں تبدیلی کے رجحانات میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن یوروپ کے بہ نسبت رشیا میں آبادی کی شرح ترقی زیادہ تھی۔

شمالی امریکہ میں ۱۷۵۰ تا ۱۸۵۰ء کے دوران آبادی کی شرح ترقی زیادہ تھی کیوں کہ اس مدت کے دوران یوروپین ممالک سے بڑے پیمانے پر امیگریشن (IMMIGRATION) تھا اور شرح پیدائش میں بھی زیادتی تھی۔ ۱۹ویں صدی کے ابتدا میں بھی شرح ترقی زیادہ تھی لیکن اس کے بعد پہلی عالمی جنگ، امیگریشن میں کمی اور شرح پیدائش میں کمی کی وجہ سے آبادی کی شرح ترقی گھٹ گئی۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء کے دوران آبادی کی شرح ترقی گھٹ کر ۰٫۷۹ فی صد ہو گئی لیکن ۱۹۴۰ء تا ۱۹۶۰ء کے دوران آبادی کی شرح ترقی میں اضافہ ہوا اور اس کے بعد کمی ہو گئی۔

گوشوارہ نمبر ۳
مختلف براعظموں میں آبادی کی سالانہ شرح ترقی (فی صد میں)

سال	یوروپ اور رشیا	شمالی امریکہ	اوشیانیہ	ایشیا	لاطینی امریکہ	افریقہ
۱۶۵۰ء تا ۱۷۵۰ء	۰٫۳۴	۰٫۰۰	۰٫۰۰	۰٫۴۵	۰٫۰۰	۰٫۰۲
۱۷۵۰ء تا ۱۸۰۰ء	۰٫۵۸	۳٫۶۵	۰٫۰۰	۰٫۵۴	۱٫۵۰	۰٫۰۶
۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۰ء	۰٫۷۱	۲٫۹۸	۰٫۰۰	۰٫۳۲	۰٫۹۱	۰٫۰۶
۱۸۵۰ء تا ۱۹۰۰ء	۰٫۸۷	۲٫۳۰	۲٫۲۲	۰٫۴۸	۱٫۳۰	۰٫۵۷
۱۹۰۰ء تا ۱۹۲۰ء	۰٫۷۱	۱٫۸۶	۱٫۹۳	۰٫۴۳	۱٫۸۶	۰٫۴۱
۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء	۰٫۸۹	۱٫۴۴	۱٫۶۸	۱٫۰۵	۱٫۸۲	۱٫۰۸
۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء	۰٫۷۵	۰٫۷۹	۰٫۸۳	۱٫۲۴	۱٫۸۶	۱٫۱۵
۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۰ء	۰٫۰۵	۱٫۳۵	۱٫۴۱	۱٫۳۴	۲٫۱۵	۱٫۶۴

	یوروپ	رشیا			مشرقی ایشیا	مغربی ایشیا		
۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء	۰٫۶۸	۱٫۷۱	۱٫۸۰	۲٫۲۵	۱٫۵۴	۱٫۹۲	۲٫۰۷	۲٫۱۲
۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء	۰٫۸۴	۱٫۷۷	۱٫۷۸	۲٫۱۸	۱٫۵۶	۲٫۳۲	۲٫۷۸	۲٫۲۹
۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۵ء	۱٫۳۹	۰٫۹۱	۱٫۴۹	۲٫۰۹	۱٫۶۲	۲٫۵۱	۲٫۷۵	۲٫۴۸
۱۹۶۵ء تا ۱۹۷۰ء	۰٫۶۲	۱٫۰۰	۱٫۱۲	۱٫۹۷	۱٫۶۳	۲٫۵۳	۲٫۷۰	۲٫۶۰
۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۵ء	۰٫۶۴	۰٫۹۵	۱٫۰۵	۱٫۸۵	۲٫۲۵	۲٫۴۴	۲٫۵۱	۲٫۷۱
۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء	۰٫۴۰	۰٫۹۳	۱٫۰۷	۱٫۶۶	۱٫۴۲	۲٫۳۰	۲٫۳۷	۳٫۰۰
۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۵ء	۰٫۳۳	۰٫۹۵	۰٫۸۹	۱٫۵۰	۱٫۱۴	۲٫۲۰	۲٫۳۰	۳٫۰۱

SOURCE :

1. From 1650 to 1940, Donald J. Bogue, Principles of Demography, Newyork, John Willey and Sons, 1969, P.48.
2. From 1950 to 1970 United Nations World Population Prospects as Assessed in 1973, Population Studies No. 60, Newyork, 1977, P.P. 94-97.
3. From 1970 to 1985, United Nations "World Population Trends, Population and Dev,t Inter Relations and Population Policies, 1983, Monitoring Report, Vol.1, Newyork, 1985, P.23.

اوشیانیہ میں ۱۹ویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں آبادی کی شرح ترقی زیادہ تھی لیکن بیسویں صدی کے ابتدا میں شرح پیدائش میں کمی ہونے کی وجہ سے آبادی کی شرح ترقی گھٹ گئی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد شرح پیدائش اور ایمیگریشن (IMMIGRATION) میں اضافہ سے آبادی کی شرح ترقی بڑھ گئی۔

لاطینی امریکہ میں ۱۸۵۰ء تا ۱۹۶۰ء کے دوران آبادی کی شرح ترقی میں مسلسل اضافہ ہوا۔ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۵ء میں یہ شرح بڑھ کر ۲٫۳ ہو گئی۔

ایشیا میں ۱۶۵۰ء تا ۱۹۲۰ء کے دوران آبادی کی شرح ترقی کم تھی لیکن ۱۹۲۰ء تا ۱۹۷۰ء کے دوران زیادتی رہی اور اس کے بعد کمی ہو گئے۔ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۵ء کے دوران مشرقی ایشیا کے بہ نسبت مغربی ایشیا میں آبادی کی شرح ترقی زیادہ تھی۔

افریقہ میں ۱۶۵۰ء تا ۱۸۰۰ء کے دوران آبادی کی شرح ترقی منفی تھی لیکن اس کے بعد مسلسل اضافہ ہوا۔ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۵ء کے دوران آبادی کی شرح ترقی بڑھ کر ۳٫۰۱ ہو گئی۔

دنیا میں اموات کے رجحانات

گوشوارہ نمبر ۴ میں دنیا کے مختلف علاقوں میں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۹۰ء کے دوران خام شرح

پیدائش (Crude Deathrate) کے رجحانات بتائے گئے ہیں۔ ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء میں دنیا میں خام اموات کی شرح ۱۸٫۸ فی ہزار تھی، ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۵ء میں گھٹ کر ۱۲٫۸ فی ہزار، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۵ء میں ۱۰٫۵ فی ہزار اور ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء ۹٫۸ فی ہزار ہو گئی۔

گوشوارہ نمبر ۴
خام اموات کی شرح (اموات فی ہزار آبادی)

ملک/علاقہ	۱۹۵۰-۵۵	۱۹۷۰-۷۵	۱۹۸۰-۸۵	۱۹۸۵-۹۰
دنیا	۱۸٫۸	۱۲٫۸	۱۰٫۵	۹٫۸
زیادہ ترقی یافتہ علاقے	۱۰٫۱	۹٫۲	۹٫۶	۹٫۸
کم ترقی یافتہ علاقے	۲۳٫۳	۱۴٫۳	۱۰٫۸	۹٫۸
افریقہ	۲۶٫۷	۱۹٫۸	۱۶٫۶	۱۴٫۷
لاطینی امریکہ	۱۴٫۴	۹٫۲	۸٫۲	۷٫۴
شمالی امریکہ	۹٫۴	۹٫۳	۸٫۹	۸٫۷
یوروپ	۱۰٫۹	۱۰٫۴	۱۰٫۹	۱۰٫۷
اوشیانیہ (OCCEANIA)	۱۲٫۴	۹٫۳	۸٫۳	۸٫۱
رشیا (USSR)	۹٫۲	۷٫۹	۹٫۳	۱۰٫۶
وسطی جنوبی ایشیا	۲۵٫۸	۱۷٫۰	[illegible]	۹٫۰

SOURCE :

(1) United Nations Population Studies N0. 60, Newyork, 1977.

(2) United Nations, World Population Prospects 1973, 1984 and 1990, Newyork.

زیادہ ترقی یافتہ علاقے اور کم ترقی یافتہ علاقوں میں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء میں خام اموات کی شرح بالترتیب ۱۰٫۱ اور ۲۳٫۳ فی ہزار تھی لیکن ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۵ء میں گھٹ کر بالترتیب ۹٫۲ اور ۱۴٫۳ فی ہزار، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۵ء میں بالترتیب ۹٫۶ اور ۱۰٫۸ فی ہزار اور ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء میں دونوں علاقوں میں ۹٫۸ فی ہزار ہو گئی

افریقہ میں ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء کے دوران خام اموات کی شرح دنیا میں سب سے زیادہ تھی یعنی ۱۴٫۷ فی ہزار تھی اور لاطینی امریکہ میں یہ سب سے کم تھی یعنی ۷٫۴ فی ہزار تھی۔ اسی مدت کے دوران شمالی امریکہ، یوروپ، اوشیانیہ اور رشیا میں خام اموات کی شرح بالترتیب ۸٫۷، ۱۰٫۷، ۸٫۱ اور ۱۰٫۶ فی ہزار تھی۔

وسطی جنوبی ایشیا میں شرح اموات ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء میں ۲۵٫۸ فی ہزار تھی لیکن ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء میں گھٹ کر ۹ فی ہزار ہو گئی۔

دنیا میں پیدائش کے رجحانات

گوشوارہ نمبر ۵ میں دنیا کے مختلف علاقوں میں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۹۰ء کے دوران خام شرح پیدائش (CRUDE BIRTH RATE) کے رجحانات بتائے گئے ہیں۔

گوشوارہ نمبر ۵
دنیا میں خام شرح پیدائش کے رجحانات

(پیدائش فی ہزار آبادی)

ملک/علاقہ	۱۹۵۰-۱۹۵۵	۱۹۷۵-۱۹۸۰	۱۹۸۵-۱۹۹۰
دنیا	۳۷٫۴	۲۸٫۳	۲۷٫۱
زیادہ ترقی یافتہ علاقے	۲۲٫۶	۱۵٫۶	۱۴٫۵
کم ترقی یافتہ علاقے	۴۴٫۶	۳۲٫۸	۳۱٫۰
افریقہ	۴۹٫۲	۴۶٫۱	۴۴٫۷
لاطینی امریکہ	۴۲٫۵	۳۲٫۴	۲۸٫۷
شمالی امریکہ	۲۴٫۶	۱۵٫۱	۱۵٫۰
ایشیا	۴۲٫۹	۲۹٫۷	۲۷٫۸
یوروپ	۱۹٫۸	۱۴٫۴	۱۲٫۹
اوشیانیہ	۲۷٫۶	۲۰٫۹	۱۹٫۴
رشیا	۲۶٫۳	۱۸٫۳	۱۸٫۴

SOURCE :

United Nations, World Population Prospects 1990, P.25.

دنیا میں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء کے دوران خام پیدائش کی شرح ۳۷٫۴ فی ہزار تھی ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء میں یہ شرح گھٹ کر ۲۸٫۳ فی ہزار اور ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء میں ۲۷٫۱ فی ہزار ہو گئی۔

زیادہ ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ ممالک میں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۵ء کے دوران خام پیدائش کی شرح بالترتیب ۲۲٫۶ فی ہزار اور ۴۴٫۶ فی ہزار تھی لیکن ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۰ء میں گھٹ کر بالترتیب ۱۵٫۶ فی ہزار اور ۳۲٫۸ فی ہزار اور ۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء میں بالترتیب ۱۴٫۵ فی ہزار اور ۳۱ فی ہزار ہو گئی۔

گوشوارہ سے ظاہر ہے کہ افریقہ، لاطینی امریکہ اور ایشیا میں خام شرح پیدائش زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف یوروپ اور شمالی امریکہ میں یہ شرح کم ہے۔

دنیا کی آبادی کی تقسیم

گوشوارہ نمبر ۶ میں ترقی یافتہ ممالک اور

ترقی پذیر ممالک میں دنیا کی آبادی کی تقسیم بتائی گئی ہے۔

گوشوارہ نمبر ۶
دنیا کی آبادی کی تقسیم (فی صد میں)

سال	ترقی یافتہ ممالک	ترقی پذیر ممالک
سنہ ۱۶۵۰ء	۲۰٫۹۱	۷۹٫۰۷
سنہ ۱۷۵۰ء	۲۰٫۶۷	۷۹٫۳۳
سنہ ۱۸۰۰ء	۲۱٫۹۳	۷۸٫۰۷
سنہ ۱۸۵۰ء	۲۶٫۷۰	۷۳٫۳۰
سنہ ۱۹۰۰ء	۳۲٫۰۸	۶۷٫۹۲
سنہ ۱۹۲۰ء	۳۳٫۸۵	۶۶٫۱۵
سنہ ۱۹۳۰ء	۳۳٫۶۰	۶۶٫۴۰
سنہ ۱۹۴۰ء	۳۲٫۴۶	۶۷٫۵۴
سنہ ۱۹۵۰ء	۳۳٫۰۷	۶۶٫۹۳
سنہ ۱۹۶۰ء	۳۱٫۲۹	۶۸٫۷۱
سنہ ۱۹۷۰ء	۲۸٫۳۷	۷۱٫۶۳
سنہ ۱۹۷۵ء	۲۶٫۸۴	۷۳٫۱۶
سنہ ۱۹۸۰ء	۲۵٫۵۶	۷۴٫۴۴
سنہ ۱۹۸۵ء	۲۴٫۲۰	۷۵٫۸۰
سنہ ۱۹۹۰ء	۲۲٫۸۰	۷۷٫۲۰

SOURCE :

(1) 1650- 1900 Based on Estimates by Carrsaunders and Wilcox.

(2) From 1920-1940 United Nations, Demographic Year Book, 1962, P 124.

(3) 1950-1990 United Nations, World Population Prospects, 1990.

گوشوارہ نمبر ۶ سے ظاہر ہے کہ ۱۶۵۰ء میں دنیا کی ۲۱ فی صد آبادی ترقی یافتہ ممالک میں بستی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں یہ فی صد بڑھ کر ۳۴ ہو گیا اس کے بعد ترقی یافتہ ممالک کی آبادی کا فی صد مسلسل گھٹ گیا۔ ۱۹۹۰ء میں دنیا کی آبادی کا صرف ۲۲٫۸۰ فی صد ترقی یافتہ ممالک میں بستا ہے جب کہ ترقی پذیر ممالک میں ۷۷٫۲۰ فی صد بستا ہے۔

عمر کے اعتبار سے دنیا کی آبادی کی تقسیم!

گوشوارہ نمبر ۷ میں عمر کے اعتبار سے دنیا کی آبادی کی تقسیم بتائی گئی ہے۔

گوشوارہ نمبر ۷
۱۹۹۰ء میں عمر کے اعتبار سے دنیا کی آبادی کی تقسیم (فی صد میں)

ملک / علاقہ	۰-۱۴	۱۵-۶۴	۶۵+	جملہ
ترقی یافتہ ممالک	۲۱٫۳۳	۶۶٫۶۰	۱۲٫۰۷	۱۰۰
ترقی پذیر ممالک	۳۵٫۵۶	۵۹٫۹۸	۴٫۴۶	۱۰۰
یو کے (یونائیٹڈ کنگ ڈم)	۱۸٫۹۷	۶۵٫۶۲	۱۵٫۴۱	۱۰۰
سوئیڈن	۱۷٫۳۵	۶۴٫۵۸	۱۸٫۰۷	۱۰۰
یو۔ایس۔ اے	۲۱٫۴۶	۶۵٫۹۷	۱۲٫۵۷	۱۰۰
چین	۲۶٫۴۷	۶۷٫۷۱	۵٫۸۲	۱۰۰
کوریا	۲۶٫۶۵	۶۸٫۷۱	۴٫۵۶	۱۰۰
سری لنکا	۳۲٫۶۰	۶۲٫۲۳	۵٫۱۷	۱۰۰
پاکستان	۴۵٫۶۴	۵۱٫۶۵	۲٫۷۱	۱۰۰
کینیا	۴۹٫۸۷	۴۷٫۲۲	۲٫۹۱	۱۰۰
ہندوستان	۳۶٫۴۹	۵۹٫۰۱	۴٫۵۰	۱۰۰

SOURCE :

United Nations, The Sex and age Distribution of Populaation, 1990.

ترقی پذیر ممالک کی بہ نسبت ترقی یافتہ ممالک میں ۱۵ تا ۶۴ سال کی عمر کی آبادی کے (کارگزار آبادی) کا فی صد زیادہ ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں ۱۵ سال سے کم عمر کی آبادی ترقی پذیر ممالک کی بہ نسبت کم ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں ۶۵ سال سے زیادہ عمر کی آبادی ترقی پذیر ممالک کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

سوئیڈن میں ۱۵ سال سے کم عمر کی آبادی کا فی صد سب سے کم ہے جب کہ کینیا میں یہ فی صد سب سے زیادہ ہے۔ سوئیڈن میں ۶۵ سال سے زیادہ عمر کی آبادی کا فی صد زیادہ ہے جب کہ کینیا اور پاکستان میں یہ فی صد کم ہے۔ کوریا میں کارگزار آبادی کا فی صد سب سے زیادہ ہے جب کہ کینیا میں یہ فی صد سب سے کم ہے۔

آبادی کی گنجانی (Density of Population)

آبادی کی گنجانی آبادی اور زمین کی نسبت کو ظاہر کرتی ہے۔ گوشوارہ نمبر ۸ میں دنیا کی آبادی کی گنجانی بتائی گئی ہے۔

گوشوارہ نمبر ۸
۱۹۸۴ء دنیا کی آبادی کی گنجانی

ملک / علاقہ	دنیا کی آبادی کا فی صد	دنیا کے رقبہ کا فی صد	گنجانی (فی مربع کلو میٹر آبادی)
دنیا	۱۰۰	۱۰۰	۳۹
افریقہ	۱۲٫۱۳	۲۲٫۲۴	۲۱
امریکہ	۱۳٫۶۸	۳۱٫۱۹	۱۷
ایشیا	۵۸٫۸۲	۲۰٫۲۴	۱۱۳

یوروپ	۹٫۴۱	۳٫۶۲	۱۰۱
اوشیانیہ	۰٫۵۰	۶٫۲۶	۳
رشیار	۵٫۲۲	۱۶٫۴۴	۱۳

SOURCE :

United Nations, Demographic Year Book, 1984, P.143.

دنیا کی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ ایشیا میں بستا ہے جب کہ ایشیا میں دنیا کے مجموعی رقبہ کا صرف ۲۴٫۲۰ فی صد ہے۔ اوشیانیہ میں دنیا کی آبادی کا بہت کم فی صد یعنی ۰٫۵۰ فی صد رہتا ہے جب کہ دنیا کی مجموعی رقبہ کا ۶٫۲۶ فی صد اس ملک میں ہے (یوروپ سے بھی زیادہ)

ایشیا میں آبادی کی گنجانی سب سے زیادہ ہے یعنی ۱۱۳ فی مربع کلو میٹر جب کہ اوشیانیہ میں یہ سب سے کم ہے یعنی صرف ۳ فی مربع کلو میٹر۔ آبادی کی گنجانی کے لحاظ سے یوروپ کو دوسرا مقام حاصل ہے۔

دنیا میں شہری آبادی کا تناسب

شہری آبادی میں اضافہ صنعتی ترقی کی نشاندہی کرتا ہے۔ گوشوارہ نمبر ۹ میں دنیا میں شہری آبادی کا تناسب بتایا گیا ہے۔ ۱۹۸۵ء میں دنیا میں شہری آبادی کا فی صد ۴۱٫۵۷ تھا۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ فی صد ۷۲٫۳۸ ہے جب کہ کم ترقی یافتہ ممالک میں یہ صرف ۳۱٫۷۳ ہے۔ ایشیا اور اور افریقہ میں شہری آبادی کا تناسب کم ہے یعنی ۲۸٫۲۶ فی صد اور ۳۲ فی صد بالترتیب ہے۔ یوروپ میں شہری آبادی کا تناسب سب سے زیادہ ہے (۷۳٫۳۷) جب کہ امریکہ میں ۷۱٪ فی صد، اوشیانیہ میں ۷۲٪ فی صد اور رشیا میں ۶۶٫۳۱٪ فی صد ہے۔

گوشوارہ نمبر ۹

۱۹۸۵ء میں دنیا میں شہری آبادی کا تناسب

ملک / علاقہ	شہری آبادی کا فی صد
دنیا	۴۱٫۵۷
زیادہ ترقی یافتہ ممالک	۷۲٫۳۸
کم ترقی یافتہ ممالک	۳۱٫۷۳
افریقہ	۳۲٫۰۰
امریکہ	۷۱٫۰۰
ایشیا	۲۸٫۲۶
یوروپ	۷۳٫۳۷
اوشیانیہ	۷۲٫۰۰
رشیا	۶۶٫۳۱

SOURCE :

World Population Trends, Population and Dev,t and Population Policies, 1983, Monitoring Report, Vol-1 Population Trends, United Nations.

اختتام

مذکورہ بالا حقائق سے ظاہر ہے کہ دنیا کی آبادی ۵٫۳ بلین ہو گئی ہے اور اس میں سالانہ ۱٫۷۴٪ فی صد کا اضافہ ہو رہا ہے۔ افریقہ میں آبادی کی سالانہ شرح ترقی سب سے زیادہ ہے اس کے بعد لاطینی امریکہ اور جنوبی ایشیا کا نمبر آتا ہے۔ یوروپ میں آبادی کی سالانہ شرح ترقی سب سے کم ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ شرح اموات اور شرح پیدائش افریقہ میں ہے۔ زیادہ ترقی یافتہ اور کم ترقی یافتہ ممالک میں شرح اموات میں یکسانیت ہے لیکن شرح پیدائش میں فرق ہونے کی وجہ سے ترقی پذیر ممالک یا کم ترقی یافتہ ممالک کی آبادی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں کارگزار آبادی کا فی صد زیادہ ہے اور ترقی پذیر ممالک میں یہ فیصد کم ہے۔ دنیا کی مجموعی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ ایشیا میں بستا ہے۔ ایشیا میں آبادی کی گنجانی سب سے زیادہ ہے اور اوشیانیہ میں یہ سب سے کم ہے۔ دنیا میں شہری آبادی کا فی صد ۴۱٫۵۷ ہے۔ یوروپ میں شہری آبادی کا فی صد سب سے زیادہ ہے اور ایشیا میں سب سے کم ہے۔

●

بقیہ:۔ اجمل خاں۔ ایک ہمہ گیر شخصیت

۷۔ **رسالہ فی ترکیب الادویہ واستخراج اللغات الطبیہ**:۔ اس میں مرکبات کی تیاری اور مفردات کی پہچان کی تفصیل درج ہے۔

۸۔ **شعر و شاعری**:۔

حکیم اجمل خاں صاحب کو شعر و شاعری سے خاص نسبت تھی۔ شیدا تخلص کرتے تھے۔ ان کے کلام کا کچھ حصہ "دیوان شیدا" کے نام سے جرمنی میں ۱۹۲۶ء میں اور دوسری بار مارچ ۱۹۷۲ء میں ہندوستانی دواخانے کی طرف سے شائع ہوا۔

۱۹۰۴ء میں حکیم صاحب کو قلبی امراض نے اس وقت گھیر لیا جب آپ نے اپنا کافی وقت خلیج ممالک کی خشک آب و ہوا میں گزارا۔ ۱۹۱۱ء میں آپ علاج کے لیے انگلینڈ تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے بہت سے مشہور انگلستانی اسپتالوں کا دورہ کیا اور طب و سیاست کے میدان کی ممتاز ہستیوں سے ملاقات کی۔ ان کا آخری غیر ملکی دورہ ۱۹۲۵ء کا تھا جس نے حکیم صاحب کی سیاسی اور تعلیمی پروگراموں کی ترقی میں خاطر خواہ مدد کی۔ رامپور میں آپ پر ANJINA PECTORIS کا حملہ ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۶۴ سال تھی۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو صبح سوا دو بجے آپ اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔

حکیم صاحب کی موت صرف ایک شخص کی موت نہیں تھی بلکہ ایک تاریخ، روایت اور ایک دور کی موت تھی۔ حکیم صاحب عام انسانی اوصاف کے لحاظ سے عظیم الشان اور اخلاق حسنہ کا پیکر تھے۔ نہایت وضعدار، بامروت اور دوست پرست ہونے کے ساتھ بہترین صلاحیتوں کے مالک تھے۔

حکیم اجمل خاں صاحب کی وفات کے نصف صدی بعد ایک بار پھر ان کی فنی اور قومی عظمت کا اعتراف کیا گیا۔ مسز گاندھی نے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ کا افتتاح کرتے ہوئے حکیم صاحب کو خراج عقیدت پیش کی۔

عادل صدیقی

ہندوستانی ریلوے کے کچھ قابلِ ذکر کارنامے

حصول آزادی کے بعد یوں تو ہر ایک شعبے کی ترقی حیران کن ہے تاہم ہندوستانی ریلوے نے جدید ترین سہولتوں کو عوام کے لیے عام کرنے پر جس قدر زور دیا، اس کے نتیجے میں نہ صرف مسافروں کو سفر کی آسائشیں میسر آسکیں بلکہ مال ڈھونے کی سہولتیں بھی مل سکیں جن کی وجہ سے مال برآمد کرنے اور دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارت کرنے کا عمل آسان ہو سکا۔ نئی اقتصادی پالیسی کے تحت ملک میں جدیدکاری کا جو عمل شروع ہوا ہے، اس کے پیش نظر ریلوے کی ترقیاتی سرگرمیاں دورِ حاضر سے مطابقت رکھتی ہیں۔

ہندوستانی ریلوے نے میٹر گیج اور نیرو گیج یعنی چھوٹی لائن کو بڑی لائن میں بدلنے کے پروگرام پر خاص طور پر زور دیا۔ اس پروگرام کے تحت ۱۹۹۲-۹۳ء میں ۱۵۱۳ کلو میٹر ریلوے لائن اور ۱۹۹۳-۹۴ء میں ۱۶۱۹ کلو میٹر ریلوے لائن کو بڑی لائن میں بدل دیا گیا۔ حصول آزادی کے بعد سے ۱۹۹۰-۹۱ء تک صرف ۲۹۶ کلو میٹر ریلوے لائن کو بڑی لائن میں تبدیل کیا گیا تھا۔ اس کے مقابلے مذکورہ دو برسوں کی کارگزاری انتہائی قابلِ تعریف ہے۔

۱۹۹۱-۹۲ء میں ۱۹۳ کلو میٹر نئی ریلوے لائنیں مکمل کی گئیں جب کہ ۱۹۹۲-۹۳ء اور ۱۹۹۳-۹۴ء میں بالترتیب ۲۴۱ کلو میٹر اور ۲۱ کلو میٹر نئی ریلوے لائنیں تعمیر کی گئیں۔ ۱۹۹۴-۹۵ء میں ۱۵۵ کلو میٹر فاصلے پر نئی ریلوے لائنوں کے بچھانے کا کام شروع کیا گیا۔

۱۹۹۱-۹۲ء میں ۲۵۰ کلو میٹر فاصلے پر دوہری ریلوے لائنیں بچھانے کا کام مکمل کیا گیا۔ ۱۹۹۲-۹۳ء اور ۱۹۹۳-۹۴ء میں بالترتیب ۲۱۴ کلو میٹر اور ۲۹۵ کلو میٹر فاصلے پر دوہری ریلوے لائنیں بچھانے کا کام شروع کیا گیا۔

کونکن ریلوے پروجیکٹ کو شدید مالی بحران کا سامنا تھا مگر اس کام کو بڑی چابکدستی اور ہوشیاری سے مرحلہ وار بنیادوں پر آگے کے لیے بڑھایا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مانگلور۔ اوڈوپی ریلوے سیکشن نیز روحا۔ ویر سیکشن پر ٹریفک چالو کر دیا گیا ہے۔ ان میں سے اول الذکر سیکشن ۴۸ کلو میٹر کا ہے جب کہ موخر الذکر ۴۸ کلو میٹر کا ہے۔ باقی ۶۴۵ کلو میٹر سیکشن کی عملی ترقی تقریباً ۷۰ فی صد ہو چکی ہے۔ اب یہ پروجیکٹ مکمل ہوا چاہتا ہے۔

۱۹۹۱-۹۲ء میں ۶۲۷ کلو میٹر فاصلے پر ریلوں کو بجلی سے چلانے کا انتظام مکمل کیا گیا جب کہ ۱۹۹۲-۹۳ء میں ۳۷۹ کلو میٹر اور ۱۹۹۳-۹۴ء کے دوران ۵۰۵ کلو میٹر فاصلے کو برقایا گیا تاکہ ریلیں بجلی کے انجنوں سے چلائی جا سکیں۔ اب دلی۔ ہوڑہ دلی۔ بمبئی، دلی مدراس، دلی۔ حیدرآباد اور بمبئی۔ ہوڑہ کے ریل راستوں کو برقایا جا چکا ہے اور ان راستوں پر بجلی سے چلنے والی ریل گاڑیاں دوڑ رہی ہیں، اس طرح کل ریلوے لائنوں کے ۱۸ فی صد حصے پر بجلی سے چلنے والی ریل گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ یعنی ۱۱۸۰۷ روٹ کلو میٹر فاصلے پر بجلی کی مدد سے ریلوے گاڑیوں کو چلایا جا رہا ہے۔ بڑی ریلوے لائن کے ۳۱ فی صد راستے پر بجلی سے ریل گاڑیاں چل رہی ہیں۔ ان راستوں سے ریلوں کے ذریعے ڈھوئے جانے والے کل مال و اسباب کے ۵۲ فی صد کے لگ بھگ سامان کی نقل و حمل عمل میں آتی ہے اور ریلوے مسافروں کی کل تعداد کا ۴۲ فی صد حصہ انھیں راستوں پر سفر کرتا ہے۔

بینا۔ کٹنی۔ انوپور سیکشن پر جدیدکاری کے پروگرام کے تحت ۲x ۲۵ kv سسٹم کو رائج کیا گیا ہے۔ اس سے بھاری وزن والے مال و اسباب کو بہت جلدی اور بہت آسانی سے ڈھویا جا سکتا ہے

۱۹۹۳-۹۴ء کے دوران ہندوستانی ریلوے کو ۳۶۲٫۱۱ ملین ٹن سامان کے بھاڑے سے آمدنی ہوئی جو ایک سال قبل کے مقابلے ۱۲ ملین ٹن زیادہ ہے۔ آٹھویں منصوبے کے آغاز پر ہندوستانی ریلوں کو ۳۳۸ ملین ٹن سامان کے بھاڑے سے آمدنی ہو رہی تھی۔

۱۹۹۱-۹۲ء میں ۵۴ نئی ٹرینیں ۱۹۹۲-۹۳ء میں ۱۲۶ نئی ٹرینیں، ۱۹۹۳-۹۴ء میں ۱۲۵ نئی ٹرینیں اور ۱۹۹۴-۹۵ء میں ۳۰ نئی ٹرینیں شروع کی گئیں۔ حضرت نظام الدین / سکندرآباد / بنگلور، حضرت نظام الدین اور مدراس، نئی دہلی۔ ہوڑہ براستہ پٹنہ اور نئی دہلی۔ بھونیشور کے درمیان راجدھانی ٹرینیں چلائی گئیں۔

۱۹۹۲-۹۳ء کے درمیان اور ۱۹۹۳-۹۴ء میں محکمہ ریلوے کے پیداواری یونٹوں کی کارگزاری قابلِ ذکر رہی۔

(۱) وارانسی میں واقع ڈیزل انجن تیار کرنے والے کارخانے میں ۱۹۹۲-۹۳ء میں ۱۵۱۔ اور ۱۹۹۳-۹۴ء میں ۱۵۲۔ ریلوے انجن تیار کیے گئے جب کہ ۱۴۵ انجنوں کی تیاری کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔

(۲) بجلی کے انجنوں کی تیاری کے لیے مشہور چترنجن لوکوموٹو ورکس میں مذکورہ ہر دو سالوں میں بالترتیب ۱۲۵۔ اور ۱۴۰ ریلوے انجن تیار کیے گئے جب کہ

انچارج پبلسٹی دارالعلوم دیوبند، یوپی

نشانہ ۱۲۰۰۔ اور ۱۳۰۰۔ ریل انجنوں کی تیاری کا تھا۔

(۳) ریل ڈبے تیار کرنے کے لیے مشہور اینٹگرل کوچ فیکٹری پیرامبور میں مذکورہ ہر دو برسوں میں بالترتیب ۱۰۲۳۔ اور ۱۰۴۸ ریل ڈبے تیار کیے گئے جب کہ نشانہ ایک ہزار ریل ڈبوں کی تیاری کا تھا۔

(۴) ریل کوچ فیکٹری کپورتھلہ نے ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۱۱۱۵ اور ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۱۰۲۵ ریل ڈبے تیار کیے جب کہ نشانہ ایک ہزار ریل ڈبوں کی تیاری کا مقرر کیا گیا تھا۔ اس فیکٹری نے ایئرکنڈیشنڈ ریل ڈبوں کی تیاری کا کام بھی شروع کر دیا ہے

(۵) پہیوں اور ایکسل کی تیاری سے متعلق پلانٹ واقع بنگلور نے مذکورہ دو سالوں میں بالترتیب ۱۲۹۰۸۰ پہیے اور ۴۹۵۰۳۔ ایکسل اور ۶۹۴۸۴ پہیے اور ۴۷۴۹۸۔ ایکسل تیار کیے۔ اس سے قبل ۹۲-۱۹۹۱ء میں اس پلانٹ میں ۶۹۶۳۲ پہیے اور ۴۳۶۲۴۔ ایکسل تیار کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا گیا تھا۔

جدید کاری کے نظام کے تحت ریلوے نے کوئلہ سے چلنے والے ریل انجنوں کی جگہ اب ڈیزل کے انجنوں اور بجلی کے انجنوں کو رائج کرنے کا پروگرام بنایا ہے، چناں چہ بھاپ سے چلنے والے ریل انجنوں کا استعمال تدریجی طور پر کم کیا جا رہا ہے۔ چناں ۹۳-۱۹۹۲ء اور ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۱۶۰۰ سے زیادہ اسٹیم انجنوں کو راستے سے ہٹا لیا گیا اور اس طرح اب ایک ہزار سے بھی کم اسٹیم انجن اس نظام میں رہ گئے ہیں۔

ریلوے سفر کو محفوظ ترین بنانے کے خیال سے بمبئی میں ایک نیا تجربہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں ڈرائیوروں کو چوکنا کرنے کے لیے وارننگ کا ایک معاون نظام چالو کیا گیا جس سے ڈرائیور کو یہ وارننگ مل جائے کہ اب سگنل آ رہا ہے۔ اس کا تجربہ ابتدا مضافاتی ریل گاڑیوں میں کیا گیا۔

مسافروں کی آسائش اور سہولت کی خاطر اطلاعاتی نظام کو بہتر بنانے پر برابر زور دیا جا رہا ہے۔ مسافروں کو اطلاع بہم پہنچانے والے الیکٹرانک بورڈوں کو مزید ۲۷۱ اہم ریلوے اسٹیشنوں پر شروع کیا جا چکا ہے۔

عوام کی سہولت کی خاطر راجدھانی ٹرینوں میں اے سی ستری ٹیر سروس شروع کی گئی۔

میل اور ایکسپریس گاڑیوں میں نیز پسنجر ٹرینوں میں سامان ڈھونے والے ریل ڈبے میں جگہ کو کچھ عرصہ کے لیے پٹہ پر دینے کا ایک نظام شروع کیا گیا۔ اس کا مقصد یہ ہے تاکہ اس جگہ کا بھرپور اور بہتر استعمال ہو سکے نیز ریلوے کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔

مسافروں کو راجدھانی گاڑیوں میں منرل واٹر بوتلیں فراہم کی جاتی ہیں۔ تمام اہم اسٹیشنوں پر پینے کا صاف اور ٹھنڈا پانی فراہم کرنے کے لیے معمولی سی قیمت پر پانی کے تھیلے فراہم کیے جانے لگے ہیں۔ یکم نومبر ۱۹۹۱ء سے ریلوے لائنوں پر لکڑی کے سلیپروں کا استعمال کم کیا جانے لگا ہے، ان کی جگہ کنکریٹ کے سلیپروں کا استعمال ہو رہا ہے، اس سے لکڑی کو بچانے اور اسے زیادہ مفید کاموں میں لگانے کا موقع مل سکے گا۔

کلکتہ کے شہریوں کی مصیبت کم کرنے کے لیے محکمہ ریلوے زیر زمین میٹرو ریلوے تعمیر کر رہی ہے، یہ ریلوے لائن ۱۶٫۴۵ کلومیٹر پر پھیلائی جا رہی ہے۔ یہ کام مرحلہ واری بنیادوں پر انجام پا رہا ہے۔ تقریباً دس کلومیٹر فاصلے پر ریلوے لائن بچھانے کا کام مکمل ہو چکا ہے، اس پر ٹریفک چالو ہو گیا ہے۔

بھارتی ریلوے کے نظام میں ہر قدم پر جدید کاری دیکھنے کو مل رہی ہے، چناں چہ ریلوے لائنوں کی چوکسی، دیکھ بھال اور مرمت کے سلسلے میں ایک جدید کمپیوٹری نظام لاگو کیا گیا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ ریلوے سفر کو محفوظ بنایا جا سکے اور تخصیص کردہ وسائل سے بھرپور کام لیا جا سکے، جن ریلوے لائنوں پر بھاری معدنیاتی سامان لے جایا جاتا ہے، ان پر دباؤ بڑھ جاتا ہے، اس طرح ریلوے لائنوں کی عمر بڑھانے کے لیے اور انھیں دیرپا بنانے کے لیے ایک نیا میکانکی نظام رائج کیا گیا ہے۔

ریلوے پر لوہے وغیرہ کی کترنوں اور فالتو نیز بے کار قرار دیے گئے سامان کی فروخت سے محکمہ کو بڑی آمدنی ہوتی ہے، اس طرح سے یہ آمدنی ریلوے کے داخلی وسائل بڑھانے میں بے حد معاون ہوگی اس مقصد کے لیے اسکریپ مینجمنٹ گروپ (SCRAP MANAGMENT GROUP) قائم کیا گیا ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء میں اسکریپ کی آمدنی سے ۵۰۴ کروڑ روپے کی آمدنی کی گئی، ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۶۷۹ کروڑ روپے اور ۹۴-۱۹۹۳ء میں ۸۴۳ کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی۔

ریلوے نے مسافروں کے ریزرویشن کے نظام کو کمپیوٹروں کی مدد سے انتہائی سہل اور آرام دہ بنا دیا ہے۔ یہ ہندوستانی ریلوے کا ایک بہت اہم کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں ریزرویشن کا تقریباً ۸۰ فی صد کام اب کمپیوٹری نظام سے ہوتا ہے۔ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۴ء کے درمیانی عرصے میں ۴۶ شہروں کو یہ سہولت دی گئی۔

ریلوے کے محکمے نے اپنی قوت متخیلہ سے بھی بھرپور کام لینے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں سیاحوں کی دلچسپی، تفریح اور آسائش کے لیے ایک رہنمایانہ اسکیم کو بطور تجربہ شروع کیا گیا ہے۔ ہر ہفتے میں دو دن کی چھٹیاں رہتی ہیں، چناں چہ جمعہ کی شام کو ٹرین سے ملک کی سیر و تفریح کے لیے نکل سکتے ہیں، یہ سہولت ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے لیے ہے۔ اس سفر کے دوران قیام، طعام، سیر و تفریح کرانے، مختلف مقامات کی سیر کرانے اور ہر مقام پر ٹرانسپورٹ وغیرہ کے ذریعے مختلف مقامات تک جانے وغیرہ کے انتظامات ہوتے ہیں، ٹرانسپورٹ کا انتظام سیاحت کی ریاستی کارپوریشنوں کے تعاون سے کیا گیا ہے۔ یہ سب سیر و تفریح دو دن تک کرنے اور زندگی کا بھرپور لطف اٹھانے کے بعد سوموار کی صبح کو ڈیوٹی پر لوٹ سکتے ہیں۔ اس سہولت کے ذریعے عام دلچسپی اور سیاحت کے لیے مشہور ۳۸ مقامات تک پہنچ کر سیر و تفریح کی جا سکتی ہے۔

نجی سیاحتی ریل گاڑیاں۔ ایک انوکھا تجربہ

ایک ہزار ملین روپے کی سرمایہ کاری سے عوامی سطح پر مقبول ۵ سرکٹوں پر پانچ ٹورسٹ ٹرینوں کی ایک اسکیم شروع کی گئی ہے، یہ اسکیم پرائیویٹ سیکٹر میں سیاحوں کے لیے ریل گاڑیوں کا بندوبست کرے گی۔ یہ ایک تاریخی حیثیت کا تجربہ ہے۔ یہ اسکیم سرکار کی نئی اقتصادی پالیسی کو سامنے رکھ کر وضع کی گئی ہے۔ ان ٹرینوں کے ذریعے سیاح ملک کے تمام تفریحی اور دلچسپ مقامات کی سیر کر سکیں گے۔ اس اسکیم سے غیر ملکوں سے آکر سرمایہ کاری کرنے والے بہت زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں اس کے ساتھ ہی ہوٹل کی صنعت سے دلچسپی لینے والوں اور دیگر تجارتی گروپوں نے بھی دلچسپی لینی شروع کر دی ہے اس سے ہندوستان میں سیاحت کو فروغ ملے گا۔

سو ہوٹل قائم کیے جانے کی اسکیم

ہندوستانی ریلوے نے سو ہوٹلوں کے

قیام کا ایک منصوبہ وضع کیا ہے اس مقصد کے لیے سو ایسے مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں سیاح بہت دلچسپی کے ساتھ آئیں گے۔ سیاحت کی وزارت نے بھی ان مقامات کی منظوری دے دی ہے سکریٹریوں پر مشتمل کمیٹی نے بھی اس تجویز کو منظوری دے دی ہے۔ بس اب باہر ملکوں کے وہ سرمایہ کار اس سلسلے میں اپنی تجاویز رکھیں گے، جو ہوٹل قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہر ہوٹل میں سو کمروں کا بندوبست کرنے کا پروگرام ہے۔ اس طرح صاف ستھری اور باکفایت جگہ سیاحوں کو ٹھہرنے کے لیے میسر آسکے گی۔ اندرون ملک سیاحت سے شوق رکھنے والے لوگ بھی اس اسکیم سے فائدہ اٹھاسکیں گے۔ ۹۷-۱۹۹۶ء تک ہندوستان میں ۵۰ لاکھ سیاح آنے لگیں گے۔

مالی کارگزاری

سال ۹۲-۱۹۹۱ء میں ریلوے محکمے نے ۳۳۸ میٹرک ٹن مال کے لدان سے بھاڑے کی آمدنی کی، یہ آمدنی ۳۳۳ میٹرک ٹن مال کی ڈھلائی کے نشانے سے زیادہ تھا اور ایک سال قبل کے مقابلے یہ لدان ۲۰ میٹرک ٹن زیادہ تھا۔ سال زیر تبصرہ میں شرح ترقی ۶ فی صد تھی۔ مسافروں کے ٹریفک میں بھی ۵ فی صد اضافہ ہوا۔

۹۳-۱۹۵۲ء میں ریلوے کی مجموعی آمدنی ۱۴۰۲۰ کروڑ روپے تک پہنچ گئی جو ابتدائی تخمینے یعنی ۱۵۹۲۴ کروڑ روپے سے کافی زیادہ رہی۔

ریلوے میں پبلک سیکٹر کے تحت تین پیداواری کارخانے ہیں۔ ایک کا نام ارکون (IRCON) ہے، دوسرے کا رائٹس (RITES) اور تیسرے کا کنکور (CONCOR)۔

ارکون نے ۹۳-۱۹۹۲ء میں ۲۵۴ کروڑ روپے کا کاروبار کیا جو سب سے زیادہ تھا۔ اس کو باہر ملکوں سے ۱۲ بڑے ٹھیکے ملے۔ سات ٹھیکے ملیشیا سے، دو انڈونیشیا سے، دو بنگلہ دیش سے، دو ترکی سے اور ایک سعودی عرب سے۔ اس کمپنی نے ۲۲۷ کروڑ روپے کا باہر ملکوں کے ساتھ کاروبار کیا جو ایک سال قبل کے مقابلے ۴۸ فی صد زیادہ تھا۔

رائٹس کو کیمرون، موزمبیق، تنزانیہ، بوتسوانہ، گھانا، انڈونیشیا، زامبیا، سعودی عرب، ایران اور نیپال سے ٹھیکے ملے۔ یہ کمپنی برابر نفع کمار ہی ہے۔

اپنی کارگزاری کے اعتبار سے اس کا نمبر سب سے اوپر ہے۔

کنکور نے ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۱۰۸۳۰۰ کنٹینروں کی دیکھ بھال کی، جو ایک سال قبل کی کارگزاری کے مقابلے ۴۶ فی صد زیادہ تھے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں اس نے ۱۵۵۸۵ کنٹینروں کو سنبھالا۔ ۹۴-۱۹۹۳ء میں اسے ۲۳۴۰۰۰ کنٹینروں کی دیکھ بھال کی۔ اندرون ملک سامان کی ڈھلائی میں کینٹنر سروس اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

گزشتہ چار برسوں میں محکمہ کو بہت سنگین چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم یہ عرصہ اس لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ ریلوے نے اس مدت میں جدید کاری کے نظام کو رائج کرکے، تیز رفتار گاڑیاں چلاکر نیز مسافروں کے لیے مختلف سہولتوں کا بندوبست کرکے اس نے ریلوے نظام کو قطعی ایک مختلف موڑ دے دیا ہے، یہ تبدیلیاں اگر ایک طرف ہندوستان کے جدید اقتصادی نظام کی نمائندگی کرتی ہیں تو دوسری طرف مسافروں کے آرام و آسائش کی ضامن بن گئی ہیں۔ نئی اقتصادی پالیسی کے نتیجے میں نئی سرمایہ کاری بڑے پیمانے پر ہوگی چناں چہ مستقبل کے ان بڑے چیلنجوں کو جدید کاری اور موثر ٹرانسپورٹ کے نظام کے ذریعے سے ہی پورا کیا جاسکتا ہے۔ ●

بقیہ: نئی نسل اور بدلتی قدریں

پرکشش بناکر پیش کیا جاتا ہے۔ اکثر لوگ عام طور سے اور نئی نسل خاص کر اشتہاروں کے چکاچوندھ اور بھول بھلیاں میں بھٹک جاتی ہے۔ فریب کو حقیقت سمجھ کر اس کے پیچھے دوڑ شروع کردی جاتی ہے۔ اس سے وقت اور پیسوں کی بربادی تو ہوتی ہی ہے، کئی بار نفسیاتی اور ذہنی پریشانیوں میں نئی نسل کو مبتلا ہوجانا پڑتا ہے۔ اور اسکے معنو میت (DEPRESSION) کا شکار نوجوان کسی لائق نہیں رہتا۔ خاندان اور معاشرے کے لیے وہ بوجھ بن جاتا ہے۔ لہٰذا نئی نسل کی صحیح نہج پر تربیت بھی بے حد ضروری ہے تاکہ وہ وقت رہتے تباہ کن نتیجوں سے آگاہ ہوسکے۔ آج کا نوجوان حقائق کا مقابلہ کرنے کے بجائے سینما کے پردے پر نظر آنے والی ڈرامائی شاندار معیار زندگی کو حقیقی سمجھ بیٹھنے کی بھول کرتا ہے اور جب اس کی زندگی ویسی نہیں بن پاتی تو وہ راہِ فرار اختیار کرتا ہے اور نشہ خوری کا عادی ہوجاتا ہے۔ آج نئی نسل کا زبردست مسئلہ نشہ خوری ہوگیا ہے۔ جس سے نجات دلانے کا زبردست کام ہمارے سامنے چیلنج بن کر کھڑا ہوگیا ہے۔

نئی نسل پر جوش کا غلبہ زیادہ کارفرما ہے۔ اسے فوری طور پر نتائج کی برآمدگی چاہیے جو ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس میں ہوش کا فقدان ہوتا جارہا ہے۔ یہ صورت حال بھی خطرناک ہے جس کا تدارک ضروری ہے، جس کی ذمہ داری پرانی نسل پر عائد ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں نئی نسل جس طرح انتشار اور خلفشار میں مبتلا ہے وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہے۔ اس میں اخلاقی گراوٹ آرہی ہے۔ ان کی اس صورت حال پر مصلحین کو توجہ دینی چاہیے۔ لیکن یہ کام نئی نسل کے خود کے امنگوں اور کوششوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا نئی نسل کو پرانی قدروں کی ناقدری نہیں کرنی چاہیے بلکہ بہترین امتزاج کے ساتھ دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا چاہیے اور اس کے لیے صحیح خطوط پر جدوجہد کرنی چاہیے۔ اسے مادیت پرستی اور انتہا پسندی سے دامن بچانا ہوگا۔ زندگی میں سادگی کو بھی پسند کرنا ہوگا، تعلیم پر خصوصی توجہ دینی ہوگی اور تنگ دائروں سے نکل کر نئی اور پرانی قدروں کے درمیان اعتدال قائم کرنا ہوگا۔ اسی میں نئی نسل کا بھی بھلا ہے اور ملک و سماج کا بھی بھلا ہے۔ ●

بقیہ: مولی کی طبی خصوصیات

مولی کھانے والے پر بچھو کے زہر کا اثر نہیں ہوتا یا بے حد کم ہوتا ہے۔ بچھو سے متاثر مقام پر مولی کا پانی ملنے سے بچھو کا زہر زائل ہوجاتا ہے۔

مولی کے استعمال میں یہ لحاظ رہے کہ اسے سرد مزاج لوگ کم استعمال کریں۔ مولی کو کالی مرچ، مصالحہ اور نمک کے بغیر نہ کھائیں۔ مولی کھانے کے بعد تھوڑا گڑ کھا لینے سے یہ جلد ہضم ہوجاتا ہے۔ مولی کھانے کے بعد اس کے چند پتے بھی دھو کر کھالیں تو بہتر ہوگا اس سے منھ کی بدبو ختم ہوجائے گی۔ رات کے وقت مولی کا استعمال نہ کریں۔ ●

جبین انجم

حکیم اجمل خاں ـ ایک ہمہ گیر شخصیت

اجمل خاں کو ملک و قوم کا سچا مسیحا کہا جاتا ہے۔

آپ کے آباؤ اجداد کاشغر (KASHGAR) ترکستان سے بابر کے زمانے میں ہندوستان آئے۔ یہاں انھوں نے سلطنت مغلیہ میں اہم عہدے حاصل کیے لیکن اس کے علاوہ آپ کے آبا و اجداد کو طب سے خاص شغف رہا ہے۔ اس لیے آپ کے خاندان میں مشہور طبیب ہوئے ہیں۔ جن میں ایک اہم نام حکیم شریف خاں کا ہے۔ اسی خاندان کے مشہور طبیب حکیم محمود اصل خاں شاہی طبیب تھے۔ اسی ممتاز خاندان میں حکیم اجمل خاں ۱۷ ارشوال ۱۲۸۸ھ بمطابق ۱۸۶۸ء کو دہلی میں "شریف منزل" میں پیدا ہوئے۔

حکیم اجمل خاں صرف ایک طبیب کی حیثیت سے ہی نہیں جانے جاتے بلکہ ان کا شمار ایک مفکر، سیاسی رہنما، شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بھی کیا جاتا ہے۔ ان تمام وصف کے باوجود آپ بہ حیثیت انسان نہایت پاکیزہ اوصاف کے حامل تھے۔ حکیم صاحب بہت سنجیدہ، شیریں کلام، وضع دار اور متحمل مزاج آدمی تھے۔ غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ اس کے علاوہ منطق، فلسفہ، ادب، طبیعات، حدیث اور تفسیر پر بھی گہری نظر تھی۔ ۱۸۹۲ء میں رامپور ریاست کی جانب سے حکیم صاحب کو وظیفہ دیا گیا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں آپ نے اپنے علمی شوق کی کسی حد تک تکمیل کی، رامپور کے قیام کے دوران آپ نے رامپور کتب خانے سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور یہی وہ دور تھا جب ملک کی قومی تحریکوں پر حکیم اجمل خاں کی نظر گہری ہوئی۔ علی گڑھ تحریک سے ان کی دلچسپی بھی اسی زمانے میں شروع ہوئی۔ رامپور ریاست کی ملازمت کے دوران آپ کی ملاقات ریاست کے امرا و رؤسا سے ہوتی رہتی تھی۔ اس طرح سماج کے اس طبقے میں آپ کی ایک شناخت بن گئی جس نے آگے چل کر آپ کی کافی مدد کی۔

۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ کے قیام کے ساتھ ہی حکیم صاحب کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ تیس برس کی عمر تک آتے آتے حکیم صاحب نے "اکمل الاخبار" کے لیے سیاسی مضامین لکھنے شروع کیے یہ اخبار ۱۸۶۵ء-۱۸۷۰ء کے درمیان شروع ہوا۔ حکیم اجمل خاں نے شروع میں اپنا رشتہ مسلم لیگ سے جوڑا لیکن گاندھی جی اور ڈاکٹر انصاری کے اثر سے آپ کانگریس میں آگئے اور قدیم و جدید کے درمیان رابطے کی ایک زنجیر بن گئے۔ حکیم صاحب ہندو اور مسلمانوں کو ایک ہی قوم سمجھتے تھے اور ان دونوں قوموں کو --- ایک دوسرے سے قریب لانے میں حکیم صاحب نے بہت کام کیا۔ گاندھی جی حکیم صاحب پر بہت بھروسہ کرتے تھے اور ہندو مسلم معاملات میں ان کے مشورے کو لفظ آخر خیال کرتے تھے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہوا تو حکیم صاحب کو صدر چنا گیا۔ اس موقع پر حکیم صاحب نے اپنی تقریر میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ بقر عید پر گائے کی قربانی نہ کریں۔ حکیم صاحب نے یہ مشورہ صرف ہندو مسلم اتحاد کو مدنظر رکھتے ہوئے دیا تھا۔ بعد میں مسلم لیگ نے بھی اس مشورے کی تائید کی اور اس سلسلے میں ایک ریزولوشن پاس کیا۔ حکیم صاحب ہندو مسلم اتحاد پر بہت زور دیتے تھے۔ ان دو بڑے فرقوں کی یک جہتی اور یگانگت کو ہی اپنی زندگی کا ماٰل سمجھتے تھے۔ آپ ہی کی بدولت سوامی شردھانند کو جامع مسجد میں تقریر کرنے کا موقع ملا۔

حکیم صاحب کی ہر دل عزیزی ہندو اور مسلمان دونوں میں یکساں تھی جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نومبر ۱۹۲۱ء میں جب ہندو مہا سبھا کا دہلی میں ایک اجلاس ہوا اس وقت حکیم صاحب کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ یہاں انھوں نے ایک خطبہ پڑھا جس میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا تھا۔

مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں اور سوامی شردھانند کی مقبولیت کے متعلق اپنی سوانح حیات میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "آنجہانی سوامی شردھانند اور حکیم اجمل خاں کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے ہیں"

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں۔

> "کانگریس کے صدر کی حیثیت سے وہ اس کے بڑے مدبر تھے۔ لیکن وہ اس سے کچھ زیادہ بھی تھے۔ انھیں کانگریس کی قیادت میں ایک منفرد مقام حاصل تھا"

حکیم صاحب صرف بہ حیثیت طبیب ہی جانے اور پہچانے نہیں جاتے تھے بلکہ ہر شعبۂ تمدن میں چاہے وہ طب ہو یا علم سیاست، معاشرت ہو یا مذہب یا پھر فنون لطیفہ وہ سب میں مقلد بھی تھے اور مجتہد بھی جس کی مثالیں طبیہ کالج، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل میں آج

ایڈیٹوریل اسسٹنٹ، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔
جب یونانی طب ایک گوشے میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ اس وقت حکیم صاحب نے دہلی سے دور افتادہ گوشے میں طبیہ کالج کی بنیاد رکھی۔ کالج کا سنگ بنیاد لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل نے قرول باغ میں رکھی۔ کالج کے نظام میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے بورڈ آف ٹرسٹیز بنائے گئے جس میں ہر مذہب وملت کے افراد کو شریک کیا گیا۔ کالج کو یونانی اور ویدک طب کی تعلیم سے مزین کیا گیا۔ آپ نے اس کے نصاب میں مناسب تبدیلیاں پیدا کی۔ اس کے علاوہ آپ نے اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا اور میڈیکل کالج (آگرہ) کے نصاب میں شامل کتاب اناٹومی (ANOTOMY) کا اردو ترجمہ تین حصوں میں تقسیم کرکے ہر جماعت کے کورس میں شامل کردیا گیا۔ اس کے علاوہ اس کالج میں آپ نے یونانی اور ویدک طب کی تعلیم بھی جاری کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نقطۂ نظر کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ۱۳ر فروری ۱۹۲۱ء کو مہاتما گاندھی نے طبیہ کالج کی رسم افتتاح ادا کرائی، جو حکیم صاحب کے قوم پرستانہ نقطۂ نگاہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حکیم صاحب ایک ترقی پسند انسان تھے اور یہ رجحان ان کے شعبۂ زندگی پر چھایا ہوا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں شیخ الہند نے "نظامت المعارف" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارے کے سرپرستوں میں حکیم صاحب کا نام بھی شامل تھا۔ یہ ادارہ مشرقی تعلیم کے ساتھ مغربی تعلیم کو بھی ضروری سمجھتا تھا جو حکیم صاحب کے منشار کے عین مطابق تھا۔

جولائی ۱۹۲۶ء میں حکیم صاحب نے طبیہ کالج میں شعبۂ تحقیقات قائم کیا جس کا مقصد جدید انکشافات کی روشنی میں ایک نیا نصاب تشکیل کرنا تھا۔ اس کام کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی اور اس شعبہ میں دیسی بوٹیوں پر ریسرچ کا کام شروع ہوگیا۔ حکیم صاحب ملکی جڑی بوٹیوں کے افعال وخواص کو سائنس کے مطابق بنانا چاہتے تھے اور اس کے ساتھ مرکبات کی تاثیرات کا تجزیہ بھی ضروری خیال کرتے رہے تھے۔ اسی سلسلے میں ۱۹۲۷ء میں طبی کانفرنس رامپور میں منعقد کی گئی جس کی صدارت حکیم صاحب کر رہے تھے۔

طبیہ کالج کے علاوہ آپ نے چوڑی والان دہلی میں زنانہ طبی مدرسہ بھی قائم کیا اور اس کے ساتھ ہی زنانہ امراض کے علاج کے لیے شفاخانہ بھی تیار کیا۔ اس زنانہ طبی مدرسہ میں تعلیم کی صورت یہ تھی کہ اطبار لکچر دیتے تھے اور پردے کے پیچھے طالبات اس لکچر کو سنتی تھیں۔

حکیم صاحب ترک موالات کے حامی نہ تھے لیکن گاندھی جی نے انھیں اپنا ہم خیال بنالیا۔ چنانچہ انھوں نے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ علی گڑھ کے طلبا سے یونیورسٹی چھوڑنے کی اپیل کی یہاں تقریبًا ۳سو طلبا نے حکیم صاحب کی آواز پر لبیک کہا اور ۲۹ر اکتوبر ۱۹۹۲۰ء میں مولانا محمود الحسن نے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ کا افتتاح کیا۔ حکیم اجمل خاں پہلے امیر جامعہ اور مولانا محمد علی جوہر پہلے شیخ الجامعہ مقرر کیے گئے۔ مولانا محمد علی جوہر کہتے ہیں کہ "طبیہ کالج حکیم صاحب کی جوانی کی اولاد ہے اور جامعہ ملیہ بڑھاپے کی" اس میں کوئی شک نہیں کہ جامعہ سے انھیں اولاد کی سی محبت تھی۔ ایک مرتبہ جب جامعہ پر مالی امداد کے تمام راستے مسدود ہوگئے اور ہمدردانِ جامعہ نے اس ادارہ کو بند کرنے کا مشورہ دیا تو حکیم صاحب نے گاندھی جی سے اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ گاندھی جی نے کہا کہ جامعہ کو ہر حال میں چلنا ہوگا میں اس کے لیے بھیک مانگوں گا۔ ان الفاظ کو سن کر حکیم صاحب کو بڑا حوصلہ ملا اور انھوں نے جامعہ کو اس حادثے سے بچالیا۔ اس کے علاوہ جامعہ پر اکثر مالی پریشانیاں آتی رہتی تھیں جنھیں حکم صاحب اپنی حکمت عملی سے دور کرتے رہتے تھے۔ حکیم صاحب کی ـــ زندگی سیاسی، سماجی فنی کارناموں کی ایسی زریں دستاویز ہے جس کا ایک حرف بھی بیکار نہیں۔ ان کے سامنے مختلف مسائل اور مصروفیتیں تھیں جن پر توجہ کے ساتھ ساتھ مالیہ فراہمی کی بھی ضرورت ہوتی تھی۔ حکیم صاحب اپنے تعلقات کے ذریعے کبھی نواب رامپور، بیگم بھوپال اور دوسرے معززین سے پورے کرلیا کرتے تھے اور اس طرح یہ ضرورت پوری ہوجاتی۔ جامعہ کے سلسلے میں بھی آپ اسی طرح کی امداد لیتے اور ادارہ کی ضرورتوں کو پورا کرتے رہتے۔

حکیم صاحب ایک سچے وطن پرست تھے۔ آپ کی طبی خدمات سے متاثر ہوکر برطانوی حکومت نے آپ کو حاذق الملک کا خطاب ۱۹۰۸ء میں دیا۔ لیکن آزادیٔ ہند کے سلسلے میں گاندھی جی کے مشورے سے ۲۰ر مارچ ۱۹۲۰ء کو آپ نے حاذق الملک کا خطاب اور قیصر ہند کا تمغہ واپس کردیا۔ اس کے تھوڑے عرصے کے بعد ہی جمعیۃ العلمار کے اجلاس کانپور میں انھیں مسیح الملک کا خطاب پیش کیا گیا۔

حکیم صاحب کو طبی اور سیاسی مصروفیتوں سے اتنی فرصت نہیں دی کہ وہ تصنیف وتالیف کی طرف زیادہ دھیان دے پاتے لیکن اس کے باوجود بھی دیگر زبانوں میں آپ کی کئی تصنیفات ملتی ہیں جن میں طبی تصنیفات کے علاوہ ایک اردو کا دیوان بھی شامل ہے۔ علاوہ ازیں دکن ریویو میں بوعلی سینا پر مسلسل آپ کے مقالات شائع ہوتے رہتے تھے۔

تصنیفات

۱۔ **حاذق** :۔ حکیم صاحب کی یہ تصنیف دراصل طب یونانی کا خلاصہ اور خاندان اشریفی کا مکمل دستور العلاج ہے۔ اس کتاب میں عبدالمجید خاں، حکیم محمود خاں اعظم اور خود طبیب اعظم حکیم اجمل خاں صاحب کے خاص الخاص نسخے اور طریقہ علاج درج ہیں۔

۲۔ **العقول المرغوب فی الماء المشروب** :۔ یہ ایک رسالہ ہے جس میں پانی کے جزو بدن نہ ہونے پر بحث کی گئی ہے۔ یہ رسالہ عربی زبان میں ہے۔

۳۔ **البیان الحسن بشرالمعجون المسمّے باکسیر البدن** :۔ اس تصنیف میں معجون کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

۴۔ **ایقاظ النعان** :۔ اس رسالے میں انھوں نے حکیم عبدالعزیز لکھنوی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔

۵۔ **التحفة الحامدیه فی العناعة الکلیه** :۔ یہ رسالہ کشتہ جات کی تیاری اور فوائد کے بارے میں ہے۔

۶۔ **الطاعون** :۔ ۱۸۹۶ء میں ہندوستان میں جب طاعون کی وبا پھیلی تب یہ رسالہ تحریر کیا گیا تھا۔

باقی صفحہ ۲۳ پر

ڈاکٹر وزیر حیدر رضوی

الزائمرز ــــ ایک لاعلاج مرض

۱۹۸۰ء کی دہائی کے بعد کچھ ترقی یافتہ ممالک میں الزائمرز کے متعلق معلومات ہو چکی تھی۔ لیکن گزشتہ دنوں جب سے سابق صدر امریکہ رونالڈ ریگن نے یہ انکشاف کیا کہ انھیں "الزائمرز" ہو گیا ہے تبھی سے امریکہ و دیگر ملکوں میں اس کے متعلق تشویش زیادہ بڑھ گئی ہے۔ دنیا کے ممالک نے اس مرض پر تحقیق و تجربہ کرنا شروع کر دیے ہیں۔

آج دنیا نے صحت میں کافی ترقی ہو چکی ہے جس کے باعث بہت سے ایسے مہلک اور جان لیوا امراض پر قابو پا لیا گیا ہے جن سے کافی لوگوں کو موت کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ چیچک، ہیضہ اور ملیریا وغیرہ پر کافی حد تک کنٹرول حاصل ہو چکا ہے۔ جن امراض کو لوگ عتاب الٰہی اور وبا سمجھتے تھے آج تقریباً ان کا صفایا ہو چکا ہے۔ ٹی۔ بی جیسے مہلک مرض کا علاج اب ناممکن نہیں رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علاج و معالجہ کے سلسلے میں دنیا نے کافی ترقی کر لی ہے مگر روز بروز ایک نہ ایک نئے مرض کا انکشاف بھی ہوتا رہتا ہے۔ کچھ دہائی قبل ٹی بی کو لا علاج سمجھا جاتا تھا مگر اب اس کا علاج کافی آسان ہو چکا ہے۔ ابھی ٹی۔ بی پر قابو ملا ہی تھا کہ کینسر نے آگھیرا اور کینسر پر تجربات شروع ہو گئے۔ کینسر پر تو ابھی پوری طرح قابو نہیں پایا جا سکا کہ ایک اور مہلک مرض ایڈز سامنے آکھڑا ہوا۔ تحقیق و تجربہ شروع ہوا۔ اس مرض کے متعلق ساری دنیا کو باخبر کیا جانے لگا اور اس سے بچنے کے طریقے کی ہدایت کا اعلان ہونے لگا۔ کچھ تجربات کامیاب بھی ہوئے۔ بچاؤ کے کچھ طریقے اور کچھ ادویات کا بھی تجربہ کیا گیا۔ اسی درمیان ایک اور نئے مرض نے اپنا قبضہ جمانے کی کوشش شروع کر دی جسے ہم الزائمرز کے نام سے جانتے ہیں۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کے قبل تو لوگوں کو اس کی کوئی معلومات نہ تھی لیکن آج جب کہ ساری دنیا میں اس کی چرچائیں ہیں اور طرح طرح کے تجربات کیے جا رہے ہیں ظاہر ہے کہ اس کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہو گیا ہوگا۔ ایک سروے کے مطابق آج تقریباً ۴۰ لاکھ لوگ امریکہ میں اس مرض سے متاثر ہیں۔ اکثر یہ مرض ۸۰ برس کی عمر تجاوز کرنے والے مرد و عورتوں کو ہوتے ہیں۔ مگر ۶۰ برس کی عمر عبور کرنے والوں کو بھی یہ مرض ہو سکتا ہے۔ اس مرض کا تعلق دماغ سے ہے۔ مریضے کی یادداشت جاتی رہتی ہے۔ اپنی ہی رکھی ہوئی چیز وہ بھول جاتا ہے۔ راستہ چلتے اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ کہاں جا رہے ہو؟ تو وہ جواب نہیں دے سکتا۔ نہ تو اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور نہ ہی وہ یہ جانتا ہے کہ وہ کس لیے جا رہا ہے۔ کیا کرنا ہے کیا کھانا ہے اور کہاں جانا ہے وہ کچھ نہیں جانتا۔

ابتدائی دور میں تو لگتا ہے کہ یہ سب عام بات ہے۔ کیوں کہ اچھے اور صحت مند آدمی بھی کبھی کبھار بہت سی چیزیں بھول جایا کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ مرض اور بڑھتا ہے تو مریض میں انتشار، سستی و جھنجھلاہٹ کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ نوبت آتی ہے کہ وہ اپنے حقیقی رشتہ داروں کو بھی پہچان نہیں پاتا۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر خود مریض پوچھ سکتا ہے کہ یہ کون ہے؟

ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس مرض میں دماغ کے پیچھے کا حصہ سکڑ جاتا ہے۔ اب تک اس مرض کے پیدا ہونے کی وجوہات کا انکشاف نہیں ہو سکا ہے۔ ٹورنٹو یونیورسٹی کی ماہر طب محترمہ بلیک کا کہنا ہے کہ اب تک صدفی صد یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ فلاں شخص کو الزائمرز ہی ہے وہ کہتی ہیں کہ مریض کے موت کے بعد پوسٹ مارٹم کے ذریعہ ہی الزائمرز ہونے کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ محترمہ بلیک کے مطابق یہ مرض خواتین میں زیادہ ہوتا ہے مگر خواتین کا ہارمونز اس مرض کو بڑھنے میں مانع ہوتا ہے۔ اس لیے عورتوں میں یہ مرض زیادہ پائے جانے کے باوجود جلدی پھیلتے نہیں ہے۔ اس کے برعکس مردوں میں الزائمرز کی شکایت نسبتاً کم پائی جاتی ہے مگر مردوں میں یہ مرض بڑی تیزی سے بڑھتا ہے۔ نتیجتاً مرد جلدی کمزور ہو جاتے ہیں اور آخر میں ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ماہر طب محترمہ بلیک نے یہ بھی انکشاف کیا کہ یہ مرض پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ لوگوں میں زیادہ پایا جاتا ہے نیز ان میں بہت تیزی سے پھیلتا بھی ہے۔

کناڈا کے ایک ماہر طب جناب سینڈرا کے مطابق ایسے بہت سے بھلکڑ، سست اور دماغی طور سے کمزور لوگوں پر تجربہ کیا گیا۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لیے کہ انھیں پاگل پن ہے یا الزائمرز یا کچھ اور۔ ان کا کہنا ہے کہ ۲۱۷ لوگوں میں سے بہت تھوڑے ہی لوگوں پر الزائمرز کا مریض ہونے کا شبہ کیا گیا ہے

کینسر، ایڈز و دیگر لاعلاج امراض کی مانند ہی الزائمرز اب تک لاعلاج اور جان لیوا مرض ہے۔ جس کا ابھی تک پوری طرح علاج تو در کنار ابھی معلوم

باقی صفحہ پر

ڈاکٹر گوچے ڈھانڈا اور ڈاکٹر کے۔ ڈی۔ رمیہ

فلیریا کی روک تھام

فلیریا کی بیماری ملک کی بیشتر ریاستوں میں صحت کے لیے زبردست خطرہ بنی ہوئی ہے۔ ملک میں ۱۷۵ اضلاع ایسے ہیں جہاں یہ بیماری پائی جاتی ہے۔ ان اضلاع میں تقریباً ۳۹ کروڑ ۵۰ لاکھ افراد رہتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک کروڑ ۹۰ لاکھ افراد ایسے ہیں جو اس مرض میں گرفتار ہیں۔ تامل ناڈو، آندھرا پردیش، اترپردیش، بہار اور اڑیسہ کے کچھ حصوں میں یہ بیماری زیادہ پائی جاتی ہے۔

۱۹۵۳ء کے بعد سے اس بیماری کا اثر زیادہ بڑھ رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس بیماری سے متاثرہ علاقوں میں آبادی بڑھ رہی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان علاقوں کے لوگوں کا باہر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ صفائی ستھرائی کی حالت بہتر نہ ہونے سے اور اس خطے میں مچھروں کی بہتات سے بھی یہ بیماری بہت زیادہ پھیلتی ہے۔

سماجی اور اقتصادی ذمہ داریاں

اس حقیقت سے سبھی آگاہ ہیں کہ فلیریا کا مرض ان لوگوں پر زبردست سماجی اور اقتصادی بوجھ ڈال دیتا ہے، جو اس مرض سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے بخار ہوتا ہے اور سوجن ہو جاتی ہے، جو بہت دکھتی ہے۔ یہ سوجن جانگھ وغیرہ میں ہوتی ہے۔ مریض دو دن سے لے کر ۱۰ دن تک بے کار ہو جاتا ہے۔ اس سے کام کا نقصان ہوتا ہے اور آمدنی بھی گھٹ جاتی ہے۔ اس مرض کے علاج پر خرچ بھی کافی ہوتا ہے۔ جب یہ مرض پرانا ہو جاتا ہے تب نچلے اعضا میں مستقل سوجن بیٹھ جاتی ہے اور کبھی کبھی فوطوں میں یہ سوجن آجاتی ہے۔

فلیریا کی روک تھام کا قومی پروگرام

فلیریا کی روک تھام کے قومی پروگرام کے تحت جو کہ ۱۹۵۵ء میں شروع کیا گیا تھا، اس بیماری کے پھیلنے کی روک تھام کے لیے بہت سی احتیاطی تدابیر اپنائی گئیں اور متاثرہ لوگوں کا علاج کیا گیا۔ ابھی کچھ دنوں پہلے تک ان شہری علاقوں پر زیادہ زور دیا گیا جہاں کہ اس بیماری کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ آٹھویں منصوبے میں یہ بات سامنے رکھی گئی کہ متاثرہ ریاستوں کے دیہی علاقوں میں بھی ابتدائی حفظان صحت نظام کے ذریعے فلیریا کی روک تھام کے لیے موثر دواؤں کی تقسیم عمل میں لائی جائے۔

تحقیقی مرکز

پانڈیچری میں فلیریا کے جراثیم کی روک تھام اور ان پر تحقیق کے مرکز نے، جسے مختصراً وی۔ سی۔ آر۔ سی کہا جاتا ہے اور جو ۱۹۷۵ء میں قائم کیا گیا تھا، اس مرض کا مقابلہ کرنے کے لیے اہم اقدامات کیے ہیں۔ یہ مرکز طبی کی بھارتی کونسل (انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ) کا مستقل ادارہ ہے۔ یہ امور صحت کی عالمی تنظیم کے تعاون سے کام کرتا ہے اور اس بیماری کے جرثومے یعنی ویکٹر پر قابو پانے کے لیے مربوط طریقوں کی تحقیق کے سلسلے میں کام کرتا ہے۔ گزشتہ ۲۰ برسوں میں اس نے بہت سے پروجیکٹ شروع کیے ہیں اور ایسے نئے طریقے ایجاد کیے ہیں جن سے ان جراثیم کی جانچ ہو سکے اور ان بیماریوں کا پتا لگایا جا سکے جن سے یہ جراثیم پھیلتے ہیں، خاص کر ملیریا اور فلیریا۔ ایسے خاص قسم کے مچھروں پر قابو پانے کے لیے بہت سے کام کیے گئے ہیں، جن سے یہ مرض پھیلتا ہے۔

اس سلسلے کے مطالعوں کی روشنی میں یہ بات طے پا گئی ہے کہ فلیریا کی تشخیص کا واحد طریقہ رات کے وقت لوگوں کے خون کے نمونے حاصل کرنا ہے اور پھر ان کی اس بات کو معلوم کرنے کے لیے جانچ کرنا ہے کہ کیا فلیریا کے جراثیم ہیں؟ عوام چونکہ اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ رات کو انگلی میں سوئی چبھا کر ۲-۳ قطرے خون لے کر اس کی جانچ ہو سکتی ہے، اس لیے وہ اس طرح جانچ کرانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ اگر اس کا ابتدا میں پتا نہ چلا لیا گیا تو اس کے پرانے پڑ جانے کا اندیشہ ہے اور اس وقت اس کا علاج بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

پانڈیچری پروجیکٹ

ویکٹر کنٹرول ریسرچ سینٹر (وی۔ سی۔ آر۔ سی) نے ۱۹۸۰ء میں ایک ۵ سالہ فلیریا کنٹرول ڈیمانسٹریشن پروجیکٹ شروع کیا۔ اس سے قبل اس مرکز نے مچھروں سے پھیلنے والی اس بیماری کی زیادتی والے علاقوں میں اس سلسلے کے بہت سے مطالعے گہرائی کے ساتھ کیے اور اس پر کنٹرول کرنے کے طریقے نکالے۔ اس پروجیکٹ کے تحت ایک مربوط انداز نظر، جس میں کیمیاوی، حیاتیاتی اور ماحولیاتی پہلوؤں کو سامنے رکھا گیا ہو، اپنایا گیا تاکہ مچھروں کی افزائش کو کم کیا جا سکے۔ اس

سے پتا چلا کہ مچھروں کے کاٹنے کی شرح ۲۵۰ فی شب سے گھٹ کر دس فی شب رہ گئی۔ اس سے پانڈیچری میں فلیریا کے معاملات میں کمی آئی۔ چناں چہ پانچ برسوں میں جو بچے پیدا ہوئے ان میں اور مرکز کے زیر انتظام اس علاقے میں فلیریا کے انفکشن کی شرح گھٹی۔ ۱۹۸۶ء میں یہ پروجیکٹ نیشنل فلیریاز کنٹرول پروگرام کی مقامی شاخ کو دے دیا گیا اور اس مرض میں کمی واقع ہونے لگی۔

چیرتلا کا تجربہ

کیرالہ کے علاقے چیرتلا میں بھی فلیریا کے روک تھام کے لیے اس طرح کا ایک پروجیکٹ شروع کیا گیا۔ یہ کام ۱۹۸۶ء میں شروع ہوا تھا۔ اس علاقے میں عوام کو بھی اس پروگرام میں شریک کیا گیا اور بہت سے رضاکار اداروں کو ویکٹر کے کنٹرول سے متعلق سرگرمیوں میں شامل کیا گیا۔ ان کی ہمت افزائی کی گئی اور ایسی مچھلیوں کی پرورش کے لیے انھیں صلاح دی گئی جن سے مچھر بھاگ سکیں۔ تالابوں میں مچھروں کے جرثومے ان مچھلیوں کی پرورش سے بھگانے کا عمل شروع کیا گیا۔ اس طرح ہزاروں تالابوں کو مچھروں سے محفوظ کر لیا گیا اور اسی کے ساتھ لوگوں نے مچھلی پالن سے اچھی آمدنی بھی کی۔ چیرتلا میں بڑے پیمانے پر صحتی مسائل سے آگاہی دینے کے لیے ایک مہم بھی چلائی گئی۔ اسے عوامی مہم کی شکل میں شروع کیا گیا اور اس کا نام "فلیریا کی روک تھام کی مہم" رکھا گیا۔ ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی مہم ہے۔ اس سے اس مرض کی روک تھام میں کافی مدد ملی اور چیرتلا میں ۷ سال سے کم عمر کے بچوں میں اس مرض کے جراثیم نہیں پائے گئے۔ اس طرح کی کوششوں کو اجتماعی کوششوں کی شکل میں جاری رکھا گیا ہے۔ ویکٹر کنٹرول ریسرچ سینٹر اس صورت حال پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور حالات کا برابر جائزہ لے رہا ہے۔

حیاتیاتی کنٹرول

اس مرکز کے ذریعے ان حیاتیاتی عوامل کا پتا لگایا جاتا ہے، جن سے مچھروں کی کسی ایک مقام پر زیادتی کو روکا جا سکے۔ ان کا تعلق ماحول کو سازگار بنانے سے ہے۔ یہ طریقے جراثیم کش دواؤں کے مقابلے سستے ہیں۔ چناں چہ دو جراثیم کا پتا لگایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں میلا لادو تھورائی (تمل ناڈو) میں علاقائی سروے کیے گئے اور یہ پتا چلایا گیا کہ یہ جرثومے مچھروں کی روک تھام میں کس حد تک موثر ہیں۔ ابتدائی نتائج سے یہ واضح ہے کہ بیکٹریائی عوامل ویکٹر کو ۶۰ فی صد تک کم کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں مزید تحقیق جاری ہے۔

وی سی آر سی کیمو تھیراپی کے اثرات کا جائزہ لے رہا ہے۔ یہ کام روایتی دوا ڈائی تھل کاربامیزین سے لیا جا رہا ہے۔ اس کا مختصر نام ڈی ای سی ہے۔ یہ فلیریا کے انفیکشن کے علاج میں موثر دوا ہے۔ اس طرح کی ایک اور دوا کا نام ہے آئیورمیکٹین۔ یہ بھی ڈی ای سی کی طرح سے ہی ہے۔ تامل ناڈو میں ولوپورم۔ راماسوامی پدیات چیئر ضلع کے دیہاتی علاقوں میں ان کے تجربات کیے جا رہے ہیں۔ اس کے ذریعے یہ پتا لگایا جائے گا کہ مندرجہ بالا دو دواؤں میں سے کون سی دوا زیادہ موثر ہے۔ اس سلسلے کے نتائج کا انتظار ہے۔

دوا آمیز نمک

نمک میں ڈی ای سی کی ۰۔۱ - ۰۔۲ فی صد مقدار شامل کر کے فلیریا کی روک تھام موثر طور سے کی جا سکتی ہے۔ وی سی آر سی اس بات کا پتا چلائے گا کہ اس نمک کو کیرالہ کے ایسے علاقوں میں جہاں کہ فلیریا کا مرض بہت زیادہ پایا جاتا ہے، کہاں کہاں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک تجارتی فرم نے اس طرح کے نمک کی تیاری شروع کر دی ہے۔ کیرالہ میں چیرتلا کے عوام میں وی سی آر سی نے پہلے سے ہی شعور پیدا کر دیا ہے۔ اس علاقے میں اس نمک کے استعمال کو رواج دیا جائے گا۔ تامل ناڈو کی حکومت نے اس نمک کی افادیت کے پیش نظر اس کے استعمال کے فروغ کے لیے ایک مہم شروع کی ہے۔ اس کا آغاز وی سی آر سی کے تعاون سے ضلع کنیا کماری سے کیا جا رہا ہے۔

اس مرض کی تشخیص کے لیے بہت سے جدید طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔ اس وقت اس کے لیے مائکرو کوپی کی جو تکنیک رائج ہے، وہ محنت طلب ہے۔ اس کے لیے ڈی این اے نامی نیا طریقہ اپنایا گیا ہے۔ وی سی آر سی اس سلسلے میں رائج نئے طریقوں کی افادیت کا پتا چلا رہا ہے، تاکہ مائکرو کوپی کی جگہ ان کو استعمال میں لایا جا سکے۔ اس سے رات کے وقت خون کے سروے سے چھٹکارا مل سکے گا کیوں کہ ان نئے طریقوں سے دن کے وقت خون کے نمونے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ فلیریا مرض کی روک تھام کے لیے کئی طرح کی کوششوں کو بڑھا دیا جا رہا ہے اور اس کام میں ویکٹر کنٹرول ریسرچ سینٹر کی خدمات بے حد اہم اور مفید ہیں۔ ●

بقیہ: نذیر احمد کے ناول "فسانۂ مبتلا" پر ایک نظر

"فسانۂ مبتلا" میں ہریالی اور غیرت بیگم دو متضاد کرداروں کے سوتن ڈاہ کو نہایت عمدہ طور سے اجاگر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ہریالی کے حسن تکلم کو خاص طور سے پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کی سلیقہ مندی، حسن ترتیب اور آرائش پر بھی بے حد زور دیا گیا ہے۔ ناول کا یہ حصہ جب قاری کی نگاہوں سے گزرتا ہے تو اسے ہریالی سے لامحالہ طور پر ہمدردی ہو جاتی ہے اور غیرت بیگم سے نفرت ہو جاتی ہے اور اس طرح مبتلا کے لیے لوگوں کے ذہن میں ایک طرح کا جذبۂ ترحم ابھر آتا ہے۔ ان کا یہ نقطۂ نظر صاف صاف سامنے آجاتا ہے کہ عورت کے لیے محض خاندانی ہونا ہی گھریلو زندگی کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ سلیقہ مندی، صفائی، شوہر کی مزاج شناسی اور آپسی نباہ کے دیگر طریقوں سے آگاہی بھی ضروری ہوتی ہے۔

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ "فسانۂ مبتلا" درحقیقت اصلاح نسواں کی غرض سے لکھا گیا ناول ہے مگر بیویوں کی اصلاح کرنے کے لیے نذیر احمد نے جس طبقے کا سہارا لیا ہے، ناول کے ختم ہوتے ہوتے وہی کردار مرکزی کردار بن جاتا ہے۔ یوں تو یہ ناول مبتلا کی زندگی کا دردناک افسانہ ہے مگر طوائفوں کے طبقے کی ترجمانی جس انداز میں کی گئی ہے وہ اپنے عہد اور اپنے سماجی اصولوں اور پابندیوں کی روشنی میں کہنا چاہیے کہ نذیر احمد نے اپنے نظام سے بغاوت کر کے اردو ادب کو نیا زاویۂ نظر بخشا۔

مناظر حسین

مولی کی طبّی خصوصیات

مولی قدرت کی عطا کردہ ایک مفید سبزی ہے۔ یہ وہ مشہور و عام عالمی سبزی ہے جس کا استعمال خواص و عوام ذوق و شوق سے کرتے ہیں۔ جڑ والی یہ سبزی جو کئی بیماریوں کا شافی علاج بھی ہے تقریباً ہر ملک میں پیدا کی جاتی ہے۔ اسے سبزیوں کے اونچے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ بعض ملکوں میں تو اس کو شمار پھلوں میں کیا جاتا ہے۔ جگہ جگہ موسمی مولیاں چھلی ہوئی اور قاشیں کی ہوئی نمک، مرچ مسالہ چھڑکا ہوا میلوں، ٹھیلوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں عام طور پر بکتی نظر آتی ہیں اور چھوٹے بڑے اس قدر ذوق و شوق سے کھاتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ یہی سب سے زیادہ مشہور موسمی پھل ہے۔ دوپہر کو بطور سلاد اسے کچا کھانا بے حد مفید تسلیم کیا گیا ہے۔ مولی اچار کی شکل میں اکثر استعمال کی جاتی ہے۔ اکثر لوگ اس کا استعمال پیاز کی جگہ پر کرتے ہیں۔

مولی میں کیلشیم، فاسفورس، وٹامن سی کے علاوہ فولاد (لوہا) بھی خاصی مقدار میں موجود ہے۔ اس کا مزاج گرم و خشک ہے۔ بعض اطبّا نے گرم و تر بھی لکھا ہے۔ خزینۃ الادویہ کے مولف حکیم نجم الغنی صاحب کی رائے میں مولی کا مزاج گرم و تر ہے۔ یہ جسم کی گرمی کو کم کرتی ہے۔ - - - - - - - - جسم کی خشکی کی نافع ہے۔

مولی کے فوائد

مولی خود دیر ہضم ہے لیکن دوسری غذاؤں کو ہضم کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ ہضم کی قوت مولی کی بہ نسبت اس کے پتوں میں زیادہ ہے اور پتوں - - - کے استعمال سے کچھ گرانی یا درد سر کی شکایت بھی نہیں ہوتی۔ مولی کے پتے بطور سلاد استعمال کرنے سے غذا جلد ہضم ہو جاتی ہے۔ دھیان رہے کہ مولی کے پتوں کو استعمال سے قبل پانی سے خوب اچھی طرح صاف کر لینا چاہیے۔

عام طور پر گھروں میں مولی کا اچار تیار کیا جاتا ہے جو بے حد مفید ہے۔ کھانے کے ہمراہ اس کے استعمال سے غذا جلد ہضم ہوتی ہے اور بھوک نہ لگنے کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔ کھانا کھانے سے قبل اسے تھوڑی مقدار میں چکھ لیا جائے تو بھوک کھل کر لگتی ہے اور یہ ذائقے کو بھی درست کرتی ہے۔ اسے کھانے سے بواسیر، تلی دور ہوتی ہے اور رکا ہوا پیشاب کھل جاتا ہے۔ اس کا اچار سرکہ میں بنانا زیادہ مفید ہے۔

مولی کئی بیماریوں کا کافی و شافی علاج ہے۔ بہت سے عوارض جن کے علاج سے ڈاکٹر عاجز رہے مولی کے استعمال سے ٹھیک ہو گئے ایسا بارہا دیکھا گیا ہے۔ چند گھریلو اور آسان نسخے اس ضمن میں تحریر ہیں جو اکثر آزمودہ اور مجرّب ہیں:-

بواسیر (خونی و بادی) کی شکایت میں مولی کو کاٹ کر اس کے قاشوں پر کھانڈ یا مصری لگا کر کھائیں۔ مولی کے پتوں کو سکھا کر ان میں چینی ملا کر لگاتار دو ماہ استعمال کرنے سے بواسیر اور اس کے مسّے ختم ہو جاتے ہیں۔

مولی کی شاخوں سے اس کے پتے الگ کریں۔ اب مولی کا عرق نکال لیں دو تولہ (۱½ چمچہ) کی مقدار میں یہ عرق صبح نہار منہ پی لیں اور ایک گھنٹے تک کوئی چیز نہ کھائیں۔ ایک ماہ کے استعمال سے گردے اور مثانے کی پتھری ریزہ ریزہ ہو کر پیشاب کے راستے سے نکل آئے گی۔

مولی کے پتوں کا پانی نکال کر اس میں قدرے چینی ملا لیں۔ چند ہفتوں کے استعمال سے یرقان (پیلیا) کا مرض جاتا رہے گا۔

مولی ہمیشہ کھانے سے تلّی اور جگر کے امراض ختم ہو جاتے ہیں۔

پیشاب رک جانا، قطرہ قطرہ آنا، پیشاب میں جلن کی شکایات مولی کھاتے رہنے سے ختم ہو جاتی ہیں۔

مولی کا عرق آنکھوں میں دو قطرہ ڈالنے سے دھند، پھولا، جالا اور موتیا بند کو فائدہ ہوتا ہے اور بصارت تیز ہوتی ہے۔

مولی کو کالی مرچ کے ساتھ کھانے سے مسوڑھوں کے امراض اور پایوریا کی شکایت دور ہو جاتی ہے اور دانت مضبوط ہوتے ہیں۔

ایک ماشہ نمک مولی شہد میں ملا کر چاٹنے سے دمہ کے مرض میں افاقہ ہوگا۔

آدھا ماشہ نمک مولی کو گرم پانی کے ہمراہ کھلانے سے زکام و نزلہ کو آرام آجائے گا۔

نمک مولی میں چینی ملا لیں۔ ایک ماشہ ہر روز کھائیں۔ پرانی کھانسی دور ہو جائے گی۔

مولی کے لمبے ٹکڑے کاٹ لیں اور نمک لگا کر ایک پلیٹ میں رکھ لیں۔ اسے رات بھر شبنم میں پڑا رہنے دیں اور صبح نہار منہ کھا لیں۔ بواسیر یقیناً ختم ہو جائے گی۔ فائدہ ہونے تک استعمال کریں۔

باقی صفحہ ۲۶ پر

موضع ٹوٹو، ڈاکخانہ بارا، وایا چاکند، ضلع گیا (بہار) ۸۰۴۴۰۳

سہیل احمد ہلّوری

گرین ہاؤس اثرات اور ہماری زندگی

فضائی آلودگی کا مسئلہ آج ایک بین اقوامی مسئلہ بن چکا ہے۔ انسانی زندگی کے لیے نقصان پیدا کرنے والی گیسیں روز بروز فضا میں داخل ہو رہی ہیں۔ کوئلہ و پٹرولیم کے جلنے سے نکلنے والے دھوئیں، جوہری تنصیبات، تھرمل پاور اور رفریجریٹروں میں استعمال ہونے والی گیسوں کے اخراج سے فضا میں اس کی ایک تہہ جم گئی ہے۔ جس سے کرۂ باد اور کرۂ ارض کے درجۂ حرارت میں اضافہ ہونا لازمی ہے۔ اسے ہی ہم گرین ہاؤس اثرات کے نام سے جانتے ہیں۔

یوں تو برفیلے پہاڑی علاقوں میں کھیتی باڑی اور پودوں کا لگانا بہت ہی مشکل کام ہے۔ لیکن انسان نے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ایسے علاقوں جیسے کشمیر اور لداخ وغیرہ میں سبزی، پھل و پھول وغیرہ کی پیداوار کے لیے ایک خاص طرح کی کیاریاں بنائی ہیں۔ ان کیاریوں کو برف کے اثر سے بچانے کے لیے اس کے اوپر شیشہ یا شیشے جیسی پلاسٹک کا چھت بنایا جاتا ہے۔ اسی کو گرین ہاؤس کہا جاتا ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کی چھتوں کو پار کرکے شمسی شعاعیں ان کیاریوں کے اندر داخل تو ہو جاتی ہیں مگر جو گرمی ان کیاریوں کے اندر مقید ہو جاتی ہے وہ نسبتاً دیر میں ان چھتوں سے خارج ہو پاتی ہے۔ نتیجتاً گرین ہاؤس کافی دیر تک گرم رہتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کیاریوں میں سرد موسم میں بھی موسم گرما کی سبزیاں اور پھل پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح شمسی کوکر بھی کام کرتا ہے۔

سائنس دانوں کے مطابق آج ہماری زمین کا بھی یہی حال ہے۔ فضا میں مسلسل گرمی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ہماری زمین بھی ایک شمسی کوکر بنتی جا رہی ہے۔ کاربن ڈائی آکسائڈ جیسی بہت سی ایسی گیسیں ہیں جن کی زیادتی کی وجہ سے فضا میں اس کی ایک سطح جمتی جا رہی ہے۔ یہ گیسیں سورج کی کرنوں کو تو زمین پر آنے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرتیں مگر جب زمین سے سورج کی گرمی فضا میں لوٹنا چاہتی ہے تو اسے یہ گیسیں روک دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارا کرۂ ارض گرم ہوتا جاتا ہے۔ ایسے حالات پیدا کرنے میں قدرت کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ اس کی پوری ذمہ داری انسان اور صرف انسان پر ہی عائد ہوتی ہے۔ انسان نے ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ اس نے صنعتی اور اقتصادی ترقی و دیگر ضروریات کے لیے اپنے آپ کو جنگلات و پیڑ پودوں پر منحصر کر لیا ہے۔ زمین پر جنگلات و پیڑ پودوں کی کٹائی ہونے لگی اور آج دنیا بھر میں درختوں کی کمی ہو گئی ہے۔ درخت فضائی آلودگی دور کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے کیوں کہ جہاں درختوں و جنگلات سے ہزاروں فوائد ہیں وہیں ان کا ایک خاص عمل یہ ہے کہ درخت کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں اور بدلے میں آکسیجن جیسی گیس جو انسانوں کی رگ حیات ہے ہمیں دیتا ہے۔

جہاں ایک طرف کوئلہ و پٹرولیم و دیگر ایندھن جلانے سے فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے وہیں تھرمل پاور و جوہری تجربات وغیرہ سے فضا میں موجود گیسوں کا توازن بگڑ چکا ہے اور اس عدم توازن کے باعث فطرت کا پورا نظام متاثر ہوا ہے۔ اگر اس مسئلہ پر تیزی سے وقت رہتے کوئی حل نہ نکالا گیا تو اس کے سنگین نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ کیوں کہ ہر سال فضا میں کاربن کی مقدار ۴ر۹ فی صد بڑھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ فضا میں درجۂ حرارت کا بڑھنا دنیا کے لیے تباہی کا باعث ہوگا۔ منجمد برفیلے حصے پگھلیں گے۔ قطب جنوبی (انٹارکٹکا) و قطب شمالی (آرکٹک) کے بڑے برفیلے حصے اگر پگھل گئے تو ساری دنیا کا تباہ ہونا لازمی ہے۔ اگر تھوڑے سے برف ہی پگھل گئے تو سمندری کناروں پر واقع بڑے بڑے شہر و چھوٹے چھوٹے جزیرہ بھی زیر آب ہو جائیں گے۔ گزشتہ صدی میں سمندروں کی سطح میں دس سے بارہ سینٹی میٹر کا اضافہ ہوا ہے۔ برف کے پگھلنے کا ایک اہم معاملہ ابھی حال میں سامنے آیا ہے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ماہرین ماحولیات کے ایک وفد نے ڈاکٹر سید اقبال حسین کی قیادت میں حال ہی میں ہمالیہ کے ۲۸ کلو میٹر لمبے گنگوتری گلیشیر پر تجربہ کیا۔ انھوں نے اپنے تجربہ میں ایک خطرناک عمل کے ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ ہے گنگوتری گلیشیر کا تیزی سے پگھلنا۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آس پاس کے علاقوں کے ڈھابوں میں روزانہ جو دو سو لیٹر کروسن تیل جلتا ہے اس کے ذریعہ پھیلی آلودگی سے ہی یہ برف تیزی سے پگھل رہی ہے۔ مشہور ماہر ماحولیات سندر لال بہوگنا کہتے ہیں کہ کچھ برسوں پہلے انڈین گلیشیر سروے ڈپارٹمنٹ کی رپورٹ میں گنگوتری کو ۱۸ میٹر سالانہ پیچھے کھسکنے کو بتایا گیا تھا۔ مگر تازہ رپورٹوں کے مطابق صرف ۴ برس میں گومکھ آٹھ سو میٹر کھسک گیا ہے۔ شری بہوگنا مانتے ہیں کہ اگر یہی رفتار جاری رہی تو سو سوا سو برسوں میں یہ برف پگھل کر ختم ہو جائے گی اور گنگا خشک ہو جائے گی۔

باقی صفحہ ۱۵ پر

میر حسن روڈ۔ نوبہار گنج۔ ہلور۔ ضلع سدھارتھ نگر۔ یوپی۔ ۲۷۲۱۹۱

بقیہ کور ۳: ریڈ کراس: امن اور بھائی چارے

ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم کام ہم ریڈ کراس کے پیغام کو اسکولوں اور کالجوں میں پہنچا کر کرتے ہیں تاکہ مستقبل کے لیے اچھے شہری تیار کیے جا سکیں۔" آج ہندوستانی ریڈ کراس سوسائٹی کی ملک بھر میں ۶۵۰ شاخیں ہیں جن کے ممبروں کی تعداد ۲۰ کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ اس میں تین کروڑ ممبر اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم ہیں۔ ہندوستانی ریڈ کراس سوسائٹی کے جوائنٹ سکریٹری ایس ہری ہرن کا کہنا ہے کہ "ہم نے پہلی طبی امداد (فرسٹ ایڈ) کے قواعد میں اصلاح کی ہے اور ہم نوجوانوں سے متعلق اپنے پروگراموں پر لگاتار نظر رکھتے ہیں۔"

ہندوستانی ریڈ کراس سوسائٹی کا قیام

ہندوستانی ریڈ کراس سوسائٹی ۱۹۲۰ء میں قائم کی گئی تھی اور موجودہ سال اس کا ڈائمنڈ جوبلی کا سال ہے۔ بہار کے ۱۹۳۴ء کے زلزلے سے لے کر حال ہی میں لاتور میں آئے زلزلے تک مصیبت زدگان کی تعداد کا ریڈ کراس کا شاندار ریکارڈ ہے۔ قبل ازیں ہندوستانی ریڈ کراس نے کوئٹہ کے زلزلے (۱۹۳۵ء)، بنگال اور جنوبی ہند کی بھکمری (۱۹۴۷ء)، تقسیم ہند (۱۹۴۷ء)، ۱۹۵۰ء میں آسام میں آئے زلزلے، ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے پناہ گزینوں کی امداد اور ۱۹۷۲ء کے اڑیسہ کے طوفان، ۱۹۸۴ء کے بھوپال المیہ وغیرہ۔ ہر آفت سماوی میں مصیبت زدگان کو بڑے پیمانے پر راحت و امداد پہنچائی ہے۔

ہندوستانی ریڈ کراس سوسائٹی لڑائی میں زخمی اور بیمار ہونے والوں کی امداد کرتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران سوسائٹی نے یوروپ میں جنگی قیدیوں کو ہر ہفتے ۲۰ ہزار گرم کپڑے ارسال کیے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی بھارت۔ پاک جنگوں میں ہندوستانی کیمپوں میں پاکستانی جنگی قیدیوں کو بھی تحفے تحائف کے پیکٹ باقاعدگی سے تقسیم کیے جاتے تھے۔

ڈاکٹر مکرجی فرماتے ہیں: "حالاں کہ ہم کل کے بہتر شہری بنانے میں مدد کرتے ہیں تاہم ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کا پہلا قدم ماں اور بچے کی دیکھ بھال ہے۔" چناں چہ ہندوستانی ریڈ کراس سوسائٹی ملک بھر میں ماں اور بچے کی حفاظت کے ۳۰ مراکز چلا رہی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ۲۶ خاندانی بہبود کے مراکز بھی کام کر رہے ہیں جہاں نوجوان جوڑوں کو خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں مشورہ دیا جاتا ہے۔

اب ہندوستانی ریڈ کراس سوسائٹی کی خدمات میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اسے چائلڈ ایلاڈ پروگرام یا کیمپ کہا جاتا ہے۔ اس کا آغاز ۱۹۸۷ء میں ہریانہ سے ہوا تھا لیکن بعد میں اتر پردیش اور کلکتہ تک اس کی توسیع کی گئی۔ اس پروگرام کا خاص مقصد بچوں کو اسہال یا دست کی بیماری سے بچانا اور عوام کو اس کے بارے میں مفید اور کارآمد جانکاری دینا ہے۔

ایڈز کی بیماری کے بارے میں پھیلی ہوئی دہشت کے دنوں میں ریڈ کراس کا بلڈ بینک اسپتالوں میں صاف اور محفوظ خون فراہم کر رہا ہے۔ وہ خون کے عطیات حاصل کرنے کا کام بھی کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ نوجوانوں سے رضاکارانہ بنیاد پر خون کے عطیے حاصل کرتا ہے۔

ہندوستانی ریڈ کراس نے اب ایک اور ذمہ داری بھی قبول کی ہے اور یہ ہے گم شدہ لوگوں کی تلاش۔ تشدد کے دور میں خواہ وہ جنگ میں ہو یا دہشت گردی میں، خاندان کے ارکان اکثر عزیز و اقارب سے بچھڑ جاتے ہیں۔ ریڈ کراس کا گم شدہ کی تلاش کرنے والا یونٹ ایسے لوگوں کو تلاش کر کے ان کے اہل خاندان سے ملاتا ہے۔

بین اقوامی سطح پر ریڈ کراس مختلف ملکوں میں مختلف خدمات انجام دیتی ہے جو ان کی اپنی ضرورتوں کے مطابق ہوتی ہیں۔ لبنان میں دیہات میں صحت کی دیکھ بھال کے لیے شفاخانے ہیں، آسٹریلیا اور فلپائن میں سابق فوجیوں کے لیے مشاورتی مراکز ہیں، برطانوی ریڈ کراس گونگے بہرے بچوں کی مدد کرتی ہے۔ سویڈن میں دماغی طور پر معذور بچوں کے لیے موسم ما میں خصوصی کیمپوں کا اہتمام کیا جاتا ہے اور آسٹریلیا میں معذور بچوں کے لیے کئی پروگرام چلائے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ریڈ کراس کے کچھ اور خصوصی پروگرام ہیں۔ بلجیم میں ریڈ کراس کانوں میں بچاؤ کے کام کی ایک ہنگامی خدمت فراہم کرتی ہے۔ اٹلی میں "ہائی وے ایکسیڈینٹ ایمبولینس سروس" ہے، سوئٹزرلینڈ میں تبتی پناہ گزینوں کے لیے ایک مرکز ہے اور تھائی لینڈ میں مار گزیدہ کے علاج کے لیے "سیرم" (تریاق) تیار کیا جاتا ہے جو ساری دنیا کو بھیجا جاتا ہے۔

گزشتہ ۸ مئی کو منائے گئے یوم ریڈ کراس اور ژاں ہنری ڈیونو کے یوم پیدائش کے موقع پر نیدرلینڈز کی ریڈ کراس سوسائٹی نے سماجی بائیکاٹ کے شکار اور طویل عرصے سے بیمار لوگوں کے لیے ژاں ہنری ڈیونو سروس شروع کی ہے۔ آج اگر ہنری ڈیونو زندہ ہوتے تو اس اقدام کو ضرور پسند کرتے۔ ریڈ کراس کئی بار نوبل امن انعام حاصل کر چکی ہے۔ پہلی بار ۱۹۱۷ء میں، دوسری بار ۱۹۴۴ء میں، تیسری بار ۱۹۶۳ء میں اور حال ہی میں ۱۹۹۰ء میں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہنری ڈیونو کی امن اور بھائی چارے کی یہ وراثت ہمیشہ قائم رہے گی۔ ●

بقیہ کور ۲: غریب لوگوں کی فلاح و بہبود کے پروگرام

کے لیے سالانہ ۷۰ روپے کے پریمیم کے سلسلے میں ۵ ہزار روپے کا زندگی بیمہ کیا جائے گا۔ غریب کنبو کے لیے مرکزی حکومت ساری رقم فراہم کرنے والی ریاستی حکومت کے ساتھ پریمیم کا ۲۵ فی صد سبسڈائز کرے گی اور مستفید ہونے والا شخص بقیہ ۵۰ فی صد فراہم کرے گا۔ مشکل سے ۳ روپے یا ۳/۵۰ روپے ماہانہ ادا کر کے دیہی غریب لوگوں کو مدتی بیمے کی سہولت حاصل ہوگی۔ اس اسکیم پر پنچایتوں کے ذریعے عمل درآمد کرایا جائے گا۔ مذکورہ اسکیم کا مقصد دیہی علاقوں میں بڑے پیمانے پر سماجی بیمے اور بچت کو فروغ دینا ہے۔ غریب لوگوں کے لیے ان پروگراموں سے اصلاحات کے سلسلے میں حکومت کے عزم کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ پروگرام غریبی کی سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان پروگراموں کا مقصد ہر ایک کی آنکھ سے آنسو پوچھنا ہے۔ یہی بابائے قوم کا خواب تھا۔ ●

ڈاکٹر حیدر علی خاں

نئی نسل اور بدلتی قدریں

کسی بھی ملک کے روشن مستقبل کا دار و مدار اس کی نئی نسل پر ہوتا ہے۔ پوری قوم بڑی امید کے ساتھ اپنی نئی نسل کے نشو و نما میں منہمک رہتی ہے اور اس کے لیے بڑی بڑی قربانیاں بھی پیش کرتی ہے۔ ملک و قوم کی توقعات نئی نسل سے یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کی بیش بہا قدروں کی حفاظت کرے، اس کو پختگی اور پائداری بخشے اور ان میں مثبت اضافہ کرے۔ مگر زمانہ کی تیز رفتار تبدیلیوں کے چلتے اور بدلتے حالات کے تحت قوم و ملک کی توقعات پوری ہوتی نہیں دکھائی پڑتیں۔ آج نئی نسل اور پرانی قدروں کے بیچ عجیب کشمکش کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنے بزرگوں، ان کی روایتوں اور قدروں کو دیکھتا ہے، دوسری طرف وہ بدلتی ہوئی قدروں، نئے ماحول اور وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتا ہے۔ ایسے عالم میں اسے اعتدال اور توازن سے کام لے کر اپنے لیے راستہ بنانا پڑتا ہے لیکن بعض اوقات یہ کشمکش اتنی شدید ہوتی ہے کہ وہ راستے کا تعین نہیں کر پاتا۔ روایت سے بغاوت کر لیتا ہے، بدلتی ہوئی قدروں کا تجزیہ نہ کر کے وقت کے سیلاب میں بہہ جاتا ہے اور اپنی منزل سے بھٹک جاتا ہے۔

آج ہم اپنی نئی نسل پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ عام طور سے وہ تناؤ، انتشار اور بے اطمینانی کا شکار ہے۔ ان میں سے اکثر کے سامنے زندگی کا کوئی واضح مقصد نہیں ہے۔ اس کے لیے پرانی قدریں اپنی اہمیت کھوتی جا رہی ہیں اور نئی قدریں پرکشش معلوم ہو رہی ہیں مگر نئی قدروں کے محاسن و معائب پر غور کیے بغیر وہ انھیں اپنی زندگی کے لیے ضروری سمجھنے لگی ہے۔ یہ تبدیلی اس قدر اہم ہے کہ اس کا گہرائی سے تجزیہ کیا جانا ضروری ہے۔

آج کا دور مادیت پرستی (MATERIALISM) کا دور ہے۔ روحانی اور اخلاقی قدروں کا زوال تیزی سے ہو رہا ہے۔ آدمی ایک مشین بنتا جا رہا ہے جس میں جذبات، احساسات، انس و محبت، رواداری، بھائی چارگی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس مادیت پرستی کا بے حد اثر ہماری نئی نسل نے قبول کیا ہے۔ وہ زندگی کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ناجائز وسائل اپنانے میں بھی نہیں ہچکتی۔ اس کی خواہشیں اور ضرورتیں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں۔ وہ کسی قیمت پر اپنی خواہشات کی تکمیل کرنا چاہتی ہے۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" کی مصداق اسے اطمینان نصیب نہیں ہے اور زمانے کی رفتار کے ساتھ بے تحاشا دوڑ رہی ہے۔

مادیت پرستی کے اس دور میں گلا کاٹ مقابلوں (CUT THROAT COMPETITION) سے نئی نسل نبرد آزما ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس میں انفرادیت کا جذبہ بے حد کارفرما ہوتا جا رہا ہے۔ خود غرضی اور نفس پرستی کے چلتے باہمی تعاون (CO-OPERATION) اور اجتماعیت کا جذبہ مرتا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں معاشرہ کی روح ہی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ آج ہماری مشرقی قدریں اور روایتیں زوال آمادہ ہیں۔ نئی نسل مغربی تہذیب اور قدروں کی دلدادہ ہے اور اس کی ظاہری آب و تاب سے متاثر ہی نہیں بلکہ مرعوب بھی نظر آتی ہے۔ آج دنیا کے فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں ایک انقلاب آ چکا ہے ٹیلی ویژن کے عالمی چینل ہماری تہذیب اور قدروں کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ویڈیو کلچر ہماری نئی نسل کو گمراہ کر رہا ہے اور نئی نسل پر ایک نشہ طاری ہے۔ وہ اس کے مضر اثرات سے شاید ابھی پوری طرح واقف نہیں ہے۔ جب نشہ ٹوٹے گا تو احساس ہوگا کہ ہم "ماڈرن" بننے کے شوق میں اپنا قیمتی ورثہ کھو آئے ہیں۔ شرم و حیا جو ہماری تہذیب کا زیور تھا وہ نئی نسل سے مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ آج فیشن کا دور ہے۔ آئے دن نئے نئے فیشن سامنے آ رہے ہیں اور نئی نسل اس کی بری طرح شکار ہے۔ نئی نسل اپنی شخصیت کی ترقی و تعمیر کے لیے اخلاق و کردار کی ترقی کی بجائے فیشن پرستی کے ذریعہ اپنی پہچان بنانا چاہتی ہے جو ظاہر ہے کہ ایک بچکانہ سوچ ہے۔ ہمارے ملک میں "سادی زندگی اعلا خیالات" کے مقولہ پر عمل ہوتا رہا ہے۔ لیکن فیشن پرستی نے زندگی کو پر تصنع اور خیالات کو ابتری کی جانب مبذول کیا ہے۔ ابھی حال ہی میں مہاتما گاندھی نے عدم تشدد اور صداقت کے راستے کو تمام مسائل کے حل کا ذریعہ بتایا تھا۔ انھوں نے اس پر تجربہ (EXPERIMENT) و عمل کر کے ہمیں دکھلا بھی دیا ہے۔ ہندوستان کے اس تجربے کو افریقہ اور ایشیا کے کئی ممالک نے کامیابی کے ساتھ آزمایا ہے۔ نئی نسل ان پر کم ہی اعتبار کرتی ہے۔ آج تشدد، آگ زنی، لوٹ مار، جبریہ گھیراؤ وغیرہ تیزی سے نئی نسل کے اسلحے بنتے جا رہے ہیں۔ یہ نئی قدریں یقیناً معاشرے کو تباہی کی جانب لے جائیں گی۔

آج کا زمانہ اشتہار بازی کا زمانہ ہے۔ گھوٹ سے گھوٹی چیز اور کمتریں خیالات کو اشتہار کے ملمع بازی کے ذریعہ بیش قیمت، نایاب اور

باقی صفحہ ۲۶ پر

شری مرلی منوہر ٹاؤن پوسٹ گریجویٹ کالج، بلیا۔ ۲۷۷۰۰۱

عرفان نجمی

کہکشاں اور سیّارے

ہر رات ہم آسمان پر چاند ستارے چمکتے ہوئے دیکھتے ہیں اور جب رات ختم ہو کر صبح کا اجالا پھیلنے لگتا ہے تو مشرق سے سورج کا گولا نمودار ہوتا ہے جو ہمارے دن کو منور کر دیتا ہے۔ شام کو سورج مغرب میں جا کر ڈوب جاتا ہے۔ ابتدا ہی سے سائنس داں اس بات پر غور کرتے چلے آئے ہیں کہ یہ سورج، چاند، ستارے کیا ہیں؟ یہ کس طرح ساری دنیا کو اپنی روشنی سے منور کرتے ہیں۔ ان کی جسامت اور خصوصیت کیا ہے۔ آسمان پر لاکھوں کی تعداد میں ستارے اور سیارے گردش کرتے رہتے ہیں تو پھر یہ آپس میں ٹکرا کیوں نہیں جاتے؟

ہر وہ سچائی جس پر ہمارا یقین ہوتا ہے شروع میں ایک خیال کی طرح ہوتی ہے لیکن جیسے جیسے نئی باتوں کا پتا چلتا ہے۔ ہمارے اس خیال کی صداقت ظاہر ہوتی جاتی۔ یہاں تک کہ ہمارا یقین پختگی کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر ظاہر ہونے والی نئی باتیں ہمارے اس خیال کی تائید نہ کریں تو ہم اس خیال کو غلط سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔

کائنات کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس کے اندر ایسے امکانات خدا نے رکھ دیے ہیں کہ انسان ضرورت پڑنے پر ان کو اپنے استعمال میں لے سکے۔ مثال کے طور پر جس زمین پر ہم رہتے ہیں وہ اپنی جسامت کے اعتبار سے دوسری دنیاؤں کے ایک ذرے کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی مگر اس کے باوجود وہ تمام دوسری دنیاؤں میں سب سے اہم ہے۔ کیوں کہ اس کے اوپر حیرت انگیز طور پر وہ حالات مہیا ہیں جو ہمارے علم کے مطابق اس عظیم کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سائنس نے موجودہ زمانے میں جن نئی دنیاؤں کو دریافت کیا ہے وہ گزرے ہوئے تمام زمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ پراسرار اور حیرت انگیز ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں ہماری معلومات گزشتہ زمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں مگر اس کے باوجود یہ معلومات ایک اعتبار سے غیر تسلی بخش ہیں کیوں کہ آئے دن نت نئی چیزوں کی دریافت ہو رہی ہے۔

دراصل یہ کائنات کچھ ناقابل تغیر اصولوں سے بندھی ہوئی ہے۔ کچھ قوانین ہیں جن کے تحت تمام اجرام سماوی حرکت کر رہے ہیں۔ زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک اٹل نظام کے تحت ظاہر ہوتے نظر آتے ہیں جس کو قانونِ فطرت (LAW OF NATURE) کہتے ہیں۔

ہم جس دنیا کا ذکر کر رہے ہیں اسے انگریزی میں اسپیس ورلڈ (SPACE WORLD) کہتے ہیں۔ اسپیس ورلڈ ایک ایسے لامحدود خلا کا نام ہے جس میں بے انتہا بڑے بڑے آگ کے الاؤ (ستارے) بے شمار تعداد میں اندھا دھند گردش کر رہے ہیں۔ جیسے بے شمار لٹو کسی فرش پر ہماری تمام سواریوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ مسلسل ناچ رہے ہوں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ستارے جب اتنی تیزی کے ساتھ گردش کر رہے ہیں تو آپس میں ٹکرا کیوں نہیں جاتے؟ دراصل قدرت کے بنائے ہوئے اصول ہی ایسے ہیں جو یہ کہکشائیں آپس میں نہیں ٹکراتیں لیکن خلائی سائنس کے مطالعہ کرنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ستاروں کا آپس میں ٹکرا جانا ممکن ہے۔ یہ گردش کسی بھی وقت زبردست ٹکراؤ کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ اس وقت کائنات کی حالت بہت بڑے پیمانے پر اس طرح ہوگی جیسے لاکھوں بمبار ہوائی جہاز بموں سے لدے ہوئے فضا میں اڑ رہے ہوں اور اچانک سب کے سب ٹکرا جائیں۔ ستاروں کا یہ ٹکراؤ کسی بھی طرح حیرت انگیز نہیں ہوگا بلکہ یہ حیرت انگیز ہے کہ وہ آخر ٹکرا کیوں نہیں جاتے۔ چناں ہماری دنیا کے وجود میں آنے کی ایک وجہ سیاروں کا ٹکراؤ بھی ہے۔ اس ٹکراؤ کا اگر ہم بہت بڑے پیمانے پر قیاس کر سکیں تو نہایت آسانی سے یہ بحث سمجھ میں آسکتی ہے۔ کیوں کہ اس ٹکراؤ کا دوسرا نام "قیامت" ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کائنات کا موجودہ نظام ایک روز درہم برہم ہو جائے گا۔ یعنی قیامت کا آنا ہمارے لیے ایک معلوم حقیقت ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج ہم اسے "سماعت" کی حد تک جانتے ہیں اور کل اسے واقعے کی صورت میں دیکھیں گے۔

ہماری آنکھ یا زمین پر نصب دوربین آسمان پر بہت سے ستاروں اور سیاروں (STAR AND PLANETS) کو نہیں دیکھ سکتی ہیئت داں ایک عرصے سے یہ ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ کہکشاؤں سے دور دراز فاصلے پر جو ستارے اور سیارے ہیں وہ کتنے اور کیسے ہیں۔ گرم ہیں یا ٹھنڈے ہیں۔ ہم تو آسمان پر صرف ایک کہکشاں دیکھتے ہیں مگر خلائی تسخیر کے بعد بے شمار کہکشاؤں کا پتا چلا ہے۔

اوپر ہم بتا چکے ہیں کہ ہر ستارہ اور سیارہ گرم یا سرد ہوتا ہے۔ اگر گرم ہے تو ریڈی ایشن خارج کرتا ہے جسے حرارت بھی کہتے ہیں۔ یا روشنی کی لہروں کو خارج کرتا ہے۔ یہی حرارت یا روشنی

پتہ: کرنیل گنج۔ کاغذی محل کانپور ۲۰۸۰۰۱

ہم زمین والوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ مگر یہ فائدہ پہنچانا براہِ راست نہیں ہوتا بلکہ کسی دوسرے ذریعے سے فائدہ پہنچاتی ہے۔ زمین پر موجود اشیا جنگلات، فصلوں، دریاؤں، پہاڑوں، سمندروں اور معدنیات کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ جو ستارے یا سیارے ٹھنڈے ہوتے ہیں ان کی فضا برفانی ہوتی ہے۔ ان کے ذریعے بھی ہم زمین والوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

خلائی دوربین (SPACE TELE SCOPE)

ہی کو ٹائم مشین کہتے ہیں۔ جس میں خلائی سائنس دانوں کو روشنی کی مدد سے ماضی کے سفر پر تقریباً اس جگہ تک بھیجا جائے گا جہاں سے وقت کا آغاز ہوا تھا۔ اس دوربین کے ذریعے محققین سیاروں سے کروڑوں سال قبل خارج ہوئی روشنی دیکھ سکیں گے۔

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ بھلا کروڑوں سال پہلے کی روشنی کیسے دیکھی جا سکتی ہے؟ اس بات کو ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ سورج کی روشنی زمین پر آٹھ منٹ اور ۲۰ سکنڈ کے بعد آتی ہے لہٰذا سورج زمین پر ویسا نظر آتا ہے جیسا کہ وہ آٹھ منٹ اور بیس سکنڈ قبل تھا۔ نہ کہ جیسا وہ اب ہے اور اگر ہم کسی کہکشاں کو دیکھیں تو ہم ایک لحاظ سے کہکشاں کو اس حالت میں دیکھیں گے جیسی وہ ایک ارب (سو کروڑ) سال پہلے تھی۔ کیوں کہ وہ زمین سے ایک ارب نوری سال کے فاصلے پر ہے۔

قارئین اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ نوری سال وقت شماری یعنی دن، ہفتے اور مہینوں کے مجموعے کا نام ہے جیسے ۱۲ مہینوں کا ایک سال ہوتا ہے اسی طرح نوری سال بھی ہوتا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ایسا نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ نوری سال وقت نہیں بلکہ دوری ناپنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک سال میں روشنی جتنی دوری طے کرتی ہے اسے نوری سال کہتے ہیں۔ نوری سال کی ضرورت بہت زیادہ لمبی دوریوں کی پیمائش کے لیے پڑتی ہے۔

نوری سال کے بارے میں بتانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم نوری منٹ اور نوری سکنڈ کے بارے میں بتا دیں۔ ۔ ۔ ۔ ایک سکنڈ میں روشنی تین لاکھ کلو میٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس لیے اسے نوری سکنڈ کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک منٹ میں روشنی کے ذریعے طے کیے گئے فاصلے کو نوری منٹ کہتے ہیں۔ یہ دوری ایک کروڑ ۸۰ لاکھ کلو میٹر ہے۔ زمین سے سورج اور چاند کی دوری نوری سکنڈ میں ناپی جاتی ہے لیکن دیگر سیاروں اور ستاروں کی زمین سے دوری ناپنے کے لیے ہمیں نوری سال کی مدد لینا پڑتی ہے۔

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے کہ شہر سے شہر کی یا ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے کی پیمائش کے لیے تو ہمارے پاس کئی پیمانے ہیں۔ انھیں ہم نے میٹر کلو میٹر یا میل کا نام دے رکھا ہے لیکن زمین سے چاند یا زمین سے کسی ستارے کی دوری ناپنے کے لیے ہمارے پاس کوئی مناسب پیمانہ نہیں تھا۔ اس دوری کو ہم کلو میٹر یا میل کا نام دے سکتے ہیں لیکن وہ اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ یاد نہیں رہ پاتا۔ اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے نوری سال کا سہارا لیا گیا ہے۔

ایک نوری سال چورانوے کھرب ۶۰ ارب کلو میٹر ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ نوری سال سے بڑی سے بڑی دوری ہم آسانی کے ساتھ ناپ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمیں سورج سے زمین کے بیچ کی دوری نکالنا ہے۔ ہمیں پتا ہے کہ سورج سے زمین پر روشنی آٹھ منٹ اور بیس سکنڈ میں آتی ہے۔ لہٰذا سورج سے زمین کی دوری ہم مندرجہ ذیل طریقے سے نکال سکتے ہیں۔

۸ نوری منٹ + ۲۰ سکنڈ = ۵۰۰ نوری سکنڈ

× ۳۰۰۰۰۰ = ۱۵۰۰۰۰۰۰۰ (۱۵ کروڑ کلو میٹر)۔

اسی طرح ہم چاند یا دوسرے سیاروں اور ستاروں کی دوری بھی روشنی سے ناپ سکتے ہیں۔ سورج زمین سے ۱۵ کروڑ کلو میٹر دور ہے تو چاند ایک نوری سکنڈ یعنی تین لاکھ کلو میٹر دور ہے۔

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوری سال کی آج کے زمانے میں کتنی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ہمارے سائنس داں دن بدن نئی نئی کھوجوں میں لگے ہوئے ہیں۔ نئے نئے سیاروں کی دریافت ہو رہی ہے۔ ان سب کے لیے زمین اور اس سے متعلق چیزوں کی دوری کا پتا ہونا بہت ضروری ہے۔ ویسے تو تاروں اور سیاروں سے زمین کی دوری کو اگر کلو میٹر یا میل میں ناپنے یا یاد رکھنے کی کوشش کی جائے تو بہت سی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔ اسی لیے سائنس داں نوری سال کا سہارا لیتے ہیں۔

ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں سے بھی زیادہ حیرت انگیز ایک چیز اور ہوتی ہے۔ اسے "کاسر" کہتے ہیں۔ "کاسر" کائنات میں نہایت ہی دور واقع اجرام ہیں جو کسی بڑے ستارے سے زیادہ وسیع نہیں لگتے۔ لیکن ستاروں یا کہکشاؤں سے سیکڑوں گنا زیادہ تاب کاری پیدا کرتے ہیں اور دس ارب نوری سال کے فاصلے پر واقع کاسر کی روشنی نے جب اپنا بین الکہکشانی سفر شروع کیا اس وقت ہماری زمین آسمانی گرد اور گیس کے سوا کچھ بھی نہیں تھی۔ ہمیں جو اس کی شکل نظر آ رہی ہے وہ دس ارب سال پہلے کی ہے۔ زمین کی فضا کی وجہ سے جو عکس کو گندہ کر دیتی ہے بڑی سے بڑی دوربین بھی دس ارب سال سے آگے نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن خلائی دوربین (SPACE TELE SCOPE) سے جو زمین کی فضا کے اوپر گردش کر رہی ہے ہم متوقع طور پر وہ روشنی بھی دیکھ سکیں گے جو دس ارب ۴ کروڑ نوری سال کی دوری پر ہے۔ یعنی وہ روشنی جس نے عظیم دھماکے کے کچھ عرصہ بعد زمین کی طرف اپنا سفر شروع کیا تھا اور سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ خلائی دوربین کی مدد سے کائنات کی تقریباً ۹۳ فی صد عمر کا مشاہدہ کیا جا سکے گا۔

ماہرین فلکیات کا خیال ہے پراسرار کاسر جن کے بارے میں سمجھا تا ہے کہ وہ قابلِ مشاہدہ کائنات کے سرے پر واقع ہیں وہ دھماکے ہو سکتے ہیں جن کے سبب کہکشائیں بننا شروع ہوئیں اور جیسا کہ ہم نے ابتدا میں کہا تھا کہ خلائی دوربین سے مستقبل میں بھی دیکھنے کا تجربہ کیا جائے گا۔ لہٰذا یہ دوربین کائنات کے انجام کا بھی اندازہ لگائے گی۔ کچھ دن ہوئے ایک ماہر فلکیات نے یہ معلوم کیا تھا کہ عظیم دھماکے کے بعد کائنات مسلسل پھیل رہی ہے اور بیشتر کہکشائیں زمین سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔ دور افتادہ کہکشاؤں میں پھٹتے ہوئے چمک دار ستاروں (سپر نورا) کے مطالعے سے سائنس دانوں کو توقع ہے کہ وہ معلوم کر سکیں گے کشش ثقل کے سبب کائنات کے پھیلاؤ میں کس شرح سے کمی آ رہی ہے۔ اگر یہ شرح بہت قلیل ہے تو سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کائنات ہمیشہ پھیلتی رہے گی لیکن اگر پھیلاؤ میں کمی کی شرح زیادہ ہے تو وہ بالآخر رک جائے گی اور کائنات شاید خود اپنے آپ پر منہدم ہو جائے خلائی دوربین کا خاص مقصد کائنات کا صحیح فاصلوں کے نقشے تیار کرنا ہے۔ ستاروں کے فاصلے کے آج جو تخمینے لگائے جاتے ہیں وہ اصل کے مقابلے

باقی صفحہ ۱۵ پر

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

اقبالؔ کی نظم "سیّد کی لوحِ تربت" ـ ایک مطالعہ

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ محض ایک شاعر نہ تھے بلکہ حکیم نکتہ داں بھی تھے۔ ان کی طبیعت ہمہ جو اور ذہن تخیل پرداز تھا۔ انھوں نے اردو شاعری میں بالخصوص نظم نگاری میں ہیئت کا کوئی نیا تجربہ نہیں کیا بلکہ اس کی تکنیک کو اسی کلاسیکی انداز میں وقار کے ساتھ برقرار رکھا۔ لیکن اپنے منفرد رنگ و آہنگ میں جذبات و احساسات اور واردات کی صداقت اور خیالات و افکار کی حسین آمیزش کرکے اردو نظم کو نئی قوتِ گویائی عطا کی۔ اقبال کی شاعری میں نہ تو روایتی اندازِ بیان ہے نہ فرسودہ خیالات و افکار بلکہ ان کی دور بین نگاہیں ہمیشہ تلاش و جستجو کی طرف مائل نظر آتی ہیں اور ذہن ہمیشہ فکر و فن پر مائل رہتا ہے۔ چوں کہ شاعری کو پیغمبری سے کم نہیں سمجھتے اس لیے جگر سوزی اور عرق ریزی سے فکر کو فن کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ اس لیے اقبالؔ کی نظمیں فکری اعتبار سے کافی وسعت رکھتی ہیں اور فن کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں۔

"سید کی لوحِ تربت" اقبالؔ کے منفرد طرزِ سخن کا شاہکار ہے۔ معنوی اعتبار سے اس نظم میں بے انتہا وسعت ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ نظم "ترکیب بند" میں ہے جو ایک قدیم طرزِ سخن ہے جس پر اقبال کے زمانے میں بہت ہی کم شعرا نے طبع آزمائی کی۔ اس طرح اس طرز کو حیاتِ نو بخشنے کا سہرا بھی اقبال ہی کے سر جاتا ہے۔ یہ نظم چار بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند میں اشعار کی تعداد مختلف ہے لیکن کہیں سے ربط و تسلسل ٹوٹتا ہوا نظر نہیں آتا جو اقبالؔ کی شاعرانہ فنکاری کا ثبوت ہے۔ نظم میں الفاظ کی ترتیب و تنظیم اور ان کا انتخاب اقبالؔ کی قادر الکلامی کو واضح کرتا ہے۔ اقبال نظم کے تعمیری حسن کو دیکھتے ہیں اور خیالات کے ارتقائی عمل کو از اول تا آخر ملحوظ رکھتے ہیں۔

مواد کے لحاظ سے یہ نظم پیغامات پر مشتمل ہے جو سرسید کے توسط سے اقبال عوام الناس تک پہنچاتے ہیں۔ اس نظم کے پس منظر کو دیکھنے کے بعد اقبال کی ندرتِ بیانی اور جدت طرازی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ سرسید خود رہنمائے قوم و ملت تھے ان کے انتقال پر اقبالؔ نے اپنے احساسات کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ یقیناً جدت کا حامل ہے۔ کیوں کہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ کسی عظیم شخصیت کی رحلت پر درد بھرے الفاظ کا استعمال کرکے صدمہ و ماتم کی فضا تیار کی جاتی ہے یا پھر مرنے والے کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر رنج و ملال کے ساتھ اظہار کیا جاتا ہے۔ مگر اقبال نے الگ انداز اپنایا۔ ان کی نظر میں کسی مفکر یا مصلح کی موت پر خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ انھوں نے جن خیالات و نظریات کو عام کرنے میں عمر صرف کی یا جن خدمات کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اسے عام کیا جائے اور ان کی زندگی سے سبق لے کر انفرادی اور اجتماعی زندگی کو منور کیا جائے۔ چناں چہ اقبال اس نظم میں سرسید کی موت پر نہ تو آنسو بہاتے ہیں اور نہ ہی اس قدر افسردہ ہوتے ہیں کہ پژمردگی چھا جائے۔ بلکہ اقبالؔ موت کو قدرت کا اٹل فیصلہ تصور کرتے ہیں جس سے کسی کو رستگاری نہیں۔ لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو مشعلِ راہ بن کر آتی ہیں۔ سرسید بھی انھیں میں سے ایک تھے۔ چناں چہ ان کے نقشِ قدم پر چلنا ہی سب سے بڑا خراجِ عقیدت ہو سکتا ہے اور چوں کہ اقبال خود بھی اپنے سینے میں دھڑکتا دل رکھتے تھے اور قوم و ملک کی فلاح و بہبود کے خواہاں تھے اسی لیے اس طرزِ فکر کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔

ان تفصیلات سے اس نظم کی فکری اور فنی رفعت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اقبال نظم کی ابتدا بھی نہایت ہی موثر انداز میں جدت کے ساتھ یوں کرتے ہیں۔ ؎

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر
اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر

اس شعر میں تناسب لفظی کا بہترین استعمال بھی ہے اور تمام الفاظ اپنی جگہ پر بہت ہی POWERFUL بھی ہیں، ان کے اندر ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے مثلاً اس شعر میں ایک طرف تو روح کو طائر سے تشبیہ دے کر اور اسے تارِ نفس کا اسیر بتا کر زندگی کے عدمِ استحکام کو واضح کرنا چاہا ہے اور دوسری طرف اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ تو ابھی زندگی رکھتا ہے اس لیے موجودہ لمحات کو غنیمت سمجھ۔ (اقبالؔ نے زندگی کے متعلق دوسری نظموں میں بھی اس کی وضاحت بڑی خوب صورتی سے کی ہے) بعد ازاں صبر و استقلال کے ثمرات دکھاتے ہوئے انسان کو اخلاص اور حرکت و عمل پر آمادہ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ آج بھی سرسید کی قبر سے یہ آوازیں تمہیں پکارتی ہیں کہ اے قوم کے مدبر، مفکرو اور شاعرو اپنی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو تاکہ حالات سازگار ہوں۔ اگر تم عالمِ دین ہو تو ہرگز اپنی قوم کو ترکِ دنیا کا درس نہ دینا کیوں کہ یہ اصولِ دین کے خلاف ہے چوں کہ تسخیرِ کائنات

باقی صفحہ ۴۴ پر

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ـ ۱۱۰۰۰۷

شاہد اختر انصاری

نذیر احمد کے ناول "فسانۂ مبتلا" پر ایک نظر

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوستانی تہذیب و تمدن اور معاشرہ انتشار، بدحالی اور لامرکزیت کا شکار تھا۔ زندگی اپنے مرکزِ اصلی سے ہٹ چکی تھی، وہ جذبے اور خلوص جو ملتوں اور قوموں کو مہمیز کرتے ہیں، سرد پڑ چکے تھے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاح کی ضرورت تھی۔ تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن کے وہ عناصر جو اب مفلوج ہو چکے تھے اور دم واپسیں کے شمار تھے، ان کی رگوں میں زندگی کا خون اور حرارت پیدا کرنے کی سخت ضرورت تھی یوں تو پورا ہندوستانی سماج بربادی کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ مگر مسلمان از بسکہ نحیف و نزار تھے۔ ان حالات میں سر سید اور ان کے حلقۂ احباب نے مسلمانوں کی اشک شوئی کا خوشگوار فریضہ انجام دیا اور ان کی اصلاح و تربیت کا بیڑا اٹھایا۔ نذیر احمد کے ناول بھی اسی پس منظر کی نشاندہی کرتے ہیں۔

نذیر احمد نے پہلا ناول "مرآۃ العروس" کے نام سے ۱۸۶۹ء میں تصنیف کیا، جس میں ایک شریف مسلم گھرانے کی زندگی کو پیش کیا گیا اور کچھ خانگی مسائل سے بحث کی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے کئی اور ناول ہیں جو سماجی، اصلاحی اور معاشرتی بیداری کے جذبے کے تیئں لکھے گئے ہیں۔

اسی سلسلے کا ایک اور اہم ناول "محصنات" یا "فسانۂ مبتلا" ہے، جس کا سن اشاعت ۱۸۸۵ء بتایا جاتا ہے۔ اس کے کئی اڈیشنوں پر اس کی تصنیف کا سال بھی دیا ہوا ہے۔ احسن مارہروی نے بھی اس کا سن تصنیف یہی دیا ہے[1]۔ اس پر بھی وہی اصلاحی اور تبلیغی رنگ غالب ہے۔ مسلم سماج جس قسم کی رسمی اور مذہبی برائیوں میں اسیر ہے۔ اس کا اس ناول میں تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

یوں تو بنیادی طور پر یہ ناول تعدد ازواج، معاشرتی اور تعلیمی مسائل، مسلم سماج کی تہذیبی برائیاں، عورتوں کے مسائل اور حقوق العباد جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ مگر ضمنی طور پر اس میں ایک ایسے طبقے کا ذکر کیا گیا ہے جن کا اپنا ایک مخصوص سماج اور مخصوص نظام حیات تھا۔ ضمنی حیثیت ہونے کے باوجود ناول کے اختتام پر دوسرے تمام بنیادی مسائل پس منظر میں پڑ جاتے ہیں اور یہ بدنام طبقہ مرکزی حیثیت اختیار کر کے اپنی اہمیت منواتا نظر آتا ہے۔ طوائفوں کے اس طبقے نے اس زمانہ میں زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ناولوں میں ان کے لیے صفوں کی گنجائش نکالی جانے لگی۔ ڈاکٹر وی۔ پی۔ سوری نے لکھا ہے کہ :-

> "اردو کا پہلا ناول ہے جس میں طوائف کا کردار ایک خوبی، سچائی اور بے باکی کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ مولوی صاحب نے یہ ناول تعداد ازواج کی مخالفت میں لکھا اور طوائف کو بیوی اور سوکن کی حیثیت سے ابھارا ہے۔"[2]

اس بات کی تصدیق اشفاق احمد اعظمی کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ :-

> "وکیل اور ایک پیشہ ور عورت کا کردار اردو ناول میں پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے۔"[3]

نذیر احمد جس ماحول اور تہذیب کے پروردہ تھے اس میں اس طبقے کی عورتوں کے لیے گنجائش نہیں تھی۔ قلم اٹھانا تو در کنار، ان کے متعلق سوچنا بھی ایک گناہ تصور کیا جاتا تھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ سماج انتشار اور بدحالی کا شکار تھا۔ شنوئیت اور دوئی اس کے مزاج کا حصہ بن چکے تھے۔ اسی وجہ سے اس زمانے میں اس طبقے کو گہری نظروں سے دیکھا جاتا تھا مگر اس کے باوجود یہ طبقہ دن بہ دن زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کرتا جا رہا تھا۔ دن کے اجالے میں رہنے والے امراء اور شرفاء رات کے اندھیروں میں اس طبقے کی پشت پناہی کرتے تھے۔

"فسانۂ مبتلا" مبتلا کی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان ہے، جو ایک بگڑا ہوا آوارہ مزاج اور غیر مستقل مزاج انسان ہے۔ گھر والوں نے اس کی نازیبا حرکتوں سے تنگ آکر اس کی شادی کر دی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ شاید مبتلا کی آوارہ مزاجی کا درماں اسے ازدواجی زندگی سے منسلک کر دینے ہی میں ہے۔ مگر شادی کا بندھن اس کی طبیعت کی جولانیوں، خوش فعلیوں اور عشرت زدہ مزاج کے لیے زنجیر نہ بن سکا۔ وہ اپنی بیوی غیرت بیگم سے ذہنی ہم آہنگی نہ پیدا کر سکا اور نت نئے جھگڑے، باہمی نزاع و اختلاف اور پریشانی اس کی زندگی کا

---

[1] نمونۂ منثورات حصہ اول۔ احسن مارہروی، صفحہ ۱۹۲۔ [2] اردو فکشن میں طوائف۔ ڈاکٹر وی۔ پی سوری، صفحہ ۱۲۹۔ [3] نذیر احمد شخصیت اور کارنامے۔ اشفاق احمد اعظمی، صفحہ ۲۷۳

۲۴۳۔ ستلج ہوسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ ۶۷

مقدر بن گئے۔ تنگ آکر لکھنؤ سے آئی ایک طوائف ہریالی بیگم سے وہ شادی کرلیتا ہے۔

ہریالی لکھنؤ کی رہنے والی تھی جو مبتلا کے گھر کے ذرا فاصلے پر ایک کرایہ کے مکان میں رہتی تھی۔ وہ ہر فن میں مہارت رکھتی تھی۔ مثلاً تاش، گنجفہ، چوسر، شطرنج وغیرہ۔ اس کی شہرت کے چرچے عیاش طبع لوگوں تک پہنچ چکے تھے۔ مصنف نے "فسانۂ مبتلا" میں ہریالی کے حرکات وسکنات کا کامیاب خاکہ کھینچا ہے کہ لکھنؤ کی زندگی ہی سے ہریالی بازار حسن میں قدم رکھ چکی تھی مگر لکھنؤ کی معاشی حالت کمزور ہوجانے کی وجہ سے دہلی آبسی تھی کیوں کہ لکھنؤ کے نوابوں کے خزانے خالی ہوچکے تھے اور وہ طوائفوں کے مطالبات پورے کرنے سے قاصر تھے۔ سماج کے کچھ سربرآوردہ مردوں کی ہوس پرستی نے اسے بازار حسن کی زینت بنادیا۔ اس کی رگوں میں شریف اور باعزت خاندان کا خون گردش کررہا تھا جورہ رہ کر اسے موجودہ زندگی کی کراہتوں کا احساس دلاتا رہتا۔ اسی لیے وہ ایک ایسی زندگی کی متلاشی نظر آتی ہے جہاں وہ ایک شفیق ماں، ایک محبت کرنے والی جاں نثار بہن اور ایک شوہر پرست وفا شعار بیوی بن کر سماجی شناخت حاصل کرسکے۔ دراصل وہ اسی سماجی اقدار کی خواہاں نظر آتی ہے۔ چناں چہ وہ اپنے اور اپنے پیشے کی تنقیص کرکے مبتلا کے دل میں اپنے خلوص کا نقش ثبت کردیتی ہے اور نکاح کے لیے ذہنی طور پر تیار کرالیتی ہے۔

ہریالی اگرچہ شریف النسل اور اعلا خاندان کی لڑکی تھی اور حالات نے اسے بالاخانے کی زینت بنادیا تھا مگر ناول میں اس کے حرکات وسکنات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ گو اس نے اس ماحول سے سمجھوتہ کرلیا ہو اور اسی لیے اس کے انداز، اس کی وضع داریاں ایک پیشہ ور طوائف کی سی جان پڑتی ہیں۔ اس نے بہت حد تک اپنے آپ کو ایک بازاری عورت کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو نفسیات کی ماہر ہونے کے ساتھ لوگوں کو اپنے دام الفت میں پھانسنے کا گر بھی جانتی تھی۔ ویسے وہ چنداں خوبصورت نہ تھی۔ مگر اس کی جامہ زیبی، خوش لباسی اور خوش گفتاری اور نازو ادا پر سب ہی نثار ہوتے تھے۔ مبتلا خود حسین تھا اور حسن پرست بھی۔ مگر ہریالی کی ان جملہ خصوصیات سے اس حد درجہ متاثر نظر آتا ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں اس کا گرویدہ ہوجاتا ہے اور عقد ثانی کی صورت میں ہریالی کو اپنی زوجیت میں لے لیتا ہے۔

اور اس طرح ہریالی، مبتلا کی منکوحہ بیوی بن کر نوکرانی کے بھیس میں اس کے گھر داخل ہوجاتی ہے۔ جب وہ ماما کی صورت میں آتی ہے تو غیرت بیگم اور ہمسائے کی لڑکیوں کو اس کے بناؤ سنگار، آرائش وزیبائش اور وضع قطع سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ یہ نووارد کم سے کم اس گھر کی نوکرانی نہیں ہے۔ آخرکار ان لوگوں نے اسے زدوکوب کرکے گھر سے باہر ڈھکیل دیا۔ لیکن اس کے باوجود ہریالی، غیرت بیگم کی خوب خدمت کرتی ہے۔ اپنے سلیقے سے گھر میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ ہریالی جس صبر اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرتی ہے اس سے اس کے خاندانی شریف ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔ اپنی سلیقہ مندی، وفا شعاری سے اس نے گھر کو بڑے سلیقے سے سجا سنوار کر آراستہ کردیا۔ اس میں شک نہیں کہ گھر میں ایک منتظم عورت کی سخت ضرورت تھی اور یہی ضرورت ہریالی کے پاؤں جمانے کا سبب ہوئی۔ مگر راز افشا ہونے پر نوبت مار پیٹ اور خون خرابے تک پہنچتی ہے اور ہریالی، غیرت بیگم کے ہاتھوں لٹنے پٹنے کے بعد میاں کو لے کر علاحدہ ہوجاتی ہے۔ علاحدگی کے بعد بھی غیرت بیگم چین نہیں لینے دیتی اور اس طرح ہریالی ان کے ہاتھوں بری طرح ذلیل ہوتی ہے۔ ہریالی اس حال میں بھی صابر وشاکر نظر آتی ہے۔ بالآخر غیرت بیگم راستے کے پتھر کو ہٹانے کے لیے ہریالی کے دودھ میں زہر ڈلوادیتی ہے۔ سچائی عیاں ہونے پر معاملہ فوجداری میں چلا جاتا ہے۔ آخرکار ہریالی بھی شرافت کا لبادہ اتار کر طوائفیت پر اتر آتی ہے اور دونوں طرف سے محاذ آرائی کا ایک سنگین سماں بن جاتا ہے۔ ان دونوں کی آپسی رسہ کشی اور چپقلش کا برا اثر مبتلا کی صحت پر پڑتا ہے اور مبتلا چند ماہ کے بعد بڑی مجبوری اور خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔ مبتلا کی موت پر جہاں غیرت بیگم آہ وزاری اور سینہ کوبی کرتی ہے وہیں ہریالی گھر کے اثاثے کو لے کر رفوچکر ہوجاتی ہے۔

نذیر احمد چونکہ ایک خاص مقصد کے تحت ناول لکھ رہے تھے اور وہ مقصد مسلم سماج کی برائیوں کو افشا کرنا اور ان کی اصلاح کرنا تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کے لیے دو مختلف الجہات کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔ ایک طرف مسلم خاندان سے تعلق رکھنے والی پردہ نشیں، اعلا حسب ونسب والی لیکن بداخلاق خاتون، جس کے پاس اچھائی کے نام پر صرف ایک خاندانی جاہ وحشمت تھا اور دوسری طرف خاندانی افتخار سے عاری بے نام ونسب والی بازاری خاتون جس کے پاس عالی نسبی کا کوئی قابل اعتماد ثبوت نہیں اور اگر ہے تو وہ لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں مگر اس کے اندر جذبۂ وفاپرستی ہے، سلیقہ مندی اور وضع داری کی دولت ہے، وہ شوہر کی خدمت کر اور اپنے فرائض نبھانا بخوبی جانتی ہے۔ نذیر احمد نے ان دو کرداروں کے ٹکراؤ اور ان کی آویزش سے اپنے ناول کے لیے سنگ خشت فراہم کیے ہیں اور اس ٹکراؤ اور کشمکش کے باعث اس طبقے کی ترجمانی کا مقصد بھی حل ہوگیا جس کے بارے میں کچھ تحریر کر تو درکنار سوچنا بھی گناہ عظیم تصور کیا جاتا تھا

جہاں تک نذیر احمد کے نقطۂ نظر کا سوال ہے، اس سمت میں وہ طوائف کے تئیں کشمکش او گومگو کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ اپنے خیالات وہ برملا اظہار نہیں کرسکتے کیوں کہ وہ خود مجبور ہیں۔ ان کے پیچھے ان کی اپنی تہذیب ہے، اپنا سماج ہے جو انھیں مقدس نظر آتا ہے۔ ہزار خرابیوں کے باوجو اسے عزیز رکھتے ہیں اور دوسری طرف ان کا اپنا ترقی پسند رویہ اور نظریہ ہے جہاں وہ حقائق کو لعینہ بیان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ مگر آخر آخر وہ اپنے تبلیغی مشن سے مجبور ہوکر انصاف نہیں کرپاتے۔ انھوں نے غیرت بیگم کو ہزار خرابیوں کے باوجود ہیروئن کے روپ میں پیش کردیا۔ اس کے نفس کا تزکیہ کرکے قارئین کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی اور ہریالی جس کے اندر جملہ اخلاقی خصوصیات موجو تھیں اسے نظر انداز کرتے ہوئے انھوں نے اس سے وہ جذبۂ ہمدردی، وفاپرستی اور شوہر شعاری کی خصوصیت چھین لیں اور اسے تمام اخلاقی صفات سے عاری کرکے قارئین کی نظروں میں مشکوک بنادیا۔ مگر جو لوگ نذیر احمد کے اصلاحی مشن سے واقف ہیں وہ ان کی مجبوری سمجھ سکتے ہیں۔ ایک ایسے زمانے میں جو طوائف کا ذکر اشراف کے درمیان کیا جاتا معیوب اور غیر اخلا سمجھا جاتا تھا، نذیر احمد نے اسے اپنے ناول کا ایک اہم موضوع بناکر اپنی دلیری اور جرأت مندی کا ثبوت دیا ہے اور لکھنے والوں کے لیے راہ ہموار کردی ہے۔

باقی صفحہ ۳۱ پر

غزلیں

ڈاکٹر منشار الرحمان خاں منشا

پتھروں کی بارشیں ہیں کانچ کے پیکر بچاؤ
جس طرح ممکن ہو یارو اپنے اپنے سر بچاؤ

داغ لگ جانے کے ساماں کی نہیں کوئی کمی
اپنی اپنی اُجلی اجلی خوشنما چادر بچاؤ

آگیا ہے آندھیوں کی زد پہ صحن گلستاں
ویکھتا ہے کام لو اور اس کو بڑھ بڑھ کر بچاؤ

آگ کے شعلوں سے اپنے گھر بچاتے ہیں سبھی
بات تو جب ہے کہ اس سے دوسروں کے گھر بچاؤ

درحقیقت عصمت گلشن بڑے خطرے میں ہے
اس کو ہر حالت میں بن کر عزم کا پیکر بچاؤ

وار کرتے ہیں غزل پر اہل جدت تو کریں
تم اے منشاؔ اس کا کہنہ طرزِ شیریں تر بچاؤ

۱۱۔ اسٹار ٹاؤن۔ ناگپور

رفعت سروش

جلتا بجھتا دن گزرے ہے کس محفل سے آئے ہیں
لب پر کوئی بات نہیں ہے بس لفظوں کے سائے ہیں

بیگانہ بیگانہ چہرے، آنکھوں میں حیرانی سی
گھر کا ذرہ ذرہ پوچھے، آپ کہاں سے آئے ہیں

تنہائی ہے، سناٹا ہے، رات کی زلفیں بھیگ چلیں
کس امید پہ آخر تم نے گھر میں دیپ جلائے ہیں

ایک مہک سی ہے کمرے میں، ٹھنڈک سی ماحول میں ہے
شاید ساز دل پہ کسی نے میرے نغمے گائے ہیں

میرے گھر کا ذرہ ذرہ مجھ سے باتیں کرتا ہے
بھولی بسری یادیں ہیں اور تنہائی کے سائے ہیں

اے۔ ۸۰، سیکٹر ۲، نوئیڈا۔ ۲۰۱۳۰۱

بدر نظیری

لباس اتار کے اپنا بہار رقص میں ہے
زباں نکالے ہوئے خار زار رقص میں ہے

یہ کائنات اٹھائے ہوئے وجود اپنا
ہزاروں سال سے سینہ فگار رقص میں ہے

یہ کیا ہوا کہ لہو رنگ ہو گیا سارا جہاں
بہار ہو کر خزاں بار بار رقص میں ہے

یہ کیسے موڑ پہ لے آیا ہے ہوا کا رخ
کہ بے تحاشا ہر اک بردبار رقص میں ہے

کبھیں نہ اصل بنے جنگ زرگری اے بدرؔ
ہر ایک آدمی دیوانہ وار رقص میں ہے

اے۔ ۲، ایس۔ آر۔ ایم فلیٹ غفار منزل
پوسٹ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

غزلیں

عابد تنظر

افق سے تابہ افق صرف ہے نظارہ مرا
یہ کائنات ہے ذرا اصل استعارہ مرا

بھنور سے کشتیٔ امید پار ہو گئے مگر
ملے گا موج حوادث کو جب اشارہ مرا

مرا وجود کہ ہے عکس اس کا پر تو کل
ہے میری ذات ورق اور سپارہ مرا

مری حیات اسیر غم زمانہ نہیں
کرو فریب سے آگر ذرا نظارا مرا

مجھے یہ عالم امکاں تو ایک منزل ہے
یہ قید مشرق و مغرب نہیں کنارا مرا

ریاضتوں کا صلا ہے مری صلہ یہ تنظر
جو گردشوں سے ابھی پاک ہے ستارہ مرا

۳۴، پاٹا نالہ متصل مسجد مولا و کھدریا اسٹریٹ لکھنؤ ۳

رئیس الدین رئیس

کون ہے آخر بتا میرا گھڑا تا کون ہے
کشتیاں میری سمندر میں ڈبوتا کون ہے

زخم دیتا ہے تو کاری زخم دیتا ہے مجھے
ہاں مگر تیزاب سے زخموں کو دھوتا کون ہے

کوئی بھی ویراں جزیرے میں نہیں مرے سوا
پھر بکھر کر ٹوٹ کر یہ مجھ میں روتا کون ہے

خارزاروں سنگ زاروں میں بجز میرے بتا
ایسی میٹھی اور گہری نیند سوتا کون ہے

جلتے صحرا ہی فقط تعبیر ہوتے ہیں رئیس
رات بھر آنکھوں میں تخم خواب بوتا کون ہے

منیلہ دہلی گیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

قطعات

صابر ابوہری

نہ کر شکوہ اگر قسمت بری ہے
مصیبت ہی کسوٹی ہے بشر کی
سر اپنا جب پٹکتا ہے سلوں پر
بھلا لگتا ہے کیا جھرنے کا پانی

○

ملیں آپس میں جیسے نور یکسر
ہوں دل سے دور جھگڑے کفر و دیں کے
سمجھتا ہے جو اسرار حقیقت
نظر اس کی ہے بیگانہ دوئی سے

○

خدا اس قوم کو دیتا ہے عظمت
سنوارے آپ ہی جو اپنی قسمت
بھروسہ جو کرے غیروں کے دم پر
نصیب اس کو نہ شہرت ہو نہ عزت

ایگرو کنگس، کورٹ روڈ جگدھاری۔ ۱۳۵۰۰۳

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

غربا کو مفت قانونی خدمات فراہم کرنے کا قانون

ملک بھر میں یکساں بنیاد پر سماج کے کمزور طبقوں کو مفت اور اہل قانونی خدمات کی فراہمی کے لیے آئینی بنیاد فراہم کرنے کی غرض سے ۹ر نومبر ۱۹۹۵ء سے "لیگل سروسیز اتھارٹی ایکٹ ۱۹۸۷ء" کا نفاذ عمل میں لایا گیا ہے۔ اگرچہ یہ قانون بہت پہلے وضع کیا گیا تھا تاہم ،لطہ عمل سے متعلق کچھ مسائل کی وجہ سے اس کا نفاذ ،ل میں نہیں لایا جا سکا تھا۔

اس قانون میں مختلف سطحوں پر قانونی خدمات ،اہم کرنے والی اتھارٹیاں قائم کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ قومی سطح پر ایک قومی خدمات اتھارٹی ہو گی۔ یاستیں ریاستی قانونی خدمات اتھارٹی، ضلعی قانونی ،مات اتھارٹی اور تعلقہ قانونی خدمات اتھارٹی قائم ،یں گی۔ قانون کا منشا یہ ہے کہ قانونی امداد سماج کے ،تریں طبقوں کو میسر ہو تاکہ سب سے نچلی سطح کے غربا ،ی اس کا فائدہ اٹھا سکیں۔

ہندوستانی آئین کے آرٹیکل ۳۹۔ اے میں ،ہا گیا ہے کہ حکومت ہند کو غریب لوگوں کو قانونی امداد ،ہیا کرنی چاہیے۔ حکومت نے اس آرٹیکل کے مقاصد ،تکمیل کے لیے ستمبر ۱۹۸۰ء میں قانونی امداد کی فراہمی کی ،یموں پر عمل درآمد کے لیے ایک اعلا اختیاراتی کمیٹی قائم ،تھی۔ اس کمیٹی نے ملک بھر میں قانونی امداد کے پروگراموں ،عمل آوری کا جائزہ لیا جس سے یہ بات سامنے آئی کہ ،ختلف ریاستوں اور مرکزی انتظام کے علاقوں میں پروگرام ،عمل آوری میں یکسانیت نہیں ہے۔ اب اس بات ،ا کوشش کی جائے گی کہ ملک بھر میں اس پروگرام پر ،ساں بنیاد پر عمل درآمد کیا جائے۔

سپریم کورٹ کے جج شری جسٹس کے۔ راماسوامی کو قانونی خدمات کی قومی اتھارٹی کا ایگزیکیٹیو چیرمین نامزد کیا گیا ہے۔ اس اتھارٹی کے فرائض درج ذیل ہیں۔

قانون کی دفعات کے تحت قانونی خدمات کی فراہمی کے لیے پالیسیاں اور اصول مرتب کرنا، قوانین کے بارے میں عوام کی معلومات میں اضافہ کرنا اور خصوصاً سماج کے کمزور طبقوں کو ان کے حقوق کے بارے میں آگاہ کرنا اور انھیں بتانا کہ وہ سماجی بہبود کے قوانین، دیگر قوانین اور انتظامیہ پروگراموں کے تحت کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

قانونی خدمات کی قومی اتھارٹی ریاستی، ضلعی، تعلقہ جاتی اتھارٹیوں، سپریم کورٹ کی قانونی امداد کمیٹی اور ہائی کورٹوں کی قانونی امداد کمیٹیوں نیز سماجی خدمات انجام دینے والے رضاکارانہ اداروں کی کارکردگی کا جائزہ لے گی اور ان میں تال میل برقرار رکھے گی اور انھیں قانونی امداد کی فراہمی کے پروگرام پر مناسب انداز سے عمل درآمد کے لیے عام ہدایات دے گی۔ کوئی بھی شخص جس کی سالانہ آمدنی ۹ ہزار روپے سے کم ہے اور اگر مقدمہ سپریم کورٹ میں پیش ہے اور اس کی مالیت ۱۲ ہزار روپے سے کم نہیں ہے تو وہ قانونی امداد حاصل کرنے کا مستحق ہوگا۔ حکومت اس مقصد کے لیے آمدنی کی حدود کو بڑھا بھی سکتی ہے۔ درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل، خواتین، بچوں، معذور افراد اور بڑے پیمانے پر ہوئی کسی تباہی کے شکار افراد کو آمدنی کی حد کا خیال رکھے بغیر قانونی امداد حاصل کرنے کا حق ہوگا۔

قانونی خدمات اتھارٹی کے قانون کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لوک عدالتوں کو ضابطہ فوج داری کے سیکشن ۱۹۵۔ اور باب ۲۵ کے مقاصد کے لیے ایک سول عدالت کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس کے فیصلے حتمی ہوں گے اور کسی تنازعہ کے فریقین پر ان کی پابندی لازم ہوگی۔ لوک عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف کسی بھی کورٹ میں کوئی اپیل نہیں کی جا سکے گی۔ لوک عدالتوں کی تمام کارروائی کو تعزیرات ہند کے سیکشن ۱۹۳، ۲۱۹۔ اور ۲۲۹ کے معانی میں عدالتی کارروائی تصور کیا جائے گا۔ ●

اقلیتوں کے لیے ۱۰ نکاتی پروگرام کا اعلان

دیہی ترقی اور روزگار کی وزارت، حکومت ہند نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک دس نکاتی پروگرام تیار کیا ہے۔ اس پروگرام کی اہم خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ ریاستوں سے کہا گیا ہے کہ وہ جواہر روزگار یوجنا کے تحت گاؤوں کے قبرستانوں کے گرد باڑ لگوائیں جس کے لیے انھیں فنڈ مہیا کیا جا چکا ہے۔

۲۔ صنعتوں کے ایسے بلاکوں اور گاؤوں کی شناخت کی جائے جس میں اقلیتیں زیادہ تعداد میں ہیں اور اقتصادی پسماندگی اور غربت کا شکار ہیں۔

۳۔ ان گاؤوں میں اقلیتوں کے خاص پیشوں کی شناخت اور سروے کیا جائے۔

۴۔ اسباب کا پتا لگایا جائے کہ اقلیتوں کو اپنے پیشوں یا کام دھندوں میں کن مسائل اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

۵۔ کاریگروں کو جدید آلات کے بکسے فراہم کرنے کے لیے "ٹرائی سیم" اور دیہی دستکاروں کی اسکیم کو ملا دیا جائے۔

۶۔ دیہی ٹکنالوجی کے اداروں اور دیگر تحقیقی تنظیموں کی وساطت سے ضروری رہنمائی اور تکنیکی مہارت فراہم کی جائے گی۔

۷۔ اقلیتی خاندانوں کے نوجوانوں کو ایسے شعبوں میں ہنرمندی اور مہارت بڑھانے کے لیے منتخب کیا جائے گا جن میں ایسے نئے کام شروع کرنے کی ضرورت ہے جن سے زیادہ آمدنی ہوسکتی ہے اور جن کی مانگ بھی زیادہ ہے۔ انھیں مسلمہ تربیتی اداروں کے ذریعہ تربیت دی جائے گی۔

۸۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ ٹرائی سیم کے تحت تربیت حاصل کرنے والے نوجوانوں کو روزگار ملے، بینکوں کی مدد سے موزوں پروجیکٹ بنائے جائیں گے۔ ان کو از خود پروجیکٹ پر عمل درآمد کرنے کے لیے بھی مدد دی جانی چاہیے۔ انھیں بینکوں سے مالی امداد اور سبسڈی بھی فراہم کی جانی چاہیے۔

۹۔ دیہی علاقوں میں خواتین اور بچوں کی ترقی کے پروگرام (DWCRA) کے تحت اقلیتوں کی خواتین کے گروپ بنائے جانے کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔

۱۰۔ ضلع سے نیچے کی سطحوں پر پنچایتی راج اداروں کے قیام کے بعد یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اقلیتوں کے گاؤں، بلاکوں اور اقلیتی ارتکاز والے علاقے میں ان اداروں میں مناسب نمائندگی دی جائے گی۔ تمام ترقیاتی پروگراموں کی تشکیل منصوبہ بندی اور عمل آوری کی ذمہ داری انجام کار انھیں اداروں میں ہوگی۔ دیہی ترقی کے خاص خاص پروگراموں مثلاً جواہر روزگار یوجنا، مربوط دیہی ترقی پروگرام (آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی) اور یقینی روزگار کے اسکیم کے تحت رقوم گاؤں پنچایتوں کو منتقل ہونا شروع ہوچکی ہیں۔ ●

لاوارث بچوں کی بہبود کی اسکیم

مرکزی حکومت نے ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران ۱۴ ریاستوں اور ایک مرکزی انتظام کے علاقے میں مجموعی طور پر ۱۸ رضاکار اداروں کو لاوارث بچوں کے تحفظ، نگہداشت اور ترقیات کے لیے یک مشت امداد دی ہے۔

مذکورہ امداد لاوارث بچوں کی بہبود سے متعلق اسکیم کے تحت دی گئی۔ مرکزی حکومت کے ذریعہ اسپانسر شدہ مذکورہ اسکیم ۹۴-۱۹۹۳ء میں نافذ کی گئی تھی۔ اس اسکیم کے تحت رضاکار اداروں کو لاوارث بچوں کے لیے مراکز قائم کرنے کی غرض سے ۹ فی بچہ یک مشت عطیہ جاتی امداد دی جاتی ہے۔ ●

نابینا افراد میں سائنس و ٹکنالوجی کو مقبول بنانا

سائنس اور ٹکنالوجی مواصلات کے قومی کمیشن (این سی ایس ٹی سی) نے نابینا افراد کے لیے خاص طور پر موزوں سافٹ ویئر بنانے کا ایک پروگرام شروع کیا ہے۔ ابتدا میں اس نے این سی ایس ٹی سی کے ۱۳ پارٹ۔ ریڈیو سیرل "سائنس کا طریقہ کار" تیار کرنے کا کام شروع کیا ہے۔ چار کڑیاں پہلے ہی ٹیسٹ کر کے مکمل کرلی گئی ہیں بقیہ نو کڑیاں تیاری کے مختلف مراحل میں ہیں۔

بچوں میں سائنس کو مقبول عام بنانے کے لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ ملک میں بچوں کی قومی سائنس اکاڈمی قائم کی جائے۔ اس کی سفارش گزشتہ برس دہلی میں منعقدہ بچوں کی قومی سائنسی کانگریس نے بھی کی تھی۔ ●

منشیات کی لعنت

حکومت نے رضاکار اداروں کی مدد سے منشیات کے خلاف بیداری و مشورے اور امداد کے مراکز کھولے ہیں ساتھ ہی منشیات کی لعنت سے چھٹکارہ دلانے والے اور باز آبادکاری مراکز کھولے ہیں۔ اس کے علاوہ منشیات کی روک تھام کے لیے عام بیداری پیدا کرنے کی غرض سے بھی ایک ملٹی میڈیا مہم چلائی ہے۔

ملک میں ۱۲۶۔ ایسے مراکز ہیں جو منشیات کی لعنت سے چھٹکارا دلانے کے کام میں مصروف ہیں ان میں سے آٹھ مراکز دہلی میں مصروف عمل ہیں۔ ●

ہندوستان سے پولیو کا مکمل صفایا

۹ دسمبر ۱۹۹۵ء اور ۲۰ جنوری ۱۹۹۶ء کو تین سال تک کی عمر کے تقریباً آٹھ تا دس کروڑ بچوں کو پولیو کی خوراک دی جائے گی تاکہ ملک سے آئندہ تین برسوں میں اس مرض کا قلع قمع کیا جاسکے۔

اس کا اہتمام روٹری انٹرنیشنل کے پولیو پلس پروگرام کے تحت کیا گیا ہے۔

ملک میں ...۷۰۰۴ مقامات پر پولیو خوراک پلانے کی سہولت دی جائے گی تاکہ زیادہ سے زیادہ متعلقہ عمر کے بچے اس سے استفادہ کرسکیں۔ ●

بقیہ: اقبال کی نظم "سید کی لوح تربت" ۔ ایک مطالعہ

اور تزئین کائنات اس کے حصے میں ہے لہٰذا جب تک دینی علوم کے ساتھ عصری علوم سے آگاہی نہیں ہوگی قوم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ساتھ ہی تیری زبان جو رکھتی ہے اس کو غلط بیانی کے لیے استعمال نہ کرنا بلکہ تقریر سے آپسی اتحاد اور میل جول کی لو آتی چاہیے اور تم مدبر ہو تو خوف و دہشت کو دور کر کے حق گوئی کا راستہ اپناؤ کیوں کہ اصل میں مومن تو وہی ہے جس کے دل میں خوف خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو۔ اس تند و تیز مخالفت میں بھی حق گوئی کے لیے بے باک رہ اور شاعروں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ شاعری چوں کہ اپنے اندر اثر انگیزی رکھتی ہے اور دلوں کو لبھاتی ہے اس کا غلط استعمال نہ کرو بلکہ تمہاری شاعری ایسی ہو کہ

سونے والوں کو جگادے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلادے شعلۂ آواز سے

اقبال کے یہ پیغامات اثر انگیزی کے ساتھ ساتھ دلآویزی بھی رکھتے ہیں اور پوری نظم میں بعض جگہ شعریت بھی قائم رہتی ہے۔ جا بجا حسنِ ترکیب اور بندش کی چستی شعر کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر اقبال کی فنکاری کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ پیغامات کو اتنے موثر طریقے سے بیان کرنا اور وہ بھی ایسا کہ پڑھنے والا دیر تک اس کی اثریت میں کھویا رہے یقیناً یہ اقبال کا کام ہے۔ اقبال کے علاوہ بھی کئی شاعروں نے اپنی شاعری سے پند و موعظت اور پیغام رسانی کا کام لیا ہے مگر براہ راست ناصحانہ انداز نے طرز بیان کو غیر دلچسپ بنا دیا ہے اور ان کے کلام کو اثر انگیزی سے دور رکھا ہے۔ لیکن اقبال کے یہاں معاملہ برعکس ہے۔ یہاں اسلوب کی رنگینی سے شاعری سحرکاری ہوگئی ہے۔ مختصر یہ کہ اقبال کی یہ نظم فکری اور فنی اعتبار سے بہت کامیاب اور اثر انگیز نظم ہے۔ ●

ترتیب

•

اس شمارے کے مختلف مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مصنفین کے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ خیالات ان اداروں، وزارتوں اور حکومت کے بھی ہوں جن سے وہ وابستہ ہیں۔

خصوصی شمارہ یوم جمہوریہ ۱۹۹۶ء

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کربانی

سب ایڈیٹر : ڈاکٹر توحید خان

فون : 677591

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : ایم۔ ایم ملک

جلد : ۱۵ شمارہ : ۱۰

جنوری ۱۹۹۶ء (۱۱ پوش تا ۱۱ ماگھ شک ۱۹۱۷)

قیمت خصوصی شمارہ : ۱۰/- روپے

زرسالانہ : ایک سال کے لیے ۵۰ روپے
(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرسالانہ بینک ڈرافٹ / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں :
بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن انچارج : کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق

خط وکتابت کا پتا :
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ
ک ۳ م لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"
منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

غریبی کے خلاف جنگ

ہمارے آباو اجداد اپنی دانائی، علم، قوت برداشت اور انسانی رویے کے لیے مشہور تھے اور بجا مشہور تھے۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے "واسودھیوا کٹمبکم" کے فلسفے کی تبلیغ کی جس کے معنی ہیں: 'دنیا ایک بہت بڑا خاندان ہے'، بلکہ وہ اس پر بھی یقین رکھتے تھے کہ غریبوں کی خدمت کرنا ہی خدا کی سچی عبادت ہے۔ درحقیقت خدمت خلق ہمارے ثقافتی ETHOS کا اندرونی حصہ رہی ہے۔ چناں چہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہماری جدوجہد آزادی کے دنوں میں بھی ہمارے قومی لیڈروں نے مستقبل کے لیے ایجنڈا تیار کرتے وقت غریبی کے خاتمے کو ترجیح دینا مناسب سمجھا۔

آج ایک قوم کی حیثیت سے ان تمام لوگوں کے مفادات کا تحفظ اور فروغ ہمارا فرض ہے جو سماجی، معاشی طور پر کمزور ہیں۔ ایک ویلفیئر اسٹیٹ کی حیثیت سے ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے تمام عوام کی ترقی اور خوشحالی کو یقینی بنائیں، خاص طور سے پچھڑے ہوئے اور محروم طبقوں کے مفادات کو۔ ہمارا آئین بھی سب کو انصاف اور یکساں حیثیت اور مواقع فراہم کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ چنانچہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب سے ہمیں آزادی حاصل ہوئی ہے، تب سے ہمارے عوام کی فلاح و بہبود حکومت کے اہم مقاصد میں شامل رہی ہے۔ چنانچہ اس عرصے کے دوران غریبی ختم کرنے کے پروگرام منصوبہ بند ترقی کا ایک جزو لاینفک بن گئے۔ پھر بھی جب صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہماری طرف سے اٹھائے گئے اقدامات افسوسناک حد تک ناکافی تھے۔ حالانکہ غریبی کی شرح میں قابل قدر کمی آئی ہے، لیکن ابھی خواتین اور بچوں کے لیے، ضعیف العمر لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے، بے زمین اور بے روزگاروں کے لیے، غریبوں کو غذا اور بے گھر لوگوں کو پناہ فراہم کرنے کے لیے بہت کیا جانا باقی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پچھلے ۴۸ برسوں میں تمام محاذوں پر زبردست ترقی ہوئی ہے۔ چاہے وہ صنعت، زراعت، نقل و حمل، تعلیم یا صحت کا شعبہ ہو یا سائنس اور ٹکنالوجی کا، متعدد دشواریوں کے باوجود نمایاں کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں۔ چاہے دفاعی معاملات ہوں یا ثقافتی سرگرمیاں، سٹیلائٹ کمیونی کیشن ہو کہ پرامن مقاصد کے لیے نیوکلیائی توانائی کا حصول، ہر شعبے میں قابل قدر ترقی درج کی گئی ہے۔ واحد شعبہ جہاں ہماری کارکردگی مطلوبہ سے کم رہی ہے وہ بے تحاشا تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی ہے جس پر ہم اطمینان بخش طور پر قابو نہیں پا سکے ہیں — یہ ایک ایسی ناکامی ہے جو ہماری ترقی کے بیشتر پھلوں کو چٹ کر گئی ہے۔

خوش قسمتی سے پچھلے چند برسوں کے دوران اس حقیقت کے ادراک میں اضافہ ہوا ہے کہ تخفیف غریبی اور سوشل ڈیفنس پروگراموں پر پہلے سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ نتیجے کے طور پر ان پروگراموں پر نئے جوش و خروش سے عمل ہو رہا ہے۔ غریبوں کی حالت بہتر بنانے اور سب کی بہبودی کے لیے ڈھانچے میں اصلاحات لانے کے نظریے سے پنچایتی راج کو عوامی سطح پر نافذ کرنے کے علاوہ حکومت نے حال ہی میں کثیر سمتی سماجی امداد کا پیکج (سوشل اسسٹنس پیکج) بڑے پیمانے پر شروع کیا ہے۔ نیشنل اولڈ ایج پنشن اسکیم، نیشنل فیملی بینیفٹ اسکیم، میٹرنٹی (زچہ بچہ) بینیفٹ اسکیم اور لائف (دیہی) گروپ انشورنس اسکیم، اسکولی بچوں کے لیے مڈ ڈے میل (دوپہر کا کھانا) اسکیم، بے گھروں کے لیے بڑے پیمانے پر رہائشی یونٹوں کی تعمیر اس زبردست پیکج کی چند نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایک اور اہم اسکیم ہے پرائم منسٹرز انٹیگریٹڈ اربن پاورٹی ارادیکیشن پروگرام (وزیراعظم کا شہری غریبی دور کرنے کا مربوط پروگرام) جس پر متعدد شہروں میں عمل درآمد کیا جانے والا ہے۔ یہ اسکیمیں ان مختلف ابرتی روزگار اسکیموں کے علاوہ ہیں جو پہلے سے جاری ہیں جیسے جواہر روزگار یوجنا، اندرا آواس یوجنا، ملین ویلز اسکیم، ایمپلائمنٹ ایشورنس اسکیم وغیرہ جن پر اب مزید زور دیا جا رہا ہے۔ شہری اور دیہی خواتین کی ترقی، بال مزدوری کا خاتمہ، سڑک پر زندگی گزارنے والے بچوں کی بہبود، دیگر اہم شعبے ہیں جن پر آج کل زیادہ توجہ دی جا رہی ہے۔ بال مزدوری کے مکمل خاتمے کے لیے، خاص طور پر پُرخطر پیشوں میں بال مزدوری کے خاتمے کے لیے ایک خصوصی پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔

سماجی امداد (سوشل اسسٹنس) کے پروگرام پر زور دیا جانا ملک کے لیے بے حد خوش آئند ہے کیونکہ نئے اقدامات سے آبادی کے ایک بڑے حصے کے بنیادی ضروریات سے محروم رہنے اور خط غریبی سے نیچے زندگی بسر کرنے کے کلنک کو دور کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ہم اپنی کامیابیوں پر بھی فخر کر سکتے ہیں جب ہم اپنے تمام لوگوں کو یکساں مواقع کی ضمانت دے سکیں، خاص طور پر پچھڑے ہوئے نادار اور دبے کچلے طبقوں کو۔ بلاشبہ یہ ایک کار عظیم ہے جو کچھ سرکار کر رہی ہے اس کے علاوہ مخلص رضاکار تنظیموں کی سرگرم شمولیت کی ضرورت ہے تاکہ سرکاری کوششوں کو بڑھاوا مل سکے اور اگر ممکن ہو تو اس بات پر بھی نظر رکھی جائے کہ فلاحی اسکیموں کے فوائد کی حقیقی ترسیل ان لوگوں کو ہو سکے جن کے لیے یہ شروع کی گئی ہیں۔ تبھی ہم اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

ڈاکٹر چترا نائک

سماجی بہبود اور خاتمۂ غریبی: چند خیالات

چونکہ فلاح و بہبود کی بیشتر ضروریات غریبی کی بنا پر ہی پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا فلاحی کاموں اور معیار زندگی کو اونچا کرنے کے لیے ملک کا اصلی ایجنڈا "تخفیف غریبی" ہے۔ اس سلسلے میں رضاکار انجمنوں، ذرائع عامہ اور کارپوریٹ سیکٹر کی بطور مشترکہ شمولیت غریبی کے خاتمے کے پروگرام کی زوردار کامیابی کے لیے لازمی ہے۔

غریبی تخفیف پروگرام اور سماجی بہبود کے کاموں میں جو موثرات کام کرتے ہیں وہ کسی قدر پیچیدہ ہوتے ہیں۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جذبۂ ہمدردی فلاح و بہبود کے کاموں کو جنم دیتا ہے۔ جو لوگ بہتر طور پر خوشحال ہیں کمتر حالت کے لوگوں کو یعنی جو جسمانی اور ذہنی طور پر ناقص ہیں اور مادی آسائش سے بہرہ مند نہیں ہیں، مدد بہم پہنچاتے ہیں مگر مکمل طور پر یہ کام اتنا بے غرضانہ بھی نہیں ہے۔ اس کی اصل محرک، اپنے خاص انداز میں دعویٰ برتری کی خواہش ہے اس لیے خیراتی کاموں کا مقصد شہرت حاصل کرنا بھی ہے اور عاقبت کے لیے اجر و ثواب کمانا بھی۔ بعض اوقات مذہبی فرائض یا کسی مرحوم رشتہ دار کی یادگار قائم کرنے کے لیے بھی یہ کام کیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی غریبوں کو کھانا کھلانا، کسی مندر کی مرمت کروانا، یا کسی دھرم شالہ کو تعمیر کروانا، اسکول، شفاخانوں، اسپتالوں، کالجوں کو عطیات دینا اور کسی کے نام ترکہ چھوڑنا وغیرہ مخیر کام ہیں، جو عموماً سماج میں ناموری حاصل کرنے کی ترغیب سے، یا اپنے ضمیر کی آسودگی کے لیے یا دولت کا ناقابل برداشت بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ غرض جہاں غریبی امیری، استعداد اور عدم استعداد پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اس طرح کے مخیر کام ہمیشہ سے ہو رہے ہیں۔

فلاح و بہبود اور غریبی دور کرنے کا موجودہ نظریہ غیر مذہبی اور معقولیت پر محمول ہے۔ یہ خیرات کے قدیمی تصور سے متخالف ہے اور ہر فرد کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ اسے خود کفیل ہونے اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے تعلیم حاصل کرنے، کاروبار چلانے اور پیسہ کمانے کا حق ملنا چاہیے۔ اگر بعض افراد جسمانی یا دماغی طور پر معذور ہیں، تو ریاست اور سماج کو ان کی مدد کرنی چاہیے کیوں کہ انھیں خودداری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے ایسی امداد کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس توجیہہ کے مدنظر ریاست کو فلاح و بہبود کے پروگراموں کو باضابطہ طور پر چلانا چاہیے۔ معذور لوگوں کے علاوہ دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن میں کسی قسم کی شخصی معذوری تو نہیں ہے لیکن جو سماجی تہذیبی حیثیت سے یا سیاسی حالات کی وجہ سے معاشی طور پر کمزور ہو گئے ہیں۔ ترقی پذیر ممالک میں یہ کمزور طبقہ بہت بڑی تعداد میں موجود ہے۔ لہٰذا ریاست اور کل معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیم و تربیت اور اہلیت کے مواقع پیدا کریں ان کے ذریعہ ایسی سہولتیں فراہم کی جائیں جن سے انھیں اپنے حقوق اور اپنی شہری ذمہ داریوں کے پروگرام چلائیں تاکہ ان سے ان کی معذوری دور ہو اور وہ بھی معاشرہ کے دوسرے افراد کی طرح اپنے شہری حقوق و فرائض یکساں طور پر سنبھال سکیں۔

لہٰذا ہر جدید ریاست کو یہ امر یقینی بنانا ہے کہ وہ نہ صرف ان لوگوں کے فلاح و بہبود کے معاملات کو نمٹائے گی جو روایتی معنوں میں معذوری کے شکار ہیں بلکہ ان حالات کو بھی درست کرے جو عام طور پر غریبی کا سبب

بنتے ہیں اور جس کی وجہ سے عام آدمی پست ترین معذوری کا شکار ہوجاتا ہے۔ عموماً ریاست ایسے اقدامات قانونی اور انتظامی کارروائیوں کے ذریعہ کرتی ہے اور ان اقدامات سے ہی سماجی، تمدنی طور پر پسماندہ طبقوں اور غریب لوگوں کی معاشی بہتری ممکن ہے۔ تمام جدید ریاستیں یہ کام دستوری دفعات کے ذریعہ انجام دیتی ہیں کیوں کہ تمام حکومتی پروگراموں کی بنیاد انھیں پر ہوتی ہے۔ کمزور فرقوں کے تحفظ اور ان کی بہبود کے معاملہ میں ہندوستان کے آئین کی سب سے اچھی مثال ہے کیوں کہ یہ کمزور فرقوں کے تحفظ اور ان کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں امور ریاست کے لیے رہنما اصول فراہم کرتا ہے۔ یہ آئین ہر ہندوستانی شہری کو آزادی، عزت و آبرو، تحفظ زندگی اور تعلیم کے یکساں مواقع کا حق ہوتا ہے۔ حقوق کا اصل مجموعہ ان سب کا احاطہ کرلیتا ہے۔

> دیہی غریبی کی تخفیف کے لیے ضروری ہے کہ خود روزگار اور مزدوری کے مقامی مواقع طرح طرح کے طریقوں سے بڑھائے جائیں۔ تقریباً آٹھویں منصوبے کے مکمل روزگار کے مقصد کو معاشی ترقی کے پورے عمل کا ایک لازمی حصہ تصور کیا گیا ہے۔ یہ مقصد آزادانہ پالیسی کے تحت نئے لازمی اقدامات کی مدد سے دوران مدت میں حاصل کرلیا جائے گا۔

فلاح و بہبود کی بڑی ضرورتیں

ہندوستان کی سماجی و معاشی پسماندگی کا مطالعہ بہت سے قومی اور بین اقوامی اداروں اور اسکالروں نے کیا ہے اور اس کی دستاویزات بھی تیار کی ہیں۔ نوآبادیاتی نظام حکومت کی ایک طویل استحصالی مدت کی وجہ سے جس میں کچھ تہذیبی عوامل بھی کارفرما ہیں، ہماری فلاح و بہبود اور خاتمہ غریبی کے کاموں کا دائرہ کافی بڑھ گیا ہے اور ان کاموں نے آگے چل کر کثیر الجہت ضرورتیں پیدا کردی ہیں۔ مثال کے طور پر فلاحی پروگرام، جسمانی، دماغی، سماجی، تمدنی اور معاشی قسم کی تمام معذوریوں کا احاطہ کرے گا۔ وزارت بہبود کے ۹۷-۱۹۹۶ء کے پلان کی تجویز کے ایک جائزے سے پتا چلتا ہے کہ وہ کس قدر چکرا دینے والے وسیع المدارج اقدامات کا انتظام کرنے والی ہے۔ اسے درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبائل، دیگر پسماندہ طبقوں اور اقلیتوں کی متعدد فلاحی ضروریات کی نگرانی کرنی ہے۔ ملک کی آبادی میں ان فرقوں کا فی صد بالترتیب ۱۶٫۴۸، ۸٫۰۸، ۵۲٫۸ اور ۱۶٫۴۷ ہے۔ کل ملاکر یہ ہماری آبادی کا تقریباً ۸۵ فی صد ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ فلاحی پروگرام صرف اپنے سائز ہی میں بڑے نہیں ہیں بلکہ اپنی سمت، رفتار اور مواد کے اعتبار سے بھی انتہائی فرق رکھتے ہیں۔ ان کے مشتملات میں درج ذیل پر نظر ڈالیے۔ ان فرقوں کے طلبا کو وظیفے دینا جو فلاحی زمرے میں آتے ہیں۔ ان لوگوں کے علاج معالجے اور آبادکاری جو طرح طرح کی معذوری کا شکار ہوں، ذات اور فرقہ پر مبنی معاملات کا انتظام جو مالی امداد اور راحت دینے کے لیے تشکیل دیا گیا ہے۔ متعدد کمیشنوں کے کاموں کی نگرانی جو پسماندہ فرقوں کے سماجی و معاشی حالات کو بہتر بنانے کی غرض سے قائم کیے گئے ہیں، معاشرہ کے ایک محروم طبقے یعنی عورتوں اور لڑکیوں کے لیے اسکیمیں چلانا، عمر رسیدہ لوگوں کے فلاحی کاموں کی دیکھ بھال کرنے، سڑکوں پہ پلے بچوں کے پروگرام ترتیب دینا، بھکاریوں اور سیلابیوں کو امداد بہم پہنچانا اور انھیں ٹریننگ دینا۔ سماجی قوانین کو نافذ کرانا، نشہ خوری کو روکنا اور اس کی ممانعت کو نافذ کرانا، سماجی دفاع کے پروگراموں کو چلانا، دفاعی طور پر ایذارسانی کے شکار لوگوں کو خدمات بہم پہنچانا، معذور اور محروم لوگوں کی آبادکاری اور رضاکار

> وزیر اعظم کی روزگار یوجنا (۹۶-۱۹۹۵ء) میں نئی فلاحی اسکیمیں ملک میں غریبوں کے لیے ان روزگار اسکیموں کے پہلو بہ پہلو چار نئی فلاحی اسکیموں کو بھی مقابلے میں لایا گیا ہے۔ یہ اسکیمیں ہیں: (الف) نیشنل سوشل اسسٹنس پروگرام (ب) نیشنل پروگرام آف نیوٹریشنل سپورٹ ٹو پرائمری [illegible] (د) [illegible] گروپ لائف انشورنس اسکیم۔

تنظیموں کو ان تمام کارگزاریوں میں حتی المقدور شامل کرنا اور اس کے لیے انھیں مالی سہولت دی جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ یہ فہرست نامکمل ہے پھر بھی اس سے ہماری آبادی کی متفرق کثیر ضرورتوں کا احساس اور ان پیچیدہ کارگزاریوں کا اندازہ ضرور ہوتا ہے جنھیں ہماری حکومت سرانجام دے رہی ہے۔ بہت سی فلاحی ضرورتیں غریبی و مفلسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے جیسے ہمارے تخفیف غریبی کے پروگرام کامیاب ہوتے جائیں گے، غریبی بھی کم ہوتی چلی جائے گی۔ یہ کام امید افزا ترقی کرے گا۔ لہٰذا ملک کا معیار زندگی بلند کرنے اور فلاحی کاموں کو فروغ دینے کے سلسلے میں ہمارے ملک کا اصل ایجنڈا خاتمۂ غریبی ہے۔

خط غریبی سے نیچے کی آبادی

ہندوستان میں خط غریبی سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی آبادی کا فی صد کچھ متنازعہ فیہ ہے۔ خط غریبی کے نیچے کے خاندانوں کے افراد کی تعداد کی تخمینہ کاری کا معیار کیلوری کے لحاظ سے کسی شخص کے تغذیہ کے اوپر منحصر ہے۔ یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ دیہاتی علاقوں میں کم سے کم ایک دن میں فی کس تغذیہ کی مقدار ۲۴۰۰ کلوریاں ہوں گی جب کہ شہری علاقوں میں ۲۲۰۰ کلوریاں درکار ہوں گی۔ اگر کوئی خاندانی فرد اس سطح کے تغذیہ کے مصارف برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے تو وہ خط غریبی سے نیچے کے درجہ میں شمار ہوگا۔ افراد کی اصل تعداد اور ان لوگوں کا کل ملاکر فی صد جو خط غریبی سے نیچے ہیں، اشیائے خوردنی کی قیمت کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ ان کلوریوں کے علاوہ لی جانے والی پروٹین کے مقدار کو بھی کسوٹی بنانا چاہیے کیوں کہ اس سے جسمانی توانائی،

دماغی طاقت بڑھتی ہے اور بیماری کے اثر کے خلاف مدافعت بڑھتی ہے۔ لیکن عام طور سے کلوریائی تغذیہ ہی بطور معیار تسلیم کیا گیا ہے۔ کیوں کہ یہ غریبی کا بہت سادہ اشارہ کار ہے۔

اس وقت غریبی کے دستیاب تخمینے وہی ہیں جو ۸۷-۱۹۸۶ء کے تھے۔ بہر حال کم و بیش تقریباً ۳۰ فی صد ہندوستانی آبادی خط غریبی کے نیچے ہے۔ ہر ریاست کا تخمینہ دوسری ریاست سے مختلف ہے اور دیہاتی و شہری فرق بھی قابلِ لحاظ ہے۔ دیہاتی اور قبائلی علاقوں میں غریبی کے وقوعات کہیں زیادہ ہیں۔ ان لوگوں کے لیے بھی جو بڑے صنعتی شہروں کی گندی بستیوں میں رہ رہے ہیں۔ خاتمۂ غریبی کی ضرورت نہایت ضروری ہے۔ اسی وجہ سے مرکز ضرورت مند شہری آبادی کے لیے روزگار پیدا کرنے کی اسکیمیں بنا رہا ہے اور ساتھ میں دیہی علاقوں میں بھی تخفیف غریبی کی کارگزاریوں کو تیز کیا جا رہا ہے۔ علاوہ ازیں بعض مخصوص بہبود اور قانون سازانہ اقدامات بھی کیے جا رہے ہیں تا کہ ان سے شہری مزدوروں کا تحفظ ہو سکے اور خاص طور سے بچہ مزدوری کا انسداد ہو سکے۔

خاتمۂ غریبی پروگرام

دیہی غریبی کی تخفیف کے لیے ضروری ہے کہ خود روزگار اور مزدوری کے مقامی مواقع، طرح طرح کے طریقوں سے بڑھائے جائیں۔ تقریباً آٹھویں منصوبے کے مکمل روزگار کے مقصد کو معاشی ترقی کے پورے عمل کا ایک لازمی حصہ متصور کیا گیا ہے۔ یہ مقصد آزادانہ پالیسی کے تحت نئے لازمی اقدامات کی مدد سے دوران مدت میں حاصل کر لیا جائے گا۔ تاہم کچھ نہایت ضروری راحت ان آبادی گروپوں کو دی جا رہی ہے جو خط غریبی سے نیچے ہیں۔ اس سلسلے کے متعدد پروگرام میدان عمل میں آ گئے ہیں اور حال میں نئے پروگراموں کو خاتمۂ غریبی کا قدم تیز کرنے کے لیے لایا جا رہا ہے تا کہ اس سے فلاحی اقدامات اور روزگار کے مواقع بڑھائے جا سکیں۔ اس سلسلے میں درمیان میں رونما ہونے والی مرکز کی بڑی اسکیموں میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام (آئی آر ڈی پی) جواہر روزگار یوجنا (جے۔ آر۔ وائی) اور ایمپلائمنٹ (روزگار) انشورنس اسکیم (ای۔ اے۔ ایس) آر۔ ڈی۔ پی اسکیم کے تحت مرکزی فنڈوں کو ریاستی حکومت کے حوالے کر دیا جاتا ہے تا کہ وہ خط غریبی سے نیچے کے دیہی کنبوں کو ان کے لیے منتخب کرے۔ اس کا مرکزی اور ریاستی حصہ آدھا آدھا ہوتا ہے۔ اس اسکیم کے اندر آنے والے گروپوں میں چھوٹے اور حاشیائی کسان، زراعتی مزدور اور دیہی دست کار ہیں۔ ٹرائیسم کی سکیم اور DWCRA اسکیم دونوں آئی آر ڈی پی پروگرام کو نافذ کرتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ ہنر و مہارت اور کارانداز یت میں ٹریننگ دیتے ہیں۔ یہ ٹریننگ ۱۸ سے ۳۵ عمر کے دیہی نوجوانوں کو اور خط غریبی سے نیچے کے کنبوں کی عورتوں کو دی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو ابتدائی سروسیں اور معاشی مواقع ان کے گروپ بنا کر دی جاتی ہیں۔

جواہر روزگار یوجنا مزدوری مہیا کرنے والی اسکیم ہے۔ یہ اسکیم دیہی بنیادی سہولتیں فراہم کرنے اور کمیونٹی اثاثے جات میں بھی مدد کرتی ہے۔ اس طرح اس سے مجموعی ترقی میں اصل کاری ہوتی ہے۔ اس اسکیم میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کا حصّہ بالترتیب ۸۰ : ۲۰ ہوتا ہے۔ جواہر روزگار یوجنا کے تحت دو اور ضمنی اسکیمیں ہیں ملاحظہ اندرا آواس یوجنا اور (ب) ملین ویلز اسکیم۔ خاص طور پر SC / ST آبادی کے لیے۔ ضلع انتظامیہ پسماندہ گروپوں کو منتخب کرتا ہے اور پنچایتوں کو ۸۰ فی صد فنڈ پہنچاتا ہے اور باقی ۲۰ فی صد انٹر بلاک یا انٹر ویلیج ورکس کے لیے رکھ لیتا ہے۔ پنچایت میں ایس سی/ایس ٹی آبادی کو ۶۰ فی صد دے دیا جاتا ہے اور دیگر آبادی کو ۴۰ فی صد دے دیا جاتا ہے۔ رفیق، جواہر روزگار یوجنا کی دوسری دھارا پسماندہ ضلعوں میں کام کرتی ہے۔ ۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۶ء تک ۵۰ فی صد فنڈ ز واٹرشیڈ ڈیولپمنٹ پلان کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ اب اس اسکیم کی ایک اور تیسری دھارا بھی تیار ہو گئی ہے جو محدود پیمانے پر اختراعی پروجیکٹوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو ایمپلائمنٹ انشورنس اسکیم (ای اے ایس) جاری کی گئی۔ خشک ڈھلوان زمین، ریگستان اور قبائلی علاقوں میں کام کرنے والی اسکیم کو سہارا دینے کے لیے تھی۔ یہ گوا، پنجاب، چنڈی گڑھ، دہلی اور پانڈیچری کو نکال کر ۲۴۷۰ بلاکوں کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ خشک سالی کے زمانے میں سو دنوں کا روزگار غیر ہنر مند جسمانی کام کے لیے مہیا کرتی ہے تا کہ اس سے بنیادی سہولتیں اور کمیونٹی اثاثے پیدا ہو سکیں جہاں تک شہری اور دیہی دونوں علاقوں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی خود روزگاری کا سوال ہے اس کے لیے وزیر اعظم کی روزگار یوجنا حال میں شروع کی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کی مدد سے تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان چھوٹے کاروبار قائم کریں۔ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کی خود روزگاری کی پہلی اسکیم جو ۸۴-۱۹۸۳ء سے ۹۴-۱۹۹۳ء تک جاری رہی اب وزیر اعظم کی روزگار یوجنا (۹۶-۱۹۹۵ء) میں مدغم کر دی گئی ہے۔

نئی فلاحی اسکیمیں ملک میں غریبوں کے لیے ان روزگار اسکیموں کے پہلو بہ پہلو چار نئی فلاحی اسکیموں کو بھی ضابطے میں لایا گیا ہے۔ یہ اسکیمیں ہیں۔ (الف) نیشنل سوشل اسسٹینس پروگرام (این ایس اے پی) (ب) نیشنل پروگرام آف نیوٹریشنل سپورٹ ٹو پرائمری ایجوکیشن (این پی این ایس پی ای)

[illegible] ... کی پیداواریت حاصل کر سکتے ہیں بلکہ ... تعلیم یافتہ ... اور خاص طور سے ... [illegible] ... کر سکتی ہیں۔

،اندرا اِمبلا یوجنا (آئی۔ ایم۔ وائی) اور (ج) رورل گروپ لائف انشورینس اسکیم۔

این۔ ایس۔ اے۔ پی کے تین حصّے ہوتے ہیں۔ (۱) نیشنل اولڈ ایج پینشن اسکیم؛ یہ ان محتاج و مفلس آدمیوں پر قابلِ اطلاق ہے جن کی عمر ۶۵ سال یا اس سے زیادہ ہے۔ اس کے وظیفہ یاب کو ہر مہینے ۷۵ روپیے دیے جاتے ہیں۔ (۲) نیشنل فیملی بینی فٹ اسکیم؛ اس اسکیم کے تحت خاندان کو پالنے والے کے گزر جانے پر، جس کے بعد خاندان کا کوئی اور سہارا نہیں ہے، یک مشت رقم دی جاتی ہے۔ یہ اسکیم ۱۸ سے ۶۴ سال تک کی عمر کے لوگوں پر قابل اطلاق ہوگی۔ اگر اس شخص کی موت فطری وجوہات کی بنا پر ہوتی ہے تو ۵۰۰۰ روپے کی رقم دی جائے گی اور اگر یہ حادثاتی موت ہے تو پھر دس ہزار روپے کی رقم دی جائے گی۔ (۳) نیشنل میٹرنٹی بینی فٹ اسکیم (این۔ ایم۔ بی ایس) اس اسکیم میں ۳۰۰ روپے فی حمل کے حساب سے بچّہ کے جنم سے پہلے اور جنم کے بعد تک زچگی کی نگہداشت کے لیے دیے جاتے ہیں۔ یہ رقم غریب گھرداروں کو صرف دو بار زندہ بچہ ہونے پر دی جاسکتی ہے۔ جو عورتیں ۱۹ سال اور اس سے زیادہ عمر کی ہیں وہ اس رعایت کی مستحق ہیں۔ یہ اسکیمیں پنچایت اور میونسپلٹی جیسے مقامی اداروں کے ذریعہ بروئے عمل لائی جائیں گی۔ نیشنل پروگرام آف نیوٹریشنل سپورٹ ٹو پرائمری ایجوکیشن۔ یہ دوپہر کے کھانے کی اسکیم کا ایک بڑا روپ ہے۔ اس کا مقصد غریب بچوں کو پرائمری اسکولوں میں بھرتی کرنے کا ہے (ایک سے پانچویں کلاس تک) یہ پروگرام ان تمام اسکولوں کے لیے ہے جو حکومت کے زیرانتظام ہیں یا مقامی اداروں کے زیرانتظام ہیں۔ حکومت کی امداد سے چلنے والے پرائیویٹ تنظیموں کے اسکول بھی اسی زمرے میں آئیں گے۔ اس پر عمل درآمد ۹۶-۱۹۹۵ء میں ان بلاکوں میں شروع ہو جائے گا جو آر۔ پی۔ ڈی۔ ایس اور ای۔ اے۔ ایس اسکیموں کے تحت آتے ہیں۔ اس میں وہ بچے بھی آئیں گے جو کم نسواں خواندگی ضلعوں اور نوٹیفائڈ مسلم میں آتے ہیں۔ مقامی اداروں سے توقع کی گئی ہے کہ وہ لگ بھگ دو سال تک اپنے اسکولوں میں ایسا انتظام کریں گے کہ جس سے پکا ہوا کھانا اور عمل کار کھانا مہیا کیا جاسکے۔ جب تک یہ انتظام مکمل ہو، اس دوران ہر مہینہ فی بچہ ۳ کلو گندم یا چاول تقسیم کیا جائے گا۔ یہ اناج ان تمام مستحق بچوں کو دیا جائے گا جن کی حاضری پڑھائی کے دنوں کی ۸۰ فی صد ہوگی۔ اندرا اِمبلا یوجنا۔ دیہاتی عورتوں میں آگاہی پیدا کرتی ہے۔ ان کی آمدنی کے ذرائع کو پیدا کرتی ہے اور انھیں سروسوں کی طرف راغب کرتی ہے۔ یہ ایک پلاٹ کے ۲۰۰ بلاکوں کا احاطہ کرے گی۔ رورل گروپ لائف انشورینس اسکیم۔ یہ اسکیم ۲۔ ایج گروپ کے لوگوں کے لیے ۵ ہزار روپے کا محافظ سرمایہ مہیا کرتی ہے۔ یہ ایج گروپ (الف) ۲۰ سے ۴۰ سال اور (ب) ۴۰ سے ۵۰ سال تک کے ہیں۔ انھیں سالانہ پریمیم بالترتیب ۶۰ روپے، ۷۰ روپے دینا ہوگا۔ اس کی اخراج کی عمر ۶۰ سال ہے۔ اس اسکیم کو پنچایتیں روبہ عمل لائیں گی۔ اس اسکیم میں ایک غریب خاندان کے صرف ایک فرد کے لیے ۵۰ فی صد سبسڈی کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ سبسڈی کی یہ رقم مرکزی اور ریاستی حکومت مل کر مساوی طور پر ادا کریں گے۔

کھادی اور دیہی صنعتی کمیشن کے پروگراموں کے لیے محرک

دیہی آمدنی کو ترقی دینے کی جدید کوشش قابل توجہ ہے۔ کھادی اور دیہی صنعتی کمیشن کے محرک کے طور پر ایک نیا منصوبۂ عمل تیار کیا گیا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں ایک ہائی پاور کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس کے چیئرمین خود وزیراعظم تھے۔ نئے پلان کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے گا کہ کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز کمیشن آٹھویں پنج سالہ منصوبے کے دوسرے نصف میں ۲۰ لاکھ (دو ملین) کام پیدا کرے گا۔ یہ نشانہ حاصل کرنے میں کچھ اور پروگرام یہ ہیں۔ ۵۰ منتخب ضلعوں میں شروع ہونے والا اسپیشل ایمپلائمنٹ پروگرام، بلاک ڈیولپمنٹ پروگرام اور اسپیشل پروجیکٹ مہاتما گاندھی کے ۱۲۵ویں جشن سالگرہ کے موقع پر کے وی۔ آئی سی ۱۲۵ بلاکوں میں اسپیشل پروگراموں کو ترقی دے رہا ہے۔ ان پروگراموں سے فی بلاک ایک ہزار آدمی کوَر ہوں گے۔ یہ بلاک ان ۷۰۰ بلاکوں میں سے لیے جائیں گے جن کو ایمپلائمنٹ انشورینس اسکیم کے تحت منسٹری آف رورل ایمپلائمنٹ اور رورل ایریا نے منتخب کیا تھا۔ این جی اوز کے اشتراک سے بھی سو اسپیشل پروجیکٹ اور شروع کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ۵۰۰ دیگر پروجیکٹ بھی شروع کیے جارہے ہیں۔ پروجیکٹ ۲۵ سے ۳۰ لاکھ روپیے کی رقم اور قرض کا بینکوں کے کنسورشیم کے ذریعہ انتظام کرے گا۔ بہت سے نئے چھوٹے دھندے ان اقدامات سے پیدا ہوگے۔

جب تک [illegible] سے متعلق مسائل کو [illegible] حل کرنے میں عوام [illegible] ہوگی، خاتمہ غریبی کے کام میں کامیابی نہیں مل سکتی، بلکہ حکومت کی کوشش [illegible] پر کامیاب بنانے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ایک بہتر زندگی کے لیے عوام کے خیالات کو تحریک دی جائے اور ان میں ایسی صلاحیتیں پیدا کردی جائیں کہ وہ مقامی ترقیات کے منصوبوں کو خود تیار کریں۔

ذیلی درآیدوں کی ضرورت

حکومت نے جو آمدنی بڑھانے والے پروگرام شروع کیے ہیں، وہ بے شبہ غریبوں کی حالت کو سدھارنے اور پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے پیسے کے کام کریں گے۔ پھر بھی صحیح معنوں میں مستفیض ہونے کے لیے انھیں کچھ ذیلی (سہارے کے طور پر کام آنے والے) درآیدوں کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر ان میں سے بہت سے پروگراموں میں دیہاتی طریقے زیادہ نفع بخش ثابت ہوسکتے ہیں۔ وہ آدمی جو کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کی طرف سے کام کررہے ہیں ان طریقوں کو آزما سکتے ہیں۔ وہ ان طریقوں میں کچھ ردو بدل کرکے یا ان کو ترقی دے کر اعلا سطح کی پیداواریت حاصل کرسکتے ہیں۔ بلکہ نیم تعلیم یافتہ کارکن اور خاص طور سے عورتیں بھی ایسا کرسکتی ہیں۔ ان طریق کاروں (تکنیکوں) کا کافی بڑا دائرہ ہے جیسے خوراک اور مبنی بر زراعت صنعتیں، کھیتی اور آمدنی والے پودوں کی عمل کاری، چمڑا اور مبنی بر مویشیان طریق کار، بلڈنگ میٹریل اور تنظیم، پینے کا پانی، ماحول اور صفائی، کرافٹ ورک کی بعض قسمیں جو مقامی طور

پر دستیاب میٹریل پر مبنی ہوں اور روایتی ہنرمندی کے کاموں کا درجہ بڑھانا۔ ان ٹکنالوجیوں کے علاوہ جو سی ایس آئی آر اداروں میں دستیاب ہیں، ہندوستان کے چند سائنٹی فیکلی طرز کے این۔جی۔اوز نئے طریقہ جات اور آلات کو رواج دے رہے ہیں تاکہ ان کی ٹریننگ دیہات کے نوجوانوں اور عورتوں کو پیداوار اور سروس دونوں کے اعتبار سے مہیا کی جا سکے۔ اس مہارت میں ان کی تنظیمی اور بازاری صلاحیتیں بھی شامل ہوں گی۔ CAPART۔ اور دوسری فنڈ مہیا کرنے والی ایجنسیوں کے ذریعہ ان کی شناخت قائم ہو سکے گی۔ مقامی حالات سے مطابقت رکھنے والی فیلڈ ڈیولپڈ اور فیلڈ ٹیسٹیڈ ٹکنالوجیوں کی حوصلہ افزائی اور انھیں امداد دینا نہایت ضروری ہے۔ تاکہ ایسے دیہی آمدنی بڑھانے کی تدابیر جلد بطور پر نتیجہ خیز ہو سکے۔ بلاک سطح اور دیہات مجموعہ سطح پر کی جانے والی چھوٹی منصوبہ کاری کی مشقوں کے ذریعہ غیر مجموعی منصوبہ کاری اور اس سمت کے عمل کو کیا جا سکتا ہے۔

ان تمام تدابیر کے سلسلے میں جن کا مقصد پیداوار کو بڑھانا اور غریبی کی تخفیف کرنا ہے، ظاہر ہے رضاکار تنظیموں اور NGOS کو مدعو کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ دوسرے کارپوریٹ سیکٹر کو بھی اپنے نجی مفادات کے پیش نظر تخفیف غریبی کے لیے کام کرنا ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا بھی عوام کو اطلاعات بہم پہنچائیں گے خاص کر دیہات کے غریبوں کو۔ تاکہ یہ لوگ مختلف اقسام کے پیشوں میں ٹریننگ اور مالی امداد حاصل کریں اور اس سمت میں آمدنی بڑھانے کے امکانات کو بھی اپنی گرفت میں لا سکیں۔

کارپوریٹ سیکٹر کا کردار

جب کہ موجودہ معاشی حالات میں ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسداد غریبی کی بڑے پیمانے پر تدابیر اختیار کرے، لہٰذا اس سلسلے میں کارپوریٹ سیکٹر کے رول پر بہت زیادہ زور دیا جانا چاہیے۔ کارپوریٹ سیکٹر صحیح معنوں میں آزاد بازار کے زور سے فائدہ پہنچا رہا ہے۔ گزشتہ دو سالوں سے یہ فائدے ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اب وہ دیہی آبادی کی صلاحیتوں کو بڑھانے کے لیے ریاست کی مدد کر رہا ہے تاکہ اس سے غریبوں کی قسمت کھل جائے۔ اس کام کو وہ منصوبہ بند تعلیم کے درآیدوں سے، ٹریننگ پیداواری مراعات اور مارکیٹنگ کے ذریعہ انجام دے رہا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ صنعت اور تجارت کو بھی اس معاملے میں سنجیدگی کے ساتھ توجہ کرنی چاہیے۔ دیہی اور قبائلی غریبوں اور خاص کر عورتوں کی حالت کا تقاضہ یہ ہے کہ کارپوریٹ میں اصل کاری کی جائے۔ لیکن کارپوریٹ کی شمولیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قدیم طرز سے ہٹ کر جدید طرز کی طرف رجوع کرے۔ یہ اصل کاری اب خیرات کی شکل میں نہیں ہونی چاہیے۔ خواہ یہ حکومت کے ذریعہ ہو یا براہ راست غریبوں کی جھولی میں ڈالی جائے۔

کارپوریٹ سیکٹر کو ملک کے قدرتی اور انسانی وسائل بڑھانے کے لیے فوری اور حقیقی اصل کاری کو اپنی ذاتی دلچسپی کا معاملہ بنا لینا چاہیے کیوں کہ اس اصل کاری کے بغیر کھلے بازار کے اقدامات میں حسب منشا پیش رفت نہیں ہو سکتی۔ حال میں FICCI نے ایک خلاصہ شائع کیا ہے۔ اس میں اس نے غریبی کی تخفیف اور فلاح و بہبود کے سلسلے میں کارپوریٹ کے کاموں کو بھی اپنی فہرست میں شامل کیا ہے لیکن اسے ابھی تک پرانے وقت کے چھوٹے تاجر کی خیرات کی قدیمی ذہنیت کا مظاہرہ ہوتا ہے اس خلاصے کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں تجارت پیشہ کمیونٹی کے فلاحی کاموں میں کافی برسوں سے نمایاں تبدیلی دکھائی پڑ رہی ہے۔ لیکن جن کاموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے انھیں پڑھ کر لگتا ہے کہ متمول لوگوں کی خیرات والی ذہنیت سے الگ ہٹ کر صرف تھوڑا بہت کام ہوا ہے۔ لہٰذا اب اہل تجارت و اہل صنعت کو چاہیے کہ وہ نفع کے سلسلے میں اپنے نظریہ کو جدید بنانے کی کوشش کریں اور اپنا نظریہ اس حقیقت پر قائم کریں کہ ہندوستان کے غریب عوام فضول شے نہیں ہیں بلکہ وہ ہر قوت، مضبوط اور تخلیقی انسانی وسائل کی شکل رکھتے ہیں جسے ہر ایک کو اپنے نفع کے لیے ترقی دینی چاہیے۔ اگر کارپوریٹ سیکٹر اس قابل عمل نظریہ کو قبول کر لیتا ہے تو پھر وہ قومی تعمیر کے کاموں میں صرف غریبوں کی مدد کے لیے کچھ رقم دیدینے تک اپنی شمولیت کو محدود نہیں کرے گا اور یہ سوچ کر مطمئن نہیں ہوگا کہ وہ ایک فریب دہ "کمیونٹی ڈیولپمنٹ" کی مد میں خرچ کر چکا ہے بلکہ وہ آئندہ اس سلسلے میں دوبارہ غور کرے گا۔ اس دیباچے نے فورڈ فاؤنڈیشن کے ایک جائزے کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ سماجی مسائل کے سلسلے میں ہندوستانی کارپوریٹ سیکٹر مصروف کار رہا ہے اور اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ یہ مصارف ٹیکس کے خالص منافع کا تقریباً ۳ فی صد ہے۔ یہ انکشاف یقینی طور پر ہندوستانی کارپوریٹ سیکٹر کے لیے وجہ امتحان نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی واضح نہیں ہوتا کہ حقیقی انسانی وسائل کی ترقی کے بارے میں ان کی سوچ مبنی بر مستقبل ہے جس سے اندرون ملک کھلے بازار کو فروغ دے سکیں اور کھلے عالمی بازار میں کسی دن امتیاز حاصل کر سکیں۔

لہٰذا آئندہ کچھ عرصے تک تو خاتمۂ غریبی کی ذمہ داری ریاست کی ہی رہے گی۔ خاص طور پر دیہی علاقوں کی تعمیر نو کے سلسلے میں اور دیہی غریبوں کی شہری مراکز کی طرف منتقلی کو روکنے کے لیے پہلے ہی سے اس قسم کی آبادی کے دباؤ سے ان مراکز کی حالت ابتر ہو گئی ہے۔ اب کارپوریٹ سیکٹر کو چاہیے کہ وہ خیرات کی ذہنیت کی بجائے انوسٹمنٹ کی ذہنیت پیدا کریں۔ اپنے مفادات میں بھی اور ریاست کے مفادات میں بھی۔ انھیں چاہیے کہ وہ اس میدان میں سرکاری خزانے پر پڑنے والے بار کو کم کریں۔ چناں چہ عوام میں اس کے متعلق دلچسپی پیدا کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس کام کی حمایت ہونی چاہیے۔ تخفیف غریبی کے مسائل سے سماج کے تمام طبقوں میں بیداری پیدا کرنے میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن بہت بڑا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ میڈیا دیہی سماج سیوکوں، کسانوں اور دست کاروں کی تعلیم و تربیت کر سکتا ہے۔ اس طرح تمام فریقین کے اشتراک سے غریبی کی تخفیف کے مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے اور اس سے بلاشبہ سبھی کو فائدہ پہنچے گا۔

دیہی غریبی کم کرنے کے لیے حکومت کی سعی و تدابیر کو بہت سے مخالف عوامل کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جیسے آبادی میں متواتر اضافہ، تعلیم کی کمی اور ذیلی ساخت اور بروقت ہونے والی انتظامی اور مالی کارروائیاں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنا اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ خاتمۂ غریبی کے پروگراموں کو شروع کرنا۔ خاتمۂ غریبی کے پروگراموں کو دیہی ترقیات کے

باقی صفحہ ۱۴ پر

ڈاکٹر ایم ایس سوامی ناتھن، ڈاکٹر ونیتا ابجن، لتا ناگارجن اور برندھا این

دیہی غریب عوام کی مدد

اس تحریر کے مرتبین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ غیر منظم خود روزگار شعبے کی بقا اور توسیع کے لیے یہ ضروری ہے کہ فوری طور پر اس کی حوصلہ افزائی کر کے اسے مستحکم بنایا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایسا طریقہ اختیار کر کے اسے منظم کیا جائے جس کے تحت اسے مطلوبہ سماجی، سیاسی ٹکنالوجیکل اور معاشی اختیارات حاصل ہو سکیں۔ خود سے روزگار حاصل کرنے والوں کو جس نوعیت کے مسائل درپیش ہیں، ان کے بارے میں عام بیداری لانے میں ذرائع ابلاغ بہت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔

اس وقت دنیا ایک ایسی معاشی ترقی کے عمل سے گزر رہی ہے جس کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ غریب اور بے روزگار افراد پچھڑتے جا رہے ہیں، غریبی بد سے بدتر شکل اختیار کر رہی ہے اور ماحولیاتی صورت حال بگڑتی جا رہی ہے۔ اس بات کی فوری طور پر ضرورت ہے کہ زرعی اور دیہی ترقیات کے لئے نیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے جو زمین کی پائیدار ماحولیاتی صورت حال، سماجی انصاف اور اقتصادی استحکام کے مربوط اصولوں پر مبنی ہو۔ ملک سے بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو ختم کرنے کے لئے ہندوستانی معیشت کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ ۲۰۰۰ء تک دس کروڑ افراد کو روزگار فراہم کرے۔ یا ایسے مواقع مہیا کرے جن سے لوگ اپنی دال روٹی کا بندوبست کر سکیں۔ روزگار کے یہ بیشتر ذرائع خالص دیہی (مثلاً کھیتی، مویشی پالن، ماہی گیری اور شجر کاری وغیرہ) اور نیم دیہی (مثلاً زراعت سے جڑی صنعت، چھوٹے پیمانے کی کمپنی اور ملازمت کے شعبے) دونوں محاذوں سے حاصل کیے جانے چاہئیں۔ دیہی شعبے سے سربجھتی مقصد یعنی "زیادہ کمانا، روزگار کے زیادہ مواقع اور زیادہ آمدنی" حاصل کرنے کے لیے فوری طور پر ضرورت اس بات کی ہے کہ دیہی نظام میں زیادہ وسعت اور تنوع پیدا کیا جائے جو ایسی ٹکنالوجی پر مبنی ہو جس میں زمین کی بہتر صورت حال کو برقرار رکھنے، معاشی اور سماجی سطح پر انصاف دلانے اور اس عمل میں جنسی امتیاز کو ختم کرنے کے اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے۔

آٹھویں پنجسالہ پلان کے خاکے میں ترجیحات کا اولین مسئلہ یہ پیش کیا گیا ہے کہ "اتنے بڑے پیمانے پر روزگار مہیا کئے جائیں کہ اس صدی کے اختتام تک تقریباً ہر ایک کو روزگار حاصل ہو جائے۔"

دوسری ترجیح یہ ہے کہ "زراعت کے شعبے میں پیداوار بڑھائی جائے اور تنوع لایا جائے تاکہ

ملک سے بڑھتی ہوئی بے روزگاری کو ختم کرنے کے لیے ہندوستانی معیشت کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ ۲۰۰۰ء تک دس کروڑ افراد کو روزگار فراہم کرے یا ایسے مواقع مہیا کرے جن سے لوگ اپنی دال روٹی کا بندوبست کر سکیں

غذائی محاذ پر خود کفیل ہوا جائے اور برآمد کے لیے غذا، فاضل اناج حاصل کیا جائے۔" اس سمت جو کام باقی ہے وہ یہ ہے کہ حکمت عملی کی تفصیل ترتیب دی جائے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے پروگرام نافذ کیے جائیں۔

چھوٹے اور برائے نام کسانوں کی مدد کرنے سے متعلق حکمت عملی زرعی تجارت نے ابھی تک بڑے تاجروں یا کاروباری گھرانوں اور کثیر قومی کمپنیوں کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ایسا اس لئے ہوا کہ زرعی تجارت سرمایہ کاری اور خطرات مول لینے کی متقاضی رہی ہے۔ اس شعبہ میں سرمایہ کے ساتھ ساتھ ٹکنالوجی، ٹریننگ اور تجارت سے متعلق مناسب خدمات کا سہارا بھی درکار ہوتا ہے۔ پائیدار زرعی تجارت کے لیے نئی ٹکنالوجی، پیشہ ورانہ مہارت اور بہتر ماحولیاتی صورت حال کی ضرورت ہے اس کے لئے ایسی ٹریننگ، نئی مہارت اور پیداوار سے جڑی ہوئی تجارت کو اس طرح فروغ دینے کی ضرورت ہے کہ زرعی پیداوار کا مالک، صارفی کی رقم کا زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کر سکے۔ اس طرح کا زرعی کاروبار بڑے صنعتی گھرانوں میں موجود ہے۔ ہمارے ملک میں جہاں تقریباً ساڑھے سات کروڑ ایسے کسان گھرانے رہتے ہیں (جن کا تعلق چھوٹے اور برائے نام کسانوں کے حلقے سے ہے اور جس حلقے میں بڑی تعداد میں گاؤں کے بے زمین مزدور بھی شامل ہیں) ایک ایسا چیلنج درپیش ہے جس کے تحت ایسا تصور اختراع کیا جانا چاہیے کہ زرعی تجارت سے ہونے والے فائدوں سے دیہی علاقوں کے غریب خاندانوں کو مستفید کیا جا سکے۔ اس تشویش کا

احساس کرتے ہوئے وزیر خزانہ نے ۱۹۹۲ء میں اپنی بجٹ تقریر میں کہا تھا:۔

"ہمیں اپنے زرعی شعبے کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع کرنا ہوگا، جہاں زرعی کاروبار نہ صرف زیادہ غذا مہیا کرے بلکہ دیہی علاقوں میں سود مند کام اور اعلیٰ آمدنی بھی فراہم کر سکے۔"

اسی خیال کے تحت سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر کی صنعت کے درمیان ایک نئے تال میل اور سماجی رابطے کو فروغ دے کر جدید زرعی تجارت سے غریب گھرانوں کو مستفید کرنے کے لیے ایک طریقہ کار کے طور پر نئے تصور کو جنم دیا گیا جسے "اسمال فارمرز ایگرو۔ بزنس کنسورشیم" (ایس ایف اے سی) کا نام دیا گیا ہے۔ صرف اسی طرح کا رابطہ یا کنسورشیم پیداوار کے چھوٹے مالکان کو اس طرح کے فائدے پہنچا سکے گا، جو بڑے زرعی تجارت کے گھرانوں کے لئے مخصوص رہے ہیں۔

ایس ایف اے سی کی حکمت عملی کے تحت زیادہ زور اس بات پر دیا جا رہا ہے کہ ایسے امکانات پیدا کئے جائیں جن کے تحت تلہن کی فصل، سبزی کی پیداوار، باغبانی، مویشی پالن اور زراعت وغیرہ کو فروغ دیا جائے اور بنجر زمینوں کو فروغ دے کر انہیں قابل استعمال بنایا جائے۔ اس نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ زرعی پیداوار کے مالکان کی ایک تنظیم قائم کرنی چاہیے، جو پیداوار، متعلقہ تجارتی عمل اور مارکیٹنگ سے متعلق سرگرمیوں کو مربوط کرے اور مشترکہ سیکٹر، کارپوریشن کی شکل میں پیداوار کے بنیادی مالکان اور پرائیویٹ صنعت کے درمیان قریبی رابطے قائم کرے۔

اس پروگرام کے تحت، پیش رفت کے طور پر ملک کے مختلف متعلقہ علاقوں میں بارہ اضلاع کا انتخاب کیا گیا۔ یہ انتخاب پلاننگ کمیشن نے متعلقہ ریاستوں کی حکومتوں کے ساتھ صلاح و مشورے کے بعد کیا ہے۔

اس پروجیکٹ کا خاکہ تیار کرنے والی ٹیم کا رکن بنانے کے لیے ملک کے مختلف علاقوں میں کام کرنے والے معروف خود مختار یا سرکاری اداروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ پروجیکٹ کا خاکہ تیار کرنے والی ٹیموں کو وسیع تر اسٹرنگ کمیٹیوں اور بین شعبہ جاتی ٹیموں کا تعاون حاصل ہوا تھا۔ یہ اسٹرنگ کمیٹی ریاستی حکومتوں، این اے بی اے آر ڈی، آئی ڈی بی آئی، ریزرو بینک آف انڈیا، سروس انڈیا بینک، انشورنس کمپنیوں اور زرعی یونیورسٹیوں / آئی سی اے آر کے اداروں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ پراجیکٹ وضع کئے جانے کے ابتدائی مرحلوں میں قرض دینے والے اور بینک کاری کے اداروں کو شامل کرنا بڑی اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ اس کا بنیادی مقصد ایسے پروجیکٹ قائم کرنا ہے جو بینک کے نظام سے جڑا ہوا ہو، اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ مارکیٹ پہ چلنے والی کمپنیوں کی نشان دہی کی جائے نہ کہ رعایت

یا سب سڈی سے چلنے والی کمپنیوں کی۔

کنسورشیم کے مختلف ممبروں کے متعلقہ رول کی مندرجہ ذیل خطوط پر نشان دہی کی جا سکتی ہے۔

۱۔ حکومت ایک دوست رہنما فلسفی اور معاون کے طور پر کام کرے تاکہ جن لوگوں نے بنیادی طور پر اپنے آپ کو داؤں پر لگا رکھا ہے وہ اپنے معاملات سے خود ہی نمٹ سکیں۔ اس سلسلے میں حکومت جو اہم رول ادا کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مطلوبہ تکنیکی ڈھانچہ مہیا کرنے کی گنجائش پیدا کرے، خاص طور سے ان اشیاء کے لئے جو بہت جلد برباد ہو جاتی ہیں۔

(۲) تعلیمی اور تحقیقی ادارے نیز پبلک سیکٹر کے کارپوریشن، تکنیکی سہارا مہیا کر سکتے ہیں اور ایسی ٹریننگ کا اہتمام کر سکتے ہیں جن کے تحت موجودہ متعلقہ مہارتوں میں بہتری لائی جا سکتی ہے نیز نئی مہارتوں کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔

(۳) پرائیویٹ سیکٹر کی صنعت، بلکہ مجموعی طور پر کارپوریٹ سیکٹر "ایس ایف اے سی" کو زرعی پیداوار کے لیے پہلے سے مقررہ شرائط اور انتظامات کے تحت کنٹریکٹ حاصل کرنے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کمپنیاں انتظامی امور کی ٹریننگ دے سکتی ہیں۔ بیج سپلائی کر سکتی ہیں اور اعلیٰ کوالٹی کی پیداوار، پروسیسنگ اور پیکیجنگ کے لئے دوسری ضروری خدمات مہیا کر سکتی ہیں۔ پرائیویٹ کمپنیاں دیہی عورتوں کے لئے متعلقہ ٹریننگ کا بھی انتظام کر سکتی ہیں۔

(۴) مالیاتی اداروں کو چاہیے کہ وہ ایس ایف اے سی کے ممبران کو اپنا قابل قدر گاہک تصور کریں نہ کہ ایسا طبقہ جنہیں جوان سے محض مستفید ہونا چاہتا ہے اس پروجیکٹ کی کامیابی کے لئے انہیں ہر ممکن مدد کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر سرمایہ مہیا کرنا چاہیے۔

(۵) ذرائع ابلاغ کامیاب تجربوں کو اجاگر کر کے اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ اس طرح اس چھوٹے پیمانے کے زرعی کاروبار کرنے والے لوگوں کے حوصلے بلند ہوں گے اور ان میں اعتماد پیدا ہوگا۔

(۶) ایس ایف اے سی کو مطلوبہ مالیہ، سیاسی اور انتظامی سہارا مہیا کر کے قوم خود مجموعی طور پر عالمی نقشے میں ایک اہم زرعی طاقت بن کر ابھر سکتی ہے۔ گذشتہ تیس برسوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ ترقی کی نچلی سطح کی نفع بخش اسکیم بہت اچھے اثرات مرتب کرتی ہے خواہ اس کے تحت کسی ایک ہی فصل یا مویشی کا احاطہ کیا ہو۔ اگر ہم پنجاب کے زرعی شعبے پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں زراعت کا فروغ گیہوں کی پیداوار

سے مہاراشٹر کا یہ علاقہ اس شعبے میں اتنی ترقی ہوئی کہ چاول آلو، گنے کی پیداوار نیز باغبانی دودھ کے کاروبار اور فروغ ماہی گیری کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ زراعت کے شعبے سے وابستہ خاندان بہتر انتظامی اصولوں کو بڑی تیزی سے آگے بڑھاتے ہیں اور ایک فصل میں حاصل کئے گئے تجربوں کا اطلاق دوسری فصلوں پر کرتے ہیں اور زراعت کے پورے نظام کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اس لئے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اگر ایس ایف اے سی کی متوازن اور معقول انداز سے پیش رفت ہوئی اور شروع میں احتیاط کے ساتھ چند منتخب کئے گئے شعبوں میں توصلہ مندی کے ساتھ توجہ دی گئی تو اس کے نتیجے میں زرعی شعبے میں انقلابی تبدیلی آسکتی ہے۔" کامیابی کسی طرح کوئی چیز کامیاب نہیں ہوتی لہٰذا ابتدائی مرحلے میں بارہ اضلاع کی سطح پر "ایس ایف اے سی" کی طرف سے جو پیش رفت ہو رہی ہے اس کے ذریعہ اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ "ایس ایف اے سی" ایک دن عوامی تحریک کی شکل اختیار کرے گی" اس سلسلے میں ایک آخری بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ "ایس ایف اے سی کے ابتدائی پراجیکٹوں میں زمین کی صورت حال کو بہتر بنانے اور اس کا تحفظ کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور جو زراعت میں دیرپا ترقی کے لئے ضروری ہے اسلئے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ ایس ایف اے سی کے ذریعہ لیا گیا انقلاب سدا بہار انقلاب ثابت ہوگا۔

"ایس ایف اے سی کے ذریعہ معمولی زمین رکھنے والے مرد عورتوں کو کس طرح فائدہ پہنچے گا؟

"ایس ایف اے سی" چھوٹے کسانوں کو مندرجہ ذیل طریقوں سے فائدہ پہنچاتا ہے۔

- ایسے کام مہیا کرتا ہے جو نفع بخش ثابت ہوں۔
- کھیت کے کاموں سے منڈی کو جوڑتا ہے۔
- انتظامی کارکردگی کو بہتر بناتا ہے اور معیار اور نفع بخش مقابلہ آرائی کو فروغ دیتا ہے۔
- زرعی پیداوار سے حاصل کو تکنیکی اداروں، منڈی اور صارفین سے جوڑتا ہے۔
- قدرتی وسائل کی پائیدار انتظامیہ کو مزید نفع بخش بناتا ہے اور اس کے تئیں دلچسپی پیدا کرتا ہے۔
- کارپوریٹ سیکٹر اور چھوٹے کسان خاندانوں کے درمیان باہمی مفادات کے حامل رابطوں کو فروغ دیتا ہے۔
- شہری و دیہی آبادی کی منتقلی کو روکتا ہے۔
- عورتوں کو معاشی طاقت یا اختیارات دلواتا ہے۔

- پیداوار اور فصل تیار ہو جانے کے بعد کے مرحلوں میں زرعی شعبے کی سرگرمیوں کو فروغ دے کر غریبی دور کرنے کے کاموں میں مدد دیتا ہے نیز تکنیکی ترقی اور منڈی کے نئے مواقع کے فائدوں میں کسانوں کی حصہ داری کو بھی فروغ دیتا ہے۔

بیج گاؤں کے ذریعہ سماجی قرار ناموں کا فروغ

بیج کی صنعت کو "طلوع آفتاب" کی صنعت کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ دیہی علاقوں میں آمدنی اور روزگار میں اضافہ کرنے کا باعث بنتی ہے۔ بیج کی صنعت ورکرز کی حامل تنظیم کے امکانات مہیا کرتی ہے جیسے کلیدی خدمات مثلاً مناسب ٹریننگ، سامان، قرضوں اور گھریلو اور بیرونی منڈی جس سے بنیادی ڈھانچے کا سہارا بھی ملتا ہے۔ یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ جہاں کہیں بھی کسانوں نے بیجوں کی پیداوار سے متعلق سرگرمیوں میں حصہ لیا ہے وہاں ان کی آمدنی میں دگنا بلکہ بعض حالات میں چوگنا بھی اضافہ ہوا ہے۔ کسان گھرانوں سے بات چیت کرنے نیز سروے کرانے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ غریب گھرانوں سے تعلق رکھنے والی عورتیں بیج سے متعلق ٹکنالوجی کے فن اور سائنس میں مہارت حاصل کر سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ان کے لئے ٹریننگ ایسے طریقہ کار کے ذریعہ دی جائے کہ وہ کام بھی کریں۔ اور سیکھیں بھی۔ بیج کی صنعت یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ غریب گھرانوں کی عورتیں اپنے کام کے اوقات میں اضافہ کر کے آمدنی بھی بڑھا سکیں۔ اس پروگرام کے تحت دیہی غریبی عوام کو روزی کمانے کے بہتر امکانات مہیا ہونے کے ساتھ ساتھ کسان سماج کو بہتر فصل اگانے کے وسائل بھی میسر آتے ہیں۔

بیجوں کی پیداوار ایک ایسی مہم جوئی ہے جو ایک طرف مہارت پر مبنی روزگار فراہم کرتی ہے تو دوسری طرف عام فصلوں کے مقابلے کہیں زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے۔ بیجوں کی پیداوار میں عورتیں کافی اہم رول ادا کر سکتی ہیں کیوں کہ بیج کی پیداوار مہارت اور بہتر کارکردگی کی متقاضی ہوتی ہے اور وہ عورتیں جو اس کام سے وابستہ ہیں، انہیں اس سے کافی نفع حاصل ہوتا ہے جو عام فصلوں کے مقابلے میں دگنا ہوتا ہے۔

"بیج گاؤں" کی ایک کامیاب مثال آندھرا پردیش کا انکاپور گاؤں ہے جہاں اس وقت لوگ ایک ساتھ کام کریں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے جب انہیں فائدے کا ایک مشترکہ محور نظر آئے گا۔ یہاں اس پس منظر میں ان کا "مشترکہ محور" زیادہ نفع اور اعلا آمدنی ہوگی۔ اس گاؤں میں یہ تبدیلی اس وقت آئی جب یہاں کے لوگوں نے دو سال قبل نیشنل سیڈ کارپوریشن کے لئے بیجوں کی پیداوار میں دلچسپی لی۔ اس طرح" دو سلسلے "بیجوں کی پیداوار، ان کسانوں کے درمیان زبردست آپسی تعاون کے متقاضی ہے جن کے کھیت آس پاس ہوتے ہیں اس ضمن میں اس بات کو ترجیح دینی چاہیے کہ تمام کسان ایک ہی قسم کے بیج پیدا کریں۔ کسانوں نے ایک کوآپریٹو سوسائٹی قائم کی۔ اور نیشنل سیڈ کارپوریشن کو بیج سپلائی کئے۔ ان لوگوں نے حال ہی میں بیج کا کاروبار کرنے والی پرائیویٹ کمپنیوں سے باقاعدہ تجارتی رابطے بھی قائم کئے۔

آئی اے ٹی ایس کرناٹک کے ضلع بنگلور میں واقع ہے۔ لہٰذا بیجوں کی پیداوار سے متعلق سرگرمیوں اور تجارتی معاہدوں کا مرکز یہی ریاست ہے اس کمپنی نے زیادہ توجہ بیج کی پیداوار سے وابستہ عورتوں پر مرکوز کی ہے اور اس طرح دیہی عورتوں کو

گذشتہ [illegible] برسوں [illegible] ہم بہت اچھے [illegible] ایک [illegible] زرعی شعبے پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ [illegible] زراعت کا [illegible] پیداوار [illegible] شعبے میں [illegible] ترقی ہوئی کہ چاول، آلو، گنے کی پیداوار نیز باغبانی دودھ کے کاروبار اور [illegible] کو کافی فروغ ہوا۔

اضافی آمدنی کے ذرائع مہیا کئے ہیں۔ آمدنی بڑھانے کے لئے نئی متعلقہ مہارتوں کو بھی فروغ دیا گیا ہے۔ اس نمونے کے تحت، کچھ ہی کسان معاہدے کے مطابق دو نسلی سبزیوں کے بیج اگاتے ہیں اور پورا گاؤں بیجوں کی پیداوار کے باعث مستفید ہوتا ہے۔ اس طرح کے معاہدے کچھ اس نوعیت کے ہوتے ہیں جو تکنیکی طور پر قابل عمل شعبوں میں زیادہ کامیاب ثابت ہو سکتے ہیں۔ بہر حال محدود وسائل اور انتظامی صلاحیت کے پیش نظر بہت بڑے علاقہ کا احاطہ کرنا فی الحال مشکل امر ہے۔ وہ غیر سرکاری ادارے، جو عوام کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ کسانوں اور بیج کی صنعت کے درمیان سماجی اقرار ناموں کو فروغ دینے میں قابل قدر خدمات انجام دے سکتے ہیں جس سے دونوں فریقوں کے مفادات کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ گاؤں کی سطح پر رابطے کا ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جو غریب کسان سماج کو درپیش بعض مشکلات پر قابو پانے میں معاون ثابت ہو۔ ان کی مشکلات میں تکنیکی جانکاری، قرض، تکنیکی ڈھانچہ اور پیداوار پر مبنی منڈی کے ڈھانچے کی عدم دستیابی شامل ہیں۔ مزید برآں اس بات پر بھی زور دینا چاہیے کہ ایسے کسانوں کے لئے زرعی کاروبار کی ایک زبردست تحریک شروع ہو سکے۔ جس کے لئے مناسب ٹکنالوجی ٹریننگ اور تجارت ضروری ہے۔ قرضوں کی فراہمی بھی اہم اور خاص رول ادا کرے گی۔ لہٰذا ٹکنالوجی اور قرضوں کے سلسلے میں ان تبدیلیوں پر اجمالاً نظر ثانی کرنا مفید ثابت ہوگا، جن کی ضرورت پیش آئے گی۔

تجارت سے متعلق اخراجات میں کمی اور قرضوں کی فراہمی

منظم شعبے، جن میں سرکاری ملازمتیں بھی شامل ہیں، آبادی کے دس فیصد سے بھی کم بالغ افراد کو کام مہیا کرتے ہیں۔ جب کہ نوے فیصد سے زیادہ افراد اپنی روزی کے لیے اپنے طور پر روزگار حاصل کرتے ہیں۔ ان میں غیر منظم اور بالکل آزاد یا پرائیویٹ شعبے شامل ہیں کسان اور بے زمین مزدور خاندان کی اکثریت خود سے روزگار حاصل کرتی ہے۔ غیر منظم اور خود روزگار شعبے اگرچہ ملک کی سماجی اور معاشی ترقی کے لئے کافی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بیشتر پالیسیاں، پروگرام، وسائل حتیٰ کہ قانونی ضابطے بھی منظم شعبے کے مفادات کو فروغ دیتے ہیں۔ انفرادی کے لحاظ سے...

تنخواہوں میں مطابقت پیدا کرتا، تنخواہ کمیشن کے ذریعہ وقفے وقفے سے تنخواہوں پر نظر ثانی کرنا اور اعلیٰ تعلیم اور صحت سے متعلق خصوصی توجہ سمیت ملازمین کی بہبود اور سلامتی سے متعلق متعدد اقدامات تنخواہ پانے والے ملازمین کیلئے مخصوص ہیں، جو چند اقدامات غیر منظم شعبے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ان میں فلاحی اور غریبی دور کرنے سے متعلق اقدامات شامل ہیں اور ان سے خوش حالی پیدا کرنے کا طریقہ فروغ دینے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ بیشتر حالات میں، خود سے روزگار حاصل کرنے والوں کا اپنا کوئی اثاثہ نہیں ہوتا۔ یعنی زمین پانی، مچھلیوں کے تالاب، پیڑ یا آمدنی حاصل کرنے والے دوسرے وسائل نہیں ہوتے لہٰذا انہیں روزی کے لئے یومیہ اجرت پر کام کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اندازوں سے یہی بات سامنے آئی ہے کہ جہاں ہر سال ایک کروڑ چالیس لاکھ اضافی روزی مہیا کرنے کی ضرورت ہے جس کی روزگار کے مواقع مہیا کرنے کے اعتبار سے شرح نمو ۲ء۸ فیصد

> بیج کی صنعت کو "طلوع آفتاب کی صنعت" کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دیہی علاقوں [illegible] آمدنی [illegible] روزگار میں اضافہ کرنے کا باعث بنتی ہے۔ بیج کی صنعت [illegible] تنظیم کے امکانات پیدا کرتی ہے [illegible] مناسب [illegible] سالانہ [illegible] زیادہ ڈھانچہ [illegible]

سالانہ ہونی چاہئے، وہاں آٹھویں پلان کے پہلے تین برسوں میں سالانہ صرف ساٹھ لاکھ پچاس ہزار کام کے مواقع مہیا کئے گئے۔ چوں کہ غریبی دور کرنے کی اسکیمیں عام طور سے مؤثر منشا سے پورا نہیں کر پاتیں۔ اس لیے غریبی کی سطح سے نیچے کی زندگی گزارنے والے افراد کی تعداد آج اتنی ہی ہے جتنی پہلے پنجسالہ پلان کے اوائل میں پورے ملک کی آبادی تھی پھر بھی پنجسالہ اور سالانہ منصوبوں میں غریبی دور کرنے کے پروگراموں کو اولین مقصد کا حامل بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ آخر غلطی کہاں ہوئی؟

چھٹے پنجسالہ پروگرام (۸۵-۱۹۸۰) میں پہلی بار اس مسئلہ کو ایک ذیلی باب کے تحت بعنوان، "خود سے روزگار حاصل کرنے والوں کے لیے نیا منصوبہ" شامل کیا گیا تھا اس باب میں کہا گیا تھا "فروغ انسانی وسائل اسی وقت پورے طور پر کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے جب تمام شہریوں کو تقریباً مستقل روزگار مہیا کرنے کی گنجائش پیدا کی جائے۔ غریبی کو ان حالات میں بڑھاوا ملتا ہے جب انسانی وسائل کو کمتر اور مادی وسائل کو برتر سمجھا جاتا ہے"۔ چھٹے پلان میں مجموعی اوسط کے بجائے مخصوص علاقوں کی صورت حال کے مطابق حکمت عملی اختیار کرنے پر زور دیا گیا تھا تاکہ اس پیچیدہ اور چیلنج سے پُر مسئلہ کا کوئی بامقصد حل تلاش کیا جا سکے اس مقصد کے لئے منصوبے میں یہ سفارش پیش کی گئی تھی کہ ہر ضلع میں "ضلعی افرادی قوت پلاننگ" اور روزگار پیدا کرنے کی کونسل قائم کی جائے۔ ان کونسلوں کو جو کام تفویض کئے گئے تھے ان میں ایک کام یہ بھی تھا کہ ٹریننگ اور مہارت پیدا کرنے والے پروگراموں کو منڈی پر مبنی روزگار کے مواقع سے جوڑا جائے۔ بدقسمتی سے خود سے روزگار حاصل کرنے والوں کے لئے پیش کردہ نئے منصوبے کو بعد کے پلان کے خاکوں میں شامل نہیں کیا گیا۔ لہٰذا ابھی تک اس منصوبے کا انتظار ہے۔

مختلف مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ روزگار سے عاری اقتصادی ترقی جدید صنعتی سماج کی خصوصیت ہے۔ مناسب پبلک پالیسی کے سہارے کی عدم موجودگی میں، اندھا دھند پیداوار کی ہم جوئی کا رویہ معیشتوں کی عالم گیریت کے ماحول میں تباہی سے دوچار ہوگا۔ ۱۹۹۲ء میں ٹیکسٹائل، دستکاری اور چمڑے جیسے شعبوں میں تین کروڑ سے زیادہ دیہی پیمانے کے کام شروع کئے گئے اور اس طرح کے ہر شعبہ میں اوسطاً ۲ء۲۲ افراد کو کام دیا گیا۔ ان میں سے ستر فیصد سے زیادہ شعبوں کی بجلی تک رسائی نہ ہو سکی۔ ۸۸-۱۹۸۷ء کے دوران زرعی شعبے میں روزگار کی شرح نمو صرف ۲ء۷ فیصد سالانہ تھی۔ لہٰذا آنے والی دہائیوں میں فصل مویشی پالن، ماہی گیری، شجر کاری نیز زرعی اور دیہی صنعتوں کو ہی زیادہ سے زیادہ کام مہیا کرنا پڑے گا۔ اس پس منظر میں سرکاری پالیسی کا ایک ایسا دائرہ کار وضع کرنا اشد ضروری ہے۔ جو دیہی علاقوں کی خود روزگاری

کو بڑھاوا دینا اور [illegible] نفع بخش خود روزگاری کے مواقع پیدا کرنے کی اسکیم کو مطلوبہ سازگاری ماحول پیدا کر کے اسے سہارا دینے کے لئے ضروری ہے کہ علاقے اور حلقے کی الگ الگ نشان دہی کی جائے۔

معاشی، ماحولیاتی اور سماجی طور پر پائیدار نوعیت کی خود روزگاری کو فروغ دینے کے لئے پالیسی کا جو بھی دائرۂ کار وضع کیا جائے گا اس کی بنیاد یہ بات ہوگی کہ غیر منظم شعبے کی طاقت اور کمزوریوں کو ذہن میں رکھا جائے اور اس کے مطابق حکمت عملی ترتیب دی جائے۔ مثال کے طور پر منظم شعبے کو کئی طرح کا سہارا دیا جاتا ہے مثلاً صنعتی پالیسی، امپورٹ اور ایکسپورٹ کی پالیسی، ٹیکس کی رعایت، خطرات مول لینے کی پشت پناہی، سرمائے کی فراہمی، معقول قرضے کی سہولیات ، انشورنس، بنیادی ڈھانچہ اور پیشہ ورانہ ترقی کے مواقع وغیرہ جیسی بہت ساری سہولیات مہیا کی جاتی ہیں ان باتوں کے علاوہ منظم صنعت کو سی آئی آئی اے ایف آئی سی سی آئی اے ایس ایس ایس اوسی ایچ اے ایم وغیرہ جیسی تنظیموں کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے منظم شعبے سے متعلق پالیسیوں پر اسی لئے اکثر نظر ثانی بھی ہوتی رہتی ہے اور ضروری تبدیلیاں بھی لائی جاتی ہیں حکومت ہند کے سالانہ بجٹ میں جو اعلانات ہوتے ہیں ان کا تعلق بڑی حد تک منظم شعبے کو سہارا فراہم کرنے سے ہوتا ہے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے ملازمین کا بھی اچھی طرح خیال رکھا جاتا ہے لیکن اس کے برعکس آبادی کے غیر منظم اور خود روزگاری کے شعبہ کو مربوط یا طویل مدتی پالیسی نہیں مہیا کی جاتی۔ وقتاً فوقتاً غریبی دور کرنے یا لوگوں کو مستفید کرنے والے پروگرام مثلاً آئی آر ڈی پی، ڈی پی اے پی ڈی ڈبلو سی آر اے، ٹی آر وائی ایس ای ایم اور متعدد روزگار یوجناؤں کا اعلان کیا جاتا ہے تاکارہ زمینوں کو قابل استعمال بنانے یا شجر کاری کے پروگرام، جنہیں غریبوں کے لئے روزگار فراہم کرنے کا وسیلہ سمجھا گیا وہ بھی اکثر اس مقصد میں ناکام ثابت ہوئے۔ غریبی دور کرنے کے مقصد سے روزگار پیدا کرنے والے بیشتر پروگرام کسی حد تک صرف غیر ہنر مند لیبر کی ضروریات پوری کر سکے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بے روزگاری کا جو سنگین مسئلہ درپیش ہے اس پر اب تک سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا ہے۔

حکومت کے روزگار مہیا کرنے والے بیشتر پروگرام مختلف محکموں اور ایجنسیوں کے ذریعہ متوازی خطوط پر چلائے جا رہے ہیں اور ان میں پیشہ ورانہ سطح پر آپس میں کوئی تال میل بھی نہیں ہے۔ کمزور طبقوں کی فلاح کے لئے جو خصوصی کارپوریشن قائم کئے گئے مثلاً درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے ترقیاتی کارپوریشن اور عورتوں کی ترقی اور بہبود کے لئے قائم کئے گئے کارپوریشن بھی اپنا مقصد حاصل کرنے میں اکثر ناکام رہے ہیں۔ لوگوں کو مستفید کرنے والا رویہ، جو سرپرستی کرنے کے رجحان پر مبنی ہے، اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ اس طرح کے خود روزگار سے جڑے افراد ملک کے پیداواری شعبے کے اہم ستون ہیں۔ اس بات کا احساس نہ کیا جانا اور عورتوں کو محض ایسے کام دلوانا، جن سے ان کے وقار اور سماجی مرتبہ پر ضرب پڑتی ہو، غریبی اور سماجی نیز جنسی نابرابری دور کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔ عورتوں کو جس طرح کے روزگار مہیا کئے جاتے ہیں، ان میں تعمیراتی کاموں میں مزدوری، گھریلو ملازمت اور چھوٹی چھوٹی چیزیں فروخت کرنے کا کام شامل ہے۔

> بیشتر حالات میں خود سے روزگار حاصل کرنے والوں کا اپنا کوئی اثاثہ نہیں ہوتا یعنی زمین، پانی، مچھلیوں کے تالاب، پیڑ یا آمدنی حاصل کرنے والے دوسرے وسائل نہیں ہوتے لہٰذا انہیں روزانہ کے پیسے یا اجرت پر کام کرنا پڑتا ہے۔

غیر منظم شعبے کی بقا اور توسیع کو اگر یقینی بنانا ہے اور اس طور پر خود روزگاری کو فروغ دینا ہے تو فوری طور پر ضرورت اس بات کی ہے کہ خیرات بانٹنے کی بجائے اسے موافق اور حوصلہ افزا ماحول مہیا کیا جائے۔ خود سے روزگار حاصل کرنے والوں کو موافق اور سازگار ماحول فراہم کرنے کے لئے جو اقدامات ضروری ہیں، ان میں ٹریننگ کے انتظامات اور کاریگری یا ہنرمندی کے کاموں میں بہتری لانا، مناسب ٹیکنیکل ڈھانچے کا سہارا دے کر سہی ٹکنالوجی کو فروغ دینا، منڈی سے متعلق اطلاعات تک رسائی، بروقت اور معقول قرضہ فراہم کرنا، سماجی سطح پر سلامتی مہیا کرنا نیز زمین اور رہائش کی صورت حال کو بہتر بنانا شامل ہے۔ سازگار ماحول مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انہیں بعض معاملات میں اختیار دیئے جائیں مثلاً خود روزگاری کی تنظیموں کا متحدہ محاذ تشکیل دیا جا سکے۔ پرائیویٹ اور سرکاری ملکیت کی کمپنیوں اور اس شعبہ سے وابستہ دیہی افرادی قوت کے درمیان باہمی مفادات سے سماجی معاہدوں کی حوصلہ افزائی ہو اور ذرائع ابلاغ اس شعبے پر توجہ دے کر اس طور پر اسے اجاگر کریں کہ لوگ عورتوں کے رول اور خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں وقار بخشیں۔ دراصل اسی طور پر اس شعبے کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے نیز سماجی ٹکنالوجیکل سیاسی اور اقتصادی سطح پر اختیارات تفویض کئے جا سکتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ اس سلسلے میں کافی اہم رول ادا کر سکتے ہیں جس کے تحت خود روزگاری سے جڑے افراد کے مسائل کے سلسلے میں عام بیداری پیدا کر کے ان کے لئے سیاسی سطح پر حمایت حاصل کی جا سکتی ہے۔

دیہی علاقوں میں کاشت اور مویشی پالن وغیرہ کے شعبے میں نفع بخش خود روزگاری کے کافی مواقع پیدا ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اطلاعاتی ٹکنالوجی، الیکٹرانک، بائیو ٹیکنیکل سوفٹ ویئر نیز مشاورتی خدمات وغیرہ کے شعبے میں ہنرمندی پر مبنی خود روزگاری کے نئے مواقع سامنے آ رہے ہیں۔ دیہی علاقوں کی زمینوں کو بہتر بنانے کی جو نئی ٹکنالوجی پیدا ہو رہی ہے، اس سے وابستہ ہونا انہیں راس آ سکتا ہے۔ ایسے نئے مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے اس بات کی فوری طور پر ضرورت ہے کہ ایسے پروگراموں پر نظر ثانی کر کے اس کا نیا ڈھانچہ اس طور پر تعمیر کیا جائے جس سے ہنرمندی پر مبنی کاموں میں بہتری لائی جائے۔ قرضوں کی فراہمی آسان ہو جائے اور اطلاعات اور منڈی تک رسائی ہو سکے قرضوں کے شعبوں میں این اے بی اے آر ڈی (NABARD) اور درج فہرست بینک کی کارکردگی کافی اچھی ہے لیکن ابھی تک غریب طبقوں کو دیہی قرضوں کے ایسے 150,000 سے زائد ذرائع سے پورا فائدہ نہیں پہنچ سکا ہے جو اس وقت پورے ملک میں موجود ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ قرضے مہیا کرنے کے باقاعدہ نظام کو مضبوط بنانے کے ساتھ ساتھ قرضے کا ایک اور معاون یا ضمنی نظام قائم کیا جانا چاہیے جو "اپنی مدد آپ اور کفایت شعاری"

کے تصور پر مبنی ہو۔ اس طرح کے حلقے خواہ رجسٹرڈ ہوں یا غیر رجسٹرڈ لیکن ان میں یہ صلاحیت اور لچک ضرور ہو کہ وہ مقامی ضروریات سے مطابقت رکھنے والے کاموں سے متعلق سرگرمیوں کو رضاکار شعبوں کی حمایت سے تیزی سے فروغ دیں۔

قرضوں کے باقاعدہ اور ضمنی نظام اگر ساجھے داری کے اصول کے تحت کام کریں تو اس سے بروقت اور معقول قرضے کی فراہمی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے اور ضرورت مند افراد کو بوجھ ڈالے بغیر فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ ٹریننگ کے شعبے میں "ٹی آر وائی ایس ای ایم" (TRYSEM) خصوصی مہارت یا ہنرمندی کی تربیت تو دیتا ہے لیکن ٹریننگ حاصل کرنے والوں کو اس طور پر مسلح نہیں کرتا کہ وہ اپنے طور پر کوئی کامیاب تجربہ کر سکیں۔ عورتوں کے لئے ٹریننگ کا جو پروگرام مرتب کیا جائے، اس میں اس حقیقت کو ملحوظ رکھا جائے کہ غریب عورتیں پہلے ہی سے کام کے بوجھ تلے دبی ہوتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی نہیں ہے کہ انہیں زیادہ کام دیا جائے بلکہ یہ دیکھا جائے کہ ان کاموں میں وہ جو اپنا وقت صرف کر رہی ہیں وہ معاشی طور پر ان کے لیے نفع بخش ہیں یا نہیں!

مارکیٹنگ کے شعبے میں اس بات کی ضرورت ہے کہ منڈی سے متعلق مشورہ بروقت دیا جائے، نیز کوالٹی کنٹرول اور پیداوار کے امکان پر مبنی مارکیٹنگ کے انتظامات پر توجہ دی جائے۔ وہ اشیاء جو بہت جلد برباد ہو جایا کرتی ہیں۔ ان کو سنبھال کر رکھنے کے لئے خصوصی اسٹوریج اور ٹرانسپورٹ کی بہتر سہولیات کی ضرورت پیش آئے گی۔ دودھ اور مرغبانی کے کاروبار یا سبزی کی منڈی کے شعبے میں جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شعبے میں بھی انہی خطوط پر کام شروع کیا جانا چاہیے۔ اس بات کی بھی ضرورت پیش آئے گی کہ پیداوار سے مالکان اس خام مال کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو سکیں جو ان کے متعلقہ کام کے لئے ضروری ہیں۔ لامرکزیت کی حامل پیداوار کو مرکزیت کی حامل خدمت کا سہارا مہیا کرنا ہوگا۔ اگر اس طرح کے اقدام کئے جائیں تو خود روزگار حاصل کرنے والے حلقوں کی رسائی، لازمی بنیادی ڈھانچے اور خدمات کے شعبے تک کم از کم اس حد تک ضرور ہو سکتی ہے کہ وہ لاگت، مالی سہارے اور ٹریننگ کے معاملے میں اپنی مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی انہیں اپنے کام کو فروغ دینے کے لئے موافق ہنرمندی، قانونی امور اور سرمایہ کاری سے متعلق مشورے اور منڈی سے متعلق ضروری اطلاعات کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔

۱۹۹۵-۹۶ کے دوران ہندوستان کے تمام گاؤں اور شہروں کی اپنی منتخب پنچایتیں اور میونسپل کونسلیں ہوں گی۔ جن میں خواتین کی نمائندگی کم از کم ۳۰ فیصد ہوگی۔ اس وجہ سے ایک ایسا مثالی موقع میسر آئے گا کہ نچلی سطح پر ترقیاتی پروگراموں سے حصہ داری (یا مساوات) نیز علاقے کے ماحولیاتی نظام، معاملات کو مربوط کیا جا سکے گا۔ ترقیاتی پروگرام کا نیا نمونہ یہ ہونا چاہیے کہ — "غور و خوض، منصوبہ بندی اور کام مقامی پیمانے پر ہونے چاہئیں لیکن ان کو سہارا ریاستی یا قومی راجدھانیوں سے ملنا چاہیے"۔ سماجی ترقی کے لئے حکومت کا جو وسیع تر بنیادی ڈھانچہ موجود ہے۔ ایسے غیر منظم شعبے کی ضروریات پوری کرنے

کا وسیلہ بنایا جانا چاہیے اس طرح کی جو تبدیلیاں لائی جا رہی ہیں انہیں کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے غیر سرکاری رضاکار تنظیمیں اس اعتبار سے گراں قدر خدمات انجام دے سکتی ہیں کہ ان کا مقصد دیہی اور شہری علاقوں کے عوام کا معیار زندگی بلند کرنا ہے۔ گروپ کی تشکیل اور انتظامی نیز متعلقہ کاروبار میں "مہم جوئی" کی ٹریننگ، ایسے شعبے ہیں جن میں رضاکار تنظیموں کا رول کافی گراں قدر ثابت ہو سکتا ہے۔ روزگار پر مبنی پائیدار معاشی ترقی کی حکمت عملی ترتیب دینے کا، اب ایک بہت اچھا موقع ہاتھ لگا ہے جس کے تحت سرکاری پالیسیاں نیز ترقیاتی حکمت عملی طے کرتے وقت ماحولیات کے تحفظ نیز غریبوں اور خواتین کی فلاح اور ترقی پر خاص توجہ دی جا سکتی ہے اس شعبے میں اگر غفلت اور لاپرواہی برتی گئی تو سماجی سطح پر اس کے نتیجے میں تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے جو قومی انتشار کا باعث بنیں گے۔

اور جن باتوں کا ذکر کیا گیا، وہ اس اعتبار سے کافی ہیں کہ ان کے ذریعہ ان ضروریات اور مواقع کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے جن کے تحت تیس کروڑ ایسے بچوں، مردوں اور عورتوں کو روزی مہیا کر کے ان کی حالت کو بہتر بنانا ہے، جو غریبی کی زندگی گزار رہے ہیں اور جو محروم اور بے سہارا ہیں۔ ان کے علاوہ مزید تیس کروڑ ایسے لوگوں کو سہولیات مہیا کرنا ہے جن کی روزانہ آمدنی کا دار و مدار خود روزگاری پر ہے۔ اگر ان تمام معاملات کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا اور اس کے مطابق جلد از جلد عمل نہ کیا گیا تو معاشی سطح پر آزاد روی اور عالم گیریت کے اقدامات غریبوں کے مسائل میں مزید اضافہ کر دیں گے اور ایک ایسی انتشار کی ترقی کو بڑھاوا ملے گا جس میں بے روزگاری بڑھتی جائے گی اور آمدنی کی تقسیم مزید عدم مساوات پر ہوگی۔ باقاعدہ بینکاری کے شعبے کو چاہیے کہ وہ نچلی سطح کی کفایت اور قرضوں کی سوسائٹیوں کی سرگرمی سے مدد اور حوصلہ افزائی کریں۔ اس سے کاروباری خدمات پر اخراجات کم ہوں گے اور ان شعبوں اور ان افراد کو قرضے فراہم کر کے مدد کی جا سکتی ہے جو صحیح معنوں میں اس کے حقدار ہیں۔ قرضے دینے والے باقاعدہ اور ضمنی اداروں کی جانب سے قرضے فراہم کرنے کا کام ہی وہ واحد طریقہ کار ہوگا جس کے تحت قرضے ضرورت مند افراد تک قابل برداشت شرح خدمات پر پہنچ سکتے ہیں۔

(اس مضمون کے فاضل مصنف ایم۔ ایس۔ سوامی ناتھن ریسرچ فاؤنڈیشن، مدراس کے چیئرمین ہیں۔)

وزیراعظم کا خط

سرپنچوں اور پنچوں کے نام:

پیارے دوستو!

۴۹ویں یوم آزادی کے موقع پر، جسے ہم نے چند روز قبل ہی منایا ہے، میں آپ کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

یہ تہنیتی خط، میں آپ کو اس خیال سے بھی لکھ رہا ہوں کہ آپ ہمارے قومی تعمیر کے پروگرام میں، اپنی بامقصد خدمات کو ایک تعمیری شکل دے سکیں گے ملک کو آپ کی خدمات کی ضرورت ہے۔ جن لوگوں نے ملک کی قیادت کی باگ ڈور سونپتے وقت مجھ پر اعتماد کیا تھا، انہی لوگوں نے آپ کو یہ ذمہ داری بھی سونپی ہے کہ آپ ان کے خوابوں اور خواہشات کی تکمیل کے لیے ان کے گاؤں اور پنچایتوں کی حالت کو سدھارنے کا فریضہ انجام دیں۔

گرام پنچایتیں ہمارے نظام کا ایک اٹوٹ حصہ رہی ہیں۔ دو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے سے ہمارے ملک میں پنچایتی راج کے ادارے کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے ہیں۔ ہماری قدیم کتابوں مثلاً والمیکی راماین، مہابھارت اور کوتلیہ کے ارتھ شاستر میں، زمانہ قدیم کے پنچایتی راج کے نظام کے حوالے ملتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً پنچایتی نظام کو بہتر اور مضبوط بنانے کے لیے کوششیں بھی ہوتی رہی ہیں اور تحریک آزادی کے دوران کانگریس کے اجلاسوں میں اس نظام پر مباحثے ہوئے اور قرارداد پاس کی گئیں۔ مہاتما گاندھی نے پنچایتوں کے ذریعہ جمہوریت میں لامرکزیت کو فروغ دینے پر بھرپور زور دیا۔ مرتے دم تک وہ یہی بات دہراتے رہے کہ ملک کی تعمیر نو کو پنچایتوں کی بنیاد مضبوط کر کے ہی ممکن بنایا جاسکتا ہے۔

آنجہانی شری راجیو گاندھی نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ دستور میں اس طور پر ترمیم ہونی چاہیے کہ پنچایتی راج کے نظام کا اس طرح احاطہ کیا جاسکے جس کے تحت سماج کے تمام تر طبقوں کی شرکت کو یقینی بنایا جاسکے۔ انھوں نے اس سمت پیش رفت بھی کی تھی لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ بے وقت موت نے انھیں ہم سے چھین لیا۔ بہرحال ان کا خواب اب شرمندۂ تعبیر ہوچکا ہے۔

آپ سب نے لوک سبھا کے لیے اپنے نمائندے چن کر مجھے وزیراعظم بننے کا موقع عنایت کیا۔ آپ سب کو یہ بات بھی معلوم ہے کہ ۲۱ جون ۱۹۹۱ء کو جب ہماری حکومت قائم ہوئی تھی تو ملک کی حالت بہت سنگین تھی۔ غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخیرے میں کمی ہوجانے کے باعث حکومت بہت مشکل حالات سے دوچار تھی۔ روزمرّہ کی ضروریات کی اشیاء مثلاً ڈیزل، مٹی کا تیل، کیمیائی کھاد اور ملک کی دفاعی ضروریات کی چیزیں مہیا کرنا بھی دشوار ہوگیا تھا۔ سرکاری خزانے سے سونے کا ذخیرہ بھی گروی ہوچکا تھا ہم نے ملک کو مالی اور اقتصادی بدحالی کے بھنور سے باہر نکالنے کے لیے متعدد اقدام کیے۔ ہم نے اقتصادی ترقی اور سیاسی استحکام کے لیے سازگار ماحول قائم کیا تاکہ دیہی ترقیات کے پروگرام کو بڑے پیمانے پر عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ ان پروگراموں کو کامیابی سے نافذ کرنے کے لیے ہم نے پنچایتی راج کے اداروں کو دستوری درجہ عطا کیا، جس کا خواب راجیو گاندھی نے دیکھا تھا۔ میں نے اس وقت آپ سب کو خط لکھا تھا جب دستور کی ۷۳ ویں ترمیم (۱۹۹۲ء) عمل میں آئی۔ اس وقت میں نے پنچایتی راج کے بارے میں تفصیل سے وضاحت کی تھی۔ اس پس منظر میں، میں نے کمزور طبقوں، شیڈول کاسٹ، درج فہرست قبائل، پسماندہ طبقوں اور خواتین کو معقول نمائندگی دینے کے اسباب بیان کیے تھے۔ ترقی کے شعبے میں، آپ کی ذمہ داریوں کی جانب بھی میں نے آپ کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ میرا پختہ یقین ہے کہ دیہی علاقوں کے ترقیاتی پروگرام پنچایتوں کے وسیلے سے کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔

آپ میں سے بیشتر لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ آٹھویں پلان میں ہم نے دیہی ترقیات کے لیے مختص رقم میں معقول حد تک اضافہ کردیا ہے۔ ہم نے

> **گرام پنچایتیں ہمارے نظام کا ایک اٹوٹ حصہ رہی ہیں۔ دو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے سے ہمارے ملک میں پنچایتی راج کے ادارے کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے ہیں۔ ہماری قدیم کتابوں مثلاً والمیکی رامائن، مہابھارت اور کوتلیہ کے ارتھ شاستر میں، زمانہ قدیم کے پنچایتی راج کے نظام کے حوالے ملتے ہیں۔**

اس بات کو بھی یقینی بنایا ہے کہ غریبی کی سطح سے نیچے کی زندگی گزارنے والے افراد کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے جواہر روزگار یوجنا، اندرا آواس یوجنا، ایمپلائمنٹ انشورنس اسکیم، مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام وغیرہ کے تحت ضلعی انتظامیہ اور پنچایت کو معقول سرمایہ فراہم کیا جائے۔ اسی طرح ضلعی منصوبوں کے ذریعہ پنچایت کو اس بات کے لیے رقم فراہم کی جائے گی کہ علاقائی ترقیاتی اسکیموں، پانی اور مٹی کے تحفظ، فصلوں کو بہتر بنانے، دیہی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور دیہی علاقوں میں بنیادی ڈھانچہ تیار کرنے کے کاموں کو بڑھاوا

غریبی دور کرنے کے پروگراموں پر زور دینے اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ اس کا فائدہ انتہائی ضرورت مند افراد کو پہنچے، ہم نے تین اسکیمیں شروع کی ہیں جنہیں نافذ کرنے کا کام پنچایتوں کو سونپا گیا ہے۔

دیا جاسکے۔ ہم نے اس بات کو بھی یقینی بنایا ہے کہ غریبی دور کرنے سے متعلق مرکز کے زیر اہتمام شروع کیے گئے پروگراموں کے نفاذ کے سلسلے میں پنچایتوں اور گرام سبھا کو اہم رول تفویض کیے جائیں۔

غریبی دور کرنے کے پروگراموں پر زیادہ زور دینے اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ اس کا فائدہ انتہائی ضرورت مند افراد کو پہنچے، ہم نے تین اہم اسکیمیں شروع کی ہیں جنھیں نافذ کرنے کا کام پنچایتوں کو سونپا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل تینوں اسکیموں کو اسی یوم آزادی سے شروع کیا جارہا ہے۔

(۱) سماجی معاونت کا قومی پروگرام

اس اسکیم کے تحت مرکز جو مدد مہیا کرے گا، اس کی تفصیل یوں ہے۔

(الف) ۶۵ سال اور اس سے زیادہ کی عمر کے بے سہارا اور غریب لوگوں کو ماہانہ ۷۵ روپے کی شرح سے پنشن دی جائے گی۔

(ب) کسی غریب خاندان کے روزی کمانے والے فرد کی قدرتی موت ہونے کے بعد اس خاندان کو ۵۰۰۰ روپے اور حادثاتی موت کی صورت میں دس ہزار روپے یک مشت دیے جائیں گے۔

(ج) غریب گھرانوں کی عورتوں کو اور دو بچوں کی پیدائش کے وقت ۳۰۰ روپے (بطور زچگی امداد) دیے جائیں گے۔ یہ رقم، اس امداد کے علاوہ ہوگی جو زچگی سے قبل اور اس کے بعد فراہم کی جائے گی۔

(۲) پرائمری اسکول کے بچوں کے لیے غذائیت بخش کھانا

پہلے مرحلے میں ۲۴۴۶ ایسے بلاکوں میں، جہاں عوامی نظام تقسیم کا نیا سلسلہ رائج کیا گیا ہے، پہلی سے پانچویں جماعت تک کے بچوں کو سو گرام فی کس فی روز کی شرح سے اناج مہیا کیا جائے گا۔ اس طرح ہر بچے کو ہر ماہ تین کلو گرام اناج مہیا کیا جاسکے گا۔ میں مخلصانہ طور پر یہ امید کرتا ہوں کہ پنچایتیں ایسا انتظام کریں گی جن کے تحت مرکزی حکومت کے ذریعہ فراہم کیے گئے اناج سے، مقامی غیر سرکاری تنظیموں، والدین اور ٹیچروں کی کمیٹیوں اور اسی طرح کی دوسری تنظیموں کے تعاون سے بچوں کو پکا ہوا کھانا مہیا کریں گی۔ پنچایتوں کو اپنے اپنے علاقوں کے پرائمری اسکولوں میں اس اسکیم کو کامیاب بنانا ہے۔ آنے والے دو برسوں میں اس اسکیم کو پورے ملک میں نافذ کر دیا جائے گا۔

(۳) دیہی گروپ بیمہ اسکیم

یہ ایک اجتماعی گروپ بیمہ اسکیم ہے جس کے تحت گاؤں کے تمام لوگوں کا ۵۰۰۰ روپے کا جیون بیمہ ہوگا اور اس کے لیے ۴۰ سال تک کی عمر کے لوگوں کو سالانہ ۶۰ روپے کی آسان قسط ادا کرنا پڑے گی۔ چالیس سے پچاس سال تک کی عمر کے لوگوں کو ۷۰ روپے سالانہ ادا کرنا پڑیں گے۔ لیکن جو لوگ غریبی کی سطح سے نیچے کی زندگی بسر کر رہے ہیں، ان کے لیے ہر بیمہ پالیسی کے اخراجات کا نصف حصہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں برداشت کریں گی۔ پنچایتوں کو اس اسکیم کے ایجنٹ کے طور پر کام کرکے اسے مقبول بنانا ہوگا۔ لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کے وضع کردہ ضابطوں کے دائرے میں پنچایتوں کو ممبران کے ناموں کا اندراج کرنا ہوگا۔ قسطیں وصول کرنے اور جمع کرانے کی ذمہ داری بھی انہی کی ہوگی۔ اس کے علاوہ بیمہ سے متعلق کلیم (دعویٰ نامہ) کو آگے بڑھانے کا کام بھی انجام دینا ہوگا۔ اس طرح پنچایتوں کے سرگرم تعاون سے گروپ بیمہ اسکیم کی دیہی علاقوں میں حوصلہ افزائی ہوسکے گی۔ یہ اسکیم غریب گھرانوں کو رعایتی شرح پر سلامتی فراہم کرے گی۔ اس طور پر سماجی معاونت کے قومی پروگرام کے توسط سے غریب گھرانوں کی مدد ہوسکے گی جو ان کے لیے ایک نعمت ثابت ہوگی۔

میں ۲۸ر جولائی ۱۹۹۵ء کو قوم کے نام نشر کی گئی اپنی تقریر کی نقل بھیج رہا ہوں جس میں غریبوں سے متعلق نئی اسکیموں کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان اسکیموں کے نفاذ میں ان لوگوں کو سرگرمی سے شامل کرنا ہوگا، جو ان سے مستفید ہونے والے ہیں۔ ان پروگراموں میں عوام کے وسیع تر حلقوں کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے مستفید ہونے والے افراد پر مبنی کمیٹی ورکرز کمیٹی اور صارفین کمیٹی جیسی متعدد کمیٹیاں تشکیل دی جانی چاہئیں۔ ان کی شرکت سے یہ فائدہ ہوگا کہ ان پروگراموں کے نفاذ کے سلسلے میں درپیش خامیاں دور ہو جائیں گی۔

آپ نے عوام کی خدمت کا عہد کیا ہے جس کے لیے لوگوں نے آپ کو منتخب کیا ہے۔ لہٰذا آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ آپ ان کے اعتماد کو ٹوٹنے نہ دیں۔ اگر ان کا اعتماد ٹوٹا تو خود آپ کی تصویر عوام میں مسخ ہو جائے گی۔

میرا خیال ہے کہ گاؤں کے ہر شخص نے الیکشن سے متعلق سرگرمیوں میں حصہ لیا ہے۔ اب چونکہ آپ فتحیاب ہوکر سامنے آئے ہیں لہٰذا آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ گرام پنچایت کے تحت شروع کی گئی اسکیموں کو یقینی بنایا جاسکے، جیسا کہ دستور میں نشاندہی کی گئی ہے۔ آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ آپ اپنے علاقے کے تمام مرد اور عورتوں کو ان اسکیموں سے فائدہ پہنچانے کا جتن کریں۔ اگر آپ نے اس کام کو کامیابی سے انجام دے دیا تو پورا گاؤں آپ کے ساتھ ہوگا اور آپ اس گاؤں کے کاندھی ہوں گے

مہاتما گاندھی اتنے عظیم تھے کہ انھوں نے محبت، خدمات، خیر سگالی، عدم تشدد اور یگانگت کے جذبات کے ذریعہ عوام کے دلوں کو فتح کیا اور لوگ انھیں دیوتا جیسا تصور کرنے لگے۔ یہ دراصل نیک جذبات کا کرشمہ تھا۔

ایک بات یاد رکھیے کہ پنچایت میں آپ کی جو حیثیت ہے، اس سے قطع نظر، آپ نے عوام کی خدمت کا عہد کیا ہے جس کے لیے لوگوں نے آپ کو منتخب کیا ہے۔ لہٰذا آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ آپ ان کے اعتماد کو ٹوٹنے نہ دیں۔ اگر ان کا اعتماد ٹوٹا تو خود آپ کی تصویر عوام میں مسخ ہو جائے گی۔ ہم سب عوامی خدمت پر اس لیے مامور ہوئے ہیں کہ نام پیدا کریں۔ ہم سب کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اچھے نام سے یاد کیا جائے۔ اگر عوام ہماری نیت پر شک کرنے لگیں گے تو ہماری زندگی بے مقصد ہو کر رہ جائے گی۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ عوام کا اعتماد بحال رکھنے کو اولیت دیں۔

ہندوستان کے عوام دولت اور منصب کے آگے سر نہیں جھکاتے۔ اس ملک کے عوام نے محبت، نیک نیتی، فرائض، وفاداری، حق گوئی اور عدم تشدد کو ہر چیز پر فوقیت دی ہے اور انھیں عزیز رکھا ہے۔ جن لوگوں میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں ان کا کافی احترام کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ تعلیم کے فقدان کے باوجود اس ملک کے عوام اخلاقی قدروں کے تعلق سے کافی باشعور رہے ہیں۔ ہر ہندوستانی شہری نے اس شخص کی شناخت قائم رکھی ہے جس میں خدمت کا جذبہ رہا ہے اور اس نے بے لوث خدمت کرنے والے لیڈروں کو بار بار خدمت کا موقع دیا ہے۔ ہندوستان کے عوام دولت اور منصب کے آگے سر نہیں جھکاتے۔ اس ملک کے عوام نے محبت، نیک نیتی، فرائض، وفاداری، حق گوئی اور عدم تشدد کو ہر چیز پر فوقیت دی ہے اور انھیں عزیز رکھا ہے۔ جن لوگوں میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں ان کا کافی احترام کیا جاتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ اپنے گاؤں اور علاقوں میں وہی مرتبہ حاصل کریں اور پھر آگے بڑھ کر ریاستی اور قومی پیمانے پر اپنا مقام حاصل کریں۔

میں اس بات سے واقف ہوں کہ عوام وقتاً فوقتاً ان منتخب نمائندوں کے تئیں بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہیں، جو اپنے فرائض کی انجام دہی میں ان کی توقعات پر پورے نہیں اترتے۔ یہی بات گاؤں، بلاک اور ضلع سطح کے ان افسران پر بھی صادق آتی ہے، جو سماجی ترقیات کے لیے مخصوص رقم کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ گزشتہ ۴۸ برسوں کے دوران بے روزگاری دور کرنے، غریب اور مفلوک الحال عوام کی مدد کرنے نیز بے گھر لوگوں کو سر چھپانے کی جگہ مہیا کرنے کے لیے متعدد اسکیمیں شروع کی گئیں۔ لیکن ان میں سے کچھ اسکیمیں کاغذ تک ہی محدود رہیں اور بعض معاملات میں یہ بھی دیکھا گیا کہ اخراجات تو دکھائے گئے لیکن لوگوں کو ان اسکیموں سے فائدہ نہیں پہنچا۔ اب آپ کو غور کرنا ہوگا کہ ایسے حالات کیوں پیدا ہوئے۔

ہندوستان ایک کثیر جماعتی جمہوریت ہے۔ آپ پنچایتی راج کے نمائندے کی حیثیت سے اس کا ایک اہم حصہ اور عوامی جمہوریہ ہند کے نگراں ہیں۔ آپ کو اسی لیے منتخب کیا گیا ہے۔ آپ کو اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی بھی اس ملک کے کثیر ثقافتی سماج کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ ہمارا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اپنے نظام کی سیکولر اقدار کو قائم رکھیں۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے آپ کو اپنی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لانا ہوگا۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس سمت اپنے فرائض کی انجام دہی میں آپ کھرے اتریں گے۔

بقیہ: ہندوستانی دیہات کی ترقی

دیہی ترقی اور گاؤوں کی ہمہ جہت ترقی کا سب سے یقینی طریقہ تیز رفتار اقتصادی ترقی ہی ہے اور موجودہ اقتصادی اصلاحات کا مقصد اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا ہے۔ مگر ان اقتصادی اصلاحات کا پورا فائدہ گھر گھر تک خصوصاً غریب تر عوام تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ سکتا ہے۔ روزگار پیدا کرنے، پرائمری تعلیم، صحت کی دیکھ بھال اور سماجی تحفظ کی امداد کے مختلف پروگرام نوآبادی راج کے زمانے سے چلی آ رہی پسماندگی اور غربت کو خوشحالی اور افراط کے نئے سویرے میں بدلنے کی غرض سے ہی شروع کیے گئے ہیں۔ جدید اور سائنٹفک طریقوں سے حاصل ہونے والی سماجی و اقتصادی ترقی دیہی ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ حکومت نے گزشتہ چار سالوں میں کافی کچھ کیا ہے اور آنے والے سالوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کا یہ عزم سارے عوام تک ___ شہروں اور گاؤوں کے ہر شہری تک پہنچے۔ تاریخ کا ایک سبق یہ ہے کہ اس قسم کی عوامی بیداری اور شمولیت حکومت خود اختیاری کے راست تجربے سے سب سے زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے بھارت میں وسیع اور دوررس اقتصادی اصلاحات اور دیہی ترقی کے پروگراموں کا سلسلہ ایسے وقت شروع کیا گیا ہے جب آئین میں ۷۳ ویں ترمیم کے بعد پنچایتی راج کی توسیع و ترویج کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ اس سے دیہی علاقوں کی اقتصادی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی ترقی میں ایک نیا زور پیدا ہوگا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں ہے جب ہندوستانی گاؤں گاندھی جی کے "ایک جاندار لامرکزی سیاسی نظام" کے خواب کی زندہ مثال بن جائیں گے اور شومیکر کی یہ کہاوت سچ ہو جائے گی کہ "چھوٹی چیز خوبصورت ہوتی ہے۔"

(مصنف جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں گاندھین اسٹڈیز پروگرام کے ڈائریکٹر (ایمریٹس) ہیں۔)

پروفیسر ایس۔ سی۔ گنگل

ہندوستانی دیہات کی ترقی

دیہی ترقی کے لیے حکومت کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے اس مضمون میں اس بات پر مسرت ظاہر کی ہے کہ ان کوششوں کے ساتھ ساتھ پنچایتی راج کی توسیع اور مکمل ترویج کے اقدامات بھی کیے گئے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سے دیہی ترقی پر اتنا پرزور عمل شروع ہوگا کہ اس کا رخ پلٹا نہیں جاسکے گا۔

تین چوتھائی سے زیادہ ہندوستان دیہات میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی گاؤوں کی ثقافتی، معاشی اور سیاسی ترقی پر بہت زور دیتے تھے اور کہتے تھے کہ "اگر گاؤں ختم ہوتے ہیں تو ہندوستان بھی ختم ہو جائے گا۔"

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی ترقی اس وقت محض حاشیائی یا نمائشی رہے گی جب تک کہ یہ ہمارے دور دراز دیہات تک نہیں پہنچتی اور دکھائی نہیں دیتی یا یوں کہیے کہ جب تک ہمارے گاؤں ترقی اور طاقت کی آماجگاہ نہیں بنتے۔ اسی لیے حصول آزادی کے وقت ہی سے دیہی ترقی کو ہندوستان کے ایجنڈے پر ایک اہم مقام دیا گیا ہے۔

دراصل ایک ایسے ملک میں جس کی ۷۰ فی صد آبادی دیہی ہے اور جس کا خاص ذریعۂ معاش زراعت ہے، اقتصادی منصوبہ بندی کے نظریے اور عمل میں زراعت اور زرعی صنعتوں کو اہم ترین مقام دینا لازمی ہے۔ ایسی منصوبہ بندی کا مقصد بہتر قسم کے بیجوں، جدید آلات سائنسی طریق کاشت، کیمیاوی کھادوں کے استعمال اور آب پاشی میں توسیع کے ذریعے زرعی پیداوار میں نمایاں اضافہ کرنا اور بے زمین مزدوروں کے لیے روزگار کے مواقع بڑھانا اور دیہات کے دست کاروں اور کاریگروں کو سارا سال کام مہیا کرنا ہونا چاہیے۔ انھیں سارا سال تبھی مصروف رکھا جاسکتا ہے جب زراعت کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ دیہات کی گھریلو دست کاریوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں صارفین کے عام استعمال کی چیزیں تیار کرنے کو بڑھاوا دیا جائے۔ ان خطوط پر منصوبے بنانے سے دیہی ترقی کے کئی مقاصد کی تکمیل ممکن ہو سکے گی مثلاً یہ کہ دیہات میں روزگار کے مواقع بڑھیں گے، گاؤوں کی معیشت میں خود انحصاری لائی جاسکے

> **یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہندوستان کی ترقی اس وقت تک محض حاشیائی یا نمائشی رہے گی جب تک کہ یہ ہمارے دور دراز دیہات تک نہیں پہنچتی۔**

گی اور وہاں سے لوگوں کی بڑی تعداد میں بھیڑ بھاڑ والے شہروں اور صنعتی مراکز کی جانب ہجرت کو روکا جاسکے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ دیہی خاندانوں کی قوت خرید میں بھی اضافہ کیا جاسکے گا اور انھیں ان تکالیف و مصائب سے نکالا جاسکے گا جو نو آبادیاتی راج کی دین ہیں۔

اس کے لیے پہلے اور دوسرے پنجسالہ منصوبے میں بڑے بڑے باندھوں اور کثیر مقصدی بجلی پروجیکٹوں، اجتماعی ترقی کے پروگرام اور مربوط دیہی ترقی کی اسکیموں کے ذریعے آبپاشی اور بجلی کی فراہمی میں اضافہ کرکے زراعت کو ترقی دینے پر زور دیا گیا۔ اس سب کے باوجود جب موجودہ حکومت جون ۱۹۹۱ء میں برسر اقتدار آئی تو بقول وزیر اعظم اس نے "بحران میں پھنسی ہوئی معیشت" ورثے میں پائی۔ گاؤوں کی حالت سب سے بری تھی۔ اس لیے وزیر اعظم نے کسانوں اور کھیت مزدوروں کو (جن کا ہماری دیہی آبادی میں بہت بڑا حصہ ہے) یقین دلایا کہ سرکار زراعت (بشمول آبپاشی اور توسیعی خدمات) پر گہری توجہ دے گی۔۔۔ اور کاشت کاروں کو پیداوار کی معقول قیمت دلائی جائے گی اور دیہات میں روزگار یقینی بنایا جائے گا۔ حکومت نے ایک سال سے بھی کم مدت میں نئی اقتصادی پالیسی مرتب کی جسے عام طور پر نرم روی یا اقتصادی اصلاحات کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس پالیسی میں دیہی غربت، بے روزگاری، زراعت، چھوٹی صنعتوں کے مسائل اور دیہی علاقوں میں ذیلی ڈھانچے کی سہولیات کی فراہمی پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

دیہی ترقی کے اس کثیر الجہت پروگرام کی اہم خصوصیات یہ ہیں :-

(۱) آٹھویں منصوبے میں دیہی ترقی کے لیے ۳۰،۰۰۰ روپے کی خطیر رقم کی تخصیص۔

(۲) ۲۵ سو ملک میں بے روزگار دیہی افراد کے لیے سو دنوں کا یقینی روزگار (اس اسکیم سے ۱۵۰ لاکھ لوگوں کو فائدہ پہنچے گا)۔

(۳) روزگار یوجنا کے تحت دیہات میں یقینی روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے لیے ۱۸۴۰ کروڑ روپے کا اہتمام۔

(۴) ۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۴ء کے دوران درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کے لیے گیارہ لاکھ مکانوں کی تعمیر اور ۹۶-۱۹۹۵ء میں مزید دس لاکھ مکان بنانے کا ارادہ۔

(۵) مربوط دیہی ترقی پروگرام کے تحت کثیر النوع ترقیاتی کوششیں اور غریبی ختم کرنے کے لیے خود روزگار کے مواقع پیدا کرنے پر زور۔

(۶) چھوٹے اور متوسط کاشت کاروں، کھیت مزدوروں، دیہی دست کاروں اور دیہات کے دوسرے غریب لوگوں کے لیے فیاضی کے ساتھ مالیات اور دیگر سہولتوں کی فراہمی، آب پاشی کی سہولیات میں اضافہ، مویشی پروری اور گھریلو اور چھوٹے پیمانوں کی صنعتوں کی ترقی اور اس بات کے لیے خصوصی کوششیں کہ ۵۰ فی صد فائدے درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کو، ۴۰ فی صد فائدے عورتوں کو اور تین سے چار فی صد فائدے جسمانی طور پر معذور افراد کو پہنچیں علاوہ ازیں لگ بھگ ۲۸۰۰ کروڑ روپے تقریباً نوے لاکھ دیہی خاندانوں میں تقسیم کیے جائیں گے۔

(۷) خراب پانی پینے سے ہونے والی بیماریوں مثلاً دست، پیچش اور یرقان وغیرہ کو ختم کرنے کے لیے پینے کے پانی کے راجیو گاندھی مشن کے تحت تقریباً دو لاکھ گاؤوں اور نیم شہری بستیوں میں پانی کے صاف پانی کا انتظام کرنا، کیچڑ اور گندگی وغیرہ کو صاف کرنا اور گاؤوں میں تقریباً ۱۵ لاکھ صاف ستھرے بیت الخلاء بنانا اور

حکومت دیہی غربت کی بابت بہت فکرمند ہے اور اسے غریبی ختم کرنے کے لیے جامع اصلاحات اور ترقیاتی اسکیمیں اور پروجیکٹ شروع کرنے کی ضرورت کا احساس ہے۔

(۸) مہلا سمردھی یوجنا (عورتوں کی خوشحالی کی اسکیم) کے تحت اقتصادی اعتبار سے گاؤوں کی عورتوں کے ہاتھ مضبوط کرنا۔

متذکرہ بالا اسکیموں کے علاوہ خشک سالی کے امکان والے علاقوں، ریگستانی علاقوں کے لیے کل ہند اسکیمیں اور پروجیکٹ بھی شروع کیے گئے ہیں اور بے کار زمینوں کو قابل کاشت بنایا جا رہا ہے۔

مختصر یہ کہ حکومت دیہی غربت کی بابت بہت فکرمند ہے اور اسے غریبی ختم کرنے کے لیے جامع اصلاحات اور ترقیاتی اسکیمیں اور پروجیکٹ شروع کرنے کی ضرورت کا احساس ہے۔ وزیر اعظم نے اس کا ذکر غیر ملکی سرمایہ کاروں سے بھارت میں سرمایہ لگانے کی بات کرتے ہوئے بھی کیا۔ فروری ۱۹۹۴ء میں انھوں نے ڈاووس میں عالمی اقتصادی فورم میں کہا: "تبدیلی لانے کے نو پیدا شدہ جوش میں سرکاروں کو اپنے عوام کی بڑی تعداد کو تکالیف و مصائب کی طرف نہیں دھکیلنا چاہیے۔ انھیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں کوئی تھیوری بیان نہیں کر رہا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے راتوں رات لاکھوں لوگوں کو ان کی ملازمت سے اس لیے باہر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ میں کوئی تبدیلی لانا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی مجھ سے ایسا کرنے کو کہے بھی تو میں پوری عاجزی اور انکساری کے ساتھ یہ کہوں گا کہ یا تو وہ میرے ملک کو نہیں جانتا یا پھر اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ میں دراصل کیا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں" ظاہر ہے کہ وہ یہی کہنا چاہتے تھے کہ اقتصادی اصلاحات کے ساتھ دیہی عوام پر، خواہ وہ خط افلاس پر گزر کر رہے ہوں

ایک ایسے ملک میں جس کی ۷۰ فی صد آبادی دیہی ہے اور جس کا خاص ذریعۂ معاش زراعت ہے، اقتصادی منصوبہ بندی کے نظریے اور عمل میں زراعت اور زرعی صنعتوں کو اہم ترین مقام دینا لازمی ہے۔

یا اس سے نیچے، مناسب توجہ دی جائے گی چاہے یہ مکمل سرکاری امداد کے ساتھ ہو یا کسی اور طرح سے ہو۔ دیہات کی بہتری اور فلاح و بہبود کے بڑے بڑے پروگرام اسی عزم کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کا مقصد اقتصادی ترقی کو ہر گھر اور فرد تک یا گاندھی جی کے الفاظ میں "آخری آدمی" تک پہنچانا ہے۔

بھارت میں زراعت کو دیہی ترقی کی ہر اسکیم میں ایک مرکزی مقام حاصل ہے کیوں کہ قومی معیشت خاص کر اسی پر ٹکی ہوئی ہے۔ دیہی آبادی کا ۹۰-۸۰ فی صد حصہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی سے اکتساب معاش کرتا ہے لیکن حالیہ برسوں میں مجموعی سرمایہ کاری میں زراعت کا حصہ گھٹتا رہا ہے۔ ۸۰ کی دہائی میں یہ ۱۹ فی صد تھا مگر اب یہ گھٹتے گھٹتے گیارہ فی صد رہ گیا ہے اگرچہ آٹھویں منصوبے کے سالوں میں اس پر سرکاری سرمایہ کاری ۱۹ فی صد رہی ہے۔ لہٰذا مناسب پالیسیوں کے ذریعے زراعت میں کافی نجی سرمایہ کاری اور زرعی پیداوار کی برآمدات کو بڑھانا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر باسمتی چاول، پھلوں اور پھولوں کی برآمدات کی حوصلہ افزائی کی جا سکتی ہے۔ یہ موجودہ زرعی پالیسی کے مقاصد میں سے ایک ہے۔ وزیر اعظم نے کہا ہے کہ "حکومت اس ملک کے کاشت کاروں اور زراعت پیشہ افراد کو جو کچھ دینا چاہتی ہے وہ ان پر برآمدات کے دروازے کھولنا اور زرعی برآمدات کے لیے انھیں سہولیات و ترغیبات مہیا کرنا ہے۔ کاشت کار کو فخر کے ساتھ کہنا ہوگا کہ وہ صرف اسی ملک کے لیے نہیں بلکہ برآمدات کے لیے بھی پیدا کرتا ہے اور اس سے اس کو پورا پورا فائدہ ہو رہا ہے۔ ہم یہی چاہتے ہیں۔" اگر زراعت ایک نفع بخش پیشہ بن جائے اور اس سے اتنی آمدنی ہونے لگے جتنی کہ دوسرے پیشوں سے ہوتی ہے تو اس سے وسیع پیمانے پر روزگار پیدا ہوگا اور دیہی معیشت کو تقویت حاصل ہوگی۔ اس

سے گاؤں کو فائدہ ہوگا اور وہ غریبی کے شکنجے سے بھی باہر نکل سکیں گے۔ دیہات سے لوگوں کو روزگار کی تلاش میں شہروں میں جانے کا سلسلہ بھی رک جائے گا اور نتیجتاً شہروں پر پڑنے والا اضافی بوجھ کم ہو جائے گا۔

زراعت کو ترقی دینے اور گاؤں میں قوت خرید بڑھانے کے لیے زمینی اصلاحات اور استعمال اراضی بے حد ضروری ہے۔ ۲۲ ریاستیں اور مرکزی انتظام کے علاقے زرعی اراضی کی حد ملکیت لاگو کرنے کے لیے

> اگر زراعت ایک نفع بخش پیشہ بن جائے اور اس سے اتنی آمدنی ہونے لگے جتنی کہ دوسرے پیشوں سے ہوتی ہے تو اس سے وسیع پیمانے پر روزگار پیدا ہوگا اور دیہی معیشت کو تقویت حاصل ہوگی۔ اس سے گاؤں کو فائدہ ہوگا اور وہ غریبی کے شکنجے سے بھی باہر نکل سکیں گے۔

قانون بنا چکی ہیں۔ ان کے نتیجے میں بے زمین اور غریب دیہی خاندانوں میں تقسیم کے لیے ۷۵ لاکھ ایکڑ زمین فاضل قرار دی جا چکی ہے اور اس میں سے ۵۱ لاکھ ایکڑ سے زیادہ اراضی درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں میں تقسیم بھی کی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود موجودہ حکومت نے محسوس کیا کہ تقسیم کی رفتار قدرے سست ہے۔ لہٰذا اکتوبر ۱۹۹۱ء میں اس نے ایک خاص مہم شروع کی جس کے تحت قریباً چار لاکھ ایکڑ فاضل زمین صرف چار ماہ کی قلیل مدت میں بے زمین خاندانوں میں تقسیم کی گئی۔ اس کے بعد مختلف ریاستوں کے وضع کردہ زمینی اصلاحات کے ۲۷ قوانین کو آئین کے نویں شیڈول میں شامل کیا گیا تاکہ انھیں طویل مقدمہ بازی سے بچایا جا سکے۔ زمین کے ریکارڈ درست طریقے سے محفوظ رکھنے کے لیے ۱۹۹۱ء میں مرکز کی سو فی صد امداد سے ایک کمپیوٹری نظام رائج کیا گیا۔ مرکزی حکومت نے اس کے لیے ۲۰ لاکھ روپے کی امداد مہیا کی جس کی بدولت کمپیوٹروں کے ذریعے زمینی ریکارڈ محفوظ رکھنے کی اسکیم ملک کے ۱۰۲ اضلاع میں آ چکی ہے۔ زراعت کی ترقی و توسیع کے اس وسیع پروگرام کے علاوہ سال رواں (۹۶-۱۹۹۵ء) کے مرکزی بجٹ میں ایک دو طرفی حکمت عملی کا اعلان کیا گیا۔ وزیر خزانہ کے اعلان کے مطابق ایک طرف اس حکمت عملی کا منشا ترقی، سرمایہ کاری اور جدید کاری کی رفتار تیز کرنا اور دوسری طرف (دیہی علاقوں میں) غریبی ختم کرنے کے پروگراموں کو بڑھانا اور مستحکم کرنا ہے۔ اس سلسلے کے بڑے پروگرام دیہی روزگار، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں، سماجی تحفظ، دیہات میں پانی کی سپلائی اور تعلیم سے متعلق ہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان ترقیاتی پروجیکٹوں کے لیے وسائل اور فنڈ تو حکومت نے فراہم کیے ہیں مگر عمل درآمد کے لیے انھیں استعمال کرنے کی ذمہ داری پنچایتی راج اداروں کو سونپی گئی ہے۔ ایسا آئین میں ۷۳ ویں ترمیم کے تاریخی قانون (۱۹۹۲ء) کے پاس ہونے کے بعد کیا گیا ہے۔ یہ قانون گاندھی جی کے "گرام سوراج" کے خواب کو پورا کرنے کی طرف ایک قدم ہے۔

حکومت کی "دیہی ترقی کے پروگراموں کو ترجیح دینے" کی حکمت عملی کے مطابق رواں مالی سال میں دیہی ترقی، روزگار پیدا کرنے، غریبی دور کرنے اور انسانی وسائل کے فروغ پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ لہٰذا ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران دیہی ترقی کے لیے ۷۷۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ دیہات میں روزگار کے مواقع

> دیہی ترقی اور گاؤں کی ہمہ جہت ترقی کا سب سے یقینی طریقہ تیز رفتار اقتصادی ترقی ہی ہے اور موجودہ اقتصادی اصلاحات کا مقصد اقتصادی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا ہے۔

پیدا کرنے کی غرض سے بجٹ میں جواہر روزگار یوجنا اور یقینی روزگار اسکیم کے لیے تخصیص زر ۵۴۳۲ کروڑ روپے تک بڑھا دی گئی ہے۔ ان دونوں پروگراموں سے موجودہ مالی سال کے اختتام تک ۱۲۹۰ ملین کے تعزی ایام کا روزگار پیدا کیے جانے کی توقع ہے۔ علاوہ ازیں وزیر اعظم کی روزگار یوجنا کے تحت ۵۴۱ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے جس سے تقریباً ۱۱ لاکھ تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو روزگار مہیا کیا جائے گا۔ دیہات میں روزگار پیدا کرنے کے لیے ۱۳۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔

کھادی اور دیہی صنعتیں بھی دیہی آبادی کو آمدنی کے ذرائع مہیا کرتی ہیں۔ ہینڈلوم کا شعبہ لاکھوں پارچہ بافوں کو روزگار مہیا کرتا ہے۔ حال ہی میں پارچہ بافوں کو حکومت اور بینکوں کی طرف سے سال کے دوران ۱۰۰۰ کروڑ روپے کی مجموعی مالیت کے قرضوں کی فراہمی کے لیے اقدامات کیے گئے ہیں۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتیں ڈیڑھ کروڑ کارکنوں کو روزگار مہیا کرتی ہیں۔ ملک کی کل مصنوعات میں اس شعبے کی مصنوعات کا ۴۰ فی صد اور برآمدات میں ۳۵ فی صد ہے۔ اس شعبے کو مضبوط بنانے کے لیے قرضوں کی بآسانی فراہمی کے واسطے نیشنلائزڈ بینکوں کی ۱۰۰ شاخوں میں خصوصی سیل قائم کیے جائیں گے۔

قومی سماجی امداد اسکیم کے تحت ان باتوں کا اہتمام کیا گیا ہے:

(۱) خط افلاس سے نیچے گزر کرنے والے ۶۵ سال سے زیادہ عمر کے لوگوں کو کم از کم ۷۵ روپے ماہانہ کی بڑھاپے کی پنشن دی جائے گی۔ (۲) غریب خاندانوں کو ان کا روزی کمانے والا سر براہ مرنے پر ۵۰۰۰ روپے تک کی امداد دی جائے گی۔ (۳) کمزور طبقوں کی حاملہ عورتوں کو بچے کی پیدائش سے قبل اور پیدائش کے دو ماہ بعد تک طبی دیکھ بھال اور علاج کی سہولت مہیا کی جائے گی۔

سماجی تحفظ اور امداد کی اس اسکیم کا مقصد دیہات میں غریبی کے دکھوں کو کم کرنا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس سے ڈیڑھ کروڑ افراد مستفید ہوں گے اور ان میں سے ایک کروڑ عورتیں ہوں گی۔ ان اقدامات کے علاوہ غریب خاندانوں کے لیے اجتماعی بیمے کی ایک فیاضانہ اسکیم بھی شروع کی گئی جس کے تحت ایک گھر کے ایک کماؤ رکن کو محض ۷۰ روپے سالانہ کے پریمیم کی ادائیگی پر ۵ ہزار روپے کے بیمے کی سہولت حاصل ہوگی۔ پرائمری تعلیم پر مصارف کے لیے مرکز کی طرف سے ۳۵ فی صد اضافے کے ساتھ ۶۵۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔

باقی صفحہ ۱۶ پر

سماجی تحفظ کی جامع اور مربوط اسکیم

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ جو لوگ غریبی کی سطح سے نیچے کی زندگی بسر کرتے ہیں اور جو لوگ خطرناک حد تک اس کے آس پاس ہیں، ان کے لیے سماجی سطح پر تحفظ فراہم کرنے کا کام پوری قوم کے لیے اقتصادی اور سماجی خوشحالی لانے میں گرانقدر خدمات کا باعث بنے گا۔

آزادی کے بعد سے ہماری تمام تر ترقیاتی سرگرمیوں میں "مساوات کے ساتھ ترقی" کے اصول کو رہنما اصول کی حیثیت حاصل رہی۔ معیشت میں موجودہ خامیوں کو دور کرنے کے لیے مملکت نے جب بھی مداخلت کرنا چاہی تو خصوصی مفادات کے حامل حلقوں اور قدیم مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ماہرین اقتصادیات نے اس کی تنقید کی اور یہ تاثر دیا کہ ضرورت سے زیادہ ضابطہ بندیوں نے پرائیویٹ شعبے میں اقتصادی پیش رفت اور مہم جوئی کی شدید حوصلہ شکنی کی۔ اب وہ حلقہ یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ اس کے موقف کو "سوویت یونین" کے زوال اور مشرقی یوروپ سے کمیونسٹ حکومتوں کے خاتمے نے درست ثابت کر دیا ہے۔ اس صورت حال کو انھوں نے اس بات کا اظہار تصور کیا ہے کہ سوشلزم پر سرمایہ داری کو یہ برتری اس کی خوبیوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے، لیکن یہ پوری سچائی نہیں ہے۔ سرد جنگ کے بعد کی صورت حال میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں طرح کے ملکوں میں جس طرح کے رجحانات پرورش پا رہے ہیں، ان کا ہم جتنی گہرائی سے جائزہ لینے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اتنا ہی زیادہ یہ احساس ابھر کر سامنے آتا ہے کہ معیشت کو کھلی منڈی میں بالکل آزاد چھوڑ دینا، سماج کے بڑے حصے کو بدحالی کی بھٹی میں جھونکنے کے مترادف ہوگا اور اس سے کمزور اور پچھڑے ہوئے طبقے بطور خاص متاثر ہوں گے۔ اس حقیقت کی تصدیق سابق سوویت یونین اور یوروپی ممالک میں کیے جانے والے تجربوں سے ہو گئی کہ پابند معیشت سے ایک دم منڈی معیشت میں چھلانگ لگانا اتنا سیدھا اور آسان کام نہیں۔ جوش اور ولولوں کے پہلے مرحلے میں اپنی معیشتوں کو بہت جلد اور بہت تیزی سے نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں وہ یہ بات شاید بھول گئے کہ ایسے بہت سے بنیادی انسانی مسائل ہیں جو پرانے نظام سے نئے نظام میں داخل ہونے کے راستہ میں سماجی اور سیاسی سطح پر زبردست رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ ایک ایسے مستحکم سماجی نظام کو جس نے ان ملکوں کی ۹۵ فی صد آبادی کو سماجی سطح پر سلامتی مہیا کی تھی، اتنے بے دریغ طور پر اور اتنی جلد بازی میں پورے طور پر مسمار کر دینا، پہلا اور لازمی قدم نہیں ہو سکتا جس کے تحت اس معیشت کو بالکل آزاد کر دیا جائے جو اب تک ضابطوں کی زنجیروں میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ یہی وہ سبق ہے جو ہمیں ان سابق کمیونسٹ ملکوں کے تجربوں سے حاصل کرنا ہے جو اس وقت سنگین قسم کے سماجی اور معاشی بحران کا شکار ہیں۔ دوسری طرف معیشت کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی لانے کی کوشش کرتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ غریب تر حلقوں کو پریشانی نہ ہو اور انھیں سماجی سطح پر تحفظ فراہم کر کے ان کی مشکلات دور کی جائیں۔ بصورت دیگر مساوات یا برابری کا اصول سب سے پہلے مجروح ہوگا۔ مجموعی گھریلو پیداوار کے اعتبار سے مساوات یا سماجی انصاف دلائے بغیر ترقی کرنا وسیع تر تناظر میں معیشت کے جمود سے بھی بدتر ثابت ہوگا۔

> معیشت کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلی لانے کی کوشش کرتے وقت اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ غریب تر حلقوں کو پریشانی نہ ہو اور انھیں سماجی سطح پر تحفظ فراہم کر کے ان کی مشکلات دور کی جائیں۔ بصورت دیگر مساوات یا برابری کا اصول سب سے پہلے مجروح ہوگا۔

ای پی ایف جمع کرنے والوں کے لیے پنشن کی اسکیم

اسی تصور کے تحت اس ملک کی حکومتوں نے سماجی تحفظ کے روایتی نظام کو نئی جہتوں سے آشنا

کرایا تا کہ مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے زیادہ سے زیادہ افراد اس دائرے میں سما سکیں، اور ترقی کے فوائد میں ان کی بھی حصہ داری ہو۔ معیشت میں لائی جانے والی آزاد روی عمل کے درمیان بھی مرکزی حکومت نے اس بات کو ضروری محسوس کیا کہ غیر سرکاری ملازمین کے لیے پنشن کی اسکیم شروع کی جائے جس کے تحت غیر سرکاری شعبے میں ای۔پی۔ایف جمع کرانے والوں کو پنشن دی جا سکے۔ اس مقصد کے لیے حکومت نے ابتدائی مرحلے میں ۳۰۰۰ کروڑ روپے مخصوص کیے ہیں۔ یہ اسکیم جس کے خط و خال ابھی نمایاں نہیں ہیں، جب پوری طور پر واضح ہو کر سامنے آ جائے گی اور اسے نافذ بھی کر دیا جائے گا تو اس سے غیر سرکاری شعبے کے مختلف زمروں سے تعلق رکھنے والے دو کروڑ کے قریب ملازمین مستفید ہو سکیں گے۔ اس پنشن کا اطلاق مختلف سطحوں پر ہوگا۔ مثلاً حادثاتی یا باقاعدہ طور پر ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد، مستقل جسمانی معذوری یا موت واقع ہو جانے کے بعد ماہانہ پنشن ملا کرے گی۔ کوئی بھی شخص جس نے دس سال تک ملازمت کی ہے اور ای پی ایف جمع کرایا ہے، وہ اس پنشن اسکیم سے فائدہ اٹھانے کا مجاز ہوگا۔ اسکیم کے تحت آخری ۱۲ مہینوں کی تنخواہوں کے اوسط کی بنیاد پر پنشن کا تعین کیا جائے گا۔ عام حالات میں ۳۳ سال کی ملازمت کے بعد سبکدوش ہونے والوں کو قابلِ وظیفہ تنخواہ کے ۵۰ فی صد حصّے کے بقدر پنشن ملے گی جس میں مہنگائی بھتّہ بھی شامل ہوگا۔ اس اسکیم کی خوبیوں اور خامیوں پر پارلیمنٹ یا دوسرے اداروں میں جو بحث و مباحثہ چل رہا ہے اس سے اس بات کی پوری امید ہے کہ یہ اسکیم مزید بہتر شکل میں سامنے آئے گی اور اس سے ملازمین کو زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ تاہم یہ بات بھی نظر آ رہی ہے کہ اگر اس اسکیم کے کچھ لوگ حامی ہیں تو کچھ لوگ اس کے نکتہ چیں بھی ہیں۔ اس کے حامیوں کو اس بات پر کسی حد تک شبہ ہے کہ اس اسکیم کا حقیقی فائدہ ملازمین کو پہنچ پائے گا یا نہیں کیوں کہ اس کے ناقدوں نے کچھ ایسے نکات اٹھائے ہیں جو بہت اہم ہیں اور ان کے جواب بھی دیے جانے ہیں۔

سب کے لیے معاشی انصاف

سماجی تحفظ یا سلامتی سے متعلق اقدام کی اس تازہ ترین مثال کا حوالہ بطور خاص یہاں اس لیے دیا جا رہا ہے کہ اس سے اندازہ ہوگا کہ ملک کے تمام شہریوں کو معاشی سطح پر انصاف دلانے کے لیے ہمیں کتنی تشویش ہے اور ہم اس کے کتنے پابند ہیں، جیسا کہ دستور کی تمہید میں پورے عزم کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ اس عہد کی پورے طور پر پاسداری کی گئی۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ معاشی اور سماجی انصاف کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں جو عہد کیا گیا تھا اسے اطمینان بخش حد تک پورا کیا گیا۔ اتنے بڑے ملک میں جہاں کا سماج روایتی طور پر اتنا متنوع رہا ہو، وہاں توازن پیدا کرنے کے لیے منظم طور پر اور لگاتار قانون سازی نیز دوسری کوششوں کا سہارا لینا پڑتا ہے یہ وہ حقیقت ہے جس سے سبھی اتفاق کرتے ہیں۔ ایک ایسی فلاحی ریاست قائم کرنے کے لیے ہم نے اپنی کوشش ترک نہیں کی ہیں جس میں سماج کے کمزور طبقوں کو سماجی سطح پر معقول حد تک تحفظ عطا کیا جا سکے۔ ان کی بہتری کے لیے باقاعدہ طور پر فکر مند ہونا بذاتِ خود اس بات کا آئینہ

> ایک ایسی فلاحی ریاست قائم کرنے کے لیے ہم نے اپنی کوششیں ترک نہیں کی ہیں جس میں سماج کے کمزور طبقوں کو سماجی سطح پر معقول حد تک تحفظ عطا کیا جا سکے۔ ان کی بہتری کے لیے باقاعدہ طور پر فکر مند ہونا بذاتِ خود اس بات کا آئینہ دار ہے کہ مساوات کو فروغ دینے کا وہ جذبہ مرا نہیں ہے، جس نے ہماری جمہوریہ کے بانیوں کو اس بات کی ترغیب اور فیضان عطا کیا تھا۔

دار ہے کہ مساوات کو فروغ دینے کا وہ جذبہ مرا نہیں ہے جس نے ہماری جمہوریہ کے بانیوں کو اس بات کی ترغیب اور فیضان عطا کیا تھا۔

آزادی کے فوراً بعد جب ملک کا ترقیاتی سفر شروع ہوا تو ہم نے ملی جلی معیشت کا درمیانی راستہ منتخب کیا جس میں پبلک سیکٹر کو بالادستی حاصل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرمایہ دارانہ اور کمیونسٹ بلاک، شدید قسم کی نظریاتی سرد جنگ کا شکار تھے۔ یہ دونوں بلاک اپنی اپنی طاقت کے مطابق ایشیا اور افریقہ کی نو آزاد اقوام کو متاثر کر کے اپنا ہمنوا بنانے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ ہندوستان، بہرحال اپنے طے شدہ منزل کی جانب گامزن رہا اور نظریاتی وابستگی پر کچھ زیادہ زور نہیں دیا اور نہ ہی ذہنی طور پر اپنے آپ کو جانبدارانہ سیاست کے قریب کیا۔ اس کا یہ رویہ اُن چند ملکوں کے عین برعکس تھا جنھوں نے اپنے آپ کو دونوں میں سے کسی ایک بلاک کے ساتھ جوڑ لیا۔ ترقی کے لیے جو انداز طرزِ فکر کو اختیار کیا گیا، وہ دراصل ایک سنگلاخ راہ پر چلنے کے مترادف تھا اور اس کے تحت سماجی انصاف کے مسئلہ پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے لیکن اس سے جو فائدے حاصل ہوئے وہ اقتصادی ترقی، سیاسی استحکام اور سماجی ہم آہنگی کے اعتبار سے خاصے اطمینان بخش رہے۔ راستہ بھلے ہی سخت تھا لیکن ملک کو کسی تباہ کن تبدیلی سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔

سرد جنگ کے بعد کے عالمی اقتصادی منظر نامے نے ہماری معیشت کے سامنے بہت سنگین چیلنج پیدا کر دیا۔ اور اب بھی یہ چیلنج موجود ہے۔ ورثے میں ملنے والی ہماری معیشت میں جو خوبیاں تھیں اور جو طاقت تھی اور جس کی ہم نے آزادی کے بعد آبیاری کی تھی، اس نے بہت سے دباؤ اور مختلف طاقتور حملوں کے باوجود ہمیں ثابت قدم رکھا اور آزمائش کی اس مدت میں ہماری قوم متحد و مستحکم رہی۔ قوم کے استحکام کا راز اس بات میں پوشیدہ تھا کہ عدم مساوات کے باوجود مجموعی اور عمومی طور پر عوام کے دلوں میں یہ احساس موجود تھا کہ عدم مساوات کے باوجود معاشی ترقی سے ہونے والے فائدوں میں وہ بھی حصہ دار ہیں۔ ترقی کا وہ حصہ خواہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ رہا ہو اور ان کے حصے میں خواہ کتنا ہی معمولی فائدہ کیوں نہ آیا ہو۔

آزادی کے بعد سماجی سطح پر عوام کے مختلف حلقوں کو تحفظ فراہم کرنے کی ان کوششوں اور ان سے حاصل ہونے والی کامیابیوں کے تئیں عوام کا رویہ مثبت اور ہمدردانہ طرزِ فکر کا حامل تھا لیکن جب ہم اس حقیقت پر نظر ڈالتے ہیں کہ پسماندہ حلقوں سے تعلق رکھنے والی بہت بڑی آبادی اب بھی ان سہولیات سے محروم ہے جو سماجی تحفظ کا باعث بنتی ہے تو صورتِ حال ایسی نظر آتی ہے۔ مشترکہ خاندان جیسا سماجی تحفظ کا روایتی طریقۂ کار، سماجی اور اقتصادی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کے دباؤ کے تحت بکھرتا جا رہا ہے اور دیہی علاقوں کی اکثریت بے روزگاری، غریبی اور امراض کے بڑھتے

ہوتے ... [illegible] جارہی ہے ۔ ایک ایسے ملک میں جہاں [illegible] اسی فیصد حصہ زراعت پر انحصار کرتا ہے وہاں ضرورت اس بات کی ہے منصوبہ ساز اور انتظامی امور سے وابستہ حکام دیہی علاقوں میں سماجی تحفظ فراہم کرنے کے پیچیدہ مسئلے پر خاص توجہ دیں۔ جیسا کہ جین ڈریزی (Green Dreze)

> آزادی کے بعد سماجی سطح پر عوام کے مختلف طبقوں کو تحفظ فراہم کرنے کی ان کوششوں اور ان سے حاصل ہونے والے کامیابیوں کے تئیں عوام کا اطمینان بخش اور ہمدردانہ طرز فکر کا حامل تھا لیکن جب ہم اس حقیقت پر نظر ڈالتے ہیں کہ پسماندہ طبقوں سے تعلق رکھنے والی بہت بڑی آبادی کو اب بھی ان سہولیات سے محروم ہے جو سماجی تحفظ کا باعث بنتی ہیں تو صورت حال مایوس کن نظر آتی ہے۔

اور امرتیہ سین نے بجا طور پر اپنی کتاب "ہنگر اینڈ پبلک ایکشن" (۱۹۸۹) میں اشارہ کیا ہے کہ اجرت پر کام کرنے والے شہری اور دیہی مزدور سماجی تحفظ کی عدم دستیابی کے باعث سنگین خطرات سے دوچار ہیں اور انہیں منڈی کے جبر سے محفوظ رکھنا مشکل نظر آتا ہے ۔ مذکورہ کتاب کے صفحہ ۴-۵ پر کہا گیا ہے :-

" وہ غریب افراد جن کے پاس اپنی محنت مزدوری کے علاوہ پیداوار کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے اور جنہیں اپنی دال روٹی کے لیے مزدوری کرنا پڑتی ہے، وہی محنت کے شعبہ میں سب سے زیادہ بدحالی کا شکار رہتے ہیں۔ ان کی اجرت میں کمی ہونے سے یا دوسرے لفظوں میں غذائی اشیاء کی قیمت بڑھ جانے سے، یا بے روزگاری میں اضافہ ہونے کے باعث اس طبقہ پر سب سے بڑی مار پڑ سکتی ہے ...... حقیقت تو یہ ہے کہ جدید زمانے میں اجرت پر کام کرنے والے بے زمین مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد ہی لوگوں کو قحط کا نشانہ بناتی ہے ۔ اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی زبوں حالی اس عمل کے درمیانی مراحل میں زیادہ اہم مسئلہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے کیوں کہ اس دوران یہ طبقہ بھی اپنے حجم کے اعتبار سے وسیع تر شکل اختیار کر لیتا ہے لیکن سماجی تحفظ کا انتظام ابھی فروغ نہیں پا سکا ہے "

بیوریج کمیٹی کی رپورٹ

ملک کے محنت کش طبقے کا [illegible] فیصد حصہ غیر منظم شعبے سے وابستہ ہے ۔ قومی آمدنی کا بسا [illegible] فیصد حصہ ، اسی طبقے کی خدمات کا مرہون منت ہوتا ہے انہیں مناسب سماجی تحفظ فراہم کرنے کا کام ، ایسے اہم اور بڑے پیمانہ کے اقدامات کا متقاضی ہے جن کی سفارش ۱۹۴۲ء میں متحدہ برطانیہ میں بیوریج کمیٹی نے کی تھی اس کمیٹی نے کہا تھا کہ " سماجی تحفظ " مہد سے لحد تک فراہم کیا جانا چاہیئے " اس رپورٹ نے جس کی حیثیت ایک سنگ میل کی سی تھی ، پہلی بار یہ اصول وضع کیا کہ مملکت ' شہریوں کے انفرادی تعاون سے اپنے آپ کو اس بات کا ذمہ دار بنائے کہ وہ سماجی تحفظ کے لئے جامع قسم کی خدمات مہیا کر سکے ، جس کا مقصد لارڈ بیوریج کے الفاظ میں ــ " پانچ عفریتوں یعنی تنگ دستی ، بیماری ' لاعلمی ، گندگی اور پریشان حالی میں پیسے غریبوں کے تئیں غفلت اور کاہلی کو ختم کر سکے " وہ لوگ اپنی مجموعی گھریلو پیداوار کا تیس فیصد حصہ سماجی اخراجات کے لئے وقف

> اگر ہم معیشت پر عائد غیر ضروری [illegible] ختم [illegible] کر دیں یا [illegible] کے لیے تعلیمی اور تکنیکی [illegible] کو [illegible] تعلیم ، حفظان صحت [illegible] فراہم کرنا [illegible] صرف اس لیے ہیں کہ غریب [illegible] سے بچایا جائے [illegible] کہ تیز رفتار اور بامقصد ترقی کے [illegible] زندگی کو [illegible]

کر دیتے تھے ۔ حال ہی میں فرانس میں ٹرانسپورٹ اور دوسرے شعبوں کے ورکرز نے جو اسٹرائیک کی تھی وہ وہاں کی حکومت کے اس فیصلے کے خلاف تھی کہ اس مد کے اخراجات میں تخفیف کی جائے ۔ جب ہم صنعتی طور پر ترقی یافتہ مغربی ممالک کے شہریوں کو دیئے جانے والے سماجی تحفظ پر غور کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اتنا طویل فاصلہ طے کرنا حقیقتاً خاصا وقت طلب اور مشکل ثابت ہوگا۔

بین الاقوامی لیبر تنظیم (آئی ایل او) کی سفارشات میں سماجی تحفظ کے مسئلہ کو ہمیشہ ترجیح کے حامل ایجنڈے میں سر فہرست رکھا گیا۔ اس عالمی تنظیم کی وضع کردہ تعریف کے مطابق سماجی تحفظ کا جو تصور ہے وہ ابھی تک دنیا کے دو سو کروڑ مزدوروں میں سے صرف ۸۰ کروڑ افراد کو مہیا کیا جا سکی ہے (یعنی ۴٪) باقی ۹۶ فیصد کو ابھی تک تحفظ فراہم نہیں کیا جا سکا ان میں سے ۷۷ فیصد مزدور ترقی پذیر ملکوں میں بستے ہیں جس میں ہندوستان بھی شامل ہے ان ملکوں میں قانوناً جو کم از کم اجرت طے کی گئی ہے، وہ بھی مالکان ادا نہیں کرتے اور اس طرح طے شدہ شرح اور مالکان کی طرف سے ملنے والی اجرت میں کافی فرق ہوتا ہے ۔ وضع کردہ قوانین کو نافذ کرنے میں انتظامیہ کی جانب سے دانستہ برتی جانے والی یہ غفلت، تیسری دنیا کے ملکوں کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے ۔

قانون سازی کے ذریعہ سماجی تحفظ

دستوری طور پر سماجی تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ہمارے پاس متعدد قوانین موجود ہیں، جن کی تحقیر مالکان لطف لے لے کر کیا کرتے ہیں کیوں کہ انہیں یہ بات معلوم ہے کہ انتظامیہ ان کے نفاذ کے سلسلے میں بے دلی سے کام کرتی ہے ۔ سماجی تحفظ سے متعلق ہندوستان میں پہلا قانون مزدوروں کے معاوضہ سے متعلق... ۱۹۲۳ء میں بنایا گیا تھا۔ آزادی سے بہت پہلے بننے والے اس قانون کے تحت یہ گنجائش پیدا کی گئی تھی کہ مالکان اپنے ملازمین کو زخمی یا کسی حادثے کا شکار ہونے کی صورت میں معاوضہ ادا کریں گے ۔ اس میں متعلقہ کام کے باعث پیدا ہونے والی بیماریاں بھی شامل ہیں۔ اس میں یہ بات واضح ہے کہ ملازمت کے دوران اگر کوئی ایسا حادثہ پیش آتا ہے جو جسمانی معذوری یا موت کا باعث بنے تو مالکان یا انتظامیہ کو اس کا معاوضہ دینا ہی پڑے گا ۔ ریلوے ملازمین یا دوسرے اداروں میں

کام کرنے والے افراد کے سلسلے میں مذکورہ ایکٹ کے شیڈیول II میں یہ تمام باتیں درج ہیں۔ یہ بات بھی موجود ہے کہ موت واقع ہونے یا جسمانی طور پر معذور ہو جانے کی صورت میں معاوضے کی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ رقم کیا ہو گی؟ آزادی کے بعد سوشل انشورنس سماجی تحفظ اور سماجی معاونت سے متعلق متعدد قوانین بنائے گئے جو حقیقتاً متاثر کن بھی ہیں۔ ملازمین کا ''ا اسٹیٹ انشورنس ایکٹ ۱۹۴۸، فیکٹری ایکٹ ۱۹۴۸، پلانٹیشن لیبر ایکٹ ۱۹۵۷، زچگی ایکٹ ۱۹۶۱،

امپلائز پراویڈنٹ فنڈ اور متفرقات ایکٹ ۱۹۵۲، گریجوئٹی ادائیگی ایکٹ ۱۹۷۲، انٹر اسٹیٹ ورک مین ایکٹ ۱۹۷۹، وغیرہ، کافی اہم قوانین ہیں جو سماجی تحفظ کے جدید تصور کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان قوانین کے علاوہ ایسی متعدد اسکیمیں، فنڈ اور کونسلیں قائم کی گئی ہیں جن کے تحت متعدد قسم کے منظم ورکرز کی فلاح کو یقینی بنانے کی گنجائش پیدا کی گئی ہے۔ لیکن ان قوانین میں خامی یہ ہے کہ ان میں سماجی تحفظ کا وہ جامع تصور نہیں پیش کیا گیا جو چالیس کی دہائی میں بیورج پلان کے تحت انگلینڈ میں پیش کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی حد تک ہم ایک ایسے مرحلے میں پہنچ گئے ہیں جہاں سماجی اور معاشی ترقی کے سماجی تحفظ سے متعلق ایک جامع اسکیم کی بھرپور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

اگر ہم معیشت پر عائد غیر ضروری قسم کی پابندی ختم بھی کر دیں یا معاشی ترقی کے لیے تحقیق اور تخلیقی طور پر سنڈی کے طریقہ، کار کو بروئے کار بھی لائیں، تب بھی تعلیم، حفظان صحت وغیرہ جیسے شعبوں کے لیے نسبتاً زیادہ رقم فراہم کرنا پڑے گی۔ صرف اس لیے نہیں کہ غریب طبقوں کو تباہ ہونے سے بچایا جائے بلکہ اس لیے بھی کہ تیز رفتار اور بامقصد ترقی کے لیے معیار زندگی کو بلند کیا جاسکے۔

مرکزی اور ریاستی حکومتوں میں یہ رجحان پرورش پا رہا ہے کہ اپنی ذمہ داریوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے تعلیم اور حفظان صحت جیسے سماجی فلاح کے شعبوں میں اس طور سے اور اس امید پر پیش رفت کی جائے کہ بالآخر پرائیویٹ سیکٹر اس کام کو سنبھال لے لیکن اس رویّہ کے باعث ان شعبوں میں بہت بڑا خلا پیدا ہو سکتا ہے جو کروڑوں افراد کی بدحالی اور تباہی کا باعث بنے گا۔ ایسی حالت میں جب پرائیویٹ سیکٹر کی جانب سے حوصلہ افزا علامتوں کا اظہار

نہیں ہوتا، مملکت کی جانب سے جلد بازی میں کسی طرح کا فیصلہ لیا جانا اقتصادی اصلاح کے عمل کو تباہی کے راستے پر لگا سکتا ہے۔ ریاست کی پالیسی سے متعلق رہنما اصولوں کے زمرے میں دستور کے دفعہ ۴۱ (باب ۱۷) میں جو بات درج ہے، اسے اس سیاق و سباق میں دوہرانے کی ضرورت ہے۔ "ریاست اپنی اقتصادی اور حیاتی صلاحیتوں کی حدود میں رہ کر اس بات کے لیے پوری گنجائش پیدا کرے گی کہ لوگوں کو کام کرنے اور تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا جائے اور بے روزگاری، بڑھاپے اور جسمانی معذوری نیز دوسرے پریشان کن حالات میں سرکاری مدد مہیا کی جائے۔" یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دستور نے "زرعی، صنعتی یا دوسرے شعبوں سے وابستہ ورکرز کے درمیان معقول اجرت، اور بہتر معیار زندگی کے حصول اور فرصت کے اوقات میں تفریح نیز سماجی اور ثقافتی مواقع فراہم کرنے کے

[illegible] ڈھانچے [illegible] بغیر عالمی معیشت سے اپنے آپ کو [illegible]
[illegible] گھوڑے کے سامنے رکھ دیا جائے [illegible]
[illegible] وقت تھوپ دی جائے [illegible]
[illegible] کے لیے تیار ہو۔

معاملہ میں کسی طرح کا فرق نہیں روا رکھا ہے۔ (دفعہ ۴۳)

حقائق سے چشم پوشی

ریاست کی جانب سے ان دستوری دفعات کی تکمیل کے عمل میں، شدید لغزشیں راہ پا گئیں۔ حقائق کو کس طرح توڑ مروڑ دیا گیا اس کی ایک مثال یہ ہے کہ زرعی اور غیر منظم شعبے کے ورکرز کو مقابلتاً نظر انداز کر دیا گیا۔ شاید اس لاپرواہی کی انتظامی اور مالی وجوہ قابل فہم ہیں۔ پھر بھی اسے جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ جو لوگ غریبی کی سطح سے نیچے کی زندگی گزار رہے ہیں یا جو اس طرح کی صورت حال سے بہت قریب ہیں، ان کے لیے سماجی تحفظ پوری قوم کے لیے مجموعی معاشی اور سماجی خوشحالی میں کافی اہم خدمات انجام دے گا۔ ریاست کی جانب سے تحفظ حاصل کرنے کے سب سے پہلے حق دار یہی ہیں۔ ان کے تئیں برتی جانے والی غفلت کے سلسلے میں وسائل کی کمی کا جواز پیش کرنا، کوئی معقول بات نہیں ہے۔ ہم اس وقت پورے عزم اور ثابت قدمی کے ساتھ مکمل سماجی تحفظ کے مقصد میں کامیابی

حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اگر اس مرحلے میں زرعی اور غیر منظم شعبے کے محنت کش طبقوں کی زبردست اکثریت کو ہم نظر انداز کر دیں جو در اصل ہماری معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں تو ترقی کا عمل مصنوعی اور کھوکھلا ہو کر رہ جائے گا۔

۱۹۹۱ء میں جو مردم شماری ہوئی تھی (جس کا قطعی تعین ۱۹۹۲ء میں ہوا) اس کے مطابق ۸۴ کروڑ ۸۰ لاکھ افراد میں سے صرف ساٹھ لاکھ بیس ہزار ورکرز پیداواری صنعت کے منظم شعبے سے جڑے ہوتے ہیں لیکن خاص یا کلیدی نوعیت کا رول ادا کرنے والے افراد کی تعداد ۸ کروڑ ساٹھ لاکھ تھی۔ اس کے علاوہ بندھوا مزدوروں کا مسئلہ ہے، پھر لاکھوں کی تعداد میں ایسے بچے ہیں جو انتہائی بدحالی کا شکار ہیں اور خطرناک قسم کے کاموں سے جڑے ہوئے ہیں ہم اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ انہیں اس ظالمانہ نظام سے نجات ملے،

اور ان کی بازآبادکاری کا کام آگے بڑھے تاکہ ان کی زبوں حالی کا مداوا ہو سکے۔ تاہم اگر سماجی سلامتی کے موجودہ دائرہ کار کو جو کم و بیش ترقی یافتہ مغرب کے طرز پر تیار کیا گیا ہے، ممکنہ حد تک وسعت بھی دے دی جائے تو بھی ان تمام طبقوں کو اس دائرہ کے اندر نہیں لایا جاسکتا۔ لہٰذا معیشت کے ڈھانچے میں تبدیلی لانے کے مسئلہ پر نظر ثانی کرنا پڑے گی اور اس بات پر غور کرنا پڑے گا کہ ملک کے مخصوص سماجی و سیاسی حالات میں سماجی سلامتی کا ایک ایسا متبادل طریقہ کار کیا جائے جو ہماری ضروریات سے مطابقت رکھتا ہو اور اسی کے مطابق ہماری معیشت کا نیا ڈھانچہ تعمیر ہو سکے۔

سماج کو کامیابی سے نئے سانچے میں ڈھالے بغیر عالمی معیشت سے اپنے آپ کو مربوط کرنے کا خیال کچھ ایسا ہی ہے جیسے گاڑی کو گھوڑے کے سامنے رکھ دیا جائے۔ مزید برآں عالم گیریت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو قوم پر اس وقت تھوپ دی جائے جب ملک اقتصادی و سیاسی سطح پر پوری طرح اس کے لیے تیار نہ ہو۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ اس بات کے مترادف ہو گا کہ کمسن لڑکی کو سن بلوغت تک پہنچنے سے قبل اس کی شادی کر دی جائے۔

بنیادی مقصد[illegible] کرنے کی جو ہماری کوششیں ہوں ان کا محور یہ مسائل ہونے چاہئیں۔ تعلیم اور حفظانِ صحت کا معقول بندوبست اور پیداواریت بڑھانے نیز پیشے طور پر روزگار فراہم کرنے کے لئے لوگوں کو مناسب کام یا ہنرمندی کی تربیت۔ ایک بار جب اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے گی تو عالمی معیشت سے اپنے آپ کو مربوط کرنے کا کام اسی طرح آسان اور قدرتی ہو جائے گا، جس طرح بطخ کا بچہ خود بخود پانی پر تیرنا سیکھ جاتا ہے۔ لہٰذا اجمالاً بنیادی مقصد یہ ہونا چاہئے کہ سماجی سلامتی یا تحفظ کے مسئلہ کو معیشت کے نئے سانچے سے مربوط کیا جائے اور ایسے منصوبہ پر عمل کیا جائے جو کافی غور و خوض کے بعد تیار کیا گیا ہو۔

سماجی تحفظ سے متعلق ہماری اسکیموں کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ اسکیمیں شروع تو اس خیال کے تحت کی گئیں کہ ان کے ذریعہ آمدنی کی تقسیم کو متوازن بنایا جائے اور آمدنی کا حصہ نسبتاً خوش حال طبقے سے غریب طبقوں کی طرف منتقل کیا جائے۔ لیکن عملاً کام اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ یعنی غریبوں کی خدمات سے ہونے والا فائدہ امیروں کو فراہم کیا جا رہا ہے۔ اس طرح آمدنی کی تقسیم کا پہیہ مخالف سمت کو گھوم رہا ہے۔

ایک اور دشواری یہ ہے کہ باقاعدہ اعشاریہ کے نظام کی عدم موجودگی میں ورکرز کو سود کے معاملے میں نقصان اٹھانا پڑتا ہے یعنی ای پی ایف اسکیم کے تحت جو رقم وہ جمع کراتا ہے اس کے عوض بینکوں کے مقابلے سود کی شرح کم ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیمت کے اعتبار سے بھی اس کی جمع شدہ رقم افراطِ زر کے باعث کم ہو جاتی ہے اور یہ بھی اسی سسٹم کی خامی کی دین ہے۔

اس کے باوجود ستم ظریفی یہ ہے کہ سماجی سلامتی سے متعلق اسکیم پر ہونے والے اخراجات کے باعث پیداوار کی لاگت میں جو اضافہ ہوتا ہے اس پر مالکان خوب چیخ پکار کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سماجی تحفظ پر جو مجموعی رقم خرچ ہوتی ہے وہ پیداوار کی لاگت کے صرف دو یا تین فیصد کے بقدر ہوتی ہے اور اس دو یا تین فیصد رقم کا بھی صرف سولہ فیصد حصہ مالکان کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ قومی کمیشن برائے لیبر نے ۱۹۶۹ء میں ملک میں سماجی سلامتی کی مربوط اسکیم کے بارے میں ایک قابلِ فہم تجویز پیش کی تھی اور کہا تھا کہ اگلے چند برسوں میں ایسی مربوط اسکیم وضع کرنا ممکن ہو سکے گا،

جس کے تحت موجودہ شرح میں سارے نام قسم کا اضافہ کر کے ملازمت سے متعلق کچھ اور خطرات کا احاطہ کیا جا سکے گا۔ کمیشن نے یہ بات بھی کہی تھی کہ "اس سلسلے میں ایک مثالی انتظام یہ ہوگا کہ سماجی سلامتی کے ایک جامع منصوبہ کے لئے بتدریج کام کیا جائے اور اس کے لئے سیکورٹی سے متعلق تمام فنڈوں کو یکجا کر دیا جائے۔"

معیشت کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا جو نازک مرحلہ ہمیں اس وقت درپیش ہے اس میں یہی بات شامل ہوگی جس کی تکمیل کے لئے حکومت جد و جہد کر رہی ہے اقتصادی اصلاح کے کاموں میں جو تیزی لائی جا رہی ہے، اسے صحیح انسانی شکل دینے کا واحد طریقہ یہی ہے۔

(مضمون نگار کیرالا یونیورسٹی کے سابق پرو وائس چانسلر ہیں)

بقیہ: بال مزدوری کے خاتمے کی کوششیں

میں اس بات سے دھکا لگا ہے کہ جنوبی ایشیا کے ایک ملک کے سلے سلائے کپڑے تیار کرنے والوں نے بین اقوامی ایجنسیوں کے ساتھ اپنے کارخانوں میں سے بال مزدوری ختم کرنے کے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

مغربی ممالک میں بھی بال مزدوری کوئی نئی بات نہیں ہے۔ صنعتی انقلاب کے دوران مغرب میں بچہ مزدوری ایک عام بات تھی اور امریکہ میں اس کا سلسلہ ۱۹۳۰ء کی دہائی تک جاری رہا۔

بال مزدوری کو کم از کم سطح پر لانے کی راہ میں ایک اور رکاوٹ یہ ہے کہ کارخانوں کے مالکان بچہ مزدوری کے مخالفین اور غیر سرکاری تنظیموں کو اپنے کارخانے کا معائنہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

بڑھتی ہوئی شہر کاری کے ساتھ ہندوستانی منظر پر ایک اور مسئلہ بھی ابھرا ہے۔ یہ ہے بچوں کا بطور "طوائف" استعمال جو جنوب مشرقی ایشیا کے کئی ممالک میں کافی پھیلا ہوا ہے۔ سیاحت میں اضافے کے ساتھ اس مسئلے نے مزید وسعت اختیار کی ہے۔ اس روز افزوں سماجی اور اخلاقی گراوٹ کی حدود کے بارے میں کوئی درست اندازہ دستیاب نہیں ہے۔ منیلا کی ایک حالیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ صرف ایشیا ہی میں دس لاکھ سے زیادہ بچے "طوائفوں" کا پیشہ کر رہے ہیں۔ تاہم اس ضمن میں مستند اعداد و شمار حاصل کرنا ناممکن ہے کیوں کہ اس پیشے کی نوعیت ہی ایسی ہے۔

ہندوستان میں بال مزدوری اور بچوں کی ترقی پر اثر انداز ہونے والی دوسری سماجی و معاشی برائیوں سے نپٹنے کے کئی قوانین بنائے گئے ہیں۔ اس بدعت کو ختم کرنے کا واحد طریقہ ان قوانین کا موثر نفاذ ہے۔ بچپن کے دنوں کی معصومیت کو ختم نہیں ہونے دینا چاہیے●

(مصنف سرکردہ صحافی ہیں)

"فلاحِ انسانی کا علم بردار معاشرہ ہونے کے ناطے ہندوستان کا مطمحِ نظر مزدوروں کی سلامتی اور صحت اور ایک جامع سیاق و سباق میں ماحول کا تحفظ ہے۔ ۲۹ مارچ ۱۹۳۱ء کو کراچی میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں بابائے قوم مہاتما گاندھی کی پیش کردہ ایک قرارداد منظور کی گئی تھی جس میں یہ بنیادی حقوق شامل کیے گئے تھے: "۔۔۔۔(۳) صنعتی مزدوروں کے لیے ایسی اجرت جس سے وہ بآسانی اپنی گزر بسر کر سکیں۔ محنت کے محدود گھنٹے اور کام کرنے کے لیے صحت مند حالات۔۔۔۔(۴) مزدوروں کو غلامی یا غلامی جیسے حالات سے نجات دلانا۔۔۔۔(۵) مزدور عورتوں کا تحفظ اور خصوصاً زچگی کے دوران کافی چھٹی کا اہتمام۔۔۔۔(۶) اسکول جانے کی عمر والے بچوں کو فیکٹریوں میں کام پر رکھنے کی ممانعت"

— راشٹرپتی ڈاکٹر شنکر دیال شرما

قلم کار، قارئین اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں

یوجنا (اردو) کے پتے میں تھوڑی تبدیلی ہوئی ہے۔ اب یوجنا (اردو) کا دفتر لیول ۵ کی بجائے لیول ۷ پر پہنچ گیا ہے۔ لہٰذا اب مکمل پتا اس طرح ہوگا:
یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴، لیول ۷
آر کے پورم (میں) نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۶
ٹیلی فون نمبروں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

(ادارہ)

مہیش پرساد

عدم مساوات کو ختم کرنے کے لیے منصوبہ بند ترقی

غریبی کے خاتمے اور سماجی انصاف دلانے کے لیے شروع کیے گئے متعدد فلاحی پروگراموں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے مصنف نے اس مضمون میں یہ اشارہ کیا ہے کہ حکومت کی حکمت عملی یہ رہی ہے کہ ترقی کو منصوبہ بند بنایا جائے اور آمدنی، سماجی مرتبہ اور مواقع کی سطح پر عدم مساوات کو کم سے کم کیا جائے۔

مرکزی حکومت نے غریبی دور کرنے، سماجی سطح پر انصاف دلانے اور عمر اور جسمانی طور پر معذور افراد کی مدد کرنے کے پروگرام میں ایک نئی جان ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا اس طور پر کیا جا رہا ہے کہ پہلے ہی سے شروع کیے گئے پروگراموں کو سختی سے نافذ العمل بنایا جا رہا ہے اور کچھ نئے پروگرام بھی شروع کیے جا رہے ہیں جن کی تفصیل سے وزیر اعظم شری نرسمہا راؤ نے یوم آزادی کے موقع پر آگاہ کر دیا ہے۔ پروگرام کی پیش رفت کا وزیر اعظم بہ نفس نفیس جائزہ لے رہے ہیں اور ترقیاتی کاموں سے متعلق سات وزارتوں سے انھوں نے کہا ہے کہ وہ اپنی رپورٹ پیش کریں۔ حکومت کی خصوصی کوششوں سے گزشتہ دو سے تین برسوں کے دوران بالخصوص رواں سال میں ان پروگراموں کی کامیابی کی جھلک صاف نظر آنے لگی ہے۔

اگرچہ منصوبہ بندی کے زمانے میں غریبی کے تناسب میں نمایاں کمی آئی ہے تاہم بہت بڑی تعداد میں غریب عوام اب بھی حالات کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اس زمرے میں سب سے بڑی تعداد درج فہرست ذاتوں اور قبائل کی ہے اور اس گروپ کی عورتوں کے حصے میں سب سے زیادہ زبوں حالی آئی ہے۔ پرانے پروگراموں پر منصوبہ بند ترقی کی پالیسی اختیار کرکے عمل کیا جا رہا ہے تاکہ آمدنی، سماجی مرتبہ اور مواقع کے اعتبار سے جو عدم مساوات نظر آتی ہے اسے کم سے کم کیا جا سکے۔ اس حکمت عملی کو اس طرح بروئے کار لایا جا رہا ہے کہ لوگوں کو انصاف دلانے میں کامیابی حاصل ہو اور معاشی وسائل کو عام فلاح کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ ان پروگراموں کا مقصد یہ ہے کہ کمزور طبقوں کے بالعموم اور درج فہرست ذاتوں اور قبائل، پسماندہ طبقوں اور اقلیتوں کے بالخصوص تعلیمی اور اقتصادی مفادات کو فروغ دیا جائے تاکہ وہ بے انصافی اور استحصال کا شکار نہ ہوں۔ عوام کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے منصوبہ بند ترقی کی حکمت عملی متعدد جہتوں سے شروع کی گئی ہے۔

چوں کہ ملک کی زبردست اکثریت گاؤں میں رہتی ہے، اس لیے ان پروگراموں کا اصل محور، دیہی علاقوں کے عوام ہیں۔ یہ پالیسی اس احساس پر بھی مبنی ہے کہ ایک بار اگر دیہی علاقوں کی غریبی اور بے روزگاری پر قابو پانے میں کامیابی مل گئی تو شہری علاقوں کے مسائل آسانی سے حل کیے جا سکیں گے کیوں کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دیہی غریب اور بے روزگار افراد ہی شہروں کا رخ کرتے ہیں۔

دیہی علاقوں میں ساتھ ہی ساتھ یہ کوشش بھی رہی ہے کہ جنھیں روزگار کی تلاش ہے انھیں ایسے کام مہیا کیے جائیں جو ان کے لیے نفع بخش ثابت ہوں، جن لوگوں کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہیں ہے انھیں مکان فراہم کیا جائے اور ان گاؤں میں پینے کے صاف پانی کا بندوبست کیا جائے جہاں ابھی تک یہ سہولت موجود نہیں ہے۔ پچھلے ایک یا دو سال کے عرصے میں حکومت نے جو پروگرام اور پالیسیاں نافذ کی ہیں ان کا مقصد دیہی علاقوں کے نچلے اور متوسط دونوں طبقوں کی پریشانیاں دور کرنا ہے۔

وزارت بہبود جہاں ایک طرف درج فہرست ذاتوں اور قبائل، پسماندہ طبقوں اور اقلیتوں پر اپنی توجہ مرکوز کر رہی ہے وہیں سماج کے دوسرے محروم طبقوں مثلاً جسمانی طور پر معذور افراد، معمر لوگوں، منشیات کے عادی اور سڑکوں پر بھٹکنے والے بے سہارا بچوں کو بھی نظر انداز نہیں کر رہی ہے۔ ان میں سے ہر زمرے کے لوگوں کے لیے خصوصی پروگرام وضع کیے گئے ہیں۔ خاص زور اس

ایک بار اگر دیہی علاقوں کی غریبی اور بے روزگاری پر قابو پانے میں کامیابی مل گئی تو شہری علاقوں کے مسائل آسانی سے حل کیے جا سکیں گے کیوں کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دیہی غریب اور بے روزگار افراد ہی شہروں کا رخ کرتے ہیں۔

بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ ان حلقوں میں تعلیم عام ہو اور جو طبقے مراعات سے محروم رہے ہیں انھیں ایسے کاموں سے جوڑا جائے جو ان کے لیے مالی اعتبار سے نفع بخش ثابت ہوں۔ عمر رسیدہ لوگوں کے لیے وزارت بہبود جو پروگرام چلا رہی ہے اس سے قطع نظر وزیراعظم نے یوم آزادی کے موقع پر انھیں اولڈ ایج پینشن دینے کی اسکیم کا اعلان بھی کیا۔ اسی طرح کی بعض دوسری اسکیموں کا اعلان بھی وزیراعظم نے اس موقع پر کیا تھا۔ مثلاً ان غریب گھرانوں کو راحت پہنچائی جائے گی جن کا روزی کمانے والا واحد فرد انتقال کر جائے گا۔ اس کے علاوہ غریب گھرانوں کی عورتوں کو پہلے دو بچوں کی پیدائش پر زچگی کی اسکیم کے تحت امداد فراہم کی جائے گی۔

دیہی ترقیات

اس بات کی توقع کی جا رہی ہے کہ دیہی ترقیات اور فلاحی اسکیموں کی انتظامیہ کو جمہوری لامرکزیت کو فروغ دے کر زیادہ سے زیادہ سہولیات فراہم کی جائیں گی اور دستور کی ۷۳ ویں ترمیم کے تحت مقامی حکومت کا تین مرحلوں والا ڈھانچہ وضع کیا جائے گا۔ مرکز اس بات پر شدت سے زور دے رہی ہے کہ ریاستیں، پنچایتی راج کے اداروں کو معقول اختیارات تفویض کریں۔ ان اقدامات کے ساتھ ساتھ دیہی ترقیات کے پروگرام کو مرکزی بجٹ سے معقول رقم دے کر مزید مستحکم بنایا جا رہا ہے اس مد میں مرکز نے آٹھویں پلان میں ۳۰ ہزار کروڑ روپے کی رقم مختص کی جب کہ ساتویں پلان میں یہ رقم ۱۱ ہزار کروڑ روپے تھے۔ دیہی ترقیات کے لیے مخصوص کی جانے والی رقم دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں جہاں یہ رقم ۳۱۰۰ کروڑ روپے تھی وہاں ۹۵-۱۹۹۴ء میں بڑھ کر ۷۰۰۰ کروڑ روپے ہو گئی ہے، جب کہ رواں مالی سال میں مزید اضافہ کر کے اسے ۷۷۰۰ کروڑ تک پہنچا دیا گیا ہے۔

جواہر روزگار یوجنا، جو دیہی علاقوں میں مردوں اور عورتوں کو اضافی روزگار مہیا کرنے والا اب سے بڑا روزگار منصوبہ ہے۔ اس کے تحت دیہی بنیادی ڈھانچے اور سماجی اثاثوں کو بھی مستحکم بنایا جائے گا تاکہ دیہی علاقوں کے غریب عوام ان سے براہ راست اور لگاتار مستفید ہوتے رہیں۔ اس پروگرام کے تحت ایک نئی اور اہم پیش رفت یہ ہوئی ہے کہ فنڈ کا ۲۰ فی صد حصہ مختلف ریاستوں کے ان ۱۲۰ اضلاع میں ترقیاتی کاموں کو تیز تر کرنے کے لیے مخصوص کیا جائے گا جو زمانہ قدیم سے پچھڑے ہوئے ہیں اور جہاں بے روزگاری بہت زیادہ ہے اور روزگار کے مواقع بہت کم میسر آتے ہیں۔ فنڈ کا مزید ۵ فی صد حصہ ایسے خاص اور جدید منصوبوں پر صرف کیا جائے گا، جن کے تحت محنت کش طبقوں کو اپنا گھر بار ترک کرنے سے روکا جا سکے، عورتوں کو زیادہ روزگار فراہم کیا جا سکے اور رضاکار تنظیموں کے توسط سے ایسے خصوصی پروگرام شروع کرائے جا سکیں جن سے خشک سالی اور سیلاب سے نمٹنے اور بنجر زمینوں کو کارآمد بنانے میں مدد ملے۔

اکتوبر ۱۹۹۳ء میں ایک نئی اسکیم جسے "یقینی روزگار اسکیم" کا نام دیا گیا ہے، شروع میں ملک کے ۱۷۷۸ انتہائی پسماندہ بلاکوں میں شروع کی گئی۔ اس کے بعد اس کی توسیع ہوتی گئی اور اس زمرے میں اب تک ۲۴۴۶ بلاکوں کو شامل کیا جا چکا ہے۔ اس اسکیم کا مقصد ایسے موسم میں لوگوں کو روزگار فراہم کرنا ہے جب زرعی شعبے میں کام کم ہوتا ہے۔ اس کے تحت ۱۸ سے زیادہ اور ۶۰ سال سے کم عمر کے لوگوں کو روزگار فراہم کیا جاتا ہے۔ اس اسکیم میں قریب ۱۵ لاکھ لوگوں نے اپنے ناموں کا اندراج کرایا ہے۔

مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام میں بھی جو غریبی دور کرنے سے متعلق خود سے روزگار حاصل کرنے کا ایک اہم پروگرام ہے، مناسب تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ امدادی رقم بڑھا دی گئی ہے اور بعض ایسی سرگرمیوں کی بھی اجازت دے دی گئی ہے جن کی اس سے پہلے اس پروگرام کے تحت اجازت نہیں تھی۔ طے شدہ نشانے کے مطابق کامیابی حاصل کرنے پر توجہ کم کر دی جائے گی، اس کے بجائے فی خاندان سرمایہ کاری کی رقم بڑھا دی جائے گی۔ رواں مالی سال میں یہ رقم ۱۲۰۰۰ روپے ہو گی اور بعد کے برسوں میں اسے مزید بڑھا کر ۱۵۰۰۰ کر دیا جائے گا۔

ان تمام سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ عورتوں اور بچوں سے متعلق ترقیاتی پروگرام کو بھی نئے سرے سے سرگرم کیا جا رہا ہے اور اب اس پروگرام کے تحت پورے ملک کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اس پروگرام کی وجہ سے اب تک ۱۵ لاکھ عورتیں مستفید ہو چکی ہیں اور انھوں نے قرضوں کی اضافہ شدہ رقم نیز دوسری فلاحی اسکیموں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران ان حلقوں کو ابتدائی فنڈ کے طور پر ملنے والی رقم کو ۱۵ ہزار روپے سے بڑھا کر ۲۵ ہزار روپے کر دیا گیا ہے۔

جس پروگرام کے تحت دیہی نوجوانوں کو خود سے روزگار حاصل کرنے کے لیے ٹریننگ دی جاتی ہے، اسے مزید مستحکم بنا دیا گیا ہے۔ ٹریننگ حاصل کرنے والوں کو ملنے والے وظیفے، ٹریننگ دینے والوں کو دیے جانے والے اعزازی بھتے نیز سامان کی خریداری سے متعلق رقم میں قابل ذکر حد تک اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ یہ پروگرام ٹریننگ حاصل کرنے والوں اور ٹریننگ دینے والوں، دونوں کے لیے قابل توجہ بن جائے۔

روزگار

غریبی دور کرنے والے پروگراموں پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ خود روزگار اسکیم، مزدوری والے کام اور علاقے کے ترقیاتی پروگراموں کے تحت دیہی غریب عوام کو زیادہ سے زیادہ روزگار اور آمدنی حاصل ہو سکے۔ جواہر روزگار یوجنا کے تحت جو اجرت مہیا کرنے والا

عمر رسیدہ لوگوں کے لیے وزارت بہبود جو پروگرام چلا رہی ہے اس سے قطع نظر وزیراعظم نے یوم آزادی کے موقع پر انھیں اولڈ ایج پینشن دینے کی اسکیم کا اعلان بھی کیا۔ اسی طرح کی بعض دوسری اسکیموں کا اعلان بھی وزیراعظم نے اس موقع پر کیا تھا۔ مثلاً ان غریب گھرانوں کو راحت پہنچائی جائے گی جن کا روزی کمانے والا واحد فرد انتقال کر جائے گا۔

سب سے بڑا پروگرام ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران مزدوروں کو ۱۰۲۳ ملین کام کے دن اور ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران ۹۵۲ ملین کام کے دن مہیا کیے گئے جن پر بالترتیب ۳۸۷۹ اور ۴۲۶۸ کروڑ روپے خرچ ہوئے۔ رواں مالی سال یعنی ۹۶-۱۹۹۵ء کے لیے ۴۸۰۳۶ کروڑ روپے کی رقم فراہم کی گئی ہے جس میں سے پہلے چھ مہینہ کا مالی نشانہ ۱۹۲۰۱۴ کروڑ روپے طے کیا گیا تھا۔ اس میں سے اس مدت کے دوران جو خرچ ہوا وہ ۱۸۱۷۹۵ کروڑ روپے کے بقدر تھا۔ اس سال کے لیے روزگار کا جو سالانہ نشانہ طے کیا گیا ہے اس کے مطابق ۸۰۴۵۸ ملین کام کے دن ہوں گے۔ اس سال ستمبر تک جو کامیابی ملی ہے اس کے مطابق ۲۶۳۹۰ ملین کام کے دن مہیا کیے جا چکے ہیں جب کہ اس مدت کے لیے ۳۲۱۸۴ ملین کام کے دن کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔

جواہر روزگار یوجنا دو جہتوں پر مبنی ہے۔ پہلی جہت میں دو اہم ذیلی اسکیموں کا احاطہ کیا گیا ہے "اندرا آواس یوجنا" اور لاکھوں کنواں قائم کرنے کی اسکیم۔ اندرا آواس یوجنا ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران شروع کی گئی جو کہ بے زمین دیہی باشندوں کو روزگار کی گارنٹی دینے والے پروگرام کی ذیلی اسکیم تھی۔ ۱۹۸۹ء میں اپنے قیام کے بعد ہی سے یہ اسکیم جواہر روزگار یوجنا کے حصے کے طور پر جاری رہی۔ جواہر روزگار یوجنا کے پروگرام نیز مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام سے جڑے ہوئے دوسرے پروگراموں کا مقصد درج فہرست ذاتوں اور قبائل کو فائدہ پہنچانا ہے۔

مکانات کی اسکیم

اس اسکیم کے شروع ہونے کے بعد اب تک ۲۰۱۹۹۵۶ مکانات تعمیر کیے جا چکے ہیں جن پر ۲۴۳۴ کروڑ کی رقم خرچ ہوئی ہے۔ رواں سال یعنی ۹۶-۱۹۹۵ء میں اندرا آواس یوجنا کے تحت ۱۰۰۷۵۱۹ مکانات تعمیر کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے جب کہ گزشتہ سال دس لاکھ مکانات تعمیر کیے گئے تھے۔ پہلے چھ ماہ کے دوران ۴۰۰۰۸ مکانات کا نشانہ طے کیا گیا ہے جن میں سے ۲۶۹۶۶۲ مکانات تیار بھی ہو چکے ہیں جبکہ ۲۴۶۶۷۴ مکانات زیر تعمیر ہیں۔

اندرا آواس یوجنا کے علاوہ ۹۴-۱۹۹۳ء میں مرکز کے زیر اہتمام دیہی علاقوں میں مکانات تعمیر کرنے کی ایک اسکیم شروع کی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ غریبی کی سطح سے نیچے کی زندگی بسر کرنے والوں اور سماج کے کمزور طبقوں کو مکان فراہم کرنے کے لیے متعدد ریاستی حکومتیں جو کوششیں کر رہی ہیں انھیں بڑھاوا دیا جائے اور پروگرام کو مستحکم بنایا جائے۔ ریاستوں نے اس مد میں ۹۳-۱۹۹۲ء میں جو رقم خرچ کی اس کا کم و بیش نصف حصہ مرکز نے ادا کیا جب کہ دس فی صد حصہ اس پروگرام سے مستفید ہونے والوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ امداد زمین کی خریداری اور متعلقہ خدمات، مکان کی مرمت کرانے اور وسعت دینے نیز نئے مکانات کی تعمیر کے لیے دی جاتی ہے۔

پلاننگ کمیشن، اس وقت ہندوستان میں ایک ایسے دیہی ہاؤسنگ پروجیکٹ پر کام کر رہا ہے جو دنیا کے سب سے بڑے پروجیکٹوں میں سے ایک ہوگا اور اسے نویں پنچسالہ پلان کے دوران شروع کیا جائے گا۔ اس کا انکشاف وزیر اعظم شری نرسمہا راؤ نے مہاراشٹر کے گورنر شری پی۔ سی الیگزنڈر کو نو تعمیر شدہ گاؤں، ہن گاؤں کی کنجیاں دیتے ہوئے کیا۔ یہ گاؤں لاتور زلزلے میں تباہ ہو گیا تھا۔

لاکھوں کنواں تعمیر کرنے کی اسکیم

اس اسکیم کے تحت ۲۹۳۹ کروڑ روپے کی لاگت سے ۸۵۵۵۴۵ کنویں تعمیر کیے جا چکے ہیں۔ اس اسکیم کو قومی دیہی روزگار پروگرام اور دیہی بے زمین لوگوں کو روزگار کی گارنٹی والے پروگرام کی ذیلی اسکیم کے طور پر شروع کیا گیا تھا اور جواہر روزگار یوجنا کے تحت یہ اب بھی جاری ہے۔ اس اسکیم کا مقصد دراصل آزاد کرائے گئے بندھوا مزدوروں، درج فہرست ذاتوں اور قبائل سے تعلق رکھنے والے چھوٹے اور برائے نام کسانوں کو آب پاشی کے لیے کھلے کنویں فراہم کرنا تھا، لیکن اب اس میں آبپاشی کی دوسری چھوٹی اسکیموں مثلاً آبپاشی کے تالاب کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ رواں مالی سال کے پہلے نصف حصے میں یعنی ستمبر ۱۹۹۵ء تک مختلف ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں ۷۹۳۲۹ کنویں تعمیر کر لیے گئے اور ۱۳۹۲۰۴ کنویں کسی نہ کسی سطح پر زیر تعمیر ہیں۔

ان تمام سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ... اور تجربہ سے متعلق ترقیاتی پروگرام کو بھی نئے سرے سے سرگرم کیا جا رہا ہے اور اب اس پروگرام کے تحت پانچ سو بلاک کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ اس پروگرام کی وجہ سے اب تک ۵ لاکھ لوگ مستفید ہو چکے ہیں اور انھوں نے قرضوں کی اضافہ شدہ رقم نیز دوسری ... اسکیموں سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اس اسکیم کے شروع ہونے کے بعد اب تک ۲۰۱۹۹۵۶ مکانات تعمیر کیے جا چکے ہیں جن پر ۲۴۳۴ کروڑ کی رقم خرچ ہوئی ہے۔ رواں سال یعنی ۹۶-۱۹۹۵ء میں اندرا آواس یوجنا کے تحت ۱۰۰۷۵۱۹ مکانات تعمیر کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے جب کہ گزشتہ سال دس لاکھ مکانات تعمیر کیے گئے تھے۔

پینے کا پانی

پینے کے پانی کے قومی مشن نے، جسے ۱۹۹۱ء میں راجیو گاندھی ڈرنکنگ واٹر مشن کا نام دیا گیا بڑی کامیابی سے ایسے ۱۶۱۷۲۲ گاؤں کا احاطہ کر لیا ہے جن کے بارے میں ۱۹۸۵ء کے سروے میں یہ نشاندہی کر دی گئی تھی کہ یہاں پانی کے ذرائع موجود نہیں ہیں۔ اس مشن کا مقصد گاؤں

میں انسانی آبادی کے لیے ۴۰ لیٹر پانی فی کس فی روز کے حساب سے مہیا کیا جائے گا۔ ریگستانی اضلاع کے لوگوں کو مزید ۳۰ لیٹر پانی فی کس فی روز کے حساب سے "ریگستانی ترقیاتی پروگرام" کے تحت دینے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہر ۲۵۰ آدمی کے لیے ایک ہینڈ پمپ یا اسٹینڈ پوسٹ بنانے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔

پانی کے مسئلہ سے گھرے ہوئے گاؤں کا کامیابی سے احاطہ کر لینے کے بعد ۱۹۹۱ء میں ایک فیصلہ یہ کیا گیا کہ ایک جامع قسم کا سروے کرایا جائے جس کے تحت ایسے اعداد و شمار حاصل کیے جائیں جن کی روشنی میں مستقبل میں دیہی علاقوں میں پانی کی سپلائی کے مسئلہ سے نمٹا جا سکے۔ ۱۹۹۴ء میں مکمل ہونے والے سروے سے یہ بات سامنے آئی کہ ۱۳۱۸۹۷۵ مسکن میں سے ۱۴۰۹۷۵ مسکن ایسے ہیں جہاں صاف پانی کی فراہمی کی قطعی کوئی سہولت موجود نہیں ہے۔ یہ تعداد ۱۰٫۶۹ فی صد کا احاطہ کرتی ہے۔ ان مقامات کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ابھی تک یہاں وہ سہولیات موجود نہیں ہیں۔ ان میں سے ۲۴۰۰۰ کا احاطہ کر لیا گیا ہے اور اب ۱۱۸۹۷۵ باقی بچے ہیں۔

> پانی کے مسئلے سے گھرے ہوئے گاؤں کا کامیابی سے احاطہ کر لینے کے بعد ۱۹۹۱ء میں فیصلہ کیا گیا کہ ایک جامع قسم کا سروے کرایا جائے جس کے تحت ایسے اعداد و شمار حاصل کیے جائیں جن کی روشنی میں مستقبل میں دیہی علاقوں میں پانی کی سپلائی کے مسئلہ سے نمٹا جا سکے

سروے سے یہ انکشاف بھی ہوا کہ اس مشن کے تحت آبادی کے ۴۸٫۹۰ فی صد حصے کا پورے طور پر احاطہ کر لیا گیا ہے جب کہ ۴۵٫۸۰ فی صد کا (جن کو دس لیٹر سے کم پانی ملتا تھا) ضمنی طور پر احاطہ کیا گیا۔ صرف ۵٫۶ فی صد کا احاطہ نہیں کیا جا سکا۔ اس کے پیش نظر مشن نے اپنے کام میں مزید تیزی لانے کی تجویز پیش کی تا کہ باقی ماندہ آبادی کا بھی احاطہ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ ۶۱۳۷۵ مسکن کو بھی پورا پانی سپلائی کیا جا سکے جہاں اب تک فی کس فی روز دس لیٹر سے کم پانی دستیاب ہے۔ تجویز کے مطابق ۱۹۹۷ء یعنی آزادی کی گولڈن جوبلی کے سال تک اس پوری آبادی کا احاطہ کر لیا جائے جس کو ابھی تک یہ سہولیات دستیاب نہیں ہیں یا ضمنی طور پر دستیاب ہیں۔ رواں مالی سال میں اضافہ شدہ پانی کی فراہمی کے پروگرام کے تحت ۱۱۰ کروڑ روپے منظور کیے گئے ہیں۔ اس کے لیے ریاستیں بھی "کم سے کم ضروریات" پروگرام کے تحت معقول امداد دیں گی۔

بنجر یا ناقابلِ استعمال زمینوں میں بہتری لانے کا پروگرام

ماحولیاتی صورت حال، متعلقہ سماجی و معاشی مسائل نیز زمین کی خراب یا برباد ہوتی ہوئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے حکومت نے ایک نیا محکمہ قائم کیا ہے، جسے "ڈپارٹمنٹ آف ویسٹ لینڈ ڈیولپمنٹ" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ محکمہ جولائی ۱۹۹۲ء میں وزارت دیہی ترقیات کے ذریعہ قائم کیا گیا تھا۔ ۳۱ مارچ ۱۹۹۵ء تک اس پروگرام کے تحت ۱۸۰ غیر سرکاری (رضا کار) تنظیموں کو ۹۰۰۰ ہیکٹیر زمین کو قابلِ استعمال بنانے کے لیے ۶۸۰ کروڑ روپے دیے جا چکے ہیں۔ ۹۵-۱۹۹۴ء کے لیے اس مد میں تین کروڑ روپے کا جو بجٹ منظور کیا گیا تھا اسے پورے طور پر استعمال کیا جا چکا ہے اور اب رواں مالی سال کے لیے بھی اتنی ہی رقم منظور کی گئی ہے۔

زمین کو بہتر یا قابلِ استعمال بنانے کے اس پروگرام کے تحت کچھ اور کاموں کو بھی فروغ دیا جا رہا ہے۔ مثلاً دیہی علاقوں میں روزگار کے مواقع پیدا کرنا، غیر جنگلاتی زمین پر ایندھن کی لکڑی، جانوروں کے چارے اور تعمیراتی کاموں میں استعمال ہونے والی لکڑیاں حاصل کرنے کے لیے پیڑ لگانا۔ (اس مقصد کے لیے پرائیویٹ بنجر زمینوں کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے) اور خشک یا بنجر زمینوں کی پائیدار نوعیت کی پیداوار بڑھانے کے لیے تحقیق کے ذریعہ کم قیمت کی مناسب ٹکنالوجی کو فروغ دینا بھی شامل ہے۔

اس کے علاوہ حکومت نے خشک سالی کا شکار ہونے والے علاقوں اور ریگستانی علاقوں کے لیے بھی دو الگ الگ ناموں سے ترقیاتی پروگرام شروع کیے ہیں جن کا مقصد مٹی اور نمی کو محفوظ کر کے زمینی توازن برقرار رکھنا ہے۔ خشک سالی کا شکار ہونے والے علاقوں سے متعلق شروع کیے گئے پروگرام کے تحت اس محکمہ کے قیام یعنی ۷۴-۱۹۷۳ء کے بعد سے اب تک ۷۵٫۱۰ لاکھ ہیکٹیر زمین کو ۷۴۰٫۵۲ کروڑ روپے کی لاگت سے بہتر بنایا جا چکا ہے اور اس کے تحت تین اہم شعبوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ یعنی زمینی و آبی وسائل نیز جنگلات اور چراگاہوں کو فروغ دینا۔ انہی تین اہم شعبوں کا انتخاب ریگستانی علاقوں کے ترقیاتی پروگرام کے تحت بھی کیا گیا تھا اور اس شعبے میں ۱۵٫۰۵ لاکھ ہیکٹیر زمین کو ۷۸-۱۹۷۷ء سے اب تک قابل استعمال بنایا جا چکا ہے۔ ان دونوں ترقیاتی پروگراموں کی ۹۵-۱۹۹۴ء کے اختتام تک کی ترقیاتی رپورٹ دستیاب ہے۔

> حکومت نے خشک سالی کا شکار ہونے والے علاقوں اور ریگستانی علاقوں کے لیے بھی دو الگ الگ ناموں سے ترقیاتی پروگرام شروع کیے ہیں جن کا مقصد مٹی اور نمی کو محفوظ کر کے زمینی توازن برقرار رکھنا ہے۔

شہری علاقوں خاص طور سے ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ کی آبادی والے چھوٹے شہروں میں غریبی کی سنگین اور پیچیدہ صورت حال کا احساس کرتے ہوئے جہاں ماحولیات اور ترقی کے مسائل سے نمٹنے کے لیے، وسائل کے فقدان کے باعث منصوبہ بندی کی صورت حال کافی سنگین ہے، وزیر اعظم نے ۱۵ اگست ۱۹۹۴ء کو غریبی کے خاتمے کے لیے ایک مربوط اسکیم کا اعلان کیا تھا جس کا نام ہے "وزیر اعظم کا شہری علاقوں میں غریبی دور کرنے کا مربوط پروگرام"۔ اس نئے پروگرام

کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ مربوط طور پر غریبی کا باعث بننے والے عوامل پر بہ یک وقت حملہ کیا جائے۔ پروگرام کے دیگر خاص مقاصد یہ ہیں۔

(۱) سماجی فلاح کے شعبے میں موثر کامیابی حاصل کی جائے۔ (۲) مقامی سماج کو اختیارات دیے جائیں۔ (۳) پائیدار نوعیت کا سہارا فراہم کر کے اس جانب لوگوں کو مائل کیا جائے۔ (۴) صحت اور صفائی کی صورت حال کو بہتر بنایا جائے اور (۵) ماحولیاتی صورت حال کو متوازن بنایا جائے۔

مختلف وزارتوں، محکموں، ریاستی حکومتوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کی انتظامیہ کو سالانہ پلان سے متعلق جو ہدایات جاری کی گئی ہیں ان میں دوسری باتوں کے علاوہ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ ان پالیسیوں اور منصوبوں پر بھی نظر رکھی جائے جن کو آٹھویں پلان میں روزگار فراہم کرنے کے محاذ پر نمایاں کامیابی حاصل کرنے کا محور تصور کیا گیا ہے۔ آٹھویں پلان میں روزگار فراہم کرنے کی جو حکمت عملی ترتیب دی گئی تھی اس کے تحت ہر سال ۸۰ لاکھ افراد کو روزگار کے مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں۔ پلان کے پہلے دو برسوں یعنی ۹۳-۱۹۹۲ء اور ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران اوسطاً سالانہ ۶۰ لاکھ افراد کو روزگار کے مواقع ملے۔

درج فہرست ذاتیں اور قبائل

چوں کہ درج فہرست ذاتوں اور قبائل سے تعلق رکھنے والے افراد نسل در نسل سماج کے سب سے پسماندہ طبقوں میں شامل رہے ہیں اور انھیں مشکل ہی سے ایسا کوئی موقع ملا کہ ترقی کر سکیں لہٰذا قدرتی طور پر اس طرح کے فلاحی کاموں کا بڑا حصہ اسی آبادی کے لیے وقف ہوتا ہے۔ ان کے لیے نہ صرف خصوصی پروگرام شروع کیے گئے (مثلاً پلان کے تحت متفرق ضمنی اسکیمیں اور مرکزی امداد کی اسکیم وغیرہ) بلکہ ایسے خصوصی مالی ادارے بھی قائم کیے گئے جن کا مقصد ان طبقوں میں کاروبار کا رجحان پیدا کرنا اور انھیں مالی امداد مہیا کرنا تھا تاکہ وہ اپنے طور پر کوئی کاروبار شروع کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں

اور اس طرح ملک کے ترقیاتی عمل کا حصہ بن سکیں۔ ایسی اسکیمیں بھی بنائی گئیں جن کے تحت وہ اپنے آپ کو اس لائق بنا سکیں کہ اعلا سطح تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ مثلاً وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ یا ایم۔ بی۔ اے بن سکیں۔ سول سروس، ریاست کی اعلا ملازمتوں میڈیکل، انجینئرنگ اور دوسری ملازمتوں نیز دوسرے داخلے کے امتحانات میں شریک ہونے کے خواہاں اس طبقے کے لوگوں کے لیے پرائیویٹ اداروں میں کوچنگ کا بندوبست کیا گیا تاکہ وہ مذکورہ امتحانات کی تیاریاں کر سکیں۔

صفائی کرمچاری اور خاک روبوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے جو کوششیں کی گئیں ان کے تحت ۱۲ اگست ۱۹۹۴ء کو صفائی کرمچاری کا قومی کمیشن قائم کیا گیا تھا کہ ان کو درپیش مخصوص مسائل پر توجہ دی جا سکے۔ خاک روبوں کو نجات دلانے نیز ان کے بازآبادکاری کے لیے قومی اسکیم کے تحت ایک سروے کرایا گیا جس سے یہ پتا چلا کہ پورے ملک میں اس وقت ۷۶ء۷ لاکھ خاکروب موجود ہیں، اس میں بہار اور بنگال کی ریاستیں شامل نہیں ہیں۔ گزشتہ تین برسوں کے دوران ان میں سے ۳۴۴۹۲۔ افراد کو مختلف قسم کے کاروبار کی ٹریننگ دی گئی اور ۶۵۴۰۶ لوگوں کی بازآبادکاری کا بندوبست کیا گیا۔ ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران اندازے کے مطابق مزید ایک لاکھ خاکروبوں کو ٹریننگ دی گئی اور ان کی بازآبادکاری کا انتظام کیا گیا۔ اس اسکیم کے لیے ۴۷ کروڑ روپے فراہم کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ۹۲-۱۹۹۱ء اور ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو مزید ۸۴ کروڑ روپے فراہم کیے گئے۔

پروگرام کی جو دوسری ضمنی سرگرمیاں ہیں

ان کے تحت کمزور طبقوں کی حالت کو بہتر بنانے کی غرض سے میٹرک پاس کرنے سے قبل اور میٹرک کے بعد اس طبقے کے طلبا کو وظیفہ دینا اور لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ہوسٹل تعمیر کرانا شامل ہے۔ میٹرک پاس کرنے سے پہلے کی وظیفہ دینے کی اسکیم کے تحت ۲٫۰۵ لاکھ طلبا و طالبات کو وظیفے دیے جائیں گے جب کہ میٹرک کے بعد والی اسکیم کے تحت ۱۸٫۴۳ لاکھ افراد کے مستفید ہونے کی توقع ہے۔ متعلقہ ریاستی حکومتوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو مرکز جو ۴۲۴٫۷۴ کروڑ روپے فراہم کرنے کا پابند ہے اس کے علاوہ مختلف ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو اس اسکیم کے تحت مرکز کی جانب سے ۱۹۶٫۳۵ کروڑ روپے کی رقم فراہم کی جائے گی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے ہاسٹل کی تعمیر کے لیے اسکیم کے تحت ۵٫۰۵ کروڑ روپے کی رقم فراہم کی گئی تھی اور اندازہ یہ تھا کہ ۹۵-۱۹۹۴ء تک ۸۴۰۰ طلبا و طالبات کے لیے اس رقم سے ۱۶۸ ہاسٹل تعمیر کیے جا سکیں گے۔ اس کے علاوہ کتابوں کا بینک قائم کرنے کے لیے ۲٫۴۵ کروڑ کی رقم ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو دی گئی تاکہ درج فہرست ذاتوں اور قبائل سے تعلق رکھنے والے طلبا و طالبات اس سے مستفید ہو سکیں۔ توقع ہے کہ اس اسکیم سے مزید ۲۰۰۰ طلبا فائدہ اٹھا سکیں گے۔

درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے طلبا کے لیے کوچنگ کا بندوبست کرنے کی غرض سے ۹۵-۱۹۹۴ء کے لیے دو کروڑ روپے کے بجٹ کی گنجائش پیدا کی گئی اور جنوری ۱۹۹۵ء تک ۱٫۸۰ کروڑ روپے فراہم بھی کر دیے گئے۔ اس سال کے دوران ۱۱ ہزار طلبا کو ٹریننگ دینے

متعدد پروگرام بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ وزارت بہبود نے اپنی کوششیں جاری رکھی ہیں کہ حکومت ہند سے متعلق سول عہدوں اور سول سروس میں دیگر پسماندہ طبقوں کے لیے مختص ۲۷ فیصد آسامیاں پر کرنے کا کام سختی سے نافذ کیا جائے [illegible] مراعات یافتہ طبقے کے [illegible] کے باعث جو آسامیاں خالی رہ جائیں انھیں پر کیا جا سکے۔

کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ ملک بھر میں ایسے بہت سے مراکز قائم کیے گئے ہیں، جن میں سول سروس ریاستی ملازمتوں، میڈیکل اور انجینئرنگ نیز دوسرے امتحانات میں شرکت کے خواہش مند امیدواروں کے لیے کوچنگ کا بندوبست کیا گیا ہے تاکہ وہ ضروری تیاریاں کرسکیں۔ "راؤ اسٹڈی سرکل" کے علاوہ مزید پرائیویٹ کوچنگ اداروں کو اس میں شامل کرنے کے لیے اسکیم پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ مذکورہ امتحانات کے علاوہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ایم بی اے اور ہوٹل مینجمنٹ جیسے پیشہ ورانہ کورس کے لیے بھی کوچنگ کی سہولیات فراہم کرنے کے انتظامات کیے گئے ہیں۔

وزارت بہبود کے قبائلی ترقی کے محکمے کو ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران ۳۸۲ کروڑ روپے دیے گئے۔ دسمبر ۱۹۹۴ء تک ۲۴،۳۲۴ کروڑ روپے تک خرچ ہو چکے تھے جو بجٹ کے ۸۴،۹۸ فی صد کے بقدر تھے۔ مجموعی طور پر ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت ۱۰،۴۲ لاکھ شیڈیول ٹرائب خاندانوں کو امداد مہیا کی گئی ٹرائبل مارکیٹنگ ڈیولپمنٹ فیڈریشن کے تحت ہونے والے کاروبار کی مالیت میں قابلِ ذکر حد تک اضافہ ہوا ہے۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں مجموعی کاروبار ۲۷،۳۱۷ کروڑ روپے تک پہنچ گیا جب کہ اس سے پچھلے سال کاروبار کی مالیت ۸۶،۰۰ کروڑ روپے سے زیادہ نہ تھی۔

متعدد پروگراموں میں تیزی لانے کے ساتھ ساتھ وزارت بہبود نے اپنی یہ کوشش جاری رکھی ہے کہ حکومت ہند سے متعلق سول عہدوں اور سول سروس میں "دیگر پسماندہ طبقوں" کے لیے مخصوص ۲۷ فی صد آسامیاں پُر کرنے کا کام سختی سے نافذ کیا جائے اور ان طبقوں کے مراعات یافتہ طبقے کی عدم شمولیت کے باعث جو آسامیاں خالی رہ جائیں انھیں پُر کیا جا سکے۔ مذکورہ وزارت نے ۱۸ ریاستوں اور مرکز کے زیرِ انتظام دو علاقوں میں "دیگر پسماندہ طبقوں" کی فہرستیں بھی مکمل کرلی ہیں۔ "بیک ورڈ کلاسز فائننس اینڈ ڈیولپمنٹ کارپوریشن (این بی سی ایف ڈی سی) نے جو قرضے فراہم کیے ہیں، ان سے اندازاً ۲۲۰۴۵ کروڑ افراد مستفید ہوئے ہیں۔ اس مالیاتی ادارے کے قیام کے بعد سے اب تک جو قرضے دیے گئے ہیں وہ ۵۵،۰۰۰ کروڑ روپے تک پہنچ گئے ہیں۔

اقلیتوں کی ترقی

ایک "قومی اقلیتی ترقیاتی کارپوریشن" ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ء کو قائم کیا گیا جس کا اندراج ایک کمپنی کے طور پر ۵۰۰ کروڑ روپے کے منظور شدہ سرمائے سے کرایا گیا۔ اس کارپوریشن کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے معاشی اور ترقیاتی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے اور اس کے تحت خاص توجہ پیشہ ورانہ مہارت کے حامل طبقوں اور خواتین پر دی جائے۔ اس کے علاوہ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۴ء تک شہری علاقوں کی وقف جائداد سے متعلق ترقیاتی کونسل کو ۴۳،۱۱ کروڑ روپے دیے گئے۔ مزید برآں مولانا آزاد ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کو گرانٹ ان ایڈ کے طور پر ۲۶ کروڑ روپے کی اضافی رقم دی گئی۔

ایک "قومی اقلیتی ترقیاتی کارپوریشن" ۳۰ ستمبر ۱۹۹۴ء کو قائم کی گئی جس کا اندراج ایک کمپنی کے طور پر ۵۰۰ کروڑ روپے کے منظور شدہ سرمائے سے کرایا گیا۔ اس کارپوریشن کے قیام کا خاص مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے معاشی اور ترقیاتی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے اور اس کے تحت خاص توجہ پیشہ ورانہ مہارت کے حامل طبقوں اور خواتین پر دی جائے۔

جسمانی طور پر معذور افراد کی بہبود

دیگر سرگرمیوں کے علاوہ رضاکار تنظیموں کو بڑے پیمانے پر اس لیے امداد فراہم کی گئی کہ وہ معذور افراد کی آبادکاری کے کاموں میں تعاون کریں۔ ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران دی جانے والی امدادی رقم کا تخمینہ ۳۷،۱۷ کروڑ روپے تھا جب کہ ۹۳-۱۹۹۲ء میں یہ رقم ۶۰،۹ کروڑ روپے سے زیادہ نہ تھی۔ ایسی رضاکار تنظیموں کی تعداد جنھیں امداد دی گئی ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران اندازاً ۴۰۰ تھی جب کہ ۹۴-۱۹۹۳ء میں امداد پانے والی رضاکار تنظیموں کی تعداد ۳۱۵ تھی۔

منشیات کی روک تھام

اس پروگرام کے تحت اس بات پر خاص توجہ دی جا رہی ہے کہ منشیات کے عادی افراد میں بیداری لانے کے اقدام کیے جائیں نیز ان کے علاج اور بازآبادکاری کا بندوبست کیا جائے۔ صلاح دینے والے مراکز، منشیات کے مضر اثرات سے متعلق بیداری لانے اور نشیلی ادویات سے چھٹکارا دلانے والے مراکز میں تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ ان مراکز کے توسط سے منشیات کا استعمال ترک کرنے والوں کی بازآبادکاری کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اس طرح کی سہولیات صنعتوں اور جیلوں میں بھی فراہم کی گئی ہیں۔ ۹۵-۱۹۹۴ء کے دوران ایسے ۸۵ نئے مراکز قائم کرنے کا نشانہ طے کیا گیا ہے جس کے بعد ان مراکز کی تعداد ۳۵۹ ہو جائے گی۔ نشیلی ادویات کے استعمال کو روکنے کے لیے متعلقہ وزارت کی طرف سے ۲۵۰ سے زیادہ غیر سرکاری تنظیموں کو مالی امداد دی جا رہی ہے۔

سماجی امداد کا قومی پروگرام

اس پروگرام کے تحت ۱۹۹۵ء میں یوم آزادی کے موقع پر وزیر اعظم نے عمر رسیدہ لوگوں کی پینشن (اولڈ ایج پینشن) سے متعلق جس اسکیم کا افتتاح کیا اس کے تحت امید ہے کہ ۶۵ سال سے زیادہ عمر کے ۵۳ لاکھ ایسے افراد فیضیاب ہو سکیں گے جن کے پاس روزی کمانے کا کوئی باقاعدہ ذریعہ موجود نہیں ہے۔ اس کے لیے ۴۸۰ کروڑ روپے کا بجٹ منظور کیا گیا ہے جس کے تحت متعلقہ افراد کو ۷۵ روپے ماہانہ دیے جائیں گے۔

ایک نیشنل فیملی بینیفٹ اسکیم بھی شروع

کی گئی ہے، جس کے توقع کے مطابق ۵ء۳ لاکھ افراد مستفید ہوں گے۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسے دکھی خاندان کو جس کا روزی کمانے والا خاص فرد اس دنیا سے گزر جائے، اسے مالی امداد فراہم کی جائے۔ اس اسکیم کے تحت قدرتی موت کا شکار ہونے والوں کے لواحقین کو ۵۰۰۰ روپے اور حادثاتی موت کا شکار ہونے والے افراد کے خاندان کو ۱۰ ہزار روپے دیئے جائیں گے۔

سماجی امداد کے قومی پروگرام کی زچگی سے متعلق بھی ایک اسکیم شروع کی گئی ہے جس کے تحت ۵۴ لاکھ خواتین کو پہلے دو بچوں کی ولادت کے وقت ۳۰۰ روپے کی امداد دی جائے گی۔ اسکیم کے تحت ۲۶ کروڑ روپے کے بجٹ کی گنجائش پیدا کی گئی ہے۔

محنت کش طبقے کا تحفظ

۱۹۹۱ء میں معاشی اصلاحات کا جو سلسلہ شروع ہوا اس کا اثر سماجی زندگی پر بھی مرتب ہوا ہے۔ حکومت نے اس کے تئیں غفلت نہیں برتی ہے وزارت محنت ان اصلاحات کے سماجی پہلو پر مسلسل نظر رکھ رہی ہے۔ چناں چہ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایسے اقدام کیے گئے ہیں جن کے تحت محنت کش طبقے کے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ وزارت نے اس بات پر خاص توجہ دی ہے کہ زرعی اور صنعتی مزدوروں کے لیے صارفی اشیاء کی قیمتوں کا جائزہ لیا جاتا رہے تاکہ کم سے کم اجرت کے سلسلے میں نظر ثانی ہوتی رہے، قیمتوں میں اضافے کی تلافی ہو اور ان کا کام محفوظ رہے۔ حکومت نے پراویڈنٹ فنڈ، گریجویٹی، صحت، کام کے وقت زخمی ہو جانے کی صورت میں معاوضہ اور مزدوروں کی فلاح جیسے شعبوں میں سماجی تحفظ سے متعلق متعدد اقدامات کیے ہیں۔ ابھی حال ہی میں حکومت نے ایک پنشن اسکیم شروع کی ہے جس پر اسی سال ۱۵ نومبر کو عمل درآمد ہوا ہے۔ یہ اسکیم موجودہ فیملی پنشن اسکیم کی جگہ نافذ کی گئی ہے۔ اس اسکیم سے غیر سرکاری شعبے کے پراویڈنٹ فنڈ جمع کرانے والے تقریباً ایک کروڑ ۸۰ لاکھ افراد مستفید ہوں گے اس اسکیم کے تحت ملازمین کو ریٹائرمنٹ کے بعد کم از کم ۵۰۰ روپے ماہانہ پینشن ملے گی۔ اب تک یہ ضابطہ تھا کہ ملازم اگر مدت ملازمت کے دوران انتقال کر جاتا تھا تو اس کے خاندان کو اس طرح کی پینشن ملتی تھی۔

نو تشکیل شدہ عوامی نظام تقسیم

۱۹۹۱ء میں یوم آزادی کے موقع پر ایسے عوامی نظام تقسیم کی اسکیم کا اعلان کیا گیا تھا جس کے تحت دور دراز علاقوں۔ مثلاً ریگستان، خشک سالی سے متاثر ہونے والے، قبائلی اور پہاڑی علاقوں میں رہنے والے عوام کو آسانیاں فراہم کی جا سکیں۔ ۳۰ جون ۱۹۹۵ء تک ۲۳ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں ۲۷۷۵ بلاکوں کی نشاندہی کی گئی اور سستے غلے کی ۱۴۱۸۱ دکانیں کھولی گئیں جن کے توسط سے عام استعمال کی اضافی اشیاء مثلاً چائے، دالیں، صابن اور نمک وغیرہ تقسیم کی جاتی ہیں۔ ایسا بیشتر ریاستوں میں ہو رہا ہے۔

غریبی دور کرنے اور سماجی انصاف دلانے کے لیے حکومت نے جو حکمت عملی ترتیب دی ہے وہ اس منصوبہ بند ترقی کا حصہ بن گئی ہے جس کے تحت آمدنی، سماجی مرتبہ اور مواقع کے اعتبار سے پائی جانے والی نابرابری کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے

غریبی دور کرنے اور سماجی انصاف دلانے کے لیے حکومت نے جو حکمت عملی ترتیب دی ہے وہ اس منصوبہ بند ترقی کا حصہ بن گئی ہے، جس کے تحت آمدنی، سماجی مرتبہ اور مواقع کے اعتبار سے پائی جانے والی نابرابری کو کم سے کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ حکمت عملی جیسا کہ وزارت بہبود نے اپنی سالانہ رپورٹ میں کہا ہے' عام آدمی کو انصاف دلانے اور معاشی وسائل سے انھیں فیض پہنچانے کا ایک وسیلہ ہے۔ اگرچہ متعلقہ وزارت نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس کے پاس موجودہ وسائل اور وسیع تر پیمانے پر شروع کیے جانے والے پروگرام کے درمیان اتنا بڑا خلا ہے کہ اسے پُر کرنا آسان کام نہ ہوگا۔ "پھر بھی محدود وسائل کے باوجود ایسے فوائد سامنے آئے ہیں جو صاف نظر آتے ہیں۔ درج فہرست ذاتوں اور قبائل میں جو تعلیم کا فروغ ہوا ہے نیز انھیں جو نمائندگی ملی ہے اسے قابل ذکر حد تک کامیابی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔" جیسا کہ رپورٹ میں کہا گیا ہے۔

مزید برآں اقتصادی اصلاحات کے نتیجہ میں اقتصادی ڈھانچے کی سطح پر جو تبدیلیاں کرنی پڑی ہیں، ان میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ محنت کش طبقے کے مفادات مجروح نہ ہونے پائیں۔ حکومت نے ایسے پروگرام بھی شروع کیے جن کے تحت معمر اور معذور افراد اور دوسرے کمزور طبقوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ ان کوششوں کے نتائج کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ وسائل کس حد تک مہیا کیے جاتے ہیں۔ پھر ان کے اثرات ظاہر ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ چوں کہ اقتصادی اصلاحات کا عمل جاری ہے اور رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ شعبوں کو پرائیویٹ سیکٹر کے حوالے کیا جا رہا ہے، اس لیے حکومت اس پوزیشن میں آ جائے گی کہ وسائل کا زیادہ حصہ سماجی شعبے کے لیے فراہم کر سکے تاکہ سماج کے غریب اور پچھڑے ہوئے طبقوں کی حالت سدھر سکے۔ ●

(مصنف سرکردہ صحافی ہیں)

اہلِ قلم حضرات

اب ہمیں قدرے ضخیم مضامین بھی ارسال کر سکتے ہیں کیونکہ "یوجنا" کے صفحات میں اضافے کے باعث اب طویل مضامین بھی شائع کیے جا سکتے ہیں۔ براہ کرم کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط تحریر کریں۔

(ادارہ)

ڈاکٹر بی. ڈی. جمیلہ

تعلیم ــــ سماجی ترقی کا ایک وسیلہ

مصنف کا خیال ہے کہ انسانی وسائل کے فروغ میں تعلیم کا فروغ معاشی ترقی کے لیے ایک اہم وسیلہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس کے باعث پیداواریت میں اضافہ ہوتا ہے اور اضافہ آبادی پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔

سماجی ترقی یا فلاح کے تعلق سے ابتدائی نوعیت کے مشاہدے کی ضرورت ہے۔ کسی ایسی وجہ سے جو واضح نہیں ہو پائی ہے، فلاح کا تصور صرفہ کے ہم معنی ہوتا جا رہا ہے اور اس طرح اولین ترجیح کی بجائے ثانوی اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔

فلاح سے متعلق پختہ عزائم کی نشاندہی پچھلے ترقیاتی منصوبوں کی دستاویزات میں کی گئی تھی۔ ایک سوشلسٹ سماج یا سوشلسٹ طرز کے سماج کا تصور پیش کیا گیا تھا۔ یعنی ایک ایسا سماج جس میں دولت اور آمدنی کی نابرابری کو ختم کیا جا سکے۔ اس تصور کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ ایک بار اگر ہم زمین اور بنیادی وسائل سمیت دولت کو بہتر طور پر تقسیم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پچھڑے اور محروم طبقوں کے ارادوں اور جوش و خروش کو اتنا بڑھاوا مل جائے گا کہ امیر طبقوں کی حوصلہ شکنی سے پیدا شدہ صورت حال کی تلافی ہی نہیں ہو جائے گی بلکہ اس سے بھی کچھ سوا ہوگا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری پالیسی پر اس خیال کی گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔

اہم مسئلہ

اس مسئلہ کا ایک ناقص پہلو یہ ہے کہ ہم معاشی ترقی اور فلاح سے متعلق ضروریات کے درمیان "ایک توازن" یا "مفاہمت" پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاص طور سے اس صورت میں جب تعلیم کے فروغ پر زیادہ توجہ صرف کی جاتی ہے اور ہم نویں پنج سالہ پلان تک مجموعی گھریلو پیداوار کا ۶ فی صد اس پر خرچ کرنے کا عزم کرتے ہیں جیسا کہ موجودہ وزیر اعظم نے وعدہ کیا ہے۔ تو کیا شرح نمو کے پیمانوں سے پیدا کیے جانے والے ربط، اس طور پر بار آور ثابت ہو سکیں گے کہ وسیع تر تعلیمی اخراجات کو

جائز قرار دیا جا سکے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہم اس بات پر غور کر لیں کہ کیا فلاح کو صرفہ سمجھ لیا جائے؟ اگر ایسا ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ وسائل کو صرفہ کی نذر کر دیا جائے جب کہ سرمایہ کاری کی ضروریات کہیں زیادہ توجہ طلب ہیں۔ ہم بہرحال ایک عجیب و غریب صورت کا شکار ہیں۔ ایک طرف غریبوں کی بہت بڑی تعداد کا صرفہ ہے تو دوسری طرف بہت کم تعداد کے امیروں کا! آخر الذکر طبقہ کو شاید بہتر تصور کیا جاتا ہے کیوں کہ امیر طبقہ صارفی بھی ہے اور بچت بھی کرتا ہے، جب کہ غریب "صارفی" تو بہت بڑا ہوتا ہے لیکن بچت بہت کم کرتا ہے۔ سماج اول الذکر کے صرفہ کا برا نہیں مانتا لیکن آخر الذکر کے صرفہ پر اظہار افسوس کرتا ہے۔

دلیل یہ دی جا تی ہے کہ غریب اس بات کا انتظار کریں کہ وہ معمول کی سست رفتار ترقی کے ذریعہ امیر ہو جائیں اس کے بعد تعلیم، بہتر صحت یا اس طرح کے دوسرے شعبوں میں اعلا صرفہ کا خواب دیکھیں! فلاح سے متعلق خدمات کے شعبے میں مارکیٹ قیمت کو مد نظر رکھنے کے خیال کی جو آج کل بڑی شد و مد سے حمایت کی جا رہی ہے، وہ بنیادی طور پر اسی تصور کی پیدا کردہ ہے۔

کسی ایک ملک یا مختلف ملکوں میں ایسے حالات بھی آئے کہ ان کے پاس وقت تو تھا لیکن انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ معمول کی سست رفتار ترقی میں تیزی لا کر عوام کے قریب پہنچا جا سکتا ہے جو ضروری ہے۔ فلاحی اقدامات کی کمی سے متعلق عوامی بیداری کو بڑھاوا نہیں دیا گیا۔ سرکاری پالیسی میں ترقی پسندی کا فقدان تھا اور سامراجی یا

نوآبادیاتی حکومت کے زمانے میں جو فلاحی کام نہیں ہو پائے تھے اور جن کا بعد ازاں پورا کیا جانا ضروری تھا، اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ لیکن اب وہ سب کچھ بدل گیا۔ لہٰذا اب اس عمل کا انتظار کرنا فضول ہے جس کے تحت سست رفتار ترقی غریب کو امیر بناتی ہے۔ اگر تعلیم پر ہونے والے اخراجات "صرفہ" کے زمرے میں آتے ہیں تب بھی اس میں امیر اور غریب کی تخصیص نہیں کی جاسکتی۔

وسائل کا مسئلہ بہت اہم ہے، لیکن ہم یہ حصے کی بچت کر پاتے ہیں۔

تعلیم کا اثر

اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ مشرقی ایشیا کے ممالک نے اپنی زراعت اور بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلہ سے بہت پہلے ہی اور بہتر طور پر قابو پانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

بہت پہلے یعنی ۱۸۷۲ء میں جب جاپان میں میجی کی حکومت برسر اقتدار تھی تو اس ملک شرح نمو بڑھانے اور سماجی ترقی سے متعلق اقدامات کا اہم حصہ ہوتی ہے اور اگر ہمارا مقصد اس عمل میں تیزی لانا ہے تو ہمیں اس مسئلہ کو ایک قومی چیلنج کے طور پر دیکھنا ہوگا اور اس سے غریبوں اور امیروں۔ دونوں کے تعاون سے نمٹنا ہوگا۔ غریبوں کے ضروری استعمال کو "اصراف بے جا" کہہ کر اس کی حوصلہ شکنی کرنا اور امیروں کے غیر ضروری اصراف کی حوصلہ افزائی کرنا اور اسے جائز قرار دینا مسئلہ کا حل نہیں ہے۔

ہندوستان میں تعلیم کے محاذ پر خاص طور سے خواندگی کے معاملے میں جو کامیابی حاصل کرنے میں بے جا تاخیر ہوئی ہے، اس پر مختصراً ہی سہی، غور کرنے کی ضرورت تھی۔ اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ تعلیم کے فروغ سے متعلق اخراجات کو بدقسمتی سے غیر ضروری اخراجات مان لیا گیا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر کیا وجہ ہے کہ تعلیم کے شعبہ میں قومی پیمانے پر جو سرمایہ فراہم کیا گیا وہ اتنی لمبی مدت تک ۳ فی صد تک محدود رہا، جب کہ وعدہ ۶ فی صد کا کیا گیا تھا۔

اہم سرمایہ کاری

یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم انسانی وسائل کے فروغ میں سرمایہ کاری کی حیثیت کہیں زیادہ رکھتی ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ عوام کے فلسفیانہ روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں کو بڑھاتی ہے حالاں کہ تعلیم کی شکل میں ہونے والی سرمایہ کاری بھی کچھ

کہہ کر اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے کہ امیروں کو "صرفہ" یا استعمال کی اجازت ملنی چاہیے کیوں کہ وہ بچت بھی کر سکتے ہیں جب کہ غریب ایسا نہیں کر سکتے۔ یہاں بنیادی طور پر جس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ امیر طبقہ اپنی بقا کے لیے قومی وسائل کا سہارا لیتا ہے جس میں غریبوں کی بھی گراں قدر خدمات شامل ہوتی ہیں، پھر زراعت، صنعت، تجارت اور خدمات کے شعبے میں یہ دونوں طبقے، ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں لہٰذا ان دونوں طبقوں کے "اصراف" یا استعمال کو قومی اصراف یا استعمال کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس میں نام نہاد غیر ضروری "صرفہ" بھی شامل ہے۔ مختصر یہ کہ قومی پیمانے پر سرمایہ کاری کے لیے جو کمی نظر آتی ہو یا جو فاضل وسائل دکھائی دیتے ہوں انھیں مجموعی قومی ونفع نقصان کا حصہ سمجھنا چاہیے نہ کہ اس کے لیے کسی مخصوص زمرے کے لوگوں کو ذمہ دار سمجھنا چاہیے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ کمی بیشی کے مسئلہ سے نمٹنا ایک اہم اور نازک معاملہ ہوتا ہے، جو ممالک ۲۵ فی صد کے قریب بچت کرتے ہیں جب کہ ہندوستان جیسے ملک ایسا نہیں کر سکتے جو اپنی مجموعی گھریلو پیداوار کے ۲۰ سے ۲۲ فی صد

میں ہمہ گیر نوعیت کا ابتدائی تعلیم کا نظام نافذ کیا گیا تھا۔ دراصل اسے فرانس کے اسکول سسٹم کے طرز پر نافذ کیا گیا تھا جب کہ اعلا تعلیم کا طریقہ امریکی تعلیمی نظام سے اخذ کیا گیا تھا۔ پرائمری اسکولوں میں ۱۸۷۳ء میں حاضری ۳۰ فی صد سے بھی کم ہوا کرتی تھی جب کہ ۱۹۰۷ء تک ۹۰ فی صد تک پہنچ گئی۔ اسی طرح پرائمری اسکولوں کی تعداد بھی ۱۸۸۵ء سے ۱۹۱۵ء کے درمیان تین گنا

بڑھ گئی۔ جاپان دنیا کا امیر ترین اور انتہائی ترقی یافتہ ملک ہونے سے پہلے ہی تعلیم کے محاذ پر نمایاں کامیابی حاصل کر چکا تھا اور دنیا کے انتہائی تعلیم یافتہ اور تعلیمی امور سے متعلق بیدار اقوام کی صف میں شامل ہو چکا تھا۔

یہ وہ موقع نہیں ہے کہ اس بات پر بحث کی جائے کہ سماجی ترقی کی رفتار کو کس طرح تیز تر کیا جائے اور نہ ایسی تجویز پیش کرنا مقصود ہے کہ بچت ہی سب کچھ ہے۔ لیکن بچت،

ایسی اقدار کے فروغ کا باعث بنتی ہے جو معاشی ترقی اور فلاح کے سلسلے میں اہم رول ادا کر سکتی ہے۔ اگر اسے "اصراف" میں بھی شامل کر لیا جائے تو بھی یہ ماننا پڑے گا۔ اس کے توسط سے جو قدریں راہ پاتی ہیں وہ اقتصادی پیمانوں کے نقطۂ نظر سے دال روٹی کے مقابلے کہیں زیادہ اہم اور مثبت اثرات کی حامل ثابت ہوتی ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی وسائل کے فروغ میں تعلیم، سماجی ترقی یا فلاح کے مقابلے

[illegible] بڑا اور اہم وسیلہ ثابت ہوتی ہے۔ [illegible] کہ یہ پیداوار کو تکنیکی سطح پر بنیاد فراہم کرتی ہے اور اس لیے بھی کہ بہتر انتظامی اور تنظیمی وسائل کے ذریعہ پیداواریت کے اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ اس کے باعث بہتر مالیہ اور مارکیٹنگ میسر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اختراعات اور تحقیقات کے سلسلے، براہ راست اعلا پیداواریت کو فیض پہنچاتے ہیں۔ تکنیکی بنیادیں تعلیم کی نچلی سطح سے حاصل ہوتی ہیں بلکہ بہتر تنظیم مارکیٹنگ اور مالیہ وغیرہ اعلا سطح کی تعلیمی اختراعات اور تحقیقات کی دین ہوتی ہیں۔ اس کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ انسانی وسائل کے فروغ کے باعث شرح پیدائش کم ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں خواتین میں خواندگی کا فروغ مردوں کی خواندگی سے زیادہ ہی اہمیت کا حامل ہوجاتا ہے۔

عالمی ترقیاتی رپورٹ

ترقیات کے چیلنج سے متعلق ۱۹۹۱ء کی عالمی ترقیات کی عالمی بینک کی رپورٹ میں (جو کچھ دوسری تحقیقات پر مبنی ہے) اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اسکول کی تعلیم پر ایک اضافی سال کے اثرات کا زرعی پیداوار کے نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے۔ اس کے لیے منتخب ممالک اور سال کو نظر میں رکھا گیا تھا۔ اس سے یہ بات سامنے آئی کہ کوریا میں زرعی پیداوار میں دو فی صد کا اضافہ ہوا، پیرو میں تین فی صد ملیشیا میں ۵ فی صد اور تھائی لینڈ میں ۳ فی صد کا اضافہ ہوا تھا۔ اس سے یہ اندازہ تو ہو ہی گیا کہ ایک اضافی سال کی تعلیم نے اتنا بڑا فائدہ پہنچایا۔ اب اگر اس پس منظر میں اس فرق کا اندازہ کیا جائے جو تعلیم کے پھیلاؤ اور عدم پھیلاؤ کے باعث پیدا ہوا ہوگا، تو صورت حال سامنے آئے گی وہ اس کا اندازہ تو کیا ہی نہیں گیا۔ کم از کم عالمی بینک کی اس رپورٹ میں تو نہیں کیا گیا۔ لیکن ایک اندازے کے مطابق، یہ فرق ۸ سے ۱۰ فی صد کے قریب ہوگا۔

ہندوستان میں زرعی پیداوار پر اسکول کی تعلیم کے اثرات کا جائزہ لینا چاہیے تھا کہ اس سے ٹھوس باتیں سامنے آئیں۔ شاید اعداد و شمار تو موجود ہیں لیکن انھیں وسیع پیمانے پر اکٹھا کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال اس بات کے پیش نظر کہ بالغوں کی شرح خواندگی، اوسط خواندگی کی شرح سے کم ہے، نیز یہ کہ جن علاقوں میں پہلے سے اسکول موجود ہیں، وہاں تعلیم کی صورت حال کے پس منظر میں زرعی پیداواریت کا جائزہ لینے سے تعلیم کے اثرات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر ایسا جائزہ لیا جائے تو ہندوستان میں پیرو، ملیشیا یا تھائی لینڈ سے ہر حال میں بہتر صورت حال سامنے آئے گی۔ ابھی عالمی بینک کی جس رپورٹ کا حوالہ دیا گیا اس سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ پیرو میں ایک سال کی اسکول کی اضافی تعلیم کے باعث زرعی شعبے میں جدید تکنالوجی کو بروئے کار لانے کے رجحان میں ۴۵ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ مشرقی ہندوستان کے بیشتر حصوں میں جہاں ناخواندگی کی شرح زیادہ ہے اور بالغوں میں ناخواندگی کی شرح اور زیادہ ہے۔ وہاں یہ دشواری بھی موجود ہے کہ جدید زرعی طریقۂ کار کو بہتر طور پر نہیں اپنایا جاتا۔ اگر پیرو کے تجربہ کی تقلید کی جائے تو زرعی پیداوار میں یقیناً اضافہ ہو سکتا ہے۔

[illegible] شرح خواندگی میں زیادہ فرق ہے [illegible] بہت کم ہے، وہاں [illegible] جہاں ان دونوں میں شرح خواندگی [illegible] وہاں صورت حال بہتر ہے

تعلیم اعلا پیداواریت میں معاون

اس طرح اگر دیکھا جائے تو ابتدائی تعلیم ایسے انسانی وسائل کے فروغ کا باعث بنتی ہے جس کے باعث نئی معلومات حاصل کی جاتی ہیں، غیر روایتی طریقۂ کار کو آزمایا جاتا ہے اور پیداواریت کے نئے طریقوں کو فروغ دیا جاتا ہے اور ان سب کے وسیلے سے بہتر پیداواریت اور شرح نمو کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

تعلیم، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا، شرح پیدائش پر بھی مثبت اور موافق اثر ڈالتی ہے اور اس طرح بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پانے میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے اور فی کس آمدنی میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ اسے بھی ترقیاتی عمل میں بالواسطہ تعاون تصور کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں ۱۹۹۰-۹۱ء میں خواندگی کی شرح ۵۲ر۲ فی صد تھی جب کہ ۱۹۸۰-۸۱ء میں یہ شرح ۴۳ر۵۶ فی صد تھی۔ جہاں تک مردوں اور عورتوں کی خواندگی کی الگ الگ شرح کا تعلق ہے۔ ۱۹۸۰-۸۱ء میں مردوں کی شرح خواندگی ۵۶ر۳۷ فی صد تھی اور عورتوں کی ۲۹ر۷۵ فی صد۔ ۱۹۹۰-۹۱ء میں یہ شرح بالترتیب ۶۴ر۱۱ اور ۳۹ر۳ فی صد ہو گئی۔ یعنی دونوں زمروں کے فی صد کا فرق بہت معمولی یا برائے نام رہا۔ ۱۹۸۰-۸۱ء میں یہ فرق ۲۶ر۶ فی صد کا تھا جب کہ ۱۹۹۰-۹۱ء میں ۲۴ر۸ فی صد کا! دس سال کے عرصے میں صرف ۱ر۸ فی صد کے خلا کو پُر کیا جاسکا۔

اس بات کو محسوس کیا گیا کہ جہاں ناخواندگی کی شرح کم ہونے سے شرح پیدائش اور کم عمر کی موت کی شرح گھٹ جاتی ہے جس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے وہیں یہ بات بھی ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ مردوں اور عورتوں میں خواندگی کی شرح کا خلا پُر ہونے کے باعث بھی اچھے نتائج سامنے آتے ہیں۔ عام تجربہ یہ ہے جہاں مردوں اور عورتوں کے شرح خواندگی میں زیادہ فرق ہے اور عورتوں کی شرح خواندگی مردوں کے مقابلے میں بہت کم ہے، وہاں پیدائش اور کم عمری کی موت کی شرح زیادہ ہے لیکن جہاں ان دونوں میں شرح خواندگی کا فرق بہت کم ہے اور عورتیں بہت معمولی فرق سے پیچھے ہیں، وہاں صورت حال بہتر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں کی شرح خواندگی کا فرق اتنی سست روی سے کم ہو رہا ہے کہ یہ قابل افسوس بات ہے لیکن یہ بات بھی اتنی ہی قابل افسوس ہے کہ خواندگی کی مجموعی شرح میں اضافہ بھی اسی سست روی کا شکار ہے۔ اگر اس صورت حال کو بہتر بنایا جاسکے اور شرح خواندگی میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ مردوں اور عورتوں کے شرح کے فرق کو تیزی سے کم کیا جاسکے تو ابتدائی
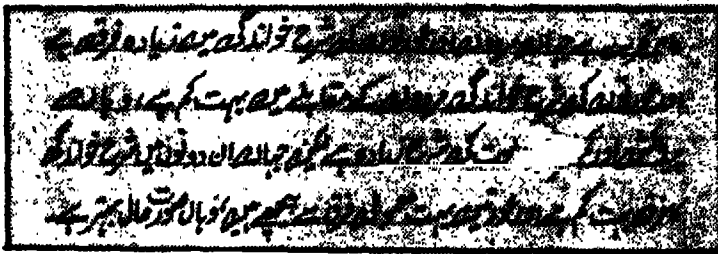
تعلیم پر ہونے والے اخراجات اضافۂ آبادی پر روک لگانے اور فی کس آمدنی میں اضافہ کرنے کا باعث بنیں گے۔

ترجیحات

جہاں تک خواندگی اور ابتدائی تعلیم کے فروغ کا سوال ہے، اس پر اختلاف کی کم ہی گنجائش موجود ہے۔ مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جب مجموعی اخراجات کی حد بندی اعلا تعلیم اور نچلی جماعتوں کی پڑھائی سے متعلق ترجیحات طے کرنے کی متقاضی ہوتی ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کی قومی تعلیمی پالیسی کے باوجود اگر "آپریشن بلیک بورڈ" کے پروگرام نے کوئی خاص پیش رفت نہیں کی تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اعلا تعلیم کو بھی کافی وسائل کی ضرورت ہے۔ خاص طور سے اس صورت میں جب کہ اسے سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی سے متعلق بنیادی ڈھانچہ تعمیر کرنے کے لیے زیادہ موثر بنانا ہے۔ کوریا کے انسانی وسائل کے فروغ کی کافی ستائش کی گئی ہے۔ وہاں سائنس اور تحقیق کے شعبے میں افرادی وسائل ہندوستان سے دس گنا زیادہ ہوں گے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ یوروپ میں اعلا تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی تعداد ۲۵ فی صد یا اس سے زیادہ ہوگی جب کہ ہندوستان میں یہ شرح صرف آٹھ فی صد ہے۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہم اعلا تعلیم یافتہ افرادی قوت کے معمولی حصے کو بھی اپنے یہاں نہیں کھپا سکتے، جن کی تعداد ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے بہت کم ہے، قدرتی طور پر ملک کے منصوبہ ساز سنگین قسم کی مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں۔ چونکہ ہم نے قومی ترجیحات میں پیداواریت میں اضافہ کرنے کے نقطۂ نظر سے تعلیم کو اولیت نہیں دی تھی اس لیے آج ہم اس طرح کی باتیں کرکے اپنا دامن بچانے لگے ہیں کہ ہمارا تعلیمی نظام اپنے حالات سے ہم آہنگ نہیں ہے یا یہ کہ روزگار سے جڑا ہوا نہیں ہے اور اساتذہ پڑھانے یا تحقیق کے کاموں میں دلچسپی نہیں لیتے۔

بلاشبہ طلبا کے ارادوں اور حوصلوں کو بلند رکھنے کے لیے روزگار کی فراہمی کو بھی یقینی بنایا جانا چاہیے اور انھیں اس بات کا حق دیا جانا چاہیے کہ وہ اپنے اساتذہ کو مجبور کریں کہ وہ ان کی رہنمائی کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ پیداواریت میں تکنالوجیکل تبدیلی اور ترقی کے ذریعہ اضافہ کرنے کے لیے اعلا تعلیم کا صحیح رول اس وقت سمجھ میں آئے گا جب کہ ترقیاتی عمل میں روزگار کے مواقع کم کی بجائے بڑے پیمانے پر فراہم کیے جائیں۔ لیکن یہ کام بنیادی طور پر تعلیمی نظام کی بجائے معیشت سے جڑا ہوا ہے کیوں کہ اس کا دار و مدار بچت، شرح سرمایہ کاری، سرمایہ کاری کے طریقۂ کار اور اس کے تحت سرمایہ کے بہاؤ پر ہے۔ زیادہ سے زیادہ نظام تعلیم میں یہ تبدیلی لائی جاسکتی ہے کہ اس کا رخ جہاں ممکن ہو "خود روزگاری" کی جانب موڑ دیا جائے۔ اس محاذ پر یہ مسئلہ پہلے ہی سے قابل غور ہے۔ ملک میں مجموعی طور پر برسر روزگار افراد میں ۶۰ فی صد کے قریب کا امکان اسی شعبے میں ہے۔ لیکن یہ بات بہرحال مشکوک ہے کہ آیا یہ شعبہ اعلا تعلیم یافتہ افرادی قوت کی ایسی گنجائش پیدا کرسکے گا جس کے تحت اعلا تعلیم کے اداروں میں طلبا کو اس نہج پر تعلیم دی جاسکے؟

ہم اس صورت حال کو نظر انداز کرکے کہ اعلا تعلیم کا شعبہ بہت چھوٹے سے حلقے کا احاطہ کرتا ہے اور سیاسی طور پر اہم نہیں ہے، کوئی اچھا مقصد پورا نہیں کرسکتے۔ بالآخر یہی وہ شعبہ ہوگا جو قطعی طور پر سائنسی اور تکنالوجیکل تبدیلیوں کو بڑھاوا دے گا اور اپنے اندر جذب کرے گا جس کی تیز رفتار معاشی ترقی کے لیے ہمیں اشد ضرورت ہے۔ ہم غیر ممالک سے کوئی بھی تکنالوجی کسی بھی وقت حاصل کرسکتے ہیں لیکن اگر ہم اپنے آپ کو اس لائق نہ بنا سکے کہ اسے ٹھیک سے بروئے کار لاسکیں اور مناسب دیکھ بھال اور جدید کاری کے تحت خود اپنے اعلا تعلیم کے بنیادی ڈھانچے کو مضبوط نہ بنا سکیں تو ہمارے ترقیاتی ڈھانچے میں پائداری نہ آسکے گی اور ہم اسی طرح ہاتھ ملتے رہیں گے جس طرح ماضی میں ہاتھ ملتے رہے۔ عالمی معیشت سے اپنے آپ کو جوڑنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم یہ توقع کریں کہ دوسرے ملکوں کا بنیادی تعلیمی ڈھانچہ ہمارے اپنے ڈھانچے کا بدل ثابت ہوسکے گا۔

(مصنف الٰہ آباد اور ساگر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ہیں) ●

بقیہ: اقلیتوں کی فلاح

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جامع اور معتبر قسم کا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس کی تکمیل موثر طریقۂ کار اور ضروری مالیہ کی فراہمی کے ذریعہ کی جائے۔

اس سمت پیش رفت کی ایک مثبت علامت یہ ہے کہ حال ہی میں ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو وزیر اعظم کی سطح پر ۱۵ نکاتی پروگرام اور اقلیتوں کی بہبود سے متعلق دیگر اسکیموں پر نظر ثانی کی گئی، جس میں متعدد اقدامات کی نشاندہی کی گئی۔ ایک کام تو یہ ہوا کہ متعلقہ وزرا سے کہا گیا کہ وہ ۱۵ نکاتی پروگرام کے نفاذ کا جائزہ لینے کے کام میں تیزی لائیں اور اس سلسلے میں ریاستوں کے ساتھ تال میل قائم کرنے کے کام کو یقینی بنائیں۔ دوسرا کام یہ ہوا کہ متعلقہ وزارتوں سے کہا گیا کہ وہ کثیر منصوبہ جاتی پروگرام ترتیب دیں تاکہ اقلیتوں کی سماجی و معاشی حالت کو بہتر بنایا جائے اور اس کے لیے ابتدائی مرحلے میں ان ۴۱ اضلاع میں کام شروع کیا جائے جہاں اقلیتوں کی آبادی قابل ذکر ہے۔ اس بات سے بھی اتفاق کیا گیا کہ جہاں کہیں بھی ضروری ہوگا ان پروگراموں میں تیزی لانے کے لیے مرکز سرمایہ فراہم کرے گا۔ ان اقدامات سمیت قومی اقلیتی کمیشن کی حالیہ سفارش کے مطابق، جس میں کہا گیا ہے کہ قبائلی ذیلی منصوبے کے خطوط پر مرکزی اور ریاستی حکومتیں پنج سالہ/سالانہ پلان میں اقلیتوں کی ترقیاتی اسکیموں کے لیے فنڈ کی گنجائش پیدا کریں، اگر کام کو آگے بڑھایا جائے تو اقلیتوں کی تعلیمی اور معاشی حالت کو بہتر بنانے میں بڑی مدد ملے گی۔

(مصنف جواہر لال یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور فی الوقت نیشنل کمیشن فار مائناریٹیز کے ممبر ہیں) ●

ایم۔ ایس۔ اگوانی

اقلیتوں کی فلاح

مصنف کا تاثر ہے کہ بلاشبہ اقلیتوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی کے لیے کافی کچھ کیا گیا ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسا جامع اور معتبر لائحہ عمل ترتیب دیا جائے جسے ایک مؤثر طریقہ کار کے ذریعہ نافذالعمل بنایا جا سکے اس کے لیے مطلوبہ بجٹ کا سہارا بھی مہیا کرنا ضروری ہے۔ حال ہی میں وزارتِ فلاح کی سطح پر، اقلیتوں کے لیے ۱۵ نکاتی پروگرام اور دیگر فلاحی اسکیموں پر جو نظرثانی کی گئی ہے وہ اقلیتوں کی ترقی کے لیے ایک مثبت علامت ہے۔

اقلیتوں کی فلاح سے متعلق مسئلہ پر غور کرتے وقت شاید یہ بات ضروری ہے کہ مذہبی اقلیتوں کی سماجی حیثیت کا تعین کر کے گفتگو کا آغاز کیا جائے۔ اس مسئلہ پر دو غلط تصورات واضح طور پر راہ پا گئے ہیں جنھیں شروع ہی میں دور کر دینا ضروری ہے۔ پہلی غلط فہمی اس صورت میں پیدا ہوتی ہے جب اقلیتوں کی فلاح کے پروگرام کو پوری قوم کی مجموعی فلاح کے مسئلے سے مختلف تصور کیا جاتا ہے۔ قوم کا اٹوٹ حصہ ہونے کی وجہ سے اقلیتیں اپنے لیے الگ سے نجات یا فلاح کا کوئی راستہ نہیں تلاش کر سکتیں۔ اس کا مطلب بہرحال یہ نہیں ہوا کہ ملک کی اقلیتوں کو ایسے مسائل درپیش نہیں ہوتے جن کی جانب قومی پیمانے پر توجہ دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک سیدھی سی حقیقت یہ ہے کہ تعلیم اور ترقی سمیت اقلیتیں متعدد مشکلات سے دوچار ہوتی رہی ہیں۔ مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں، بدھسٹوں، پارسیوں اور دوسری اقلیتوں کے کچھ اپنے مسائل ہیں جو ان کے مخصوص حالات کی دین ہیں۔ ان میں سے کچھ مسائل معمولی نوعیت کے ہو سکتے ہیں، جنھیں ہر وقت انتظامی اقدام کے تحت حل کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا غلط تصور یہ ہے کہ کسی قوم میں اکثریت اور اقلیت کی تفریق کیوں کی جائے! یہ بات تو بہرحال درست ہے کہ سیاسی شعبے میں، مذہب، زبان اور دوسرے تہذیبی عوامل کی بنیاد پر اکثریت اور اقلیت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر پارلیمنٹ یا ریاستی اسمبلیوں میں جو اکثریت ہوتی ہے وہ متعدد اور متنوع مفادات کے اشتراک کی حامل ہوتی ہے، جس میں مذہب، زبان یا علاقے کی حد بندی نہیں ہوتی۔ یہی بات ان اداروں میں اپوزیشن پر بھی صادق آتی ہے۔ لیکن یہ تمام عوامل اس حقیقت کی نفی نہیں کرتے کہ ہندوستانی سماج، مذاہب اور لسانی نیز تہذیبی تنوع کا ایک خوبصورت گہوارہ ہے اور اس کی اندرونی یکجہتی اور یگانگت کو بہتر طور پر برقرار رکھنے کے لیے ایک ایسے رویّہ کی ضرورت ہے جس میں نہ صرف ہر ایک کے لیے گنجائش ہو بلکہ ایک دوسرے کے لیے احترام کا جذبہ بھی ہو۔

ہندوستانی سماج مذاہب اور لسانی نیز تہذیبی تنوع کا ایک خوبصورت گہوارہ ہے اور اس کی اندرونی یکجہتی اور یگانگت کو بہتر طور پر برقرار رکھنے کے لیے ایک ایسے رویّہ کی ضرورت ہے جس میں نہ صرف ہر ایک کے لیے گنجائش ہو بلکہ ایک دوسرے کے احترام کا جذبہ بھی ہو۔

دستوری مداوا

اس بنیادی خیال کو جمہوریہ ہند کے دستور میں بڑی پاکیزگی سے سمویا گیا ہے۔ دستور کے باب سوئم میں جہاں بنیادی حقوق سے بحث کی گئی ہے وہاں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ مذہب، نسل، ذات، جنس، جائے پیدائش یا ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر امتیاز برتنا ممنوع ہے۔ اسی باب میں تمام شہریوں کے لیے روزگار میں یکساں مواقع دینے کی ضمانت بھی موجود ہے (دفعہ ۱۵ اور ۱۶)۔ اس کے علاوہ دفعہ ۲۹ اور ۳۰ میں اس بات پر خاص زور دیا گیا ہے کہ جہاں تک

زبان، رسم الخط، تہذیب اور تعلیمی اداروں کے قیام اور انتظامی امور کا تعلق ہے، اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی یعنی مختصراً دستور نے نہ صرف مذہبی اور دیگر اقلیتوں کے وجود کو تسلیم کیا ہے بلکہ ان کے حقوق کے تحفظ کی یقین دہانی بھی کرائی ہے۔

۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق مذہبی اقلیتیں ملک کی مجموعی ۸۱ کروڑ ساٹھ لاکھ آبادی کے ۱۷٫۶۵ فی صد حصے کا احاطہ کرتی ہیں (اس میں جموں وکشمیر شامل نہیں ہے کیوں کہ ۱۹۹۱ء میں وہاں مردم شماری نہیں ہوسکی تھی) ان میں مسلمانوں کا تناسب

جہاں تک روزگار کا مسئلہ ہے، گوپال سنگھ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں، پبلک سیکٹر کے اداروں، کوآپریٹو کے شعبے اور مقامی اداروں میں مسلمان ملازمین کی تعداد سماج کے انتہائی پسماندہ اور محروم طبقوں سے کہیں زیادہ کم ہے۔ یعنی درج فہرست ذاتوں سے بھی کم!

۱۲٫۱۲ فی صد، عیسائیوں کا ۲٫۳۴ فی صد، سکھوں کا ۱٫۹۴ فی صد، بدھسٹ کا ۰٫۷۶ فی صد، پارسیوں کا ۰٫۰۹ اور جینیوں کا ۰٫۴۰ فی صد ہے۔ چوں کہ تمام اقلیتوں کے مخصوص مسائل پر یہاں تفصیل سے بحث کرنا ممکن نہیں اس لیے زیرِ نظر مضمون میں صرف مسلمانوں کے مسائل پر اظہار خیال کیا جائے گا جن کی آبادی دس کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔

اقلیتوں سے متعلق رپورٹ

جب سے محکمۂ مردم شماری نے مختلف فرقوں کی تعلیمی اور سماجی و معاشی حیثیت سے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے کا سلسلہ بند کر دیا ہے تب سے اس موضوع پر جامع نوعیت کی معلومات حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اقلیتوں، درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے تعلیمی اور معاشی حالات کا جائزہ لینے کے لیے ڈاکٹر گوپال سنگھ کی قیادت میں ایک اعلا اختیاراتی کمیٹی قائم کی تھی۔ اس کمیٹی نے ملک کے مختلف علاقوں میں صورتِ حال کا جائزہ لینے اور اعداد و شمار حاصل کرنے کے لیے ۲۰ محققوں کو بھیجا۔ جون ۱۹۸۳ء میں اس نے اقلیتوں کے بارے میں دو جلدوں میں اپنی رپورٹ پیش کی جس میں ملک کی اقلیتوں کے سماجی مرتبے سے متعلق متعدد پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اسی کی بنیاد پر ہم یہاں مسلمانوں کی تعلیم اور روزگار کے تعلق سے مختصراً کچھ باتیں کریں گے۔

تعلیم کے محاذ پر ۱۲ ریاستوں کے ۴۵ اضلاع سے جو اعداد و شمار اکٹھا کیے گئے ان کے مطابق صرف کرناٹک، تامل ناڈو، مدھیہ پردیش اور مغربی بنگال کے ضلع مالدہ اور مرشدآباد میں ابتدائی اسکولوں کی سطح پر مسلمان بچوں کا اندراج، ان کی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے قدرے بہتر ہے۔ لیکن دوسری تمام ریاستوں کے اسکولوں میں یہ تناسب ان کی آبادی کے لحاظ سے کم ہے۔ بہار، ہریانہ اور اتر پردیش جیسی ریاستوں میں تو یہ خلا کافی وسیع ہے۔

بی۔ اے کی سطح پر عام نصاب کا جہاں تک تعلق ہے، گیارہ سے زائد ریاستوں کی ۱۲ یونیورسٹیوں کے نتائج سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹٫۲ لاکھ کامیاب طلبا میں مسلمان طلبا کی

مدھیہ پردیش [illegible] جہاں اقلیتوں کے [illegible] تعداد اور ان کو [illegible] ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے [illegible] ہے۔ لیکن دوسری تمام ریاستوں میں یہ تناسب بہت کم ہے۔

تعداد صرف ۱۷۵۳۱ تھی، جو مجموعی طور پر کامیاب ہونے والے طلبا کے صرف ۱٫۲۶ فی صد کے برابر ہے جب کہ سروے کے مطابق ان کی آبادی کا تناسب ۱۰٫۷۳ فی صد ہے۔ انجینئرنگ اور میڈیکل کورس کے شعبے میں ان کی شرکت بہت ہی کم ہے۔ چھ ریاستوں کی ۹ یونیورسٹیوں سے جو اعداد و شمار جمع کیے گئے ان کے مطابق بیچلر آف انجینئرنگ یا اس کے مساوی امتحان میں جو ۲۶۹۸ طلبا شریک ہوئے، ان میں مسلمان لڑکوں کی تعداد صرف ۹۲ تھی یعنی ۳٫۴۲ فی صد جب کہ ان ریاستوں میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۲٫۴۴ فی صد ہے۔ میڈیکل تعلیم کے شعبے میں بھی صورت حال کچھ بہتر نہیں ہے جیسا کہ آٹھ ریاستوں کی ۱۲ یونیورسٹیوں کے اعداد و شمار سے پتا چلا۔

لائحہ عمل

۱۹۸۶ء کی قومی تعلیمی پالیسی میں اس نکتے کو بطور خاص اجاگر کیا گیا جسے فروغ انسانی وسائل کی وزارت نے قومی پیمانے کے وسیع تر مباحثے کے بعد وضع کیا تھا۔ اس میں اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی تھی کہ بعض اقلیتی فرقے تعلیمی اعتبار سے محروم یا پسماندہ ہیں لہٰذا "مساوات اور سماجی انصاف کے تقاضوں کے مدنظر ان فرقوں پر خصوصی توجہ دی جائے گی"۔ تقریباً اسی زمانے میں وزارت داخلہ نے مسلمانوں اور نئے بدھسٹوں کو "قومی پیمانے پر، تعلیمی طور پر پسماندہ" قرار دیا تھا۔ اس کے بعد محکمہ تعلیم نے اس سلسلے میں جو لائحہ عمل ترتیب دیا، اس میں یہ وضاحت کی گئی کہ تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں کو سماج کے باقی حصے کی سطح پر لانے کے لیے خصوصی کوشش کی جائے گی تاکہ وہ قومی ترقیات کے کاموں میں پوری طرح شریک ہوسکیں۔

روزگار کے مواقع کا فقدان

جہاں تک روزگار کا مسئلہ ہے، گوپال سنگھ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں، پبلک سیکٹر کے اداروں، کوآپریٹو کے شعبے اور مقامی اداروں میں مسلمان ملازمین کی تعداد، سماج کے انتہائی پسماندہ اور محروم طبقوں سے بھی کہیں زیادہ کم ہے۔ یعنی درج فہرست ذاتوں سے بھی کم!

تفصیل

ملازمین کی مجموعی تعداد کے اعتبار سے تناسب

	مسلمان	شیڈول کاسٹ
ہندوستانی انتظامی سروس (آئی اے ایس)	۳٫۷	۹٫۹
ہندوستانی پولیس سروس (آئی پی ایس)	۲٫۷	۹٫۸
خارجہ سروس (آئی ایف ایس)	۳٫۳۷	۱۶٫۴۸
مرکزی سبارڈینیٹ سروس	۱٫۵	۱۳٫۱

مزید تفصیل یہ ہے کہ ۱۴ ریاستوں میں واقع مرکزی حکومت کے دفاتر میں ۵۹۵۳۰ کی مجموعی تعداد میں مسلمان ملازمین کی تعداد محض ۴ فی صد ہے۔ البتہ ریاستی حکومت کے ملازمین کی تعداد نسبتاً بہتر ہے

[illegible]

یعنی ۱۰٫۶ فی صد۔ پھر بھی یہ ان کی آبادی کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے جب کہ شیڈول کاسٹ کا تناسب ۱۳ فی صد سے زائد ہے۔ روزگار مہیا کرنے والے دفاتر (ایمپلائمنٹ ایکسچینج) میں مختلف زمروں کے کاموں کے لیے مسلمانوں کا اندراج ۶٫۵ فی صد تھا اور جن مسلمانوں کو ان دفاتر کے توسط سے ملازمت ملی، ان کا تناسب صرف دو فی صد تھا جب کہ شیڈول کاسٹ کے امیدواروں کا تناسب ۱۳٫۲۵ فی صد تھا۔

گوپال سنگھ رپورٹ پیش کیے جانے کے کوئی ایک دہائی بعد گجرات انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ ریسرچ کے ڈاکٹر ابو صالح شریف نے مردم شماری اور مختلف سروے پر مبنی رپورٹوں کی بنیاد پر ایک تفصیلی نوعیت کی رپورٹ مرتب کی جو اس موضوع پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ اس رپورٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیہی علاقوں میں بے زمین مسلمانوں کا تناسب ۳۵ فی صد ہے جبکہ ہندوؤں کا ۲۸ فی صد ہے۔ مزید یہ کہ ہندو آبادی کا پانچواں حصہ ایسا ہے جن کے پاس ۵ ایکڑ یا اس سے زیادہ زمین ہے لیکن مسلمانوں کا دسواں حصہ اس زمرے میں آتا ہے۔

ترجیحی شعبے میں پیشگی رقم

سماج کے کمزور طبقوں کے لیے پیشگی رقم فراہم کرنے والے شعبے کے بارے میں ریزرو بینک آف انڈیا جو سہ ماہی رپورٹ مرتب کرتی ہے۔ ان سے اقلیتوں کی حصہ داری کے بارے میں بھی کافی قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ پیشگی رقم فراہم کرنے والے قومی بینکوں کی تعداد ۲۷ ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱ میں ۳۰ جون ۱۹۹۴ء کو ختم ہونے والی سہ ماہی مدت کی رپورٹ کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے جس میں ۵ اقلیتی فرقوں کو ملنے والی پیشگی رقم کی تفصیل درج ہے۔ اس کے تحت ایسے ۱۴۱ اضلاع ہیں جہاں اقلیتوں کی تعداد قابلِ ذکر ہے، مذکورہ تمام اقلیتوں نیز مجموعی آبادی کے تناظر میں سب کا تناسب واضح کیا گیا ہے۔

ان تمام باتوں سے [illegible] کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقلیتوں کے [illegible] مالی [illegible] تعلیمی پسماندگی [illegible] نوعیت [illegible] دور کرنے [illegible] کوششیں [illegible] کوششوں کے باوجود [illegible] حقیقتاً کوئی تبدیلی آئی ہے؟

گوشوارہ نمبر ۱

ترجیحی شعبے میں اقلیتوں کو ملنے والی پیشگی رقم

	کھاتوں کی تعداد (۰۰۰)	رقم (کروڑ میں)
مسلمان	۱۰۶۵٫۹	۷۹۰٫۷
عیسائی	۱۲۸٫۱	۱۲۸٫۶
بدھسٹ	۱۳٫۲	۹٫۲
سکھ	۴۸٫۲	۱۱۳٫۶
پارسی	۰٫۶	۱۹٫۰
اقلیتوں سے متعلق کل میزان	۱۲۵۶٫۰	۱۰۶۱٫۱
مجموعی میزان	۴۲۸۹٫۰	۷۳۰۹٫۸
سب میں اقلیتوں کا تناسب	۲۹٫۳	۱۴٫۵

اس سے اندازہ ہوا کہ اقلیتوں کے کھاتوں کی تعداد ان کی مجموعی آبادی کے تناسب سے اگرچہ زیادہ ہے (۱۷٫۶۵ فی صد) لیکن انھیں جو مجموعی رقم دی گئی وہ واضح طور پر کم ہے۔ گوشوارہ نمبر ۲ سے گیارہ بڑی ریاستوں میں رقم کی غیر منصفانہ تقسیم کا اندازہ ہوگا۔ مدھیہ پردیش اور ہریانہ ہی دو ایسی ریاستیں ہیں جہاں اقلیتوں کے کھاتوں کی تعداد اور ان کو ملنے والی رقم، ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ لیکن دوسری تمام ریاستوں میں یہ تناسب بہت کم ہے۔

(گوشوارہ نمبر ۲ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

گوشوارہ نمبر ۲

۳۰ جون ۱۹۹۴ء کو ختم ہونے والی سہ ماہی مدت میں ترجیحی شعبے سے اقلیتوں کو ملنے والی رقم سے متعلق ریزرو بینک آف انڈیا کی رپورٹ

ریاست	اقلیتی آبادی کا تناسب (فی صد)	اقلیتوں کو ملنے والے قرضے کھاتوں کی تعداد ـــ رقم (لاکھ) ـــ (کروڑ)	دوسروں کو ملنے والے قرضے کھاتوں کی تعداد ـــ رقم (لاکھ) ـــ (کروڑ)	سب کو ملنے والے قرضے کھاتوں کی تعداد ـــ رقم (لاکھ) ـــ (کروڑ)	ان سب میں اقلیتوں کا تناسب کھاتوں کی تعداد ـــ رقم (لاکھ) ـــ کروڑ
آندھرا پردیش	۱۰٫۸	۱۱٫۵ ـــ ۲۶۰٫۴	۳۰٫۵۹ ـــ ۳۵۸۴٫۱۹	۳۵٫۷ ـــ ۳۸۴۴٫۵۹	۱۴٫۳ ـــ ۶٫۷
مہاراشٹر	۱۷٫۴۵	۳٫۱۶ ـــ ۴۶۹٫۳۴	۲۲٫۸۵ ـــ ۶۰۱۱٫۱	۲۶٫۰۱ ـــ ۶۴۸۰٫۴۴	۱۲٫۱ ـــ ۷٫۲
راجستھان	۹٫۶۱	۱٫۱۱ ـــ ۱۵۷٫۸۵	۱۰٫۵۷ ـــ ۱۶۹۷٫۷۹	۱۱٫۶۸ ـــ ۱۹۵۵٫۴۴	۹٫۵ ـــ ۸٫۱
اتر پردیش	۱۸٫۱۲	۶٫۱۲ ـــ ۶۸۶٫۵۳	۳۲٫۶۶ ـــ ۴۸۱۲٫۳۷	۳۸٫۷۸ ـــ ۵۴۹۸٫۹	۱۵٫۸ ـــ ۱۲٫۵
مدھیہ پردیش	۶٫۱۸	۲٫۵۹ ـــ ۱۸۹٫۸۵	۱۸٫۳۹ ـــ ۲۴۷۱٫۶۷	۲۰٫۹۸ ـــ ۲۶۶۱٫۵۲	۱۲٫۳ ـــ ۷٫۱
دھلی	۱۵٫۳۱	۰٫۳۴ ـــ ۱۴۳٫۵۸	۱٫۴۳ ـــ ۱۹۰۸٫۰	۲٫۲۷ ـــ ۲۰۷۱٫۵۸	۱۵٫۰ ـــ ۷٫۱
آسام	۳۲٫۱۱	۱٫۳۳ ـــ ۷۵٫۲۶	۴٫۳۴ ـــ ۵۶۶٫۶	۵٫۶۷ ـــ ۶۴۱٫۸۶	۲۳٫۵ ـــ ۱۵٫۷
کیرالا	۴۲٫۶۶	۸٫۱۸ ـــ ۶۴۰٫۵۳	۱۱٫۲۹ ـــ ۱۱۷۶٫۴	۱۹٫۴۷ ـــ ۱۸۱۶٫۹۷	۴۲٫۰ ـــ ۳۵٫۳
بہار	۱۵٫۸۸	۳٫۷۹ ـــ ۲۲۹٫۲۹	۲۵٫۸ ـــ ۲۴۹۲٫۷۶	۲۹٫۵۹ ـــ ۲۷۲۲٫۰۷	۱۲٫۸ ـــ ۸٫۴
ہریانہ	۱۰٫۵۶	۱٫۰۲ ـــ ۱۷۷٫۴۱	۵٫۷۲ ـــ ۱۴۹۵٫۶	۶٫۷۴ ـــ ۱۶۷۳٫۰۱	۱۵٫۱ ـــ ۱۰٫۶
گجرات	۹٫۳۱	۱٫۰۰ ـــ ۱۳۰٫۸۷	۱۳٫۱۵ ـــ ۲۵۵۸٫۴۲	۱۴٫۱۵ ـــ ۲۶۸۹٫۴۹	۷٫۶ ـــ ۴٫۹

ٹھوس نتائج اور تجاویز

ان اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی تک اقلیتوں کی تعلیم اور ترقی سے متعلق زبوں حالی کی جانب سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔ گوپال سنگھ رپورٹ شاید وہ پہلی رپورٹ تھی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ "اقلیتوں میں اب احساس محرومی پیدا ہوا ہے۔ رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ "اگر ہم اقلیتوں کو عام دھارے کا ایک موثر حصہ بنانا چاہتے ہیں" تو صورتحال میں بہتری لانا ہوگی۔ سرکاری ملازمتوں میں اقلیتوں کے انتہائی کم تناسب کے پیش نظر دو ٹھوس تجاویز اس رپورٹ میں پیش کی گئی تھیں۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ جہاں کہیں بھی حکومت نامزدگی کے ذریعہ بحالی کرتی ہے، (مثلاً بینک اور سرکاری اداروں کی انتظامی کمیٹیوں میں) وہاں اس بات کا بھرپور خیال رکھنا ہوگا کہ اقلیتی فرقے کے ممبران کی تعداد منصفانہ ہو، خاص طور سے فیصلہ سازی کی سطح پر۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ پبلک سروس کمیشن سمیت تقرری سے متعلق تمام اداروں میں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ سلیکشن بورڈ میں اقلیتوں کی معقول نمائندگی ہو" تاکہ اس وقت محرومی یا بے انصافی کا جو احساس موجود ہے، اس کا خاتمہ ہوسکے۔"

۱۵ نکاتی پروگرام
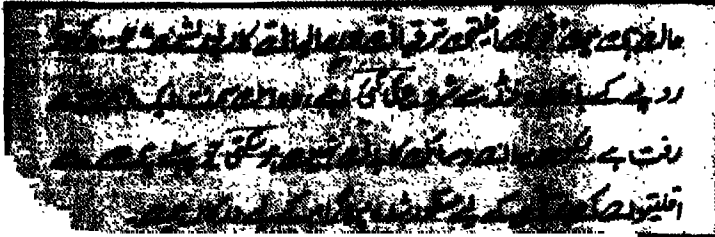
ممبران پارلیمنٹ کے وفود اور اقلیتی فرقوں کے نمائندوں سے صلاح و مشورہ کے بعد ۱۹۸۳ء میں اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے جس ۱۵ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا تھا اس میں اقلیتوں کے لیے روزگار اور ترقی کے مواقع فراہم کرنے کے مسئلہ پر خاص زور دیا گیا تھا۔ اس کے تحت مرکزی اور ریاستی حکومتوں، ریلوے، قومیائے جانے والے بینکوں اور پبلک سیکٹر کے اداروں کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ وہ اپنے یہاں ہونے والی

تقرریوں میں اقلیتوں کا خیال رکھیں نیز اپنے سلیکشن بورڈ کو نمائندہ ادارے کی شکل دیں۔ اس پروگرام کے تحت اس بات کی بھی وضاحت کی گئی تھی کہ ان علاقوں میں جہاں اقلیتوں کی آبادی قابلِ ذکر ہے وہاں آئی۔ آئی۔ ٹی اور پالی ٹکنک کے جو ادارے حکومت اور پرائیویٹ ایجنسیوں کے ذریعہ قائم کیے جائیں۔ ان میں اقلیتی فرقوں کے طلبار کی حوصلہ افزائی کی جائے اور داخلے میں ان کو

مناسب نمائندگی دی جائے۔ اس کے علاوہ مقابلے کے امتحانوں کی تیاری کرنے والے اقلیتی فرقے کے لوگوں کو ٹریننگ دینے کے لیے کوچنگ کلاسز کا اہتمام کیا جائے۔ ساتھ ہی ۲۰ نکاتی پروگرام سمیت متعدد ترقیاتی پروگراموں کی نگرانی کے لیے جو کمیٹیاں تشکیل دی جائیں ان میں اقلیتی فرقے کے نمائندوں کو بھی شامل کیا جائے۔

اقلیتوں کی تعلیم

اس کے تین سال بعد تعلیم کے محاذ پر محکمۂ تعلیم نے جو ایکشن پلان شروع کیا، اس میں اقلیتوں کی تعلیم کو خصوصی اہمیت دی گئی اور ان کے تعلیمی مسائل پر پورا ایک باب شامل کیا گیا اس کے تحت اقلیتوں کے تعلیمی مسائل کے حل کے لیے فوری اور طویل مدتی نوعیت کے اقدامات کی نشاندہی کی گئی۔ فوری نوعیت کے اقدامات میں اقلیتی آبادی والے علاقوں میں دس پالی ٹکنک کے ادارے قائم کرنے، قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے نصابی کتابیں تیار کرانے، اقلیتی تعلیمی اداروں کے اساتذہ اور پرنسپل صاحبان کے لیے ٹریننگ پروگرام شروع کرنے اور مقابلے کے امتحانوں کے لیے کوچنگ کلاسوں کا انتظام کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی جب کہ طویل مدتی پروگرام کے تحت مدرسوں یا رضاکارانہ بنیادوں پر قائم ہونے والے دوسرے روایتی اسکولوں میں سائنس، ریاضی اور انگریزی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے مالی معاونت، لسانی اقلیت کے ٹیچروں کی بحالی میں تاخیر نہ کرنے، منتخب علاقوں میں دست کاری کی ٹریننگ کے لیے ادارے قائم کرنے، اقلیتی فرقے کی لڑکیوں کی تعلیم اور دست کاری کی ٹریننگ پر توجہ دینے، اقلیتی تعلیمی اداروں کے قیام کے سلسلے میں منظوری کے لیے واضح ہدایات اور اس سلسلے میں دی گئی درخواستوں پر بروقت عمل کرنے نیز اقلیتی فرقوں کے کمزور طبقوں کے لیے وظیفہ کی اسکیم شروع کرنے کی تجاویز شامل تھیں۔

اصل حقیقت

ان تمام باتوں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اقلیتوں کی مالی مشکلات کتنی شدید اور ان کی تعلیمی پسماندگی کتنی سنگین نوعیت کی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی زبوں حالی کو دور کرنے کے لیے کوششیں کی گئی ہیں لیکن کیا ان کوششوں کے باوجود صورت حال میں حقیقتاً کوئی تبدیلی آئی ہے؟ یقیناً بہتری کی جانب کچھ پیش رفت ہوئی ہے، لیکن ابھی کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ ۱۵ نکاتی پروگرام کے تحت فروغ انسانی وسائل کی مرکزی وزارت نے متعدد تعلیمی اداروں میں مقابلے کے امتحان میں شریک ہونے کے متمنی امیدواروں کے لیے کوچنگ کلاسز کا بندوبست کیا۔ ریاستی حکومتوں سے کہا گیا کہ انتظامیہ اور پبلک سیکٹر کے اداروں میں بحالی کے وقت اقلیتی امیدواروں کا "خاص خیال" رکھا جائے نیز سلیکشن بورڈوں میں اقلیتی امیدواروں کو بھی نامزد کیا جائے۔ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں سے یہ بھی کہا گیا کہ جن علاقوں میں اقلیتوں کی آبادی زیادہ ہے وہاں آئی ٹی آئی کے ادارے قائم کیے جائیں لیکن ۱۵ نکاتی پروگرام کا مجموعی اثر برائے نام ہی رہا اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس کے نفاذ کے سلسلے میں کوئی طریقۂ کار وضع نہیں کیا گیا۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ تقرری میں اقلیتوں کا "خاص خیال" رکھنے سے متعلق کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی لہٰذا اس پر سرے سے کوئی عمل ہی نہ ہو سکا اور تیسری اور آخری اہم وجہ یہ ہے کہ اس پروگرام کے تحت جن اقدامات کا احاطہ کیا گیا، ان کے لیے بجٹ فراہم کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں نکالی گئی۔ البتہ حال ہی میں "قومی اقلیتی ترقیاتی اور مالیاتی کارپوریشن" جو ۵ سو کروڑ روپے کے باقاعدہ فنڈ سے شروع کیا گیا ہے وہ اس سمت ایک اہم پیش رفت ہے۔ لیکن یہ ان وسائل کا بدل نہیں ہو سکتا جو پہلے ہی سے اقلیتوں کی ترقی کے لیے منظور شدہ پروگرام کے لیے درکار ہیں۔

تعلیم کے شعبے میں بھی کچھ یہی صورت حال ہے کیوں کہ نئی تعلیمی پالیسی کے ایکشن پلان کے تحت توقعات تو پیدا کی گئی تھیں لیکن عمل نہ ہو سکا۔ جنوری ۱۹۹۱ میں فروغ انسانی وسائل کی وزارت کو اقلیتوں سے متعلق ایک اسٹڈی گروپ کی جو رپورٹ پیش کی گئی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ "نہ تو ۱۵ نکاتی پروگرام کا اور نہ ہی "پروگرام آف ایکشن" کا اقلیتی فرقوں کی تعلیمی صورت حال پر کوئی خاص اثر پڑا۔ اس اسٹڈی گروپ نے جن دو ریاستوں یعنی اتر پردیش اور بہار کا دورہ کیا تھا۔ ان میں "پروگرام آف ایکشن" پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ نہ تو ریاستی حکام نے کوئی دلچسپی لی اور نہ ہی متعلقہ اداروں نے اسے عملی جامہ پہنایا۔ حد تو یہ ہے کہ ابتدائی نوعیت کا کام بھی نہیں ہو سکا۔ یعنی ان علاقوں کی نشاندہی کرنے کا کام بھی نہ ہو سکا جہاں اقلیتوں کی قابل ذکر آبادی ہے اور جہاں اسکول اور پالی ٹکنک کے ادارے کھولنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ اسٹڈی گروپ کے مطابق اس صورت حال کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ مرکز نے کسی بھی مرحلے میں متعدد پروجیکٹوں کے لیے سرمائے کی فراہمی کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کہی ہے۔ نہ تو اس نے ریاستی حکومت سے کوئی صلاح و مشورہ کیا اور نہ ہی پلاننگ کمیشن نے۔ ان تمام باتوں کے نتیجہ میں اب صورت حال یہ ہے کہ ریاستوں اور مرکز کی جانب سے ۱۵ نکاتی پروگرام اور پروگرام آف ایکشن کے بارے میں معمول کی جو رپورٹیں پیش کی جاتی ہیں، ان کی حیثیت رسمی کارروائی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔

مجموعی طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ ۱۵ برسوں کے دوران مختلف سطحوں پر جو جائزے لیے گئے ان سے نہ صرف اقلیتوں کی تعلیمی اور معاشی زبوں حالی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بات بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ان کی ترقی کے لیے کیا کیا اقدام ضروری ہیں۔ یہ بھی کچھ کم کامیابی نہیں ہے۔

باقی صفحہ ۳۵ پر

مجموعی طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ ۱۵ برسوں کے دوران مختلف سطحوں پر جو جائزے لیے گئے۔ ان سے نہ صرف اقلیتوں کی تعلیمی اور معاشی زبوں حالی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بات بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ ان کی ترقی کے لیے کیا کیا اقدام ضروری ہیں۔ یہ بھی کچھ کم کامیابی نہیں ہے۔

پروفیسر کے. ڈی. گنگریڈ

عوام کی بہبود عوام کے ہاتھوں میں
پنچایتی راج کا کردار

پنچایتی راج اداروں کو ترقیاتی اور فلاح و بہبود کی سرگرمیوں کے لیے لوگوں کو حرکت میں لانے منظم اور باخبر کرنے اور ان میں بیداری پیدا کرنے میں ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔ مصنف نے زیر نظر مضمون میں اسی بات کو مدلل انداز میں واضح کیا ہے۔

۷۳ ویں آئینی ترمیم سے ملک میں پنچایتوں کا از سر نو ترویج و احیاء ہوا ہے اور دیہی عوام کی وسیع تر اکثریت کو جنہیں "بے زبان" کہا جاتا رہا ہے، آواز مل گئی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد سیاسی نظام میں لامرکزیت لانا اور اختیارات کو تقسیم کرنا ہے۔ ترمیم کا منشا تین سطحی پنچایتی راج اداروں کو ذمہ داریاں سونپنا اور مقامی معاملات میں فیصلے لینے کا مجاز بنانا ہے۔ سرکار جسے خدمات کی فراہمی اور عوام کی فلاح و بہبود کی دیکھ بھال کے لئے ذمہ دار سمجھا جاتا ہے اپنا یہ رول ان اداروں کو منتقل کرے گی تاکہ وہ مقامی دلچسپی اور فلاح و بہبود کے کام خود سر انجام دیں۔

وقار

یہ سماجی لائحہ عمل انسان کو اس کا وقار واپس دلاتا اور اس کے اندر اپنے کاموں کے لئے ذمہ داری کا قوی احساس پیدا کرتا ہے۔ دیہی عوام اب انحصار کے کلچر کو چھوڑ کر اپنے آپ پر انحصار کرنے لگیں گے۔ عالمی کرائسس اور معاشی بحران سے خصوصاً بھارت میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں جنہیں حل نہ کیا جاسکے۔ ہماری دشواریاں یقیناً بے شمار ہیں اور ہماری فوری ترجیحات بھی اس نوعیت کی ہیں کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلے کس ترجیح پر توجہ کی جائے اور کس پر بعد میں۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ نئے اقتصادی نظام کو، جسے ہمارے عوام دل سے چاہتے ہیں، برابر کی حیثیت سے گفت و شنید اور برادرانہ اتحاد پر مبنی ہونا ہوگا۔

نصب العین

سماجی بہبود کا میدان ایک وسیع میدان ہے جس میں سبھی قسم کی پہلیں کرنے کی گنجائش ہے۔ ہمارا آخری نصب العین اب بھی ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہے جو منصفانہ اور متوازن ہو اور جس میں قومی ترقی کا فائدہ ہر شخص کو پہنچے۔ عوام کو ایک مؤثر انداز میں ذمہ داری سونپنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ ذمہ داری ان امور کے لیے ہے جن کا خود عوام سے تعلق ہے۔ ہر انسان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، معذور ہو یا صحت مند یا کسی درج فہرست ذات یا درج فہرست قبیلے سے تعلق رکھتا ہو، ہر اس کام میں پوری طرح شریک ہونا ہوگا جو اس کے فائدے کے لئے ہے۔ ایسے ترقی یا بہبود کے ہر پروجیکٹ اور پروگرام میں پلاننگ، عمل درآمد اور تعین افادیت کے ہر مرحلے میں مکمل شرکت کرنی ہوگی۔ اسے محسوس کرنا ہوگا کہ تبدیلی لانے کے عمل میں وہ نہ صرف ایک کارندہ ہے بلکہ اس کا فائدہ بھی خود اسی کو اٹھانا ہے۔ جہاں تک سرکار کا تعلق ہے وہ یہ تسلیم کرتی ہے کہ عوام کے کسی گروپ کی بقا کا انحصار بہبود کی عالمی کوشش میں فرد کی مکمل شرکت و شمولیت پر ہے۔

نیٹ ورک

خوش قسمتی سے ہندوستانی معاشرہ میں انسانی

رشتوں کے جال کا ایک حصہ ہے۔ ایک شخص کی زندگی کا اثر دوسرے کی زندگی پر پڑتا ہے اور انسانوں کے کسی گروپ یا سماج کی بقا کے لئے فرد اور گروپ دونوں ہی کو کام کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ عمومی طور پر ہندوستانی کی جڑیں اس کے کنبے یا خاندان میں ہوتی ہیں اور افقی طور پر وہ گروپ یا سماج سے جڑا ہوتا ہے۔ عہد ماضی میں رشتے اختلاف یا تنازعہ نہیں پیدا کرتے تھے۔ نسلوں کے درمیان اختلاف ناپید تھا اختلاف کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی رکنوں کا مکالمہ سے دور کرنے کا ایک سنہری گُر تھا۔ بدقسمتی اور معذوری کی بنا پر

کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ یہ سماجی توازن ہر شخص کو رشتہ اتحاد کی بنا پر، جس میں خود اس کا بھی سرگرم حصّہ ہوتا تھا، پھولنے پھلنے کی اجازت دیتا تھا۔ اس سیاق وسباق میں عمل کی جو سرگرمی پیدا ہوئی وہ خاندان فرد اور سماجی گروپ کی زندگی میں بھی داخل ہوئی اور اس نے فرد پر خوش گوار اثرات مرتب کیے اور کمزور اور محروم لوگوں کے لیے، بوڑھے اور معذور لوگوں کے لیے تحفظی رشتے

قبائل کی بہبود۔

مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو ان چار شعبوں کی مکمل ذمہ داری پنچایتی راج اداروں کو سونپنی چاہئے۔ عورتوں، درج فہرست ذاتوں، درج فہرست قبیلوں اور دیگر پسماندہ طبقات کے لئے ریزرویشن کی پالیسی سے ان گروپوں کی خود اپنی ترقی و بہبود میں شرکت یقینی ہو جائے گی۔

انھوں نے سماجی خدمات اور سماجی بہبود میں فرق کیا۔ ان کے مطابق اوّل الذکر میں وہ خدمات شامل ہیں جو پورے سماج کے لیے ہے جب کہ سماجی سرگرمیوں کا مقصد ان خدمات کو بڑھانا ہے جو ایسے لوگوں اور گروپوں کی سماجی ضرورتوں کو پورا کرتی ہوں جو سماجی، معاشی، جسمانی اور دماغی معذوری کے سبب عام لوگوں کو فراہم کی گئی سہولیات کا استعمال نہیں کرسکتے۔ ان کے مطابق عورتوں بچوں اور معذور لوگوں کو ترجیحات کی ترتیب میں پہلی جگہ دی جانی چاہیے۔

> ہمارا آخری نصب العین اب بھی ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہے جو منصفانہ اور متوازن ہو اور جس میں قومی ترقی کا فائدہ ہر شخص کو پہنچے۔

قائم کیے۔

کنبہ

اگر کسی کنبہ کو مشکلات یا مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا تو اسے کافی امداد دی جاتی تھی۔ بڑے بوڑھوں کا احترام کیا جاتا تھا۔ ہر بچّے کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ بڑا ہو کر اپنے ضعیف والدین سے اظہار تشکر کے طور پر ان کی آخری سانس تک ان کی خدمت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں کنبہ یا خاندان کو سماجی تحفظ کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے۔

لیکن بدقسمتی سے اس کا مرثیہ مدتوں پہلے پڑھا جا چکا ہے۔ کنبے کے افراد کا باہمی رشتہ دیہی ہندوستان میں سب سے مضبوط تھا لیکن صنعت کاری، جدید کاری مغربیت اور مادیت نے اسے بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

پنچایتی راج اداروں کا رول

اس پس منظر میں پنچایتی راج اداروں کو ترقی اور بہبود کی سرگرمیوں کے لئے لوگوں کو منظم کرنے، انہیں باخبر رکھنے اور اطلاعات بہم پہنچانے اور حرکت میں لانے میں ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔ ایکٹ کے گیارہویں شیڈول میں پنچایتی راج اداروں پر خصوصاً چار شعبوں میں فلاح و بہبود کی سرگرمیوں کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے یہ چار شعبے ہیں ـــ (۱) خاندانی بہبود (۲) عورتوں اور بچوں کی ترقی (۳) سماجی بہبود (جس میں جسمانی طور پر معذور افراد اور دماغی طور پر پسماندہ لوگوں کی بہبود بھی شامل ہے) اور (۴) کمزور طبقات" بالخصوص درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست

بہبود

بھارت کے اوّلین وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا :-

" ہم ایک ویلفیئر اسٹیٹ کی بات کرتے ہیں اور اپنی قوت و توانائی اس کے حصول پر لگاتے ہیں بھارت میں ویلفیئر یا بہبود ہر ایک کی مشترک ملکیت ہونی چاہیئے کسی مخصوص گروپ کی اجارہ داری نہیں جیسی کہ یہ آج ہے۔ بہبود کے دائرے میں خاص کر ان لوگوں کو لایا جانا چاہیے جو کم سہولت یافتہ ہیں اور جنہیں ترقی کے مواقع حاصل نہیں ہیں"

انھوں نے یہ بھی کہا کہ :-

" سماجی بہبود کا مرکزی خیال انسان کی ہر معنی اور ہر لحاظ سے بہتری ہے۔ ویلفیئر اسٹیٹ کو تمام شہریوں کی جسمانی اور سماجی بہتری کو یقینی بنانا چاہیے اس سے استحصال اور نابرابریاں ختم ہو جائیں گی اور فرد کو اپنی ترقی کے مواقع حاصل ہوں گے"

مقصد

سماجی بہبود کے نظریئے کی دو خصوصیات ہیں (۱) بہبود کے اقدامات کا کنبے یا خاندان کو ضرورتیں پوری کرنے والی ایک بنیادی سماجی اکائی کی حیثیت سے مضبوط بنانے کے لئے استعمال اور (۲) فرد کی زندگی کی حقیقتوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کو بہتر بنانا، سماجی بہبود کے نظام کا خاص مقصد بنیادی حالات کو بہتر بنانا ہے جس سے کہ سماج کے تمام لوگ ترقی اور تکمیلِ نفس کے لیے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کرسکیں۔ یہ سب سے اہم رول ہے جو سب سے نیچے کی سطح پر پنچایتی راج اداروں کو گرام پنچایتوں اور گرام سبھا کی مدد سے ادا کرنا ہے بہبود کے چار ماڈل ہیں۔ گرام پنچایت مقامی حالات کے مطابق ان میں سے ایک رول چن سکتی ہے۔

چار ماڈل

مختلف ملکوں میں سماجی بہبود کے انتظام و انصرام کے یہ چار ماڈل رائج ہیں (۱) خاندانی ماڈل (۲) مالیتی ماڈل (۳) مشترکہ معیشت کا ماڈل (۴) سرکاری کنٹرول والا ماڈل۔

> دیہی ہندوستان میں مشترکہ خاندان کا نظام (جوائنٹ فیملی سسٹم) مختلف وجوہات سے زوال پذیر ہونے کے باوجود مختلف فرقوں میں اب بھی رائج ہے اس سے اقتصادی تحفظ میں خصوصاً بچوں بوڑھوں اور بیروزگاروں کے اقتصادی تحفظ میں مدد ملتی

(۱) خاندانی ماڈل

دیہی ہندوستان میں مشترکہ خاندان کا نظام (جوائنٹ فیملی سسٹم) مختلف وجوہات سے زوال پذیر ہونے کے باوجود مختلف فرقوں میں اب بھی رائج ہے اس سے اقتصادی تحفظ میں خصوصاً بچوں، بوڑھوں اور

بے روزگاروں کے اقتصادی تحفظ میں مدد ملتی ہے۔

(۲) مالیتی ماڈل

کافی زیادہ لوگوں کا خیال ہے کہ بڑھاپے، بے روزگاری اور بیماری میں سرکاری امداد کا اہتمام غریب اور ضرورت مند لوگوں کی مالیتی تعداد تک ہی محدود ہونا چاہیے۔ نیز بیشتر آبادی کی ایک بڑی تعداد کے لیے سماجی خدمات کا بہترین حصول پرائیویٹ مارکیٹ سے کیا جا سکتا ہے۔

(۳) مشترکہ معیشت کا ماڈل

یہ ماڈل سرکار، سوشل ایڈمنسٹریشن، بینکوں بیمہ کمپنیوں اور جرمنی میں بیمہ سمیت کارخانہ داروں کے درمیان تعاون کی نہایت کامیاب اشکال پیش کرتا ہے۔ جرمنی میں بیمہ کے فوائد فیاضانہ ہوتے ہیں اور افراط زر کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے از خود میسر آتے ہیں۔ وہ انفرادی کمائی یا آمدنی سے جڑے ہوتے ہیں اور بہت سی مادی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔

(۴) سرکاری کنٹرول والا ماڈل

اس ماڈل میں سماجی بیمہ، مالیتی بہبود، ذاتی سماجی خدمات اور بیشتر طبی علاج کا انتظام مقامی انجمنیں یا مقامی، صوبائی، یا مرکزی حکام کرتے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک کا تجربہ

برطانیہ ویلفیئر اسٹیٹ کا بہترین ماڈل پیش کرتا ہے لیکن تھیچرازم نے فلاح و بہبود کی خدمات پر خرچ کیے جانے والے اربوں پونڈ کے اخراجات میں کمی کرنے کی حمایت کی۔ امریکن ماڈل سماجی تحفظ کے نظام کا بہترین ماڈل پیش کرتا ہے لیکن وہ صحت کی طبی دیکھ بھال فراہم نہیں کرتا جو کینیڈین ماڈل کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ سویڈن اور اسکینڈے نیویا کے دوسرے ملکوں کو اپنے شہریوں کو پنگھوڑے سے لے کر قبر تک فلاحی خدمات فراہم کرنے کا امتیاز حاصل ہے اور وہ انسان کی ترقی پر زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگانے کو تیار ہیں۔ مشرقی یورپ کے سوشلسٹ ممالک سرکاری کنٹرول والے ماڈل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اب انہیں اپنے یہاں کے سیاسی واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی فلاحی خدمات از سر نو تنظیم کرنا پڑ رہی ہے۔

خود انحصاری والا ماڈل

نئی اقتصادی پالیسی کی روشنی میں بھارت کے لیے بہترین ماڈل خود انحصار دیہی سماج کا ہے جس کی گاندھی جی نے وکالت کی تھی۔ ایک دن کا واقعہ سنیے۔ ایک روز گاندھی جی شام کی سیر کے لیے جا رہے تھے۔ راہ میں چلتے ہوئے وہ ہر چند سکنڈ بعد رکتے تھے اور راستے میں پڑے ہوئے پتھر اٹھا کر ایک ٹوکری میں رکھتے جاتے تھے۔

"مہاتما جی یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"ہم کو امید تھی کہ یہاں پکی سڑک بن جائے گی۔" مہاتما جی نے جواب دیا لیکن خرچ کا تخمینہ ہماری طاقت سے باہر ہے۔ ہمیں یہ سڑک خود بنانی چاہیے اسی لیے میں پتھر اکٹھا کر رہا ہوں۔"

یہ پنچایتی راج اداروں کے لیے ایک صحیح پیغام ہے۔ انہیں (یعنی پنچایتی راج اداروں کو) لوگوں کی فلاح و بہبود کے کاموں کی ذمہ داری کہیں اور سے مدد کی توقع کیے بغیر خود سنبھالنی چاہیے۔

بہبود کا یہ خود انحصاری والا ماڈل دراصل دیہی سماج کی سرگرم شمولیت اور حصہ داری پر مبنی ہے پنچایتیں اپنے علاقے میں ذمہ داری سنبھالنے سرکاری اور دوسری بیرونی ایجنسیوں کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے غیر سرکاری کمیٹیاں اور ذیلی کمیٹیاں بنا سکتی ہیں وسائل اکٹھا کرنے کا کام بہت باقاعدہ انداز اور سلیقے سے کیا جانا چاہیے۔ ہر ذیلی کمیٹی میں اس کے علاقے کے ہر پچیس گھروں کے لئے ایک مقامی نمائندہ ہونا چاہیے تاکہ علاقے کے ہر گھر تک بآسانی پہنچا جا سکے ان نمائندوں کو پہلے اپنے علاقے کی ضرورتوں اور وسائل کا سروے کرنا چاہیے اور پھر اس سروے کی روشنی میں ایک منصوبہ عمل تیار کر کے اسے گاؤں کے تمام لوگوں اور دستکاروں کے گروپوں وغیرہ کے تعاون اور شمولیت سے زیر عمل لانا چاہیے۔

> سماجی بہبود کے نظام کا [illegible] حالات کو بہتر بنانا ہے کہ سماج کے تمام لوگ [illegible] کا بھرپور استعمال کر سکیں [illegible] سطح پر پنچایتی راج اداروں کو گرام [illegible]

مطالعاتی جائزوں کے نتائج

ملک کے گاؤں میں سماجی ترقی اور بہبود کے تقابلی مطالعہ کے لیے کئی مطالعاتی جائزے مرتب کیے گئے۔ ان جائزوں کی بنیاد پر پنچایتوں کو دو گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروپ ان پنچایتوں کا ہے جنہوں نے ترقی و بہبود کے لیے خود انحصاری پر مبنی طریقہ اختیار کیا ہے اور اس طریقے پر مقامی لوگوں کی سرگرم شمولیت اور فیڈ بیک کے ساتھ عمل کیا جا رہا ہے۔ اس گروپ کی پنچایتوں پر عوام ہی کا کنٹرول ہوتا ہے اور وہی ترقی و بہبود کا منصوبہ یا نقشہ تیار کرتی ہیں لیکن یہ بات بہت اہم ہے کہ یہ ادارے نہ صرف رسمی کمیٹیوں یا بورڈ آف کنٹرول کے بلکہ عام لوگوں کے اثر میں آ سکتے ہیں۔

مرکزی اور ریاستی سرکاروں یا دوسری ایجنسیوں سے جو بھی مدد دستیاب ہو سکتی تھی وہ لیڈروں نے اس طرح عمل کی جس طرح کمیٹیوں (پنچایتوں) اور جنرل باڈیوں (گرام سبھاؤں) نے انھیں بتایا۔ لیڈروں کا طریق عمل زیادہ جمہوری تھا اور انھوں نے اپنے فیصلے باہمی رشتے اور فیڈ بیک کی بنیاد پر کیے۔
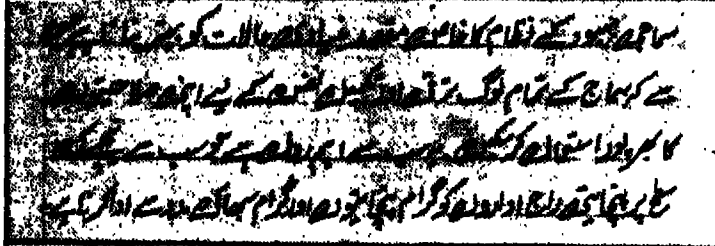
اس کے برعکس پنچایتوں کے دوسرے گروپ میں باہر کے کئی آدمی چند پنچایت لیڈروں کے ذریعہ کام کرتے تھے جنھیں انھوں نے اپنا آلۂ کار بنا رکھا تھا۔ پنچایتوں پر ان کا کنٹرول تھا اور ترقی اور بہبود کا نقشہ وہی بناتے تھے۔ مالیات ریاست فراہم کرتی تھی۔ ریاست، لیڈران اور ادارے سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے لیکن جس طریقے سے وہ باہم مربوط تھے وہ ایک دوسرے پر انحصار رکھنے والا جمہوری طریقہ نہیں تھا۔ پہلے گروپ میں مقامی ادارے ترقی و بہبود کا مرکز تھے۔ پلاننگ اداروں کے اندر ہوتی تھی اور وہ اس پر عمل درآمد کرتے تھے اگرچہ کبھی کبھی رفتار سست ہوتی تھی اور بہبود کے کام تیزی سے نہیں

ہوپاتے تھے۔

[illegible]پ کی پنچایتوں میں اپنی مدد آپ کرنے اور اپنے آپ پر انحصار رکھنے کا جذبہ تھا اور وہ سرکاری گرانٹ پر ہی انحصار نہیں رکھتی تھیں جب کہ دوسرے گروپ کی پنچایتیں گرانٹ پر انحصار رکھتی تھیں نہ ہی خود انحصاری کا جذبہ اور بہبود رسمی ایڈمنسٹریشن یا سماجی بہبود اداروں تک محدود تھی اس لیے اپنی جڑیں دور دور تک پھیلائیں اور مختلف ویلفیئر پروگراموں کی ترقی سے ساتھ بڑھی اور مستحکم ہوئی۔

پہلے گروپ کی پنچایتوں میں جو تبدیلیاں یا بہبود میں جو بہتری آئی اس کا مادی نشانوں کے حصول سے اتنا زیادہ تعلق نہ تھا۔ سامنے صرف یہی مقصد تھا کہ لوگوں کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو اتنا بیدار کیا جائے کہ وہ اپنی سماجی بہبود کی ضرورتوں اور دستیاب وسائل کی شناخت کر سکیں اور اس کے بعد خود اپنی کوششوں سے تبدیلی لانے کا پروگرام تیار کر سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سماجی بہبود اور سماجی تبدیلی کے عمل کو صرف اداروں پر ہی نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ اس میں عام لوگوں کو شریک کیا جائے اور یہ بات اوپر سے مسلط نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے گروپ کی پنچایتوں میں لیڈروں کو مرکزی اہمیت حاصل تھی اور وہ گرانٹ کے منتظر رہتے تھے اس سے بہت سے لوگوں میں جوش پیدا نہیں ہو پاتا تھا جب کہ پہلے گروپ گروپ میں لوگوں کو مرکزی اہمیت حاصل تھی اور یہاں کا رخ سماج کی طرف تھا۔

عورتوں اور بچوّں کی بہبود

بھارت میں عورتوں کی پوزیشن کا اندازہ آبادی میں مردوں کی تعداد سے عورتوں کی تعداد کے تناسب سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تناسب ۱۹۸۱ء میں ۹۳۵ سے گھٹ کر ۱۹۷۱ میں ۹۳۴ اور ۱۹۹۱ میں ۹۲۹ ہو گیا ہے۔ عورتوں کی تعداد میں اس کمی کی خاص وجہ ملک میں لڑکیوں کے بارے میں عدم توجہی یا لاپروائی کا برتا جانا ہے۔ عورتوں کے مرتبے کو بلند کرنے کے لیے سبھی سطحوں کی پنچایتوں کے ممبروں کو مختلف قوانین اور بہبود کے اقدامات کے بارے میں جانکاری دینا بہت ضروری ہے۔ خاتون ممبروں کو بالخصوص اپنے حقوق کے لیے لڑنے کے واسطے ان اقدامات پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

پنچایتوں کا دخل

پنچایتوں کو عورتوں اور لڑکیوں کو اُن کے حقوق

دلوانے چاہئیں۔ آٹھویں منصوبے کے قومی نشانوں کی تکمیل کے لیے ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیئے۔ یہ نشانے ہیں:۔

ا۔ سبھی بچوں کے لئے ایک کلومیٹر کے دائرے میں ایک پرائمری اسکول ہونا چاہیے، جہاں وہ پیدل جا سکیں۔ کسی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر اسکول جانا بند کر دینے والے طلبا، کام کرنے والے بچوں اور لڑکیوں کے لیے جو اسکول نہ جا سکتی ہوں، غیر رسمی تعلیمات کا بندوبست ہونا چاہیے۔

۲۔ پرائمری اسکولوں کا اپر پرائمری اسکولوں کے ساتھ تناسب موجودہ ۱:۳۸ء۱ سے ـ ـ ـ ـ ـ ـ بڑھا کر ۲ : ۱ کر دیا جانا چاہیے کیوں کہ یہ اپر پرائمری اسٹیج اور دوسری سطحوں پر لڑکیوں کی شمولیت بڑھانے کے لیے ضروری ہے۔

یہ کام کرنے کے لئے پنچایتیں سرکار اور دوسری غیر سرکاری تنظیموں سے مالی اور دوسری قسم کی امداد حاصل کر سکتی ہیں۔

بہبود کے مختلف پروگراموں کے ذریعے بچوں کے لیے سرکاری تحفظ کا فائدہ اٹھایا جانا چاہیے جس کے لیے مندرجہ ذیل پروگرام چل رہے ہیں:۔

ا۔ تحفظی ٹیکے لگا کر بچوں کو بیماری سے بچانے کا پروگرام۔ (۲) خاندانی منصوبہ بندی اور مانع حمل طریقوں کے بارے میں معلومات کی بہم رسانی (۳) پیشہ ورانہ طبی خدمات کی فراہمی (۴) غذائیت بخش خوراک، صحت کی دیکھ بھال اور بیماریوں کی روک تھام کے بارے میں معلومات کی بہم رسانی (۵) دوران حمل اور وضع حمل کے بعد علاج اور دیکھ بھال کے لیے طبی اداروں کی سہولیات۔

ان کے علاوہ عورتوں کا مرتبہ بڑھانے کے لیے درج ذیل تجاویز پیش کی جاتی ہیں:۔

ا۔ عورتوں کو مردوں کے برابر مشاہرہ / تنخواہ / یومیہ اجرت دینے کا قاعدہ بنایا جائے۔

> [illegible] کا ثبوت [illegible]
> [illegible] جہالت ختم کرنے اور [illegible]
> [illegible] پروگرام شروع کرنے ہوں گے [illegible]
> [illegible] عزت و احترام [illegible] مقام حاصل ہو جو ہمارے [illegible]
> [illegible] کے تمام شہریوں کا حق ہے

فیملی پالیسی اور بچوّں کی دیکھ بھال

چھوٹی بچیاں اور لڑکیاں محروم نہ رہیں، اس کے لیے پنچایتوں کو اپنے داخلی اور خارجی وسائل سے درج ذیل امور کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ا۔ نرسری، گہواروں (Creches)، بے بی سٹنگ اور بہبود کی دوسری مطلوبہ خدمات کے لیے امدادی تنظیمیں قائم کی جانی چاہئیں۔

۲۔ ملازمت پیشہ عورتوں کے اوقات کار اور ان کے لئے کام کی تفویض اس نوعیت کی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے وقت نکال سکیں۔

۳۔ کام کرنے والے والدین، خصوصاً بے زمین مزدوروں کے فرصت کے اوقات کو بڑھانا چاہیے۔

پنچایتوں کے لیے سرکار کی امداد اور خاندانی

۲۔ انہیں زچگی کے لیے با تنخواہ چھٹی لینے کا آئینی حق ہونا چاہیے۔

۳۔ ان کے کام کی جگہ اُن کے گھر کے قریب ہونی چاہیے اور

۴۔ جنس کی بنا پر تفریق ختم کرنے کے لیے سماجی تنظیموں کی امداد حاصل کی جانی چاہیے۔

عام تجاویز

ا۔ بیواؤں، جسمانی طور پر معذور لوگوں اور ضعیف افراد کو امداد دی جانی چاہیے۔

۲۔ جہیز کی لعنت، عورتوں کے خلاف تشدد، کثرت ازدواج کے خلاف قوانین کے بارے میں معلومات فراہم کر کے عورتوں میں بیداری پیدا کی جانی چاہیے۔

۳۔ عوام میں عورتوں کی عزت و احترام کا جذبہ

پیدا کیا جانا چاہیئے۔

۴۔ خاندانی بہبود کے بارے میں مشاورتی ایجنسیاں قائم کی جانی چاہئیں اور بچوں کی مربوط ترقی کی اسکیم کا بندوبست پنچایتوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

بچوں کی مربوط ترقی کی اسکیم

ملک میں چھ سال سے کم عمر کے ۱۵ کروڑ بچے ہیں۔ ان کی ضرورتیں معمولی نوعیت کی مگر گوناگوں ہوتی ہیں۔ مثلاً محبت و شفقت کا برتاؤ، سمجھ بوجھ، سیکھنے اور کھیلنے کے مواقع، صحت کی ابتدائی دیکھ بھال اور غذائیت بخش خوراک کی دستیابی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان بچوں کی بہت بڑی تعداد ایسے سماجی و معاشی حالات میں رہتی ہے جس میں مشکلات ان کی جسمانی اور دماغی نشو و نما ٹھیک طرح سے نہیں ہونے دیتیں۔ ان کی ضرورتوں کی تکمیل اور ان کی صلاحیت کی نشو و نما کے لیئے بچوں کی مربوط ترقی کی اسکیم ۲ راکتوبر ۱۹۷۵ء کو شروع کی گئی تھی۔ ابتداً یہ اسکیم ۳۳ بلاکوں میں شروع کی گئی تھی لیکن آج یہ اجتماعی ترقی کے ۷۰ فیصد بلاکوں اور شہروں کی ۲۶۰ گندی بستیوں میں زیر عمل ہے۔

پنچایتوں کو مکمل ذمہ داری کی منتقلی سے انہیں اسکولی بچوں کو دوپہر کا کھانا فراہم کرنے کا پروگرام سارا سال چلانے کے لیے وسائل مہیا کرنے میں مدد ملے گی۔ گاؤں والے یہ محسوس کر کے کہ یہ ان کی اپنی اسکیم ہے جس میں حکومت بھی شریک ہے، زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دیں گے۔ اس کے نتیجے میں اسکیم پر عمل آوری کی لاگت کم ہوگی۔

مختصر یہ کہ ابتدائی مرحلے پر سب سے قدرتی اور جامع تنظیم کنبہ یا خاندان ہے۔ یہ سماج کی ایک بنیادی قدرتی اکائی ہے جس کے مشترک اقتصادی اور سماجی مفادات تمام ممبران خاندان کو باندھے رکھتے ہیں۔ اس میں تمام ارکان والدین کے سائے میں اپنی بقا اور تحفظ کے لیے ایک مشترکہ محاذ بناتے ہیں۔ والدین پدری یا مادری جذبے کے تحت اپنی اولاد کو اس کے جوان اور مکمل ہونے تک تحفظ اور سرپرستی کرتے ہیں۔ وہ کسی لالچ یا توقع کے بغیر اپنے بچوں کے لیے ہر ممکن قربانی کرتے ہیں۔ اسی طرح بچے بھی بڑے ہو کر اپنے والدین کے بڑھاپے میں ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور ان کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ اگرچہ مشترک خاندان کا نظام اب ٹوٹتا جا رہا ہے پھر بھی خاندان کے تمام افراد بحرانی حالات میں متحد ہو کر مسائل کا سامنا کرتے ہیں۔ اس امدادی نظام کو مضبوط بنانا چاہیے تاکہ کسی بیرونی بہبود ایجنسی یا ادارے کی ضرورت نہ پڑے۔

درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کی بہبود

درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کی حالت متعدد آئینی تحفظات اور بہبود کے خصوصی پروگراموں کے باوجود افسوسناک ہے۔ چھوت چھات پر پابندی اور ملازمتوں میں ریزرویشن سے بھی ذاتوں کی حالت میں سدھار نہیں ہوا ہے۔ چھوت چھات کسی نہ کسی شکل میں ابھی تک جاری ہے۔ بالخصوص دیہی علاقوں میں۔

پنچایتوں کے ممبران اس بات کا عہد کر سکتے ہیں کہ وہ نہ صرف یہ کہ خود چھوت چھات نہیں برتیں گے بلکہ وہ خصوصی مہمیں چلا کر عوام کو چھوت چھات نہ برتنے کی تلقین کریں گے اور دلتوں کے حقوق کی حفاظت کریں گے۔ مختلف ذاتوں کے ارکان کے درمیان شادی کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے اور اسے قابل سزا نہیں سمجھنا چاہیے۔ پنچایتوں کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ درج فہرست ذاتوں کی فلاح و بہبود کے لیئے چلائی جانے والی اسکیمیں انہیں باقی آبادی سے الگ نہ کریں، مثال کے طور پر درج فہرست ذاتوں کو مختلف اسکیموں کے تحت جو مکانات یا پلاٹ مہیا کیئے جاتے ہیں وہ گاؤں سے دور ہوتے ہیں جس سے ان کے دوسری ذاتوں کے لوگوں کے نزدیک آنے میں رکاوٹ پیش آتی ہے۔ اسی طرح درج فہرست ذاتوں کے لیے جو تعلیمی ادارے یا ہاسٹل کھولے جاتے ہیں وہ بھی انہیں دوسری ذاتوں کے لوگوں سے دور رکھتے ہیں۔ اس طرح کی علاحدگی سے احتراز کیا جانا چاہیے۔

پنچایتوں کو چاہیے کہ وہ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کی اقتصادی ترقی کی اسکیمیں اور پروگرام اس طرح زیر عمل لائیں کہ ان ذاتوں اور قبیلوں کے لوگ سماج کے بڑے دھارے میں مل جائیں۔

پنچایتوں کو درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کی بہبود کے لیے درج ذیل اقدامات بھی کرنے ہیں:-

۱۔ انہیں درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کے مفادات کا تحفظ کرنے والے قوانین کو لاگو کرنے میں مدد دینی چاہیے۔

۲۔ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کے لوگوں کو زمین الاٹ کرنے اور کھیتی کا ضروری سامان دینے کے بارے میں بھی غور کیا جانا چاہیئے۔

۳۔ درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کو ملنے والے فائدوں کو خورد برد نہ ہونے دینا چاہیے۔

۴۔ قبائلی علاقوں میں بندوبست کو درست بنانے کے لیئے پانچویں شیڈول کے تحت ضروری قواعد مرتب کیئے جانے چاہئیں۔

۵۔ چھٹے شیڈول کے تحت سیلف مینجمنٹ کی جو دفعہ موجود ہے اسے پانچویں شیڈول کے علاقوں میں لاگو کیا جانا چاہیے۔

۶۔ قبائلی علاقوں میں، جو ۱۰۱ شیڈولڈ ایریا قرار دیئے جا چکے ہیں، دیسی شراب کی تمام دکانیں بند کروانے کی پر زور کوشش کی جانی چاہیے۔

پنچایتوں کو سماج کے کمزور طبقوں کو اوپر اٹھانے کی فکر مندی کا ثبوت دینے کے لئے سب سے نیچے کی سطح پر چھوت چھات ختم کرنے اور اس بات کو یقینی بنانے کے پروگرام شروع کرنے ہوں گے کہ ہمارے سماج کے کم سہولیات یافتہ طبقہ کو عزت و احترام کا وہ مقام حاصل ہو جو ہمارے عظیم سماج کے تمام شہریوں کا حق ہے۔ لوگوں میں بیداری پیدا کر کے انہیں منظم کرنا چاہیئے تاکہ وہ انتظامیہ پر ان پالیسیوں کو بدلنے کے لیے زور ڈالیں جن سے درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کی بہبود میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔

جسمانی طور پر معذور افراد کی بہبود

جسمانی طور پر معذور لوگوں کی بہبود کا کام انتہائی پیچیدہ اور جزوی طور پر نامکمل ہے۔ یہ کام اچھی طرح سے صرف اسی وقت سر انجام دیا جا سکتا ہے جب تمام شہری، رضاکار تنظیمیں، حکومت اور پنچایتیں اجتماعی طور پر اس کام کے لیے اپنی ذمہ داری محسوس کریں۔

نیشنل سامپل آرگنائزیشن کے مطابق تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ہندوستانی یا یوں کہیے کہ ہندوستان کی آبادی کا لگ بھگ ۱.۹ فیصد حصہ کسی نہ کسی طرح کی معذوری میں مبتلا ہے۔ ایک سے چودہ سال تک کے بچوں کی آبادی کا تین فیصد حصہ ایسا

ہے جس کی افزائش یا نشوونما دیر سے ہوتی ہے۔ آج یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ معذور افراد کو بھی وہی حقوق اور مواقع حاصل ہونے چاہئیں جو باقی آبادی کو حاصل ہیں۔

اس نصب العین کے حصول کے لئے یک جہتی کا ہونا سب سے ضروری ہے۔ معذور افراد کو صرف فزیکل یا آکیو پیشنل تھیراپی کی سہولیات مہیا کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ انہیں خاص تعلیم یا پیشہ ورانہ تربیت دلائی جانی چاہیے۔ اور سماج میں علاحدگی پیدا کرنے والے رجحانات کے بجائے انضمام و یک جہتی پیدا کرنے کا عزم کیا جانا چاہیے معذور افراد کی صرف آبادکاری ہی کافی نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر تندرست لوگوں کا ان کے تئیں رویہ بھی بدلنا ہوگا تاکہ وہ انہیں اپنے سے الگ نہ رکھیں۔

سرودے اور معذور افراد

سرودے کا منشا صرف جسمانی طور پر تندرست افراد کی ہی بہبود نہیں ہے بلکہ معذور افراد کی بھی بہبود ہے سرودے معذور اور تندرست لوگوں کے درمیان فرق کو دور کرے گا۔ گاندھی جی کے الفاظ میں "ہر شخص ایک چلتا پھرتا مندر ہے"۔ جسمانی طور پر معذور کوئی بھی شخص حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جانا چاہیے اور کسی بھی شخص کو اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ سبھی کو کام کر کے اپنی روزی کمانے کا حق ہے اور معذور لوگوں کا کام بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ تندرست آدمیوں کا۔

نتیجہ

آزادی کے بعد ملک میں فلاح و بہبود کے متعدد پروگرام شروع کئے گئے ہیں خصوصاً گزشتہ چند برسوں میں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب سے نیچے کی سطح پر ان پر عمل درآمد کمزور رہا ہے۔ اسی لئے پنچایتوں پر پروگراموں پر عمل درآمد اور مختلف سطحوں پر عمل درآمد کی مشینری پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

مرکزی اور ریاستی حکومتوں کا پہلا کام پنچایتوں کے منتخب نمائندوں کو تربیتی کیمپوں یا مقامی زبان میں چھاپے گئے لٹریچر کے ذریعے یا پھر ان دونوں کے ذریعے معلومات بہم پہنچانا ہے۔ پنچایتوں کو اپنے فرائض باصلاحیت اور موثر انداز سے انجام دینے کے قابل بنانے کے لیے رضاکار تنظیموں کو ایک اہم رول ادا کرنا ہوگا۔ ہر پنچایت کے لیے یہ لازم بنانا ہوگا کہ ان کی پنچایت کے علاقے میں ایک بھی شخص بھوکا نہ رہے اور کوئی اس کا استحصال نہ کر سکے۔ سماج کے کمزور طبقات کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ ممبروں کو لوگوں کی بہبود سے متعلق قوانین اور مختلف ذرائع سے مل سکنے والی مالی اور تکنیکی امداد کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنی ہوگی۔ پنچایتوں کو پروگراموں پر عمل آوری پر نگاہ رکھنے کے لیے ایک نگراں ادارے کی حیثیت سے کام کرنا ہوگا۔ ان کا رہنما مقولہ دوسری طرف دیکھنے کے بجائے خود انحصاری ہونا چاہیے۔ پنچایتی راج اداروں کو ایک دوسرے کے ساتھ قریبی رابطہ رکھنا چاہیے تاکہ وہ ایک دوسرے کی مالی اور تکنیکی مدد کر سکیں۔ پنچایتوں اور سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کو اس طرح کام کرنا چاہیے کہ پروگراموں پر عمل درآمد میں مختلف سطحوں پر باہمی تعاون اور اشتراک عمل یقینی ہو جائے۔ اس سے پنچایتیں اپنے ممبروں میں اس بات پر فخر کا احساس پیدا کر سکیں گی کہ وہ اپنے عوام کی بہبود کی ضرورتوں کی خود دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ ●

(مصنف دہلی یونیورسٹی کے سابق پرو وائس چانسلر ہیں)

بقیہ: سماجی بہبود اور خاتمۂ غریبی: چند خیالات

دوسرے اقدامات سے بھی مدد ملنی چاہیے مثلاً (الف) ذیلی ساخت ترقی (ب) بہتر مواصلات (ج) پیداواریت میں اضافہ کے لیے بجلی کا انتظام (د) ماحولیاتی تحفظ (ہ) قدرتی وسائل کا منصوبہ بند استعمال (و) انسانی وسائل کو تقویت دینے کے لیے ان دو ذرائع کا استعمال (۱) سبھی کے لیے تعلیم اور ہنرمندی کی تحصیل (۲) سبھی کے لیے صحت سے متعلق بنیادی خدمت۔ (ز) سائنس اور تکنالوجی کو عوامی سطح تک لے جانا۔ (ح) خود عوام کی مدد سے اضافۂ آبادی کو کنٹرول میں لانا۔

مشنری جذبے کا طریق کار

جب تک غریبی سے متعلق مسائل کو سمجھنے اور ان کے حل کرنے میں عوام کی شمولیت نہیں ہوگی، خاتمۂ غریبی کے کام میں کامیابی نہیں مل سکتی، بلکہ حکومت کی کوششوں کو یقینی طور پر کامیاب بنانے کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے کہ ایک بہتر زندگی کے لیے عوام کے خیالات کو تحریک دی جائے اور ان میں ایسی صلاحیتیں پیدا کر دی جائیں کہ وہ مقامی ترقیات کے منصوبوں کو خود تیار کریں۔ مرکزی حکومت کا ریاستوں اور مقامی اداروں کی شرکت سے اسکیموں کو چلانا بلاشبہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اس سے عوامی سطح پر لوگوں کو تحریک ملتی ہے جو نہایت ضروری ہے۔ لیکن ان اسکیموں کی بہت کچھ کامیابی ان افسروں پر بھی منحصر ہے جو ان اسکیموں کا نفاذ کرتے ہیں۔ ان افسروں کو اس کام کے لیے براہ راست عوام کو جوابدہ ہونا چاہیے نہ کہ دور دراز کے انتظامی دفاتر کو اس سلسلے میں جو بہت ضروری ہے وہ خاتمۂ غریبی کے لیے مشنری جذبے کا طریق کار ہے۔ یہ حکومت کی، رضاکار تنظیموں کی، سماجی اور قدرتی سائنس دانوں اور عوامی اداروں کی بالاشتراک، منتخب اور ہم آہنگ جدوجہد ہونی چاہیے۔ حکومت کو ایسی پر اشتراک تحریک کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ اسی طرح اس کام میں دیہی فرقوں (کمیونٹیز) کو بھی مدد دینی چاہیے کہ وہ دیہاتی اور قبائلی ترقیات کے اپنے نجی متبادل نمونے تیار کریں۔ یہ غیر اجتماعی اور مقامی طریق کار نہایت ضروری ہے کیوں ہندوستان کا سماجی معاشی تانا بانا مختلف مقامی تاریخی واقعات کی ترکیب سے، تہذیبی سرچشموں سے اور جغرافیائی حالتوں اور آبادی کے گروپوں سے مل کر بنا ہے۔ لہٰذا غریبی کی تخفیف کی تدابیر اختیار کرنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں غیر مرکوز پروگراموں کی فوری ضرورت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ کیوں کہ اسی طریقے سے ہم ہندوستانی زندگی سے مطابقت پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمیں مقامی کارروائیوں کا اختیار بھی زیادہ سے زیادہ اقدامات کی حد تک مقامی استفادہ کنندگان پر چھوڑ دینا چاہیے۔

خاتمۂ غریبی کے لیے جب سماجی، معاشی اور سیاسی مفادات کے اعتبار سے ایک متفقہ پروگرام مشنری جذبے کے تحت چلایا جائے گا تو اس سے ملک کو بہ عجلت ترقی کے نصب العین تک پہنچنے میں بڑی مدد ملے گی۔ لہٰذا ہمارے خاتمۂ غریبی کے پروگراموں کو پنچایت راج کے اداروں کی طرف رخ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اس سے انہیں ایک موافق ماحول اور ضروری وسائل حاصل ہو جائیں گے۔ ہمیں اس عمدہ موقع کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

(مضمون نگار ممبر پلاننگ کمیشن ہیں) ●

ڈاکٹر اپرنا باسو

مردوں اور عورتوں کی برابری کی جانب

مصنفہ محسوس کرتی ہیں کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان برابری پیدا کرنے کے لیے لازم ہے کہ تمام لڑکیوں کو ابتدائی اور ثانوی اسکولوں تک رسائی حاصل ہو کیوں کہ محض خواندگی کافی نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان نابرابری جاری نہیں رہنی چاہیے نیز یہ کہ ان میں سبھی سطحوں پر برابری ہونی چاہیے۔

جوں جوں انسانی ترقی عالمی اسٹیج کے مرکز کی جانب بڑھ رہی ہے، ترقیاتی عمل میں عوام کی شمولیت زیادہ محسوس کی جا رہی ہے۔ عوام کی کثیر تعداد ترقی کے فائدوں سے بے بہرہ ہے۔ عورتوں کو، جن کی دنیا کی آبادی میں اکثریت ہے، ترقی کے موقعوں کا محض ایک قلیل حصہ ہی ملتا ہے۔ ماہ ستمبر ۱۹۹۵ء میں بیجنگ میں منعقدہ خواتین کی چوتھی عالمی کانفرنس میں برابری، ترقی اور امن کا نصب العین اختیار کیا گیا۔ لیکن کتنی برابر ہیں ہم؟ کیا ہمیں خواندگی، تعلیم، خوراک، غذائیت بخش اجزاء، خوراک، صحت، روزگار یا سیاسی اور اقتصادی فیصلے لینے کے عمل میں برابر کے مواقع دستیاب ہیں؟

خواندگی

خصوصاً ترقی پذیر ممالک میں عورتیں مردوں کی بہ نسبت کافی کم تعداد میں خواندہ ہیں۔ بھارت میں ۱۹۹۱ء میں ۴۰ فی صد سے کم عورتیں خواندہ تھیں۔ نیپال میں نسوانی خواندگی کا تناسب ۲۵ فی صد، سیرالیون میں ۲۷ فی صد، افغانستان میں ۳۲ فی صد اور سوڈان میں ۲۷ فی صد تھا۔ دنیا کی آبادی کی دو تہائی عورتیں ناخواندہ ہیں۔

حصول آزادی کے بعد بھارت میں شرح خواندگی میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ نسوانی خواندگی بھی بڑھی ہے۔ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۱ء تک کی دہائی میں نسوانی خواندگی کی شرح مردوں کی بہ نسبت زیادہ تیز رفتار سے بڑھی۔ مگر اس کے باوجود نسوانی خواندگی کی شرح آج اسی سطح پر ہے جہاں کہ ۳۰ برس پہلے مردوں کی شرح خواندگی تھی۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں نسوانی خواندگی کی شرح مختلف ہے۔ مثال کے طور پر کیرالہ میں یہ سو فی صد ہے جب کہ راجستھان میں صرف ۲۰.۸ فی صد عورتیں ہی لکھنا پڑھنا جانتی ہیں۔ شہروں اور دیہی علاقوں

[illegible]

کے درمیان بھی نسوانی خواندگی کی شرح میں بہت فرق ہے اور ۱۹۸۱ء سے ۱۹۹۱ء تک کی دہائی میں یہ فرق اور بڑھا ہے۔ دیہی علاقوں میں نسوانی خواندگی کی شرح ۳۰.۶ ہے جو شہروں کی شرح خواندگی کے نصف سے بھی کم ہے۔ اس لیے عام اور مکمل خواندگی کے حصول کے لیے بنیادی ضرورت یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں نیز مختلف علاقوں کے درمیان نابرابریاں کم کی جائیں۔

دوسرے تعلیمی اشاریوں کی طرح جنس کی نابرابری اسکولوں کے داخلوں اور بدستور تعلیم جاری رکھنے والے طلبا کی تعداد میں کافی نمایاں ہے۔ اگرچہ اسکولوں میں لڑکیوں کے داخلوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہے لیکن نابرابریاں پھر بھی موجود ہیں۔ بیچ میں اسکول چھوڑ دینے والی لڑکیوں کی تعداد لڑکوں کی بہ نسبت کافی زیادہ ہے۔ ۹۴-۱۹۹۳ء کے دوران پرائمری اسکولوں میں داخل ہونے والی لڑکیوں میں سے ایک تہائی سے زیادہ تعداد (۳۹ فی صد) نے پرائمری تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی اسکول آنا بند کر دیا اور جو لڑکیاں پرائمری سے ہائر سیکنڈری کے مرحلے میں پہنچیں ان میں سے مزید دس فی صد نے ہائر سیکنڈری مکمل کرنے سے پہلے اسکول چھوڑ دیا۔ اس طرح پرائمری اسکولوں میں داخلہ لینے والی لڑکیوں میں سے صرف ۳۲ فی صد لڑکیاں ہی اسکول کی تعلیم مکمل کر پاتی ہیں۔ بیچ میں اسکول چھوڑ دینے والی لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سماجی و ثقافتی اور اقتصادی حالات ہیں۔

اعلا تعلیم کے معاملے میں ترقی پذیر ملکوں کی عورتیں مردوں سے بہت پیچھے ہیں۔ افریقہ میں تیسری سطح کی (یعنی اعلا) تعلیم کے لیے ان کے داخلوں کی تعداد مردوں کے داخلوں کی فقط ایک تہائی ہے۔ بھارت

میں بھی تیسری سطح کی تعلیم میں لڑکیاں لڑکوں سے بہت پیچھے ہیں۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں بھی سائنسی اور تکنیکی تعلیم میں عورتوں کی نمائندگی بہت کم ہے۔ اسپین میں ان شعبوں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا تناسب ۲۸ فی صد، آسٹریا میں ۲۵ فی صد اور کینیڈا میں ۲۹ فی صد ہے۔

صحت

اوسطاً عورتوں کی عمر مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔

> ترقی پذیر ممالک میں عورتوں کو مردوں سے کم روزگار کے مواقع میسر ہوتے ہیں، روزگار میں عورتوں کی حصہ داری اوسطاً مردوں کی تعداد کی ۵۰ فی صد ہے۔

لیکن ایشیا اور افریقہ کے کچھ ملکوں میں عورتوں کی صحت اور غذائیت بخش خوراک کے معاملے میں عدم توجہی یا تفریق اتنی زیادہ ہے کہ ان کی متوقع عمر کم ہوتی ہے۔ اگرچہ کچھ ملکوں میں جن میں بھارت بھی شامل ہے عورتیں ہی اپنے کنبے کے لیے اشیائے خوراک اگاتی اور کھانا تیار کرتی ہیں وہ سب کو کھلانے کے بعد بچا کچھا کھاتی ہیں اور کم مقدار میں کھاتی ہیں۔ اگر ہم عالمی شرح ہائے اموات کی روشنی میں ان آبادیوں کا موازنہ کریں جنھیں زندہ رہنا چاہیے تو ہم دیکھیں گے کہ ایشیا کی دس کروڑ عورتیں "غائب" ہیں۔ غریب ملکوں میں صحت کے لیے سب سے بڑا خطرہ بچے کی پیدائش سے ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں بچے کی پیدائش کے وقت ماؤں کی اموات کی شرحیں صنعتی ترقی والے ممالک سے ۱۵ گنی سے بھی زیادہ ہیں۔

روزگار

ترقی پذیر ممالک میں عورتوں کو مردوں سے کم روزگار کے مواقع میسر ہوتے ہیں، روزگار میں عورتوں کی حصہ داری اوسطاً مردوں کی تعداد کی ۵۰ فی صد ہے۔ جنوبی ایشیا میں تو یہ صرف ۲۹ فی صد ہے۔ بھارت میں برسر روزگار عورتوں کی کل تعداد (جو ۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں صرف ۲۹ فی صد تھی) میں سے صرف چار فی صد ہی منظم سیکٹر میں کام کرتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں منظم سیکٹر میں مردوں کی تعداد دس گنی ہے۔ تعلیم یافتہ اور باخبر نہ ہونے کی وجہ سے عورتیں عموماً چھوٹے چھوٹے کام ہی کرتی ہیں جن کے لیے کم ہنر مندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ صنعتی سیکٹر میں عورتیں زیادہ تر گھریلو صنعتوں ہی میں کام کرتی ہیں جن میں روزگار غیر یقینی یا موسمی نوعیت کا ہوتا ہے اور اجرت بھی کم ملتی ہے۔ گھر کی ضرورتوں اور بچے پالنے کی ذمہ داری کی وجہ سے عورتیں جز وقتی یا عارضی نوعیت کا کام قبول کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

جب عورتوں کو کام مل جاتا ہے تو انھیں کم اجرت دی جاتی ہے۔ جمہوریہ کوریا میں عورتوں کو مردوں کو دی جانے والی اجرت کا صرف ۴۷ فی صد ہی دیا جاتا ہے۔ اجرت میں یہ امتیاز صنعتی ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جو عورتیں با اجرت ملازمت میں نہیں ہوتیں وہ خالی نہیں بیٹھتیں۔ وہ مردوں کی بہ نسبت زیادہ گھنٹے کام کرتی ہیں جس میں کھانا پکانا، ایندھن اور پانی لانا اور بچوں اور بوڑھوں کی دیکھ بھال کرنا شامل ہوتا ہے۔ لیکن قومی آمدنی کے حساب کتاب میں یہ کام کسی شمار میں نہیں آتا۔

خود روزگار

عورتوں کے لیے خود روزگار کے مواقع بھی محدود ہوتے ہیں۔ کچھ ملکوں میں تو انھیں جائداد کی مالک بننے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کو قرضے بھی بآسانی نہیں ملتے۔ احمد آباد میں "سیوا" نام کی تنظیم اور بنگلہ دیش میں گرامین بینکوں کے تجربوں سے پتا چلتا ہے کہ قرضوں سے عورتوں میں کیسے اعتماد پیدا ہو سکتا ہے اور خاندان اور سماج میں ان کا رتبہ کس طرح بلند ہو سکتا ہے۔

> عورتوں کے لیے خود روزگار کے مواقع بھی محدود ہوتے ہیں۔ کچھ ملکوں میں تو انھیں جائداد کی مالک بننے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کو قرضے بھی بآسانی نہیں ملتے۔

سیاست

جمہوریت اس وقت صحیح جمہوریت نہیں کہلا سکتی جب تک کہ کمزور طبقے جن میں عورتیں بھی شامل ہیں اقتدار کے سیاسی نظام سے باہر رہیں گے۔ سیاسی شرکت کا مطلب صرف اس بات میں حق رائے دہی نہیں ہے بلکہ اس سے پالیسیوں کی تشکیل اور فیصلے لینے پر اثر انداز ہونے کی اہلیت بھی مراد ہے۔ قریب قریب ہر جگہ کی عورتوں کو سرکار، قانون ساز اداروں، انتظامیہ اور عدلیہ میں مناسب نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ دنیا کی پارلیمنٹوں کے ارکان میں ۱۹۸۰ء میں خواتین کی تعداد صرف دس فی صد اور کابیناؤں (CABINETS) میں فقط چار فی صد تھی۔ بھارت میں ایک اندرا گاندھی یا مایاوتی کے برسر اقتدار آنے کے باوجود خواتین کی نمائندگی بہت معمولی ہے۔ یہاں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں علی الترتیب ۸ فی صد اور ۱۰ فی صد سے زیادہ نہیں ہے۔ جو خواتین سیاسی اقتدار تک پہنچی ہیں وہ اس لیے پہنچ سکی ہیں کہ وہ مرفع الحال یا بارسوخ خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں یا بہ الفاظ دیگر جو سیاست دانوں کی بیویاں، بیوائیں یا بیٹیاں ہیں۔ بہت کم خود اپنے بل پر آتی ہیں۔ خواتین کے مرتبے سے متعلق کمیٹی نے ۲۰ سال پہلے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ "پارٹیوں کا ڈھانچہ ہی کچھ ایسا ہے کہ ان پر مردوں کا غلبہ رہتا ہے اور کچھ نمایاں مستثنات کے باوجود

> جمہوریت اس وقت صحیح جمہوریت نہیں کہلا سکتی جب تک کہ کمزور طبقے جن میں [illegible]

پارٹیوں کے ممبران سماج کے عام تعصبات اور رجحانات سے پاک نہیں ہیں۔ وہ خاتون ووٹروں اور خاتون شہریوں کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے وہ مردوں کی دُم چھلا ہوں۔ وہ خاندانوں اور کنبوں کے سربراہوں سے ہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پورے خاندان یا کنبے کے ووٹ ان کی پارٹیوں یا ان کے امیدواروں کو دلائیں گے"۔ بدقسمتی سے آج بھی صورت حال یہی ہے۔

> عورتوں کو برابری پر لانے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ یقینی بنانا ہوگا کہ تمام لڑکیوں کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم تک رسائی حاصل ہو صرف خواندگی کافی نہیں ہے۔ برطانیہ کے برابری کے موقعوں کی فراہمی سے متعلق کمیشن کی طرز پر ہمارے ملک میں بھی ایک کمیشن مقرر کیا جانا چاہیے جو تمام سرکاری محکموں، پبلک سیکٹر کے اداروں، نیم سرکاری اداروں، نجی سیکٹر اور عدلیہ کے ضمن میں ایک نگراں اور ازالۂ شکایات کے ادارے کی حیثیت سے کام کرے۔

بھارت میں ایک اہم پیش رفت آئین میں ۷۳ ویں اور ۷۴ ویں ترامیم ہیں جن کے مطابق یہ لازمی ہوگیا ہے کہ پنچایتوں اور میونسپلٹیوں میں کل نشستوں میں سے ایک تہائی نشستیں عورتوں کے لیے مخصوص رکھی جائیں گی۔ عورتوں کے سیاسی بے اختیاری کے پس منظر میں یہ قانون ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ پہلی مرتبہ قریباً آٹھ لاکھ عورتیں جن میں قبائل اور پسماندہ طبقات کی عورتیں بھی شامل ہوں گی، سب سے نیچے کی سطح پر پنچوں اور سرپنچوں کی حیثیت سے پالیسیاں اور منصوبے بنانے اور پروگراموں کے بندوبست پر اثر انداز ہو سکیں گی۔

بیوروکریسی

بیوروکریسی تبدیلی لانے کا ایک اہم ذریعہ بن سکتی ہے۔ نظم و نسق میں پالیسی بنانے اور پالیسیوں اور پروگراموں پر عمل درآمد کرانے کی سطح پر کافی تعداد میں خواتین کی شرکت نہ صرف ایک جمہوری ملک عورتوں کی بلند مرتبت کی عکاس ہوگی بلکہ عورتوں کی ترقی میں معاون بھی ہوگی۔ بھارت میں ایک خاتون وزیراعظم کی سکریٹری رہ چکی ہے اور آج کل یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور یونین پبلک سروس کمیشن کی چیئرمین بھی دو خواتین ہی ہیں۔ تاہم سپریم کورٹ کے ۲۱ ججوں میں سے صرف ایک خاتون جج ہے۔ ہائی کورٹوں میں ۴۱۹ ججوں میں سے صرف ۱۴ جج خواتین ہیں۔ بھارت سرکار کے ۷۵ سکریٹریوں میں صرف ایک خاتون سکریٹری ہے۔ اس سے نیچے ایڈیشنل سکریٹریوں کی سطح پر ۲۹۳ مردوں کے مقابلے میں صرف ۱۶ عورتیں اور جوائنٹ سکریٹریوں ۴ ۱۱۱ مردوں کے مقابلے میں ۱۵۵ عورتیں ہیں۔ مختلف وزارتوں میں فیصلے لینے کی سطحوں پر عورتوں کا تناسب اور بھی کم ہے۔ ۱۹۹۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق کل خاتون ملازمین میں سے صرف ۲،۴۴ فی صد سینئر عہدوں پر فائز تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرائض کی تقسیم میں بھی عورتوں کے ساتھ تفریق برتی جاتی ہے۔ خاتون ایڈمنسٹریٹروں کو اکثر سماجی بہبود، صحت، تعلیم، عورتوں اور بچوں کی بہبود جیسے شعبوں کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔

اس معاملے میں جنوبی ایشیا کے کچھ ملکوں مثلاً سری لنکا میں صورت حال بھارت سے بہتر ہے۔ سویڈن، ناروے، ڈنمارک اور کینیڈا کے مقابلے میں ہمارا ریکارڈ بہت معمولی ہے۔ برطانیہ میں اعلا عہدوں اور بیچ کی سطح کے انتظامیہ عہدوں پر ۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۳ء کے درمیان عورتوں کی تعداد دوگنی ہوگئی ہے۔

عورتوں کی برابری کو یقینی بنانے کے لیے نصب العین مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ نصب العین کی تکمیل کے لیے کافی وسائل بھی مقرر ہونے گے [illegible] ادارے قائم کرنے [illegible] گے جو مقاصد [illegible] کو یقینی بنا سکیں

اعلا تعلیم کے شعبے میں ۲۲۱ وائس چانسلروں میں صرف آٹھ عورتیں وائس چانسلر کے عہدے پر کام کر رہی ہیں (عام طور پر عورتوں کی یونیورسٹیوں میں)۔ اسی طرح ۲۱۵ یونیورسٹی رجسٹراروں میں صرف تین عورتیں رجسٹرار ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یونیورسٹیوں کے اعلا انتظامیہ عہدوں میں سے چار فی صد سے بھی کم عہدوں پر عورتیں کام کر رہی ہیں۔

کمپنیوں میں بھی صورت حال بہتر نہیں ہے۔ اس شعبے میں ۱۹۹۱ء میں صرف ۲،۳ فی صد عورتیں اعلا انتظامیہ عہدوں پر فائز تھیں۔

صورت حال کو بہتر بنانے کی تجاویز

عورتوں کو برابری پر لانے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ یقینی بنانا ہوگا کہ تمام لڑکیوں کو ابتدائی اور ثانوی تعلیم تک رسائی حاصل ہو۔ صرف خواندگی کافی نہیں ہے۔ تعلیم کے مشمولات ایسے ہونے چاہئیں جس سے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے خیالات و رجحانات اور قدروں میں تبدیلی آئے۔ نصابی کتابوں سے جنسی تعصبات پیدا کرنے والا مواد حذف کر دیا جانا چاہیے۔ بالغ عورتوں کو بھی خصوصی پروگراموں کے ذریعے خواندہ بنانا چاہیے۔ عورتوں کے لیے صحت کی دیکھ بھال کے پروگرام بھی ضروری ہیں۔ ایک ہی طرح کے کام کے لیے عورتوں کو مردوں کے برابر اجرت دی جانی چاہیے۔ عورتوں کے لیے پیشہ ورانہ تربیت بھی ضروری ہے تاکہ وہ صرف غیر ہنرمند یا نیم ہنرمند کاموں کے لیے مخصوص ہو کر نہ رہ جائیں۔ اگر عورتوں کو ماں بننے کے ساتھ ساتھ ملازمت بھی کرنا ہے تو ان کے لیے بچے کی دیکھ بھال کرنے والی تنظیمیں قائم کرنا ضروری ہوگا۔ ہمیں نظم و نسق میں فیصلے لینے کی سطح پر کم از کم ۵۰ فی صد تقرر کے لیے کام کرنا ہوگا۔ جنسی تفریق ختم کی جانی چاہیے اور ملک کی سلامتی اور مالیات جیسے زیادہ اہم محکموں میں بھی عورتوں کو بھی نمائندگی دی جانی چاہیے۔ مردوں اور عورتوں میں ہر سطح پر برابری کا احساس پیدا کیا جانا چاہیے۔ برطانیہ کے برابری کے موقعوں کی فراہمی سے متعلق کمیشن کی طرز پر ہمارے ملک میں بھی ایک کمیشن مقرر کیا جانا چاہیے جو تمام سرکاری محکموں، پبلک سیکٹر کے اداروں، نیم سرکاری اداروں، نجی سیکٹر اور عدلیہ کے ضمن میں ایک نگراں اور ازالۂ شکایات کے ادارے کی حیثیت سے کام کرے۔

جنسی برابری اور جنسی انصاف کے اصول ہندوستانی

باقی صـ۵۳ پر

نیلا مکرجی

مردوں اور عورتوں کی برابری اور دیہی عورتوں کی فلاح و بہبود

مصنف کا کہنا ہے کہ اگرچہ سرکاری تنظیمیں قرض، زمین، پانی اور تکنالوجی وغیرہ تک عورتوں کی رسائی بڑھانے والے پروگراموں کی مدد و حمایت کر رہی ہیں تاہم سماجی سیکٹر میں صحت اور بچوں کی دیکھ بھال، خاندانی منصوبہ بندی اور خواندگی وغیرہ کے پروگراموں پر کافی زیادہ سرمایہ کاری اور صاف ستھرے عملی درآمد کی ضرورت ہے۔

مردوں اور عورتوں کے درمیان عدم مساوات کے سبب غریب گھروں میں غریبی اور بھی زیادہ دکھائی دیتی ہے کیوں کہ عورتوں کو جو کام یا جو ذمہ داریاں سنبھالنی پڑتی ہیں ان کی نسبت سے انھیں موزوں مواقع اور وسائل تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ ان پر سب سے بڑی ذمہ داری گھر کے لوگوں کا پیٹ بھرنے کی ہوتی ہے لیکن یہ ذمہ داری پورا کرنے کی ان کی صلاحیت اس بات سے متاثر ہوتی ہے کہ اس کے لیے انھیں کافی وسائل دستیاب نہیں ہیں اور جو ہیں وہ بھی گھٹتے جا رہے ہیں۔ یہ واضح کرنے کے لیے کہ جنس کی بنیاد پر مرد اور عورت کے درمیان مساوات کیسے غریبی اور کنبے کی بہبود پر اثر انداز ہو رہی ہے اور اس کے پالیسی مضمرات کیا ہیں، اس مضمون میں ضلع مدناپور مغربی بنگال کے دو گاؤوں، کرشنا کرشت چک اور کلمی گریا کی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

دیہات میں غریب گھرانوں کی عورتوں پر کام کا بوجھ بہت زیادہ ہوتا ہے اور اس کے لیے انھیں بہت محنت کرنی پڑتی ہے مگر وسائل اور فیصلے لینے کے عمل میں ان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی نظریوں کا نتیجہ ایسے امتیازی قوانین یا اصولوں کی شکل میں برآمد ہوا ہے جو سماج کے برابر کے رکنوں کی حیثیت سے عورتوں کی شرکت کو روکتے ہیں۔ عورتوں کو سماجی، سیاسی اور اقتصادی اختیارات کا حاصل نہ ہونا وسائل، مواقع اور فیصلہ لینے کے اختیار تک ان کی رسائی میں مزاحم ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں غریب گھرانوں کی غریبی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

> ایک غریب گھر میں جنس کی بنیاد پر مردوں اور عورتوں کی نابرابری گھریلو معاملات میں نابرابریاں پیدا کرتی ہے، تشدد کو جنم دیتی ہے اور جسمانی بہبود اور ذہنی سکون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وسائل اور مواقع کے محدود ہونے کا نتیجہ عورتوں کو ہی بھگتنا پڑتا ہے، وہ کم کھاتی ہیں، بیمار ہونے پر علاج نہیں کراتیں، پڑھنا لکھنا نہیں سیکھ پاتیں، مارپیٹ سہتی اور تفریقی برتاؤ کا شکار بنتی ہیں اور اس طرح حقوقِ انسانی سے محروم رہتی ہیں۔

ایک غریب گھر میں جنس کی بنیاد پر مردوں اور عورتوں کی نابرابری گھریلو معاملات میں نابرابریاں پیدا کرتی ہے، تشدد کو جنم دیتی ہے اور جسمانی بہبود اور روحانی سکون پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وسائل اور مواقع کے محدود ہونے کا نتیجہ عورتوں کو ہی بھگتنا پڑتا ہے، وہ کم کھاتی ہیں، بیمار ہونے پر اپنا علاج نہیں کراتیں، پڑھنا لکھنا نہیں سیکھ پاتیں، مارپیٹ سہتی اور تفریقی برتاؤ کا شکار بنتی ہیں اور اس طرح حقوقِ انسانی سے محروم رہتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق گزشتہ ۲۰ سالوں میں دیہات کی عورتوں میں غریبی ۴۷ فی صد بڑھی ہے۔ نہ صرف یہ کہ عورتوں کا کام مردوں کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا بلکہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ روایتی انداز میں مرتب کیے جانے والے جائزوں کے لیے سوالنامے بھی اس طرح تیار کیے جاتے ہیں کہ ان میں جنسی تعصب نظر آتا ہے۔

دیہی عورتوں کی غریبی کو ختم یا کم کرنے کی کوشش وسائل کے جاری رہ سکنے والے استعمال کے ذریعے

ان کے رہن سہن کو بہتر بنانے کی مشق ہے۔ غریبی، محرومی اور بہبود کے درمیان رشتے کی پیچیدگی کو سمجھنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ غریب عورتوں کے گروپوں سے رابطہ قائم کرکے انھیں اپنا نقطۂ نگاہ اور نظریات پیش کرنے اور اپنی دیسی معلومات اور قابلیت وصلاحیت کا اظہار کرنے دیا جائے۔

اگر ان عورتوں کو مناسب موقع دیا جائے تو وہ اپنا تجربہ مع تجزیے کے بیان کرسکتی ہیں اور یہ بھی بتا سکتی ہیں کہ ان کی ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے ان کے وسائل کتنے محدود ہیں اور وسائل کا محدود ہونا ان کی اور ان کے گھروں کی غریبی کو کیسے اور بڑھاتا ہے۔ عورتوں کی اس طرح کی شمولیت سے حاصل شدہ معلومات کی بنیاد پر ایک تعمیری منصوبۂ عمل تیار کیا جاسکتا ہے جس کے ذریعے عورتوں کے ہاتھ مضبوط کیے جاسکتے ہیں اور ان کی اور ان کے گھر والوں کی زندگی کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

گاؤں کرشنار کشت چک کا جائزہ

خاص کر دیہی عورتوں کا ماحولیاتی وسائل سے روزمرہ کا ایک خاص تعلق ہوتا ہے۔ اگر یہ وسائل مفقود ہوجاتے ہیں یا ان میں گراوٹ آتی ہے تو اس کا دیہی عورتوں پر سیدھا اثر پڑتا ہے۔ جنگلوں اور مشترکہ وسیلوں مثلاً خوراک، چارہ، ایندھن، دواؤں اور جنگل کی چھوٹی موٹی پیداوار پر ان کا بہت زیادہ انحصار ہوتا ہے۔ آس پاس کے وسائل جو تحفظی جال فراہم کرتے ہیں وہ نہ بازار میں ملتا ہے نہ ریاست کے ترقیاتی پروگراموں میں۔ درختوں، جنگلوں، پانی اور جنگلی زمین تک ان کی گھٹتی ہوئی رسائی کے سبب غریب عورتوں کے پاس روزانہ دکھ اور تکلیف اٹھانے اور محرومی کی حالت میں دن گزارنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں رہتا۔

گاؤں کرشنار کشت چک عورتوں کی پوزیشن، وسائل کے انحطاط اور خوراک کے بارے میں غیر یقینیت کے پیچیدہ رشتے کی گواہی دیتا ہے۔ اس گاؤں کے لوگ جو لودھ قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں زیادہ تر بے زمین مزدور ہیں۔ ان کی خوراک میں جنگلی خوراک کا ایک بڑا حصہ ہوتا ہے اور ان کی عورتیں یہ جنگلی خوراک جنگلوں، درختوں، تالابوں اور دوسرے مشترکہ ذرائع سے اکٹھا کرتی ہیں۔ جب ان قدرتی ذرائع میں کمی آجاتی ہے یا وہ سرے سے مفقود ہوجاتے ہیں تو بے چاری عورتیں جنگلی خوراک کہاں سے اکٹھا کرکے لائیں؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان قبائلی گھروں کو کبھی کبھی بھک مری کی حالت میں زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ گاؤں میں زمین اور پانی دو قدرتی وسیلوں میں گراوٹ آگئی ہے اور دونوں ہی آلودہ ہوگئے ہیں جس کے نتیجے میں وہاں حال ہی کے سالوں میں غریبی بڑھ گئی ہے۔

غریب عورتوں سے بات چیت ہوئی تو انھوں نے کھل کر بتایا کہ وہ کون سی خوراک کہاں سے اکٹھا کرتی ہیں اور ان کے لیے خوراک اکٹھا کرنا کتنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ نتیجتاً انھیں متبادل خوراک پر انحصار رکھنا پڑتا ہے خواہ وہ بازار سے خریدی جائے یا مالکان سے بطور اجرت ملے۔ اس سے ان کا اقتصادی توازن بگڑتا ہے۔ جب گاؤں کے مردوں سے بات کی گئی تو وہ اس بات کی توضیح نہیں کر پائے۔ ان کے برعکس عورتوں نے واضح لفظوں میں بتایا کہ جنگل اور تالاب جیسے قدرتی وسیلوں میں گراوٹ یا کمی آجانے سے انھیں مشکل دنوں میں ان سے ملنے والی مدد گزشتہ کچھ سالوں میں کافی کم ہوگئی ہے۔

گاؤں کرشنار کشت چک کی عورتوں کو دو مشکل موسموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو چیت، بیساکھ اور جیٹھ کے مہینوں میں (وسط مارچ سے وسط جون تک) جب وہ چاول، دال اور آلو بہت کم کھانے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور نیم بھک مری کی سی حالت پیدا ہوجاتی ہے۔ دوسرا مشکل وقت آشون اور کارتک میں (وسط ستمبر سے وسط اکتوبر تک) آتا ہے۔ جب چاول اور دال کی دستیابی کم ہوجانے سے پھر نیم بھک مری کی نوبت آجاتی ہے۔

خوراک کی قلت کے پہلے موسم میں گاؤں کی غریب گھروں کی عورتیں تالاب سے مچھلیاں اور آبی پودے اکٹھا کرتی ہیں جس سے خوراک کی قلت کچھ حد تک پوری ہوجاتی ہے۔ لیکن دالوں کے استعمال میں کمی سے خوراک میں پروٹین کا عنصر کم ہوجاتا ہے۔ چاول اور آلو کے کم استعمال سے حراروں یعنی کیلوریز میں ہونے والی کمی آم جیسے پھلوں کی دستیابی سے پوری ہوتی ہے۔ اس طرح قدرت ان قبیلوں کی عام خوراک کی قلت کے پہلے موسم میں غریب عورتوں کی مدد کرتی ہے۔

قلت خوراک کے دوسرے موسم میں پہلے تو دالوں کا استعمال کم ہوجاتا ہے لیکن پھر بڑھتا ہے مگر چاول کی کھپت گھٹ جاتی ہے۔ اس موسم میں دیہی سیکٹر میں روزگار کے مواقع کم ہوجاتے ہیں کیوں کہ فصلوں کی کٹائی ابھی شروع نہیں ہوئی ہوتی اور دوسری معاشی سرگرمیاں اتنی زیادہ نہیں ہوتیں کہ غریبوں کو اتنی آمدنی ہوسکے کہ وہ بازار سے خوراک خرید سکیں۔

عورتوں سے بات چیت سے ان باتوں کا پتا چلا:

- عورتیں مختلف ذرائع سے جو خوراک اکٹھا کرکے لاتی ہیں اس کے بارے میں وہ عموماً مردوں کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح سے بتا سکتی ہیں۔
- کہاں سے کیا خوراک اکٹھا کرتی ہے، اس کے بارے میں گاؤں کی عورتیں ہی زیادہ باخبر ہیں خواہ یہ تالاب ہو، دریا کا طاس ہو، جنگل ہو یا گاؤں یا گاؤں سے باہر کے درخت ہوں۔
- خوراک کی دستیابی میں کمی کے مسئلہ کا مقابلہ عورتیں ہی کرتی ہیں اور موسم کے مطابق متبادل ذرائع سے اکتساب کرتی ہیں۔
- جن دنوں میں عام قدرتی ذرائع سے خوراک کی دستیابی بہت کم ہوجاتی ہے ان دنوں میں عورتیں دال، چاول اور آلو کے علاوہ خودرو جنگلی پیڑ پودوں سے بھی خوراک حاصل کرتی ہیں۔ سال کے

سرکاری تنظیمیں پہلے ہی سے [illegible] جنگلات [illegible]
غریب عورتوں کے مسائل کو بہتر بنانے کے پروگراموں کی حمایت کر رہے
ہیں۔ تاہم [illegible] مسائل کو [illegible] شعبے میں صحت کی دیکھ
بھال، بچوں کی نگہداشت [illegible] خاندانی منصوبہ بندی، خواندگی، ہنر سکھانے
[illegible] بچوں کی [illegible] پروگراموں پر سرکار کی طرف سے زیادہ سرمایہ
لگائے جانے کے [illegible] بہت ضروری ہے

دوسرے مشکل دور میں گاؤں کی عورتیں قدرتی ماحول [illegible] خرابی کی وجہ سے جنگلی خوراک کافی مقدار میں جمع نہیں کر پاتیں۔ کنبے کو خوراک بہم پہنچانے کا ان کا رول کمزور ہو جاتا ہے۔ اس سے گھر میں غریبی کے حالات میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

گاؤں کو رشنا رکشت چک کے لیے حکمت عملی کی کچھ تجاویز

گاؤں کی غریب عورتوں کے ساتھ میٹنگوں اور تبادلۂ خیال کا دائرہ بڑھایا جائے تاکہ خوراک کی دستیابی بڑھانے اور عورتوں کو کنبے کے لیے خوراک اکٹھا کرنے میں غیر یقینیت سے بچانے کے لیے غریبی ختم کرنے کے پروگراموں کے تحت درخت اور پودے لگانے کے ایسے پروجیکٹوں کی شناخت کی جاسکے جو خود عورتوں ہی کے زیر انتظام چلائے جاسکتے ہوں۔

[illegible]

عورتوں کے گروپوں سے نہ صرف جنگلی اور دوسرے پیڑ پودے لگانے کے بارے میں بلکہ ان کی مناسب دیکھ بھال کے بارے میں بھی تجاویز طلب کی جاسکتی ہیں۔ عورتوں کے گروپوں کو ان پروجیکٹوں میں اپنا تعاون دینے اور ان پر عمل آوری میں وقت صرف کرکے اپنی ہنرمندی سے معاونت کرنے کا اختیار دیا جاسکتا ہے۔ عورتیں راستوں کے کنارے زرعی جنگل بانی بھی کرسکتی ہیں اور بعد میں پودوں کی دیکھ بھال کا کام بھی انہی کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔ زرعی جنگل بانی کے ان پروجیکٹوں کے تحت ایسے موسمی پودے بھی لگائے جاسکتے ہیں جن کے پھول، پھل، پتیاں، جڑیں اور تنے گاؤں والوں کی خوراک کے کام آسکتے ہوں۔ عورتیں ایسے پودے تجویز کرسکتی ہیں جو وہ لگانا چاہتی ہوں۔ ان کی بدولت خوراک اکٹھا کرنے کی تگ و دو میں جو وقت بچے گا اس کا استعمال وہ ایسے پروجیکٹوں کی دیکھ بھال میں اور جب یہ پروجیکٹ پروان چڑھ جائیں تو ان سے مستفید ہونے میں مدد کرسکتی ہیں۔ جن دنوں میں روزگار دستیاب نہ ہو ان دنوں میں روزگار کا بندوبست کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ کام مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے بااجرت روزگار کی اسکیموں کے تحت کیا جاسکتا ہے اس سے غریب عورتوں کا بوجھ کسی حد تک کم ہو جائے گا۔

گاؤں کلسی گریا کا معاملہ

دیہی عورتوں میں ایسے گروپ بھی ہوتے ہیں، مثلاً بیوہ عورتیں اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہوئی لڑکیاں وغیرہ، جنھیں سماجی اور ثقافتی بندشوں کے سبب پیچیدہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ بے بسی میں زندگی گزارتی ہیں۔ اس کی کچھ مثالیں گاؤں کلسی گریا میں دکھائی دیں۔

گاؤں کلسی گریا کا کل رقبہ ۵۲۱۳۶ ہیکٹیر ہے اور ۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق اس میں ۴۰ کنبے آباد ہیں۔ یہ ایک غریب گاؤں ہے جس میں درج فہرست ذات کے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ گروپوں کے پاس کوئی زمین نہیں ہے جب کہ دوسرے گروپوں کے پاس تھوڑی سی زمین ہے۔ اس لیے دونوں گروپوں کی روزی روٹی میں معمولی سا فرق ہے۔ ایک گروپ کی دماغی اور جسمانی صحت اور دوسرے گروپ کی سماجی و معاشی محرومی دکھانے کے لیے کلسی گریا کے کچھ گاؤں والوں نے ایک نقشہ بنایا۔ اس نقشے میں ہر کنبے کی صحت کی صورت حال دکھائی گئی جو مختلف عمروں کی عورتوں کے حوالے سے غریب گھروں کے صحتی اور سماجی مسائل کی عکاسی کرتی تھی۔ نقشہ بنانے والوں نے ہر گھرانے کو ایک نمبر دیا اور اس کی صحت کا اسٹیٹس ایک علیحدہ اشاریے سے ظاہر کیا گیا۔ نقشے میں مختلف پہلو دکھائے گئے مثلاً مختلف گھروں کی کہنہ بیماریاں، مجبوریاں اور دماغی الجھنوں کے اسباب وغیرہ۔ دماغی صحت کے معاملے میں ان کنبوں کو نشان زد کیا گیا جن میں کوئی کوئی پاگل تھا یا عورت کو اس کے شوہر نے چھوڑ دیا تھا، کوئی بیوہ تھی یا جوان لڑکی کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔

گاؤں والوں نے نقشے میں دکھائے گئے سماجی مسئلوں کی وضاحت کی جو دماغی سکون کو تہہ و بالا کرتے تھے۔ ان میں بڑے مسائل تھے غریب گھروں میں بیوگی یا جوان لڑکیوں کی شادی۔ بیواؤں نے بتایا کہ انھیں کس طرح حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں کتنی بے بسی میں زندگی گزارنا پڑتی ہے، چاہے وہ اکیلی بیوہ ہوں یا بچوں والی اپنے گھر کی مکھیا بیوہ۔ ان کی حالت اتنی نازک تھی کہ ان میں روزگار کا کوئی موقع ملنے پر بہتر شرائط طے کرنے کی کوئی طاقت نہیں ہوتی تھی۔ اکثر انھیں سماجی تحفظ حاصل کرنے، چھوٹے بچوں کی پرورش کرنے اور اپنے کنبے کی مناسب دیکھ بھال میں دقت پیش آتی تھی۔

گھر میں شادی کے لائق جوان لڑکیوں کا ہونا دماغ پر بوجھ اور فکر و تردد کا ایک اور سبب تھا۔ ایک ایسے سماج میں جہاں لڑکیوں کی شادی کرنا والدین کی ذمہ داری ہوتی ہے، لڑکیوں کی شادی نہ کر پانا گھر میں پریشانی اور دماغی تناؤ کا موجب بن جاتا ہے۔ مایوسی اور محرومی کا جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ الگ۔ ایک کنواری جوان لڑکی کو بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے سن بلوغت میں قدم رکھتے ہی سماج کا دباؤ شروع ہو جاتا ہے کہ اب ان کی شادی کردی جانی چاہیے۔ لڑکی کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ دباؤ بڑھتا رہتا ہے اور متعلقہ خاندان کافی فکرمند ہو جاتا ہے۔ لڑکی کی شادی کا مطلب ہے اخراجات میں بے پناہ اضافہ کیوں کہ جہیز اور شادی کی رسومات کے لیے خطیر رقم درکار ہوتی ہے جو غریب خاندانوں کے بس سے باہر ہوتی ہے۔ ان حالات میں خود لڑکیاں بھی بہت فکرمند رہتی ہیں۔ کچھ لڑکیوں نے انٹرویو کے دوران بتایا کہ وہ اپنے والدین پر بوجھ ہیں اور انھیں اپنی حالت پر ترس آتا ہے۔

صحیح عمر میں لڑکیوں کی شادی کردینا، جہیز وغیرہ کا انتظام کرنا، شوہر کا بیوی کو چھوڑ دینا ایسے سماجی مسائل ہیں جنھیں حل نہ کر پانے سے گھر میں تناؤ پیدا ہوتا ہے، جھگڑے ہوتے ہیں اور خصوصاً عورتیں مایوسی و محرومی کا شکار رہتی ہیں۔

گاؤں کلسی گر کے لیے حکمت عملی کی کچھ تجاویز

جہاں تک جسمانی تکالیف یا بیماری کا تعلق ہے ان کے لیے پرائمری ہیلتھ سینٹر کھلے ہوئے ہیں جو کچھ افاقہ تو کر ہی سکتے ہیں لیکن دماغی تناؤ اور فکرمندی کا، خاص طور پر غریب عورتوں کی ذہنی الجھنوں کا کیا کیا جائے۔ ان کا علاج ان کے بس سے باہر ہوتا ہے۔ ان کی الجھنوں اور پریشانیوں کا بڑا سبب سماجی و معاشی دباؤ، مسائل کی کمی اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ جو عورتوں اور پورے کنبے کی بہبود پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا بدترین شکار ایک غریب گھر کی جوان لڑکی ہوتی ہے جسے نہ صرف اپنے مستقبل کی فکر ہوتی ہے بلکہ گھر والوں کے طعنے تشنے بھی خاموشی سے سہنے پڑتے ہیں اور وہ سوچنے لگتی ہے کہ سارا فساد اسی کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا سن بلوغت میں قدم رکھنے والی لڑکیوں کے لیے ایسے خصوصی پروگرام شروع کرنے کی اشد ضرورت ہے جن سے سماجی اور اقتصادی طور پر ان کے ہاتھ مضبوط کیے جا سکیں۔ اگر ان لڑکیوں کے لیے آمدنی کے مواقع پیدا کر دیے جائیں تو اس سے ان کی اور گھر والوں کی کشیدگیاں کم کی جا سکتی ہیں۔ بیوہ عورتوں کے لیے بھی روزگار کے خصوصی پروگرام بنائے جا سکتے ہیں۔ اس سے ان کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں گی اور ان کا رہن سہن بھی بہتر ہو سکے گا۔

اس کے علاوہ صحتی خدمات میں سماجی کارکنوں کو شامل کر کے مزید توسیع کی جا سکتی ہے۔ یہ سماجی کارکن ذہنی تناؤ والے غریب گھرانوں کو سمجھا بجھا کر ان کا تناؤ کم کر سکتے ہیں یا پھر گاؤں کے سماج کو ان گھرانوں کے مسائل حل کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ اس سیاق و سباق میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کی ترقیاتی تنظیمیں بھی ایک اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ وہ دیہی عوام کے اندر جہیز اور دوسری سماجی برائیوں کے خلاف جذبہ پیدا کر کے انھیں روشن خیال بنا سکتی ہیں اور انھیں ان برائیوں کے خلاف حرکت میں آنے پر آمادہ کر سکتی ہیں۔ جو بھی ہو عورتوں کو تعلیم دینا اور ان کی اخلاقی، سماجی اور معاشی حمایت کرنا ہی بہت سے سماجی مسائل کو حل کرنے کی کلید ہے۔

کچھ عام پالیسی تجاویز

مندرجہ بالا دونوں گاؤوں کی مثالوں سے ظاہر ہے کہ دیہی علاقوں میں غریب گھروں کی غربت اور محرومی عورتوں کی کمزور پوزیشن سے اور بڑھتی ہے اور اس کا اثر نہ صرف گھر کے اندر بلکہ گھر کے باہر بھی پڑتا ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان غریب عورتوں کی معلومات کتنی زیادہ ہیں اور وہ کیسے اپنے مسائل و مشکلات اور ترجیحات بیان کر کے بنیادی معلومات مہیا کر سکتی ہیں اور کیسے یہ معلومات انھیں طاقتور بنانے کی کلید بن سکتی ہیں اور کیسے وہ اپنے پروجیکٹ خود بنا سکتی ہیں۔ حقوق نسواں کے لیے کام کرنے والے لوگ اور تنظیمیں سرکاری مشینری اور عوامی نمائندوں پر اس قسم کے ڈھانچے کو مضبوط بنانے کے لیے زور ڈال کر ایک اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔ بیداری اور سماجی طاقت اتنی ہی اہم ہیں جتنی کہ اقتصادی اور سیاسی طاقت جس کے لیے کام کرنے کا بہت سی غیر سرکاری تنظیموں نے بیڑہ اٹھایا ہے۔ سرکاری تنظیمیں پہلے ہی سے قرض، زمین، پانی، ٹکنالوجی جنگل وغیرہ تک غریب عورتوں کی رسائی کو بہتر بنانے کے پروگراموں کی حمایت کر رہی ہیں۔ تاہم درپیش مسائل کو دیکھتے ہوئے سماجی شعبے میں صحت کی دیکھ بھال، بچوں کی نگہداشت، خاندانی منصوبہ بندی، خواندگی، ہنر سکھانے، اسکولی بچوں کو دوپہر کا کھانا دینے کے پروگراموں پر سرکار کی طرف سے زیادہ سرمایہ لگائے جانے کے ساتھ ساتھ صاف ستھرا اور بے داغ عمل درآمد بہت ضروری ہے۔

غریب گھروں کی عورتوں کو سماجی اور اقتصادی طور پر طاقتور بنانے کے لیے ہمیں ایک طویل فاصلہ طے کرنا ہے۔ ان عورتوں کی نازک حالت غربت کی وجہ سے اور زیادہ نازک ہو جاتی ہے اور ان کی دماغی اور جسمانی بہتری کا ان کے گھروں کی بہبود و بہتری سے سیدھا تعلق ہے۔ عورت ہونے کے ناطے ان کی جو پوزیشن ہے اس سے غریبی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ دیرپا اور برابر جاری رہنے والی ترقی کی راہ پر پہلا قدم ان کی پوزیشن کو بہتر اور مضبوط بنانا ہے۔

(مصنف لال بہادر شاستری نیشنل اکیڈمی آف ایڈمنسٹریشن، مسوری میں پروفیسر آف اکنامکس ہیں۔)

بقیہ: مردوں اور عورتوں کی برابری کی جانب

آئین کی تمہید، بنیادی حقوق اور ہدایتی اصولوں میں مندرج ہیں۔ آرٹیکل ۱۴ میں سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف کی ضمانت دی گئی ہے اور اس بات کو یقینی بنانے کو کہا گیا ہے کہ انصاف کے سامنے سب برابر ہیں اور جنس کی بنیاد پر کسی کے ساتھ تفریق و امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ آرٹیکل ۱۵ (۳) حکومت کو عورتوں کی بہبود و ترقی کو فروغ دینے کے لیے خصوصی انتظامات کرنے کو اختیار دیا گیا ہے۔ بھارت نے حقوق انسانی کی مختلف دستاویزات و معاہدات خصوصاً عورتوں کے خلاف امتیاز ختم کرنے کی کنونشن کی توثیق کر کے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ وہ مردوں اور عورتوں کو برابر کے حقوق اور برابر کا وقار دلائے گا۔ حال ہی میں حکومت نے بیجنگ اعلان اور پلیٹ فارم آف ایکشن بے قیل و قال منظور کیا ہے۔

بدقسمتی سے نصب العین اور حقیقی صورت حال میں نظریے اور عمل میں بہت فرق ہے۔ جیسا کہ ہم متذکرہ بالا اعداد و شمار میں دیکھتے ہیں۔ جنسی انصاف، مساوات اور برابری کے ترازو کا ایک پلڑا مردوں کی طرف جھکا ہوا ہے۔ عورتوں کو بہت سی مشکلات اور رکاوٹوں پر عبور پانا ہے۔ بھارت میں عورتوں کو غریبی، جہالت، معاشی، بدحالی، فیصلے لینے میں عدم شمولیت، وسائل تک نہ پہنچ پانے، سماجی تعصبات نیز گھر اور گھر سے باہر سماج میں تشدد کا بوجھ بدستور برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ لڑکیوں اور چھوٹی بچیوں کے خلاف لگاتار تعصب اور امتیاز برتا جا رہا ہے اور جنسی انصاف و مساوات کے حصول کے انتظامات ناکافی ثابت ہو رہے ہیں۔

عورتوں کی برابری کو یقینی بنانے کے لیے نصب العین مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ نصب العین کی تکمیل کے لیے کافی وسائل بھی مقرر کرنے ہوں گے اور مقامی، ریاستی اور قومی سطح پر ایسے ادارے قائم کرنے ہوں گے جو مقاصد کے حصول کو یقینی بنا سکیں اور اس کے لیے کی جانے والی کوششوں پر نگاہ رکھ سکیں۔ بھارت میں عورتوں کی تحریک کافی مضبوط ہے۔ اسے حکومت کے ساتھ مل کر جنسی امتیاز و تفریق کا خاتمہ یقینی بنانا ہوگا۔

(مصنف آل انڈیا ویمنز کانفرنس کی سکریٹری جنرل ہیں)

سنیل بسی رائے

بال مزدوری کے خاتمے کی کوششیں

بال مزدوری کی لعنت ساری دنیا میں پائی جاتی ہے۔ چوں کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے انتہائی غریب خاندانوں میں بھی بچوں سے مزدوری کروانے کا رواج ہے اس لیے سرکار کی تشویش بے وجہ نہیں ہے۔ زیر نظر مضمون میں بتایا گیا ہے کہ حکومت ہند نے اس برائی کو جڑ سے ختم کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور اس کے لیے مختلف اقدامات کیے ہیں۔

ہر بچے کا ایک خواب ہوتا ہے لیکن زیادہ تر صورتوں میں یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوتا، ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔

اپنی نارضامندی اور ناپسندیدگی کے باوجود غریب خاندانوں کے بچے محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب ان کی کھیلنے کودنے کی عمر ہوتی ہے تب انھیں غلام بنا دیا جاتا ہے۔ یہ دردناک صورت حال صرف ایشیا ہی میں نہیں افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے جہاں غریبی کی لعنت موجود ہے۔

ہندوستان میں بھی صورت حال زیادہ مختلف نہیں ہے۔ حصول آزادی کے بعد گزشتہ ۵۰ برسوں میں مختلف پنج سالہ منصوبوں کے ذریعے ملک میں بہت سی تبدیلیاں لائی گئی ہیں۔ بچوں کے مسائل مختلف النوع ہیں۔ ان میں تغذیہ اور تعلیم سے لے کر ترقی اور تحفظ کے مسائل شامل ہیں۔ بچے بڑے ہو کر بہتر انسان اور اچھے شہری بنیں، اس کے لیے ان مسائل کو حل کرنا ضروری ہے۔

ہندوستان میں بچوں کے حقوق کا تحفظ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ یہ نظریہ ہمارا آئین بنانے والوں کی بصیرت اور بیدار مغزی کا مرہون منت ہے۔ سرکاری پالیسی کے ایک جزو کے طور پر ہندوستانی آئین کے آرٹیکل ۳۹ میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ "حکومت بطور خاص اپنی پالیسی کا رخ اس مقصد کے حصول کی جانب موڑے گی کہ محنت کش مردوں اور عورتوں کی صحت اور توانائی اور بچوں کی نازک عمر کا بے جا استعمال نہ کیا جائے اور شہریوں کو معاشی ضرورت کے سبب ایسے پیشے اختیار کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے جو ان کی عمر اور توانائی کے لیے ناموزوں ہوں۔"

اپنی نارضامندی اور ناپسندیدگی کے باوجود غریب خاندانوں کے بچے محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب ان کے کھیلنے کودنے کی عمر ہوتی ہے تب انھیں غلام بنا دیا جاتا ہے۔ یہ دردناک صورت حال صرف ایشیا ہی میں نہیں افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے جہاں غریبی کی لعنت موجود ہے۔

اس آرٹیکل کی دوسری شق میں حکومت کو ہدایت کی گئی ہے کہ "بچوں کو ایک صحت مندانہ طریقے اور آزادی اور وقار کے ساتھ نشوونما کے لیے مواقع اور سہولیات فراہم کی جانی چاہئیں اور استحصال اور اخلاقی و مادی لاپروائی یا عدم توجہی سے ان کی حفاظت کی جانی چاہیے۔

صرف ہندوستان ہی نہیں کسی بھی حکومت کے لیے ان مقاصد کا حصول کوئی آسان کام نہیں تھا۔ آئین کے منظور کیے جانے کے ۲۷ سال بعد ہندوستان نے ۲۲ اگست ۱۹۷۴ کو بچوں کے لیے ایک قومی پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس قومی پالیسی میں اس امر کا اعادہ کیا گیا ہے کہ "حکومت ۱۴ سال تک کی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کے اقدامات کرے گی اور اس کے لیے دستیاب وسائل کے مطابق مقررہ وقتی پروگرام وضع کیا جائے گا۔"

اس پالیسی کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ "عدم توجہی اور ظلم و استحصال سے بچوں کا تحفظ کیا جائے گا اور ۱۴ سال سے کم عمر کے کسی بچے کو کسی خطرناک کام یا

بیشے پر لگانے کی اجازت نہیں دی جائے گی نہ ہی اسے کوئی بھاری کام کرنے دیا جائے گا۔"

عالمی سطح پر اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونیسیف) نے ستمبر ۱۹۹۰ء میں بچوں کے بارے میں ایک بین اقوامی چوٹی کانفرنس کا اہتمام کرکے ہندوستان کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس میں ۷۱ ملکوں کے سربراہوں اور سربراہانِ حکومت اور ۱۰۰ اعلا حکام نے جن میں زیادہ تر لوگ وزیروں کی سطح کے تھے، شرکت کی۔

> ہندوستان میں بچوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کا [illegible] آئین کے آرٹیکل ۳۹ میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ حکومت [illegible] [illegible] [illegible] اور بچوں [illegible] [illegible]

اس چوٹی کانفرنس میں بچوں کی بقا، تحفظ اور ترقی کے بارے میں ایک اعلان اور اس اعلان پر ۱۹۹۰ء کی دہائی میں عمل درآمد کے لیے ایک منصوبۂ عمل منظور کیا گیا۔ بچوں کے حقوق کے تعلق سے اس اعلان کے اغراض و مقاصد موٹے طور پر وہی ہیں جو بھارت کی بچوں کے بارے میں ۱۶ سال قبل مرتب کی گئی قومی پالیسی کے تھے۔

چوٹی کانفرنس میں منظور کیے گئے اعلان اور منصوبۂ عمل میں باریک تفصیلات بیان کی گئی تھیں جو ۵۴ سے زیادہ آرٹیکلز پر مبنی تھیں۔ یہ اعلان تیرہویں صدی کے انگلستان کے میگنا کارٹا کی طرح تھا۔

مارچ ۱۹۹۴ء میں انڈین لا انسٹی ٹیوٹ نے بچوں، صحت انسانی اور ماحول کے بارے میں ایک بین اقوامی کانفرنس کی میزبانی کی جس میں کئی مقالے پیش کیے گئے۔ ان میں سے ایک مقالے میں کہا گیا تھا کہ ہر ۶ سیکنڈ میں ۲۴۳ بچے پیدا ہوں گے جن میں سے ۱۳۶ ایشیا میں پیدا ہوں گے اور ان میں سے ۴۳ سے زیادہ بچے ۱۵ سال کی عمر تک پہنچنے کے پہلے ہی مر جائیں گے۔

بچوں کے متعلق عالمی چوٹی کانفرنس سے قریباً دس ماہ پہلے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں بچوں کے حقوق کے بارے میں ایک کنونشن منظور کی گئی۔ اس کنونشن میں ۵۴ آرٹیکل ہیں اور ان میں طے کیا گیا ہے کہ ملازمت کے لیے کسی بچے کی کم سے کم عمر کتنی ہونی چاہیے، بچوں کے لیے کام کے گھنٹے کتنے اور دوسری شرائطِ ملازمت کیا ہونی چاہئیں۔ ان قواعد و ضوابط کے موثر نفاذ کے لیے آرٹیکلز میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قواعد کی خلاف ورزی کے لیے کیا سزا دی جا سکتی ہے۔ بھارت نے اس کنونشن کو ۱۱ دسمبر ۱۹۹۲ء کو منظور کیا۔

ایسے بہت سے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ بچوں کے حقوق کے بارے میں یہ بین اقوامی کنونشن صرف کاغذ کا ایک ٹکڑا، نیک ارادوں کی ایک اور فہرست یا بین اقوامی برادری کی مسائل حاضرہ پر مل کر غور کرنے کی ایک اور مثال ہے۔ لیکن اگر وہ لوگ اور تنظیمیں جو ۱۵۶ حکومتوں کے وعدوں کو پورا کرنے کی مہم چلا رہی ہیں، اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں تو اس سے ایک ایسا معیار قائم ہوگا جس سے نیچے گرنا کوئی بھی مہذب قوم۔ خواہ امیر ہو یا غریب، اپنے لیے باعثِ شرم سمجھے گی۔

عالمی سطح پر اقوام متحدہ کے بچوں کے فنڈ (یونیسیف) نے ستمبر ۱۹۹۰ء میں بچوں کے بارے میں ایک بین اقوامی چوٹی کانفرنس کا اہتمام کرکے ہندوستان کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اس میں ۷۱ ملکوں کے سربراہوں اور سربراہانِ حکومت اور ۱۰۰ اعلا حکام نے جن میں زیادہ تر لوگ وزیروں کی سطح کے تھے، شرکت کی۔

گزشتہ چند برسوں کا تجربہ بتاتا ہے کہ بہت سے سماجی اور معاشی حقوق مثال کے طور پر صحت، تعلیم اور تغذیہ سے متعلق حقوق زیرِ عمل لائے جا رہے ہیں۔ بچوں کے لیے عالمی چوٹی کانفرنس اور قومی منصوبۂ عمل کے طے کردہ نصب العین جن سماجی اور معاشی حقوق کی نشاندہی کرتے ہیں وہ خیالی نہیں، حقیقی ہیں۔

یہ وسیع منظر کسی کو بھی اس بات کا یقین دلانے کے لیے کافی ہے کہ بچوں کی ترقی کی راہ میں حائل مسئلوں سے بے توجہی نہیں برتی جا رہی ہے۔ حکومت ہند کی کوششوں کے پیچھے دنیا بھر کی حمایت ہے۔ اس کے باوجود ایسے لوگ بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ بچوں کے حقوق کی حفاظت کے معاملے میں ہندوستان کا ریکارڈ ویسا نہیں ہے جیسا کہ ہونا چاہیے۔

بھارت میں بڑھتی ہوئی شہرکاری کے سبب بال مزدوری کا مسئلہ بھی وسعت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بچے کانچ کی چوڑیاں، تالے، بیڑی اور آتش بازی بنانے اور قالین بافی کے کام کرتے ہیں۔ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ بچے ۲۶۰۰ منظور شدہ اور ۳۰۰۰ غیر منظور شدہ بوچڑ خانوں میں بھی کام کر رہے ہیں۔

جہاں تک پالیسی کا سوال ہے بھارت میں بہت سے بامعنی میونسپل قوانین اور اعلانات پاس کیے گئے ہیں لیکن پھر بھی یہ ایک سنگین حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ہر تیسرا مزدور ایک بچہ ہے۔ ان میں سے ۷۰ فی صد بچے بہت کم اجرت ۔۔ صرف ایک سو پچاس روپے ماہانہ پاتے ہیں۔

قانون ہمارے دیہات میں نہیں پہنچ پایا ہے جہاں بچے پیسہ کمانے کے لیے مختلف کام کرتے ہیں اور یہ پیسہ ان کے گھروں کے اخراجات پورا کرنے میں کام آتا ہے۔ بال مزدوری کے مسئلے پر پی ایچ ڈی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے زیرِ اہتمام ایک سہ روزہ ورکشاپ مئی ۱۹۹۵ء میں منعقد ہوئی جس میں بتایا گیا کہ بچوں سے مزدوری کروانے پر صرف چار ہزار افراد کو سزا دی گئی۔ ان میں سے ۳۵۰۰ افراد کو صرف ۱۵۰ روپے کے جرمانے کی سزا دے کر چھوڑ دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ قانون بہت نرم ہے اس لیے یہ اس برائی کو روکنے میں کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔

غیر منظم سیکٹر میں کام کرنے والے ۱۰ کروڑ

[illegible] ۲ لاکھ سے زیادہ بچے جو کم عمری صنعتوں میں کام کر رہے ہیں جو ان کی صحت کے لیے مضر ہے۔

نومبر ۱۹۹۵ء میں سیواکاشی کے آتش بازی بنانے والے کارخانوں کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ انھیں بھی عالمی منڈی میں اپنی چیزوں کی فروخت کا موقع ملنا چاہیے۔ وہ عالمی مارکیٹ میں چین کی جگہ لینا چاہتے ہیں جو پٹاخوں کا سب سے بڑا اسپلائر ہے۔

چونکہ آتشبازی بنانے والے کارخانے بچوں سے مزدوری کروانے کی بین اقوامی پیچیدگیوں سے باخبر ہیں اس لیے وہ عالمی قواعد کی پابندی کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر وہ بین اقوامی منڈی میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جائیں تو بچوں کو ملازم رکھنے کا سلسلہ قریب قریب ختم ہو جائے گا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ بیرونی دنیا ایسی چیزیں نہیں خریدے گی جو بال مزدوروں کی مدد سے تیار کی جاتی ہیں۔ گزشتہ سال ہندوستانی تاجروں نے تین کروڑ روپے کی مالیت کے پٹاخے غیر ممالک کو برآمد کیے۔

گو یہ بات کہ بچوں کو کم مزدوری پر زیادہ گھنٹوں تک کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے کافی غیر منصفانہ ہے تاہم اس سے بھی زیادہ تشویشناک یہ حقیقت ہے کہ انھیں ان کے بچپن اور گھریلو زندگی کی محبت وشفقت سے محروم کیا جاتا ہے۔

حکومت نے اس مسئلے کی بیخ کنی کا تہیہ کر لیا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں یوم آزادی پر وزیر اعظم شری پی۔ وی نرسمہا راؤ نے سنہ ۲۰۰۰ تک جوکھم بھرے کاموں میں بال مزدوری کا سلسلہ مکمل طور پر ختم کرنے کی اپیل کی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت بال مزدوری کے مسئلے پر فکرمند ہے۔

ملک میں تقریباً ۲۰ لاکھ بچوں کو جوکھم بھری ملازمتوں سے نکالنے کے لیے ایک خصوصی پروگرام تیار کیا گیا ہے جس پر آٹھ ارب روپے خرچ کیے جائیں گے۔ سال ۹۵-۱۹۹۴ء میں اس کام کے لیے ۳۴ کروڑ روپے مختص کیے گئے ہیں

اس پروگرام پر عمل درآمد کے کام کی نگرانی ایک قومی اتھارٹی کر رہی ہے جو بال مزدوری کے خاتمے کے لیے مرکزی وزیر محنت کی صدارت میں بنائی گئی ہے۔

بال مزدوری ختم کرنے کے بین اقوامی پروگرام کے تحت ۱۹۹۲ء سے ۸۹ پروجیکٹ زیر عمل لائے گئے ہیں اور ان پر ۳۰ء۱ کروڑ روپے خرچ کیے جا چکے ہیں۔

بال مزدوری کو کم از کم سطح پر لانے کی راہ میں ایک اور رکاوٹ یہ ہے کہ کارخانوں کے مالکان بال مزدوری کے مخالفین اور غیر سرکاری تنظیموں کو اپنے کارخانے کا معائنہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

وزارت بہبود اور اقوام متحدہ کے بچوں کے بین اقوامی ہنگامی فنڈ (یونیسیف) کے زیر اہتمام ۹۳-۱۹۹۲ء میں کیے گئے ایک سروے سے معلوم ہوا ہے کہ گلیوں اور بازاروں میں رہنے والے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد بے گھر اور محتاج اور بے توجہی، غلط استعمال اور استحصال کی شکار ہے۔ متذکرہ بالا اسکیم کا ایک اہم مقصد بچوں کو استحصال اور غلط استعمال سے نجات دلانا اور بچوں کو جوکھم بھرے کام دھندوں سے باہر نکالنا ہے۔

اسکیم کے تحت ہر رضاکار تنظیم سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ۲۰۰ بچوں کے لیے ایک پروجیکٹ پر عمل درآمد کرے گی۔ پروجیکٹ کے ۹۰ فی صد اخراجات حکومت ہند برداشت کرے گی اور باقی غیر سرکاری تنظیمیں۔ ۹۴-۱۹۹۳ء اور ۹۵-۱۹۹۴ء میں ۳۴ شہروں میں یہ اسکیم زیر عمل لائی گئی۔ وزارت محنت کے زیر سرپرستی "خطرناک کام دھندوں میں بال مزدوری کا خاتمہ" کے موضوع پر ستمبر ۱۹۹۵ء میں منعقدہ ایک ورکشاپ کو بتایا گیا کہ بچوں کو عام طور پر ماچس بنانے، ہیروں اور قیمتی پتھروں پر پالش کرنے، شیشے اور پیتل کے برتن بنانے، قالین بننے، سلیٹیں اور تالے بنانے کے کارخانوں میں کام ملتا ہے۔ ورکشاپ نے مزدور بچوں کی زیادہ تعداد والے علاقوں میں زیر عمل پروجیکٹوں کی بنیاد پر قانون سازی کا ایک منصوبہ پیش کیا۔

ہندوستان میں مزدور بچوں کی تعداد کے بارے میں مختلف اندازے لگائے گئے ہیں۔ آپریشنز ریسرچ گروپ کے مطابق یہ تعداد ساڑھے پانچ کروڑ ہے اور اس صدی کے اختتام تک بڑھ کر سات کروڑ ہو جائے گی۔

یہ خیال ہندوستان کے پیدائش و اموات کے اعداد و شمار کے ماہرین کا ہے جن کی دلیل یہ ہے کہ ملک کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی دیہات کے اور زیادہ خاندانوں کو غریبی کی طرف دھکیلتی ہے اور اقتصادی نرم روی سے ایسی اشیاء کی مانگ بڑھ رہی ہے جو بال مزدوری کے ذریعے تیار کی جاتی ہیں۔

دنیا بھر میں دس سے چودہ برس تک کی عمر کے ۲۰ کروڑ بچے ایسی ملازمتوں پر کام کر رہے ہیں جو جوکھم بھری ہونے کے علاوہ غیر صحت مندانہ اور غیر انسانی ہیں۔ یہ اندازہ بین اقوامی محنت تنظیم (آئی ایل او) کا ہے۔ اس کے سروے کے مطابق سب سے کم ترقی پذیر ممالک میں ہر ۵ بچوں میں سے ایک بچہ اپنے خاندان کا خرچ پورا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مزدوری کرتا ہے اور ایسے بچوں میں ۵ سال کے چھوٹے بچے بھی ہوتے ہیں۔

ہندوستان، نیپال اور پاکستان میں کم عمر بچے قالین بنتے ہیں جو مغربی ممالک کے زیادہ خرچیلے اسٹوروں میں بکتے ہیں۔ بچوں کے حقوق کی بحالی کی کوششوں

باقی صفحہ ۲۳ پر

ہندوستان میں مزدور بچوں کی تعداد کے بارے میں مختلف اندازے لگائے گئے ... کے مطابق یہ تعداد ساڑھے ۵ کروڑ ہے اور اس صدی کے اختتام تک بڑھ کر سات کروڑ ہو جائے گی۔

جیہ اروناچلم

عوامی سطح پر سماجی تبدیلی کے موثر عوامل

عوامی سطح پر غریب مزدور عورتوں کی بہتری کے لیے این۔جی۔او (NETWORK WITH GRASSROOTS ORGANISATIONS) نے جو کام کیے ہیں، مزدور عورتوں کا فورم (WORKING WOMENS FORUM) اس کی ایک تابناک مثال ہے۔ یہ کامیابی اس کام کے ابتدا کرنے والوں کی بصیرت، پختہ ارادے اور اپنے آپ کو وقف کر دینے کے جذبے کی وجہ سے ممکن ہوئی۔

کیا غریبوں کو قرض دینے سے مسئلہ کی کوئی شکل نکل سکتی ہے؟ کیا غریبوں کو خود اپنے مسائل کو حل کرنے کی ذمہ داری سونپی جا سکتی ہے؟ کیا حرف ناشناسی اور جہل ترقی کے عمل میں شریک ہونے کے لیے سنگین رکاوٹ نہیں ہیں؟

ورکنگ ویمنز فورم (W.W.F) نے جو شہری سلم کی نہایت غریب عورتوں اور بے زمین دیہاتی عورتوں کا ایک ممتاز این جی او ہے، اپنی بامقصد ۱۷ سالہ زندگی کے دوران ان استفسارات کے بڑے تسلی بخش جواب دیے ہیں۔ اس فورم نے مزدور عورتوں کے فوائد کے لیے ایک ایسے متحد عمل کی حکمت عملی کا راستہ سمجھایا ہے جس کے ذریعہ تمام لازمی خدمات کو مربوط کیا جائے۔ کیوں کہ اس طرح کے مثبت اقدام سے مطلوبہ سماجی تبدیلیوں کو بڑھاوا ملے گا اور جب ہم اس کے نتیجے میں کل ترقی کا جائزہ لیں، خاص طور سے ملک کے جنوبی اور مغربی حصے کا، تو ہمیں ترقی کے عوامل کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے یعنی ہم یہ دیکھیں کہ پیداوار مساوی تقسیم کے ساتھ ہے کہ نہیں۔ کوئی بہتری پیدا ہوئی ہے تو اس سے زندگی کی کیفیت (QUALITY) بھی بڑھی کہ نہیں اور عوامی سطح پر مزدوروں کا اتحاد عمل قائم ہوا کہ نہیں۔

ورکنگ ویمنز فورم (W.W.F) نے اپنے قیام کے آغاز سے ہی ۱۹۷۸ء میں مزدور عورتوں کو روزگار دلانے کے لیے بڑے استقلال کے ساتھ جد و جہد کی ہے۔ اس نے مختلف ٹریڈوں کی تنظیم میں ان کی اعانت کی اور ان کی زندگی کے معیار اور ان کے کام کی حالت کو بہتر بنایا۔ اس فورم نے مزدور عورتوں کی نازک وقت کی ضروریات کے لیے بھی مدد کی۔ جیسے قرض دلانا، کام دلانا اور دوسرے کام۔ اس نے ان کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کے عمیق پروگرام بھی چلائے تاکہ انھیں بازپیدائشی حقوق کی آگاہی ہو۔ وہ صحت کا تحفظ کرسکیں اور ان کا تخلیقاتی معاشی کردار مضبوط ہو۔

غیر رسمی سیکٹر میں مزدور عورتیں

ہمارے ملک میں ۸۹ فی صد مزدور عورتیں غیر رسمی سیکٹر میں لگی ہوئی ہیں۔ لہٰذا انھیں کچھ کام کرنے کے لیے غیر رسمی طور پر قرض دیے جانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے بیشتر عورتیں ناخواندہ یا نیم خواندہ طبقے کی ہوتی ہیں۔ چوں کہ ان کے پاس کوئی اثاثہ نہیں ہوتا اور وہ لاچاری، ناخواندگی اور لاعلمی کا شکار ہوتی ہیں اس لیے بآسانی یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ وہ اپنے حالات کو بہتر بنانے کی تنظیمی صلاحیت سے عاری ہیں۔ انجام کار انھیں مستقل قرضداری کے عالم میں ہاتھ پاؤں مارنے پڑتے ہیں۔ مزدور عورتوں کے فورم (W.W.F) کے وجود میں آنے کی وجہ سے ان کی زندگی کا ویران منظر بدل گیا۔ کیوں کہ انھوں نے اس فورم کے ذریعہ اپنے آپ کو منظم کیا۔ خود انتظامی اور خود مددگاری کے عمل سے ان کی رسائی قرضوں تک ہوئی اور ان قرضوں کی حصولیابی سے یہ ممکن ہوا کہ وہ اپنے پیداواری کاموں کو پورا کرسکیں۔

> فورم کے اوّلین آغاز کاروں نے قرضوں کو سماجی تبدیلی کا ایک موثر آلۂ کار سمجھ کر اس پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اس طرح کاروبار کرنے والی عورتوں کو قرضوں کی سہولت سے بہت راحت ملی۔ وہ قرض دینے والے ساہوکاروں اور دلالوں کے پنجۂ ستم سے آزاد ہو گئیں۔ فورم نے اپنے ممبروں کی اجتماعی پیداواری قوت سے فائدہ اٹھا کر بینک کاری کا ایک غیر رسمی نظام قائم کیا۔ اسے چلانا آسان تھا اور یہ ان کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے ایک نئی حکمت عملی تھی۔

گندی بستیوں اور دیہی علاقوں کی رہائش، خط غربی سے کم آمدنی، مضر صحت ماحول، صنفی امتیاز، خاندانی جارحیت، دوزوجیت، ذات، مذہب اور نسلی جبر وغیرہ اذیت ناک حالات کی موجودگی میں عورتوں نے اس فورم کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا۔ چناں چہ چھوٹی بڑی عمر کی سبھی عورتیں بغیر کسی استثنٰی کے بڑی تعداد میں فورم میں داخل ہو گئیں اور انھوں نے زندگی کے یکساں مواقع حاصل کرنے کے لیے لڑنے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے علاوہ اس فورم نے اپنی جانب سے ایک بالکل نئے

سماجی نظام کی ہے جس کے ذریعہ غریب عورتوں کو بھی سماجی شراکت کے مواقع حاصل ہوں گے بلکہ اس میں ان کی تعداد کو بھی بڑھایا جائے گا۔

قرضہ جات کی مدد

فورم کے اوّلین آغاز کاروں نے قرضوں کو سماجی تبدیلی کا ایک موثر آلۂ کار سمجھ کر اس پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اس طرح کاروباری عورتوں کو قرض کی سہولت سے بہت راحت ملی۔ وہ قرض دینے والے ساہوکاروں اور دلّالوں کے پنجۂ ستم سے آزاد ہو گئیں۔ فورم نے اپنے ممبروں کی اجتماعی بیداری مغزی سے لے کر بینک کاری کا ایک غیر رسمی نظام قائم کیا۔ اسے چلانا آسان تھا اور یہ ان کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے ایک نئی حکمت عملی تھی۔

اس کے بعد ورکنگ ویمنز کوآپریٹو کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ جواب انڈین کوآپریٹو نیٹ ورک فار ویمنز کہلاتے ہیں۔ ان کو ۱۹۸۱ء سے آگے کے لیے ایک الگ قانونی شکل کے تحت ترقی دی گئی۔ ان بینک یونٹوں کی کارکردگی اور ان کا تعیلی حجم دیکھ کر انتظام کی تعریف کی جائے گی اور اس کا سہرا یقیناً کارکنوں کے سر جائے گا جنھوں نے قرضوں کی وصولی کی درکو ۹۵ فی صد تک پہنچا دیا۔

کاموں کی توسیع

فورم اور کوآپریٹو بینکوں نے ۱۹۹۴ء تک ورکروں کی درج ذیل تعداد کا احاطہ کر لیا تھا۔ مدراس شہر اور اس کی پٹی کے علاقے میں ۱۷ ہزار پھیری لگانے والی عورتیں۔ آدی راما پٹینم میں ۳۱ ہزار ماہی گیر عورتیں، ویلور میں ۲۳ ہزار بیڑی بنانے والیاں، ڈنڈاگل کے دیہی بازاروں میں ۲۸ ہزار مزدور عورتیں، کانچی پورم میں ۱۶ ہزار بنکر عورتیں اور دھرما پوری میں ۴ ہزار ہینڈلوم بنکر اور غیر زرعی مزدور عورتیں۔ انھوں نے جن دوسرے اور ورکروں کو شامل کیا وہ یہ ہیں۔ نرسا پور (مغربی گوداوری) میں تقریباً ۵۶ ہزار گوٹا کناری بنانے والیاں، پوربی گوداوری ضلع میں ۱۵ ہزار ممبر اور بھیمادرم اور پالاکول میں ۱۸ ہزار ممبر۔ بیدر میں ۷ ہزار ممبر اور چنا پٹنا میں ۷ ہزار ممبروں کو شامل کیا گیا۔ اس طرح تینوں جنوبی ریاستوں تامل ناڈو، آندھرا پردیش اور کرناٹک میں فورم کے ممبروں کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی۔

کوآپریٹو یونٹ چوں کہ غریب عورتوں کو قرض دینے والے ماڈل ادارے کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اس لیے کسی بھی سیاق میں ان کی گونج سنائی دے گی۔ حال میں اڑیسہ کی قبائلی پٹی میں جو شراکت داری (پارٹنرشپ) پروگرام کیا گیا ہے، اس نے اپنے دائرہ عمل کے ضلعوں میں کافی کام کی رفتار پکڑ لی ہے۔

مزدور عورتوں کا فورم اب ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ کیوں کہ اس میں ممبروں اور گروپوں کا برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لیے ہر منظم گروپ کا لیڈر (رہنما) خود بخود مجلس انتظامیہ کا ممبر ہو جاتا ہے۔ چوں کہ ممبروں کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہیں، اس لیے فورم نے اس بات کا خود ہی اندازہ کر لیا کہ اس تیز رفتاری سے بڑھنے والے ادارے کو تعداد کے بے قابو ہونے سے پہلے اپنی کارگزاری کو برقرار رکھنے کے لیے محتاط رہنا چاہیے۔ لہٰذا رہنمائی کی تربیت کے پروگراموں میں عورتوں کو تربیت کے دوران تنظیمی طریق کار سکھانے پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ تاکہ وہ مختلف سطحوں پر انتظام کو سنبھال سکیں۔

مزدور عورتوں کے فورم/انڈین کوآپریٹو نیٹ ورک فار ویمن کے اندر عورتوں نے غریبوں کو قرضہ دلانے کے تجربے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے۔ زمین سے محرومی اور دیگر پیداواری وسائل نہ ہونے کے باعث غریبوں کو معاشی طاقت حاصل کرنے میں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ قرضہ ہی ہے۔ انڈین کوآپریٹو نیٹ ورک فار ویمن میں غریب عورتوں کو قرض کی فراہمی اب ادارہ کا ایک آسان میکنکی عمل بن گیا ہے۔ کیوں کہ یہ اپنے ہی انتظامی عمل میں اپنے آپ کو مدد پہنچانا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عمل سے انڈین کوآپریٹو نیٹ ورک فار ویمن (ICNW) غیر معمولی طور پر بڑھ گیا۔ ۱۹۹۴ء تک اس کی تعداد تقریباً ۱۳ لاکھ عورتوں تک پہنچ گئی اور غریب قرض داروں سے ۹۵ فی صد سے بھی زیادہ قرضے کی وصولی ہوئی جو ایک ریکارڈ ہے۔ ایسی خود انتظام حکمت عملیوں سے غریب عورتوں کا ساہوکاروں اور دلّالوں پر انحصار کم ہو گیا۔ بالآخر اپنے کاروبار کی ترقی کے لیے انھیں بازار کے دباؤ سے نجات ملی۔

فیلڈ کریڈٹ پالیسی

قرضہ جات کے پھیلاؤ میں آئی۔ سی۔ این۔ ڈبلیو کی کامیابیاں اسکیل، خوبی انتظام اور عوامی سطح پر پڑنے والے اثرات کے لحاظ سے مکمل طور پر FIELD ORIENTED ہیں۔ شہری گندی بستیوں اور دیہی علاقوں کے پاس کے آئی۔ سی۔ این۔ ڈبلیو کے انتظام میں رہنماؤں اور تنظیم کاروں کے کردار کو گھٹا کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ان لوگوں نے قرض حاصل کرنے کی راہ میں اطلاعاتی نظام کو کافی مستحکم کر دیا ہے یعنی پرچار اور اس کا فیڈبیک دونوں ترقی یافتہ ہیں۔ یہ عمل قرض کے امیدوار، تنظیم کار، برانچ اور صدر دفتر کے لامرکزی عمل سے ہو کر گزرتا اور لوٹتا ہے۔ اس طرح اس سے قرضوں کی وصولی اور پھر قرض کے دوسرے امیدواروں میں اس کی تقسیم کا دائرہ باضابطہ ہو جاتا ہے۔ جب قرضہ کی ادائیگی میں ۱۵ دن کی تاخیر ہو جاتی ہے تو بینک کا اسٹاف فیلڈ سطح کے تنظیم کاروں کو ہوشیار کر دیتا ہے۔ وہ اپنی ہفتہ واری میٹنگوں میں گروپ کے رہنماؤں اور ممبروں سے فوراً ہی تال میل شروع کر دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں بہت اچھی وصولی ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ تمام کے تمام قرضے بروقت ادا ہو گئے ہوں۔ کچھ کیس عدم ادائیگی کے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کارروائی کے اور طریق کار سے عدم ادائیگی استثنا کے طور پر کم ہو جاتی ہے۔ بہت سی رہنما عورتوں نے قابل تعریف ذمہ داری قبول کی اور اپنے پڑوس کے باقی دار (DEFAULTING) ممبروں پر ان کے شناسا لوگوں کا

کرناٹک کے بیدر ضلع اور تامل ناڈو کے دھرماپوری ضلع میں ڈبلیو ڈبلیو ایف نے واضح وجوہات کی بنا پر ۱۹۹۳ء میں اپنی دو برانچیں کھولی تھیں۔ ان دونوں ضلعوں میں لڑکیوں پر جو ظلم و جبر ہو رہا ہے اس نے اس تنظیم کو اپنی حمایت پر آمادہ کیا۔ لہٰذا اس نے عورتوں اور لڑکیوں کی ماؤں کو ہر لڑکیوں کی اہمیت سمجھانے کی کوشش کی۔

دباؤ ڈلوا کر قرض کی وصولی کرائی۔

بچت رقوم کی فراہمی کے کام کی بھی قرض لینے والوں کو ترغیب دی گئی۔ کوآپریٹو سوسائٹیوں میں ان کے بچت کھاتے کھلوائے گئے۔ کسی سوسائٹی سے قرض لینے کی شرط یہ رکھی کہ دس فی صد کی رقم کے حصص (شیئر) لے کر اس سے دس گنی رقم کا قرض لیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا قرض دینے والی سوسائٹی کا شیئر ہولڈر (حصص دار) بننے سے پہلے یہ شرط پوری کرنی پڑتی ہے۔

گروپ بیمہ

آئی۔سی۔این۔ڈبلیو کی جدید کاوشوں میں سے ایک غیر منظم سیکٹر کی مزدور عورتوں کے لیے گروپ انشورنس کا پروگرام تھا۔ یہ پروگرام لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا کے ذریعہ ۲۵ سے ۵۵ سال تک کی عمر کی عورتوں کے لیے ہے۔ اس کا پریمیم آئی۔سی۔این۔ڈبلیو کے بچت منصوبے کے ذریعہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ کریڈٹ کوآپریٹو کی تمام برانچوں میں پریمیم کے جمع کرنے اور اس کی بازادائیگی دونوں کام ہوتے ہیں۔ کسی ممبر کے فوت ہو جانے کی صورت میں متوفی کے کنبے کے کسی قریبی وارث کو ۵ ہزار کی رقم یا جو رقم بنتی ہو دے دی جاتی ہے۔ تقریباً ۲۵۰ ممبروں کے کنبے بیمہ پروگرام سے مستفید ہو رہے ہیں۔

ٹریننگ (تربیت) پروگرام

ڈبلیو ڈبلیو ایف (WORKING WOMENS FORUM) کی مذکورہ بالا توسیع کی وجہ سے تنظیم کاروں کی ٹریننگ کو بھی اولیت دی گئی۔ کیونکہ انھیں یونین کاری کے عمل سے واقف ہونا ہے اور غریبوں کے علاقوں میں ترقی کے معاملات سے بھی انھیں زود آگہی ہونی ضروری ہے۔ ۱۹۸۸ء میں دیہی علاقوں کے ممبروں، رہنماؤں اور تنظیم کاروں کی ٹریننگ پر توجہ مرکوز کی گئی تھی۔ اس ٹریننگ کا خاص مقصد عوامی سطح کے رہنماؤں کو اس بات کی واقفیت بہم پہنچانا تھا کہ کن تکنیک کے ذریعہ گروپوں کی تشکیل کی جائے اور کن حکمت عملیوں سے پریشر گروپ (دباؤ ڈالنے والا دستہ) بن کر طاقت رکھنے والے ساختوں (POWER STRUCTURE) سے مقابلہ کیا جائے۔ آئی۔سی۔این۔ڈبلیو میں ہر سال ۵۰۲ سو سے زیادہ عورتیں رہنمائی (لیڈرشپ) اور ORIENTATION (شناخت رخ) کی ٹریننگ حاصل کرتی ہیں۔

لڑکیوں کا تحفظ

کرناٹک کے بلیری ضلع اور تامل ناڈو کے دھرماپوری ضلع میں ڈبلیو ڈبلیو ایف نے واضح وجوہات کی بنا پر ۱۹۹۳ء میں اپنی دو برانچیں کھولی تھیں۔ ان دونوں ضلعوں میں لڑکیوں پر جو ظلم و جبر ہو رہا ہے اس نے اس تنظیم کو اپنی حمایت پر آمادہ کیا۔ لہٰذا اس نے عورتوں اور لڑکیوں کی ماؤں کو لڑکیوں کی اہمیت سمجھانے کی کوشش کی۔

بلیری ضلع میں دیوداسی رسم کا مسئلہ ہے۔ یہاں لڑکیوں کو الما مندر کی سیوا کے لیے نذر کیا جاتا ہے۔ بعد میں وہ استحصال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ دھرماپوری میں لڑکیوں کی ایک بہت بڑی

ڈبلیو ڈبلیو ایف جنوبی ایشیا کے ممالک مثلاً نیپال، بنگلہ دیش، پاکستان، سری لنکا اور مالدیپ کے دیگر گروپوں کو بھی ٹریننگ دینے اور ان کو شناخت رخ (ORIENTATION) پروگرام مہیا کرنے میں پیش پیش رہا ہے۔ افریقہ، لاطینی امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے حصوں کے گروپ بھی ڈبلیو ڈبلیو ایف کے ORIENTATION پروگرام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

تعداد بچہ موت اور اسقاط حمل کا شکار ہو جاتی ہیں۔

ان لڑکیوں کی قسمت کا فیصلہ یہاں کے رسم و رواج دنیا میں آنے سے بہت پہلے کر دیتے ہیں۔ لہٰذا غریب عورتوں کو تعلیم دینے اور ان کی مدد کرنے کے لیے کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔ تاکہ تعلیم کے علاوہ وہ روزگار بھی حاصل کر سکیں۔ بلیری ضلع میں تقریباً ۴۶۸۹ عورتوں کو قرضے دیے گئے اور دھرماپوری ضلع میں روزگار بڑھانے کے لیے بینک ۵،۵۰۰ عورتوں کو قرض دلائے گئے۔ یہ پروگرام کناڈین انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ایجنسی اور آسٹریلیا کی اعانت سے چلایا جا رہا ہے۔ حالاں کہ ڈبلیو۔ڈبلیو۔ایف کو قرض سوسائٹی کے طور پر ترقی دی گئی تھی۔ تاکہ وہ تامل ناڈو میں غریب، مجبور اور بے سہارا عورتوں کو امداد دے سکے۔ مگر بعد میں اس تنظیم نے دوسری اور چیزیں بھی اپنی ٹریننگ میں شامل کر لیں۔ مثال کے طور پر کرناٹک اور آندھرا پردیش میں یونین کاری کے عمل کے ساتھ خاندانی منصوبہ بندی، بچہ مزدور بحالی اور پیشہ مراکز کو بھی شروع کر دیا گیا۔

اپریل ۱۹۸۹ء میں پنج سالہ خاندانی منصوبہ بندی کو جسے مرکزی حکومت چلا رہی تھی ختم کر دیا گیا۔ اس پروجیکٹ نے آبادی کنٹرول کرنے میں کافی وسیع نتائج حاصل کیے تھے۔ اس کے تحت ۱۲ فی صد جوڑا تحفظ شرح رہی۔ چناں چہ اس کام کو سراہتے ہوئے، اپریل ۱۹۹۰ء میں اس پروجیکٹ کے تیسرے دور میں حکومت ہند، آئی ایل او اور یو این ایف پی اے تینوں ہی اسے چلانے کے لیے آگے آئے۔ ان کی مشترکہ کوشش یہ ہے کہ ۲۰۰۰ء تک ۶۰ فی صد جوڑا تحفظ شرح کا نشانہ پورا ہو جائے۔ غریب عوام کو اسپتال اور صحت مراکز دونوں جگہ اس فورم کے کمیونٹی ہیلتھ ورکروں کے ذریعہ زچگی، تولید اور طفل صحت رعایات مہیا کی جاتی ہیں۔

بچہ مزدور بحالی مراکز

غریب تر طبقوں کے بہت سے کنبوں میں ایک دوسری لعنت بچہ مزدوری ہے۔ یہ بچے بچپن کی معمولی چیزوں کے استحقاق سے بھی محروم ہیں۔ گویا وہ ۷ سال کی چھوٹی عمر سے ہی کام کرنے کے قابل ہو گئے ہوں۔ ملک میں اس طبقے سے لکھو کھا غریب لڑکے لڑکیاں تعلق رکھتی ہیں۔ چناں چہ ڈبلیو ڈبلیو ایف کے ممبروں کے کنبوں میں بھی اس طرح کے بچوں کا نقش ذہن میں ابھرتا ہے۔ اگر ان کی مرضی معلوم کی جائے تو پتا چلے گا کہ ان میں سے ۹۰ فی صد بچے پڑھنا سیکھنا چاہتے ہیں اور بہت کم کام کرنے کی حامی بھرتے ہیں۔ فورم نے اس مقصد سے کہ تعلیم تک ان بچوں کی رسائی ہو سکے۔ بچہ مزدور بحالی مراکز شروع کر دیے ہیں۔

اسکول چھوڑنے والی نوعمر لڑکیوں کے لیے بھی پیشہ مراکز (کرافٹ سینٹر) کھولے گئے ہیں۔ تاکہ ان کے ذریعہ مہیا کیا جانے والا روزگار ان کے ماں باپ کے لیے محرک ثابت ہو اور یہ لڑکیاں نوعمری کی شادی اور مادریت کے مذموم دائرہ میں پڑنے سے بچ جائیں۔

اثرات

آئی۔سی۔این۔ڈبلیو کے پچھلے دنوں کے قرض پروگرام کے مطالعہ سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ قرضوں کی مدد سے اس کے غریب ممبروں کی زندگی میں برابر ارتقا ہوا ہے۔ درحقیقت کسی طرح کی زمین یا پیداواری اثاثہ نہ ہونے کی وجہ سے صرف قرض نے ہی عورت کی سماجی و معاشی حالت کو بہتر بنایا ہے۔ اس کی وجہ سے عورتیں اس قابل ہوئیں کہ وہ اپنی بڑھتی آمدنی اپنے بچوں کی تعلیم میں لگا سکیں۔ اپنے پچھلے قرضوں کا حساب بے باق کرسکیں اور اپنے کاروبار کے حجم میں اضافہ کرسکیں۔ واقعی بہت سے کنبے عورتوں کے روزگار کے پیسوں سے دو وقت پیٹ بھر کھانا کھا سکے اور انھیں فاقہ کشی اور بھوک سے نجات ملے۔ مطالعات کے دوران بہت سی عورتوں نے بتایا کہ ان کی آمدنی سے ان کے کچے مکان پکے ہو گئے ہیں یا اپنے موجودہ گھر میں انھوں نے ایک کمرہ اور بنالیا ہے اور وہ اب شہری زندگی کا بھی لطف لینے کے لیے خرچ کرنے لگی ہیں۔ کچھ عورتوں نے بڑے جوشیلے انداز میں بتایا کہ انھوں نے اپنے کاروبار کو متنوع کرلیا ہے۔ انھوں نے کچھ اور لوگوں کو بھی ملازم رکھ لیا ہے۔ بلکہ انھوں نے محنت کی بچت کے لیے مشینیں بھی خرید لی ہیں اور اس سے ان کی کاروباری کارکردگی کی صلاحیت بھی بڑھ گئی۔ اس طرح آئی۔سی۔این۔ڈبلیو کا قرض ان کی تمام تر زندگی کی کیفیت میں اضافہ کرنے کے لیے ایک محرک ثابت ہوا اور اس سے مزدور طبقے کی عورتوں کے سماجی حالات بہتر ہوئے۔

دیگر این۔جی۔او کا شناخت رخ

اس کے علاوہ ڈبلیو ڈبلیو ایف جنوبی ایشیا کے ممالک مثلاً نیپال، بنگلہ دیش، پاکستان، سری لنکا اور مالدیپ کے دیگر گروپوں کو بھی ٹریننگ دینے اور ان کو شناخت رخ (ORIENTATION) پروگرام مہیا کرنے میں منہمک رہا ہے۔ افریقہ، لاطینی امریکہ اور جنوبی یورپی ایشیا کے دوسرے حصوں کے گروپوں نے بھی ڈبلیو ڈبلیو ایف کے ORIENTATION پروگرام سے فائدہ اٹھایا ہے۔

آندھرا پردیش کے ڈبلیو ڈبلیو ایف کے کارکنوں سے مستقل تجارتی بینکوں کے افسران اور مواضعاتی DWACRA عہدیداروں (مکھیہ سیوکا اور گرام سیوکا) نے بھی ORIENTATION TRAINING حاصل کی ہے۔ یونیسیف، آئی ایل او، یو این ڈی پی اور مرکزی حکومت کے مالی ذرائع سے چلنے والے پروگراموں نے بھی ڈبلیو ڈبلیو ایف شناخت رخ (ORIENTATION) پروگرام سے فائدہ اٹھایا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کا ٹریننگ پروگرام عورتوں کے لیے ایک امدادی پروگرام ہے۔ اس سے عورتوں کو قرض پروگرام کے مطلوبہ توازن تک پہنچنے میں مدد ملے گی۔

ڈبلیو ڈبلیو ایف نے اپنا اثر و رسوخ ثابت کرنے کے لیے عوامی تنظیموں کے ساتھ نیٹ ورک کا بھی آغاز کیا ہے۔ یہ کام جنوبی ایشیا کے علاقے میں اندرونی اور بیرونی طور پر اور پوری دنیا میں پھیلایا جائے گا۔ یہ گروٹس انٹرنیشنل (GROOTS INTERNATIONAL) کے بانی ممبروں میں سے ہے۔ گروٹس کینیا میں ۱۹۸۵ء میں این۔جی۔او کے فورم پر تشکیل دیا گیا تھا۔ گروٹس کم آمدنی والی عورتوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں شمولیت چاہتا ہے جس سے ان کے طبقوں کی ترقی ہو سکے۔ وہ کم آمدنی والی عورتوں کی ضرورت اور قابلیت کو فوکس کرتا ہے تاکہ ان کی طرف بین اقوامی اداروں کی توجہ کھینچے، سرحدوں کے پار براہ راست نیٹ ورک کے ذریعہ وہ ان عورتوں کے لیے مواقعات بڑھاتا ہے، وہ طریق عمل (ACTION METHOD) اور پروگرام نمونوں (PROGRAMME MODELS) کو عالمی سیاق میں ان کے اندر حصہ لینے اور انھیں دوبارہ تیار کرنے کے لیے ترقی دیتا ہے اور ان کی پہچان کراتا ہے جیسے کہ ڈبلیو ڈبلیو ایف کے پروگرام۔ اس طرح کی کوششیں کچھ سال پہلے تک الگ تھلگ تجربات کی صورت میں تھیں۔ لیکن آج این جی او ماڈلے (نمونے) ہیں جنھوں نے عورتوں کی اجتماعی نقل پذیری (MOVEMENT) کو عمل ترقی کا قوی تر حصہ بنادیا ہے۔

اس طرح فورم کے غریب طبقے کی عورتوں کے تجربے نے اس کی ترقی ماڈل کے سلسلے میں خاص پہچان بنائی ہے۔ وہ یہ کہ اگر کم قیمت ڈیلیوری کا میکانکی عمل بہت بڑی تعداد تک پہنچ جائے تو یہ بذات خود ایک متبادل ترقی نمونہ ہو جاتا ہے۔ روزگار کے انتظام کا اختیار مل جانا ایک بڑی کامیابی ہے۔ اس سے عورتوں کی اجتماعی نقل پذیری ہوگی اور یہ مالی ترقی کے سوا آگے بڑھنے میں مدد دے گا۔ ڈبلیو ڈبلیو ایف کے مزدور عورتوں کی فراہمی کے تجربے نے اس بات کا موثر طور پر مظاہرہ کردیا ہے کہ نئے سماجی عمل کے لیے مزدور طبقے کی جدوجہد اور تحریکوں کی نئی شکلیں ممکن ہی نہیں بلکہ ان کو پھر سے لازمی طور پر دہرایا جانا چاہیے۔ ●

قلم کار حضرات سے

گزارش ہے کہ

(۱) مضامین/دیگر تصانیف جو یوجنا کو ارسال کریں انھیں کہیں اور چھپنے کے لیے قطعاً نہ بھیجیں۔

(۲) ہر مضمون کے آخر میں طبع زاد/غیر مطبوعہ لکھ کر اپنا دستخط، نام اور پتا ضرور درج کریں۔

(۳) مضمون کی اصل ہمیں ارسال کریں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۴) مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کریں۔

(۵) مضامین میں جو اقوال (QUOTATIONS) استعمال کیے گئے ہوں، ان کے سورس کا حوالہ دینا لازمی ہے۔

(۶) جواب طلب امور کے لیے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں۔

(ادارہ)

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔ کے۔ بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی
سب ایڈیٹر : ڈاکٹر توحید خان

فون : 677591

تزئین و کتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : جتندر سنگھ

جلد : ۱۵ شمارہ : ۱۱
فروری ۱۹۹۶ء (۱۲ماگھ تا ۱۰ پھاگن شک ۱۹۱۷)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے
زرسالانہ : ایک سال کے لیے ۵۰ روپے
(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)
زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:
بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن انچارج : کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق
خط کتابت کا پتا :
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴، لیول ۷، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"
منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

ڈاکٹر (کرنل) کے۔ایل۔چوپڑہ

غریبوں کی صحت کی دیکھ بھال:
رضاکارانہ کوششوں کی ضرورت

زیر نظر مضمون میں مصنف نے حالیہ برسوں میں دل کے دورے، کینسر اور ایڈس جیسی مہلک بیماریوں کے واقع ہونے کی شرح میں تشویشناک اضافے پر اپنی فکرمندی ظاہر کرتے ہوئے تدارکی اقدامات اور عوام میں بیداری پیدا کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ مصنف کے خیال میں تمباکو جس کا استعمال ملک میں وسیع پیمانے پر کیا جاتا ہے صحت انسانی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے لیکن اس کا تدارک کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ کے ہر عہد کو اپنے فنون، موسیقی اور ثقافت کے لیے یاد کیا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اگر ہم بیدار نہ ہوئے اور ہم نے صحیح سمت میں موزوں اقدامات نہ کیے تو مستقبل میں ہمارا عہد ہارٹ اٹیک، کینسر، ایڈس اور دہشت گردی کے لیے جانا جائے گا۔

ہارٹ اٹیک، کینسر اور ایڈس کو روکنے کے لیے تاحال کوئی ٹیکہ ایجاد نہیں ہوا ہے۔ جیسا کہ سبھی جانتے ہیں، یہ بیماریاں جان لیوا ہیں لیکن ضروری احتیاط برت کر انھیں بڑی حد تک روکا جاسکتا ہے۔

منصوبہ بندی کمیشن کے زیر اہتمام نیشنل کونسل آف اپلائڈ اکنامکس ریسرچ کے ایک حالیہ سروے کے مطابق کسی بھی وقت تپ دق کے زیر علاج مریضوں کی تعداد ۳۸ لاکھ ہوسکتی ہے اور ہوسکتا ہے کہ کل مریضوں کی تعداد اس سے دگنی ہو لیکن ہر سال تپ دق کے ۱۵ لاکھ کیسوں کا پتا لگتا ہے۔ سروے سے معلوم ہوا کہ ۵۵ لاکھ لوگ ہائی بلڈ پریشر اور مزید ۳۵ لاکھ امراض قلب میں مبتلا ہیں۔ سروے کے مطابق دست، زکام اور بخار جیسی مختصر مدتی بیماریوں کے مریضوں کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی۔ ۱۰۰۰ میں ۱۷ افراد بخار میں اور ۱۰۰۰ میں سے ۱۳ دستوں

کی بیماری میں مبتلا پائے گئے۔ ملک کی آبادی ۱۴۲ بلین روپے صحت کی دیکھ بھال پر خرچ کرتی ہے۔ غریب طبقہ اپنی آمدنی کا کافی زیادہ حصہ صحت کی دیکھ بھال پر صرف کررہا تھا۔ غریب لوگ اپنی آمدنی کا ۸ فی صد، درمیانی آمدنی والے لوگ ۴ فی صد اور امیر لوگ صرف دو تین فی صد صحت کی دیکھ بھال پر خرچ کرتے ہیں۔ مختصر مدت کی ہر بیماری پر ایک گھرانے کا خرچ ۱۰۸ روپے کے لگ بھگ ہے۔ سروے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چار سال سے کم عمر کے بچوں کی جسمانی نشو و نما ناقص یا ناکافی تغذیہ کے سبب نا درست تھی۔

صحت کو نقصان پہنچانے والے عناصر غریب طبقے پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں پھر ہم غریبوں کے لیے صحت کی مناسب دیکھ بھال کے لیے کیا کرسکتے ہیں؟ اس سوال پر فوراً دھیان دینے اور ضروری اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

ملیریا

ملیریا گرم ممالک میں ہونے والی خوفناک ترین بیماریوں میں سے ایک ہے۔ یہ بیماری تیزی سے پھیل رہی ہے۔ ہندوستان میں ہر سال ملیریا کے لاکھوں کیس ہوتے ہیں۔ راجستھان اور ہندوستان کے مشرقی علاقوں سے فیلسی پیرم ملیریا سے سیکڑوں اموات ہونے کی خبر ملی ہے۔

تپ دق اور ایڈس

تپ دق کی وبا بھی ہمارے ملک میں کافی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو آنے والی نسلیں اس دہائی کو ایک ایسی دہائی کے طور پر یاد کریں گی جس میں انسان نے مہلک بیکٹیریا کو ہوا میں پھیلنے اور دواؤں سے بے اثر ہونے دیا اور نہ صرف ملک میں بلکہ دنیا بھر میں اسے لاعلاج صورت اختیار کرنے دیا۔ تپ دق کا مرض تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس سے لڑنے اور آئندہ دس برس کے دوران لاکھوں اموات کو روکنے کے لیے ایک جنگی منصوبہ بنانا ہوگا۔

عالمی ادارۂ صحت (ڈبلیو ایچ او) کے مطابق ہندوستان میں جہاں عالمی آبادی کا چھٹا حصہ رہتا ہے، ایڈس کا دھماکہ ہونے ہی والا ہے۔ "ہم ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔"

عالمی ادارۂ صحت کے مطابق سال ۱۹۹۴ میں دنیا میں ۵۷ لاکھ لوگوں میں تپ دق اور ایچ آئی وی (ایڈس وائرس) دونوں ہی کے جراثیم داخل ہوئے۔ غالب امکان ہے کہ موجودہ صدی کے

اختتام تک ایچ آئی وی سے متاثرہ افراد کی موت کی سب سے بڑی وجہ تپ دق کی بیماری ہوگی۔ اگر تپ دق کے کیسوں پر مناسب توجہ دی جائے تو مستقبل میں ایڈس کے مریضوں کی صحت کی دیکھ بھال کے اخراجات کا تقریباً نصف حصہ بچایا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے بشمول ایشیائی ملکوں میں صورت حال کافی نازک ہے۔ ان ملکوں میں تپ دق کے کل مریضوں کی دو تہائی تعداد پائی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ دونوں وبائیں ایک دوسرے کو بڑھاوا دیتی ہیں تاہم یہ دونوں الگ مسئلے ہیں۔ لہٰذا ان بیماریوں سے لڑنے کے لیے ہمیں مختلف ہتھیار استعمال کرنے ہوں گے۔ ایڈس کے معاملے میں لوگوں کے جنسی طرز عمل کو بدلنے اور بچاؤ کا ٹیکہ اور علاج نکالنے کے لیے تحقیق پر زور دینا ہوگا۔ جہاں تک تپ دق کا تعلق ہے اس کا موثر اور کم خرچ علاج پہلے ہی سے موجود ہے۔ اب علاج معالجہ کے بہتر پروگراموں پر زور دینا چاہیے۔

ایڈس ایک عالمی مسئلہ ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کا اندازہ ہے کہ ۱۹۹۴ء میں دنیا میں ایک کروڑ چالیس لاکھ "سیرو پوزیٹو" (ہیومن امیونو ڈیفی سینسی وائرس ایچ آئی وی پوزیٹو) افراد تھے۔ ان میں سے چھ لاکھ بچے تھے، ۲۶ لاکھ افراد اس تباہ کن بیماری کے پنجے میں گرفتار تھے ہندوستان میں پوزیٹو مریضوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ تجارتی جنسی ورکروں میں یہ تعداد سب سے زیادہ ہے اور ان سے یہ بیماری عام پبلک میں تیزی سے پھیلتی جارہی ہے۔

اس پھیلاؤ کی وجہ لاعلمی اور تعلیم کی کمی ہے ہم سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ تاریخ انسانی میں اس بیماری کا ثانی نہیں ہے۔ اس سے پہلے کسی اور بیماری سے نوع انسانی کے لیے اتنا بڑا خطرہ نہیں پیدا ہوا۔ پھر بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے ہمیں بصیرت اور دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے ایڈس کے عظیم خطرے کو محسوس کرنا اور اس کے چیلنج کو قبول کرنا چاہیے۔ ہمارے سماج کے تمام لوگوں کو مل کر اس کے تدارک کی راہیں تلاش کرنی چاہئیں۔ ایڈس بنیادی طور پر ایک ایسی بیماری ہے جو غیر محتاط جنسی اختلاط سے پھیلتی ہے۔ ازدواجی زندگی کے باہر جنسی اختلاط سے احتراز کرنا چاہیے اور بوقت ضرورت کنڈوم استعمال کرنا چاہیے۔

تمباکو نوشی خطرناک عادت

تمباکو پینا اور کھانا صحت کے لیے ایک ایسا خطرہ ہے جس سے بخوبی بچا جاسکتا ہے۔ یہ بری عادت ہارٹ اٹیک اور کینسر کے امکانات میں اضافہ کرتی ہے۔ تیس چالیس سگریٹ پینے والے لوگوں میں ہارٹ اٹیک دس گنا زیادہ ہوتا ہے۔ جو لوگ پانچ سے دس سگریٹ روزانہ پیتے ہیں ان میں یہ خطرہ دوگنا زیادہ ہوتا ہے۔ دل کے دورے کی بہت سی پیچیدگیاں تمباکو نوشی ہی سے پیدا ہوتی ہیں جن کی وجہ سے اکثر لوگوں کی موت ہو جاتی ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے ماہر امراض و اعداد و شمار پروفیسر رچرڈ پیٹو کا کہنا ہے کہ اکثر لوگ تمباکو نوشی اور بیماری کی اہمیت کو صحیح طور پر اس لیے نہیں سمجھ پاتے کہ عادت کے شروع ہونے

ہارٹ اٹیک، [illegible]
نہیں ہوا ہے۔ [illegible]
لیکن [illegible]

اور ہارٹ اٹیک، کینسر، گیسٹرک السر اور کہنہ برانکائٹس جیسی مہلک بیماریوں کے نمودار ہونے کے درمیان سالوں کا فرق الگ الگ بیماری کے لیے الگ الگ ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عہد حاضر میں دنیا میں جتنے حادثات ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں تمباکو نوشی سے ہونے والی اموات ۵۰ گنا زیادہ ہوتی ہیں۔ ... اتمباکو نوشوں میں سے نصف تعداد ہارٹ اٹیک یا کینسر سے مرتی ہے دنیا میں ہر منٹ پر چھ اشخاص تمباکو نوشی سے مرتے ہیں۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق ہر سال تقریباً ۳ لاکھ افراد ہندوستان میں تمباکو کے مضر اثرات سے مرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم ٹائم بم پر بیٹھے ہوں۔ ہارٹ اٹیک اور کینسر میں بڑا اضافہ ابھی ہونا باقی ہے۔

لہٰذا ہمیں تمباکو نوشی کے نقصانات سے بچوں کو باخبر کرنا چاہیے لیکن اگر ہم خود سگریٹ پئیں گے تو ہم اپنے بچوں کو کیسے سگریٹ نوشی سے باز رکھ سکتے ہیں۔ سگریٹ نوشی ڈرگس (منشیات) کے استعمال کا دروازہ کھولتی ہے جو ہمارے بچوں کی زندگی اور مستقبل کو تباہ کرسکتی ہیں۔

ہمارے ملک میں حنجرہ کا کینسر عام ہے۔ یہ حد سے زیادہ تمباکو نوشی سے ہوتا ہے۔ تاہم تمباکو یا پان مصالحہ کھانے کی وجہ سے زبان اور منہ کا کینسر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ کینسر سے ہونے والی تمام اموات میں سے ۳۰ فی صد سانس لینے میں رکاوٹ کی پرانی بیماری (کہنہ برانکائٹس) سے ہونے والی اموات میں سے ۸۰ فی صد اور ہارٹ اٹیک سے ہونے والی اموات میں سے ۲۵ فی صد اموات تمباکو نوشی یا تمباکو کھانے یا چبانے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ تمباکو کے استعمال سے پیدا ہونے والا خطرہ ہائی پرٹینشن، ذیابیطیس، جسمانی ورزش کی کمی وغیرہ کے سبب پیدا ہونے والے خطرات میں مزید اضافہ کرتا ہے۔

ہندوستان میں ہر سال تقریباً ۵ ۲ لاکھ لوگ ہارٹ اٹیک سے مرتے ہیں۔ یہ تعداد کینسر سے ہونے والی اموات سے لگ بھگ ڈھائی گنی اور لقوہ اور فالج سے پیدا ہونے والی کمزوری اور معذوری کی وجہ سے ہونے والی اموات سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

بہرحال حقیقت یہی ہے کہ تمباکو نوشی یا تمباکو کا کسی بھی شکل میں استعمال زندگی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے اور یہ خطرہ کینسر، کہنہ برانکائٹس سانس لینے میں رکاوٹ اور پیٹ کے السر جیسی بیماریوں سے زندگی کو لاحق ہونے والے خطروں میں مزید اضافہ کرتا ہے۔

حالیہ مطالعاتی جائزوں سے پتا چلا ہے کہ تمباکو نوشی دل اور پھیپھڑے کو براہ راست نقصان پہنچا سکتی ہے اور بالغوں میں ذیابیطیس کی بیماری پیدا کرسکتی ہے۔ تمباکو دل کی رگوں میں سکڑن اور رکاوٹ پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے ہارٹ اٹیک ہوسکتا ہے۔ یہ جسم کے مختلف حصوں میں

السر کی ایک بڑی وجہ ہے۔ یہ ان بیماریوں سے لڑنے کے لیے انسان کی قوت مدافعت کو بھی کم کرتی ہے۔ اب ہارٹ اٹیک سماج کے مرفع الحال لوگوں ہی تک محدود نہیں ہے کیوں کہ کینسر اور ہارٹ اٹیک کے کافی زیادہ کیس سماج کے کم خوشحال لوگوں اور غریب طبقے میں بھی دیکھے جاتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ تمباکو کا حد سے زیادہ استعمال ہے۔ کہنہ برانکائٹس بھی خرابیٔ صحت اور موت کی ایک بڑی وجہ ہے۔

کرواتی ہیں اور اس طرح امیر اور غریب دونوں ہی خاندانوں کے بچوں اور نوجوانوں کے ذہن کو متاثر کر کے ان میں یہ ہلاکت کن عادت ڈالتی ہیں۔

ہمارے ملک میں بیڑی بہت وسیع پیمانے پر پی جاتی ہے۔ امیر و کبیر" بیڑی بادشاہ" تقریباً ۹۰۰ بلین بیڑیوں کے تیر معصوم دیہاتیوں اور دوسرے غریب لوگوں کے سینوں میں پیوست کرتے ہیں۔ ہر سال ایسے لاکھوں لوگ مرتے ہیں

شرح اونچی ہونے کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔

ہم غریبوں کی صحت کی دیکھ بھال کی بات کرتے ہیں جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تمباکو اور شراب پی پی کر آہستہ آہستہ خود کو مار رہے ہیں۔ یہ دونوں جان لیوا عادتیں برابر بڑھ رہی ہیں اور خاص کر غریب طبقے ان کے جال میں زیادہ پھنس رہے ہیں۔ آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی تا وقتیکہ ہم سب۔ سرکاری افسران، سرکاری ایجنسیاں، ذرائع ابلاغ، اساتذہ، ڈاکٹر اور رضاکار تنظیمیں پوری طرح بیدار ہو کر اس عظیم انسانی المیہ کے خلاف جس کا نام تمباکو ہے تمام مورچوں پر تمام ممکن طریقوں سے جنگ نہ چھیڑ دیں۔

محفوظ پانی اور صفائی ستھرائی کی اہمیت

اس بات پر زور دینے کی ضرور نہیں ہے کہ صحت کی دیکھ بھال میں پینے کے محفوظ ... کافی مقدار میں فراہمی اور صفائی ستھرائی ... ہے کیوں کہ یہ بات سبھی جانتے ہیں۔ لاکھو... محفوظ پانی کافی مقدار میں دستیاب نہیں ... ان کی صفائی ستھرائی کی حالت بھی درست ... ہے سیکڑوں ذاتی صفائی ستھرائی کے لیے پانی کی فراہمی

ایڈس ایک عالمی مسئلہ ہے۔ ہم سب کو معلوم ہونا چاہیے کہ تاریخ انسانی میں اس بیماری کا ثانی نہیں ہے۔ اس سے پہلے کسی اور بیماری سے نوع انسانی کے لیے اتنا بڑا خطرہ نہیں پیدا ہوا۔ پھر بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے ہمیں بصیرت اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ایڈس کے عظیم خطرے کو محسوس کرنا اور اس کے چیلنج کو قبول کرنا چاہیے

تپ دق کا مرض غریبوں کے لیے زیادہ ہلاکت خیز ثابت ہوا ہے کیوں کہ جہاں تمباکو ان کی قوت مدافعت کو کم کرتی ہے وہاں یہ بیماری غریب لوگوں میں پھیلتی بھی زیادہ ہے کیوں کہ ان کا کنبہ چھوٹے چھوٹے مکانوں یا جھگی جھونپڑیوں میں رہتا ہے اور یہ بیماری چھوت سے پھیلتی ہے۔

تمباکو کے استعمال کو بجا طور پر انسان کے لیے سب سے قبیح اور خطرناک عادت کہا جاتا ہے۔ انسان کی زندگی کے لیے یہ سب سے بڑا خطرہ ہے لیکن اس سے بچا جا سکتا ہے۔ اگر ہم تمباکو نوشی ترک کر دیں۔ ہمارے ملک میں یہ عادت وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے۔ سگریٹ اور بیڑی کے دھوئیں میں ۴۰۰۰ سے زیادہ کیمیکل مرکبات ہوتے ہیں جن میں سے بیشتر نقصان دہ ہیں۔ سگریٹ بیڑی کا وہ دھواں جس میں گاڑیوں، بسوں، چھوٹی موٹی فیکٹریوں یا دوسرے بند مقامات میں پاس بیٹھے ہوئے تمباکو نوشی نہ کرنے والے لوگ سانس لیتے ہیں صحت کے لیے اور بھی خراب ہوتا ہے۔

تمباکو بنانے والی کمپنیوں کے پاس روپے کی طاقت ہوتی ہے جب کہ سرکاری ایجنسیوں اور رضاکار تنظیموں کی تمباکو کے خطروں کے خلاف لڑنے کی کوشش اس وقت تک محض علامتی رہی ہے۔ تمباکو کمپنیاں بڑے بڑے کھیل مقابلے اور رسیع

اور کئی گنا خرابیٔ صحت کا شکار بنتے ہیں جس کی وجہ سے وہ روزی کمانے اور اپنے بال بچوں کی پرورش کرنے کے قابل نہیں رہتے۔

کوئی چار برس پہلے ہم نے گوڑگاؤں (ہریانہ)

اندازہ لگایا گیا ہے کہ کینسر سے ہونے والی تمام اموات میں سے ۳۰ فی صد سانس لینے میں دقت کی پرانی بیماری (کہنہ برانکائٹس) سے ہونے والی اموات میں سے ۵۰ فی صد اور ہارٹ اٹیک سے ہونے والی اموات میں سے ۲۵ فی صد اموات تمباکو نوشی یا تمباکو کھانے یا چبانے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ تمباکو کے استعمال سے پیدا ہونے والا خطرہ ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس ... کی وجہ سے پیدا ہونے والے خطرات میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

کے گاؤں میں صحت کی مفت جانچ کا ایک کیمپ لگایا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ لوگوں میں مختلف بیماریوں کے لاحق ہونے کی شرح کافی زیادہ تھی۔ بعد میں ہم پنچایت کے ممبروں سے ملے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ گاؤں میں کتنے لوگ بیڑی سگریٹ پیتے ہیں۔ قدرے توقف کے بعد انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کے کہا" ہر ایک، کیا مرد کیا عورت" یہ جواب سن کر ان میں بیماریاں لاحق ہونے کی

ضروری ہے جس قدر کہ پینے اور کھانا پکانے کے لیے صاف اور محفوظ پانی کی سپلائی ہے۔ مگر دیکھا گیا ہے کہ مختلف مشکلات اور دشواریوں کے سبب بنیادی ضرورت کی یہ اہم چیز ملک کے کئی حصوں میں دستیاب نہیں ہے۔ علاقائی رضاکار تنظیموں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے کہ وہ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

ہماری آبادی کی ایک بڑی تعداد ناخواندہ ہے

کی وجہ سے موثر رابطے اور تبادلۂ خیال، حصول معلومات اور اسے بخوبی سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ ایسے لوگ اپنے گرد و نواح سے آگے کی دنیا نہیں دیکھ سکتے۔ پڑھنا نہ جاننے کی وجہ سے وہ صحت کے بارے میں بنیادی جانکاری اور صحت کو بہتر بنانے کے طریقوں سے باخبر نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ناخواندگی ان کی صحت کو سدھارنے اور ان کا طرز زندگی بہتر بنانے کی راہ میں حائل ہے۔

کام چلاؤ خواندگی پرائمری تعلیم سے مختلف ہوتی ہے۔ اس میں جینے کا ہنر، زندگی کے بارے میں ضروری معلومات اور سماج کے ایک حصے کے طور پر کام کرنے کی اہلیت شامل ہوتی ہے۔ یہ نہ صرف فرد کے مستقبل کے لیے بلکہ خاندان، سماج اور قوم کے مستقبل کے لیے بھی اشد ضروری ہے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی کے آخری اور ۱۹۷۰ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی کوششوں کے نتیجے میں ملک میں شرح پیدائش میں کمی دیکھنے میں آئی تھی مگر بعد میں اس میدان میں کوئی نمایاں پیش رفت مشکل ہو گئی۔ اضافہ آبادی اور آبادی کی نامساوی تقسیم، دیہی علاقوں سے عوام کی ہجرت، تیز رفتار شہر کاری اور ان سب کے ساتھ غریبی ملک کے قدرتی وسائل، خوراک اور پانی کی سپلائی، ماحولیات، صحت کی دیکھ بھال کی خدمات کی دستیابی اور ان خدمات تک رسائی اور قوم کے اقتصادی ڈھانچے پر بری طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ سب سے زیادہ اثر دیہات اور شہروں کے غریبوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں پر پڑا ہے۔ صحتی خدمات ملک بھر میں مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی ضرورتیں پوری نہیں کر سکتیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کی رفتار تیز کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔

ادویات کا غیر دانشمندانہ استعمال

ان دنوں اینٹی بائیوٹک ادویات کا اندھا دھند استعمال ہو رہا ہے۔ اس سے آنتوں کی عام کارکردگی متاثر ہوتی ہے، مریض کی وٹامنوں اور دوسرے تدارکی اور ہاضمہ بڑھانے والے انزائمس کو جزو بدن بنانے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور آگے چل کر ہونے والے انفکشنوں سے مدافعت کی

ان دنوں اینٹی بائیوٹک ادویات کا اندھا دھند استعمال ہو رہا ہے۔ اس سے آنتوں کی عام کارکردگی متاثر ہوتی ہے، مریض کے وٹامنوں اور دوسرے تدارکی اور ہاضمہ بڑھانے والے انزائمس کو جزو بدن بنانے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور آگے چل کر ہونے والے انفکشنوں سے مدافعت کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔

طاقت کم ہو جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص کوئی اینٹی بائیوٹک لیتا ہے وہ مستقبل میں اور بھی زود اثر اور مہلک جراثیم سے انفیکشن کا بیج بوتا ہے۔ نتیجتاً نئے اور زیادہ طاقتور اور زیادہ مہنگے اینٹی بائیوٹک بازار میں آ جاتے ہیں اور یہ چکر چلتا جاتا ہے اندھا دھند اور غیر ضروری طور پر لی جانے والی دواؤں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس کے نتیجے میں ایسی بیماریوں کی فہرست بھی کافی بڑی ہے جو ڈاکٹروں اور غیر ضروری طور پر لی گئی دواؤں کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ کسی بھی بڑے اسپتال میں داخل ہونے والے مریضوں کی ایک تہائی تعداد انہی بیماریوں میں مبتلا ہوتی ہے۔

کینسر سے ہونے والی اموات میں اضافہ ہوا ہے۔ ہمارے ملک میں ہر سال تین لاکھ افراد کینسر سے مرتے ہیں۔ کسی ایک وقت میں کینسر کے ۱۵ لاکھ تشخیص شدہ مریض ہوتے ہیں اور ۵ لاکھ نئے رجسٹرڈ کیس ہوتے ہیں۔ دیگر بہت سے بلا تشخیص مرتے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ہم کینسر اور امراض قلب کے خلاف جنگ میں ہار رہے ہیں باوجود اس کے کہ ملک میں متوقع عمر میں کئی سالوں کا اضافہ ہوا ہے اور میڈیکل اور سرجیکل طریقۂ علاج سے، جو اگرچہ بہت مہنگا ہے اور جسے محض تھوڑے سے خاندان ہی برداشت کر سکتے ہیں، لوگوں کی عمر بڑھی ہے۔

جدید دواؤں سے ہمیں ملیریا جیسی انفیکشن سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا قلع قمع کرنے میں مدد ملی ہے۔ امراض اور شرح اموات میں کافی کمی آئی ہے اور انسان کی اوسط عمر بڑھی ہے۔ سرجری کے طریقوں میں کئی نئی تکنیکوں کے آ جانے اور طبی علاج بہتر ہو جانے سے بہت سی جانیں بچائی گئی ہیں۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ نئی اور اعلا تکنیکوں کی بدولت ہم زندگی کو طویل تر بنا سکتے ہیں۔ زندگی کی کوالٹی بہتر نہیں بنا سکتے۔

جدید طریق علاج کے ڈاکٹروں میں میڈیکل کالجوں میں تربیت کے دوران بیماریوں کے بارے میں دلچسپی پیدا کی جاتی ہے اور وہ تشخیص امراض کے نئے طریقے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان میں صحت برقرار رکھنے کے بارے میں بھی دلچسپی پیدا کی جائے۔ اگر ہم اینٹی بائیوٹکس، کورٹی زون اور کیموتھیراپی والی دواؤں کے اندھا دھند استعمال کو نہیں روکیں گے تو یہ "ہر بیماری کے لیے ایک گولی" کی کہاوت الٹی ہو جائے گی اور "ہر گولی سے ایک بیماری" کی کہاوت میں بدل جائے گی۔ سچ ہے کہ تشخیص امراض کے خرچیلے طریقوں اور سرجری سے

جدید دواؤں سے ہمیں ملیریا جیسی انفیکشن سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا قلع قمع کرنے میں مدد ملی ہے۔ امراض اور شرح اموات میں کافی کمی آئی ہے اور انسان کی اوسط عمر بڑھی ہے۔

مریضوں کو فائدہ ہوا ہے۔ اس کے باوجود مرض کی تاریخ وہی رہتی ہے اور لاکھوں افراد تکلیف، پریشانی اور موت کی طرف بڑھتے رہتے ہیں اور اسپتالوں کے ان ڈور اور آؤٹ ڈور ڈیپارٹمنٹوں میں مریضوں کی بھیڑ بڑھتی جاتی ہے۔ آخر اس کا حل کیا ہے؟ ہم اسی طرح نہیں چل سکتے۔ باہر کی دنیا بھی ایک متبادل طریق علاج کی ضرورت محسوس کرنے لگی ہے۔

آیورویدکی اہمیت

آئیے کچھ ہزار سال پہلے کی طرف لوٹیں اور دیکھیں کہ قدیم ہندوستان کا طریقۂ علاج کیا تھا۔ آیوروید کے لغوی معنی ہیں" زندگی کی سائنس"۔ اس طویل علاج کا سلسلہ ۱۰۰۰ تا ۵۰۰۰ سال قبل مسیح تک دراز ہے۔ آیوروید کی قدیم کلاسیکی کتاب "چرک سنگھتا" لگ بھگ ۵۰۰ سال قبل مسیح میں لکھی گئی تھی۔

آیوروید کا بڑا مقصد صحت مند لوگوں میں صحت کو صحت اور مسرت کے اس عالم تک پہنچانا ہے جس میں بیماری کا نام ونشان نہ ہو۔

"صحت بہبود و بہتری، نیکی، خوشحالی، دولت، خوشی اور نجات کی بنیاد ہے"

(چرک ۹۵۴ : ۴۷)

آیوروید کے چار ابواب ہیں صحت برقرار رکھنا اور صحت کو بہتر بنانا، بیماری کا علاج کرنا اور بیماری کے دوبارہ ہونے کی روک تھام کرنا، اعضائے جسمانی کی قوت کارکردگی کو بحال کرنا اور روحانی خوشی حاصل کرنا۔ آیوروید کا منشا، ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہم بیماری اور بڑھاپے کی مداخلت کے بغیر کیسے اپنی زندگی بنا اور بڑھا سکتے ہیں اور کیسے اس پر کنٹرول رکھ سکتے ہیں۔ دیپک چوپڑہ اپنی کتاب "مکمل صحت" میں لکھتے ہیں کہ آیوروید جسم اول و دماغ، ہوش مندی، ماحول اور طرز عمل کے تمام پہلوؤں پر دھیان دیتا ہے۔ وہ انسان کو مکمل روپ میں دیکھتا ہے اور بیماریوں کو محض جسمانی یا محض نفسیاتی تصور نہیں کرتا۔ اس کے مطابق کوئی بھی بیماری یا تکلیف ساری کی ساری صرف دماغ میں یا ساری کی ساری صرف جسم میں نہیں ہوتی۔ اس لیے کوئی ایسا انداز نظر جو صرف دماغ کو یا صرف جسم کو ہی دیکھتا ہو یا دونوں ہی کو دیکھتا ہو مگر روح کو نظرانداز کرتا ہو، ناکافی ہوگا۔ آیوروید جسم، دماغ، ماحول اور طرز عمل تمام پہلوؤں پر دھیان دیتا ہے۔ وہ ہمارے جسمانی نظام کے عدم توازن پر توجہ دیتا ہے جو بیماری کا سبب ہوتا ہے۔

جدید طریق علاج کے ڈاکٹر ہونے کے ناطے ہمیں اس وقت اپنی ہوشیاری پر مسرت ہوتی ہے جب ہم کسی ایکسرے یا سی ٹی اسکین یا ای سی جی میں کوئی غیر معمولی بات دیکھتے ہیں خاص کر جب وہ اپنی ابتدائی اسٹیج میں ہو۔ لیکن حقیقت میں یہ غیر معمولی بات یا خرابی جس کا ہم پتا لگاتے ہیں کسی ایسے عدم توازن کی آخری شکل کو ظاہر کرتی ہے جو ہمارے جسم میں برسوں سے پنپ رہا ہوتا ہے۔ آیوروید اس عدم توازن کے کسی خفیف سی شکل میں نمودار ہونے سے پہلے ہی توازن بحال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آیوروید یہ کام مختلف طریقوں سے کرتا ہے جن میں طرز عمل، رہن سہن، غذا میں تبدیلی اور جڑی بوٹیوں کا استعمال شامل ہیں۔

جدید طریق علاج میں اینٹی بایوٹک یا کیموتھیراپی کی دواؤں کے استعمال اور مخصوص جراثیم کو ختم کرنے پر زور دیا جاتا ہے جو اگرچہ باہر کی چیز ہوتے ہیں مگر ہمارے جسم میں داخل ہوکر لڑتے ہیں۔ ان دواؤں سے ان کی لڑائی ہمارے حق میں ختم ہوسکتی ہے مگر ہم نہیں جانتے کہ حملہ آور جراثیم نے میدان جنگ کو اس قدر تباہ و برباد کردیا ہے اور اسے اتنا کمزور بنا دیا ہے کہ وہ آگے چل کر جراثیم کی دوسری فوج کے حملے سے خود کو نہیں بچا سکے گا۔

بیماری کی روک تھام اور علاج میں غذا بہت ہی اہم رول ادا کرتی ہے۔ لہٰذا ویجیٹیرین ہونی چاہیے۔ یہ تازہ، ہلکی پھلکی اور زود ہضم ہونی چاہیے اور اوسط مقدار میں کھانی چاہیے یعنی نہ زیادہ نہ کم۔ ایسی غذا ساگ سبزیوں، بھورے چاول، بنا چھنے آٹے، پھلوں اور پھلوں کے رس پر مشتمل ہونی چاہیے۔

غذا

بیماری کی روک تھام اور علاج میں غذا بہت ہی اہم رول ادا کرتی ہے۔ لہٰذا ویجیٹیرین ہونی چاہیے۔ یہ تازہ، ہلکی پھلکی اور زود ہضم ہونی چاہیے اور اوسط مقدار میں کھانی چاہیے یعنی نہ زیادہ نہ کم۔ ایسی غذا ساگ سبزیوں، بھورے چاول، بنا چھنے آٹے، پھلوں اور پھلوں کے رس پر مشتمل ہونی چاہیے۔ یہی "ساتوک" غذا ہے جس کی آیوروید سفارش کرتا ہے۔ بھاری چیزیں نہیں کھانی چاہئیں۔ آیوروید میں ہمارے جسم کی ضرورت کے مطابق غذا تجویز کی جاتی ہے۔ کچھ چیزیں کھانے کی صلاح دی جاتی ہے تو کچھ چیزوں سے پرہیز بتایا جاتا ہے۔ لہٰذا غذا ایک علاج ہے۔ آپ جو کچھ کھاتے ہیں وہی بنتے ہیں۔ اس لیے آیوروید بھاری چیزیں کھانے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔

جڑی بوٹیاں ڈرگس نہیں ہوتیں۔ وہ ہمارے جسم میں ہلکے اشارات داخل کر کے شفا کی راہیں کھولتی ہیں۔ جدید طریق علاج میں بھی جڑی بوٹیاں استعمال کی جاتی ہیں لیکن عام طور پر وہ اس کے فعال جزو کو الگ کر کے کسی خاص بیماری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ آیوروید میں ایسا نہیں ہوتا وہاں تو ساری کی ساری جڑی بوٹی استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں یہ اصول کارفرما ہے کہ جڑی بوٹی کا فعال جزو پودے کے اندر دوسرے اجزاء کے ساتھ مستور ہے۔ اسے الگ کرنے سے نامناسب نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

یہ سبھی طریقے ہمارے جسمانی نظام میں توازن بحال کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہم ان کی بدولت قدرت کے قریب ہوتے ہیں۔ ہمارے اندر بیماریوں سے بچاؤ کی قوت بڑھ جاتی ہے اور ہم عدم توازن اور حملہ آور جراثیم سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ہم اپنی لڑائی خود لڑتے ہیں اور بیماری سے شفا پاتے ہیں۔ ہم سے بہتر ہماری دیکھ بھال کوئی اور نہیں کر سکتا۔

متوازن نظریہ

لیکن ہمیں یہ بھی سمجھنا اور محسوس کرنا چاہیے کہ جدید طریق علاج نے کچھ عظیم کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اس نے لاکھوں قیمتی جانیں بچائی ہیں اور انھیں نئی زندگی دے کر ان کی عمر بڑھائی ہے۔ ہم عوام کو اپنا طرز زندگی بدلنے کی جو سیکھ دے رہے ہیں وہ آیوروید کے اصولوں اور قانون قدرت کے عین مطابق ہے۔ لیکن پھر بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنی عادتیں نہیں بدلیں گے اور اپنے جسم پر ایک نہ ایک طرح سے ظلم کرتے رہیں گے اور

باقی صفحہ ۱۲ پر

خاندانی بہبود اور قومی تعمیر

مصنف کا خیال ہے کہ قومی تعمیر کے کام میں خاندانی بہبود ایک ضرورت بن گئی ہے۔ ہمارا مقصد محدود خاندان کے ذریعہ اضافۂ آبادی پر قابو پاکر سماجی بہبود کو فروغ دینا ہے۔

خاندانی بہبود کا تصور، خاندانی منصوبہ بندی کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع ہے کیوں کہ اس میں صرف خاندان کو محدود رکھنا ہی شامل نہیں ہے بلکہ ماں اور بچے کی صحت وغیرہ کا معاملہ بھی اس سے جڑا ہوا ہے۔ اگر ایک طرف محدود خاندان، کنبے کی بہبود کا باعث بنتا ہے تو دوسری طرف خاندانی بہبود بھی خاندان کو محدود رکھنے کے تصور کو فروغ دے گی۔ اس طرح اگر خاندانی بہبود کے کاموں کو فروغ دیا گیا تو یہ بالآخر قومی تعمیر سے متعلق سرگرمیوں کا ایک اہم وسیلہ ثابت ہوں گے۔ سماج اور ملک کی وسیع تر بہبود کے پیش نظر، انفرادی اور خاندان کی سطح پر مثبت طرز فکر کو فروغ دینا ہوگا۔ ملک اور اس کی ریاستوں میں تاریخی طور پر اور موجودہ اعتبار سے آبادی کا جو منظر نامہ پیش نظر رہا، اس نے شادی شدہ جوڑوں کو، خاندان کو محدود رکھنے کے خیال کی وکالت کرنے پر آمادہ کیا کیوں کہ یہی بات بالآخر سماجی فلاح کے کاموں کو آگے بڑھائے گی۔ ان خطوط پر جب کام کیا جائے گا تو اس سے سماج کے ان طبقوں کی حالت کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی جو اس لائق بھی نہیں ہیں کہ اپنی روزانہ کی ضروریات پوری کر سکیں جن میں کھانا، کپڑا اور مکان وغیرہ شامل ہے۔

اس چھوٹے سے مضمون میں ملک اور مختلف ریاستوں کے، آبادی سے متعلق منظر نامے کو پیش کیا گیا ہے۔ اضافۂ آبادی پر قابو پانے کے لیے جو پالیسیاں، پروگرام اور حکمت عملی اپنائی گئی اور ان کے جو نتائج سامنے آئے ان کا خاکہ پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد ان پالیسیوں اور اقدامات کی نشاندہی کی گئی ہے جن پر عمل کیا جائے گا۔ اس مقصد کے تحت مردم شماری کی رپورٹ اور دوسرے ذرائع سے حاصل کیے گئے اعداد و شمار کے علاوہ ان تفصیلی اطلاعات سے بھی مدد لی گئی ہے جو خاندانی بہبود اور صحت سے متعلق قومی پیمانے کے سروے نے فراہم کی ہیں۔ یہ سروے ۹۳-۱۹۹۲ء میں ملک کی تمام اہم ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں کیے گئے تھے۔ ملک میں پہلی بار اس نوعیت کا سروے کرایا گیا تھا جس میں شرح اموات و پیدائش کے علاوہ خاندانی منصوبہ بندی اور خاندان کو محدود رکھنے کے رجحان، ماں اور بچوں کی صحت نیز بچوں کی غذائی صورت حال وغیرہ کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کی گئی تھیں

آبادی کا منظر نامہ

آزادی کے بعد سے ملک میں آبادی کے محاذ پر کافی تبدیلیاں نظر آئی ہیں۔ ۱۹۹۱ء تک بے تحاشہ اضافۂ آبادی کی شرح مدھم پڑ گئی۔ یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ ملک کی تقریباً تمام ریاستوں میں شرح پیدائش میں کمی آئی جیسا کہ موجودہ شرح سے واضح ہوتا ہے جو ۲۹ فی ہزار ہے (دیہی علاقوں میں ۳۰ اور شہری علاقوں میں ۲۴) جب کہ موجودہ شرح اموات کا تناسب ۹ ہے (دیہی علاقوں میں گیارہ اور شہری علاقوں میں چھ)۔ اگرچہ خاندانی منصوبہ بندی کا پیغام ملک کے گوشے گوشے تک پہنچ گیا ہے لیکن متعلقہ عمر کے شادی شدہ جوڑوں کے تقریباً نصف حصے نے اپنے خاندان کو محدود رکھنے کا رجحان اختیار کیا ہے۔ نوزائیدہ اور کم عمر کے بچوں کی شرح اموات گھٹ کر بالترتیب ۸۰ اور ۳۲ کی سطح پر آگئی ہے اور اس میں مزید کمی آنے کے امکانات موجود ہیں۔ مرد اور عورت

نوزائیدہ اور کم عمر کے بچوں کی شرح اموات گھٹ کر [illegible] ۳۲ کی سطح پر آگئی ہے اور اس میں مزید کمی آنے کے امکانات [illegible] ہیں۔ اس مثبت پیش رفت کے باوجود [illegible] معاملات [illegible] کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

دونوں کے لیے ۶۰ سال کی اوسط عمر کے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ اس حقیقت پیش رفت کے باوجود بعض معاملات سنگین تشویش کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ابھی تک ہم اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں کہ شرح پیدائش کی مجموعی شرح کو ایک پر لاسکیں۔ اضافہ آبادی کی جو موجودہ شرح ہے اس کے مطابق اندازاً ۳۷ سال میں آبادی دگنی ہو سکتی ہے۔ اضافہ آبادی کی روک تھام کے لیے مناسب طریقہ کار کو اختیار کرنا لازمی ہے تاکہ صورت حال کو متوازن بنایا جا سکے۔ اس وقت صورت حال غیر متوازن ہے مثلاً لڑکیوں کی شادیاں ملک کے بہت سے حصوں میں ۱۸ سال سے کم کی عمر میں ہی ہو جاتی ہیں جب کہ قانونی طور پر کم سے کم ۱۸ سال کی عمر طے کی گئی ہے۔ شادی کی جو کم سے کم عمر مقرر کی گئی ہے اس کے بارے میں بہت معمولی پیمانے پر بیداری لائی جا سکی ہے۔ اوسط سطح پر اس منظر نامے سے صورت حال کا مجموعی طور پر اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ملک کی مختلف ریاستوں اور علاقوں کی صورت حال میں کافی فرق نظر آتا ہے۔ (گوشوارہ نمبر ۱)

اس سلسلے میں ریاستی سطح پر جتنے بھی اشاریئے تیار کیے گئے ہیں، ان سب میں کافی فرق دکھائی دیتا ہے۔ مردم شماری کی گزشتہ دہائی میں اضافہ آبادی کی سالانہ شرح میں ۱۱۳ سے لے کر ۴/۲ کا فرق ہے۔ ایک طرف ہمیں گوا، کیرالا اور تامل ناڈو کی ریاستیں نظر آتی ہیں جہاں شرح پیدائش کی سطح بہت نیچے آگئی ہے لہٰذا ان ریاستوں میں تو مطلوبہ نشانہ پورا کر لیا گیا لیکن دوسری انتہا یہ ہے کہ اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان جیسی بڑی ریاستوں میں شرح پیدائش لگاتار بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ ان ریاستوں میں بھی شرح پیدائش قدرے گھٹی ہے لیکن یہ ایسی برائے نام کی تبدیلی ہے جس کا کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا۔ جنوبی اور مغربی ہندوستان میں شرح پیدائش کی سطح قومی اوسط سے قابل ذکر حد تک کم ہے۔ آبادی پر قابو پانے کے طریقے اپنائے جانے کے رجحان نیز دوسرے پیمانوں کے اعتبار سے، بھی فرق بیشتر صورت میں نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر شادی کی عمر کے تعلق سے کیرالا اور اتر پردیش میں بہت بڑا فرق ہے۔ کیرالا میں جہاں ۷۵ فی صد جوڑوں کی شادیاں پختہ عمر میں ہوتی ہیں، وہاں اتر پردیش میں یہ شرح صرف ۲۶ فی صد ہے۔ کیرالا میں لڑکیوں کی شادیاں ۲۲ سال سے کم عمر میں نہیں ہوتیں جب کہ راجستھان میں کم سے کم عمر ۱۸ سال ہے۔ نوزائدہ بچوں کی موت کی شرح میزورم میں جہاں ۱۵ ہے، وہاں اڑیسہ میں ۱۱۲ ہے۔ آبادی اور بہبود وغیرہ سے متعلق تمام اشاریوں میں، ہر ریاست کے اندر بھی اسی طرح کا فرق نظر آتا ہے۔ ہر ریاست اور اضلاع کے اشاریوں میں کافی تضاد اور فرق دکھائی دے گا لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ کافی گہرائی سے چھان بین کی جائے۔

پروگرام کا نفاذ

ہندوستان دنیا کا وہ پہلا ملک تھا جس نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں سرکاری طور پر خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام شروع کیا۔ ۱۹۷۶ء میں حکومت نے آبادی سے متعلق قومی پالیسی کا اعلان کیا، متعدد حکمت عملی وضع کر کے شادی شدہ جوڑوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ شرح پیدائش کم کرنے میں معاونت کریں۔

اضافہ آبادی کو قابو میں رکھنے کے لیے کیا کیا کوششیں کی گئیں؟ ہندوستان دنیا کا وہ پہلا ملک تھا جس نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں سرکاری طور پر خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام شروع کیا۔ ۱۹۷۶ء میں حکومت نے آبادی سے متعلق قومی پالیسی کا اعلان کیا، متعدد حکمت عملی وضع کر کے شادی شدہ جوڑوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ شرح پیدائش کم کرنے میں معاونت کریں۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے پروگرام شروع کیے گئے جن سے بالواسطہ طور پر اس مقصد میں کامیابی مل سکتی ہے۔ مثلاً تعلیم بالغان پر زور دیا گیا، ماؤں کی بہتر صحت اور بچوں کی بقا کے لیے اقدامات کیے گئے، بچوں کو مقوی غذا فراہم کرنے پر توجہ دی گئی اور ان تمام اقدامات کے نتیجہ میں کسی حد تک کامیابی ملی اور ماؤں کی صحت پر اچھا اثر پڑا۔ بچوں کی بقا سے متعلق بہتر طریقے سے زیادہ مانوس ہیں لیکن بچوں کی پیدائش کے درمیان فاصلے کی مدت کے سلسلے میں ان میں ابھی کچھ زیادہ بیداری نہیں آئی ہے، خاص طور سے دیہی علاقوں کی عورتیں ابھی نئے طریقے سے واقف نہیں ہو پائی ہیں۔ دیہی علاقوں کی شادی شدہ عورتوں میں صرف ۷ فی صد ایسی ہیں جو فاصلہ قائم رکھنے کے جدید طریقے کا استعمال کرتی ہیں۔ (گوشوارہ نمبر ۲)۔

اس وقت دیہی علاقوں کے مردوں اور عورتوں میں نس بندی کا طریقہ کار زیادہ مقبول ہے جب کہ شہری علاقوں میں عارضی طریقوں کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے۔ تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ عورتیں نس بندی کے مقابلے جدید طریقوں پر زیادہ بھروسہ کرنے لگی ہیں۔ اس کے علاوہ روایتی طریقوں کا بھی استعمال کرتی ہیں۔ اضافہ آبادی صورت حال سامنے آئی اور شادی شدہ جوڑوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت کو سمجھیں۔ لیکن کامیابی کا معیار مختلف رہا لہٰذا نتائج میں یکسانیت پیدا نہ ہو سکی۔ تاہم اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان کوششوں کے غیر متاثر کن نتائج کے باوجود یہ غیر اہم نہیں ہیں۔

ماضی میں خاندانی بہبود کے سلسلے میں نس بندی پر کافی زور دیا گیا اور اسی طریقہ کار کو مطلوبہ مقصد میں کامیابی کی کلید تصور کیا گیا لیکن اس طریقہ کار کو اپنانے والوں کو دی جانے والی سہولیات اور مراعات کے سلسلے میں کچھ مسائل پیدا ہو گئے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے پیغام کا اثر مختلف ریاستوں اور مختلف مذہبی اور ثقافتی حلقوں میں مختلف انداز سے پڑا۔ توقع کے مطابق ہندوستان میں عورتیں، نس بندی کے

کی روک تھام کے طریقوں کے موجودہ استعمال کا رجحان
رہنے والے بچوں سے گہرا تعلق ہے۔ خاندانی بہبود
اور صحت سے متعلق ۹۳-۱۹۹۲ء میں جو قومی
سروے ہوا تھا اس کے مطابق ایسے ۳۰ فی صد سے
زیادہ جوڑوں کی نس بندی ہوئی تھی جن کے پاس
دو بچے موجود ہیں، جب کہ دو بچوں والے تمام
جوڑوں کا تقریباً نصف حصہ اضافہ آبادی کی روک
تھام کے دوسرے طریقے استعمال کرتا ہے۔ اگرچہ
پیدائش کی روک تھام کے طریقوں کے استعمال کے
اعتبار سے مختلف ریاستوں کے درمیان فرق پایا
جاتا ہے لیکن عمر کے اعتبار سے ان طریقوں کے
استعمال میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ ان طریقوں
کے استعمال کی آخری حد ۳۰ سے ۳۹ سال کی عمر تک
رہی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں اور
خدمات کو شہری علاقوں میں سرکاری اسپتالوں
اور خاندانی بہبود کے مراکز اور دیہی علاقوں میں
پرائمری ہیلتھ سینٹر اور ذیلی مراکز کے تحت فروغ
دیا جاتا ہے۔ اب پرائیویٹ اسپتال اور غیر سرکاری
تنظیمیں بھی اس طرح کی خدمات مہیا کرنے لگی
ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے بڑی تعداد میں شادی
شدہ جوڑوں کو بڑے کیمپوں میں بلوانے کی
حکمت عملی اختیار کی گئی تھی لیکن اب اس طریقۂ کار
کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے اور اس کی جگہ چھوٹے
کیمپوں کا طریقۂ کار بہت زیادہ مقبول ہو گیا
ہے۔ نس بندی کے تقریباً ۹۰ فی صد معاملات
سرکاری اداروں میں نمٹائے جاتے ہیں۔ شہری
علاقوں میں خاندانی منصوبہ بندی کے جدید
طریقے استعمال کرنے والے ۵۰ فی صد افراد کو
پرائیویٹ ادارے اپنی خدمات مہیا کرتے
ہیں جب کہ دیہی علاقوں میں سرکاری تحویل کے
ادارے زیادہ سرگرم ہیں۔

ماں اور بچوں کی بہبود

ملک میں خاندانی بہبود کے پروگرام میں
کامیابی حاصل کرنے کے لیے ماؤں اور بچوں
کی صحت سے متعلق خدمات کی فراہمی کو کلیدی
اہمیت کا حامل تصور کیا گیا ہے۔ اس کے لیے
یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ جب شادی شدہ جوڑوں
کو ان کے بچوں کی بقا کی ضمانت دے دی جائے
گی تو وہ اپنے خاندان کو محدود رکھنے کے خیال کو
فوراً قبول کر لیں گے۔ ماں کی صحت اور بہبود نیز
بچوں کی بقا کو خاندانی بہبود کے پروگرام کے
اولین شرط قرار دیا گیا ہے۔ اسی لیے حال میں
شروع کیے گئے "ایم سی ایچ" پروگرام کو بچوں
کی بقا اور ماں کی محفوظ صحت کے پروگرام کا
نام دیا گیا ہے۔

ماؤں کی صحت سے متعلق خدمات کافی
موثر ثابت ہوئی ہیں لیکن ابھی اس سلسلے میں
بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ماؤں کی صحت کے سلسلے
میں اب تک جو کچھ ہوا ہے اس میں صحت کی
دیکھ بھال کرنے والے کارکنوں کے دورے،
صحت بخش ادویات کی تقسیم اور ٹٹنس سے محفوظ
رکھنے والے ٹیکے لگانا وغیرہ شامل ہے۔ ایسی

عورتوں کی تعداد ۶۰ فی صد کے قریب ہے جنہیں
ان کے آخری بچے کی پیدائش کے وقت ٹٹنس
سے محفوظ رکھنے والے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔
ایسی عورتوں کے ایام حمل میں کم از کم ایک بار
اس طرح کا ٹیکہ لگایا جاتا ہے (گوشوارہ نمبر ۳)
جوان ماؤں (۳۵ سال سے کم) کم بچوں والی
ماؤں اور خواندہ اور تعلیم یافتہ خواتین کا اس
پروگرام کے تحت بطور خاص احاطہ کیا گیا ہے۔
اسی طرح ان عورتوں کی تقریباً نصف تعداد کو
ان کی بہتر صحت برقرار رکھنے کے لیے آئرن اور
فالک کی گولیاں دی گئی ہیں۔ دیہی علاقوں میں
صحت کی دیکھ بھال کرنے والے کارکنوں کا
گھر گھر جانا بہت عام ہے جہاں کم از کم ایک
چوتھائی عورتوں کی ہیلتھ ورکرز نے گھر گھر جا کر
دیکھ بھال کی۔ ان میں سے ۵۰ فی صد عورتیں ایسی
تھیں جنہیں ڈاکٹر یا طبی امور کے کسی ماہر نے
ایام حمل کے دوران طبی سہولیات فراہم کیں۔ اس
طرح ہیلتھ ورکرز کے یہ دورے اس پروگرام کا
بہت اہم حصہ ہیں اور اس میں مزید بہتری لانے
کی ضرورت ہے۔

گزشتہ برسوں میں دوسری کوشش یہ کی
گئی کہ ایسی زچگی کی حوصلہ افزائی کی جائے جو
کسی متعلقہ ادارے یا کسی تربیت یافتہ فرد کی نگرانی
میں ہو۔ اس کا خاص مقصد یہ ہے کہ بچوں کی پیدائش
کے وقت صحت کی بہتر طور پر دیکھ بھال کی جا سکے۔
حالیہ برسوں میں ایک چوتھائی سے زیادہ زچگی
صحت کے اداروں میں ہوئی ہے۔ باقی گھروں میں ہوئی
ہیں۔ اس معاملہ میں بھی مختلف ریاستوں کی
کارکردگی میں کافی فرق رہا ہے۔ لیکن ہر ریاست
میں ایک بات نمایاں رہی کہ زچگی کی بہتر سہولیات
دیہی علاقوں کے مقابلے شہری علاقوں میں زیادہ
بہتر طور پر فراہم کی گئیں۔ ظاہر ہے اس صورت حال
کے مضمرات دوسرے پروگراموں میں بھی نظر
آئیں گے۔ مثلاً بیماریوں سے محفوظ رہنے کے
اقدامات اور خاندانی منصوبہ بندی کے
فروغ کم رہا!
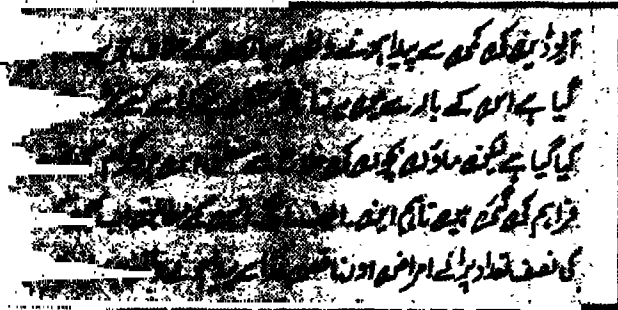
حالیہ برسوں میں بچوں کی صحت سے متعلق
متعدد پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔ ان میں
بچوں میں پیدا ہونے والی چھ بیماریوں کی
روک تھام کے لیے ٹیکے لگانا، بچوں کو
ڈائریا سے محفوظ رکھنے کے لیے ضروری اقدام
کرنا اور ایسی مقوی غذا فراہم کرنے کا پروگرام
شامل ہے جس سے بچے جسمانی طور پر معذور نہ
ہونے پائیں۔ ان پروگراموں کو اس لیے فروغ
دیا جا رہا ہے کہ بچوں کی بقا کے امکانات
زیادہ روشن ہوں اور ان کی صحت اور
غذائیت میں بہتری آئے۔ ملک میں بچوں کی

صحت سے متعلق چلائے جانے والے پروگراموں میں ایسی بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے اقدامات کو خاص اہمیت حاصل ہے، جن کی روک تھام ممکن ہوتی ہے۔ خاص طور سے ٹی بی، ڈیپتھیریا، ٹیٹنس، خسرہ، پولیو وغیرہ ان بیماریوں سے بچنے کے لیے ٹیکے لگانے کا پروگرام بڑے پیمانے پر شروع کیا گیا ہے۔ ٹیکے لگانے کا ہمہ گیر پروگرام ۸۶-۱۹۸۵ء میں شروع کیا گیا تھا اور یہ سات ٹکنالوجی مشن میں سے ایک تھا۔ اس پروگرام کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ ۱۹۹۰ء تک کم از کم ۸۵ فی صد نوزائیدہ بچوں کو ٹیکہ لگایا جا سکے۔ ان تمام بیماریوں سے بچنے کے لیے ٹیکے لگانے کا پروگرام متوازن خطوط پر چلا صرف خسرے کا ٹیکہ لگانے کا کام نسبتاً سست روی کا شکار رہا کیوں کہ اس میں پیدائش کے بعد ۹ ماہ کا وقت ہوتا ہے۔

اس پروگرام کے تحت پولیو سمیت دیگر بیماریوں کا جہاں ۵۰ سے ۶۰ فی صد احاطہ کیا گیا وہاں خسرے کی روک تھام سے متعلق صرف ۴۲ فی صد کام کا احاطہ کیا جا سکا اور اس طرح اس پروگرام کا مجموعی اوسط کم ہو گیا۔ اس پروگرام میں بھی شہری علاقوں کو دیہی علاقوں پر اور لڑکوں کو لڑکیوں پر سبقت حاصل ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ تعلیم یافتہ خواتین اپنے بچوں کو ان بیماریوں سے ناخواندہ خواتین کے مقابلے میں زیادہ محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ملک کی مختلف ریاستوں کی صورت حال مختلف ہے۔

• "او آر ٹی" کے نام سے جو پروگرام شروع کیا گیا ہے اس کے تحت بھی بچوں کی بقا کے مسئلہ کو اولیت دی گئی ہے۔ اس پروگرام کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ عورتوں اور پورے سماج میں اس بات کے لیے بیداری پیدا کی جائے کہ وہ ڈائریا یا دست آنے کی بیماری کے اسباب اور علاج کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کر لیں۔ اس پروگرام کے تحت گھریلو دواؤں کے استعمال کو بھی فروغ دیا جاتا ہے۔ اس طرح کی گھریلو دوائیں نمک، شکر اور پانی سے تیار کی جا سکتی ہیں۔ ان بیماریوں کے خلاف چھیڑی جانے والی لڑائی میں لوگوں کو بیدار کرنے میں ذرائع ابلاغ بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ "او آر ٹی" کی پڑیا یا پیکٹ کا استعمال بڑے پیمانے پر نہیں ہو سکا ہے۔ این ایف ایچ ایس کے مطابق صرف ایک تہائی کے قریب بچوں کا او آر ٹی کے پیکٹ یا گھریلو دواؤں کے استعمال سے علاج ہو سکا ہے۔

[illegible] سیاق و سباق میں ہمیں جو مقصد حاصل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ محدود خاندان کے ذریعے [illegible] آبادی پر قابو پا کر سماجی بہبود کے اہداف کو فروغ دیا جائے اور یہ صورت حال [illegible] ضرورت ہے کہ آبادی کے [illegible] پر بھی توجہ دی تاکہ عوام کی بنیادی [illegible] پوری ہوں اور ان کے [illegible] بلند ہوں۔

کچھ دوسرے پروگرام بھی شروع کیے گئے ہیں۔ مثلاً بچوں سے متعلق مربوط ترقیاتی اسکیم! اس طرح کے پروگراموں کو ملک کے منتخب ترقیاتی بلاکوں میں نافذ کیا گیا ہے۔ دیگر نئے پروگراموں میں آیوڈین کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماریوں کی روک تھام اور پلس پولیو کے ٹیکے کے پروگرام شامل ہیں جنھیں حالیہ مہینوں میں شروع کیا گیا ہے۔ آیوڈین کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماری کے خلاف جو پروگرام شروع کیا گیا ہے اس کے بارے میں یہ بتانا تو مشکل ہے کہ اسے کتنے بڑے پیمانے پر نافذ کیا گیا ہے لیکن ماؤں اور بچوں کی فلاح سے متعلق اس پروگرام کے تحت اہم خدمات فراہم کی گئی ہیں تاہم این ایف ایچ ایس کے مطابق اب بھی ملک کے بچوں کی نصف تعداد پرانے امراض اور ناقص غذا سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہے۔

فروغ انسانی وسائل کی فہرست میں مقوی غذا اور صحت کے معاملات اولین ترجیح کے حامل ہیں کیونکہ یہ دونوں چیزیں "[illegible] کی شرح اموات" اور "پیدائش کے وقت [illegible] کے امکانات" سے جڑی ہوتی ہیں۔

اب غور کریں کہ ان تمام کوششوں کا اضافہ آبادی پر قابو پانے کی کوششوں پر کیا اثر پڑا؟ اگرچہ ہم نے کچھ قابلِ ذکر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پورے عمل کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تاکہ تشویش کے حامل شعبوں، مقامی حالات کو سمجھنے اور ایسی پالیسی، پروگرام اور حکمت عملی اپنانے کے کاموں کی نشاندہی ہو سکے جو مقامی ضروریات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ اس اعتبار سے علاقائی طور پر صورت حال کا جائزہ لینا زیادہ مفید ثابت ہوگا کہ اسی طور پر مقامی ضروریات کو زیادہ بہتر ڈھنگ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں ایسی صورت حال بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ بعض علاقے ریاستی حد بندیوں سے بھی صرف نظر کر کے پروگراموں کے نفاذ کے متقاضی ہوں۔ اس پس منظر میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ شرح پیدائش کم کرنے سے متعلق پروگراموں کی تفصیلی پالیسی وضع کرنے نیز اسے نافذ کرنے کے لیے ریاستی حکومتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ کلیدی رول ادا کر سکیں جب کہ مرکزی حکومت مالی تکنیکی اور انتظامی سطح پر امداد مہیا کرے۔ آبادی کے اعتبار سے ہندوستان ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے جہاں آبادی سے متعلق پالیسی پروگرام اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے حکمت عملی طے کرنے کی پوری ذمہ داری مملکت کی ہونی چاہیے۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ پروگرام اور حکمت عملی طے کرتے وقت مقامی حالات اور پس منظر کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اس طرح کے خیالات کا اظہار آبادی سے متعلق قومی پالیسی کے مسودے میں ماہرین کے گروپ نے بھی کیا ہے۔ یہ دلیل بھی پیش کی گئی ہے کہ آبادی کی صورت حال پر قابو پانے کے لیے جو پروگرام وضع کیے جائیں ان میں ان حقائق کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ پیدائش اور موت نیز بچوں کی موت کی مجموعی شرح کے تناظر میں مختلف ریاستوں کی شرحوں کے درمیان کتنا فرق

ہے۔ پالیسیاں اور پروگرام اس طور پر مرتب کیے جانے چاہئیں کہ وہ علاقے کے مخصوص سماجی و ثقافتی نیز عوامل اور صورت حال سے مطابقت رکھتے ہوں لہٰذا آبادی سے متعلق پالیسی کا جو ڈھانچہ ترتیب دیا گیا ہے اس کا نچوڑ یہ ہے " مقامی طور پر سوچیے، منصوبہ بنایئے اور کام کیجیے لیکن اسے سہارا قومی پیمانے پر دیجیے"

حاصل گفتگو

قومی سیاق و سباق میں جو مقصد حاصل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ محدود خاندان کے ذریعہ اضافہ آبادی پر قابو پاکر سماجی بہبود کے کاموں کو فروغ دیا جائے اور یہ صورت حال اس بات پر زور دیتی ہے کہ آبادی کے معیار زندگی پر بھی توجہ دی جائے تاکہ عوام کی بنیادی ضروریات پوری ہوں اور ان کے ولولے بلند ہوں۔ مزید برآں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کسی بھی آبادی کی بہتر صحت کا دارومدار ایک حد تک اس بات پر ہوتا ہے کہ ماں اور بچے کی صحت کی صورت حال کیا ہے۔ عمومی حالت میں ایک صحت مند ماں ہی صحت مند بچے کو جنم دیتی ہے اور اس طرح سماج کے وسیع تر مفاد میں اپنی خدمات پیش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ " ری پروڈکٹیو ہیلتھ پروگرام" پر خاص زور دیا گیا ہے، جس میں ماں کی صحت اولین ترجیح کی حامل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح آج کے بچے مستقبل کے ہندوستان ـــــ کے شہری ہیں لہٰذا پیدائش کے وقت سے ہی ان کی دیکھ بھال ضروری ہے جس میں ان کی مقوی غذا، صحت اور تعلیم کے معاملات شامل ہیں۔ جیسے جیسے وہ بڑے ہوں ویسے ویسے ان کی خواہشات کی تکمیل بھی ضروری ہے جس میں روزگار کے مواقع بھی شامل ہیں۔ فروغ انسانی وسائل کی فہرست میں مقوی غذا اور صحت کے معاملات اولین ترجیح کے حامل ہیں کیونکہ یہ دونوں چیزیں " ادائل عمری کی شرح اموات" اور " پیدائش کے وقت طویل عمری کے امکانات" سے جڑی ہوئی ہیں اور ان دونوں کے عوامل کو خواندگی اور اسکولوں میں ناموں کے اندراج کی طرح کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی بھی ملک کی قومی تعمیر سے متعلق سرگرمیوں میں یہ عوامل بہت نازک اور اہم ہو جاتے ہیں۔ قومی تعمیر کا کام اسی وقت حقیقت کی شکل اختیار کرسکتا ہے جب مستقبل کے شہریوں کی ٹھیک سے نگہداشت کی جائے اور ان کے والدین کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔ مختصراً یہی وقت کی اہم ضرورت ہے۔

گوشوارہ نمبر ۱

ریاستوں کے آبادی سے متعلق منتخب اشاریئے، ۹۳-۱۹۹۲ء

ریاست	اضافہ آبادی کی سالانہ شرح (۹۱-۱۹۸۱ء)	شرح پیدائش (تخمینتاً)	شرح اموات (تخمینتاً)	بچوں کی شرح اموات	شادی کے وقت اوسط عمر (عورتوں کی)
ہندوستان	۲٫۱	۲۸٫۷	۹٫۷	۷۸٫۵	۲۰٫۰
شمالی ہند					
دہلی	۴٫۱	۲۶٫۶	۷٫۸	۶۵٫۴	۲۰٫۹
ہریانہ	۲٫۳	۳۲٫۹	۹٫۰	۷۳٫۳	۱۸٫۴
ہماچل پردیش	۱٫۸	۲۸٫۲	۸٫۴	۵۵٫۸	۲۰٫۴
جموں وکشمیر کا جموں علاقہ	۲٫۶	۲۷٫۹	۸٫۷	۴۵٫۴	۲۱٫۲
پنجاب	۱٫۸	۲۵٫۰	۷٫۱	۵۳٫۷	۲۱٫۱
راجستھان	۲٫۵	۲۷٫۰	۷٫۸	۷۲٫۶	۱۸٫۴
وسطی ہند					
مدھیہ پردیش	۲٫۴	۳۱٫۶	۱۰٫۳	۸۵٫۲	۱۷٫۴
اتر پردیش	۲٫۲	۳۵٫۹	۱۱٫۹	۹۹٫۹	۱۸٫۶
مشرقی ہند					
بہار	۲٫۱	۳۲٫۱	۱۱٫۵	۸۹٫۲	۱۸٫۰
اڑیسہ	۱٫۸	۲۶٫۵	۱۱٫۰	۱۱۲٫۱	۲۰٫۷
مغربی بنگال	۲٫۲	۲۵٫۵	۹٫۷	۷۵٫۳	۱۹٫۲
شمال مشرق					
اروناچل پردیش	۳٫۱	۳۴٫۶	۸٫۲	۴۰٫۰	۲۰٫۰
آسام	۲٫۱	۳۰٫۴	۱۱٫۳	۸۸٫۷	۲۱٫۶
منی پور	۲٫۵	۲۴٫۴	۵٫۸	۴۲٫۴	۲۵٫۰
میگھالیہ	۲٫۸	۳۱٫۹	۶٫۲	۶۴٫۲	۲۱٫۲
میزورم	۳٫۳	۲۰٫۸	۳٫۴	۱۴٫۶	۲۲٫۹
ناگالینڈ	۴٫۵	۳۱٫۳	۱٫۹	۱۷٫۲	۲۲٫۷
تریپورہ	۲٫۹	۲۲٫۱	۱۱٫۸	۷۵٫۸	۲۱٫۲
مغربی ہند					
گوا	۱٫۵	۱۷٫۲	۶٫۵	۳۶٫۹	۲۵٫۱
گجرات	۱٫۹	۲۷٫۲	۹٫۱	۶۸٫۷	۲۰٫۲
مہاراشٹر	۲٫۳	۲۶٫۲	۷٫۷	۵۰٫۵	۱۹٫۲

جنوبی ہند					
آندھرا پردیش	۲٫۱	۲۴٫۲	۸٫۷	۷۰٫۴	۱۸٫۱
کرناٹک	۱٫۹	۲۵٫۹	۷٫۵	۶۵٫۴	۱۹٫۶
کیرالا	۱٫۳	۱۹٫۶	۶٫۲	۲۳٫۸	۲۲٫۱
تامل ناڈو	۱٫۴	۲۳٫۵	۹٫۷	۶۷٫۷	۲۰٫۵

ماخذ ــــــ (۱) ہندوستان کی مردم شماری ۱۹۹۱ء

(۲) نیشنل فیملی ہیلتھ سروے ۹۳-۱۹۹۲ء

گوشوارہ نمبر ۲

ریاستوں میں آبادی کی روک تھام سے متعلق اختیار کیے گئے طریقوں کے منتخب اشاریئے ۹۳-۱۹۹۲ء

مطلوبہ طریقہ استعمال کرنے والی عورتوں کا فی صد تناسب

ریاست	کوئی بھی متبادل طریقہ	نس بندی	کوئی بھی جدید عارضی طریقہ	خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق جو ضروریات پوری نہ ہوئیں
ہندوستان	۴۰٫۶	۳۰٫۸	۵٫۵	۱۹٫۵
شمالی ہند				۱۵٫۴
دہلی	۶۰٫۳	۲۳٫۳	۳۱٫۳	۱۶٫۴
ہریانہ	۴۹٫۷	۳۴٫۸	۹٫۶	۱۴٫۹
ہماچل پردیش	۵۸٫۴	۴۵٫۸	۸٫۶	۱۷٫۵
جموں وکشمیر کا جموں علاقہ	۴۹٫۴	۲۹٫۷	۱۰٫۰	۱۳٫۰
پنجاب	۵۸٫۷	۳۴٫۰	۱۷٫۳	۱۹٫۸
راجستھان	۳۱٫۸	۲۷٫۷	۳٫۳	
وسطی ہند				
مدھیہ پردیش	۳۶٫۵	۳۱٫۵	۴٫۰	۲۰٫۵
اتر پردیش	۱۹٫۸	۱۳٫۱	۵٫۵	۳۰٫۱
مشرقی ہند				
بہار	۲۳٫۱	۱۸٫۶	۲٫۹	۲۵٫۱
اڑیسہ	۳۶٫۳	۳۱٫۶	۳٫۰	۲۲٫۴
مغربی بنگال	۵۷٫۴	۳۰٫۶	۶٫۷	۱۷٫۴
شمال مشرق				
اروناچل پردیش	۲۳٫۶	۱۰٫۷	۸٫۶	۲۰٫۴
آسام	۴۲٫۸	۱۴٫۴	۵٫۴	۲۱٫۷
منی پور	۳۴٫۹	۱۳٫۸	۱۰٫۳	۳۱٫۷
میگھالیہ	۲۰٫۷	۱۰٫۰	۵٫۱	۲۵٫۱

میزورم	۵۳٫۸	۴۴٫۶	۸٫۳	۱۱٫۹
ناگالینڈ	۱۳٫۰	۶٫۴	۶٫۵	۲۶٫۷
تری پورہ	۵۶٫۱	۱۹٫۱	۹٫۵	۲۳٫۵
مغربی ہند				
گوا	۴۷٫۸	۳۰٫۵	۷٫۳	۱۵٫۷
گجرات	۴۹٫۳	۴۱٫۰	۵٫۹	۱۳٫۱
مہاراشٹر	۵۳٫۷	۴۶٫۱	۶٫۴	۱۴٫۱
جنوبی ہند				
آندھرا پردیش	۴۷٫۰	۴۴٫۸	۱٫۸	۱۰٫۴
کرناٹک	۴۹٫۱	۴۲٫۵	۴٫۸	۱۸٫۲
کیرالا	۶۳٫۳	۴۸٫۳	۶٫۱	۱۱٫۷
تامل ناڈو	۴۹٫۸	۳۹٫۵	۵٫۹	۱۴٫۶

ماخذ۔ نیشنل فیملی ہیلتھ سروے ۹۳-۱۹۹۲ء

گوشوارہ نمبر ۳

ریاستوں میں ماؤں اور بچوں کی صحت سے متعلق صورت حال کے منتخب اشاریئے ۹۳-۱۹۹۲ء

ریاست	گزشتہ چار برسوں میں ہونے والی پیدائش کے لیے، فی صد						
	ایسی مائیں جن کی زچگی سے قبل دیکھ بھال کی گئی	ایسی مائیں جن کو ٹیٹنس کے دوا انجکشن دیئے گئے	ایسی پیدائش جو صحت کی کسی مرکز میں ہوئی	ایسی پیدائش جس کی دیکھ بھال کسی طبی ماہر نے کی	ایسے بچے جنھوں نے دست کی دوا کا پیکٹ یا گھریلو دوا استعمال کی	ان بچوں کا فی صد جن کو سارے ٹیکے دیے گئے (عمر ۱۲ سے ۲۳ ماہ)	چار سال سے کم کے زندہ رہنے والے ان بچوں کا فی صد جن کا وزن کم ہے
ہندوستان	۶۲٫۳	۵۳٫۸	۲۵٫۵	۳۴٫۲	۳۰٫۶	۳۵٫۴	۵۳٫۴
شمالی ہند							
دھلی	۸۲٫۴	۷۲٫۵	۴۴٫۳	۵۳٫۰	۳۹٫۴	۵۷٫۸	۴۲٫۶
ہریانہ	۷۲٫۷	۶۳٫۳	۱۶٫۷	۳۰٫۳	۱۹٫۵	۵۳٫۵	۳۷٫۹
ہماچل پردیش	۷۶٫۶	۴۷٫۴	۱۶٫۰	۲۵٫۶	۴۴٫۹	۶۲٫۹	۴۷٫۰
ریاست جموں وکشمیر (جموں کا علاقہ)	۷۹٫۵	۶۸٫۹	۲۱٫۹	۳۱٫۲	۴۴٫۴	۶۵٫۷	۴۴٫۵
پنجاب	۸۷٫۹	۸۲٫۷	۲۴٫۸	۴۸٫۳	۳۲٫۷	۶۱٫۹	۴۵٫۹
راجستھان	۳۱٫۲	۲۸٫۳	۱۱٫۶	۲۱٫۸	۲۷٫۷	۲۱٫۱	۴۱٫۶
وسطی ہند							
مدھیہ پردیش	۵۲٫۱	۴۲٫۸	۱۵٫۹	۳۰٫۰	۲۳٫۰	۲۹٫۲	۵۷٫۴
اتر پردیش	۴۴٫۷	۳۷٫۴	۱۱٫۲	۱۷٫۲	۲۲٫۷	۱۹٫۸	۵۹٫۰
مشرقی ہند							
بہار	۳۶٫۸	۳۰٫۷	۱۲٫۱	۱۹٫۰	۲۳٫۰	۱۰٫۷	۶۲٫۶
اڑیسہ	۶۱٫۶	۵۳٫۸	۱۴٫۱	۲۰٫۵	۴۱٫۱	۳۶٫۱	۵۳٫۳
مغربی بنگال	۷۵٫۳	۷۰٫۴	۳۱٫۵	۳۳٫۰	۷۴٫۷	۳۴٫۲	۵۶٫۸

شمال مشرق							
اروناچل پردیش	۴۸٫۹	۳۱٫۹	۱۹٫۹	۲۱٫۳	۳۳٫۳	۲۲٫۵	۳۹٫۷
آسام	۴۹٫۳	۴۴٫۹	۱۱٫۱	۱۷٫۹	۳۵٫۲	۱۹٫۴	۵۰٫۴
منی پور	۶۳٫۴	۴۸٫۰	۲۳٫۰	۴۰٫۴	۶۳٫۱	۲۹٫۱	۳۰٫۱
میگھالیہ	۵۱٫۸	۳۰٫۰	۲۹٫۶	۳۶٫۹	۴۰٫۷	۹٫۷	۴۵٫۵
میزورم	۸۸٫۹	۴۲٫۵	۴۸٫۹	۶۱٫۵	۲۴٫۵	۵۶٫۴	۲۸٫۱
ناگالینڈ	۳۹٫۳	۳۳٫۰	۶٫۰	۲۲٫۲	۲۴٫۶	۳٫۸	۲۸٫۷
تریپورہ	۶۴٫۹	۵۸٫۷	۳۰٫۷	۳۳٫۵		۱۹٫۰	۴۸٫۸
مغربی ہند							
گوا	۹۵٫۴	۸۳٫۴	۸۶٫۸	۸۸٫۴	۴۱٫۴	۷۴٫۹	۳۵٫۰
گجرات	۷۵٫۷	۶۲٫۷	۳۵٫۶	۴۲٫۵	۲۰٫۷	۴۹٫۸	۵۰٫۱
مہاراشٹر	۸۲٫۷	۷۱٫۰	۴۳٫۹	۵۳٫۲	۴۱٫۷	۶۴٫۱	۵۴٫۲
جنوبی ہند							
آندھرا پردیش	۸۶٫۳	۷۴٫۸	۳۲٫۸	۴۹٫۳	۳۲٫۵	۴۵٫۰	۴۹٫۱
کرناٹک	۸۳٫۵	۶۹٫۸	۳۷٫۵	۵۰٫۹	۳۴٫۰	۵۲٫۲	۵۴٫۳
کیرالا	۹۷٫۳	۸۹٫۹	۸۷٫۸	۸۹٫۷	۳۷٫۸	۵۴٫۴	۲۸٫۵
تامل ناڈو	۹۴٫۲	۹۰٫۱	۶۳٫۴	۷۱٫۲	۲۷٫۱	۶۴٫۹	۴۸٫۲

ماخذ ـ نیشنل فیملی ہیلتھ سروے ۹۳-۱۹۹۲ء

بقیہ: غریبوں کی صحت کی دیکھ بھال

جب وہ کسی سنگین بیماری کے شکنجے میں پھنس جاتے ہیں تو انھیں جدید میڈیکل علاج کی مدد لینی پڑتی ہے۔ یا سرجری کروانی پڑتی ہے۔ تیزی سے دوڑتی ہوئی اس دنیا میں سرجری ہمیشہ ایک رول ادا کرتی رہے گی۔ بیلون انجیو پلاسٹی اور بائی پاس سرجری سے کچھ لوگوں کو کچھ وقت کے لیے فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن اگر وہ اپنے رہن سہن کا ڈھنگ بدل دیں تو یہ فائدہ طویل مدت تک برقرار رہ سکتا ہے۔

جدید طریق علاج کے ڈاکٹروں کو یہ ذہن نشین کرانے کی ضرورت ہے کہ آیوروید ایک زندہ قوت ہے۔ اس کی قدیم دانائی اور جدید طریق علاج کے نجات دلانے والے طریقوں اور دواؤں سے ہم ملک میں غریبوں کی صحت کی دیکھ بھال کے معاملے میں آج کل کے بحران کو حل کر سکتے ہیں۔ اگر ہم علاج کے موجودہ انتظام پر ہی چلتے رہے تو عالمی ادارہ صحت اور ہماری حکومت کا ۲۰۰۰ء تک سب کے لیے صحت کا نصب العین حاصل کرنا مشکل ہوگا۔ حالیہ برسوں میں مختلف بیماریوں میں ہوا اضافہ تشویشناک ہے اور اگر ہم جاگتے نہیں اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہمارے ملک کو سنگین بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو بنیادی اور ترقی یافتہ علاج کی سہولت ہی نہیں بہم پہنچانی چاہیے بلکہ غریبوں اور امیروں کے لیے یکساں طور پر احتیاطی اور تدارکی اقدامات بھی کرنے چاہئیں۔ یہ کام تعلیم میں توسیع و اضافہ، اطلاعات کی فراہمی اور فرد اور سماج کی سطح پر قریبی رابطے کے ذریعے انجام دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نصب العین کے حصول میں رضاکار تنظیموں کو بھی ایک بڑا رول ادا کرنا ہے۔

وسیع پیمانے پر عوام میں بیداری پیدا کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ، الیکٹرانک میڈیا اور سماجی رہنماؤں کی مدد ضروری ہے۔ صحت میلے بھی، جیسے کہ ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۵ء میں لگائے گئے، بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ تمباکو کے خلاف جنگی پیمانے پر جہاد شروع کرنا ہوگا۔

سب کو آیوروید کو اگر ایک متبادل طریق علاج نہیں تو ایک امدادی طریق علاج ضرور سمجھنا چاہیے۔ یہ طریق کار سائنٹفک اور تدارکی ہوگا۔ کم خرچ اور زہریلے اثرات سے پاک ہوگا اور اسے بآسانی زیر عمل لایا جا سکے گا۔ پھر ہمیں کروڑوں روپے کی لاگت سے کھولے جانے والے کم اسپتالوں کی ضرورت ہوگی لیکن ہمیں کھیل میدان، تفریحی پارک، یوگ اور دھیان لگانے کے مراکز زیادہ تعداد میں کھولنے ہوں گے۔ اس عظیم منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے غیر سیاسی رضاکار سماجی تنظیموں، گاؤں پنچایتوں، ویدوں، ڈاکٹروں اور زندگی کے سبھی شعبوں کے لوگوں کا اشتراک عمل بہت ضروری ہوگا۔ تبھی ہم اپنے ملک میں صحت مند لوگ ہونے کی امید کر سکتے ہیں۔ اس لیے رضاکارانہ عمل کی فوری ضرورت ہے۔

سی. جیا پال

ابتدائی تعلیم کو مقوّی غذا کا سہارا

مصنف کا کہنا ہے کہ بچوں کو ملنے والی ناقص غذا کے خلاف جو جنگ چھیڑی گئی ہے، اس میں پرائمری تعلیم کو مقوّی غذا کا سہارا فراہم کرنے کا قومی پروگرام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ متعدد ماہرین نے یہ ثابت کیا ہے کہ بہتر اور مقوّی غذا ملنے سے بچے پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

بھری پُری دنیا میں فاقہ زدگی یا بھوک سے مرنے کے واقعات کا ہونا، نسل انسانی کا ایک عجیب المیہ رہا ہے۔ ہندوستان میں ہوں یا امریکہ میں، اس طرح کے واقعات نے انسان دوستوں کو ہمیشہ اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ قومی شاعر بھارتی تو فاقہ زدگی کے واقعات پر بپھر اٹھتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ "ایسی دنیا کو نیست و نابود ہو جانا چاہیے جس میں انسان کو کھانا نصیب نہ ہو سکے"۔ امریکہ کے بارڈر کیسی چیپین نے تو یہ سوال بھی اٹھایا ہے۔

"دنیا میں جب اتنی غذائی اشیاء موجود ہیں تو بچے بھوک سے مرتے ہی کیوں ہیں؟"

اس سوال نے بہت سے حکمرانوں، سائنس دانوں اور انفرادی طور پر بھی بہت سے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ ایک زمانے سے ان میں سے ہر ایک نے اس صورت حال پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ صورت حال انتہائی مکروہ چیز ہے لیکن اسے نرم اور شائستہ زبان میں ناقص غذا کا نام دیا گیا ہے۔

ناقص غذائیت کا پھیلاؤ

ایک اندازے کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں ۱۲ فی صد بچے (یعنی کم و بیش چھ کروڑ ۷۰ لاکھ) کی پرورش، غذا کے اعتبار سے ناقص طور پر ہوتی ہے۔ اگر ان میں پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کو بھی جوڑ دیا جائے تو یہ تعداد بڑھ کر ۱۹ کروڑ ۳۰ لاکھ تک پہنچ جائے گی یعنی ۳۶ فی صد۔ ہندوستان میں ۶۸٫۶ فی صد بچے ایسے ہوتے ہیں

> ایک اندازے کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں ۱۲ فی صد بچے (یعنی کم و بیش چھ کروڑ ۷۰ لاکھ) کی پرورش، غذا کے اعتبار سے ناقص طور پر ہوتی ہے۔ اگر ان میں ۵ سال سے کم عمر کے بچوں کو بھی جوڑ دیا جائے تو یہ تعداد بڑھ کر ۱۹ کروڑ ۳۰ لاکھ تک پہنچ جائے گی یعنی ۳۶ فی صد!

جن کا وزن ان کی عمر کے اعتبار سے کم ہوتا ہے جب کہ ۳۰ فی صد بچے ایسے ہوتے ہیں جن کا وزن پیدائش کے وقت ہی مطلوبہ وزن سے کم ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا وزن ۲٫۵ کلو گرام سے بھی کم ہوتا ہے۔ راجیل دیو وس اور این جیا نے اپنی تصنیف "ہندوستان میں بچوں کی صحت اور غذا" میں یہ بتایا ہے کہ یہ صورت حال بدلتی نظر نہیں آتی۔

غذائیت کا جائزہ لینے والے قومی بیورو نے چھ سے گیارہ سال کی عمر کے بچوں کی غذائی صورت کے جو جائزے لیے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سروے میں شامل بچوں میں صرف ۵٫۷ فی صد بچے ایسے ہیں جنھیں معمول کی غذا مل پاتی ہے جب کہ باقی تمام بچوں کو کچھ کم یا کچھ زیادہ ناقص غذا ملتی ہے۔ یہ سروے ۸ ریاستوں آندھرا پردیش، گجرات، کرناٹک، کیرالہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، تامل ناڈو اور اڑیسہ میں ۹۲-۱۹۹۰ء کے دوران کیے گئے تھے۔ سروے سے یہ بھی پتا چلا کہ ۱۲٫۲۲ فی صد لڑکے اور ۱۵٫۵۹ فی صد لڑکیاں بدترین قسم کی ناقص غذائیت کا شکار ہیں۔ (دیکھیے گوشوارہ نمبر ۱ اور چارٹ نمبر ۱)۔

(گوشوارہ نمبر ۱ اور چارٹ نمبر ۱ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

گوشوارہ نمبر ۱

چھ سے گیارہ سال کی عمر کے دیہی بچوں کو ملنے والی غذا کی صورت حال

(پیمانہ ــــ وزن بہ اعتبار عمر)

ناقص غذائیت کی سطح (فی صد عمر)

جنس	شدید	متوازن	ہلکا	معمول کا
لڑکے	۱۲٫۲۲	۵۸٫۸۳	۲۸٫۵۳	۵٫۴۲
لڑکیاں	۱۵٫۵۹	۵۰٫۴۵	۲۸٫۲۳	۵٫۷۸
مجموعی (اوسط)	۱۳٫۸۹	۵۲٫۱۴	۲۸٫۳۸	۵٫۵۷

چارٹ نمبر ۱

بچوں کی تقسیم (۶ سے ۱۱ سال)

غذائیت کی سطح کے اعتبار سے (پیمانہ ــــ وزن بہ اعتبار عمر)

متوازن ۵۸٫۸۳ فی صد
معمول کا ۵٫۴۲
ہلکا ۲۸٫۵۳ فی صد
شدید ۱۲٫۲۲ فی صد
(لڑکے)

متوازن ۵۰٫۴۵ فی صد
معمول کا ۵٫۷۸ فی صد
ہلکا ۲۸٫۲۳ فی صد
شدید ۱۵٫۵۹ فی صد
(لڑکیاں)

• این سی ایچ ایس کا معیار آٹھ ریاستوں کے

ماخذ ــــ این این ایم بی (دیہی) سروے (۹۲-۱۹۹۰ء)
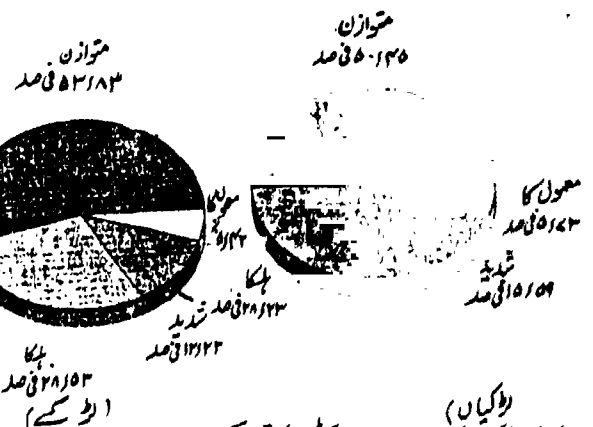
اس کی درجہ بندی وزن بہ اعتبار عمر کے اوسط پیمانے کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ غذائیت کی سطح کا تعین کرنے کا پیمانہ یہ رکھا گیا ہے کہ جن بچوں کو ۹۰ فی صد یا اس سے زیادہ مقوی غذا، ان کی عمر کے اعتبار سے ملتی ہے اسے معمول کا تصور کیا گیا ہے۔ باقی سبھی کو ناقص غذا والے خانے میں رکھا گیا ہے۔ ناقص غذائیت کی سطح یوں مقرر کی گئی ہے۔ ہلکا (وزن کے اعتبار سے ۷۵ سے ۹۰ فی صد) متوازن (۶۰ سے ۷۵ فی صد) شدید (۶۰ فی صد سے کم)

یہ بچے جو غذا استعمال کرتے ہیں اس کا اندازہ ۲۴ گھنٹوں کے دوران استعمال کی جانے والی غذا کی بنیاد پر کیا گیا تھا۔

(دیکھیے گوشوارہ ۲)

گوشوارہ نمبر ۲

اوسط پروٹین اور کیلوریز کا استعمال

(۶ سے گیارہ سال کے دیہی بچے)

عمر (سال)	پروٹین (گرام) لڑکے	پروٹین (گرام) لڑکیاں	کیلوریز لڑکے	کیلوریز لڑکیاں
۵ — ۶	۲۸٫۴۵	۲۷٫۸۶	۱۱۰۲	۱۰۷۰
۶ — ۷	۳۱٫۰۰	۲۹٫۲۰	۱۱۶۳	۱۱۰۷
۷ — ۸	۳۲٫۵۶	۳۱٫۱۵	۱۲۵۲	۱۲۱۱
۸ — ۹	۳۶٫۵۰	۳۶٫۰۸	۱۳۷۹	۱۳۵۰
۹ — ۱۰	۳۷٫۸۵	۳۷٫۵۵	۱۴۵۸	۱۴۴۳
اوسط استعمال	۳۱٫۱۱	۳۲٫۸۰	۱۲۷۲	۱۲۵۷
خوراک میں اوسط کی سفارش	۳۹٫۵۰	۴۰٫۰۰	۱۹۰۳	۱۸۶۶
اوسط سے کم	۶٫۴۰	۷٫۲۰	۶۳۱	۶۰۹
مجموعی کمی	۶٫۸		۶۲۰	

ان بچوں میں توانائی کی کمی اس مقررہ مقدار کے ایک تہائی کے برابر ہے جس کی عام طور سے سفارش کی جاتی ہے۔ اگر اس خلا کو پاٹا جا سکے تو پروٹین کی کمی خود بخود پوری ہو جائے گی۔

اسکول جانے والے بچوں کی ناقص غذا

ڈی اگروال اور دوسروں نے (۱۹۸۱ء) اس سلسلے میں جو جائزے لیے تھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسکول جانے والے غریب اور دیہی علاقوں کے بچوں کو عام طور سے ناقص غذا پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ ان جائزوں سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ان بچوں کو مقوی غذا کے فقدان کے باعث پیدا ہونے والی بعض بیماریوں کا بھی شکار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں وٹامن اے کی کمی کے باعث پیدا ہونے والی بیماری بھی شامل ہے۔ غذائیت کے ماہر سائنس داں ڈاکٹر سی۔ گوپالن کے مطابق دیہی اسکولوں کے ۲۰ فی صد بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں کسی نہ کسی مرحلے میں کئی طرح کی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ ان میں چھوت کی بیماریاں مثلاً حلق کا درد اور سوجن وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ گٹھیا اور دل کا عارضہ بھی ہو سکتا ہے۔

۱۹۹۱ء میں میرلین ای لاک ہیڈ، بیڈریان ایم ویرسپور اور ان کے ساتھیوں نے ترقی پذیر ملکوں میں پرائمری تعلیم کی صورت حال بہتر بنانے کے سلسلے میں اپنی مطالعاتی رپورٹ پیش کی تھی اس میں اس بات کی نشاندہی کی گئی تھی کہ ہندوستان میں ۸۴ فی صد بچے ایسے ہوتے ہیں، جنھیں ایسی ناقص غذا ملتی ہے جو بعض بیماریوں کا باعث بنتی ہے۔ ۶۹ فی صد بچے ایسے ہوتے ہیں جو آئرن کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماری کا شکار ہوتے ہیں، جب کہ آیوڈین کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماری میں ۵۵ فی صد بچے مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ۴۸ فی صد بیماریاں کسی دوسری بیماری کی دین ہوتی ہیں۔ ان کے جائزے کے مطابق کم اور نچلی متوسط آمدنی والے ممالک کا تقابلی مطالعہ گوشوارہ ۳ میں پیش کیا جاتا ہے۔

اسکول جانے والے اور اسکول جانے والی عمر سے قبل کے بچوں اور ان کی غذائی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سی. گوپالن نے کہا ہے کہ "یہ بات تو بالکل درست ہے کہ اسکول جانے والی عمر سے قبل کے جو بچے ہوتے ہیں، وہ عمر کے بڑے اہم اور نازک مرحلے میں ہوتے ہیں لیکن اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اسکول جانے والی عمر، اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ

ہندوستان میں ۸۴ فی صد بچے ایسے ہوتے ہیں، جنھیں ایسی ناقص غذا ملتی ہے جو بعض بیماریوں کا باعث بنتی ہے۔ ۶۹ فی صد بچے ایسے ہوتے ہیں جو آئرن کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماری کا شکار ہوتے ہیں جب کہ آیوڈین کی کمی سے پیدا ہونے والی بیماری میں ۵۵ فی صد بچے مبتلا ہوتے ہیں۔

اس عمر کے بچوں نے نازک عمر میں درپیش خطرات کی منزل کو عبور کر لیا ہے اور بچپن کے پختہ مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں، لیکن اس عمر کے بہت سے بچوں میں بھی بہت سی کمزوریاں اور بیماریاں باقی رہ جاتی ہیں جو ان کے ابتدائی برسوں کی دین ہوتی ہیں۔ بہت سے بچوں میں ناقص غذا سے پیدا ہونے والی بیماریاں بھی ہوتی ہیں۔ بعض مطالعات سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ مکتبی یا علمی کاموں کا غذائی صورت حال سے بھی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اسکول جانے والی عمر سے کم عمر کے بچے، نسبتاً موت کے خطرات سے زیادہ گھرے رہتے ہیں لیکن اسکول جانے والے بچوں میں وہ بچے بھی سن بلوغت کو پہنچنے لگتے ہیں جن کی پرورش ناقص انداز سے ہوتی ہے۔ یعنی یہ اس منزل میں ہوتے ہیں جب وہ ہمارے مستقبل کے بالغ شہری بننے کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر ان پر توجہ نہ دی گئی تو ان کی صحت اور جسمانی کمزوریاں تاریک مستقبل کا اشارہ کریں گی۔

غذائی سہارا مہیا کرنے کا قومی پروگرام

اسی پس منظر میں اسکول جانے والے بچوں کی غذائی صورت حال پر نظر رکھنا اولین ترجیح کا حامل ہو جاتا ہے۔ اسکول کے بچوں کو دن کا کھانا مہیا کر کے حکومت کی جانب سے اس سمت قابل تحسین کوشش ہو رہی ہے۔ پرائمری اسکول کے بچوں کو مقوی غذا فراہم کرنے کا حکومت ہند نے جو قومی پروگرام ۱۵ اگست ۱۹۹۵ء سے شروع کیا وہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دن وزیر اعظم شری پی. وی. نرسمہا راؤ نے دن کے کھانے والی اسکیم کا افتتاح بہادر گڑھ میں کیا جو ریاست ہریانہ کے روہتک ضلع کی ایک تحصیل ہے۔

گوشوارہ نمبر ۳

ناقص غذا سے پیدا ہونے والی نیز چھوت کی بیماریوں کی، بچوں کے فی صد کے اعتبار سے تفصیل (متعدد سال)

ملک	ناقص غذا سے پیدا ہونے والی بیماری •	آئرن کی کمی	آیوڈین کی کمی	دوسری بیماری کی دین
کم آمدنی				
بنگلہ دیش	۷۱٫۰	۲۳٫۰	—	..
چین	۵٫۰	۸۶٫۹	—	۲٫۴
ہندوستان	۸۴٫۴	۶۹٫۴	۵۵٫۴	۴۸٫۰
(نچلی متوسط آمدنی)				
انڈونیشیا	۶۹٫۹	—	۷۲٫۵	—
فلپائن	۵۹٫۴	۲۰٫۶	۱۵٫۱	۸۷٫۷
تھائی لینڈ	۸٫۰	۱۱٫۴	۲۳٫۵	—
ملیشیا	۵۲٫۷	—	—	۸۹٫۰

—— اعداد و شمار دستیاب نہیں

• بہ اعتبار عمر انسانی قد یا ساخت کو پیمانہ تصور کیا گیا ہے۔

(نوٹ :۔ اس گوشوارے میں اسکول جانے والے بچوں کی عمر کے اعتبار سے اعداد و شمار جمع کیے گئے ہیں۔ جائزوں میں مختلف اوقات، مختلف مثالوں اور مختلف معیار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ملکوں اور بیماریوں کا تقابل کرتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔)

پروگرام کے پیش رو

دن کے کھانے کی اسکیم کو عالمی پیمانے پر بچوں کو ملنے والی ناقص غذا کے خلاف سرکاری طور پر چھیڑی ہوئی جنگ تصور کرنا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا آغاز جرمنی، فرانس اور دوسرے ممالک میں ہوا لیکن اس میں تیزی اس صدی کے آغاز میں انگلینڈ میں آئی۔ دستیاب معلومات کے مطابق

تعداد اور حاضری بڑھانے نیز اسکول جانے کی ان کی عادت بنائے رکھنے کے جتن کیے جائیں گے۔
—— بچوں میں صحت مند سماجی شعور پیدا کرنا تاکہ ان میں ذات پات اور فرقہ وارانہ اختلافات کا رجحان پیدا ہو۔
—— غریب طبقوں میں بتدریج سماجی اور معاشی سطح پر یہ تبدیلی لائی جائے۔
—— غریبی کی سطح سے نیچے کی زندگی گزارنے

نہیں ہے، وہاں ان علاقوں کا انتخاب کیا جائے گا جہاں قومی اوسط کے مقابلے عورتوں کی شرح خواندگی کم ہے اور دہلی، چنڈی گڑھ اور پانڈیچری جیسے مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں جہاں کہیں بھی اس طرح کے بلاکوں کا وجود نہیں ہے وہاں پرانی گندگی بستیوں میں اس پروگرام کو نافذ کیا جائے گا۔

عورتوں کے کم خواندگی والے باقی علاقوں میں جن کی تعداد ۲۰۰۰ کے قریب ہے، ۹۷-۱۹۹۶ء میں اس پروگرام کا اطلاق ہوگا اور ۹۸-۱۹۹۷ء میں اس پروگرام کے تحت دوسرے تمام پرائمری اسکولوں کو شامل کر لیا جائے گا۔

> اسکول جانے والے بچوں میں وہ بچے بھی سن بلوغت کو پہنچنے لگتے ہیں جن کی پرورش ناقص انداز سے ہوتی ہے یعنی یہ اس منزل میں ہوتے ہیں جب وہ ہمارے مستقبل کے بالغ شہری بننے کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر ان پر توجہ نہ دی گئی تو ان کی صحت اور جسمانی کمزوریاں تاریک مستقبل کا اشارہ کریں گی۔

اس وقت دنیا کے ۴۰ سے زیادہ ممالک اسکول کے بچوں کو دن کا کھانا مہیا کر رہے ہیں جس کے تحت اسکول کے بچوں کو بہتر غذا ملتی ہے۔

ہندوستان میں صحیح معنوں میں بچوں کو مقوی غذا فراہم کرنے کا پروگرام آزادی کے بعد ہی شروع کیا گیا۔ اس وقت ملک میں ایک خصوصی پروگرام کے تحت کام ہو رہا ہے جو دراصل بچوں کے لیے شروع کیے گئے مربوط ترقیاتی خدمات کا ایک حصہ ہے اور اس کے تحت ۶ سال سے کم عمر کے بچوں اور حاملہ عورتوں کو مقوی غذا فراہم کرنے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ اس پروگرام کے توسط سے جو لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ انھیں سال میں ۳۰۰ دن کے لیے ضمنی خوراک مہیا کی جاتی ہے۔

دن کے کھانے کی اسکیم کا مقصد

پرائمری اسکول کے بچوں کو دن کے کھانے کی شکل میں مقوی غذا فراہم کرنے کا جو قومی پروگرام شروع کیا گیا ہے اس کے مقاصد یہ ہیں۔

(الف) بچوں کو بہتر معیار کی غذا ملے اور

(ب) ابتدائی تعلیم کے ہمہ گیر پھیلاؤ کے کام میں تیزی لائی جائے تاکہ ۲۰۰۰ء کے طے شدہ وقت سے پہلے ہی نشانہ پورا کر لیا جائے۔ اس کے تحت اسکول میں بچوں کی

والوں، بالخصوص اس طبقے کی عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کیے جائیں۔

پروگرام کا وسیع تر اطلاق

پرائمری تعلیم کو مقوی غذا کا سہارا دینے کے قومی پروگرام کے تحت سرکاری اور مقامی اداروں اور سرکاری امداد پر چلنے والے تمام ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے اسکولوں میں مرحلہ وار طور پر بچوں کو دن کا کھانا مہیا کیا جائے گا۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں نئے عوامی

مرکزی معاونت اور اناج کی فراہمی

جہاں یہ اسکیم نافذ کی جائے گی وہاں نگر پالیکا اور پنچایت جیسے مقامی اداروں کو مرکز کا تعاون حاصل ہوگا اور چاول یا گیہوں فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے مقامی گوداموں سے مہیا کیے جائیں گے۔ اناج سو گرام فی طالب علم اور فی روز کی شرح سے دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں وضع کردہ مندرجہ ذیل ضابطوں پر عمل کیا جائے گا۔

—— اناج مہیا کرنے کا مرکز ضلعی یونٹ ہوگا۔
—— اناج ہر تین ماہ بعد فراہم کیا جائے گا۔
—— پہلے سہ ماہی عرصے میں اناج مہیا کرنے کی بنیاد یہ بات ہوگی کہ چھٹے کل ہند تعلیمی

> پرائمری اسکول کے بچوں کو مقوی غذا فراہم کرنے کا حکومت ہند کا جو قومی پروگرام ۱۵ اگست ۱۹۹۵ء سے شروع کیا وہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ [illegible] وزیر اعظم شری پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے دن کے کھانے والی اسکیم کا افتتاح بہادر گڑھ میں کیا جو ریاست ہریانہ کے روہتک ضلع کی ایک تحصیل ہے۔

نظام تقسیم کے تحت تمام ۲۴۴۶ بلاکوں نیز یقینی روزگار اسکیم کے تحت آنے والے تمام تر بلاکوں میں یہ پروگرام شروع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ایسے بلاکوں کا بھی اس پروگرام کے تحت احاطہ کیا جائے گا جہاں عورتوں میں خواندگی کی شرح بہت کم ہے۔ پنجاب جیسی ریاستوں میں جہاں نئے عوامی نظام تقسیم اور یقینی روزگار اسکیم کے تحت آنے والے بلاکوں کا وجود

سروے نے کتنے بچوں کے داخلے کے اعداد و شمار جمع کیے ہیں۔
—— بعد کے سہ ماہی عرصے میں اناج مہیا کرنے کا دارومدار ان باتوں پر ہوگا۔
(۱) فوڈ کارپوریشن آف انڈیا نے اناج کی تقسیم سے متعلق کیا تفصیل پیش کی ہے۔
(۲) ہر ضلع سے اناج کی تقسیم کے بارے میں کیا رپورٹ پیش کی گئی۔ اور

(۴) ریاستوں سے داخلے سے متعلق کیا اعداد و شمار پیش کیے گئے۔

—— فوڈ کارپوریشن آف انڈیا سے جس سہ ماہی عرصے کے لیے اناج مہیا کیا جائے گا، وہ صرف اسی عرصے کے لیے مخصوص ہوگا۔ اگلی سہ ماہی مدت میں اسے سپلائی نہیں کیا جائے گا۔

—— مرکز کی جانب سے اضلاع کو مجموعی طور پر جو اناج دیا جائے گا اس کے سلسلے میں ضلع کلکٹر یہ فیصلہ کرے گا کہ اسے حاصل کرنے کا مجاز ہر اسکول یا مقامی ادارے سے کون ہوگا۔ ضلع کلکٹر ہی اس بات کا فیصلہ بھی کرے گا کہ گودام سے اناج کون اٹھائے گا۔

اناج کی تقسیم کا بندوبست

اس کی ذمہ داری بنیادی طور پر ضلع کلکٹر پر عاید ہوگی، یعنی فوڈ کارپوریشن آف انڈیا سے اناج حاصل کرنا، اسے ان مقامی اداروں تک پہنچانا، جو اس کے مجاز ہیں، نیز اسے تقسیم کرنا ضلع کلکٹر کی ذمہ داری ہوگی، ضلع کلکٹر ہی اس بات کو بھی یقینی بنائے گا۔ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا اور ضلع کے اسکولوں کے درمیان مناسب رابطہ قائم ہو تاکہ اناج کی فراہمی آسانی سے ہو سکے۔ اناج لے جانے کے لیے ٹرانسپورٹ پر جو اخراجات آئیں گے وہ بعد میں مرکزی حکومت شہر کی نگر پالیکاؤں اور ضلع دیہی ترقیاتی ایجنسی کو ادا کر دے گی۔

ضلع دیہی ترقیاتی ایجنسی کے لیے جو شرح مقرر کی گئی ہے یعنی ۲۵ روپے فی کوئنٹل، اس کا اطلاق دوسرے اداروں پر بھی ہوگا۔ اناج اور ٹرانسپورٹ پر خرچ ہونے والی رقم ریاستی حکومت کی جانب سے اندراج اور حاضری سے متعلق فراہم کردہ تفصیلات کی بنیاد پر اضلاع کو براہ راست دی جائے گی۔

اسکیم نافذ کرنے والی ایجنسیاں

اس پروگرام کو نافذ کرنے کی ذمہ داری نگر پالیکاؤں اور پنچایت جیسے مقامی اداروں کی ہوگی۔ اس کے عوض ان اداروں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اگر چاہیں تو پکا ہوا کھانا مہیا کرنے کا بندوبست کریں یا صرف اناج مہیا کریں۔ اس کا دارومدار اس بات پر ہوگا کہ وہ اسکول کے حکام، والدین اور ٹیچر کی تنظیموں، ماؤں اور ٹیچروں کی کونسل، غیر سرکاری تنظیموں یا خواتین کی انجمنوں کے اشتراک سے، کون سا طریقۂ کار وضع کرتے ہیں۔

اخراجات کی بھی گنجائش موجود ہے کہ باورچی خانے کا سائبان بنانے اور کھانا پکانے میں جو اخراجات آئیں گے وہ حکومت کی جانب سے ادا کر دیے جائیں گے۔ ان اخراجات کا احاطہ غریبی دور کرنے کی اسکیم کے تحت کیا جائے گا جو دیہی ترقیات کی وزارت کے تحت کام کر رہی ہے۔

اس بات کا فیصلہ بھی مقامی ادارے ہی کریں گے کہ بچوں کو کس طرح کا کھانا دیا جائے گا لیکن شرط یہ ہوگی کہ اس میں اتنی ہی غذائیت ہو جتنی سو گرام چاول یا گیہوں (فی کس فی روز) میں ہوتی ہے۔ مقامی اداروں کا فرض ہوگا کہ وہ اس طور پر اس پورے عمل کی نگرانی کریں کہ حقیقی معنوں میں مقدار اور معیار میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔

اس پروگرام کو نافذ کرنے کی ذمہ داری نگر پالیکاؤں اور پنچایت جیسے مقامی اداروں کی ہوگی۔ اس کے عوض ان اداروں کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اگر چاہیں تو پکا ہوا کھانا مہیا کرنے کا بندوبست کریں یا صرف اناج مہیا کریں۔

مقامی اداروں کو ان کے علاقے میں پروگرام شروع ہونے کے بعد دو سال کی مدت ملے گی کہ وہ بچوں کو ادارہ جاتی سطح پر کچا یا پکا ہوا کھانا فراہم کرنے کا انتظام کریں۔ اس وقت تک وہ ابتدائی کارروائی کے طور پر درجہ پہلے سے پانچویں تک کے بچوں کو ۳ کلوگرام ماہانہ کی شرح سے تمام بچوں کو اناج مہیا کریں لیکن اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ حاضری ۸۰ فی صد سے کم نہ ہو۔

اس بات کی بھی گنجائش موجود ہے کہ باورچی خانے کا سائبان بنانے اور کھانا پکانے میں جو اخراجات آئیں گے وہ حکومت کی جانب سے ادا کر دیے جائیں گے۔ ان اخراجات کا احاطہ غریبی دور کرنے کی اسکیم کے تحت کیا جائے گا، جو دیہی ترقیات کی وزارت کے تحت کام کر رہی ہے۔

نگرانی اور جائزہ

مقوی غذا فراہم کرنے کا یہ پروگرام اس بات کا متقاضی ہے کہ ہر سطح پر اس کی نگرانی کی جائے اور کارکردگی کا جائزہ لیا جائے۔ چوں کہ ضلع ہیڈکوارٹر ہی اس پروگرام اصل مرکز ہوگا لہٰذا کلکٹر کی سربراہی میں اس کی نگرانی کے لیے کمیٹی بنانا ضروری ہوگا۔ یہ کمیٹی وسیع تر نمائندگی پر قائم ہونی چاہیے تاکہ ممبران پارلیمنٹ ایم۔ ایل۔ اے، سرپنچ، ضلع پنچایت کے ممبر، نگر پالیکا کے چیئرمین اور متعلقہ محکموں کے افسران کو بطور نمائندہ شامل کیا جاسکے۔

اس کمیٹی کو چاہیے کہ پروگرام کے تعلق سے بیداری لائے، اس کے نفاذ کے لیے آسانیاں مہیا کرنے کی کوشش کرے نیز کارکردگی کا جائزہ لے۔ اس کے علاوہ دوسرے متعلقہ پروگراموں مثلاً بچوں کی ترقی سے متعلق مربوط خدمات، ابتدائی تعلیم اور اسکول کے بچوں کی صحت سے متعلق پروگراموں میں ربط قائم کرے ان سطحوں پر پنچایت اور بلاک کے دائرے میں اس طرح کی مزید کمیٹیاں قائم کی جانی چاہئیں اور انھیں اسی طرح کی ذمہ داریاں بھی سونپی جانی چاہئیں۔

ریاستی سطح پر ایک محکمہ کو اس پروگرام کے نفاذ کا کام دیا جانا چاہیے۔ اگر پرائمری تعلیم کے محکمے کے ساتھ تال میل قائم کرنا ہو تو چیف سکریٹری / ترقیاتی کمشنر کی سربراہی میں اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جانی چاہیے۔ سکریٹریوں اور متعلقہ محکموں کے سربراہوں کو اس کا رکن بنایا جانا چاہیے۔ اس

کمیٹی کی خاص ذمہ داریوں میں ایک ذمہ داری یہ ہونی چاہیے کہ وہ پرائمری تعلیم، بنیادی صحت، بچوں کی مناسب نگہداشت، ان کے لیے مقوی خوراک کی فراہمی اور متعلقہ خدمات کے فروغ پر توجہ دیں اور اس کی نگرانی بھی کریں۔

پروگرام کا جائزہ لینے کے لیے حکومت ہند کے محکمہ تعلیم کو چاہیے کہ وہ نیشنل انفارمیٹک سینٹر کے مشورے سے کمپیوٹر پر مبنی ایک اطلاعاتی سسٹم قائم کرے۔ جب تک یہ سسٹم نافذ العمل نہیں ہو جاتا تب تک یہ ذمہ داری ریاستوں کی ہو گی

کہ وہ اس پروگرام کے نفاذ سے متعلق جانکاری فراہم کرنے کے کام کو یقینی بنائیں۔

مرکز نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ جائزہ لینے کا کام مرکزی پیمانہ پر ہو اور اس کی ذمہ داری کسی آزاد ادارے کو سونپی جائے۔ اس طرح کے مقاصد کے لیے قائم کیے گئے اداروں کو مناسب سہولیات فراہم کی جانی چاہئیں تاکہ وہ اپنا کام ٹھیک ڈھنگ سے انجام دے سکیں۔

ریاستی حکومتوں کا رول

اس پروگرام پر عمل درآمد کے لیے اصل بنیاد ریاستی حکومت کی اسکیم فراہم کرے گی لہٰذا جب ریاستیں اسکیم کا خاکہ پیش کریں گی تو یہ توقع کی جائے گی کہ پروگرام کے تحت آر۔ پی۔ ڈی/ ای۔ اے۔ ایس/ ایل۔ ایف۔ ایل بلاک، مقامی اداروں/ حکام اور شہری علاقوں کی گھنی آبادی والی گندی بستیوں کا احاطہ کیا جا سکے گا۔ ان بلاکوں/ علاقوں/ بستیوں میں واقع پرائمری اسکولوں کی تعداد کی زمروں کے ساتھ نشاندہی کی جائے گی۔ جتنے بچوں نے داخلہ لیا ہے ان کی تعداد بتائی جائے گی۔ وضع کردہ پیمانے کو ذہن میں رکھتے ہوئے اناج کے معیار کی نشاندہی کی جائے گی۔ تعلیمی سال میں ہر ماہ کتنے دن پڑھائی ہوئی۔ ڈی۔ آر۔ ڈی۔ اے کے نام اور پتے درج کیے جائیں۔ کھانا پکانے اور اسے تقسیم کرنے کی سہولیات فراہم کرنے کی تفصیل دی جانی چاہیے۔ اس محکمے کا نام دیا جائے جو یہ پروگرام چلانے کا ذمہ دار ہو گا۔ ہر ضلع اور ہر اسکول کے درجہ اوّل سے درجہ پنجم تک کے بچوں کی حاضری کی تفصیل دی جائے۔ ہر ماہ تفصیلی رپورٹ دی جائے جس میں فوڈ کارپوریشن آف انڈیا سے اٹھائے گئے اناج کے معیار کی تصدیق ہو تاکہ فوڈ کارپوریشن کی رقم ادا کی جائے ساتھ ہی ٹرانسپورٹ پر آنے والے اخراجات کی بھی تفصیل بتائی جائے تاکہ ڈی آر ڈی اے/ نگر پالیکا کو واجب الادا رقم دی جا سکے۔ باورچیوں یا دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنے والوں کو مزدوری کے یا معاوضے کی شکل میں دی جانے والی رقوم نیز باورچی خانے کے لیے سائبان کی تعمیر جیسے کاموں پر آنے والے اخراجات کی تفصیل دیہی ترقیات کی مرکزی وزارت کو پیش کی جانی چاہیے تاکہ اسے غریبی دور کرنے کے پروگرام میں شامل کیا جا سکے۔

موجودہ اسکیمیں

بہت سی ریاستیں اور مرکز کے زیر انتظام علاقے دن کے کھانے کی اسکیم کو پہلے ہی سے نافذ کر رہے

ہیں۔ ان ریاستوں میں مقامی ادارے، اس پروگرام کے تحت وضع کردہ اصولوں کے مطابق مرکزی امداد حاصل کرنے کے بھی مجاز ہوں گے۔ لیکن اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ اس پروگرام کے تحت مرکز سے اس مد میں جو رقم وصول ہو گی اسے وہ ریاستیں اور مرکز کے زیر انتظام علاقے ابتدائی تعلیم سے متعلق دوسرے کاموں پر صرف کریں گے، خاص طور سے معیار کو بلند کرنے کے پروگرام کو ترجیح دیں گے۔

تحقیقی مطالعات

لاکھیڈ اور ورسیتور نے ۱۹۹۱ء میں جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں بچوں کی غذائی صورت حال اور اسکول میں ان کی کارکردگی کے درمیان جو ربط ہوتا ہے اس کے بارے میں متعدد تحقیقی کاموں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس طرح کی تحقیق، اسکول میں نام لکھوانے کی عمر، غیر حاضری، اسکول چھوڑ دینے کے واقعات، امتحانات کے نتائج، بچوں کی عام ذہانت، خاص کاموں میں بچوں کی کارکردگی (جس میں کلاس کی پڑھائی میں دلچسپی لینا بھی شامل ہے) جیسے عوامل کو سامنے رکھ کر کی گئی تھی۔ اگرچہ متعدد قسم کی باتیں سامنے آئیں لیکن اس مثبت بات کی تصدیق ضرور ہو گئی کہ مقوی غذا سے ذہنی صلاحیتوں اور تعلیمی کامیابیوں کا گہرا رشتہ ہے۔ تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ کسی وجہ سے صبح کا ناشتہ نہ کرنے کے باعث جن بچوں کو فوری طور پر بھوک محسوس ہوتی ہے ان کا دل پڑھائی میں اتنا نہیں لگتا جتنا ان بچوں کا لگتا ہے جو کھا کر آتے ہیں۔ تحقیق سے جو دوسرے پہلو سامنے آئے وہ یہ ہیں۔

- آیوڈین آئرن اور وٹامن کی کمی، اسکول کے کاموں پر برا اثر ڈالتی ہے۔
- متواتر بیمار رہنا، جس کے نتیجہ میں بچے غیر حاضر رہتے ہیں، یا چھوت کی بیماری ہو جاتی ہے یا بینائی اور سماعت پر خراب اثر پڑتا ہے، پڑھائی پر بہت برا اثر مرتب کرتا ہے۔

اس طرح کے حقائق ہندوستان اور بین اقوامی پیمانے پر کیے گئے دیگر سروے کے نتیجہ میں بھی سامنے آئے ہیں۔ اگرچہ ان تمام تحقیقات کا خلاصہ پیش کرنا تو مشکل ہے لیکن حکومت ہند نے دن کے کھانے کے پروگرام سے متعلق جو کمیٹی تشکیل کی تھی اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کہ اسکول میں مقوی غذا فراہم کرنے سے حاضری

میں یقینی طور پر اضافہ ہوتا ہے۔ اس طرح کی رپورٹوں سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ناقص غذائیت نیز بینائی، سماعت اور صحت کو نقصان پہنچانے والے دوسرے عوامل کو دور کرنے سے پڑھائی لکھائی میں زبردست کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

ان امور کا مطالعہ کرنے والے ماہرین نے اسکول میں دن کے کھانے کا اہتمام کرنے والے منصوبہ سازوں اور منتظمین سے بعض معاملات میں احتیاط برتنے کے لیے کہا ہے۔ مثلاً

(۱) ان پروگراموں کو موثر بنانے کے لیے پوری احتیاط برتنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ پڑھائی کا وقت برباد نہ ہو۔

(۲) اس پروگرام کو جہاں تک ضروری ہو باقی رکھنا چاہیے اور ایسی صورت حال سے احتراز کرنا چاہیے جس کے تحت پروگرام درمیان ہی میں بند ہو جائے اور اسکول کی کارکردگی یا اشتراک پر منفی اثر پڑے۔

(۳) مقوی غذا فراہم کر کے اسکولوں میں حاضری بڑھانے کا جو اہتمام کیا جا رہا ہے اس کا اطلاق اسکول کے پورے اوقات پر ہونا چاہیے تاکہ تعلیم کے فروغ میں نمایاں کامیابی حاصل کی جا سکے۔

تامل ناڈو کی مثال

تامل ناڈو میں اسکول کے بچوں کو دن کا کھانا فراہم کرنے کا پروگرام سب سے پہلے مدراس کارپوریشن نے ۱۹۲۵ء میں شروع کیا تھا جس کے تحت ۲۵۰ لڑکے مستفید ہوئے تھے اور اب صورت حال یہ ہے کہ پروگرام اتنی وسعت اختیار کر گیا ہے کہ اس کے تحت اسکول جانے کی عمر سے قبل کے بچوں سے لے کر اسکول جانے والے ۱۵ سال تک کی عمر کے تمام بچوں کو دن کا کھانا مہیا کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اولڈ ایج پنشن پانے والوں، ریٹائرڈ سروس مین نیز ان کی بیواؤں کو بھی کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔ یہ کھانا سال میں ۲۰۰ سے لے کر ۳۶۵ دنوں تک دیا جاتا ہے اور اس کا سالانہ بجٹ ۲۰۰ کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

قومی اسکیم کے شروع ہونے سے پہلے دن کے کھانے سے متعلق قائم کی جانے والی کمیٹی نیز حکومت ہند کے سینئر افسران نے تامل ناڈو کے اس پروگرام کا جائزہ لیا تھا۔ پروگرام شروع کیے جانے کے بعد متعدد ریاستی حکومتوں کے افسران کی ٹیم نے تامل ناڈو کا دورہ کر کے براہ راست صورت حال کا جائزہ لیا۔

راجیل دیادوس اور یونیسکو کے سروے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ دن کے کھانے کی اسکیم کے تحت غذائیت کے اعتبار سے بچوں پر بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ نمونے کے طور پر کنیا کماری جیسے خواندگی کی اعلا شرح والے اضلاع کا سروے کرنے سے پتا چلا ہے کہ دن کے کھانے کی اسکیم نے بلاشبہ اسکول کی حاضری پر اچھا اثر ڈالا ہے اور اسکول چھوڑنے کی شرح کم ہوئی ہے۔

روزگار کے محاذ پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلے گا کہ تامل ناڈو میں دن کے کھانے کی اسکیم، تامل ناڈو کے دیہی علاقوں میں روزگار کے مواقع پیدا کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ ثابت ہوئی ہے جس کے تحت ۱۰۶ لاکھ افراد کو روزگار حاصل ہوا ہے ان میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہے جو منتظم باورچی اور معاون کی حیثیت سے برسر روزگار ہیں۔

تامل ناڈو میں دن کے کھانے کی اسکیم ذات پات کے امتیاز سے ماورا اور ہم آہنگی پر مبنی سماج کی تشکیل کا ایک بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔ ایک مطالعے کے مطابق "بچوں کو ایک دوسرے سے ملنا جلنا، ایک ساتھ کھانا اور کھیلنا سکھایا جاتا ہے اور اس طرح بچوں میں کم عمری میں ہی ہندوستانی شہری ہونے کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے اور وہ ہر طرح کے اختلافات اور تقسیم کے تصور سے بلند ہونے لگتے ہیں۔ دراصل یہی طریقہ کار غیر مراعات یافتہ طبقے میں سماجی و معاشی تبدیلی کا باعث بنے گا۔"

"بچوں کو ایک دوسرے سے ملنا جلنا، ایک ساتھ کھانا اور کھیلنا سکھایا جاتا ہے اور اس طرح بچوں میں کم عمری میں ہی ہندوستانی شہری ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ ہر طرح کے اختلافات اور تقسیم کے تصور سے بلند ہونے لگتے ہیں۔ دراصل یہی طریقہ کار غیر مراعات یافتہ طبقے میں سماجی و معاشی تبدیلی کا باعث بنے گا۔"

قصہ مختصر

ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں غریبی کا خاتمہ اقتصادی سرگرمیوں کا بڑھاوا، اضافہ آبادی پر روک لگانا اور صاف اور صحت مند ماحولیات قائم کرنا۔ ایسی چیزیں ہیں جو اولین ترجیح کی حامل ہیں۔ یہ عوامل عوام کو صحیح معنوں میں اختیار دلوانے کے متقاضی ہیں لیکن ہمہ گیر ابتدائی تعلیم کے بغیر عوام کے اختیارات کو صرف ایک واہمہ تصور کیا جائے گا۔ ہمہ گیر ابتدائی تعلیم لڑکیوں اور پسماندہ طبقوں کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔ لہٰذا ہمہ گیر ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کے تمام اقدامات کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے۔ ●

[illegible]۳: ایڈز کے خلاف جنگ - رضاکار تنظیموں کا رول

پیش رفت کریں اور اس دشوار مسئلہ کے حل کے لیے اپنا بھرپور تعاون پیش کریں۔

درپیش چیلنج

ایڈز کا باعث بننے والے عوامل قطعی عجیب

> [illegible] بیماری پر قابو رکھنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ [illegible] زیادہ سے زیادہ غیر سرکاری تنظیمیں اس سمت پیش رفت کریں اور [illegible] مسئلے کے حل کے لیے اپنا بھرپور تعاون پیش کریں۔

نوعیت کے ہیں۔ اس سے پہلے چھوت کی بیماری کا باعث بننے والے عوامل اتنے عجیب نوعیت کے نہیں ہوتے تھے۔ ایڈز کے عوامل یہ ہیں:

۱۔ اس کا تعلق چھوت کی عام بیماریوں کے برعکس بنیادی طور پر جنسی اختلاط سے ہے۔ چھوت کی عام بیماریاں، معمولی سماجی رابطوں کے باعث بہت آسانی سے ایک آدمی سے دوسرے میں پہنچ جاتی ہیں۔ جب کہ ایڈز کا معاملہ یہ ہے کہ یا تو یہ جنسی اختلاط کے باعث پھیلتی ہے یا پھر ایک دوسرے کے خون کی آمیزش سے۔

۲۔ یہ ایک ایسی موذی بیماری ہے جس کی روک تھام کے لئے اس وقت کوئی دوا یا طریقہ علاج موجود نہیں ہے۔ ایک بار اگر کسی شخص کے جسم میں اس کے جراثیم داخل ہو گئے تو وہ زندگی بھر کے لئے آ گئے۔ اس کے ذریعہ یہ بیماری وقت کے ساتھ ساتھ دوسروں میں بھی پھیلتی جائے گی۔

۳۔ چھوت کی دوسری بیماریوں کی روک تھام کے کئی طریقے ہیں جن میں سے ایک طریقہ تو یہی ہے کہ ایسے طبی اقدام کئے جاتے ہیں جن کے تحت اُن علامتوں پر قابو پا لیا جاتا ہے، جو چھوت کی بیماری سے متعلق ہوتی ہیں تاوقتیکہ چھوت سے محفوظ رہنے کا انسان کا مزاحمتی نظام ہی جواب نہ دے جائے۔ جب کہ ایڈز کے جراثیم قدرتی مزاحمتی نظام کو تباہ کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ایک ایسا مسئلہ درپیش ہے، جس کا سامنا اس سے پہلے کبھی نہیں کرنا پڑا تھا۔

۴۔ ہیضہ، ملیریا اور تپ دق جیسی چھوت کی بیماری کا علاج کلینک اور حفظانِ صحت سے متعلق دوسرے اداروں یا اقدامات کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے لیکن ایڈز ایسی موذی بیماری ہے جس میں اتنی طاقت موجود ہے کہ وہ صحت سے متعلق ان مسائل کو مزید پیچیدہ بنا دیتی ہے جس کے باعث حفظانِ صحت کی موجودہ خدمات پر اور زیادہ بوجھ بڑھ جاتا ہے اور اس طرح اُن کامیابیوں پر پانی پھیر جاتا ہے جو بچپن اور زچگی کے دوران کی شرح اموات کو کم کر کے حاصل کی گئی ہیں۔

۵۔ ایڈز کا ایک دوسرا خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ ایک ایسی سماجی لعنت کے طور پر وارد ہوئی ہے کہ اس سے انسانی زندگی کا ایک انتہائی اہم اور ذاتی گوشہ سنگین خطرے میں گھر گیا ہے۔

> ایڈز کے یہ خاص عوامل بلاشبہ بے حد خطرناک ہیں لیکن ان کا ایک مثبت پہلو بھی ہے [illegible] اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ جنس کے معاملے میں [illegible] منشیات کے استعمال کی روک تھام کر کے محفوظ طبی طریقوں [illegible] کنڈوم کے استعمال کو بھی فروغ دے کر ابتدائی سطح پر ہی [illegible] بیماری کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔

ایڈز کے یہ خاص عوامل بلاشبہ بے حد خطرناک ہیں لیکن ان کا ایک مثبت پہلو بھی ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ جنس کے معاملے میں احتیاط برت کر، منشیات کے استعمال کی روک تھام کر کے، محفوظ طبی طریقوں کو بروئے کار لا کر اور کنڈوم کے استعمال کو بھی فروغ دے کر ابتدائی سطح پر ہی اس موذی بیماری کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔

اس سلسلے میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اجتماعی سطح پر سماجی رابطے قائم کرنے اور عوامی بیداری لانے میں غیر سرکاری تنظیمیں بڑی کامیاب اور گراں قدر خدمات انجام دے سکتی ہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں کا طریقۂ کار کچھ اس نوعیت کا ہے کہ یہ بین افرادی تعلیم کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے جس کے تحت یہ موقع ملتا ہے کہ کسی قابلِ اعتماد شخص سے رابطہ قائم کر کے اپنی کوششوں کے فوری نتائج کے بارے میں تفصیلات حاصل کی جائیں۔ ایچ آئی وی/ایڈز کی روک تھام کے لئے خاص زور اس بات پر دیا جانا چاہیے کہ زندگی کے طور طریقوں میں تبدیلی لائی جائے اور اس کے لئے ایک منصوبہ بند حکمت عملی ضروری ہے۔

غیر سرکاری تنظیمیں ایڈز سے متأثرہ افراد اور ان کے خاندان کے لوگوں کی سماجی معاونت کے لئے بھی ایک بنیاد فراہم کر سکتی ہیں جس کے تحت سماج کے اندر ایک ایسی فضا قائم ہو سکتی ہے کہ لوگ مرتے ہوئے شخص اس کے یتیم بچوں اور بے سہارا ہو جانے والے خاندان کی فلاح کا خیال رکھ سکیں۔

سماجی حقائق

"ایڈز پسماندگی کی علامت ہے۔" یہ ہمیں باور کراتی ہے کہ صحت سے متعلق خدمات کہاں کمزور ہیں، عورت کہاں کمزور ہے اور روزگار کے مواقع کہاں محدود ہیں۔ جب تک آپ ان حالات سے نہیں نمٹتے، اس وقت تک آپ ایچ آئی وی کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے میں کوئی خاص کام انجام نہیں دے سکتے۔"

موجودہ سرکاری خدمات (پی ایچ سی ضلعی اور شہری) ابھی تک صرف چند ہی پروگراموں کا بطور خاص احاطہ کر پائی ہیں لیکن اب انہیں اپنے دائرۂ کار کو بڑھا کر عوام کی وسیع تر ضروریات کا احاطہ کرنا ہوگا اور اسی کے مطابق اقدامات کرنے ہوں گے۔ اقتصادی عوامل - مثلاً طبی اور دوسرے بالواسطہ اخراجات نیز سسٹم سے متعلق عوامل مثلاً ڈاکٹر اور مریض کا تناسب، ڈاکٹر اور مریض کے تعلقات، ناکافی

معلومات اور ٹریننگ، حفظانِ صحت سے وابستہ ورکرز کی عدم دلچسپی، مواصلات اور ٹرانسپورٹ کا کمزور نظام، یہ وہ عوامل ہیں جو صحت سے متعلق خدمات کی راہ میں رکاوٹ بنتے رہے ہیں۔ لہٰذا ان مسائل سے مؤثر طور پر نمٹنا ضروری ہے۔

صحت کے شعبہ میں پیسے کمانے والا ضابطوں سے ماورا ایک پرائیویٹ سیکٹر بھی ہے جس کی کارکردگی میں پورے طور پر تبدیلی لانے کی ضرورت ہے اور ایسا ضابطہ نافذ کرنے کی ضرورت ہے کہ علاج و معالجہ کے سلسلے میں معقول اور محفوظ طریقے استعمال کرنا لازمی تصور کیا جائے۔ بنگلور میں ایک سروے کرنے سے پتہ چلا تھا کہ اکیاسی فیصد ڈاکٹر اب بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ صرف سوئی بدل دینے کے بعد ایک ہی سیرنج کو بار بار استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مشاہدہ کرنے سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اس پیشے سے وابستہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو سوئی بدلنا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

اٹلانٹا، جارجیا (امریکہ) کے بیماریوں پر قابو پانے اور ان کی روک تھام کرنے سے متعلق مرکز کے سروے سے پتہ چلا ہے کہ نہ صرف یہ کہ عورتوں میں مردوں کے مقابلے میں زخمی یا معذور ہو جانے کے امکانات تین گنا زیادہ ہوتے ہیں بلکہ ان میں چھوت کی بیماری اتنی تیزی سے پھیل رہی ہے کہ ۲۵ سے ۴۴ سال تک کی عمر کی عورتوں کی چوتھی سب سے بڑی قاتل یہی بیماری ہے۔ بڑے پیمانہ پر گھروں میں ہونے والی زچگی، گندے چاقو، بلیڈ یا ہنسوے کا استعمال، ڈریسنگ میں استعمال ہونے والی گندی ڈوریاں، طبی اعتبار سے غلط طریقۂ کار، زچگی کا پرانا اور ضرر رساں طریقہ اور غیر قانونی اور غیر محفوظ... اسقاطِ حمل کے معاملات عورتوں کی صحت کے لئے مزید خطرات کا باعث بن سکتے ہیں۔ ابھی تک ان بچوں یا نوجوانوں کی حالت پر توجہ نہیں دی جا سکی ہے جو ایڈز کی وبا کا شکار ہو سکتے ہیں۔ ان میں ایڈز کے جراثیم پیدا ہونے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں مثلاً جنسی استحصال، منشیات کا استعمال یا ان کے والدین میں ایچ آئی وی جراثیم کی موجودگی۔ سڑکوں پر آوارہ بھٹکنے والے اور مزدوری کرنے والے بچوں کی تعداد ہندوستان میں بہت بڑی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ میٹروپولیٹن شہروں میں جسم فروشی کرنے والوں میں پندرہ فی صد بچے ہوتے ہیں۔ جن کی عمر پندرہ سال سے کم ہوتی ہے۔ دوسرے پچیس ۲۵ فیصد سولہ سے اکیس ۲۱ سال کی عمر کے ہوتے ہیں۔

سڑکوں کے ان آوارہ بچوں اور نوجوانوں کی حالت پر بھی سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسری جگہ جانے والے مزدور، اور کام کی تلاش میں شہروں کا رخ کرنے والے افراد، خاص طور سے عورتیں اور بچے ایسی صورت حال کا شکار ہو سکتے ہیں کہ روزی کے چکر میں وہ کسی ایسے جال میں پھنس جائیں جو ان کے لیے تباہ کن ثابت ہو۔ صنعتی گھرانوں کو یہ خوف لاحق ہے کہ اس بیماری کی وجہ سے کام کے دن میں پچاس فیصد کی کمی واقع ہو سکتی ہے۔

ان لوگوں تک پہنچ کر جن کی رسائی کہیں نہیں ہوتی مثلاً غریب عورتوں، بچوں، بیمار، بے سہارا، قبائل، تارکینِ وطن، گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہونے والے انسان، ناخواندہ اور محروم طبقوں کو ایڈز کنٹرول پروگرام میں شامل کر کے غیر سرکاری تنظیمیں اس پروگرام کو ایک نیا اور اہم رخ عطا کر سکتے ہیں۔ سماجی سطح پر ان کا، کام کرنے کا جو تجربہ ہے وہ قومی پالیسی اور مقامی کوششوں کے درمیان موجود خلا کو پُر کر سکتا ہے۔ غیر سرکاری تنظیمیں اس بات کے

سڑکوں کے ان آوارہ بچوں اور نوجوانوں کی حالت پر بھی سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسری جگہ جانے والے مزدور اور کام کی تلاش میں شہروں کا رخ کرنے والے افراد خاص طور سے عورتیں اور بچے ایسی صورت حال کا شکار ہو سکتے ہیں کہ روزی کے چکر میں وہ کسی ایسے جال میں پھنس جائیں جو ان کے لیے تباہ کن ثابت ہو۔

لیے مشہور ہیں کہ وہ مقامی ضروریات کو سمجھتی ہیں اور اس کے مطابق کام کرتی ہیں اور پھر انہیں اعلیٰ سطح تک لے جا کر قومی مسائل میں شامل کراتی ہیں۔

غیر سرکاری تنظیموں کی کوششوں نے، تعلیم، کام کی ٹریننگ، اقتصادی سرگرمیوں اور قانونی حقوق کے بارے میں بیداری پیدا کر کے عوام کو حوصلے اور اختیارات دلوائے ہیں۔ وہ اگر ایڈز کی روک تھام کے اپنے آپ کو متحرک کریں تو اس کے بڑے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

لاعلمی

قومی پیمانے پر ایک سروے کیا گیا جس سے پتہ چلا کہ تیرہ ریاستوں (جن کے سروے ہوئے) میں ۸۳ فیصد شادی شدہ عورتیں ایسی ہیں جنھوں نے ایڈز کے بارے میں ابھی تک کسی سے کچھ سنا بھی نہیں تھا۔ اور جس چھوٹی سی تعداد نے سنا بھی تھا تو اس بیماری کے بارے میں اس کے تصورات بالکل غلط تھے۔

خرابی صحت کے بارے میں تہذیبی سطح پر، جو تصورات ہیں، ان میں طبی بیماری کے ساتھ ساتھ اخلاقی بحران کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مریض دواؤں کے ساتھ ساتھ عقائد اور رسم کے مطابق دعاؤں پر بھی بھروسہ کرتا ہے۔ عوام کا ایک بہت بڑا طبقہ اس بات پر یقین کرتا ہے کہ بیماری کی متعدد وجوہ میں یہ وجہیں بھی ہو سکتی ہیں کہ جنس سے متعلق عائد پابندیوں کو توڑا گیا ہو۔ خون ناقص یا ناپاک ہو۔ دیوی دیوتاؤں کی بددعا (شراپ) ہو، کسی کی نظر لگ گئی ہو، کسی نے کالا جادو کر دیا ہو۔ ایڈز سے متعلق بیداری لانے اور اس کی روک تھام کے سلسلے میں اقدام کرتے وقت اس پس منظر کو بھی سامنے رکھنا چاہیے اور اسے اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ روایتی طور پر علاج اور "جھاڑ پھونک" کرنے والوں کے تئیں لوگوں کا عقیدہ بہت پختہ ہوتا ہے۔ ان میں مذہبی منتر کے ذریعے "علاج" کرنے والے، سانپ کے کاٹے کا منتر جاننے والے ہڈی جوڑنے والے اور بد روحوں سے بات کرنے والے" شامل ہیں۔

جنسی اختلاط سے پیدا ہونے والی بیماری کے علاج اور ایڈز کی روک تھام کے نام پر کسی نوجوان دوشیزہ کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا ایک بہت بڑا واہمہ ہے جو بہت سے نوجوان بچوں کی زندگیاں برباد کر رہا ہے۔

ایچ آئی وی اور ایڈز کے معاملے میں چھوت پر اس خیال سے بھی غور کرنا چاہیے کہ یہ کسی اضافی عامل مثلاً ناقص کھانے یا جنسی بے راہ روی کے نتیجہ میں بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بار بار بخار یا دست آنے کی صورت میں بطور خاص علاج کے سلسلے میں ان زاویے کو سامنے رکھنا چاہیے۔ ایچ آئی وی اور ایڈز سے متعلق بیداری لانے کے پروگرام میں ان نکات کو سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔

جنسی زندگی یا جنسی بے راہ روی اور جنسی تجربے کے فرق کو سمجھنے میں جو غلطی ہوتی ہے، اسے دور کرنے کے

لیے تحقیق کی مدد لینی چاہیے۔ غیر سرکاری تنظیمیں سماجی سطح پر [illegible] کام کرکے جو تجربے حاصل کرتی ہیں اور جو [illegible]ت افزا ہوتے ہیں وہ حکومت کے ایڈز کے پروگرام کو بہت مستحکم بنا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دستاویزی عمل، کامیابی کے تجربات اور اس سلسلے میں حاصل کیے گئے سبق دوسری بہت سی رضاکار تنظیموں کی حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں کا، تدریجی عمل کا نہ صرف تجربہ ہے بلکہ اس پر ان کا پختہ یقین بھی ہے ان تجربات نے دیرپا اثرات بھی مرتب کیے ہیں۔ اختراعات، معقولیت اور انسانی احساسات پر مبنی ان کے طریقہ کار سماجی تبدیلیوں کا وسیلہ ثابت ہوئے ہیں۔

نسلی تصوّرات کی کشمکش

سڑکوں پر بھٹکنے والے ایک زخمی نوجوان کا، بمبئی کے ایک اسپتال سے ڈاکٹر کی جانب سے، حفاظتی لباس یا سامان کی عدم دستیابی کے باعث علاج کرنے سے انکار کیا جانا، ایک ایسا واقعہ ہے جو ایسی اور بھی متعدد کہانیوں کا پتہ دیتا ہے۔ اس سے دراصل اس پیشہ ورانہ شعبے میں راہ پانے والے تعصبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر ابتدا ہی میں اس رجحان کا قلع قمع نہ کیا گیا تو یہ جڑ پکڑ سکتا ہے۔

قانون کو بیک وقت دو طرح کے مفادات کے تحفظ کا حق دینا چاہیے ایک تو یہ کہ مریض کو یہ حق ملے کہ، بیماری سے اس کی حفاظت کی جائے اور دوسرے یہ کہ کسی بھی فرد کو جو بیمار ہو، یا خطرے میں گھرا ہوا تصور کیا جائے اس پر غیر منصفانہ پابندیاں نہ کی جائیں۔

سماجی حلقوں سے اُنس اور غیر تحکمانہ رویّوں کے باعث غیر سرکاری تنظیمیں نسلی اور انسانی حقوق کے متعلق سے بہت سے ایسے شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہیں جن پر ابھی تک توجہ نہیں دی گئی تھی

مستقبل

ہندوستان سے ایڈز کے خطرات کو کم کرنے کے لیے غیر سرکاری تنظیموں کے مثبت اور حقیقی اشتراک کو یقینی بنانے کے لئے مندرجہ ذیل باتوں پر غور کرنا پڑے گا

۱۔ ایک معینہ مدت کے دوران صورت حال کا ریاست بہ ریاست جائزہ اور حقیقت پسندانہ انداز سے جائزہ لیا جائے اور اس کے مطابق لائحہ عمل تیار کیا جائے۔

۲۔ غیر سرکاری تنظیموں کو اشتراکی عمل میں شامل کرنے نیز ان کے آزادانہ کام کے لیے اس شعبہ کے دائرۂ کار کو وسعت دی جائے۔

۳۔ شرائط اور ضوابط نیز طریقہ کار میں لچک پیدا کی جائے تاکہ مالی اور دوسری سطح پر امداد فراہم کرکے ایسے گروپ قائم کیے جا سکیں جن کے تحت ایسی اختراعات اور تحقیقی کاموں کی حوصلہ افزائی ہو جس سے ہماری ضروریات پوری ہو سکیں۔

۴۔ منصوبہ کو مالیہ فراہم کیا جائے تاکہ پائیداری کے ساتھ ان سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کے کام کو یقینی بنایا جا سکے۔

۵۔ جواب دہی عائد کرنے کا طریقہ وضع کیا جائے۔

۶۔ ضابطہ بندیوں کی وجہ سے ہونے والی تاخیر سے بچنے کے لئے کام کا جائزہ لینے کا نظام قائم کیا جائے۔ وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق لچک پیدا کی جائے اور کام کی نگرانی کی جائے تاکہ قومی پالیسی اور مقاصد میں کامیابی حاصل کی جا سکے۔

۷۔ عمل آوری کے دوران غیر سرکاری تنظیموں کو مطلوبہ لچک، کنٹرول اور اختیارات کے معاملے میں ان کا احترام کیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ جواب دہی کو بھی لازمی قرار دیا جائے۔

حاصل شدہ کامیابیوں یا نتائج کو اپنائیت کے احساس کے ساتھ دیکھا جائے اور مشترکہ انسانی درد کے احساس اور مشترکہ کوششوں کو فروغ دیا جائے۔

کارکردگی کی جانچ اور نیت کا حقیقی اندازہ اسی وقت ہوگا جب حکومت ان معاون تنظیموں کے کھلے اشتراک اور ساجھے داری کو برقرار رکھ سکے گی جو اپنی خدمات پیش کرتے وقت حکومت کے رویّوں اور اسکیموں کی تنقید بھی کرتی ہوں۔ غیر سرکاری تنظیموں کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ وہ ترسیل کے ایسے طریقے وضع کریں جن کے تحت اختلافات کو دور کیا جا سکے۔ اپنے نقطۂ نظر کے تئیں پالیسی سازوں اور بیوروکریٹس کو ہموار اور مطمئن کیا جا سکے۔ نیز زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس لڑائی میں شریک کیا جا سکے۔

بقیہ: راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری اور پنجاب کی تہذیب

کسی نہ کسی کے ہاں ضرور بچہ ہو جایا کرتا تھا اور وہ اپنے بچے کا نام رکھوانے کے لیے میرے والد کے پاس آیا کرتے تھے اور والد صاحب بچے کا نام عمر دین، خیر دین، نانک چند، اور فاطمہ وغیرہ رکھ دیا کرتے تھے اور سب لوگوں کو وہ نام قبول ہوتا تھا یہ نام اکثر بیساکھی کے روز رکھا جاتا تھا اور شیرنی بانٹی جاتی تھی۔"

(دکو کھ جلی۔ راجندر سنگھ بیدی ص ۶۸)

افسانہ "لمبی لڑکی" میں شادی سے ہی متعلق درج ذیل رسومات کا ذکر ملتا ہے۔

۱۔ شادی کے موقع پر سہاگن کے ساتھ کسی بیوہ کا موجود ہونا نامسعود سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ لڑکی کی رخصتی پر اس کی ڈولی پر پیسے لٹائے جاتے ہیں۔

پنجاب کی زندگی کی ایک اہم رسم یہ ہے کہ نئے شادی شدہ جوڑے مکر سکرانتی کے پہلے تہوار کو بڑے اہتمام سے مناتے ہیں۔ شوہر بیوی کے لیے ہنسلی اور پازیب وغیرہ بناتا ہے۔ خود بیدی کے الفاظ میں دیکھیں۔

"سنو کل سنکرانت ہے سنکرات تمہارے بہو بیٹے کا پہلا تہوار ہوگا۔ ہو سکے تو سونار کے پاس ہی بیٹھ کر ہنسلی ڈھلوا لینا نہیں تو اس کے عوض کوئی اور ہی لے لینا پل کی پل میں لوگی جلدی آنا میں نے تیوہار منانے کا بندوبست کر لیا ہے۔"

(دانہ ودام ص ۴۳)

بیدی کے افسانوں میں پنجاب کی زندگی کے جن مختلف النوع معلومات کا ذکر ملتا ہے اس سے پنجابی تہذیب و معاشرے کے بے شمار نئے گوشے اجاگر ہوتے ہیں اور پنجاب کی سرزمین کی جو انفرادی شناخت رقص و سرود اور روایات و اقدار کے حوالے سے قائم ہے وہ تمام خصوصیات ان کہانیوں میں پوری طرح در آئی ہیں۔

نشہ بندی: قوانین، نفاذ اور سدباب

ملک میں بڑھتی ہوئی منشیات کا استعمال ایک نہایت افسوسناک امر ہے۔ منشیات کے عادی لوگوں کی آبادی میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے (گوشوارہ نمبر ۱) سماج کا ہر طبقہ اس کے زیر دام ہے۔ (گوشوارہ نمبر ۲) قانونی سطح پر اس کی روک تھام کے لیے متعدد کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ لیکن دن بدن یہ سماجی برائی ایک ناسور کی طرح بڑھتی جا رہی ہے۔ افیونی قوانین ۱۸۵۷ء اور ۱۸۷۸ء (OPIUM ACT 1857 AND OPIUM ACT 1878) اور خطرناک ادویات قانون ۱۹۳۰ء (DANGEROUS DRUG ACT 1930) کے نفاذ اور تجربے کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ اس برائی سے نبرد آزمائی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کوئی نیا قانون نئے سیاق و سباق اور معاشرتی تناظر میں وضع نہ کیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر پارلیمانی ہند نے ۱۹۸۶ء میں ایک جامع ایکٹ پاس کیا جو مخدر مفردات اور سائکوٹروپک مادیاتی قانون (THE NARCOTICS DRUG AND PSYCHOTROPIC SURSTANCES ACT 1986) کے نام سے موسوم ہے۔ اس مختصر مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ منشیات

گوشوارہ نمبر ۱
جرائم کے واقعات اور شرح جرم

(THE NARCOTICS AND PSYCHOTROPIC SUBSTANCES N.D.P.S.ACT)

(مخدر مفردات اور سائکوٹروپکس مادیاتی قانون کے تحت)

سال	۱۹۸۲ء	۱۹۸۷ء	۱۹۸۸ء	۱۹۸۹ء	۱۹۹۰ء	۱۹۹۱ء	۱۹۹۲ء	۱۹۹۳ء
واقعات	۱۴۵۹۰	۹۴۴۲	۱۳۴۵۷	۱۲۸۳۱	۱۴۱۷۶	۲۰۹۴۴	۲۲۴۷۸	۲۱۰۸۷
شرح جرم (فی صد)	۲٫۱	۱٫۲	۱٫۷	۱٫۶	۱٫۷	۲٫۵	۲٫۶	۲٫۴

بحوالہ: ہندوستان میں جرائم، قومی جرائم ریکارڈ بیورو، نئی دہلی
سالنامہ ۱۹۹۲ء اور سالنامہ ۱۹۹۳ء صفحات ۱۰۲-۱۰۳

CRIMES IN INDIA ANNUAL 1992 AND 1993 NATIONAL CRIME RECORD BUREAU NEW DELHI P.102-103

کی روک تھام کے لیے قانونی کاوشیں کس حد تک موثر ثابت ہوئی ہیں۔ نفاذ کی سطح پر انتظامی عاملہ کس حد تک کامیاب ہے۔ طریقہ کار کے طور پر اس کا التزام کیا گیا ہے کہ عالیہ سروے کی چھان پھٹک کی جائے تاکہ انسداد کی طرف رجوع کیا جا سکے مزید یہ کہ ممکنہ ترمیمات کی روشنی میں ازالے کی صورت سامنے آسکے۔

لکچرر سینٹر فار ایڈوانسڈ سوشیو لیگل اسٹڈیز
ہمدرد یونیورسٹی، ہمدرد نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۲

گوشوارہ نمبر ۲
گرفتار ہونے والوں کی تعداد
(N.D.P.S ایکٹ کے تحت)

سال	مرد	عورت	کل	کل فی صدی	
				مرد	عورت
۱۹۹۲ء	۲۳۵۳۹	۸۵۱	۲۴۳۹۰	۹۶٫۵	۳٫۵
۱۹۹۳ء	۲۲۲۲۰	۸۴۱	۲۳۰۶۱	۹۶٫۴	۳٫۶

بحوالہ مذکورہ: صفحہ ۱۵۶

تشویشناک پہلو

ایک اندازے کے مطابق امریکہ میں ایک ہزار کی آبادی میں ہر تیسرا آدمی منشیات کا عادی ہے۔ ایک تخمینے کے ذریعے یہ انکشاف ہوا ہے کہ قومی خزانے کی ایک خطیر رقم جو سو بلین ڈالر کے قریب ہے منشیات کے عادی لوگوں کے علاج اور آبادکاری پر صرف ہوتی ہے۔ اس تجارت میں پیش پیش رہنے والے دو قبیل کے ممالک ہیں جنہیں بالترتیب طلائی مثلث (GOLDEN TRIANGLE) اور طلائی ہلال (GOLDEN CRESCENT) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جنوبی مشرقی ایشیا کے ممالک مثلاً تھائی لینڈ، لیوس (LAOS) اور کمبوڈیا جیسے طلائی مثلث سے تعبیر کیا جاتا ہے، پوست (POPPY) کی زرخیز پیداوار کی وجہ سے منشیات کی سب سے بڑی بین اقوامی منڈی تصور کی جاتی ہے۔ دوسری جانب طلائی ہلال کے ممالک مثلاً ترکی اور ایران ہیں جن کی سرحدوں کو عبور کر کے منشیاتی اور مخدر مفردات افغانستان اور پاکستان سے ہوتے ہوئے ہندوستانی حصار میں داخل ہوتے ہیں۔ (گوشوارہ ۳، ۴ اور ۵) اس میں قابل ذکر مخدر مفردات و منشیات چرس، گانجا، افیون، ہیروئن، کوکین، حشیش، بادامی شکر (BROWN SUGAR) وغیرہ ہیں۔ سب سے زیادہ خطرناک مخدر دوا بادامی شکر ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ صرف پانچ خوراک کا استعمال کسی آدمی کو اس کے عادی بننے یا بنانے کے لیے کافی ہے۔ ایک ماہر ڈاکٹر کے حوالے سے یہ بات عام طور کہی جاتی ہے کہ اس

گوشوارہ نمبر ۳
صوبہ جاتی منشیاتی جرائم کے واقعات اور شرح
N.D.P.S ایکٹ کے تحت

صوبے	واقعات ۱۹۹۲ء	شرح جرم ۱۹۹۲ء	واقعات ۱۹۹۳ء	شرح جرم ۱۹۹۳ء
آندھرا پردیش	۱۳۴	۰٫۲	۲۹۰	۰٫۴
اروناچل پردیش	۲۱	۲٫۴	۱۶	۱٫۷
آسام	۱۳۰	۰٫۶	۱۸۳	۰٫۸
بہار	۱۱۳	۰٫۱	۱۳۰	۰٫۱
گوا	۲۹	۲٫۴	۲۶	۲٫۱
گجرات	۲۶۱	۰٫۶	۲۳۸	۰٫۶
ہریانہ	۸۷۹	۵٫۲	۱۲۱۳	۷٫۰
ہماچل پردیش	۹۰	۱٫۷	۹۵	۱٫۸
جموں وکشمیر	۳۵	۰٫۴	۴۷	۰٫۶
کرناٹک	۱۳۶	۰٫۳	۲۱۴	۰٫۵

کیرالہ	۳۵۳	۱٫۲	۳۱۲	۱٫۰
مدھیہ پردیش	۱۲۵۸	۱٫۸	۱۴۵۳	۲٫۱
مہاراشٹر	۱۴۲۰	۱٫۸	۱۱۸۰	۱٫۴
منی پور	۳۰۰	۱۵٫۹	۲۱۲	۱۰٫۰
میگھالیہ	۱۵	۰٫۸	۱۸	۱٫۰
میزورم	۱۸۸	۲۶٫۱	۱۵۸	۲۱٫۴
ناگالینڈ	۱۴۳	۱۱٫۳	۲۱۸	۱۶٫۸
اڑیسہ	۱۱۳	۰٫۳	۱۳۸	۰٫۴
پنجاب	۱۲۳۱	۵٫۹	۱۶۰۵	۷٫۶
راجستھان	۸۸۵	۲٫۰	۸۱۸	۱٫۸
سکم	۸	۱٫۹	۱۱	۲٫۵
تامل ناڈو	۳۵۶۷	۶٫۳	۲۶۱۱	۴٫۶
تری پورا	۸	۰٫۳	۱۱	۰٫۴
اترپردیش	۹۸۶۳	۶٫۹	۸۶۹۹	۶٫۰
مغربی بنگال	۳۷۴	۰٫۵	۴۱۳	۰٫۶
کل	۲۱۵۵۴	۲٫۵	۲۰۳۰۹	۲٫۳

بحوالہ مذکورہ : صفحات ۱۰۵/ ۱۹۹۲

مرض سے نبرد آزمائی کی امید صرف ۵ فی صد ہے۔

قانونی کاوشیں: آزادی سے قبل

آزادی سے قبل بھی اس سماجی لعنت کو ختم کرنے کے لیے کئی قانون وضع کیے گئے جو اپنے مخصوص زمان و مکان کے حسب حال نہایت سود مند ثابت ہوئے لیکن جس تیزی سے منشیاتی دواؤں کی پیداوار اور صنعت کو گزشتہ دہائیوں میں جلا ملی ہے اس سے یہ بات سامنے آئی کہ یہ قوانین اس کی روک تھام کے لیے ناکافی ہیں۔ افیونی قوانین ۱۸۵۷ء اور ۱۸۷۸ء (OPIUM ACT 1857 AND OPIUM ACT 1878) اور خطرناک ادویاتی قانون ۱۹۳۰ء (THE DANGEROUS DRUGS ACT 1930) وغیرہ اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔ جیسا کہ نام سے واضح ہے۔ افیونی قوانین کا دائرہ کار صرف افیون تک محدود تھا۔

گوشوارہ نمبر ۴
قومی خطے میں واقعات اور شرح جرم ۹۲ء کے دوران N.D.P.S. ایکٹ کے تحت

قومی خطے	واقعات	شرح جرم
انڈمان و نکوبار جزائر	۳	۱٫۰
چنڈی گڑھ	۱۲	۱٫۸
دادر و نگر حویلی		.
دمن و دیو	.	.
دہلی	۹۰۲	۹٫۱
لکشدیپ	.	
پانڈیچری	۷	۰٫۸
کل (قومی خطے)	۹۲۴	۷٫۷
کل ہند	۲۲۴۷۸	۲٫۶

بحوالہ مذکورہ : صفحہ ۱۰۵/ ۱۹۹۲

لہٰذا افیون کی پیداوار، تجارت، استعمال کی روک تھام کی جاتی رہی۔ غیر سماجی عناصر اور منشیاتی گروہ کی سرگرم بازاری سے دوسرے اقسام کی دواؤں کا ناجائز استعمال جلد ہی شروع ہو گیا۔ اس سلسلے میں بین اقوامی سطح پر اس موضوع پر ایک کانفرنس نومبر ۱۹۲۴ء اور فروری ۱۹۲۵ء میں منعقد ہوئی تھی (جسے جینوا کنونشن کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) کانفرنس کے منظور شدہ قرارداد کی بحالی کے لیے خطرناک

ادویاتی قانون ۱۹۳۰ء میں وضع ہوا۔ اس دفعہ افیون کے علاوہ دوسرے خطرناک اور مخدر مفردات کی روک تھام پر زور دیا گیا۔ ایکٹ کی وجہ تسمیہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ۱۹۳۰ء . . . . . .

گوشوارہ نمبر ۵
اہم شہروں میں واقعات اور شرح جرم
N.D.P.S. ایکٹ کے تحت

شہر	واقعات ۱۹۹۲ء	شرح ۱۹۹۲ء
احمدآباد	۱۹	۰/۷
بنگلور	۴۹	۱/۲
بھوپال	۲۶	۲/۴
کلکتہ	۲۴۲	۲/۲
کوئمبٹور	۱۱۲	۹/۷
دھلی	۸۵۴	۹/۷
حیدرآباد	۲۷	۰/۶
اندور	۱۷	۱/۵
جے پور	۴۹	۳/۱
کانپور	۴۵۰	۲۰/۷
کوچی	۴۴	۳/۷
لکھنؤ	۲۸۴	۱۹/۷
لدھیانہ	۴۳	۴/۱۰
مدراس	۱۳۷	۲/۵
مدورائی	۱۰۲	۹/۲
ناگپور	۱۷۲۰	۱۰/۶
پونہ	۵۵	۲/۱
سورت	۱۲	۰/۸
ودودرا	۲۱	۱/۸
وارانسی	۶۲۳	۵۹/۳
وشاکھاپٹنم	۱۴	۱/۳
بمبئی	۱۹۰	۱/۵

بحوالہ مذکورہ : ۱۹۹۲ء

میں ہی ان دواؤں کی شناخت تو ہوچکی تھی البتہ تفصیلات پر زیادہ سنجیدگی سے غور وخوض کی کمی باقی رہی۔ شاید یہی وجہ رہی ہو کہ نت نئی منشیاتی دوائیں منڈیوں میں پھر سے اپنے خریدار ڈھونڈ لیے ہوں۔ خطرناک دوائیوں کے زمرے میں افیون، کوکا پتی (COCA LEAF) حشیش اور اس قبیل کی دوسری دوائیں تھیں۔ پیداوار، صنعت، تجارت، استعمال پر پابندی تھی اور اس کی نافرمانی کی صورت میں تین سال کی سزا تجویز کی گئی تھی۔ قوانین کے وضع ہونے سے نفاذ تک کے مراحل اور تجربے کی روشنی میں یہ بات واضح ہوئی کہ اس کا ازالہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ سخت سزاؤں پر مربوط قانون نافذ نہ ہو۔

آزادی کے بعد

آزادی کے بعد اور بالخصوص پچھلی دہائی میں دو اہم قانون بنائے گئے۔ ۱۹۸۵ء میں مخدر مفردات اور سائیکوٹروپک مادیاتی قانون (THE NARCOTICS DRUGS AND PSYCHOTROPIC SUBSTANCES ACT 1986) آیا۔ ۱۹۸۸ء میں مخدر مفردات اور سائیکوٹروپک مادیاتی اشیاء کی ناجائز تجارت اور نقل وحمل کے انسداد (THE PREVENTION OF ILLICIT TRAFFIC IN NARCOTIC DRUGS AND PSYCHOTROPIC SUBSTANCES ACT 1988) کا قانون پاس ہوا۔ ۱۹۸۵ء کے ایکٹ کی غرض و غایت کا اندازہ ایکٹ میں درج دیباچے سے ہوتا ہے۔ "یہ ایکٹ سابقہ قوانین کی ترتیب اور ترمیم کے طور پر میعاد سزا کے اضافے اور مخدر مفردات اور سائیکوٹروپکس مادیات کی روک تھام سے منسلک ہے"۔

مخدر مفردات اور سائیکوٹروپکس ما دیاتی قانون ۸۳ دفعات پر مشتمل نہایت جامع ایکٹ تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں چھ ابواب ہیں جو مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ پہلے سبق میں بعض ضروری قانونی اصطلاحات کی تعریف اور توضیح کی گئی ہے۔ دوسرے سبق میں منشیاتی جرائم کے روک تھام کے سلسلے میں جملہ عہدیداران، افسران اور مشاورتی کمیٹی کے ذمہ داروں کا بیان ہے۔ اس ایکٹ کا سب سے اہم جزو تیسرا سبق ہے۔ اس میں جرم کے خاتمے، کنٹرول اور منظم طریقے سے

گوشوارہ نمبر ۶
واقعات جرم و شرح کا پنج سالہ مرکزی اوسط
N.D.P.S ایکٹ کے تحت

QUINQUENTIAL AVERAGE (Q.A) پنج سالہ مرکزی اوسط: ۱۹۸۷-۱۹۹۱	QUINQUENTIAL AVERAGE (Q.A) پنج سالہ مرکزی اوسط: ۱۹۸۸-۱۹۹۲	واقعات	شرح	فی صد تبدیلی ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء کے دوران: ۱۹۸۲	فی صد تبدیلی: Q.A	فی صد تبدیلی: ۱۹۹۱	فی صد تبدیلی: ۱۹۹۲
۱۴۱۵۰	۱۶۷۵۷	۲۲۴۷۸ (۱۹۹۲)	۲/۶	+۵۴/۱	+۵۸/۱	–۷/۳	۱۹۹۲
۱/۷	۲/۰	۲۱۰۸۷ (۱۹۹۳)	۲/۴	+۴۶/۹	+۲۵/۸	–۶/۲	۱۹۹۳ء

نپٹنے کے لیے ہدایتیں دی ہوئی ہیں۔ سزاؤں کے سلسلے میں تفصیلات چوتھے سبق میں موجود ہے۔ طریقۂ کار کا ذکر پانچویں سبق میں ہے آخری سبق ایکٹ کے متفرقاتی اور ثانوی پہلوؤں پر مبنی ہے۔ ایکٹ سے منسلک ضمیمے مخدر مفردات اور سائکو ٹروپک مادیات کی مکمل فہرست فراہم کرتے ہیں، جس میں ۷۷ اندراج ہے۔

گوشوارہ نمبر ۷

پولیس کے ذریعے N.D.P.S ایکٹ کے تحت جرائم کا تصفیہ

سال	کل منشیاتی مقدمات کا فی صد		
	تفتیش سے انکار	تفتیش مکمل	التوائی مقدمات کا فی صد
۱۹۹۲ء	۱٫۳	۶۰٫۰	۳۸٫۷
۱۹۹۳ء	۰٫۱	۶۰٫۹	۳۹٫۰

بحوالہ مذکورہ: صفحہ ۱۲۶/ ۱۹۹۲

تقابلی جائزہ

سابقہ اور لاحقہ قوانین کے تقابلی جائزے سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۸۶ء کا ایکٹ کئی اعتبار سے جامع ترین ایکٹ ہے۔ اول یہ ہے کہ پہلی دفعہ منشیاتی دواؤں اور مادیات کا قدرے تفصیل سے احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ رہا کہ اس کی روک تھام میں انتظامیہ اور عہدیداران کو ان پریشانیوں کا سامنا کرنا نہیں پڑا جو پچھلے ایکٹ کے نفاذ میں درپیش رہی تھیں۔ اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی دفعہ آٹھ ہے۔ اس کے مطابق کوکا پودے، افیون اور دوسرے منشیاتی دواؤں اور مادوں کی کاشت کاری، تجارت، درآمدات و برآمدات، ذخیرہ اندوزی، نقل و حمل، استعمال وغیرہ کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ خلاف ورزی کی صورت میں سخت سزائیں تجویز کی گئیں ہیں۔ کم از کم دس سال اور زیادہ سے زیادہ ۲۰ سال کی قید اور ایک لاکھ سے دو لاکھ روپے تک جرمانہ عائد کیا گیا ہے۔ دفعہ ۱۵ سے ۴۰ تک

گوشوارہ نمبر ۸

عدالتوں کے ذریعے N.D.P.S ایکٹ کے تحت جرائم کا تصفیہ

سال	زیر سماعت التوائی مقدمات	مقدمات: واپس لیے گئے	مقدمات: موردِ سزا ٹھہرائے گئے	مقدمات: رہا کیے گئے	کل	التوائی مقدمات
۱۹۹۲ء	۶۱۴۳۱	۱۴۳۴	۴۱۸۱	۴۴۳۴	۸۸۱۵	۵۱۱۸۲
	—	۲٫۳٪	۶٫۸٪	۷٫۵٪	۱۴٫۳٪	۸۳٫۳٪
۱۹۹۳ء	۷۱۱۰۰	۱۳۴	۵۳۴۵	۶۵۸۷	۱۱۹۵۲	۵۹۰۱۴
		۰٫۱۲٪	۷٫۵٪	۹٫۳٪	۱۶٫۸٪	۸۳٫۰٪

بحوالہ مذکورہ: صفحہ ۱۲۶/ ۱۹۹۲

مختلف منشیاتی اشیاء کے حسب نوعیت مختلف سزائیں مندرج ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی دفعہ اتنی سخت سزائیں وضع کی گئیں ہیں۔ دوسری اہم چیز جو اس ایکٹ کو سابقہ قوانین سے ممتاز بناتی ہے وہ یہ ہے کہ منشیاتی دواؤں کی موجودگی بھی کسی شخص کو۔۔۔۔ موردِ الزام اور موردِ سزا ٹھہرا سکتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ استعمال اور تجارت نہیں کرنے کے باوجود صرف ان دواؤں کا کسی کے تحویل میں پایا جانا بھی ایکٹ کے اطلاق کے لیے کافی ہے۔ دوسری جانب دواؤں کی تجارت کے سلسلے میں تصوراتی کوششیں بھی موردِ الزام ٹھہرا سکتی ہے۔ مثلاً اگر کسی نے درآمد اور برآمد کے نیت سے خط و کتابت کی ہو اور معاملات ایجاب و قبول کی حد تک پہنچ چکے ہوں لیکن عملی طور پر اسے پورا نہ کیا گیا ہو۔

شماریاتی تجزیہ

اس ایکٹ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بعض اہم اقدامات کیے گئے ہیں۔ دفعہ چار کے تحت مرکزی حکومت وہ سارے اقدامات اٹھائے گی جس سے منشیات کے استعمال، نقل و حمل، ناجائز تجارت پر قابو پایا جا سکے۔ مرکزی حکومت ایک مخدر مفرداتی کمشنر بھی مقرر کرتی ہے جو بحیثیت معتمد سنگالے

(WATCH DOG) کا کام کرتا ہے۔ مزید یہ کہ مخدر مفرداتی اور سائکو ٹروپک مشاورتی کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے جو وقتاً فوقتاً اس ایکٹ کے نفاذ کے لیے بہتر سے بہتر تجاویز اور امکانات کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ایکٹ کا نفاذ ۱۵ نومبر ۱۹۸۵ء کو عمل میں آیا۔ نفاذ کے ایک سال کے درمیان غیر معمولی تبدیلیاں ہوئیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۱۱۵ ٹن ہیروئن اور ۵ر۸ ٹن حشیش ضبط کیے گئے۔ جب کہ ایکٹ کے نفاذ سے ایک سال پہلے یعنی ۱۹۸۵ء میں صرف سات سو کلو گرام ہیروئن اور ۴ر۷ میٹرک ٹن حشیش ضبط کیے گئے تھے۔ ۱۵ نومبر ۱۹۸۵ء سے ۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء تک صرف بمبئی میں پولیس نے ۸۲۱ مقدمات درج کیے اور ۱۲۱۱ لوگوں کو حراست میں لیا تھا۔ ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء کے قومی جرائم۔۔۔۔۔۔

گوشوارہ نمبر ۹

N.D.P.S. ایکٹ کے تحت گرفتار ملزمین (۱۹۹۲)

زیر سماعت ملزمین	ملزمین جن کے: مقدمات واپس لیے گئے	ملزمین جن کے: سماعت مکمل ہوئی	سماعت زیر غور	مورد سزا ملزمین
۶۷۰۳۹	۳۰۵	۱۰۲۱۲	۵۶۵۱۶	۴۵۷۶

بحوالہ مذکورہ

ریکارڈ بیورو کے سروے کی روشنی میں ایکٹ کے دائرۂ کار کا جائزہ مزید انکشافات سے روشناس کراتا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر مناسب ہوگا کہ تمام ممکنہ کوششوں کے باوجود ۱۹۹۳ء کے بعد کی رپورٹ بعید از حاصل رہی۔

گوشوارہ ۱ پر عمومی نگاہ ڈالنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ نفاذ کے فوری بعد معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ واقعات اور شرح جرم میں کافی اضافہ (۱۱٫۲ سے ۱۲٫۱۱ فی صد) ہوا۔ ۱۹۸۸ء میں یہ شرح ۷٫۲ رہی اور بعد کے دو سالوں میں لگ بھگ معین (CONSTANT) رہی۔ نوے کی دہائی میں اضافہ ہونے لگا لیکن دو پنج سالہ مرکزی اوسط شرح کے مطابق (گوشوارہ ۲ ملاحظہ فرمائیں) ۷٫۱ اور ۲٫۱۰ شرح جرم بالترتیب طے پائی۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۲ء کے مقابلے میں پھر بھی کمی ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۹۲ء میں فی صد تبدیلی ۶٫۲ رہی۔ جغرافیائی اعتبار سے سب سے زیادہ جرائم اتر پردیش اور پنجاب میں واقع ہوئے۔ گوشوارہ ۳، گوشوارہ ۴ اور گوشوارہ ۵ کے مطابق ان صوبوں کا مجموعی شرح جرائم ۲٫۶ کل ہند اوسط شرح جرم کے مقابلے دہلی میں شرح جرم ۹٫۱ فی صد ریکارڈ کیا گیا جو بہرحال ایک تشویش ناک صورت حال ہے (گوشوارہ ۵) اہم شہروں کی فہرست میں ناگپور، دہلی، وارانسی اور کانپور میں سب سے زیادہ واقعات رونما ہوئے (گوشوارہ ۵)۔ جرائم کی روک تھام میں پولیس کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے۔ اعداد و شمار سے یہ واضح ہے کہ ۶۰ فی صدی سے زائد معاملات کا تصفیہ پولیس کی سطح پر ہوا۔ ۳۸٫۷ اور ۳۹ فی صد معاملات التوا میں ہیں۔ (گوشوارہ ۸) ضرورت اس بات کی ہے کہ محکمہ پولیس مزید دلچسپی اور توجہ دے تا کہ شرح التوائے مخاصمت میں کمی واقع ہو۔ عدالتوں کے ذریعے معاملات کے تصفیہ میں تساہلی برتی گئی ہے۔ ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء میں ۸۳٫۳ اور ۸۳ فی صد معاملات بالترتیب التوا میں رہے۔ مورد الزام لوگوں کی تعداد ۶۷۰۳۹ اور ۳۴۹۶۷ بالترتیب ۱۹۹۲ء اور ۱۹۹۳ء میں رہی۔ گوشوارہ ۱۱، گوشوارہ ۹ اور گوشوارہ ۱۰ کے تقابلی مطالعہ سے یہ گمان

گوشوارہ نمبر ۱۰

N.D.P.S. ایکٹ کے تحت گرفتار ملزمین اور عدالتی کارروائی (۱۹۹۳)

گرفتار شدہ ملزمین	سماعت سے قبل رہا کیے گئے	ملزمین جن کا جرم ثابت ہوا	زیر سماعت ملزمین
۳۴۹۶۷	۴۶۳	۲۲۲۹۱	۱۲۲۱۳
	۱٫۳٪	۶۳٫۷٪	۳۴٫۹٪

بحوالہ مذکورہ

۷٫۷ فی صد رہا۔ قومی خطے کے مابین دہلی میں سب سے زیادہ ان جرائم کا دور دورہ رہا (گوشوارہ ۱۲) ہوتا ہے کہ مقدمات کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں عدالتیں منشیاتی جرائم کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے پا رہی ہے۔ ایکٹ کی غرض و غایت اور سماجی سطح پر مرتب ہونے والے مضر اثرات کے پیش نظر یہ امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں عدلیہ خصوصی اولیت دے گی۔

اس سماجی لعنت کے خاتمے کے سلسلے میں حکومتی سطح پر مسلسل جد و جہد جاری ہے۔ دوسری طرف جرائم کی تیز رفتاری سے چشم پوشی ممکن نہیں ہے۔ ہندوستان میں رضاکارانہ تنظیمیں (NON-GOVERNMENTAL ORGANISATIONS) مختلف النوع معاشرتی پروگراموں کے توسط سے اپنے دائرۂ کار کو وسیع کر رہی ہیں۔ اس امید افزا صورت حال میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ سماجی، اصلاحی اور رفاہی اقدامات کے ذریعے ہم اس پر قابو پا سکتے ہیں۔ اس نوزائیدہ سیکٹر (INFANT SECTOR) کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ قوانین میں ترمیم کے ذریعے رضاکارانہ تنظیموں کی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ ایسی فضا ہموار کی جائے کہ حکومتی اور نیم حکومتی اشتراک عمل سے متوازی دائرہ کار کا تعین ہو سکے۔ واضح رہے کہ انصاف اطفال قانون ۱۹۸۶ء (THE JUVENILE JUSTICE ACT 1986) تحفظ صرف قانون سے (THE CONSUMER PROTECTION ACT 1986) اور تحفظ ماحولیاتی قانون (THE ENVIRONMENT PROTECTION ACT 1986) میں ایسی تنظیموں کو متوازی خطوط پر کام کرنے کی آزادی میسر ہے۔ اس سے قبل کہ یہ سماجی لعنت ایک ناسور بن جائے باہمی اشتراک عمل سے اس کا سدباب نہایت ضروری ہے۔ ●

اہلِ قلم حضرات

اب ہمیں قدرے ضخیم مضامین بھی ارسال کر سکتے ہیں کیونکہ "یوجنا" کے صفحات میں اضافے کے باعث اب طویل مضامین بھی شائع کیے جا سکتے ہیں۔
براہ کرم کاغذ کے ایک طرف اور خوشخط تحریر کریں۔

(ادارہ)

اسد رضا

جہیز نامہ

جہیز لینا اور دینا سماجی، معاشی اور قانونی لحاظ سے جائز ہے یا ناجائز، اس سوال کا جواب تو ماہرین سماجیات و معاشیات اور قانون داں ہی دے سکتے ہیں لیکن جہیز گزیدوں کی جانِ عزیز کی قسم، اس جہیز کی بدولت ہمیں جتنا پریشان اور پشیمان ہونا پڑا اتنا اگر حضرت قیس کو ہونا پڑتا تو ہمیں یقین کامل ہے کہ وہ لیلیٰ سے شادی کرنے کا خیال چھوڑ دیتے۔ بہرحال جہیز سے متعلق ہمارے تجربات و مشاہدات اور آپ بیتی کو سن کر یا پڑھ کر سامعین عظام اور قارئین کرام عبرت ضرور حاصل کریں گے اور جہیز لینے اور دینے سے قبل سو مرتبہ سوچیں گے۔ ہم لڑکپن بلکہ بچپن سے جہیز مخالف رہے ہیں کیوں کہ ہماری چھوٹی چھوٹی آنکھوں نے جہیز سے متعلق بڑے بڑے افسوسناک واقعات اور حادثات دیکھے ہیں، متعدد دوشیزاؤں کو جہیز کی عدم موجودگی اور والدین کی مفلسی کی وجہ سے متوقع شریف دولہاؤں کے جو جہیز کا غیر شریفانہ مطالبہ نہ کریں، انتظار میں بوڑھا ہوتے اور نئی نویلی دلہنوں کو جہیز کی چتا میں جلتے ہوئے دیکھا ہے۔ لہٰذا جب ہماری منگنی ہوئی تو ہم نے سسرال والوں سے درخواست کی کہ وہ جہیز دینے کی زحمت نہ فرمائیں لیکن ہمارے خسر محترم نے ہماری اس درخواست کو اظہار انکساری سمجھا اور نتیجتاً دل کھول کر جہیز دیا اور جب ہم نے احتجاج کیا تو فرمایا "ہم اپنی بیٹی کو جہیز دے رہے ہیں آپ کو نہیں۔" اب ہم ان سے یہ کیسے کہتے کہ "آپ کی صاحب زادی اپنے تمام تر جہیز کے ساتھ رہیں گی تو ہمارے ایک کمرے والے غریب خانے ہی میں۔" دہلی جیسے بڑے اور مہنگے شہر میں ایک کمرے کا مکان ہی بڑی مشکل سے ملتا ہے دو یا تین کمروں کے مکان کی تلاش تو جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور اگر اتفاق سے دو تین کمروں والا بڑا مکان مل بھی جائے تو اس کا کرایہ سن کر ہی متوسط طبقے کا ایک ایماندار انسان بے ہوش ہو جائے۔ لہٰذا ہم اسکوٹر، فریج، واشنگ مشین، کولر، رنگین ٹیلی ویژن، سیف کی حامل ایک آہنی الماری، دو بڑے بڑے بکسوں، چوکیوں، نعمت خانے، ڈبل بیڈ، صوفہ سیٹ، ڈائننگ سیٹ وغیرہ پر مشتمل جہیز کے سامان کو کہاں اور کیسے رکھتے؟ ہم نے خسر صاحب سے منت کی کہ وہ یہ سامان اس وقت تک کے لیے اپنے ہی دولت کدے پر رکھیں جب تک کہ ہمیں بڑا مکان نہیں مل جاتا۔ لیکن ہماری منت سماجت کو اس دلیل کے ساتھ مسترد کر دیا گیا کہ شادی کے بعد جہیز کا سامان سسرال میں رکھنا سماجی لحاظ سے غلط اور روحانی لحاظ سے بدشگونی کا باعث ہے۔ اس لیے قہراً و جبراً ہمیں بیوی کے ہمراہ مذکورہ بالا جہیز کا سامان بھی اپنے ساتھ لانا پڑا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ فقط ایک کمرے پر مشتمل مکان میں جہیز کا اتنا سامان کیسے سمائے؟ ہمارے دوست میر منّن نے ہمارا یہ جہیزی مسئلہ حل کیا اور نہایت خندہ پیشانی سے جہیز کا سارا سامان اپنے دولت خانے پر رکھنے کی پیش کش کی جسے ہم نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ میر منّن کا مکان چار کمروں پر مشتمل ہے، جس میں وہ اپنی بیوی اور ایک بچی کے ساتھ رہتے ہیں لیکن ان کا المیہ یہ تھا کہ اتنے بڑے مکان میں ان کی بیوی جہیز چھوٹا لائی تھیں یعنی ان کے جہیز میں نہ بڑے بڑے ٹرنک تھے نہ لمبی تڑنگی سیف اور نہ چوڑا چکلا صوفہ سیٹ اور ڈائننگ ٹیبل حالاں کہ میر منّن کے خسر خاصے دولت مند تھے۔ ویسے کم جہیز کے لیے خسر سے زیادہ خود میر منّن ذمہ دار تھے کیوں کہ رشتہ طے ہونے کے وقت انھوں نے از راہ انکساری کہہ دیا تھا کہ "ہمیں جہیز کی تمنا نہیں ہے" اور سسرال والوں نے وہ جہیز دینا مناسب خیال نہیں کیا جس کی داماد کو تمنا ہی نہیں ہے اور اس طرح انھیں چاند سی بیوی ضرور مل گئی لیکن چاندی کے زیور اور برتن نہیں ملے اور ان کا ڈرائنگ روم صوفے سیٹ اور بیڈ روم ڈبل بیڈ سے محروم رہا۔ بہرحال ہمارے جہیز کے سامان سے میر صاحب کے مکان میں چار چاند لگ گئے تھے اور ان کے چاروں کمروں کا خالی پن دور ہو گیا تھا۔ ہمارے جہیز سے سب سے بڑا فائدہ مسز منّن کو ہوا تھا کیوں کہ ہمارا جہیزی سامان جب سے میر صاحب کے گھر رکھا گیا تھا انھوں نے بیوی کو جہیز کے طعنے دینا بند کر دیے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری بیگم نے ہمیں مکان چھوٹا ہونے اور اپنا جہیز دوسروں کے گھر رکھوانے کے طعنے دینا شروع کر دیے اور جب ہم بیگم کے طعنوں اور ٹھنڈی سانسوں کی حقارت آمیز نگاہوں سے عاجز آ گئے تو دو کمرے والے مکان کی تلاش شروع کی۔ بالآخر ہماری تلاش و جستجو کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور ہمیں جہیز کا سامان رکھنے کے لائق مکان مل گیا۔ اب یہ بات دیگر ہے کہ اس مکان کا کرایہ ادا کرتے وقت ہماری تنخواہ کی رقم ہی ہمارے ہاتھ میں رہ جاتی

ای۔ ۳۴/۷۱۱۔ حوض رانی مالویہ نگر نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۷

ہے اور نصف سے زائد تنخواہ مالک مکان کی جیب میں پہنچ جاتی ہے۔ اس جہیز کی وجہ سے اب ہمارے حالت یہ ہے کہ ہمارے پاس اسکوٹر ہے لیکن پیٹرول ڈلوانے کی گنجائش جیب میں قطعی نہیں ہے، ہم جہیز کی بدولت ایک سیف کے مالک ضرور بن گئے ہیں لیکن اس میں رکھنے کے لیے روپے نذارد ہیں، نعمت خانہ اور فریج ہمارے پاس موجود ہیں لیکن ان میں رکھنے کے لیے پھل، مٹھائیاں، مرغ کا گوشت اور میوے جات خریدنے کی معاشی قوت ہماری چھوٹی سی نوکری میں نہیں ہے۔ یہی نہیں اس جہیز کی وجہ سے ہم ایک بار تو انکم ٹیکس والوں کی زد میں آتے آتے بچے۔ ہمارے جہیزی سامان کو دیکھ کر کسی حاسد نے انکم ٹیکس افسر کو خبر کر دی اور وہ اپنے عملے کے ساتھ ہمارے غریب خانے پر آدھمکے اور ہماری آمدنی اور اس کے ذرائع کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے لگے۔ ہم نے انھیں بڑی مشکل سے سمجھایا کہ یہ سب سامان جہیز اور ہمارے خسر محترم کی عنایات کا نتیجہ ہے۔ انکم ٹیکس والوں سے جان چھڑائی تو انسداد جہیز سے متعلق سیل کے عملے نے آدبوچا اور ہم پر یہ الزام لگایا کہ معاذ اللہ ہم نے زبردستی اپنی بیوی سے اتنا سارا جہیز منگوایا ہے۔ یہ لوگ تو انسداد جہیز سے متعلق قانون کے تحت ہمیں گرفتار کرنے اور ہمارے خلاف عدالت میں مقدمہ چلانے کے لیے پورے طرح آمادہ ہو گئے تھے، وہ تو یہ کہیے کہ ہماری بیگم کو ہم پر کسی وجہ سے رحم آگیا اور انھوں نے اینٹی ڈاوری (جہیز مخالف) سیل کے عملے کو قسمیں کھا کھا کر یہ یقین دلایا کہ اتنا سارا جہیز ہمارے مانگ پر نہیں بلکہ ان کے مائکے والوں نے اپنی مرضی سے دیا ہے۔ ہمارے خسر گرامی اور خوش دامن صاحبہ کی گواہی کے بعد ہی جہیز کے سلسلہ میں ہماری بے گناہی کو تسلیم کیا گیا۔ ان افسوسناک اور حیرتناک بلکہ عبرتناک حادثات و واقعات کے بعد بھی جہیز کے بھوت نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ایک روز ہمارے دفتر کا چپراسی جو باس کا منہ چڑھا اور ہمارے تئیں تک چڑھا تھا افسر اعلیٰ کا پیغام لے کر غریب خانے جو جہیز کی بدولت امیر خانے میں تبدیل ہو چکا تھا، پر آگیا۔ چوں کہ ہم افسر کے چپراسی کو بھی افسر سے کم نہیں سمجھتے لہٰذا اسے عزت سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مناسب خاطر تواضع کی لیکن نہ معلوم یہ ہمارے نمک کی تاثیر تھی یا جہیز کی تقصیر کہ اس کمبخت نے ہمارے ڈرائنگ روم اور گھر کی دیگر اشیاء (ظاہر ہے جن میں سے بیشتر جہیز ہی میں ملی تھیں) کی اس قدر تعریف کی ہمارے افسر کو ہماری دیانت داری پر شک ہو گیا اور اس نے اپنے کمرے میں طلب کر کے نہ صرف ہم سے سخت پوچھ تاچھ کی بلکہ یہ حکم بھی دے دیا کہ ہم تحریری طور پر بتلائیں کہ اسکوٹر، رنگین ٹیلی ویژن، فریج۔۔۔۔ اور دیگر قیمتی سامان اپنی قلیل آمدنی میں ہم نے کیسے خرید لیا؟ افسر کا شک غلط تھا بھی نہیں کیوں کہ ہماری طرح دو ہزار روپے ماہانہ کی تنخواہ لینے والا ایک کلرک بالائی آمدنی کے بغیر مذکورہ بالا چیزیں خرید ہی نہیں سکتا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ایک مرتبہ پھر ہمیں اپنی سسرال والوں کی نہ صرف گواہی دلوانی پڑی بلکہ مذکورہ بالا اشیا کی رسیدیں بھی پیش کرنی پڑیں تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ان مہنگی چیزوں کو خریدنے کا گناہ کبیرہ ہم سے نہیں بلکہ ہماری سسرال والوں بالخصوص خسر محترم سے سرزد ہوا ہے۔

اور ان تمام تکلیف دہ مراحل سے گزرنے کے بعد اب ہم نے اپنے ہونے والے بیٹے کے نام یہ وصیت نما ہدایت بلکہ تنبیہ لکھ دی ہے کہ برخوردار بڑی سے بڑی غلطی کرنا لیکن جہیز لینے کی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔ ●

ڈاکٹر نجیب اختر

فیض کی شاعرانہ انفرادیت

اردو کے بت شکن نقاد کلیم الدین احمد لکھتے ہیں۔

"فیض میں دو چیزیں ہیں جو دوسرے ترقی پسند شاعروں میں نہیں ملتیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ فیض کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس ہے اور وہ ان فنی تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے ترقی پسند شعرا کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس نہیں اور یہی ان کی ناکامیابی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ دوسری چیز جو فیض میں ملتی ہے وہ ایک قسم کی خود ضبطی ہے۔ وہ اپنے کو لیے دیے رہتے ہیں اور دوسرے باغی شاعروں کی طرح اپنے نعروں سے آسمان کو نہیں ہلاتے۔"

کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر ناقد بھی فیض کی اہمیت عظمت اور ان کے شعری مرتبے کے معترف ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ کیوں کہ کلیم الدین احمد کو غزل نیم وحشی صنف سخن نظر آئی، میر، غالب، ذوق، انیس، سودا اور اقبال سبھی بونے اور اوسط درجے کے شاعر نظر آئے۔ ان کی شعری کاوشیں ان کے نزدیک کوئی اہم مقام نہیں رکھتیں۔ کیوں کہ کسی مغربی ناقد نے ان شعرا کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔ اس لیے انھیں پایۂ اعتبار کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے۔ انھیں اپنے والد عظیم الدین احمد کے علاوہ کوئی معتبر شاعر ہی نظر نہ آیا۔ انھوں نے اپنا سارا علمی زور اپنے والد کو بڑا شاعر ثابت کرنے میں صرف کیا اور کیوں نہ کرتے سعادت مندی کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ انھوں نے بیک قلم اردو کے پورے شعری سرمایہ کو رد کر دیا۔ ایسی صورت میں ان کا یہ کہنا کہ فیض کو نظم کے فنی تقاضوں کا احساس ہے اور ان میں ایک قسم کی خود ضبطی ہے، بہت بڑی بات ہے۔ ورنہ کلیم الدین احمد تو کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ فیض اپنے معاصرین اور دوسرے ترقی پسند شعرا سے بہت حد تک مختلف اور منفرد ہیں۔ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنی شاعری کو پروپیگنڈوں اور نعروں سے محفوظ رکھا۔ شعری روایات اور قدروں کی پاسداری کی۔ فنی تقاضوں کو پورا کیا۔ انہی آفاقی قدروں کی وجہ سے ان کی شاعری اپنی ممتاز حیثیت بنا چکی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز اور منفرد مقام کے مالک ہیں۔

شاعر اور شاعری سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے "دست صبا" کے دیباچہ کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے۔

"یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے اجزار کا مشاہدہ اس کی بینائی کی ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔"

پھر آگے چل کر یوں لکھتے ہیں۔

"نظام زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا سنگ بستہ مقید پانی نہیں ہے جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے۔ دور دراز، اوجھل، دشوار گزار پہاڑیوں میں برفیں پگھلتی ہیں، چشمے ابلتے ہیں، ندی نالے، پتھروں کو چیر کر چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہمکنار ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ پانی گھٹتا، بڑھتا، گھاٹیوں، وادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جس دیدۂ بینا نے ہم زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے اس نے دجلہ کا کیا دیکھا ہے ــــ پھر شاعر کی نگاہ ان گزشتہ اور حالیہ مقامات تک پہنچ بھی گئی۔ لیکن اس کی منظر کشی میں نطق و لب نے یاوری نہ کی۔ یا اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے جسم و جان جہد و طلب پر راضی نہ ہو سکے تو بھی شاعر اپنے فن سے پوری طرح سرخ رو نہیں ہے۔"

اپنے اس نقطۂ نظر کا خلاصہ فیض ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیات انسانی کی اجتماعی جد و جہد کا ادراک اور اس جد و جہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا تقاضہ ہی نہیں فن کا بھی تقاضہ ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جد و جہد اسی جد و جہد کا ایک پہلو ہے۔"

اپنے اس نقطۂ نظر کی فیض نے اپنے ایک مضمون "شاعر کی قدریں" سویرا لاہور میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس ساری بحث کا خلاصہ فیض خود اس طرح بیان کرتے ہیں۔

۱۔ شعر کی جمالیاتی قدر کافی حد تک شاعر کی دوسری قدروں پر منحصر ہے۔

۲۔ ان قدروں کی ترتیب ان کی سماجی افادیت

سینٹر آف انڈین لینگویجز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

کے مطابق ہونا چاہیے۔

۳۔ جمالیاتی [illegible] بھی ایک سماجی قدر ہے جو اجتماعی [illegible] میں اضافہ کرتی ہے۔ اس لیے اسے دوسری افادی قدروں سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ شعر کی مجموعی قدر میں جمالیاتی خوبی اور سماجی افادیت دونوں شامل ہیں۔"

فیض نے اپنی شاعری میں مندرجہ بالا نکات کا پوری بصیرت اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ التزام کیا ہے۔ ان کی شاعری ایک نئے موڑ اور ان کی فکر کی ایک نئی منزل کا پتا دیتی ہے۔ ان کا ایک نیا انداز ہے۔ اس میں ندرت، تازگی، متانت، شادابی اور ایک نیا بانکپن ہے۔ اس میں ایک نیا وقار و آہنگ ہے۔ ان کے جذبے کی شدت اور خلوص نے اس میں ایک ہمہ گیری اور وسعت پیدا کردی ہے موضوعات کچھ نئے بھی نہیں لیکن فکر کی گہرائی و گیرائی، تخیل کی بلند پروازی اور انداز بیان کی ندرت نے اس میں ایک انوکھا پن پیدا کردیا ہے جس کی وجہ سے اردو شاعری کی محراب میں فیض کی عظمت کا چراغ روشن ہے۔

فیض کی شاعری کا سرمایہ بہت ہی مختصر لیکن بہت ہی وقیع ہے۔ چند مختصر مجموعے نقش فریادی، زنداں نامہ، دست تہہ سنگ، دست صبا، سروادیٔ سینا اور شام شہر یاراں شائع ہوچکے ہیں۔ انھوں نے نظمیں بھی کہیں ہیں اور غزلیں بھی۔ پہلے ہم نظموں کا جائزہ پیش کریں گے پھر غزلوں کا۔

ان کی اہم نظمیں ان کے مجموعہ کلام "دست صبا" میں شامل ہیں۔ ان نظموں میں جذباتیت کم ہے۔ زندگی کے مختلف حقائق کا شعور زیادہ ہے۔ زندگی کے بہت سے اسرار و رموز ان میں کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں جو توازن اور ہم آہنگی ان نظموں میں ملتی ہے اس سے اس کا تاثر بڑھتا ہے یہ تاثر ان کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔

فیض کی نظموں میں زندگی کے حقائق کی ترجمانی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی افادیت ایک شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ فیض نے خاص طور پر اس کو اپنے پیش نظر رکھا ہے جیسا کہ انھوں نے اپنے دیباچے میں اس کی وضاحت بھی کی ہے۔ ان کے خیال میں شاعر کا کام مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ اسی کے سہارے فن صحیح معنوں میں فن بنتا ہے۔ اسی بنیادی خیال نے ان نظموں کی تخلیق کی ہے۔ اس اجتماعی جد و جہد کا ان نظموں میں بہت شدید احساس ہے۔ اسی شدید احساس نے اس میں افادیت کا رنگ بھرا ہے اور تاثر کی سحرکاری پیدا کی ہے اس میں شاعر کا خونِ جگر بھی شامل ہے، جس کی وجہ سے نظمیں شعریت سے مملو ہیں:

بقول "ڈاکٹر عبادت بریلوی"

"زندگی کی مسرتوں کا احساس اور اس کو برتنے کی خواہش، حالات کو سمجھنے کا شعور اور ان کو صحیح ڈگر پر ڈالنے کی تمنا، اس اجتماعی نقطۂ نظر ہی کے سہارے پیدا ہوتی ہے۔ چناں چہ اس اجتماعی نقطۂ نظر نے فیض کی ان نظموں میں یہ خصوصیت پیدا کی ہے۔ ان میں حالات کو بدلنے کی فکر ہے۔ نئے حالات کو وجود میں لانے کی تمنا ہے۔ نئے ماحول کو پیدا کرنے کا یقین محکم ہے۔"

فیض کی نظموں کے دو اہم موضوعات ہیں، غم عشق اور غم روزگار۔ ان کے یہاں غم روزگار پر غم عشق کے حاوی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ آج زندگی کی حقیقتیں اور صداقتیں اسی دھند اور کہر میں لپٹی ہوئی ہیں۔ اس حقیقت کا انھیں احساس بھی ہے اور وہ اس کا گہرا شعور بھی رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غم حیات اور غم روزگار کی ترجمانی اور عکاسی میں جذباتی نہیں ہوئے۔ انھوں نے اس سلسلے میں غور و فکر سے کام لیا ہے۔ ان میں حالات کو سمجھنے اور سمجھ کر اس کی اصلاح کا جذبہ ضرور ہے۔ اس سلسلے میں سیاسی حالات کو بھی دیکھا ہے اور عوام کی اہمیت کا بھی انھیں احساس ہے۔

فیض کی سیاسی شعور کی نمائندہ نظمیں جس میں اس رجحان کی وضاحت ہوتی ہے درج ذیل ہیں۔

"اے دل بے تاب ٹھہر" سیاسی لیڈر کے نام
"صبح آزادی" ایرانی طلبا کے نام "شیشوں کا مسیحا"
"دو آوازیں"

فیض کی شاعری میں گہری انسانیت کے ساتھ یہ احساس نہایت شدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ انھوں نے محبت اور سیاست کو ایسا شیر و شکر کیا ہے کہ اس آمیزے کی دو آتشہ چاشنی آج کے انسان کے کام و دہن کو بے اختیار اپیل کرتی ہے۔ فیض کیسی ہی فقیہانہ باتیں کریں ان کا انداز ہمیشہ زاہدانہ ہوتا ہے۔ کسی قیامت کا ذکر چھیڑے بات پہنچے گی محبوب کی جوانی تک، عشق کی کسی حقیقت کا بیان ہو، مرکز حوالہ حسن ہی کی ذات ہوگی ؎

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر تیرے رخ پر بکھر گئی ہوگی

فیض نے "اے دل بے تاب ٹھہر" میں ماحول کی تغیر پذیر کیفیت کو گرچہ اختصار سے پیش کیا ہے لیکن اس کے SYMBOLIC انداز نے اس میں خاصی وسعت اور ہمہ گیری پیدا کردی ہے۔ شاعر کی نظروں نے ایک غلط قسم کے نظام کی تیرگی کو امڈتے ہوئے دیکھا ہے۔ شب کی رگ رگ سے انھیں لہو پھوٹتا نظر آیا ہے۔ لیکن وہ اس تیرگی کے بڑھنے اور رات کے گرم لہو کے بڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ یہ تاریکی ہی تو سحر پیدا کرتی ہے۔ یہی غازۂ رخسار سحر بنتی ہے۔ اس لیے وہ صبر سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں کہ اب سحر کے بے نقاب ہونے میں کوئی دیر نہیں، اب صبح ہونے ہی والی ہے جو چیز اسے روکے ہوئے ہے وہ لغزش پا کی پابندیٔ آداب ہے جب یہ پابندی آداب اٹھ جائے گی اور ایک والہانہ انداز پیدا ہوجائے گا تو نگار سحر بے نقاب ہوگی ؎

طبقاتی سماج افراد کی ذہنیتوں کو بڑی حد تک مسخ کردیتا ہے۔ زندگی کے حقائق کا احساس ان میں باقی نہیں رہتا۔ ان کی قدریں بدل جاتی ہیں۔ نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات غلط بنیادوں پر قائم ہوجاتا ہے اس لیے گوہر مراد حاصل کرلینے کا خیال آنکھوں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور اس طرح زندگی ایک فرار کا نام بن جاتی ہے۔ یہ رجحان طبقاتی سماج میں بہت عام ہوتا ہے۔ فیض نے یہ حقیقت شدت کے ساتھ محسوس کی ہے اور وہ اس کا گہرا شعور بھی رکھتے ہیں۔ "میرے ہم دم میرے دوست" میں انھوں نے اسی حقیقت کو بہت ہی حسین اور دلآویز پیکروں میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔

فیض کے یہاں ایک باشعور انسان کا عزم اور ولولہ ملتا ہے۔ وہ محض ناسازگار حالات پر کڑھنے اور آنسو بہانے ہی پر بس نہیں کرتے۔ زندگی کے غلط انداز سے جھنجھلا کر نعروں کے پٹاخے ہی نہیں چھوڑتے، اس

وسدھارنے اور سنوارنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں فیض
کے یہاں اس دور کی کئی نظموں میں اس صورت حال
کے اثرات ایک رجحان کی صورت میں موجود ہیں۔
لوح و قلم" میں اس کا اظہار بڑی شدت سے ہوا
ہے۔ ؎

هم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
میخانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئین در و بام حرم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے
اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

فیض کے پاس ایک آدرش اور نصب العین
ہے اس آدرش اور نصب العین کو سامنے رکھ کر
فیض نے بڑی ہی کامیاب نظمیں کہی ہیں۔ جن میں زندگی
وراس کی کشمکش، ماحول اور اس کی طبقاتی آویزش
کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا گیا ہے۔ فرسودہ نظام
وراس کی کارفرمائیوں پر خون کے آنسو بہائے گئے
ہیں۔ انسان کی بے بسی اور زبوں حالی پر ماتم کیا گیا
ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ قدیم نظام اور اقدار حیات
کے ختم ہونے کا شدت سے احساس ہے۔ فیض کے
خیال میں اس کا ختم ہونا یقینی ہے۔ سرمایہ دار اور
غیر سرمایہ داروں کی کشمکش جاری ہے۔ ان حقائق کو بہت
ہی حسین پیکر میں فیض نے پیش کیا ہے۔ ؎

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

سب ساغر شیشے لعل و گہر
اس بازی میں ہر جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن کے بلاوے آتے ہیں

طبقاتی آویزش اور انقلابی کشمکش کے تمام پہلوؤں کی
تصویر ان اشعار سے آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ ان سے
فیض کے طبقاتی شعور کا پتا چلتا ہے اور ان کے انسانی
اور حکیمانہ نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔

فیض نے روایتی اور تجرباتی دونوں قسم کی نظمیں
لکھی ہیں۔ انھوں نے حالی اور اکبر و اقبال کی ترقی
دی ہوئی پختہ ہیئت میں طبع آزمائی کی ہے اور مغرب
سے ماخوذ آزاد نظم اور نظم معریٰ میں بھی تجربے کیے
ہیں۔ لیکن فیض کا شدید فنی احساس انھیں اس معاملے
میں بھی ایک طرف نہیں ہونے دیتا۔ وہ ایک بہت
ہی منفرد فنکار ہیں۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے
کسی بندھے ٹکے سانچے پر اکتفا نہیں کرتے۔ انھیں اپنی
انفرادیت اور اس کی موزوں تشکیل کے لیے عائد
ہونے والی ذمہ داری کا پورا شعور ہے۔ چناں چہ
مسلسل ریاض کے ذریعہ انھوں نے اپنے ذہن کی
تربیت کچھ اس طرح کرلی ہے کہ ہر تخیل کے ابلاغ
کے لیے ان کے سامنے نظم کا ایک خاکہ سا ابھرتا
ہے۔ پھر وہ اس میں جگہ جگہ رنگ بھرتے ہیں۔ اس
لیے ہر تخیل کی ہیئت بھی اس تخیل کے انفرادی
انداز کے مطابق مخصوص ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ جیسے ہر تخیل اپنی فنی شکل خود لے کر نمودار
ہوتا ہے۔ اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ فیض کی
نظمیں نہ سراسر روایتی ہیں نہ یکسر تجرباتی۔

فیض کی غزلوں میں ان کی نظموں کی طرح
جدت اور اچھوتا پن ہے۔ یہ غزلیں بھی فیض کی
شاعری کے ایک نئے موڑ اور ایک نئی منزل کا پتا
دیتی ہیں۔ احساس کی شدت اور جذبہ کے خلوص
نے ان میں بڑی رچی ہوئی کیفیت پیدا کردی ہے
یہی وجہ ہے کہ غزلیں شعریت سے بھرپور ہیں۔
ان میں دل لبھانے اور دل موہ لینے والی کیفیت
زیادہ ہے۔

حسن و عشق اور اس کے معاملات جو غزل
کا بنیادی موضوع ہیں۔ ان کا بیان فیض کی ان
غزلوں میں بھی ملتا ہے۔ لیکن اس کی بنیادیں صرف
جذباتیت پر استوار نہیں۔ ان کے بیان میں احساس
کی شدت کے ساتھ ساتھ شعور کی فراوانی بھی
نظر آتی ہے اور اسی کا یہ اثر ہے کہ حسن و عشق کے مجرد
تصورات ان غزلوں میں نسبتاً کم نمایاں ہوتے ہیں۔
اس کے پس منظر میں انسانی مسائل ہیں۔ زندگی کی
کشمکش کا احساس ہے، اس کی الجھنوں کا خیال ہے۔
حسن و عشق اور اس کے معاملات اس کشمکش اور
الجھن سے علاحدہ نہیں ہیں۔ ان کے یہاں حسن و عشق
کا بڑا نکھرا ہوا مذاق ملتا ہے۔ چوں کہ وہ ایک رچا
ہوا مذاق رکھتے ہیں اس لیے ان کے پیش کرنے
میں ایک رچی ہوئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ؎

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں
حدیث یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

رنگ پیراہن کا خوشبو، زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو! اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

تیری صورت جو دل نشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے
حسن سے دل لگا کے ہستی کی
ہر گھڑی ہم نے آتشیں کی ہے
صبح گل ہو کہ شام میخانہ
مدح اس روئے نازنیں کی ہے

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

یہ سب غزلیں فیض کی دیدۂ تر کی تابندگی کی امانت دار ہیں۔ ان میں نغمہ ہے، نشتر ہے، گھلاوٹ ہے اور لگاوٹ ہے۔ اردو غزل کا سارا خمار ان میں رچا ہوا ہے۔

فیض کے موجودہ دور کی غزلوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زندگی اور اس کی کشمکش کو غزل کا روپ دے دیا ہے۔ اس کی ترجمانی انھوں نے اس شدت سے کی ہے کہ ان کے مقابلے میں حسن و عشق کے موضوعات تک پس منظر میں جا پڑتے ہیں۔ غزل کی تمام روایات اس کے تمام اشارے، اس کی تمام علامتیں، اس کی ساری رمزیت اور ایمائیت سب کے سب ان موضوعات کو پیش کرنے کے سلسلے میں ان کے لیے ایک سہارا بن گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعروں کا اثر بہت گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ کتنے حسین اور خوب صورت اشعار انھوں نے کہے ہیں۔ سے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے
چمن میں غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے صبا آج بے قرار گزری ہے

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے ابھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے
دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام
اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

ان تمام اشعار میں غزل کی صحیح روایت کو برتا گیا ہے۔ ان کے مفاہیم میں زیادہ وسعت اور گہرائی ہے، یہ صرف حسن و عشق کی باتیں نہیں ہیں بلکہ زندگی اور اس کی کشمکش کی باتیں ہیں۔ یہاں صرف جنوں، جنوں ہی نہیں رہ جاتا عمل کی ایک علامت بن جاتا ہے ـــــ فیض کی جدید غزلوں کی یہ بڑی اہم خصوصیت ہے کہ انھوں نے قدیم مینائے غزل میں معنویت کی نئی شراب بھری ہے اور اس طرح غزل کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا ہے ان کے موضوعات بے شک نئے ہیں لیکن چونکہ انھوں نے غزل کی تمام روایات کو برتا ہے اور نئے موضوعات کو ان روایات میں سمو کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے ان سے غزل اور اس کے مقتضیات کو ٹھیس نہیں لگتی۔ وہ بہرحال غزل معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ایک رچا ہوا انداز بہرصورت باقی ہے۔

یہ غزلیں اس وجہ سے ایک نئے رجحان کی علم بردار ہیں۔ ان سے غزل کے ایک نئے موڑ اور اس کی ایک نئی منزل کا پتا چلتا ہے۔ یہ بذاتِ خود بھی اہم ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ انھوں نے غزل میں نئے امکانات کی شعوری کوشش کیا ہے۔

اب آئیے ہم چند ناقدین کی رائے بھی جان لیں کہ ان کا فیض کی شاعری کے بارے میں سوچنے کا کیا انداز ہے۔ ان کے نزدیک ان کے شعری سرمایے کی کیا قدر و قیمت ہے۔ تب ہم ایک قطعی فیصلے پر پہنچ سکیں گے۔

مجنوں گورکھپوری

فیض ان لوگوں میں سے ہیں جو اردو غزل اور جدید اردو نظم دونوں میں ایک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہماری شاعری میں نئے امکانات پیدا کیے ہیں اور اس کے لیے بہت سی آزادیاں مہیا کی ہیں۔

سردار جعفری

"فیض سے اردو میں ایک نئے دبستانِ شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ جدید مغربیت اور قدیم مشرقیت کا حسین امتزاج ہے جس نے اردو شاعری کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔"

احمد ندیم قاسمی

"فیض کو ماضی کی ادبی روایت پر بڑا عبور حاصل ہے وہ تلمیحیں اور رمزیں اور کیفیت جس سے ہماری کلاسیکی شاعری بھری پڑی ہے۔ فیض کے یہاں ذرا زیادہ بھرپور معنویت کے ساتھ اس لیے نظر آتی ہیں کہ وہ میر و سودا، غالب و مومن، حالی اور اقبال کی قائم کی ہوئی بڑھی ہوئی روایات کا احترام کرتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ تراکیب و الفاظ کی بھی ایک تاریخ اور ایک روایت ہوتی ہے اور ہر لفظ کتنے ہی ادوار کی نازک جزئیات کو سمیٹے ہوئے ہم تک پہنچا ہے۔ فیض کو الفاظ کی تاریخ کے شعور کے ساتھ ہی مسکراہٹوں، آنسوؤں اور امنگوں کی تاریخ کا بھی شعور ہے اور یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری میں حسنِ معنیٰ کا بڑا حسین امتزاج ہے۔"

عبد المغنی

"فیض دورِ جدید کے سربرآوردہ شاعر ہیں۔ ان کے انفرادی تجربوں نے اردو شاعری کی روایت میں اضافے کیے ہیں۔ ان کے احساس میں تازگی اور اظہار میں شادابی ہے ان کے کلام میں سرشاری اور ولولہ ہے اور یہ اثر دل پر خون کی ایک گلابی کا ہے۔ ہر طرف داغِ حسرتِ دل کی لالہ کاری ہے۔ فیض کے انداز و ادا میں بڑی متانت اور وقار ہے۔"

آلِ احمد سرور

"فیض ہمارے ایسے شاعروں میں سے ہیں جنھیں زندگی اور اس کے ہزار شیوہ حسن سے محبت ہے اور اس محبت کی وجہ سے ان کا اور زندگی کا جھگڑا ابھی چلا جاتا ہے۔ فیض کو آتش خانوں کی مقدس آنچ ملتی ہے مگر اس نے انھیں جھلسایا نہیں بلکہ ان کی شخصیت کو توانائی اور ان کی شاعری کو تب و تاب عطا کی ہے۔ فیض نے اپنی چنگاری پر اکتفا نہیں کیا اسے ہوائے رہگزر سے دہکایا اور اس سے ایک شمع کا کام لیا ہے۔"

ان ناقدین کی رایوں کے مطالعے سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سبھی ان کی عظمت اور ان کے شاعرانہ مرتبے کے معترف ہیں۔ اس میں وہ خواب ناکی، وہی نغمگی، وہی رمزیت ہے جو ہمیں ELIOT' YEAST اور دوسرے مغربی شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ ●

محمد احسن

راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری اور پنجاب کی تہذیب

پنجاب کی زندگی اپنی نیرنگی اور رعنائی کے سبب ہندوستانی تہذیب میں منفرد شناخت رکھتی ہے۔ پنجاب کو اپنی تہذیبی روایات واقدار کے لحاظ سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اسی تہذیبی زنگارنگی سے بیدی کے افسانوں کا خمیر تیار ہوا ہے۔ بیدی کے بیشتر افسانے اسی زندگی کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ لیکن بیدی کا کمال یہ ہے کہ وہ اس رنگارنگ زندگی کو پیش کرتے ہوئے اس کی پیچیدگیوں اور اس کی تہوں میں چھپی حقیقتوں کو بڑی فنکاری سے آشکار کرتے ہیں اور اس طرح یہ زندگی کسی مخصوص علاقے سے جڑی ہونے کے باوجود پورے ہندوستانی زندگی کا آئینہ بن جاتی ہے اور یہیں آکر معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی تہذیبی رنگارنگی میں بھی یگانگت پائی جاتی ہے۔

پنجاب کے علاقے کو اس اعتبار سے امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ تمام ترقیوں کے باوجود اس علاقے نے اپنی زندگی کے آب ورنگ کو جانے نہیں دیا۔ وہاں کی تہذیب اور اس کے مظاہر ابھی تک کتابوں کی زینت اور تجارت کے اشتہار نہیں بنے ہیں۔ وہاں کی تہذیب زندہ ہے۔ ہولی، دیوالی وغیرہ تو ایسے تہذیبی مظاہر ہیں جو دوسری جگہوں پر بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں کے مخصوص تہذیبی مظاہر بھنگڑا اور رقص، سمّی ناچ، کِکلی ناچ، مختلف طرح کے میلے، عوامی شاعری، لوک گیت، اوہام وروایات، رام لیلا، ڈراما، کرشن لیلا، یاراس، سوانگ، نوٹنکی، کھیوڑا وغیرہ آج بھی موجود ہیں اور ان میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ تہذیبی روایات اور مظاہر کی اس پختگی اور شادابی کی وجہ سے اس علاقے کا ادب بھی خاصا مالدار ہے۔ یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ نسائی معقول ترین عشقیہ کہانیوں میں جن ہندوستانی کہانیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ وہ "ہیر رانجھا" "سوہنی مہیوال" "سسی پنوں" اور "مرزا صاحباں" وغیرہ ہیں۔ جن کی جڑیں پنجاب کی سرزمین میں پیوست ہیں۔ عشق اور شاعری کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ دونوں چیزیں اس معاشرے میں زیادہ پنپتی ہیں۔ جس میں مذہب ایک مرکز ثقل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پنجابی معاشرہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آج بھی وہاں کی زندگی میں مذہب کا عمل دخل موجود ہے۔ ہر چیز مذہب کے گرد گھومتی ہے۔ اپنے ماضی پر اصرار اور افتخار بھی اس معاشرہ کا ایک اہم پہلو ہے۔ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ وہاں جتنے بھی میلے لگتے ہیں ان میں اکثر مذہبی شخصیات سے متعلق مقامات پر انھیں کی یاد میں لگتے ہیں۔ چھپیٹر میلہ، گگا پیر کے اعزاز میں، جرگ میلا دیوی ستیلا کے لیے، روشنی میلا پیر عبدالقادر جیلانی کی یاد میں لگتے ہیں۔ ان سب میں یہاں کے لوگ بلا تفریق مذہب وملت شریک ہوتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔ شادی، بیاہ، موت، پیدائش اور اس طرح کے دوسرے مواقع پر عورتیں اسی طرح اپنے روایات پر اصرار کرتیں، گانے گاتیں، ہنستی بولتی یا مغموم ہوتی ہیں۔ ان میں کسی چیز کو نظر انداز کر دیے جانے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ایک پنجابی کی حیثیت سے بیدی اپنی تخلیقات میں ان تجربات ومشاہدات سے فائدہ اٹھا کر اپنے فن کو ایک طرف پنجابی تہذیب کا حقیقی ترجمان بناتے ہیں تو دوسری طرف اقدار واوہام کی دنیا کی سیر کرتے ہوئے پسماندہ طبقے کی زندگی کے کرب والم اور روایتی جکڑ بندیوں کو اساطیری ودیومالائی تصورات کے پردے میں پیش کر کے انھیں زندگی کے اس دلدل سے نکلنے کی ترغیب بھی دلاتے ہیں۔ بیدی کی ابتدائی کہانیوں کا پس منظر خالص پنجابی معاشرہ ہے۔ وسطی اور آخری دور کی کہانیوں میں شہری زندگی اور ہنگامی حالات کو پس منظر بنایا گیا ہے۔ لیکن یہاں بھی کہیں نہ کہیں پنجابیت کی جھلک نظر آہی جاتی ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کے افسانوں کا خمیر پنجاب کی سرزمین سے تیار ہوا اور اسی زمین پر اپنی نکھار کے دن دیکھے ہیں۔

بیدی کے افسانوں میں پنجاب کی معاشرتی زندگی کو نمایاں جگہ حاصل ہے۔ معاشرے کے مختلف اقدار وروایات کا ذکر بیدی کی کہانیوں میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں چند اہم پہلوؤں کو ان کے افسانوں کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

افسانہ "بھولا" کا پس منظر پنجاب اور پنجابی کسان ہے جو معاشرے میں رائج مختلف اوہام سے گھرا ہوا ہے۔ انھیں اوہام میں سے ایک اس افسانے کا موضوع ہے کہ "دن میں کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں" اسی اوہام کے ذریعہ بیدی نے اپنے کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے مگر کہانی میں مایا کے سماجی بندھنوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس نے

۲۶۷۔ سابرمتی ہوسٹل۔ جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی، ۶۷

کہانی کو مزید تقویت بخشی۔ یہ دراصل نہ صرف مایا کے سماجی بندھن ہیں بلکہ پنجابی معاشرہ کے ان سماجی جکڑ بندیوں کی عکاسی کرتے ہیں جو پنجاب کی بیوہ پر عائد کر دیے گئے ہیں اور ہر بیوہ عورت اس پہ عمل کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔

"مگر مایا نے خود اپنے آپ کو سماج کے روح فرسا احکام کے تابع کر لیا تھا۔ اس نے اپنے تمام اچھے کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک صندوق میں مقفل کر کے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دی تھی۔"

(افسانہ دانہ ودام صفحہ ۱۱)

مایا کے اچھے کپڑے اور زیورات سے پرہیز کرنے کے ذکر سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہاں کی معاشرتی زندگی میں یہ بات شامل ہے کہ بیوہ ان چیزوں سے پرہیز کرے اور زندگی کے لطف اور خوشگواری سے الگ رہے۔ پنجابی تہذیب میں اس معاملہ میں کتنی شدت ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ افسانے میں یہ چیز معاشرہ کے جبر کے طور پر سامنے آتی ہے کہ سسر کے کہنے کے باوجود بھی مایا ان چیزوں کو صندوق میں بند کر کے چابی ایک جوہڑ میں پھینک دیتی ہے تاکہ اس کے کھولنے کا امکان بھی باقی نہ رہے۔ مایا کے گیتا کے پاٹھ کرنے اور بچے کی اس میں دلچسپی لینے سے اس تہذیب میں مذہب کے مرکز ثقل کی حیثیت اور بھولا کی کہانیوں میں دلچسپی لینے سے اس معاشرے میں کہانیوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

"چھوکری کی لوٹ" افسانہ چھوکری کی لوٹ میں شادی بیاہ کے رسم و رواج پر بیدی نے بڑی فنی چابک دستی سے لطیف پیرایہ میں پنجاب کے معاشرے پر طنز کیا ہے۔ یہاں بیدی نے بچوں کی نفسیات کے حوالے سے بہن کا بھائی سے جدا ہونا جو صرف ایک بہن ہی نہیں، ایک اچھی دوست بھی تھی، کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ پرسادی رام اپنی بہن کی جدائی کے سبب طرح طرح کے خیالات میں گم ہے۔ کبھی وہ سوچتا ہے کہ لڑکیاں اپنی مرضی سے جاتی ہیں اور اپنی لوٹ پسند کرتی ہیں۔ جب وہ اس خیال پر پہنچتا ہے تو اسے اپنی بہن رتی سے اتنا پیار نہیں رہ جاتا ہے جتنا پہلے تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے خیالات کا سلسلہ نہیں ختم ہوتا، عقل کام نہیں کرتی تو مجبور ہو کر اماں سے اس کی حقیقت دریافت کرتا ہے ماماں کا جواب پوری سماجی زندگی کے اقدار پر ایک گہرا طنز ہے:

"پرسادی نے اماں سے تایا کی عقل کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگی۔ بیٹا! یہ چھوکری کی لوٹ آج سے نہیں جب سے دنیا بنی ہے چلی آرہی ہے۔ سب اپنی اپنی بیٹیوں کو دے دیتے ہیں۔ اتنی دولت اور دھن بھی۔ ہائے اس پہ بھی بس ہو تو کوئی لاکھ منائے بیٹیوں والے منتیں کرتے ہیں۔ پاؤں پڑتے ہیں۔ کیا جانے اس کی سسرال والے روٹھ جائیں۔ تب جا کر ساری عمر کے لیے کوئی کسی کی بیٹی لیتا ہے۔"

(دانہ ودام۔ ص ۸۱-۸۰)

بیدی نے ان چند جملوں سے جہیز کا مسئلہ اور لڑکی کی شادی کے لیے والدین کی پریشانی و سرگردانی کو نہایت ہی پر اثر طریقے سے بیان کر دیا ہے۔ "تلادان" تلادان راجندر سنگھ بیدی کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں انھوں نے اونچ نیچ اور چھوا چھات جو پنجاب کی زندگی میں ہنوز ایک اہم مسئلہ ہے اسے پیش کیا ہے۔

افسانہ تلادان کا مرکزی کردار "بابو" ہے جو دھوبی کے گھر اچھی شکل و صورت لے کر پیدا ہوا ہے، جس میں اونچے طبقے کی تفاخرانہ خصوصیات بھی ہیں۔ لیکن سماج کی تیکھی نظریں تہواروں کے وقت اسے اس بات کا احساس دلاتی رہتی ہیں کہ وہ نچلے طبقے کا ہے اور یہی باتیں اس کے معصوم ذہن میں گھر کر جاتی ہیں۔ مگر بچے کے ذہن میں "اس قسم کی فضول باتوں کے متعلق خیال آرائی کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔" (دانہ ودام۔ ص ۱۴۶)

مگر حالات اس معصوم ذہن کو بھی پراگندہ کر دیتے ہیں۔ سماجی زندگی کے اس ناسور کو بیدی نے مختلف حوالوں سے اس افسانے میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

"اپنے دکھ مجھے دے دو" بیدی کا ایک بہت عمدہ افسانہ ہے۔ اس افسانے کا مرکزی خیال عورت اور مرد کے رشتے کو اجاگر کرتا ہے۔ دراصل عورت ہمارے سماج کا اہم ترین جزو ہے، جس کے بغیر زندگی کا تصور ادھورا ہے۔ بیدی نے اس کہانی کے ذریعے مشترکہ خاندان میں ایک پنجابی بلکہ ہندوستانی عورت کا آئیڈیل (IDEAL) پیش کیا ہے۔

اندو اپنے سسرال کے تمام لوگوں کا خیال رکھتے رکھتے اپنے شوہر تک کے خیال سے عاری ہو جاتی ہے اور اسے ہوش اس وقت آتا ہے جب مدن اندو میں دلچسپی نہیں لیتا بلکہ کہیں اور زندگی سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔ لیکن اندو ایک آئیڈیل ہندوستانی عورت کی طرح مدن کو پھر سے سنبھال لیتی ہے۔

اس افسانے میں بیدی نے سماجی اقدار اور اس معاشرے میں عورتوں کی صورت حال کا بڑا خوبصورت جائزہ لیا ہے۔ افسانے کے مجموعی جائزے سے پنجاب کی زندگی میں عورت کے سماجی مقام و احترام کا علم ہوتا ہے اور یہ نہ صرف پنجاب کی زندگی سے مختص ہیں یہاں پورے ہندوستانی معاشرے کی جھلک ملتی ہے۔ عورتوں کی بے بسی اور استحصال کے متعلق بیدی کی ایک کہانی "گرہن" بھی کافی اہم ہے۔ جس میں اساطیر کے سہارے اس اہم مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔ "گرہن" میں ہولی ایک مظلوم اور بے بس عورت ہے۔ جسے اس کا شوہر محض جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھتا ہے اور کبھی کتھو رام جو گاؤں کے رشتے سے اس کا بھائی ہونے کے باوجود اسے اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتا ہے۔ ان دونوں کی ہوس زدہ نگاہوں سے ہولی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسری طرف رسیلا اور کتھو اس کو گھنانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ اس کو بیدی نے "چاند گہن" کے سلسلے کے اساطیر کے سہارے پیش کیا ہے۔ سورج گرہن یا چاند گرہن کے سلسلے میں پنجاب کی تہذیب کا عقیدہ یہ ہے کہ اس موقع پر حاملہ عورت کو چلنے پھرنے کی ممانعت ہوتی ہے۔

> "جب تک کہ گرہن ختم نہ ہو جائے کھانے پینے حتی کہ کپڑے بدلنے تک کو ملتوی رکھا جاتا ہے۔ عقیدہ ہے کہ گرہن کے وقت حاملہ عورت کی کسی بھی جنبش کا اس بچہ پر منفی اثر ہوتا ہے جو ماں کے رحم میں ہے۔ اگر گرہن کے دوران وہ کوئی لکیر کھینچتی ہے تو اس کا نشان اس بچے کے جسم پر نمودار ہو جائے گا۔"

(پنجاب: ادب اور ثقافت ص ۳۹)

انھیں عقائد کے تحت یہ افسانہ آگے بڑھتا

ہے مگر بیچ بیچ میں عورتوں پر کیے جانے والے مظالم کا ذکر بھی ہے۔ مثلاً ہولی کی ساس کہتی ہے :۔

"تو نے سُرمہ کیوں لگایا ری رانڈ
جانتی نہیں آج گہن ہے۔ بچہ اندھا ہو جائے
تو تیری ایسی بیوا اسے پالنے چلی "
(گرہن ص۹)

لیکن دوسری طرف وہی بڑھیا ساس جب دوپٹہ سے بھیگی ہوئی ترازو کا پیندا صاف کر کے ہولی کی طرف پھینک دیتی ہے کہ اسے دھو ڈال تو ہولی سوچتی ہے:۔

"اس وقت چاند گرہن کے زمرے میں داخل ہونے والا ہی ہوگا۔ بچہ ڈھلے ہوئے کپڑے کی طرح چرماسا پیدا ہوگا اور اگر ماہ دو ماہ کا بچہ کا براسا چہرہ دیکھ کر اسے کوسا جائے تو اس میں ہولی کا کیا قصور" (گرہن ص۱۰)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بیدی نے " اپنے دکھ مجھے دے دو" کی شکل میں گرہن کی ہی ترمیم و اضافہ شدہ شکل پیش کی ہے۔ بہت واضح طور پر اپنے دکھ مجھے دے دو گرہن سے زیادہ بھرپور افسانہ ہے۔ گرہن کی ہولی اساڑھی سے بھاگ جاتی ہے یا بھاگنے کی کوشش کرتی ہے اور کتھو رام کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ لیکن اپنے دکھ مجھے دے دو کی اندو اپنا گھر بساتی ہے وہ ہر نازک موقع پر اپنے شوہر کے کام آتی ہے اور آخر میں اپنے کھوئے ہوئے شوہر کو بھی گھر لے آتی ہے۔ یہ بات بہت واضح ہے کہ ۱۹۴۱ء میں گرہن کی اشاعت کے بعد بیدی کو یہ احساس ہوا کہ راہو اور کیتو اور چاند و سورج کے اسطور اور استعارہ کی وجہ سے راہو کے راکشس پن کی خصوصیت کے باعث وہ چاند دیوتا کو اس طرح نہ پیش کر سکے جیسے وہ پیش کرنا چاہتے تھے۔ پھر معاملہ صرف گرہن اور اس کے چھٹکارے تک محدود رہ گیا۔ بیدی کے تصور کی مکمل عورت سامنے نہ آسکی جو پیدا کرنے والی اور راحت دینے والی ہے، جو (WORDS-WORTH) کے الفاظ میں "TO WARM TO COMFORT AND TO COMMAND" کے لیے بنی ہوتی ہے۔

اساطیر و توہمات

منگل اشٹکا بیدی کا ایک خوبصورت افسانہ

ہے۔ پس منظر میں وہی پنجاب اور پنجاب کے رسوم و عقائد ہیں جو مختلف قسم کے اوہام سے گھرا ہوا ہے۔ انھیں اوہام سے ایک اس افسانے کا موضوع ہے۔ اس افسانے میں بیدی نے ایک جگہ ستاروں سے منسوب عقائد کا ذکر بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔ پنجاب کے عوام میں یہ تصور مقبول رہا ہے کہ ایک ہی ستارے کے زیر اثر پیدا ہونے والے مختلف افراد کے مزاج، قسمت وغیرہ میں یکسانیت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ منگل اشٹکا کے مرکزی کردار جیوا رام کی خصوصیات بیان کرتے وقت بیدی ہنومان جی کے ستاروں اور خصوصیات سے اس کا موازنہ کراتے ہیں۔ بیدی کے الفاظ میں

"ایک اور بات سے بھی اس کا اس قدر شرمیلا ہونا منسوب کیا جا سکتا تھا۔ شروع سال میں باتوں باتوں میں جیوا رام نے مجھے بتایا کہ اس سال چیت کی پورنماسی کو ہنومان جینتی کے دن وہ چالیسویں سال میں قدم رکھے گا۔ یکا یک مجھے خیال آیا کہ چیت کی پورنماسی کے دن ماروتی دیو یعنی ہنومان جی پیدا ہوئے تھے اور اس دن سے چالیس برس پہلے جیوا رام کی پیدائش بھی انہی ستاروں کے زیر ہوئی ہوگی۔ جس کے باعث اس کا جسم بھی تنومند تھا اور طبیعت میں ہنومان جی کی سی بے چینی و جوش تھا یعنی وہ ایک جگہ جم کر کم ہی بیٹھ سکتے تھے۔"
(دانا و دام۔ ص۱۰۹)

افسانہ ہمدوش کا بھی تانا بانا اسی وہم کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔

"جب پرندہ پرواز کے لیے پر تولتا ہے تو نیچے کا پچھلا حصہ زمین پر سے اٹھا کر نشست و پرواز کی درمیانی حالت میں ہوتا ہے اسے صورت ناہمض کہتے ہیں۔ بیمار کے لیے صورت ناہمض میں بیٹھنا معیوب اور بدشگونی کی علامت گنا جاتا ہے یعنی جو اس دنیا سے ایڑیاں اٹھا کر فضائے عدم میں پرواز کرنا چاہتا ہے۔ وہ بیمار بلا خوف اس حالت میں بیٹھے"
(دانا و دام۔ ص۳)

کھیڑا مغلی اس حالت میں بیٹھا رہتا ہے۔ راوی اس سے اس حالت میں بیٹھنے سے منع کرتا ہے پھر راوی اور اسٹیج لال ٹھیک ہو کر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ ان دونوں کی حالت بہت خطرناک تھی اور یہ اپنی زندگی سے خاصے مایوس تھے لیکن جب ایک دن راوی اسپتال جاتا ہے تو اس سے کھیڑا مغلی کی لاش اور اس کی موت پر روتے ہوئے لوگ وہاں دکھائی پڑتے ہیں اور افسانہ اپنے اختتام کو پہنچ جاتا ہے یعنی کھیڑا مغلی کا صورت ناہمض میں بیٹھنا اس کی موت کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ یہ پنجاب کے لوگوں کی زندگی میں اوہام کی کارفرمائی کی نمائندگی کرتا ہے۔

افسانہ "من کی من میں" جو مجموعہ "دانا و دام" کا تیسرا افسانہ ہے بنیادی طور پر کہانی مادھو اور گاؤں کی ایک بیوہ امبو کے تعلقات کی ہے۔ جس پر کلکارنی اور بقیہ معاشرہ REACT کرتا ہے۔ امبو کی تئیں لوگوں کا رویہ بیوہ کے سلسلے میں اس تہذیب کے وہم کو سامنے لاتا ہے وہ یہ کہ سنکرانت کے دن جب سہاگنیں ایک دوسرے کی مانگ بھرتی ہیں، تو کسی بیوہ کو وہاں موجود ہونا نہیں چاہیے۔

"جب کلکارنی کو بہو کی مانگ میں پڑوس کی ایک دلہن نے سیندور لگایا تو امبو وہیں کھڑی رہی۔ سہاگن کے پاس بیوہ کھڑی رہے۔ رام رام! کلکارنی نے امبو کو بازو سے پکڑا اور دھکا دے کر برآمدے سے باہر کر دیا۔ بولی دیکھتی نہیں کیا ہو رہا ہے ـــــ ؟"
(دانہ و دام۔ از بیدی ص۴۲)

"تلادان کی رسم انسانی جان کے خطرے کو مال کے ذریعہ ٹالنے کی رسم ہے۔ یہ رسم مختلف علاقوں اور طبقوں میں مختلف طریقوں سے ہوتی ہے ـــــ اردو فکشن میں اس کی صورت پریم چند کے ناول "گئودان" میں پائی جاتی ہے۔ جہاں ہوری کی موت کے موقع پر پنڈت گئو دان کرنے کے لیے کہتا ہے تاکہ ہوری کی جان پر آئی ہوئی آفت ٹل جائے لیکن دھنیا اسے صرف چودہ آنے پیش کر پاتی ہے کیونکہ یہی اس کا کل اندوختہ ہوتا ہے۔ بیدی کا افسانہ "تلادان" بھی اسی تصور پر مبنی ہے۔ سکھ نندن کے جنم دن کے موقع پر اسے مختلف قسم کی اجناس سے تولا جاتا ہے تاکہ اس پر کوئی زمینی یا آسمانی آفت نہ آئے اور اس اجناس کو غریب غربا میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب بابو بیمار پڑتا ہے تو اسے بھی اس بیماری سے چھٹکارے

کے لیے اجناس سے تولا جاتا ہے۔ لیکن اس افسانے میں ایک اور رسم جو اہم ہے وہ سیتلا دیوی کی پوجا ہے۔ سیتلا دیوی کے لیے پنجاب میں جرگ میلہ لگتا ہے۔ لیکن "تلادان" میں سیتلا کے زد میں آئے گاؤں کی عورتیں گوری میا کے متعلق ایسے گانے گاتی ہیں جس میں اس سے واپس چلے جانے اور اپنا غصہ گاؤں والوں اور ان کے خاندان کے افراد پر نہ اتارنے کی درخواست کی جاتی ہے۔ سرخ پھلکاریوں کے پرچے لگائے جاتے ہیں اور دوسرے طریقوں سے سیتلا میا کا غصہ ٹھنڈا کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسے سجایا اور سنوارا جاتا ہے۔ مونگے کی مالا اس کے گلے میں ڈالی جاتی ہے اور عزت واحترام کے ساتھ گاؤں کے باہر لے جا کر اسے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ وہ کسی دوسرے گاؤں کی طرف رخ کرلے۔

افسانہ "رحمان کے جوتے" کے لیے بھی بیدی نے توہم کا سہارا لیا ہے۔ "جوتے پہ جوتے چڑھ جانا" سفر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ رحمان بھی اسی توہم کا شکار ہو کر اپنی بیٹی کے گھر کا سفر کرتا ہے۔ مگر بیدی نے کہانی کے اختتام پر رحمان کے اس سفر کو سفر آخرت میں تبدیل کر دیا ہے اور ڈاکٹر اور رحمان کے "سفر یکجا" میں "حقیقت اور توہم" کو واضح کیا ہے۔ یہ عبارت دیکھیں :

"رحمن قے کرنے کے لیے جھکا اور اس نے دیکھا کہ اس نے اپنے جوتے بدستور جلدی سے چارپائی کے نیچے اتار دیے تھے اور جوتے پہ جوتا چڑھ گیا تھا۔ رحمن ایک میلی سی سکڑی ہوئی ہنسی ہنسا اور بولا ڈاکدار جی مجھے سفر پر جانا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں جوتا جوتے پر کیسے چڑھ رہا ہے؟ ڈاکٹر جو اُبا مسکرا دیا اور بولا ہاں بابا تو نے بڑے لمبے سفر پر جانا ہے۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ رحمن نے زاد راہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ایک بڑے لمبے سفر پر روانہ ہو گیا۔"

(گرہن۔ بیدی۔ ص ۲۹)

مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ راجندر سنگھ بیدی نے اپنے کہانیوں میں پنجاب کی زندگی میں رائج توہمات واساطیر کو اہم جگہ دی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی کہاوتوں، محاوروں، ضرب الامثال وغیرہ کو اپنی کہانی کے خام مواد کے طور پر استعمال کرتے ہیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں مگر پنجاب کی زندگی میں ان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بیدی ان توہمات کے پس منظر میں اپنی بات بڑی چابکدستی سے کہہ جاتے ہیں اور قاری کو ایک فکر بھی عطا کر جاتے ہیں۔

رسم ورواج

بیدی کے افسانوں میں پنجابی زندگی کی رنگارنگ تصویریں ملتی ہیں۔ ان تصویروں میں پیدائش سے لے کر موت تک کے رسوم اور دیگر تقریبات میں ضمناً منائے جانے والے رسومات سب کے سب پوری رنگینی ورعنائی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کی جھلکیاں ذیل کے حوالوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

"چھوکری کی لوٹ" میں شادی سے متعلق رسوم ورواج پنجاب کی تہذیبی زندگی کو پیش کرتی ہے۔ اس افسانے میں تہذیبی زندگی کا مرکز گھر آنگن ہے جہاں رت جگے ہوتے ہیں لڑکیاں بیاہ کے گیت گاتے ہوئے جوان ہوتی ہیں اور ایک دن وہ خود بھی بیاہ دی جاتی ہیں اور ان کی جگہ دوسری لڑکیاں لے لیتی ہیں۔ شادی بیاہ کی تقریبات، تیاریاں، پکوان رسم ورواج، دلہن کی رخصتی، بابل کے گیت، گھر والوں کا رونا دھونا سب کچھ اس افسانے میں موجود ہے۔ ایک اقتباس سے اس منظر کو ملاحظہ فرمائیں :۔

"تائی اماں منڈپ کے نیچے جھنڈیوں اور لکڑیوں کی چڑیوں کے نیچے بیٹھی تھیں۔ اردگرد عورتیں گا رہی تھیں۔ باہر باجا بج رہا تھا اور پنڈت جی کے شلوکوں کی آواز شور وغوغا سے علاحدہ سنی جا سکتی تھی۔ جب پھیرے ہو گئے تو سب نے تائی اماں اور جگت گورو کو بدھائی دی۔ تائی اماں کو سرخ پھلکاری اور جگت گورو جی کو گلابی پگڑی پر کیسر کے نشان لگائے گئے اور پیلے پیلے پھول پنکھڑیاں برسائے گئے۔"

(دانہ ودام۔ از بیدی۔ ص ۸۲)

اس افسانے میں ایک اور سماجی رسم کا ذکر ملتا ہے اور وہ چھوکری کی لوٹ کی رسم ہے۔ یہ رسم مکر سنکرانتی کے موقع سے ادا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر جس کی لڑکی جوان اور شادی کے لائق ہو جاتی ہے وہ اس کی لوٹ مچاتی ہے۔ یعنی کوئی بوڑھی سہاگن مختلف قسم کے پھل پھلاریاں متعلقہ لڑکی کے سر پر مٹھائیاں بھر بھر کر گراتی ہے اور تمام سہاگن اور کنواری لڑکیاں اسے لوٹ کر کھاتی ہیں۔ سہاگن کے کھانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا بانجھ پن ختم ہو جاتا ہے اور کنواری کے کھانے کا مقصد اس کی جلدی سے جلدی شادی طے ہو جائے۔ اس رسم کا مقصد اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ متعلقہ لڑکی جلد سے جلد اپنے گھر کی ہو جاتی ہے اور کوئی اسے لوٹ کر لے جاتا ہے۔"

بیدی کا ایک افسانہ "چیچک کا داغ" ہے اس کہانی میں بیدی نے پنجاب کے متوسط طبقے کے اس نوجوان کی کہانی لکھی ہے جو کالج میں تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اس کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہوتی ہے جس کے منھ پر چیچک کے داغ ہیں اس بات کا لڑکے کے ذہن پر کیا اثر ہوتا ہے یہ بتاتے ہوئے پھر گاؤں سماج اور گھر والوں کے اثرات کو دکھاتے ہوئے بیدی نے بڑی فنکارانہ مہارت سے پنجابی عناصر کو چند بلیغ اشاروں میں ظاہر کیا ہے جن کا تعلق توہمات سے بھی ہے اور ان رسوم ورواج سے بھی۔ ایسا لگتا ہے کہ بیدی نے اس تہذیب کے تمام تر عناصر کو بہت گہرائی سے دیکھا ہے اور اپنی کہانیوں کی اساس بنا کر پیش کیا ہے اس کہانی میں جن تہذیبی عناصر کی نشان دہی ہوتی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ بچے کی پیدائش کے تیرھویں دن زچہ کو غسل دیا جاتا ہے اور اس میں گائے کے پیشاب کا استعمال ہوتا ہے۔
۲۔ پیتل کے برتن (مرادآبادی) میں کھانا بہتر سمجھا جاتا ہے۔
۳۔ شادی کے گھر میں رونا اشگن مانا جاتا ہے۔
۴۔ شادی کے دن برتن بنانے کی رسم ہوتی ہے۔
۵۔ شادی کے دن ایک رسم اور یہ ہوتی ہے کہ کسی تھیلی وغیرہ میں بہت سے روپے رکھ دیے جاتے ہیں دلہن ایک ہاتھ سے اس میں جتنے پیسے نکال لیتی ہے اس کے مطابق اس کے مزاج کا تعین ہوتا ہے یعنی وہ کتنی خرچ کرنے والی ہے۔

افسانہ "کوکھ جلی" میں نام رکھائی سے متعلق معلومات یوں فراہم ہوتی ہیں۔

"بیساکھی کے اردگرد ہمارے گاؤں میں

باقی صفحہ ۲۴ پر

غزلیں

غمگین قریشی

بہاروں کے زمانے میں اداسی ہوگیا موسم
ہوا کا رُخ بدلتے ہی یہ کیسا ہوگیا موسم

ابھی تو ہم اندھیروں کا سفر طے کرکے آئے تھے
ابھی سے کیوں اجالوں کا مخالف ہوگیا موسم

بنامِ اتحاد و امن بیداری ضروری ہے
یہ چادر بے حسی کی تان کر کیوں سوگیا موسم

خوشی کے پھول اس کی راہ میں ہم نے بچھائے تھے
ہماری راہ میں کانٹے غموں کے بوگیا موسم

بڑی محنت سے ہم نے پیار کے منظر نکھارے تھے
مگر فرقہ پرستی کی فضا میں کھوگیا موسم

دلوں سے اہل گلشن کے مروت اٹھتی جاتی ہے
محبت کے سبھی جذبوں کو شاید دھوگیا موسم

ہمیں غمگین اپنی سادگی کی مل گئی قیمت
ہماری بے بسی پر چند آنسو روگیا موسم

محلہ ڈھولی کھال، ضلع سہارنپور، یوپی۔ ۲۴۷۰۰۱

مجرم عابدی

دل کے معاملات کو ہم کس سے پوچھتے
ترکِ تعلقات کو ہم کس سے پوچھتے

اپنی نظر تو بس تیرے جلووں میں گم رہی
اسرارِ کائنات کو ہم کس سے پوچھتے

اک ایک کرکے بجھ گئے پلکوں کے سب چراغ
اسبابِ حادثات کو ہم کس سے پوچھتے

جب بھی ذرا سی ٹھیس لگی چھپ کے رو لیے
دل سوز واقعات کو ہم کس سے پوچھتے

بس آنسوؤں کے ساتھ ہی اک عمر کٹ گئی
محرومیِ حیات کو ہم کس سے پوچھتے

ان سے تعلقات کی جو شرط بن گئی
مجرمؔ اس ایک بات کو ہم کس سے پوچھتے

سید واڑہ، محمد آباد گوہنہ، ضلع مئو (یوپی) ۲۷۶۴۰۳

انورؔ پانی پتی

ان کے ماتھے پر بل تھا
رات کا سایہ بوجھل تھا

جس پہ نظر رک جاتی تھی
کس کا چہرہ کومل تھا؟

پھول تھے پیاسے آنگن کے
بھیگا بھیگا بادل تھا

خاموشی کے رستے میں
آوازوں کا جنگل تھا

میری وفا کا پہریدار
رستے میں ایک پیپل تھا

نگری نگری بلوے تھے
کوچہ کوچہ مقتل تھا

خون کے چھینٹے گلشن میں
دیکھ کے انورؔ بیکل تھا

موضع و ڈاکخانہ لدورا درگاہ، جتا چوک سمستی پور، بہار

غزلیں

حامد سہارنپوری

جو مہرباں تھے وہ نامہرباں ہوئے دریافت
زمیں پہ رہ کے بہت آسماں ہوئے دریافت

سبو و جام کی تقدیر جب بدل ڈالی
نئے عزائم پیر مغاں ہوئے دریافت

گراں تھا سب کو سمندر کھنگالنا میرا
یہ اور بات سبھی استخواں ہوئے دریافت

لہو میں جن کو ڈبو کر لکھا تھا حال اپنا
وہی قلم تو مری انگلیاں ہوئے دریافت

سفید برف کی چادر تھی جن کے شانوں پر
وہی پہاڑ تو آتش فشاں ہوئے دریافت

عجیب دورِ ترقی ہے جس میں اے حامد
تاثرات مہ و کہکشاں ہوئے دریافت

۱۵۱۰/۱۱، گلی ۵، نشاط روڈ، ابراہیم آباد، سہارنپور

تنویر رامپوری

دل کو میرے کسی نے توڑ دیا
ہائے زخموں کو بھی نچوڑ دیا

وہ جو دیکھا تھا میں نے خواب حسیں
خود ہی تعبیر دے کے موڑ دیا

زندگی تشنہ لب تھی صدیوں سے
کس نے دریا پہ لا کے چھوڑ دیا

کون تھا جس نے پنجۂ باطل
آن کی آن میں مروڑ دیا

اس نے بنیاد ڈال دی ایسی
ایک رشتے میں سب کو جوڑ دیا

اس نے تنویرؔ جب کتاب لکھی
ایک سادہ ورق بھی چھوڑ دیا

مردانہ امام باڑہ اندرون قلعہ رامپور (یو پی)

دانش کمال سہارنپوری

بغض و نفرت کی یہ ساری فصل جلنی چاہیے
پیار کی ایثار کی ہر شاخ پھلنی چاہیے

شعلے نفرت کے چلو مل کر بجھا دیں دوستو!
شمعِ الفت اب تو ہر اک دل میں جلنی چاہیے

عشرتوں میں ڈھل کے ہر جانب سے پھوٹے صبحِ نو
اب تو یہ غم کی اندھیری رات ڈھلنی چاہیے

بھول جاؤ کیا کہا، کس نے کہا اور کیوں کہا
بات نفرت کی نہ اب ہرگز اچھلنی چاہیے

کچھ نہیں یہ بھید بھاؤ، ذات پات اور اونچ نیچ
اب دلوں سے ایسی ہر لعنت نکلنی چاہیے

اہلِ دانش ہو اگر اس بات پر سوچو ذرا
دشمنی انسان کے سینے میں پلنی چاہیے؟

شوکت علی روڈ، ڈھولی کمال، سہارنپور

یوجنا نمائندہ دہلی

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

خاندانی بہبود سے متعلق حکمت عملیاں

۱۹۵۱ء میں ہندوستان نے خاندانی منصوبہ بندی کا اپنا پہلا پروگرام شروع کیا تھا۔ بعد میں اس پروگرام کا نام خاندانی بہبود کا پروگرام رکھ دیا گیا تھا۔ مذکورہ پروگرام کا مقصد شرح پیدائش میں اس حد تک کمی لانا ہے، جو قومی معیشت کی ضرورت کے مطابق ایک سطح پر آبادی میں استحکام لانے کے لیے ضروری ہو۔ چنانچہ آبادی اور ترقی کے درمیان جو تعلق ہے اسے ۱۹۵۱ء میں ہی بخوبی سمجھ لیا گیا تھا۔

گزشتہ چار دہوں میں، خاندانی بہبود کا پروگرام خاندانی بہبود سے متعلق خدمات، ماں اور بچے کی صحتی دیکھ بھال سے متعلق خدمات، خاندانی بہبود دنیز ماں اور بچے کی صحتی دیکھ بھال سے متعلق سرگرمیوں کے لیے درکار سپلائز، ایسی معلومات اور تعلیم کی تشہیر کا ایک مربوط پروگرام بن گیا ہے، جس سے میاں بیوی رضاکارانہ طور سے یہ بات خود طے کر سکیں کہ ان کا کنبہ کتنا بڑا ہونا چاہیے اور دو بچوں کی پیدائش کی درمیانی مدت میں کتنا فرق ہونا چاہیے۔ تعلیم، غذائیت، غریبی کے خاتمے، کم سے کم ضروریات کے اہتمام کے شعبوں میں ترقیاتی پروگراموں کے ساتھ رابطے قائم کیے گئے ہیں۔

اہم کامیابیاں

آبادی کی شرح اضافہ میں کمی لانے کے معاملے کو ملک کے آٹھویں پنج سالہ منصوبے (۱۹۹۲-۱۹۹۷ء) کے چھ ترجیحی مقاصد میں سے ایک مقصد کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ مقررہ نشانے ہیں: شرح پیدائش (فی ۱۰۰۰ آبادی) ۲۶ء۰، شیر خوار بچوں کی شرح اموات (فی ۱۰۰۰ زندہ بچے) ۷۰۔ اور کپل پروٹیکشن شرح ۵۶ فی صد۔

ٹیکوں کے ذریعے قابل روک تمام بیماریوں سے تمام بچوں کو محفوظ رکھا جانا اور اس کے نتیجے میں شیر خوار بچوں کی شرح اموات ۱۹۸۵ء میں (جب سبھی کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کا پروگرام شروع کیا گیا تھا) ۹۷ فی ہزار زندہ بچوں سے گھٹ کر ۱۹۹۴ء میں ۷۳ رہ جانا ایک اہم کامیابی ہے۔ ۱۹۹۲-۹۳ء سے سبھی کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے پروگرام کی توسیع کی گئی ہے اور اس پروگرام کو بچوں کی بقا اور محفوظ مادریت کے پروگرام کے ساتھ مربوط کر دیا گیا ہے تاکہ ۱۹۹۷ء تک ملک بھر میں لازمی خدمات فراہم کی جا سکیں۔

موجودہ سال سے "ری پروڈکٹیو اور بچوں کی صحت" کے معاملے کی مناسبت سے ری پروڈکٹیو صحت کے اضافی عناصر کو خاندانی بہبود کے پروگرام میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں تجرباتی پروجیکٹ تیار کیے جا رہے ہیں۔ ایک اور اہم اضافہ دائیوں کی تربیت ہے تاکہ ان کی خدمات ہر ایک گاؤں میں دستیاب ہو سکیں اور اس طرح ماؤں کی شرح اموات میں کمی آ سکے۔

پلس پولیو مہم

تین سال تک کی عمر کے تمام بچوں کے لیے بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے حسب معمول پروگرام کے علاوہ پلس پولیو کی خوراک پلانے کا پروگرام ۱۹۹۵ء سے شروع کیا گیا ہے تاکہ ۲۰۰۰ء تک ملک سے پولیو کا خاتمہ کیا جا سکے۔ ۹ دسمبر ۱۹۹۵ء کو ۸۷ لاکھ سے زیادہ بچوں کو پولیو کے ٹیکے کی خوراک پلائی گئی تھی۔ یہ خوراک پلائے جانے کا ایک اور دور ۲۰ جنوری ۱۹۹۶ء کو چلا۔

پلس پولیو کی خوراک پلائے جانے کے اس پروگرام میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی تھی۔ بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے حسب معمول پروگرام کے نتیجے میں پولیو، پرٹسز، کھسرا، ڈپتھیریا اور پیدائشی ٹیٹنس کے واقعات میں کافی کمی واقع ہوئی ہے۔ مستفید کیے جانے کی سطح ۸۰ فی صد سے لے کر ۹۰ فی صد تک ہے۔

خاندانی بہبود کے پروگرام کی اہمیت کے پیش نظر اس سلسلے میں مخصوص کی جانے والی رقم میں وقتاً فوقتاً اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۹۱ء میں یہ رقم ۴۸۴ء۶۸ کروڑ روپے تھی، جو بڑھ کر ۱۹۹۵-۹۶ء میں ۱۵۸۱ کروڑ روپے ہو گئی ہے۔

خاندانی بہبود کے پروگرام کے لیے مرکزی حکومت سو فی صد رقم فراہم کرتی ہے اور اس پروگرام پر ریاستی حکومتیں اور مرکزی انتظام کے علاقے عمل درآمد کرتے ہیں۔ علاقے کے لیے مخصوص حکمت عملیوں اور پروگراموں کے لیے زیادہ تر بیرونی امداد سے رقم فراہم کی جاتی ہے۔ یہ حکمت عملیاں اور پروگرام ان مخصوص علاقوں میں چلائے جا رہے ہیں، جہاں پیدائش اور اموات کے اعداد و شمار کے ناموافق اشاریے پائے جاتے ہیں، پروگرام پر عمل درآمد کی پیش رفت کم ہے، بنیادی ڈھانچے کی سطح مقابلتاً کم ہے اور چھوٹے کنبے کا اصول کم اپنایا گیا ہے۔

صحتی خدمات کی فراہمی کا بنیادی ڈھانچہ

صحت اور خاندانی بہبود سے متعلق خدمات، سپلائز اور معلومات کی فراہمی کے لیے دیہی علاقوں میں صحتی خدمات کی فراہمی کا ایک وسیع بنیادی ڈھانچہ

قائم کیا گیا ہے۔ اس میں ۱۳۱۹۰۰ طبی مراکز، جن میں ایک خاتون اور ایک مرد پر مشتمل نیم طبی عملہ ہے، ۲۱۶۹۳۔ ابتدائی صحتی مراکز، جن کا سربراہ ایک کوالیفائڈ میڈیکل پریکٹیشنر ہے اور ۲۳۸۵ کمیونٹی صحتی مراکز شامل ہیں، جن میں ۳۰ بستر اور چار طبی ماہرین ہیں۔ ملک میں شہرکاری کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیش نظر شہری علاقوں میں اور خاص طور سے شہری گندی بستیوں میں قابل بھروسہ ابتدائی صحتی ڈھانچہ فراہم کرنے کے معاملے پر حکومت توجہ دے رہی ہے۔

بیداری میں اضافہ کرنا

خاندانی بہبود کے پروگرام کے دیگر فوائد آبادی سے متعلق امور کے بارے میں بڑے پیمانے پر بیداری، آبادی سے متعلق امور کے بارے میں وسیع پیمانے پر قومی اتفاق رائے پیدا کرنا اور اس شعبے میں غیر سرکاری ایجنسیوں کی شمولیت رہے ہیں۔ آبادی سے متعلق امور کے بارے میں بیداری کا اظہار کنبے کی صحت کے بارے میں قومی سروے ۹۳-۱۹۹۲ء میں کیا گیا ہے، جو ۸۸۵۰۰ سے زیادہ کنبوں پر مشتمل ہے۔ مذکورہ سروے میں کہا گیا ہے کہ ان خدمات تک رسائی کی ضرورت ہے، جنھیں خاندانی بہبود کے پروگرام کے تحت فراہم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ذرائع ابلاغ، روایتی ذرائع ابلاغ اور بین شخصی مواصلات کا استعمال کرتے ہوئے، اطلاعات، تعلیم اور مواصلات سے متعلق خدمات خاندانی بہبود کے پروگرام کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اطلاعات، تعلیم اور مواصلات سے متعلق خدمات کا مقصد پروگرام کے لیے قومی حمایت حاصل کرتے ہوئے نیز خواتین اور لڑکیوں کی امیج کو بہتر بناتے ہوئے، بیداری میں اور خاندانی منصوبہ بندی کی قبولیت میں اضافہ کرنا ہے۔

ہندوستان کے آئین میں ۷۳ ویں اور ۷۴ ویں ترامیم سے ابتدائی صحتی دیکھ بھال اور خاندانی بہبود کے کام میں خواتین بلدیاتی اداروں اور پنچایتوں کی شمولیت کے لیے بے مثل موقع فراہم ہوا ہے۔ پنچایتوں کی شمولیت کے لیے اور کمیونٹی کی شرکت کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے نمونہ جاتی اسکیمیں وضع کی گئی ہیں اور ان پر تجرباتی بنیاد پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ صحتی میلوں کا اہتمام کرکے، طبی اور نیم طبی عملے کی سرگرمی میں اضافہ کرکے نیز جزوقتی خاتون ڈاکٹروں اور ماہرین امراض نسواں کی خدمات حاصل کرکے خاندانی بہبود سے متعلق خدمات تک رسائی میں اضافہ کرنے کے لیے بھی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

نشانے سے مستثنیٰ علاقے

مخصوص نشانوں اور ترغیباتی نظاموں کے موجودہ طریقے میں تبدیلیاں کرنے کے سلسلے میں حکومت تجربہ کر رہی ہے۔ ایک اہم اقدام میں حکومت نے ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران ہر ایک بڑی ریاست میں ایک ضلع کو نیز پوری ریاست تامل ناڈو اور مرکزی انتظام کے علاقے پورے چنڈی گڑھ کو مانع حمل کے نشانے سے مستثنیٰ بنایا ہے۔ نشانے سے مستثنیٰ اضلاع کا تجربہ حوصلہ افزا ہے۔

خاندانی بہبود کا قومی پروگرام نہ صرف کنبوں کے لیے بلکہ ہندوستان کے مستقبل کے شہریوں کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے کاز کے لیے بھی اہم جذبات فراہم کر رہا ہے۔ توقع ہے کہ حکومت کی زبردست کوششوں کے بہتر نتائج حاصل ہوں گے۔ ●

پرتھوی دوئم کی کامیاب پرواز

طویل رینج کی صلاحیت کا حامل پرتھوی دوئم نے ۲۷ جنوری ۱۹۹۶ء کو ۲ بج کر ۲۵ منٹ پر عبوری تجربہ رینج چاندی پور، اڑیسہ سے کامیابی کے ساتھ پرواز کی۔ اس کے تمام مشن مقاصد بھی مکمل ہو گئے ہیں۔ اس کامیاب پرواز کے ساتھ ہی ملک کے انٹیگریٹیڈ گائیڈڈ میزائل پروگرام کے پرتھوی پروجیکٹ کی سمت کامیابی کا ایک نیا سنگ میل حاصل ہوا ہے اس کی رینج ڈھائی سو کلو میٹر کی ہے۔ توسیعی رینج والے پرتھوی کو فضائیہ کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ پرتھوی ایک جس کا رینج ڈیڑھ سو کلو میٹر ہے پہلے ہی کامیاب تجربہ سے ہمکنار ہو چکا ہے اور اسے بری فوج کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ ●

سائنس و تکنالوجی کی اسٹیرنگ کمیٹی کا قیام

منصوبہ بندی کمیشن نے نویں پنج سالہ منصوبہ ۲۰۰۲-۱۹۹۷ء تشکیل دیے جانے کے پس منظر میں سائنس اور تکنالوجی کمیٹی قائم کی ہے۔ اس ۲۸ رکنی کمیٹی کی صدارت ڈاکٹر ایس زیڈ قاسم رکن (سائنس) منصوبہ بندی کمیشن کے تحت ہے۔ اس کمیٹی میں متعدد ممتاز سائنس داں، ماہرین تعلیم اور سائنس کے محکمے کے سکریٹری حضرات شریک ہیں۔ ●

قلم کار حضرات سے

گزارش ہے کہ

(۱) مضامین / دیگر تصانیف جو یوجنا کو ارسال کریں انھیں کہیں اور چھپنے کے لئے قطعاً نہ بھیجیں۔

(۲) ہر مضمون کے آخر میں طبع زاد / غیر مطبوعہ لکھ کر اپنا دستخط، نام اور پتا ضرور درج کریں۔

(۳) مضمون کی اصل ہی ارسال کریں فوٹو اسٹیٹ کاپی اپنے پاس محفوظ رکھیں۔ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں قبول نہیں کی جائیں گی۔

(۴) مضمون کے شروع یا آخر میں اپنا نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کریں۔

(۵) مضامین میں جو اقوال .... (QUOTATIONS) استعمال کیے گئے ہیں، ان کے سورس کا حوالہ دینا لازمی ہے۔

(۶) مضامین میں انگریزی الفاظ کا استعمال بدرجۂ مجبوری ہی کریں۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں

(ادارہ)

نئی دہلی

یوجنا

چیف ایڈیٹر : ڈی۔کے۔بھاردواج

اسسٹنٹ ایڈیٹر : عابد کرہانی

سب ایڈیٹر : ڈاکٹر توحید خان

فون : 677591

تزئین وکتابت : افتخار احمد خاں

سرورق : جیتندر سنگھ

جلد: ۱۵ شمارہ : ۱۳

مارچ ۱۹۹۶ء (۱۱ پھالگن تا ۱۱ چیتر شک ۱۹۱۷-۱۸)

قیمت فی شمارہ : ۵ روپے

زرِ سالانہ : ۵۰ روپے

(طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فی صد رعایت)

زرِ سالانہ بینک ڈرافٹ/منی آرڈر/پوسٹل آرڈر کے ذریعے درج ذیل پتے پر بھیجیں:

بزنس منیجر پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

پروڈکشن انچارج : کے۔آر۔کرشنن

مضامین سے متعلق

خط وکتابت کا پتا :

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن ایسٹ بلاک ۴ لیول ۷، آر۔کے۔پورم (ساؤتھ) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

"یوجنا"

منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں۔

ترتیب

ڈاکٹر اقبال محی الدین

ہندوستان میں جنگلات کا تحفظ اور ماحولیاتی کثافت کی پاکیزگی

کسی ملک کی قدرتی نباتات وہاں کی آب و ہوا اور مٹی پر منحصر ہوتی ہے۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں بھی آب و ہوا اور مٹی کی تبدیلی سے قدرتی نباتات بھی الگ الگ طرح کی پائی جاتی ہیں۔ یہاں تقریباً ۴۵۰۰۰ طرح کے پیڑ پودے ملتے ہیں۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں اتنی زیادہ قسمیں نباتات کی نہیں ملتیں۔ یہاں کے پیڑ پودے پھل دار اور پھول دار بھی ہوتے ہیں اور غیر پھولدار بھی۔ اتنی زیادہ قدرتی نباتات کی قسمیں یہاں اس لیے پائی جاتی ہیں کہ ملک کے مختلف حصوں کی آب و ہوا، طبعی حالات اور مٹی کی قسمیں الگ الگ ہیں۔ اسی لیے یہاں منطقہ حارہ خطوں کے نباتات سے لے کر آرکٹک خطوں کی نباتات تک ملتی ہیں۔

ہندوستان کے جنگلاتی خطے

ہندوستان کی قدرتی نباتات کے ۵ اہم خطے ہیں۔ (۱) منطقہ حارہ کی بارش والے جنگلات (۲) منطقہ حارہ کے پت جھڑ جنگلات (۳) کانٹے دار درخت اور جھاڑیوں والے خطے (۴) سمندری کنارے کے مدوجزری جنگلات اور (۵) شمالی کوہستانی خطے والے جنگلات۔

۱۔ منطقہ حارہ کی بارش والے جنگلات

منطقہ حارہ کی بارش والے جنگلات میں پتوں کے گرنے کا کوئی وقت متعین نہیں ہے کیوں کہ یہ علاقے سال بھر گرم اور نم رہتے ہیں۔ یہ جنگلات ہمیشہ ہرے بھرے رہتے ہیں۔ جن علاقوں میں ۲۰۰ سینٹی میٹر سے زیادہ بارش ہوتی ہے وہیں یہ جنگلات پائے جاتے ہیں۔ ایسے علاقے، مغربی گھاٹ، مغربی بنگال کے میدانی حصے، اڑیسہ اور شمال مشرقی ہندوستان کے ہیں۔ ان خطوں کے جنگلات بہت تیزی سے بڑھتے ہیں اور درخت عموماً ۶۰ میٹر تک کی اونچائی تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان جنگلات میں بہت طرح کی قسموں کے درخت ملتے ہیں جن کی تجارتی نقطہ نظر سے بہت اہمیت ہے۔ مہاگونی، ایبونی اور روز ووڈ کے درخت ان جنگلوں میں عام طور سے پائے جاتے ہیں۔

۲۔ منطقہ حارہ کے پت جھڑ جنگلات

منطقہ حارہ کے پتی گرانے والے جنگلات "مانسون جنگلات" بھی کہلاتے ہیں جو بہت عمدہ ہوتے ہیں کیوں کہ یہ سارے ہندوستان کو قدرتی سایہ بخشتے ہیں۔ یہ جنگلات ۷۵ سے ۲۰۰ سینٹی میٹر بارش والے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ معاشی اعتبار سے یہ جنگلات بہت اہم ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کی بہت ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ ان میں آگ بہت جلدی لگ جاتی ہے۔

ان جنگلات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) نم پت جھڑ جنگلات اور (۲) خشک پت جھڑ جنگلات۔ نم پت جھڑ جنگلات مغربی گھاٹ کی مشرقی ڈھال پر پائے جاتے ہیں۔ ٹیک کے جنگلات اس علاقے کی خاص قدرتی نباتات ہے۔ نم پت جھڑ جنگلات عموماً شمال مشرقی ہندوستان اور سطح مرتفع دکن کے کچھ حصوں میں بھی ملتے ہیں جیسے چھوٹا ناگپور پلیٹو جس میں مشرقی مدھیہ پردیش، جنوبی بہار اور مغربی اڑیسہ کے علاقے شامل ہیں۔ شمال میں کوہ شوالک میں بھی یہ جنگلات بہت عام ہیں۔

خشک پت جھڑ جنگلات میں "سال" کا پیڑ بہت اہم ہوتا ہے۔ یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ نم پت جھڑ جنگلات کی جگہ دھیرے دھیرے خشک پت جھڑ جنگلات لیتے جا رہے ہیں۔ جن کو صرف "پت جھڑ جنگلات" کہا جاتا ہے (نم اور خشک الفاظ کا وہاں استعمال نہیں ہوتا)۔ یہ گرمیوں میں ۶ سے ۸ ہفتہ تک اپنی پتیوں کو گرا دیتے ہیں۔ جنگلوں کے ہر قسم کے درختوں کے پتی گرانے کا الگ الگ وقت ہوتا ہے۔ اسی لیے سارے جنگلات ایک دم سے ننگے نہیں ہو جاتے بلکہ کچھ پتوں سے ڈھکے بھی رہتے ہیں۔ نیم کے پیڑ مانسونی جنگلات کے اہم درخت ہیں۔

۳۔ کانٹے دار درخت اور جھاڑیوں والے خطے

کانٹے دار جنگلات ان علاقوں میں ملتے ہیں جہاں بارش ۷۵ سینٹی میٹر سے کم ہوتی ہے۔ یہ ہندوستان کے شمال مغرب کا علاقہ ہے جو جنوب میں سوراشٹر سے لے کر شمال میں پنجاب کے میدانی حصے تک پھیلا ہوا ہے۔ مشرق میں یہ خطہ شمالی مدھیہ پردیش (خاص طور سے مالوہ پلیٹو)

۵۴۔ بی۔ ڈی۔ ڈی۔ اے۔ فلیٹ، قطب انکلیو نزد قطب ہوٹل، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۶

اور جنوب مغربی اتر پردیش جس میں بُندیل کھنڈ پلیٹو شامل ہے، تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کانٹے دار جنگلات میں کیکر، ببول، کھیر، کھجور اور کچھ دوسرے اہم درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ ان درختوں کی جڑیں زمین کے اندر دور تک چلی جاتی ہیں تاکہ وہاں کی نمی کو حاصل کر سکیں۔ دھیرے دھیرے کانٹے دار جنگلات جو عام طور سے پیڑوں کی شکل میں ہیں، ختم ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ کانٹے دار جھاڑیاں لیتی جا رہی ہیں جو ریگستانی نباتات کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ ریگستانوں میں کھجور کے پیڑوں کے لیے کہا جاتا ہے کہ "ان کے پیر پانی میں اور سر آگ میں ہوتا ہے" یعنی ان کی جڑیں زمین کی گہرائی میں ہوتی ہیں جہاں سے انھیں نمی ملتی ہے اور اوپری حصہ تیز دھوپ میں رہتا ہے۔

۴۔ سمندری کنارے کے مدّوجزری جنگلات

دریائی اور سمندری کناروں کے مدّوجزری جنگلات میں عام طور سے "مین گروو" کے درخت پائے جاتے ہیں جو میٹھے اور کھارے دونوں پانی میں اُگ سکتے ہیں۔ ان درختوں کو سندری درخت بھی کہا جاتا ہے۔ مدّوجزری علاقوں میں عام طور پر کھارا پانی پایا جاتا ہے لیکن اس درخت پر اس کھارے پن کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی درخت کے نام پر سُندر بن کے جنگلات کا نام پڑا جو گنگا۔ برہم پُتر ڈیلٹا میں ہے۔

۵۔ شمالی کوہستانی خطّے والے جنگلات

پہاڑوں پر سطح سمندر سے بلندی کے بڑھنے سے قدرتی نباتات میں بھی فرق آجاتا ہے کیوں کہ بلندی کے ساتھ ساتھ وہاں کا درجہ حرارت کم ہوتا جاتا ہے اور سردی بڑھتی جاتی ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ کوہستانی علاقوں میں منطقہ حارّہ کے جنگلات سے لے کر ٹنڈرا تک کی نباتات ملتی ہیں۔ ان ہی پہاڑی علاقوں میں جو حصے سورج کی روشنی کے سامنے ہوتے ہیں ان کی نباتات میں اور جو سورج کی روشنی میں نہیں ہوتے، ان کی نباتات میں بہت فرق ہوتا ہے خواہ دونوں حصے ایک ہی بلندی پر کیوں نہ ہوں۔

کوہ ہمالیہ کی فُٹ ہل میں شوالک پہاڑ ہیں جو منطقہ حارّہ کے نم پت جھڑ نباتات سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ "سال" یہاں کا بہت قیمتی درخت ہے۔ بانس کے پیڑوں کے جنگلات اس خطے میں عام طور پر ملتے ہیں۔

سطح سمندر سے ۱۰۰۰۔ اور ۲۰۰۰ میٹر تک نم پہاڑی جنگلات ملتے ہیں جن میں ہمیشہ ہرے بھرے چوڑی پتی والے "اوک" "چیسٹ نٹ" اور سیب کے درخت ہیں۔ ان کے علاوہ "ایش" اور "بیچ" کے درخت بھی ان پہاڑی جنگلات میں ملتے ہیں۔ اس اونچائی پر شمال مشرقی ہندوستان میں "پائن" اور "چیڑ" کے درخت بہت پائے جاتے ہیں کیوں کہ یہاں بے حد بارش ہوتی ہے اور یہ درخت زیادہ بارش اور ٹھنڈی آب و ہوا چاہتے ہیں۔

پہاڑوں کی مزید اونچائی پر یعنی ۱۶۰۰۔ اور ۳۳۰۰ میٹر کی سطح سمندر سے بلندی پر "پائن" "سیدار"، "سلور فر"، اور "اسپروس" وغیرہ کے جنگلات ملتے ہیں۔ یہ بہت مشہور "کونی فیرس جنگلات" ہیں جو منطقہ سرد میں واقع ہیں۔ اندرونی ہمالیہ کے سلسلے میں کچھ خشک آب و ہوا ہونے کی وجہ سے وہاں "دیودار" کے جنگلات پائے جاتے ہیں۔

منطقہ سرد کے کونی فیرس جنگلات جو ۳۶۰۰ میٹر کی بلندی پر پائے جاتے ہیں ان میں سلور فر، پائن، برچیز اور جونیپرس کے جنگلات ہیں۔ ان کے علاوہ الپائن گھاس کے میدان اور جھاڑیاں بھی اس خطے میں پائی جاتی ہیں۔

ہندوستان کے جنگلات اور ان کے فوائد

ہندوستان میں تقریباً ۴۵۰۰۰ طرح کے پیڑ پودے ہیں جو یہاں کے جنگلات میں ملتے ہیں۔ "ساگوان" مغربی گھاٹ، آسام اور میگھالیہ میں ملتے ہیں۔ "سال" کوہ وندھیاچل اور ست پڑا پر، بانس، پچھمی بنگال میں اور کوہ ہمالیہ کے ساتھ ساتھ اور مدھیہ پردیش میں ملتے ہیں۔ "ناریل" مغربی بنگال میں اور مشرقی ساحلی میدانوں میں خصوصاً کیرالا میں ملتے ہیں۔ شہتوت کے پیڑ مغربی بنگال، آسام، میگھالیہ، کشمیر، پنجاب اور اتر پردیش میں بہت ہوتے ہیں۔ ان پیڑوں پر ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں۔

شیشم، کیکر، جنید کے پیڑ پنجاب، ہریانہ، راجستھان، مدھیہ پردیش، گجرات اور آندھرا پردیش میں بہت ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ چیڑ، شمشاد، سفیدہ وغیرہ کوہ ہمالیہ کے خطے میں ملتے ہیں۔ چندن اور آبنوس کے جنگلات مغربی گھاٹ پر اور کرناٹک میں ملتے ہیں۔ ببول اور کھجور کے درخت راجستھان میں بہت پائے جاتے ہیں۔ ربڑ اور سنکونا، آسام میں اور نیل گری کی پہاڑیوں پر ملتے ہیں۔ دیودار کے درخت ہمالیہ کے علاقوں میں ملتے ہیں۔ اس کی لکڑی بڑی کارآمد ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ نیم کا درخت تقریباً ہندوستان میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

جنگلات کے بہت سے فوائد ہیں۔ ان سے ہمیں عمارتی لکڑی، ایندھن کے لیے لکڑی اور چارہ حاصل ہوتا ہے۔ ان سے متعدد جڑی بوٹی اور دوائیں حاصل ہوتی ہیں۔ گوند، بہروزہ، رنگ، نارپین، لاکھ وغیرہ جیسی مفید اشیا جنگلات سے ہی میسّر ہوتی ہیں۔ جنگلات کے سہارے کئی صنعتیں چلتی ہیں مثلاً کاغذ، صاف شدہ بیروزہ، بوٹ پالش، کھیلوں کا سامان تیار کرنا، دیا سلائی بنانا اور لکڑی چیرنا۔ جنگلات ہوا میں ٹھنڈک بنائے رکھتے ہیں اور زمین کی مٹی کو نمی سے پُر اور مٹی کو لیس دار بنائے رکھتے ہیں اور بارش لانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ جنگلات طغیانی کو روکتے ہیں۔ مٹی کو پانی سے گھل کٹ کر بہہ جانے سے روکتے ہیں اور ندی نالوں و دریاؤں کو خشک موسم میں سوکھ جانے سے بچاتے ہیں۔

نباتاتی اور زراعتی زمین کا استعمال

ہندوستان میں تقریباً ۵۰ء۷ لاکھ ہیکٹیر غیر جنگلاتی بے کار زمین ہے اور ۴۰۰ لاکھ ہیکٹیر زمین زرعی حاشیے کی پیداوار میں ہے۔ جنگلات کو ختم کر دینے سے وہاں کا ماحولیاتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ جنگلات، مٹی کی زرخیزی کو اور آبی بنیادی خط کو قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ جنگلات اوپری فاصل آب کو قائم رکھنے

میں اور خشک زمین میں خاص طور پر بہت مفید ہوتے ہیں۔

ہندوستان کی کل زراعتی زمین کا ۵۰ فی صد حصہ کھیتی کے استعمال میں ہے۔ جنگلات ۲۳ فی صد کو محیط ہیں۔ غیر پیداواری زمین ۱۲ فی صد حصے میں ہے۔ غیر زراعتی زمین ۵ فی صد میں ہے اور اُوسر اور بنجر زمین ۱۰ فی صد میں ہے۔

۱۹۸۴ء سے ۱۹۹۲ء تک کی دہائی میں ۲٫۷۹ فی صد جنگلات کا نقصان ہوا ہے۔ اگر اسی طرح جنگلات کٹتے یا جلتے رہے اور ان کی جگہ نئے پیڑ نہیں لگائے گئے تو ایکولوجی کا توازن بگڑ سکتا ہے اور وہاں کے جاندار زندگی پر بہت برا اثر پڑے گا۔

مٹی کا کٹاؤ

جنگلات کو کاٹ کر ختم کر دینے سے کئی طرح کے مسائل سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے نہ رہنے سے نہ صرف SOIL EROSION ہی ہوتا ہے بلکہ زراعت کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور خاص طور سے وہ علاقے جو نشیب میں واقع ہیں۔ وہاں فصلیں بھی بے حد متاثر ہوتی ہیں۔ سیلاب سے زمین کو بہت نقصان ہوتا ہے اور کھیتی تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ صرف جنگلات ہی ہیں جو سیلاب کی تیز روانی کا رخ موڑ دیتے ہیں یا ان کا زور کم کر دیتے ہیں اور فصلوں کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ ہر سال تقریباً ۹۰ لاکھ ہیکٹیر زمین سیلاب کی زد میں آکر کٹ پھٹ جاتی ہے جس سے کھیتی کو زبردست نقصان ہوتا ہے اور فصلیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ جنگلات کے نہ رہنے سے خشک سالی کا بھی دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ پانی کی زیادتی اور روانی و تیز دھاراؤں سے مٹی کا کٹاؤ (SOIL EROSION) ہو جاتا ہے اور سیلاب کے بعد خشک سالی کا ہی دور رہ جاتا ہے۔

۴۰ کروڑ ہیکٹیر میٹر بارش جو ملک میں ہوتی ہے اس میں سے تقریباً ۹ کروڑ ہیکٹیر میٹر جنگلات کو ملتی ہے اور دس کروڑ ہیکٹیر میٹر جنگلات کی مٹی جذب کر لیتی ہے۔ تقریباً دو کروڑ ہیکٹیر میٹر بھاپ بن کر فضا میں اڑ جاتی ہے اور تقریباً ۳ کروڑ ہیکٹیر میٹر بارش سطح زمین پر بہہ جاتی ہے۔ بقیہ بارش کا پانی مٹی میں جذب ہو جاتا ہے۔ وہ چشموں اور دریاؤں کی شکل میں باہر نکل آتا ہے۔

مٹی کے کٹاؤ یا SOIL EROSION کے ذمہ دار عناصر ہیں: بارش، سیلاب اور تیز ہوائیں۔ اگر کسی علاقے میں جنگلات نصیب ہوں تو یہ کانٹ چھانٹ کم ہو جاتی ہے اور جنگلات مٹی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے سے روکتے ہیں۔ اس مٹی میں بعد میں ہرے بھرے گھاس کے میدان تیار ہو جاتے ہیں جو جانوروں کی چراگاہ کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں۔ زمین کا کٹاؤ، چراگاہ کا زیادہ استعمال اور کٹے ہوئے کناروں پر کاشت کاری کرنے سے خشک موسم میں برا اثر ہوتا ہے۔ ان جگہوں پر زیادہ سے زیادہ پیڑ لگائے جائیں اور پھر کاشت کاری کی جائے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ وہاں کی مٹی میں زرخیزی آتی ہے بلکہ وہ سارے خشک سالی والے علاقے دوبارہ ہرے بھرے گھاس کے میدان ہو جاتے ہیں۔

جنگلات کا استعمال

ہندوستان میں جنگلات کے استعمال کی مانگ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے کیوں کہ عمارتی لکڑیوں اور ایندھن کے لیے استعمال میں آنے والی لکڑیاں برابر کاٹی جا رہی ہیں جن کی وجہ سے جنگلات صاف ہوتے جا رہے ہیں جن سے معیشت کا حیوانانی توازن (ECOLOGICAL BALANCE) بھی بگڑتا جا رہا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنگلات بادلوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں جن سے بارش ہوتی ہے۔ جہاں جہاں جنگلات ختم کر دیے گئے ہیں وہ علاقے بارش سے یا تو بالکل محروم ہوتے جا رہے ہیں یا بہت کم بارش وہاں ہوتی ہے۔

دنیا کے جنگلات کے فی صد کے اعتبار سے ہندوستان کے ۲ فی صد جنگلات یہاں کی ۱۵ فی صد آبادی کے لیے مددگار ثابت ہوتے ہیں اور ۱۴ فی صد مویشیوں کو چارہ بہم پہنچاتے ہیں۔ ایک بڑا علاقہ ایک کروڑ ہیکٹیر کے متحرک زراعت (SHIFTING CULTIVATION) سے متاثر ہوتا ہے۔ ہر سال تقریباً ۳ لاکھ ہیکٹیر رقبہ جنگلات کا نذرِ آتش ہو جاتا ہے۔ بہار، مدھیہ پردیش اور اڑیسہ کے جنگلات سے ۱۰ سے ۵۵ فی صد خاندان مستفید ہوتے ہیں۔ بستر ضلع (مدھیہ پردیش) میں ہر ایک خاندان جنگلات اور اس کی پیداوار سے تقریباً ۱۵۰۰ سے ۷۰۰ روپے تک سالانہ کما لیتے ہیں۔ تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ غیر تجارتی ایندھن خاص طور سے ایندھن کی لکڑی (FUEL WOOD) اور جنگلات کی پتیاں، برادہ، چارکول وغیرہ گھریلو ایندھن کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ ۱۱٫۰ کروڑ ٹن گھریلو ایندھن کے علاوہ صنعت میں ۲٫۲۰ کروڑ ٹن ایندھن خرچ کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے کل ایندھن جو استعمال کیا جاتا ہے وہ ۱۳٫۳۰ کروڑ ٹن ہے۔ امید ہے ۲۰۰۰ء تک یہ بڑھ کر ۲۲٫۵ کروڑ ٹن ہو جائے گا۔

۱۹۷۰ء سے پیڑوں کے لگانے کا کام زور پکڑنے لگا کیوں کہ حکومت اور عوام دونوں نے یہ محسوس کیا کہ جنگلات کو ختم کرنے سے ایکولوجی کا توازن ختم ہو جائے گا۔ فورسیٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا اور جنگلات کو دوبارہ لگانے کا کام شروع کر دیا۔

ہندوستان کے جنگلات کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بانس کی پیداوار بہت ہوتی ہے جس سے لگدی بنائی جاتی ہے جو کاغذ بنانے کے کام آتی ہے۔ "منطقہ حارہ کے بارش والے جنگلات" اروناچل پردیش، کیرالا اور انڈمان و نکوبار جزائر میں بہت ہیں۔ مان گرو جنگلات بھی معاشی طور پر بہت فائدے مند ہیں۔

جنگلات کے تحفظ کے لیے قومی پالیسی

۱۹۵۲ء میں ہندوستان کی حکومت نے جنگلات کے تحفظ کے لیے ایک نئی قومی پالیسی بنائی تھی۔ یہ پالیسی جنگلات کے استعمال پر مبنی تھی۔ جنگلات کی تقسیم عملی بنیاد پر کی گئی جن میں جنگلات کے تحفظ اور دیہی جنگلات شامل تھے۔ طے یہ کیا گیا کہ جہاں تک ہو سکے نئے پیڑ پودے لگائے جائیں تاکہ ان سے سایہ، پھل، ایندھن اور چارہ تو ملے ہی اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایکولوجی کا توازن بھی قائم رکھ سکیں۔ اس

قومی پالیسی میں یہ بات صاف طور پر واضح کر دی گئی کہ جنگلات کو کاٹ کر ان کی جگہ کھیتی نہ کی جائے بلکہ کھیتی صرف ان حصوں میں کی جائے جہاں پیڑ نہ اگتے ہوں۔ قدرتی آفتوں جیسے طوفان، آندھی اور سیلاب وغیرہ سے بچنے کے لیے جنگلات کا نصب کرنا ضروری قرار دیا گیا تا کہ زمین کا کٹاؤ نہ ہو اور زراعت کی زرخیز زمین خراب نہ ہو جائے۔ جنگلوں میں جانوروں کو پالنے اور ان کی حفاظت کا ذمہ بھی نیشنل پالیسی میں شامل کیا گیا۔ "ون مہوتسو" ہر سال ۲۱ مارچ کو منایا جاتا ہے جس میں سارے ملک میں پیڑ پودے لگانے کا کام ہوتا ہے۔

ماحولیات

ہندوستان کی آزادی کے بعد سے ہی صفائی، صحت، غذائیت، جنگلات، مٹی کے کٹاؤ کی حفاظت، مکانات وغیرہ پر حکومت ہند نے بہت سارے پروگرام بنائے۔ ان سب سے بڑھ کر ماحولیات کے تحفظ کے بھی پروگرام پیش کیے گئے۔ شروع میں یہ سارے پروگرام آہستہ آہستہ چلتے رہے مگر ۱۹۷۰ء کے بعد سے جن پروگراموں پر زیادہ زور دیا گیا وہ تھے ماحولیاتی پاکیزگی (ENVIRONMENTL SANITAION)۔ مٹی کے کٹاؤ کو بچانا اور جنگلات کا نصب کرنا اور ان کا تحفظ۔

۱۹۷۰ء میں ہی ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کو THE COMMITTEE ON HUMAN ENVIRONMENT کہا جاتا ہے جس کے ذمہ یہ کام دیا گیا کہ وہ ایک رپورٹ تیار کرے جس سے یہ بات سامنے آجائے کہ ماحولیات کا تحفظ اور توازن کس طرح برقرار رہ سکتا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں دوسری کمیٹی قائم ہوئی جس کو NATIONAL COMMITTEE ON ENVIRONMENT PLANNING AND CO-ORDINATION (NCEPC) کہتے ہیں۔ اس کمیٹی کا کام حکومت ہند کو ماحولیاتی مسائل پر مشورہ دینا تھا اور ان مسائل کا حل بھی تلاش کرنا تھا۔

اب شعبہ ماحولیات (DEPARTMENT OF ENVIRONMENT) ماحولیاتی پروگرام کو تشکیل دیتا ہے اور حکومت ہند کو ان پروگراموں کے لاگو کیے جانے میں مدد کرتا ہے۔ اس محکمہ کا کام یہ ہے کہ وہ

(۱) ماحولیاتی تنزلی (ENVIRONMENTAL DEGRADATION) کے وجوہات معلوم کرے اور ان کا مداوا کرے۔

(۲) فضائی اور آبی کثافت کے مسائل کو اجاگر کرے اور اس کا مداوا کرے۔

(۳) ترقیاتی پروجیکٹس پر ماحولیاتی اثرات کا جائزہ لے۔

(۴) ماحولیاتی ترقیاتی (ECO- DEVELOPMENT) کا کام کرے۔

(۵) جنگلی زندگی کی نشوونما اور حفاظت کرے۔

(۶) ماحولیاتی اطلاعات کے لیے "ڈیٹا بینک" قائم کرے۔

(۷) ماحولیاتی تحقیقات کو بڑھاوا دے۔

(۸) اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام اور بین اقوامی یونین فار کنزرویشن آف نیچر اینڈ نیچرل ریسورسیز سے تعاون کرے۔

(۹) ڈپارٹمنٹ آف این وائرن منٹ کے دو خاص محکمے ہیں۔ بوٹینکل سروے آف انڈیا اور زولوجیکل سروے آف انڈیا۔ یہ دونوں شعبہ ماحولیات کی مدد کرتے ہیں۔

(۱۰) نیشنل میوزیم آف نیچرل ہسٹری بھی ماحولیاتی مطالعہ میں اس شعبہ کی مدد کرتا ہے۔

(۱۱) ڈپارٹمنٹ آف این وائرن منٹ کا دوسرا محکمہ سینٹرل بورڈ فار پری وینشن اینڈ کنٹرول آف واٹر پلوشن ہے۔ اس محکمہ کی مدد سے پانی کی کثافت کو دور کرنے کا کام ہوتا ہے۔

سینٹرل گنگا اتھارٹی

دریائے گنگا لاکھوں لوگوں کی زندگی کی شہ رگ ہے۔ یہ ہندوستان کی پرانی تہذیب اور روایات سے جڑی ہوئی ہے۔ لوگوں کی صحت، کھانا اور کئی پیشے اس سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس دریا کو بہت "پوتر" مانا جاتا ہے مگر اب وہ آبی کثافت و آلودگی سے بھر چکی ہے جس سے لوگوں کی صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔

حکومت ہند نے یہ دیکھتے ہوئے طے کیا کہ کثافت کو دور کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک پلان تیار کیا گیا جو گنگا کی آبی کثافت اور آلودگی کو دور کرے۔ اس کے پہلے فیز میں پہلے درجہ کے ۲۷ شہر ہیں جو گنگا کے کنارے بسے ہوئے ہیں اور وہ اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال میں واقع ہیں۔ گنگا کے کثیف پانی کی صفائی کا کام تیزی سے چل رہا ہے جو سینٹرل گنگا اتھارٹی کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔

ماحولیاتی ترقیاتی بورڈ

حکومت ہند نے ECO -DEVELOPMENT بورڈ بنایا ہے جو یہ دیکھتا ہے کہ فضائی کثافت سے ماحولیاتی آلودگی والے علاقوں کی صفائی و پاکیزگی کیسے ہو؟ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ مٹی کے کٹاؤ کو کس طرح روکا جا سکتا ہے؟ اور پیڑ پودے اور جنگلات لگانے کا کام کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس طرح یہ بورڈ مٹی کا تحفظ (SOIL CONSERVATION) اور جنگل اگانے (AFFORESTATION) کے کام کا ذمہ دار ہے۔ اس کے علاوہ ماحولیاتی مسائل پر لٹریچر و دیگر مواد تیار کرنا اور ان مسائل کا مداوا تلاش کرنا بھی ایکو ڈیولپمنٹ بورڈ کا ہی کام ہے۔ اس کے بڑے عملی علاقائی پروجیکٹس (MAJOR FIELD ACTION PROJECTS) شوالک فٹ ہلز (پنجاب)، جوشی مٹھ اور دھولی علاقے جو ضلع چمولی (اتر پردیش) میں ہیں، ہلدی گھاٹی (اودے پور) اور آوروول (AUROVILLE) جو پانڈیچری میں واقع ہے، وہاں بھی یہ پروجیکٹس بخوبی چل رہے ہیں۔

قومی ماحولیاتی تحفظ کی حکمت عملی

ماحولیاتی تحفظ حکومت ہند کے بڑے

باقی صفحہ ۳۹ پر

کلیم اللہ

خواتین۔ جرائم اور انسداد

۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی میں خواتین کا تناسب ۴۸ر۱۲ فی صد ہے اگر اس تناسب کو تعداد میں تبدیل کیا جائے تو ان کی مجموعی تعداد ۴۰۶ر۵ ملین تک پہنچتی ہے۔ تاہم ان کے خلاف جرم و جبر، ناانصافی اور بدسلوکیوں کی کہانی بہت پرانی ہے۔ ہندوستان میں ہر ایک ۵۴ منٹ پر عصمت دری، ۲۶ منٹ پر چھیڑ چھاڑ (MOLESTATION) ۴۳ منٹ پر اغوا کا معاملہ اور ۴۲ منٹ پر جہیز سے متعلق موت کی وارداتیں آئے دن کا معمول ہو گئی ہیں۔

ویدک عہد میں عورتوں کا مقام

حالاں کہ تین۔ چار ہزار برس قبل قدیم ہندوستانی سماج میں خواتین کو وہ وقار و عظمت حاصل تھی جو دوسرے ممالک کی خواتین کے لیے ایک خواب تھا۔ مرد و زن کو برابر حقوق حاصل تھے۔ زندگی کے ہر شعبے چاہے وہ مذہبی ہوں یا دنیاوی، سماجی ہوں یا ثقافتی، سیاسی ہوں یا اقتصادی وہ مساوی حیثیت کی حامل تھیں اور اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو مذہبی معاملات میں انھیں اس وقت کچھ زیادہ ہی اختیار حاصل تھے۔ روایتی طور سے ویدک سوسائٹی میں خواتین کو بالخصوص دو خانوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ نمبر ایک برہما وادنی (BRAHMAVADINI) اور نمبر دو سدیو ودھو (SADYO VADHO) پہلے زمرہ کی خواتین مجردانہ زندگی اختیار کر کے اعلا سطح کی منطقی بحث و تمحیص میں اپنی زندگی بسر کرتی تھیں۔ اس کے برعکس دوسرے زمرہ کی خواتین اپنے خاندان کی فلاح و بہبود اور گھر کے کام کاج کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتی تھیں۔ ان کا یہ طرز زندگی بغیر کسی خلل کے ایپک (EPIC) اور پران کے عہد تک چلتا رہا۔ اُپنشد میں گارگی، میتریئی اور کتیانی کا ذکر بڑے ہی تزک و احتشام کے ساتھ کیا گیا ہے، جن کی شخصیت کی تابانی قدیم زمانے کی طرح آج بھی باقی ہے۔ ایک اور پران کے عہد میں اس قسم کی خواتین کی ایک لمبی فہرست ہے جو آئندہ کی خواتین کے لیے مشل راہ تھیں۔ ان میں گاندھاری، کنتی، دروپدی، ساوتری، دمایانی، ساکنتلا اور ستیہ بھاما کے نام پیش پیش ہیں۔

اسمرت عہد میں خواتین کی سماجی حیثیت

مگر یہ سلسلہ اسمرت عہد (SMIRIT AGE) میں بتدریج جاری نہ رہا۔ یہ زمانہ منو یا سماجی قوانین کی تدوین کے عہد (MANU OR THE AGE OF CODIFICATION OF SOCIAL LAWS) کے نام سے تاریخ اور مذہب کی کتابوں میں جانا جاتا ہے۔ خواتین کا تنزل اور اس کے خلاف امتیاز کی کہانی اسی عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا یہ قطعی مطلب نہیں کہ اس سے قبل عورتوں کے خلاف جرم کا ارتکاب کیا ہی نہیں جاتا تھا۔ اس عہد میں ان کے خلاف جرائم اور امتیازات کی رفتار تیز سے تیز تر ہوئی۔ یہ کوئی فطری عمل نہیں تھا۔ بلکہ اس کے پس پردہ سماجی، مذہبی، سیاسی اور اقتصادی حالات کارفرما تھے جو پدرانہ سماج کا طرۂ امتیاز سمجھے جاتے ہیں۔ یعنی لڑکوں کو لڑکیوں پر سبقت، لڑکیوں کو خاندانی جائداد سے عاق کرنا اور انھیں پرایا دھن تسلیم کرنا وغیرہ ہیں۔ اس سے نہ صرف مرد و زن کے درمیان من و تو کا امتیاز پیدا ہوا بلکہ عورت، جو نسل افزائش کی ضامن اور مستقبل کی پاسبان ہے، کی انا کو ٹھیس پہنچی۔ اس کی شخصیت داغدار ہوئی۔ اس کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا گیا۔ معروف تاریخ داں رام چودھری کے یہ الفاظ اس کے عین شاہد ہیں۔

> "خواتین کو سودروں کی فہرست میں رکھ دیا گیا تھا۔ ان سے ویدوں کی تعلیم حاصل کرنے، ویدک منتروں کے کہنے اور ویدک کی رسومات کے ادا کرنے کے حقوق کو غصب کر لیا گیا تھا۔ اس سطح پر شادی یا خانگی زندگی کو ان کے لیے ضروری قرار دیا گیا اور شوہر کی خدمت کے لیے خود کو بے چوں و چرا وقف کر دینا ہی صرف ان کا فرض تھا۔"[1]

اس موقع پر اگر شودر کی وضاحت کر دی جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ ذات پات سے قبل قدیم ہندوستانی سماج چار طبقوں میں منقسم تھا۔ وہ ہیں۔ براہمن، چھتری، ویش اور شودر۔ اس تقسیم میں شودروں کو حقیر نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اعلا طبقے کے افراد ان کے سایہ کے پڑنے

۲۳۶۔ ستلج ہوسٹل۔ جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی ۶۷

(1) SOME REFLECTIONS ON THE IDEALS OF INDIAN WOMENHOOD VOL. II PAGE-607

سے ناپاک ہو جاتے تھے۔ ان کی واحد ایک ڈیوٹی تھی کہ وہ صلہ سے بے پروا ہو کر بقیہ تینوں طبقوں کے افراد کی خدمت کریں۔

اس عہد میں عورتوں پر بے شمار بے جا پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ زندگی تو خود ان کی اپنی تھی مگر اسے بسر کرنے کے تمام ضابطے اور قوانین پدرانہ سماج کے ان تمام ٹھیکیداروں کے وضع کردہ تھے جنھوں نے اپنے تشخص کے لیے خواتین کے حقوق کی پروا نہ کی۔ منو کے لفظوں میں:

"ایک خاتون کی حفاظت بچپن میں اپنے والد، عالم شباب میں اپنے شوہر اور ضعیفی میں اخلاف کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ وہ آزادی کے لائق کبھی بھی نہیں ہیں۔" (1)

خواتین کی بابت منو کے یہ خیالات تھے جو اسمرتی کی کتابوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔

عہد جدید میں خواتین

ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت سے قبل یہاں کا تعلیمی نظام مشرقی پیرایہ پر تھا۔ لیکن ان کے زیر اثر یہاں کے تعلیمی نظام میں کافی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ حکومت کی شہ پر کرسچین مشنریوں نے تعلیم اور صحت کے میدان میں کار ہائے نمایاں انجام دیے جس کے باعث خواتین کی خواندگی میں اضافہ ہوا اور انھیں سرکاری اور غیر سرکاری محکموں میں نوکریاں بھی ملیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں وہ خود کفیل ہوں گی۔ خود کفالت انسانی زندگی کے مجموعی نشو و نما کا ضامن ہوتی ہے کیوں کہ اپنے تحفظ کے لیے دوسروں پر انحصار کرنا خود کو کمزور کرنے کے مترادف ہے۔ اس سے منحصر کی آزادی سلب ہوتی ہے جیسا کہ اس عہد سے قبل خواتین کا معاملہ تھا۔

علاوہ ازیں ہندوستانیوں کے ذریعہ عصری سماج کی تشکیل نو کے لیے متنوع قسم کی سماجی و اصلاحی تحریکات کو شروع کیا گیا۔ ان تحریکات میں برہمو سماج، آریہ سماج، رام کرشن، پرم ہنس مشن، ستیہ بودھک سماج اور تھیوسوفیکل سوسائٹی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ راجا رام موہن رائے نے، جو جدید ہندوستان کی تشکیل نو کے پیش رو تسلیم کیے جاتے ہیں، ستی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ بنیاد پرستوں کے خیموں میں اس سے ایک کہرام برپا ہو گیا۔ مگر راجا رام موہن رائے اپنے موقف پر کوہ ہمالیہ کی مانند اٹل رہے۔ اور قدیم مذہبی کتابوں سے اپنے موقف کی تائید میں مثالیں پیش کیں۔ جن کی بے کاٹ دلائل کے سامنے بنیاد پرستوں کو سر خم کرنے پڑے اور انگریزی حکومت نے اسے ایک انسانیت نواز قدم قرار دے کر ستی امتناع قانون وضع کیا۔ جس سے اس انسانیت سوز رسم میں کمی تو آئی مگر بیسویں صدی کی آخری دہائی کے زمانے میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ روپ کنور اس کی زندہ و جاوید نظیر ہے۔ تاہم اس زمانے میں مجموعی طور سے خواتین کی سماجی، سیاسی، مذہبی اور اقتصادی حیثیت میں خاطر خواہ اصلاح ہوئی۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں۔ اول تو سماجی و اصلاحی تحریکات ہیں جس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ دوم تمام قسم کی وہ سیاسی تحریکات ہیں جس کے ذریعہ ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ قومی کانگریس کے پرچم تلے خواتین کو مردوں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی۔ انھیں کوششوں کا یہ نتیجہ تھا کہ اینی بیسنٹ، بھیکا جی کاما، سروجنی نائیڈو، سچیتا کرپلانی، امرت کور، بیگم اعجاز حسین، متنگنی ہزارا، وجے لکشمی پنڈت، کستوربا بائی، پریتی لتا بادھیدار اور اندرا گاندھی جیسی بہت سی خواتین نے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لے کر اپنے حق کو ادا کیا۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس نے جب آزاد ہند فوج کی تشکیل کی تو عورتوں کے لیے ایک نئی یونٹ کی بھی تشکیل کی تھی جس کا کمانڈر ہونے کا شرف لکشمی سوامی کو حاصل تھا جو ایک خاتون تھی۔

آزاد ہندوستان کے لیے بابا بھیم راؤ امبیڈکر کی سربراہی میں ایک ایسا دستور مرتب کیا گیا جو صحیح جمہوری خطوط کے ساتھ ساتھ اس ملک کے حالات کے عین مطابق تھا۔ یہ دستور ۲۶ جنوری ۱۹۴۹ء کو مکمل ہوا اور ایک سال بعد یعنی ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ کیا گیا۔ اس آئین نے ہندوستان میں رائج اونچ نیچ، ذات، پات، نسل و مذہب کے امتیاز کو ختم کر دیا۔ اس دستور میں ایسی بہت سی دفعات شامل کی گئیں جن کا براہ راست یا بالواسطہ اثر سماج کے کمزور طبقوں پر پڑتا ہے۔

آئین ہند کی دفعہ چودہ کے تحت مرد و زن کو سیاسی، سماجی اور اقتصادی طور سے مساوی مواقع دیے گئے ہیں۔ دفعات پندرہ اور سولہ کے تحت اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ مذہب، نسل ذات اور جنس کی بنا پر کسی بھی شہری کے خلاف کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جائے گا اور سرکاری نوکری میں تمام شہریوں کو یکساں مواقع دیے جائیں گے۔ مزید یہ کہ دفعہ ۳۹ اس بات پر زور دیتی ہے کہ حکومت پالیسی وضع کرتے وقت تمام شہریوں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت، یکساں ذرائع مہیا کروائے گی اور یکساں کام کے لیے یکساں اجرت دی جائے گی۔ ان سب کے باوجود دفعہ پندرہ (۸) تمام شہریوں پر یہ بنیادی ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ خواتین کے وقار و عظمت کی بقا اور ان کے تقدس کی خاطر اہانت آمیز رسومات سے گریز کیا جائے۔

اقوام متحدہ اور دوسری عالمی تنظیموں نے بھی خواتین کو یکساں حقوق دینے کی خاطر متعدد قرارداد پاس کیں اور ان قراردادوں کو عملی جامہ پہنانے کا بھی عہد کیا۔ ۱۹۴۵ء میں اقوام متحدہ کے چارٹر کے انسانی حقوق کے عالمی بل میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ

"خواتین تمام معاملات میں مردوں کے ساتھ مکمل اور یکساں حقوق کی حامل ہیں۔"

۱۹۷۹ء میں نیروبی اعلان میں اس کا اعادہ کیا گیا تھا کہ خواتین کے خلاف امتیاز کو ختم کیا جائے گا۔ اقوام متحدہ کی دہ سالہ مدت ۸۵-۱۹۷۶ء عہد خواتین تھا۔ اسی عرصے کے درمیان ۱۹۸۰ء میں کوپن ہیگن میں ایک کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا جس کے پہلے کے تین مقاصد یعنی مساوات، ترقی اور امن میں تین اور ذیلی مقاصد کا اضافہ

(1) SOME REFLECTIONS ON THE IDEALS OF INDIAN WOMENHOOD VOL. II PAGE-607

کردیا گیا تھا۔ (۱) تعلیم، (۲) روزگار اور (۳) صحت۔ ستمبر ۱۹۹۵ء میں بیجنگ میں منعقدہ خواتین کی چوتھی عالمی کانفرنس میں عملی پلیٹ فارم (A PLAT FORM FOR ACTION) تیار کیا گیا ہے جو خواتین کی ترقی کے لائحہ عمل کا جائزہ لے گا۔

ان تمام طرح کے قومی اور عالمی تحفظات کے باوجود بھی خواتین کے خلاف مظالم کا سلسلہ آج بھی بدستور جاری ہے۔ ان میں جنسی امتیاز، ستی، کم سنی میں شادی، عصمت دری، عصمت فروشی، خواتین سے چھیڑ چھاڑ، اغوا اور جہیز کی کمی کے نتائج میں ان کی اموات وغیرہ شامل ہیں، جن میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ثبوت کے لیے مندرجہ ذیل گوشوارے پیش ہیں۔

نمبر شمار	سنہ	آئی پی سی میں مندرج مجموعی جرائم کی تعداد	خواتین کے خلاف جرائم کی تعداد	فی صد میں اضافہ	کل آئی پی سی جرائم کا فی صد
۱	۲	۳	۴	۵	۶
۱۔	۱۹۹۰	۱۶۰۴۴۴۹	۶۸۳۱۷	---	۴٫۳
۲۔	۱۹۹۱	۱۶۷۸۳۷۵	۷۴۰۹۳	۸٫۵	۴٫۴
۳۔	۱۹۹۲	۱۶۸۹۳۴۱	۷۹۰۳۷	۶٫۷	۴٫۷

نمبر شمار	جرائم	واردات			فی صد میں تغیر	
		۱۹۹۰ء	۱۹۹۱ء	۱۹۹۲ء	۱۹۹۰ء کے مقابلے ۱۹۹۱ء میں	۱۹۹۱ء کے مقابلے ۱۹۹۲ء
۱۔	عصمت دری	۹۵۱۸	۹۷۹۳	۱۱۱۱۲	۲٫۹	۱۳٫۵
۲۔	اغوا	۱۱۶۹۹	۱۲۳۰۰	۱۲۰۷۷	۵٫۱	۱٫۸
۳۔	جہیز سے متعلق اموات	۴۸۳۶	۵۱۵۷	۴۹۶۲	۶٫۶	۳٫۸
۴۔	جسمانی اذیت	۱۳۴۵۰	۱۵۹۴۹	۱۹۷۵۰	۱۸٫۶	۲۳٫۸
۵۔	ٹوئیشن	۲۰۱۹۴	۲۰۶۱۱	۲۰۳۸۵	۲٫۱	۱٫۱
۶۔	خواتین سے چھیڑ چھاڑ	۸۴۲۰	۱۰۲۸۳	۱۰۷۵۱	۱۹٫۳	۴٫۶

کرائم ان انڈیا ۱۹۹۲ء

جنسی امتیاز

ہندوستانی سماجی ڈھانچے کا انحصار پدرانہ نظام پر ہے۔ جہاں نر بچے کی پیدائش ایک مذہبی فریضہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ ہندو مذہب کی کچھ رسومات کی ادائیگی صرف انھیں کے ہاتھوں ہو سکتی ہے۔ ویسے ہر مذہب کے افراد کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ نر بچے کو جنم دے کر اپنے نام و نسب کو برقرار رکھیں۔ یہ امتیازی سلوک صرف گھر کی چہار دیواری کے اندر تک ہی محدود نہیں رہتا ہے بلکہ تعلیم، شادی کے انتخاب اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نظر آتا ہے، جس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچپن سے ہی لڑکیوں کے اندر احساس کمتری، غیر اعتمادی، خود انحصاری اور غیر محفوظ ہونے کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا احساس انھیں رہتا ہے۔

عہد جدید سائنس کا عہد ہے۔ سائنس نے زندگی کے ہر شعبہ میں خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ طب کے میدان میں جہاں سائنس نے انسانوں کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کیں وہیں اس کے برعکس بہت سے سماجی مسائل کو بھی جنم دیا۔ بالخصوص ایمینو سنٹیسس (AMNIO CENTESIS) کی تکنیک۔ سماج میں مرد و زن کے تناسب کو غیر متوازن کرنے میں ایک خطرناک رول ادا کر رہی ہے۔ اس تکنیک کے ذریعہ رحم میں پلنے والے بچے کے جنس کی شناخت کر لی جاتی ہے اور اگر یہ جنس مادہ ہوتی ہے تو اسقاط کے ذریعہ عالم وجود میں آنے سے قبل ہی اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔ گزشتہ دہائیوں میں تقریباً ۰۰۰۸۷ اسقاط حمل کیے گئے ہیں۔ ۱۹۷۱ء تک تعزیرات ہند کے تحت اسقاط کے عمل کو ایک جرم قرار دیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۷۱ء کے حمل کے طبی اسقاط قانون کے تحت (MEDICAL TERMINATION OF PREGNANCY ACT) خواتین کو یہ آزادی دی گئی کہ وہ اسے محفوظ رکھ سکتی ہیں یا سائنسی اور اور قانونی طور سے اسقاط حمل کر سکتی ہے۔ لیکن ایم ٹی پی کے تحت یہ واضح نہیں کیا گیا ہے کہ غیر تولد شدہ بچے کی جنس کی شناخت خواتین کے دائرۂ انتخاب میں نہیں آتی ہے۔ نسوانی حمل کے اسقاط کے خلاف مسلسل احتجاج اور جدوجہد نے مہاراشٹر حکومت کو اس بات کے لیے مجبور کیا کہ وہ ایسے غیر اخلاقی اور غیر قانونی عمل کے خلاف قانون وضع کرے۔ مہاراشٹر وہ پہلی ریاست ہے جس نے ۱۹۸۸ء میں تولد سے قبل شناخت کے تکنیک (PRENATAL DIAGNOSTIC TECHNIQUES) کے استعمال کے لیے قوانین مرتب کیے جس کے تحت جنس کی شناخت کرنے والے اداروں پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ اس بابت حکومت ہند نے بھی ۱۹۸۷ء میں ایک بل کا مسودہ تیار کیا تھا لیکن وہ طاق نسیاں کی زینت بن گیا۔

ستی

ستی، جس کے لغوی معنی ہیں شوہر کی چتا پر بیوہ کی خود سوزی، ہندوستانی سماج کی ایک ایسی برائی ہے جس کو مذہب کی منظوری حاصل رہی ہے۔ مذہبی امور میں خواہ ہندو ہوں یا مسلم، سکھ ہوں یا عیسائی عقل کے مقابلے جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں جس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے اسی قسم کی دوسری سماجی برائیوں کی پاسبانی ہوتی ہے۔ بیوہ جیسے ہمدردی، حوصلہ اور پیار محبت چاہیے۔ یہ پدرانہ سماج اس کا علم غلط

کرنے کی بجائے اس کے مذہبی جنون کو ابھار کر نذر آتش کر دیتا ہے۔ ایسی سماجی برائیاں صرف سماج پر ہی نہیں بلکہ انسانیت پر ایک بدنما داغ ہیں۔ اس مہلک سماجی برائی کی بیخ کنی میں راجا رام موہن رائے نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی مگر مذہبی بنیاد پرستوں نے آج تک اس رسم کو قائم رکھا۔ ۴ ستمبر ۱۹۸۷ء کو راجستھان کے سکار ضلع کے دیورالہ گاؤں میں ۱۸ سالہ روپ کنور جو ایک راجپوتنی تھی نے ایک بے حس بھیڑ کی موجودگی میں اپنی جان عزیز کو نذر آتش کر دیا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس وقت پورے ملک میں ۱۴۰ ستی مندر ہیں، جن میں ۳۰ راجستھان کی ریاست میں واقع ہیں۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ حکومت ہند نے اس کے خلاف ضابطے وضع نہیں کیے یقیناً حکومت نے اس کے امتناع کے لیے سخت قانون وضع کیے، جس کے تحت ایسے واقعات کو شہ دینے والے حضرات تعزیرات ہند کے سیکشن ۳۰۸ کی رو سے مجرم قرار دیے جاتے ہیں۔ لیکن ایسی انسانیت سوز رسم کے لیے یہ قانون ناکافی ثابت ہوا۔ اس لیے حکومت ہند نے ۱۹۸۸ء میں ستی کمیشن ایکٹ کو آئینی شکل دے کر ایسے جرم کو شہ دینے والوں کو سزائے موت کی سزا تجویز کی ہے، جو ان کے کالعدم کی جانب ایک ٹھوس قدم ہے۔

کم سنی میں شادی

زمانۂ قدیم سے عصر جدید تک لڑکیوں کی شادی سن بلوغ سے قبل ہی کر دی جاتی ہے۔ اس کے پس پردہ ہندوستانی سماج کا وہ دیہی نظام ہے جہاں لڑکیاں پرایا دھن خیال کی جاتی ہیں اور والدین اس بوجھ سے جلد از جلد نجات پانا چاہتے ہیں، اسی لیے ان کی شادیاں کچی عمر میں کر دی جاتی ہے۔ ان کے اندر شادی جیسی پاک و صاف رسم کی افادیت و معنویت اجاگر ہی نہیں کی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک شادی صرف جائز مباشرت کا ایک طریقہ ہے جس کے تحت انھیں اپنے شوہر سے جسمانی تعلقات قائم کرنے کی مذہبی، سماجی اور قانونی اجازت مل جاتی ہے جب کہ شادی صرف دو جسموں کا ملن ہی نہیں بلکہ خاندان کا منبع ہے جہاں انسانوں کی تخلیق ہوتی ہے اور سماج کی تشکیل بھی۔

لالہ ہر بلاس سارڈا نے اس رسم کے خلاف آواز بلند کی تھی اور انھیں کی احتجاجی تحریک کے زیر اثر ۱۹۲۹ء میں سارڈا ایکٹ منظور کیا گیا تھا جس کے تحت لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کے لیے ایک عمر مقرر کی گئی تھی۔ مگر تقاضائے وقت کے پیش نظر اس میں تبدیلی کی گئی اور ۱۹۷۸ء میں امتناع کم سنی شادی ایکٹ پاس کیا گیا، جس کی رو سے شادی کے وقت لڑکوں کی عمر ۲۱ برس اور لڑکیوں کی ۱۸ برس ہونی چاہیے۔ اس عمر سے قبل شادی کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔ مگر یہ رسم دیہی علاقوں میں آج بھی جاری ہے جسے صرف سماجی بیداری کے ذریعہ ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔

عصمت فروشی

ہندوستانی سماج کے قدیم پیشوں میں عصمت فروشی ایک معتبر پیشہ رہا ہے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کی نوعیت میں تبدیلی آئی۔ آج کے جدید سماج میں جسم کی تجارت کرنے والوں کو اس پیشے سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔ خواتین کے جنسی استحصال کی اس سے بدترین مثال شاذ و نادر ہی تاریخ کے اوراق میں کہیں ملے گی۔ شہر کے ہر گلی کوچے میں ان کی بستیاں آباد کر دی گئیں ہیں۔ جہاں دلال (PIMP) حضرات کے ذریعہ اس پیشے کی دن دونی رات چوگنی ترقی کی جا رہی ہے۔

حکومت ہند نے اس جانب ۱۹۵۶ء میں سلیتا (SUPPRESSION OF IMMORAL TRAFFIC ACT) وضع کیا تھا لیکن وہ نفع بخش ثابت نہ ہوا اس لیے ۱۹۸۶ء میں اس میں ترمیم کر کے اس قانون کے دائرے کو وسیع کر دیا گیا۔ مگر اس شجر کی آبیاری آج بھی جاری ہے اور شاید سماج سے اس کی جڑ کبھی بھی ختم نہیں ہوگی۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ اس کی نوعیت مختلف ہو جیسا کہ آج کچھ ممالک میں نظر آتا ہے۔

خواتین سے چھیڑ چھاڑ اور زنا بالجبر

خواتین سے چھیڑ چھاڑ اور ان کی عصمت دری آج آئے دن کا معمول بن گیا ہے۔ اخبارات و رسائل کے صفحات پر ایسے واقعات کو نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ کیا خواتین کے مقدر میں بے بسی، لاچاری، مایوسی اور استحصال کے کالم ہی تحریر کیے ہوئے ہیں! یا یہ ہمارے پدرانہ سماج کی ان کے خلاف زیادتیوں کے نتائج ہیں؟ اس سوال کا جواب ہاں یا نہ میں دینا بہت ہی مشکل ہے لیکن خواتین کا جنسی استحصال کسی مخصوص تقاضائے وقت کے تحت نہیں کیا جاتا ہے بلکہ انسان اپنی فطری خواہشوں کی تکمیل کے لیے خواتین کی پاکیزگی کو سلب کرتا ہے اس عمل میں مردوں کو ذہنی اور جسمانی تلذذ حاصل ہوتا ہے جب کہ عصمت دری کا شکار خواتین جسمانی، روحانی اور اخلاقی تکالیف سے دوچار ہوتی ہیں۔ اس کا اندازہ مرد حضرات نہیں کر سکتے۔ عصمت دری سے خواتین کا تقدس ختم ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کے سر چھپانے کے لیے آسمان کا سایہ کم پڑ جاتا ہے اور پیر رکھنے کے لیے زمین تنگ۔ وہ بذات خود نفسیاتی طور سے اپنے آپ کو مجرم قرار پاتی ہیں۔ اس سے نجات پانے کے لیے وہ ہر طریقے استعمال کرتی ہیں مگر مایوسی اور ناامیدی ہی ان کے ہاتھ آتی ہے۔

عصمت دری کا دائرہ آج اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ لڑکیاں اپنے خاندان میں خود کو محفوظ نہیں پاتی ہیں۔ جب باپ ہی اپنی بچی کی عصمت دری کرے تو غیروں سے کیا گلہ! ایسے واقعات اخبار کی سرخیوں میں عام طور سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ عام ہو گیا تو قانون کیا دنیا کا کوئی بھی نظام خواتین کی پاکبازی کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ جب قانون کے محافظ ہی قانون اور اخلاق شکن ہو جائیں تو ایسے معاشرے اور ماحول کا خدا ہی حافظ! دنیاوی قوانین میں اس کا کوئی حل نہیں۔ ۳۰ جنوری ۱۹۹۶ء کی ٹائمز آف انڈیا کی ایک سہ کالمی رپورٹ میں سری لیکھا مترا چودھری نے اس کا انکشاف کیا ہے کہ ۴۲ سالہ ہری رام نے اپنی سات سالہ معصوم بچی ارونا کے ساتھ زنا کیا۔ ارونا تو درد کی تاب نہ لاکر اللہ کو پیاری ہو گئی مگر ایسے قہر برپا واقعات کو بیان کرنے کے لیے بہت سی معصوم بچیاں آج بھی زندہ ہیں۔ اس طرح کے واقعات بڑے بڑے شہروں اور جھگیوں میں عام ہوتے جا رہے

ہیں۔ دہلی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ شماریات کے رپورٹیں دلدوز ہیں۔ ۱۹۹۴ء میں اس سے متعلق درج واقعات کی شرح ۱۹۹۲ء کے مقابلے ۱۱ فی صد سے تجاوز کر کے ۷۶٫۸۳ فی صد تک پہنچ گئی۔ ۱۹۹۵ء میں ایسے ۳۰۳ واقعات درج کیے گئے تھے۔

تعزیرات ہند کی دفعات ۳۷۵، ۳۷۶ اور ۳۷۶ A، B، C اور D کے تحت اس کے انسداد کے لیے قوانین درج ہیں۔ تاہم ایسے واقعات کی اعداد و شمار میں دن بدن اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں۔ اول تو زانی کو سزا مل ہی نہیں پاتی ہے کیوں کہ ہند کا قانون بغیر ثبوت کے مجرم کو سزا دینے سے قاصر ہے۔ ایسے واقعات سے متعلق ثبوت فراہم کرنا بھی ایک دشوار گزار مرحلہ ہے کیوں کہ زانی پردے کے پیچھے زنا کرتا ہے۔ اور ایسے واقعات میں کبھی کبھی عصمت دری کا شکار خواتین کو ہلاک بھی کر دیا جاتا ہے۔ دوم خواتین بذات خود شرم و حیا کے باعث انصاف کے لیے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتی ہیں کیوں کہ سماج ایسے معاملات میں انھیں ہی رسوائی اور ذلت کے اہل قرار دیتا ہے۔ سوم جب خاندان کے افراد ہی اپنی دختروں، بہنوں اور دوسری خواتین سے زنا کرنا شروع کر دیں تو اس کا کیا علاج ہے؟ ایسے سماج میں مذہبی تعلیم پر زور اور سخت سے سخت قوانین ہی اس میں معاون ہو سکتے ہیں۔ عدالت عالیہ کے فاضل ججوں اے۔ ایس آنند اور صغیر احمد پر مشتمل بنچ نے اپنے ایک حالیہ فیصلے میں اس پر زور دیا ہے کہ عصمت دری کا شکار خواتین بذات خود اپنی عصمت دری کی چشم دید گواہ ہیں۔ مگر اس جملے میں قیل و قال کے بہت سے گوشے پوشیدہ ہیں۔ اول جسم فروشی کی تجارت کرنے والی خواتین اس کا ناجائز فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ دوم ایسے غیر اخلاقی سماج میں جہاں جرم ہی جرم کی گونج ہو وہاں معصوم عورتوں کو بآسانی مرد اپنے جال میں پھانس کر دوسرے مردوں سے اپنا الو سیدھا کر سکتے ہیں۔ اس لیے ایسے جملوں پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ماہرین طب نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عصمت دری کا شکار خواتین کو اپنے اس کپڑے کو محفوظ رکھنا چاہیے جس سے وہ زانی کے منی کو اپنے اندام نہانی سے صاف کرتی ہیں۔ ایسے کپڑے کا طبی معائنہ کر کے صحیح زانی کی سراغ رسانی کی جا سکتی ہے۔

جہیز

اوپر ذکر تمام برائیوں کی مانند جہیز بھی ایک سماجی برائی ہے۔ جس کے سبب یکسانیت و مساوات پر مبنی ازدواجی زندگی کے سماجی رشتوں میں دراڑیں پڑتی ہیں۔ قدیم زمانے میں شادی کے شگون پر لڑکی والوں کی جانب سے دولہا کے خاندان والوں کو تحفہ و تحائف کے طور پر کچھ رقوم و اشیاء بھینٹ کی جاتی تھی مگر تاریخی و سماجی عوامل کے تحت عصری زمانے میں اس کی خطرناک شکل ابھر کر سامنے آتی ہے۔ جہاں لڑکی کے والدین سے شادی کے عین وقت یا اس سے قبل یا بعد شادی کے عوض میں زبردستی رقمیں وصول کی جا رہی ہیں۔ جو اس اٹوٹ سماجی رشتے کی ناپائیداری کا سبب بنتی ہیں۔

حکومت ہند نے اس رسم کو ختم کرنے کے لیے ۱۹۶۱ء میں جہیز امتناع قانون وضع کیا لیکن جب اس قانون کے ذریعہ اس مہلک سماجی برائی میں کوئی کمی نہیں آئی تو حکومت نے اس جانب اور سخت اقدام اٹھائے اور ۱۹۸۶ء میں اس سے متعلق ایک ترمیمی قانون کو آئینی شکل دی، جس کے تحت جہیز کے لینے اور دینے والے ملزمان پر کم سے کم ۵ برس کی قید اور ۱۵ ہزار روپیہ کا جرمانہ یا جہیز کی کل رقم ادا کرنے کی دفعات عائد ہوتی ہیں۔ اس قانون کے نفاذ سے جہیز کی شدت میں کمی آئی مگر اس کی شاخیں آج بھی ہری ہیں اور سماج کے ہر کس و ناکس اس کی آبیاری کر رہا ہے۔

ان تمام طرح کی سماجی اور مذہبی برائیوں کو ختم کرنے کی جانب حکومت ہند نے اپنے طور سے ہر ممکن کوشش کی مگر وہ اپنے مقاصد میں ناکام رہی۔ اس کے پس پردہ بہت سے تاریخی، سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی عوامل کارفرما ہیں جو اس قسم کی سماجی برائیوں کو جنم دیتے ہیں اور اس کی پرورش کرتے ہیں۔ پھر بھی حکومت اور عوام اس سے غافل نہیں ہیں۔ بلکہ ایسی برائیوں کو ختم کرنے کی جد و جہد میں مصروف ہیں۔ حکومت نے قوانین کے علاوہ ان برائیوں کے انسداد کے لیے دوسرے اور بہت سے طریقے اختیار کیے ہیں۔ ان میں خواتین پولیس کی تقرری خواتین کونسل کا قیام اور قومی کمیشن برائے خواتین کی تشکیل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

خواتین پولیس

خواتین اور لڑکیوں سے متعلق غیر اخلاقی تجارت عصمت دری اور ان سے منسلک جرائم کے انسداد کی ۴۶ویں (مارچ ۱۹۷۵ء) اور ۴۸ویں (اپریل ۱۹۸۰ء) کی رپورٹوں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ایسے معاملات کو حل کرنے کے لیے خواتین پولیس عملہ کی بے حد ضرورت ہے۔ ہند کے قانونی کمیشن نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اپنے دلائل میں قوت لانے کی غرض سے قومی پولیس کمیشن اور قانونی کمیشن نے دوسرے ممالک کی پولیس فورس میں خواتین کے تناسب کو پیش کیا۔ ان تمام دلائل کے زیر اثر حکومت ہند نے ۱۹۷۳ء میں کیرالہ کے کالی کٹ علاقے میں پہلا خواتین پولیس اسٹیشن قائم کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان پولیس اسٹیشنوں کی کارکردگی پر اب بھی بحث و مباحثہ جاری ہے۔ تاہم اس کے نتائج تشفی بخش ہیں۔ کیرالہ ریاست کے نقش قدم پر مدھیہ پردیش، راجستھان اور جموں و کشمیر کی حکومتوں نے اپنے یہاں خواتین پولیس اسٹیشن قائم کیے۔ اس وقت مدھیہ پردیش میں خواتین پولیس اسٹیشنوں کی تعداد چھ ہے۔

قومی سطح پر بھی خواتین پولیس افسروں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں صرف ایک خاتون آئی۔ پی۔ ایس افسر تھی لیکن ۱۹۹۰ء تک ان کی تعداد ایک سے بڑھ کر ۴۹ تک پہنچ گئی۔ ہندوستانی پولیس فورس میں بھی خواتین کے تناسب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں کل پولیس فورس میں ان کا تناسب ۰٫۴۰ فی صد تھا جو ۱۹۹۰ء میں ۱٫۰۵ فی صد تک پہنچ گیا۔

مزید معلومات کے لیے اگلے صفحہ کے گوشوارے پر نظر ڈالیں۔

سنہ	کل پولیس فورس میں خواتین کا تناسب فی صد میں
۱۹۷۹	۰٫۴۰
۱۹۸۵	۰٫۶۱
۱۹۸۶	۰٫۸۶
۱۹۸۷	۰٫۷۸
۱۹۸۸	۰٫۷۱
۱۹۹۰	۱٫۰۵
کرائم اگینسٹ ویمن، صفحہ نمبر ۲۱۴	

قومی کمیشن برائے خواتین

مرکزی حکومت نے قومی کمیشن برائے خواتین کی تشکیل جنوری ۱۹۹۲ء میں کی تھی۔ اس جانب متعدد ریاستوں یعنی بنگال، کیرالہ اور کرناٹک نے ریاستی سطح پر ایسے کمیشنوں کی تشکیل کی۔ اس وقت قومی کمیشن برائے خواتین کی چیرمین مسز موہنی گری ہیں۔ یہ قومی اور صوبائی کمیشن خواتین کے سماجی وسیاسی حالات کو بہتر بنانے کی جانب مثبت قدم ہیں جو اپنے کردار میں فعال ہیں۔ یہ کمیشن خواتین کے خلاف کیے جا رہے جرم وزیادتی کا گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے۔ اس کی تحقیق کرکے مجرم کو سزا دلواتا ہے۔ عورتوں کے حقوق کو تحفظ فراہم کرتا ہے اور ان سے متعلق قوانین کے نفاذ میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ کمیشن کے فوائد کے پیش نظر اس طرح کے کمیشنوں کی تشکیل ہر ریاست اور یونین ٹیری، ٹریز میں کرنی چاہیے تاکہ خواتین کے حقوق کے پاسبانی اوران کے خلاف جرائم کا انسداد عملی طور سے کیا جاسکے۔

غیر سرکاری تنظیمیں

مظلوم خواتین کو سماجی انصاف دلانے اور سماج کی تعمیری اور اصلاحی سرگرمیوں میں یکساں شمولیت کی خاطر غیر سرکاری تنظیمیں ایک فعال کردار ادا کرسکتی ہیں کیوں کہ صرف خواتین کے ذریعہ کسی بھی سماجی، اخلاقی، مذہبی اور سیاسی برائی کو ختم نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے حکومت اور عوام دونوں کو یکساں طور سے مستعد ہونا ہوگا۔ حکومت قانون تو وضع کرسکتی ہے مگر اس کا نفاذ حکمراں عملے اور عوام کی ذمہ داری ہے۔ اگر عوام کسی قانون سے بدظن ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے قوانین کو عوام کے ذریعہ نظر انداز کیا جائے گا۔ اس کے لیے اشد ضروری ہے کہ ذرائع ابلاغ اور دوسرے طریقوں سے ان کے اندر ایسی بیداری پیدا کی جائے کہ وہ ایسی ضرر رساں رسومات کو خود بخود ترک کردیں۔ یہ احساس حکومت سے زیادہ غیر سرکاری تنظیمیں ہی پیدا کرسکتی ہیں۔ ایسے معاملات میں نسائی تنظیموں کو پیش پیش ہونا چاہیے۔ ایسی تنظیمیں ایک حد تک اپنا کام بخوبی انجام دے رہی ہیں۔ تاہم ایسی تنظیموں کو اور زیادہ متحرک و فعال بنانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ بقول ویویکانند

"جس طریقے سے ایک طیر صرف ایک پر سے پرواز نہیں کرسکتا اسی طریقے سے خواتین کو پس پشت ڈال کر قوم ترقی کی منزلیں طے نہیں کرسکتی۔"

اس لیے ضروری ہے کہ ملک کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ذاتی اور مجموعی طور سے ایسے غیر اخلاقی اور غیر قانونی رسومات کو ختم کرنے کے لیے جد و جہد کرنی ہوگی۔ تب شاید یہ ممکن ہوسکے کہ خواتین کے جو حقوق، ان کی عظمت اور وقار، قانون، اخلاقیات اور مذاہب کی کتابوں میں محفوظ ہیں انھیں صحیح معنوں میں نصیب ہوں! ●

بقیہ: گاندھی جی کا تعمیری پروگرام۔ کھادی اور دیہی صنعتیں

ساتھ ساتھ یہ اعتراف بھی بہر حال کیا جانا چاہیے کہ اس پروگرام کو سرکار کی نیم دلانہ تائید و حمایت حاصل رہی ہے اس کا اظہار پالیسی کی سطح پر معقول و مناسب تائید و حمایت، مالی تائید و حمایت (آٹھویں پنچ سالہ منصوبے میں اس کے لیے ۰٫۳۴ فی صد رقم مختص ہوتی ہے جب کہ دوسرے پنچ سالہ منصوبے میں یہ رقم ۸٫۱ فی صد تھی اور اس کے بعد اس میں برابر کمی آتی گئی) اور ایسے قوانین کے اطلاق جیسی رکاوٹوں کو دور کرنے میں مثبت عزم و ارادہ کا فقدان ہوتا ہے۔ یہ قوانین منافع کمانے والے منظم سیکٹر کے لیے بنائے گئے ہیں تاکہ اس سیکٹر کے لیے جو کہ خود روزگار کے دائرے میں کام کرنے والے دست کاروں پر مشتمل ہوتا ہے اور نہ نفع اور نہ نقصان کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔ اس ضمن میں یہ تذکرہ یقیناً بے محل نہ ہوگا کہ اگر اعلا اختیاراتی کمیٹی کی سفارشات پر اسی جذبہ کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے جس جذبہ کے ساتھ یہ مرتب کی گئی ہے تو آٹھویں پنچ سالہ منصوبے کے اواخر میں کھادی کی پیداوار اور فروخت دوگنی ہوسکتی ہے۔ اس سے دیہی صنعتوں کے ذریعہ ہمارے گاؤں کے ۲۰ لاکھ لوگوں کو اضافی روزگار ملے گا جنھیں بے کاری کے دنوں میں کمائی کرنے پر کوئی اور بہتر موقع حاصل نہیں ہے۔ اس طرح اگر پالیسی کی سطح پر اور مالی تائید و حمایت ملے تو کھادی اور دیہی صنعتوں کا سیکٹر ۵۷ لاکھ نئے لوگوں کو روزگار فراہم کرسکتا ہے جنھیں اپنی موجودہ آمدنی میں مزید اضافہ کی ضرورت ہے۔

محسوس یہ ہوتا ہے کہ موجودہ حکومت اس پروگرام کو فروغ دینے میں حقیقی دلچسپی رکھتی ہے۔ وزیر اعظم اعلا اختیاراتی کمیٹی کے سربراہ ہیں اور کابینی سطح کے اپنے کئی وزیروں اور منصوبہ بند کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین کو ان پروگراموں کا پابند بنایا ہے۔ اگر حکومت کی مشنری اور اس کی بنیادی ایجنسی یعنی کھادی اور دیہی صنعتی کمیشن کو حالات کے مناسبت سے جوش و جذبہ سے معمور کردیا جائے تو اس پروگرام کے تحت ۲ لاکھ گاؤں میں سرگرم کار ۵۰ ہزار گاندھیائی رضاکار معجزہ دکھا سکتے ہیں جو حکومت کی پالیسی تائید و حمایت نیز جس جذبۂ ایثار و خدمت اور عزت نفس کے ساتھ اس کے بانی اور اس کے پیرووں نے شروع کیا تھا اور چلایا تھا اور موجودہ کھادی کارکن چلا رہے ہیں۔ اس کے اختیار کرنے کی صورت میں یہ پروگرام نہ صرف یہ کہ آنے والی کئی دہائیوں کے حالات کے مطابق ہوگا بلکہ یہ ایک اہم رول بھی ادا کرے گا۔ ●

بقیہ: دیہی روزگار: موجودہ حالات اور مستقبل کے لیے لائحہ عمل

جو سلسلہ وار چلائے جائیں تاکہ مزدوروں کی ہجرت کو روکا جاسکے اور بے حد غریب بے روزگاروں کو زندگی گزارنے کے بہتر مواقع فراہم کرائے جاسکیں اور ساتھ ہی اندرونی علاقوں میں بنیادی سہولتوں کی فراہمی میں تعاون مل سکے۔ ●

کے۔ کے کھلر

گاندھی جی۔ نیتاجی اور آزاد ہند فوج

ایک غلط فہمی جو عام لوگوں کے ذہن میں کبھی کبھی ابھرتی ہے وہ یہ کہ مہاتما گاندھی آزاد ہند فوج کے قدردان نہ تھے۔ تاریخی اعتبار سے یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ہے۔ آزاد ہند فوج کی خوبیوں کے گاندھی جی معترف اور اس کی ان گنت قربانیوں کے قائل تھے۔ بقول ان کے "نیتا جی نے آزاد ہند فوج کو ایک نئی تربیت دی ہے، جس پر سارے ملک کو ناز ہے۔" یہ گاندھی جی کے کردار کی خوبی ہے کہ عدم تشدد کے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے انھوں نے ہر ایک نقطہ نظر کو ہمدردی سے دیکھا اور جس واقعہ کو انھوں نے قابلِ تعریف سمجھا اس کی تعریف کی۔

گاندھی جی کے ہندوستانیت کے نظریے پر آزاد ہند فوج پوری اترتی ہے۔ کیوں کہ اس فوج کے سپاہی مختلف مذاہب اور مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک رشتہ اتحاد میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ سچے ہندوستانی تھے۔ مادر وطن کی سچی محبت اس کو غلامی کی زنجیروں سے نجات دلانے کا شدید جذبہ ان کے وجود میں سرایت کر گیا تھا۔ اس عظیم مقصد نے انھیں آپس میں پوری طرح متحد کر دیا تھا۔ ایک ایسی لڑی میں پرو دیا تھا جو ان کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گئی۔

ان کا ترانہ "جن گن من" تھا۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے وقت اور جدا ہوتے وقت "جے ہند" کہتے تھے۔ ان کا لباس، طرزِ گفتگو، انداز زندگی خالص ہندوستانی تھا۔ ہندوستان ان کی روح تھی۔ ہندوستان سے باہر رہ کر وہ ہندوستانی رسم و رواج مناتے تھے۔ ہندوستان کی باتیں کرتے تھے۔ ہندوستان کی تہذیب ان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہندوستان کے صدیوں پرانے مشترکہ کلچر کے نمائندے تھے۔ بالکل ویسے ہی جیسے گاندھی جی تمام ہندوستانیوں سے توقع رکھتے تھے۔

ان تمام چیزوں نے گاندھی جی کا دل جیت لیا تھا۔ آزاد ہند فوج گاندھی جی کی ہندوستانیت کے خواب کی تعبیر تھی۔ وہ اس فوج کی کھلم کھلا تعریف کیا کرتے تھے۔ وہ فوج کے سپاہیوں کے طرز زندگی کے نہ صرف حامی تھے بلکہ جذبۂ ہندوستانیت کو بیدار کرنے کے عمل میں اس فوج کے دلدادہ تھے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں وہ اسے ایک معتبر اور امتیازی مقام دیتے تھے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ یہ جنگ اصولوں کی جنگ ہے اور اس میں جیت ہندوستانیوں کی ہوگی۔ وہ ایسے سربراہ تھے جنھوں نے سچائی کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔

آزاد ہند فوج کے کارناموں اور قربانیوں پر جب نگاہ جاتی ہے تو سر اپنے آپ فخر سے اونچا ہو جاتا ہے۔ آزادی کی اس عظیم جنگ میں آزاد ہند فوج کے تقریباً ۱۶ ہزار بہادر سپاہی شہید ہو گئے۔ ان کا نصب العین دہلی کا لال قلعہ تھا۔ وہی لال قلعہ جہاں سے پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے دن لاہور کانگریس (۱۹۲۹ء) کے عزم کو پورا کرتے ہوئے ترنگا جھنڈا لہرایا تھا۔ وہی ترنگا جھنڈا جو آزاد ہند فوج نے ۱۹ مارچ ۱۹۴۴ء کے روز اپنے وطن کی دھرتی پر لہرایا تھا۔ چشم دید سپاہیوں کے بیان کے مطابق جب آزاد ہند فوج اپنے وطن کی سرزمین پر پہنچی تو اس خوشی کے عالم میں انھوں نے اپنے وطن کی مٹی کو بار بار چوما۔ فضا "جے ہند" کے نعروں سے گونج اٹھی۔

۱۲ مئی ۱۹۴۴ء کے دن آزاد ہند فوج امپھال شہر میں داخل ہوئی۔ وکٹری مارچ کی سربراہی نیتا جی سبھاش بوس نے کی۔ وہ ناقابل فراموش منظر ہندوستان کی تاریخ کا اہم باب بن چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب بھی آزاد ہند فوج کا ذکر آیا ہے مہاتما گاندھی نے اس کی شجاعت کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ ایک بہادر فوج نے حکومت برطانیہ کو للکارا اور اسے شکست فاش دی۔ جس طرح گاندھی جی کی "ہندوستان چھوڑو" تحریک نے جنگ آزادی کو ایک نئی سمت دی آزاد ہند فوج نے اسی جنگ آزادی کو ایک نیا موڑ دیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انگریز اور خاص کر انگریزی سپاہی آزاد ہند فوج کے نام سے خوف کھاتا تھا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی اپنی نوعیت کی ایک ایسی جدوجہد تھی جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آزادی ہمیں کسی نے طشتری میں رکھ کر نہیں دی تھی اور نہ ہی یہ کسی مہربان یا خیر خواہ حاکم کا دیا ہوا عطیہ تھی۔ نوے سال کی اس تحریک آزادی میں انگریزی جبر و استبداد کے کچھ واقعات ایسے [illegible] جنھوں نے آزادی کے شعلوں کو ہوا دی اور اسے جلد حاصل کرنے میں بے حد مددگار ثابت ہوئے۔ ان واقعات میں جلیان والا باغ میں قتل عام (۱۹۱۹ء)۔ بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی (۱۹۳۱ء)۔ ہندوستان چھوڑو تحریک (۱۹۴۲ء)

باقی صفحہ ۳۱ پر

سی۔ 8/8438 / وسنت کنج۔ نئی دہلی، 110070

محمد قمرالہدیٰ

مرارجی بھائی رن چھوڑجی دیسائی: ایک ہمہ گیر شخصیت

بھارت کی ریاست گجرات کی گود میں ۲۹ فروری ۱۸۹۶ء کو ایک سپوت پیدا ہوا جس کو دنیا "مرارجی بھائی رن چھوڑجی دیسائی" کے نام سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی عظمت کے سامنے عقیدت کی گردن جھک جاتی ہے۔ ایسی ہی ایک شخصیت مرارجی دیسائی کی تھی جو اپنی بے لوث و بے نظیر خدمات کی وجہ سے ہماری موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے اچھے اور بڑے مقاصد کے حصول میں امید اور امنگ کی علامت بن گئے۔ مرارجی دیسائی گزشتہ ۱۰ اپریل ۱۹۹۵ء کو ۲۱ روز کی شدید علالت کے بعد اپنی عمر کا سوواں برس مکمل کرنے سے ۳۲۴ روز قبل اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

مرارجی دیسائی ایک ہمہ گیر اور تہہ دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بے جلد ذہین طالب علم، بہترین منتظم، قابل وزیر، صائب الرائے دانشور، سچے انسان، بے باک سیاست داں اور ممتاز مجاہد آزادی تھے۔ یہ ایک اسکول ٹیچر کے چشم و چراغ تھے جو ۲۹ فروری ۱۸۹۶ء کو بلسار کے موضع بھدیلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اصول اور نظم و ضبط کے کٹر حامی تھے، جس کا اثر مرارجی دیسائی کی ذات پر بھی پڑا۔ انھوں نے اپنے والد سے سخت جفاکشی، محنت و مشقت اور ہر حال میں سچ بولنے کا سبق پڑھا اور سیکھا تھا اس کو اپنی زندگی کا بنیادی لائحہ عمل بنایا اور آخری وقت تک اس پر عمل پیرا رہے۔

سادگی، نظم و ضبط، ڈسپلن، صبر، سچائی اور اصول کی بنیادوں پر زندگی گزارنے والے بزرگ، گاندھی نواز، محب وطن اور رہنما مرارجی دیسائی نے اپنی ۹۹ سالہ زندگی میں ملک و قوم کی جو خدمت کی ہے وہ یقیناً ہندوستان کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھی جائے گی۔

مرارجی دیسائی کی ابتدائی تعلیم عام رواج کے مطابق بلسار ہی کے ایک اسکول میں ہوئی تھی جہاں سے انھوں نے میٹرک پاس کیا۔ وہ اپنے دور کے ایک غیر معمولی ذہین طالب علم تھے۔ ان کی غیر معمولی صلاحیت ہی کا ثمرہ ہے کہ انھیں میٹرک میں ہی بھاونگر اسٹیٹ سے دس روپے ماہوار کا وظیفہ ملا تھا جس کی بدولت انھوں نے اعلا تعلیم کے لیے ولسن کالج بمبئی میں داخلہ لیا اور ۱۹۱۷ء میں فزکس میں گریجولیشن درجہ اول سے کیا۔ اس مرتبہ بھی وہ وظیفہ کے حق دار قرار پائے۔

مرارجی دیسائی نے ابھی بلوغت کی منزل میں قدم رکھا ہی تھا کہ انھیں والد کے سایہ سے محروم ہو جانا پڑا۔ مرارجی کی شادی ۱۵ برس کی برس میں ۱۱ سالہ گجرا بین سے ہوئی۔ چوں کہ مرارجی اپنے تین بھائیوں اور تین بہنوں میں سب سے بڑے تھے۔ لہٰذا ۸ افراد پر مشتمل خاندان کی کفالت کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر آپڑی۔ ایسے مشکل حالات میں بھی انھوں نے ہمت نہ ہاری اور گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ وہ فضول خرچی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کفایت شعاری ان کی عادت تھی۔ انھیں بھاونگر کے مہاراجہ سے جو وظیفہ ملتا تھا وہ رقم گھر روانہ کر دیتے تھے۔ تقریباً چار سال تک دیسائی خاندان کی گزر بسر اسی قلیل رقم پر رہی۔ وہ گوکل داس تیج پال بورڈنگ ہاؤس میں رہا کرتے تھے جہاں طعام و قیام کا مفت انتظام تھا۔ ان کی کفایت شعاری کی عادت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب وہ وزیر اعظم بنے تو ان کی ذاتی کوشش تھی کہ وہ اندرون ملک میں اپنے سفر کے دوران ایئر فورس کے خصوصی طیاروں کا استعمال نہیں کریں گے۔ لیکن کچھ دنوں بعد انھیں اپنے فیصلے میں تبدیلی اس لیے لانی پڑی کہ ان کی سیکورٹی کے سبب عام مسافروں کو پریشانی ہونے لگی تھی اور طیارہ میں بہت سی سیٹیں خالی رہ جاتی تھیں۔ وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر ضرورت سے زیادہ سیکورٹی کی بھی انھیں ہمیشہ شکایت رہی۔

مرارجی دیسائی کی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۱۸ء سے ہوتا ہے جب وہ صوبائی سول سروس میں کامیاب ہو کر ۲۲ برس کی عمر میں احمد آباد کے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوتے ہیں اور ۱۲ برس تک اپنی ذمہ داری کو سنبھالتے ہیں۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی میں قدم ہی رکھا تھا کہ اسی اثنا یعنی ۱۹۲۰ء کی دہائی میں ہندوستان میں گاندھی جی، تلک، موتی لال نہرو اور مدن موہن مالویہ کی قیادت میں برطانوی سامراج کے خلاف آواز نہ صرف اٹھ رہی تھی بلکہ اس تحریک میں آئے دن تیزی اور شدت آرہی تھی۔ خود حکومت میں رہنے کے باعث مرارجی دیسائی سرکاری ملازمتوں

۲۲۷۔ ستلج ہوسٹل، جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

میں ہندوستانیوں کے خلاف برتے جانے والے
امتیازات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان باتوں سے
کافی ملول رہا کرتے تھے اور برطانوی سرکار کی ملازمت
میں گھٹن محسوس کرتے تھے۔ وہ استعفیٰ سے تین سال
قبل ہی سے یہ سوچنے لگے تھے کہ ان کی جگہ حکومت
میں نہیں ہے اور اس وقت سے ہی ان کا نظریہ بن
گیا تھا کہ جو افراد سرکاری ملازمت میں ہیں دراصل
ملک کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس
دور میں وہ بعض اوقات اپنی ذات سے یہ بھی سوال
کیا کرتے تھے کہ "کیا حکومت کے لیے کام کر کے
درحقیقت میں قوم کا غدار تو نہیں بن گیا ہوں"۔ لہٰذا
۱۹۳۰ء میں وہ مستعفی ہو کر حکومت کی ملازمت سے
آزاد ہو کر گاندھی جی کی قیادت میں چلائی جانے
والی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔

مرارجی دیسائی بڑے ہی خوش قسمت تھے
کہ ان کو گاندھی جی کا سایہ اور سہارا اور ان کے نادر
روزگار رفقائے کرام کی صحبتیں نصیب ہوئیں۔
ان کو گاندھی جی سے بہتر اور بڑا رہنما اور جنگ آزادی
کی تحریک سے زیادہ مفید مقتضائے وقت اور
جامع پروگرام کہاں مل سکتا تھا۔ ان کی غیر معمولی
ذہنی استعداد، ثابت قدمی اور کام کرنے کی لگن
کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ گاندھی جی جیسی
عملی و نظری رہبری نہ میسر آتی تو کیا معلوم وہ کدھر
نکل جاتے اور جتنے کارہائے عظیم جتنی طویل مدت
تک انھوں نے جس خوبی سے انجام دے وہ دے
بھی سکتے یا نہیں۔

۱۹۳۱ء میں مرارجی دیسائی کو بمبئی صوبائی
کانگریس کمیٹی کا سکریٹری اور انڈین کانگریس کمیٹی
کا رکن منتخب کیا گیا۔ آئندہ چند برسوں میں ان کو
کئی بار جیل جانا پڑا۔ انھیں پہلی مرتبہ اکتوبر ۱۹۳۰ء
میں تین ماہ کے لیے قید کیا گیا۔ دوسری مرتبہ وہ
جنوری ۱۹۳۱ء میں تحریک سول نافرمانی میں حصہ
لینے کی پاداش میں جیل گئے۔ گاندھی جی کے مشورہ
پر انھوں نے احمد آباد چھوڑ دینے کے ایک نوٹس
کی خلاف ورزی کی جس کی وجہ سے انھیں اکتوبر
۱۹۳۳ء تک قید بامشقت کی صعوبتیں برداشت
کرنی پڑیں۔ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۰ء میں برطانوی
حکومت نے اصلاحات کے بہانے ٹال مٹول کی
پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ
کی منظوری کے بعد مرارجی دیسائی سورت سے بمبئی
قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء
سے ۱۹۳۹ء تک مالیات، زراعت اور جنگلات
کے کابینی وزیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔
۱۹۳۹ء میں وہ اپنے عہدہ سے دست بردار ہو گئے
کیوں کہ انھیں عدم تعاون کی تحریک میں حصہ لینا تھا۔
۱۹۴۰ء میں انھیں ۱۱ ماہ کی اور اگست ۱۹۴۲ء میں
تین سال کی قید و بند کی سزا دی گئی۔ جیل میں مدت
اسیری کے دوران مرارجی دیسائی نے محاسبۂ ذات
مراقبہ اور گاندھی جی کے فلسفہ پر سنجیدگی سے مطالعہ
کیا اور گاندھی جی کے فلسفے سے اتنا متاثر ہوئے
کہ اس کو اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بنا لیا۔

جب ریاست بمبئی میں ۱۹۴۶ء میں عبوری
حکومت بنی تو بی۔ جی۔ کھیر کی وزارت میں مرارجی
دیسائی وزیر داخلہ بنائے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں آزاد
ہندوستان کے پہلے عام انتخاب میں مرارجی
دیسائی نے بلسار سے مقابلہ کیا مگر ناکام رہے
بعد ازاں وہ احمد آباد سے اسمبلی کے لیے منتخب
ہو گئے۔ بلسار کی شکست کے باوجود مرارجی کی
مستعفی نہ ہونے کی ترغیب کامیاب رہی۔ کیوں کہ
اسمبلی کے ممبر منتخب ہونے کے بعد پھر وزیر بنائے
گئے۔ اسی اثنا میں بی۔ جی۔ کھیر کی سرگرم عملی سیاست
سے سبکدوشی نے مرارجی کو ایک خوش آئند موقع عطا
کیا، لہٰذا ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۶ء تک بمبئی کے
وزیر اعلیٰ بنائے گئے۔ مرارجی دیسائی ریاستی
وزیر داخلہ اور وزیر اعلا ہونے سے قبل ایک اچھے
اور باصلاحیت منتظم رہ چکے تھے اور اس نظام
کی خوبیوں اور خامیوں سے پوری طرح واقف
تھے لہٰذا جب وہ وزیر اعلا بنے تو محکمۂ پولیس
میں تبدیلی لائے اس کے ساتھ ہی راس اراضی
اور جیل اصلاحات روبہ عمل لائے جس کا ایک
خاص پہلو یہ ہے کہ عدلیہ کو عاملہ یعنی انتظامیہ سے
علاحدہ کیا گیا۔

۱۹۵۶ء میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں
کی تشکیل نو کے بعد پر تشدد واقعات کا سلسلہ
شروع ہو گیا۔ بمبئی، احمد آباد اور دیگر کئی مقامات
پر سنگینیہ، مہاراشٹر اور مہاگجرات کے حامیوں
کے مابین جھڑپیں ہوئیں تو مرارجی دیسائی نے
احمد آباد میں ایک سچے گاندھی وادی کی حیثیت
سے برت رکھنا شروع کر دیا جس کا احتجاجیوں
پر خاطر خواہ اثر ہوا اور پر تشدد واقعات ختم
ہو گئے۔ تاہم بمبئی کی تقسیم کے بعد مرارجی دیسائی
مہاراشٹر کی وزارت عالیہ سے نومبر ۱۹۵۶ء میں
دست بردار ہو گئے اور پنڈت جواہر لال نہرو کے
ایما پر دہلی آ گئے۔ مرارجی دیسائی چوں کہ ہندوستان
کی سب سے بڑی اقتصادی اور تجارتی ریاست کے
وزیر مالیات، زراعت، جنگلات اور وزیر اعلا
رہ چکے تھے لہٰذا ۱۹۵۶ء میں مرکز کے صنعت و
تجارت کے وزیر مقرر کیے گئے اور ۱۹۵۸ء تک
اس عہدے پر قائم رہے اور جب مندھرا اسکنڈل
کا معاملہ بے نقاب ہوا تو ٹی۔ ٹی۔ کرشنم چاری کو
۲۲ مارچ ۱۹۵۸ء کو اپنی وزارت سے دست بردار
ہونا پڑا۔ اب محکمۂ خزانہ بھی مرارجی دیسائی کے
سپرد ہو گیا۔

وزیر خزانہ کی حیثیت سے مرارجی دیسائی کی
شخصیت بے حد اہمیت کی حامل ہے ان کی
بصیرت اور دوراندیشی کا اندازہ لگانے کے لیے
برصغیر میں کشادہ بازاری اور آزاد معیشت کی
پالیسی کا دور دورہ ثبوت کے طور پر موجود ہے
جب انھوں نے وزیر مالیات کی حیثیت سے
اقتصادی اصلاحات، آزاد معیشت اور بین اقوامی
منڈی میں شرکت کی حمایت کی تھی تو بائیں بازو
کی جماعتوں نے ان کی اس مالیاتی پالیسی کو اجارہ
داری سے تعبیر کیا، جس کی وجہ سے انھیں ایک بڑے
طبقہ کی زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔
یہی نہیں بلکہ ۱۹۶۲ء میں ان کے گولڈ کنٹرول،
بینکوں پر سماجی عمل داری وغیرہ کی پالیسی پر بائیں
بازو کی پارٹیوں نے شدید تنقیدیں کیں اور اس
وقت تک اطمینان کی سانس نہ لی جب تک
اگست ۱۹۶۳ء میں وہ کامراج پلان کے تحت
کابینہ سے علاحدہ نہ ہو گئے جب کہ آج ہندوستان
انہیں اقتصادی نظریات کو قبول کرتے ہوئے
آزاد معیشت کی راہ پر گامزن ہے اور غیر ملکی
سرمایہ کاری کو فروغ دے رہا ہے یہی لہر پورے
برصغیر میں شدت کے ساتھ چل رہی ہے۔
موجودہ معاشی تناظر میں ان کے لیے "صاحب
بصیرت" ہونے کی اصطلاح بہرحال استعمال
کی جا سکتی ہے کیوں کہ آج ڈاکٹر منموہن سنگھ کی

آزاد معیشت والی پالیسی کی وکالت مرارجی نے برسوں پہلے کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وزیر مالیات ڈاکٹر منموہن سنگھ کو یہ کہنا پڑا کہ "وزیر اعظم اور اس سے پہلے وزیر مالیات کی حیثیت سے مسٹر دیسائی نے ہندوستانی سیاست کو انقلاب آفریں بنانے میں نمایاں حصّہ لیا۔"

۱۹۶۳ء میں کامراج پلان کے تحت مرارجی دیسائی جب کابینہ سے مستعفی ہوگئے تو اپنے سیاسی سرگرمیاں صرف گجرات تک ہی محدود رکھیں۔ لیکن مئی ۱۹۶۴ء میں پنڈت جواہر لال نہرو اور ۱۹۶۶ء میں لال بہادر شاستری کے انتقال کے بعد وہ وزارت عظمیٰ کے ایک طاقتور دعویدار کے طور پر ابھر کر سامنے آئے مگر ناکام رہے۔ انھوں نے اپنی سوانح عمری "دی اسٹوری آف مائی لائف" میں جو دو جلدوں پر مشتمل ہے لکھا ہے کہ "اگر میں چند ممبروں سے لین دین کرتا تو یقیناً کامیاب ہوتا۔ مگر مجھے یہ بات پسند نہیں تھی جس پر بعض ساتھیوں نے کہا کہ سیاست کا راستہ بالکل سیدھا نہیں ہوتا بلکہ اس میدان میں بہت سارے خار ہیں جنھیں توڑ پھوڑ کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

اندرا گاندھی نے جب وزارت عظمیٰ کے عہدے کو سنبھالا تو مرارجی دیسائی کو اپنی کابینہ میں شریک کرکے وزیر خزانہ کے ساتھ ۱۹۶۷ء میں نائب وزیر اعظم بھی بنایا۔ مگر ان کی پالیسی سے افراط زر کا رجحان پیدا ہونے لگا تھا کیوں کہ انھوں نے ریاستوں اور پبلک سیکٹر کے اخراجات میں کمی کردی تھی۔ اس کی وجہ سے ان پر پرائیویٹ سیکٹر کو فروغ دینے کا الزام عائد کیا گیا۔ انھوں نے بینک کی شرح کو کم کرکے نجی تجارت کو رعایات دی تھیں۔ بینک نیشنلائزیشن سے مرارجی کو سخت اختلاف تھا اسی لیے اندرا گاندھی نے ۱۹۶۹ء میں ڈرامائی طور پر یہ عذر پیش کرتے ہوئے کہ انھیں امید نہیں ہے کہ وہ اقتصادی پالیسی کو کامیاب ہونے دیں گے ان سے محکمۂ خزانہ کا قلمدان لے لیا۔ صدارتی فرمان کے ذریعے ۱۴ بینکوں کو قومیانے کے احتجاج میں مرارجی دیسائی نے کابینہ سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ لال بہادر شاستری کے بعد جب اندرا گاندھی ملک کی وزیر اعظم ہوئیں تو وہ سیاسی اور سماجی ڈھانچے میں بڑے پیمانے پر تبدیلی لائیں۔

۱۹۷۷ء میں جب جے پرکاش نارائن کی تحریک نے جنتا پارٹی کو جنم دیا اور وہ مارچ ۱۹۷۷ء میں ہوئے چھٹے لوک سبھا انتخاب میں برسر اقتدار آئی تو بالاتفاق مرارجی دیسائی کو پارلیمانی جنتا پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا اور ۸۲ برس کی عمر میں ۲۴ مارچ ۱۹۷۷ء کو ہندوستان کے غیر کانگریسی وزیر اعظم کی حیثیت سے انھیں حلف دلایا گیا۔ اس طرح ان کی وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ہوگئی۔ لیکن وزارت عظمیٰ کا تاج ان کے لیے کانٹوں بھرا ثابت ہوا کیوں کہ دو سال کے اندر جب تک جنتا پارٹی کی حکومت رہی۔ ایک سے ایک نظریاتی اختلاف ابھرتے رہے۔ یہاں تک کہ جنتا پارٹی تقسیم ہوگئی۔ نتیجتاً حکومت ٹوٹ گئی تو انھوں نے ۱۵ جولائی ۱۹۷۹ء کو وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور جب ۱۹۸۰ء میں پھر عام انتخاب ہوا تو مرارجی دیسائی نے اس میں حصّہ نہیں لیا اور بمبئی آکر اپنی قیام گاہ "اوشیانا" جو میرین ڈرائیو علاقہ میں تھی خاموش زندگی گزارنے لگے اور "تلاش حق" میں مصروف ہوگئے۔ یوں وہ بتدریج سیاسی گمنامی میں چلے گئے۔ بعد میں وہ حکومت مہاراشٹر کی فراہم کردہ رہائش گاہ میں منتقل ہوگئے تھے۔ سیاسی عملی زندگی سے کنارہ کش ہونے کے باوجود اختلاف نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا کیوں کہ امریکہ کے ایک صحافی سیمور ہرش نے اپنی کتاب "دی پرائس آف پاور" میں لکھ دیا تھا کہ ان کا تعلق سی۔ آئی۔ اے سے تھا اور وہ اپنی حکومت کے زمانے میں ڈالروں کے بدلے سرکاری راز فروخت کیا کرتے تھے۔ اس غلط الزام سے ملک کو ہی نہیں بلکہ مرارجی کو اتنا صدمہ پہنچا کہ انھوں نے امریکہ جاکر اس مصنف کے خلاف ہتک عزت اور تاوان کا مقدمہ وہاں کی عدالت میں دائر کیا۔

مرارجی دیسائی ایک سیاست داں ضرور تھے لیکن انھوں نے سیاست کی آلودگیوں سے اپنے دامن کو ہمیشہ محفوظ رکھا، جس کا اعتراف ان کی وفات کے بعد تقریباً سب نے کیا ہے۔ ڈاکٹر اوشا مہتا کے لفظوں میں "وہ اخلاقیات اور صالح قدروں کے شہنشاہ تھے۔" نائب صدر کے۔ آر۔ نارائنن کے مطابق "وہ ایسے اصولوں اور اقدار کے پابند رہے کہ جس کی وجہ سے وہ عالمی طور پر تعریف کے مستحق ہوئے۔" وزیر داخلہ ایس۔ بی چوہان نے کہا کہ "قومی اتحاد و یک جہتی اور سماجی و ثقافتی زندگی کی بہتری کے لیے جو خدمات انھوں نے پیش کی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔" راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیئر پرسن نجمہ ہبت اللہ نے فرمایا کہ "مسٹر مرارجی دیسائی جدوجہد آزادی کے نظریات و اقدار کی تجسیم اور عوامی زندگی میں اعلا اقدار کے نقیب تھے۔ گاندھیائی فلسفہ میں ان کے گہرے ایقان نے کئی نسلوں کو تحریک دی ہے۔" صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور وزیر اعظم پی۔ وی نرسمہا راؤ نے مرارجی دیسائی کو ہندوستان کا ایک عظیم مجاہد آزادی اور سپوت بتایا اور ان کی دیانت داری، فرض شناسی اور انتظامی اہلیت کی تعریف کی جنھوں نے قومی تعمیر میں قابل ذکر کردار ادا کیا۔ "ان کی زندگی اعلا قدروں اور گاندھیائی اصولوں پر قائم تھی۔ ان کی موت نے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔"

دراصل سیاست میں دیسائی کی دلچسپی کا مرکز قوت کا کھیل اور سیاست کی مہرہ بازی نہ تھی۔ بلکہ گاندھی جی، ٹیگور، مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو کی طرح صحیح اور صالح قدروں کی اشاعت اور قومی کردار کی تشکیل تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو سیاسی اقتدار اور آزادی ان قدروں کی بنیاد پر قائم نہ ہو اس کا انجام بخیر نہیں ہوسکتا اور جب تک قوم میں رواداری، جرأت، سچائی کی لگن، محنت و مشقت کی عادت، نظم و ضبط، ڈسپلن، مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت اور ایثار کی صفات نہ پیدا نہ ہوں آزادی ریت کی دیوار ثابت ہوگی۔

مرارجی دیسائی برصغیر ہند کے پہلے ایسے سیاست داں تھے جنھیں ہندوستان و پاکستان دونوں ممالک کے سب سے اعلا اعزازات سے سرفراز کیا گیا۔ پاکستان کے سابق صدر جنرل ضیاء الحق نے مرارجی دیسائی کو اپنے ملک کا سب سے اعلا اعزاز "نشان پاکستان" دینے کا اعلان کیا۔ ہندوستانی حکومت نے انھیں ۱۹۹۱ء میں ہندوستان کے سب سے بڑے قومی اعزاز "بھارت رتن" سے سرفراز کیا۔ ۱۹۸۷ء میں تنظیم آچاریہ تلسی امرت قومی کمیٹی کی طرف سے صدر

جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ کے ہاتھوں انھیں ایک لاکھ روپیے پر مشتمل "عدم تشدد" ایوارڈ دیا گیا اس موقع پر مرارجی دیسائی نے کہا تھا کہ "پیسہ تمام برائیوں کی جڑ اور انسان کے زوال کا سبب ہے۔ پیسہ اور عدم تشدد ایک ساتھ نہیں مل سکتے۔"

اپنے کردار و عمل سے انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ سچے گاندھی نواز ہیں۔ اصول پسند اور نظم و ضبط کے سخت پابند رہنما نے عمر بھر کھدر کے لباس کے سوا کوئی اور لباس زیب تن نہیں کیا اور جب اقتدار میں آئے تو کھادی کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے خصوصی مراعات دیں۔ ہمیشہ سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی گزاری۔ ممبر اسمبلی سے لے کر وزیراعظم کے عہدے تک نہ تو کبھی وقت برباد کیا اور نہ ہی بیماری کے علاوہ کبھی تعطیل لی۔

مرارجی دیسائی چونکہ مہاتما گاندھی کے شاگردوں میں سے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک گاندھی کی طرح اپنے اصولوں سے منہ نہیں موڑا۔ سب واقف ہیں کہ گاندھی جی اپنی روزمرہ زندگی میں بے حد نرم خلیق اور ملنسار انسان تھے لیکن جہاں اصولوں کا معاملہ آپڑتا تھا تو وہ فولاد سے بھی زیادہ سخت ہو جایا کرتے تھے۔ جہاں کہیں برائی اور ناانصافی پایا اس کی مخالفت کی۔ اپنی جان تک دے دی لیکن ان ابدی اقدار کو خیرباد نہیں کیا جو انھیں عزیز تھیں کچھ یہی حال مرارجی دیسائی کا تھا۔ انھوں نے کسی حال میں گاندھیائی اصولوں کا دامن نہیں چھوڑا۔ انھیں معلوم تھا کہ بہت سے لوگ بلکہ خود ان کے ساتھی انھیں پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن وہ کسی کی پسند و ناپسند کی پروا کیے بغیر ہمیشہ اسی راستے پر گامزن رہے جو ان کے نزدیک سچا راستہ تھا۔ بڑے سے بڑا عہدہ یا مالی منفعت بھی انھیں سچ کہنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں انھوں نے اسی آہنی عزم و ارادے سے کام لیا۔ اور جب وزیراعظم بنے تو پورے ملک میں شراب نوشی بند کرا دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورے ملک سے انھیں مختلف حلقوں کی جانب سے شدید مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، بالخصوص بمبئی سے کیونکہ بمبئی ۱۹ویں صدی سے ہی مغربی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ بن چکا تھا، لیکن وہ ان مخالفتوں سے بے نیاز ہو کر اپنی پالیسی پر سختی سے کاربند رہے۔ ان کی وفات کے بعد کل ہند نشہ بندی کونسل نے ان کے یوم پیدائش یعنی روز ۲۹ فروری کو ہر سال "یوم نشہ بندی" کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا ہے۔

مرارجی ۸۲ برس کی عمر میں وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے تھے۔ اس عمر میں بھی وہ اتنے چاق و چوبند تھے کہ جب وہ آسام کے دورے پر جا رہے تھے تو ان کا ہیلی کوپٹر حادثہ کا شکار ہو کر دھان کے کھیت میں گر پڑا اور اسپیشل جہاز کے ۸ محافظ ہلاک ہو گئے اور مرارجی کے بیٹے کانتی دیسائی کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی مگر وہ ہیلی کوپٹر کے زمین پر گرنے سے چند لمحے پہلے ہی پانی بھرے دھان کے کھیت میں کود پڑے۔

مرارجی دیسائی کی عظمت کا غالباً سب سے بڑا راز یہ تھا کہ انھوں نے ہمیشہ صحت مند سیاسی اور سماجی اقدار کو اہمیت دی اور بڑی سے بڑی قیمت پر بھی اپنے اصولوں کا سودا نہیں کیا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک اہم تاریخی شخصیت کے حامل تھے، جس نے ایک غیر معمولی تاریخی دور کا مشاہدہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ ملک کی تاریخ کو بنانے میں فعال حصہ لیا تھا۔ ان کے ان ہی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے ایک مغربی مفکر ویلیس ہینگر نے ان لفظوں میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

THE MAN IS NOT COLD EXCEPT WHEN HE WISHES TO BE. HIS SMILE IS ENGAGING, THE WORDS THAT SOUND BIGOTED OR HEARTLESS IN COLD PRINT ARE THE PERSUASIVE VOICE OF REASON.

"وہ سرد مزاج نہیں تھے مگر بعض اوقات ضرورتاً سرد مہری برتتے تھے۔ ان کی مسکراہٹ معنی خیز ہوتی تھی۔ ان کے وہ الفاظ جو کانوں کو عصبیت سے پُر یا بے مروت اور سرد لگتے تھے، دراصل وہ استدلال پر مبنی متعاقب ہوتے تھے۔"

اس تمام بحث و تمحیص کا لب لباب یہ ہے کہ مرارجی دیسائی ان معدودے چند سیاست دانوں میں سے تھے جن کے نزدیک قومی مفاد سے بڑھ کر اور کوئی مفاد یا مقصد نہیں تھا۔ سیاسی اقتدار کو بجائے خود ایک مقصد سمجھنے کے وہ اسے حصول مقصد کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ہر چند کہ انھوں نے ایک عرصہ سے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، لیکن ان کی ذات کانگریس کے شاندار ماضی اور جدوجہد آزادی کی روشن علامت تھی۔ مرارجی دیسائی نے اپنی موت سے دو ماہ قبل اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ "ہمیں ہر اس چیز سے دور رہنا چاہیے جس سے ملک و قوم کو سلامتی کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔" آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کا ہر طبقہ مرارجی کی زندگی سے سبق سیکھے اور ان کے اصولوں، نظم و ضبط، ڈسپلن، سادگی، سچائی، ایمانداری، بے باکی، محنت و مشقت اور جفاکشی کی لگن کو اپنے کردار و عمل کا حصہ بنائے تاکہ وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے جو آزادی کے وقت ہمارے رہنماؤں نے دیکھا تھا۔ ●

بقیہ: لڑکیوں پر توجہ — بہتر مستقبل کی کلید

ان کی حیثیت کمتر ہوتی جاتی ہے۔ خواتین سے متعلق قومی کمیشن نے لڑکیوں کے استحصال سے متعلق مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ اس موضوع پر خلاصہ تیار کرنے اور اسے شائع کرنے کے علاوہ مذکورہ کمیشن نے اس گھناؤنے جرم کے خلاف رائے عامہ حاصل کرنے اور کارروائی کرنے کے سلسلے میں اپنی کوششوں کو تیز تر کیا ہے۔ اس سلسلے میں کمیشن نے کرناٹک، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، پنجاب اور دہلی میں اس طرح کے واقعات پر نظر رکھنے کے لیے سماجی کارکنان کی ضمنی کمیٹیاں قائم کی ہیں۔ خواتین سے متعلق قومی کمیشن نے سزا میں اضافہ کرنے کی سفارش سمیت حکومت کو قوانین میں ترمیم کرنے کی تجویز بھی پیش کی ہے۔

لڑکیوں کے سلسلے میں کوشش کرنے اور ضوابط وضع کیے جانے کے باوجود بھی، ان کو زیادہ مدد اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ لڑکیاں زندگی بھر مختلف اقسام کے امتیازات سے دوچار ہوتی ہیں اور موجودہ سماجی و ثقافتی طریقوں کی وجہ سے ان کے لیے ان رکاوٹوں کو دور کرنا مشکل ہو جاتا ہے، جو ان کے وجود کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔

اس سال خواتین کا عالمی دن ایک ایسے نئے عالمی نظام کی سمت شروعات کی علامت ہے، جس میں لڑکیوں کو مساوی درجہ دیا جائے گا اور اس طرح ایک بہتر مستقبل کے لیے راہ ہموار ہوگی۔ ●

پردیپ بھٹناگر

دیہی روزگار: موجودہ حالت اور مستقبل کے لیے لائحہ عمل

محنت اور بے روزگاری کا مسئلہ ہمیشہ سے ہی معاشیات کا مرکزی موضوع رہا ہے۔ روایتی معاشی اصول کے مطابق محنت کو پیداوار کے چار ستونوں میں سے ایک مانا جاتا تھا۔ دوسرے تین ستون تھے۔ زمین، پونجی اور صنعت۔ یہ مانا جاتا تھا کہ پیداوار کے یہ چاروں ستون مخصوص مقدار میں حاصل ہوتے ہیں۔ اور ماہر معاشیات بڑی سنجیدگی سے اس بات پر غور و فکر کرتے رہے کہ ان اصولوں کی مانگ اور کھپت کے بیچ تال میل سے ان کی قیمت کس طرح سے متعین ہوتی ہے۔ مغربی ممالک کے تجربوں کی بنیاد پر قائم ان اصولوں کی ہندوستان جیسے ملک میں کچھ زیادہ ضرورت نہ تھی کیوں کہ ہندوستان میں محنت کی زیادتی ہے۔

یہ تو چھٹی دہائی کے درمیان پروفیسر آرتھر لوئس نے دوہرے معاشی نظام کے بارے میں لکھا، جس میں انھوں نے زرعی حلقے میں "بالواسطہ روزگار" کی شکل میں محنت کے زیادہ ہونے کی بات کی اور دلیل دی کہ یہ فاضل محنت صنعتی حلقے کے لیے محنت کی لامحدود تکمیل کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ صنعتی حلقے میں مناسب مقدار میں پونجی کے قائم ہونے سے دھیرے دھیرے یہ وسیلہ صنعتوں کو دیا جا سکتا ہے، جس سے فاضل محنت والے معاشی نظام کو مکمل فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔

پروفیسر لوئس کا مضمون جن دنوں شائع ہوا ان دنوں بھارت میں آبادی کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر چکا تھا اور بے روزگاری کو ایک بھیانک خطرہ مانا جانے لگا تھا۔ تب اس مضمون نے بے روزگاری کے، خاص طور سے دیہی بے روزگاری کے مسئلے ۔ ۔ ۔ اور اس کے حل کے بارے میں ایک انقلابی تبدیلی کا سراغ دیا۔

۱۸۹۲ء سے ۱۹۲۱ء تک کی گئی مردم شماری میں خاص معاشی سوال، ہر ایک آدمی کے روزگار کے وسیلے سے جڑا تھا۔ جب کہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۵۱ء تک کی مردم شماری میں فرد کی آمدنی کو اہمیت دی گئی۔ لیکن ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں پہلی بار بے روزگاری کے اعداد و شمار کو مخصوص مقام دیا گیا اور مردم شماری کو روزگار اور بے روزگار کے دو خانوں میں بانٹا گیا۔ بعد کی مردم شماری میں بے روزگاری کا صحیح پتا لگانے کے لیے اور باریکی لائی گئی۔ "راشٹریہ نمونہ سروے سنگٹھن نے ان خیالوں کو وسعت دی جنھیں ۷۳-۱۹۷۲ء سے بے روزگاری / نیم روزگاری کے بارے میں کیے گئے سروے میں اپنایا گیا۔ اس سنگٹھن کے اعداد و شمار کے ذریعہ فراہم معلومات کو اس سلسلے میں زیادہ معتبر مانا جانے لگا اور چھٹے پنج سالہ منصوبے (۸۵-۱۹۸۰ء) سے پلاننگ کمیشن ان اعداد و شمار کو اپنے پلاننگ دستاویز میں استعمال کر رہا ہے۔

دیہی بے روزگاری کا تخمینہ

"آل انڈیا نمونہ سروے" کے حالیہ تخمینوں (۴۸ واں چکر جنوری۔ دسمبر ۱۹۹۲ء) کے مطابق ملک میں دیہی مزدوروں کی کل تعداد ۲۴۱.۴ کروڑ ہے۔ اس میں روزگار میں لگے اور بے روزگار دونوں شامل ہیں۔ قومی سطح پر کیے گئے نمونہ سروے نے اپنے تازہ سروے میں بے روزگاری کے دو نظریے کو اپنایا ہے وہ عام حالت کے مطابق بے روزگاری اور حالیہ ہفتہ واری حالت کے مطابق بے روزگاری۔ عام حالت کی بے روزگاری کا تعلق لمبے عرصے تک بے روزگار رہنے سے ہے، جس میں متعلق ہر شخص سروے کی مدت سے ایک سال پہلے یا اس سے بھی زیادہ مدت سے بے روزگار ہے۔

عام حالت پر قائم بے روزگاری کے اعداد و شمار کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ دیہی حلقوں میں لگ بھگ ۲.۰۷ فی صد یا ۲۶ لاکھ سے زیادہ آدمی بے روزگار ہیں۔ اس تجزیے کی کچھ دوسری خصوصیات اس طرح ہیں۔

- یہ تجزیہ ایسے تعلیم یافتہ اور تجربہ کار افراد پر زیادہ لاگو ہوتا ہے، جو مستقل نوکری کی تلاش میں ہیں اور جنھیں کم وقتی روزگار نہیں چاہیے۔
- عام حالت میں لگ بھگ ۷۰ فی صد بے روزگاری ۱۵ سے ۲۹ سال کی عمر میں پائی جاتی ہے۔
- شہری حلقوں میں یہ دیہی حلقوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔
- عورتوں کی نسبت مردوں میں زیادہ ہے۔
- بھارت میں بے روزگاری کی اہم وجہ موجودہ ہفتہ واری حالت کے مطابق بے روزگاری پر منحصر اعداد و شمار کا تجزیہ ہے۔ اس کے تحت پچھلے سات دنوں کے لیے کسی شخص کے کام دھندے کی حالت درج کی جاتی ہے۔ اس طرح سیزن پر منحصر بے روزگاری اور مستقل بے روزگاری کا زیادہ بہتر طریقے سے تخمینہ کیا جاتا ہے۔ ہفتہ واری حالت کے مطابق

ملک میں شمار کی گئی بے روزگاری کی کچھ خصوصیات اس طرح ہیں۔

- یہ شہری حلقوں (۱۴.۱ فی صد) کی نسبت دیہی حلقوں میں (۵.۹ فی صد) زیادہ ہے۔
- دیہی خاندانوں میں یہ محنت کش طبقوں میں خود روزگار والے گھروں کے مقابلے زیادہ ہے۔
- علاقائی سطح پر کافی فرق ہے، سب سے زیادہ بے روزگاری کیرل میں ہے، جس کے بعد تامل ناڈو اور آسام کا نمبر آتا ہے اور راجستھان میں ایسی بے روزگاری بہت کم ہے۔

روزمرہ کے اندازے کے مطابق دیہی حلقوں میں بے روزگار مزدوروں کی کل تعداد کا لگ بھگ ۹.۱ فی صد یعنی لگ بھگ ۴۶ لاکھ ہے۔ یہ تناسب کئی ترقی یافتہ ملکوں کی بے روزگاری کی شرح سے مقابلتاً کم ہے اور اسے راشٹریہ نمونہ سروے سنگٹھن کے سروے کرنے کے طریقے سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ کسی شخص کو بے روزگاری کے خانے میں رکھنے کا پیمانہ اس شخص سے یہ پوچھنا ہے کہ کیا وہ متعلقہ مدت کے دوران کام کر رہا تھا/رہی تھی یا اور کیا کام تلاش کر رہا/رہی تھی یا کام کے لیے حاضر تھا/تھی۔ بے روزگار کہلانے کے لیے اس شخص کا کام کی تلاش میں ہونا ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس نے مخصوص مدت میں ہر دن ایک گھنٹہ بھی کام نہ کیا ہو۔ دیہی ہندوستان کے بارے میں یہ صورت حال بے حد ضروری معلوم ہوتی ہے۔

دیہی ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں لوگوں کے پاس مکمل روزگار نہیں ہوتا ہے، مگر سماجی روایات کی وجہ سے وہ ایک ہی جگہ رہنا پسند کرتے ہیں اور چوں کہ انھیں اپنے آس پاس کے علاوہ دوسری جگہوں پر روزگار کے مواقع کا علم نہیں، اس لیے وہ کھیتی سے باہر یا اپنے گاؤں سے باہر کام دھندا ڈھونڈھنے نہیں جاتے ہیں۔ یہ صورت حال گاؤں میں رہنے والی عورتوں کے بارے میں زیادہ بھی ہے۔ اگر ایسے بے روزگار افراد کو بھی بے روزگاروں کے ساتھ شامل کرلیں تو بے روزگاری/نیم روزگار حاصل کرنے والے افراد کی تعداد میں لگ بھگ دو کروڑ افراد کا یا ملک کے آٹھ فی صد دیہی مزدور سے زیادہ کا اضافہ ہو جائے گا۔

دیہی علاقوں میں روزگار کے مواقع

تاریخی نقطہ نظر سے دیکھیں تو دیہی علاقوں سے شہروں اور قصبوں میں مزدور طبقے کے ہجرت کرنے کا عمل جاری رہا ہے۔ ہندوستانی صورت حال یہ ہے کہ شہری حلقہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہو گا کہ سبھی بے روزگاروں کو روزگار دے سکے۔ شہری اور دیہی حلقوں کی مزدوری میں ۳۰ فی صد کے فرق کو پروفیسر لوئس نے دیہی مزدوروں کو صنعتی حلقے کی طرف راغب کرنے کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ حقیقت میں یہ فرق اس سے کہیں زیادہ ہے اور اس کی وجہ سے بہت بڑے پیمانے پر شہروں کی طرف مزدوروں کی ہجرت ہوئی ہے۔ لیکن صنعتی حلقوں میں سب کے لیے مطلوبہ روزگار کے مواقع پیدا نہیں کیے جاسکے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر لبرل لائزیشن اور پرائیویٹائیزیشن کی نئی معاشی پالیسی کے نتیجے میں شہری علاقوں میں روزگار کے مواقع میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے تو بھی گاؤں میں موجود فاضل مزدوروں کو شہروں میں روزگار فراہم کرنا ممکن نہیں ہو پائے گا۔ لہٰذا اس کا حل یہی ہے کہ دیہی علاقوں میں روزگار کے اور زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں۔

دیہی علاقوں میں روزگار کے مواقع کا پتا لگانے کے لیے دو طبقوں کو فوری طور پر واضح شکل میں پہچانا جاسکتا ہے۔

۱۔ زراعت اور اس کا متعلقہ علاقہ

۲۔ غیر زراعتی علاقہ۔

زراعتی علاقہ

زراعتی علاقے میں ممکنہ مندرجہ ذیل طریقوں سے روزگار کے دوسرے اور مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔

(الف) آب پاشی کا پھیلاؤ، جس کے نتیجے میں ایک فصلی زمین کو کئی فصلی زمین میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، جس سے اسی زمین پر کیے جانے والے کام میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہے۔

(ب) کھیتوں میں نئے نئے طریقوں کا استعمال، جس سے جوتائی، نرائی، کھاد ڈالنے، کیڑا مار دوا چھڑکنے، پودا لگانے وغیرہ کے نئے طریقوں کا استعمال کرنے سے کام میں اضافہ ہوتا ہے۔

ان دونوں طریقوں سے پیداوار میں ہونے والے اضافہ سے بیج تیار کرنے، کٹائی پسائی، اناج کی ڈھلائی اور اس کے محفوظ رکھے جانے سے اور زیادہ روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے۔ بے روزگاری کے اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ ان طریقوں کے استعمال سے ہی پنجاب، ہریانہ، اتر پردیش جیسے زیادہ پیداوار والی ریاستوں میں بے روزگاری بہت کم ہے۔

متعلقہ علاقہ

متعلقہ حلقوں میں روزگار کے زیادہ تر مواقع مویشی پالنے میں ہیں۔ اس حلقے میں روزگار گاؤں میں ہی دستیاب ہوتا ہے اور عورتوں و بچوں کو بھی منافع بخش روزگار مل جاتا ہے۔ اس کام میں مزدوروں کی کثیر تعداد میں ضرورت پڑتی ہے اور چمڑے اور ہڈیوں کے کاروبار، مویشی کی غذا کی پیداوار، چراگاہوں کی ترقی اور چارا پیدا کرنے میں بھی کافی لوگوں کو روزگار ملتا ہے۔

ملک میں ۲۹۰۰ کلومیٹر لمبی ندیوں اور ۲۰ لاکھ ہیکٹیر زمین میں پھیلے ہوئے آبی طاسوں کو دیکھتے ہوئے مچھلی پالن کے پیشے میں بھی روزگار کے کافی مواقع ہیں۔ آبی ذخیرے کے بڑے حصے کے غیر استعمال شدہ رہنے کی وجہ سے مچھلی پالن کے پیشے میں توقع سے کم افراد کو روزگار ملا ہوا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اندرونی علاقوں میں مچھلی پالن کا کام ضمنی طور پر کیا جاتا ہے جب کہ ساحلی علاقوں میں مچھلی پالن موسمی پیشہ ہوتا ہے، جو سمندر میں رہنے والی مچھلیوں کے ساحل کے نزدیک آنے پر منحصر ہوتا ہے۔ آبی ذخیرے، گاؤں کے تالابوں اور دلدلی علاقوں میں پانی کے حصے زمین کے تشفی بخش استعمال کے ساتھ ساتھ مچھیارے (ملاح) کے کاروبار کو منافع بخش بنانے کے لیے مناسب ٹریننگ فراہم کرنے سے اس پیشے سے مستقل مدتی کام دھندا کرنے والے افراد کی تعداد میں بھاری اضافہ ہوسکتا ہے۔ ساحلی علاقوں میں بڑے

پیمانے پر گہرے سمندر میں مچھلی پکڑنے کو بڑھاوا دینے سے سمندری غذا کی پیداوار کی ٹریننگ وغیرہ سے بھی اس شعبے میں کثیر تعداد میں روزگار کے مواقع فراہم ہو سکتے ہیں۔

غیر زرعی علاقہ

دیہی ہندوستان کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ ویسے تو صدیوں سے کھیتی کے کام میں خاص طور سے لگے لوگوں کی تعداد ۷۰ فی صد کے آس پاس رہی ہے، پھر بھی غیر زرعی کاموں سے بھی گاؤں میں کافی روزگار ملتا ہے۔ اس پیشے میں ۱۵ سے ۲۰ فی صد تک مزدور کام کرتا ہے۔ ہتھ کرگھا، ہینڈی کرافٹ، دیہی صنعت، ریشم کے کیڑے پالنا، کھادی، چھوٹے موٹے دھندوں، مکان کی تعمیر، اور ٹرانسپورٹ کے پیشے میں کم پونجی سے کیے جانے والے دھندے بھی بغیر زمین والوں کی آمدنی کے اہم ذرائع ہیں اور ان سے چھوٹے و غریب کسانوں کو بھی فاضل آمدنی ہوتی ہے۔

دیہی اور گھریلو صنعت

ملک نے کئی چیزوں کی پیداوار کو مکمل طور پر دیہی اور گھریلو صنعت کے لیے مخصوص رکھنے کے اصول کو اپنایا ہے۔ ان صنعتوں کی خاطر خواہ ترقی کے سبب اس میں مزید روزگار کے مواقع کا پیدا ہونا، ملک میں دیہی بے روزگاری کے مسئلے سے نپٹنے کے طریقے کا ایک اہم حصہ بنا رہنا چاہیے، کیونکہ قائم شدہ کارخانوں میں ہی نوکری کے مواقع بڑھانے پر زور دینے پر بھی بے روزگاری کا مسئلہ حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی جب تک دیہی علاقوں میں ہی مزید روزگار نہ پیدا کیا جائے۔

مندرجہ بالا سبھی شعبوں میں مزید روزگار کے مواقع فراہم کرنے میں وقت لگتا ہے اور پھر گھریلو اور دیہی صنعت کی محنت سے متعلق مزدوروں کو پورا کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ مزدوروں میں ایک معمولی سطح کی صلاحیت بھی موجود ہو۔ کھیتی کے شعبے میں مزید روزگار کے مواقع پیدا کرنا اس بات پر بھی منحصر کرے گا کہ کسانوں کو ایک فصلی زمینوں کو کئی فصلی زمینوں میں بدلنے میں کتنا وقت لگے گا اور کھیتی کے جدید طریقوں کو اپنانے میں کتنی تیزی آئے گی۔ مخصوص دیہی ترقی کے پروگرام جیسے کاموں کے ذریعے سے مویشی پالن اور دوسرے مددگار شعبوں میں اپنے کام دھندوں کو بڑھاوا دینے کے لیے قرض کی بھی ضرورت پڑے گی جیسا کہ مخصوص دیہی ترقی کے پروگرام کے پچھلے ۱۵ برسوں کے تجربوں سے پتا چلتا ہے کہ غریب/مجبور بے روزگاروں کو اس پروگرام کا فائدہ اکثر نہیں مل پاتا کیونکہ بینک بھی خطرہ نہیں لے سکتے۔ نیچے رہنے والے ان لوگوں کو ہی قرض دیتے ہیں جو مقابلتاً بہتر حالت میں ہیں۔

یومیہ اجرت

بے روزگاروں میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بے زمین ہیں، اچھی حالت میں نہیں ہیں اور جو یومیہ اجرت پر منحصر کرتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے سبب چھوٹے اور غریب کسانوں کی پہلے ہی سے کاشت کاری کی زمینوں کے ٹکڑے ہو جانے سے بے زمین مزدوروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ملک کے کئی حصوں میں کھیتی کے مندی والے موسم میں مزدوروں کو ہجرت کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے یا پھر مقامی سطح پر بہت ہی معمولی مزدوری پر کام کرنے پر مجبور کر کے ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں قومی تعمیری پروگرام مختصر مدتی ذریعہ فراہم کرتے ہیں۔ پچھلے دو ایک دہوں سے ملک میں ایسے پروگرام چل رہے ہیں۔ لیکن ایک تو اس بات کے لیے ان کی تنقید کی جاتی ہے کہ اس طرح کے پروگرام مناسب نہیں ہیں اور ان سے جو عوامی... دولت بنتی ہے وہ پائیدار نہیں ہوتی لہٰذا یہ اب ایسے پروگرام بن کر رہ گئے ہیں جن سے غریبوں کو وقتی آمدنی تو ہوتی ہے مگر پائیدار بنیاد نہیں بن پاتے ہیں۔

یہ مزید واضح ہوتا جا رہا ہے کہ مکمل طور پر سرکاری ایجنسیاں یا منافع بخش گروپ کے اپنے گروپ کے ذریعے چلائے جانے والی عوامی فلاح کے پروگرام نہ تو روزگار کے مواقع پیدا کرنے میں اور نہ ہی مضبوط عوامی پونجی قائم کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ ان منصوبوں میں ٹھیکیداروں کے حصہ داری کی ممانعت سے کام پر لگائے گئے مزدوروں کا مناسب استعمال نہیں ہو پایا ہے۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ کامیاب اور ناکامیاب دونوں ہی طرح کے محنت طلب عوامی تعمیری پروگرام ساتھ ساتھ چلائے جائیں، مثال کے طور پر کام کے بدلے اناج، جس میں کم اجرت دی جاتی ہے اور زیادہ تر غریب ترین بے روزگار مزدوروں کو پٹایا جاتا ہے، جن کو بنیادی سہولت فراہم کی جاتی ہے تاکہ پروگرام کامیابی سے چلے، جس میں ٹھیکے پر مزدوروں کو لگایا جاتا ہے، جنھیں بازار بھاؤ پر مزدوری دی جاتی ہے، مگر واضح شرط یہی ہوتی ہے کہ سامان اور مشینری کا کم سے کم استعمال کیا جائے گا، چاہے ایسا کرنے کے لیے دوگنے یا تین گنے مزدوروں کا استعمال کیوں نہ کرنا پڑے۔ ملک کی موجودہ یومیہ اجرت کے پروگراموں کو اس نقطۂ نظر سے ترمیم کیا جا سکتا ہے۔

توقعات

ہندوستان میں دیہی بے روزگاری کا مسئلہ، خاص طور پر مندی کے سیزن کی بے روزگاری کا مسئلہ ہے۔ جموں و کشمیر، راجستھان اور آسام جیسے سب سے زیادہ موسمی فرق والے ریاستوں میں بڑے پیمانے پر ایک فصلی کھیتی کی جاتی ہے اور وہاں حل یہی ہے کہ بڑے، منجھلے اور چھوٹے سینچائی منصوبوں پر زیادہ روپیہ خرچ کر کے سینچائی کی سہولتوں کو عام کیا جائے اور جدید زراعتی طریقوں کو بڑھاوا دینے کی مشترکہ کوشش کی جائے۔ دیہی بے روزگاری میں معمولی موسمی فرق والے پنجاب، ہریانہ اور اتر پردیش جیسے ریاستیں بھی ہیں جہاں کی سینچائی کی سہولتوں اور نئی زراعتی تکنیک کا خاطر خواہ استعمال ہوا ہے۔ ایسی ریاستوں کو اپنے دیہی مزدوروں کو روزگار دینے کے لیے غیر زراعتی شعبوں میں روزگار فراہم کرنے والے منصوبوں پر توجہ مرکوز کرنا پڑے گا۔ باقی سبھی ریاستوں کے لیے سب سے بہتر یہی رہے گا کہ وہ دونوں طریقوں کو ملا جلا کر استعمال میں لائیں۔ ویسے زیادہ تر ریاستوں میں کامیاب اور ناکامیاب دونوں ہی محنت پر مبنی والے یومیہ روزگار پروگرام جاری رہنے چاہئیں۔

باقی صفحہ ۱۱۱ پر

ڈاکٹر بیدیہ ناتھ مصرا

معیشت کی پیش رفت کا گاندھیائی طریق کار

”معیشت ایسی ہونی چاہیے جو مذہب یا روحانیت کی شرائط پوری کرنے کی اہل ہو۔“

گاندھی جی کے مطابق معاشیات کو سماج کے دیگر مسائل سے الگ تھلگ نہیں رکھا جاسکتا اور نہ ہی زندگی کو سماجی معیشت، سیاست وغیرہ کے محدود خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ مربوط زندگی اخلاقی آدرشوں کے تابع ہونی چاہیے۔ زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا اطلاق ہونا چاہیے۔ گاندھی جی کی معیشت صرف دولت کی سائنس ہے بلکہ اس کا اخلاقی اور روحانی مقصد بھی ہے جو سماج کی اخلاقی اور روحانی ضرورتوں کے مطابق وضع کی گئی ہے۔ جیسا کہ انھوں نے کہا تھا ”میں معیشت اور اخلاقیات میں کوئی شدید حد فاصل نہیں کھینچتا۔ ایسی معیشت جس سے فرد یا قوم کے اخلاقیات کو نقصان پہنچے وہ معیشت بد اخلاقی اور نقصان پر مبنی ہے۔“ ان کی معاشی حکمت عملی کا مقصد زندگی سے غریبی کو دور کرنے اور زندگی کو بہتر بنانا ہے جس میں فرد اور قوم دونوں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ نظریہ جامع اور وسیع نظریات پر مبنی ہے۔ جب معاشیات کے ماہرین مجموعی ترقیاتی پیداوار کی پیش رفت، سرمایہ کی ترغیب کی تکنالوجی، مرکزی منصوبہ کاری، شہریت اور توانائی کے اخراجات وغیرہ سے متعلق امور پر بحث کرتے ہیں تو اس کا جواب گاندھیائی نظام میں انھیں ملتا ہے۔ گاندھی جی کے مطابق بھارت کو ایک ایسے معاشی نظام کی ضرورت ہے جو خودداری اور خود کفالتی پر مبنی ہو

اور جس سے انسان کی بنیادی قدروں کی تکمیل ہوتی ہو۔ گاندھی جی کی زندگی ایک ناقابل تقسیم ”کل“ تھی اور ان کی زندگی کی پوری سرگرمیاں ایک دوسرے سے مربوط تھیں اور سبھوں کو انسانیت کے دائرے میں ترقی کرنے کا حق حاصل تھا۔ (دیکھیے ۱۱ ستمبر ۱۹۲۴ء کا ینگ انڈیا کا شمارہ)

گاندھی جی کے اہم معاشی پروگراموں میں اول اور سب سے اہم پروگرام گاؤں کی زندگی کو ایک نئی روح عطا کرنا تھا۔ گاندھی جی نے گرام پنچایتوں کے نظام کو پھر سے متحرک کرکے معاشیات اور سیاسیات کی قوت کو لامرکزی بنانے پر زور دیا تھا تاکہ گاؤں کو اپنی حکومت، اپنے سماج اور اپنی ترقی کا موقع ملے اور وہ خود اپنے حالات کو بہتر بنانے کی سمت کام کرسکے، ان کا خیال تھا کہ صنعتی سماج میں گاؤں کے مفادات کا استحصال ہوا ہے اس لیے بھارت میں اس کے تجربے کی ضرورت کو وہ نظر انداز کرتے تھے۔

دادا بھائی نوروز جی نے بیرونی قوتوں کو بھارتیوں کے ذہن بدلنے کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ لیکن گاندھی جی اس کے لیے دونوں قوتوں کو مورد الزام قرار دیتے تھے جو اندرونی اور بیرونی قوتوں پر مشتمل تھے۔ گاندھی جی کے مطابق اس استحصال کے لیے بھارتی بھی برابر کے شریک کار تھے۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے ۱۹۲۱ء میں یوں کیا تھا ”ہمارے شہروں پر ہی بھارت مشتمل نہیں ہے۔ شہری افراد یوروپ، امریکہ اور جاپان کے بڑے گھرانوں کے کمیشن ایجنٹ اور دلال ہیں۔ شہر کے لوگوں نے ان کے ساتھ ۲۰۰ برسوں سے سانٹھ گانٹھ کر رکھی ہے جس کی وجہ سے دیگر علاقے کے لوگوں کی حالت زار انتہائی خراب ہوتی رہی ہے۔“

غریبی کو دور کرنے کی وہاں شدید ضرورت ہے جس کو گاؤں کہتے ہیں۔ گاؤں کی ضرورت بہت کم باتوں پر مبنی ہوتی ہے۔ گاؤں کی ضرورتوں میں سب سے اہم روٹی، پانی، کپڑا، مکان، تعلیم، حفظان صحت اور دوا ہیں اور گاندھی جی یہ سہولتیں گاؤں کو فراہم کرنے کی ضرورت پر زور دیتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہم آدرش واد گاؤں کے باسی چاہتے ہیں جو ہیں بھی اور نہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کیا کھاتے ہیں اور کیسا کھاتے ہیں انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ انھیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ انھیں ایک اصولی خوراک کی ضرورت ہے۔ ان کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے انھیں کام چاہیے اور یہ کام انھیں فراہم کیے جائیں۔ انھیں بھیک یا امداد یا خیرات نہیں، کام چاہیے۔

گاندھی جی کا دیہی نظریہ ان کے ستیہ اور اہنسا کے نظریہ پر مبنی تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے نام ایک مکتوب میں انھوں نے لکھا تھا ”مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اگر بھارت کو اور دنیا کو بھی آزادی حاصل کرنی ہے تو صحیح معنی میں دیر یا سویر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ لوگوں کو گاؤں میں رہنا ہوگا، شہر میں نہیں، انھیں جھونپڑیوں میں

رہنا ہوگا، قصبوں کے محلوں میں نہیں۔ گاندھی جی کا زور (الف) گاؤں پر مبنی معیشت (ب) سادہ زندگی (ج) امداد باہمی اور سماجی معیشت (د) اور سودیشی پر تھا۔ ظاہر ہے کہ ان سے ایسا لگتا ہے کہ گاندھی جی غریبی کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ گاندھی جی غریبی کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کے خیال میں غریبی، مفلوک الحالی کا مطلب کم از کم ضرورتوں کی فراہمی ہے جس کی وجہ سے انسان کی قدریں گھٹ جاتی ہیں۔ ایسی مفلوک الحالی سے کوئی بھی اعلا زندگی حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ زندگی کے معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کی فکر بھی اسی طرح غیر انسانی بنا دیتی ہے جس طرح غریبی۔ اس سے انسان میں زندگی کے تئیں تجارتی نقطۂ نظر پیدا ہو جاتا ہے اور ہر جگہ وہ نفع و نقصان کی بات سوچتا ہے۔ اس کی خواہشیں لامحدود ہونے لگتی ہیں جو لالچ کی حد تک پہنچ جاتی ہیں اور یہ بادشاہت، استحصال اور جنگ کی طرف رہنمائی کرنے لگتی ہیں۔ خواہشات میں رضاکارانہ طور پر کٹوتی مسرت کی بات ہوتی ہے اور لامحدود خواہشات اندیشے اور فکر کا موجب قرار پاتی ہیں۔

گاندھی جی نے کہا تھا" میں نے سنا ہے کہ میرے ہم وطن یہ کہتے ہیں کہ ہم امریکہ سے اتنی دولت حاصل کریں گے۔ لیکن ایسا کہتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ اس دولت کو حاصل کرنے کے طریقۂ کار کیا ہیں۔ میں انھیں یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر ایسی کوشش کی گئی تو اس کا نتیجہ ناکامی پر ختم ہوگا۔" یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گاندھی جی چاہتے تھے کہ عوام اعلا معیارِ زندگی کے خبط سے گریز کریں تاکہ ایک مستحکم اور مطمئن سوسائٹی کی ضمانت دی جا سکے۔ گاندھی جی کی معیشت معاشی تفکر، محنت کے تقدس اور معاشی منتقلی کی سوچ پر مبنی تھی جو رسکن کے "آخر کار" معاشی نظام سے مستعار تھی۔ رسکن نے کہا تھا "فرد کی اچھائی جماعت کی اچھائی میں ہے، ایک وکیل کا کام اتنا ہی قابل قدر ہے جتنا قابل قدر ایک حجام کا کام ہے۔ دونوں کو زندگی بسر کرنے کے لیے کام کی ضرورت ہے، مزدور کی زندگی جو کھیت جوتنے کے لیے ہل چلانے اور دست کار کی زندگی دست کاری تک محدود ہیں یہ بھی زندگی بسر کرنے کے لیے ہی ہیں۔ پھر ان میں قدروں کی بڑائی یا چھوٹائی کہاں ہے۔" گاندھی جی کا نظریہ سودیشی وسائل پر مبنی زندگی کی سادگی پر قائم ہے۔ وہ ایک حساس انسان تھے۔ انھیں آدمی کی کنجوس طبیعت کا احساس تھا۔ وہ آدمی کی اس فطرت کو جانتے تھے چاہے یہ ملک کے لوگوں کی بات ہو یا ملک کے باہر کے لوگوں کی۔ وہ دونوں کی فطرت کو جانتے تھے۔ انھیں فکر تھی تو اس کی کہ یہ اندازِ زندگی اور ترقی کا طریق کار سماج کو اس کی مرکزیت سے کہیں دور نہ کر دے اور کہیں فرد کا تقدس پائمال نہ ہو جائے۔

گاؤں کی صنعتیں

گاندھی جی گاؤں کے خود کفیل ہونے کے اصول کی جستجو میں صنعت پر اعتماد کرتے تھے لیکن گاؤں کی صنعت کاری کا ان کا نظریہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے تھا۔ کھادی اور گاؤں کی صنعتیں معاشی آزادی اور مساوات کی علامتیں تھیں۔ معاشی پروگراموں کا سب سے اہم مقصد مکمل روزگار فراہم کرنے، غریبی ہٹانے اور مساوی سماج کے تخلیق کرنے سے تھا۔ گاؤں کی صنعتوں میں یہ تمام مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ معیشت کا فروغ وسائل کی بنیاد پر ہوگا یعنی کم سرمایہ اور زیادہ مزدوری چوں کہ گاؤں میں مزدوروں کی بہتات ہے اور معیشت کو روزگار کی فراہمی کے زیادہ مواقع حاصل ہیں یعنی جو کام کرنے کے قابل ہیں انھیں کام ملیں گے۔ دوسری بات یہ کہ گاؤں کی صنعتوں کے فروغ سے جدید مشینوں کے استعمال میں کمی ہوگی اور صنعت کاری کے تیزی سے پھیلاؤ کے امکان میں کٹوتی بھی۔ گاندھی جی مشین کے مخالف نہیں تھے۔ ۱۹۳۵ء میں انھوں نے لکھا تھا کہ گاؤں کی صنعتیں مشینوں کے استعمال کو روکیں گی، جن سے کام کے متلاشی لوگوں کی بے روزگاری کو خطرہ ہو سکتا ہے لیکن یہ مشینیں افراد کی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے میں یہ ان مزدوروں کو غلام بنائے بغیر تعاون کر سکتی ہیں۔ اگر گاؤں کے ہر ایک گھر میں بجلی فراہم ہو جائے تو مجھے مشینوں کے چلانے کے لیے بجلی کے استعمال میں کوئی حرج نہیں دکھائی دیتا۔ (ہریجن، ۲۲-۶-۱۹۳۵) اس سلسلے میں آگے وہ کہتے ہیں "ہمیں بے جان مشینوں کو جاندار مشینوں کا متبادل نہیں بنا لینا چاہیے۔ ایسی جاندار مشینیں بھارت کے دور دراز گاؤں میں پھیلی ہیں۔ مشین کا استعمال اچھا ہے اگر یہ مزدور کی مدد کرتی ہیں اور ان کے کام کے طریق کار کو آسان بناتی ہیں۔ لیکن آج مشینوں کا استعمال دولت بٹورنے کے لیے ہوتا ہے اور یہ دولت چند گھرانوں کی جیب خاص میں جاتی ہے۔ لیکن وہ کروڑوں لوگوں کی طرف نہیں دیکھتے جن کی روزی روٹی ان مشینوں نے چھین لی ہیں۔" (ہریجن ۱۵-۹-۱۹۳۵)۔

گاندھی جی گاؤں کی صنعتوں کو ترجیح اس لیے دیتے تھے کہ اس کے معاشی، سیاسی اور سماجی امکانات ہیں۔ ہم یہاں چند بنیادی باتوں کا ذکر کر سکتے ہیں جو گاؤں کی چھوٹی صنعتوں کے فروغ کے لیے انتہائی موزوں ہیں۔

(۱) اکثر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ترقی کا دارو مدار بچت کی شرح ہے اور بچت کی شرح منافع پر منحصر کرتی ہے اور یہ منافع میں اضافہ کرتی ہے۔ اس لیے سرمایہ پر مبنی پیداوار چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے برتر ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ماہرین معاشیات بائیر اور یامے کے نظریات کو پیش نظر رکھا جائے جن کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ تکنیکی کارکردگی اور معاشی کارکردگی میں ایک غلط فہمی مشترک ہے۔ ایسی تکنیک کی سفارش کوئی انصاف کی بات نہیں ہے جو تکنیکی لحاظ سے اہم ہو لیکن مقامی لوگوں کی تکنیکی کامیابیوں کی سطح پر غیر مناسب اور ذرائع کے لحاظ سے بے کار ہو ــــ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے ہونے والی آمدنی چوں کہ غریبوں کو جائے گی اس سے ان کی صحت اور کام کے معیار میں بھی بہتری ہوگی جو افرادی سرمایہ ہے اور یہ سرمایہ قدرتی سرمایہ سے شاید زیادہ اہم ہے۔

(۲) گاندھی جی کا نظریہ کھادی کے ماہرین معیشت تکنیکی ماہرین اور سائنس دانوں کے نظریہ سے مستعار نظریہ ہے۔ ہاں یہ بات صحیح ہے کہ گاندھی جی نہ تو ماہر معاشیات تھے اور نہ ہی ٹکنالوجسٹ نہ ہی وہ خواہشات کی زیادتی پر ہی یقین رکھتے تھے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ وہ سادہ زندگی بسر کرتے پر دشواس کرتے تھے۔ وہ ایسی تکنیک اپنانے کے حامی تھے جو آدمی کی کم سے کم ضرورتیں پوری کرتی ہوں اور جن سے ان کا استحصال نہ ہوتا ہو کیوں کہ صنعتی تہذیب میں استحصال کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

کھادی کا خواہ معاشی پیمانہ کوئی نہ ہو لیکن یہ

ملک کی معاشی آزادی اور تمام لوگوں کی برابری کے نظریے کا نقطۂ آغاز ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مکمل طور پر دیسی ذہنیت پر مبنی ہے اور اس کا بھارتی زندگی کی تمام ضروریات سے تعلق ہے۔ گاندھی جی کے مطابق کھادی بھارتی عوام کی ایکتا معاشی آزادی اور برابری کی ایک علامت ہے۔ اس لیے بقول جواہر لال نہرو یہ بھارت کی آزادی کی شہ رگ ہے۔

(۳) سرمایہ پر مبنی ٹکنالوجی سے صنعت کاری کے طریقۂ کار میں دوہری معیشت پیدا ہوگی اور بقول شوماخر جدید ترین خیالوں کے یہ جزیرے ایک قبل۔ صنعتی سماج میں مربوط نہیں کیے جا سکتے۔ بلکہ یہ اس کی ہم آہنگی کو تباہ کر دے گی۔ ایک ترقی یافتہ ملک میں بھی خوشحالی، ترقی اور ناکامی، بے روزگاری اور سماجی کشیدگی کا وجود ثابت کرتا ہے کہ اس میں سماجی تحفظ اور بڑے پیمانے کی پیداوار کا کوئی زیادہ میکانکی نتیجہ برآمد ہوا ہو" (گالبریتھ)

(۴) سوشلزم اور کیپٹل ازم میں خرابی یہ ہے کہ دونوں مادی دولت حاصل کرنے پر زیادہ زور دیتی ہیں، جس میں سرمایہ دار اپنے لیے اور سماج واد جماعت کے تمام لوگوں کے لیے دولت جمع کرتے ہیں۔ چناں چہ یہ دونوں طبقے پیداوار کے ایسے طریقے اپناتے ہیں جن میں مزدوروں کا استحصال ہوتا ہے۔ سرمایہ داری سے دولت کی ہوس کا اضافہ ہوتا ہے اور یہیں سے معاشی تکرار شروع ہوتی ہے اور اس طرح سماج واد اجتماعیت کو جنم دیتا ہے، جس میں فرد کی آزادی تباہ ہو جاتی ہے۔ گاندھی جی کی چھوٹی سی دنیا میں عام آدمی کی آزادی نہ صرف باقی رہے گی بلکہ یہ اتنی ترقی یافتہ اور منقسم ہوگی کہ اس میں سبھوں کو کام اور زندگی بسر کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوگا اور اس سے پیداوار کی لامرکزیت اور ضرورت زندگی کی تقسیم کے حالات بہتر ہوں گے۔

(۵) معاشی بہتری مزدوروں کی بچت کے سازوسامان میں اضافہ کا دوسرا نام نہیں ہے۔ اس کی بھی کچھ حدیں ہیں، جن سے زندگی کو قوتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جسمانی محنت کی بعض حد ہر آدمی کے لیے اچھی بات ہے لیکن اس کے لیے اسے بڑا دانشور ہونا چاہیے۔ پروفیسر کارل مان ہائم کے مطابق "صنعت کاری کی زیادتی ایک ایسا عمل ہے جو سماج کے تئیں انصاف کو مفلوج بنا دیتا ہے۔"

(۶) انصاف پر مبنی سماج کی وکالت سماجی اور معاشی ہونی چاہیے۔ یہ مقولہ "چھوٹا خوب صورت ہے" آج بہت مقبول ہے۔ گاندھی جی زراعت پر مبنی چھوٹی صنعت کی تشکیل کی وکالت کرتے تھے جس میں آدمی اور قدرت کے درمیان ایک ایسا تال میل ہوتا ہے کہ اس میں جنگل یا نی پر مبنی سماج کا بحران نہیں ہوتا۔

(۷) گاندھی جی کھادی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے فروغ میں دوہری ذہنیت سے بچنے کے لیے حق بہ جانب تھے۔ دوہری ذہنیت جو کہنے کو پیداوار ہے لیکن جس میں قدروں کا نقصان ہوتا ہے اور جس میں تربیت کے مواقع ختم ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ کھادی اور گاؤں کی صنعتیں لالچ، نابرابری اور مایوسی کو دور بھگا دیں گی اور اس سے گاؤں میں رہنے والوں کو اپنی غریبی دور کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے۔ سوت کی کتائی بُنائی سے کافی پیداوار حاصل ہو گئے اور یہ پیداوار گھروں میں ہو گئے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گاندھی جی کو بڑی صنعتوں سے انکار تھا یا انھیں وہ مسترد کرتے تھے۔ بڑی صنعتیں جن میں زیادہ پیداوار حاصل ہوتی ہے انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سب سے اہم مسئلہ چھوٹے اور بڑے پیمانے کی پیداواری یونٹوں کے درمیان توازن کا برقرار رکھنا ہے۔ جیسا کہ سرمایہ اور محنت کی تکنیک کے ساتھ ہوتا ہے۔ محنت سے متعلق عالمی ادارہ نے کہا ہے "ایسے رشتوں کے تمام معاشی اور تکنیکی امکانات کا مقصد چھوٹے اور بڑے پیمانے کی صنعتوں کے فروغ اور منصوبہ کاری کا اہم ترین پہلو ہو سکتا ہے" گاندھی جی اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ بڑے پیمانے کی صنعتوں کو افراد کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑ دینا چاہیے بلکہ ان کے انتظامات وغیرہ حکومت کی ذمہ داری ہونی چاہیے اگرچہ وہ سماج واد پر زیادہ یقین نہیں رکھتے تھے، لیکن استحصال کو روکنے کے لیے یہاں تک سمجھوتہ کے لیے تیار رہتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں گاندھی جی نے کہا تھا کہ جواہر لال نہرو صنعت کاری چاہتے ہیں کیوں کہ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ سماج واد پر مبنی ہوگی تو یہ سرمایہ داری کی تمام برائیوں سے آزاد ہوگی۔ میرا بھی خیال ہے کہ صنعت کاری میں برائی موروثی ہوتی ہے اور کوئی بھی سماج واد اس برائی کو ختم نہیں کر سکتا۔"

امانت

گاندھی جی کا ایک اور نظریہ جسے غلط سمجھا گیا وہ نظریہ "امانت کا اصول" ہے۔ یہ سرمایہ داری اور سماج واد کے نظریہ سے مشتق ہے۔ سرمایہ داری یا پونجی واد میں مالک ٹیکسوں کے نظام کا پابند ہوتا ہے اور یہی اس کے منافع کا محافظ بھی ہے۔ سماج واد یا مساوات پیداوار کے تمام وسائل کو قومیا کر نجی ملکیت کو گرفت میں لے لیا جاتا ہے۔ قومی تحویل میں لینے کے بعد افسر شاہی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس سے پیداواری مقابلہ رک جاتا ہے اور ذاتی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اور صنعتی اور معاشی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ امانت یا ٹرسٹی شپ کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کو خود کو امین سمجھنا چاہیے، جو دولت اس نے حاصل کی ہے یہ اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ یہ قوم کی امانت ہے جس کا وہ صرف امین ہے مالک نہیں۔ اس دولت میں سے ایک چھوٹی سی مقدار اپنی نجی ضرورت کے لیے وہ لے سکتا ہے لیکن باقی رقوم سماج کی ضرورت کے مطابق اور ان کے مقاصد سے استعمال کے لیے ہونے چاہئیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ نجی ضرورت اس کی کم از کم ضرورت کا بارہواں حصہ ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ امانت یا ٹرسٹی شپ کا نکتہ معاشی نظریے کے تابع نہیں ہے کہ اس سے سماجی بدلاؤ کی بات کی جائے۔ اہنسا اور عدم تشدد کے نظریے کے حامل ہونے کے لیے وہ غلط کام کرنے والوں کو اس کا موقع دیتے ہیں کہ وہ اپنی اصلاح کر لیں۔ اس تکنیک سے ایک انقلاب آئے گا۔ گنر مائرڈل کے نظریے کے مطابق بھی یہ خیال عملی نظریے پر مبنی ہے اور یہ تشدد کو رد کرتا ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ امیر لوگ اپنی طبیعت سے اپنی دولت چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اگر یہ تکنک کامیاب نہ بھی ہو تو بھی اس کی ملکیت تقسیم ہو جائے گی اور یہ پھر اس سماج کے ذریعہ ممکن ہے جس میں وہ ہوتے ہیں نہ کہ حکومت کی طرف سے۔

انھوں نے جائداد کے مالکوں کو سخت لفظوں میں تاکید کی تھی جو حسب ذیل ہے۔

اگر موجودہ ملکیت رکھنے والوں کا طبقہ اپنے آپ کو امین یا امانت دار نہیں سمجھتا تو حالات اس کو اصلاح کے لیے مجبور کریں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس کا متبادل انتہائی تباہی ہو۔ زمین داروں کی موجودہ قوت، سرمایہ داروں کا موجودہ ظلم اور راجاؤں کی ملک گیری کی ہوس تب تک پھلتی پھولتی رہیں گی جب تک عام آدمی اپنے حقوق سے انجان ہیں، انھیں اپنی قوتوں کا پتا نہیں ہے۔ اگر لوگ زمیں داروں اور سرمایہ داروں کے زمیں داری نظام کی برائیوں کی مخالفت کریں تو یہ اپنی موت آپ مر جائیں گی۔" (ہریجن ۱۹۴۷۔۵۔۲۵)

امانت داری کے نظریہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ انسان کی اچھائیوں پر بے پناہ یقین رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں ہر امیر یا غریب خواہ وہ کہیں بھی ہو اچھائی اس کی وراثت میں ہوتی ہے۔ اگر مواقع دیے جائیں تو وہ اپنی ذمہ داری کو یقیناً سمجھیں گے اور انسان کی طرح سلوک کریں گے۔ سوشلسٹوں کی طرح گاندھی جی بھی تمام استحصال کے خاتمے کے بعد ایک ایسے سماج کی تخلیق چاہتے تھے جس میں طبقہ واریت نہیں ہو۔ وہ بد ترین استحصال کرنے والوں کو اس کا موقع دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنے طریقہ کار میں تبدیلی لائیں استحصال، ناانصافی، غلط کاری اور فریب کاری کا نظریہ چھوڑ دیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا "سوشلسٹوں سے میری بنیادی مخالفت ظاہر ہے۔ میں انسان کی فطرت کی تبدیلی پر یقین رکھتا ہوں اور اس کے لیے کوشاں ہوں، لیکن سوشلسٹ اس کو نہیں مانتے۔"

اختلافات

اس سلسلے میں ہم سوشلسٹوں کے آئین اور گاندھیائی معاشی اصولوں کے اختلافات کی طرف نشاندہی کر سکتے ہیں۔ سائنسی زبان میں سماج واد کی تشریح دو وسیع معنوں میں کر سکتے ہیں۔ پہلے معنی میں پیداوار کے وسائل کی سماجی ملکیت اور دوسرے معنی میں آمدنی کی مساوی تقسیم۔ جہاں تک آمدنی کی مساوی تقسیم کا تعلق ہے تو گاندھی جی اس معاملے میں سوشلسٹوں سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ انھوں نے خود کہا تھا "سوشلزم ایک خوبصورت لفظ ہے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے سماج واد میں سماج کے تمام اراکین برابر ہیں۔ نہ کوئی بڑا ہے نہ کوئی چھوٹا۔ انفرادی تنظیم میں سربراہ بڑا نہیں ہے کیوں کہ یہ تنظیم یا جسم کا سب سے بلند حصہ ہے۔ یا جوتے میں ایڑی چھوٹی ہے اس لیے کہ یہ سب سے نیچے ہے۔ جب جسم کے تمام اعضاء برابر ہیں اور ان کی جوڑ سے کوئی چھوٹا یا کوئی بڑا نہیں ہے تو پھر سماج میں یہ چھوٹے بڑے کا احساس غیر ضروری کیوں ہے۔؟ یہی سماج واد ہے۔ یہی برابری ہے۔" گاندھی جی نے صاف طور پر کہا ہے کہ ان کا نظریہ دولت کی برابر تقسیم پر قائم ہے۔ وہ کہتے ہیں "میرا نظریہ برابر کی تقسیم ہے لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسے ایسا سمجھا نہیں گیا ہے۔ چناں چہ میں برابر کی تقسیم پر کام کرتا ہوں۔" ینگ انڈیا (۲۷۔۳۔۱۷) اس لیے وہ چاہتے تھے کہ یہ نابرابری معقول طور پر کم ہو کر ۱۲ گنا کم ہو جائے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ آمدنی کی نابرابری کو ختم کرنے کے حق میں تھے بلکہ وہ ایک ایسے ملک کا تصور پیش کرتے تھے جس میں ضروریات زندگی سبھوں کو حاصل ہوں۔ "میرے خواب کا سوراج (آزادی)" میں انھوں نے کہا تھا کہ مجھے ذرا بھی شک نہیں ہے کہ مکمل آزادی تب تک ممکن نہیں ہے جب تک اس کے تحت آنے والوں کو ضروریات زندگی کی ضمانت نہ ملتی ہو۔"

لیکن جب پیداوار کے وسائل کی سماجی ملکیت کی بات کرتے ہیں تو گاندھی جی کا نظریہ سوشلسٹ مخالف نظریہ سمجھ میں آتا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ پیداوار کے وسائل کی سماجی ملکیت تو بھی واد سماج کی تمام برائیوں کو دور کر دیں گی جیسا کہ انھوں نے کہا تھا "میں حکومت کی طاقت کو خوف کی نظر سے دیکھتا ہوں کیوں کہ استحصال کی کمی کی اچھائی سے یہ انفرادیت کو تباہ کر کے انسانیت کو زبردست نقصان پہنچا رہی ہے جس کی جڑیں ترقی کی گہرائی میں پیوست ہیں۔" اس کے آگے انھیں اس بات کا اندیشہ تھا کہ حکومت منظم تشدد کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس لیے انھوں نے پیداوار کے وسائل کو بھی ملکیت کی بنیاد پر معاشی اختیارات کی تقسیم کو ترجیح دی تھی۔ گاندھی جی سماج وادی فلسفہ اور طریقہ کار کے بھی مخالف تھے۔ سوشلسٹوں کی مادہ پرستی نے ایسے اسکول قائم کیے جن میں مادی پیش رفت زندگی کی منزل قرار پاتی ہے۔ اس سے زندگی کی اچھائی کھو گئی۔ اس طرح گاندھی جی سماج وادی طریقہ کار کے بھی مخالف تھے۔ سماج واد کے پیرو تشدد پر یقین رکھتے ہیں اور یہ طبقاتی جنگ کے نظریہ سے پیدا ہوا ہے جس کے ذریعہ مارکس نے عوام کے مختلف طبقوں کے درمیان تعلقات کی ترجمانی کی ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے قبل ذکر کر چکے ہیں کہ گاندھی جی فرد کی انتہائی اچھائیوں پر یقین رکھتے تھے اس لیے وہ نفرت یا طبقاتی جھگڑوں سے سماج کو بدلنے یا ترقی کرنے کے نظریہ کے حامی نہیں تھے۔ ان کے لیے وسائل کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی اہمیت منزل کی ہوتی ہے اور ایک لحاظ سے یہ اور بھی اہم ہے کیوں کہ انسان کو اپنے آپ پر اختیار حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ منزل کا اس کے سامنے کوئی پتا نہیں رہے گا اگر اس نے وسائل پر اپنے اختیارات کھو دئیے۔

گاندھی جی کے مطابق کوئی تشدد کے راستے سے عدم تشدد تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔ تشدد سے تشدد ہی پیدا ہوتا ہے۔ سچائی تک پہنچنے کے لیے جھوٹ کا راستہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح بھیڑ بھاڑ اور لاقانونیت کے عہد میں نہ آزادی کی حاصل ہو سکتی ہے نہ مساوات کے مواقع حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ سماجی انصاف مل سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تشدد کے دور میں جہاں سچائی متاثر ہوتی ہے، نفرت کی جیت ہوتی ہے اور جہاں پیار کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا وہاں یہ مناسب ہی ہے کہ سوشلسٹوں نے اپنے نظریے میں بڑی تبدیلی کی اور جو کچھ اچھا تھا اسے قبول کیا۔ خاص طور پر کمیونسٹ سلطنت کے زوال کے بعد۔ گو کہ اس لائحہ عمل کے دوران انھیں کٹر مارکسیت سے بڑی حد تک انحراف کرنا پڑا۔

شراکت کی معیشت

مذکورہ جائزہ سے گاندھیائی نظام کے معاشی ڈھانچہ کا پتا چلتا ہے۔ گاندھی جی عدم تشدد پر مبنی سماج چاہتے تھے جس میں امداد باہمی کی معیشت کے ذریعہ سماج کی تشکیل کی جا سکتی ہے

باقی صـ۳۳ پر

کھادی اور دیہی صنعتیں

گاندھی جی کا تعمیری پروگرام

ایک مختصر مگر انتہائی اہم کتابچہ "تعمیری پروگرام۔ مفہوم اور مقام" کے پیش لفظ میں گاندھی جی نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو بہت ہی زور دے کر کہا تھا کہ "یہ پروگرام مکمل سوراج حاصل کرنے کا سچا اور عدم تشدد پر مبنی راستہ ہے۔" ان کے تعمیری پروگرام کی روح یہ تھی کہ ہر شخص خواہ اس کا تعلق کسی سطح سے کیوں نہ ہو اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے اپنے جسمانی، دماغی اور مادی وسائل کو پوری طرح روبہ کار لائے۔

بیرونی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کی جدوجہد میں جب سے گاندھی جی نے ہندوستانی عوام کی قیادت سنبھالی، خلافت اور عدم تعاون کی تحریکات سے گذر کر انھوں نے کھادی کو اپنے پروگرام کا لازمی جزو بنالیا۔ انھوں نے اس پروگرام کو (بعد میں دیہی صنعتوں کی ترقی کے اس سے جڑے ہوئے پروگرام کو بھی) کتنی زیادہ اہمیت دی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اگرچہ عام طور پر کسی تنظیم کا عہدیدار بننا پسند نہیں کرتے تھے تاہم انھوں نے ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا اسپنرز ایسوسی ایشن (بنکر ایسوسی ایشن) کی تشکیل کے بعد سے ہی اس کا تاسیسی مدر بننا منظور کر لیا اور یہ تعلق زندگی کے آخری لمحوں تک برقرار رہا۔ اسی طرح ۱۹۳۴ء میں جب آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا تو انھوں نے اس کا اعلا عہدیدار بننا منظور کر لیا اور اس ادارے کے ساتھ بھی ان کا تعلق آخری سانس تک برقرار رہا۔ عوامی شرکت پر مبنی اس پروگرام کو وہ اتنی اہمیت دیتے تھے کہ وہ ان دونوں اداروں کی کبھی بھی میٹنگ میں شرکت کا موقع کم ہی ہاتھ سے جانے دیتے تھے اور واقعہ تو یہ ہے کہ وہ اس میدان میں سرگرم کارکنوں کی رہنمائی اور انھیں صلاح و مشورہ دینے کے لیے وقت نکال ہی لیا کرتے تھے حالاں کہ وہ انتہائی مصروف ترین شخص تھے۔

انھوں نے اپنے تعمیری پروگرام میں ان دونوں پروگراموں کو بہت ہی باوقار مقام دے رکھا تھا۔

غلط ترجمانی سے بچنے کے لیے خواہ ایسا جدیدیت، سائنس اور تکنالوجی وغیرہ جیسے بلند آہنگ الفاظ کے استعمال کی بنیاد پر ہی ہوسکتا ہو مناسب یہ ہوگا کہ اس ضمن میں اس فلسفہ اور اس آئیڈیالوجی کے تعلق سے مہاتما گاندھی کی اپنی رائے پیش کر دی جائے، جس سے انھیں کھادی پروگرام شروع کرنے کی تحریک ملی تھی۔ انھوں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ ان کے اپنے ہی خیالات کو ہی پیش کر دیں خواہ اس کے نتیجہ میں ہمیں جانب داری برتنے کے الزام کا خطرہ ہی کیوں نہ مول لینا پڑے۔

اس کتابچے میں کھادی کی آئیڈیالوجی اور فلسفے کی مزید تشریح کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ "یہ ملک کے تمام لوگوں کی معاشی آزادی اور مساوات کے آغاز کی مظہر ہے۔ ۔ ۔ کھادی کو اس کے تمام مضمرات کے ساتھ لیا جانا چاہیے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے ایک جامع سودیشی ذہنیت، زندگی کی تمام ضروری اور بنیادی اشیا کو خود ہندوستان میں پالینے کا عزم اور وہ بھی گاؤں کے لوگوں کی محنت اور ان کی ذہانت کے ذریعہ، اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ سلسلۂ عمل کو الٹ دیا جائے یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان کے سات لاکھ گاؤں کی تباہی و بربادی ان کے استحصال پر زندہ ہندوستان اور برطانیہ عظمیٰ کے نصف درجن شہروں کے بجائے ہندوستانی دیہات کو خود کفیل بنایا جائے جو نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے شہروں کی ضرورتوں کی رضاکارانہ طور پر تکمیل کریں گے بلکہ دونوں فریقوں کے لیے سودمند ہونے کی صورت میں وہ باہر کی دنیا کی خدمت بھی کرسکیں گے۔

"۔ ۔ ۔ کھادی کے مضمرات کی تشریح کے بعد میں لازمی طور پر یہ بتانا چاہوں گا کہ کانگریس والے لوگوں کو اسے فروغ دینے کے لیے کیا کچھ کرنا چاہیے اور وہ کیا کچھ کرسکتے ہیں۔ کھادی کی تیاری میں کپاس کی کاشت، اس کا چننا، بیج اور ریشوں کو الگ کرنا اس کی صفائی ستھرائی، دھنائی، کتائی، سائزنگ، رنگائی، تانے اور بانے کی تیاری، بنائی اور دھلائی شامل ہے۔ دھلائی کے علاوہ یہ سارے مراحل لازمی ہیں۔ ان سارے مراحل سے گاؤں میں موثر انداز سے نمٹا جاسکتا ہے اور بہت سے گاؤں میں جہاں آل انڈیا اسپنرز ایسوسی ایشن کے لوگ سرگرم ہیں ایسا ہو بھی رہا ہے۔"

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ مذکورہ بالا پیراگراف میں "کانگریس کے لوگوں" سے مراد موجودہ تناظر میں کھادی کارکنوں سے ہی ہے۔

کھادی کا اس سے پہلے تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا "لاکھوں لوگوں کو زراعت کے تکملہ کے طور پر ایک اور سادہ و آسان صنعت کی ضرورت ہے۔ برسوں پہلے کتائی کو گھریلو صنعت کی حیثیت حاصل تھی اور اگر لاکھوں لوگوں کو بھوک مری سے بچانا ہے تو انھیں اس لائق بنایا

جانا چاہیے کہ وہ اپنے گھروں میں کتائی کو دوبارہ رائج کر لیں اور ہر گاؤں میں اس کے بنکر پائے جانے لگیں۔"
(ینگ انڈیا ۱۹۲۰۔ ۷۔ ۲۱)

کتائی کے وسیع تر امکانات کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ (۱) یہ ان تمام لوگوں کو فوری کام مہیا کرتی ہے جن کے پاس فاضل وقت ہو اور جنھیں پیسوں کی ضرورت ہو۔ (۲) ہزاروں لوگ اس سے واقف ہیں۔ (۳) اسے آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے۔ (۴) اس کے لیے عملاً سرمایہ کاری کی ضرورت نہیں پڑتی (۵) چرخہ آسانی سے اور سستے داموں پر بنایا جا سکتا ہے (۶) لوگ اس میں کوئی کراہیت نہیں محسوس کرتے (۷) قحط اور قلت کے زمانے میں یہ فوری راحت بہم پہنچاتا ہے۔ (۸) بیرونی کپڑوں کی خریداری کے لیے جو دولت ہندوستان سے باہر جاتی ہے اس کے ذریعہ اس پر روک لگائی جا سکتی ہے۔ (۹) اس طرح لاکھوں، کروڑوں کی جو رقم بچائی جا سکتی ہے اسے ان غریب لوگوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو حقیقی معنوں میں اس کے مستحق ہیں (۱۰) اس سلسلہ میں ملنے والی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی بھی لوگوں کے لیے خاصا بڑا فائدہ بن سکتی ہے۔ (۱۱) لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کا یہ ایک بڑا وسیلہ ہے۔" (ینگ انڈیا ۱۹۴۴۔ ۸۔ ۲۱)

آج کی طرح پہلے بھی کھادی کے پروگرام کی اس بنیاد پر تنقید کرنے والے لوگ موجود تھے کہ اس کے ذریعے کتائی کرنے والوں کے لیے کم سے کم اجرت (یعنی ایسی اجرت جو بنیادی ضرورتوں کی کفالت کر سکے) کی فراہمی ممکن نہیں ہے۔ گاندھی جی نے ہاتھ کی کتائی کو مکمل روزگار کے روپ میں نہیں دیکھا تھا یہ کام خالی وقت میں اور اپنے گھر میں کیا جانا تھا۔ جیسا کہ گاندھی جی کے درج ذیل تین اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے۔

"ینگ انڈیا کے پڑھنے والے یہ جانتے ہیں کہ میں نے یہ مشورہ کبھی نہیں دیا کہ وہ لوگ جنھیں بہتر روزگار حاصل ہے وہ اپنے اس بہتر اور منافع بخش روزگار کو ترک کر کے ہاتھ سے کتائی کا کام اختیار کر لیں۔ میں نے یہ بات بار بار کہی ہے کہ چرخہ سے صرف کاتنے کے کام کی توقع انہی لوگوں سے کی جاتی ہے جن کے پاس آمدنی والا کاروبار نہ ہو اور وہ بھی یہ کام اس وقت کریں جب وہ فارغ ہوں اور جب وہ بے روزگار ہوں چناں چہ جن لوگوں سے کتائی کے کام کی توقع کی جا سکتی ہے وہ صرف دو طرح کے لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو کچھ کمانے کے لیے کتائی کا کام کریں اور جن کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ دوسرے وہ لوگ جو ہندوستان کے سوچنے سمجھنے والے لوگ ہیں انھیں چرکھا کاتنے کا کام ایثار و قربانی کی مثال کے طور پر کرنا چاہیے اور اس لیے بھی کہ کھدر سستا ہو جائے۔"

(ینگ انڈیا ۱۹۲۵۔ ۱۰۔ ۲۲)

وہ میں نے نہ تو کبھی یہ سوچا ہے اور نہ تو کبھی یہ مشورہ دیا ہے کہ ہاتھ کی کتائی کو فروغ دینے کے لیے کسی ایک بھی صحت مند اور زندگی دینے والی صنعتی سرگرمی کو ترک کر دیا جائے۔ چرکھے کی بنیاد دراصل اس حقیقت پر ہے کہ ہندوستان میں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جو نیم بے روزگاری کے حالات سے دوچار ہیں اور مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اگر ایسے لوگ نہ ہوتے تو چرکھے کی کوئی ضرورت باقی ہی نہیں رہ جاتی یہ ایک حقیقت ہے اور ہر وہ شخص جو کبھی گاؤں گیا ہو یا گاؤں میں رہا ہو وہ اس سے واقف بھی ہے کہ گاؤں کے لوگ مہینوں تک بیکار رہتے ہیں ان کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا ہے اور یہی بات ان کی تباہی و بربادی کا سبب بنتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ میں متوسط طبقے کے لوگوں سے چرکھا کات کر ایثار و قربانی کی مثال پیش کرنے کی جو اپیل کرتا ہوں اس کا تعلق بھی ان کے فاضل وقت کے استعمال سے ہی ہے چرکھے کی تحریک کسی بھی کاروبار کو تباہ کرنے کے لیے نہیں ہے یہ زندگی دینے والی سرگرمی ہے اسی لیے میں نے اسے ان پورنا یعنی روٹی روزی کی فراہمی کا نام دیا ہے۔"

(ینگ انڈیا ۱۹۲۶۔ ۵۔ ۲۷)

"یہ کہنا درست نہیں ہے کہ چرکھا کاتنے والی عورتیں روزانہ دس گھنٹے کام کرتی ہیں یہ عورتیں اپنے فاضل اوقات میں ہی چرکھا کاتتی ہیں اور اس کے عوض انھیں جو کچھ ملتا ہے وہ ان کے ایک دن کی اجرت نہیں ہوتی بلکہ بعض حالات میں اس کی حیثیت ان کی روزمرہ کی آمدنی میں اضافہ کی ہوتی ہے۔ چرکھے سے ہونے والی آمدنی کو عملاً اس دولت کا نام دیا جا سکتا ہے جو ضائع ہو رہی ہوتی ہے کتائی کو کبھی بھی دن بھر کے پورے کام کے روپ میں نہیں دیکھا گیا ہے۔ اسے ہمیشہ جز وقتی کام کے طور پر دیکھا اور برتا گیا ہے۔"

(ینگ انڈیا ۱۹۲۹۔ ۱۲۔ ۱۹)

جہاں تک چرخے کی لاگت اور اس کے معاشی پہلو کا تعلق ہے تو اس معاملے میں گاندھی جی کا موقف بہت واضح رہا ہے وہ لکھتے ہیں: "کھدر کی معاشیات عام معاشیات سے بالکل مختلف ہے۔ موخر الذکر انسانی عنصر یا عامل پر اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے۔ جب کہ اول الذکر یعنی چرخے کی معاشیات کی توجہ کا مرکز انسان ہے۔ موخر الذکر واضح طور پر خود غرضی پر مبنی ہے جب اول الذکر لازمی طور پر بے غرض ہے۔ کھدر کے تصور سے باہمی مسابقت اور اس پر مبنی قیمتوں کے عنصر کو خارج کر دیا گیا ہے۔ ہوٹلوں اور گھریلو باورچی خانوں میں ظاہر ہے کوئی مسابقت نہیں ہوتی۔ گھر کی مالکن کے ذہن میں کبھی یہ بات پیدا نہیں ہوتی کہ وہ اپنی محنت اور جگہ کا حساب کتاب لگائے۔ وہ یہ مان کر چلتی ہے کہ بچوں کی پرورش و پرداخت کی طرح گھر کا باورچی خانہ بھی اس کے لیے فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر وہ لاگت کا حساب کتاب لے کر بیٹھ جائے تو حقائق کی منطق اسے لازمی طور پر باورچی خانہ اور بچوں، دونوں ہی کو تباہی کی طرف لے جائے گی۔ کچھ ایسی ہیں جنھوں نے دونوں ہی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن مقام شکر ہے کہ یہ لعنت قابل لحاظ حد تک بڑھتی نظر نہیں آ رہی ہے۔ یہ ہماری فطری کاہلی ہے جس کے سبب ہم اس حقیقت کا مشاہدہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ ہم نے گھریلو چرخے کو تباہ کر کے ہندوستانی معیشت کے خلاف گناہ کیا ہے۔ ہمیں اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا اور امن و سکون مہیا کرنے والے چرخے کی طرف واپس لوٹ جانا چاہیے۔" (ینگ انڈیا ۱۹۳۱۔ ۷۔ ۱۶)

یہ کہنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ وہ سارے دلائل جو کھادی کے تعلق سے دیے گئے ہیں ان کا اطلاق یکساں طور پر دیہی صنعتوں پر بھی ہوتا ہے۔ دونوں کے باہمی تعلق کو اجاگر کرنے کے لیے گاندھی جی نے ایک بہت ہی اہم بیان دیا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ کھادی کی حیثیت نظام شمسی کے سورج جیسی ہے اور دیگر دیہی صنعتیں اس کے گرد گھومتی ہیں۔

نظریہ اور عمل

اب آیئے اس تصور کا جسے باباۓ کھادی نے پیش کیا تھا اور ان کی پیروی کا دعوا کرنے والے لوگوں کے عمل کا ذہنی موازنہ کر لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ انھوں نے اس میدان میں کیا کچھ کیا ہے۔ اگر ہم معروضی انداز میں اس بات کا تجزیہ کریں تو یہ پائیں گے کہ جہاں کہیں بھی مہاتما گاندھی کے وضع کردہ رہنما خطوط پر عمل ہو رہا ہے وہاں کھادی پروگرام قوت حیات سے پوری طرح معمور ہے اور جہاں کہیں بھی گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستے سے لوگ ہٹ گئے ہیں وہاں مسائل کا سامنا ہے۔ (یہ مسائل ایک دو نہیں سیکڑوں ہیں) کتائی اور بنائی کا نشانہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جن کا تعلق ہمارے گاؤں کی سب سے نچلی سطح سے ہے۔ انھیں آسانی کے ساتھ خط غربی سے نیچے کے زمرے سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں شمار کیا جاسکتا ہے اور سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دیہی علاقوں میں اس زمرے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی تعداد تقریبًا ۴۰ فی صد ہے۔ یہی وہ غیر ہنر مند لوگ ہیں جن کے لیے کتائی اور بنائی کے ذریعہ کام چلاؤ آمدنی کا انتظام کرنا ہے۔ کیوں کہ ہندستان میں تقریبًا نصف صدی کی ترقیاتی منصوبہ بندی کے باوجود ہمارے منصوبہ ساز اور سیاسی لیڈر ان کا کوئی بہتر متبادل فراہم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ دیہی علاقوں میں اصلاح شدہ یعنی بہتر تکنالوجی کی ترویج سے متعلق بہت سی مطالعاتی رپورٹیں سامنے آئی ہیں جن میں حیرت انگیز تصویر پیش کی گئی ہے۔ اکثر و بیشتر رائج کی جانے والی اعلا تکنالوجی سے عام مرد و عورت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ وہ لوگ اس تھوڑی سی آمدنی سے بھی محروم ہو جاتے ہیں جو روایتی تکنالوجی سے حاصل ہو رہی ہوتی ہے۔ بہتر اور اصلاح شدہ تکنالوجی کا فائدہ اونچی معاشی سماجی حیثیت والے زمروں کے لوگوں کو ہی پہنچتا ہے۔ اس صورت حال کا تازہ ترین مشاہدہ سپریم کورٹ کی اس رولنگ میں کیا جاسکتا ہے جس میں روایتی ماہی گیری کشتیاں استعمال کرنے والے سیکڑوں، ہزاروں مچھیروں کے حق میں مشینی کشتیوں کے ذریعہ ماہی گیری پر کیرالہ حکومت کی عائد پابندی کو جائز ٹھہرایا گیا ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کی ۲۷ر جون ۱۹۹۴ء میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق ملک کی سب سے بڑی عدالت نے مشینی کشتیوں کے ذریعہ ماہی گیری پر پابندی عائد کرنے سے متعلق حکومت کیرالہ کے فیصلہ کی تائید کرتے ہوئے کہا ہے کہ "عوامی مفاد کا تعین محض پیداوار کی بنیاد پر ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ریاستی حکومت اپنے اس موقف میں پوری طرح حق بجانب ہے کہ وہ روایتی مچھیروں کے معاشی مفاد کے تحفظ اور اس بات کو یقینی بنانے کی پابند ہے کہ انھیں زندگی کے ان معمولی سہاروں سے محروم نہ کیا جاسکے۔" ہمارے ملک کو جس مسئلہ کا سامنا ہے اس کی وسعت اور مزاج کو سمجھنے کے لیے یہ کافی ہوگا کہ سپریم کورٹ کی اس رولنگ میں "مچھیروں" کی جگہ "دست کار" پڑھ لیا جائے۔ کیوں کہ یہی سب تو کچھ روایتی ڈھنگ سے کتائی کرنے والوں کے معاملے میں بھی ہوا ہے، جن کے بارے میں بہر حال یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ امبر چرخوں کی ترویج سے جن لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے ان میں لازمی طور پر وہ بھی شامل ہیں اور موجودہ حالات میں کتائی و بنائی کے رائج طریقوں کی جگہ زیادہ بہتر تکنالوجی کی صورت میں ترویج کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ وہ تمام لوگ جو کتائی، بنائی کا کام کر رہے ہیں مگر اعلا تکنالوجی تک ان کی رسائی نہیں ہے، انھیں بے روزگاری کے جبڑے میں ڈھکیل دیا جائے۔ اس زمرے میں یا تو عورتیں آتی ہیں یا وہ مرد و عورت جن کا تعلق شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب سے ہوتا ہے۔

پروگرام کی کامیابی کے لیے عوامی سطح پر ایک یہ اہم اقدام بھی ضروری ہے کہ تحریک آزادی کے دوران کی سودیشی روح کو زندہ کیا جائے اس کا مطلب یہ ہے کہ دور دراز لوگوں کی تیار کردہ مصنوعات پر خواہ وہ سستی اور زیادہ پرکشش کیوں نہ ہو لے پڑوسی کی تیار کردہ مصنوعات کو ترجیح دی جائے گی۔ اپنے نسبتًا کم خوش قسمت اور معاشی طور پر پسماندہ اہل وطن کے تعلق سے ہماری کچھ سماجی ذمہ داری ہے اس کو ہمیں محسوس کرنا چاہیے۔ ہمارا فرض ہے کہ انھیں بھیک یا امداد پر زندہ رکھنے کے بجائے ان کی ان مصنوعات یا پیداوار کے لیے منڈی فراہم کی جائے جو وہ حاصل شدہ تکنالوجی اور ہنر کے ذریعہ پیدا کرتے ہیں۔ جمہوریہ ہند کے ایک عام شہری کی حیثیت سے ان کی عزت نفس کو یقینی بنانے کے نقطۂ نظر سے یہ ایک زیادہ ترجیحی بات ہے۔ اگر ہم اپنے سماج کے استحکام کو یقینی بنانے کے خواہاں ہیں تو ہمارے ان لوگوں کو جو نسبتًا خوشحال ہیں اپنے بدقسمت بھائیوں کے لیے کم سے کم اتنا تو کرنا ہی چاہیے۔ دوسرا اقدام بلاشبہ اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے کہ اس کا نتیجہ کسی کی بھی بے روزگاری کی صورت میں نہ نکلے، بہتر ہنر مندی اور بہتر تکنالوجی کی ترویج کا ہی ہوگا۔ کھادی کا ماضی میں کیا رول رہا ہے اس کا تذکرہ خود گاندھی جی نے اپنے مذکورہ کتابچہ تعمیری پروگرام میں کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"۱۹۶۴۵ ہریجنوں اور ۵۷۳۷۸ مسلمانوں سمیت ۲۷۵۱۴۶ افراد جو ۱۳۴۵۱ گاؤں کے رہنے والے تھے انھیں ۱۹۴۰ء میں کتائی اور بنائی وغیرہ کے لیے ۳۴۸۵۶۰۹ روپے ملے۔ کتائی کا کام کرنے والی زیادہ تر عورتیں تھیں۔" تقریبًا نصف صدی کے صنعتی کرن کے باوجود کھادی پروگرام پہلے سے کہیں زیادہ ضروری اور ہمارے حالات سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ کھادی پروگرام کا موجودہ رول اور اس کی اہمیت کا اندازہ درج ذیل اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہے جو صنعتی ترقی کی وزارت کی تیار کردہ اس مطالعاتی رپورٹ میں درج ہیں جو وزیر اعظم کی سربراہی میں کام کرنے والی کھادی اور دیہی صنعتوں سے متعلق اس اعلا اختیاراتی کمیٹی میں پیش کی گئی تھی۔ اس کے مطابق ۹۳-۱۹۹۲ء میں تقریبًا دو لاکھ گاؤں میں ۵۰ر۵۳۳ کروڑ کی مالیت کی کھادی تیار کی گئی جس کے ذریعہ اپنا کام کرنے والے ۱۴ر۴۵ لاکھ دست کاروں کو جزوی طور پر روزگار ملا۔ اس سال کے دوران انھیں ۱۶۸/۰۵ کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی جو ان کی گھریلو آمدنی میں اضافہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ پروگرام میں عورتوں کی شرکت ۴۷ فی صد رہی جب کہ قومی اوسط ۱۴ فی صد ہے۔

کھادی کی ترویج میں غیر معمولی اضافہ کا سبب زیادہ تر تو یہ رہا کہ آزادی کے بعد کے دور میں اسے سرکاری سرپرستی حاصل رہی ہے لیکن اس کے

باقی صفحہ پر

ڈاکٹر کستوری رنگن

خلائی پروگرام سے ہندوستان کی مسلسل پیش رفت

ہندوستان ترقیاتی ضروریات کے لیے خلا جیسی جدید ٹکنالوجیوں سے فوائد حاصل کرنے کے سلسلے میں مسلسل پیش رفت کر رہا ہے۔ آئی ایس آر او میں تیار کردہ انسیٹ۔۲ سلسلے کے تیسرے مصنوعی سیارے انسیٹ۔۲ سی کو ۷ دسمبر ۱۹۹۵ء کو کامیابی کے ساتھ چھوڑا گیا ہے۔ اس کے فوراً بعد ۲۸ دسمبر ۱۹۹۵ء کو دور سے معلومات حاصل کرنے والا تیسرا آپریشنل ہندوستانی مصنوعی سیارہ آئی آر ایس۔ ایک سی کامیابی کے ساتھ چھوڑا جا چکا ہے۔ اس سے ایک بار پھر بالکل واضح طور سے ہندوستان کی اس صلاحیت کا بھرپور مظاہرہ ہوا ہے، جو اس نے خلا پر مبنی جدید ترین نظام وضع کرنے اور انھیں چلانے کے سلسلے میں حاصل کی ہے تاکہ مواصلات، موسمیات اور قدرتی وسائل کے بارے میں دور سے معلومات حاصل کرنے کے شعبوں میں اہم خدمات فراہم کی جاسکیں۔

انسیٹ پروگرام

پہلی نسل کے مصنوعی سیاروں میں سے آخری مصنوعی سیارہ انسیٹ۔ ایک ڈی ۱۹۹۰ء میں چھوڑا گیا تھا۔ آئی ایس آر او میں تیار کردہ دوسری نسل کے دو مصنوعی سیارے یعنی انسیٹ۔ دو اے اور انسیٹ۔ ۲ بی بالترتیب جولائی ۱۹۹۲ء اور جولائی ۱۹۹۳ء میں چھوڑے گئے تھے۔ انسیٹ نظام کی صلاحیت میں کافی اضافہ کرتے ہوئے انسیٹ۔ ۲ سی بھی اس سلسلے میں شامل ہوگیا ہے۔

انسیٹ۔ ۲ سی اس سے پہلے کے مصنوعی سیاروں کے مقابلے میں متعدد جدید ترین خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ مصنوعی سیارہ ہندوستانی سرحدوں سے آگے بھی ٹیلی ویژن پروگرام دکھانے کے لیے طاقتور ٹرانسپونڈروں اور کو۔ بینڈ ٹرانسپونڈروں کے ذریعے جو حال ہی میں شروع کیے گئے ہیں، چلتی پھرتی سٹیلائٹ خدمات، کاروباری مواصلات فراہم کرے گا۔ انسیٹ۔ ۲ ڈی اور انسیٹ۔ ۲ ای کے سلسلے میں کام شروع کر دیا گیا ہے۔ یہ مصنوعی سیارے بالترتیب ۹۷۔۱۹۹۶ء اور ۹۸۔۱۹۹۷ء میں چھوڑے جائیں گے۔

انسیٹ کا استعمال کرتے ہوئے نئے مظاہرے اور خدمات کا سلسلہ جاری ہے۔ انسیٹ نظام میں ایک چینل ترقیاتی تعلیم اور تربیت کے سلسلے میں مخصوص کیا گیا ہے۔ دیہی ترقیات کے لیے مصنوعی سیارے پر مبنی ترقیاتی مواصلات اور تربیت کے نظام کے موثر ہونے کا مظاہرہ کرنے کے لیے دو سالہ تجرباتی پروجیکٹ مدھیہ پردیش کے ضلع جھبوا میں شروع کیا گیا ہے۔

آئی آر ایس مصنوعی سیارہ

دور سے معلومات حاصل کرنے والا ہندوستانی مصنوعی سیارہ آئی آر ایس۔ ایک سی تعلق آئی آر ایس سلسلے کی دوسری نسل سے ہے۔ یہ مصنوعی سیارہ آئی آر ایس۔ ایک بی، جو اگست ۱۹۹۱ء میں چھوڑا گیا تھا، نیز آئی آر ایس۔ پی دو میں شامل ہوگیا ہے، جو اکتوبر ۱۹۹۴ء میں ہندوستان کی خود اپنی خلائی گاڑی پی ایس ایل وی کے ذریعے چھوڑا گیا تھا۔ آئی آر ایس۔ ایک سی جدید خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ مصنوعی سیارہ اس سے پہلے کے مصنوعی سیاروں کے مقابلے میں بہتر فضائی تجزیہ، مزید اسپیکٹرل بینڈز، اسٹیریو اسکوپک امیجنگ، وسیع کوریج اور زیادہ جلدی جلدی ری ویزیٹ کی صلاحیتیں فراہم کر رہا ہے۔

درحقیقت یہ بات ہندوستانی خلائی سائنسدانوں کے لیے باعث فخر ہے کہ تصوراتی تجزیے کے لحاظ سے آئی آر ایس۔ ایک سی دنیا میں آج زیر عمل بہترین سویلین مصنوعی سیارہ ہے۔ اس مصنوعی سیارے میں اس صورت میں معلومات ریکارڈ کرنے کے لیے ٹیپ ریکارڈ بھی ہے، جب حقیقی وقت میں معلومات کی ترسیل نہیں کی جا رہی ہوتی ہے۔ آئی آر ایس۔ ایک ڈی، جو آئی آر ایس۔ ایک سی کے مماثل ہے۔ ۹۸۔۱۹۹۷ء میں چھوڑے جانے کا پروگرام ہے۔ اس کے علاوہ دور سے معلومات حاصل کرنے والے مصنوعی سیاروں کا ایک سلسلہ یعنی آئی آر ایس۔ پی سلسلہ خاص طور سے بحریات، نقشہ کشی اور ماحولیاتی نگرانی کے شعبوں میں جدید ترین ٹکنالوجی کو آزمانے والے مشن کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ مصنوعی سیارے ہندوستان کی پی ایس ایل وی استعمال کر کے چھوڑے جائیں گے۔ مصنوعی سیاروں کے اس مجموعے سے ہندوستان آئندہ برسوں میں قابل رشک مقام حاصل کر لے گا اور عالمی برادری کو خلا پر مبنی دور سے حاصل کردہ گوناگوں معلومات فراہم کرے گا۔

آئی آر ایس معلومات۔ گوناگوں استعمال

قدرتی وسائل کے انتظام سے متعلق قومی نظام کے تحت آئی آر ایس معلومات کو نئے نئے شعبوں میں استعمال کرنے کا عمل جاری ہے۔ پائیدار ترقی کے لیے مربوط مشن ۱۹۹۲ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس مشن کے تحت منصوبۂ عمل تیار کرنے اور اس پر عمل درآمد کرنے کے کام میں مزید پیش رفت ہوئی ہے اور اس مشن کے تحت ملک میں ۱۷۴ اضلاع کی نشاندہی کی گئی ہے۔ وزیر اعظم نے پائیدار ترقی کے لیے

مرلوط مشن کا خود جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے کی بنیاد پر ۹۴ بلاکوں کی خصوصی طور سے نشاندہی کی گئی ہے تاکہ زمینی اور آبی وسائل کی مرلوط ترقی کے لیے ترجیحی بنیاد پر منصوبۂ عمل تیار کیے جائیں۔ آئی آر ایس۔ ایک سی کے ذریعے معلومات کی دستیابی سے دور سے حاصل کردہ معلومات کا استعمال کرنے کے پروگرام کو مزید فروغ حاصل ہوگا۔ اس سے بڑی اور چھوٹی سطح پر قدرتی وسائل کے انتظام، ماحولیاتی نگرانی اور آفات کے روک تھام' فصل کے رقبے اور پیداوار کے تخمینے، خشک سالی پر نظر رکھنے اور اس کا جائزہ لینے، سیلاب کی نقش کشی، زمینی استعمال اور زمینی علاقے کی نقشہ کشی، شہری نقشہ کشی اور جنگلاتی وسائل کے سروے کے لیے دور سے حاصل کردہ معلومات کا استعمال کرنے کے سلسلے میں متعدد نئے شعبے کھلیں گے۔ اس کے علاوہ اونچائی کے بارے میں معلومات سمیت معلومات کی زیادہ جلدی جلدی دستیابی اور زیادہ تجزیے سے اس کام میں مزید بہتری آسکے گی۔ آئی آر ایس۔ ایک سی سے پائیدار ترقی کے لیے مرلوط مشن پر عمل درآمد میں مدد ملے گی نیز چھوٹی سطح پر منصوبہ بندی کرنے کی غرض سے علاقے کے لیے مخصوص تجاویز تیار کرنے کے سلسلے میں زیادہ تجزیے پر مبنی معلومات فراہم ہوں گی۔ کیڈسٹرل سطح پر معلومات کی دستیابی سے کسان اپنے انفرادی زمینی اثاثوں کی پائیدار ترقی کے لیے طویل مدتی اقدامات پر عمل درآمد کرسکتے ہیں۔

مصنوعی سیارے چھوڑنے کی اندرون ملک صلاحیتیں

اکتوبر ۱۹۹۴ء میں مصنوعی سیارہ چھوڑنے والی گاڑی پی ایس ایل وی۔ ڈی ۲ کو کامیابی کے ساتھ چھوڑے جانے کے بعد، پی ایس ایل وی کی تیسری ترقیاتی اڑان کے لیے بڑا ساز و سامان حاصل کرلیا گیا ہے اور ۱۹۹۶ء کی پہلی سہ ماہی میں اسے چھوڑے جانے کا پروگرام ہے۔ مصنوعی سیارہ آئی آر ایس۔ پی ۳، جو اس گاڑی کے ذریعے چھوڑا جائے گا، تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔ اس گاڑی کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں پی ایس ایل وی کی مزید تین اڑانوں، ہر سال ایک کا منصوبہ بھی بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس گاڑی کا استعمال مصنوعی سیاروں کا آئی آر ایس۔ پی سلسلہ چھوڑنے کے لیے کیا جائے گا۔ اعلا سطحی کرایوجینیک انجن سمیت ہندوستان کی جی ایس ایل وی کی تیاری کے سلسلے میں نمایاں پیش رفت حاصل کی گئی ہے۔ ایس آر او ایس ایس۔ سی ۲ مصنوعی سیارہ مئی ۱۹۹۴ء میں اے ایس ایل وی۔ ڈی ۴ کے ذریعے چھوڑا گیا تھا۔ یہ مصنوعی سیارہ فلکیات اور زراعت کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کررہا ہے۔

تجارتی فوائد

ہندوستان کی خلائی صلاحیتوں سے تجارتی فوائد حاصل کرنے کے سلسلے میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔ دنیا بھر میں آئی آر ایس معلومات حاصل کرنے اور انھیں فراہم کرنے کے لیے فروری ۱۹۹۵ء میں خلا کے محکمے کی انترکش کارپوریشن اور امریکہ کی ایک مشہور کمپنی ای آر ایس اے ٹی کمپنی کے درمیان ایک طویلے مدتی تجارتی معاہدے پر دستخط کیے گئے ہیں۔ یہ معاہدہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوستانی مصنوعی سیاروں سے معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں امریکہ میں دو زمینی اسٹیشنوں کو پہلے ہی بہتر بنادیا گیا ہے۔ آئی آر ایس۔ ایک سی کے ذریعے معلومات کی دستیابی سے توقع ہے کہ آنے والے مہینوں میں کچھ اور اسٹیشن تیار ہوجائیں گے۔ ہندوستان کے انسیٹ۔ ۲۔ ای کے بارے میں، جو ۹۸-۱۹۹۷ء میں چھوڑا جائے گا، پٹے پر دینے کی صلاحیت کے سلسلے میں جنوری ۱۹۹۵ء میں بین اقوامی تنظیم آئی این ٹی ای ایل ایس اے ٹی کے ساتھ خلا کے محکمے نے ایک معاہدے پر دستخط کیے ہیں۔ اس معاہدے سے بین اقوامی معیار کے مواصلاتی مصنوعی سیارے فراہم کرنے کے سلسلے میں ہندوستان کی صلاحیت کے ایک اور اہم اعتراف کا اظہار ہوتا ہے۔

اشتراک عمل

خلائی پروگرام سے باہمی مفاد کے لیے ہندوستانی صنعت مسلسل مستفید ہورہی ہے۔ اب تک پروگرام کے تحت تیار کردہ ۲۲۷ تکنالوجیوں صنعتوں کو منتقل کی جاچکی ہیں۔ ہندوستانی صنعتیں ساز و سامان تیار کرنے کا اہم کام مسلسل انجام دے رہی ہیں نیز خلائی پروگرام کے لیے ساز و سامان اور حصے پرزے مسلسل سپلائی کررہی ہیں۔

بین اقوامی تعاون

بین اقوامی فورموں میں ہندوستان مسلسل ایک اہم کردار ادا کررہا ہے۔ نومبر ۱۹۹۵ء میں ہندوستان میں خلائی تعلیم کے لیے اقوام متحدہ کے ایشیائی بحرالکاہل علاقائی مرکز کا افتتاح کیا گیا ہے، جس سے سماجی فوائد کے لیے خلائی ٹکنالوجی کی ترقی و فروغ اور اس کے استعمال کے سلسلے میں ہندوستان کی صلاحیتوں کے اعتراف کا اظہار ہوتا ہے۔

پیش بینی

آئی آر ایس اور آئی این ایس اے ٹی (انسیٹ) کے سلسلے کے تحت یکے بعد دیگرے مصنوعی سیارے چھوڑے جانے کے عمل نیز جی ایس ایل وی کے تیاری مکمل ہونے اور مزید کچھ اڑانوں کے بعد پی ایس ایل وی کو بروئے کار لاکر مصنوعی سیارے چھوڑنے کی ہم پلہ صلاحیتیں پیدا کرنے سمیت، مستقبل کے لیے منصوبوں سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستان کا خلائی پروگرام مسلسل اور یقینی بنیاد پر ملک کے لیے خلائی خدمات فراہم کرتا رہے گا اور اسی کے ساتھ ساتھ اس عمل میں تیار کردہ صلاحیتوں سے تجارتی فوائد حاصل کرتا رہے گا۔ ●

بقیہ: ماحولیات کا تحفظ۔ ایک قومی عزم

اور اس پر قابو پانے سے متعلق معیارات کے بارے میں لوگوں کو تعلیم دینے کے سلسلے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتا ہے۔

یہ بورڈ ملک بھر میں اور خاص طور سے آلودگی سے بہت زیادہ - - - - متاثرہ علاقوں میں آلودگی کی روک تھام کرنے اور اس پر قابو پانے کے سلسلے میں کیمپوں کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔ نمائشوں میں اسٹال لگانے اور لکچروں کا اہتمام کرنے سے لے کر سمعی و بصری پروگراموں کا اہتمام کرنے تک ہر ایک قابل فہم ذریعے کا استعمال کرکے مرکزی بورڈ مختلف شکلوں میں آلودگی کے مہلک اثرات کے بارے میں عوام کو تعلیم دیتا ہے۔ لوگوں کی شمولیت کے نئے نئے مواقع تلاش کرنے کے سلسلے میں مذکورہ بورڈ فوٹوگرافی اور مصوری کے ایسے مقابلوں کا اہتمام بھی کرتا ہے، جن میں آلودگی کے خطرات اور صحت مند زندگی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہو۔ ●

عادل صدیقی

شہری رسدات کی کہانی

ہندوستان میں ہر سال چار لاکھ سے زیادہ فیر پرائس شاپس ایک کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن غلہ، ۳۴ لاکھ ٹن لیوی کی چینی اور ۸۳ لاکھ ٹن مٹی کا تیل تقسیم کرتی ہیں۔ اس طرح ملک میں اشیائے ضروری کی مناسب قیمتوں پر فروخت کا نظام دنیا میں اپنے طرز کا واحد نظام ہے اور یہ سب سے بڑا نظام ہے۔ یہ ذمہ داریاں شہری رسدات کی وزارت سنبھالتی ہے۔

۱۹۴۳ء میں بنگال میں قحط پڑا۔ اس نے اشیائے ضروری کی تقسیم کے نظام کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ چنانچہ ملک میں پہلی بار ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی گئی جو غلہ کی تقسیم اور اس کی ذخیرہ بندی کے سلسلے میں ایک پالیسی بنائے۔ اس پالیسی کے تحت ملک میں راشننگ کا نظام رائج ہوا اور غلہ کی ذخیرہ بندی کی گئی۔ لیکن آج یہ محض راشننگ کا ایک نظام نہیں، اس کا مقصد محض بازار پر انحصار کرنے والی شہری آبادی کو فائدہ پہنچانا ہی نہیں بلکہ اب یہ ایک ایسا پروگرام ہے جس کے تحت سماج کے کمزور طبقات کو یقینی طور پر خوراک اجناس اور دیگر اشیائے ضروری فراہم کرنا ضروری ہے۔ اس طرح یہ سماج کے کمزور طبقات کے تحفظ کا ضامن ایک نظام ہے۔

شہری رسدات اور اشیائے ضروری کی سرکاری دوکانوں کے ذریعے فروخت کی ذمہ داریاں سنبھالنے والی وزارت اپنی موجودہ شکل میں جون ۱۹۹۱ء میں معرض وجود میں آئی اس سے قبل یہ وزارت خوراک کا ایک حصہ تھی اور یہ شہری رسدات کے شعبے کے طور پر کام کرتی تھی۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں صارفین کے تحفظ کی ضرورت کی اہمیت پہچان کر، اس وزارت کو شہری رسدات، امور صارفین اور اشیائے ضروری کی تقسیم کی وزارت کا نام دیا گیا۔ ۸ رمارچ ۱۹۹۵ء سے اس وزارت کو دو شعبوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک شعبے کا نام شہری رسدات کا محکمہ رکھا گیا اور دوسرے کا نام امور صارفین اور اشیائے ضروری کی تقسیم کا شعبہ رکھا گیا۔

سرکاری دوکانوں کے ذریعے اشیائے ضروری کی تقسیم کا نظام گزشتہ ۴۰ برسوں سے عوام کی بڑی حد تک مدد کر رہا ہے۔ اس نظام کے تحت غلہ اور خوردنی تیل کی تقسیم ہوتی ہے جس سے ان دونوں اہم اشیار کی قیمتوں کو بڑھنے سے روکا جا سکا ہے۔

شہری رسدات کی وزارت محض اشیائے ضروری کی تقسیم کی ذمہ داریاں ہی نہیں سنبھالتی بلکہ یہ اشیائے ضروری کی قیمتوں پر نظر رکھتی ہے اور ان کی فراہمی کو یقینی بناتی ہے اس کے علاوہ ضروری اشیار کی تقسیم کے نظام سے متعلق ایکٹ مجریہ ۱۹۹۵ء پر عمل درآمد کا بھی جائزہ لیتی ہے۔ مزید براں یہ ضروری اشیار کی فراہمی کو برقرار رکھنے اور چور بازاری کو روکنے سے متعلق قانون مجریہ ۱۹۸۰ء پر عمل درآمد کی صورت حال پر بھی نظر رکھتی ہے۔ یہ وزارت صارفین کے مفادات کا تحفظ بھی کرتی ہے اور صارفین کے کوآپریٹو اداروں پر نظر رکھتی ہے۔ ونا سپتی، خوردنی تیلوں، تلہنوں، کھلی اور چکنائی کی تقسیم کے نظام کو بھی اس وزارت کے توسط سے موثر بنایا گیا ہے۔ سٹہ بازاری کی روک تھام اور اوزان و پیمائش سے متعلق امور کی نگرانی بھی اس کے ذمے ہے ہندوستانی معیارات کا بیورو بھی اس کے ماتحت ہے۔

یہ وزارت منتخبہ اشیائے ضروری کی قیمتوں کے رجحانات پر بہت گہری نظر رکھتی ہے مستقبل میں کن اشیار کی کمی پڑ سکتی ہے اور کن اشیار کی فراہمی میں اضافہ ہو سکتا ہے، اس بارے میں بھی یہ وزارت پیشین گوئی کرتی ہے۔

یہ وزارت گندم، چاول، ارہر کی دال، تور کی دال، آلو، پیاز، چائے، چینی، نمک، وناسپتی، مونگ پھلی کے تیل اور سرسوں کے تیل کی خوردہ قیمتوں کا روزانہ جائزہ لیتی ہے کیوں کہ یہ وہ اشیار ہیں جو ہر گھر کی ضرورت ہیں۔

قیمت پر نگاہ

حکومت اس بات کی پوری کوشش کرتی ہے کہ اشیار کی قیمتوں میں اضافہ نہ ہو۔ اس کام کی جانچ کے لیے بین وزارتی تال میل کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ جو اشیار ضروری کی قیمتوں پر نظر رکھتی ہے اور متعلقہ حکام کو مناسب اور بروقت کارروائی کے لیے مشورے دیتی ہے۔ قلت والی اشیار کو باہر سے منگایا جاتا ہے تاکہ منڈی میں ان کی قلت محسوس نہ ہو۔ چینی، خوردنی تیل، پامولین اور کپاس اوپن جنرل لائسنس اسکیم کے تحت باہر سے منگائی جاتی ہے۔ اشیائے ضروری کو سرکاری دوکانوں کے ذریعے سے تقسیم کرنے کا نظام مستحکم کیا جا رہا ہے اور اسے ان علاقوں کے عوام تک پہنچایا جا رہا ہے جو دور دراز ہیں اور دشوار گزار بھی۔ اشیار کی ناجائز جمع خوری کرنے والوں، چور بازاری کرنے والوں اور دیگر سماج دشمن عناصر

انچارج پبلسٹی، دارالعلوم دیوبند

کے خلاف اشیائے ضروری کی تقسیم کے قانون مجریہ ۱۹۹۵ء کے تحت کارروائی کی جاتی ہے۔

اشیائے ضروری کی تقسیم کے نظام میں نئی سمتیں

ہندوستان ایک بڑا ملک ہے، یہاں مختلف طرح کے جغرافیائی خطے ہیں، ایسے بہت سے علاقے ہیں جہاں آسانی سے نہیں پہنچا جا سکتا۔ چناں چہ سرکار نے اشیار کی سرکاری دوکانوں کے ذریعے فروخت کے نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کی اور اس طرح ایسے بہت سے افراد کو اس نظام کا فائدہ ملا جو غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ اس نئے اور بہتر نظام کو یکم جنوری ۱۹۹۲ء سے شروع کیا گیا اور وزیراعظم نے راجستھان کے بارمیر علاقے میں اس نئے نظام کا افتتاح کیا۔ اس اسکیم سے ایسے مختلف علاقوں کو فائدہ پہنچایا گیا جہاں مختلف طرح کے ترقیاتی پروگرام چل رہے تھے مثلاً خشک سالی کی زد میں آنے والے علاقوں کے ترقیاتی پروگرام، ریگستان کی ترقی کے پروگرام، قبائلی آبادی کے مربوط پروجیکٹ اور پہاڑی علاقوں کی ترقی کے پروگرام وغیرہ۔ یہ بہت سے پروگرام ریاستی سرکاروں کے مشورے سے شروع کیے گئے اور ریاستی سرکاروں کے کہنے پر ہی ان علاقوں میں سرکاری دوکانوں کے ذریعے اشیار کی فروخت کا نظام شروع کیا گیا۔ اس وقت یہ نظام ۱۷۷۵ بلاکوں میں رائج ہے۔

سرکار نے ہر سال ۲۰ لاکھ ٹن غلہ خالصتاً ایسے علاقوں میں فروخت کے لیے مخصوص کیا جہاں یہ نظام رائج کیا گیا تھا۔ اس طرح یہ علاقے ان کے علاوہ ہیں جہاں ریاستی سرکاروں کے ذریعے سے پہلے ہی اشیار کی تقسیم کا نظام رائج تھا، جون ۱۹۹۲ء سے غلہ کی مزید مقدار ان نئے علاقوں کو دی جانے لگی۔ ان پسماندہ علاقوں میں جو غلہ دیا جاتا ہے اس کی قیمت عام پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم سے فائدہ اٹھانے والی آبادی کے مقابلے ۵۰ روپے فی کوئنٹل کم رکھی گئی ہے۔

اس طرح مذکورہ شناخت کے تحت مختص کردہ علاقوں میں بسنے والی آبادی کو رعایتی نرخ پر غلہ کی فراہمی سے نہ صرف یہ کہ ان کی غذائی ضرورتوں کی تکمیل میں مدد ملی بلکہ ان کا معیار زندگی بلند کرنے میں بھی مدد ملی۔ ریاستی سرکاروں نے نئے پبلک ڈسٹری بیوشن سسٹم کو لاگو کرنے کے لیے رضامندی دے دی ہے۔ اس طرح یہ ریاستی سرکاریں نئی فیر پرائس شاپس کھولیں گی اور مزید لوگوں کو راشن کارڈ جاری کریں گی۔ ان کے علاوہ اس نظام پر عمل درآمد کے لیے وجی لنس کمیٹیاں بھی قائم کی جائیں گی۔

۱۵ مئی ۱۹۹۵ء تک موصولہ اطلاعات کے مطابق ۱۴۱۵۶ فیر پرائس شاپس کھولی گئیں جب کہ ان نئی دکانوں کے لیے صرف ۱۰۵۸۰ دکانوں کو کھولنے کا نشانہ رکھا گیا تھا اور مزید ۳۷ لاکھ ۱۳ ہزار افراد کے لیے راشن کارڈ فراہم کیے گئے جب کہ ان کے لیے ۲۶ لاکھ ۷۶ ہزار افراد کو نئے راشن کارڈ دینے کا نشانہ تھا۔

خوردنی تیلوں کا نظام

وزارت ہٰذا خوردنی تیلوں کی معیشت کے تال میل اور نظم ونسق کو بھی سنبھالے ہوئے ہے۔ اس میں پبلک ڈسٹری بیوشن کے تحت درآمد شدہ خوردنی تیلوں کی سپلائی اور تقسیم بھی شامل ہے۔ سرکار کی مربوط کوششوں کی مدد سے خوردنی تلہنوں کی پیداوار بڑھی اور تیلوں کی سپلائی کے نظام میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس کے ساتھ ہی ملک میں خوردنی تیلوں کی مانگ بڑھی، اس کا ایک سبب تو اضافہ آبادی ہے اور دوسرے عوام کے معیار زندگی میں اضافہ ہے۔ اگرچہ تیلوں کی پیداوار میں اضافہ کے باوجود یہ مطلوبہ ضرورتوں سے کم ہے تاہم اس اضافے نے مانگ اور رسد کے فرق کو بڑی حد تک کم ضرور کیا ہے۔

منصوبہ بندی کمیشن کے اندازوں پر مبنی تیل کی مانگ اور پیداوار کے اعداد وشمار گزشتہ پانچ برسوں میں اس طرح ہیں:۔

سال	خوردنی تیلوں کی مانگ	خوردنی تیلوں کی پیداوار
۱۹۸۹-۹۰	۵۷٫۷۲	۴۷٫۲۲
۱۹۹۰-۹۱	۶۰٫۲۶	۵۴٫۰۰
۱۹۹۱-۹۲	۶۲٫۸۵	۵۲٫۴۰
۱۹۹۲-۹۳	۶۵٫۵۹	۶۱٫۰۱
۱۹۹۳-۹۴	۶۷٫۲۰	۶۱٫۷۰
۱۹۹۴-۹۵	۶۹٫۸۵	۶۴٫۰۰ (نشانے)

عارضی طور پر ضرورتوں کو جلد سے جلد پورا کرنے کے لیے خوردنی تیلوں کی درآمدات کا سہارا لیا گیا ہے البتہ تلہنوں اور تیل کی پیداوار میں اضافے سے خوردنی تیلوں کی درآمدات کافی حد تک کم ہو گئی ہیں۔

صارفین کا تحفظ

سرکار نے صارفین کے تحفظ کو سب سے زیادہ مقدم سمجھا ہے، یہ وزارت صارفین کے تحفظ کے لیے کلیدی کردار ادا کر رہی ہے۔ ملک میں صارفین کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے بہت سے نئے اقدامات کیے گئے ہیں۔

صارفین کے تحفظ کے قانون مجریہ ۱۹۸۶ء میں ترمیم کی گئی ہے اور اسے مزید موثر بنایا گیا ہے۔ اس قانون کے تحت کچھ مزید سروسز (خدمات) کو لیا گیا ہے۔ تمام اضلاع میں صارفین کے تحفظ کے لیے فورم قائم کیے جا چکے ہیں۔ اس وقت ملک میں ۳۱ ریاستی کمیشن اور ۵۵۴ ضلعی فورم ہیں۔ ان فورموں کو مضبوط بنانے کے لیے مرکز نے ریاستوں کو ۶۱ کروڑ روپے کی گرانٹ دی ہے، یہ اب تک کی سب سے بڑی گرانٹ ہے۔

تمام ریاستوں میں صارفین کے تحفظ کی کونسلیں قائم کی جا چکی ہیں جو صارفین کے تحفظ کی سرگرمیوں پر نظر رکھتی ہیں اور اس راست کو موثر بنانے کے لیے مشورے دیتی ہیں۔ مرکز کی سطح پر صارفین کے تحفظ کی مرکزی کونسل باقاعدگی سے صارفین کے تحفظ کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتی ہے۔ وزارت میں صارفین کی شکایات سننے کے لیے ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے اس شعبہ کی سربراہی ڈپٹی سکریٹری کے مرتبے کے ایک افسر کو سونپی گئی ہے۔

ملک میں صارفین کی بہبود کی سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کے واسطے صارفین کی بہبود کے لیے فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ اس فنڈ میں ۱۹ کروڑ روپے سے زیادہ رقم رکھی گئی ہے اور یہ ایک تسلسل کے ساتھ چلنے والا فنڈ ہے۔ صارفین کے تحفظ کے لیے جو بھی پروجیکٹ شروع کیے جاتے ہیں، ان کے لیے اسی فنڈ سے امداد دی جاتی ہے۔

صارفین کے لیے کوآپریٹو شعبہ

صارفین کے کوآپریٹو اداروں کے لیے سرکار نے پچھلے ۳۰ برسوں میں ۳۰۰ کروڑ روپے

کے لگ بھگ قرضے، ایکوٹی سرمایہ اور سبسڈی وغیرہ منظور کیے۔ ۱۹۹۵ء تک ملک میں صرف تین محکمہ جاتی اسٹور تھے۔ ایک بمبئی میں، دوسرا کلکتہ میں اور تیسرا مدراس میں۔ سرکار کی مالی امداد سے اب ملک کے مختلف حصوں میں سپر بازار اور محکمہ جاتی اسٹور کھولے گئے ہیں۔ اب قصبات اور شہروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سو سے زیادہ کنزیومرز کوآپریٹو اسٹور ہیں جہاں صارفین کو خوردہ اشیاء مل جاتی ہیں۔ ان میں سے ۱۳ خوردہ دکانیں ایسی ہیں جن کی سالانہ خوردہ فروخت ۵ سو کروڑ روپے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں سے ایک دکان دہلی میں ہے اور باقی ۱۲ دکانیں مہاراشٹر میں ہیں۔

کنزیومر کوآپریٹو دکانیں اس طرح کام کرتی ہیں کہ ان سے دوسری دکانوں کو بھی تحریک عمل ملتی ہے مثلاً ہر چیز کے پیکٹ پر قیمت کا اندراج، دکان سے خود سامان اٹھانا اور پھر ایک مقررہ جگہ پر اس کی قیمت ادا کرنا۔ گزشتہ ۲۰ برسوں میں تقریباً ایک ہزار سپر مارکیٹ کے قسم کی دکانیں کھولی گئیں جہاں گاہک اپنا سامان خود اکٹھا کر کے ایک کاؤنٹر پر اس کی قیمت ادا کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے نظام سے گاہک کے اس حق کو تقویت پہنچی ہے کہ اسے ہر چیز کی قیمت جاننے، اس کے معیار کو پرکھنے اور اس کی اچھائی برائی کو پہچاننے کا حق حاصل ہے۔ یہی باتیں صارفین کے تحفظ کے قانون کی جان ہیں۔ اب ملک میں بھی سپر مارکیٹ کھولے جا رہے ہیں۔

البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ صارفین کے کوآپریٹو اداروں کا فروغ نہ تو متوازن ہے اور نہ ہی یکساں طور پر ملک کے مختلف حصوں میں ہو سکا ہے۔ صرف مہاراشٹر، تمل ناڈو، گوا، نئی دہلی اور انڈمان نکوبار میں بہترین کنزیومر کوآپریٹو اسٹورز ہیں۔ گجرات میں احمد آباد اور بڑودہ میں، مدھیہ پردیش میں بھوپال اور بھلائی میں، مغربی بنگال میں کلکتہ، بالدیہ اور درگا پور میں کامیاب سپر مارکیٹ ہیں۔ ان دکانوں پر مختلف طرح کا سامان مقابلتاً سستے نرخ پر فروخت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے بھی بیوپاری اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ نہیں کر پاتے۔

اشیائے ضروری کا قانون مجریہ ۱۹۹۵ء

سرکار نے دو قانون بنائے ہیں جن کے ذریعے سے ایک تو صارفین کو ضروری سامان بآسانی مل جاتا ہے اور دوسرے ان کو تاجروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک قانون کا نام ہے ضروری اشیاء کا قانون مجریہ ۱۹۵۵ء، دوسرا ہے چور بازاری کی روک تھام اور ضروری اشیاء کی فراہمی کو برقرار رکھنے کا قانون مجریہ ۱۹۸۰ء۔ ان دونوں قوانین کی مدد سے اشیاء کی پیداوار، تقسیم اور قیمتوں کے ضابطوں پر کنٹرول رکھنے میں بھی مدد مل سکی ہے۔ مرکزی سرکار نے ریاستی سرکاروں / مرکز کے زیر انتظام علاقوں کو اختیارات منتقل کر دیے ہیں اور اب ریاستی سرکاریں اور یہ مرکزی علاقے اشیائے ضروری کے قانون مجریہ ۱۹۵۵ء کا نفاذ کر سکتی ہیں۔ اس مسئلے میں ڈیلرشپ، خوردنی تلہنوں، خوردنی تیلوں اور چینی سے متعلق مختلف کنٹرول آرڈر جاری کیے جا چکے ہیں اور ضابطہ شکنی کرنے والے تاجروں کے خلاف تعزیری کارروائی کی جاتی ہے۔ ●

بقیہ: گاندھی جی۔ نیتاجی اور آزاد ہند فوج

اور آزاد ہند فوج کے بہادر سپاہیوں کے ساتھ ۱۹۴۵ء میں انتقامی سلوک خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان واقعات نے انسانی تاریخ کی روح ہلا دی۔

آزادی کی جد و جہد کا آخری مرحلہ آزاد ہند فوج نے نیتاجی سبھاش بوس کی مقناطیسی قیادت میں طے کیا۔ تاریخ آزادی کا یہ سنہرا باب ہندوستان کی سرحدوں کے باہر لکھا گیا۔ یہ تاریخ ساز باب دنیا کی تاریخ میں اپنی وضع کا انوکھا باب ہے۔

بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ آزاد ہند فوج نے جب عبوری حکومت قائم کی تو اس نے ہندوستان کے پہلے دو صوبے جزائر انڈمان اور نکوبار کے نام "شہید" اور "سوراج" رکھے۔ یہ دونوں نام گاندھی جی کو بہت پسند تھے۔ کیوں کہ گاندھی جی شہادت اور سوراج دونوں کے دل و جان سے قائل تھے۔

دوسری طرف یہ عالم تھا کہ نیتاجی اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے بھی گاندھی جی کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہ نیتاجی ہی تھے جنہوں نے گاندھی جی کو سب سے پہلے "راشٹر پتا" کہا۔ سبھاش چندر بوس نے جب گاندھی جی سے آشیرواد مانگا تو گاندھی جی نے دل کھول کر دیا۔ راستے الگ ہونے کے باوجود منزل ایک تھی۔ اپنی مادر وطن کی آزادی دونوں کے لیے جنون تھا۔ جب لال قلعے میں آزاد ہند فوج پر بغاوت کا مقدمہ چلا تو جواہر لال نہرو نے آزاد ہند فوج کی وکالت گاندھی جی کی صلاح سے کی۔ جنگ آزادی کی تاریخ میں مہاتما گاندھی اور نیتاجی سبھاش بوس کی قربانیاں ناقابل فراموش تھیں۔ اب جب کہ نیتاجی کی سو سالہ برسی منائی جا رہی ہے۔ یہ لازم ہے کہ ان کی قربانی کو پورے خلوص کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا جائے اور تمام تاریخی حقائق منظر عام پر آئیں۔ ●

بقیہ: گھریلو صنعتیں اور ملک کی معاشی ترقی

یہی وجہ ہے کہ دیہی جوانوں نے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو کھولنے میں صحیح طریقے سے دلچسپی نہیں لی۔ آمد و رفت کے ذرائع میں زیادہ سدھار ہو۔ گاؤں کو بڑے شہروں اور قصبوں سے جوڑا جانا ضروری ہے۔ کیوں کہ ان سے مال آسانی سے لے جایا جا سکے۔ تعلیم پیشہ دارانہ اور تکنیکی ہو۔ جس سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد صنعتوں کی طرف نوجوان لڑکے اور لڑکیاں دلچسپی لیں ابھی تک وہ سرکاری نوکریوں کی ہی طرف بھاگتے رہے ہیں"۔ گاؤں کی طرف چلو" کا نعرہ دے کر ہی ایسی صنعتوں کی طرف دھیان دیا جا سکے گا۔ گاؤں میں آسانی سے زمین بھی ملتی ہے اور خام مال بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔

مغرب کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے لیے بڑی بڑی صنعتیں صحیح قدم ہیں لیکن بھارت جیسے وسیع ملک کے لیے نہیں۔ اس ملک کا بڑا مسئلہ بڑھتی آبادی کی وجہ سے بے روزگاری کو روکنا ہے۔ یہ سب چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ان کو ترقی دے کر ہی بین اقوامی کمپنیوں کو اپنے ملک میں آنے سے روکا جا سکتا ہے۔ سرکار غیر ملکی کمپنیوں کو بلائے اس سے ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی بھی ترقی مکمل روپ میں کرتی رہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملک کی معاشی ترقی چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں پر ہی منحصر ہے۔ زراعت کے بعد صنعتیں ہی سب سے زیادہ روزگار کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ ●

خورشید عالم

بھارتی معیشت میں ویٹ۔ ایک جائزہ

وزیر خزانہ مسٹر منموہن سنگھ نے ریاستوں کے وزرائے خزانہ کی میٹنگ میں معاشی اصلاحات کے ضمن میں VALUE ADDED TAX (VAT) کی کوششوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ اس کے لیے ابھی سے ماحول بنایا جائے، کیوں کہ عوامی رجحان کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ ویٹ کیا ہے اور اس کا نفاذ کس طرح ہوگا، صنعت کاروں پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ کیا اس سے ٹیکس چوری رک جائے گی اور پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوگا؟ نیز کیا یہ موجودہ ٹیکس سسٹم سے آسان ہوگا یا پیچیدہ؟ اور ہندوستان جیسے ملک میں یہ ٹیکس سسٹم کس حد تک مفید ثابت ہوگا۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے۔

"ویلیو ایڈڈ ٹیکس" جس کو مختصراً (ویٹ) اور اردو میں قدر زائد ٹیکس کہتے ہیں در اصل سیلز ٹیکس کی ایک دوسری شکل ہے۔ یورپ میں سب سے پہلے فرانس نے ۱۹۵۴ء میں اس کو اپنے یہاں نافذ کیا تھا اور ۱۹۶۷ء کے بعد یوروپی تجارتی برادری نے اس کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ ایشیا میں پہلے اسے جاپان نے ۸۰ کی دہائی کے آخری سالوں میں اپنایا تھا لیکن بعد میں اس سے دامن جھٹک لیا۔ اس وقت ایشیا میں بنگلہ دیش جیسے ترقی پذیر ملک نے اس ٹیکس سسٹم کو اپنا رکھا ہے جب کہ بھارت میں ابھی اس کا جائزہ لیا جا رہا ہے

۲/ا اے ۲۳۴، ذاکر نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے قدر زائد ٹیکس (VAT)، سیلز ٹیکس کی ایک دوسری شکل ہے لیکن دونوں میں ایک بڑا فرق ہے۔ سیلز ٹیکس وہ ٹیکس ہے جو فروخت کے سودوں پر لگتا ہے لیکن تجارتی طریقۂ کار میں اسے کسی ایک مرحلہ میں لگایا جاتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح سے ہے کہ کوئی تیار شدہ مال صارفین تک پہنچنے سے پہلے کئی مرحلوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ صنعت کار اسے بناتا ہے، پھر وہ تھوک دوکان دار کے پاس پہنچتا ہے اور تھوک دوکاندار سے پھٹکر دوکاندار کے پاس، پھٹکر دوکاندار سے صارف تیار شدہ مال خریدتا ہے۔ سیلز ٹیکس ان مختلف مرحلوں میں سے کسی ایک مرحلے پر لگایا جاتا ہے، ویسے عام طور پر یہ ٹیکس تھوک دوکاندار یا پھٹکر دوکاندار کے مرحلہ میں ہی وصول کیا جاتا ہے۔ دوکانداروں کے پاس سیلز ٹیکس رجسٹریشن نمبر ہوتا ہے اور جس دوکاندار کے پاس یہ رجسٹریشن نمبر ہوتا ہے وہ بغیر کسی ٹیکس کی ادائیگی کیے خام مال یا تیار شدہ مال خرید سکتا ہے۔ اسی طرح وہ کسی دوسرے خریدار کو جس کے پاس سیلز ٹیکس رجسٹریشن نمبر ہے بغیر سیلز ٹیکس لگائے ہی اس خریدار کو مال فروخت کر سکتا ہے اور اگر خریدار کے پاس سیلز ٹیکس رجسٹریشن نمبر نہیں ہے تو پھر اسے سیلز ٹیکس دینا پڑے گا اور سیلز ٹیکس لگانے والا دوکاندار اس ٹیکس کو سیلز ٹیکس آفس میں جمع کرائے گا۔

سیلز ٹیکس اور قدر زائد ٹیکس (VAT)

سیلز ٹیکس اور قدر زائد ٹیکس (VAT) میں جو بنیادی فرق ہے وہ یہ ہے کہ قدر زائد ٹیکس (VAT) سامان کی ریٹیل فروخت کی کل قیمت پر نہیں لگتا ہے بلکہ پیداوار کے مختلف مرحلوں میں ہونے والے کل قیمت پر لگتا ہے اس لیے اس طریقۂ کار میں خریدار کو مال کے کل قیمت پر ٹیکس کی ادائیگی نہیں کرنا پڑتی بلکہ خالص قیمت (NET VALUE) پر کرنا پڑتی ہے۔ خالص قیمت، کل قیمت سے یا دوسری فرموں وغیرہ سے خریدے گئے مال کی قیمت گھٹا کر حاصل کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ قدر زائد ٹیکس (VAT) اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس طریقۂ کار میں ٹیکس کی ادائیگی کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ اصولی طور پر ٹیکس چاہے ویٹ کے ذریعہ لگایا جائے یا پھٹکر دوکانداروں کے ذریعہ یکساں ہونا چاہیے۔

قدر زائد ٹیکس (VAT) کی افادیت کا جہاں تک سوال ہے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جس طرح دیگر طریقۂ کار میں کچھ خوبیاں، خامیاں ہوتی ہیں اسی طرح اس طریقۂ کار میں بھی ہیں۔ قدر زائد ٹیکس (VAT) کے جو فوائد بتائے جاتے ہیں اس کے مطابق اس طریقۂ کار سے ٹیکس چوری کے امکانات توقع سے بھی کم ہوں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طریقۂ کار میں ٹیکس مختلف مرحلوں میں لگتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی دوکاندار ٹیکس چوری کرنا بھی چاہتا ہے تو وہ توقع سے کم ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ جن لوگوں سے پہلے کچا مال خریدا گیا ہے ان لوگوں یا فرموں کے ذریعہ چکائے گئے ٹیکس کا حساب رکھنا خود کمپنی یا فرم کے اپنے مفاد میں ہوتا ہے۔ بصورت دیگر اس کمپنی یا فرم کو وہ ٹیکس خود ادا کرنا پڑے گا اور اگر کوئی

کمپنی یا فرم جو مال بناتی ہے اور فروخت کو کم دکھاتی ہے تو وہ پکڑی جائے گی کیوں کہ دوسری فرم جس سے مال خرید اگیا ہے وہ اپنی فروخت کا حساب محکمۂ ٹیکس کو دے گی۔

قدر زائد ٹیکس (VAT) کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے برآمدات کو بڑھاوا ملے گا۔ دوسرے ملکوں کو برآمد کیے جانے والے مال پر چکائے گئے ٹیکس کی واپسی حکومت ایکسپورٹروں کو کر سکتی ہے۔ کیوں کہ اس طریقۂ کار میں پیداوار لاگت سے ٹیکس کو الگ کرنا آسان ہوتا ہے جب کہ رائج طریقۂ کار میں پیداوار لاگت میں ٹیکس مل جاتا ہے کیوں کہ وہ کل قیمت پر ٹیکس لگتا ہے۔ اس کے علاوہ گیٹ معاہدے کے تحت دیے جانے والی چھوٹ (REBATE) برآمدات کو بڑھاوا دینے میں مددگار ثابت ہوگی۔

اقتصادیات کے ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ قدر زائد ٹیکس (VAT) کے طریقۂ کار سے کارکردگی میں اضافہ ہوگا، وہ اس لیے کہ کسی کمپنی یا فرم کو ٹیکس ادائیگی سے اس وقت بھی آزاد نہیں کیا جاتا جب اسے نقصان ہوتا ہے کیوں کہ کوئی کمپنی یا فرم ٹیکس اپنے منافع پر نہیں بلکہ پیداوار کی قیمت پر چکاتی ہے اس لیے ہر کمپنی یا فرم اپنی کارکردگی بڑھا کر پیداواری لاگت کم کرنے کی کوشش کرتی ہے یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ملک اس طریقۂ کار سے کارکردگی بڑھانے کے مواقع کم ہی ہوتے ہیں۔

قدر زائد ٹیکس (VAT) کے طریقۂ کار سے کیا صارفین کو بھی راحت ملے گی یا اس کا فائدہ صرف دوکانداروں کو ہوگا۔ کیوں کہ بھارت جیسے ملک کے بازار پر صارفین کا نہیں بلکہ دوکاندار کا قبضہ ہے اس لیے یہ کہنا کہ اس طریقۂ کار سے پیداواری کارکردگی بڑھ جائے گی اور پیداواری لاگت کم ہو جائے گی، مناسب نہیں ہوگا کیوں کہ یہاں عام طور پر چیزوں کی کمی رہتی ہے اور چیزوں کی جمع خوری ہو جاتی ہے اور جب چاہے قیمت بڑھا لی جاتی ہے نتیجتاً آج بھی گھٹیا چیزیں اونچے داموں پر بکتی ہیں۔

قدر زائد ٹیکس (VAT) کے طریقۂ کار کو اپنانے کے لیے ایماندار اور محنتی سرکاری افسروں کی ضرورت ہے جو پیداوار کے ہر مرحلہ میں اچھی طرح ایمانداری سے جانچ پڑتال کر کے ہر ایک کمپنی یا فرم کو صحیح ٹیکس ادائیگی کا پتا لگائیں اور اس کو ٹیکس ادا کرنے کے لیے اکسائیں لیکن اس کے باوجود اس میں ٹیکس چوری کی گنجائش تو بنی رہتی ہے۔

ماہرین اقتصادیات کی رائے کے مطابق قدر زائد ٹیکس (VAT) کے طریقۂ کار کو اپنانے والے ممالک کی مالی حالت اقتصادی لحاظ سے مضبوط ہونا چاہیے اور وہاں کی کمپنیوں و فرموں میں صحیح حساب کتاب رکھنے کی عادت ہونی چاہیے۔ اس رائے کی روشنی میں اگر یہاں کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہے کہ اقتصادی لحاظ سے ملک کی صورت حال کچھ بہتر نہیں ہے اور یہاں کے صنعت کاروں میں حساب کتاب رکھنے کی عادت بھی نہیں ہے کیوں کہ یہ عام ذہن ہے کہ اگر سارا حساب کتاب صحیح رکھا گیا تو ان کی کمائی کا بیشتر حصہ ٹیکس میں چلا جائے گا اور وہ کھائیں گے کیا؟ اس کی بنیادی وجہ ملک میں ٹیکس کی اونچی شرح کا ہونا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ قدر زائد ٹیکس (VAT) کے طریقۂ کار سے بے ایمانی کتنی کم ہو جائے گی اور ٹیکس کی وصولیابی میں کتنا اضافہ ہو سکے گا یہ تو اس طریقۂ کار کو اختیار کرنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔ ●

بقیہ: معیشت کی پیش رفت کا گاندھیائی طریق کار

اور یہ امیر اور غریب کے درمیان لین دین کے طریقۂ کار سے ممکن ہو سکتا ہے اس میں نہ تو فرد کا غیر معمولی مالکانہ حق ہوتا ہے اور نہ ہی حکومت کے پیداواری وسائل کا اختیار۔ اجتماعی مفاد میں یہ دونوں نظریے نقصان دہ ہیں۔ گاندھی جی ایک ایسا سماجی نظام چاہتے تھے یا ان کا معاشی نظام ایسا تھا جس میں کوئی [illegible] استحصال نہیں ہے، کوئی دھوکہ یا فریب نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی معیشت پر مبنی ہے جس میں باہمی تعاون اور معیشت کے مکمل اختیار کو عمل دخل حاصل ہے۔

گاندھی جی اس لیے ایک ایسے خود مختار اور خود کفیل گاؤں کی تشکیل چاہتے تھے جو سماجی وجود کی ایک یونٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور جس میں انسان باہمی رشتوں کے بہت قریب ہوتا ہے۔ انھوں نے آگے اس کا تجزیہ پیش کیا کہ گاؤں کی پنچایت قانون سازیہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے بہترین فرائض انجام دے سکتی ہے۔ کچھ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ گاندھی جی امیروں کے دوست تھے۔ اس سے بڑا جھوٹ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ چوں کہ وہ سرودے (سب کی ترقی) چاہتے تھے اس لیے وہ سبھوں کو معاشی ترقی اور سماجی انصاف دلانے کے حامی تھے۔ ۔ ۔ ۔ گاندھی جی کے پروگرام کے حسب ذیل اہم نکات ہیں۔

(۱) معاشی ترقی صرف مادی ترقی پر مبنی نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کا مقصد افراد کی زندگی کی سماجی قدروں کے اعلیٰ وسائل کا قیام ہونا چاہیے صنعت کاری سے مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ ہو سکتا ہے لیکن اس سے کوئی سماجی بدلاؤ نہیں ہو سکتا۔

(۲) گاندھی جی کا نسخہ سب کو روٹی کے لیے لازمی طور سے کام، سماج کی مصنوعی تقسیم متعدد طبقوں اور ذاتوں کی خاطر تھا۔ وہ ان تمام لوگوں کی عزت کرتے تھے جو جسمانی محنت کے ذریعہ اپنی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ضرورت کے مطابق اجرت فراہم کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ایک حجام کی تنخواہ ایک فلاحی سماج میں ایک پروفیسر کی تنخواہ کے برابر ہونی چاہیے۔

(۳) گاندھی جی نئے پن کو پرانے پن کی جگہ اندھا دھند تسلیم کر لینے کی وکالت نہیں کرتے تھے۔ سماجی تشکیل نو کی ان کی پیش قدمی جدید ترین تلاش تھی جو زندگی کے معیار کو بہترین بناتی ہو اور جس میں مکمل روزگار فراہم ہونے کا یقین ہو اور جس سے غریبی دور ہوتی ہو اور جس میں سماجی برابری کا زیادہ امکان ہو۔

اس مقالہ کو پروفیسر دانتوالا کے اقتباس پر ختم کرنا چاہیں گے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ مارکس نے ۱۹ویں صدی کی سرمایہ داری کو تریاق فراہم کیا تھا۔ گاندھی جی نے ۲۰ویں صدی کو دیکھا تھا اور بعد کے عہد کی سرمایہ داری اور اجتماعیت کے مرض کی دوا تشخیص کی۔ سماج واد اکیلے بڑے آدرشوں کی بلندی پر جمہوریت کو نہیں چڑھا سکتا، اسے نئے آدمی کی مدد کی ضرورت ہوگی جو برے کاموں کا مقابلہ کر سکے لیکن یہ سرگرمیاں عدم تشدد کے ساتھ ہی انجام پا سکتی ہیں۔ ●

ترقی میں عورتوں کا حصّہ

قرضوں کی عدم فراہمی ہمارے ملک کی ضرورت مند و مجبور عورتوں کے لیے معاشی طور سے خود کفیل بننے کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ رہی ہے۔ تمام کمیٹیوں اور کمیشنوں کی رپورٹ ہے کہ شاخوں کے وافر جال کے باوجود باقاعدہ قرضہ دینے والی انجمنوں سے مجبور عورتوں کو قرضہ ملنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس کے وجوہات میں ایک تو ان انجمنوں کے قرض دینے کے طریقے بڑے سخت ہوتے ہیں اور دوسرے بینک اسٹاف مجبور عورتوں کی ضرورتوں کو نظر انداز کرنے کا رویہ عورتوں کے ذاتی روزگار اور غیر رسمی پیشے کی عورتوں کے لیے بنائے گئے قومی کمیشن نے اپنی سفارشات میں ذاتی کاروبار میں لگی عورتوں کے لیے ایک قرضہ دینے والی انجمن کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مارچ ۱۹۹۳ء میں حکومت نے ایک خود مختار ادارے کی شکل میں عورتوں کے لیے ایک "راشٹریہ مہیلا کوش" (رام کو) کی بنیاد ڈالی۔

اس کمیشن کا نظام ایک گورننگ باڈی چلاتی ہے جس میں اہم غیر سرکاری اداروں کے عہدیداروں اور سماجی کاموں میں ناقابل فراموش تعاون دینے والے افراد کو شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح "رام کو" کے اصول وضوابط وضع کرتے وقت عورتوں کی ترقی اور ان کی ضرورتوں کے تئیں مخصوص نقطۂ نظر اپنایا جاتا ہے اور بنیادی سطح پر کام کر رہی رضا کارانہ تنظیموں اور سرکاری عہدیداران کے تجربے کا فائدہ بھی انھیں ملتا ہے۔

قرضہ تجربہ کار غیر سرکاری اداروں کے ذریعے دیا جاتا ہے۔ غیر سرکاری اداروں کو آٹھ فی صدی شرح سود پر مختصر المدت اور درمیانی مدت کے قرضے اس طرح دلوائے جاتے ہیں جس سے قرض پانے والے کو ہر حال میں ۱۲ فی صد سے زیادہ سود نہیں دینا پڑے۔ "کوشش" قرضہ دار عورتوں کو کاروبار / پیشے میں دلچسپی بڑھانے کے لیے چھوٹے موٹے چندے بھی دیتا ہے۔

"رام کو" نے نومبر ۱۹۹۳ء سے کام کرنا شروع کیا ہے۔ دسمبر ۱۹۹۴ء کو ایک سال کی مدت میں فعال اداروں سے ۴۹ر۱۹ کروڑ روپے قرض کے لیے ۸۷ درخواستیں موصول ہوئیں۔ اس مدت میں منصوبے کے مطابق ۵۴۵۴۸ عورتوں کو قرض دیا گیا۔ مختصر مدتی قرضوں کی شکل میں ۵۴ر۳۰۴ لاکھ روپے اور درمیانی مدتی قرض کی شکل میں ۹۹ر۱۶۴ لاکھ روپے دیے گئے۔

زیادہ قرض (۳۰ فی صد) دودھ دینے والے جانوروں کے لیے دیے گئے۔ چھوٹے موٹے کاروبار کے لیے ۱۷ فی صد اور خوردنی اکائیوں کے لیے ۱۵ فی صد کے علاوہ امداد باہمی انجمنوں کو قرض اور گھریلو صنعت وغیرہ کے لیے بھی قرض دیے گئے۔

آندھرا پردیش، اتر پردیش، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور کیرل کے غیر سرکاری اداروں کے معاملوں میں عورتوں کو قرض میں دی گئی سہولت کے تجزیے سے یہ پتا چلتا ہے کہ قرض کی سہولت سے نہ صرف عورتیں فاضل آمدنی کے حصول میں پورے طور پر کامیاب ہوئیں ہیں، بلکہ مشورے اور فیصلے میں بھی وہ شامل ہونے لگی ہیں۔

"رام کو" نے سودوں میں دور اندیشی اور بھرپور یقین سے اپنے حصہ دار غیر سرکاری اداروں کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ اس کے لیے "کوشش" کے عہدیداران غیر سرکاری اداروں سے مشورہ کرتے رہتے ہیں اور ان کے مشورے پر دھیان دیتے ہیں۔ یہ ادارے بھی کوش کے کام کرنے کے طریقے میں سدھار کے لیے اپنے قیمتی مشورے دیتے رہتے ہیں۔ کوش کپاٹ سی ایس ڈبلو بی، این آئی پی سی سی ڈی اور ریاستوں کے سماجی فلاح کے شعبوں کے ساتھ بھی تال میل پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

کوش کی ۱۲ر دسمبر ۱۹۹۴ء کو ہوئے سالانہ جلسۂ عام میں ترقی کی رفتار کو اور تیز کرنے کے لیے ایک ٹھوس پلان وضع کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کمیشن نے قرضہ دار عورتوں کی موت، بڑے حادثوں اور مخصوص حالتوں میں پیداواری اثاثے کے خسارے یا نقصان کی صورت میں ان کے قرضوں کو معاف کرنے کے مقصد سے غیر سرکاری اداروں کو تعاون دینے کے لیے ایک ٹھوس بعد موت امداد اور بازآبادکاری کے اصول بھی بنائے گئے ہیں۔

"رام کو" کے قرض منصوبے سے مستقبل کے تئیں بڑی امیدیں پیدا ہوئی ہیں۔ یہ نہ صرف عورتوں کی غریبی کے خاتمے کے لیے قرض بازار میں اپنی جگہ بنا رہا ہے بلکہ انھیں معاشی طور سے خود کفیل بنانے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔ کل ملاکر ملک کی ترقی میں عورتیں یقینی طور پر حصہ دار بن رہی ہیں۔

سنجیو کمار

گھریلو صنعتیں اور ملک کی معاشی ترقی

ہمارے ملک کی معیشت کی ترقی کی ذمہ داری زراعت اور صنعت پر ہے۔ بھارت کے معاشی حالات کو دیکھتے ہوئے صنعتی انقلاب چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ زراعت کی مکمل طور پر ترقی کی بنیاد زراعت کے علاوہ پیداوار کے میدان کو وسعت دینا ہے اس کے لیے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور دیہی صنعتوں کا جال بچھانے کی ایسی حالت کو جنم دینا ہے جو کہ ہماری لیاقت، ماحول اور ذرائع کی حد کے اندر ہوں۔

ہمارے ملک کی معاشی ترقی چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں سے ہی ممکن ہے۔ عام آدمی بڑی صنعتیں نہیں کھول سکتا کیوں کہ اس سرمایہ کی بڑے پیمانے پر ضرورت پڑتی ہے اور ہمارے ملک میں دولت کی تقسیم غیر مساوی ہے۔ دولت مٹھی بھر لوگوں کے پاس ہی جمع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی صنعتوں پر ٹاٹا، برلا، موہن سنگھانیہ، کیلوسکر، مودی، ڈالمیا، بجاج، ہندوجا جیسے خاندانوں نے قبضہ کیا ہوا ہے صنعتوں کے علاوہ ذرائع ابلاغ (نشر و اشاعت) پر بھی ان کا قبضہ ہے۔ گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو کم لاگت پر آسانی سے قائم کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے ملک کا سب سے بڑا مسئلہ آبادی کا تیز رفتار اضافہ ہے جو کہ ترقی سے متعلق کاموں کو ٹھپ کرتی ہے۔ آبادی کے اضافہ کی وجہ سے بے روزگاری بڑھتی ہے اور بے روزگاری کی وجہ سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں غلط راستے پر چلنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ بڑی بڑی صنعتوں کی وجہ سے بے روزگاری پھیلتی ہے کیوں کہ جس کام کو کئی مزدور کر سکتے ہیں اسے ایک مشین کم وقت اور کم لاگت میں کرتی ہے ایسا ہونے پر مزدور بے روزگاری کی طرف چلتے ہیں۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار مہیا کرایا جاسکتا ہے۔

ہمارے ملک کی بہت سی عورتیں خالی بیٹھی رہتی ہیں، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کے ذریعے گاؤں کی زیادہ تر عورتیں گاؤں میں رہ کر کام کر سکتی ہیں انھیں بڑے شہروں کی طرف ترک سکونت کرنے کی ضرورت نہیں۔

مرد آج گاؤں چھوڑنے کو مجبور ہیں انھیں روزگار کی تلاش میں ہزاروں میل جانا پڑتا ہے۔ اگر گاؤں میں ہی چھوٹی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کا فروغ ہو تو انھیں باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔

مہاتما گاندھی کہتے تھے "بھارت گاؤں کا دیش ہے اس لیے چھوٹے پیمانے اور گھریلو صنعتوں کے ذریعے دیہات کے عوام کو فائدہ ہو سکتا ہے اور ان کے ذریعے بے روزگاری، غربت اور استحصال وغیرہ جیسے مسائل کافی حد تک ختم ہو سکتے ہیں۔ بھارت کی آتما گاؤں میں بستی ہے جب تک گاؤں کی صحیح اور مکمل ترقی نہیں ہوگی تب تک آزادی کا تصور برائے نام ہے۔"

گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں خاص تربیت کی ضرورت نہیں پڑتی ان میں تکنیکی علم کی ضرورت ہوتی ہے یہ صنعتیں بڑی بڑی صنعتوں کے لیے مددگار کے روپ میں کام کرتی ہیں۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہماری سرکار نے گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کے لیے کچھ نہیں کیا۔ آزادی حاصل کرتے وقت کاٹیج انڈسٹری بورڈ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ پہلے پنج سالہ منصوبے میں اکھل بھارتیہ کھادی اور گرام اُدیوگ بورڈ، سلک بورڈ جیسے کئی بورڈ قائم ہوئے۔ اگرچہ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں بڑی بڑی صنعتوں کو بڑھاوا دیا گیا تھا لیکن چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مالیاتی کارپوریشن اور صنعتی کارپوریشنوں کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۶۹ء میں ۱۴ بینکوں کو قومیایا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں ۶ اور بینکوں کو قومیایا گیا ایسا ہونے پر چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کو آسانی سے قرضہ ملنے لگا۔ ۱۹۸۰ء میں کونسل آف ایڈوانسمینٹ آف نیشنل ٹکنالوجی ادارہ قائم ہوا۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتی ترقی اور گھریلو صنعتی ترقی بینک کا بھی قیام عمل میں آیا۔

اتنا ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان صنعتوں کو پورے طور پر فروغ حاصل ہوا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان صنعتوں پر صحیح ڈھنگ سے دھیان نہیں دیا گیا ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ بڑی بڑی صنعتوں کو کھولا ہی نہیں جاتا لیکن ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا رجحان بڑی صنعتوں کی طرف تھا، وہ مغربی تہذیب میں پلے بڑھے تھے اور ملک کے کئی مسائل سے بے خبر تھے ان کو گاندھی جی کے اصولوں پر چلنا چاہیے تھا۔

ہم کو چاہیے کہ دیہی علاقوں میں بینکوں کی شاخیں زیادہ تعداد میں کھولیں چوں کہ وہاں پر مالی اداروں کا آج بھی مکمل طور پر انتظام نہیں ہو پایا ہے۔

باقی صفحہ ۳۱ پر

اے-۴- سوچیتا اپارٹمنٹ - پلاٹ نمبر ۱۵، وسندھرا انکلیو، دہلی ۹۲

ایم۔ کے۔ دھرم راجا

عظیم "سی۔ کے"

ہندوستانی کرکٹ کی تاریخ میں سی۔ کے نائیڈو کا تحریک دلانے والا ممتاز نام روشن و نمایاں ہے۔ وہ مہارت، استادی، امتیازی شان اور ہمہ گیری جیسی صفات سے متصف کھلاڑی تھا۔ اس کے کھیل کی تابانی تماشائیوں کے دلوں میں جذبات کی لہر موجزن کر دیتی تھی۔ کریز میں اس کی محض موجودگی مخالف ٹیم کے گیند بازوں اور فیلڈروں کے بدن میں ایک طرح کا لرزہ پیدا کر دیتی۔ اعلا درجہ کا فیلڈر تھا۔ ٹیم کی قیادت کرنے والوں کے لیے وہ کپتان کی حیثیت سے جیتی جاگتی مثال تھا۔ اس کی بارعب موجودگی اور کسرتی بدن سے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ جسمانی اور دماغی اعتبار سے فوق العادہ شخص کے مانند ہے کہ وہ کرکٹ کھیلنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔

کوٹاری کنکیا نائیڈو ۱۸۹۵ء میں بمقام ناگپور پیدا ہوا۔ وہ ممتاز ورزش کار تھا۔ اسکول میں کئی کھیلوں میں فضیلت رکھتا تھا لیکن جو ان سال کوٹاری نے سنجیدگی سے تمام تر توجہ کرکٹ پر صرف کی۔ کرکٹ کیریر کے اوائل میں ہی ایک بہترین موقعے کا حصول اس کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ افسانوی "راجی"، نوان نگر کے جام صاحب، نائیڈو کے والد کے کیمبرج میں انڈر گریجویٹ کے زمانے سے دوست تھے۔ راجی لڑکے کے غیر معمولی قد و قامت اور چستی جیسے خداداد ملکہ سے نہایت متاثر ہوئے۔ نائیڈو کے والد سے پوچھا کہ وہ گیند کو ہٹ کیوں نہیں کرتا؟ اس کے بعد والد کی محتاط نگرانی میں اعلاترین طوفانی بلے باز بن گیا۔

کسی بھی آرزومند کھلاڑی کے لیے توانائی اور قوت برداشت لازمی عنصر ہیں۔ نائیڈو نے بڑھتی عمر کے ساتھ جسمانی ورزش کی پابندی قائم رکھ کر یہ عنصر حاصل کیے۔ اس میں کوئی شک نہیں نوجوان سی۔ کے کو کرکٹ کے کیریر کے آغاز میں ہی قابل ذکر کامیابی نصیب ہوئی۔ اول درجہ کے کرکٹ میں اس کا آغاز ناقابل تقلید چابکدستی سے ہوا، جب اس نے پہلے پہل کھیل میں پہلی ہی گیند پر چھکا لگا دیا۔ یہ کھیل بمبئی کے جو گوشہ میدان میں ہوا۔ یہی مبارک میدان تھا جہاں نوخیز نائیڈو چکا چوندھ کر دینے والے کھیل کی بنا پر بین اقوامی کرکٹ میں داخل ہوا۔ کھیل کے تماشائی جو گوشہ میدان میں نائیڈو کو زقند بھرتے رعب سے آتے دیکھ کر اس انتظار میں رہتے کہ وہ اپنے عقوبتی بلے سے نظر فریب کھیل کا مظاہرہ کرے گا۔ کھیل کے پر جوش شائقین اسی توقع کے ساتھ مدراس میں ہندوستانیوں اور یوروپین کے درمیان سالانہ پریزیڈنسی مقابلے میں اس کی شرکت کے منتظر رہے۔

نائیڈو کا نام انتہائی خوفناک گیند بازوں کی گیندوں پر چھکے لگانے کی قابلیت کی بنا پر شامل کیا گیا۔ ہند میں تقریباً تمام کرکٹ کے میدانوں میں وہ نشان جہاں اس کی گیندیں چھکوں کے بعد بلندی میں پرواز کرتی زمین پر گرتیں اس کے گواہ ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ہندوستانی ٹیم کے ہمراہ انگلستان کے دورے کے دوران ایک چھکا دریا کے اس پار گرا جو وارِوک شائر اور وورسسٹر شائر کے درمیان حد بندی کا کام دیتا ہے۔ نائیڈو واحد کھلاڑی ہے جسے ایک کاؤنٹی سے دوسری کاؤنٹی میں گیند پہنچانے کا شرف حاصل ہے۔

یہ اس قابل ذکر کرکٹ کے کھلاڑی کی زبردست بلے بازی کے واقعات میں سے ایک ہے، جس کی بنا پر بین اقوامی کرکٹ میں شمولیت کا موقع ملا۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب ۱۹۲۵-۲۶ء میں ایم سی سی کی ٹیم نے آرتھر گلیگن کی قیادت میں بمبئی میں میچ کھیلا۔ "سی۔ کے" نے بلے بازی کی غیر معمولی تخلیق کا مظاہرہ ایسی حالت میں کیا جب ایم سی سی کی ٹیم میں موریس ٹاٹے جیسے نامور پایہ کے گیند باز شامل تھے۔ جب نائیڈو نے پریشان کن سنچری چھکوں اور چوکوں کی مدد سے پوری کی تو امپائر بھی بے حد متاثر ہو کر تالیاں بجانے لگے۔ اس لیے ۱۵۳۔ رنز گیارہ چھکوں اور ۱۳۔ چوکوں کی مدد سے صرف سو منٹوں میں بنا لیے۔ گلیگن نے اس کارنمایاں کو ایک ماہر بلے باز کی حقیقی عظیم انگز سے تعبیر کیا۔ نائیڈو دونوں ٹیموں میں بہترین فیلڈر رہا۔

ایم سی سی کا کپتان ہندوستانی کرکٹ کے معیار نیز بلے بازی خاص طور پر نائیڈو کی استعداد سے نہایت متاثر ہوا۔ ان اہم وجوہات میں جس کی بنا پر ہند کو کرکٹ کھیلنے والی ٹیموں کی برادری میں داخلہ ملا، نائیڈو کا واقعہ بھی شامل ہے۔ نیز ۱۹۳۲ء میں انگلستان کے دورے کی راہ بھی ہموار ہو گئی۔ نائیڈو اس سے پہلے بھی اپنے سابق دورہ کے موقع پر انڈین جمخانہ کی طرف سے انگلستان میں کھیل چکا تھا اس کے علاوہ ان کی کپتانی کے فرائض بھی انجام دے چکا تھا۔ حالاں کہ وہ ۳۷ برس کا ہو گیا تھا پھر بھی ہمیشہ کی مانند اعلا کرکٹر تھا۔

سی۔ کے نائیڈو کا یہ بے مثال امتیاز ہے کہ اسے اولین ٹسٹ کپتان ہونے کا شرف حاصل

ہے۔ ٹور کے دونوں کپتان پوربندر کے مہاراجہ اور
دانس کپتان کے۔ انیس گھنشام سنجی نائیڈو کو کپتان
بنانے کے واسطے خوش اسلوبی سے دست بردار ہو گئے۔
اس ٹور میں صرف ایک میچ کھیلا گیا۔ ہندوستانی ٹیم
انگلستان کی تجربہ کار ٹیم کے مقابلے کی نہیں تھی۔
لیکن میزبان ٹیم کو میچ جیتنے کے لیے سخت دشواریوں
سے گزرنا پڑا۔ باوجود اس کے کہ گیند پکڑنے کی کوشش
میں نائیڈو کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا پھر بھی پہلی اننگز میں
سب سے زیادہ ۴۰ رنز بنائے۔ اس نے انگلستان کی
ٹیم کے مقابلے اپنی ٹیم کی قابل ستائش ڈھنگ سے
کپتانی کی۔ وزڈن نے نائیڈو کی ستائش کے دوران
کہا "مہمان ٹیم میں نائیڈو کی موجودگی مایۂ خوش بختی
ہے۔ وہ بیشک ان کا بہترین بلے باز، اعلا اخلاقی
قوت کا حامل، اصل مقصود سے آگاہ ہے۔ اپنے دو
افضل کھلاڑیوں کی عدم موجودگی میں قیادت کے
فرائض سلیقہ مندی سے انجام دیے۔ بلا تردید اس نے
خود کو قابل ستائش اور ممتاز کپتان ثابت کیا۔"

"سی۔ کے" کے لیے یہ ٹور ایک قابل ذکر
ذاتی کامیابی تھا اس نے چھ سنچریز بنائیں، ۱۸۴۲
رنز اسکور کیے۔ اس کا اوسط اسکور ۳۴ میچوں میں
۴۰ رہا۔ دو سنچریز لارڈز میں بنائیں۔ نائیڈو کا لارڈز
پر حیرتناک نمایاں کارنامہ ۳۲ چھکے تھے جو کسی بھی
مہمان ٹیم کا بہترین کارنامہ تھا۔ وزڈن نے "پانچ
کرکٹرز آف دی ایئر" میں اسے انتخاب کر کے خراج
تحسین پیش کیا۔

نائیڈو نے ایک بار پھر ہندوستان میں
بمقام بمبئی ۳۴-۱۹۳۳ء ڈگلس جارڈن کی سربراہی
میں انگلستان کے خلاف اولین ٹیسٹ میں قیادت
کی۔ اس میچ میں لالہ امرناتھ نے اپنے سب سے پہلے
میچ میں اپنے کپتان کی حوصلہ افزا کپتانی میں سنچری بنائی۔
دونوں کی ۱۳۸ رنز کی ساجھے داری تھی۔ اس دوران
نائیڈو کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔ "سی۔ کے" اب عمر کے
چالیسویں سال میں پہنچ گیا تھا اس کے باوجود تین
ٹیسٹ کی سیریز میں ٹیم کے اہم ترین کھلاڑی کے
طور پر برقرار رہا۔ اس عظیم کھلاڑی کی عمر جب چالیس
سے تجاوز کر گئی اس لمبے عرصے تک اپنی دھاک جمائے
رہنے والے اس کھلاڑی نے اپنی آخری ٹیسٹ سیریز
کھیلی جب وہ ۴۴ برس کی عمر سے تجاوز کر چکا تھا۔
حالاں کہ اب انگلستان کے ابتدائی دوروں کی طرح

وہ طوفانی بلے باز نہیں تھا تاہم ٹیم کو تقویت پہنچاتا
رہا۔ انگلستان کے پہلے ٹور میں ۶۵ اور دوسرے میں
۵۱ وکٹس گرا کر اپنی ہمہ جہتی مہارت کی قدر و قیمت
متعین کی۔ اس نئے ادوار میں ٹیسٹ سیریز کے
آخری میچ میں بے باکانہ ڈھنگ سے ۸۱ رنز بنا کر
اپنی ٹیسٹ اننگز کو خیرباد کہا۔ ہندوستان کے
متقدم کھلاڑی امتیازی دلیرانہ اسکور کی وجہ
سے ہند کی ٹیم ایک اننگز کی شکست سے بچ گئی۔

سی۔ کے نائیڈو کا شمار بیشک ہندوستان
کے عظیم کپتانوں میں ہے۔ وہ مخالف ٹیم پر جری
اور موثر داؤ پیچ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ
دباؤ رکھتا۔ وہ کھلاڑیوں کو زبردست تحریک
دلاتا تھا۔ نائیڈو نے رانجی ٹرافی چیمپئن شپ میں
ہولکر کو چار بار اپنی قیادت میں فتح دلائی اور چھ بار
رنرز اپ مرحلے تک پہنچے۔ ۵۶ سالہ نائیڈو نے
ٹیم کی مثالی قیادت کی اور سنٹرل زون کے لیے
۱۹۵۲ء میں ایم سی سی کے مقابلے میں ۴۷ اور
۳۹ رنز اسکور کیے۔

ہولکر کی فوج سے سبکدوش ہو کر کرنل سی۔
کے نائیڈو نے آندھرا کی نئی تشکیل دی گئی ٹیم کی رانجی
ٹرافی میں قیادت کی۔ ۹۶ منٹ میں ۸۴ رنز بنائے
اس میں ایک چھکا اور دس چوکے شامل تھے۔ ۶۲ برس
کی عمر میں اتر پردیش کی ٹیم کی رانجی ٹرافی میں قیادت
کی۔ ونو منکڈ کی گیندوں پر دو چھکے لگا کر ۱۸ رنز
بنائے۔ ۶۸ سال کی عمر میں اس ماہر بلے باز نے ناگپور
میں متواتر ۴۹ ویں سال کھیلتے ہوئے اپنا آخری فرسٹ کلاس میچ
کھیلا۔ چار سال بعد یہ اپنی طرز کا واحد کھلاڑی اپنے
کیریئر کی قابل یادگار اننگز بنا کر اس جہان سے
کوچ کر گیا۔

اندور کے مہاراجہ پدم بھوشن سی کے نائیڈو
کا بے حد احترام کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے "میں اندور
کا حکمراں ہوں لیکن سی۔ کے نائیڈو زیر آسمان
کھیلوں کا بادشاہ ہے۔ وہ یقیناً متعدد کمالات
پر حاوی تھا۔ وہ اسپورٹس مین تھا، بہت تیز
دوڑتا تھا۔ ایک مرتبہ ۱۰۵ گز کی دوری ۱۰.۵
سکنڈ میں پوری کی۔ بلیرڈز کا اچھا کھلاڑی تھا۔ ہاکی کا
نمایاں فارورڈ اور فٹبال کا قابل اعتبار ہاف بیک تھا، اعلا
معیاری ٹینس کھیلتا تھا۔ ان سب سے بالاتر یہ کہ وہ پولو کا
شاندار کھلاڑی اور سلیقہ مند گھوڑسوار تھا۔ ●

بقیہ نظیر اکبرآبادی۔ عوامی تہذیب و تمدن کے آئینہ دار

مشہور شاعر سوکانت بھٹاچاریہ نے اس تصور کو نظیر سے لیا اور
اس پر ایک خوبصورت نظم لکھی۔

نظیر اکبرآبادی کی شاعری ہماری تہذیبی اور تمدنی
زندگی کی زندہ اور متحرک تصویر ہے یہ اتنی رنگا رنگ
ہے کہ اسے دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ یہ شاعری
زندگی کے ہر لمحے کی شاعری ہے، اس کا کینواس بہت وسیع
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حبیب تنویر نے "آگرہ بازار"
ڈراما لکھا تو وہ بے حد کامیاب ہوا۔ سچ پوچھئے تو
...... نظیر کی شاعری بصری آرٹ
(VISUAL ART) کا ایک نادر اور نایاب نمونہ ہے۔ اس
کی مدد سے آج ہم اپنے ذہنی اسکوپ پر ایک ایسے ہندوستان
کو دیکھ سکتے ہیں جہاں ایک متحدہ قوم زندگی کی راہوں
پر ایک ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔ یہ آہستہ خرامی اپنے جلو
میں زندگی کا سارا حسن سمیٹے تھی۔ شاید یہی وہ مرکزہ
(NUCLEUS) رہا ہو جو آج نظیر کی معنویت کو روز روشن
کی طرح عیاں کر رہا ہے۔ ان کی شاعری ہمارا ایک ایسا
ورثہ ہے جو ہر دور میں احترام سے دیکھا جائے گا اور
اس پر آنے والی نسلیں فخر کریں گی۔

عظیم ترین شاعر ہونے کے علاوہ نظیر ایک مایہ ناز
نیشنلسٹ (NATIONALIST) اور قابل رشک سیکولرسٹ
(SECULARIST) ہیں۔ اپنی دھرتی سے ان کا بے پناہ
لگاؤ اور عوام سے والہانہ محبت اس حد تک ہے کہ ان
کے انتقال کے بعد جب سنی اور شیعہ حضرات اپنے اپنے
عقیدے کے مطابق نماز جنازہ ادا کرتے ہیں تو عقیدت مند
ہندو احباب ان کے کفن کے کپڑے تک کو بطور نذرانہ
اپنے گھر لے جاتے ہیں، یہ نظیر کی انتہائی مقبولیت کا
عین عکاس ہے اور جس کی مثال خال خال ملتی ہے
خصوصاً اس پر آشوب دور میں جب ملک کے سیکولر
ڈھانچے زخم آلود اور افراتفری کے شکار ہیں،
ملکی حکومت سے سفارش کی جانی چاہیے
کہ وہ غالب اکادمی، یا اقبال اکادمی کی طرح
نظیر اکادمی قائم کرے تاکہ ایسے ریسرچ سینٹر میں سیکولر
نظیر کی شاعری کے بے شمار نامعلوم گوشے پر مختلف
زاویوں سے تفتیش و تحقیق کا باضابطہ طور پر کام ہو،
کیوں کہ نظیریات ایک ایسا قابل فخر ورثہ ہے جس کی
حفاظت اس عہد کی صرف اہم آواز ہی نہیں بلکہ
شدید ترین ضرورت بھی ہے۔ ●

منور حسن کمال

بچّوں کی تربیت کیسے کریں: چند اہم نکتے

آج دنیا کے تمام انسان خواہ وہ کسی مذہب، رنگ، نسل، فرقہ یا ذات سے تعلق رکھتے ہوں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ بچوں کے ذہن، دل اور دماغ پر جو بات بچپن میں اثر پذیر ہو جائے گی۔ اس کے اثرات یا ثمرات نوجوانی میں ظاہر ہونے لگے۔ اس لیے انسانیت کی فلاح اور اس کی بقا کے لیے یہ بات قطعی ضروری ہے کہ ابتدا ہی میں بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعے مثبت راہ کی جانب رہنمائی کی جائے۔ چوں کہ سب سے پہلے بچہ کا سابقہ والدین سے پڑتا ہے۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی سوچ، فکر اور ذہن صحیح سمت میں رواں ہوں۔ اگرچہ بعض لوگ اپنے اندر کم ہمتی یا سراسیمگی پاتے ہیں، خواہ وہ غربت و افلاس کی وجہ سے ہو یا احساس کمتری کی وجہ سے، لیکن وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد بڑے ہو کر کسی قابل بن جائے اور وہ شکستگی، احساس کمتری، سراسیمگی جو ان کے اندر پائی جاتی ہے اس سے ان کے بچے بہت دور نہ سہی کم از کم نزدیک قطعی نہ ہوں۔ وہ اپنے اردگرد ایک صاف ستھرا اور خوش رنگ معاشرہ دیکھنا چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد فرماں بردار ہو، سبھی کی عزت کرے، قوم کی خدمت کرے اور ملک کی فلاح و بہبود کے لیے ایسے کار ہائے نمایاں انجام دے کہ وہ تادیر ایک معتبر اور منفرد شناخت کے ساتھ یاد کیے جائیں۔

آیئے! سب سے پہلے ہم ان عوامل کا جائزہ لیں جن کا اثر بالواسطہ یا بلا واسطہ بچے کے ذہن پر پڑتا ہے اور وہ بہت جلد اس اثر کو قبول بھی کر لیتا ہے۔

ہمیں اپنے کردار، عادات اور اطوار کا جائزہ لینا چاہیے کیوں کہ والدین کی سیرت و کردار اور عادت ہی سب سے پہلے بچے کے لیے نمونۂ عمل ہوتی ہے۔ ہماری بعض عادتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہم انھیں برا نہیں سمجھتے حالاں کہ وہ ہمارے لیے بھی اتنی ہی خطرناک اور مہلک ہوتی ہیں جتنے سے ہماری آئندہ نسلوں کے لیے۔ ایسی عادتوں کو فی الفور ترک کر دینا انتہائی ضروری ہے خواہ وہ کسی بھی زمرے میں ہوں۔ یہ عادات ہمارے لیے، سماج یا ملک و قوم کے لیے نقصان دہ ہیں۔ مثلاً:

۱۔ بعض لوگ سگریٹ پیتے ہیں چند ایک تو کسی حد تک اس کو برا سمجھتے ہوئے اپنی عادت بتاتے ہیں ایسی عادت جو مجبوری بن چکی ہوتی ہے۔

۲۔ بعض لوگ شراب نوشی بھی کرتے ہیں۔

۳۔ بعض معمولی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے خوب صورت جھوٹ بول کر جان بچانا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اس سے بعض مرتبہ ایسے ایسے ناقابلِ تلافی نقصانات ہو جاتے ہیں کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

۴۔ بعض بچوں کے سامنے ایسی بے حیائی کی باتیں کر جاتے ہیں جو انھیں وقت سے پہلے وہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں جس کو انھیں ابھی بہت بعد میں سوچنا تھا۔

۵۔ بعض صورتوں میں والدین کی ناانصافی بھی بڑی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی باتیں ہیں جنھیں آپ ذہن پر معمولی سا بوجھ ڈال کر سوچ سکتے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ عادتیں وہبی یا فطری نہیں ہوتیں بلکہ یہ کسبی ہوتی ہیں فطری عادتیں صرف وہ ہوتی ہیں جو ہمیں پیدائشی طور پر ملتی ہیں۔ مثلاً: کوئی شخص فوجی ہے اور ملک و قوم کی خدمت کر رہا ہے تو اس کے بچوں میں یہ جذبہ دوسروں کے بہ نسبت زیادہ ہوگا کہ وہ بھی ملک و قوم کی خدمت کریں گے، کوئی شخص تاجر ہے تو اس کے بچوں میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ وہ بھی تجارتی دنیا میں خوب نام اور شہرت حاصل کریں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ڈاکٹر، انجینئر یا وکیل ہے تو اس کی اولاد کے ذہن میں اسی مناسبت سے جذبہ کارفرما ہوگا۔

یہ عادتیں بار بار کی مشق سے اتنی پختہ اور مستحکم ہو جاتی ہیں کہ پھر مشکل سے ہی چھوٹتی ہیں۔ فطری خواہشات کی طرح ان میں بھی کشش ہوتی ہے اور پھر ہم ان کے تابع ہو جاتے ہیں اور اسی طرح مجبور ہو جاتے ہیں جیسے کسی فطری خواہش یا جبلّی تقاضے کی تکمیل پر۔ اسی لیے عادتوں کو فطرتِ ثانیہ بھی کہا جاتا ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ عادت ڈلوانے یا ترک کرانے کا سب سے اچھا زمانہ بچپن کا ہوتا ہے خصوصاً ۱۲۔۱۳ برس کی عمر تک۔ اس کے بعد بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں اور بہت مستحکم ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔

کسی کام کی عادت پڑ جائے تو وہ بڑی آسانی سے ہونے لگتا ہے، ذہن پر نہ تو بار ڈالنا پڑتا ہے، نہ ارادہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ طبیعت پر جبر ہی کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ وہ کام

معروف تابش مہدی۔ اے ار جے ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

پوری تیزی اور مہارت کے ساتھ انجام پانے لگتا ہے۔ اس کے لیے بنیادی طور پر تین چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تحریک یا آمادگی: کسی بھی قسم کی عادت ڈالنے کے لیے ذہن کے اندر تحریک کا پایا جانا ضروری ہے۔ یعنی بچے کے ذہن کو پوری طرح اس کام کے لیے آمادہ کرنا جس کی آپ اسے عادت ڈلوانا چاہتے ہیں۔ تاثر یا خوشی: یعنی اس کام کو کرنے کے بعد بچہ یک گونہ مسرت اور طمانیت حاصل کرے اور اسی طمانیت اور مسرت کی خاطر بار بار اس کام کے اعادے کی خواہش پیدا ہو۔ تکرار: اور پھر بچہ اس فعل کو بار بار انجام دے جس کے ذریعہ اسے مشق اور پھر وہ مہارت کامل حاصل کرکے کسی لائق بنے — پھر آپ دیکھیں گے کہ مہارت کی وجہ سے قوت کارکردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جس چیز کی عادت ہو اس کو پورا کرنے کے بعد تھکاوٹ بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ اس کا مشاہدہ تو ہم اور آپ دن اور رات کرتے رہتے ہیں۔ ہاں جس کام کی عادت نہیں ہوتی اس کو کرنے میں غیر معمولی جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور بہت جلد تھکن کا احساس ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کی مطالعے کی عادت ہے تو آپ گھنٹوں مطالعہ کرتے رہیے آپ قطعی نہیں تھکیں گے — مزدور آخر دن بھر بوجھ ڈھوتا ہے اور بالکل نارمل رہتا ہے حالاں کہ کوئی دوسرا شخص اس بوجھ کو شاید ہی ایک مرتبہ یا زیادہ مرتبہ اٹھانے کی استطاعت رکھتا ہے۔

معلوم ہوا کہ ہماری شبانہ روز کی زندگی میں عادتوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ بچپن ہی سے اگر پسندیدہ عادتیں ڈلوائی جائیں اور بچے کی طرف بھرپور توجہ دی جائے تو اس کو ترقی کی منزلیں سر کرنے میں آسانی ہو جائے گی اور اسے اپنی منزل نزدیک تر نظر آئے گی۔

اس لیے بچوں کے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، مطالعے اور محنت و مشقت کے کاموں کو پابندی وقت کے ساتھ پورا کرنے کی عادت ڈلوائیں — اس کے لیے آپ سادہ اور عام فہم انداز کے قصے کہانیاں، تصاویر اور مشاہیر کے واقعات اور ان کی سوانح حیات سے مدد لے سکتے ہیں — اس طرح عادت کے فوائد، اہمیت اور محسوس کرائی جائے کہ بچہ اپنی خواہش اور ارادے سے اس کے لیے آمادہ اور تیار ہو جائے۔ اس کے بعد مختصر اور متعین الفاظ میں یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ اس کو کسی لائق بننے کے لیے کیا کیا مطلوب ہے۔ وہاں تک پہنچنے کا آسان راستہ اور سادہ طریقہ کیا ہے اور کس طرح اس کو بہ آسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

یہ بھی بہتر ہے کہ ارد گرد کا ماحول صاف ستھرا اور پاکیزہ ہو۔ آسندہ ماحول رکاوٹ بن سکتا ہے اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔ بعض والدین عذر کر سکتے ہیں کہ ہمارے پاس تو وقت ہی نہیں۔ یہ سوچنا اور کہنا غلط ہے خواہ آپ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں بچوں کے لیے وقت نکالیے۔ آخر آپ یہ کاروبار، یہ تجارت، یہ ملازمت کس کے لیے کر رہے ہیں۔ بچوں کے لیے ہی کر رہے ہیں۔ صرف دو وقت روٹی مہیا کرا دینے سے آپ اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہو جائیں گے۔ جہاں آپ کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ ان کے لیے کھانے، پینے اور رہنے سہنے کا انتظام کریں وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی پرورش و پرداخت ایسے انداز پر ہو کہ وہ سماج کی باعزت شخصیت بن جائیں۔

گاہے لگاہے بچے کو تنہا چھوڑ دیں اور مشاہدہ کریں کہ وہ ہر کام جس کی آپ نے مشق کرائی ہے صحیح وقت پر اور صحیح انداز میں کر رہا ہے یا نہیں — اگر معمولی خامی ہو تو بازپرس نہ کی جائے۔ بلاوجہ بار بار متنبہ کرنے سے بچے بددل ہو جاتے ہیں۔ نیز وہ اپنے کو قابل تعریف سمجھنے لگتے ہیں۔

بچوں سے بہت زیادہ توقعات بھی وابستہ نہ رکھیں چوں کہ کم عمری، ناتجربے کاری اور کم فہمی کی وجہ سے کبھی کبھی وہ ایسی حرکات بھی کر گزرتے ہیں جو بنیادی خواہشات اور جبلی تقاضوں سے مجبور ہونے کی بنا پر ان سے سرزد ہو جاتی ہیں۔

بچوں کو موقع فراہم کیجیے کہ وہ اپنے ہم جولیوں سے ملتے جلتے رہیں اور ان کے ساتھ کھیلیں کودیں۔ کبھی کبھی بچوں سے کہیے کہ وہ اپنے ہم جولیوں اور ساتھیوں کو اپنے گھر مدعو کریں۔ ان کی دعوت (خواہ معمولی ہی ہو) اسی طرح نظم و نسق کے ساتھ کرائیے جیسے آپ اپنے دوستوں کی دعوت کے موقع پر کرتے ہیں۔ لیکن ایسے موقعوں پر سختی قطعی نہ کیجیے، نہایت پیار اور دل نشین انداز میں انھیں دعوت کے طور طریقے سکھائیے۔ نیز اگر ان سے کوئی اہم اور بڑی غلطی بھی سرزد ہو جائے تو بھی ہنس کر ٹال دیجیے۔ ان کے ہم جولیوں اور دوستوں کے سامنے انھیں کچھ مت کہیے۔ ہاں دعوت کے بعد علاحدگی میں انھیں نہایت محبت اور شفقت سے اس کمی کا احساس دلائیے اور ان سے ہنستے ہنستے یہ بھی عہد لیجیے کہ آئندہ اس قسم کی غلطی ان سے سرزد نہ ہوگی۔ اگر ان چند باتوں کو والدین اپنا لائحہ عمل بنا لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ آنے والا زمانہ ان کے بچوں کا اور حقیقتاً ان کا نہ ہو — اور پھر وہ بھی معاشرے کے ایک اہم ترین فرد کہلائیں اور وقیع مقام حاصل کریں۔ ●

بقیہ: ہندوستان میں جنگلات کا تحفظ

کاموں میں سے ایک ہے۔ اس سلسلہ میں ۴۲ سیکٹر بنائے گئے ہیں جن میں ماہرین کی نگرانی میں کام ہوتا رہتا ہے۔ ایک GRID OF BIOSPHERE RESERVE قائم کیا گیا ہے جو BIOLGICAL DIVERSITY کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ ۱۳ BIOGEO GRAPHICAL REGIONS بنائے گئے ہیں جو BIOSPHERE RESERVE کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ تفصیلی پروجیکٹس ڈاکومنٹ نیل گری، نندہ دیوی، نام دابھا، نوکرک اور گلف آف منار کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ BIOSPHERE RESERVE کے سائنس دانوں کی مدد کرنا بھی اس محکمہ کا کام ہے۔ ماحولیاتی کثافت اور فضائی آلودگی کو پاکیزہ بنانا بھی اسی محکمہ کی ذمہ داری ہے جو اپنے کام کو بخوبی انجام دے رہا ہے۔

ڈاکٹر رشید کوثر*

نظیر اکبر آبادی عصری تہذیب و تمدن کے آئینہ دار

فنون لطیفہ کی تمام صنفوں میں شاعری سب سے زیادہ افضل ہے۔ دنیا کی تمام مقدس اور الہامی کتابیں اگر شاعری میں نہیں تو شاعری سے قریب ضرور ہیں۔ زبور کے معنی ہی گیت کے ہوتے ہیں۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے۔ شاید اس میں ایک رمز یہ بھی پوشیدہ ہے کہ خالق کائنات کو اپنی باتیں کہنے کے لیے جن علامتوں، استعاروں کی ضرورت تھی وہ سب کی سب شاعری میں ہی ملتی ہیں۔ نثر وضاحت کی صنف ہے یعنی جو آنکھ قطرے میں دجلہ دیکھ سکتی ہے اسے پوری داستان سنانے کی ضرورت نہیں۔ شاعری علامتوں کا ایک ایسا خزانہ ہے جس میں دنیا و مافیہا کے سارے اسرار و رموز پوشیدہ ہیں۔ یہ کہنا کہ وہ زندگی کی ترجمان ہے، آئینہ دار ہے یا زندگی کی تنقید ہے شاعری کی دنیا کو محدود کردیتا ہے۔ شاعری نہ جذبات سے گریز کی کوشش ہے اور نہ خاموش نرم لمحوں کی زبان ہے۔ اس میں بقول غالب گنجینۂ معانی کا طلسم ہے۔ بڑا شاعر اس رمز سے واقف ہے۔ اس لیے وہ لفظوں کے انتخاب اور استعمال پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ شعر کا ایک ایک لفظ اپنے اندر معنی رکھتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خالق کائنات بھی پہلا شاعر ہے تو وہ کوئی نہ کوئی قوی دلیل ضرور پیش کرتے ہیں۔ شاعری کو پیغمبری کے جزو کا درجہ تو دیا گیا ہے۔ اس سے ہم واقف ہیں لیکن کن وجوہات کے بنا پر ایسا کہا جاتا ہے۔ شاید ہم بہت زیادہ واقف نہیں۔

اردو شاعری کی عمر تقریباً ہزار سال ہے۔ ممکن ہے آنے والی تحقیق اس کی قدامت کا مزید سراغ لگائے۔ گزشتہ ہزار برسوں میں اس کے ارتقا کی دلچسپ تاریخ رہی ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ مسلمان اگر ہندوستان نہ آتے تو بھی کھڑی بولی اپنی ارتقائی شکل اختیار کرتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس رسم الخط میں اردو آج زندہ و تابندہ ہے وہ وجود میں نہ آتی اور اردو شاعری پر ایک اعتراض عدم واقفیت ------ کی بنا پر یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں ہندوستان نظر نہیں آتا۔ یہ وہ اعتراض تھا جس نے مجھے سنجیدگی سے اردو شاعری کی تاریخ، اس کے مزاج اور اس کے کلچر کو سمجھنے کے لیے اکسایا۔ ہزار برسوں اس ادبی اور تاریخی مطالعے کے بعد میری نظریں نظیر اکبر آبادی پر آکر ٹھہر گئیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک ہندوستانی شاعر ہیں اور دوسروں کی شاعری میں ہندوستانی روپ نہیں ملتا بلکہ اس لیے کہ نظیر اکبر آبادی کی شاعری عرصہ دراز تک اپنے ہندوستانی پن، اپنے عوامی لب و لہجہ اور زندگی گزارنے کے اصول و ضوابط کی وجہ سے نظر انداز کی جاتی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ جو زبان عوام کی تھی اور جسے شمال و جنوب میں بھی اظہار خیال کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا وہ کئی سو برسوں تک امرا اور درباروں کی سرپرستی میں پرورش پانے لگی اس سرپرستی نے اس کے خد و خال اور نقش و نگار بے شک سنوارے لیکن غیر ملکی ادب نے اس کو اس حد تک متاثر کیا کہ اردو شاعری پر فارسی شاعری غالب آگئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی روایتیں، علامتیں دور ہوتی گئیں یہاں تک کہ فارسی کے زیر اثر اردو شاعری کا محبوب بھی مذکر ہو گیا۔ شاید اسی ایک سبب نے کلیم الدین احمد سے یہ کہلوایا کہ "نظیر اکبر آبادی کی ہستی اردو شاعری کے آسمان پر تنہا ستارے کی طرح روشن ہے"۔

نظیر نے ایک طویل عمر پائی اور زندگی کے بہت سے نشیب و فراز کو بغور دیکھا۔ اپنی مصروفیات کی وجہ سے انھیں اس کا موقع ملا کہ وہ سوسائٹی کے مختلف طبقے کے افراد سے رابطہ قائم کرسکیں اور اس قومی دھارے کو سمجھ سکیں جو متحدہ قومیت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نظیر کا تعلق اگر کسی دربار سے ہو جاتا تو وہ عوام سے کٹ جاتے، پھر ریلے میلے میں بچے کی طرح دلچسپی لیتے ہوئے نظیر کہیں گم ہو جاتے۔ یہ اردو ادب کی خوش قسمتی ہے کہ نظیر میلے کی بھیڑ میں بالک کی طرح گم نہیں ہوئے بلکہ کھلی آنکھوں سے تماشا دیکھتے رہے اور جو کچھ دیکھا اسے دائرہ تحریر میں لاتے رہے۔

بڑے شاعروں اور بڑے افراد پر ہم عصر ادیبوں اور دانشوروں کے بھی اثرات ہوتے ہیں۔ نظیر نے کسی بڑے شاعر اور دانشور کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔ وہ پوری زندگی عوام کے درمیان بسر کرتے رہے اس لیے نظیر کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس عہد کے عوام کو بھی نظر میں رکھیں۔ آگرہ اور دہلی کے عوام ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ غریب اور امیر بھی تھے، جاہل اور اہل علم بھی تھے۔ بازاروں میں سبزی اور پھل بیچنے والے بھی نظیر سے خلوص رکھتے۔ اس تعلق نے نظیر اکبر آبادی کے نظریہ

---

* گلریزہ رسالدار نگر، ڈورنڈہ۔ رانچی۔ ۸۳۴۰۰۲

حیات میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کی۔

سیکولرزم کی وہ روایت جو مغل بادشاہوں سے پہلے دکن کے بادشاہوں نے قائم کی تھی اور جسے بعد میں مغل بادشاہوں نے تقویت پہنچائی! اہمیت کی حامل ہے۔ سیکولرزم کا مطلب ایک ایسے نظریۂ حیات سے ہے جو مذہب، ذات پات کی بنیادوں پر بھید بھاؤ نہ کرے اور امتیاز من و تو کو جگہ نہ دے۔ یہ بات سننے میں نئی نہیں معلوم ہوتی۔ بڑے بڑے فقیروں، سنتوں اور درویشوں نے ایک پرامن زندگی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں ایک نئے فلسفے اور نظریے نے جنم لیا۔ تیرہویں اور چودہویں صدی میں بھگتی تحریک کی ابتدا ہوئی اور کئی بڑے اہم صوفیائے کرام ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ کبیر، نانک اور رامانند ان میں سے چند ہیں۔ ان لوگوں کی تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ مذہبی تعصب اور انتہا پسندی کم ہوئی اور ہندوستان کے مسلم حکمرانوں نے یہ محسوس کیا کہ ہم اپنا نظام حکومت قائم کرکے ملک کی اکثریت کا دل نہیں جیت سکتے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نظریۂ حیات کو اپنایا جائے جو مذہب کی بنیاد پر سماجی زندگی میں کسی قسم کا فرق روا نہ رکھے۔ حکمرانوں کے اس رویہ نے عام ذہنوں کو متاثر کیا۔ اہل علم بھی اس طرف راغب ہوئے اور قومی زندگی میں سیکولرزم کی پہلی دھار بہنے لگی۔ یہ سیکولرزم کسی طرح کا BY- PRODUCT نہیں تھا بلکہ ایک نیا فلسفۂ حیات تھا، ایک نیا طرز زندگی تھا اور زندگی گزارنے کا ایک نیا نصب العین تھا۔ اس فلسفہ کا سرچشمہ زندگی کی قدیم اور ابدی قدر انسان دوستی تھی۔ یہ اسی چشمہ کا فیضان تھا کہ عوام و خواص نے قومی یک جہتی کا پہلا جام پیا۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ہندوستان میں سیکولرزم کی ابتدا اور نشو و نما کسی مصلحت یا سیاسی حکمت عملی کی بنیاد پر نہیں ہوئی بلکہ یہ وقت کا اہم تقاضا تھا۔

نظیر کے سلسلے میں جو باتیں تحقیق و تنقید کی مختلف منزلوں سے گزرنے کے بعد میرے ذہن میں پیدا ہوئیں۔ ان میں سب سے زیادہ اولیت اور اہمیت میں نظیر اکبرآبادی کے سیکولرزم کو دیتا ہوں جو کسی مصلحت کا پروردہ نہ تھا بلکہ اس حقیقت کا نمائندہ تھا جو ہندوستان میں بسنے والی مختلف قوموں کو اپنے ظاہری فرق کے باوجود ایک رشتے میں پروئے ہوئے ہے۔ نظیر کا یہ تخلیقی رویہ ایک ایسا ورثہ ہے جس کی حفاظت اور جس کی توسیع آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر نظیر کوئی سماجی مصلح (SOCIAL REFORMER) ہوتے تو ان کا سیکولرزم مصلحت آمیز ہوتا۔ وہ سو بھیس بدل کر اقبال کے لفظوں میں عیار بن جاتے۔ لیکن یہ ایک ایسا ترکہ ہے جو صرف اور صرف انسان دوستی کے چشمے سے لبریز ہے۔ نظیر کی سیکولرزم جس کی اصطلاح سے وہ ناواقف تھے آج کا طرز زندگی بن گئی ہے۔ یوں تو اردو شاعری سیکولر ماحول کی ہی پروردہ ہے لیکن نظیر ایک ایسے روشن ستارہ کی طرح ہیں جو بھولے بھٹکوں کو منزل کا پتا دیتا ہے۔

موضوعات نظیر کے یہاں اس طرح بکھرے ہیں جیسے آسمان پر تاروں کا جال۔ اگر آپ اس عہد کی تاریخ لکھنا چاہیں تو میں بغیر جھجھک کہہ سکتی ہوں کہ نظیر کی شاعری اکیلے اس عہد کی زندہ اور جیتی جاگتی تاریخ بن سکتی ہے۔ تہذیب اور تمدن کی یہ تاریخ نظیر کی شاعری کو نظر انداز کرکے نہیں لکھی جا سکتی۔ ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ عوامی ادب کے پہلے باضابطہ تخلیقی فنکار تھے۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ عوامی ادب کی بات کرنا غیر معیاری ادب کو فروغ دینے کے برابر ہے۔ نظیر کی تخلیق کے مطالعے کے بعد اپنی رائے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کریں گے۔ نظیر کا تخلیقی رویہ زندگی کی مثبت اقدار پر مبنی ہے اور زندگی کی مثبت اقدار کو ابدی قدروں سے گہرا رشتہ ہے۔ اقدار کی تخلیق ہر خاص و عام کے بس کی بات نہیں۔ نظیر نے صرف اقدار کی بازیافت نہیں کی بلکہ ان کی توسیع بھی کی۔ توسیع کی ساری کوشش اور سارا عمل مخلصانہ ہے۔

اگر شاعری کسی اصطلاح کا فن ہے تو نظیر کی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے مگر میں یہاں اس حقیقت کو واضح کر دوں کہ وہ کسی حد تک بوہیمین (BOHEMIAN) بھی تھے جو نظریات کی قید و بند سے آزاد تھے اور ان کی شاعری کسی مخصوص فلسفے کی تابع نہیں ہے۔ اگر شاعری تجربات و حوادث کے اظہار کا نام ہے، مشاہدات کی بوقلمونی کا نام ہے تو نظیر کی شاعری اعلاترین مثال ہے۔ واقعی ان کی شاعری آگہی کا ایک منظر نامہ ہے۔

شاعری کا گہرا رشتہ جمالیات سے بھی ہے۔ جمالیات، حسن کے فلسفہ کا نام ہے۔ یہ حسن صرف انسان کے چہروں تک محدود نہیں بلکہ کائنات کی ہر شئے میں بکھرا ہوا ہے۔ یہ کہنا کہ حسن ایک ماورائی شئے ہے نظیر کے یہاں درست نہیں معلوم ہوتا۔ انھوں نے ہر شئے میں آہنگ، توازن اور اعتدال کو دیکھنے کی کوشش کی، اس کی افادیت پر نظر رکھی ہے۔ یہ موسم ہوں، مناظر فطرت ہوں، ہولی اور دیوالی کا جشن ہو یا ہماری ثقافتی زندگی کا کوئی پہلو ہو، نظیر حسن کے افادی نقطۂ نظر کے ساتھ اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ نظیر کا نظریۂ جمالیات یا نظریۂ حسن سراسر مادی ہے، ارضی ہے، خاکی ہے۔ ماورائی اور مابعد الطبیعاتی نہیں۔ اس کا اظہار جا بجا ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ ان کے یہاں ایک طرح کی لذت اندوزی بھی ہے جسے اہل کمال فحاشی سے تعبیر کرتے ہیں۔ فحاشی اور عریانیت میں بڑا فرق ہے۔ فحاشی اسے کہیں گے جس سے ہمارے اعصاب میں ہیجان پیدا ہو اور عریانیت اسے کہتے ہیں جس میں لطافت، شائستگی ہو اور مظاہر فطرت اپنے حقیقی رنگ میں اہل نظر کو دعوت شوق دیں۔ مثلاً اجنتا اور ایلورا کی سنگ تراشی اور پینٹنگس۔ عشقیہ شاعری کے کچھ حصے میں نظیر کے یہاں اگر بعض باتیں فحش ملتی ہیں تو انھیں اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ وہ فحش نگار نہیں تھے بلکہ اپنے عہد کی مروجہ رسم و رواج کے حقیقی آئینہ دار تھے اسی لیے ان کی زبان سے ایسے شعر نکلتے ہیں ؎

اس رنگ رنگیلی محفل میں وہ رنڈی ناچنے والی ہو
منہ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو اور آنکھیں مے کی پیالی ہو

شاعری کو جو چیز لطیف، وقیع، دلکش، اور پُراثر کرتی ہے وہ استعاروں اور تشبیہوں کی دنیا ہے۔ نظیر تشبیہوں کے بادشاہ ہیں۔ چاند کو روٹی سے تشبیہ دینا اور بھوکے آدمی سے یہ کہلوانا ؎

ہم تو نہ چاند جانیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

انتہائی حیرت انگیز ہے۔ صدیوں بعد بنگالی کے

باقی صفحہ ۳۷ پر

پیدا کرو

(فیملی پلاننگ)

اسرار جامعی

کون کہتا ہے نہ فخرِ خانداں پیدا کرو
ہاں! مگر ہرگز نہ فوجِ جاہلاں پیدا کرو

ہے فراغت سے اگر جینے کا دنیا میں خیال
بھول کر بچے نہ مثلِ مرغیاں پیدا کرو

کثرتِ اولاد سے بن جائے گا جینا عذاب
تین سے زائد نہ بچے بچیاں پیدا کرو

ہر نئے سال اک کلنڈر کا نکلنا ہے فضول
تین بچے چار جگ کے درمیاں پیدا کرو

بوجھ اتنا ہی اٹھاؤ جتنا لے کر چل سکو
تم نہ اپنے واسطے بارِ گراں پیدا کرو

تین نقلوں سے زیادہ جب نہ ٹائپ صاف ہو
بے سبب کیوں دھندلی دھندلی کاپیاں پیدا کرو

جس طرح اپنے ترنگے کے فقط ہیں تین رنگ
تم بھی گھر میں تین ہی نام و نشاں پیدا کرو

جس طرح سے چاند سورج اور ستارے تین ہیں
ڈاکٹر، انجینئر اور سائنس داں پیدا کرو

بڑھتی آبادی سے خطرہ ہے ہمارے ملک کو
تم نہ خود سے دشمنِ ہندوستاں پیدا کرو

کیا ضروری ہے کہ ٹُک بندوں کی پیدائش بھی ہو
میر، سودا، ذوق و غالب جانِ جاں پیدا کرو

ہے اگر یہ شوق دل کی تازگی قائم رہے
گھر میں اپنے برگ و بار اور سبزیاں پیدا کرو

سر میں سودا ہے اگر اب بھی کسی تخلیق کا
دوستو! اسرار سا طرزِ بیاں پیدا کرو

واجد سحری

جو شخص بدلتا ہے کپڑوں کی طرح چہرے
وہ اہلِ ہنر ہے تو اندازِ ہنر بدلے

کتنا وہ ستمگر ہے انساں نہیں پتھر ہے
اندازِ وفا اس کا مجھ کو بھی نہ پتھرا دے

خوشبو کی طرح میں بھی پھرتا ہوں زمانے میں
جب سے ترے دامن کو چھو آئے مرے جھونکے

تعظیمِ حوادث میں خاموش ہوں میں ورنہ
ٹھہرا ہوا طوفاں ہوں کوئی نہ مجھے چھیڑے

یہ ترکِ تعلق تو ہے فیصلہ غیرت کا
دور اور ہوا ہم سے، ہم جب بھی ملے اس سے

گلزاروں کی ٹھنڈک ہے سینے میں ہمارے بھی
گزرے ہیں ہمیشہ ہم تپتے ہوئے صحرا سے

اپنوں کی نوازش بھی واجد مجھے لے ڈوبی
دشمن بھی ہنسے مجھ پر شرماؤں میں اب دشمن سے

مدیر پوسٹ مارٹم۔ ۲۰۱ جامعہ نگر، دہلی ۲۵

۲۸۔ بی۔ طبیہ کالج، قرول باغ۔ نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۵

غزلیں

عقیل رحمت اعظمی

اگر تم گاؤں کے حالات لکھنا
مجھے چھوٹی بڑی ہر بات لکھنا

وہ بوڑھا پیڑ برگد کا تو ہوگا
گزرتے تھے جہاں دن رات لکھنا

ہیں اب بھی یاد، وہ ساون کے جھولے
وہاں کیسی ہے اب برسات لکھنا

مرے اسکول کے کمروں میں اب بھی
رُکا کرتی ہے کیا بارات[1] لکھنا

کہاں اور کیسے ہیں بچپن کے ساتھی
کبھی کرتے ہیں میری بات لکھنا

میں اپنے گاؤں جب آؤں گا واپس
تو کیا لاؤں تمہیں سوغات لکھنا

ہیڈ ڈیپارٹمنٹ آف فزیکل ایجوکیشن شبلی نیشنل پی جی کالج، اعظم گڑھ (یوپی)

شاہد اختر

کوئی موسم کوئی منظر کام کا اترا نہیں
سونی دہلیزوں پہ اب کے بھی دیا اترا نہیں

اپنے بندوں پر عنایت کی نظر ہوتی بھی کیا
ایک لمحہ بھی زمینوں پر خدا اترا نہیں

میری آنکھوں میں برائے نام بھی حیرت نہ تھی
اس کے چہرے سے مگر رنگ انا اترا نہیں

پھر منور ہیں سماعت کے سبھی دیوار و در
ایسا لگتا ہے صداؤں کا نشہ اترا نہیں

خود سے ملنے کی ہوس میں خود میں ہم بھٹکے رہے
ہم سے لوگوں پر کسی کا نقشِ پا اترا نہیں

پھر وہی قید عذاب زندگی ہے اور میں
میرے حصے میں سفر کا ذائقہ اترا نہیں

مغلپورہ، سہسرام، بہار

محمد شمشیر شمشیر

کبھی کلی، کبھی غنچہ، کبھی گلاب لگے
مجھے تو حسنِ چمن کا ترا شباب لگے

اڑے جو زلف تو چھائیں گھٹائیں ساون کی
چمک بھی چہرے پہ ایسی کہ آفتاب لگے

ہنسے تو گردشِ دوراں کو بھی ہنسی آئے
اگر وہ روئے تو دنیا ہی آب آب لگے

بہار صدقے ہیں جس کے ملی زمانے کو
اسی چمن کا مجھے تو کوئی گلاب لگے

قدم قدم پہ نئے حادثے ہوئے لیکن
ہر ایک حادثہ دیکھا ہوا سا خواب لگے

کیے ہیں پھولوں نے شمشیر خار کو سجدے
یہ حسن والوں کی دنیا میں انقلاب لگے

اے ۵ سی۔ آر۔ بی۔ ایسٹ بلاک ۷۔ آر کے پورم، نئی دہلی

[1] اصل لفظ "برات" ہے شاعر نے غالباً ضرورتِ شعری کے تحت "بارات" استعمال کیا ہے۔ (ادارہ)

بڑھتے قدم

(ترقیاتی خبرنامہ)

دیہی اور شہری غریبوں کے لیے بنا ہاؤسنگ پروگرام

حکومت نے غریبوں کے لیے ایک بڑے ہاؤسنگ پروگرام کو اصولی طور پر منظوری دی ہے، جو زندگی بیمے اور بچت سے وابستہ ہے۔ اسے وزیراعظم آواس یوجنا کے نام سے جانا جائے گا۔ شہری اور دیہی علاقوں میں غریب افراد کے لیے رہائشی اکائیاں فراہم کرانے کے ضمن میں کل وزیراعظم کو ایک جانکاری دی گئی۔ وزیراعظم شری پی وی نرسمہا راؤ نے بینکوں، ہاؤسنگ مالیاتی اداروں، شہری امور، دیہی ترقیات کی وزارتوں کو ہدایت کی ہے کہ انھیں ۲۰۰۰ء تک دیہی علاقوں میں بسنے والے ایسے غریبوں کو رہائشی اکائیاں فراہم کرانے کے لیے تمام تر کوششیں کرنی ہیں جو خط غریبی سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ایک قومی دیہی ہاؤسنگ تکنالوجی مشن (NRHTM) کو انھیں خطوط پر ریاست وار مشن کے ساتھ شروع کیا جائے گا۔

اندرا آواس یوجنا کے تحت دیہی علاقوں میں غریب ترین افراد کے لیے ۸۰ لاکھ نئے مکانات تعمیر ہوں گے اور ایک کروڑ مکانات کی حالت بہتر بنائی جائے گی۔

اندرا آواس یوجنا نفاذ کی پیش رفت کا جائزہ لیتے ہوئے جس کے تحت ۹۶-۱۹۹۵ء کے دوران دس لاکھ مکان تعمیر ہوئے ہیں، وزیراعظم کو بتایا گیا کہ تقریباً ۵۰ لاکھ مکان اب تک بن چکے ہیں اور بقیہ تعمیر کے مختلف مراحل میں ہیں۔ کچھ ریاستیں جو شروع میں پیچھے رہ گئی تھیں۔ مرکزی سرکار کی نگرانی اور تعاون کے نتیجے میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ غریبی ریکھا سے اوپر دیہی اور شہری غربا کے لیے ایک نئی اسکیم وزیراعظم آواس یوجنا کو اصولی طور پر منظوری دے دی گئی ہے۔

وزیراعظم نے پورے پروگرام کو عوامی تحریک کی شکل دینے پر زور دیا ہے۔ سرکار اس میں سرمایہ لگانے اور ضروری بنیادی ڈھانچہ مہیا کرنے اور اسے رہنمائی و فعالیت عطا کرنے کے لیے ایک پروگرام وضع کر رہی ہے۔ اس جامع ہاؤسنگ پروگرام میں آئی اے وائی کے تحت ۲۰۰۰ کروڑ روپے کا خرچ آئے گا جب کہ ۲۶۰۰ کروڑ روپے وزیراعظم آواس یوجنا کے تحت خرچ ہوں گے۔

نئے پروگرام وزیراعظم کی آواس یوجنا کے تحت رعایتی شرحوں پر قرض دیئے جائیں گے۔ پائیدار املاک فراہم ہوں گی پندرہ ہزار سے ۲۵ ہزار روپے کے درمیان کا زندگی بیمہ فراہم کرایا جائے گا۔ اس کے علاوہ ۱۲ سے ۲۳۰۰۰ روپے کی بچت بھی ہوگی۔ اس طرح یہ ایک ایسی اسکیم ہے جس کے تحت تین طرح کے فوائد ہوں گے۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں ہمہ گیر شرح اضافہ

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے شعبے میں ۱۹۹۱ء سے لے کر اب تک کے برسوں میں روزگار اور برآمدات سمیت متعدد زمروں میں موثر شرح اضافہ حاصل ہوئی ہے۔

۹۲-۱۹۹۱ء میں یونٹوں کا تخمینہ ۲۰ر۸۲ لاکھ تھا جو ۹۵-۱۹۹۴ء میں بڑھ کر ۲۵ر۷۱ لاکھ روپے ہو گیا اور اس طرح ۲۹۳۴۹۰ کروڑ روپے کی مالیت کی پیداواری صلاحیت رجسٹر کی گئی ۹۲-۱۹۹۱ء میں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی پیداوار کی مالیت ۱۷۸۶۹۹ کروڑ روپے تھی روزگار کے ضمن میں یہ شعبہ ۹۲-۱۹۹۱ء میں ۱۳۰ لاکھ افراد کو روزگار فراہم کر رہا تھا۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں اس کے تحت روزگار پانے والوں کی تعداد بڑھ کر ۱۴۶ر۵۶ لاکھ ہو گئی۔ سب سے زیادہ متاثر کن اضافہ برآمدات کے ضمن میں ہوا ہے۔ ۹۲-۱۹۹۱ء کے دوران ۱۴۰۰۰ کروڑ کے بقدر برآمدات کی گئیں تھیں۔

۹۵-۱۹۹۴ء تک یہ برآمدات بڑھ کر ۲۸۰۰۰ کروڑ روپے کے بقدر ہو گئیں۔

ماحولیات کا تحفظ — ایک قومی عزم

ماحولیات کا تحفظ نہ صرف حال کے لیے بلکہ مستقبل کے لیے بھی قومی عزم کا ایک مطالبہ ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ ہماری صحت مندانہ بقا کے لیے قدرت کی دین اور انسان کی تخلیق کے درمیان توازن برقرار رکھا جانا چاہیے، پانی میں آلودگی کی روک تھام اور اس پر قابو پانے سے متعلق قانون ۱۹۷۴ء کے تحت ستمبر ۱۹۷۴ء میں آلودگی پر قابو پانے سے متعلق مرکزی بورڈ قائم کیا گیا تھا۔ مذکورہ بورڈ کا قیام آبی آلودگی کی روک تھام کرنے اور اس پر قابو پانے کے سلسلے میں حکومت کا اہم اقدام تھا۔

آلودگی پر قابو پانے سے متعلق مرکزی بورڈ ملک بھر میں آلودگی پر قابو پانے کے پیغام کی تشہیر کا ذریعہ رہا ہے۔ ۲۴ ریاستیں پانی اور ہوا سے متعلق قوانین اختیار کر چکی ہیں اور آلودگی پر موثر طور سے قابو پانے کے لیے آلودگی کی روک تھام کرنے اور اس پر قابو پانے سے متعلق ریاستی بورڈ قائم کر چکی ہیں۔

ہوا میں آلودگی کی روک تھام کرنے اور اس پر قابو پانے سے متعلق قانون ۱۹۸۱ء اور ماحولیات کے تحفظ سے متعلق قانون ۱۹۸۶ء کی وجہ سے بورڈ کی سرگرمی کی گنجائش میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ ماحولیات کے تحفظ سے متعلق قانون کی وجہ سے ان بورڈوں کو جہاں کہیں ضروری ہے فیصلہ کن طریقے سے کارروائی کرنے کے سلسلے میں مزید اختیارات ملے ہیں۔

کثیر پہلو مقاصد

آلودگی کی روک تھام کرنے اور اس پر قابو پانے سے متعلق مرکزی بورڈ اور ریاستی بورڈوں کے بنیادی فرائض میں ایک طرف تو صفائی ستھرائی کو فروغ دینا نیز کنوؤں اور ندیوں میں پانی کے صاف اور صحت بخش ہونے کو برقرار رکھنا اور دوسری طرف ملک میں ہوا کے معیار کو بہتر بنانا شامل ہیں۔

مرکزی اور ریاستی بورڈوں کے پاس مختلف ذمہ داریاں ہیں۔ مرکزی بورڈ اعلا ادارے کی حیثیت سے دہلی میں واقع اپنے صدر دفتر نیز ملک کے مختلف حصوں میں واقع ۵ علاقائی دفتروں اور دو شعبہ جاتی دفتروں کے ذریعے کام کرتا ہے۔

مرکزی بورڈ پانی اور ہوا میں آلودگی نیز موثر طور سے اس کی روک تھام کرنے اور اس پر قابو پانے کی غرض سے کیے گئے اقدامات کے بارے میں تکنیکی معلومات اور اعداد و شمار جمع کرتا ہے اور انھیں ترتیب دے کر شائع کرتا ہے۔ گندے پانی اور صنعتی فضلے کی نکاسی اور اسے بروئے کار لانے سے متعلق ضابطے، رہنما خطوط اور کتابچے تیار کرنا بھی اس بورڈ کی ذمہ داری ہے۔ پانی اور ہوا میں آلودگی نیز اس کی روک تھام کرنے اور اس پر قابو پانے سے متعلق امور کے سلسلے میں معلومات کی تشہیر کرنے کے علاوہ مرکزی بورڈ متعلقہ ریاستی حکومتوں کے صلاح و مشورے سے ندیوں اور کنوؤں نیز ہوا کے سلسلے میں معیارات وضع کرتا ہے اور ان میں ترمیم کرتا ہے۔

آلودگی کی نگرانی

آلودگی پر قابو پانے سے متعلق مرکزی بورڈ ریاستوں میں کسی بھی ایسے علاقے یا علاقوں کی نشاندہی آلودگی پر قابو پائے جانے والے علاقے کے طور پر کرتا ہے جس کا اعلان ہوا میں آلودگی کی روک تھام کرنے اور اس پر قابو پانے سے متعلق قانون ۱۹۸۱ء کے تحت کیا جاتا ہے۔ یہ بورڈ پانی اور ہوا میں موجود آلودگی کا اندازہ لگاتا ہے اور خراب پانی کو صاف کرنے سے متعلق تنصیبات، ہوا میں آلودگی پر قابو پانے سے متعلق آلات اور ساز و سامان، صنعتی پلانٹوں وغیرہ کا معائنہ بھی کرتا ہے تاکہ ان کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے نیز ہوا اور پانی میں آلودگی کی روک تھام کرنے اور اس پر قابو پانے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔

پانی کے معیار کی نگرانی کرنے والے ۱۴۵۰ اسٹیشن ہیں، جو ملک کے تقریباً سبھی بڑے نیز کچھ درمیانہ اور چھوٹے دریاؤں کا احاطہ کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے ۲۲ اسٹیشن بھی ہیں جو ملک کے مختلف حصوں میں ہوا کے معیار کا مسلسل جائزہ لیتے ہیں۔

نہ صرف آلودگی سے بہت زیادہ متاثرہ علاقوں میں ہوا اور پانی کے معیار کی نگرانی کرنے کے لیے بلکہ صنعتوں سے خارج ہونے دھوئیں اور فضلے کی روک تھام کرنے کے لیے بھی خصوصی طور سے آلات اور ساز و سامان سے لیس چلتی پھرتی تجربہ گاہوں سے کام لیا جاتا ہے۔

آلودگی پر قابو پانے سے متعلق مرکزی بورڈ متعدد قومی اور بین اقوامی پروگراموں میں سرگرمی سے شرکت کر کے آلودگی کی روک تھام کرنے اور اس پر قابو پانے کے سلسلے میں سخت جد و جہد کر رہا ہے۔ ان پروگراموں میں ہندوستانی قومی آبی وسائل کی نگرانی کا پروگرام، ہوا کے معیار کی نگرانی کا قومی پروگرام، ماحولیات کی نگرانی کے عالمی نظام وغیرہ شامل ہیں۔

عوام کی تعلیم

مذکورہ مرکزی بورڈ آلودگی کی روک تھام کرنے

باقی صفحہ ۲۸ پر

REGD. NO. D (DN) 204
R.N. 27032/81
VOL-15-NO-12
YOJANA (URDU)
LICENSED U (DN) 65 TO POST WITHOUT
PREPAYMENT AT NDPSO NEW DELHI
MARCH 1996

PUBLISHED BY THE DIRECTOR PUBLICATIONS DIVISION PATIALA HOUSE NEW DELHI 110001
PRINTED AT BENGAL OFFSET WORKS 335 KHAJOOR ROAD KAROL BAGH NEW DELHI 110005